

ایشر سنگھ جو نہی ہو ٹل کے کمرے میں داخل ہوا، کلونت کو رپنگ پر سے اٹھی۔ اپنی تیز تیز آنکھوں سے اس کی طرف گھور کے دیکھا اور دروازے کی چھینگ بند کر دی۔ رات کے بارہ نجح پچھے تھے، شہر کا مضافات ایک عجیب پر اسرار خاموشی میں غرق تھا۔

کلونت کو رپنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ایشر سنگھ جو غالباً اپنے پر اگنہ خیالات کے الجھے ہوئے دھاگے کھول رہا، ہاتھ میں کرپان لیے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ چند لمحات اسی طرح خاموشی میں گزر گئے۔ کلونت کو تھوڑی دیر کے بعد اپنا آسن پسند نہ آیا، اور وہ دونوں ٹانگیں پنگ سے نیچ لکا کر ہلانے لگی۔ ایشر سنگھ پھر بھی کچھ نہ بولا۔

کلونت کو بھرے بھرے ہاتھ پیروں والی عورت تھی۔ چوڑے چکلے کو لے، تھل تھل کرنے والے گوشت سے بھر پور کچھ بہت ہی زیادہ اوپر کو اٹھا ہوا سینہ، تیز آنکھیں، بالائی ہونٹ پر بالوں کا سرمی غبار، ٹھوڑی کی سانحنت سے پتہ چلتا تھا کہ بڑے دھڑلے کی عورت ہے۔

ایشر سنگھ گوسر نیوڑھائے ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ سر پر اس کی کس کرباندھی ہوئی پگڑی ڈھیلی ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جو کرپان تھا میں ہوئے تھے، تھوڑے تھوڑے لرزائ تھے، مگر اس کے قد و قامت اور خدوخال سے پتہ چلتا تھا کہ کلونت کو جنمی عورت کے لیے موزوں ترین مرد ہے۔

چند اور لمحات جب اسی طرح خاموشی سے گزر گئے تو کلونت کو رچھلک پڑی۔ لیکن تیز تیز آنکھوں کو نچا کروہ صرف اس قدر کہہ سکی، ”ایشرسیا۔“ ایشر سنگھ نے گردن اٹھا کر کلونت کو کی طرف دیکھا، مگر اس کی نگاہوں کی گولیوں کی تاب نہ لا کر منہ دوسرا طرف موڑ لیا۔ کلونت کو رچلائی، ”ایشرسیا۔“ لیکن فوراً ہی آواز بھیجنی اور رپنگ پر سے اٹھ کر اس کی جانب جاتے ہوئے بولی، ”کہاں رہے تم اتنے دن؟“

ایشر سنگھ نے خشک ہو نہیں پر زبان پھیری۔ ”مجھے معلوم نہیں۔“

کلونت کو رہنا گئی۔ ” یہ بھی کوئی مولیا جواب ہے؟“

ایشر سنگھ نے کرپان ایک طرف پھینک دی اور پینگ پر لیٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی دنوں کا بیمار ہے۔ کلونت کو نے پینگ کی طرف دیکھا۔ جواب ایشر سنگھ سے لمبا بھرا تھا۔ اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے بڑے پیار سے پوچھا، ”جانی کیا ہوا ہے تمہیں؟“

ایشر سنگھ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا، اس سے نگاہیں ہٹا کر اس نے کلونت کو رکے انوس چہرے کو ٹھوٹنا شروع کیا۔ ”کلونت“

آواز میں درد تھا۔ کلونت کو رسا ری کی ساری سمت کراپنے بالائی ہونٹ میں آگئی۔ ”ہاں جانی“ کہہ کرو وہ اس کو داتنوں سے کاٹنے لگی۔

ایشر سنگھ نے گلڈی اتار دی۔ کلونت کو کی طرف سہارا لینے والی نگاہوں سے دیکھا، اس کے گوشت بھرے کو لے پر زور سے دھپا مارا اور سر کو جھکنکا دے کر اپنے آپ سے کہا، ”یہ کڑی یاد ماغ ہی خراب ہے۔“

جھکنکا دینے سے اس کے کیس کھل گیے۔ کلونت کو رانگیوں سے ان میں کنگھمی کرنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے پوچھا، ”ایشر سیاں، کہاں رہے تم اتنے دن؟“

”برے کی ماں کے گھر“ ایشر سنگھ نے کلونت کو کو گھور کے دیکھا اور دفعتاً دنوں ہاتھوں سے اس کے ابھرے ہوئے سینے کو مسلنے لگا۔

” قسم واہورو کی بڑی جاندار عورت ہے۔“

کلونت کو نے ایک ادا کے ساتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ ایک طرف جھک دیے اور پوچھا، ”تمہیں میری قسم بتاؤ، کہاں رہے۔۔۔؟ شہر گئے تھے؟“

ایشر سنگھ نے ایک ہی لپیٹ میں اپنے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے جواب دیا، ”نہیں۔“

کلونت کو رچڑھی۔ ”نہیں تم ضرور شہر گئے تھے۔۔۔ اور تم نے بہت سارو پیہ لوٹا ہے جو مجھ سے چھپا رہے ہو۔“

”وہ اپنے باپ کا ختم نہ ہو جو تم سے جھوٹ بولے۔“

کلونت کو رخوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی، لیکن فوراً ہی بھڑک اٹھی، ”لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا، اس رات تمہیں کیا ہوا۔۔۔؟ اچھے بھلے میرے ساتھ لیٹئے تھے، مجھے تم نے وہ تمام گہنے پہنار کئے تھے جو تم شہر سے لوٹ کر لائے تھے۔ میری جھپیاں لے رہے تھے، پر جانے ایک دم تمہیں کیا ہوا، اٹھے اور کپڑے پہن کر باہر نکل گئے۔“

ایش سنگھ کارنگ زرد ہو گیا۔ کلونت کو رنے یہ تبدیلی دیکھتے ہی کہا، ”دیکھا کیسے رنگ نیلا پڑ گیا۔۔۔ ایشرسیاں، قسم و اگورو کی، ضرور کچھ دال میں کالا ہے؟“

”تیری جان کی قسم کچھ بھی نہیں۔“

ایش سنگھ کی آواز بے جان تھی۔ کلونت کو رکا شہر اور زیادہ مضبوط ہو گیا، بالائی ہونٹ بھینچ کر اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا، ”ایشرسیاں، کیا بات ہے۔ تم وہ نہیں ہو جو آج سے آٹھ روز پہلے تھے؟“

ایش سنگھ ایک دم اٹھ بیٹھا، جیسے کسی نے اس پر حملہ کیا تھا۔ کلونت کو رکا پنے تو مند بازوؤں میں سمیٹ کر اس نے پوری قوت کے ساتھ اسے بھجنوڑنا شروع کر دیا۔ ”جانی میں وہی ہوں۔۔۔ گھٹ گھٹ پا جھپیاں، تیری نکلے ہڈاں دی گرمی۔۔۔“

کلونت کو رنے مراحت نہ کی، لیکن وہ شکایت کرتی رہی۔ ”تمہیں اس رات ہو کیا گیا تھا؟“

”برے کی ماں کا وہ ہو گیا تھا۔“

” بتاؤ گے نہیں؟“

”کوئی بات ہو تو بتاؤ۔“

”مجھے اپنے ہاتھوں سے جلا؟ اگر جھوٹ بولو۔“

ایش سنگھ نے اپنے بازو اس کی گردان میں ڈال دیے اور ہونٹ اس کے ہو نٹوں میں گاڑ دیے۔ موچھوں کے بال کلونت کو رکھنے کے نتھنوں میں گھسے تو سے چھینک آگئی۔ دونوں ہنسنے لگے۔ ایش سنگھ نے اپنی صدری اتار دی اور کلونت کو کو شہوت بھری نظر وہ سے دیکھ کر کہا، ”آجائے، ایک بازی تاش کی ہو جائے!“

کلونت کو رکھنے کا بالائی ہونٹ پر سینے کی نہیں نہیں یوندیں پھوٹ آئیں، ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھمائیں اور کہا، ”چل دفان ہو۔“

ایش سنگھ نے اس کے بھرے ہوئے کو لہے پر زور سے چکنی بھری۔ کلونت کو ترپ کر ایک طرف ہٹ گئی، ”نه کرا ایش سیاں، میرے درد ہوتا ہے۔“ ایش سنگھ نے آگے بڑھ کر کلونت کو کا بالائی ہونٹ اپنے دانتوں تلے دبایا اور کچکچا نہ اگا۔ کلونت کو بالکل پکھل گئی۔ ایش سنگھ نے اپنا کرتہ اتار کے چھینک دیا اور کہا، ”لو، پھر ہو جائے ترپ چال۔۔۔“

کلونت کو کا بالائی ہونٹ کپکپانے لگا، ایش سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے کلونت کو رکھنے کا گھیر اپڑا اور جس طرح بکرے کی کھال اتارتے ہیں، اسی طرح اس کو اتار کر ایک طرف رکھ دیا، پھر اس نے گھور کے اس کے نگے بدن کو دیکھا اور زور سے اس کے بازو پر چکنی بھرتے ہوئے کہا، ”کلونت، قسم واہگرو کی، بڑی کراری عورت ہے تو۔“ کلونت کو اپنے بازو پر ابھرتے ہوئے لال دھبے کو دیکھنے لگی، ”بڑا ظالم ہے تو ایش سیاں۔“

ایش سنگھ اپنی گھنی کالی موچھوں میں مسکرایا، ”ہونے دے آج ظلم؟“ اور یہ کہہ کر اس نے مزید ظلم ڈھانے شروع کیے۔ کلونت کو کا بالائی ہونٹ دانتوں تلے کچکچا یا کان کی لووں کو کٹا، ابھرے ہوئے سینے کو بھنجھوڑا، ابھرے ہوئے کوہوں پر آواز پیدا کرنے والے چانٹے مارے۔ گالوں کے منہ بھر بھر کے بو سے لیے۔ چوس چوس کر اس کا سارا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا۔ کلونت کو تیز آنچ پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح ابلنے لگی۔

لیکن ایشر سنگھ ان تمام حیلوں کے باوجود خود میں حرارت پیدا نہ کر سکا۔ جتنے گر اور جتنے داؤ اسے یاد تھے، سب کے سب اس نے پڑ جانے والے پہلوان کی طرح استعمال کر دیے، پر کوئی کارگر نہ ہوا۔ کلونت کرنے، جس کے بدن کے سارے تار تن کر خود بخونج رہے تھے، غیر ضروری چھپٹر چھاڑ سے تنگ آ کر کہا، ”ایشر سیاں، کافی پھینٹ چکا ہے، اب پتا پھینک!“

یہ سنتے ہی ایشر سنگھ کے ہاتھ سے جیسے تاش کی ساری گذی نیچے پھسل گئی۔ ہانپتا ہوا وہ کلونت کور کے پہلو میں لیٹ گیا اور اس کے ماتھے پر سرد پسینے کے لیپ ہونے لگے۔ کلونت کرنے اسے گرمانے کی بہت کوشش کی۔ مگر ناکام رہی، اب تک سب کچھ منہ سے کہے بغیر ہوتا رہا تھا لیکن جب کلونت کور کے منتظر بہ عمل اعضا کو سخت نا امیدی ہوئی تو وہ جھلا کر پلٹنگ سے نیچے اتر گئی۔ سامنے کھونٹی پر چادر پڑی تھی، اس کو اتار کر اس نے جلدی اوڑھ کر اور نتھنے پھلا کر، بپھرے ہوئے لبھ میں کہا ”ایشر سیاں، وہ کون حرام زادی ہے، جس کے پاس تو اتنے دن رہ کر آیا ہے۔ جس نے تجھے نچوڑ ڈالا ہے؟“ ایشر سنگھ پلٹنگ پر لیٹا ہانپتا رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

کلونت کو رخصے سے ایلنے لگی۔ ”میں پوچھتی ہوں؟ کون ہے چڈو۔۔۔ کون ہے وہ الفتی۔۔۔ کون ہے وہ چور پتا؟“

ایشر سنگھ نے تھکے ہوئے لبھ میں جواب دیا، ”کوئی بھی نہیں کلونت، کوئی بھی نہیں۔“

کلونت کرنے اپنے بھرے ہوئے کوہبوں پر ہاتھ رکھ کر ایک عزم کے ساتھ کہا، ”ایشر سیاں، میں آج جھوٹ کچ جان کے رہوں گی۔۔۔ کھا واہگرو جی کی قسم۔۔۔ کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟“

ایشر سنگھ نے کچھ کہنا چاہا، مگر کلونت کرنے اس کی اجازت نہ دی۔ ”قسم کھانے سے پہلے سوچ لے کہ میں سردار نہال سنگھ کی بیٹی ہوں۔۔۔ تکابوٹی کر دوں گی، اگر تو نے جھوٹ بولा۔۔۔ اب کھاواہگرو جی کی قسم۔۔۔ کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟“

ایشر سنگھ نے بڑے دکھ کے ساتھ اثبات میں سرہلایا، کلونت کو بالکل دونی ہو گئی۔ لپک کر کونے میں سے کرپان الٹھائی، میان کو کیلے کے چھکلے کی طرح اتار کر ایک طرف پھینکا اور ایشر سنگھ پر وار کر دیا۔ آن کی آن میں لہو کے فوارے چھوٹ پڑے۔ کلونت کو کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے وحشی بلیوں کی طرح ایشر سنگھ کے کیس نوچنے شروع کر دیے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی نامعلوم سوت کو موٹی موٹی گالیاں دیتی رہیں۔ ایشر سنگھ نے تھوڑی دیر کے بعد نقاہت بھری التجاکی، ”جانے دے اب کلونت اجائے دے۔“

آواز میں بلا کا درد تھا، کلونت کو ریچھے ہٹ گئی۔

خون، ایشر سنگھ کے گلے سے اڑاڑ کر اس کی موچھوں پر گر رہا تھا، اس نے اپنے لرزال ہونٹ کھولے اور کلونت کو رکی طرف شکریے اور گلے کی ملی جملی نگاہوں سے دیکھا۔ ”میری جان! تم نے بہت جلدی کی۔۔۔ لیکن جو ہوا ٹھیک ہے۔۔۔“

کلونت کو رکا حسد پھر بھڑکا۔ ”مگر وہ کون ہے تمہاری ماں؟“

لہو، ایشر سنگھ کی زبان تک پہنچ گیا، جب اس نے اس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن پر جھر جھری سی دوڑ گئی۔

”اور میں۔۔۔ اور میں۔۔۔ بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں۔۔۔ اسی کرپان سے۔۔۔“

کلونت کو رکے دماغ میں صرف دوسری عورت تھی۔ ”میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ حرام زادی؟“

ایشر سنگھ کی آنکھیں دھنڈ لارہی تھیں، ایک ہلکی سی چمک ان میں پیدا ہوئی اور اس نے کلونت کو رکے کہا، ”گالی نہ دے اس بھڑوی کو۔“

کلونت چلائی، ”میں پوچھتی ہوں، وہ ہے کون؟“

ایشر سنگھ کے گلے میں آواز نہ گئی۔ ” بتاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی گردان پر ہاتھ پھیر اور اس پر اپنا جیتا جیتا خون دیکھ کر مسکرا یا۔ ”انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔“

کلونت کو رکے جواب کی منتظر تھی۔ ”ایشر سیاں، تو مطلب کی بات کر۔“

ایشر سنگھ کی مسکرا ہٹ اس کی لہو بھری موچھوں میں اور زیادہ پھیل گئی۔ ”مطلب ہی کی بات کر رہا ہوں۔۔۔ گلا چرا ہے ماں یا میرا۔۔۔ اب دھیرے دھیرے ہی ساری بات بتاؤں گا۔“

اور جب وہ بات بنانے لگا تو اس کے ماتھے پر ٹھٹھلے پینے کے لیپ ہونے لگے۔

”کلونت! میری جان۔۔۔ میں تمہیں نہیں بتا سکتا، میرے ساتھ کیا ہوا۔۔۔؟ انسان کڑی یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔۔۔ شہر میں لوٹ پھی تو سب کی طرح میں نے بھی اس میں حصہ لیا۔۔۔ گہنے پاتے اور روپے پیسے جو بھی ہاتھ لگے وہ میں نے تمہیں دے دیے۔۔۔ لیکن ایک بات تمہیں نہ بتائی۔۔۔“

ایشر سنگھ نے گھاؤ میں درد محسوس کیا اور کراہنے لگا۔ کلونت کو رنے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ اور بڑی بے رحمی سے پوچھا۔ ”کون سی بات؟“

ایشر سنگھ نے موچھوں پر جمٹے ہوئے لہو کو پھونک کے ذریعے سے اڑاتے ہوئے کہا، ”جس مکان پر۔۔۔ میں نے دھاوا بولا تھا۔۔۔ اس میں سات۔۔۔ اس میں سات آدمی تھے۔۔۔ چھ میں نے۔۔۔ قتل کر دیے۔۔۔ اسی کرپان سے جس سے تو نے مجھے۔۔۔ چھوڑا سے۔۔۔ سن۔۔۔ ایک لڑکی تھی بہت سندر۔۔۔ اس کو اٹھا میں اپنے ساتھ لے آیا۔“

کلونت کو رن، خاموش سنتی رہی۔ ایشر سنگھ نے ایک بار پھر پھونک مار کے موچھوں پر سے لہوا زایا۔ ”کلونت جانی، میں تم سے کیا کہوں، کتنی سندر تھی۔۔۔ میں اسے بھی مارڈالتا، پر میں نے کہا، ”نہیں، ایشر سیاں، کلونت کو رکے تو ہر روز مزے لیتا ہے، یہ میوہ بھی چکھ دیکھ۔۔۔“

کلونت کو رنے صرف اس قدر کہا، ”ہوں۔۔۔!“

”اور میں اسے کندھے پر ڈال کر چل دیا۔۔۔ راستے میں۔۔۔ کیا کہہ رہا تھا میں؟۔۔۔ ہاں راستے میں۔۔۔ نہر کی پڑی کے پاس، تھوڑی کی جھاڑیوں تلے میں نے اسے لٹادیا۔۔۔ پہلے سوچا کہ پھیٹوں، لیکن پھر نیاں آیا کہ نہیں۔۔۔“ یہ کہنے کہتے ایشر سنگھ کی زبان سوکھ گئی۔

کلونت کو رنے تھوک نگل کر اپنا حلق ترکیا اور پوچھا، ”پھر کیا ہوا؟“

ایشر سنگھ کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے، ”میں نے۔۔۔ میں نے پتا پھینکا۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔“

اس کی آواز ڈوب گئی۔

کلونت کرنے اسے بھینجوڑا: ”پھر کیا ہوا؟“

ایش رنگ نے اپنی بند ہوتی آنھیں کھولیں اور کلونت کرنے کے جسم کی طرف دیکھا، جس کی بوٹی بوٹی تحریر رہی تھی۔ ”وہ۔۔۔ وہ مری ہوئی تھی۔۔۔ لاش تھی۔۔۔ بالکل ٹھنڈا گوشت۔۔۔ جانی مجھے اپنا ہاتھ دے۔۔۔“

کلونت کرنے اپنا ہاتھ ایش رنگ کے ہاتھ پر رکھا، جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔

-[2]-

ٹوبہ ٹیک سنگھ: سعادت حسن منٹو

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا تبادلہ بھی ہونا چاہیے یعنی جو مسلمان پاگل، ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو اور سکھ، پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول، بہر حال دانشمندوں کے فیصلے کے مطابق ادھر ادھر اونچی سطح کی کافر نسیں ہوئیں اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لیے مقرر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے، وہیں رہنے دیے گئے تھے۔ جو باقی تھے، ان کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو، سکھ جا چکے تھے اسی لیے کسی کو رکھنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔ جتنے ہندو، سکھ پاگل تھے سب کے سب پولیس کی حفاظت میں بار ڈر پر پہنچا دیے گئے۔

ادھر کا معلوم نہیں، لیکن ادھر لا ہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی تو بڑی دلچسپی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ ”رمیندار، پڑھتا تھا، اس سے جب اس کے ایک دوست نے پوچھا، ”مولبی سا ب! یہ پاکستان

کیا ہوتا ہے؟” تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا، ”ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے بنتے ہیں۔“ یہ جواب سن کر اس کا دوست مسلمان ہو گیا۔

اسی طرح ایک سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا، ”سردار جی ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا رہا ہے۔۔۔ ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی۔“

دوسرا مسکرا یا، ”مجھے تو ہندوستوڑوں کی بولی آتی ہے۔۔۔ ہندوستانی بڑے شیطانی، اکٹھا کڑھرتے ہیں۔“

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے ”پاکستان زندہ باد“ کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر، پاگل خانے بھجوادیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے نجح جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے۔ لیکن صحیح واقعات سے وہ بھی خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور پھرہ دار سپاہی ان پڑھ اور جاہل تھے۔ ان کی گفتگوؤں سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائد اعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے۔۔۔ یہ کہاں ہے، اس کا محل و قوع کیا ہے، اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح مادف نہیں ہوا تھا، اس مخصوصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔۔۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے! اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصے پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے!

ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان، اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہو گیا۔ جھاڑو دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹھنپ پر بیٹھ کر دو گھنے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایاد ہمکایا گیا تو اس نے کہا، ”میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں۔۔۔ میں اس درخت پر ہوں گا۔“

بڑی مشکلوں کے بعد جب اس کا دورہ سر دپڑا تو وہ نیچے اتر اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل کر رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔

ایک ایم۔ ایس۔ سی۔ پاس ریڈ یو انجینئر میں، جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھا، باعث کی ایک خاص روشن پر، سارا دن خاموش ٹھہلتا رہتا تھا، یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اتار کر دفعدار کے حوالے کر دیے اور ننگ دھڑنگ سارے باعث میں چلا پھر ناشروع کر دیا۔

چنیوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا سرگرم کارکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا، یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دن اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائد اعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماstry تاراسنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خراہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علیحدہ علیحدہ بند کر دیا گیا۔

لاہور کا ایک نوجوان ہندو و کیل تھا جو محبت میں ناکام ہو کر پاگل ہو گیا تھا۔ جب اس نے سنا کہ امر تر ہندوستان میں چلا گیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہوئی تھی۔ گواں نے اس و کیل کو ٹھکرایا تھا، مگر دیو اگنی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام ہندو اور مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا جنہوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیے۔۔۔ اس کی محبوہ ہندوستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔

جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وہ کیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل برانہ کرے، اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندوستان میں جہاں اس کی محبوہ رہتی ہے۔ مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے کہ اس کا خیال تھا کہ امر تر میں اس کی پریکیش نہیں چلے گی۔

یورپین وارڈ میں انگلکو انڈیں پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں آپس میں اس اہم مسئلے پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں اب ان کی حیثیت کس قسم کی ہو گی۔ یورپین وارڈ رہے گایا اڑا دیا جائے گا۔ بریک فاست ملا کرے گایا نہیں۔ کیا انھیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی انڈیں چپاٹی تو زہر مار نہیں کرنا پڑے گی۔

ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان سے یہ عجیب و غریب الفاظ سننے میں آتے تھے۔ ”اوپڑ دی گڑ گڑ دی انکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال اف دی لائیں۔“ دن کو سوتا تھا نہ رات کو۔ پھر یہ اروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سویا۔ لیٹا بھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں سوچ گئے تھے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں، مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجود دلیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان، پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی وہ غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا تھا کہ اس کا کیا خیال ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا، ”اوپڑ دی گڑ گڑ دی انکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی پاکستان گور نمنٹ۔“

لیکن بعد میں ”آف دی پاکستان گور نمنٹ“ کی جگہ ”آف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ گور نمنٹ“ نے لے لی اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے جہاں کا وہ رہنے والا ہے۔ لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ جو بتانے کی کوشش کرتے تھے، خود اس الجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا پر اب سنا ہے کہ پاکستان میں ہے، کیا پتہ ہے کہ لاہور جواب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے۔ یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن جائے اور یہ بھی کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہی ہو جائیں۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کر بہت منقص رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم نہتا تھا، اس لیے داڑھی اور سر کے بال آپس میں جم گئے تھے، جس کے باعث اس کی شکل بڑی بھی انک ہو گئی تھی۔ مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں اس نے کبھی کسی سے جھگڑا افساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے، وہ اس کے متعلق جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زیمنیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا کہ اچانک دماغ المٹ گیا۔

اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کر اگئے۔ مہینے میں ایک بار ملاقات کے لیے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پر جب پاکستان، ہندوستان کی گڑ بڑ شروع ہوئی تو ان کا آنا بند ہو گیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے، مہینہ کون سا ہے یا کتنے سال بیت چکے ہیں۔ لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز واقارب اس سے ملنے کے لیے آتے تھے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آرہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر گنگھا کرتا، اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا، نکلوں کے پہنچا اور یوں سچ کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار ”اوپر دی گڑ گڑ دی انکیس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی لا لٹھین“ کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینے ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہو گئی تھی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کرید دن بدن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی تھی۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا کہ ملنے والے آرہے ہیں، پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہو گئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لیے پہل، مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟ تو وہ اسے یقیناً بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں، جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک روز بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں تو اس نے حسب عادت قہقهہ لگایا اور کہا، ”وہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں۔ اس لیے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں دیا۔“

بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ منت سماجت سے کہا کہ وہ حکم دیدے تاکہ جھنجھٹ ختم ہو، مگر وہ بہت مصروف تھا اس لیے کہ اسے اور بے شمار حکم دینے تھے۔ ایک دن تنگ آکر وہ اس پر برس پڑا، ”اوپر دی گڑ گڑ دی انکیس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف والے گورو جی دا خالصہ اینڈ والے گورو جی کی فتح۔۔۔ جو بولے سونہاں، سوت سری اکاں۔“

اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمان کے خدا ہو۔۔۔ سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔

تباہ لے سے کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا، ملاقات کے لیے آیا۔ پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا، مگر سپاہیوں نے اسے روکا، ”یہ تم سے ملنے آیا ہے۔۔۔ تمہارا دوست فضل دین ہے۔“

بشن سنگھ نے فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور کچھ بڑھانے لگا۔ فضل دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، ”میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی۔۔۔ تمہارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے۔۔۔ مجھ سے جتنی مدد ہو سکی، میں نے کی۔۔۔ تمہاری بیٹی روپ کو رکھ دیا۔۔۔ وہ کچھ کہتے کہتے روک گیا۔ بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا۔ ”بیٹی روپ کو رکھ دیں نے رک رک کر کہا، ”ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔۔۔ ان کے ساتھ ہی چلی گئی۔“

بشن سنگھ خاموش رہا۔ فضل دین نے کہنا شروع کیا، ”انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری خیر خیریت پوچھتا رہوں۔۔۔ اب میں نے سنایا ہے کہ تم ہندوستان جا رہے ہو۔۔۔ بھائی بلیسیر سنگھ اور بھائی ودھا و سنگھ سے میر اسلام کہنا۔۔۔ اور بھن امرت کو رسمی۔۔۔ بھائی بلیسیر سے کہنا فضل دین راضی خوشی ہے۔۔۔ دو بھوری بھینیں جو وہ چھوڑ گئے تھے، ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے۔۔۔ اور دوسری کے کٹی ہوئی تھی پر وہ چھ دن کی ہو کے مر گئی۔۔۔ اور۔۔۔ میرے لاٹ جو خدمت ہو کہنا، میں ہر وقت تیار رہوں۔۔۔ اور یہ تمہارے لیے تھوڑے سے مر و نذرے لایا ہوں۔“

بشن سنگھ نے مر و نذر کی پوٹی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا، ”ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟“ فضل دین نے قدرے حیرت سے کہا، ”کہاں ہے۔۔۔ وہیں ہے جہاں تھا۔“ بشن سنگھ نے پھر پوچھا، ”پاکستان میں یا ہندوستان میں؟“

”ہندوستان میں۔۔۔ نہیں نہیں، پاکستان میں۔“ فضل دین بوکھلا سا گیا۔

بشن سنگھ بڑھ رہا تھا ہوا چلا گیا۔ ”اوپر دی گڑ گڑ دی انکس دی بے دھیانا دی مگ دی دال آف پاکستان ایڈ ہندوستان آف دی در فٹے منہ۔“

تباہ لے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تباہ لے کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔ سخت سردیاں تھیں، جب لاہور کے پاگل خانے سے ہندو، سکھ پاگلوں سے بھری ہوئی لا ریاں پولیس کے محافظ دستے کے

ساتھ روانہ ہوئیں۔ متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واہم کے بارڈ پر طرفین کے سپرنٹنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کارروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرا افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو ماہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ جو نکلنے پر رضا مند ہوئے تھے، ان کو سنبھالنا مشکل ہوا جاتا تھا کیوں کہ ادھر ادھر بھاگ اٹھتے تھے، جو نگے تھے، ان کو کپڑے پہنائے جاتے وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے۔ کوئی گالیاں بک رہا ہے۔ کوئی گارہا ہے۔ آپس میں لڑ بھگڑ رہے ہیں۔ رو رہے ہیں، بلکہ رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پاگل عورتوں کا شور و غوغاء الگ تھا اور سردی اتنی کڑا کے کی تھی کہ دانت سے دانت نج رہے تھے۔

پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی، اس لیے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پچھینا جا رہا ہے۔ وہ چند جو کچھ سوچ سمجھ سکتے تھے۔ پاکستان زندہ باد اور پاکستان مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا کیوں کہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو یہ نفرہ سن کر طیش آگیا تھا۔

جب بیشن سنگھ کی باری آئی اور واہم کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا، ”ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔۔۔ پاکستان میں یا ہندوستان میں؟“

”متعلقہ افسر ہنسا، ”پاکستان میں۔“

یہ سن کر بیشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔

پاکستانی سپاہیوں نے اسے کپڑا لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے، مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا، ”ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے۔۔۔“ اور زور زور سے چلانے لگا، ”اوپڑی گڑ گڑ دی انکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان۔“

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے۔۔۔ اگر نہیں گیا تو اسے فوراً وہاں بھیج دیا جائے گا، مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوچی ہوئی تاگلوں پر کھڑا ہو گیا جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لیے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی۔ اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔

سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چھپنکی۔ ادھر ادھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا، اوندھے منہ لیٹا ہے۔ ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا۔۔۔ ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا، توبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔

-[3]-

بو: سعادت حسن منتو

برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے اسی طرح نہار ہے تھے۔ ساگوان کے اس اسپرنگ دار پلنگ پر، جواب کھڑکی کے پاس سے تھوڑا ادھر سر کا دیا گیا تھا، ایک گھاٹن لوڈ یارندھیر کے ساتھ چھٹی ہوئی تھی۔

کھڑکی کے پاس باہر پیپل کے نہائے ہوئے پتے رات کے دودھیا لے اندھیرے میں جھمکوں کی طرح تھر تھر ارہے تھے۔۔۔ اور شام کے وقت جب دن بھرا ایک انگریزی اخبار کی ساری خبریں اور اشتہار پڑھنے کے بعد، جب وہ باکتنی میں ذرا تفریح کی خاطر آ کھڑا ہوا تھا تو اس نے اس گھاٹن لڑکی کو، جو ساتھ دوالے رسیوں کے کارخانے میں کام کرتی تھی اور بارش سے بچنے کے لیے الی کے پیڑ کے نیچے کھڑی تھی، کھانس کھانس کر اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور اس کے بعد ہاتھ کے اشارے سے اوپر بلا لیا تھا۔

وہ کئی دن سے شدید قسم کی تہائی محسوس کر رہا تھا۔ جنگ کے باعث بمبئی کی تقریباً تمام کر سچین چھو کریاں جو سنتے داموں مل جایا کرتی تھیں، عورتوں کی اگزاری فورس میں بھرتی ہو گئی تھیں، ان میں سے کئی ایک نے فورٹ کے علاقے میں ڈنس اسکول کھول لیے تھے جہاں صرف فوجی گوروں کو جانے کی اجازت تھی۔۔۔ رندھیر بہت اداس ہو گیا تھا۔

اس کی اداہی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کر سچین چھو کریاں نایاب ہو گئی تھیں۔ دوسرا وجہ یہ بھی تھی کہ فوجی گوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہذب، تعلیم یافہ، صحت مند اور خوبصورت تھا، صرف اس لیے اس پر قہوہ خانوں کے دروازے بند کر دیے گئے تھے کہ اس کی چھڑی سفید نہیں تھی۔

جنگ سے پہلے رندھیر ناگپاراڑہ اور تاج ہوٹل کی کئی مشہور و معروف کر سچین لڑکیوں سے جسمانی تعلقات قائم کر چکا تھا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ اس قسم کے تعلقات کی کر سچین لڑکوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ معلومات رکھتا تھا جن سے لڑکیاں فیشن کے طور پر رومانس لڑاتی ہیں اور بعد میں کسی چغدے سے شادی کر لیتی ہیں۔

رندھیر نے محض دل ہی دل میں ہی ہیز لے سے بد لہ لینے کی خاطر اس گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تھا۔ ہیز ل اس کے فلیٹ کے نیچے رہتی تھی اور ہر روز صبح وردی پہن کر کٹھے ہوئے بالوں پر خاکی رنگ کی ٹوپی ترچھے زاویے سے جما کر باہر نکلتی تھی اور اس انداز سے چلتی تھی گویاٹ پا تھ پر تمام جاننے والے اس کے قدموں کے آگے ٹاٹ کی طرح پچھتے چلے جائیں گے۔

رندھیر نے سوچا تھا کہ آخر کیوں وہ ان کر سچین چھو کریوں کی طرف اتنا زیادہ راغب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے جسم کی تمام قابل نمائش چیزوں کی اچھی طرح نمائش کرتی ہیں۔ کسی قسم کی جھجک محسوس کیے بغیر اپنے ایام کی بے ترتیبی کا ذکر کر دیتی ہیں۔ اپنے پرانے معاشقوں کا حال سناتی ہیں۔۔۔ جب ڈانس کی دھن سنتی ہیں تو اپنی ٹانگیں تھر کانا شروع کر دیتی ہیں۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن کوئی بھی عورت ان تمام خوبیوں کی حامل ہو سکتی ہے۔

رندھیر نے جب گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تو اسے کسی طرح بھی اس بات کا لیکن نہیں تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ سلاٹے گا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اس نے اس کے بھیگے ہوئے کپڑے دیکھ کر یہ نیال کیا تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ بیچاری کو نمودنیا ہو جائے تو رندھیر نے اس سے کہا تھا، ”یہ کپڑے اتار دو۔“ سر دی لگ جائے گی۔

وہ رندھیر کی اس بات کا مطلب سمجھ گئی تھی کیوں کہ اس کی آنکھوں میں شرم کے لال ڈورے تیر گئے تھے لیکن بعد میں جب رندھیر نے اسے اپنی دھوتی نکال کر دی تو اس نے کچھ دیر سوچ کر اپنا کاشٹا کھولا۔ جس پر میل بھیگنے کی وجہ سے اور بھی نمایاں ہو گیا تھا۔۔۔ کاشٹا کھول کر اس نے ایک طرف رکھ دیا اور جلدی سے دھوتی اپنی رانوں پر ڈال لی۔ پھر اس نے اپنی پھنسنی پھنسنی چولی اتارنے کی کوشش کی جس کے

دونوں کناروں کو ملا کر اس نے ایک گانٹھ دے رکھی تھی۔ وہ گانٹھ اس کے تند رست سینے کے نخے مگر میلے گڑھے میں جذب سی ہو گئی تھی۔

دیر تک وہ اپنے گھے ہوئے ناخنوں کی مدد سے چوپی کی گانٹھ کھولنے کی کوشش کرتی رہی جو بھیگنے کی وجہ سے بہت زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ جب تھک ہار کر بیٹھ گئی تو اس نے مراٹھی زبان میں رندھیر سے کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا، ”میں کیا کروں۔۔۔ نہیں کھلتی۔“

رندھیر اس کے پاس بیٹھ گیا اور گرہ کھولنے لگا۔ تھک ہار کر اس نے ایک ہاتھ میں چوپی کا ایک سراپکڑا، دوسرا ہاتھ میں دوسرا۔ اور زور سے کھینچا، گرہ ایک دم پھسلی، رندھیر کے ہاتھ زور میں ادھر ادھر ہٹے، اور دو دھڑکتی ہوئی چھاتیاں نمودار ہو گئیں۔

لمحہ بھر کے لیے رندھیر نے سوچا کہ اس کے اپنے ہاتھوں نے اس گھاٹن لڑکی کے سینے پر، نرم نرم گندھی ہوئی مٹی کو ماہر کھار کی طرح دو پیالوں کی شکل بنادی ہے۔

اس کی صحت مند چھاتیوں میں وہی گدر اہٹ، وہی جاذبیت، وہی طراوت، وہی گرم گرم ٹھنڈک تھی جو کھار کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے تازہ تازہ کچے برتوں میں ہوتی ہے۔

مشینلے رنگ کی ان جوان چھاتیوں میں جو بالکل بے داغ تھیں، ایک عجیب قسم کی چمک مخلوں تھی، سیاہی مائل گندی رنگ کے نیچے دھنڈلی روشنی کی ایک تہہ سی تھی جس نے ایک عجیب و غریب قسم کی چمک پیدا کر دی تھی جو چمک ہوتے ہوئے بھی چمک نہیں تھی۔ اس کے سینے پر چھاتیوں کے یہ ابھاریہ ایسے دیے معلوم ہوتے تھے جو تالاب کے گدے پانی پر جل رہے ہوں۔

برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے اسی طرح کپکاپ رہے تھے۔ لڑکی کے دونوں کپڑے جو پانی میں شرابوں ہو چکے تھے ایک غلیظ ڈھیری کی شکل میں فرش پر پڑے تھے اور وہ رندھیر کے ساتھ چٹی ہوئی تھی۔ اس کے ننگے اور میلے بدن کی گرمی رندھیر کے جسم میں وہ کیفیت پیدا کر رہی تھی جو سخت سردیوں میں نایوں کے غلیظ گرم حمام میں نہاتے وقت محسوس ہوا کرتی ہے۔

ساری رات وہ رندھیر کے ساتھ چٹی رہی۔۔۔ دونوں جیسے ایک دوسرے کے مدغم ہو گئے تھے۔ انھوں نے بہ مشکل ایک دوباریں کی ہوں گی۔ کیوں کہ جو کچھ انہیں کہنا تھا، سانسوں، ہونٹوں اور ہاتھوں سے طے ہو رہا تھا۔ رندھیر کے ہاتھ ساری رات اس کی چھاتیوں پر ہوائی لس

کی طرح پھرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی چوچیاں اور وہ موئے موئے مسام جو چاروں طرف ایک سیاہ دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے، اس ہوائی لمس سے جاگ اٹھتے اور اس گھاٹن لڑکی کے سارے جسم میں ایسا ارتعاش پیدا ہوا جاتا کہ رندھیر خود بھی ایک لحظے کے لیے کپکا اٹھتا۔

ایسی کپکا ہٹوں سے رندھیر کا سیکڑوں بار واسطہ پڑھ کا تھا۔ وہ ان کو بخوبی جانتا تھا۔ کئی لڑکیوں کے نرم و نازک اور سخت سینوں سے اپنا سینہ ملا کر کئی کئی راتیں گزار چکا تھا۔ وہ ایسی لڑکیوں کے ساتھ بھی رہ چکا تھا جو بالکل اس کے ساتھ لپٹ کر گھر کی وہ ساری باتیں سنادیا کرتی تھیں جو کسی غیر کے لیے نہیں ہوتیں۔ وہ ایسی لڑکیوں سے بھی جسمانی تعلق قائم کر چکا تھا جو ساری مشقت کرتی تھیں اور اسے کوئی تکلیف نہیں دیتی تھیں۔۔۔ لیکن یہ گھاٹن لڑکی جو پیڑ کے نیچے بھیگی ہوئی کھڑی تھی اور جسے اس نے اشارے سے اوپر بلالیا تھا، مختلف تھی۔

ساری رات رندھیر کو اس کے جسم سے ایک عجیب قسم کی بوآتی رہی تھی۔ اس بوکو جو بیک وقت خوشبو بھی تھی اور بدبو بھی۔۔۔ وہ تمام رات پیتا رہا تھا۔ اس کی بغلوں سے، اس کی چھاتیوں سے، اس کے بالوں سے، اس کے پیٹ سے، ہر جگہ سے، یہ جو بدبو بھی تھی اور خوشبو بھی، رندھیر کے ہر سانس میں موجود تھی۔ تمام رات وہ سوچتا رہا تھا کہ یہ گھاٹن لڑکی بالکل قریب ہونے پر بھی ہر گز ہر گز اتنی زیادہ قریب نہ ہوتی اگر اس کے جسم سے یہ بونہ اڑتی۔۔۔ یہ بوجو اس کے دل و دماغ کی ہر سلوٹ میں رینگ رہی تھی۔ اس کے تمام پرانے اور نئے خیالوں میں رنج گئی تھی۔

اس بونے اس لڑکی کو اور اور رندھیر کو ایک رات کے لیے آپس میں حل کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے اندر داخل ہو گئے تھے، عمیق ترین گہرائیوں میں اتر گئے تھے؛ جہاں پہنچ کر وہ ایک خاص انسانی لذت میں تبدیل ہو گئے تھے۔ ایسی لذت جو لمحاتی ہونے کے باوجود دامنی تھی، جو ماں پرواز ہونے کے باوجود ساکن اور جامد تھی۔۔۔ وہ دونوں ایک ایسا پچھی بن گئے تھے جو آسمان کی نیلا ہٹوں میں اڑتا اڑتا غیر متحرک دکھائی دیتا ہے۔

اس بوجو اس گھاٹن لڑکی کے ہر مسام سے باہر نکلتی تھی، رندھیر اچھی طرح سمجھتا تھا، حالانکہ وہ اس کا تجربہ نہیں کر سکتا تھا۔ جس طرح بعض اوقات مٹی پر پانی چھڑکنے سے سوندھی سوندھی باس پیدا ہوتی ہے۔۔۔ لیکن نہیں، وہ بوکچھ اور ہی قسم کی تھی۔ اس میں لوڈر اور عطر کا مصنوعی پن نہیں تھا، وہ بالکل اصلی تھی۔۔۔ عورت اور مرد کے باہمی تعلقات کی طرح اصلی اور ازالی۔

رندھیر کو پسینے کی بوسے سخت نفرت تھی۔ وہ نہانے کے بعد عام طور پر اپنی بغلوں وغیرہ میں خوشبو دار پوڈر لگاتا تھا یا کوئی ایسی دو استعمال کرتا تھا جس سے پسینے کی بودب جائے۔ لیکن جیرت ہے کہ اس نے کئی بار۔۔۔ ہاں کئی بار اس گھاٹن لڑکی ہی بالوں بھری بغلوں کو چوما اور اسے

بالکل گھن نہ آئی بلکہ عجیب طرح کی لذت محسوس ہوئی۔ اس کی بغلوں کے نرزم بال پسینے کے باعث گیلے ہو رہے تھے۔ ان سے وہی بو نکتی تھی جو غایت درجہ قابل فہم ہونے کے باوجود ناقابل فہم تھی۔ رندھیر کو ایسا لگتا تھا کہ وہ اس بو کو جانتا ہے، پہچانتا ہے، اس کا مطلب بھی صحبت ہے لیکن کسی اور کو سمجھا نہیں سکتا۔

برسات کے یہی دن تھے۔۔۔ یہی، کھڑکی کے باہر جب اس نے دیکھا تو پیپل کے پتے لرز لرز کرنہاڑ ہے تھے۔ ہوا میں سرراہٹیں اور پھر پھر رہٹیں گھلی ہوئی تھیں۔ اندھیرا تھا مگر اس میں دبی دبی، دھبدي سی روشنی بھی سموئی ہوئی تھی جیسے بارش کے قطروں کے ساتھ گر کر تاروں کی تھوڑی تھوڑی روشنی اتر آئی ہو۔۔۔ برسات کے یہی دن تھے جب رندھیر کے اس کرے میں ساگوان کا صرف ایک پلنگ ہوتا تھا مگر اب اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا بھی پڑا تھا اور کونے میں ایک نئی ڈرینگ ٹیبل بھی موجود تھی۔ دن یہی برسات کے تھے، موسم بھی بالکل ایسا ہی تھا، مگر فضامیں عطر کی تیز خوشبو بی ہوئی تھی۔

دوسرا پلنگ خالی تھا۔ اس پلنگ پر جس پر رندھیر اوندھے منہ لیٹا کھڑکی کے باہر پیپل کے لرزتے ہوئے پتوں پر بارش کے قطروں کا رقص دیکھ رہا تھا، ایک گوری چٹی لڑکی اپنے ستر کو نگے جسم سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتے گالباً سوگئی تھی۔ اس کی لال ریشمی شلوار دوسرے پلنگ پر پڑی تھی اس کے گھرے سرخ ازار بند کا ایک پھنڈنا نیچے لٹک رہا تھا۔ پلنگ پر اس کے دوسرے اترے ہوئے کپڑے بھی پڑے تھے۔ اس کی سنہری پھولوں والی قمیص، انگلیا، جانگلیا اور دوپٹہ۔۔۔ سب کارنگ سرخ تھا۔۔۔ بے حد سرخ۔ یہ سب کپڑے حنا کے عطر کی تیز خوشبو میں بے ہوئے تھے۔ لڑکی کے سیاہ بالوں میں میش کے ذرے گرد کی طرح جھے ہوئے تھے۔ چہرے پر غازے، سرخی اور میشت کے ان ذرات نے مل جل کر ایک عجیب و غریب رنگ پیدا کر دیا تھا۔۔۔ بے جان ساڑا اڑارنگ اور اس کے گورے سینے پر انگلیا کے کچے رنگ نے جا بجا لال لال دھبے ڈال دیے تھے۔

چھاتیاں دودھ کی طرح سفید تھیں جس میں تھوڑی تھوڑی نیلاہٹ بھی تھی۔ بغلوں کے بال منڈے ہوئے تھے جس کے باعث وہاں سرمنی غبار سا پیدا ہو گیا تھا۔ رندھیر کئی بار اس لڑکی کی طرف دیکھ کر سوچ چکا تھا۔۔۔ کیا ایسا نہیں لگتا جیسے میں نے ابھی کیلیں اکھیر کر اس کو لکڑی کے بند بکس میں سے نکالا ہے۔ کتابوں اور چینی کے برتوں کی طرح۔ کونکہ جس طرح کتابوں پر داب کے نشان ہوتے ہیں، چینی کے برتوں ہلنے جلنے سے خراشیں آ جاتی ہیں، ٹھیک اسی طرح اس لڑکی کے بدن پر بھی کئی نشان تھے۔

جب رندھیر نے اس کی تنگ اور چست انگلیاں کھوئی تھیں تو اس کی پیچھے پر اور سامنے سینے کے زم زم گوشہ پر جھریاں تھیں جیسی بندی ہوئی۔ اس کے سینے پر کئی جگہ خراشیں پڑ گئی تھیں۔ جیسے ناخنوں سے بڑے زور سے کھجایا گیا ہو۔

برسات کے وہی دن تھے۔۔۔ پیپل کے نرم کول پتوں پر بارش کے قطرے گرنے سے ویسی ہی آواز پیدا ہو رہی تھی جیسی رندھیر اس دن ساری رات سنتا رہا تھا۔ موسم بہت خوش گوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن اس میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو گھلی ہوئی تھی۔

رندھیر کے ہاتھ بہت دیر تک اس گوری چٹی لڑکی کے کچے دودھ ایسے سفید سینے پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے۔ اس کی انگلیوں نے اس گورے گورے جسم میں کئی ارتعاش دوڑتے ہوئے محسوس کیے تھے۔ اس کے نرم زم جسم کے کئی گوشوں میں سُمٹی ہوئی کپکاپا ہٹوں کا بھی پتہ چلا تھا جب اس نے اپنا سینہ اس کے سینے کے ساتھ ملا یا تو رندھیر کے جسم کے ہر سامنے اس لڑکی کے بدن کے چھڑے ہوئے تاروں کی آواز سنی۔۔۔ لیکن وہ پکار کہاں تھی؟ وہ پکار جو اس نے گھاٹن لڑکی کے جسم کی بو میں سو گھمی تھی۔۔۔ وہ پکار جو دودھ کے پیالے سے بچے کے رونے سے کہیں زیاد ہتھاں فہم تھی، وہ پکار جو صوتی حدود سے نکل کر بے آواز ہو گئی تھی۔

رندھیر سلانخوں والی کھڑکی سے باہر دکھ رہا تھا۔ اس کے بہت قریب پیپل کے پتے لرز رہے تھے۔ مگر وہ ان کی لرزشوں کے اس پار کھیں بہت دور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، جہاں اس مٹ میلے بادلوں میں عجیب قسم کی دھنڈی روشنی دکھائی دیتی تھی۔۔۔ ٹھیک ویسے ہی جیسی اس گھاٹن لڑکی کے سینے میں اسے نظر آئی تھی۔ ایسی روشنی جو راز کی بات کی طرح پچھی ہوئی مگر ظاہر تھی۔

رندھیر کے پبلو میں ایک گوری چٹی لڑکی۔۔۔ جس کا جسم دودھ اور گھی ملے آٹے کی طرح ملائم تھا، لیٹی تھی۔۔۔ اس کے سوے ہوئے جسم سے حنا کے عطر کی خوشبو آرہی تھی۔۔۔ جواب تھکی معلوم ہوتی تھی۔ رندھیر کو یہ دم توڑتی اور حالت نزع کو پہنچی ہوئی خوشبو بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ اس میں کچھ کھٹاس تھی۔۔۔ ایک عجیب قسم کی کھٹاس جس طرح بد ہضمی کے ڈکاروں میں ہوتی ہے۔ ادا۔۔۔ بے رنگ۔۔۔ بے کیف۔

رندھیر نے اپنے پبلو میں لیٹی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا۔ جس طرح پھٹے ہوئے دودھ میں سفید سفید بے جان پکھنکیاں بے رنگ پانی میں ساکن ہوتی ہیں، اسی طرح اس لڑکی کی نسوانیت اس کے وجود میں ٹھہری ہوئی تھی، سفید سفید دھبوں کی صورت میں۔ اصل میں رندھیر کے دل و دماغ میں وہ یوں ہوئی تھی جو اس گھاٹن لڑکی کے جسم سے بغیر کسی بیرونی کو شش کے باہر نکل رہی تھی۔ وہ بوجو حنا کے عطر سے

کہیں زیادہ بکلی پھلکی اور دور رس تھی۔ جس میں سونگھے جانے کا اضطراب نہیں تھا۔ جو خود بخود ناک کے راستے داخل ہو کر اپنی صحیح منزل پر پہنچ گئی تھی۔

رندھیر نے آخری کوشش کرتے ہوئے اس لڑکی کے دودھیا لے جسم پر ہاتھ پھیرا مگر اسے کوئی کپکاپاہٹ محسوس نہ ہوئی۔۔۔ اس کی نئی نویلی بیوی جو فرست کلاس میسٹریٹ کی لڑکی تھی، جس نے بی۔ اے تک تعلیم پائی تھی اور جو اپنے کالج میں سیکڑوں لڑکوں کے دل کی دھڑکن تھی۔ رندھیر کی نبض تیز نہ کر سکی۔ وہ حنا کی مرتبی ہوئی خوشبو میں اس بوکی جنتو کرتار ہا جو بر سات کے انھیں دنوں میں، جب کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے بارش میں نہار ہے تھے، اسے گھاٹن لڑکی کے میلے جسم سے آئی تھی۔

-[4]-

کھول دو: سعادت حسن منٹو

امر تر سے اسپیشل ٹرین دوپہر دو بجے کو چلی اور آٹھ گھنٹوں کے بعد مغل پورہ پہنچی۔ راستے میں کئی آدمی مارے گیے۔ متعدد زخمی ہوئے اور کچھ ادھر ادھر بھٹک گئے۔

صحیح دس بجے۔۔۔ کیمپ کی ٹھنڈی زمین پر جب سراج الدین نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایک متلاطم سمندر دیکھا تو اس کی سوچنے سمجھنے کی قوتیں اور بھی ضعیف ہو گئیں۔ وہ دیر تک گد لے آسمان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا ہا۔ یوں تو کیمپ میں ہر طرف شور برپا تھا۔ لیکن بوڑھے سراج الدین کے کان جیسے بند تھے۔ اسے کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی اسے دیکھتا تو یہ خیال کرتا کہ وہ کسی گھری فکر میں غرق ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ اس کے ہوش و حواس شل تھے۔ اس کا سارا وجود خلامیں معلق تھا۔

گد لے آسمان کی طرف بغیر کسی ارادے کے دیکھتے دیکھتے سراج الدین کی نگاہیں سورج سے ٹکرائیں۔ تیز روشنی اس کے وجود کے رگ و ریشے میں اتر گئی اور وہ جاگ اٹھا۔ اوپر تلے اس کے دماغ پر کئی تصویریں دوڑ گئیں۔ لوٹ۔۔۔ آگ۔۔۔ بھاگم بھاگ۔۔۔ اسٹیشن۔۔۔ گولیاں۔۔۔ رات اور سکینہ۔۔۔ سراج الدین ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور پاگلوں کی طرح اس نے اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے انسانوں کے سمندر کو کھاگ لانا شروع کیا۔

پورے تین گھنٹے وہ "سکینہ، سکینہ" پکارتا کیمپ میں خاک چھانتراہا۔ مگر اسے اپنی جوان اکتوبر بیٹی کا کوئی پتائنا ملا۔ چاروں طرف ایک دھاندی سی پچی تھی۔ کوئی اپنا چپڑہ ڈھونڈ رہا تھا، کوئی ماں، کوئی بیوی اور کوئی بیٹی۔ سراج الدین تھک ہار کر ایک طرف بیٹھ گیا اور حافظے پر زور دے کر سوچنے لگا کہ سکینہ اس سے کب اور کہاں جدا ہوئی۔ لیکن سوچنے اس کا دماغ سکینہ کی ماں کی لاش پر جنم جاتا۔ جس کی ساری انتہیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس سے آگے وہ اور کچھ نہ سوچ سکتا۔

سکینہ کی ماں مر چکی تھی۔ اس نے سراج الدین کی آنکھوں کے سامنے دم توڑا تھا۔ لیکن سکینہ کہاں تھی جس کے متعلق اس کی ماں نے مرتے ہوئے کہا تھا، "مجھے چھوڑو اور سکینہ کو لے کر جلدی یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

سکینہ اس کے ساتھ ہی تھی۔ دونوں ننگے پاؤں بھاگ رہے تھے۔ سکینہ کا دوپٹہ گر پڑا تھا۔ اسے اٹھانے کے لیے اس نے رکنا چاہا تھا مگر سکینہ نے چلا کر کہا تھا، "ابا جی۔۔۔ چھوڑ یے۔" لیکن اس نے دوپٹہ اٹھایا تھا۔۔۔ یہ سوچنے سوچنے اس نے اپنے کوٹ کی ابھری ہوئی جیب کی طرف دیکھا اور اس میں ہاتھ ڈال کر ایک کپڑا انکالا۔۔۔ سکینہ کا وہی دوپٹہ تھا۔۔۔ لیکن سکینہ کہاں تھی؟

سراج الدین نے اپنے تھکے ہوئے دماغ پر بہت زور دیا مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ کیا وہ سکینہ کو اپنے ساتھ استیشن تک لے آیا تھا۔۔۔ کیا وہ اس کے ساتھ ہی گاڑی میں سوار تھی۔۔۔؟ راستے میں جب گاڑی روکی گئی تھی اور بلوائی اندر گھس آئے تھے تو کیا وہ بے ہوش ہو گیا تھا جو وہ سکینہ کو اٹھا کر لے گیے؟

سراج الدین کے دماغ میں سوال ہی سوال تھے، جواب کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کو ہمدردی کی ضرورت تھی لیکن چاروں طرف جتنے بھی انسان پھیلے ہوئے تھے سب کو ہمدردی کی ضرورت تھی۔ سراج الدین نے رونا چاہا مگر آنکھوں نے اس کی مدد نہ کی۔ آنسو جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ چھ روز کے بعد جب ہوش و حواس کسی قدر درست ہوئے تو سراج الدین ان لوگوں سے ملا جو اس کی مدد کرنے کے لیے تیار تھے۔ آٹھ نوجوان تھے۔ جن کے پاس لاری تھی، بندوقیں تھیں۔ سراج الدین نے ان کو لاکھ لاکھ دعائیں دیں اور سکینہ کا حلیہ بتایا، "گوارنگ ہے اور بہت ہی خوبصورت ہے۔۔۔ مجھ پر نہیں اپنی ماں پر تھی۔۔۔ عمر ستہ برس کے قریب ہے۔۔۔ آنکھیں بڑی بڑی۔۔۔ بال سیاہ، داہنے گال پر موٹا سا تمل۔۔۔ میری اکتوبر بیٹی ہے۔۔۔ ڈھونڈ لاؤ۔ تمہارا خدا بھلا کرے گا۔"

رضا کار نوجوانوں نے بڑے جذبے کے ساتھ بڑھے سراج الدین کو لیقین دلایا کہ اگر اس کی بیٹی زندہ ہوئی تو چند ہی دنوں میں اس کے پاس ہو گی۔

آٹھوں نوجوانوں نے کوشش کی۔ جان ہتھیلیوں پر رکھ کروہ امر تسری گئے۔ کئی عورتوں، کئی مردوں اور کئی بچوں کو نکال کر انہوں نے محفوظ مقاموں پر پہنچایا۔ دس روز گزر گئے مگر انھیں سکینہ کہیں نہ ملی۔

ایک روز وہ اسی خدمت کے لیے لاری پر امر تسری جا رہے تھے کہ چھپہ ہڑ کے پاس سڑک پر انھیں ایک لڑکی دکھائی دی۔ لاری کی آواز سن کروہ بد کی اور بھاگنا شروع کر دیا۔ رضاکاروں نے موڑ روکی اور سب کے سب اس کے چیچپے بھاگے۔ ایک کھیت میں انہوں نے لڑکی کو کپڑ لیا۔ دیکھا تو بہت خوبصورت تھی۔ داہنے گال پر موٹا تل تھا۔ ایک لڑکے نے اس سے کہا، ”گھبراؤ نہیں۔۔۔ کیا تمہارا نام سکینہ ہے؟“

لڑکی کا رنگ اور بھی زرد ہو گیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن جب تمام لڑکوں نے اسے دم دلا سادیا تو اس کی دحشت دور ہوئی اور اس نے مان لیا کہ وہ سراج الدین کی بیٹی سکینہ ہے۔

آٹھ رضاکار نوجوانوں نے ہر طرح سکینہ کی دلجوئی کی۔ اسے کھانا کھلایا۔ دودھ پلایا اور لاری میں بٹھا دیا۔ ایک نے اپنا کوٹ اتنا کرائے دے دیا۔ کیونکہ دوپتہ نہ ہونے کے باعث وہ بہت الجھن محسوس کر رہی تھی۔ اور بار بار بانہوں سے اپنے سینے کو ڈھانکنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔

کئی دن گزر گئے۔۔۔ سراج الدین کو سکینہ کی کوئی خبر نہ ملی۔ وہ دن بھر مختلف کیمپوں اور دفتروں کے چکر کا ٹھارہتا۔ لیکن کہیں سے بھی اس کی بیٹی کا پتہ نہ چلا۔ رات کو وہ بہت دیر تک ان رضاکار نوجوانوں کی کامیابی کے لیے دعاکیں مانگتا رہتا۔ جنہوں نے اس کو یقین دلایا تھا کہ اگر سکینہ زندہ ہوئی تو چند دنوں ہی میں وہ اسے ڈھونڈنکالیں گے۔

ایک روز سراج الدین نے کیمپ میں ان نوجوان رضاکاروں کو دیکھا۔ لاری میں بیٹھے تھے۔ سراج الدین بھاگ بھاگا ان کے پاس گیا۔ لاری چلنے ہی والی تھی کہ اس نے پوچھا، ”بیٹا، میری سکینہ کا پتہ چلا؟“

سب نے یک زبان ہو کر کہا، ”چل جائے گا، چل جائے گا۔“ اور لاری چلا دی۔ سراج الدین نے ایک بار پھر ان نوجوانوں کی کامیابی کے لیے دعا مانگی اور اس کا بجی کسی قدر ہلاکا ہو گیا۔

شام کے قریب یکم پہ میں جہاں سرانج الدین بیٹھا تھا، اس کے پاس ہی کچھ گڑبڑی ہوئی۔ چار آدمی کچھ اٹھا کر لارہے تھے۔ اس نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک لڑکی ریلوے لائن کے پاس بے ہوش پڑی تھی۔ لوگ اسے اٹھا کر لائے ہیں۔ سرانج الدین ان کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ لوگوں نے لڑکی کو ہسپتال والوں کے سپرد کیا اور چلے گئے۔ کچھ دیر وہ ایسے ہی ہسپتال کے باہر گڑے ہوئے لکڑی کے کھبے کے ساتھ لگ کر کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اندر چلا گیا۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک اسٹریچر تھا جس پر ایک لاش پڑی تھی۔ سرانج الدین چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھا۔ کمرے میں دفتار و شنی ہوئی۔ سرانج الدین نے لاش کے زرد چہرے پر چمکتا ہوا تل دیکھا اور چلایا۔

”سکینہ!“

ڈاکٹر نے جس نے کمرے میں روشنی کی تھی سرانج الدین سے پوچھا، ”کیا ہے؟“

سرانج الدین کے حلقت سے صرف اس قدر نکل سکا، ”جی میں۔۔۔ جی میں۔۔۔ اس کا باپ ہوں!“

ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا۔ اس کی نبض ٹھوٹی اور سرانج الدین سے کہا، ”کھڑکی کھول دو۔“

سکینہ کے مردہ جسم میں جنبش پیدا ہوئی۔ بے جان ہاتھوں سے اس نے ازار بند کھولا اور شلووار نیچے سر کا دی۔

بوڑھا سرانج الدین خوشی سے چلایا، ”زندہ ہے۔۔۔ میری بیٹی زندہ ہے۔۔۔“

ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو گیا۔۔۔

-[5]-

کالی شلووار: سعادت حسن منٹو

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے جانے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی، ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک روز اس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا، ”وس لیف۔۔۔ ویری بیڈ۔۔۔“ یعنی یہ زندگی بہت بری ہے جبکہ کھانے ہی کو نہیں ملتا۔

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آ جاتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر میں تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی۔ یہ گورے، اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر ان کی زبان سے یہ علمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی، ”صاحب، ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا۔“ اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھپڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ وہ حیرت میں اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ ان سے کہتی، ”صاحب، تم ایک دم الوکا بٹھا ہے۔۔۔ سمجھا۔“ یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجے میں سختی پیدا نہ کرتی بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی۔ یہ گورے ہنس دیتے اور ہنسنے وقت وہ سلطانہ کو بالکل الوکے پڑھ دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تین مہینے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہو گئے تھے جہاں اس نے سنا تھا کہ بڑے لاث صاحب رہتے ہیں، جو گرمیوں میں شملے چلتے ہیں، مگر صرف چھ آدمی اس کے پاس آئے تھے۔ صرف چھ، یعنی مہینے میں دو اور ان چھ گاہوں سے اس نے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے تھے۔ تین روپے سے زیادہ پر کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپناریٹ دس روپے بتایا تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی کہا، ”بھی ہم تین روپے سے ایک کوڑی زیادہ نہ دیں گے۔“ نہ جانے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا۔

چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے خود اس سے کہا، ”دیکھو، میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی۔ اس سے ایک دھیلام کم کہو تو میں نہ لوں گی۔“ اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ۔ ”چھٹے آدمی نے یہ بات سن کر تکرار نہ کی اور اس کے ہاں ٹھہر گیا۔ جب دوسرے کمرے میں دروازے وروازے بند کر کے وہ اپنا کوٹ اتار نے لگا تو سلطانہ نے کہا، ”لائیے ایک روپیہ دو دھکا۔“ اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنی جیب میں سے نکال کر اس کو دے دی اور سلطانہ نے بھی چکپے سے لے لی کہ چلو جو آیا ہے غنیمت ہے۔

سماڑھے اٹھا رہ روپے تین مہینوں میں۔۔۔ بیس روپے ماہوار تو اس کو ٹھٹھے کا کرایہ تھا جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔ اس فلیٹ میں ایسا پا خانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے ٹل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس شور نے اسے بہت ڈرایا تھا۔ پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لیے اس پا خانہ میں گئی تو اس کے کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ فارغ ہو کر جب اٹھنے لگی تو اس نے لکھی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا۔ اس زنجیر کو دیکھ کر اس نے خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لیے تیار کیے گئے ہیں، یہ زنجیر اس لیے لگائی گئی ہے کہ اٹھنے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے مگر جو نہیں اس نے زنجیر پکڑ کر اٹھنا چاہا، اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر ایک دم پانی اس شور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹو گرفتاری کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائی ڈر کو نین ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سنی۔ دوڑ کروہ باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا، ”کیا ہوا؟۔۔۔ یہ چیخ تمہاری تھی؟“

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے کہا، ”یہ مو پا خانہ ہے یا کیا ہے۔ ٹھیک میں یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے۔ میری کمر میں درد تھا۔ میں نے کہا چلو اس کا سہارا لے لوں گی، پر اس مولیٰ زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھا کہ ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں۔“

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس پیخانے کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی نیچے زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خدا بخش را ولپنڈی کا تھا۔ انٹر نٹس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھا، چنانچہ چار برس تک وہ را ولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہو گئی۔ اس کو بھگا کروہ لا ہور لے آیا۔ لا ہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا۔ اس لیے اس نے عورت کو پیشے بھٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالہ میں ہے۔ وہ اس کی تلاش میں انبالہ آیا جہاں اس کو سلطانہ مل گئی۔ سلطانہ نے اس کو پسند کیا، چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اٹھا۔ عورت چوں کہ ضعیف الاعتقاد تھی اس لیے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوں ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی، چنانچہ اس خوش اعتمادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظر وں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی مختی تھا۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فوٹو گرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیسرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔ اس لیے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھ لیا۔ پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیسرہ بھی خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پر دہ بنوایا، دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل لکا، چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا انبار لے چھاؤنی میں قائم کر دیا۔ یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا رہتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہو گئی، چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعہ سے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے اور اس کی آمدی پہلے سے دو گنی ہو گئی۔

سلطانہ نے کانوں کے لیے بندے خریدے۔ ساڑھے پانچ تو لے کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوائیں۔ دس پندرہ اچھی اچھی سائزیاں بھی جمع کر لیں، گھر میں فرنچیپر وغیرہ بھی آگیا۔ قصہ مختصر یہ کہ ان بالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی مگر ایکا ایکی نہ جانے خدا بخش کے دل میں کیا سماںی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ سلطانہ انکار کیسے کرتی جبکہ خدا بخش کو اپنے لیے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کر لیا۔ بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سن چکی تھی۔ پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ تھی جس سے اسے بے حد عقیدت تھی، چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باج کرو وہ خدا بخش کے ساتھ دہلی آگئی۔ یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا جس میں وہ دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی۔ میونسل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسپیوں کے لیے مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں۔ یونچے دکانیں تھیں اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ۔ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی تھیں اس لیے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت محسوس ہوئی تھی، پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگادیا تو اس کو ایک پکی نشانی مل گئی۔ ”یہاں میلے کپڑوں کی دھلانی کی جاتی ہے“ یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی۔

اسی طرح اس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کر لی تھیں، مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں کوئی دوکان، لکھا تھا وہاں اس کی سیمیلی ہیرا بائی رہتی تھی جو کبھی کبھی ریڈ یو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں نشر فا کے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے، لکھا تھا وہاں اس کی دوسری سیمیلی منت

رہتی تھی۔ نواڑ کے کارخانے کے اوپر انوری رہتی تھی جو اسی کارخانے کے سینٹھ کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ سینٹھ صاحب کو رات کے وقت اپنے کارخانے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اس لیے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دوکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی، پرجب دو مہینے گزر گئے اور کوئی آدمی اس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اسے بہت تشویش ہوئی۔ اس نے خدا بخش سے کہا، ”کیا بات ہے خدا بخش، دو مہینے آج پورے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے، کسی نے ادھر کارخ بھی نہیں کیا۔۔۔ مانتی ہوں آج کل بازار بہت مندا ہے، پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی میں نہ آئے۔“

خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصہ سے کھٹک رہی تھی مگر وہ خاموش تھا، پرجب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا، ”میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ باگ دوسرا دھندوں میں پڑ کر ادھر کا رستہ بھول گئے ہیں۔۔۔ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ۔۔۔“ وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی۔ خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ یہ پہلا گاہک تھا جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا۔ اس کے بعد پانچ اور آئے یعنی تین مہینے میں چھ، جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے، پانی کا ٹکنیکس اور بجلی کا بل جدا تھا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرا خرچ تھے۔ کھانا پینا، کپڑے لئے، دوادارا اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینے میں آئے تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے۔ سلطانہ پریشان ہو گئی۔ ساڑھے پانچ تو لے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے ابنا لے میں بنوائی تھیں آہستہ بک گئیں۔ آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا۔ ”تم میری سنو اور چلو واپس ابنا لے میں یہاں کیا دھرا ہے۔۔۔؟ بھی ہو گا، پر ہمیں تو یہ شہر اس نہیں آیا۔ تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا، چلو، وہیں چلتے ہیں۔ جو نقصان ہوا ہے اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو۔ اس کنگنی کو بیچ کر آؤ، میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں۔ آج رات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے۔“

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا، ”نہیں جانِ من، ابنا لے اب نہیں جائیں گے، بیتیں دہلی میں رہ کر کماںیں گے۔ یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب سیبیں واپس آئیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا کار ساز ہے۔ یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی نہ کوئی اسباب بننا ہی دے گا۔“

سلطانہ چپ ہو رہی، چنانچہ آخری کلگن ہاتھ سے اتر گئی۔ بُچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوتا تھا، پر کیا کرتی، پسیٹ بھی تو آخر کسی جیلے سے بھرنا تھا۔

جب پانچ مینے گزر گیے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چو تھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطانہ کو اس کا بھی دکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی، پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت بر الگتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سہیلیوں سے ملنا جنبا لکل ترک کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے سمنان مکان میں بیٹھی رہتی۔ کبھی چھالیسا کا طقی رہتی، کبھی اپنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی باہر بالکونی میں آکر جنگلے کے ساتھ کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کو نے سے اس کو نے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لو ہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال اسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے۔ باسیں ہاتھ کو کھلامیدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پڑیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لو ہے کی یہ پڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پڑیوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجنا اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک بچھک سدا گونجتی رہتی تھی۔

صحح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکونی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا۔ دھند لکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھوال نکلتا تھا اور گد لے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پڑیوں سے اٹھتے تھے اور آنکھ جھینکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجی نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو، اکیلے پڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدلتے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔۔۔ نہ جانے کہاں۔ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا ذرور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور وہ کہیں رک جائے گی۔۔۔ کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا جا بلانہ ہو گا۔

یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانگی پڑیوں اور ٹھہرے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی تھی، پر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا مگر وہاں اس نے کبھی ان

چیزوں کو ایسی نظر دیں جس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹریوں کا جال سا بچا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اٹھ رہا ہے ایک بہت بڑا چکلہ ہے۔ بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو چند موٹے موٹے انجن ادھر دھکلتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو تو بعض اوقات یہ انجن سیئٹ معلوم ہوتے ہیں جو کبھی کبھی انبالہ میں اس کے ہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے، چنانچہ جب اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکل کوئی میں جانا چھوڑ دیا۔ خدا بخش سے اس نے بارہا کہا، ”دیکھو، میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔ میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں۔“ مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اس کی تشغی کر دی، ”جان من۔۔۔ میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں ہی میں بیڑا پار ہو جائے گا۔“

پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک نہ سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔

محرم کا مہینہ سر پر آ رہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ مختار نے لیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قیمت بنوائی تھی جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں۔ اس کے ساتھ مچ کرنے کے لیے اس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس سائزی خریدی تھی۔ اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس سائزی کے نیچے سفید بو سکنی کا پیٹ کوٹ پہننے کی کیونکہ یہ نیافیشن ہے۔ اس سائزی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی محمل کا ایک جو تالائی تھی جو بڑا نازک تھا۔ سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس احساس نے بہت دکھ دیا کہ وہ محروم نہ کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت مغموم تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھوڑا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ گھر بالکل خالی تھا۔ خدا بخش حسبِ معمول باہر تھا۔ دیر تک وہ دری پر گاؤں تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی رہی، پر جب اس کی گردان اونچائی کے باعث اکٹھی گئی تو اٹھ کر باہر بالکل کوئی میں چل گئی تاکہ غم افرا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔

سامنے پڑیوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے پرانج� کوئی بھی نہ تھا۔ شام کا وقت تھا۔ چھتر کا وہ پکا تھا اس لیے گرد و غبار دب گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گیے تھے جوتاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اوپنجی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ مسکرا دی اور اس کو بھول گئی کیونکہ اب سامنے پڑیوں پر ایک انجن نمودار ہو گیا تھا۔

سلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ عجیب و غریب خیال دماغ سے نکالنے کی خاطر جب اس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا جس نے اس کی طرف للچائی نظر وہ سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا۔ اس آدمی نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا، کہ در سے آؤ، سلطانہ نے اسے راستہ بتایا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا مگر پھر بڑی پھر تی سے اوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اسے دری پر بٹھایا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلہ گفتگو شروع کرنے کے لیے کہا، ”آپ اوپر آتے ڈر رہے تھے۔“ وہ آدمی یہ سن کر مسکرا یا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا۔۔۔ ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟“ اس پر سلطانہ نے کہا، ”یہ میں نے اس لیے اس کے آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے۔“ وہ یہ سن کر پھر مسکرا یا۔ ”تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ میں تمہارے اوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھار ہی تھی۔ مجھے یہ منظر پسند آیا۔ پھر بالکوئی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا۔ سبز روشنی مجھے پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔“ یہ کہہ اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سلطانہ نے پوچھا، ”آپ جا رہے ہیں؟“ اس آدمی نے جواب دیا، ”نہیں، میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔ چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ۔“

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھادیے۔ اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معاشرہ کیا۔ جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آگئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اس آدمی نے کہا، ”میرا نام شنکر ہے۔“

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں۔ کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک بھی پیدا ہوتی تھی۔ گھٹھیا اور کسرتی بدن تھا۔ کنپیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ خاکستری رنگ کی گرم پتلوں پہنے تھا۔ سفید قمیص تھی جس کا کالر گردن پر سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے۔ اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا۔ چنانچہ اس نے شنکر سے کہا، ”فرمائیے۔۔۔“

شکر بیٹھا تھا، یہ سن کر لیٹ گیا۔ ”میں کیا فرماؤں، کچھ تم ہی فرماؤ۔ بلا یا تمہیں نے ہے مجھے۔“ جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اٹھ بیٹھا۔ ”میں سمجھا، لو اب مجھ سے سنو، جو کچھ تم نے سمجھا، غلط ہے، میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے۔ مجھے جب بلا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے۔“

سلطانہ یہ سن کر چکرائی مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار نہیں آگئی۔

”آپ کام کیا کرتے ہیں؟“

شکر نے جواب دیا، ”یہی جو تم لوگ کرتے ہو۔“

”کیا؟“

”تم کیا کرتی ہو؟“

”میں--- میں--- میں کچھ بھی نہیں کرتی۔“

”میں بھی کچھ نہیں کرتا۔“

سلطانہ نے بھنا کر کہا، ”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی--- آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے۔“

شکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا، ”تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہوگی۔“

”جھک مارتی ہوں۔“

”میں بھی جھک مارتا ہوں۔“

”تو آؤ دونوں جھک ماریں۔“

”میں حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے لیے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا۔“

”ہوش کی دوا کرو۔۔۔ یہ لنگر خانہ نہیں۔“

”اور میں بھی والنشیر نہیں ہوں۔“

سلطانہ بیہاں رک گئی۔ اس نے پوچھا، ”یہ والنشیر کون ہوتے ہیں۔“

شنکر نے جواب دیا، ”لوکے پٹھے۔“

”میں بھی لوکی پٹھی نہیں۔“

”مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ضرور الوکا پٹھا ہے۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدار سیدہ فتیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگتالے کی طرح بند ہے۔“ یہ کہہ کر شنکر ہنسا۔

اس پر سلطانہ نے کہا، ”تم ہندو ہو، اسی لیے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہو۔“

شنکر مسکرا یا، ”ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے۔ بڑے بڑے پنڈت اور مولوی اگر یہاں آئیں تو وہ بھی شریف آدمی بن جائیں۔“

”جانے تم کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو۔۔۔ بولو رہو گے؟“

”اسی شرط پر جو پہلے بتاچکا ہوں۔“

سلطانہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”تو جاؤ رستہ پکڑو۔“

شنکر آرام سے اٹھا۔ پتلون کی جیبوں میں اس نے اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا، ”میں کبھی کبھی اس بازار سے گزر اکرتا ہوں۔ جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو بلا لینا۔۔۔ میں بہت کام کا آدمی ہوں۔“

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کا لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس آدمی کی باتوں نے اس کے دکھ کو بہت ہلاکر دیا تھا۔ اگر وہ انباہلے میں آیا ہوتا جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا ہوتا مگر یہاں چونکہ وہ بہت اداس رہتی تھی، اس لیے شنکر کی باتیں اسے پسند آئیں۔

شام کو جب خدابخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا، ”تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟“ خدابخش تھک کر چور چور ہو رہا تھا، کہنے لگا، ”پرانے قلعہ کے پاس سے آ رہا ہوں۔ وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں، انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن بھر جائیں۔۔۔“

”کچھ انہوں نے تم سے کہا؟“

”نہیں، ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے۔۔۔ پر سلطانہ، میں جوان کی خدمت کر رہا ہوں وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی۔ اللہ کا فضل شامل حال رہا تو پسرووارے نیارے ہو جائیں گے۔“

سلطانہ کے دماغ میں محروم منانے کا خیال سما یا ہوا تھا، خدا بخش سے رونی آواز میں کہنے لگی، ”سار اسارا دن باہر غائب رہتے ہو۔۔۔ میں یہاں پنجھرے میں قید رہتی ہوں، نہ کہیں جاسکتی ہوں نہ آسکتی ہوں۔ محروم سر پر آگیا ہے، کچھ تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں، گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں، اب تم ہی بتاؤ کیا ہو گا؟۔۔۔ یوں نقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دلبی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو۔ کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا۔“

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا، ”پر یہ کام شروع کرنے کے لیے بھی تو تھوڑا بہت سر ما یہ چاہیے۔۔۔ خدا کے لیے اب ایسی دکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہو سکتیں۔ میں نے سچ مجھ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی، پر جو کرتا ہے اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے لیے کرتا ہے، کیا پتا ہے کہ کچھ دیر اور تکفین برداشت کرنے کے بعد ہم۔۔۔“

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا، ”تم خدا کے لیے کچھ کرو۔ چوری کرو یا ذا کہ مارو پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لادو۔ میرے پاس سفید بو سکی کی قمیص پڑی ہے، اس کو میں رنگوں والوں کی۔ سفید نینون کا ایک نیادو پٹہ بھی میرے پاس موجود ہے، وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لا کر دیا تھا، یہ بھی قمیص کے ساتھ ہی کالا رنگوں والیا جائے گا۔ ایک صرف شلوار کی کسر ہے، سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو۔۔۔ دیکھو تمہیں میری جان کی قسم کسی نہ کسی طرح ضرور لادو۔۔۔ میری بھتی کھاؤ اگر نہ لاؤ۔“

خدا بخش اٹھ بیٹھا۔ ”اب تم خواہ مزاہ زور دیے چلی جا رہی ہو۔۔۔ میں کہاں سے لاوں گا۔۔۔ افیم کھانے کے لیے تو میرے پاس پیسہ نہیں۔“

”کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گزر کالی ساٹن لادو۔“

”دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے۔“

”لیکن تم کچھ نہیں کرو گے۔۔۔ تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو۔ جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنہ گزر مل جاتی تھی، اب سوا روپے گزر کے حساب سے ملتی ہے۔ ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟“

”اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا۔“ یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا۔ ”لواب ان باتوں کو بھول جاؤ، میں ہو ٹل سے کھانا لے آؤں۔“

ہو ٹل سے کھانا آیادونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گیے۔ صبح ہوئی۔ خدا بخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ ایکلی رہ گئی۔ پکھ دیر لیٹی رہی، کچھ دیر سوئی رہی۔ ادھر ادھر کمروں میں ٹھہلتی رہی، دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نینیوں کا دوپٹہ اور سفید بو سکی کی قیص بکالی اور نیچے لانڈری والے کورنگے کے لیے دے آئی۔ کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آکر فلموں کی کتابیں پڑھیں جن میں اس کی دیکھی ہوئی فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سوگئی، جب اٹھی تو چارنج چکے تھے کیونکہ دھوپ آنگن میں سے موری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ نہاد ہو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکوئی میں آکھڑی ہوئی۔ قریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکوئی میں کھڑی رہی۔

اب شام ہو گئی تھی۔ بتیاں روشن ہو رہی تھیں۔ نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے۔ سردی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی تھی مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی۔ وہ سڑک پر آتے جاتے ٹانگوں اور موڑوں کی طرف ایک عرصہ سے دیکھ رہی تھی۔ دفتار سے شنکر نظر آیا۔ مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گردن اوپھی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اسے اوپر بلا لیا۔

جب شنکر اپر آگیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے۔ دراصل اس نے ایسے ہی بلا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا تھا۔ شنکر بے حد مطمئن تھا جیسے اس کا اپنا گھر ہے، چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤں تکیہ سر کے نیچر کر لیٹ گیا۔ جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس سے کہا، ”تم مجھے سود نعمہ بلا سکتی ہو اور سود نعمہ ہی کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ۔۔۔ میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔“

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی، کہنے لگی، ”نہیں بیٹھو، تمہیں جانے کو کون کہتا ہے۔“

شنکر اس پر مسکرا دیا۔ ”تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں۔“

”کیسی شرطیں؟“ سلطانہ نے ہنس کر کہا، ”کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟“

”نکاح اور شادی کیسی؟ نہ تم عمر بھر میں کسی سے نکاح کرو گئے نہ میں۔ یہ رسماں ہم لوگوں کے لیے نہیں۔ چھوڑوان فضولیات کو۔ کوئی کام کی بات کرو۔“

”بولو کیا بات کروں؟“

”تم عورت ہو۔۔۔ کوئی ایسی بات شروع کرو جس سے دو گھنٹی دل بھل جائے۔ اس دنیا میں صرف دو کامداری ہی دو کامداری نہیں، اور کچھ بھی ہے۔“

سلطانہ ذہنی طور پر اب شکر کو قبول کر چکی تھی۔ کہنے لگی، ”صاف صاف کہو، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔“

”جو دوسرا رے چاہتے ہیں۔“ شکر اٹھ کر پیٹھ گیا۔

”تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا۔“

”تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور مجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں خود سمجھنا چاہئیں۔“

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی پھر کہا، ”میں سمجھ گئی۔“

”تو کہو، کیا ارادہ ہے؟“

”تم جیتے، میں ہاری۔ پر میں کہتی ہوں، آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہو گی۔“

”تم غلط کہتی ہو۔۔۔ اسی محلے میں تمہیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی جو کبھی یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو۔ لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو۔۔۔ تمہارا نام سلطانہ ہے نا؟“

”سلطانہ ہی ہے۔“

شکر اٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا، ”میرا نام شکر ہے۔۔۔ یہ نام بھی عجب اٹ پٹانگ ہوتے ہیں، چلو آؤ اندر چلیں۔“

شکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں بنس رہے تھے، نہ جانے کس بات پر۔ جب شکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا، ”شکر میری ایک بات مانو گے؟“

شکر نے جواباً کہا، ”پہلے بات بتاؤ۔“

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی، ”تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر۔“

”کہو کہو۔۔۔ رک کیوں گئی ہو۔“

سلطانہ نے جرأت سے کام لے کر کہا، ”بات یہ ہے کہ محروم آرہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنو سکوں۔۔۔ یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔ قمیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لیے دے دیا ہے۔“

شکر نے یہ سن کر کہا، ”تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں جو تم یہ کالی شلوار بنو سکو۔“

سلطانہ نے فوراً ہی کہا، ”نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار لادو۔“

شنگر مسکرا یا، ”میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے، بہر حال میں کوشش کروں گا۔ محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی۔ لے بس اب خوش ہو گئیں۔“ سلطانہ کے بندوں کی طرف دیکھ کر شنگر نے پوچھا، ”کیا یہ بندے تم مجھے دے سکتی ہو؟“

سلطانہ نے ہنس کر کہا، ”تم انھیں کیا کرو گے۔ چندی کے معمولی بندے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔“

اس پر شنگر نے کہا، ”میں نے تم سے بندے مانگے ہیں۔ ان کی قیمت نہیں پوچھی، بولو، دیتی ہو۔“

”لے لو۔“ یہ کہہ کر سلطانہ نے بندے اتار کر شنگر کو دے دیے۔ اس کے بعد افسوس ہوا مگر شنگر جا چکا تھا۔

سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنگر اپنا وعدہ پورا کرے گا مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نوبجے دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنگر کھڑا تھا۔ اخبار میں پڑی ہوئی چیز اس نے سلطانہ کو دی اور کہا، ”سائن کی کالی شلوار ہے۔۔۔ دیکھ لینا، شاید لمبی ہو۔۔۔ اب میں چلتا ہوں۔“

شنگر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اس کی پتلون میں شلنیں پڑی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے اور سیدھا دھرہ ہی چلا آیا ہے۔ سلطانہ نے کاغذ کھولا۔ سائن کی کالی شلوار تھی ایسی ہی جیسی کہ وہ مختار کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت خوش ہوئی۔ بندوں اور اس سودے کا جو افسوس اسے ہوا تھا اس شلوار نے اور شنگر کی وعدہ ایسا نی نے دور کر دیا۔

دو پھر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیص اور دوپٹہ لے کر آئی۔ تینوں کالے کپڑے اس نے جب پہن لیے تو دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو مختار اندر داخل ہوئی۔ اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا، ”قمیص اور دوپٹہ تو رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے، پر یہ شلوار نئی ہے۔۔۔ کب بنوائی؟“

سلطانہ نے جواب دیا، ”آج ہی درزی لایا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں مختار کے کانوں پر پڑیں، ”یہ بندے تم نے کہاں سے لیے؟“

مختار نے جواب دیا، ”آج ہی منگوائے ہیں۔“

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر تک خاموش رہنا پڑا۔

-[6]-

1919 کی ایک بات: سعادت حسن منٹو

یہ 1919ء کی بات ہے بھائی جان، جب رولٹ ایکٹ کے خلاف سارے پنجاب میں ایجی ٹیشن ہورہی تھی۔ میں امر تسر کی بات کر رہا ہوں۔ سرمائیکل اوڈوارنے ڈینس آف انڈیا رولز کے تحت گاندھی جی کا داغلہ پنجاب میں بند کر دیا تھا۔ وہ ادھر آرہے تھے کہ پلوں کے مقام پر ان کو روک لیا گیا اور گرفتار کر کے واپس بمبئی بھیج دیا گیا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں بھائی جان! اگر انگریز یہ غلطی نہ کرتا تو جلیاں والا باغ کا حادثہ اس کی حکمرانی کی سیاہ تاریخ میں ایسے خونیں ورق کا اضافہ کبھی نہ کرتا۔

کیا مسلمان، کیا ہندو، کیا سکھ، سب کے دل میں گاندھی جی کی بے حد عزت تھی۔ سب انھیں مہاتما نتھے۔ جب ان کی گرفتاری کی خبر لا ہو ر پہنچی تو سارا کاروبار ایک دم بند ہو گیا۔ یہاں سے امر تسر والوں کو معلوم ہوا، چنانچہ یوں چنکیوں میں مکمل ہڑتال ہو گئی۔

کہتے ہیں کہ نو اپریل کی شام کو ڈاکٹرستیہ پال اور ڈاکٹر کچلو کی جلاوطنی کے احکام ڈپٹی کمشنر کو مل گئے تھے۔ وہ ان کی تعییل کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے کہ اس کے خیال کے مطابق امر تسر میں کسی یہجان خیز بات کا خطروہ نہیں تھا۔ لوگ پر امن طریقے پر احتجاجی جلسے وغیرہ کرتے تھے۔ جن سے تشدد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اپنی آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہوں۔ نوکرام نومی تھی۔ جلوس نکلا مگر مجال ہے جو کسی نے حکام کی مرضی کے خلاف ایک قدم اٹھایا ہو، لیکن بھائی جان سرمائیکل عجب اوندھی کھوپڑی کا انسان تھا۔ اس نے ڈپٹی کمشنر کی ایک نہ سئی۔ اس پر بس یہی خوف سوار تھا کہ یہ لیڈر مہاتما گاندھی کے اشارے پر سامراج کا تختہ اللئے کے درپے ہیں، اور جو ہڑتالیں ہو رہی ہیں اور جلسے منعقد ہوتے ہیں ان کے پس پر دیہی سازش کام کر رہی ہے۔

ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹرستیہ پال کی جلاوطنی کی خبر آنکھاں شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ دل ہر شخص کا مکدر تھا۔ ہر وقت دھڑکا سالگار ہتا تھا کہ کوئی بہت بڑا حادثہ برپا ہونے والا ہے، لیکن بھائی جان جوش بہت زیادہ تھا۔ کاروبار بند تھے۔ شہر قبرستان بننا ہوا تھا، پر اس قبرستان کی خاموشی میں بھی ایک شور تھا۔ جب ڈاکٹر کچلو اورستیہ پال کی گرفتاری کی خبر آئی تو لوگ ہزاروں کی تعداد میں اکٹھے ہوئے کہ مل کر ڈپٹی کمشنر بہادر

کے پاس جائیں اور اپنے محبوب لیڈروں کی جلاوطنی کے احکام منسخ کرانے کی درخواست کریں۔ مگر وہ زمانہ بھائی جان درخواستیں سننے کا نہیں تھا۔ سرمایکل جیسا فرعون حاکم اعلیٰ تھا۔ اس نے درخواست سننا تو کجا، لوگوں کے اس اجتماع ہی کو غیر قانونی قرار دیا۔

امر تسر۔۔۔ وہ امر تسر جو کبھی آزادی کی تحریک کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ جس کے سینے پر جلیاں والا باغ جیسا قابلِ فخر رکھ تھا۔ آج کس حالت میں ہے۔۔۔؟ لیکن چھوڑ یئے اس قصے کو۔ دل کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس مقدس شہر میں جو کچھ آج سے پانچ برس پہلے ہوا اس کے ذمہ دار بھی انگریز ہیں۔ ہو گا بھائی جان، پر سچ پوچھتے تو اس لہو میں جو وہاں بہا ہے ہمارے اپنے ہی ہاتھ رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خیر۔۔۔!

ڈپٹی کمشنر صاحب کا بیگنگہ سول لاکھ میں تھا۔ ہر بڑا افسر اور ہر بڑا ٹوڈی شہر کے اس الگ تحمل حصے میں رہتا تھا۔۔۔ آپ نے امر تسدیکھا ہے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ شہر اور سول لاکھ کو ملانے والا ایک پل ہے جس پر سے گزر کر آدمی ٹھنڈی سڑک پر پہنچتا ہے۔ جہاں حاکموں نے اپنے لیے یہ ارضی جنت بنائی ہوئی تھی۔

ہجوم جب ہال دروازے کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ پل پر گھٹ سوار گوروں کا پھرہ ہے۔ ہجوم بالکل نہ رکا اور بڑھتا گیا۔ بھائی جان میں اس میں شامل تھا۔ جوش کتنا تھا، میں بیان نہیں کر سکتا، لیکن سب نہتے تھے۔ کسی کے پاس ایک معمولی چھٹری تک بھی نہیں تھی۔ اصل میں وہ تو صرف اس غرض سے نکلے تھے کہ اجتماعی طور پر اپنی آواز حاکم شہر تک پہنچائیں اور اس سے درخواست کریں کہ ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر سٹیہ پال کو غیر مشروط طور پر رہا کر دے۔ ہجوم پل کی طرف بڑھتا ہا۔ لوگ قریب پہنچے تو گوروں نے فائر شروع کر دیے۔ اس سے بھلڈ ڈیچ گئی۔ وہ گنتی میں صرف بیس پچیس تھے اور ہجوم سیکڑوں پر مشتمل تھا، لیکن بھائی گولی کی دہشت بہت ہوتی ہے۔ ایسی افرا騰ری پھیلی کہ الاماں۔ کچھ گولیوں سے گھائل ہوئے اور کچھ بھلڈ ڈیں زخمی ہوئے۔

دائیں ہاتھ کو گندانا لاتھا۔ دھکا لگاتو میں اس میں گرپٹا۔ گولیاں چلنی بند ہو گئیں تو میں نے اٹھ کر دیکھا، ہجوم تتر بترا ہو چکا تھا۔ زخمی سڑک پر پڑے تھے اور پل پر گورے کھڑے ہنس رہے تھے۔ بھائی جان مجھے قطعاً یاد نہیں کہ اس وقت میری دماغی حالت کس قسم کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ میرے ہوش و حواس پوری طرح سلامت نہیں تھے۔ گندے نالے میں گرتے وقت تو قطعاً مجھے ہوش نہیں تھا۔ جب باہر نکلا تو جو حادثہ و قوع پذیر ہوا تھا، اس کے خدو خال آہستہ آہستہ دماغ میں ابھرنے شروع ہوئے۔

دور شور کی آواز سنائی دے رہی تھی جیسے بہت سے لوگ غصے میں چنج چلار ہے ہیں۔ میں گند انا لاعبور کر کے ظاہر اپیر کے تکیے سے ہوتا ہوا ہال دروازے کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ تیس چالیس نوجوان جوش میں بھرے پتھر اٹھا کر دروازے کے گھڑیاں پر مار رہے ہیں۔ اس کا شمیشہ ٹوٹ کر سڑک پر گرا تو ایک لڑکے نے باقیوں سے کہا، ”چلو۔۔۔ ملکہ کا بت توڑیں!“

دوسرے نے کہا، ”نہیں یار۔۔۔ کوتوالی کو آگ لگائیں!“

تیرے نے کہا، ”اور سارے بینکوں کو بھی!“

چوتھے نے ان کو روکا، ”مٹھر و۔۔۔ اس سے کیا فائدہ۔۔۔ چلو پل پر ان لوگوں کو ماریں۔“

میں نے اس کو پہچان لیا۔ یہ تھیلا کنجر تھا۔۔۔ نام محمد طفیل تھا مگر تھیلا کنجر کے نام سے مشہور تھا۔ اس لیے کہ ایک طوائف کے بطن سے تھا۔ بڑا آوارہ گرد تھا۔ چھوٹی عمر ہی میں اس کو جوئے اور شراب نوشی کی لست پڑ گئی تھی۔ اس کی دو بہنیں شمشاد اور الماس اپنے وقت کی حسین ترین طوائفیں تھیں۔ شمشاد کا گلا بہت اچھا تھا۔ اس کا مجرمانے کے لیے رنیس بڑی دور دور سے آتے تھے۔ دونوں اپنے بھائی کی کرتوقتوں سے بہت نالاں تھیں۔ شہر میں مشہور تھا کہ انہوں نے ایک قسم کا اس کو عاق کر رکھا ہے۔ پھر بھی وہ کسی نہ کسی حیلے اپنی ضروریات کے لیے ان سے کچھ نہ کچھ وصول کر رہی لیتا تھا۔ ویسے وہ بہت خوش پوش رہتا تھا۔ اچھا کھاتا تھا، اچھا پیتا تھا۔ بڑا انفاست پسند تھا۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گولی مزان میں کوٹ کے بھری تھی۔ میراثیوں اور بھانڈوں کے سو قیانہ پن سے بہت دور رہتا تھا۔ لمبا تقد، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، مضبوط کسرتی بدن۔ ناک نقشے کا بھی خاصا تھا۔

پر جوش لڑکوں نے اس کی بات نہ سنی اور ملکہ کے بت کی طرف چلنے لگے۔ اس نے پھر ان سے کہا، ”میں نے کہامت ضائع کرو اپنا جوش، ادھر آؤ میرے ساتھ۔۔۔ چلو ان کو ماریں جنہوں نے ہمارے بے قصور آدمیوں کی جان لی ہے اور انھیں زخمی کیا ہے۔۔۔ خدا کی قسم ہم سب مل کر ان کی گردن مر ڈسکتے ہیں۔۔۔ چلو!“

کچھ روانہ ہو چکے تھے۔ باقی رک گئے۔ تھیلا پل کی طرف بڑھا تو اس کے پیچھے چلنے لگے۔ میں نے سوچا کہ ماوں کے یہ لال بیکار موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ فوارے کے پاس دبکا کھڑا تھا۔ وہیں میں نے تھیلے کو آواز دی اور کہا، ”مت جاؤ یار۔۔۔ کیوں اپنی اور ان کی جان کے پیچھے

پڑے ہو۔ ”تحیلے نے یہ سن کر ایک عجیب ساتھیوں کے لئے بند کیا اور مجھ سے کہا، ”تحیلہ صرف یہ بتانے چلا ہے کہ وہ گولیوں سے ڈرنے والا نہیں۔“
پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا، ”تم ڈرتے ہو تو واپس جاسکتے ہو۔“

ایسے موقعوں پر بڑھے ہوئے قدم اٹھ کیسے ہو سکتے ہیں۔ اور پھر وہ بھی اس وقت جب لیڈر اپنی جان ہٹھیلی پر رکھ کر آگے جا رہا ہو۔
تحیلے نے قدم تیز کیے تو اس کے ساتھیوں کو بھی کرنے پڑے۔ ہال دروازے سے پل کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں۔۔۔ ہو گا کوئی ساٹھ ستر گز کے
قریب۔۔۔ تحیلہ اس سے آگے آگے تھا۔ جہاں سے پل کا دور ویہ متوازی جنگلہ شروع ہوتا ہے، وہاں سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر دو
گھڑ سوار گورے کھڑے تھے۔ تحیلہ اندرے لگا تا جب جنگلے کے آغاز کے پاس پہنچا تو فائز ہوا۔ میں سمجھا کہ وہ گر پڑا ہے۔۔۔ لیکن دیکھا کہ وہ
اسی طرح۔۔۔ زندہ آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کے باقی ساتھی ڈر کے بھاگ اٹھے ہیں۔ مڑ کر اس نے پیچھے دیکھا اور چلا یا، ”بھاگو نہیں۔۔۔
آؤ!“

اس کا منہ میری طرف تھا کہ ایک اور فائز ہوا۔ پلٹ کر اس نے گوروں کی طرف دیکھا اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔۔۔ بھائی جان نظر تو مجھے کچھ
نہیں آنا پا ہیے تھا، مگر میں نے دیکھا کہ اس کی سفید بو سکلی کی قیص پر لال لال دھبے تھے۔۔۔ وہ اور تیزی سے بڑھا، جیسے زخمی شیر۔۔۔
ایک اور فائز ہوا۔ وہ گھڑ ایسا مگر ایک دم قدم مضبوط کر کے وہ گھڑ سوار گورے پر لپکا اور چشم زدن میں جانے کیا ہوا۔۔۔ گھوڑے کی پیٹھ
خالی تھی۔ گورا زمین پر تھا اور تحیلہ اس کے اوپر۔۔۔ دوسرا گورے نے جو قریب تھا اور پہلے بوکھلا گیا تھا، بدلتے ہوئے گھوڑے کو روکا اور
دھڑادھڑ فائز شروع کر دیے۔۔۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا مجھے معلوم نہیں۔ میں وہاں فوارے کے پاس بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

بھائی جان جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے گھر میں اپنے گھر میں تھا۔ چند پہچان کے آدمی مجھے وہاں سے اٹھا لائے تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ پل پر سے
گولیاں کھا کر بجوم مشتعل ہو گیا تھا۔ نتیجہ اس اشتعال کا یہ ہوا کہ ملکہ کے بہت کو توڑنے کی کوشش کی گئی۔ ٹاؤن ہال اور تین بکھوں کو آگ
لگی اور پانچ یا چھ گورے مارے گئے۔ خوب لوٹ پھی۔

لوٹ کھسوٹ کا انگریز افسروں کو اتنا خیال نہیں تھا۔ پانچ یا چھ یورپین ہلاک ہوئے تھے اس کا بدله لینے کے لیے چنانچہ، جلیاں والا باغ کا
خونیں حادثہ رونما ہوا۔ ڈپٹی کمشنر بہادر نے شہر کی باگ ڈور جزل ڈائر کے سپرد کر دی۔ چنانچہ جزل صاحب نے بارہ اپریل کو فوجیوں کے
ساتھ شہر کے مختلف بازاروں میں مارچ کیا اور درجنوں بے گناہ آدمی گرفتار کیے۔ تیرہ کو جلیاں والا باغ میں جلسہ ہوا۔ قریب قریب پچھیں
ہزار کا مجمع تھا۔ شام کے قریب جزل ڈائر مسلح گورکھوں اور سکھوں کے ساتھ وہاں پہنچا اور نہتے آدمیوں پر گولیوں کی بارش شروع کر دی۔

اس وقت تو کسی کو نقصانِ جان کا ٹھیک اندازہ نہیں تھا۔ بعد میں جب تحقیق ہوئی تو پتہ چلا کہ ایک ہزار ہلاک ہوئے ہیں اور تین یا چار ہزار کے قریب زخمی۔۔۔ لیکن میں تھیلے کی بات کر رہا تھا۔۔۔ بھائی جان آنکھوں دیکھی آپ کو بتاچکا ہوں۔۔۔ بے عیب ذات خدا کی ہے۔

مرحوم میں چاروں عیب شرعی تھے۔ ایک پیشہ ور طوائف کے بطن سے تھا مگر جیلا تھا۔۔۔ میں اب یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس ملعون گورے کی پہلی گولی بھی اس کے لگی تھی۔ آواز سن کر اس نے جب پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا تھا، اور انھیں حوصلہ دلایا تھا جوش کی حالت میں اس کو معلوم نہیں ہوا تھا کہ اس کی چھاتی میں گرم گرم سیسہ اتر چکا ہے۔ دوسرا گولی اس کی پیٹھ میں لگی۔ تیسرا پھر سینے میں۔۔۔ میں نے دیکھا نہیں، پر سنائے جب تھیلے کی لاش گورے سے جدا کی گئی تو اس کے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں اس بری طرح پیوست تھے کہ علیحدہ نہیں ہوتے تھے۔۔۔ گورا جہنم واصل ہو چکا تھا۔

دوسرے روز جب تھیلے کی لاش کفن دفن کے لیے اس کے گھر والوں کے سپرد کی گئی تو اس کا بدنبال گولیوں سے چھلنی ہو رہا تھا۔۔۔ دوسرے گورے نے تو اپنا پورا اپسٹول اس پر خالی کر دیا تھا۔۔۔ میرا خیال ہے اس وقت مرحوم کی روح نفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ اس شیطان کے پچھے نے صرف اس کے مردہ جسم پر چاند ماری کی تھی۔

کہتے ہیں جب تھیلے کی لاش محلے میں پکنچی تو کہرام مچ گیا۔ اپنی برادری میں وہ اتنا مقبول نہیں تھا، لیکن اس کی قیمہ قیمہ لاش دیکھ کر سب دہڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اس کی بہنیں شمشاد اور الماس توبے ہوش ہو گئیں۔ جب جنازہ اٹھاؤ ان دونوں نے ایسے بین کیے کہ سننے والے لہو کے آنسو روئے رہے۔

بھائی جان، میں نے کہیں پڑھا تھا کہ فرانس کے انقلاب میں پہلی گولی وہاں کی ایک گھمیانی کے لگی تھی۔ مرحوم محمد طفیل ایک طوائف کا لڑکا تھا۔ انقلاب کی اس جدوجہد میں اس کے جو پہلی گولی لگی تھی دسویں تھی یا پچاسویں، اس کے متعلق کسی نے بھی تحقیق نہیں کی۔ شاید اس لیے کہ سوسائٹی میں اس غریب کا کوئی رتبہ نہیں تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں پنجاب کے اس خونیں غسل میں نہانے والوں کی فہرست میں تھیلے سکنجر کا نام و نشان تک بھی نہیں ہو گا۔۔۔ اور یہ بھی کوئی پتہ نہیں کہ ایسی کوئی فہرست تیار بھی ہوئی تھی۔

سخت ہنگامی دن تھے۔ فوجی حکومت کا دور دورہ تھا۔ وہ دیو جسے مار شل لاء کہتے ہیں۔ شہر کے گلی گلی کوچے کوچے میں ڈکارتا پھرتا تھا۔ بہت افراتفری کے عالم میں اس غریب کو جلدی جلدی یوں دفن کیا گیا جیسے اس کی موت اس کے سو گوار عزیزوں کا ایک سنگین جرم تھی جس کے نشانات وہ مٹا دینا چاہتے تھے۔

بس بھائی جان تھیلا مر گیا۔ تھیلا د فنا دیا گیا اور۔۔۔ اور۔۔۔ یہ کہہ کر میرا ہم سفر پہلی مرتبہ کچھ کہتے کہتے رکا اور خاموش ہو گیا۔ ٹرین دندناتی ہوئی جا رہی تھی۔ پڑیوں کی کھٹاکھٹ نے یہ کہنا شروع کر دیا، ”تھیلا مر گیا۔۔۔ تھیلا د فنا دیا گیا۔۔۔ تھیلا مر گیا۔۔۔ تھیلا د فنا دیا گیا۔۔۔“ اس مر نے اور دفنانے کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں تھا، جیسے وہ اُدھر مر اور ادھر د فنا دیا گیا۔ اور کھٹ کھٹ کے ساتھ ان الفاظ کی ہم آہنگی کچھ اس قدر جذبات سے عاری تھی کہ مجھے اپنے دماغ سے ان دونوں کو جدا کرنا پڑا۔ چنانچہ میں نے اپنے ہم سفر سے کہا، ”آپ کچھ اور بھی سنانے والے تھے؟“

چونکہ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”جی ہاں۔۔۔ اس داستان کا ایک افسوسناک حصہ باقی ہے۔۔۔“

میں نے پوچھا، ”کیا؟“

اس نے کہنا شروع کیا، ”میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ تھیلے کی دو ہنپیں تھیں۔ شمشاد اور الماس۔ بہت خوبصورت تھیں۔ شمشاد بھی تھی۔ پتلے پتلے نقش، غلافی آنکھیں، ٹھمری بہت خوب گاتی تھی۔ سنا ہے خاں صاحب فتح علی خاں سے تعلیم لیتی رہی تھی۔ دوسرا الماس تھی۔ اس کے گلے میں سُر نہیں تھا، لیکن بتاوے میں اپنا شانی نہیں رکھتی تھی۔ مجر اکرتی تھی تو ایسا لگتا تھا کہ اس کا انگ انگ بول رہا ہے۔ ہر بجاوے میں ایک گھات ہوتی تھی۔۔۔ آنکھوں میں وہ جادو تھا جو ہر ایک کے سر پر چڑھ کے بولتا تھا۔“

میرے ہم سفر نے تعریف و توصیف میں کچھ ضرورت سے زیادہ وقت لیا۔ مگر میں نے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ خود اس لمبے چکر سے نکلا اور داستان کے افسوسناک حصے کی طرف آیا، ”قصہ یہ ہے بھائی جان کہ ان آفت کی پرکالہ دو بہنوں کے حسن و جمال کا ذکر کسی خوشامدی نے فوجی افسروں سے کر دیا۔۔۔ بلوے میں ایک میم۔۔۔ کیانام تھا اس چڑیل کا۔۔۔؟ مس۔۔۔ مس شر و ڈماری گئی تھی۔۔۔ طے یہ ہوا کہ ان کو بلوایا جائے اور۔۔۔ اور۔۔۔ جی بھر کے انتقام لیا جائے۔۔۔ آپ سمجھ گئے ناجھائی جان؟“

میں نے کہا، ”جی ہاں!“

میرے ہم سفر نے ایک آہ بھری، ”ایسے نازک معاملوں میں طوائفیں اور کسی بھی اپنی ماں میں بہنیں ہوتی ہیں۔۔۔ مگر بھائی جان یہ ملک اپنی عزت و ناموس کو میرا خیال ہے پہچانتا ہی نہیں۔ جب اوپر سے علاقے کے تھانیدار کو آرڈر ملانا تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔ چنانچہ وہ خود شمشاد اور الماس کے مکان پر گیا اور کہا کہ صاحب لوگوں نے یاد کیا ہے۔ وہ تمہارا مجر اسننا چاہتے ہیں۔۔۔ بھائی کی قبر کی مٹی بھی ابھی تک خشک نہیں

ہوئی تھی۔ اللہ کو پیارا ہوئے اس غریب کو صرف دودن ہوئے تھے کہ یہ حاضری کا حکم صادر ہوا کہ آئے ہمارے حضور ناچو۔۔۔ اذیت کا اس سے بڑھ کر پر اذیت طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔۔۔؟ مستعد تمثیر کی ایسی مثال میرا خیال ہے شاید ہی کوئی اور مل سکے۔۔۔ کیا حکم دینے والوں کو اتنا خیال بھی نہ آیا کہ طوائف بھی غیرت مند ہوتی ہے۔۔۔؟ ہو سکتی ہے۔۔۔ کیوں نہیں ہو سکتی؟“ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا، لیکن مخاطب وہ مجھ سے تھا۔

میں نے کہا، ”ہو سکتی ہے!“

”جی ہاں۔۔۔“ تھیلا آخر ان کا بھائی تھا۔ اس نے کسی قمار خانے کی لڑائی بھڑائی میں اپنی جان نہیں دی تھی۔ وہ شراب پی کر دگافساد کرتے ہوئے ہلاک نہیں ہوا تھا۔ اس نے وطن کی راہ میں بڑے بہادرانہ طریقے پر شہادت کا جام پیا تھا۔ وہ ایک طوائف کے بطن سے تھا۔ لیکن وہ طوائف مال تھی اور شمشاد اور الماس اسی کی بیٹیاں تھیں اور یہ تھیلے کی بہنیں تھیں۔۔۔ طوائفیں بعد میں تھیں۔۔۔ اور وہ تھیلے کی لاش دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ جب اس کا جنازہ اٹھا تھا تو انہوں نے ایسے میں کیے تھے کہ سن کر آدمی لہور و تا تھا۔۔۔“

میں نے پوچھا ”وہ گئیں؟“

میرے ہم سفر نے اس کا جواب تھوڑے وقفے کے بعد افسر دگی سے دیا، ”جی ہاں۔۔۔ جی ہاں گئیں۔۔۔ خوب سچ بن کر۔“ ایک دم اس کی افسر دگی تیکھا پن اختیار کر گئی، ”سو لے سنگار کر کے اپنے بلاں والوں کے پاس گئیں۔۔۔ کہتے ہیں کہ خوب محفل جمی۔۔۔ دونوں بہنوں نے اپنے جو ہر دکھائے۔۔۔ زرق برق پشازوں میں ملبوس وہ کوہ قاف کی پریاں معلوم ہوتی تھیں۔۔۔ شراب کے دور چلتے رہے اور وہ ناجتی گاتی رہیں۔۔۔ یہ دونوں دور چلتے رہے۔۔۔ اور کہتے ہیں کہ۔۔۔ رات کے دو بجے ایک بڑے افسر کے اشارے پر محفل برخاست ہوئی۔۔۔ یہ دونوں دور چلتے رہے۔۔۔ اور کہتے ہیں کہ۔۔۔“ میرا ہم سفر کچھ دیر خاموش رہا پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور باہر بھاگتے ہوئے درختوں کو دیکھنے لگا۔

پہلوں اور پڑیوں کی آہنی گڑ گڑاہٹ کی تال پر اس کے آخری دولفاظ ناچنے لگے، ”برخاست ہوئی۔۔۔ برخاست ہوئی۔“ میں نے اپنے دماغ میں انھیں، آہنی گڑ گڑاہٹ سے نوچ کر علیحدہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا، ”پھر کیا ہوا؟“

بھاگتے ہوئے درختوں اور کھمبوں سے نظریں ہٹا کر اس نے بڑے مضبوط لبھے میں کہا، ”انہوں نے اپنی زرق برق پشازوں نوچ ڈالیں اور الف ننگی ہو گئیں اور کہنے لگیں۔۔۔ لو دیکھ لو۔۔۔ ہم تھیلے کی بہنیں ہیں۔۔۔ اس شہید کی جس کے خوبصورت جسم کو تم نے صرف اس لیے

اپنی گولیوں سے چھلنی چھلنی کیا تھا کہ اس میں وطن سے محبت کرنے والی روح تھی۔ ہم اسی کی خوبصورت بہنیں ہیں۔۔۔ آکہ، اپنی شہوت کے گرم گرم لوہے سے ہمارا خوشبوؤں میں بسا ہوا جسم داغدار کرو۔ مگر ایسا کرنے سے پہلے صرف ہمیں ایک بار اپنے منہ پر تھوک لینے

دو۔۔۔“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ اس طرح کہ اور نہیں بولے گا۔ میں نے فوراً ہی پوچھا، ”پھر کیا ہوا؟“

اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، ”ان کو۔۔۔ ان کو گولی سے اڑا دیا گیا۔“

میں نے کچھ نہ کہا۔ گاڑی آہستہ ہو کر اسٹیشن پر رکی تو اس نے قلی بلا کر اپنا اسباب اٹھوا�ا۔ جب جانے لگا تو میں نے اس سے کہا، ”آپ نے جو داستان سنائی، اس کا انجام مجھے آپ کا خود ساختہ معلوم ہوتا ہے۔“

ایک دم چونک کراس نے میری طرف دیکھا، ”یہ آپ نے کیسے جانا؟“

میں نے کہا، ”آپ کے لجے میں ایک ناقابل بیان کرب تھا۔“

میرے ہم سفر نے اپنے حلق کی تلخی تھوک کے ساتھ نگتے ہوئے کہا، ”جی ہاں۔۔۔ ان حرام۔۔۔“ وہ گالی دیتے دیتے رک گیا۔ انہوں نے اپنے شہید بھائی کے نام پر بٹاگا دیا۔ ”یہ کہہ کر وہ پلیٹ فارم پر اتر گیا۔

-[7]-

آنکھیں: سعادت حسن منتو

اس کے سارے جسم میں مجھے اس کی آنکھیں بہت پسند تھیں۔ یہ آنکھیں بالکل ایسی ہی تھیں جیسے اندھیری رات میں موڑ کار کی ہیڈلا نیٹس، جن کو آدمی سب سے پہلے دیکھتا ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ وہ بہت خوبصورت آنکھیں تھیں۔ ہرگز نہیں۔ میں خوبصورتی اور بد صورتی میں

تمیز کر سکتا ہوں۔ لیکن معاف کیجیے گا، ان آنکھوں کے معاملے میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ خوبصورت نہیں تھیں۔ لیکن اس کے باوجود ان میں بے پناہ کشش تھی۔

میری اور ان آنکھوں کی ملاقات ایک ہسپتال میں ہوئی۔ میں اس ہسپتال کا نام آپ کو بتانا نہیں چاہتا، اس لیے کہ اس سے میرے اس افسانے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ گا۔ بس آپ یہی سمجھ لیجیے کہ ایک ہسپتال تھا، جس میں میرا ایک عزیز آپریشن کرانے کے بعد اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔ یوں تو میں تیار داری کا قاتل نہیں، مریضوں کے پاس جا کر ان کو دم دلا سد دینا بھی مجھے نہیں آتا لیکن اپنی بیوی کے پیغم اصرار پر مجھے جانا پڑتا کہ میں اپنے مرنے والے عزیز کو اپنے خلوص اور محبت کا ثبوت دے سکوں۔ یقین مانیے کہ مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ ہسپتال کے نام ہی سے مجھے نفرت ہے، معلوم نہیں کیوں۔ شاید اس لیے کہ ایک بار بسمی میں اپنی بوڑھی ہمسائی کو جس کی کلامی میں موقع آگئی تھی، مجھے بے بے ہے جانا پڑا تھا۔ وہاں کیونزوالی ڈیپارٹمنٹ میں مجھے کم از کم ڈھانی گھنٹے انتظار کرنا پڑا تھا۔ وہاں میں جس آدمی سے بھی ملا، لوہے کے مانند سرداور بے حس تھا۔

میں ان آنکھوں کا ذکر کر رہا تھا جو مجھے بے حد پسند تھیں۔ پسند کا معاملہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ بہت ممکن ہے اگر آپ یہ آنکھیں دیکھتے تو آپ کے دل و دماغ میں کوئی رد عمل پیدا نہ ہوتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ سے اگر ان کے بارے میں کوئی رائے طلب کی جاتی تو آپ کہہ دیتے، ”نهایت وابحیات آنکھیں ہیں۔“ لیکن جب میں نے اس لڑکی کو دیکھا تو سب سے پہلے مجھے اس کی آنکھوں نے اپنی طرف متوجہ کیا۔

وہ بر قع پہنے ہوئے تھی، مگر نقاب اٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دو اکی بوتل تھی اور وہ جزل وارڈ کے برآمدے میں ایک چھوٹے سے لڑکے کے ساتھ چلی آرہی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں جو بڑی تھیں، نہ چھوٹی، سیاہ تھیں نہ بھوری، نیلی تھیں نہ سبز، ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوئی۔ میرے قدم رک گئے۔ وہ بھی ٹھہر گئی۔ اس نے اپنے سا تھی لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا، ”تم سے چلانہیں جاتا!“ لڑکے نے اپنی کلامی چھڑرائی اور تمیزی سے کہا، ”چل تو رہا ہوں، تو تو اندر ہی ہے!“

میں نے یہ ساتا تو اس لڑکی کی آنکھوں کی طرف دوبارہ دیکھا۔ اس کے سارے وجود میں صرف اس کی آنکھیں ہی تھیں جو پسند آئی تھیں۔

میں آگے بڑھا اور اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے مجھے پلکیں نہ جھپکنے والی آنکھوں سے دیکھا اور پوچھا، ”ایکسرے کہاں لیا جاتا ہے؟“ اتفاق کی بات ہے کہ ان دونوں ایکسرے ڈیپارٹمنٹ میں میرا ایک دوست کام کر رہا تھا، اور میں اسی سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ میں نے اس لڑکی سے کہا، ”آؤ، میں تمہیں وہاں لے چلتا ہوں، میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں۔“

لڑکی نے اپنے ساتھی لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور میرے ساتھ چل پڑی۔ میں نے ڈاکٹر صادق کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایکسرے لینے میں مصروف ہیں۔

دروازہ بند تھا اور باہر مرا یضوں کی بھیڑ لگی تھی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے تیز و تندر آواز آئی، ”کون ہے۔۔۔ دروازہ موت ٹھوکو!“ لیکن میں نے پھر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور ڈاکٹر صادق مجھے گالی دیتے رہ گئے، ”اوہ تم ہو!“

”ہاں بھئی۔۔۔ میں تم سے ملنے آیا تھا۔ دفتر میں گیا تو معلوم ہوا کہ تم یہاں ہو۔“

”آجاؤ اندر۔“ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا اور اس سے کہا، ”آؤ۔۔۔ لیکن لڑکے کو باہر ہی رہنے دو!“ ڈاکٹر صادق نے ہولے سے مجھ سے پوچھا، ”کون ہے یہ؟“ میں نے جواب دیا، ”معلوم نہیں کون ہے۔۔۔ ایکسرے ڈیپارٹمنٹ کا پوچھ رہی تھی۔ میں نے کہا چلو، میں لیے چلتا ہوں۔“ ڈاکٹر صادق نے دروازہ اور زیادہ کھول دیا۔ میں اور وہ لڑکی اندر داخل ہو گئے۔

چار پانچ مریض تھے۔ ڈاکٹر صادق نے جلدی جلدی ان کی سکریننگ کی اور انھیں رخصت کیا۔ اس کے بعد کمرے میں ہم صرف دورہ گئے۔ میں اور وہ لڑکی۔ ڈاکٹر صادق نے مجھ سے پوچھا، ”انھیں کیا بیماری ہے؟“ میں نے اس لڑکی سے پوچھا، ”کیا بیماری ہے تمہیں۔۔۔ ایکسرے کے لیے تم سے کس ڈاکٹرنے کہا تھا؟“ انہیرے کمرے میں لڑکی نے میری طرف دیکھا اور جواب دیا، ”مجھے معلوم نہیں کیا بیماری ہے۔۔۔ ہمارے محلے میں ایک ڈاکٹر ہے، اس نے کہا تھا کہ ایکسرے لو۔“ ڈاکٹر صادق نے اس سے کہا کہ مشین کی طرف آئے۔ وہ آگے بڑھی تو بڑے زور کے ساتھ اس سے ٹکرائی۔ ڈاکٹر نے تیز لمحے میں اس سے کہا، ”کیا تمہیں بھائی نہیں دیتا۔“ لڑکی خاموش رہی۔ ڈاکٹرنے اس کا بر قع اتارا اور اسکرین کے پیچھے کھڑا کر دیا۔ پھر اس نے سوچ اون کیا۔ میں نے شیشے میں دیکھا تو مجھے اس کی پسلیاں نظر آئیں۔ اس کا دل بھی ایک کونے میں کالے سے دھبے کی صورت میں دھڑک رہا تھا۔

ڈاکٹر صادق پانچ چھ منٹ تک اس کی پسلیوں اور ہڈیوں کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے سوچ اوف کر دیا اور روشنی کر کے مجھ سے مخاطب ہوا، ”چھاتی بالکل صاف ہے۔“ لڑکی نے معلوم نہیں کیا سمجھا کہ اپنی چھاتیوں پر جو کافی بڑی بڑی تھیں، دو پہنچے کو درست کیا اور بر قع ڈھونڈنے لگی۔ بر قع ایک کونے میں میز پر پڑا تھا۔ میں نے بڑھ کر اسے اٹھایا اور اسکے حوالے کر دیا۔ ڈاکٹر صادق نے رپورٹ لکھی اور اس سے پوچھا، ”تمہارا نام کیا ہے؟“ لڑکی نے بر قع اوڑھتے ہوئے جواب دیا، ”جی میرا نام۔۔۔ میرا نام غنیفہ ہے۔“

”خنیفہ!“ ڈاکٹر صادق نے اس کا نام پرچی پر لکھا اور اس کو دے دی۔ ”جاؤ، یہ اپنے ڈاکٹر کو دکھادینا۔“ لڑکی نے پرچی لی اور قمیص کے اندر اپنی انگلیاں اڑس لی۔ جب وہ باہر نکلی تو میں غیر ارادی طور پر اس کے پیچے پیچے تھا۔ لیکن مجھے اس کا پوری طرح احساس تھا کہ ڈاکٹر صادق نے مجھے شک کی نظر وہ سے دیکھا تھا۔ اسے جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس بات کا یقین تھا کہ اس لڑکی سے میرا تعلق ہے، حالانکہ جیسا آپ جانتے ہیں، ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔۔۔ سوائے اس کے کہ مجھے اس کی آنکھیں پسند آگئی تھیں۔

میں اس کے پیچے پیچے تھا۔ اس نے اپنے ساتھی لڑکے کی انگلی پکڑی ہوئی تھی۔ جب وہ تاگوں کے اڈے پر پہنچے تو میں نے خنیفہ سے پوچھا، ”تمہیں کہاں جانا ہے؟“ اس نے ایک گلی کا نام لیا تو میں نے اس سے جھوٹ موت کہا، ”مجھے بھی ادھر ہی جانا ہے۔۔۔ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں گا۔“ میں نے جب اس کا ہاتھ پکڑ کر تالے میں بٹھایا تو مجھے محسوس ہوا کہ میری آنکھیں ایکس ریز کاشیشہ بن گئی ہیں۔ مجھے اس کا گوشت پوست دکھائی نہیں دیتا تھا۔۔۔ صرف ڈھانچہ نظر آتا تھا۔۔۔ لیکن اس کی آنکھیں۔۔۔ وہ بالکل ثابت و سالم تھیں، جن میں بے پناہ کشش تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ یہ ٹھوں لیکن یہ سوچ کر کہ کوئی دیکھ لے گا، میں نے اس کے ساتھی لڑکے کو اس کے ساتھ بٹھا دیا اور آپ اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔

”میں۔۔۔ میں سعادت حسن منٹو ہوں۔“

”من ٹو۔۔۔ یہ من ٹو کیا ہوا؟“

”کشمیریوں کی ایک ذات ہے۔“

”ہم بھی کشمیری ہیں۔“

”اچھا!“

”ہم کنگ وائیس ہیں۔“

میں نے مژکراس سے کہا، ”یہ تو بہت اونچی ذات ہے۔“

وہ مسکرائی اور اس کی آنکھیں اور زیادہ پر کشش ہو گئیں۔

میں نے اپنی زندگی میں بے شمار خوبصورت آنکھیں دیکھی تھیں۔ لیکن وہ آنکھیں جو حنفیہ کے چہرے پر تھیں، بے حد پر کشش تھیں۔ معلوم نہیں ان میں کیا چیز تھی جو کشش کا باعث تھی۔ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں کہ وہ قطعاً خوبصورت نہیں تھیں، لیکن اس کے باوجود دیرے دل میں کھبڑی تھیں۔ میں نے جسارت سے کام لیا اور اس کے بالوں کی ایک لٹ کو جو اس کے ماتھے پر لٹک کر اس کی ایک آنکھ کو ڈھانپ رہی تھی، انگلی سے اٹھایا اور اسکے سر پر چسپاں کر دی۔ اس نے برانہ مانا۔ میں نے اور جسارت کی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس پر بھی اس نے کوئی مزاحمت نہ کی اور اپنے ساتھی لڑکے سے مخاطب ہوئی، ”تم میرا ہاتھ کیوں دبارے ہو؟“ میں نے فوراً اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور لڑکے سے پوچھا، ”تمہارا مکان کہاں ہے؟“ لڑکے نے ہاتھ کا اشارہ کیا، ”اس بازار میں!“

تالنگے نے ادھر کا رج کیا، بازار میں بہت بھیڑ تھی، ٹریفک بھی معمول سے زیادہ۔ تالنگہ رک رک کر چل رہا تھا۔ سڑک میں چونکہ گڑھے تھے، اس لیے زور کے دھپکے لگ رہے تھے، بار بار اس کا سر میرے کندھوں سے ٹکرایا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ اسے اپنے زانو پر رکھ لوں اور اس کی آنکھیں دیکھتا رہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کا گھر آگیا۔ لڑکے نے تالنگے والے سے رکنے کے لیے کہا۔ جب تالنگہ رکا تو وہ نیچے اتر۔ حنفیہ بیٹھی رہی۔ میں نے اس سے کہا، ”تمہارا گھر آگیا ہے؟“ حنفیہ نے مژکر میری طرف عجیب و غریب آنکھوں سے دیکھا، ”بدرو،“ کہا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا، ”کون بدرو؟“

”وہ لڑکا جو میرے ساتھ تھا۔“ میں نے لڑکے کی طرف دیکھا جو تالنگے کے پاس ہی تھا، ”یہ کھڑا تو ہے!“

”اچھا۔۔۔“ یہ کہہ کر اس نے بدرو سے کہا، ”بدرو! مجھے اتار تو دو۔“ بدرو نے اس کا ہاتھ کپڑا اور بڑی مشکل سے نیچے اتارا۔ میں سخت متحیر تھا۔ پچھلی نشست پر جاتے ہوئے میں نے اس لڑکے سے پوچھا، ”کیا بات ہے، یہ خود نہیں اتر سکتیں؟“ بدرو نے جواب دیا، ”جب نہیں۔۔۔ ان کی آنکھیں خراب ہیں۔۔۔ دکھائی نہیں دیتا۔“

جمیلہ کو پہلی بار محمود نے باغ جناح میں دیکھا۔ وہ اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ چہل قدمی کر رہی تھی۔ سب نے کام لے بر قع پہنے تھے۔ مگر نقابیں الٹی ہوئی تھیں۔ محمود سوچنے لگا یہ کس قسم کا پردہ ہے کہ بر قع اور ہا ہوا ہے مگر چہرہ ننگا ہے۔۔۔ آخری اس پردے کا مطلب کیا۔۔۔؟ محمود جمیلہ کے حسن سے بہت متاثر ہوا۔

وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی جا رہی تھی۔ محمود اس کے پیچے چلنے لگا۔ اس کو اس بات کا قطعاً ہوش نہیں تھا کہ وہ ایک غیر اخلاقی حرکت کا مر تکب ہو رہا ہے۔ اس نے سینکڑوں مرتبہ جمیلہ کو گھور گھور کے دیکھا۔ اس کے علاوہ ایک دوبار اس کو اپنی آنکھوں سے اشارے بھی کیے۔ مگر جمیلہ نے اسے درخور اعتنانہ سمجھا اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ اس کی سہیلیاں بھی کافی خوبصورت تھیں مگر محمود نے اس میں ایک ایسی کشش پائی جو لوہے کے ساتھ مقناطیس کی ہوتی ہے۔۔۔ وہ اس کے ساتھ چھٹ کر رہ گیا۔

ایک جگہ اس نے جرأت سے کام لے کر جمیلہ سے کہا، ”حضور اپنا نقاب تو سننجا لیے۔۔۔ ہوا میں اڑ رہا ہے۔“ جمیلہ نے یہ سن کر شور مچانا شروع کر دیا۔ اس پر پولیس کے دوسرا ہی جو اس وقت باغ میں ڈیوٹی پر تھے، دوڑتے آئے۔ اور جمیلہ سے پوچھا، ”بہن کیا بات ہے؟“ جمیلہ نے محمود کی طرف دیکھا جو سہا کھڑا تھا اور کہا، ”یہ لڑکا مجھ سے چھیڑ خانی کر رہا تھا۔ جب سے میں اس باغ میں داخل ہوئی ہوں، یہ میرا پیچھا کر رہا ہے۔

سپاہیوں نے محمود کا سر سری جائزہ لیا اور اس کو گرفتار کر کے حوالات میں داخل کر دیا۔۔۔ لیکن اس کی ضمانت ہو گئی۔

اب مقدمہ شروع ہوا۔۔۔ اس کی روکناد میں جانے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ یہ تفصیل طلب ہے۔ قصہ منحصر یہ ہے کہ محمود کا جرم ثابت ہو گیا اور اسے دو ماہ قید بامشققت کی سزا مل گئی۔ اس کے والدین نادار تھے۔ اس لیے وہ سیشن کی عدالت میں اپیل نہ کر سکے۔ محمود سخت پریشان تھا کہ آخر اس کا قصور کیا ہے۔ اس کو اگر ایک لڑکی پسند آگئی تھی اور اس نے اس سے چند باتیں کرنا چاہیں تو یہ کیا جرم ہے، جس کی پاداش میں وہ دو ماہ قید بامشققت بھگت رہا ہے۔ جیل خانے میں وہ کئی مرتبہ بچوں کی طرح رویا۔ اس کو مصوری کا شوق تھا، لیکن اس سے وہاں چکلی پسوائی جاتی تھی۔

ابھی اسے جیل خانے میں آئے بیس روز ہی ہوئے تھے کہ اسے بتایا گیا کہ اس کی ملاقات آئی ہے۔ محمود نے سوچا کہ یہ ملاقاتی کون ہے؟ اس کے والد تو اس سے سخت ناراض تھے۔ والدہ اپاٹج تھیں اور کوئی رشتے دار بھی نہیں تھے۔ سپاہی اسے دروازے کے پاس لے گیا جو آہنی سلانخوں کا بننا ہوا تھا۔ ان سلانخوں کے پیچھے اس نے دیکھا کہ جمیلہ کھڑی ہے۔۔۔ وہ بہت حیرت زدہ ہوا۔۔۔ اس نے سمجھا کہ شاید کسی اور کو دیکھنے آئی ہو گی۔ مگر جمیلہ نے سلانخوں کے پاس آ کر اس سے کہا، ”میں آپ سے ملنے آئی ہوں۔“

مودود کی حیرت میں اور بھی اضافہ ہو گیا، ”مجھ سے۔۔۔؟“

”جی ہاں۔۔۔ میں معافی مانگنے آئی ہوں کہ میں نے جلد بازی کی۔ جس کی وجہ سے آپ کو یہاں آنا پڑا۔“ محمود مسکرا یا، ”ہائے اس زُورِ پشیاں کا پشیاں ہونا۔“

جمیلہ نے کہا، ”یہ غالب ہے؟“

”جی ہاں! غالب کے سوا اور کون ہو سکتا ہے جو انسان کے جذبات کی ترجیح کر سکے۔۔۔ میں نے آپ کو معاف کر دیا۔۔۔ لیکن میں یہاں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ یہ میرا گھر نہیں ہے سرکار کا ہے۔۔۔ اس کے لیے میں معافی کا خواستگار ہوں۔“ جمیلہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، ”میں آپ کی خادمہ ہوں۔“ چند منٹ ان کے درمیان اور باتیں ہوئیں، جو محبت کے عہد و پیمان تھیں۔۔۔ جمیلہ نے اس کو صابن کی ایک ٹکنیہ دی۔ مٹھائی بھی پیش کی اس کے بعد وہ ہر پندرہ دن کے بعد محمود سے ملاقات کرنے کے لیے آتی رہی۔ اس دوران میں ان دونوں کی محبت استوار ہو گئی۔

جمیلہ نے محمود کو ایک روز بتایا، ”مجھے مو سیقی سکھنے کا شوق ہے۔۔۔ آج کل میں خاں صاحب سلام علی خاں سے سبق لے رہی ہوں۔“ محمود نے اس سے کہا، ”مجھے مصوری کا شوق ہے۔۔۔ مجھے یہاں جیل خانے میں اور کوئی تکلیف نہیں۔۔۔ مشقت سے میں گھبرا تا نہیں۔ لیکن میری طبیعت جس فن کی طرف مائل ہے اس کی تسلیم نہیں ہوتی۔ یہاں کوئی رنگ ہے نہ رونگ ہے۔ کوئی کاغذ ہے نہ پنسل۔۔۔ بس چچی پیتے رہو۔“ جمیلہ کی آنکھیں پھر آنسو بہانے لگیں، ”بس اب تھوڑے ہی دن باقی رہ گئے ہیں۔ آپ باہر آئیں۔ تو سب کچھ ہو جائے گا۔“

مودود و ماہ کی قید کا ٹنے کے بعد باہر آیا تو جمیلہ دروازے پر موجود تھی۔۔۔ اس کا لے بر قلعے میں جواب بھو سلا ہو گیا تھا اور جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔

دونوں آرٹسٹ تھے۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ شادی کر لیں۔۔۔ چنانچہ شادی ہو گئی۔ جمیلہ کے ماں باپ کچھ اتنا شے چھوڑ گئے تھے اس سے انہوں نے ایک چھوٹا سامان کا نبنا یا اور پر مسرت زندگی بسرا کرنے لگے۔

محمود ایک آرٹ اسٹوڈیو میں جانے لگاتا کہ اپنی مصوری کا شوق پورا کرے۔۔۔ جمیلہ خاں صاحب سلام علی خاں سے پھر تعلیم حاصل کرنے لگی۔

ایک برس تک وہ دونوں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ محمود مصوری سیکھتا رہا اور جمیلہ مو سیقی۔ اس کے بعد سارا اتنا شے ختم ہو گیا اور نوبت فاقوں پر آگئی۔ لیکن دونوں آرٹ شیدائی تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ فاقے کرنے والے ہی صحیح طور پر اپنے آرٹ کی معراج تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنی اس مفلسی کے زمانے میں بھی خوش تھے۔

ایک دن جمیلہ نے اپنے شوہر کو یہ مژدہ سنایا کہ اسے ایک امیر گھرانے میں مو سیقی سکھانے کی ٹیوشن مل رہی ہے۔ محمود نے یہ سن کر اس سے کہا، ”میں ٹیوشن ویوشن بکواس ہے۔۔۔ ہم لوگ آرٹسٹ ہیں۔“ اس کی بیوی نے بڑے پیار کے ساتھ کہا، ”لیکن میری جان گزارہ کیسے ہو گا؟“ محمود نے اپنے پھوسٹے نکلے ہوئے کوٹ کا کالر بڑے امیر انداز میں درست کرتے ہوئے جواب دیا، ”آرٹسٹ کو ان فضول باتوں کا خیال نہیں رکھنا چاہیے۔ ہم آرٹ کے لیے زندہ رہتے ہیں۔۔۔ آرٹ ہمارے لیے زندہ نہیں رہتا۔“ جمیلہ یہ سن کر خوش ہوئی، ”لیکن میری جان آپ مصوری سیکھ رہے ہیں۔۔۔ آپ کو ہر مہینے فیس ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس کا بندوبست بھی تو کچھ ہونا چاہیے۔۔۔ پھر کھانا پینا ہے۔ اس کا خرچ علیحدہ ہے۔“

”میں نے فی الحال مصوری کی تعلیم لینا چھوڑ دی ہے۔۔۔ جب حالات موافق ہوں گے تو دیکھا جائے گا۔“

دوسرے دن جمیلہ گھر آئی تو اس کے پرس میں پندرہ روپے تھے جو اس نے اپنے خاوند کے حوالے کر دیئے اور کہا، ”میں نے آج سے ٹیوشن شروع کر دی ہے، یہ پندرہ روپے مجھے پیشگی ملے ہیں۔۔۔ آپ مصوری کافی سیکھنے کا کام جاری رکھیں۔“ محمود کے مردانہ جذبات کو بڑی ٹھیکیں لگی، ”میں نہیں چاہتا کہ تم ملازمت کرو۔۔۔ ملازمت مجھے کرنا چاہیے۔“ جمیلہ نے خاص انداز میں کہا، ”ہائے۔۔۔ میں آپ کی غیر ہوں۔ میں نے اگر کہیں تھوڑی دیر کے لیے ملازمت کر لی ہے تو اس میں حرجن ہی کیا ہے۔۔۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔ جس لڑکی کو میں مو سیقی کی تعلیم دیتی ہوں، بہت پیاری اور ذہین ہے۔“ یہ سن کر محمود خاموش ہو گیا۔ اس نے مزید گفتگو نہ کی۔

دوسرے ہفتے کے بعد وہ پچیس روپے لے کر آیا اور اپنی بیوی سے کہا، ”میں نے آج اپنی ایک تصویر بیچی ہے خریدار نے اسے بہت پسند کیا۔ لیکن خسیں تھا۔ صرف پچیس روپے دیئے۔ اب امید ہے کہ میری تصویروں کے لیے مارکیٹ پل نکلے گی۔ جیلہ مسکراتی، ”تو پھر کافی امیر آدمی ہو جائیں گے۔“ محمود نے اس سے کہا، ”جب میری تصویریں بننا شروع ہو جائیں گی تو میں تمھیں ٹیوشن نہیں کرنے دوں گا۔“ جیلہ نے اپنے خاوند کی ٹائی کی گرہ درست کی اور بڑے پیار سے کہا، ”آپ میرے مالک ہیں جو بھی حکم دیں گے مجھے تسلیم ہو گا۔

دونوں بہت خوش تھے اس لیے کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ محمود نے جیلہ سے کہا، ”اب تم کچھ فکرنا کرو۔ میرا کام چل نکلا ہے۔۔۔ چار تصویریں کل پر سوں تک بک جائیں گی اور ابھی دام وصول ہو جائیں گے۔ پھر تم اپنی موسیقی کی تعلیم جاری رکھ سکو گی۔“ ایک دن جیلہ جب شام کو گھر آئی تو اس کے سر کے بالوں میں ڈھنکی ہوئی روئی کا غبار اس طرح جما تھا جیسے کسی اوہیڑ عمر آدمی کی داڑھی میں سفید بال۔

محمود نے اس سے استفسار کیا، ”یہ تم نے اپنے بالوں کی کیا حالات بنارکھی ہے۔۔۔ موسیقی سکھانے جاتی ہو یا کسی جنگ فیکٹری میں کام کرتی ہو۔“

جیلہ نے، جو محمود کی نئی رضائی کی پرانی روئی کو ڈھنک رہی تھی مسکرا کر کہا، ”ہم آرٹسٹ لوگ ہیں۔ ہمیں کسی بات کا ہوش بھی نہیں رہتا۔“

محمود نے حقتے کی نے منہ میں لے کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور کہا، ”ہوش واقعی نہیں رہتا۔۔۔“ جیلہ نے محمود کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی، ”یہ ڈھنکی ہوئی روئی کا غبار آپ کے سر میں کیسے آگیا۔۔۔؟“ محمود نے حقتے کا ایک کش لگایا، ”جیسا کہ تمہارے سر میں موجود ہے۔۔۔ ہم دونوں ایک ہی جنگ فیکٹری میں کام کرتے ہیں صرف آرٹ کی خاطر۔“

مہاراجہ گ سے ریس کورس پر اشوک کی ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد دونوں بے تکلف دوست بن گئے۔ مہاراجہ گ کو ریس کے گھوڑے پالنے کا شوق ہی نہیں خبط تھا۔ اس کے اصطبل میں اچھی سے اچھی نسل کا گھوڑا موجود تھا۔ اور محل میں جس کے گنبد ریس کورس سے صاف دکھائی دیتے تھے، طرح طرح کے عجائب موجود تھے۔

اشوک جب پہلی بار محل میں گیاتو مہاراجہ گ نے کئی گھنٹے صرف کر کے اسکواپنے تمام نوادرد کھائے۔ یہ چیزیں جمع کرنے میں مہاراجہ کو ساری دنیا کا دورہ کرنا پڑا تھا۔ ہر ملک کا کونہ کونہ چھاننا پڑا تھا۔ اشوک بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ اس نے نوجوان مہاراجہ گ کے ذوقِ انتخاب کی خوب داد دی۔

ایک دن اشوک گھوڑوں کے ٹپ لینے کے لیے مہاراجہ کے پاس گیاتو وہ ڈارک روم میں فلم دیکھ رہا تھا۔ اس نے اشوک کو وہیں بلوالیا۔ سکیشن ملی میٹر فلم تھے جہا مہاراجہ نے خود اپنے کیسرے سے لیے تھے۔ جب پرو جیکٹر چلا تو پچھلی ریس پوری کی پوری پردے سے دوڑ گئی۔ مہاراجہ کا گھوڑا اس ریس میں ون آیا تھا۔

اس فلم کے بعد مہاراجہ نے اشوک کی فرماش پر اور کئی فلم دکھائے۔ سوئزر لینڈ، پیرس، نیویارک، ہونولولو، ہوائی، وادیِ کشمیر۔۔۔ اشوک بہت مخطوط ہوا۔ یہ فلم قدرتی رنگوں میں تھے۔ اشوک کے پاس بھی سکیشن ملی میٹر کیسرہ اور پرو جیکٹر تھا۔ مگر اس کے پاس فلموں کا اتنا ذخیرہ نہیں تھا۔ دراصل اس کو اتنی فرستہ ہی نہیں ملتی تھی کہ اپنا یہ شوق جی بھر کے پورا کر سکے۔ مہاراجہ جب کچھ فلم دکھاچکا تو اس نے کیسرے میں روشنی کی اور بڑی بے تکلفی سے اشوک کی ران پر دھپمار کر کہا، ”اور سناؤ دوست۔“

اشوک نے سکریٹ سلاگا، ”مز آگیا فلم دیکھ کر۔“

”اور دکھاؤ؟“

”نہیں نہیں“

”نہیں بھائی ایک ضرور دیکھو۔۔۔ مزا آجائے گا تمہیں۔“ یہ کہہ کر مہاراجہ گ نے ایک صندوق قہ کھول کر ایک ریل نکالی اور پرو جیکٹر پر چڑھا دی، ”ذرائع میان سے دیکھنا۔“ اشوک نے پوچھا ”کیا مطلب؟“ مہاراجہ نے کمرے کی لائٹ اوف کر دی، ”مطلب یہ کہ ہر چیز غور

سے دیکھنا۔” یہ کہہ کر اس نے پروجیکٹر کا سوچ دبادیا۔ پردے پر چند لمحات صرف سفید روشنی تھر تھر آتی رہی، پھر ایک دم تصویریں شروع ہو گئیں۔ ایک الف ننگی عورت صوفے پر لیٹی تھی۔ دوسرا سنگار میز کے پاس کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی۔ اشوک کچھ دیر خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔۔۔ اس کے بعد ایک دم اس کے حلق سے عجیب و غریب آواز نکلی۔ مہاراجہ نے ہنس کر اس سے پوچھا، ”کیا ہوا؟“

اشوک کے حلق سے آواز پھنس کر باہر نکلی، ”بند کرو یار۔۔۔ بند کرو۔“

”کیا بند کرو؟“

اشوک اٹھنے لگا۔ مہاراجہ گنے اسے پکڑ کر بٹھا دیا، یہ فلم تمہیں پورے کا پورا دیکھنا پڑے گا۔“ فلم چلتا رہا۔ پردے پر برہنگی منہ کھولے ناچتی رہی۔ مرد اور عورت کا جنسی رشتہ مادرزاد عربیانی کے ساتھ تھر کتا رہا۔ اشوک نے سارا وقت بے چینی میں کاٹا۔ جب فلم بند ہوا اور پردے پر صرف سفید روشنی تھی تو اشوک کو ایسا محسوس ہوا کہ جو کچھ اس نے دیکھا تھا، پروجیکٹر کی بجائے اسکی آنکھیں پھینک رہی ہیں۔ مہاراجہ گنے کمرے کی لائٹ اون کی اور اشوک کی طرف دیکھا اور ایک زور کا قہقہہ لگایا، ”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ اشوک کچھ سکڑ سا گیا تھا۔ ایک دم روشنی کے باعث اسکی آنکھیں بھنخی ہوئی تھیں۔ ماتھے پر سینے کے موٹے موٹے قطرے تھے۔ مہاراجہ گنے زور سے اس کی ران پر دھپا پارا۔ اور اس قدر بے تحاشا ہنسا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اشوک صوفے پر سے اٹھا۔ رومال نکال کر اپنے ماتھے کا پسینہ پوچھا، ”کچھ نہیں یار۔“

”کچھ نہیں کیا۔۔۔ مرا نہیں آیا؟“ اشوک کا حلق سوکھا ہوا تھا۔ تھوک نگل کر اس نے کہا، ”ہاں سے لائے یہ فلم؟“ مہاراجہ نے صوفے پر لیٹتے ہوئے جواب دیا، ”پیرس سے۔۔۔ پے ری!۔۔۔ پے ری!“ اشوک نے سر کو جھٹکا سا دیا۔ ”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

”کیا؟“

”یہ لوگ۔۔۔ میرا مطلب ہے کیمرے کے سامنے یہ لوگ کیسے۔۔۔“

”یہی تو کمال ہے۔۔۔ ہے کہ نہیں؟“

”ہے تو سہی۔“ یہ کہہ کر اشوک نے رومال سے اپنی آنکھیں صاف کیں، ”ساری تصویریں جیسے میری آنکھوں میں پھنس گئی ہیں۔“ مہاراجہ گ اٹھا، ”میں نے ایک دفعہ چند لیڈیز کو یہ فلم دکھایا۔“

اشوک چلایا، ”لیڈیز کو؟“

”ہاں ہاں۔۔۔ بڑے مزے لے لے کر دیکھا انہوں نے۔“

”غلط“

مہاراجہ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا، ”سچ کہتا ہوں۔۔۔ ایک دفعہ دیکھ کر دوسرا دفعہ پھر دیکھا۔ بھیختی، چلاتی اور ہنستی رہیں۔“ اشوک نے اپنے سر کو جھکا سادیا، ”حد ہو گئی ہے۔۔۔ میں تو سمجھتا تھا وہ۔۔۔ بے ہوش ہو گئی ہوں گی۔“

”میرا بھی یہی خیال تھا، لیکن انہوں نے خوب اطف اٹھایا۔“

اشوک نے پوچھا، ”کیا یورپین تھیں؟“ مہاراجہ گ نے کہا، ”نہیں بھائی۔۔۔ اپنے دیس کی تھیں۔۔۔ مجھ سے کئی بار یہ فلم اور پرو جیکٹر مانگ کر لے گئیں۔۔۔ معلوم نہیں کتنی سہیلیوں کو دکھاچکی ہیں۔۔۔“

”میں نے کہا۔۔۔“ اشوک کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”کیا؟“

”ایک دو روز کے لیے یہ فلم دے سکتے ہو مجھے؟“

”ہاں ہاں لے جاؤ!“ یہ کہہ کر مہاراجہ نے اشوک کی پسلیوں میں ٹھونکا دیا، ”سالے کس کو دکھائے گا۔“

”دوستوں کو“

”دکھا جس کو بھی تیری مرضی!“ یہ کہہ کر مہاراجہ گنے پرو جیکٹر میں سے فلم کا اسپول نکالا۔ اس کو دوسرے اسپول پر چڑھا دیا اور ڈبہ اشوک کے حوالے کر دیا۔ ”لے پکڑ۔۔۔ عیش کر!“ اشوک نے ڈبہ ہاتھ میں لے لیا تو اس کے بدن میں جھر جھری سی دوڑگئی۔ گھوڑوں کے ٹپ لینا بھول گیا اور چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد چلا گیا۔ گھر سے پرو جیکٹر لے جا کر اس نے کئی دوستوں کو یہ فلم دکھایا۔ تقریباً سب کے لیے انسانیت کی یہ عربیانی بالکل نئی چیز تھی۔ اشوک نے ہر ایک کارڈ عمل نوٹ کیا۔ بعض نے خفیف سی گھبر اہٹ اور فلم کا ایک ایک انج غور سے دیکھا۔ بعض نے تھوڑا ساد کیچھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ بعض آنکھیں کھلی رکھنے کے باوجود فلم کو تمام و کمال طور پر نہ دیکھ سکے۔ ایک برداشت نہ کر سکا اور اٹھ کر چلا گیا۔

تین چار روز کے بعد اشوک کو فلم لوٹانے کا خیال آیا تو اس نے سوچا کیوں نہ اپنی بیوی کو دکھاؤں چنانچہ وہ پرو جیکٹر اپنے گھر لے گیا۔ رات ہوئی تو اس نے اپنی بیوی کو بلایا۔ دروازے بند کیے۔ پرو جیکٹر کا لکنشن وغیرہ ٹھیک کیا۔ فلم نکالا۔ اس کو فٹ کیا۔ کمرے کی بقیہ بجھائی اور فلم چلا دیا۔

پردے پر چند لمحات سفید روشنی تھر تھرائی۔ پھر تصویریں شروع ہوئیں۔ اشوک کی بیوی زور سے چھینی، تڑپی، اچھلی۔ اس کے منہ سے عجب و غریب آوازیں نکلیں۔ اشوک نے اسے کپڑ کر بٹھانا چاہا تو اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے اور چیننا شروع کر دیا، ”بند کرو۔۔۔ بند کرو۔“

اشوک نے ہنس کر کہا، ”ارے بھئی دیکھ لو۔۔۔ شرماتی کیوں ہو؟“

”نہیں نہیں“ یہ کہہ کر اس نے ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہا۔ اشوک نے اسکو زور سے کپڑ لیا، وہ ہاتھ جو اس کی آنکھوں پر تھا، ایک طرف کھینچا۔ اس کھینچاتا نی میں دفعتاً اشوک کی بیوی نے رونا شروع کر دیا۔ اشوک کے بریک سے لگ گئے۔ اس نے تو محض تفریح کی خاطر اپنی بیوی کو فلم دکھایا تھا۔ روتی اور بڑی بڑاتی اس کی بیوی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اشوک چند لمحات بالکل خالی الذہن بیٹھا نگی تصویریں دیکھتا رہا۔ جو حیوانی حرکات میں مشغول تھیں، پھر ایک دم اس نے معاملہ کی نزاکت کو محسوس کیا۔ اس احساس نے اسے خجالت کے سمندر میں غرق کر دیا۔۔۔ اس نے سوچا مجھ سے بہت ہی نازیبا حرکت سرزد ہوئی۔ لیکن جیرت ہے کہ مجھے اس کا خیال تک نہ آیا۔۔۔ دوستوں کو دکھایا تھا۔ ٹھیک تھا۔ گھر میں اور کسی کو نہیں، اپنی بیوی۔۔۔ اپنی بیوی کو۔۔۔ اس کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔

فلم چل رہا تھا۔ مادر زار برہنگی مختلف آسن اختیار کرتی دوڑ رہی تھی۔ اشوک نے اٹھ کر سوچ اوف کر دیا۔۔۔ پر دے پر سب کچھ بجھ گیا۔ مگر اس نے اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔ اس کا دل و دماغ شرمساری میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ احساس اس کو چھپ رہا تھا کہ اس سے ایک نہایت ہی ناز بیبا۔۔۔ نہایت ہی واہیات حرکت سرزد ہوئی۔ اس نے یہاں تک سوچا کہ وہ کیسے اپنی بیوی سے آنکھ ملا سکے گا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ ایک سکریٹ سلگا کر اس نے احساسِ ندامت کو مختلف خیالوں کے ذریعہ سے دور کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ تھوڑی دیر دماغ میں ادھر ادھر اتھر مارتا رہا۔ جب چاروں طرف سے سرزنش ہوئی تو زخمی ہو گیا اور ایک عجیب سی خواہش اسکے دل میں پیدا ہوئی کہ جس طرح کمرے میں اندھیرا ہے اسی طرح اسکے دماغ پر بھی اندھیرا چھا جائے۔

بار بار اسے یہ چیز ستارہ ہی تھی، ”ایسی واہیات حرکت اور مجھے خیال تک نہ آیا۔“ پھر وہ سوچتا ”بات اگر ساس تک پہنچ گئی۔۔۔ سالیوں کو پتہ چل گیا۔۔۔ میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے یہ لوگ کہ ایسے گرے ہوئے اخلاق کا آدمی نکلا۔۔۔ ایسی گندی ذہنیت کہ اپنی بیوی کو۔۔۔“

تنگ آ کر اشوک نے سکریٹ سلگا یا۔ وہ ننگی تصویریں جو وہ کئی بار دیکھ چکا تھا، اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگیں۔۔۔ ان کے عقب میں اسے اپنی بیوی کا چہرہ نظر آتا۔ حیران و پریشان، جس نے زندگی میں پہلی بار عفونت کا انتابڑا ڈھیر دیکھا ہو۔ سر جھٹک کر اشوک اٹھا اور کمرے میں ٹھہنے لگا۔ مگر اس سے بھی اس کا اضطراب دور نہ ہوا۔

تحوڑی دیر کے بعد وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر نکلا۔ ساتھ والے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ اس کی بیوی منہ سر لپیٹ کر لیئی ہوئی تھی۔ کافی دیر کھڑا سوچتا رہا کہ اندر جا کر مناسب و موزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگے۔ مگر خود میں اتنی جرأت پیدا نہ کر سکا۔ دبے پاؤں لوٹا اور اندھیرے کمرے میں صوفے پر لیٹ گیا۔ دیر تک جا گلتارہا، آخر سو گیا۔ صبح سوریے اٹھا۔ رات کا واقعہ اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ اشوک نے بیوی سے ملنا مناسب نہ سمجھا اور ناشتہ کیے بغیر نکل گیا۔

آفس میں اس نے دل لگا کر کوئی کام نہ کیا۔ یہ احساس اس کے دل و دماغ کے ساتھ چپک کر رہ گیا تھا، ”ایسی واہیات حرکت اور مجھے خیال تک نہ آیا۔“ کئی بار اس نے گھر بیوی کو ٹیلی فون کرنے کا ارادہ کیا مگر ہر بار نمبر کے آدھے ہندسے گھما کر رسیور کھ دیا۔ دوپھر کو گھر سے جب اس کا کھانا آیا تو اس نے نوکر سے پوچھا، ”میم صاحب نے کھانا کھالیا؟“ نوکرنے جواب دیا، ”جب نہیں۔۔۔ وہ کہیں باہر گئے ہیں۔“

”کہاں؟“

”معلوم نہیں صاحب!“

”کب گئے تھے؟“

”گیارہ بج“

اشوک کا دل دھڑ کنے لگا۔ بھوک غائب ہو گئی۔ دو چار نوالے کھائے اور ہاتھ اٹھایا۔ اسکے دماغ میں ہلچل مج گئی تھی۔ طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔۔۔ گیارہ بجے۔۔۔ ابھی تک لوٹی نہیں۔۔۔ گئی کہاں ہے۔۔۔ ماں کے پاس؟ کیا وہ اسے سب کچھ بتا دیگی۔۔۔؟ ضرور بتائے گی۔ ماں سے بیٹی سب کچھ کہہ سکتی ہے۔۔۔ ہو سکتا ہے بہنوں کے پاس گئی ہو۔۔۔ سنیں گی تو کیا کہیں گی۔۔۔؟ دونوں میری کتنی عزت کرتی تھیں۔ جانے بات کہاں سے کہاں پہنچے گی۔۔۔ ایسی وابیات حرکت اور مجھے خیال تک نہ آیا۔

اشوک آفس سے باہر نکل گیا۔ موڑلی اور ادھر ادھر آوارہ چکر لگاتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے موڑ کا رخ گھر کی طرف پھیر دیا، ”دیکھا جائے گا جو کچھ ہو گا۔“ گھر کے پاس پہنچا تو اس کا دل زور زور سے دھڑ کنے لگا۔ جب لفت ایک دھنکے کے ساتھ اوپر اٹھی تو اس کا دل اچھل کر اس کے منہ میں آگیا۔ لفت تیری منزل پر رکی۔ کچھ دیر سوچ کر اس نے دروازہ کھولا۔ اپنے فلیٹ کے پاس پہنچا تو اس کے قدم رک گئے۔ اس نے سوچا کہ لوٹ جائے۔ مگر فلیٹ کا دروازہ کھلا اور اس کا نوکر بیڑی پینے کے لیے باہر کلا۔ اشوک کو دیکھ کر اس نے بیڑی ہاتھ میں چھپائی اور سلام کیا۔ اشوک کو اندر داخل ہونا پڑا۔

نوکر پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اشوک نے پلت کر اس سے پوچھا، ”میم صاحب کہاں ہیں؟“

نوکرنے جواب دیا، ”اندر کمرے میں؟“

”اور کون ہے؟“

”ان کی بہنیں صاحب۔۔۔ کولا بے والے صاحب کی میم صاحب اور دوپار سی بائیاں!“

یہ سن کر اشوك بڑے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے دھکا دیا۔ اندر سے اشوك کی بیوی کی تیلی مگر تیز آواز آئی ”کون ہے؟“

نوکر بولا ”صاحب“

اندر کمرے میں ایک دم گڑ بڑ شروع ہو گئی۔ چینی بلند ہوئیں۔ دروازوں کی چٹنیاں کھلنے کی آوازیں آئیں۔ کھٹ کھٹ پھٹ پھٹ ہوئی۔ اشوك کوئی ڈور سے ہوتا پچھلے دروازے سے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ پروجیکٹر چل رہا اور پردے پردن کی روشنی میں دھنڈی دھنڈی انسانی شکلیں ایک نفرت انگیز مکانگی یک آہنگ کے ساتھ حیوانی حرکات میں مشغول ہیں۔

اشوك بے تحاشا ہنسنے لگا۔

- [10] -

آخری سلیوٹ: سعادت حسن منشو

یہ کشمیر کی لڑائی بھی عجیب و غریب تھی۔ صوبیدار رب نواز کا دماغ ایسی بندوق بن گیا تھا جس کا گھوڑا خراب ہو گیا ہو۔

پچھلی بڑی جنگ میں وہ کئی محاذوں پر لڑ کچا تھا۔ مارنا اور مرن جانتا تھا۔ چھوٹے بڑے افسروں کی نظروں میں اس کی بڑی توقیر تھی، اس لیے کہ وہ بڑا ہبادر، نذر اور سمجھدار سپاہی تھا۔ پلاٹون کمانڈر مشکل کام ہمیشہ اسے ہی سونپتے تھے اور وہ ان سے عہدہ برآ ہوتا تھا۔ مگر اس لڑائی کا ڈھنگ ہی نرالا تھا۔ دل میں بڑا لوٹہ، بڑا جوش تھا۔ بھوک پیاس سے بے پرواصل ایک ہی لگن تھی، دشمن کا صفائی کر دینے کی، مگر جب اس سے سامنا ہوتا، تو جانی پہچانی صورتیں نظر آتیں۔ بعض دوست دکھائی دیتے، بڑے بغلی قسم کے دوست، جو پچھلی لڑائی میں اس کے دوش بدوش، اتحادیوں کے دشمنوں سے لڑتے تھے، پر اب جان کے پیاسے بنے ہوئے تھے۔

صوبیدار رب نواز سوچتا تھا کہ یہ سب خواب تو نہیں۔ پچھلی بڑی جنگ کا اعلان، بھرتی، قد آور چھاتیوں کی پیمائش، پیٹی، چاند ماری اور پھر مجاز۔ ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر، آخر جنگ کا خاتمہ۔ پھر ایک دم پاکستان کا قیام اور ساتھ ہی کشمیر کی لڑائی۔ اوپر تلے کتنی چیزیں۔ رب نواز سوچتا تھا کہ کرنے والے نے یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر کیا ہے تاکہ دوسرے بوکھلا جائیں اور سمجھنہ سکیں۔ ورنہ یہ بھی کوئی بات تھی کہ اتنی جلدی اتنے بڑے انقلاب برپا ہو جائیں۔

اتنی بات تو صوبیدار رب نواز کی سمجھ میں آتی تھی کہ وہ کشمیر حاصل کرنے کے لیے لڑ رہے ہیں۔ کشمیر کیوں حاصل کرنا ہے، یہ بھی وہ اچھی طرح سمجھتا تھا اس لیے کہ پاکستان کی بقاء کے لیے اس کا الحال اشد ضروری ہے، مگر نشانہ باندھتے ہوئے اسے جب کوئی جانی پہچانی شکل نظر آجائی تھی تو وہ کچھ دیر کے لیے بھول جاتا تھا کہ وہ کس غرض کے لیے لڑ رہا ہے، کس مقصد کے لیے اس نے بندوق اٹھائی ہے۔ اور وہ یہ غالباً اسی لیے بھولتا تھا کہ اسے بار بار خود کو یاد کرنا پڑتا تھا کہ اب کی وہ صرف تنخواہ زمین کے مربوعوں اور تمغوں کے لیے نہیں بلکہ اپنے وطن کی خاطر لڑ رہا ہے۔ یہ وطن پہلے بھی اس کا وطن تھا، وہ اسی علاقے کا رہنے والا تھا جواب پاکستان کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ اب اسے اپنے اسی ہم وطن کے خلاف لڑنا تھا جو کبھی اس کا ہمسایہ ہوتا تھا، جس کے خاندان سے اس کے خاندان کے پشت ہاپشت کے دیرینہ مراسم تھے۔ اب اس کا وطن وہ تھا جس کا پانی تک بھی اس نے کبھی نہیں پیا تھا، پر اب اسکی خاطر، ایک دم اس کے کاندھے پر بندوق رکھ کر یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ جاؤ، یہ جگہ جہاں تم نے ابھی اپنے گھر کے لیے دو اینٹیں بھی نہیں چینیں، جس کی ہوا اور جس کے پانی کا مزہ بھی تھہارے منہ میں ٹھیک طور پر نہیں بیٹھا، تمہارا وطن ہے۔۔۔ جاؤ اس کی خاطر پاکستان سے لڑو۔۔۔ اس پاکستان سے جس کے عین دل میں تم نے اپنی عمر کے اتنے برس گزارے ہیں۔

رب نواز سوچتا تھا کہ یہی حال ان مسلمان فوجیوں کا ہے جو ہندوستان میں اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں آئے ہیں۔ وہاں ان سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا یہاں آ کر انھیں اور تو کچھ نہیں ملا۔ البتہ بندوقیں مل گئی ہیں۔ اسی وزن کی، اسی شکل کی، اسی مارکی اور چھاپ کی۔

پہلے سب مل کر ایک ایسے دشمن سے لڑتے تھے جن کو انہوں نے پیٹ اور انعام و اکرام کی خاطر اپنا دشمن یقین کر لیا تھا۔ اب وہ خود دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ پہلے سب ہندوستانی فوجی کھلاتے تھے۔ اب ایک پاکستانی تھا اور دوسرے ہندوستانی۔ ادھر ہندوستان میں مسلمان ہندوستانی فوجی تھے۔ رب نواز جب ان کے متعلق سوچتا تو اس کے دماغ میں ایک عجیب گڑ بڑی پیدا ہو جاتی۔ اور جب وہ کشمیر کے متعلق سوچتا تو اس کا دماغ بالکل جواب دے جاتا۔۔۔ پاکستانی فوجی کشمیر کے لیے لڑ رہے تھے یا کشمیر کے مسلمانوں کے لیے؟ اگر انھیں کشمیر کے مسلمانوں ہی کے لیے لڑایا جاتا تھا تو حیدر آباد اور جونا گڑھ کے مسلمانوں کے لیے کیوں انھیں لڑنے کے لیے نہیں کہا جاتا تھا۔ اور اگر یہ جنگ ٹھیک اسلامی جنگ تھی تو دنیا میں دوسرے اسلامی ملک ہیں وہ اس میں کیوں حصہ نہیں لیتے۔

رب نوازاب بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ یہ باریک باریک بالکل نہیں سوچنا چاہئیں۔ اس کی عقل مولیٰ ہونی چاہیے۔ کیونکہ مولیٰ عقل والا ہی اچھا سپاہی ہو سکتا ہے، مگر فطرت سے مجبور کبھی کبھی وہ چور دماغ سے ان پر غور کر ہی لیتا تھا اور بعد میں اپنی اس حرکت پر خوب ہنستا تھا۔

دریائے کشن گنگا کے کنارے اس سڑک کے لیے، جو مظفر آباد سے کرن جاتی ہے، کچھ عرصے سے لڑائی ہو رہی تھی۔۔۔ عجیب و غریب لڑائی تھی۔ رات کو بعض اوقات آس پاس کی پہاڑیاں فائروں کے بجائے گندی گالیوں سے گونج اٹھتی تھیں۔ ایک مرتبہ صوبیدار رب نواز اپنی پلاٹوں کے جوانوں کے ساتھ شب خون مارنے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ دور نیچے ایک کھائی سے گالیوں کا شور اٹھا۔ پہلے تو وہ گھبر گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ بہت سے بھوت مل کر ناق رہے ہیں اور زور زور کے قعقہے لگا رہے ہیں۔ وہ بڑا یا، ”خنزیر کی دُم۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔“ ایک جوان نے گونجتی ہوئی آوازوں سے مخاطب ہو کر یہ بڑی گالی دی اور رب نواز سے کہا، ”صوبیدار صاحب گالیاں دے رہے ہیں۔ اپنی ماں کے یار۔“

رب نواز یہ گالیاں سن رہا تھا جو بہت اکسانے والی تھیں۔ اس کے جی میں آئی کہ بزن بول دے مگر ایسا کرنا غلطی تھی، چنانچہ وہ خاموش رہا۔ کچھ دیر جوان بھی چپ رہے، مگر جب پانی سر سے گزر گیا تو انہوں نے بھی گلا پچاڑ پچاڑ کے گالیاں لڑھانا شروع کر دیں۔۔۔ رب نواز کے لیے اس قسم کی لڑائی بالکل نئی چیز تھی۔ اس نے جوانوں کو دو تین مرتبہ خاموش رہنے کے لیے کہا، مگر گالیاں ہی کچھ ایسی تھیں کہ جواب دیے بنا انسان سے نہیں رہا جاتا تھا۔

دشمن کے سپاہی نظر سے او جھل تھے۔ رات کو تو خیر اندھیرا تھا، مگر وہ دن کو بھی نظر نہیں آتے تھے۔ صرف ان کی گالیاں نیچے پہاڑی کے قدموں سے اٹھتی تھیں اور پتھروں کے ساتھ مکڑا مکڑا کر ہوا میں حل ہو جاتی تھیں۔ رب نواز کی پلاٹوں کے جوان جب ان گالیوں کا جواب دیتے تھے تو اس کو ایسا لگتا تھا کہ وہ نیچے نہیں جاتیں، اوپر کو اڑ جاتی ہیں۔ اس سے اس کو خاصی کوفت ہوتی تھی۔۔۔ چنانچہ اس نے جھنجھلا کر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ رب نواز کو وہاں کی پہاڑیوں میں ایک عجیب بات نظر آئی تھی۔ چڑھائی کی طرف کوئی پہاڑی درختوں اور بوٹوں سے لدی پھندی ہوتی تھی اور اترائی کی طرف گنجی۔ کشمیری ہتوکے سر کی طرح۔ کسی کی چڑھائی کا حصہ گنجہ ہوتا تھا اور اترائی کی طرف درخت ہی درخت ہوتے تھے۔ چیڑ کے لمبے تناؤ درخت۔ جن کے بٹے ہوئے دھاگے جیسے پتوں پر فوجی بوٹ پھسل پھسل جاتے تھے۔

جس پہاڑی پر صوبیدار رب نواز کی پلاٹون تھی، اس کی اترائی درختوں اور جھاڑیوں سے بے نیاز تھی۔ ظاہر ہے کہ حملہ بہت ہی خطرناک تھا مگر سب جوان حملے کے لیے بخوبی تیار تھے۔ گالیوں کا انتقام لینے کے لیے وہ بے تاب تھے۔ حملہ ہوا اور کامیاب رہا۔ دو جوان مارے گئے۔ چار زخمی ہوئے۔ دشمن کے تین آدمی کھیت رہے۔ باقی رسد کا کچھ سامان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ صوبیدار رب نواز اور اس کے جوانوں کو اس بات کا بڑا دلکھ تھا کہ دشمن کا کوئی زندہ سپاہی ان کے ہاتھ نہ آیا جس کو وہ خاطر خواہ گالیوں کا مراچھاتے۔ مگر یہ سورچ فتح کرنے سے وہ ایک بڑی اہم پہاڑی پر قابض ہو گئے تھے۔ وائر لیس کے ذریعے سے صوبیدار رب نواز نے پلاٹون کمانڈر میجر اسلام کو فوراً ہی اپنے حملے کے اس نتیجے سے مطلع کر دیا تھا اور شباشی وصول کر لی تھی۔

قریب قریب ہر پہاڑی کی چوٹی پر پانی کا ایک تالاب سا ہوتا تھا۔ اس پہاڑی پر بھی تالاب تھا، مگر دوسرا پہاڑیوں کے تالابوں کے مقابلے میں زیادہ بڑا۔ اس کا پانی بھی بہت صاف اور شفاف تھا۔ گو موسم سخت سرد تھا، مگر سب نہائے۔ دانت بجھتے رہے مگر انہوں نے کوئی پرواہ نہ کی۔ وہ ابھی اس شغل میں مصروف تھے کہ فائر کی آواز آئی۔ سب ننگے ہی لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد صوبیدار رب نواز خال نے دور میں لگا کر نیپے ڈھلوانوں پر نظر دوڑائی، مگر اسے دشمن کے چھپنے کی جگہ کاپانہ چلا۔ اس کے دلکھتے دلکھتے ایک اور فائر ہوا۔ دور اترائی کے فوراً بعد ایک نسبتاً چھوٹی پہاڑی کی داڑھی سے اسے دھواں اٹھتا نظر آیا۔ اس نے فوراً ہی اپنے جوانوں کو فائر کا حکم دیا۔

ادھر سے دھڑ دھڑ فائر ہوئے۔ ادھر سے بھی جواباً گولیاں چلنے لگیں۔۔۔ صوبیدار رب نواز نے دور میں سے دشمن کی پوزیشن کا بغور مطالعہ کیا۔ وہ غالباً بڑے بڑے پتھروں کے پیچھے محفوظ تھے۔ مگر یہ محافظ دیوار بہت ہی چھوٹی تھی۔ زیادہ دیر تک وہ جنم نہیں رہ سکتے تھے۔ ان میں سے جو بھی ادھر ادھر ہٹتا، اس کا صوبیدار رب نواز کی زد میں آناتھی تھا۔ تھوڑی دیر فائر ہوتے رہے۔ اس کے بعد رب نواز نے اپنے جوانوں کو منع کر دیا کہ وہ گولیاں ضائع نہ کریں صرف تاک میں رہیں۔ جو نہیں دشمن کا کوئی سپاہی پتھروں کی دیوار سے نکل کر ادھر یا ادھر جانے کی کوشش کرے اس کو اڑا دیں۔ یہ حکم دے کر اس نے اپنے الف ننگے بدن کی طرف دیکھا اور بڑا بڑا یا، ”خنزیر کی دُم۔۔۔ کپڑوں کے بغیر آدمی حیوان معلوم ہوتا ہے۔“

لبے لمبے و تقویں کے بعد دشمن کی طرف سے اکاڑ کا فائر ہوتا رہا۔ یہاں سے اس کا جواب کبھی کبھی دے دیا جاتا۔ یہ کھلیل پورے دودن جاری رہا۔۔۔ موسم یک لخت بہت سرد ہو گیا۔ اس تدریس سرد کہ دن کو بھی خونِ محمد ہونے لگتا تھا، چنانچہ صوبیدار رب نواز نے چائے کے دور شروع کر دیے۔ ہر وقت آگ پر کیتی دھری رہتی۔ جو نہیں سردی زیادہ ستائی ایک دور اس گرم گرم مشروب کا ہو جاتا۔ ویسے دشمن پر برابر نگاہ تھی۔ ایک ہتھا تو دوسرا اس کی جگہ دور میں لے کر بیٹھ جاتا۔

ہڈیوں تک اتر جانے والی سرد ہوا چل رہی تھی۔ جب اس جوان نے جو پھرے دار تھا، بتایا کہ پتھروں کی دیوار کے پیچھے کچھ گڑ بڑھ رہو رہی ہے۔ صوبیدار رب نواز نے اس سے دور بین لی اور غور سے دیکھا۔ اسے حرکت نظر نہ آئی لیکن فوراً ہی ایک آواز بلند ہوئی اور دیر تک اس کی گونج آس پاس کی پہاڑیوں کے ساتھ ٹکراتی رہی۔ رب نواز اس کا مطلب نہ سمجھا۔ اس کے جواب میں اس نے اپنی بندوق داغ دی۔ اس کی گونج دبی تو پھر ادھر سے آواز بلند ہوئی، جو صاف طور پر ان سے مخاطب تھی۔ رب نواز چلا یا، ”خنزیر کی دم۔۔۔ بول کیا کہتا ہے تو!“

فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ رب نواز کے الفاظ دشمن تک پہنچ گئے، کیونکہ وہاں سے کسی نے کہا، ”گالی نہ دے بھائی“

رب نواز نے اپنے جوانوں کی طرف دیکھا اور بڑے جھنجھلانے ہوئے تعجب کے ساتھ کہا، ”بھائی؟“ پھر وہ اپنے منہ کے آگے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر چلا یا، ”بھائی ہو گا تیری ماں کا جنا۔۔۔ یہاں سب تیری ماں کے یار ہیں!“ ایک دم ادھر سے ایک زخمی آواز بلند ہوئی ”رب نواز!“ رب نواز کا نپ گیا۔۔۔ یہ آواز آس پاس کی پہاڑیوں سے سر پھوڑتی رہی اور مختلف انداز میں، رب نواز۔۔۔ رب نواز، دھر اتنی بالآخر خون مجدر کر دینے والی سرد ہوا کے ساتھ جانے کہاں اٹھ گئی۔

رب نواز بہت دیر کے بعد چونکا، ”یہ کون تھا۔“ پھر وہ آہستہ سے بڑ بڑا یا، ”خنزیر کی دم!“ اس کو اتنا معلوم تھا ٹیکھوں کے مذاپر سپاہیوں کی اکثریت 6/9 رجنٹ کی ہے۔ وہ بھی اسی رجنٹ میں تھا۔ مگر یہ آواز تھی کس کی؟ وہ ایسے بے شمار آدمیوں کو جانتا تھا جو کبھی اس کے عزیز ترین دوست تھے۔ کچھ ایسے بھی جن سے اس کی دشمنی تھی، چند ذاتی اغراض کی بناء پر۔ لیکن یہ کون تھا جس نے اس کی گالی کا برآمان کر اسے چھپ کر پکارا تھا۔

رب نواز نے دور بین لگا کر دیکھا، مگر پہاڑی کی ہلتی ہوئی چھدری داڑھی میں اسے کوئی نظر نہ آیا۔ دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر اس نے زور سے اپنی آواز ادھر چھینکی، ”یہ کون تھا؟ رب نواب بول رہا ہے۔۔۔ رب نواز۔۔۔ رب نواز۔۔۔“ یہ رب نواز، بھی کچھ دیر تک پہاڑیوں کے ساتھ ٹکراتا رہا۔ رب نواز بڑ بڑا یا، ”فوراً ہی ادھر سے آواز بلند ہوئی، ”میں ہوں۔۔۔ میں ہوں رام سنگھ!“

رب نواز یہ سن کریوں اچھلا جیسے وہ چھلانگ لگا کر دوسرا طرف جانا چاہتا ہے۔ پہلے اس نے اپنے آپ سے کہا، ”رام سنگھ؟“ پھر حلق پھاڑ کے چلا یا، ”رام سنگھ؟ اوے رام سنگھا۔۔۔ خنزیر کی دم!“

”خنزیر کی دم“ ابھی پہاڑیوں کے ساتھ گلراٹکر پوری طرح گم نہیں ہوئی تھی کہ رام سنگھ کی بچھی بچھی آواز بلند ہوئی، ”اوے کمہار کے کھوتے!“ رب نواز پھوں کرنے لگا۔ جوانوں کی طرف رعب دار نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ بڑا یا، ”بکتا ہے--- خنزیر کی دم!“ پھر اس نے رام سنگھ کو جواب دیا، ”اوے باباٹل کے کڑاہ پر شاد--- اوے خنزیر کے جھٹکے۔“ رام سنگھ بے تحاشا قہقہے لگانے لگا۔ رب نواز بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ پہاڑیاں یہ آوازیں بڑے کھلنڈرے انداز میں ایک دوسرے کی طرف اچھانی رہیں۔ صوبیدار رب نواز کے جو ان خاموش تھے۔

جب ہنسی کا دور ختم ہوا تو ادھر سے رام سنگھ کی آواز بلند ہوئی، ”دیکھو یار ہمیں چائے پینی ہے!“ رب نواز بولا، ”پیو--- عیش کرو۔“ رام سنگھ چلا یا، ”اوے عیش کس طرح کریں--- سامان تو ہمارا دھر پڑا ہے۔“ رب نواز نے پوچھا ”کدھر؟“ رام سنگھ کی آواز آئی، ”ادھر--- جدھر تمہارا فائزہ ہمیں اڑا سکتا ہے۔“ رب نواز ہنسا، ”تو کیا چاہتے ہو تم--- خنزیر کی دم!“ رام سنگھ بولا، ”ہمیں سامان لے آنے دے۔“

”لے آ!“ یہ کہہ کر اس نے اپنے جوانوں کی طرف دیکھا۔ رام سنگھ کی تشویش بھری آواز بلند ہوئی، ”تو اڑا دے گا، کمہار کے کھوتے!“ رب نواز نے بھنا کر کہا، ”بک نہیں اوے سنتو کھ سر کے کچھوے۔“ رام سنگھ ہنسا، ”قسم کھا نہیں مارے گا!“ رب نواز نے پوچھا، ”کس کی قسم کھاؤ!“ رام سنگھ نے کہا، ”کسی کی بھی کھا لے!“ رب نواز ہنسا، ”اوے جا--- منگو اے اپنا سامان۔“

چند لمحات خاموشی رہی۔ دور بین ایک جوان کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے معنی خیز نظروں سے صوبیدار رب نواز کی طرف دیکھا۔ بندوق چلانے ہی والا تھا کہ رب نواز نے اسے منع کیا، ”نہیں--- نہیں!“ پھر اس نے دور بین لے کر خود ہی دیکھا۔ ایک آدمی ڈرتے ڈرتے پنجوں کے بل پتھروں کے عقب سے نکل کر جا رہا تھا۔ تھوڑی دور اس طرح چل کر وہ اٹھا اور تیزی سے بھاگا۔ اور کچھ دور گھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ دو منٹ کے بعد واپس آیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں کچھ سامان تھا۔ ایک لحظے کے لیے وہ رکا۔ پھر تیزی سے او جھل ہوا تو رب نواز نے اپنی بندوق چلا دی۔ تڑاخ کے ساتھ ہی رب نواز کا قہقہہ بلند ہوا۔ یہ دونوں آوازیں مل کر کچھ دیر جھنجھناتی رہیں۔ پھر رام سنگھ کی آواز آئی، ”تھینک یو۔“

”نو میںشن۔“ رب نواز نے یہ کہہ کر جوانوں کی طرف دیکھا، ”ایک را ڈنڈ ہو جائے۔“ تفریح کے طور پر دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگیں۔ پھر خاموشی ہو گئی۔ رب نواز نے دور بین لگا کر دیکھا۔ پہاڑی کی داڑھی میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ پکارا، ”چائے تیار کر لی رام سنگھا؟“ جواب آیا، ”ابھی کہاں اوے کمہار کے کھوتے!“

رب نواز ذات کا کمہار تھا۔ جب کوئی اس کی طرف اشارہ کرتا تھا تو غصے سے اس کا خون کھولنے لگتا تھا۔ ایک صرف رام سنگھ کے منہ سے وہ اسے برداشت کر لیتا تھا اس لیے کہ وہ اس کا بے تکلف دوست تھا۔ ایک ہی گاؤں میں وہ پل کر جوان ہوئے تھے۔ دونوں کی عمر میں صرف چند دن کا فرق تھا۔ دونوں کے باپ، پھر ان کے باپ بھی ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک ہی اسکول میں پر ائمہ تک پڑھتے تھے اور ایک ہی دن فوج میں بھرتی ہوئے تھے اور پچھلی بڑی جنگ میں کئی محاذوں پر اکٹھے لڑے تھے۔

رب نواز اپنے جوانوں کی نظر وہ میں خود کو خفیف محسوس کر کے بڑھایا، ”خنزیر کی دم۔۔۔ اب بھی باز نہیں آتا۔“ پھر وہ رام سنگھ سے مخاطب ہوا، ”بک نہیں اونے کھوتے کی جوں۔“ رام سنگھ کا قہقہہ بلند ہوا۔ رب نواز نے ایسے ہی شست باندھی ہوئی تھی۔ تفریح اس نے لبی دبادی۔ تڑاخ کے ساتھ ہی ایک فلک شگاف چین بلند ہوئی۔ رب نواز نے فوراً دریں لگائی اور دیکھا کہ ایک آدمی، نہیں، رام سنگھ پیٹ کپڑے، پتھروں کی دیواروں سے ذرا ہٹ کر دوہر اہوا اور گر پڑا۔

رب نواز زور سے چیخا، ”رام سنگھ!“ اور اچھل کر کھڑا ہو گیا، ادھر سے بیک وقت تین چار فائر ہوئے۔ ایک گولی رب نواز کا دایاں بازو چاٹتی ہوئی نکل گئی۔ فوراً ہی وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ اب دونوں طرف سے فائر شروع ہو گئے۔ ادھر کچھ سپاہیوں نے گڑبڑ سے فائدہ اٹھا کر پتھروں کے عقب سے نکل کر بھاگنا چاہا۔ ادھر سے فائر جاری تھے۔ مگر نشانے پر کوئی نہ بیٹھا۔ رب نواز نے اپنے جوانوں کو اتنے کا حکم دیا۔ تین فوراً ہی مارے گئے، لیکن افتال و خیز اس باقی جوان دوسری پہاڑی پر پہنچ گئے۔

رام سنگھ خون میں لٹ پت پتھریلی زمین پر پڑا کہ رہا تھا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ رب نواز کو دیکھ کر اس کی آنکھیں تمباٹھیں۔ مسکرا کر اس نے کہا، ”اوے کمہار کے کھوتے، یہ تو نے کیا کیا؟“ رب نواز، رام سنگھ کا زخم اپنے پیٹ میں محسوس کر رہا تھا، لیکن وہ مسکرا کر اس پر جھکا اور دوزا نہ ہو کر اس کی پیٹی کھولنے لگا۔ ”خنزیر کی دم“ تم سے کس نے باہر نکلنے کو کہا تھا؟“

پیٹی اتارنے سے رام سنگھ کو سخت تکلیف ہوئی۔ درد سے وہ چلا چلا پڑا۔ جب پیٹی اتر گئی اور رب نواز نے زخم کا معاشرہ کیا جو بہت خطرناک تھا تو رام سنگھ نے رب نواز کا ہاتھ دبا کر کہا، ”میں اپنا آپ دکھانے کے لیے باہر نکلا تھا کہ تو نے۔۔۔ اوے رب کے پتیر، فائر کر دیا۔“ رب نواز کا گلار ندھ گیا، ”قسم وحدہ لاشریک کی۔۔۔ میں نے ایسے ہی بندوق چلانی تھی۔۔۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تو کھوتے کا سنگھ باہر نکل رہا ہے۔۔۔“ مجھے افسوس ہے!“

رام سنگھ کا خون کافی بہہ نکلا تھا۔ رب نواز اور اس کے ساتھی کئی گھنٹوں کے بعد وہاں پہنچ چکے۔ اس عرصے تک تو ایک پوری مشک خون کی خالی ہو سکتی تھی۔ رب نواز کو حیرت تھی کہ اتنی دیر تک رام سنگھ زندہ رہ سکا ہے۔ اس کو امید نہیں تھی کہ وہ بچے گا۔ ہلانا جلانا غلط تھا، چنانچہ اس نے فوراً اور لیس کے ذریعے سے پلاٹون کمانڈر سے درخواست کی کہ جلدی ایک ڈاکٹر روانہ کیا جائے۔ اس کا دوست رام سنگھ زخمی ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر کا وہاں تک پہنچا اور پھر وقت پر پہنچنا بالکل محل تھا۔ رب نواز کو یقین تھا کہ رام سنگھ صرف چند گھنٹیوں کا مہمان ہے۔ پھر بھی وہ لیس پر پیغام پہنچا کر اس نے مسکرا کر رام سنگھ سے کہا، ”ڈاکٹر آرہا ہے۔۔۔ کوئی فکر نہ کر!“ رام سنگھ بڑی نحیف آواز میں سوچتے ہوئے بولا، ”فکر کسی بات کی نہیں۔۔۔ یہ بتا میرے کتنے جوان مارے ہیں تم لوگوں نے؟“

رب نواز نے جواب دیا ”صرف ایک!“ رام سنگھ کی آواز اور زیادہ نحیف ہو گئی، ”تیرے کتنے مارے گئے؟“ رب نواز نے جھوٹ بولا، ”چھ!“ اور یہ کہہ کر اس نے معنی خیز نظر وہ سے اپنے جوانوں کی طرف دیکھا۔ ”چھ۔۔۔ چھ!“ رام سنگھ نے ایک ایک آدمی اپنے دل میں گنا۔ ”میں زخمی ہوا تو وہ بہت بد دل ہو گئے تھے۔۔۔ پر میں نے کہا۔۔۔ کھیل جاؤ اپنی اور دشمن کی جان سے۔۔۔ چھ۔۔۔ ٹھیک ہے!“ وہ پھر ماضی کے دھنڈ لکوں میں چلا گیا، ”رب نواز۔۔۔ یاد ہیں وہ دن تمہیں۔۔۔“

اور رام سنگھ نے بیتے دن یاد کرنے شروع کر دیے۔ کھیتوں کھلیاں کی باتیں، اسکوں کے قصے، 6/9 جاٹ رجنٹ کی داستانیں۔۔۔ کمانڈنگ افسروں کے لطفی اور باہر کے ملکوں میں اجنبی عورتوں سے معاشرے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے رام سنگھ کو کوئی بہت دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ ہنسنے لگا تو اس کے ٹیس اٹھی گمراں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے زخم سے اوپر ہی اوپر ہنس کر کہنے لگا۔ ”اوئے سور کے تل۔۔۔ یاد ہے تمہیں وہ مڈم۔۔۔“

رب نواز نے پوچھا ”کون؟“ رام سنگھ نے کہا، ”وہ۔۔۔ اٹلی کی۔۔۔ کیانام رکھا تھا، ہم نے اس کا۔۔۔ بڑی مار خور عورت تھی!“ رب نواز کو فوراً ہی وہ عورت یاد آگئی، ”ہاں، ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ مڈم منیتا فیتو۔۔۔ پیسے ختم، تماشا ختم۔۔۔ پر تجھ سے کبھی کبھی رعایت کر دیتی تھی مسویں کی پچی!“ رام سنگھ زور سے ہنسا۔۔۔ اور اس کے زخم سے جھے ہوئے خون کا ایک لوٹھڑا باہر نکل آیا۔ سرسری طور پر رب نواز نے جو پٹی باندھی تھی، وہ کسک گئی تھی۔ اسے ٹھیک کر کے اس نے رام سنگھ سے کہا، ”اب خاموش رہو۔“

رام سنگھ کو بہت تیز بخار تھا۔ اس کا دماغ اس کے باعث بہت تیز ہو گیا تھا۔ بولنے کی طاقت نہیں تھی مگر بولے چلا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی رک جاتا۔ جیسے یہ دیکھ رہا ہے کہ ٹنکی میں کتنا پڑاں باقی ہے۔ کچھ دیر کے بعد اس پر نہیں کیفیت طاری ہو گئی، لیکن کچھ ایسے وقے بھی آتے تھے کہ اس کے ہوش و حواس سلامت ہوتے تھے۔ انہی وقوف میں اس نے ایک مرتبہ نواز سے سوال کیا، ”یار اسچ سچ بتاؤ، کیا تم لوگوں کو واقعی کشمیر چاہیے؟“

رب نواز نے پورے خلوص کے ساتھ کہا۔ ”ہاں، رام سنگھا!“ رام سنگھ نے اپنا سر ہلایا، ”نہیں۔۔۔ میں نہیں مان سکتا۔۔۔ تمہیں ور غلایا گیا ہے۔“ رب نواز نے اس کو تین دلانے کے انداز میں کہا، ”تمہیں ور غلایا گیا ہے۔۔۔ قسم پختن پاک کی۔۔۔“ رام سنگھ نے رب نواز کا ہاتھ کپڑا لیا، ”قسم نہ کھایا را۔۔۔ ٹھیک ہو گا۔“ لیکن اس کا لبچ صاف بتا رہا تھا کہ اس کو رب نواز کی قسم کا تین نہیں۔

دن ڈھلنے سے کچھ دیر پہلے پلاٹون کمانڈنٹ میجر اسلام آیا۔ اس کے ساتھ چند سپاہی تھے، مگر ڈاکٹر نہیں تھا۔ رام سنگھ بے ہوشی اور نزع کی حالت میں کچھ بڑا رہا تھا۔ مگر آواز اس قدر کمزور اور شکستہ تھی کہ سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ میجر اسلام بھی 6/9 جاٹ رجمنٹ کا تھا اور رام سنگھ کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ رب نواز سے سارے حالات دریافت کرنے کے بعد اس نے رام سنگھ کو بلایا۔۔۔ ”رام سنگھ۔۔۔ رام سنگھ!“

رام سنگھ نے اپنی آنکھیں کھولیں، لیٹے لیٹے اٹینشن ہو کر اس نے سلیوٹ کیا۔ لیکن پھر آنکھیں کھول کر اس نے ایک لحظے کے لیے غور سے میجر اسلام کی طرف دیکھا۔ اس کا سلیوٹ کرنے والا آکٹر اہواہ تھا ایک دم گرپڑا۔ جھنگلا کر اس نے بڑا ناشروع کیا، ”کچھ نہیں اوئے رام سیاں۔۔۔ بھول ہی گیا تو سور کے نلا۔۔۔ کہ یہ لڑائی۔۔۔ یہ لڑائی؟“

رام سنگھ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے اس نے رب نواز کی طرف نیم سوالیہ انداز میں دیکھا اور سر دھو گیا۔

منگو کو چوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گواں کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کو چوان جن کو یہ جانے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے، استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اس نے گاماچودھری کے چوڑے کا نام ہے پر تھکی دے کر مبارانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی، ”دیکھ لینا گاماچودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔“

جب گاماچودھری نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ اپین کہاں واقع ہے تو استاد منگو نے بڑی متنانت سے جواب دیا تھا، ”ولایت میں اور کہاں؟“

اپین کی جنگ چھڑی۔ اور جب ہر شخص کو پہتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کو چوان حقہ پر رہے تھے دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے۔ اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے کسی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلہ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اڈے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تتمما یا ہوا تھا۔ حقے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگو نے سر پر سے خاکی گڈڑی اتاری اور بغل میں داب کر بڑے مفکرانہ لبجھ میں کہا، ”یہ کسی پیر کی بد دعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو، چھریاں چلتی رہتی ہیں۔ اور میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا۔ اور اس درویش نے جل کر یہ بد دعادی تھی، جا، تیرے ہندستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے، اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے ہندستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اور پھر حقے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی، ”یہ کا انگریز ہندستان کو آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پکلنے ریں تو کچھ نہ ہو گا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہو گی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا۔ یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سنا ہے کہ بہت تکڑا آدمی ہے۔ لیکن ہندستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بد دعا بھی دی تھی کہ ہندستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔“

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی۔ اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ ہندستان پر اپنا سکلمہ چلاتے ہیں۔ اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے شیفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سرخ و سپید

چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی آجائی۔ نہ معلوم کیوں وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجائی ہے جس کے جسم پر سے اور پر کی جھلکیں گل گل کر جھٹر رہی ہو۔

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھلکر اہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدر رہتی۔ اور وہ شام کو اڈے میں آکر بیان مار کر سکرٹ پیتے یا خفجتے کے کش لگاتے ہوئے اس گورے، کو جی بھر کر سنایا کرتا۔ “---” یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پکڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا، ”آگ لینے آئے تھے۔ اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانختے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں۔“

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس کا کوئی سا تھی اس کے پاس بیٹھا رہتا وہ اپنے سینے کی آگ اگلتا رہتا، ”شکل دیکھتے ہونا تم اس کی --- جیسے کوڑھ ہو رہا ہے --- بالکل مردار، ایک دھپے کی مار اور گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مارہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم، پہلے پہل جی میں آئی کہ ملعون کی کھوپڑی کے پرزے اڑا دوں لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہٹک ہے۔---“ یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتا۔ اور ناک کو خاکی قیص سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑھانے لگ جاتا، ”قسم ہے بھگوان کی ان لاث صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ آ گیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھا ہوں رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون و انوں بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آ جائے۔“

اور جب ایک روز استاد مغلونے کچھری سے اپنے تانگ پر دوساریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انہتانا رہی۔

دومارواڑی جو کچھری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے، ”سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا۔--- یا ہر چیز بدل جائے گی؟“

”ہر چیز تو نہیں بد لے گی۔ مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندستانیوں کو آزادی مل جائے گی؟“

”کیا پیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا؟“

”یہ پوچھنے کی بات ہے کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔“ ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابلی بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا۔ اور چاپک سے بہت بڑی طرح پیٹا کرتا تھا۔ مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا۔ اور اپنی بڑھی ہوئی موچھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اوپنچ کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا، ”چل پیٹا۔۔۔ ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھادے۔“

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے انارکلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکاری۔ اور موچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوتے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا، ”ہت تیری ایسی تیسی۔“

شام کو جب وہ اڑے کو لوٹا تو خلافِ معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا۔۔۔ بہت بڑی خبر، اور اس خبر کو اپنے اندر سے نکالنے کے لیے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چاپک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڑے کی آہنی چھت کے نیچے بیقراری کی حالت میں ٹھہلتا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آرہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندستان میں نافذ ہونے والا تھا اپنے دماغ کی تمام بیاس روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ ”کیا بیان کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا؟“ بار بار گونج رہا تھا۔ اور اس کے تمام جسم میں مسّرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی موچھوں کے اندر ہنس کر اس نے مارواڑیوں کو گالی دی۔۔۔ ”غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل۔۔۔ نیا قانون ان کے لیے کھوتا ہوا پانی ہو گا۔“

وہ بے حد مسرور تھا، خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں۔۔۔ سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی ہوتھیں یا نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گنج، بگڑی بغل میں دبائے، اڑے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا، ”لہا تھو ادھر۔۔۔ ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے۔۔۔ تیری اس گنجی کھوپری پر بال اگ آئیں۔“ اور یہ کہہ کر منگو نے

بڑے مزے لے لے کرنے والے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دورانِ گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا، ”تو دیکھتا رہ، کیا بتتا ہے، یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔“

استادِ منگو موجودہ سوویت نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزوں بہت پسند تھیں۔ اسی لیے اس نے روس والے بادشاہ ”کوانڈیا ایکٹ“ یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا۔ اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں۔ وہ انھیں ”روس والے بادشاہ“ کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری ہی تھی۔ منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں روس والے بادشاہ اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملا کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں بساز پکڑے گئے ہیں۔ یافلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے۔ تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمه سمجھتا اور دل ہی دل میں خوش ہوتا۔

ایک روز اس کے تالگے میں دو بیر سڑ بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا ان میں سے ایک، دوسرے سے کہہ رہا تھا، ”جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آسکا۔ فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سنبھال سکی گئی۔ سیاسی نظریہ سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں!“

ان بیر سڑوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے۔ اس لیے استادِ منگو صرف اوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے کہا، ”یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو برائی سمجھتے ہیں۔ اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔“ چنانچہ اس خیال کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیر سڑوں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا، ”ٹوڈی بچے!

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں ”ٹوڈی بچے“ کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور ”ٹوڈی بچے“ کی تمیز کرنے کی امیلت رکھتا ہے۔

اس وقت کے تیرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلباء کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزگ جارہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں یہ بتیں کرتے سنا، ”نے آئینے نے میری امیدیں بڑھادی ہیں اگر۔۔۔ صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے۔ تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔“

”ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آجائے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“

”وہ بے کار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ان میں کچھ تو کی ہو گی۔“

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بڑھادی۔ وہ اس کو ایسی ’چیز‘ سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ ’نیا قانون۔۔۔! وہ دن میں کئی بار سوچتا، یعنی کوئی ’نئی چیز!‘ اور ہر بار اس کی نظر وہ سامنے اپنے گھوڑے کا وہ ساز آ جاتا۔ جو اس نے دو برس ہوئے چودھری خدا بخش سے اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا۔ جگہ جگہ لو ہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دکھاتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی ’نئے قانون‘ کا درخشاں و تباہ ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سننا۔ مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا۔ بدلتا نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا۔ اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی ان سے اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کارما روک کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلافِ معمول سرد تھا۔ اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور اصل میں جا کر گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی۔۔۔ وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سر دھنڈ کے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا۔ مگر اسے ہر چیز پر اپنی نظر آئی۔ آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیارنگ دیکھنا چاہتی تھیں۔ مگر سوائے اس کلاغی کے جورنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی۔ اور اس کے گھوڑے کے سر پر

جمی ہوئی تھی۔ اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلاغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں کیمپ مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنہ میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بھلی کے کھبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھروں کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی۔۔۔ ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں لیکن استاد منگومایوس نہیں تھا۔

”ابھی بہت سویرا ہے دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں۔“ اس خیال سے اسے تسلیم تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا، ”ہائی کورٹ میں نوبجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟“

جب اس کا تانگہ گور نمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھریاں نے بڑی رعونت سے نوچا۔ جو طلباء کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ خوش پوش تھے۔ مگر استاد منگو کونہ جانے ان کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی، کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تائے کو دائیں ہاتھ موز کروہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انارکلی میں تھا۔ بازار کی آدمی دکانیں کھل چکی تھیں۔ اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعویٰ نظارہ دے رہی تھیں۔ اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑر ہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لیے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔۔۔ وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب استاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری سے گزارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہو گا مگر وہ نظر کی گھریاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اسی غیر مغلوب خواہش کے زیر اثر اس نے کئی بار اپنی بیماریوی کے پیٹ کو دبادبا کر اور اس کے اوپر کان رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آگیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس پڑا تھا، ”تو ہر وقت مردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ انھوں را جل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچے جن دے گی؟“

استاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشكیل دیکھنے کا خواہش مند تھا بلکہ متحبس تھا۔ اس کی بیوی گنگا دیوی اس کی اس قسم کی بے قرار یوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی، ”ابھی کنوں کھو دا نہیں گیا اور پیاس سے نڈھال ہو رہے ہو۔“

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا یقین رکھنے تھا۔ جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا۔ وہ نئے قانون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا، ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لیے نکلا کرتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو استاد منگو کے نزدیک، وہ بڑا آدمی تھا۔ اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں۔ تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی ترازو میں تو ناچاہتا تھا۔

انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موڑوں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چاک دکھایا۔ اور دل میں خیال کیا، ”چلو یہ بھی اچھا ہوا۔۔۔ شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔“

چھاؤنی پتھر کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اتار دیا۔ اور جیب سے سگریٹ نکال کر باکیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا۔ اور پچھلی نشست کے گذے پر بیٹھ گیا۔۔۔ جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی۔ یا اسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تھا۔ تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنا نے کے بعد بڑی دھیمی چال چلانا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لیے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی۔ جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا۔ وہ اس قابل غوربات کو آئین جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلا یا ہے۔ پتھر پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دُور بجلی کے کھبے کے پاس ایک ”گورا“ کھڑا نظر آیا۔ جو اسے ہاتھ سے بلارہ تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے استاد منگو کو گوروں سے بیحد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اس کو خیال آیا ان کے پیسے چھوڑنا بھی یہ تو فی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دئے ہیں، ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگا موڑ کر اس نے گھوڑے کو چاہک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا، ”صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟“ اس سوال میں بلا کاظفیہ انداز تھا، صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کاموچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا۔ اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آرہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی، گویا کسی نے نوکیے چاقو سے شیشم کی سانویں لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا، اور اپنے اندر اس نے اس ”گورے“ کو سینے کی آگ میں جلا کر جسم کر دالا تھا۔

جب ”گورے“ نے جو بجلی کے کھبے کی اوٹ میں ہوا کارخ چاکر سکرٹ سلکارہ تھامڑ کرتا نگے کے پاند ان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو کی اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں۔ اور آپس میں ٹکر کر ایک آتشیں بگولابن کر اوپر کو اڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باغ کے بل کھول کرتا نگے پر سے نیچے اترنے والا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے ”گورے“ کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے ذرے ذرے کو اپنی نگاہوں سے چبارا ہے۔ اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلوں پر سے غیر مرلی چیزیں جھاڑ رہا ہے، گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سکریٹ کا دھوال نگتے ہوئے کہا، ”جانا مانگتا یا پھر گڑ بڑ کرے گا؟“

”وہی ہے“ یہ لفظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناپنے لگے۔

”وہی ہے۔“ اس نے یہ لفظ اپنے منہ کے اندر رہا رہائے اور ساتھ ہی اسے پورا تین ہو گیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا ہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھٹپٹ ہوئی تھی، اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی۔ اسے طوعاً کرہا بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے پر زے اڑادیجے ہوتے، مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور کو چوانوں ہی پر گرتا ہے۔

استاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا، ”ہاں جانا مانگتا ہے؟“ استاد منگو کے لہجے میں چاک ایسی تیزی تھی۔ گورے نے جواب دیا۔ ”ہیر امنڈی۔“

”کرایہ پانچ روپے ہو گا“۔ استاد منگو کی موچھیں تھر تھرائیں۔

یہ سن کر گورا حیران ہو گیا۔ وہ چلایا۔ ”پانچ روپے۔ کیا تم---؟“

”ہاں، ہاں، پانچ روپے۔“ یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا دہنا بالوں بھرا تھا جھنچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا۔ ”کیوں جاتے ہو یا بیکار باتیں بناؤ گے؟“ استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیش نظر کھڑک استاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزایخیاں کے زیر اثر وہ تالگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھٹری سے استاد منگو کو تالگے پر سے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ بیدار کی یہ پاش کی ہوئی تپلی چھٹری استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پست قدر گورے کو دیکھا گویا وہ اپنی بگاہوں کے وزن ہی سے اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح سے اوپر کو اٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹھایا۔ اور نیچے اتر کر اسے دھڑادھڑ پینا شروع کر دیا۔

ششدرو متحیر گورے نے ادھر ادھر سمت کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی۔ اور جب دیکھا کہ اس کے مقابلہ پر دیوالی کی سی حالت طاری ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے بر س رہے ہیں۔ تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ اس کی چیخ پاکار نے استاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا، ”پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں۔۔۔ پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں۔۔۔ اب ہمارا راج ہے بچ؟“

لوگ جمع ہو گئے۔ اور پولیس کے دوساریوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھپ رکھا۔ استاد منگو ان دوساریوں کے درمیان کھڑا تھا اس کی چوری چھاتی پھولی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منه سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زده جمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔“

”وہ دن گزر گئے۔ جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔۔۔ اب نیا قانون ہے میاں۔۔۔ نیا قانون!“

اور بچارا گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوف کے مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ ”نیا قانون نیا قانون“ چلا تارہا۔ مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

”نیا قانون، نیا قانون۔ کیا بک رہے ہو۔۔۔ قانون وہی ہے پرانا!“

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا!

کچھ دنوں سے مومن بہت بے قرار تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کا وجود کچھ پھوڑا سا بن گیا تھا۔ کام کرتے وقت، باتیں کرتے ہوئے حتیٰ کہ سوچنے پر بھی اسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ ایسا درد جس کو وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔

بعض اوقات بیٹھے بیٹھے وہ ایک دم چونک پڑتا۔ دھند لے دھند لے خیالات جو عام حالتوں میں ہے آواز بلبلوں کی طرح پیدا ہو کر مت جایا کرتے ہیں۔ مومن کے دماغ میں بڑے شور کے ساتھ پیدا ہوتے اور شور ہی کے ساتھ پھٹتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے دل و دماغ کے نرم و نازک پر دوں پر ہر وقت جیسے خاردار پاؤں والی چیزوں میں سی رینگتی تھیں۔ ایک عجیب قسم کا کھنچا اس کے اعضا میں پیدا ہو گیا تھا۔ جس کے باعث اسے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ اس تکلیف کی شدت جب بڑھ جاتی تو اس کے جی میں آتا کہ اپنے آپ کو ایک بڑے ہاون میں ڈال دے اور کسی سے کہے، ”مجھے کو ٹنا شروع کر دو۔“

باور پی خانہ میں گرم مصالحہ کوٹتے وقت جب لوہے سے لوہا ٹکراتا اور دھمکوں سے چھت میں ایک گونج سی دوڑ جاتی تو مومن کے نگے پیروں کو یہ لرزش بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ پیروں کے ذریعے سے یہ لرزش اس کی تن ہوئی پنڈلیوں اور رانوں میں دوڑتی ہوئی اس کے دل تک پہنچ جاتی، جو تیز ہوا میں رکھے ہوئے دیے کی طرح کانپنا شروع کر دیتا۔ مومن کی عمر پندرہ برس کی تھی۔ شاید سولہواں بھی لگا ہو۔ اسے اپنی عمر کے متعلق صحیح اندازہ نہیں تھا۔ وہ ایک صحت مندا اور تدرست لڑکا تھا۔ جس کا لڑکپن تیز قدی سے جوانی کے میدان کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اسی دوڑ نے جس سے مومن بالکل غافل تھا، اس کے لہو کے ہر قطرے میں سنسنی پیدا کر دی تھی۔ وہ اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا تھا مگر ناکام رہتا۔

اس کے جسم میں کئی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ گردن جو پہلے تلی تھی اب موٹی ہو گئی تھی۔ بانہوں کے پھلوں میں اینٹھن سی پیدا ہو گئی تھی۔ کنٹھ نکل رہا تھا۔ سینے پر گوشت کی تھے موٹی ہو گئی تھی۔ اور اب کچھ دنوں سے پستانوں میں گولیاں سی پڑ گئی تھیں۔ جگہ ابھر آئی تھی جیسے کسی نے ایک ایک برٹھا اندر داخل کر دیا ہے۔ ان ابھاروں کو ہاتھ لگانے سے مومن کو بہت درد محسوس ہوتا تھا۔ کبھی کبھی کام کرنے کے دوران میں غیر ارادی طور پر جب اس کا ہاتھ ان گولیوں سے چھو جاتا تو وہ ترپ اٹھتا۔ قیص کے موٹے اور کھردے کپڑے سے بھی اس کو تکلیف دہ سر سراہٹ محسوس ہوتی تھی۔

غسل خانے میں نہاتے وقت یا باور پی خانہ میں جب کوئی اور موجود نہ ہو، مومن اپنی قیص کے بٹن کھول کر ان گولیوں کو غور سے دیکھتا تھا۔ ہاتھوں سے مسلتا تھا۔ درد ہوتا ٹیسیں اٹھتیں۔ اس کا سارا جسم پھلوں سے لدے ہوئے پڑ کی طرح جسے زور سے ہلا یا گیا ہو کانپ کانپ جاتا۔

مگر اس کے باوجود وہ اس درد پیدا کرنے والے کھیل میں مشغول رہتا تھا۔ کبھی کبھی زیادہ دبانے پر یہ گولیاں پچک جاتیں اور ان کے منہ سے لیس دار لعاب نکل آتا۔ اس کو دیکھ کر اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سُرخ ہو جاتا۔ وہ سمجھتا کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے۔

گناہ اور ثواب کے متعلق مومن کا علم بہت محدود تھا۔ ہر وہ فعل جو ایک انسان دوسرے انسانوں کے سامنے نہ کر سکتا ہو، اس کے خیال کے مطابق گناہ تھا۔ چنانچہ جب شرم کے مارے اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سُرخ ہو جاتا تو وہ جھٹ سے اپنی قیصیں کے بٹن بند کر لیتا۔ اور دل میں عہد کرتا کہ آئندہ ایسی فضول حرکت کبھی نہیں کرے گا۔ لیکن اس عہد کے باوجود دوسرے تیرے روز تنی میں وہ پھر اس کھیل میں مشغول ہو جاتا۔

مومن سے گھروالے سب خوش تھے۔ وہ بڑا معنqi لڑکا تھا۔ ہر کام وقت پر کر دیتا تھا اور کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتا تھا۔ ڈپٹی صاحب کے یہاں اسے کام کرتے ہوئے صرف تین مہینے ہوئے تھے لیکن اس قلیل عرصے میں اس نے گھر کے ہر فرد کو اپنی محنت کش طبیعت سے متاثر کر لیا تھا۔ چھ روپے مہینے پر وہ نو کرہوا تھا مگر دوسرے مہینے ہی اس کی تنخواہ میں دور روپے بڑھادیے گئے تھے۔ وہ اس گھر میں بہت خوش تھا۔ اس لیے کہ اس کی یہاں قدر کی جاتی تھی۔ مگر وہ اب کچھ دنوں سے بے قرار تھا۔ ایک عجیب قسم کی آوارگی اس کے دماغ میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا بھی چاہتا تھا کہ سارا دن بے مطلب بازاروں میں گھومتا پھرے۔ یا کسی سنسان مقام پر جا کر لیٹا رہے۔

اب کام میں اس کا بھی نہیں لگتا تھا لیکن اس بے دلی کے ہوتے ہوئے بھی وہ کاہلی نہیں بر تاتھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ گھر میں کوئی بھی اس کے اندر ورنی انتشار سے واقف نہیں تھا۔ رضیہ تھی سو وہ دن بھر با جا بجائے، نئی نئی فلمی طرزیں سیکھنے اور رسالے پڑھنے میں مصروف رہتی تھی۔ اس نے کبھی مومن کی نگرانی ہی نہیں کی تھی۔ شکلیہ البتہ مومن سے ادھر ادھر کے کام لیتی تھی اور کبھی کبھی اسے ڈاٹتی بھی تھی۔ مگر اب کچھ دنوں سے وہ بھی چند بلا ذریعہ کے نمونے اتارنے میں بے طرح مشغول تھی۔ یہ بلا ذریعہ کی ایک سیکھی کے تھے۔ جسے نئی نئی تراشوں کے کپڑے پہننے کا بہت شوق تھا۔ شکلیہ اس سے آٹھ بلا ذریعہ کر لائی تھی۔ اور کاغذوں پر ان کے نمونے اتار رہی تھی۔ چنانچہ اس نے بھی کچھ دنوں سے مومن کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

ڈپٹی صاحب کی بیوی سخت گیر عورت نہیں تھی۔ گھر میں دونوں کر تھے۔ یعنی مومن کے علاوہ ایک بڑھیا بھی تھی۔ زیادہ تر باور پچی خانے کا کام یہی کرتی تھی۔ مومن کبھی کبھی اس کا ہاتھ بٹا دیا کرتا تھا۔ ڈپٹی صاحب کی بیوی نے ممکن ہے مومن کی مستعدی میں کوئی کمی دیکھی ہو۔ مگر اس نے مومن سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا، اور وہ انقلاب جس میں سے مومن کا دل و دماغ اور جسم گزر رہا تھا، اس سے تو ڈپٹی صاحب کی بیوی بالکل غافل تھی۔ چونکہ اس کا کوئی لڑکا نہیں تھا اس لیے وہ مومن کی ذہنی اور جسمانی تبدیلیوں کو نہیں سمجھ سکتی تھی اور پھر مومن نوکر

خدا۔ نوکروں کے متعلق کون غور و فکر کرتا ہے؟ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہ تمام منزیلیں پیدا کر جاتے ہیں اور آس پاس کے آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔

مومن کا بھی بالکل یہی حال تھا۔ وہ کچھ دنوں سے موڑ مرتا، زندگی کے ایک ایسے راستے پر آنکھا تھا جو زیادہ لمبا تو نہیں تھا مگر بے حد پر خطر تھا۔ اس راستے پر اس کے قدم کبھی تیز تیز اٹھتے تھے کبھی ہولے ہولے۔ وہ دراصل جانتا نہیں تھا کہ ایسے راستوں پر کس طرح چلنا چاہیے۔ انھیں جلدی طے کر جانا چاہیے یا کچھ وقت لے کر آہستہ آہستہ ادھر ادھر کی چیزوں کا سہارا لے کر طے کرنا چاہیے۔ مومن کے ننگے پاؤں کے نیچے آنے والے شباب کی گول گول چکنی بیٹیاں پھسل رہی تھیں۔ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ بے حد مضطرب تھا۔ اسی اضطراب کے باعث کئی بار کام کرتے کرتے چونک کروہ غیر ارادی طور پر کسی کھونٹی کو دونوں ہاتھوں سے کپڑا لیتا اور اس کے ساتھ لٹک جاتا۔ پھر اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ ٹانگوں سے کپڑا کرا سے کوئی اتنا کھینچنے کہ وہ ایک مہین تار بن جائے۔ یہ سب باتیں اس کے دماغ کے کسی ایسے گوشے میں پیدا ہوتی تھیں کہ وہ ٹھیک طور پر ان کا مطلب نہیں سمجھ سکتا تھا۔

غیر شعوری طور پر وہ چاہتا تھا کہ کچھ ہو۔۔۔ کیا ہو۔۔۔؟ بس کچھ ہو۔۔۔ میز پر قرینے سے چُنی ہوئی پلیٹیں ایک دم اچھلنا شروع کر دیں۔ کیتیلی پر رکھا ہوا ڈھکنا پانی کے ایک ہی ابال سے اوپر کو اڑ جائے۔ مل کی جستی نالی پر دباؤ ڈالے تو وہ دہری ہو جائے اور اس میں سے پانی کا ایک فوارہ سا پھوٹ نکلے۔ اسے ایک ایسی زبردست انگڑی آئے کہ اس کے سارے جوڑ علیحدہ علیحدہ ہو جائیں اور ایک ڈھیلا پن پیدا ہو جائے۔۔۔ کوئی ایسی بات و قوع پذیر ہو جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔

مومن بہت بے قرار تھا۔

رضیہ نتی فلمی طرزیں سکھنے میں مشغول تھی۔ اور شکلیہ کاغذوں پر بلا ذریعہ کے نمونے اتار رہی تھی۔ اور جب اس نے یہ کام ختم کر لیا تو وہ نمونہ جوان میں سب سے اچھا تھا سامنے رکھ کر اپنے لیے اودی ساٹن کا بلا ذریعہ بنانا شروع کیا۔ اب رضیہ کو بھی اپنا باجا اور فلمی گانوں کی کاپی چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ شکلیہ ہر کام بڑے اہتمام اور چاؤ سے کرتی تھی۔ جب سینے پر ورنے بیٹھتی تو اس کی نشست بڑی پر اطمینان ہوتی تھی۔ اپنی چھوٹی بہن رضیہ کی طرح وہ افراتقری پسند نہیں کرتی تھی۔ ایک ایک ٹانکا سوچ سمجھ کر بڑے اطمینان سے لگاتی تھی تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔ پیمائش بھی اس کی بہت صحیح ہوتی تھی، اس لیے کہ وہ پہلے کاغذ کاٹ کر پھر کپڑا کاٹتی تھی۔ یوں وقت زیادہ صرف ہوتا تھا مگر چیز بالکل فٹ تیار ہوتی تھی۔

شکلیہ بھرے بھرے جسم کی صحت مند لڑکی تھی۔ اس کے ہاتھ بہت گدگے تھے۔ گوشت بھری مخروطی انگلیوں کے آخر میں ہر جوڑ پر ایک نہماً گڑھا تھا۔ جب وہ مشین چلاتی تھی یہ نئے نئے گڑھے ہاتھ کی حرکت سے کبھی کبھی غائب بھی ہو جاتے تھے۔ شکلیہ مشین بھی بڑے اطمینان سے چلاتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی دو یا تین انگلیاں بڑی رعنائی کے ساتھ مشین کی ہستھی کو گھماتی تھیں، اس کی کلامی میں ایک ہلا ساختم پیدا ہو جاتا تھا۔ گردن ذرا اس طرف کو جھک جاتی تھی اور بالوں کی ایک لٹ جسے شاید اپنے لیے کوئی مستقل جگہ نہیں ملتی تھی نیچے پھسل آتی تھی۔ شکلیہ اپنے کام میں اس قدر منہمک رہتی کہ اسے ہٹانے یا جانے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔

جب شکلیہ اودی سائن سامنے پھیلا کر اپنے ناپ کا بلاوز تراشنے لگی تو اسے ٹیپ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیونکہ ان کا اپنا ٹیپ گھس اکر اب بالکل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ لو ہے کا گز موجود تھا۔ مگر اس سے کمراور سینے کی پیاسا کش کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کے اپنے کئی بلاوز موجود تھے مگر اب چونکہ وہ پہلے سے کچھ موٹی ہو گئی تھی اس لیے ساری پیاسا کشیں دوبارہ کرنا چاہتی تھی۔ قیصیں اتنا کر اس نے مومن کو آواز دی۔ جب وہ آیا تو اس سے کہا، ”جاوہ مومن دوڑ کر چھ نمبر سے کپڑے کا گز لے آؤ۔ کہنا شکلیہ بی بی مانگتی ہیں۔“

مومن کی نگاہیں شکلیہ کی سفید بنیان کے ساتھ ٹکرائیں۔ وہ کئی بار شکلیہ بی بی کو ایسی بنیادوں میں دیکھ چکا تھا مگر آج اسے ایک قسم کی جھجک محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی نگاہوں کا رخ دوسری طرف پھیر لیا اور گھبر اہٹ میں کہا، ”کیسا گز بی بی جی۔“ شکلیہ نے جواب دیا، ”کپڑے کا گز۔۔۔ ایک گز تو یہ تمہارے سامنے پڑا ہے، یہ لو ہے کا ہے۔ ایک دوسرا گز بھی ہوتا ہے جو کپڑے کا بناء ہوتا ہے۔ جاؤ چھ نمبر میں جاؤ اور دوڑ کے ان سے یہ گز لے آؤ۔ کہنا شکلیہ بی بی مانگتی ہیں۔“

چھ نمبر کا فلیٹ بالکل قریب تھا۔ مومن فوراً ہی کپڑے کا گز لے کر آگیا۔ شکلیہ نے یہ گز اس کے ہاتھ سے لیا اور کہا، ”یہیں ٹھہر جاؤ، اسے ابھی واپس لے جانا۔“ پھر وہ اپنی بہن رضیہ سے مخاطب ہوئی، ”ان لوگوں کی کوئی چیز زیادہ دیر اپنے پاس رکھ لی جائے تو وہ بڑھیا تھا صندھ کر کر کے پریشان کر دیتی ہے۔۔۔ ادھر آؤ اور یہ گزلو اور بیہاں سے میرا ناپ لو۔“ رضیہ نے شکلیہ کی کمراور سینے کا ناپ لینا شروع کیا تو ان کے درمیان کئی باتیں ہوئی۔ مومن دروازے کی دہلیز میں کھڑا تکلیف دہ خاموشی سے یہ باتیں سنتا رہا۔

”رضیہ تم گز کو کھینچ کر ناپ کیوں نہیں لیتیں۔۔۔ پچھلی دفعہ بھی یہی ہوا۔ تم نے ناپ لیا اور میرے بلاوز کا ستیا ناں ہو گلیا۔ اوپر کے حصہ پر اگر کپڑا فٹ نہ آئے تو ادھر ادھر بغلوں میں جھول پڑ جاتے ہیں۔“

”کہاں کالوں، کہاں کانہ لوں۔ تم تو عجبِ مختصے میں ڈال دیتی ہو۔ یہاں کانپ لینا شروع کیا تھا تو تم نے کہا ذرا اور نیچے کر لو۔۔۔ ذرا چھوٹا بڑا ہو گیا تو کون سی آفت آجائے گی۔“

”بھی وہ۔۔۔ چیز کے فٹ ہونے میں تو ساری خوبصورتی ہے۔ ثریا کو دیکھو کیسے فٹ کپڑے پہننی ہے۔ محل ہے جو کہیں شکن پڑے، کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں ایسے کپڑے۔۔۔ لواب تم ناپ لو۔۔۔“ یہ کہہ کر شکلیہ نے سانس کے ذریعے سے اپنا سینہ پھلانا شروع کیا۔ جب اچھی طرح پھول گیا تو سانس روک کر اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا ”لواب جلدی کرو۔“ جب شکلیہ نے سینے کی ہوا خارج کی تو مومن کو ایسا محسوس ہوا اس کے اندر کے کئی غبارے پھٹ گئے ہیں۔ اس نے گھبر اکر کہا، ”گزر لائیے بی بی جی۔۔۔ میں دے آؤں۔“

شکلیہ نے اسے جھٹک دیا، ”ذرا ٹھہر جاؤ۔“ یہ کہتے ہوئے، کپڑے کا گز، اس کے ننگے بازو سے لپٹ گیا۔ جب شکلیہ نے اسے اتارنے کی کوشش کی تو مومن کو سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آیا۔ مومن کی اپنی بغلوں میں بھی ایسے ہی بالاں رہے تھے۔ مگر یہ گچھا سے بہت بھلا معلوم ہوا۔ ایک سنسنی سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ کالے کالے بال اس کی موچھیں بن جائیں۔۔۔ بچپن میں وہ بھٹوں کے کالے اور سنہرے بال نکال کر اپنی موچھیں بنایا کرتا تھا۔ ان کو اپنے بالائی ہونٹ پر جماتے وقت جو سر سراہٹ اسے محسوس ہوا کرتی تھی، اسی قسم کی سر سراہٹ اس خواہش نے اس کے بالائی ہونٹ اور ناک میں پیدا کر دی۔

شکلیہ کا بازو اب نیچے جھگ گیا تھا۔ اور اس کی بغل چھپ گئی تھی۔ مگر مومن اب بھی کالے کالے بالوں کا وہ گچھاد کیجھ رہا تھا۔ اس کے تصور میں شکلیہ کا بازو دیر تک ویسے ہی اٹھا رہا اور بغل میں اس کے سیاہ بال جھانکتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد شکلیہ نے مومن کو گزدے دیا اور کہا، ”جاو، اُسے واپس دے آؤ۔ کہنا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے۔“ مومن گزو واپس دے کر باہر صحن میں بیٹھ گیا۔ اس کے دل و دماغ میں دھندلے دھندلے سے خیال پیدا ہو رہے تھے۔ دیر تک وہ ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے غیر ارادی طور پر اپنا چھوٹا سا سڑنک کھولا جس میں اس نے عید کے لیے نئے کپڑے بنو کر رکھے تھے۔

جب ٹرنک کا ڈھکنا کھلا اور نئے لٹھنے کی بواں کی ناک تک پہنچی تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ نہاد ہو کر اور یہ نئے کپڑے پہن کرو وہ سیدھا شکلیہ بی بی کے پاس جائے اور اسے سلام کرے۔۔۔ اس کی لٹھنے کی شلوار کس طرح کھڑ کھڑ کرے گی۔۔۔ اور اس کی رومی ٹوپی۔۔۔“ رومی ٹوپی کا خیال آتے ہی مومن کی نگاہوں کے سامنے اس کا چند نا فورائی ان کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہو

گیا جو اس نے شکلیہ کی بغل میں دیکھا تھا۔ اس نے کپڑوں کے نیچے سے اپنی نئی رومنی ٹوپی نکالی اور اس کے نرم اور چمکیلے پہننے پر ہاتھ پھیرنا شروع ہی کیا تھا کہ اندر سے شکلیہ بی بی کی آواز آئی، ”مو من!“

مو من نے ٹوپی ٹرنک میں رکھی، ڈھنکنا بند کیا اور اندر چلا گیا۔ جہاں شکلیہ نمونے کے مطابق اودی ساٹن کے کئی ٹکڑے کاٹ پھی تھی۔ ان چمکیلے اور پھسل پھسل جانے والے ٹکڑوں کو ایک جگہ رکھ کر وہ مو من کی طرف متوجہ ہوئی ”میں نے تمہیں اتنی آوازیں دیں، سو گنتے تھے کیا؟“ مو من کی زبان میں لکھت پیدا ہو گئی۔ ”نہیں بی بی جی۔“

”تو کیا کر رہے ہیں؟“

”کچھ۔۔۔ کچھ بھی نہیں؟“

”کچھ تو ضرور کرتے ہو گے؟“ شکلیہ یہ سوال کیے جا رہی تھی مگر اس کا دھیان اصل میں بلاوز کی طرف تھا۔ جسے اب اسے کچھ کرنا تھا۔ مو من نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ جواب دیا، ”ٹرنک کھول کر اپنے نئے کپڑے دیکھ رہا تھا۔ شکلیہ لکھلا کر ہنسی۔ رضیہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ شکلیہ کو ہنستے دیکھ کر مو من کو ایک عجیب سی تسلیم ہوئی۔ اور اس تسلیم نے اس کے دل میں یہ خواہش پیدا کی کہ وہ کوئی ایسی مصکھے خیز طور پر احمقانہ حرکت کرے جس سے شکلیہ کو اور زیادہ ہنسنے کا موقع ملے۔ چنانچہ لڑکیوں کی طرح جھینپ کر اور لبھے میں شرماہٹ پیدا کر کے اس نے کہا، ”بڑی بی بی جی سے پیسے لے کر میں ریشمی رومال بھی لاؤں گا۔“

شکلیہ نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا، ”کیا کرو گے اس رومال کو؟“ مو من نے جھینپ کر جواب دیا، ”گلے میں باندھ لوں گا بی بی جی۔۔۔ بڑا اچھا معلوم ہو گا۔“ یہ سن کر شکلیہ اور رضیہ دونوں دیر تک ہنستی رہیں۔ ”گلے میں باندھو گے تو یاد کھانا میں اسی سے پھانسی دے دوں گی تمھیں۔“ یہ کہہ کر شکلیہ نے اپنی ہنسی دبانے کی کوشش کی اور رضیہ سے کہا، ”کمجنگ نے مجھے کام ہی بھلا دیا۔ رضیہ میں نے اسے کیوں بلا�ا تھا؟“

رضیہ نے جواب نہ دیا اور وہ نئی فلمی طرز گنگنا نا شروع کی جو وہ دور و زم سے سیکھ رہی تھی۔ اس دوران میں شکلیہ کو خود ہی یاد آگیا کہ اس نے مو من کو کیوں بلایا تھا۔ ”دیکھو مو من! میں تمہیں یہ بنیان اتار کر دیتی ہوں۔ دوائیوں کی دوکان کے پاس جو ایک دکان نئی کھلی ہے نا، وہی

جہاں تم اس دن میرے ساتھ گئے تھے۔ وہاں جاؤ اور پوچھ کے آؤ کہ ایسی چہ بنیانوں کا وہ کیا لے گا۔۔۔ کہنا ہم پوری چھلیں گے۔ اس لیے کچھ رعایت ضرور کرے۔۔۔ سمجھ لینا؟“ مومن نے جواب دیا، ”جی ہاں۔“

”اب تم پرے ہٹ جاؤ۔“

مومن باہر نکل کر دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ چند لمحات کے بعد بنیان اس کے قدموں کے پاس آ کر گرا اور اندر سے شکلیہ کی آواز آئی، ”کہنا ہم اسی قسم، اسی ڈیزائن کی بالکل یہی چیز لیں گے، فرق نہیں ہونا چاہیے۔“ مومن نے بہت اچھا کہہ کر بنیان اٹھالیا جو پسینے کے باعث کچھ کچھ گیلا ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے بھاپ پر رکھ کر فوراً ہی ہٹالیا ہو۔ بدن کی بُو بھی اس میں بُسی ہوئی تھی۔ میٹھی میٹھی گرمی بھی تھی۔ یہ تمام چیزیں اس کو بہت بھلی معلوم ہوئیں۔ وہ اس بنیان کو جو بُلی کے بچ کی طرح ملامم تھا، اپنے ہاتھوں میں ملتا باہر چلا گیا۔ جب بھاؤ واؤ دریافت کر کے بازار سے واپس آیا تو شکلیہ بلاوز کی سلائی شروع کر چکی تھی۔ اس سیاہی مائل ساٹن کے بلاوز کی جو مومن کی روئی ٹوپی کے پھندنے سے کہیں زیادہ چمکتی اور چکدار تھی۔

یہ بلاوز شاید عید کے لیے تیار کیا جا رہا تھا کیونکہ عیداب بالکل قریب آگئی تھی۔ مومن کو ایک دن میں کئی بار بلایا گیا۔ دھاگہ لانے کے لیے، استری نکلنے کے لیے، عوئی ٹوٹی توئی سوئی لانے کے لیے۔ شام کے قریب جب شکلیہ نے دوسرے روز پر باقی کام اٹھادیا تو دھاگے کے ٹکڑے اور اودی ساٹن کی بیکار کتریں اٹھانے کے لیے بھی اسے بلایا گیا۔ مومن نے اچھی طرح جگہ صاف کر دی۔ باقی سب چیزیں اٹھا کر باہر پھینک دیں مگر اودی ساٹن کی چمکدار کتریں اپنی جیب میں رکھ لیں۔۔۔ بالکل بے مطلب کیونکہ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ان کو کیا کرے گا؟

دوسرے روز اس نے جیب سے کتریں نکالیں اور الگ بیٹھ کر ان کے دھاگے الگ کرنے شروع کر دیے۔ دیر تک وہ اس کھیل میں مشغول رہا۔ حتیٰ کہ دھاگے کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کا ایک گچھا سا بن گیا اس کو ہاتھ میں لے کر وہ دباتا رہا، مسلتا رہا۔۔۔ لیکن اس کے تصور میں شکلیہ کی وہی بغل تھی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا چھوٹا سا گچھا دیکھا تھا۔

اس دن بھی شکلیہ نے اسے کئی بار بلایا۔۔۔ کالی ساٹن کے بلاوز کی ہر شکل اس کی نگاہوں کے سامنے آتی رہی۔ پہلے جب اسے کچا کیا گیا تھا تو اس پر سفید دھاگے کے بڑے بڑے ٹانکے جا بجا پھیلے ہوئے تھے۔ پھر اس پر استری کی گئی۔ جس سے سب شکنین دوڑھو گئیں۔ اور چک بھی دو بالا ہو گئی۔ اس کے بعد کچھی حالت ہی میں شکلیہ نے اسے پہنا، رضیہ کو دکھایا۔ دوسرے کمرے میں سنگھار میز کے پاس جا کر آئینے میں خود

اس کو ہر پہلو سے اچھی طرح دیکھا۔ جب پورا طینان ہو گیا تو اسے اتارا، جہاں جہاں تگ یا کھلا تھا وہاں نشان بنائے، اور اس کی ساری خامیاں دور کیں۔ ایک بار پھر پہن کر دیکھا۔ جب بالکل فٹ ہو گیا تو پُنی سلامی شروع کی۔

ادھر اودی ساٹن کا یہ بلاوز سیا جا رہا تھا۔ ادھر مومن کے دماغ میں عجیب و غریب خیالوں کے جیسے ٹانکے سے ادھر ہے تھے۔۔۔ جب اسے کمرے میں بلا یا جاتا اور اس کی نگاہیں چکیلی ساٹن کے بلاوز پر پڑتیں تو اس کا جی چاہتا کہ وہ ہاتھ سے چھو کر اسے دیکھے۔ صرف چھو کرہی نہیں دیکھے۔۔۔ بلکہ اس کی ملامت اور روئیں دار سطح پر دیر تک ہاتھ پھیرتا رہے۔۔۔ اپنے کھرد رے ہاتھ۔ اس نے ان ساٹن کے ٹکڑوں سے اس کی ملامت کا اندازہ کر لیا تھا۔ دھاگے جو اس نے ان ٹکڑوں سے نکالے تھے اور بھی زیادہ ملامت ہو گئے تھے۔ جب اس نے ان کا چھابنا یا تھا تو دباتے وقت اسے معلوم ہوا کہ ان میں ربڑی لپک بھی ہے۔۔۔ وہ جب اندر آ کر بلاوز کو دیکھتا اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے شکلیہ کی بغل میں دیکھے تھے۔ کالے کالے بال مومن سوچتا تھا کیا وہ بھی اس ساٹن ہی کی طرح ملامت ہوں گے۔

بلاوز بالآخر تیار ہو گیا۔۔۔ مومن کمرے کے فرش پر گیلا کپڑا پھیر رہا تھا کہ شکلیہ اندر آئی۔ تمیں اتار کر اس نے پنگ پر رکھی۔ اس کے نیچے اسی قسم کا سفید بنیان تھا جس کا نمونہ لے کر مومن بھاؤ دریافت کرنے گیا تھا۔۔۔ اس کے اوپر شکلیہ نے اپنے ہاتھ کا سلا ہوا بلاوز پہننا۔ سامنے کے ہمک لگائے اور آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

مومن نے فرش صاف کرتے کرتے آئینہ کی طرف دیکھا۔ بلاوز میں اب جان سی پڑ گئی تھی۔۔۔ ایک دو جگہ پر وہ اس قدر چمکتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا ساٹن کا رنگ سفید ہو گیا ہے۔۔۔ شکلیہ کی پیچھے مومن کی طرف تھی۔ جس پر ریڑھ کی ہڈی کی لمبی جھری بلاوز فٹ ہونے کے باعث اپنی پوری گھر ائی کے ساتھ نمایاں تھی۔ مومن سے نہ رہا گیا، چنانچہ اس نے کہا، ”لبی جی! آپ نے تودرزیوں کو بھی مات کر دیا!“

شکلیہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوئی مگر وہ رضیہ کی رائے طلب کرنے کے لیے بے قرار تھی۔ اس لیے وہ صرف ”اچھا سلا ہے نا؟“ کہہ کر باہر دوڑ گئی۔۔۔ مومن آئینے کی طرف دیکھتا رہ گیا جس میں بلاوز کا سیاہ اور چمکیلا عکس دیر تک موجود رہا۔ رات کو جب وہ پھر اس کمرے میں چڑھی رکھنے کے لیے آیا تو اس نے کھوٹی پر لکڑی کے ہینگر میں اس بلاوز کو دیکھا۔ کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ چنانچہ آگے بڑھ کر پہلے اس نے غور سے دیکھا۔ پھر ڈرتے ڈرتے اس پر ہاتھ پھیرا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے یہ محسوس ہوا کہ کوئی اس کے جسم کے ملامت روئیں پر ہو لے ہو لے بالکل ہوائی لمس کی طرح ہاتھ پھیر رہا ہے۔

رات کو جب وہ سویا تو اس نے کئی اٹ پٹانگ خواب دیکھے۔ ڈپٹی صاحب نے پھر کے کوئلوں کا ایک بڑا ذہیر اسے کوئٹنے کو کہا۔ جب اس نے ایک کوئلہ اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی ایک ضرب لگائی تو وہ نرم زرم بالوں کا ایک چھابن گیا۔ یہ کالی کھانڈ کے مہین مہین تار تھے جن کا گولہ بننا ہوا تھا۔ پھر یہ گولے کالے رنگ کے غبارے بن کر ہوا میں اڑنا شروع ہوئے۔ بہت اور جا کر یہ پھٹنے لگے۔

پھر آندھی آگئی اور مو من کی روئی ٹوپی کا پھندنا کہیں غائب ہو گیا۔ پھندنے کی تلاش میں وہ نکلا۔ دیکھی اور ان دیکھی جگہوں میں گھومتا رہا۔ نئے لٹھے کی بو بھی کہیں سے آنا شروع ہوئی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ ایک کالی سائن کے بلاوز پر اس کا ہاتھ پڑا۔ کچھ دیر وہ اس دھڑکتی ہوئی چیز پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر دفتاہ بڑا کے اٹھ بیٹھا۔ ٹھوڑی دیر تک وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے۔ اس کے بعد اسے خوف، تعجب اور ایک انوکھی ٹمیں کا احساس ہوا۔ اس کی حالت اس وقت عجیب و غریب تھی۔ پہلے اسے تکلیف دہ حرارت محسوس ہوئی تھی مگر چند لمحات کے بعد ایک ٹھنڈی سی لبر اس کے جسم پر رینگے لگی۔

-[13]-

آم: سعادت حسن منٹو

خزانے کے تمام کلر ک جانتے تھے کہ منشی کریم بخش کی رسائی بڑے صاحب تک بھی ہے۔ چنانچہ وہ سب اس کی عزت کرتے تھے۔ ہر مہینے پیش کے کاغذ بھرنے اور روپیہ لینے کے لیے جب وہ خزانے میں آتا تو اس کا کام اسی وجہ سے جلد جلد کر دیا جاتا تھا۔ پچاس روپے اس کو اپنی تیس سالہ خدمات کے عوض ہر مہینے سرکار کی طرف سے ملتے تھے۔ ہر مہینے دس دس کے پانچ نوٹ وہ اپنے خفیف طور پر کا نپتہ ہوئے ہاتھوں سے پکڑتا اور اپنے پرانے وضع کے لمبے کوت کی اندر ورنی جیب میں رکھ لیتا۔ چشمے میں خدا چی کی طرف تشكیر بھری نظر وہ سے دیکھتا اور یہ کہہ کر ”اگر زندگی ہوئی تو اگلے مہینے پھر سلام کرنے کے لیے حاضر ہوں گا“ بڑے صاحب کے کمرے کی طرف چلا جاتا۔

آٹھ برس سے اس کا یہی دستور تھا۔ خزانے کے قریب قریب ہر کلر کو معلوم تھا کہ منشی کریم بخش جو مطالبات خفیہ کی کچھری میں کبھی محافظہ دفتر ہوا کرتا تھا، بے حد و ضع دار، شریف الطبع اور حلیم آدمی ہے۔ منشی کریم بخش واقعی ان صفات کا مالک تھا۔ کچھری میں اپنی طویل ملازمت کے دوران میں افسران بالا نے ہمیشہ اس کی تعریف کی ہے۔ بعض منصفوں کو تو منشی کریم بخش سے محبت ہو گئی تھی۔ اس کے خلوص کا ہر شخص قائل تھا۔

اس وقت منشی کریم بخش کی عمر پینٹھ سے کچھ اوپر تھی۔ بڑھاپے میں آدمی عموماً گواہ حیم ہو جاتا ہے مگر وہ جوانی میں بھی اسی ہی طبیعت کا مالک تھا۔ دوسروں کی خدمت کرنے کا شوق اس عمر میں بھی ویسے کاویساہی قائم تھا۔

خزانے کا بڑا افسر منشی کریم بخش کے ایک مرتبی اور مہربان نجح کا لڑکا تھا۔ نجح صاحب کی وفات پر اسے بہت صدمہ ہوا تھا۔ اب وہ ہر مہینے ان کے لڑکے کو سلام کرنے کی غرض سے ضرور ملتا تھا۔ اس سے اسے بہت تسلیم ہوتی تھی۔ منشی کریم بخش انھیں چھوٹے نجح صاحب کہا کرتا تھا۔

پنشن کے پچاس روپے جیب میں ڈال کر وہ برآمدہ طے کرتا اور چنگ لگے کمرے کے پاس جا کر اپنی آمد کی اطلاع کرتا۔ چھوٹے نجح صاحب اس کو زیادہ دیر تک باہر کھڑا رہتے، فوراً اندر بلایتے اور سب کام چھوڑ کر اس سے باقیں شروع کر دیتے۔

”تشریف رکھیے منشی صاحب۔۔۔ فرمائیے مرا ج کیسا ہے؟“

”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔۔۔ آپ کی دعا سے بڑے مزے میں گزر رہی ہے، میرے لاکن کوئی خدمت؟“

”آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ میرے لاکن کوئی خدمت ہو تو فرمائیے۔ خدمت گزاری تو بندے کا کام ہے۔“

”آپ کی بڑی نوازش ہے۔“

اس قسم کی رسمي گفتگو کے بعد منشی کریم، نجح صاحب کی مہربانیوں کا ذکر چھیڑ دیتا۔ ان کے بلند کردار کی وضاحت بڑے فدویانہ انداز میں کرتا اور بار بار کہتا، ”اللہ بخشنے مر حوم فرشتہ خصلت انسان تھے۔ خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔“

مشی کریم بخش کے لبجے میں خوشامد وغیرہ کی ذرہ بھر ملاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ وہ جو کچھ کہتا تھا، محسوس کر کے کہتا تھا۔ اس کے متعلق نجح صاحب کے لڑکے کو جواب خزانے کے بڑے افسر تھے اچھی طرح معلوم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کو عزت کے ساتھ اپنے پاس بٹھاتے تھے اور دیر تک ادھر ادھر کی باقیں کرتے رہتے تھے۔

ہر مہینے دوسری باتوں کے علاوہ منشی کریم بخش کے آم کے باغون کا ذکر بھی آتا تھا۔ موسم آنے پر نج صاحب کے لڑکے کی کوٹھی پر آموں کا ایک ٹوکرہ اپنچھ جاتا تھا۔ منشی کریم بخش کو خوش کرنے کے لیے وہ ہر مہینے اس کو یاد دہانی کرایتے تھے، ”منشی صاحب، دیکھیے، اس موسم پر آموں کا ٹوکرہ بھیجا نہ بھولیے گا۔ پچھلی بار آپ نے جو آم بھیجے تھے اس میں تو صرف دو میرے حصے میں آئے تھے۔“

کبھی یہ تین ہو جاتے تھے، کبھی چار اور کبھی صرف ایک ہی رہ جاتا تھا۔

منشی کریم بخش یہ سن کر بہت خوش ہوتا تھا، ”حضور ایسا کبھی ہو سکتا ہے۔۔۔ جو نہی فصل تیار ہوئی میں فوراً ہی آپ کی خدمت میں ٹوکرائے کر حاضر ہو جاؤں گا۔۔۔ دو کہیے دو حاضر کر دوں۔ یہ باغ کس کے ہیں۔۔۔ آپ ہی کے توہین۔“

کبھی کبھی چھوٹے نج صاحب پوچھ لیا کرتے تھے، ”منشی جی آپ کے باغ کہاں ہیں؟“

دینا گر میں حضور۔۔۔ زیادہ نہیں ہیں صرف دو ہیں۔ اس میں سے ایک تو میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو دے رکھا ہے جو ان دونوں کا انتظام وغیرہ کرتا ہے۔

مئی کی پشن لینے کے لیے منشی کریم بخش جوں کی دوسری تاریخ کو خزانے گیا۔ دس دس کے پانچ نوٹ اپنے خفیف طور پر کاپنے ہوئے ہاتھوں سے کوٹ کی اندر ونی جیب میں رکھ کر اس نے چھوٹے نج صاحب کے کمرہ کارخ کیا۔ حسب معمول ان دونوں میں وہی رسمی باتیں ہوئیں۔ آخر میں آموں کا ذکر بھی آیا جس پر منشی کریم بخش نے کہا، ”دینا گر سے چھپی آئی ہے کہ ابھی آموں کے منہ پر چیپ نہیں آیا۔ جو نہی چیپ آگیا اور فصل پک کر تیار ہو گئی، میں فوراً ہلاٹوکرائے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔۔۔ چھوٹے نج صاحب! اس دفعہ ایسے تخفہ آم ہوں گے کہ آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ ملائی اور شہد کے گھونٹ نہ ہوئے تو میرا ذمہ۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ چھوٹے نج صاحب کے لیے ایک ٹوکرہ اخاص طور پر بھروادیا جائے اور سواری گاڑی سے بھیجا جائے تاکہ جلدی اور احتیاط سے پہنچے۔ دس پندرہ روز آپ کو اور انتظار کرنا پڑے گا۔“

چھوٹے نج صاحب نے شکریہ ادا کیا۔ منشی کریم بخش نے اپنی چھتری اٹھائی اور خوش خوش گھروپس آگیا۔

گھر میں اس کی بیوی اور بڑی لڑکی تھی۔ بیاہ کے دوسرے سال جس کا خادوند مر گیا تھا۔ منشی کریم بخش کی اور کوئی اولاد نہیں تھی مگر اس مختصر سے کنبے کے باوجود بچا سروپوں میں اس کا گزر بہت ہی مشکل سے ہوتا تھا۔ اسی تنگی کے باعث اس کی بیوی کے تمام زیور ان آٹھ برسوں میں آہستہ آہستہ پک گئے تھے۔

مشی کریم بخش فضول خرچ نہیں تھا۔ اس کی بیوی اور وہ بڑے کلفایت شعار تھے مگر اس کلفایت شعاری کے باوصف تنخواہ میں سے ایک پیسہ بھی ان کے پاس نہ بیٹھتا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ مشی کریم بخش چند آدمیوں کی خدمت کرنے میں بے حد سرست محسوس کرتا تھا ان چند خاص الخاص آدمیوں کی خدمت گزاری میں جن سے اسے دلی عقیدت تھی۔

ان خاص آدمیوں میں سے ایک تو نج صاحب کے لڑکے تھے۔ دوسرے ایک اور افسر تھے جو ریٹائر ہو کر اپنی زندگی کا بقا یا حصہ ایک بہت بڑی کوٹھی میں گزار رہے تھے۔ ان سے مشی کریم بخش کی ملاقات ہر روز صح سویرے کمپنی باغ میں ہوتی تھی۔

بانگ کی سیر کے دوران میں مشی کریم بخش ان سے ہر روز پچھلے دن کی خبریں سنتا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ بیتے ہوئے دونوں کے تارچھیڑ دیتا تو ڈپٹی سپرینٹنڈنٹ صاحب اپنی بہادری کے قصے سنانا شروع کر دیتے تھے کہ کس طرح انہوں نے لاکل پور کے جنگلی علاقے میں ایک خونخوار قاتل کو پستول، خبردار کھائے بغیر گرفتار کیا اور کس طرح ان کے رعب سے ایک ڈاکوسارا مال چھوڑ کر بھاگ گیا۔

کبھی کبھی مشی کریم بخش کے آم کے باغوں کا بھی ذکر آ جاتا تھا، ”مشی صاحب کہیے، اب کی دفعہ نصل کیسی رہے گی۔“ پھر چلتے چلتے ڈپٹی سپرینٹنڈنٹ صاحب یہ بھی کہتے، ”پچھلے سال آپ نے جو آم بھجوائے تھے بہت ہی اپنے تھے، بے حد لذیذ تھے۔“

”انشاء اللہ خدا کے حکم سے اب کی دفعہ بھی ایسے ہی آم حاضر کروں گا۔ ایک ہی بوٹے کے ہوں گے۔ ویسے ہی لذیذ، بلکہ پہلے سے کچھ بڑھ چڑھ کر ہی ہوں گے۔“

اس آدمی کو بھی مشی کریم بخش ہر سال موسم پر ایک ٹوکرا بھیجنتا تھا۔ کوٹھی میں ٹوکرائنوں کے حوالے کر کے جب وہ ڈپٹی صاحب سے ملتا اور وہ اس کا شکریہ ادا کرتے تو مشی کریم بخش نہایت انکساری سے کام لیتے ہوئے کہتا، ”ڈپٹی صاحب آپ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔۔۔ اپنے باغ ہیں۔ اگر ایک ٹوکرائیہاں لے آیا تو کیا ہو گیا۔ بازار سے آپ ایک چھوڑ کئی ٹوکرے منگو سکتے ہیں۔۔۔ یہ آم چونکہ اپنے باغ کے

ہیں اور باغ میں صرف ایک بوٹا ہے جس کے سب دانے گلاؤٹ، خوشبو اور مٹھاں میں ایک جیسے ہیں، اس لیے یہ چند تختے کے طور پر لے آیا۔“

آم دینے کے بعد جب وہ کوٹھی سے باہر نکلتا تو اس کے چہرے پر تتمتیہ ہوتی تھی۔ ایک عجیب قسم کی روحانی تسلیم اسے محسوس ہوتی تھی جو کئی دنوں تک اس کو مسرور رکھتی تھی۔

مشی کریم بخش اکھرے جسم کا آدمی تھا۔ بڑھاپے نے اس کے بدن کو ڈھیلا کر دیا تھا۔ مگر یہ ڈھیلا پن بد صورت معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہاتھوں کی پھولی ہوئی ریگیں، سر کا خفیف سار تعاش اور چہرے کی گھری لکیریں اس کی متانت و سنجیدگی میں اضافہ کرتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑھاپے نے اس کو نکھار دیا ہے۔ کپڑے بھی وہ صاف سترے پہنتا تھا جس سے یہ نکھار ابھر آتا تھا۔

اس کے چہرے کا رنگ سفیدی مائل زرد تھا۔ پتلے پتلے ہونٹ جودا نت نکل جانے کے بعد اندر کی طرف سمتی رہتے تھے، ہلکے سرخ تھے، خون کی اس کمی کے باعث اس کے چہرے پر ایسی صفائی پیدا ہو گئی تھی جو اچھی طرح منہ دھونے کے بعد تھوڑی دیر تک قائم رہا کرتی ہے۔

وہ کمزور ضرور تھا، پینیٹھ برس کی عمر میں کون کمزور نہیں ہو جاتا مگر اس کمزوری کے باوجود اس میں کئی کئی میل پیدل چلنے کی ہمت تھی۔ خاص طور پر جب آموں کا موسم آتا تو وہ ڈپٹی صاحب اور چھوٹے بچے صاحب کو آموں کے ٹوکرے بھینجنے کے لیے اتنی دوڑ دھوپ کرتا تھا کہ بیس پچیس برس کے جوان آدمی بھی کیا کریں گے۔ بڑے اہتمام سے ٹوکرے کھولے جاتے تھے۔ ان کا گھاں پھوس الگ کیا جاتا تھا۔ داغی یا گلے سڑے دانے الگ کیے جاتے تھے۔ اور صاف سترے آمنے ٹوکروں میں گن کر ڈالے جاتے تھے۔ مشی کریم بخش ایک بار پھر اطمینان کرنے کی خاطر ان کو گن لیتا تھا تاکہ بعد میں شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔

آم نکالنے اور ٹوکروں میں ڈالتے وقت مشی کریم بخش کی بہن اور اس کی بیوی کے منہ میں پانی بھر آتا۔ مگر وہ دونوں خاموش رہتیں۔ بڑے بڑے رس بھرے خوبصورت آموں کا ڈھیر دیکھ کر جب ان میں سے کوئی یہ کہہ بغیر نہ رہ سکتی، ”کیا ہرج ہے اگر اس ٹوکرے میں سے دو آم نکال لیے جائیں۔“ تو مشی کریم بخش سے یہ جواب ملتا، ”اور آجائیں گے اتنا بے تاب ہونے کی کیا ضرورت ہے۔“

یہ سن کر وہ دونوں چپ ہو جاتیں اور اپنا کام کرتی رہتیں۔

جب منشی کریم بخش کے گھر میں آموں کے ٹوکرے آتے تھے تو ٹلی کے سارے آدمیوں کو اس کی خبر لگ جاتی تھی۔ عبد اللہ نیچ بند کا لڑکا جو کبوتر پانے کا شو قین تھا، دوسرے روز ہی آدم حملتا تھا اور منشی کریم بخش کی بیوی سے کہتا تھا، ”خالہ میں گھاس لینے کے لیے آیا ہوں۔ کل خالو جان آموں کے دو ٹوکرے لائے تھے ان میں سے جتنی گھاس نکلی ہو مجھے دے دیجیے۔“ ہمسائی نوراں جس نے کئی مر غیاب پال رکھی تھیں، اسی روز شام کو ملنے آجائی تھی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا کرتی تھی، ”چھلے بر س جو تم نے مجھے ایک ٹوکرا دیا تھا، بالکل ٹوٹ گیا ہے۔ اب کے بھی ایک ٹوکرا دے دو تو بڑی مہربانی ہو گی۔“

دونوں ٹوکرے اور ان کی گھاس یوں چلی جاتی۔

حسب معمول اس دفعہ بھی آموں کے دو ٹوکرے آئے۔ گلے سڑے دانے الگ کیے گیے، جو اچھے تھے ان کو منشی کریم بخش نے اپنی گنگرانی میں گناہ کرنے ٹوکروں میں رکھوا یا۔ بارہ بجے سے پہلے یہ کام ختم ہو گیا۔ چنانچہ دونوں ٹوکرے غسل خانے میں ٹھنڈی جگہ رکھ دیے گئے تاکہ آم خراب نہ ہو جائیں۔ ادھر سے مطمئن ہو کر دوپھر کا کھانا کھانے کے بعد منشی کریم بخش کمرے میں چارپائی پر لیٹ گیا۔

جون کے آخری دن تھے۔ اس قدر گرمی تھی کہ دیواریں توے کی طرح تپ رہی تھیں۔ وہ گرمیوں میں عام طور پر غسل خانے کے اندر ٹھنڈے فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹا کرتا تھا۔ یہاں موری کے رستے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی آجائی تھی لیکن اب کے اس میں دو بڑے بڑے ٹوکرے پڑے تھے۔ اس کو گرم کمرے ہی میں، جو بالکل تور بنا ہوا تھا، چھ بجے تک وقت گزارنا تھا۔

ہر سال گرمیوں کے موسم میں جب آموں کے یہ ٹوکرے آتے، اسے ایک دن آگ کے بستر پر گزارنا پڑتا تھا۔ مگر وہ اس تکلیف کو خنداہ پیشانی سے برداشت کر لیتا تھا۔ قریباً پانچ گھنٹے تک چھوٹا سا پنکھا بار بار پانی میں ترکر کے جھلتا رہتا۔ انتہائی کوشش کرتا کہ نیند آجائے مگر ایک پل کے لیے بھی اسے آرام نصیب نہ ہوتا۔ جون کی گرمی اور ضدی قسم کی لکھیاں کسے سونے دیتی ہیں۔

آموں کے ٹوکرے غسل خانے میں رکھوا کر جب وہ گرم کمرے میں لیٹا تو پنکھا جھلتے جھلتے ایک دم اس کا سر چکرا یا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا سانس اکھڑ رہا ہے اور وہ سارے کا سارا اگھرا یوں میں اتر رہا ہے۔

اس قسم کے دورے اسے کئی بار پڑھے تھے، اس لیے کہ اس کا دل کمزور تھا مگر ایسا زبردست دورہ پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔ سانس لینے میں اس کو بڑی دقت محسوس ہونے لگی، سر بہت زور سے چکرانے لگا۔ گھبرا کر اس نے آواز دی اور اپنی بیوی کو بلایا۔

یہ آواز سن کر اس کی بیوی اور بہن دونوں دوڑی دوڑی اندر آئیں۔ دونوں جانتی تھیں کہ اسے اس قسم کے دورے کیوں پڑتے ہیں۔ فوراً اسی اس کی بہن نے عبد اللہ نیچپند کے لڑکے کو بلا یا اور اس سے کہا کہ ڈاکٹر کو بلا لائے تاکہ وہ طاقت کی سوئی لگادے۔ لیکن چند منٹوں ہی میں مشی کریم بخش کی حالت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ بے قرار اس قدر بڑھ گئی کہ وہ چار پانی پر مجھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کی بیوی اور بہن نے یہ دیکھ کر شور برپا کر دیا۔ جس کے باعث اس کے پاس کئی آدمی جمع ہو گئے۔

بہت کو شش کی گئی، اس کی حالت ٹھیک ہو جائے، لیکن کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

ڈاکٹر بلانے کے لیے تین چار آدمی دوڑائے گئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی واپس آئے، مشی کریم بخش زندگی کے آخری سانس لینے لگا۔ بڑی مشکل سے کروٹ بدلتے کر اس نے عبد اللہ نیچپند کو جو اس کے پاس ہی بیٹھا تھا پنی طرف متوجہ کیا اور ڈومنی ہوئی آواز میں کہا، ”تم سب لوگ باہر چلے جاؤ۔ میں اپنی بیوی سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

سب لوگ باہر چلے گئے۔ اس کی بیوی اور لڑکی دونوں اندر داخل ہوئیں، رورو کران کابر احال ہو رہا تھا۔ مشی کریم بخش نے اشارے سے اپنی بیوی کو پاس بلا یا اور کہا، ”دونوں ٹوکرے آج شام ہی ڈپٹی صاحب اور چھوٹے نج صاحب کی کوئی پر ضرور پہنچ جانے چاہئیں۔ پڑے پڑے خراب ہو جائیں گے۔“

ادھر ادھر دیکھ کر اس نے بڑے دھیمے لبھ میں کہا، ”دیکھو، تمہیں میری قسم ہے، میری موت کے بعد بھی کسی کو آموں کا راز معلوم نہ ہو۔ کسی سے نہ کہنا کہ یہ آم ہم بازار سے خرید کر لوگوں کو سمجھتے تھے۔ کوئی پوچھئے تو یہی کہنا کہ دینا نگر میں ہمارے باغ ہیں۔۔۔ بس۔۔۔ اور دیکھو جب میں مر جاؤں تو چھوٹے نج صاحب اور ڈپٹی صاحب کو ضرور اطلاع پہنچ دینا۔“

چند لمحات کے بعد مشی کریم بخش مر گیا، اس کی موت سے ڈپٹی صاحب اور چھوٹے صاحب کو لوگوں نے مطلع کر دیا۔ مگر دونوں چند ناگزیر مجبوریوں کے باعث جنازے میں شامل نہ ہو سکے۔

اب اور کہنے کی ضرورت نہیں: سعادت حسن منٹو

یہ دنیا بھی عجیب و غریب ہے۔۔۔ خاص کر آج کا زمانہ۔۔۔ قانون کو جس طرح فریب دیا جاتا ہے، اس کے متعلق شاید آپ کو زیادہ علم نہ ہو۔ آج کل قانون ایک ہے معنی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ ادھر کوئی نیا قانون بنتا ہے، ادھر یار لوگ اس کا توڑ سوچ لیتے ہیں، اس کے علاوہ اپنے بچاؤ کی کئی صورتیں پیدا کر لیتے ہیں۔

کسی اخبار پر آفت آنی ہو تو آیا کرے، اس کا مالک محفوظ و مامون رہے گا، اس لیے کہ پرنٹ لائن میں کسی قصائی یاد ہو بی کا نام بحیثیت پر نظر پبلش اور ایڈیٹر کے درج ہو گا۔ اگر اخبار میں کوئی ایسی تحریر چھپ گئی جس پر گورنمنٹ کو اعتراض ہو تو اصل مالک کے بجائے وہ ہو بی یا قصائی گرفت میں آجائے گا۔ اس کو جرمانہ ہو گا قید۔ جرمانہ تو ظاہر ہے اخبار کا مالک ادا کر دے گا، مگر قید تو وہ ادا نہیں کر سکتا۔ لیکن ان دو پارٹیوں کے درمیان اس قسم کا معاهده ہوتا ہے کہ اگر قید ہوئی تو وہ اس کے گھر اتنے روپے ماہوار پہنچا دیا کرے گا۔ ایسے معاهدے میں خلاف ورزی بہت کم ہوتی ہے۔

جو لوگ ناجائز طور پر شراب بیچتے ہیں، ان کے پاس دو تین آدمی ایسے ضرور موجود ہوتے ہیں جن کا صرف یہ کام ہے کہ اگر پولیس چھاپے مارے تو وہ گرفتار ہو جائیں اور چند ماہ کی قید کاٹ کرو اپس آجائیں، اس کا معاوہ ان کو معقول مل جاتا ہے۔

چھاپے مارنے والے بھی پہلے ہی سے مطلع کر دیتے ہیں کہ ہم آرہے ہیں، تم اپنا انتظام کرلو۔۔۔ چنانچہ فوراً انتظام کر لیا جاتا ہے، یعنی مالک غائب غلہ ہو جاتا ہے اور وہ کرانے کے آدمی گرفتار ہو جاتے ہیں۔۔۔ یہ بھی ایک قسم کی ملازمت ہے لیکن دنیا میں جتنی ملازمتیں ہیں کچھ اسی قسم کی ہوتی ہیں۔

میں جب امین پہلوان سے ملا تو وہ تین مہینے کی قید کاٹ کرو اپس آیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا، ”امین! اس دفعہ کیسے جیل میں گئے؟“

امین مسکرا یا، ”اپنے کاروبار کے سلسلے میں۔“

”کیا کاروبار تھا؟“

”جور ہا، وہی ہے۔“

”بھی بتاؤ تو۔۔۔“

”باتنے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں مگر خواہ مخواہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔“

میں نے تھوڑے سے توقف کے بعد اس سے کہا، ”ایمن! تمہیں آئے دن جیل میں جانا کیا پسند ہے؟“

ایمن پہلوان مسکرا�ا، ”جناب۔۔۔ پسند اور ناپسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ لوگ مجھے پہلوان کہتے ہیں، حالانکہ میں نے آج تک اکھاڑے کی شکل نہیں دیکھی۔۔۔ ان پڑھ ہوں۔۔۔ کوئی اور ہنر بھی مجھے نہیں آتا۔۔۔ بس، جیل جانا آتا ہے۔۔۔ وہاں میں خوش رہتا ہوں۔۔۔ مجھے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔۔۔ آپ ہر روز دفتر جاتے ہیں۔۔۔ کیا وہ جیل نہیں۔۔۔“

میں لاجواب ہو گیا، ”تم ٹھیک کہتے ہو ایمن، لیکن دفتر جانے والوں کا معاملہ دوسرا ہے۔۔۔ لوگ انہیں بری نگاہوں سے نہیں دیکھتے۔“

”کیوں نہیں دیکھتے؟ ضلع کچھری کے جتنے منشی اور کلرک ہیں، انہیں کون اچھی نظر سے دیکھتا ہے۔۔۔ رشو تین لیتے ہیں۔۔۔ جھوٹ بولتے ہیں اور پر لے درجے کے مکار ہوتے ہیں۔۔۔ مجھ میں ایسا کوئی عیب نہیں۔۔۔ میں اپنی روزگی بڑی ایمان داری سے کرتا ہوں۔“

میں نے اس سے پوچھا، ”کس طرح؟“

اس نے جواب دیا، ”اس طرح کہ اگر کسی کا کام کرتا ہوں اور قید کا ثاہوں، جیل میں محنت مشقت کرتا ہوں اور بعد میں اس شخص سے جس کی خاطر میں نے سزا ہمگتی تھی، مجھے دو تین سور و پیہ ملتا ہے تو یہ میرا معاوضہ ہے، اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔۔۔ میں رشتہ تو نہیں لیتا۔۔۔ حلال کی کمائی کھاتا ہوں۔۔۔ لوگ مجھے غنڈا سمجھتے ہیں۔۔۔ بڑا خطرناک غنڈا۔۔۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے آج تک کسی کے تھپڑ بھی نہیں مارا۔۔۔ میری لائے ن بالکل الگ ہے۔“

اس کی لائے واقعی دوسروں سے الگ تھی۔۔۔ مجھے حیرت تھی کہ تین چار مرتبہ قید کا ٹنے کے باوجود اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ وہ بڑا سنجیدہ مگر گنوار فرم کا آدمی تھا جس کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ قید کا ٹنے کے بعد جب بھی آتا تو اس کا وزن کم از کم دس پاؤ نڈ زیادہ ہوتا۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا، ”میں! کیا وہاں کا کھانا تمہیں راس آتا ہے؟“

اس نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا، ”کھانا کیسا بھی ہو، اس کو اس کرنا آدمی کا اپنا کام ہے۔۔۔ مجھے دال سے نفرت تھی، لیکن جب پہلی مرتبہ مجھے وہاں نکلوں بھری دال دی گئی اور ریت ملی روٹی تو میں نے کہا۔۔۔ میں یار۔۔۔ یہ سب سے اچھا کھانا ہے، کھا، ڈنڑپیل اور خدا کا شکر بجالا۔ چنانچہ میں ایک دو روز ہی میں عادی ہو گیا۔۔۔ مشقت کرتا، کھانا کھاتا اور یوں محسوس کرتا جیسے میں نے گنجے کے ہوٹل سے پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے۔“

میں نے ایک دن اس سے پوچھا، ”تم نے کبھی کسی عورت سے بھی محبت کی ہے؟“

اس نے اپنے دونوں کان پکڑے، ”خدا بچائے اس محبت سے، مجھے صرف اپنی ماں سے محبت ہے۔“

میں نے اس سے پوچھا، ”تمہاری ماں زندہ ہے؟“

”جی ہاں۔۔۔ خدا کے فضل و کرم سے۔۔۔ بہت بوڑھی ہے، لیکن آپ کی دعا سے اس کا سایہ میرے سر پر دیر تک قائم رہے گا اور وہ توہر وقت میرے لیے دعائیں مانگتی رہتی ہے کہ خدا مجھے نیکی کی ہدایت کرے۔“

میں نے اس سے کہا، ”خدا تمہاری ماں کو سلامت رکھے! پر میں نے یہ پوچھا تھا کہ تمہیں کسی عورت سے محبت ہوئی یا نہیں دیکھو، جھوٹ نہیں بولنا۔“

میں پہلوان نے بڑے تیز لمحے میں کہا، ”میں نے اپنی زندگی میں آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا۔۔۔ میں نے کسی عورت سے محبت نہیں کی“

میں نے پوچھا، ”کیوں؟“

اس نے جواب دیا، ”اس لیے کہ مجھے اس سے دلچسپی ہی نہیں۔“

میں خاموش ہو رہا۔

تیرے روز اس کی ماں پر فانج گرا اور وہ راہی ملک عدم ہوتی۔ امین پہلوان کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ وہ سو گوار، مغموم اور دل شکستہ بیٹھا تھا کہ شہر کے ایک رئیس کی طرف سے اسے بلاوا آیا۔ وہ اپنی عزیز ماں کی میت چھوڑ کر اس کے پاس گیا اور اس سے پوچھا، کیوں میاں صاحب، آپ نے مجھے کیوں بلا�ا ہے؟“

میاں صاحب نے کہا، ”تمہیں کیوں بلا�ا جاتا ہے۔۔۔ ایک خاص کام ہے۔“

امین نے جس کے دل و دماغ میں اپنی ماں کا کفن دفن تیر رہا تھا، پوچھا، ”حضور یہ خاص کام کیا ہے؟“

میاں صاحب نے سکریٹ سلاگایا، ”بلیک مار کیٹ کا قصہ ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج میرے گودام پر چھاپ مارا جائے گا، سو میں نے سوچا کہ امین پہلوان بہترین آدمی ہے جو اسے نمائش کر سکتا ہے۔“

امین نے بڑے مغموم اور زخی انداز میں کہا، ”آپ فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”بھی، خدمت و دمت کی بات تم مت کرو۔۔۔ بس صرف اتنی سی بات ہے کہ جب چھاپ پڑے تو گودام کے مالک تم ہو گے۔ گرفتار ہو جاؤ گے۔ زیادہ سے زیادہ جرمانہ پانچ ہزار روپے ہو گا اور ایک دو برس کی قید!“

”مجھے کیا ملے گا؟“

”جب وہاں سے رہا ہو کر آؤ گے تو معاملہ طے کر لیا جائے گا۔“

امین نے میاں صاحب سے کہا، ”حضور، یہ بہت دور کی بات ہے، جرمانہ تو آپ ادا کر دیں گے، لیکن قید تو مجھے کاٹنی پڑے گی۔ آپ باقاعدہ سودا کریں۔“

میاں صاحب مسکرائے، ”تم سے آج تک میں نے کبھی وعدہ خلافی کی ہے۔۔۔ پچھلی دفعہ میں نے تم سے کام لیا اور تم کو تین مہینے کی قید ہوئی، تو کیا میں نے جیل خانے میں ہر قسم کی سہولت بہمنہ پہنچائی۔ تم نے باہر آ کر مجھ سے کہا کہ تمہیں وہاں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ اگر تم کچھ عرصے کے لیے جیل چلے گئے تو وہاں تمہیں ہر آسانی شہو گی۔“

امین نے کہا، ”جی۔۔۔ یہ سب درست ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا؟“

امین کی آنکھوں میں آنسو آگئے، ”میاں صاحب! میری ماں مر گئی ہے۔“

”کب؟“

”آج صح“

میاں صاحب نے افسوس کا اظہار کیا، ”کفناہ فنا دیا ہو گا۔“ امین کی آنکھوں میں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے، ”میاں صاحب! ابھی تو کچھ بھی نہیں ہو سکا۔۔۔ میرے پاس تو افیم کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں ہے۔“

میاں صاحب نے چند لمحات حالات پر غور کیا اور امین سے کہا، ”تو ایسا کرو۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ تختیز و تکفین کا بندوبست میں ابھی کیے دیتا ہوں۔۔۔ تمہیں کسی قسم کا تردد نہیں کرنا چاہیے۔۔۔ تم گودام پر جاؤ اور اپنی ڈیوٹی سنبھالو۔“

امین نے اپنی میلی قیص کی آستین سے آنسو پوٹھپے، ”لیکن میاں صاحب میں۔۔۔ میں اپنی ماں کے جنازے کو کندا بھی نہ دوں!“

میاں صاحب نے فلسفیانہ انداز میں کہا، ”یہ سب رسی چیزیں ہیں، مر حومہ کو دفاتا ہے، سو یہ کام بڑی اچھی طرح سے ہو جائے گا، تمہیں جنازے کے ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارے ساتھ جانے سے مر حومہ کو کیا راحت پہنچے گی۔۔۔ وہ تو بے چاری اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔۔۔ اس کے جنازے کے ساتھ کوئی بھی جائے۔۔۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ اصل میں تم لوگ جاہل ہو۔۔۔ میں اگر مر جاؤں تو مجھے کیا معلوم ہے کہ میرے جنازے میں کس کس عزیز اور دوست نے شرکت کی تھی۔ مجھے اگر جلا بھی دیا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میری لاش کو چیلوں اور گدھوں کے حوالے کر دیا جائے تو مجھے اس کی کیا خبر ہو گی۔ تم زیادہ جذباتی نہ ہو، دنیا میں سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ اپنی ذات کے متعلق سوچا جائے۔۔۔ میں پوچھتا ہوں، تمہاری کمائی کے ذرائع کیا ہیں؟“

امین سوچنے لگا۔ چند لمحات اپنی بساط کے مطابق غور کرنے کے بعد اس نے جواب دیا، ”حضور! میری کمائی کے ذرائع آپ کو معلوم ہیں، مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں۔“

”میں نے اس لیے پوچھا تھا کہ تمہیں میرا کام کرنے میں کیا جیل و جحت ہے۔ میں تمہاری ماں کی تجویز و تکفین کا ابھی بندوبست کیے دیتا ہوں اور جب تم جیل سے واپس آؤ گے تو۔۔۔“

امین پہلوان نے بڑے بینڈے انداز میں پوچھا، ”تو آپ میرا بھی بندوبست کر دیں گے؟“

میاں صاحب بوکھلا گئے، ”تم کیسی باتیں کرتے ہو امین پہلوان!“

امین پہلوان نے ذرا درشت لجھے میں کہا، ”امین پہلوان کی ایسی کی تیسی۔ آپ یہ بتائیے کہ مجھے کتنے روپے ملیں گے۔۔۔ میں ایک ہزار سے کم نہیں لوں گا۔“

”ایک ہزار تو بہت زیادہ ہیں۔“

امین نے کہا، ”زیادہ ہے یا کم۔۔۔ میں کچھ نہیں جانتا۔۔۔ میں جب قید کاٹ کر آؤں گا تو اپنی ماں کی قبر پختہ بناؤں گا، سنگ مرمر کی۔۔۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔“

میاں صاحب نے اس سے کہا، ”اچھا بھئی، ایک ہزار ہی لے لینا۔“ امین نے میاں صاحب سے کہا، ”تولائیے اتنے روپے دیجئے کہ میں کفن دفن کا انتظام کر لوں۔۔۔ اس کے بعد میں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔“

میاں صاحب نے اپنی جیب سے ٹوانکلا، ”لیکن تمہارا کیا بھروسہ ہے؟“

امین کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کو کسی نے ماں بہن کی گالی دی ہے، ”میاں صاحب! آپ مجھے بے ایمان سمجھتے ہیں۔۔۔ بے ایمان آپ ہیں۔۔۔ اس لیے کہ اپنے فعلوں کا بوجھ میرے سر پر ڈال رہے ہیں۔“

میاں صاحب موقع شناس تھے۔ انہوں نے سمجھا کہ امین بگڑ گیا ہے، چنانچہ انہوں نے فوراً اپنی چوب زبانی سے رام کرنے کی کوشش کی لیکن امین پر کوئی اثر نہ ہوا۔

جب وہ گھر پہنچا تو دیکھا کہ غشال اس کی ماں کو آخری عسل دے چکے ہیں۔ کفن بھی پہنایا جا چکا ہے۔۔۔ امین بہت متھیر ہوا کہ اس پر یہ مہربانی کس نے کی ہے۔۔۔ میاں صاحب نے۔۔۔ لیکن وہ تو سودا کرنا چاہتے تھے۔

اس نے ایک آدمی سے جو تابوت کو سمجھا کیلیے پھول گوندھ رہا تھا، پوچھا، ”یہ کس آدمی نے اتنا اہتمام کیا ہے؟“

پھول والے نے جواب دیا، ”حضور! آپ کی بیوی نے۔“

امین چکر آگیا۔۔۔ وہ اپنے شدید تجھ کا مظاہرہ کرتا مگر خاموش رہا۔ پھول والے سے صرف اتنا پوچھا، ”کہاں ہیں وہ؟“

پھول والے نے جواب دیا، ”جی اندر ہیں۔۔۔ آپ کا انتظار کر رہی تھیں۔۔۔“

امین اندر گیا۔۔۔ تو دیکھا کہ ایک نوجوان، خوبصورت لڑکی اس کی چارپائی پر بیٹھی ہے۔

ایمن نے اس سے پوچھا، ”آپ کون ہیں۔۔۔ یہاں کیوں آئی ہیں؟“

اس لڑکی نے جواب دیا، ”میں آپ کی بیوی ہوں، یہاں کیوں آئی ہوں، یہ آپ کا عجیب و غریب سوال ہے۔“

ایمن نے اس سے پوچھا، ”میری بیوی تو کوئی بھی نہیں۔ بتاؤ تم کون ہو۔“

لڑکی مسکرائی، ”میں۔۔۔ میاں۔۔۔ دین کی بیٹی ہوں۔۔۔ ان سے جو آپ کی گفتگو ہوئی، میں نے سب سنی۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔“

ایمن نے کہا، ”اب اور کہنے کی ضرورت نہیں۔۔۔“

-[15]-

انارکلی: سعادت حسن منشو

نام اس کا سلیم تھا مگر اس کے یار دوست اسے شہزادہ سلیم کہتے تھے۔ غالباً اس لیے کہ اس کے خدوخال مغلیٰ تھے۔ خوبصورت تھا۔ چال ڈھال سے رعنوت پکی تھی۔ اس کا باپ پی ڈبلیو ڈی کے دفتر میں ملازم تھا۔ تنواہ زیادہ سے زیادہ سور و پے ہو گی مگر بڑے ٹھاٹ سے رہتا۔ ظاہر ہے کہ رشوت کھاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سلیم اچھے سے اچھا کپڑا پہنتا، جیب خرچ بھی اس کو کافی ملتا اس لیے کہ وہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔

جب کانج میں تھاتو کئی لڑکیاں اس پر جان چھڑ کتیں تھیں۔۔۔ مگر وہ بے اعتنائی بر تنا۔ آخر اس کی آنکھ ایک شوخ و شنگ لڑکی جس کا نام سیما تھا، لڑکی۔ سلیم نے اس سے راہ و رسم پیدا کرنا چاہا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کا الفاظ حاصل کر لے گا۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ تو یہاں تک سمجھتا تھا کہ سیما اس کے قدموں پر گرپڑے گی اور اس کی ممنون و تنشکر ہو گی کہ اس نے محبت کی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

ایک دن کانج میں سلیم نے سیما سے پہلی بار مخاطب ہو کر کہا، ”آپ کتابوں کا اتنا بوجھ اٹھائے ہوئی ہیں۔۔۔ لایئے مجھے دے دیجیے۔۔۔ میرا تانگہ باہر موجود ہے آپ کو اور اس بوجھ کو آپ کے گھر تک پہنچا دوں گا۔“ سیما نے اپنی بھاری بھر کم کتابیں بغل میں دانتے ہوئے بڑے

خشک لبج میں جواب دیا، ”آپ کی مدد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ بہر حال شکریہ ادا کیے دیتی ہوں۔“ شہزادہ سلیم کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ پہنچا۔ چند لمحات کے لیے وہ اپنی خفت مٹا تا رہا۔ اس کے بعد اس نے سیما سے کہا، ”عورت کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ نے میری پیش کش کو کیوں ٹھکرایا؟“ سیما کا لہجہ اور زیادہ خشک ہو گیا، ”عورتوں کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہو گی۔۔۔ مگر فی الحال مجھے ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔۔۔ آپ کی پیشکش کا شکریہ میں ادا کر چکی ہوں۔۔۔ اس سے زیادہ آپ اور کیا چاہتے ہیں؟“

یہ کہہ کر سیما چل گئی۔ شہزادہ سلیم جوانار کلی کے خواب دیکھ رہا تھا، آنکھیں جھپکتا رہ گیا۔ اس نے بہت بڑی طرح شکست کھائی تھی۔ اس سے قبل اس کی زندگی میں کئی لڑکیاں آچکی تھیں جو اس کے ابرو کے اشارے پر چلتی تھیں۔۔۔ مگر یہ سیما کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خوبصورت ہے۔۔۔ جتنی لڑکیاں میں نے اب تک دیکھی ہیں ان میں سب سے زیادہ حسین ہے مگر مجھے ٹھکرا دینا۔۔۔ یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔۔۔ میں ضرور اس سے بدلہ لوں گا۔۔۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

شہزادہ سلیم نے اس سے بدلہ لینے کی کئی اسکیمیں بنائیں مگر بار آور ثابت نہ ہوئیں۔ اس نے یہاں تک سوچا کہ اس کی ناک کاٹ ڈالے۔ یہ وہ جرم کر بیٹھتا مگر اسے سیما کے چہرے پر یہ ناک بہت پسند تھی۔ کوئی بڑے سے بڑا مصور بھی ایسی ناک کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ سلیم تو اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوا۔ مگر تقدیر نے اس کی مدد کی۔ اس کی والدہ نے اس کے لیے رشتہ ڈھونڈنا شروع کیا۔ نگاہ انتخاب آخر سیما پر پڑی جو اس کی سیپیلی کی لڑکی تھی۔ بات کپی ہو گئی، مگر سلیم نے انکار کر دیا۔ اس پر اس کے والدین بہت ناراض ہوئے۔ گھر میں دس بارہ روز تک ہنگامہ مچا رہا۔ سلیم کے والدزراحت طبیعت کے تھے، انہوں نے اس سے کہا، ”دیکھو تمھیں ہمارا فیصلہ قبول کرنا ہو گا۔“ سلیم ہٹ دھرم تھا۔ جواب میں یہ کہا، ”آپ کا فیصلہ کوئی ہائی کورٹ کا فیصلہ نہیں۔۔۔ پھر میں نے کیا جرم کیا ہے جس کا آپ فیصلہ سنارہے ہیں۔“

اس کے والدین کو یہ سن کر طیش آگیا، ”تمہارا جرم کہ تم ناخلف ہو۔۔۔ اپنے والدین کا کہنا نہیں مانتے۔ عدول حکمی کرتے ہو، میں تمھیں عاق کر دوں گا۔“ سلیم کا جوش ٹھنڈا ہو گیا، ”لیکن اباجان، میری شادی مرضی کے مطابق ہونی چاہیے۔“

” بتاؤ، تمہاری مرضی کیا ہے؟“

”اگر آپ ٹھنڈے دل سے سنیں تو میں عرض کروں۔“

”میر ادل کافی ٹھنڈا ہے۔۔۔ تمھیں جو کچھ کہنا ہے فوراً گہہ ڈالو۔۔۔ میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔“

سلیم نے رک کے کہا، ”مجھے۔۔۔ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہے۔“

اس کا باپ گر جا، ”کس لڑکی سے؟“

سلیم تھوڑی دیر ہچکچایا، ”ایک لڑکی ہے۔“

”کون ہے وہ۔۔۔ کیا نام ہے اس کا؟“

”سیما۔۔۔ میرے ساتھ کانج میں پڑھتی تھی۔“

”میاں افتخار الدین کی لڑکی؟“

جی ہاں، ”اس کا نام سیما افتخار ہے۔۔۔ میر انحصار ہے وہی ہے۔“

اس کے والد بے تحاشہ ہنسنے لگے، ”خیال کے بچے۔۔۔ تمہاری شادی اسی لڑکی سے قرار پائی ہے۔۔۔ کیا وہ تمھیں پسند کرتی ہے؟“ سلیم بو کھلاسا گیا۔۔۔ یہ سلسلہ کیسے ہو گیا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہیں اس کا باپ جھوٹ تو نہیں بول رہا تھا۔۔۔ سلیم سے جو سوال کیا گیا تھا اس کا جواب اس کے والد کو نہیں ملا تھا، چنانچہ انھوں نے کڑک کے پوچھا، ”سلیم مجھے بتاؤ کیا سیما تمھیں پسند کرتی ہے؟“

سلیم نے کہا، ”جی نہیں۔“

”تم نے یہ کیسے جانا؟“

”اس سے۔۔۔ اس سے ایک بار میں نے مختصر الفاظ میں۔۔۔ محبت کا اظہار کیا۔۔۔ لیکن اس نے مجھے۔۔۔“

”تمھیں درخور اعتنا نہ سمجھا۔“

”جی ہاں۔۔۔ بڑی بے رخی بر تی۔“

سلیم کے والد نے اپنے گنجے سر کو تھوڑی دیر کے لیے کھجلایا اور کہا، ”تو پھر یہ رشته نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ میں تمہاری ماں سے کہتا ہوں کہ وہ لڑکی والوں سے کہہ دے کے لڑکار ضامن نہیں۔“ سلیم ایک دم جذبائی ہو گیا۔ ”نہیں ابا جان۔۔۔ ایسا نہ کیجیے گا، شادی ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا، میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اور کسی کی محبت اکارت نہیں جاتی۔۔۔ لیکن آپ ان لوگوں کو۔۔۔ میر امطلب ہے سیما کو یہ پتھنہ لگنے دیجیے کہ اس کا بیاہ مجھ سے ہو رہا ہے جس سے وہ بے رخی اور بے اعتنائی کا اظہار کر چکی ہے۔“ اس کے باپ نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا، ”میں اس کے متعلق سوچوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ انھیں ایک ٹھیکیدار سے رشوت و صول کرنا تھی اپنے بیٹے کی شادی کے اخراجات کے سلسلے میں۔ شہزادہ سلیم جب رات کو پلنگ پرسونے کے لیے لیٹا تو اسے انار کی کلیاں ہی کلیاں نظر آئیں ساری رات وہ ان کے خواب دیکھتا رہا۔

گھوڑے پر سوار باغ میں آیا ہے۔۔۔ شاہانہ لباس پہنے۔ اسپ تازی سے اتز کرباغ کی ایک روشن پر جا رہا ہے۔۔۔ کیا دیکھتا ہے کہ سیما انار کے بوٹے کی سب سے اوپری شاخ سے ایک نو خیز کلی توڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔۔۔ اس کی بھاری بھر کم کتابیں زمین پر بکھری پڑی ہیں۔۔۔ زلفیں الجھی ہوئی ہیں اور وہ اچک اچک کراس شاخ تک اپنا ہاتھ پہنچانے کی کوشش کر رہی ہے مگر ہر بار ناکام رہتی ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھا، انار کی جھاڑی کے پیچے چھپ کر اس نے اس شاخ کو کپڑا اور جھکا دیا۔ سیما نے وہ کلی توڑی جس کے لیے وہ اتنی کوشش کر رہی تھی۔۔۔ لیکن فوراً اس بات کا احساس ہوا کہ وہ شاخ نیچے کیسے جھک گئی۔

وہ ابھی یہ سوچ رہی تھی کہ شہزادہ سلیم اس کے پاس پہنچ گیا۔ سیما گھبرائی لیکن سنجدل کر اس نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور بغل میں داب لیں، انار کلی اپنے جوڑے میں اڑس لی اور یہ خشک الفاظ کہہ کر وہاں سے چلی گئی، ”آپ کی امداد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ بہر حال شکر یہ ادا کیے دیتی ہوں۔“ تمام رات وہ اسی قسم کے خواب دیکھتا رہا۔ سیما، اس کی بھاری بھر کم کتابیں، انار کی کلیاں اور شادی کی دھوم دھام۔ شادی ہو گئی۔ شہزادہ سلیم اس تقریب پر اپنی انار کلی کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ پایا تھا۔ وہ اس لمحے کے لیے ترپ رہا تھا جب سیما اس کی آنکھ میں ہو گئی۔ وہ اس کے اتنے پیارے گا کہ وہ تنگ آکر رونا شروع کر دے گی۔

سلیم کو رونے والی لڑکیاں بہت پسند تھیں۔ اس کا یہ فلسفہ تھا کہ عورت جب رورہی ہو تو بہت حسین ہو جاتی ہے۔ اس کے آنسو شبنم کے قطروں کے مانند ہوتے ہیں جو مرد کے جذبات کے پھولوں پر نکلتے ہیں جن سے اسے ایسی راحت، ایسی فرحت ملتی ہے جو اور کسی وقت نصیب نہیں ہو سکتی۔

رات کے دس بجے دو لہن کو جملہ عروسی میں داخل کر دیا گیا۔ سلیم کو بھی اجازت مل گئی کہ وہ اس کمرے میں جاسکتا ہے۔ لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ اور سم ور سوم سب ختم ہو گئی تھیں۔ وہ کمرے کے اندر داخل ہوا۔ پھولوں سے سبھی ہوئی مسہری پر دو لہن گھو نگھٹ کاڑھے ریشم کی گھٹھری سی بنی بیٹھی تھی۔ شہزادہ سلیم نے خاص اہتمام کر لیا تھا کہ پھول، انار کی کلیاں ہوں۔۔۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ مسہری کی طرف بڑھا اور دو لہن کے پاس بیٹھ گیا۔ کافی دیر تک وہ اپنی بیوی سے کوئی بات نہ کر سکا۔۔۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کی بغل میں کتابیں ہوں گی جن کو وہ اٹھانے نہیں دے سکے۔ آخر اس نے بڑی جرأت سے کام لیا اور اسے کہا، ”سیما۔۔۔“

یہ نام لیتے ہی اس کی زبان خشک ہو گئی لیکن اس نے پھر جرأت فراہم کی اور اپنی دو لہن کے چہرے سے گھو نگھٹ اٹھایا اور بھو نچکارہ گیا۔۔۔
یہ سیما نہیں تھی۔۔۔ کوئی اور ہی لڑکی تھی۔۔۔ انار کی ساری کلیاں اس کو ایسا محسوس ہوا کہ مر جھائی ہیں

-[16]-

وہ لڑکی: سعادت حسن منٹو

سو اچار نج کچے تھے لیکن دھوپ میں وہی تمازت تھی جو دو پھر کو بارہ بجے کے قریب تھی۔ اس نے بالکل میں آکر باہر دیکھا تو اسے ایک لڑکی نظر آئی جو بظاہر دھوپ سے بچنے کے لیے ایک سایہ دار درخت کی چھاؤں میں آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔

اس کا رنگ گہر اسانوا ل تھا، اتنا سانوا ل کہ وہ درخت کی چھاؤں کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔ سریندر نے جب اس کو دیکھا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کی قربت چاہتا ہے، حالانکہ وہ اس موسم میں کسی کی قربت کی بھی خواہش نہ کر سکتا تھا۔ موسم بہت واهیات قسم کا تھا۔ سوا اچار نج کچے تھے۔ سورج غروب ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا لیکن موسم نہایت ذلیل تھا۔ پسینہ تھا کہ چھوٹا جاہر رہا تھا۔ خدا معلوم کہاں سے مساموں کے ذریعے اتنا پانی نکل رہا تھا۔ سریندر نے کئی مرتبہ غور کیا تھا کہ پانی اس نے زیادہ چار گھنٹوں میں صرف ایک گلاس پیا ہو گا مگر پسینہ بلا مبالغہ چار گلاس نکلا ہو گا۔ آخر یہ کہاں سے آیا!

جب اس نے لڑکی کو درخت کی چھاؤں میں آلتی پالتی مارے دیکھا تو اس نے سوچا کہ دنیا میں سب سے خوش یہی ہے جسے دھوپ کی پرواہ ہے نہ موسم کی۔

سریندر پسینے میں لٹ پت تھا۔ اس کی بنیان اس کے جسم کے ساتھ بہت بڑی طرح چھٹی ہوئی تھی۔ وہ کچھ اس طرح محسوس کر رہا تھا جیسے اس کے بدن پر کسی نے موبائل آئی مل دیا ہے لیکن اس کے باوجود جب اس نے درخت کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا تو اس کے جسم میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس کے پسینے کے ساتھ گھل مل جائے، اس کے مساموں کے اندر داخل ہو جائے۔

آسمان خاکستری تھا۔ کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ بادل بین یا محض گرد و غبار۔ بہر حال، اس گرد و غبار یا بادلوں کے باوجود دھوپ کی جھلک موجود تھی اور وہ لڑکی بڑے اطمینان سے پیپل کی چھاؤں میں بیٹھی ستارہ ہی تھی۔

سریندر نے اب کی غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ گہر انسانوں مگر نقش بہت تنکھے کہ وہ سریندر کی آنکھوں میں کئی مرتبہ چھپے۔ مزدور پیشہ لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بھکارن ہو۔ لیکن سریندر اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ اصل میں وہ یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ آیا اس لڑکی کو اشارہ کرنا چاہیے یا نہیں۔

گھر میں وہ بالکل اکیلا تھا۔ اس کی بہن مری میں تھی۔ ماں بھی اس کے ساتھ تھی۔ باپ مر چکا تھا۔ ایک بھائی، اس سے چھوٹا، وہ بورڈنگ میں رہتا تھا۔ سریندر کی عمر تاسیس اٹھائیں سال کے قریب تھی۔ اس سے قبل وہ اپنی دوادھی عمر کی نوکرائیوں سے دو تین مرتبہ سلسلہ لڑاچکا تھا۔

معلوم نہیں کیوں، لیکن موسم کی خرابی کے باوجود سریندر کے دل میں یہ خواہش ہو رہی تھی کہ وہ پیپل کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی لڑکی کے پاس جائے یا اسے اوپر رہی سے اشارہ کرے تاکہ وہ اس کے پاس آجائے، اور وہ دونوں ایک دوسرے کے پسینے میں غوطہ لگائیں اور کسی نامعلوم جزیرے میں پہنچ جائیں۔

سریندر نے بالکنی کے کٹھرے کے پاس کھڑے ہو کر زور سے کھکارا مگر لڑکی متوجہ نہ ہوئی۔ سریندر نے جب کئی مرتبہ ایسا کیا اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو اس نے آواز دی، ”ارے بھئی۔۔۔ ذرا دھر دیکھو!“ مگر لڑکی نے پھر بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ وہ اپنی پنڈلی کھجلاتی

رہی۔ سریندر کو بہت لمحن ہوئی۔ اگر لڑکی کی بجائے کوئی کتاب ہوتا تو وہ یقیناً اس کی آواز سن کر اس کی طرف دیکھتا۔ اگر اسے اس کی یہ آواز ناپسند ہوتی تو جو نکتا مگر اس لڑکی نے جیسے اس کی آواز سنی ہی نہیں تھی۔ اگر سنی تھی تو ان سنی کر دی تھی۔

سریندر دل ہی دل میں بہت خفیف ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بار بلند آواز میں اس لڑکی کو پکارا، ”اے لڑکی!“

لڑکی نے پھر بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ جھنگلا کر اس نے اپنا ممل کا کرتا پہنچا اور نیچے اترنا۔ جب اس لڑکی کے پاس پہنچا تو وہ اسی طرح اپنی پنڈلی کھجلاتی تھی۔ سریندر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ لڑکی نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور شلوار نیچی کر کے اپنی پنڈلی ڈھانپ لی۔

سریندر نے اس سے پوچھا، ”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

لڑکی نے جواب دیا، ”بیٹھی ہوں“

”کیوں بیٹھی ہو؟“

لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی، ”لو، اب کھڑی ہو گئی ہوں!“

سریندر بوكھلا گیا، ”اس سے کیا ہوتا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ تم اتنی دیر سے یہاں بیٹھی کیا کر رہی تھیں؟“

لڑکی کا چہرہ اور زیادہ سنولا ہو گیا، ”تم چاہتے کیا ہو؟“

سریندر نے تھوڑی دیر اپنے دل کو ٹھوڑا، ”میں کیا چاہتا ہوں۔۔۔ میں کچھ نہیں چاہتا۔۔۔ میں گھر میں آکیلا ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ چلو تو بڑی مہربانی ہو گی۔“

لڑکی کے گھرے سانو لے ہونٹوں پر عجیب و غریب قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی، ”مہربانی۔۔۔ کاہے کی مہربانی۔۔۔ چلو!“

اور دونوں چل دیے۔

جب اوپر پہنچے تو لڑکی صوف کی بجائے فرش پر بیٹھ گئی اور اپنی پنڈلی کھلانے لگی۔ سریندر اس کے پاس کھڑا سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ خوبصورت نہیں تھی لیکن اس میں وہ تمام تو سیں اور وہ تمام خطوط موجود تھے جو ایک جوان لڑکی میں موجود ہوتے ہیں۔ اس کے کپڑے میلے تھے، لیکن اس کے باوجود اس کا مضبوط جسم اس کے باہر جھانک رہا تھا۔

سریندر نے اس سے کہا، ”یہاں کیوں بیٹھی ہو۔۔۔ ادھر صوف پر بیٹھ جاؤ!“

لڑکی نے جواب میں صرف اس قدر کہا، ”نہیں!“

سریندر اس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا، ”تمہاری مرضی۔۔۔ لواب یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور درخت کے نیچے تم اتنی دیر سے کیوں بیٹھی تھیں؟“

”میں کون ہوں اور درخت کے نیچے میں کیوں بیٹھی تھی۔۔۔ اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں۔“ لڑکی نے یہ کہہ کر اپنی شلوار کا پانچھ نیچے کر لیا اور پنڈلی کھلانا بند کر دی۔

سریندر اس وقت اس لڑکی کی جوانی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ اس کا اور ان دوادھی عمر کی نوکر انیوں کا مقابلہ کر رہا تھا جن سے اس کا دو تین مرتبہ سلسلہ ہو چکا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کے مقابلے میں ڈھیلی ڈھالی تھیں، جیسے برسوں کی استعمال کی ہوئی سائیکلیں۔ لیکن اس کا ہر پر زہ اپنی جگہ پر کسما ہوا تھا۔

سریندر نے ان دوادھی عمر کی نوکر انیوں سے اپنی طرف سے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ خود اس کو کھینچ کر اپنی کوٹھریوں میں لے جاتی تھیں مگر سریندر اب محسوس کرتا تھا کہ یہ سلسلہ اس کواب خود کرنا پڑے گا، حالانکہ اس کی تکنیک سے قطعاً اوقاف تھا۔ بہر حال۔ اس نے اپنے ایک بازو کو تیار کیا اور اسے لڑکی کی کمر میں حمل کر دیا۔

لڑکی نے ایک زور کا جھٹکا دیا، ”یہ کیا کر رہے ہو تم؟“

سریندر ایک بار پھر بوکھلا گیا، ”میں--- میں--- کچھ بھی نہیں۔“

لڑکی کے گھر سے سانو لے ہونٹوں پر عجیب قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی، ”آرام سے بیٹھے رہو!“

سریندر آرام سے بیٹھ گیا۔ مگر اس کے سینے میں ہلچل اور زیادہ بڑھ گئی۔ چنانچہ اس نے ہمت سے کام لے کر لڑکی کو کپڑ کر اپنے سینے کے ساتھ بھیجنے لیا۔ لڑکی نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، مگر سریندر کی گرفت مجبو طبقتی۔ وہ فرش پر چلت گرپڑی۔ سریندر اس کے اوپر تھا۔ اس نے دھڑادھڑ اس کے گھر سے سانو لے ہونٹ چومنے شروع کر دیے۔ لڑکی بے بس تھی۔ سریندر کا بوجھ اتنا تھا کہ وہ اسے اٹھا کر سمجھنک نہیں سکتی تھی۔ بوجھ مجبوری وہ اس کے گلے بوسے برداشت کرتی رہی۔ سریندر نے سمجھا کہ وہ رام ہو گئی ہے، چنانچہ اس نے مزید درازدستی شروع کی۔ اس کی قیص کے اندر راتھ ڈالا۔ وہ خاموش رہی۔ اس نے ہاتھ پاؤں چلانے بند کر دیے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے مدافعت کو اب فضول سمجھا ہے۔

سریندر کو اب یقین ہو گیا کہ میدان اسی کے ہاتھ رہے گا، چنانچہ اس نے درازدستی چھوڑ دی اور اس سے کہا، ”چلو آؤ، پلنگ پر لیٹتے ہیں۔“ لڑکی اٹھی اور اس کے ساتھ چل دی۔ دونوں پلنگ پر لیٹ گئے۔ ساتھ ہی تپائی پر ایک طشتری میں چند مالٹے اور ایک تیز چھری پڑی تھی۔ لڑکی نے ایک مالٹا اٹھایا اور سریندر سے پوچھا، ”میں کھالوں؟“

”ہاں ہاں--- ایک نہیں سب کھالو!“

سریندر نے چھری اٹھائی اور مالٹا چھیلنے لگا، مگر لڑکی نے اس سے دونوں چیزیں لے لیں۔

”میں خود چھیلوں گی!“

اس نے بڑی نفاست سے مالٹا چھیلا۔ اس کے چھلکے اتارے۔ چھانکوں پر سے سفید سفید جھلی ہٹائی۔ پھر چھانکیں علیحدہ کیں۔ ایک چھانک سریندر کو دی، دوسری اپنے منہ میں ڈالی اور مزہ لیتے ہوئے پوچھا، ”تمہارے پاس پستول ہے؟“

سریندر نے جواب دیا، ”ہاں--- تمہیں کیا کرنا ہے؟“

لڑکی کے گھرے سانو لے ہونٹوں پر پھر وہی عجیب و غریب مسکراہٹ نمودار ہوئی، ”میں نے ایسے ہی پوچھا تھا۔۔۔ تم جانتے ہو ناکہ آج کل ہندو مسلم فساد ہو رہے ہیں۔“

سریندر نے دوسرا مالٹشتری میں سے اٹھایا، ”آج سے ہورہے ہیں۔۔۔ بہت دنوں سے ہورہے ہیں۔۔۔ میں اپنے پستول سے چار مسلمان مار چکا ہوں۔۔۔ بڑے خونی قسم کے!“

”سچ؟“ یہ کہہ کر لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”مجھے ذرا وہ پستول تود کھانا!“

سریندر اٹھا۔ دوسرے کمرے میں جا کر اس نے اپنے میز کا دراز کھولا اور پستول لے کر باہر آیا، ”یہ لو۔۔۔ لیکن ٹھہرو!“ اور اس نے پستول کا سیفی کچھ ٹھیک کر دیا کیوں کہ اس میں گولیاں بھری تھیں۔ لڑکی نے پستول پکڑا اور سریندر سے کہا، ”میں بھی آج ایک مسلمان ماروں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے سیفی کچھ کو ایک طرف کیا اور سریندر پر پستول داغ دیا۔۔۔ وہ فرش پر گرپڑا اور جان کنی کی حالت میں کراہنے لگا، ”تم نے کیا کیا؟“

لڑکی کے گھرے سانو لے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی، ”وہ چار مسلمان جو تم نے مارے تھے، ان میں میرا باب پ بھی تھا!“

-[17]-

ایک خط: سعادت حسن منشو

تمہارا طویل خط ملا جسے میں نے دو مرتبہ پڑھا۔ دفتر میں اس کے ایک ایک لفظ پر میں نے غور کیا۔ اور غالباً اسی وجہ سے اس روز مجھے رات کے دس بجے تک کام کرنا پڑا، اس لیے کہ میں نے بہت سا وقت اس غورو فکر میں ضائعاً کر دیا تھا۔ تم جانتے ہو اس سرمایہ پرست دنیا میں اگر مزدور مقررہ وقت کے ایک ایک لمحے کے عوض اپنی جان کے ٹکڑے تول کرنہ دے تو اسے اپنے کام کی اجرت نہیں مل سکتی۔ لیکن یہ رونے سے کیا فائدہ!

شام کو عزیز صاحب، جن کے یہاں میں آج کل مٹھر ہوں، دفتر میں تشریف لائے اور کمرے کی چاپیاں دے کر کہنے لگے، ”میں ذرا کام سے کہیں جا رہا ہوں۔ شاید دیر میں آنا ہو۔ اس لیے تم میرا انتظار کیے بغیر چلے جانا۔“ لیکن پھر فوراً ہی چاپیاں جیب میں ڈالیں اور فرمانے لگے، ””نہیں، تم میرا انتظار کرنا، میں دس بجے تک واپس آ جاؤں گا۔“

دفتری کام سے فارغ ہوا تو دس نجح پکے تھے۔ سخت نیند آ رہی تھی۔ آنکھوں میں بڑی پیاری گدگدی ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ رسی پر ہی سو جاؤں۔ نیند کے غلبے کے اثر میں میں نے گلیارہ بجے تک عزیز صاحب کا انتظار کیا مگر وہ نہ آئے۔ آخر کار تھک کر میں نے گھر کی راہ لی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ادھر ہی ادھر گھر چلے گئے ہوں گے اور آرام سے سور ہے ہوں گے۔ آہستہ آہستہ نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں تیسری منزل پر چڑھا اور جب اندر ہیرے میں دروازے کی کنڈی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو آہنی تالے کی ٹھنڈک نے مجھے بتایا کہ عزیز صاحب ابھی تشریف نہیں لائے۔

سیڑھیاں چڑھتے وقت میرے تھک ہوئے اعضا سکون بخش نیند کی قربت محسوس کر کے اور بھی ڈھیلے ہو گئے، اور جب مجھے ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا تو مصلح ہو گئے۔ دیر تک چوبی زینے کی ایک سیڑھی پر سرزاؤں میں دبائے عزیز صاحب کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئے۔ آخر کار تھک ہار کر میں اٹھا اور تین منزلیں اتر کر نیچے بازار میں آیا اور ایسے ہی ٹھلانا شروع کر دیا۔ ٹھلتے ٹھلتے پل پر جانکلا جس کے نیچے سے ریل گاڑیاں گزرتی ہیں۔ اسی پل کے پاس ہی ایک بڑا چوک ہے۔

یہاں تقریباً آدھ گھنٹے تک میں بھلی کے ایک کھبے کے ساتھ گل کر کھڑا رہا اور سامنے نیم روشن بازار کو اس امید پر دیکھتا رہا کہ عزیز صاحب گھر کی جانب لوٹنے نظر آ جائیں گے۔ آدھ گھنٹے کے اس انتظار کے بعد میں نے دفعتاً سراٹھا کر کھبے کے اوپر دیکھا، بھلی کا قسمہ میری ہنسی اڑا رہا تھا۔ جانے کیوں!

تھکاوت اور نیند کے شدید غلبے کے باعث میری کمر ٹوٹ رہی تھی اور میں چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاؤں۔ بند دوانوں کے تھڑے مجھے نشست پیش کر رہے تھے مگر میں نے ان کی دعوت قبول نہ کی۔ چلتا چلتا پل کی سنگین منڈیر پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

کشادہ بازار بالکل خاموش تھا۔ آمدوفت قریب قریب بند تھی، البتہ کبھی کبھی دور سے موڑ کے ہارن کی رومنی آواز خاموش فضائیں لرزش پیدا کرتی ہوئی اوپر کی طرف اڑ جاتی تھی۔ میرے سامنے سڑک کے دورویہ بھلی کے بلند کھبے دور تک پھیلے چلے گئے تھے جو نیند اور اس کے

احساس سے عاری معلوم ہوتے تھے۔ ان کو دیکھ کر مجھے روس کے مشہور شاعر میا تلف کی نظم کے چند اشعار یاد آگئے۔ یہ نظم چرا غہائے سر راہ سے معنوں کی گئی ہے۔

میا تلف، سڑک کے کنارے جملماقی روشنیوں کو دیکھ کر کہتا ہے

یہ نئھے چرا غ، یہ نئھے سردار
صرف اپنے لیے چکتے ہیں
جو کچھ یہ دیکھتے ہیں، جو کچھ یہ سنتے ہیں
کسی کو نہیں بتاتے

روسی شاعر نے کچھ درست ہی کہا ہے۔۔۔ میرے پاس ہی ایک گز کے فاصلے پر بھلی کا کھبما گڑا تھا اور اس کے اوپر بھلی کا ایک شون چشم قائمہ ینچے جھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں روشن تھیں مگر وہ میرے سینے کے تلاطم سے بے خبر تھا۔ اسے کیا معلوم مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔

سکریٹ سلاگانے کے لیے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو تمہارے وزنی لفافے پر پڑا۔ ذہن میں تمہارا خط پہلے ہی سے موجود تھا۔ چنانچہ میں نے لفافہ کھول کر بستنی رنگ کے کاغذ نکال کر انھیں پڑھنا شروع کیا۔ تم لکھتے ہو، ”کبھی تم شیطان بن جاتے ہو اور کبھی فرشتہ نظر آنے لگتے ہو۔“ یہاں بھی دو تین حضرات نے میرے متعلق یہی رائے قائم کی ہے اور مجھے یقین سا ہو گیا ہے کہ میں واقعی دوسرے توں کا مالک ہوں۔ اس پر میں نے اچھی طرح غور کیا ہے اور جو نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ کچھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

بچپن اور لڑکپن میں میں نے جو کچھ چاہا، وہ پورا نہ ہونے دیا گیا، یوں کہو کہ میری خواہشات کچھ اس طرح پوری کی گئیں کہ ان کی تکمیل میرے آنسوؤں اور میری ہیچکیوں سے لپٹی ہوئی تھی۔ میں شروع ہی سے جلد باز اور زور دنخ رہا ہوں۔ اگر میرا بھی کسی مٹھائی کھانے کو چاہا ہے اور یہ چاہ عین وقت پر پوری نہیں ہوئی تو بعد میں میرے لیے اس خاص مٹھائی میں کوئی لذت نہیں رہی۔ ان امور کی وجہ سے میں نے ہمیشہ اپنے حلق میں ایک تنی سی محسوس کی ہے اور اس تنی کی شدت بڑھانے میں اس افسوس ناک حقیقت کا ہاتھ ہے کہ میں نے جس سے محبت کی، جس کو اپنے دل میں جگہ دی، اس نے صرف میرے جذبات کو مجرد کیا بلکہ میری اس کمزوری ”محبت“ سے زبردستی ناجائز فائدہ بھی اٹھایا۔ وہ مجھ سے دغافریب کرتے رہے، اور لطف یہ ہے کہ میں ان تمام دغابازیوں کے احساس کے باوجود ان سے محبت کرتا رہا۔

مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اپنی ہر نئی چال کی کامیابی پر بہت مسرور ہوتے تھے کہ انہوں نے مجھے بے وقوف بنالیا اور میری بے وقوف دیکھو کہ میں سب کچھ جانتے ہوئے بے وقوف بن جاتا تھا۔

جب اس ضمن میں مجھے ہر طرف سے نامیدی ہوئی، یعنی جس کسی کو میں نے دل سے چاہا، اس نے میرے ساتھ دھوکا کیا تو میری طبیعت بھگئی اور میں نے محسوس کیا کہ ریگستان میں ایک بھونزے کے مانند ہوں، جسے رس چونے کے لیے حد نظر تک کوئی پھول نظر نہیں آ سکتا لیکن اس کے باوجود محبت کرنے سے بازنہ رہا اور حسبِ معمول کسی نے بھی میرے اس جذبے کی قدر نہ کی۔ جب پانی سر سے گزر گیا اور مجھے اپنے نام نہاد دوستوں کی بے وفائیاں اور سرد مہریاں یاد آنے لگیں تو میرے سینے کے اندر ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ میرے جذباتی، سرمدی اور ناطق وجود میں ایک جنگ سی چھڑگئی۔

ناطق وجود ان لوگوں کو ملعون و مطعون گردانتے ہوئے اور گزشتہ واقعات کی افسوس ناک تصویر دکھاتے ہوئے اس بات کا طالب تھا کہ میں آئندہ سے اپنادل پتھر کا بنا لوں اور محبت کو بیشہ کے لیے باہر نکال پھینکوں، لیکن جذباتی وجود ان افسوسناک واقعات کو دوسرے رنگ میں پیش کرتے ہوئے مجھے فخر کرنے پر مجبور کرتا تھا کہ میں نے زندگی کا صحیح راستہ اختیار کیا ہے۔ اس کی نظر میں ناکامیاں ہی کامیابیاں تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ میں محبت کیے جاؤں کہ یہی کائنات کی روی رواں ہے۔ تحت الشعور وجود اس جھگڑے سے میں بالکل الگ تھلگ رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ایک نہایت ہی عجیب و غریب نیند کا غلبہ طاری ہے۔

یہ جنگ خدا جانے کس نامبار ک روز شروع ہوئی کہ اب میری زندگی کا ایک جزو بن کے رہ گئی ہے۔ دن ہو یارات، جب کبھی مجھے فرصت کے چند لمحات میر آتے ہیں، میرے سینے کے چھیل میدان پر میر اناطق وجود اور جذباتی وجود ہتھیار باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان لمحات میں جب ان دونوں کے درمیان لڑائی زوروں پر ہو، اگر میرے ساتھ کوئی ہم کلام ہو تو میر الہجہ یقیناً کچھ اور قسم کا ہوتا ہے۔ میرے حلق میں ایک ناقابل بیان تنخی گھل رہی ہوتی ہے۔

آنکھیں گرم ہوتی ہیں اور جسم کا ایک ایک عضو بے کل ہوتا ہے۔ میں بہت کوشش کیا کرتا ہوں کہ اپنے لہجے کو درشت نہ ہونے دوں، اور بعض اوقات میں اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتا ہوں۔ لیکن اگر میرے کانوں کو کوئی چیز سنائی دے یا میں کوئی ایسی چیز محسوس کروں جو میری طبیعت کے یکسر خلاف ہے تو پھر میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میرے سینے کی گہرائیوں سے جو کچھ بھی اٹھے، زبان کے راستے باہر نکل جاتا ہے۔ اور اکثر اوقات جو الفاظ بھی ایسے موقع پر میری زبان پر آتے ہیں، بے حد تلنخ ہوتے ہیں۔ ان کی تنخی اور درشتی کا احساس مجھے اس وقت کبھی نہیں ہوا۔

اس لیے کہ میں اپنے اخلاص سے ہمیشہ اور ہر وقت باخبر رہتا ہوں اور مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں کبھی کسی کو دکھ نہیں پہنچا سکتا۔ اگر میں نے اپنے ملنے والوں میں سے یا کسی دوست کو ناخوش کیا ہے تو اس کا باعث میں نہیں ہوں بلکہ یہ خاص لمحات ہیں جب میں دیوانے سے کم نہیں ہوتا یا تمہارے الفاظ میں ”شیطان“ ہوتا ہوں، گویہ لفظ بہت سخت ہے اور اس کا اطلاق میری دیوانگی پر نہیں ہو سکتا۔

جب تمہارا پچھلے سے پچھلا خط موصول ہوا تھا، اس وقت میرا ناطق وجود جذباتی وجود پر غالب تھا اور میں اپنے دل کے نرم و نازک گوشت کو پتھر میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں پہلے ہی سے اپنے سینے کی آگ میں پھنکا جا رہا تھا کہ اوپر سے تمہارے خط نے تیل ڈال دیا۔

تم نے بالکل درست کہا ہے، ”تم درد مند دل رکھتے ہو، گواں کو اچھائیوں نہیں سمجھتے۔“ میں اس کو اچھائیوں نہیں سمجھتا۔۔۔ اس سوال کا جواب ہندوستان کا موجودہ انسانیت کش نظام ہے جس میں لوگوں کی جوانی پر بڑھاپے کی مہر ثبت کر دی جاتی ہے۔

میرا دل درد سے بھرا ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ میں علیل ہوں اور علیل رہتا ہوں۔ جب تک درد مندی میرے سینے میں موجود ہے، میں ہمیشہ بے چین رہوں گا۔ تم شاید اسے مبالغہ لیتیں کرو مگر یہ واقعہ ہے کہ درد مندی میرے لہو کی بوندوں سے اپنی خوراک حاصل کر رہی ہے، اور ایک دن ایسا آئے گا جب درد ہتی درد رہ جائے گا اور تمہارا درد و سوت دنیا کی نظر وہ سے غائب ہو جائے گا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ درد مندی کے اس جذبے نے مجھے کیسے کیسے بھی ان دکھ پہنچائے ہیں۔ یہ کیا کم ہے کہ میری جوانی کے دن بڑھاپے کی راتوں میں تبدیل ہو گئے ہیں اور جب یہ سوچتا ہوں تو اس بات کا ہتھیہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ مجھے اپنا دل پتھر بنالینا چاہیے۔ لیکن افسوس ہے اس درد مندی نے مجھے اتنا کمزور بنا دیا ہے کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا، اور چونکہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا اس لیے میری طبیعت میں عجیب و غریب کیفیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔

شعر میں اب بھی صحیح نہیں پڑھ سکتا، اس لیے کہ شاعری سے مجھے بہت کم دلچسپی رہی ہے۔ لیکن مجھے اس بات کا کامل طور پر احساس ہے کہ میری طبیعت شاعری کی طرف مائل ہے۔ شہر میں بننے والے لوگوں کی ”وزنی شاعری“ مجھے پسند نہیں۔ دیہات کے ہلکے چکلے نغمے مجھے بے حد بھاتے ہیں۔ یہ اس قدر شفاف ہوتے ہیں کہ ان کے پیچھے دل دھڑکتے ہوئے نظر آسکتے ہیں۔ تمہیں حیرت ہے کہ میں ”رومی حزنیہ“ کیونکر لکھنے لگا اور میں اس بات پر خود حیران ہوں۔

بعض لوگ ایسے ہیں جو اپنے محسوسات کو دوسروں کی زبان میں بیان کر کے اپنا سینہ خالی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ ”ذہنی مفلس“ ہیں اور مجھے ان پر ترس آتا ہے۔ یہ ذہنی افلاس مالی افلاس سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ میں مالی مفلس ہوں مگر خدا کا شکر ہے، ذہنی مفلس نہیں ہوں، ورنہ میری مصیبتوں کی کوئی حد نہ ہوتی۔ مجھے یہ کتنا بڑا طمیناں ہے کہ میں جو کچھ محسوس کرتا ہوں، وہی اپنی زبان میں بیان کر لیتا ہوں۔

میں نے اپنے افسانوں کے متعلق کبھی غور نہیں کیا۔ اگر ان میں کوئی چیز بقول تمہارے ”جلوہ گر“ ہے تو میرا بے کل باطن۔ میرا ایمان نہ تشدد پر ہے اور نہ عدم تشدد پر۔ دونوں پر ہے اور دونوں پر نہیں۔ موجودہ تغیری پسند ما جوں میں رہتے ہوئے میرے ایمان میں استقلال نہیں رہا۔ آج میں ایک چیز کو اچھا سمجھتا ہوں لیکن دوسرے روز سورج کی روشنی کے ساتھ ہی اس چیز کی بیت بدلت جاتی ہے۔ اس کی تمام اچھائیاں برائیاں بن جاتی ہیں۔ انسان کا علم بہت محدود ہے اور میرا علم محدود ہونے کے علاوہ منتشر بھی ہے۔ ایسی صورت میں تمہارے اس سوال کا جواب میں کیوں نکر دے سکتا ہوں!

”مجھ“ پر مضمون لکھ کر کیا کرو گے بیارے! میں اپنے قلم کی مفترض سے اپنا بابس پہلے ہی تار تار کر چکا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے اور نیگا کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میرے چہرے سے اگر تم نے نقاب اٹھا دی تو تم دنیا کو ایک بہت ہی بھی انک شکل دکھاؤ گے۔ میں ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہوں جس پر میرا قلم کبھی کبھی پتلی جملی منڈھتار ہتا ہے۔ اگر تم نے جھلیوں کی یہ تہہ ادھیر ڈالی تو میرا انھیاں ہے جو ہبہت تمہیں منہ کھولے نظر آئے گی، اسے دیکھنے کی تاب تم خود میں نہ پاؤ گے۔

میری کشمیر کی زندگی، ہائے میری کشمیر کی زندگی! مجھے معلوم ہے تمہیں میری زندگی کے اس خوشنگوار مکٹرے کے متعلق مختلف قسم کی باتیں معلوم ہوتی رہی ہیں۔ یہ باتیں جن لوگوں کے ذریعے تم تک پہنچتی ہیں، ان کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس لیے تمہارا یہ کہنا درست ہے کہ تم ان کو سن کر ابھی تک کوئی صحیح رائے مرتب نہیں کر سکے۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ کہنے کے باوجود تم نے ایک رائے مرتب کی اور ایسا کرنے میں بہت عجلت سے کام لیا ہے۔

اگر تم میری تمام تحریروں کو پیش نظر رکھ لیتے تو تمہیں یہ غلط فہمی ہرگز نہ ہوتی کہ میں کشمیر میں ایک سادہ لوح لڑکی سے کھیلتا رہا ہوں۔ میرے دوست تم نے مجھے صدمہ پہنچایا ہے۔

وزیر کون تھی۔۔۔ اس کا جواب مختصر یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دیہاتی لڑکی تھی۔ جوان اور پوری جوان! اس پہاڑی لڑکی کے متعلق، جس نے میری کتاب زندگی کے کچھ اور اس پر چند حسین نقوش بنائے ہیں۔ میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔

میں نے وزیر کو تباہ نہیں کیا۔ اگر ”تباهی“ سے تمہاری مراد ”جسمانی تباہی“ ہے تو وہ پہلے ہی سے تباہ شدہ تھی، اور وہ اسی تباہی میں اپنی مسرت کی جستجو کرتی تھی۔ جوانی کے نشے میں مخمور اس نے اس غلط خیال کو اپنے دماغ میں جگہ دے رکھی تھی کہ زندگی کا اصل حظ اور لطف اپنا خون کھولانے میں ہے، اور وہ اس غرض کے لیے ہر وقت ایندھن چنتی رہتی تھی۔ یہ تباہ کن خیال اس کے دماغ میں کیسے پیدا ہوا، اس کے متعلق بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ ہماری صنف میں ایسے افراد کی کمی نہیں جن کا کام صرف بھولی بھالی لڑکیوں سے کھلیتا ہوتا ہے۔ جہاں تک میرا اپنا خیال ہے، وزیر اس چیز کا شکار تھی جسے تہذیب و تمدن کا نام دیا جاتا ہے۔

ایک چھوٹا سا پہاڑی گاؤں ہے جو شہروں کے شور و شتر سے بہت دور ہمالیہ کی گود میں آباد ہے، اور اب تہذیب و تمدن کی بدولت شہروں سے اس کا تعارف کر دیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں شہروں کی گندگی اس جگہ منتقل ہونا شروع ہو گئی ہے۔

خالی سلیٹ پر تم جو کچھ بھی لکھوگے، نمایاں طور پر نظر آئے گا اور صاف پڑھا جائے گا۔ وزیر کا سینہ بالکل خالی تھا۔ دنیوی خیالات سے پاک اور صاف لیکن تہذیب کے کھر درے ہاتھوں نے اس پر نہایت بحدے نقش بنادیے تھے جو مجھے اس کی غلط روشن کا باعث نظر آتے ہیں۔

وزیر کا مکان یا جھونپڑا، سڑک کے اوپر پہاڑ کی ڈھلوان میں واقع تھا اور میں اس کی ماں کے کہنے پر ہر روز اس سے ذرا اوپر چڑی کے درختوں کی چھاؤں میں زمین پر دری بچھا کر کچھ لکھا پڑھا کرتا تھا اور عام طور پر وزیر میرے پاس ہی اپنی بھیس چرایا کرتی تھی۔ چونکہ ہوٹل سے ہر روز دری اٹھا کر لانا اور پھر اسے واپس لے جانا میرے جیسے آدمی کے لیے ایک عذاب تھا، اس لیے میں اسے ان کے مکان ہی میں چھوڑ جاتا تھا۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مجھے غسل کرنے میں دیر ہو گئی اور میں ٹہلتا ٹہلتا پہاڑی کے دشوار گزار راستوں کو طے کر کے جب ان کے گھر پہنچا اور دری طلب کی تو اس کی بڑی بہن کی زبانی معلوم ہوا کہ وزیر دری لے کر اوپر چل گئی ہے۔ یہ سن کر میں اور اوپر چڑھا اور جب اس بڑے پتھر کے قریب آیا جسے میں میز کے طور پر استعمال کرتا تھا تو میری نگاہیں وزیر پر پڑیں۔ دری اپنی جگہ بچھی ہوئی تھی اور وہ اپنا سبز کلف لگا دوپٹہ تانے سو رہی تھی۔

میں دیر تک پتھر پر بیٹھا رہا۔ مجھے معلوم تھا وہ سونے کا بہانہ کر کے لیٹی ہے شاید اس کا خیال تھا کہ میں اسے جگانے کی کوشش کروں گا اور وہ گھری نیند کا بہانہ کر کے جا گئے میں دیر کرے گی۔ لیکن میں خاموش بیٹھا ہا بلکہ اپنے چرمی تھیلے سے ایک کتاب نکال کر اس کی طرف پیٹھ کر کے پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ جب نصف گھنٹہ اسی طرح گزر گیا تو وہ مجبور ہو کر بیدار ہوئی۔ انگڑائی لے کر اس نے عجیب سی آواز منہ سے نکالی۔ میں نے کتاب بند کر دی اور مڑ کر اس سے کہا، ”میرے آنے سے تمہاری نیند تو خراب نہیں ہوئی؟“

وزیر نے آنکھیں مل کر لبھ کو خواب آلو بنا تے ہوئے کہا، ”آپ کب آئے تھے؟“

”ابھی ابھی آکے بیٹھا ہوں۔ سونا ہے تو سو جاؤ۔“

”نہیں۔ آج نگوڑی نیند کو جانے کیا ہو گیا۔ کمر سید ہی کرنے کے لیے یہاں ذری کی ذری لیٹی تھی کہ بس سو گئی۔۔۔ دو گھنٹے سے کیا کم سوئی ہوں گی۔“

اس کے گلے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے جو کچھ باہر جھانک رہا تھا، اس کو میرا قلم بیان کرنے سے عاجز ہے۔ میرا خیال ہے اس وقت اس کے دل میں یہ احساس کروٹیں لے رہا تھا کہ اس کے سامنے ایک مرد بیٹھا ہے اور وہ عورت ہے۔۔۔ جوان عورت۔۔۔ شباب کی انگلوں کا ابتما ہوا چشمہ!

تحوڑی دیر کے بعد وہ غیر معمولی باقونی بن گئی اور بہک سی گئی۔ مگر میں نے اس کی بھیس اور پچھڑے کا ذکر چھیڑنے کے بعد ایک دلچسپ کہانی سنائی جس میں ایک پچھڑے سے اس کی ماں کی الفت کا ذکر تھا۔ اس سے اس کی آنکھوں میں وہ شرارے سرد ہو گئے جو کچھ پہلے لپک رہے تھے۔

میں زاہد نہیں ہوں، اور نہ میں نے کبھی اس کا دعویٰ کیا ہے۔ گناہ و ثواب اور سزا و جزا کے متعلق میرے خیالات دوسروں سے جدا ہیں اور یقیناً تمہارے خیالات سے بھی بہت مختلف ہیں۔ میں اس وقت ان بخشوں میں نہیں پڑنا چاہتا، اس لیے کہ اس کے لیے سکون قلب اور وقت در کار ہے۔ بر سیبل تذکرہ ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے تم میرے خیالات کے متعلق کچھ اندازہ لگا سکو گے۔

باقون باقون میں ایک مرتبہ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ حسن اگر پورے شباب اور جوبن پر ہو تو وہ دلکشی کھو دیتا ہے۔ مجھے اب بھی اس خیال پر ایمان ہے۔ مگر میرے دوست نے اسے مہمل منطق قرار دیا۔ ممکن ہے تمہاری نگاہ میں بھی یہ مہمل ہو۔ مگر میں تم سے اپنے دل کی بات کہتا ہوں۔ اس حسن نے میرے دل کو اپنی طرف راغب نہیں کیا جو پورے شباب پر ہو۔ اس کو دیکھ کر میری آنکھیں ضرور چندھیا جائیں گی۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اس حسن نے اپنی تمام یکفیتیں میرے دل و دماغ پر طاری کر دی ہیں۔ شوخ اور بھڑکیے رنگ اس بلندی تک کبھی نہیں جا سکتے جو نرم و نازک الوان و خطوط کو حاصل ہے۔ وہ حسن یقیناً قابل احترام ہے جو آہستہ آہستہ نگاہوں میں جذب ہو

کر دل میں اتر جائے۔ روشنی کا خیرہ کن شعلہ دل کے بجائے اعصاب پر اثر انداز ہوتا ہے۔۔۔ لیکن اس فضول بحث میں پڑنے سے کیا فائدہ۔

میں کہہ رہا تھا کہ میں زاہد نہیں ہوں، یہ کہتے وقت میں دبی زبان میں بہت سی چیزوں کا اعتراف بھی کر رہا ہوں لیکن اس پہاڑی لڑکی سے جو جسمانی لذتوں کی دلدادہ تھی، میرے تعلقات صرف ذہنی اور روحانی تھے۔ میں نے شاید تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میں اس بات کا قائل ہوں کہ اگر عورت سے دوستی کی جائے تو اس کے اندر ندرت ہونی چاہیے۔ اس سے اس طرح ملتا چاہیے کہ وہ تمہیں دوسروں سے بالکل علیحدہ سمجھنے پر مجبور ہو جائے، اسے تمہارے دل کی ہر دھڑکن میں ایسی صدائی دے جو اس کے کانوں کے لیے نئی ہو۔

عورت اور مرد۔۔۔ اور ان کا باہمی رشتہ ہر بالغ آدمی کو معلوم ہے۔ لیکن معاف کرنا، یہ رشتہ میری نظر وہ میں فر سودہ ہو چکا ہے۔ اس میں یکسر حیوانیت ہے۔ میں پوچھتا ہوں اگر مرد کو اپنی محبت کا مرکز کسی عورت ہی کو بنانا ہے تو وہ انسانیت کے اس مقدس جذبے میں حیوانیت کو کیوں داخل کرے۔۔۔ کیا اس کے بغیر محبت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔۔۔ کیا جسم کی مشقت کا نام محبت ہے؟

وزیر اس غلط فہمی میں بتلا تھی کہ جسمانی لذتوں کا نام محبت ہے اور میرا خیال ہے جس مرد سے بھی وہ ملتی تھی، وہ محبت کی تعریف انہی الفاظ میں بیان کرتی تھی۔ میں اس سے ملا اور اس کے تمام خیالات کی ضد بن کر میں نے اس سے دوستی پیدا کی۔ اس نے اپنے شوخ رنگ خوابوں کی تعبیر میرے وجود میں تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اسے مایوسی ہوئی۔ لیکن چونکہ وہ غلط کار ہونے کے ساتھ ساتھ معمولی مقصوم تھی، میری سیدھی سادی با توں نے اس مایوسی کو حیرت میں تبدیل کر دیا۔ اور آہستہ آہستہ اس کی یہ حیرت اس خواہش کی شکل اختیار کر گئی کہ وہ اس نئی رسم و راہ کی گھر ایوں سے واقفیت حاصل کرے۔ یہ خواہش یقیناً ایک مقدس مخصوصیت میں تبدیل ہو جاتی اور وہ اپنی نسوانیت کا وقار رفتہ پھر سے حاصل کر لیتی جسے وہ غلط راستے پر چل کر کھو بیٹھی تھی، لیکن افسوس ہے مجھے اس پہاڑی گاؤں سے دفتاً پر نم آنکھوں کے ساتھ اپنے شہر واپس آنا پڑا۔

مجھے وہ اکثریاد آتی ہے۔۔۔ کیوں۔۔۔ اس لیے کہ رخصت ہوتے وقت اس کی سدا متبسم آنکھوں میں دو چھکلتے آنسو بتا رہے تھے کہ وہ میرے جذبے سے کافی متاثر ہو چکی ہے اور حقیقی محبت کی ایک نئی سی شعاع اس کے سینے کی تاریکی میں داخل ہو چکی ہے۔۔۔ کاش! میں وزیر کو محبت کی تمام عظمتوں سے روشناس کر اسکتا اور کیا پتہ ہے کہ یہ پہاڑی لڑکی مجھے وہ چیز عطا کر دیتی جس کی تلاش میں میری جوانی بڑھاپے کے خواب دیکھ رہی ہے۔

یہ ہے میری داستان جس میں بقول تمہارے، لوگ اپنی دلچسپی کا سامان تلاش کرتے ہیں۔۔۔ تم نہیں سمجھتے، اور نہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں یہ داستان میں کیوں لکھتا ہوں۔۔۔ پھر کبھی سمجھاؤں گا۔

-[18]-

ہٹک: سعادت حسن منٹو

دن بھر کی تھکلی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی۔ میونسل کمیٹی کا داروغہ صفائی، جسے وہ سیٹھ جی کے نام سے پکارا کرتی تھی، ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور، گھر واپس گیا تھا۔ وہ رات کو یہیں پر ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتی کا بہت خیال تھا، جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔

وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بد لے اس داروغہ سے وصول کیے تھے، اس کی چست اور تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے اور اس کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے۔

اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی کچھ تو اس برانڈی کے باعث تھی جس کا اڈھادروغہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور کچھ اس بیوڑا کا نتیجہ تھی جس کا سوڑا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔

وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے بلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی بائیں جو کاندھوں تک نگنی تھیں، بلنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ دیکھیں بازو کی بغل میں شکن آلو دگوشت ابھرا ہوا تھا۔ جو بار بار موڑنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا۔ جیسے چھی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔

کمرہ بہت چھوٹا تھا جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی تھیں۔ تین چار سو کھے سڑے چپل بلنگ کے نیچے پڑے تھے جن کے اوپر منہ رکھ کر ایک خارش زدہ کتسور ہا تھا۔ اور نیند میں کسی غیر مریٰ چیز کو منہ چڑھا رہا تھا۔ اس کتے کے بال جگہ جگہ سے خارش کے باعث اڑے ہوئے تھے۔ دور سے اگر کوئی اس کتے کو دیکھتا تو سمجھتا کہ پیر پوچھنے والا پر اناٹاٹ دوہر اکر کے زمین پر رکھا ہے۔

اس طرف چھوٹے سے دیوار گیر پر سنگار کا سامان رکھا تھا۔ گالوں پر لگانے کی سرخی، ہونٹوں کی سرخی، پاؤڑ، لگنگی اور لوہے کے پن جو وہ غالباً اپنے جوڑے میں لگایا کرتی تھی۔ پاس ہی ایک لمبی کھونٹی کے ساتھ سبز طوطے کا پنجھرہ لٹک رہا تھا، جو گردن کو اپنی پیٹھ کے بالوں میں چھپائے سورہاتھا۔ پنجھرہ کچے امرود کے ٹکڑوں اور گلے ہوئے سنگترے کے چھلکوں سے بھرا پڑا تھا۔ ان بدبودار ٹکڑوں پر چھوٹے چھوٹے کالے رنگ کے چھریا پنگ اڑ رہے تھے۔

پنگ کے پاس ہی بید کی ایک کرسی پڑی تھی جس کی پشت، سرٹینکے کے باعث بے حد میلی ہو رہی تھی۔ اس کرسی کے دائیں ہاتھ کو ایک خوبصورت تپائی تھی جس پر ہزار ماسٹر زواں کا پورٹ ایبل گراموفون پڑا تھا، اس گراموفون پر منڈھے ہوئے کالے کپڑے کی بہت بڑی حالت تھی۔ زنگ آلو دسویاں تپائی کے علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس تپائی کے عین اوپر دیوار پر چار فریم لٹک رہے تھے جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی تھیں۔

ان تصویروں سے ذرا ہٹ کر یعنی دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف کی دیوار کے کونے میں گنیش جی کی شوخ رنگ کی تصویر جو تازہ اور سوکھے ہوئے چھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے اتنا کر فریم میں جڑائی گئی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے دیوار گیر پر جو کہ بے حد چکنا ہو رہا تھا، تیل کی ایک پیالی دھری تھی۔ جو دیے کو روشن کرنے کے لیے رکھی گئی تھی۔ پاس ہی دیا پڑا تھا۔ جس کی لوہا بند ہونے کے باعث ماتھے کے تلک کے مانند سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوار گیر پر روئی کی چھوٹی بڑی مردویاں بھی پڑی تھیں۔

جب وہ بوہنی کرتی تھی تو دور سے گنیش جی کی اس مورتی سے روپے چھوکر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ لگا کر انھیں اپنی چوپی میں رکھ لیا کرتی تھی۔ اس کی چھاتیاں چونکہ کافی ابھری ہوئی تھیں اس لیے وہ جتنے روپے بھی اپنی چوپی میں رکھتی محفوظ پڑے رہتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی جب مادھوپنے سے چھٹی لے کر آتا تو اسے اپنے کچھ روپے پنگ کے پائے کے نیچے اس چھوٹے سے گڑھے میں چھپانا پڑتے تھے جو اس نے خاص اس کام کی غرض سے کھو دا تھا۔ مادھو سے روپے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ سو گندھی کو رام لال دلال نے بتایا تھا۔ اس نے جب یہ سننا کہ مادھوپنے سے آکر سو گندھی پر دھاوے بولتا ہے تو کہا تھا، ”اس سالے کو تو نے کب سے یار بنایا ہے؟ یہ بڑی انوکھی عاشقی معاشوی ہے۔“

”ایک بیسہ اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور تیرے ساتھ مزے اڑا تارہتا ہے، مزے الگ رہے، تجھ سے کچھ لے بھی مرتا ہے۔۔۔ سو گندھی! مجھے کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے۔ اس سالے میں کچھ بات ضرور ہے جو تجھے بھاگیا ہے۔ سات سال سے یہ دھندا کر رہا ہوں۔ تم چھو کریوں

کی ساری کمزوریاں جاتا ہوں۔” یہ کہہ کر رام لال دلال نے جو بیٹی شہر کے مختلف حصوں میں دس روپے سے لے کر سوروپے تک والی ایک سو بیس چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا، سو گندھی کو بتایا؛ ”سالی اپنادھن یوں نہ برباد کر۔ تیرے انگ پر سے یہ کپڑا بھی اتار کر لے جائے گا۔ وہ تیری ماں کا یار۔۔۔ اس پلنگ کے پائے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں سارے پیسے دبادیا کرو جب وہ یار آیا کرے تو اس سے کہا کر۔۔۔ تیری جان کی قسم مادھو، آج صح سے ایک دھیلے کامنہ نہیں دیکھا۔ باہر والے سے کہہ کر ایک کپ چائے اور افلاطون بسکٹ تو منگا۔ بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔۔۔ سمجھیں! بہت نازک وقت آگیا ہے میری جان۔۔۔ اس سالی کانگرس نے شراب بند کر کے بازار بالکل مندا کر دیا ہے۔ پر تجھے تو کہیں نہ کہیں سے پینے کو مل ہی جاتی ہے، بھگوان کی قسم، جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور دارو کی باس سو گھنٹا ہوں تو مجھی چاہتا ہے تیری جوں میں چلا جاؤں۔“

سو گندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جننا نے اس سے کہا تھا، ”نیچے سے ان بہب کے گولوں کو باندھ کر رکھا کر، انگیا پہننے گی تو ان کی سختائی بھیک رہے گی۔“ سو گندھی یہ سن کر ہنس دی۔ ”جننا تو سب کو اپنے سری کا سمجھتی ہے۔ دس روپے میں لوگ تیری بوٹیاں توڑ کر چلے جاتے ہیں۔ تو تو سمجھتی ہے کہ سب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہو گا۔ کوئی موالکائے تو ایسی ویسی جگہ ہاتھ۔۔۔ ارے ہاں، کل کی بات تجھے سناؤں: رام لال رات کے دو بجے ایک پنجابی کو لایا۔ رات کا تیس روپے طے ہوا۔ جب سونے لگے تو میں نے بتی بجھادی۔ ارے وہ توڈرنے لگا۔ سنتی ہو جمنا؟ تیری قسم اندھیرا ہوتے ہی اس کا سارا اٹھاٹ کر کر اہو گیا۔ وہ ڈر گیا۔ میں نے کہا چلو چلو دیر کیوں کرتے ہو۔ تین بجھے والے ہیں، اب دن چڑھ آئے گا۔ بولا۔۔۔ روشنی کرو، روشنی کرو۔۔۔ میں نے کہا، یہ روشنی کیا ہوا، بولا؛ لائٹ۔۔۔ لائٹ۔۔۔ اس کی بھیشی ہوئی آواز سن کر مجھ سے ہنسی نہ رکی۔

”بھی میں تو لائٹ نہ کروں گی!“ اور یہ کہہ کر میں نے اس کی گوشت بھری ران کی چکلی لی۔ تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور لائٹ اون کر دی میں نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی، اور کہا، تجھے شرم نہیں آتی مردوے۔۔۔ وہ پلنگ پر آیا تو میں اٹھی اور لپک کر لائٹ بجھادی۔۔۔ وہ پھر گھر انے لگا۔ تیری قسم بڑے مزے میں رات کٹی، کبھی اندھیرا کبھی اجالا، کبھی اجالا، کبھی اندھیرا۔۔۔ رام کی کھڑکھڑ ہوئی تو پتلون و تلون پہن کر وہ اٹھ بجا گا۔۔۔ سالے نے تیس روپے سے میں جیتے ہوں گے۔ جو یوں مفت دے گیا۔۔۔ جننا تو بالکل المحتضن ہے۔ بڑے بڑے گریاد ہیں مجھے ان لوگوں کو بھیک کرنے کے لیے!“

سو گندھی کو واقعی بہت سے گریاد تھے جو اس نے اپنی ایک دو سہیلیوں کو بتائے بھی تھے۔ عام طور پر وہ یہ گرسب کو بتایا کرتی تھی، ”اگر آدمی شریف ہو، زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو تو اس سے خوب شرار تیں کرو، ان گنت باتیں کرو، اسے چھپڑو ستاؤ، اس کے گد گدی کرو۔ اس سے کھیلو۔۔۔ اگر داڑھی رکھتا ہو تو اس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوچ لو، پیٹ بڑا ہو تو تھپٹھپاؤ۔۔۔ اس کو اتنی

مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے۔ وہ خوش خوش چلا جائے گا اور قم بھی بچ رہے گی۔ ایسے مرد جو گپ چپ رہتے ہیں بڑے خطرناک ہوتے ہیں بہن۔۔۔ ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے۔“

سو گندھی اتنی چالاک نہیں تھی جتنا خود کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کے گاہک بہت کم تھے۔ غایت درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گرجو سے یاد تھے اس کے دماغ سے پھسل کر اس کے پیٹ میں آ جاتے تھے جس پر ایک بچ پیدا کرنے کے باعث کئی لکیریں پڑ گئی تھیں۔۔۔ ان لکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اسے ایسا لگا تھا کہ اس کے خارش زدہ کتنے اپنے پنچے سے یہ نشان بنادیے ہیں۔

سو گندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی لیکن جو نہیں کوئی نرم نازک بات، کوئی کومل بول اس سے کہتا تو جھٹ پکھل کروہ اپنے جسم کے دوسرا حصوں میں پھیل جاتی۔ گوردا اور عورت کے جسمانی ملک کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا مگر اس کے جسم کے باقی اعضا سب کے سب، اس کے بہت بری طرح قائل تھے؛ وہ تھکن چاہتے تھے۔۔۔ ایسی تھکن جو انھیں جھنجھوڑ کر۔۔۔ انھیں مار کر سلانے پر مجبور کر دے۔۔۔ ایسی نیند جو تھک کر چورپور ہو جانے کے بعد آئے، کتنی مزے دار ہوتی ہے۔ وہ بے ہوش جومار کھا کر بند بند ڈھیلے ہو جانے پر طاری ہوتی ہے، کتنا آمند دیتی ہے! کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم ہو اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں ہو، اور اس ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ تم ہو ایں بہت اوپنچی جگہ لٹکی ہوئی ہو۔ اوپر ہوا، نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا، بس ہوا، ہی ہوا! اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزادیتا ہے۔

بچپن میں جب وہ آنکھ مچوی کھیلا کرتی تھی، اور اپنی ماں کا بڑا صندوق کھول کر اس میں چھپ جایا کرتی تھی، تو ناکافی ہوا میں دم گھٹنے کے ساتھ ساتھ پکڑے جانے کے خوف سے وہ تیز دھڑکن جو اس کے دل میں پیدا ہو جایا کرتی تھی، کتنا مزادیا کرتی تھی۔

سو گندھی چاہتی تھی کہ اپنی ساری زندگی کسی ایسے ہی صندوق میں چھپ کر گزار دے جس کے باہر ڈھونڈنے والے پھرتے رہیں۔ کبھی اس کو ڈھونڈنے کا لیں تاکہ وہ بھی ان کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے۔ یہ زندگی جو وہ پانچ برس سے گزار رہی تھی آنکھ مچوی ہی تو تھی۔ کبھی وہ کسی کو ڈھونڈنے لیتی تھی اور کبھی کوئی اسے ڈھونڈ لیتا تھا۔

بس یونہی اس کا جیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اس لیے کہ اس کو خوش رہنا پڑتا تھا۔ ہر روز رات کو کوئی نہ کوئی مرد اس کے چوڑے سا گوانی پنگ پر ہوتا تھا اور سو گندھی جس کو مردوں کے ٹھیک کرنے کے لیے بے شمار گریا دتھے، اس بات کا بار بار تھیہ کرنے پر بھی کہ وہ ان

مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی، ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی اور فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا کرتی تھی۔

ہر روز رات کو اس کا پرانا یا نیا ملا قاتی اس سے کہا کرتا تھا، ”سو گندھی میں تجھ سے پریم کرتا ہوں۔“ اور سو گندھی یہ جان بوجھ کر بھی کہ وہ جھوٹ بولتا ہے بس مومن ہو جاتی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ نجاح اس سے پریم کیا جا رہا ہے۔۔۔

پریم۔۔۔ کتنا سندربول ہے! وہ چاہتی تھی، اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں پر مل لے اس کی ماش کرے تاکہ یہ سارے کاسارا اس کے مساموں میں رچ جائے یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے۔ سمت سمتا کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے۔ کبھی کبھی جب پریم کیے جانے کا جذبہ اس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گودھی میں لے کر تھپتھپنا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اسے گودھی میں سلا دے۔

پریم کر سکنے کی الہیت اس کے اندر اس قدر زیادہ تھی کہ ہر اس مرد سے جو اس کے پاس آتا تھا، وہ محبت کر سکتی تھی اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی۔ اب تک چار مردوں سے اپنا پریم نباہ ہی تو رہی تھی جن کی تصویریں اس کے سامنے دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ہر وقت یہ احساس اس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے لیکن یہ اچھا پن مردوں میں کیوں نہیں ہوتا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ایک بار آئینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا تھا، ”سو گندھی۔۔۔ تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا!“

یہ زمانہ یعنی پانچ برسوں کے دن اور ان کی راتیں، اس کے جیون کے ہر تارکے ساتھ وابستہ تھے۔ گواں زمانے سے اس کو خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی جس کی خواہش اس کے دل میں موجود تھی۔ تاہم وہ چاہتی تھی کہ یوں نہیں اس کے دن بیتتے چلے جائیں، اسے کون سے محل کھڑے کرنا تھے جو روپے پیسے کالائج کرتی۔ دس روپے اس کا عام نرخ تھا جس میں سے ڈھائی روپے رام لال اپنی دلائل کے کاث لیتا تھا۔ ساڑھے سات روپے اسے روز مل ہی جایا کرتے تھے جو اس کی اکیلی جان کے لیے کافی تھے۔ اور مادھو جب پونے سے بقول رام لال دلال، سو گندھی پر دھاوے بولنے کے لیے آتا تھا تو وہ دس پندرہ روپے خرچ بھی ادا کرتی تھی! یہ خرچ صرف اس بات کا تھا کہ سو گندھی کو اس سے کچھ وہ ہو گیا تھا۔

رام لال دلال ٹھیک کہتا تھا: اس میں ایسی بات ضرور تھی جو سو گندھی کو بہت بھاگئی تھی۔ اب اس کو چھپانا کیا، بتاہی کیوں نہیں دیں! سو گندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا تھا، ”تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے! جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا

کر رہی ہے۔ اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں۔۔۔؟ چھی چھی چھی۔۔۔ دس روپے اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلال کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟ اب ان ساڑھے سات روپوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے آیا جو میں لے ہی نہیں سکتا۔۔۔

مجھے عورت چاہیے پر تجھے کیا اس وقت اسی گھٹری مرد چاہیے۔۔۔؟

مجھے تو کوئی عورت بھی بھاجائے گی پر کیا میں تجھے جپتا ہوں! تیر امیر اناطہ ہی کیا ہے کچھ بھی نہیں۔۔۔ بس یہ دس روپے، جن میں سے ڈھائی، دلائی میں چلے جائیں گے اور باقی ادھر ادھر بکھر جائیں گے۔ تیرے اور میرے نقش میں نج رہے ہیں، تو بھی ان کا جناسن رہی ہے اور میں بھی۔ تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور۔۔۔ کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری۔۔۔ پونے میں حوالدار ہوں، مہینے میں ایک بار آیا کروں گا۔ تین چار دن کے لیے۔۔۔ یہ دھندا چھوڑ۔۔۔ میں تجھے خرچ دے دیا کروں گا۔ کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا۔۔۔؟“

مادھونے اور بھی بہت کچھ کہا تھا جس کا اثر سو گندھی پر اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لیے خود کو حوالدار نی سمجھنے لگی تھی۔ باقی کرنے کے بعد مادھونے اس کے کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور ننگی تصویریں جو سو گندھی نے اپنے سرہانے لڑکا رکھی تھیں، بناؤ چھے گچھے پھاڑ دی تھیں اور کہا تھا، ”سو گندھی بھی میں ایسی تصویریں یہاں نہیں رکھنے دوں گا۔ اور پانی کا یہ گھڑا۔۔۔ دیکھنا کتنا میلا ہے اور یہ۔۔۔ یہ چیختھے۔۔۔ اف کتنی بری باس آتی ہے، اٹھا کے باہر چھینک ان کو۔۔۔ اور تو نے اپنے بالوں کا ستیا ناس کر رکھا ہے۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔“

تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سو گندھی اور مادھو آپس میں گھل مل گئے تھے اور سو گندھی کو تو ایسا محسوس ہوا تھا کہ برسوں سے حوالدار کو جانتی ہے، اس وقت تک کسی نے بھی کمرے میں بد بودار چیختھوں، میلے گھڑے اور ننگی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں کیا تھا اور نہ کبھی کسی نے اس کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اس کا ایک گھر ہے جس میں گھر لیوپن آسکتا ہے۔ لوگ آتے تھے اور بسٹر تک کی غلافت کو محسوس کیے بغیر چلے جاتے تھے۔ کوئی سو گندھی سے یہ نہیں کہتا تھا، ”دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے کہیں زکام نہ ہو جائے تجھے۔۔۔ ٹھہر میں تیرے واسطے دوالاتا ہوں۔“

مادھو کتنا اچھا تھا۔ اس کی ہر بات باون تو لہ اور پاؤرتی کی تھی۔ کیا کھری کھری سنائی تھیں اس نے سو گندھی کو۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ اسے مادھو کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

مہینے میں ایک بار مادھو پونے سے آتا تھا اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سو گندھی سے کہا کرتا تھا، ”دیکھ سو گندھی! اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔۔۔ اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چیز سے کپڑ کر باہر نکال دوں گا۔ دیکھ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا۔ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھوں کا۔۔۔“

نہ مادھو نے کبھی پونا سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سو گندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ نہ سو گندھی نے کبھی مادھو سے یہ کہا تھا، ”تو یہ کیا ٹرٹر کیا کرتا ہے، ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تو نے؟“ اور نہ مادھو نے کبھی سو گندھی سے پوچھا تھا، ”یہ مال تیرے پاس کہاں سے آتا ہے جب کہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں۔“ دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں ایک ملع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن سو گندھی خوش تھی۔ جس کو اصل سونانہ ملے وہ ملع کیے ہوئے گنوں ہی پر راضی ہو جایا کرتا ہے۔

اس وقت سو گندھی تھکی ماندی سور ہی تھی۔ بجلی کا قائمہ جسے اوپ کرنا وہ بھول گئی تھی، اس کے سر کے اوپر لٹک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے سامنے تکرار ہی تھی۔ مگر وہ گہری نیند سور ہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔۔۔ رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟

سو گندھی کے خواب آلو دکانوں میں دستک بھنجنا ہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ جب زور سے کھلکھلا گیا تو چونکر اڑھ بیٹھی۔۔۔ دو ملی جلی شرابوں اور دانتوں کے رینخوں میں پہنسنے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا عاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسیلا اور لیس دار تھا۔ دھوٹی کے پلو سے اس نے یہ بدبو دار عاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پنگ پر وہ اکیلی تھی۔ جھک کر اس نے پنگ کے نیچے دیکھا تو اس کا لٹا سوکھے ہوئے چلپوں پر منہ رکھے سورہا تھا اور طوطا پیٹھ کے بالوں میں سردیے سورہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ سو گندھی بستر پر سے اٹھی۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اس نے کلی کی اور دوسراؤ نگاغٹ پی کر اس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا، ”رام لال؟“

رام لال جو باہر دستک دیتے ہوئے تھک گیا تھا۔ بھنا کر کہنے لگا، ”تجھے سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہو گیا تھا۔ ایک کلاک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھلکھلھارہا ہوں کہاں مر گئی تھی۔۔۔؟“ پھر آواز دبا کر اس نے ہولے سے کہا، ”اندر کوئی ہے تو نہیں؟“

جب سو گندھی نے کہا، ”نہیں۔۔۔ تو رام لال کی آواز پھر اوپھی ہو گئی۔“ تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی۔۔۔؟ بھئی حد ہو گئی ہے کیا نیند پائی ہے۔ یوں ایک ایک چھو کری اتارنے میں دو دو گھنٹے سر کھپاتا پڑے تو میں اپنا وہندہ اکر چکا۔۔۔ اب تو میرا منہ کیا دیکھتی ہے۔ جھٹ پٹ یہ دھوتی اتار کر وہ پھولوں والی سازھی پہن، پوڈرو وڈر لگا اور چل میرے ساتھ۔۔۔ باہر موڑ میں ایک سیٹھ بیٹھے تیر انتظار کر رہے ہیں۔ چل چل ایک دم جلدی کر۔“

سو گندھی آرام کر سی پر بیٹھ گئی اور رام لال آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔ سو گندھی نے تپائی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا، ”رام لال آج میرا جی اچھا نہیں۔“

رام لال نے کنگھی دیوار گیر پر رکھ دی اور مڑ کر کہا، ”تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔“ سو گندھی نے ماتھے اور کنپیوں پر بام ملتے ہوئے غلط فہمی دور کر دی۔

”وہ بات نہیں رام لال۔۔۔! ایسے ہی میرا جی اچھا نہیں۔۔۔ بہت پی گئی۔“

رام لال کے منہ میں پانی بھر آیا، ”تھوڑی بچھی ہو تو لا۔۔۔ ذرا ہم بھی منہ کا مز اٹھیک کر لیں۔“

سو گندھی نے بام کی شیشی تپائی پر رکھ دی اور کہا، ”بچائی ہوتی تو یہ موادر میں درد ہی کیوں ہوتا۔ دیکھ رام لال! وہ جو باہر موڑ میں بیٹھا ہے اسے اندر ہی لے آؤ۔“

رام لال نے جواب دیا، ”نہیں بھئی وہ اندر نہیں آسکتے۔ جنمیں آدمی ہیں۔ وہ تو موڑ کو گلی کے باہر کھڑی کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔۔۔ تو کپڑے و پڑے پہن لے اور ذرا گلی کے نکڑ تک چل۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

ساتھ سات روپے کا سودا تھا۔ سو گندھی اس حالت میں جب کہ اس کے سر میں شدت سے درد ہوا تھا، کبھی بول نہ کرتی مگر اسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس کی ساتھ والی کھوٹی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی جس کا خاوند موڑ کے نیچے آ کر مر گیا تھا۔ اس عورت کو اپنی جوان لڑکی سمیت وطن جانا تھا۔ لیکن اس کے پاس چونکہ کراہی ہی نہیں تھا اس لیے وہ کسپری کی حالت میں پڑی تھی۔ سو گندھی نے کل ہی اس کو ڈھارس دی تھی اور اس سے کہا تھا، ”بہن تو چنانہ کر۔ میرا مرد پونے سے آنے ہی والا ہے، میں اس سے کچھ روپے لے کر تیرے جانے کا بندوبست کر دوں گی۔“

مادھوپونا سے آنے والا تھا مگر روپوں کا بندوبست تو سو گندھی ہی کو کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اٹھی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ پانچ منٹوں میں اس نے دھوتی اتار کر پھولوں والی ساڑھی پہنی اور گالوں پر سرخی پوڑا کر تیار ہو گئی۔ گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک اور ڈونگا پیا اور رام لال کے ساتھ ہوئی۔

گلی جو کہ چھوٹی شہروں کے بازار سے بھی کچھ بڑی تھی، بالکل خاموش تھی۔ گیس کے وہ یہ پ جو کھمبوں پر جڑے تھے، پہلے کی نسبت بہت دھنڈلی روشنی دے رہے تھے۔ جنگ کے باعث ان کے شیشوں کو گدلا کر دیا گیا تھا۔ اس اندر ہی روشنی میں گلی کے آخری سرے پر ایک موڑ نظر آ رہی تھی۔ کمزور روشنی میں اسے سیاہ رنگ کی موڑ کا سایہ سانظر آیا اور رات کے پچھلے پھر کی بھیدوں بھری خاموشی۔۔۔ سو گندھی کو ایسا لگا کہ اس کے سر کا درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ ایک کسی لاپن اسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا جیسے برانڈی اور بیوڑا کی بآس سے وہ بو جھل ہو رہی ہے۔

آگے بڑھ کر رام لال نے موڑ کے اندر بیٹھتے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا۔ اتنے میں جب سو گندھی موڑ کے پاس پہنچ گئی تو رام لال نے ایک طرف ہٹ کر کہا، ”لبجیے وہ آگئی۔“

”بڑی اچھی چھوکری ہے تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اسے دھندا شروع کیے۔“ پھر سو گندھی سے مخاطب ہو کر کہا، ”سو گندھی، ادھر آؤ سیٹھ جی بلا تے ہیں۔“

سو گندھی ساڑھی کا ایک کنارہ اپنی انگلی پر لپیٹی ہوئی آگے بڑھی اور موڑ کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ صاحب نے بیٹری اس کے چہرے کے پاس روشن کی۔ ایک لمحے کے لیے اس روشنی نے سو گندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چکا چوند پیدا کی۔ بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی اور بجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے ”اوہ نہ“ نکلا۔ پھر ایک دم موڑ کا انجن پھر پھر ایسا اور کاریہ جاوہ جا۔۔۔

سو گندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موڑ چل دی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک بیٹری کی تیز روشنی گھسی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر ہوا کیا تھا۔ اس ”اونہہ“ کا کیا مطلب تھا۔ جو ابھی تک اس کے کانوں میں بھجنہنا رہی تھی۔ کیا۔۔۔ کیا؟

رام لال کی آواز سنائی دی، ”پسند نہیں کیا تجھے۔۔۔ اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔ دو گھنٹے مفت میں ہی برباد کیے۔“

یہ سن کر سو گندھی کی ٹانگوں میں، اس کی بانہوں میں، اس کے ہاتھوں میں ایک زبردست حرکت کا ارادہ پیدا ہوا۔ کہاں تھی وہ موڑ۔۔۔ کہاں تھا وہ سیٹھ۔۔۔ تو ”اونہہ“ کا مطلب یہ تھا کہ اس نے مجھے پسند نہیں کیا۔۔۔ اس کی۔۔۔

گالی اس کے پیٹ کے اندر سے اٹھی اور زبان کی نوک پر آ کر رک گئی۔ وہ آخر گالی کے دیتی، موڑ تو جا چکی تھی۔ اس کی دم کی سرخ بیتی اس کے سامنے بازار کے اندر ہیارے میں ڈوب رہی تھی اور سو گندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لال لال انگارہ ”اونہہ“ ہے جو اس کے سینے میں برے کی طرح اتر اچلا جا رہا ہے۔ اس کے بھی میں آیا کہ زور سے پکارے۔ ”او سیٹھ۔ ذرا موڑ رو کنا اپنی۔۔۔“ بس ایک منٹ کے لیے۔ ”پروہ سیٹھ، ٹھڑی ہے اس کی ذات پر، بہت دور نکل چکا تھا۔

وہ سنستان بازار میں کھڑی تھی۔ بھولوں والی سائز ہی جو وہ خاص موقوں پر پہننا کرتی تھی، رات کے پچھلے پہر کی ہلکی ہلکی ہوا سے لہرا رہی تھی۔ یہ سائز ہی اور اس کی ریشمی سرسر اہٹ سو گندھی کو کتنی بڑی معلوم ہوتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس سائز ہی کے چیڑھے اڑا دے کیونکہ سائز ہی ہوا میں لہر لہرا کر ”اونہہ اونہہ“ کر رہی تھی۔

گالوں پر اس نے پوڑ لگایا تھا اور ہونٹوں پر سرفنگی۔ جب اسے خیال آیا کہ یہ سنگار اس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے کیا تھا تو شرم کے مارے اسے پسینہ آگیا۔ یہ شرمندگی دور کرنے کے لیے اس نے کچھ سوچا۔۔۔ میں نے اس موئے کو دکھانے کے لیے ٹھوڑی اپنے آپ کو سمجھا تھا۔ یہ تو میری عادت ہے۔۔۔ میری کیا سب کی یہی عادت ہے۔۔۔ پر۔۔۔ پر۔۔۔ یہ رات کے دو بجے اور رام لال دلال اور۔۔۔ یہ بازار۔۔۔ اور وہ موڑ اور بیٹری کی چمک۔۔۔ یہ سوچتے ہی روشنی کے دھبے اس کی حدِ نگاہ تک فضا میں ادھر ادھر تیرنے لگے اور موڑ کے انجن کی پھٹ پھٹ اہٹ اسے ہوا کے ہر جھونکے میں سنائی دینے لگی۔

اس کے ماتھے پر بام کالیپ جو سنگار کرنے کے دوران میں بالکل ہلاکا ہو گیا تھا، پسینہ آنے کے باعث اس کے مساموں میں داخل ہونے لگا۔ اور سو گندھی کو اپنا ماتھا کسی اور کاماتھا معلوم ہوا۔ جب ہوا کا ایک جھونکا اس کے عرق آلو دماتھے کے پاس سے گزرا تو اسے ایسا لگا کہ سرد سر دمیں کا ٹکڑا کاٹ کر اس کے ماتھے کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ سر میں درد دیسے کاویسا موجود تھا مگر خیالات کی بھیڑ بھاڑ اور ان کے شور نے اس درد کو اپنے نیچے دبار کھا تھا۔ سو گندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے نیچے سے نکال کر اوپر لانا چاہا مگر ناکام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انگ انگ دکھنے لگے، اس کے سر میں درد ہو، اس کی ٹانگوں میں درد ہو، اس کے پیٹ میں درد ہو، اس کی بانہوں میں درد ہو۔ ایسا درد کہ وہ صرف درد ہی کا خیال کرے اور سب کچھ بھول جائے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کے دل میں کچھ ہوا۔۔۔ کیا یہ درد تھا؟ ایک لمحے کے لیے اس کا دل سکڑا اور پھر پھیل گیا۔۔۔ یہ کیا تھا۔۔۔؟ لعنت! یہ تو وہی ”اوہہ“ تھی جو اس کے دل کے اندر کبھی سکڑتی تھی اور کبھی پھیلتی تھی۔

گھر کی طرف سو گندھی کے قدم اٹھے ہی تھے کہ رک گئے اور وہ ٹھہر کر سوچنے لگی، رام لال دلال کا خیال ہے کہ اسے میری شکل پسند نہیں آئی۔ شکل کا تو اس نے ذکر نہیں کیا۔ اس نے تو یہ کہا تھا، ”سو گندھی تجھ پسند نہیں کیا!“ اسے۔۔۔ اسے۔۔۔ صرف میری شکل ہی پسند نہیں آئی تو کیا ہوا؟ مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آتی۔۔۔ وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا۔ کتنی بڑی صورت تھی اس کی۔۔۔ کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا تو مجھے گھن نہیں آئی تھی؟ کیا مجھے ابکائی آتے آتے نہیں رک گئی تھی؟ ٹھیک ہے، پر سو گندھی۔۔۔ تو نے اسے دھنکا را نہیں تھا۔۔۔ اس کو ٹھنکرا یا نہیں تھا۔۔۔ اس موڑ والے سیٹھ نے تو تیرے منہ پر تھوکا ہے۔۔۔

اوہہ۔۔۔

اس ”اوہہ“ کا اور مطلب ہی کیا ہے۔۔۔؟ یہی کہ اس چھپنڈر کے سر میں چنبلی کا تیل۔۔۔ اوہہ۔۔۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔۔۔ ارے رام لال تو یہ چھپکلی کہاں سے پکڑ کر لے آیا ہے۔۔۔ اس لوندیا کی اتنی تعریف کر رہا ہے تو۔۔۔ دس روپے اور یہ عورت۔۔۔ خچر کیا بری ہے۔۔۔

سو گندھی سوچ رہی تھی اور اس کے پیر کے انگوٹھے سے لے کر سر کی چوٹی تک گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا، کبھی رام لال دلال پر جس نے رات کے دو بجے اسے بے آرام کیا لیکن فوراً ہی دونوں کوبے قصور پا کر وہ سیٹھ کا خیال کرتی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھیں، اس کے کان، اس کی بانہیں، اس کی ٹانگیں، اس کا سب کچھ مژتھا تھا کہ اس سیٹھ کو کہیں دیکھ پائے۔۔۔

اس کے اندر یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے ایک بار پھر ہو۔۔۔ صرف ایک بار۔۔۔ وہ ہو لے ہو لے موڑ کی طرف بڑھے۔ موڑ کے اندر سے ایک ہاتھ بیٹری نکالے اور اس کے چہرے پر روشنی پھینکے۔ ”اوہ نہ“ کی آواز آئئے اور وہ۔۔۔ سو گندھی انہاد ہند اپنے دونوں پنجوں سے اس کامنہ نو چنان شروع کر دے۔ وحشی بلی کی طرح جبھے اور۔۔۔ اور اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو اس نے موجودہ فیشن کے مطابق بڑھا کر تھے۔ اس سیٹھ کے گالوں میں گاڑ دے۔۔۔ گالوں سے پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑک دھڑک مکے مارنا شروع کر دے اور جب تھک جائے۔۔۔ جب تھک جائے تو رونا شروع کر دے۔

رونے کا خیال سو گندھی کو صرف اس لیے آیا کہ اس کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کی شدت کے باعث تین چار بڑے بڑے آنسو بن رہے تھے۔ ایک ایکی سو گندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا، ”تم روتنی کیوں ہو؟ تمہیں کیا ہوا ہے کہ ٹپکنے لگی ہو۔۔۔؟“

آنکھوں سے کیا ہوا سوال چند لمحات تک ان آنسوؤں میں تیرتا رہا جواب پلکوں پر کانپ رہے تھے۔ سو گندھی ان آنسوؤں میں سے دیر تک اس خلا کو گھورتی رہی بعد میں سیٹھ کی موڑ گئی تھی۔

پھر پھر پھر۔۔۔ یہ آواز کہاں سے آئی؟ سو گندھی نے چونک کر ادھر دیکھا لیکن کسی کو نہ پایا۔۔۔ ارے یہ تو اس کا دل پھر پھر ایما تھا۔ وہ سمجھی تھی موڑ کا انجمن بولا ہے۔۔۔ اس کا دل۔۔۔ یہ کیا ہو گیا تھا اس کے دل کو! آج ہی روگ لگ گیا تھا اسے۔۔۔ اچھا بھلا چلتا چلتا ایک جگہ رک کر دھڑک دھڑکیوں کرتا تھا۔۔۔ بالکل اس گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح جو سوئی کے نیچے ایک جگہ آکے رک جاتا تھا: ”رات کٹی گن گن تارے۔۔۔“ کہتا کہتا تارے تارے کی رٹ لگا دیتا تھا۔

آسمان تاروں سے اٹا ہوا تھا۔ سو گندھی نے ان کی طرف دیکھا اور کہا کتنے سندر ہیں۔۔۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنا دھیان کسی اور طرف پلٹ دے۔۔۔ پرجب اس نے سندر کہا تو جھٹ سے یہ خیال اس کے دماغ میں کوندا، ”یہ تارے سندر ہیں پر تو کتنی بھونڈی ہے۔۔۔ کیا بھول گئی ابھی ابھی تیری صورت کو پھٹکا را گیا ہے؟“

سو گندھی بد صورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ جو ان پانچ برسوں کے دوران میں وہ آئینے میں دیکھ چکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا رنگ روپ اب وہ نہیں رہا تھا جو آج سے پانچ سال پہلے تھا، جب کہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی لیکن وہ بد صورت تو نہیں ہو گئی تھی۔ اس کی شکل و صورت ان عام عورتوں کی سی تھی جن کی طرف مرد گزرتے گزرتے گھور کے دیکھ لیا کرتے ہیں۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو سو گندھی کے خیال میں ہر

مرد اس عورت میں ضروری سمجھتا ہے جس کے ساتھ اسے ایک دوران میں بسر کرنا ہوتی ہیں۔ وہ جوان تھی، اس کے اعضا متناسب تھے۔ کبھی کبھی نہاتے وقت جب اس کی نگاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں تو وہ خود ان کی گولائی اور گد گد اہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ خوش خلق تھی۔

ان پانچ برسوں کے دوران میں شاید ہی کوئی آدمی اس سے ناخوش ہو کر گیا ہو۔۔۔ بڑی ملنسار تھی، بڑی رحم دل تھی۔ پچھلے دنوں کر سمس میں جب وہ گول پیٹھا میں رہا کرتی تھی، ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس آیا تھا۔ صح اٹھ کر جب اس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھونٹی سے کوٹ اتارا تو بُوہ غائب پایا۔ سو گندھی کا نوکر یہ بُوہ لے اڑا تھا۔ بے چارہ بہت پریشان ہوا۔ چھٹیاں گزارنے کے لیے حیدر آباد سے بمبئی آیا تھا۔ اب اس کے پاس واپس جانے کے لیے دام نہ تھے۔ سو گندھی نے ترس کھا کر اسے اس کے دس روپے واپس دے دیے تھے۔۔۔

”مجھ میں کیا برائی ہے؟“

سو گندھی نے یہ سوال ہر اس چیز سے کیا جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ گیس کے اندر ہے یمپ، لوہے کے کھبے، فٹ پاٹھ کے چوکور پتھر اور سڑک کی اکھڑی ہوئی بجری۔۔۔ ان سب چیزوں کی طرف اس نے باری باری دیکھا، پھر آہمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ جو اس کے اوپر جھکا ہوا تھا مگر سو گندھی کو کوئی جواب نہ ملا۔

جواب اس کے اندر موجود تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بڑی نہیں اچھی ہے، پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی تائید کرے۔۔۔ کوئی۔۔۔ کوئی۔۔۔ اس وقت اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے، ”سو گندھی! کون کہتا ہے، تو بڑی ہے، جو تجھے برائے وہ آپ براہے۔۔۔“ نہیں یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا، ”سو گندھی تو بہت اچھی ہے!“

وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کوئی اس کی تعریف کرے۔ اس سے پہلے اسے اس بات کی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے ان پر اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا چاہتی ہے، اس کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں ”ماں“ بن رہا ہے۔۔۔ وہ ماں بن کر دھرتی کی ہرشے کو اپنی گود میں لینے کے لیے کیوں تیار ہو رہی تھی۔۔۔ اس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اس کے سر دلو ہے پر اپنے گال رکھ دے۔۔۔ اپنے گرم گرم گال اور اس کی ساری سردی چو س لے۔

تحوڑی دیر کے لیے اسے ایسا محسوس ہوا کہ گیس کے اندر ہے لیپ، لوہے کے کھبے، فٹ پاٹھ کے چوکور پتھر اور ہر وہ شے جو رات کے سننے میں اس کے آس پاس تھی۔ ہمدردی کی نظر وہ سے اسے دیکھ رہی ہے اور اس کے اوپر جھکا ہوا آسمان بھی جو میا لے رنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا تھا جس میں بے شمار سوراخ ہو رہے ہوں، اس کی باتیں سمجھتا تھا اور سو گندھی کو بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ تاروں کا ٹمثانا سمجھتی ہے لیکن اس کے اندر یہ کیا گڑ بڑ تھی۔۔۔؟ وہ کیوں اپنے اندر اس موسم کی فضائی محسوس کرتی تھی جو بارش سے پہلے دیکھنے میں آیا کرتا ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے جسم کا ہر مسام کھل جائے اور جو کچھ اس کے اندر ابل رہا ہے ان کے رستے باہر نکل جائے۔ پر یہ کیسے ہو۔۔۔ کیسے ہو؟

سو گندھی گلی کے نکٹ پر خطڈانے والے لال بھکے کے پاس کھڑی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے سے اس بھکے کی آہنی زبان جو اس کے کھلے ہوئے منہ میں لٹکتی رہتی ہے، لڑکھڑائی تو سو گندھی کی نگاہیں یک بیک اس کی طرف اٹھیں جدھر موڑ گئی تھی مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔۔۔ اسے کتنی زبردست آرزو تھی کہ موڑ پھرا ایک بار آئے اور۔۔۔ اور۔۔۔

”نہ آئے۔۔۔ بلا سے۔۔۔ میں اپنی جان کیوں بے کار ہلاکان کروں۔ گھر چلتے ہیں اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ ان جھگڑوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ مفت کی دردسری ہی تو ہے۔۔۔ چل سو گندھی گھر چل۔۔۔ ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگاپی اور تھوڑا سا بام مل کر سو جا۔۔۔ فست کلاس نیند آئے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ سیٹھ اور اس کی موڑ کی ایسی تمی۔۔۔“

یہ سوچتے ہوئے سو گندھی کا بوجھ ہلاکا ہو گیا جیسے وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہاد ہو کر باہر نکلی ہے۔ جس طرح پوچا کرنے کے بعد اس کا جسم ہلاکا ہو جاتا تھا، اسی طرح اب بھی ہلاکا ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف چلنے لگی تو خیالات کا بوجھنا ہونے کے باعث اس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔

اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کے ساتھ پھر تمام واقعہ اس کے دل میں اٹھا اور درد کی طرح اس کے روئیں روئیں پر چھا گیا۔ قدم پھر بو جھل ہو گئے اور وہ اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ گھر سے بلا کر، باہر بازار میں منہ پر روشنی کا چانٹا مار کر ایک آدمی نے اس کی ابھی ابھی ہتک کی ہے۔ یہ خیال آیا تو اس نے اپنی پسلیوں پر کسی کے سخت انگوٹھے محسوس کیے جیسے کوئی اسے بھیڑ بکری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال، ہی بال ہیں۔۔۔ اس سیٹھ نے۔۔۔ پر ماتما کرے۔۔۔ سو گندھی نے چاہا کہ اس کو بد دادے، مگر سوچا، بد دادینے سے کیا بنے گا۔ مزاوجہ تھا کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ اس کے وجود کے ہر ذرے پر لعنتیں لکھ دیتی۔۔۔ اس کے منہ پر کچھ ایسے الفاظ کہتی کہ زندگی بھر بے چین رہتا۔۔۔ کپڑے چاڑ کر اس کے سامنے نگلی ہو جاتی اور کہتی، ”یہی لینے آیا تھا نا تو۔۔۔؟ لے دام دیے بنالے جا سے۔۔۔ یہ جو کچھ میں ہوں، جو کچھ میرے اندر چھپا ہوا ہے وہ تو کیا، تیرا اب پ بھی نہیں خرید سکتا۔۔۔“

انتقام کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آرہے تھے۔ اگر اس سیٹھ سے ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار۔۔۔ اس کی ٹھیک بھیڑ ہو جائے تو یہ کرے۔ نہیں، یہ نہیں، یہ کرے۔۔۔ یوں اس سے انتقام لے، نہیں یوں نہیں، یوں۔۔۔ لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیٹھ سے اس کا دوبارہ ملنا محال ہے تو وہ اسے ایک چھوٹی سی گالی دینے ہی پر خود کو راضی کر لیتی۔۔۔ بس صرف ایک چھوٹی سی گالی، جو اس کی ناک پر چکپو کھی کی طرح بیٹھ جائے اور ہمیشہ وہیں جی رہے۔

اسی ادھیر بن میں وہ دوسری منزل پر اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی۔ چوپی میں سے چاپی نکال کر تلاکھو لئے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو چاپی ہوا، ہی میں گھوم کر رہ گئی! کنڈے میں تلا نہیں تھا۔ سوگندھی نے کواڑ اندر کی طرف دبائے تو بلکل سی چڑچڑاہٹ پیدا ہو گئی۔ اندر سے کنڈی کھولی گئی اور دروازے نے جماں لی، سوگندھی اندر داخل ہو گئی۔

مادھو موچھوں میں ہنسا اور دروازہ بند کر کے سوگندھی سے کہنے لگا، ”آج تو نے میرا کہماں ہی لیا۔۔۔ صح کی سیر تند رستی کے لیے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہر روز اس طرح صح اٹھ کر گھومنے جایا کرے گی تو تیری ساری سستی دور ہو جائے گی اور وہ تیری کمر کا درد بھی غائب ہو جائے گا، جس کی بابت تو آئے دن شکایت کیا کرتی ہے۔۔۔ وکٹوریہ گارڈن تک ہو آئی ہو گی تو۔۔۔ کیوں؟“

سوگندھی نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ مادھونے جواب کی خواہش ظاہر کی۔ دراصل جب مادھو بات کیا کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ سوگندھی ضرور اس میں حصہ لے اور سوگندھی جب کوئی بات کیا کرتی تھی یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ مادھو اس میں حصہ لے۔۔۔ چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی، اس لیے وہ کہہ دیا کرتے تھے۔

مادھو بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جس کی پشت پر اس کے تیل سے چڑے ہوئے سرنے میں کا ایک بہت بڑا دھبہ بنار کھاتھا۔ اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنی موچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ سوگندھی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اور مادھو سے کہنے لگی، ”میں آج تیر انتظار کر رہی تھی۔“

مادھو بڑا سپٹا یا: ”انتظار۔۔۔؟ تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں آج آنے والا ہوں۔“

سوگندھی کے بھچنے ہوئے لب کھلے۔ ان پر ایک پیلی مسکراہٹ نمودار ہو گئی، ”میں نے رات تجھے سپنے میں دیکھا تھا۔۔۔ انھی تو کوئی بھی نہ تھا۔ سوچی نے کہا، چلو کہیں باہر گھوم آئیں۔۔۔ اور۔۔۔“

مادھو خوش ہو کر بولا، ”اور میں آگیا۔۔۔ بھئی بڑے لوگوں کی باتیں بڑی پکی ہوتی ہیں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے، دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔۔۔ تو نے یہ سپنا کب دیکھا تھا؟“

سو گندھی نے جواب دیا، ”چار بجے کے قریب۔“

مادھو کرسی سے اٹھ کر سو گندھی کے پاس بیٹھ گیا، ”اور میں نے تجھے ٹھیک دو بجے سپنے میں دیکھا۔۔۔ جیسے تو پھولوں والی سارا ٹھی۔۔۔ ارے بالکل یہی سارا ٹھی پہنے میرے پاس کھڑی ہے تیرے ہاتھوں میں۔۔۔ کیا تھا تیرے ہاتھوں میں۔۔۔! ہاں تیرے ہاتھوں میں روپوں سے بھری ہوئی تھیں تھی۔ تو نے یہ تھیلی میری جھوٹی میں رکھ دی۔ اور کہا، ”مادھو تو چتنا کیوں کرتا ہے۔۔۔؟ لے یہ تھیلی۔ ارے تیرے میرے روپے کیا دو ہیں۔۔۔؟ سو گندھی تیری جان کی قسم فوراً اٹھا اور لٹک کشا کرا دھر کا رخ کیا۔۔۔ کیا سناوں بڑی پریشانی ہے! بیٹھ بٹھائے ایک کیس ہو گیا ہے اب میں تیس روپے ہوں تو ان سپکٹر کی مٹھی گرم کر کے چھکارا ملے۔۔۔ تھک تو نہیں گئی تو؟ لیٹ جا میری طرف پیٹ کر کے لیٹ جا۔“

سو گندھی لیٹ گئی۔ دونوں بانہوں کا تکیہ بنایا کروہ ان پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ اور اس لمحے میں جواس کا اپنا نہیں تھا، مادھو سے کہنے لگی، ”مادھو یہ کس موئے نے تجھ پر کیس کیا ہے۔۔۔؟ بیل ویل کا ڈر ہو تو مجھ سے کہہ دے، میں تیس کیا، سو پچاس بھی ایسے موقعوں پر پولیس کے ہاتھ میں تھا مادیے جائیں تو فائدہ اپناہی ہے۔۔۔ جان بچی لاکھوں پائے۔۔۔ بس بس اب جانے دے۔ تھکن کچھ زیادہ نہیں ہے۔۔۔ مٹھی چاپی چھوڑ اور مجھے ساری بات سن۔۔۔ کیس کا نام سنتے ہی میرا دل دھک کرنے لگا ہے۔۔۔ واپس کب جائے گا تو؟“

مادھو کو سو گندھی کے منہ سے شراب کی باس آئی تو اس نے یہ موقع اچھا سمجھا اور جھٹ سے کہا، ”دو پھر کی گاڑی سے واپس جانا پڑے گا۔۔۔ اگر شام تک سب اسپکٹر کو سو پچاس نہ تھاۓ تو۔۔۔ زیادہ دینے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں بچاس میں کام چل جائے گا۔“

”پچاس!“ یہ کہہ کر سو گندھی بڑے آرام سے اٹھی اور ان چار تصویروں کے پاس آہستہ آہستہ گئی۔ جو دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ باعث طرف سے تیرے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔ بڑے بڑے پھولوں والے پردے کے آگے کرسی پر وہ دونوں رانوں پر اپنے ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا۔ پاس ہی تپائی پر دو موٹی موٹی کتابیں دھری تھیں۔ تصویر اتر واتے وقت، تصویر اتر وانے کا خیال مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اس کی ہر شے تصویر سے باہر نکل کر پا رہی تھی: ”ہمارا فوٹو اترے گا۔ ہمارا فوٹو اترے گا!“

کیمرے کی طرف مادھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوٹو اتواتے وقت اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

سوگندھی لکھلا کر ہنس پڑی۔۔۔ اس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نوکیلی تھی کہ مادھو کے سوپاں سی چھیں۔ پنگ پر سے اٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا، ”کس کی تصویر دیکھ کر تو اس قدر زور سے ہنسی ہے؟“

سوگندھی نے باسیں ہاتھ کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو میونسپلی کے داروغہ صفائی کی تھی، ”اس کی۔۔۔ منشی پالٹی کے داروغہ کی۔۔۔ ذرا دیکھ تو اس کا تھوڑا۔۔۔ کہتا تھا، ایک رانی مجھ پر عاشق ہو گئی تھی۔۔۔ او نہہ! یہ منہ اور مسور کی دال۔“ یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار میں سے کیل بھی پلستر سمیت اکھڑ آئی!

مادھو کی حیرت ابھی دور نہ ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ دو منزلوں سے فریم نیچے زمین پر گرا اور کانچ ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی۔ سوگندھی نے اس جھنکار کے ساتھ کہا، ”رانی بھنگن کچرا اٹھانے آئے گی۔ تو میرے اس راجہ کو بھی ساتھ لے جائے گی۔“

ایک بار پھر اسی نوکیلی اور تیکھی ہنسی کی پھوار سوگندھی کے ہونٹوں سے گرن اثر دع ہوئی جیسے وہ ان پر چاقو یا چھری کی دھار تیز کر رہی ہے۔
مادھو بڑی مشکل سے مسکرا یا۔ پھر ہنسا۔ ”ہی ہی ہی۔۔۔“

سوگندھی نے دوسرا فریم بھی نوج لیا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ ”اس سالے کا یہاں کیا مطلب ہے۔۔۔؟ بھوٹی شکل کا کوئی آدمی یہاں نہیں رہے گا۔۔۔ کیوں مادھو؟“

مادھو پھر بڑی مشکل سے مسکرا یا اور پھر ہنسا، ”ہی ہی ہی۔“

ایک ہاتھ سے سوگندھی نے گپڑی والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو کا فوٹو جڑا تھا۔ مادھو اپنی جگہ پر سمت گیا، جیسے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سینٹ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔

زور کا قہقہہ لگا کر اس نے ”اوہنہ“ کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹونے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر کہا، ”اچھا کیا۔۔۔؟ مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔“

آہستہ آہستہ سو گندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی، ”تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔ پر میں پوچھتی ہوں تجھ میں ایسی کون سی چیز ہے جو کسی کو پسند آسکتی ہے۔۔۔ تیری کپڑا ایسی ناک، یہ تیرابالوں بھرا تھا، یہ تیرے سوچے ہوئے نہیں، یہ تیرے بڑھے ہوئے کان، یہ تیرے منہ کی باس، یہ تیرے بدن کا میل۔۔۔؟ تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا، اوہنہ۔۔۔ پسند کیوں ہوتا، تیرے عیب جو چھپا رکھے تھے اس نے۔۔۔ آج کل زمانہ ہی ایسا ہے جو عیب چھپائے وہی بر۔۔۔“

مادھو پچھے ہٹا گیا۔ آخر جب وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا تو اس نے اپنی آواز میں زور پیدا کر کے کہا، ”دیکھو سو گندھی، مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کر دیا ہے۔۔۔ اب میں تجھ سے آخری بار کہتا ہوں۔۔۔“

سو گندھی نے اس سے آگے مادھو کے لبجے میں کہنا شروع کیا، ”اگر تو نے پھر سے دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے پھر کسی کو اپنے یہاں بلا یا تو چڑیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا۔۔۔ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا سے ہی منی آرڈر کر دوں گا۔۔۔ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟“

مادھو چکر اگیا۔

سو گندھی نے کہنا شروع کیا، ”میں بتاتی ہوں۔۔۔ پندرہ روپیہ بھاڑا ہے اس کھولی کا۔۔۔ اور دس روپیہ بھاڑا ہے میرا۔۔۔ اور جیسا تجھے معلوم ہے۔ ڈھائی روپے دلال کے۔ باقی رہے ساڑھے سات۔ ہے ناساڑھے سات؟ ان ساڑھے سات روپیوں میں میں نے ایسی چیز دینے کا وچن دیا تھا جو میں دے ہی نہیں سکتی تھی۔ اور تو ایسی چیز لینے آیا تھا جو تو لے ہی نہیں سکتا تھا۔۔۔ تیر امیر اناتھی کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ بس یہ دس روپے تیرے اور میرے بیچ میں نج رہے تھے، سو ہم دونوں نے مل کر ایسی بات کی کہ تجھے میری ضرورت اور مجھے تیری۔۔۔ پہلے تیرے اور میرے بیچ میں دس روپے بجھتے تھے، آج پچاس نج رہے ہیں۔ تو بھی ان کا بجناسن رہا ہے اور میں بھی ان کا بجناسن رہی ہوں۔۔۔ یہ تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیا ناس کر رکھا ہے؟“

یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی انگلی سے ایک طرف اڑا دی۔ یہ حرکت مادھو کو بہت ناگوار گزرا۔ اس نے بڑے کڑے لبھے میں کہا،
”سوگندھی!“

سوگندھی نے مادھو کی جیب سے رومال نکال کر سو نگھا اور زمین پر چھینک دیا۔ یہ ”چیخڑے، یہ چند یاں--- اف کتنی بری باس آتی ہے، اٹھا
کے باہر چھینک ان کو---“

مادھو چلا یا، ”سوگندھی!“

سوگندھی نے تیز لبھے میں کہا، ”سوگندھی کے بچی تو آیا کس لیے ہے یہاں؟ تیری ماں رہتی ہے اس جگہ جو تجھے پچاس روپے دے گی؟ یا تو
کوئی ایسا بڑا گبر و جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں، کتنے، کمینے، مجھ پر رعب گانختا ہے؟ میں تیری دبیل ہوں کیا۔---؟ بھک منگے تو
اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے؟ میں کہتی ہوں تو ہے کون؟ چور یا لٹکتا۔---؟ اس وقت تو میرے مکان میں کرنے کیا آیا ہے؟ بلاوں پویں
کو۔ پونے میں تجھ پر کیس ہونہ ہو، یہاں تو تجھ پر ایک کیس کھڑا کر دوں---“

مادھو سہم گیا۔ دبے ہوئے لبھے میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا، ”سوگندھی، تجھے کیا ہو گیا ہے؟“

”تیری ماں کا سر۔--- تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا۔--- بھاگ یہاں سے، ورنہ۔---“ سوگندھی کی بلند آواز سن کر اس کا
خارش زدہ کتابوں سوکھے ہوئے چلوں پر منہ رکھے سورہاتھا، ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا اور مادھو کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔ کتنے کے
بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندھی زور سے ہنسنے لگی۔

مادھو ڈر گیا۔ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لیے وہ جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی، ”خبردار۔--- پڑی رہنے دے وہیں۔--- تو جا، تیرے پونا
پہنچتے ہی میں اس کو منی آرڈر کر دوں گی۔“ یہ کہہ کروہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی کر سی پر بیٹھ گئی۔ اس کے خارش زدہ کتنے نے بھونک
بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ سیڑھیاں اتار کر جب کتا اپنی ٹنڈ منڈ دم ہلاتا سوگندھی کے پاس آیا اور اس کے قدموں کے پاس
بیٹھ کر کان پھٹ پھٹانے لگا۔ تو سوگندھی چونکی۔--- اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سنناٹا دیکھا۔--- ایسا نٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ
دیکھا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے۔ جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لو ہے کے شیڈ میں
بالکل اکیلی کھڑی ہے۔ یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا، اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے کافی دیر تک اس خلا کو

بھرنے کی کوشش کی۔ مگر بے سود، وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی مگر بالکل چھلنے کا سا حساب تھا۔ ادھر دماغ کو پر کرتی تھی ادھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پر چانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کئے کو گود میں اٹھایا اور سا گوان کے چوڑے پنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔

-[19]-

اولاد: سعادت حسن منشو

جب زبیدہ کی شادی ہوئی تو اس کی عمر پچیس برس کی تھی۔ اس کے ماں باپ تو یہ چاہتے تھے کہ سترہ برس کے ہوتے ہی اس کا بیاہ ہو جائے مگر کوئی مناسب و موزوں رشتہ ملتا ہی نہیں تھا۔ اگر کسی جگہ بات طے ہونے پاتی تو کوئی ایسی مشکل پیدا ہو جاتی کہ رشتہ عملی صورت اختیار نہ کر سکتا۔

آخر جب زبیدہ پچیس برس کی ہو گئی تو اس کے باپ نے ایک رندوے کار شستہ قبول کر لیا۔ اس کی عمر پینتیس برس کے قریب قریب تھی، یا شاید اس سے بھی زیادہ ہو۔ صاحب روزگار تھا۔ مارکیٹ میں کپڑے کی تھوک فروشی کی دکان تھی۔ ہر ماہ پانچ چھ سوروپے کا لیتا تھا۔

زبیدہ بڑی فرمائی بردار لڑکی تھی۔ اس نے اپنے والدین کا فیصلہ منظور کر لیا۔ چنانچہ شادی ہو گئی، اور وہ اپنے سسرال چلی گئی۔

اس کا خاوند جس کا نام علم الدین تھا، بہت شریف اور محبت کرنے والا ثابت ہوا۔ زبیدہ کی ہر آسائش کا خیال رکھتا۔ کپڑے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ حالانکہ دوسرے لوگ اس کے لیے ترستے تھے۔ چالیس ہزار اور تھمری بی کا لٹھا، شنوں اور دو گھوڑے کی بو سکی کے تھانوں کے تھان زبیدہ کے پاس موجود تھے۔

وہ اپنے میکے ہر ہفتے جاتی۔۔۔ ایک دن وہ گئی تو اس نے ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی بین کرنے کی آواز سنی۔ اندر گئی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا باپ اچانک دل کی حرکت بند ہونے کے باعث مر گیا ہے۔ اب زبیدہ کی ماں اکیلی رہ گئی تھی۔ گھر میں سوانے ایک نوکر کے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنے شوہر سے درخواست کی کہ وہ اسے اجازت دے کہ وہ اپنی بیوہ ماں کو اپنے پاس بلائے۔

علم الدین نے کہا، ”اجازت لینے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ یہ تمہارا گھر ہے اور تمہاری ماں میری ماں۔۔۔ جاؤ انہیں لے آؤ۔۔۔ جو سامان وغیرہ ہو گا اس کو یہاں لانے کا بندوبست میں ابھی کیے دیتا ہوں۔“

زبیدہ بہت خوش ہوئی۔ گھر کافی بڑا تھا۔ دو تین کمرے خالی پڑے تھے۔ وہ تانگے میں گئی اور اپنی ماں کو ساتھ لے آئی۔ علم الدین نے سامان اٹھوانے کا بندوبست کر دیا تھا، چنانچہ وہ بھی پہنچ گیا۔ زبیدہ کی ماں کے لیے کچھ سوچ بچار کے بعد ایک کمرہ مختص کر دیا گیا۔

وہ بہت منون و مشکر تھی۔ اپنے داماد کے حسن سلوک سے بہت متاثر۔ اس کے جی میں کئی مرتبہ یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنا سارا زیور جو کئی ہزاروں کی مالیت کا تھا، اس کو دے دے کہ وہ اپنے کاروبار میں لگائے اور زیادہ کمائے۔ مگر وہ طبعاً کنجوس تھی۔

ایک دن اس نے اپنی بیٹی سے کہا، ”مجھے یہاں آئے دس مہینے ہو گئے ہیں۔۔۔ میں نے اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔۔۔ حالانکہ تمہارے مرحوم باپ کے چھوٹے ہوئے دس ہزار روپے میرے پاس موجود ہیں۔۔۔ اور زیور الگ۔“

زبیدہ انگیٹھی کے کوئلوں پر پھلا کاسیک رہی تھی، ”ماں، تم بھی کیسی بتیں کرتی ہو۔۔۔“

”کیسی ولیسی میں نہیں جانتی۔۔۔ میں نے یہ سب روپے علم الدین کو دے دیے ہوتے، مگر میں چاہتی ہوں کہ تمہارے کوئی بچہ پیدا ہو۔۔۔ تو یہ سارا روپیہ اس کو تھفے کے طور پر دوں۔۔۔“

زبیدہ کی ماں کو اس بات کا بڑا نتیجہ تھا کہ ابھی تک بچہ پیدا کیوں نہیں ہوا۔۔۔ شادی ہوئے قریب قریب دو برس ہو چکے تھے، مگر بچے کی پیدائش کے آثار ہی نظر نہیں آتے تھے۔ وہ اسے کئی حکیموں کے پاس لے گئی۔ کئی معجونیں، کئی سفوف، کئی قرص اس کو کھلوائے، مگر خاطر خواہ نتیجہ برآمدہ ہوا۔

آخر اس نے پیروں نقیروں سے رجوع کیا۔ ٹونے ٹونے مکمل استعمال کیے گئے، تعویز، دھاگے بھی۔۔۔ مگر مراد برلن آئی۔ زبیدہ اس دوران میں تنگ آگئی۔ ایک دن چنانچہ اس نے اکتا کر اپنی ماں سے کہہ دیا، ”چھوڑو اس قصے کو۔۔۔ بچہ نہیں ہوتا تو نہ ہو۔۔۔“

اس کی بوڑھی ماں نے منہ بسور کر کہا، ”بیٹا۔۔۔ یہ بہت بڑا قصہ ہے۔۔۔ تمہاری عقل کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے۔۔۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھتی کہ اولاد کا ہونا کتنا ضروری ہے۔۔۔ اسی سے تو انسان کی زندگی کا باعث سدا ہر ابھر رہتا ہے۔“

زبیدہ نے پہلا چنگیز میں رکھا، ”میں کیا کروں۔۔۔ بچہ پیدا نہیں ہوتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“

بڑھیانے کہا، ”قصور کسی کا بھی نہیں بیٹی۔۔۔ بس صرف ایک اللہ کی مہربانی چاہیے۔“

زبیدہ اللہ میاں کے حضور ہزاروں مرتبہ دعائیں مانگ چکی تھی کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اس کی گودھری کرے، مگر اس کی ان دعاؤں سے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

جب اس کی ماں نے ہر روز اس سے بچے کی پیدائش کے متعلق باتیں کرنا شروع کیں، تو اس کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ بخوبی میں ہے، جس میں کوئی پودا اگھی نہیں سکتا۔ راتوں کو وہ عجیب عجیب سے خواب دیکھتی۔ بڑے اوٹ پلانگ قسم کے۔ کبھی یہ دیکھتی کہ وہ لق و دق صحراء میں کھڑی ہے، اس کی گود میں ایک گل گو تھنا سا بچہ ہے، جسے وہ ہوا میں اتنے زور سے اچھاتی ہے کہ وہ آسمان تک پہنچ کر غائب ہو جاتا ہے۔ کبھی یہ دیکھتی کہ وہ اپنے بستر میں لیٹی ہے جو نہیں منے پکوں کے زندہ اور متحرک گوشت سے بنتا ہے۔

ایسے خواب دیکھ دیکھ کر اس کا دل و دماغ غیر متوازن ہو گیا۔۔۔ بیٹھے بیٹھے اس کے کانوں میں بچوں کے رونے کی آواز آنے لگی، اور وہ اپنی ماں سے کہتی، ”یہ کس کا بچہ رورہا ہے؟“ اس کی ماں نے اپنے کانوں پر زور دے کر یہ آواز سننے کی کوشش کی، جب کچھ سنائی نہ دیا تو اس نے کہا ”کوئی بچہ رو نہیں رہا۔۔۔“

”نہیں ماں۔۔۔ رو رہا ہے۔۔۔ بلکہ رو رو کے ہلاکاں ہوئے جا رہا ہے۔“

اس کی ماں نے کہا، ”یا تو میں بھری ہو گئی ہوں، یا تمہارے کان بختے لگے ہیں۔“

زبیدہ خاموش ہو گئی، لیکن اس کے کانوں میں دیر تک کسی نوزائدہ بچ کے رونے اور بلکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ اس کو کئی بار یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کی چھاتیوں میں دودھ اتر رہا ہے۔ اس کا ذکر اس نے اپنی ماں سے نہ کیا۔ لیکن جب وہ اندر اپنے کمرے میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے گئی تو اس نے قمیں اٹھا کر دیکھا کہ اس کی چھاتیاں ابھری ہوئی تھیں۔

بچ کے رونے کی آواز اس کے کانوں میں اکثر پیکتی رہی۔۔۔ لیکن وہاب سمجھ گئی تھی کہ یہ سب وابحہ ہے۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ اس کے دل و دماغ پر مسلسل ہتھوڑے پڑتے رہے ہیں کہ اس کے بچ کیوں نہیں ہوتا اور وہ خود بھی بڑی شدت سے وہ خلا محسوس کرتی ہے، جو کسی بیانی عورت کی زندگی میں نہیں ہونا چاہیے۔

وہاب بہت اداس رہنے لگی۔۔۔ محلے میں بچ شور مچاتے تو اس کے کان پھٹنے لگتے۔ اس کا جی چاہتا کہ باہر نکل کر ان سب کا گلا گھونٹ ڈالے۔ اس کے شوہر علم الدین کو اولاد و ولاد کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ اپنے بیوپار میں مگن تھا۔ کپڑے کے بھاؤ روز بروز چڑھ رہے تھے۔ آدمی چونکہ ہوشیار تھا، اس لیے اس نے کپڑے کا کافی ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ اب اس کی ماہانہ آمدن پہلے سے دو گناہو گئی تھی۔

مگر اس آمدن کی زیادتی سے زبیدہ کو کوئی خوشی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ جب اس کا شوہر نوٹوں کی گذگی اس کو دیتا، تو اسے اپنی جھوٹی میں ڈال کر دیر تک انہیں لوری دیتی رہتی۔۔۔ پھر وہ انہیں اٹھا کر کسی خیالی جھولنے میں بٹھا دیتی۔

ایک دن علم الدین نے دیکھا کہ وہ نوٹ جو اس نے اپنی بیوی کو لا کر دیے تھے، دودھ کی پیتلی میں پڑے ہیں۔ وہ بہت حیران ہوا کہ یہ کیسے یہاں پہنچ گئے۔ چنانچہ اس نے زبیدہ سے پوچھا، ”یہ نوٹ دودھ کی پیتلی میں کس نے ڈالے ہیں؟“

زبیدہ نے جواب دیا، ”بچ بڑے شریر ہیں، یہ حرکت انہی کی ہو گی۔“

علم الدین بہت متحیر ہوا، ”لیکن یہاں بچ کہاں ہیں؟“

زبیدہ اپنے خاوند سے کہیں زیادہ متحیر ہوئی، ”کیا ہمارے ہاں بچ نہیں۔۔۔ آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔۔۔ ابھی اسکول سے واپس آتے ہوں گے۔۔۔ ان سے پوچھوں گی کہ یہ حرکت کس کی تھی۔“

علم الدین سمجھ گیا، اس کی بیوی کے دماغ کا توازن قائم نہیں۔ لیکن اس نے اپنی ساس سے اس کا ذکر نہ کیا کہ وہ بہت کمزور عورت تھی۔ وہ دل ہی دل میں زبیدہ کی دماغی حالت پر افسوس کرتا رہا۔ مگر اس کا اعلان اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس نے اپنے کئی دوستوں سے مشورہ لیا۔ ان میں سے چند نے اس سے کہا کہ پاگل خانے میں داخل کر دو۔ مگر اس کے خیال ہی سے اسے وحشت ہوتی تھی۔

اس نے دکان پر جانا چھوڑ دیا۔ سارا وقت گھر رہتا اور زبیدہ کی دیکھ بھال کرتا کہ مبادا وہ کسی روز کوئی خطرناک حرکت کر بیٹھے۔

اس کے گھر پر ہر وقت موجود رہنے سے زبیدہ کی حالت کسی قدر درست ہو گئی، لیکن اس کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ دکان کا کاروبار کون چلا رہا ہے۔ کہیں وہ آدمی جس کو یہ کام سپرد کیا گیا ہے، غبن تو نہیں کر رہا۔

اس نے چنانچہ کئی مرتبہ اپنے خاوند سے کہا، ”دکان پر تم کیوں نہیں جاتے؟“

علم الدین نے اس سے بڑے پیار کے ساتھ کہا، ”جانم--- میں کام کر کے تھک گیا ہوں، اب تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔“

”مگر دکان کس کے سپرد ہے؟“

”میرا نو کر ہے--- وہ سب کام کرتا ہے۔“

”کیا ایمان دار ہے؟“

”ہاں، ہاں--- بہت ایمان دار ہے--- دمڑی دمڑی کا حساب دیتا ہے--- تم کیوں فگر کرتی ہو۔“

زبیدہ نے بہت متفکر ہو کر کہا، ”مجھے کیوں فکر نہ ہو گی، بال بچے دار ہوں۔ مجھے اپنا تو کچھ خیال نہیں، لیکن ان کا تو ہے--- یہ آپ کا نوکر اگر آپ کا روپیہ مار گیا تو یہ سمجھیے کہ بچوں---“

علم الدین کی آنکھوں میں آنسو آگئے، ”زبیدہ۔۔۔ ان کا اللہ مالک ہے۔۔۔ ویسے میر انوکر بہت وفادار ہے اور ایمان دار ہے۔ تمہیں کوئی تردود نہیں کرنا چاہیے۔“

”مجھے تو کسی قسم کا تردود نہیں ہے، لیکن بعض اوقات ماں کو اپنی اولاد کے متعلق سوچنا ہی پڑتا ہے۔“

علم الدین بہت پریشان تھا کہ کیا کرے۔ زبیدہ سارا دن اپنے خیالی بچوں کے کپڑے سیتی رہتی۔ ان کی جرایں دھوتی، ان کے لیے اونی سویٹر بنتی۔ کئی بار اس نے اپنے خاوند سے کہہ کر مختلف سائز کی چھوٹی چھوٹی سینڈ لیں منگوائیں، جنہیں وہ صبح پالش کرتی تھی۔

علم الدین یہ سب کچھ دیکھتا اور اس کا دل رونے لگتا۔ اور وہ سوچتا کہ شاید اس کے گناہوں کی سزا اس کو مل رہی ہے۔ یہ گناہ کیا تھے، اس کا علم، علم الدین کو نہیں تھا۔

ایک دن اس کا ایک دوست اس سے ملا جو بہت پریشان تھا۔ علم الدین نے اس سے پریشانی کی وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ اس کا ایک لڑکی سے معاشقہ ہو گیا تھا۔ اب وہ حاملہ ہو گئی۔ اسقاط کے تمام ذرائع استعمال کیے گئے ہیں مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ علم الدین نے اس سے کہا، ”دیکھو، اسقاط و سقط کی کوشش نہ کرو۔ بچہ پیدا ہونے دو۔“

اس کے دوست نے، جسے ہونے والے بچے سے کوئی لمحپی نہیں تھی، کہا، ”میں بچے کا لیا کروں گا؟“

”تم مجھے دے دینا۔“

بچہ پیدا ہونے میں کچھ دیر تھی۔ اس دوران میں علم الدین نے اپنی بیوی زبیدہ کو لیقین دلایا کہ وہ حاملہ ہے اور ایک ماہ کے بعد اس کے بچہ پیدا ہو جائے گا۔

زبیدہ بار بار کہتی، ”مجھے اب زیادہ اولاد نہیں چاہیے، پہلے ہی کیا کم ہیں۔“

علم الدین خاموش رہتا۔

اس کے دوست کی داشتہ کے لڑکا پیدا ہوا، جو علم الدین نے زبیدہ کے پاس، جو کہ سورہی تھی، لٹادیا۔۔۔ اور اسے جگا کر کہا ”زبیدہ، تم کب تک بے ہوش پڑی رہو گی۔ یہ دیکھو، تمہارے پہلو میں کیا ہے؟“

”zbideh نے کروٹ بدی اور دیکھا کہ اس کے ساتھ ایک نخاماں تجھے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، علم الدین نے اس سے کہا، ”لڑکا ہے۔ اب خدا کے فضل و کرم سے ہمارے پانچ بچے ہو گئے ہیں۔“

زبیدہ بہت خوش ہوئی، ”یہ لڑکا کب پیدا ہوا؟“

”صحیح سات بجے۔“

”اور مجھے اس کا علم ہی نہیں۔۔۔ میرا خیال ہے، درد کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گئی ہوں گی۔“

علم الدین نے کہا، ”ہاں، کچھ ایسی ہی بات تھی، لیکن اللہ کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو گیا۔“

دوسرے روز جب علم الدین اپنی بیوی کو دیکھنے لیا تو اس نے دیکھا کہ وہ اہولہ بان ہے۔ اس کے ہاتھ میں اس کا کٹ تھروٹ استرا ہے۔ وہ اپنی چھاتیاں کاٹ رہی ہے۔

علم الدین نے اس کے ہاتھ سے استرا چھین لیا، ”یہ کیا کر رہی ہو تم؟“

زبیدہ نے اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے بچے کی طرف دیکھا اور کہا، ”ساری رات بلکتر رہا ہے، لیکن میری چھاتیوں میں دودھ نہ اترتا۔۔۔ لعنت ہے ایسی۔۔۔“

اس سے آگے، وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ خون سے لھڑری ہوئی ایک انگلی اس نے بچے کے منہ کے ساتھ لگادی، اور ہمیشہ کی نیند سو گئی۔

وہ جب اسکول کی طرف روانہ ہوا تو اس نے راستے میں ایک قصائی دیکھا، جس کے سر پر ایک بہت بڑا ٹوکرا تھا۔ اس ٹوکرے میں دو تازہ ذبح کیے ہوئے بکرے تھے۔ کھالیں اتری ہوئی تھیں، اور ان کے ننگے گوشت میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ جگہ جگہ پر یہ گوشت جس کو دیکھ کر مسعود کے ٹھنڈے گالوں پر گرمی کی لہریں سی دوڑ جاتی تھیں، پھر کر رہا تھا جیسے کبھی کبھی اس کی آنکھ پھر کا کرتی تھی۔

اس وقت سوانوبجے ہوں گے مگر جھکے ہوئے خاکستری بادلوں کے باعث ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سویرا ہے۔ سردی میں شدت نہیں تھی، لیکن راہ پلے آدمیوں کے منہ سے گرم گرم سماوار کی ٹونیوں کی طرح گاڑھا سفید دھواں نکل رہا تھا۔ ہرشے بو جھل دکھائی دیتی تھی جیسے بادلوں کے وزن کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ موسم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو بڑے کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہو۔ اس کے باوجود کہ بازار میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی اور دکانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو چکے تھے؛ آوازیں مددھم تھیں، جیسے سر گوشیاں ہو رہی ہیں، چکے چپکے، دھیرے دھیرے باقیں ہو رہی ہیں، ہولے ہولے لوگ قدم اٹھا رہے ہیں کہ زیادہ اونچی آواز پیدا نہ ہو۔

مسعود بغل میں بستہ دبائے اسکول جا رہا تھا۔ آج اس کی چال بھی سست تھی۔ جب اس نے بے کھال کے تازہ ذبح کیے ہوئے بکروں کے گوشت سے سفید سفید دھواں اٹھتا دیکھا تو اسے راحت محسوس ہوئی۔ اس دھوکیں نے اس کے ٹھنڈے ٹھنڈے گالوں پر گرم گرم لکیروں کا ایک جال سا بن دیا۔ اس گرمی نے اسے راحت پہنچائی اور وہ سوچنے لگا کہ سردیوں میں ٹھنڈے تختا ہوں پر بید کھانے کے بعد اگر یہ دھواں مل جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔

فضامیں اجلاء پن نہیں تھا۔ روشنی تھی مگر دھنڈی۔ کہر کی ایک پتلی سی تہہ ہر شے پر چڑھی ہوئی تھی جس سے فضامیں گدلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ یہ گدلا پن آنکھوں کو اچھا معلوم ہوتا تھا اس لیے کہ نظر آنے والی چیزوں کی نوک پلک کچھ مددھم پڑ گئی تھی۔

مسعود جب اسکول پہنچا تو اسے اپنے ساتھیوں سے یہ معلوم کر کے قطعی طور پر خوشی نہ ہوئی کہ اسکول سکتر صاحب کی موت کے باعث بند کر دیا گیا ہے۔ سب لڑکے خوش تھے جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے بستے ایک جگہ پر رکھ کر اسکول کے صحن میں اوٹ پلانگ کھیلوں میں

مشغول تھے۔ کچھ چھٹی کا پتہ معلوم کرتے ہی گھر چلے گے۔ کچھ آرہے تھے اور کچھ نوٹس بورڈ کے پاس جمع تھے اور بار بار ایک ہی عبارت پڑھ رہے تھے۔

مسعود نے جب سنائے سکتر صاحب مر گئے ہیں تو اسے بالکل افسوس نہ ہوا۔ اس کا دل جذبات سے بالکل خالی تھا۔ البتہ اس نے یہ ضرور سوچا کہ پچھلے برس جب اس کے دادا جان کا انتقال ان ہی دنوں میں ہوا تو ان کا جنازہ لے جانے میں بڑی دقت ہوئی تھی اس لیے کہ بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ بھی جنازے کے ساتھ لیا تھا اور قبرستان میں چکنی کی پڑکے باعث ایسا پھسلاتا تھا کہ کھدی ہوئی قبر میں گرتے گرتے مچا تھا۔ یہ سب باقیں اس کو اچھی طرح یاد تھیں۔ سردی کی شدت، اس کے کیچھ سے لٹ پٹ کپڑے، سرخی مائل نیلے ہاتھ جن کو دبانے سے سفید سفید دھبے پڑ جاتے تھے، ناک جو کہ برف کی ڈلی معلوم ہوتی تھی اور پھر آکر ہاتھ پاؤں دھونے اور کپڑے بدلنے کا مرحلہ۔۔۔ یہ سب کچھ اس کو اچھی طرح یاد تھا۔ چنانچہ جب اس نے سکتر صاحب کی موت کی خبر سنی تو اسے یہ بیتی ہوئی باقی یاد آگئیں اور اس نے سوچا، جب سکتر صاحب کا جنازہ اٹھے گا تو بارش شروع ہو جائے گی اور قبرستان میں اتنی کیچھ ہو جائے گی کہ کئی لوگ پھسلیں گے اور ان کو ایسی چوٹیں آئیں گی کہ بلبا اٹھیں گے۔

مسعود نے یہ خبر سن کر سیدھا اپنی کلاس کا رخ کیا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنے ڈسک کا تالا کھولا۔ دو تین کتابیں جو کہ اسے دوسرے روز پھر لانا تھیں، اس میں رکھیں اور باقی بستہ اٹھا کر گھر کی جانب چل پڑا۔

راستے میں اس نے پھر وہی دو تازہ ذبح کیے ہوئے بکرے دیکھے۔ ان میں سے ایک کواب قصائی نے لکھا دیا تھا وہ سر اتنی پڑھا تھا۔ جب مسعود دکان پر سے گزر اتواس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ گوشت کو جس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا، چھو کر دیکھے۔ چنانچہ آگے بڑھ کر اس نے انگلی سے بکرے کے اس حصے کو چھو کر دیکھا جو ابھی تک پھر کر رہا تھا۔ گوشت گرم تھا۔ مسعود کی ٹھنڈی انگلی کو یہ حرارت بہت بھی معلوم ہوئی۔ قصائی دکان کے اندر چھریاں تیز کرنے میں مصروف تھا۔ چنانچہ مسعود نے ایک بار پھر گوشت کو چھو کر دیکھا اور وہاں سے چل پڑا۔

گھر پہنچ کر اس نے جب اپنی ماں کو سکتر صاحب کی موت کی خبر سنائی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے ابا جی انہی کے جنازے کے ساتھ گیے ہیں۔ اب گھر میں صرف دو آدمی تھے۔ ماں اور بڑی بہن۔ ماں باور پی خانہ میں بیٹھی سالم پکارہی تھی اور بڑی بہن کلثوم پاس ہی ایک کا گنگڑی لیے درباری کی سرگم یاد کر رہی تھی۔

چونکہ گلی کے دوسرے لڑکے گورنمنٹ اسکول میں پڑھتے تھے۔ جس پر اسلامیہ اسکول کے سکتر کی موت کا کچھ اثر نہیں پڑا تھا۔ اس لیے مسعود نے خود کو بالکل بیکار محسوس کیا۔ اسکول کا کوئی کام بھی نہیں تھا۔ چھٹی جماعت میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ گھر میں اپنے ابا جی سے پڑھ چکا تھا۔ کھلینے کے لیے بھی اس کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ ایک میلہ کچیلا تاش طاق میں پڑا تھا مگر اس سے مسعود کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لوڈ اور اسی قسم کے دوسرے کھلیل جو اس کی بڑی بہن اپنی سہیلوں کے ساتھ ہر روز کھلیتی تھی اس کی سمجھتے سے بالاتر یوں تھے کہ مسعود نے کبھی ان کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس کو فطرتاً یہ کھیلوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

بستہ اپنی جگہ پر رکھنے اور کوٹ اتارنے کے بعد وہ باور پچی خانے میں اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا اور درباری کی سرگم ستارہ جس میں کئی دفعہ سارے گاما آتا تھا۔ اس کی ماں پاک کاٹ رہی تھی۔ پاک کاٹنے کے بعد اس نے سبز سبز پتوں کا گیلا گیلا ڈھیر اٹھا کر ہندیا میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب پاک کو آنچ لگی تو اس میں سے سفید سفید دھواں اٹھنے لگا۔ اس دھوکیں کو دیکھ کر مسعود کو بکرے کا گوشت یاد آگیا۔ چنانچہ اس نے اپنی ماں سے کہا، ”امی جان، آج میں نے قصائی کی دکان پر دو بکرے دیکھے۔ کھال اتری ہوئی تھی اور ان میں سے دھواں نکل رہا تھا بالکل ایسے ہی جیسا کہ صحیح سویرے میرے منہ سے نکلا کرتا ہے۔“

”اچھا۔۔۔!“ یہ کہہ کر اس کی ماں چولھے میں لکڑیوں کے کوئلے جھاڑنے لگی۔ ”ہاں اور میں نے گوشت کو اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تو وہ گرم تھا۔“

”اچھا۔۔۔!“ یہ کہہ کر اس کی ماں نے وہ برتن اٹھایا جس میں اس نے پاک کا ساگ دھویا تھا اور باور پچی خانہ سے باہر چلی گئی۔

”اور یہ گوشت کئی جگہ پر پھر کتا بھی تھا۔“

”اچھا۔۔۔“ مسعود کی بڑی بہن نے درباری سرگم یاد کرنا چھوڑ دی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”کیسے پھر کتا تھا؟“

”یوں۔۔۔ یوں۔“ مسعود نے انگلیوں سے پھر کن پیدا کر کے اپنی بہن کو دکھائی۔

”تو پھر کیا ہوا؟“

یہ سوال کلثوم نے اپنے سرگم بھرے دماغ سے کچھ اس طور پر نکالا کہ مسعود ایک لحظے کے لیے بالکل خالی الذہن ہو گیا۔ ”پھر کیا ہونا تھا، میں نے تو ایسے ہی آپ سے بات کی تھی کہ قصائی کی دکان پر گوشت پھڑک رہا تھا۔ میں نے انگلی سے چھو کر بھی دیکھا تھا۔ گرم تھا۔“

”گرم تھا۔۔۔ اچھا مسعود یہ بتا و تم میرا ایک کام کرو گے۔“

” بتائیئے۔“

”آؤ، میرے ساتھ آؤ۔“

”نہیں آپ پہلے بتائیے۔ کام کیا ہے۔“

”تم آؤ تو سہی میرے ساتھ۔“

”جی نہیں۔۔۔ آپ پہلے کام بتائیے۔“

”دیکھو میری کمر میں بڑا درد ہو رہا ہے۔۔۔ میں پنگ پر لیٹتی ہوں، تم ذرا پاؤں سے دبادینا۔۔۔ اچھے بھائی جو ہوئے۔ اللہ کی قسم بڑا درد ہو رہا ہے۔“ یہ کہہ کر مسعود کی بہن نے اپنی کمر پر مکیاں مارنا شروع کر دیں۔

”یہ آپ کی کمر کو کیا ہو جاتا ہے۔ جب دیکھو درد ہو رہا ہے، اور پھر آپ دبواتی بھی مجھی سے ہیں، کیوں نہیں اپنی سہیلیوں سے کہتیں۔“
مسعود اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلیے، لیکن یہ آپ سے کہہ دیتا ہوں کہ دس منٹ سے زیادہ میں بالکل نہیں دباوں گا۔“

”شباش۔۔۔ شباش۔“ اس کی بہن اٹھ کھڑی ہوئی اور سرگوں کی کاپی سامنے طاق میں رکھ کر اس کمرے کی طرف روانہ ہوئی جہاں وہ اور مسعود دونوں سوتے تھے۔ صحن میں پہنچ کر اس نے اپنی دکھتی ہوئی کمر سیدھی کی اور اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ میالے بادل جھکے ہوئے تھے۔ ”مسعود، آج ضرور بارش ہوگی۔“ یہ کہہ کر اس نے مسعود کی طرف دیکھا مگر وہ اندر اپنی چارپائی پر لیٹا تھا۔

جب کلثوم اپنے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی تو مسعود نے اٹھ کر گھڑی میں وقت دیکھا۔ ”دیکھتے باجی گیارہ بجھے میں دس منٹ باقی ہیں۔ میں پورے گیارہ بجے آپ کی کمر دبنا چھوڑ دوں گا۔“

”بہت اچھا، لیکن تم اب خدا کے لیے زیادہ نخرے نہ بگھارو۔ ادھر میرے پلنگ پر آکر جلدی کمر دباو ورنہ یاد رکھو بڑے زور سے کان اینٹھوں گی۔“ کلثوم نے مسعود کو ڈانت پلائی۔ مسعود نے اپنی بڑی بہن کے حکم کی تعییں کی اور دیوار کا سہارا لے کر پاؤں سے اس کی کمر دبنا شروع کر دی۔ مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کر میں خفیف سا جھکا و پیدا ہو گیا۔ جب اس نے پیروں سے دبنا شروع کیا، تھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہو لے ہائے کرنا شروع کیا۔

کلثوم کے کوٹھوں پر گوشت زیادہ تھا، جب مسعود کا پاؤں اس حصے پر پڑا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس بکرے کے گوشت کو دبارہ ہے جو اس نے قصائی کی دکان میں اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تھا۔ اس احساس نے چند لمحات کے لیے اس کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا کیے جن کا کوئی سر تھانہ پیر، وہ ان کا مطلب نہ سمجھ سکا اور سمجھتا بھی کیسے جبکہ کوئی خیال مکمل نہیں تھا۔

ایک دوبار مسعود نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے پیروں کے نیچے گوشت کے لو تھڑوں میں حرکت پیدا ہوئی ہے، اسی قسم کی حرکت جو اس نے کبرے کے گرم گرم گوشت میں دیکھی تھی۔ اس نے بڑی بدلتی سے کمر دبنا شروع کی تھی مگر اب اسے اس کام میں لذت محسوس ہونے لگی۔ اس کے وزن کے نیچے کلثوم ہولے ہو لے کراہ رہی تھی۔ یہ بھنچی بھنچی آواز جو کہ مسعود کے پیروں کی حرکت کا ساتھ دے رہی تھی اس گمنام سی لذت میں اضافہ کر رہی تھی۔

ٹائم پیس میں گیارہ نج گیے مگر مسعود اپنی بہن کلثوم کی کمر دباتا رہا۔ جب کمراچھی طرح دبائی جا چکی تو کلثوم سیدھی لیٹ گئی اور کہنے لگی۔ ”شباش مسعود، شباش۔ لواب لگے ہاتھوں ٹائیں بھی دبادو، بالکل اسی طرح۔۔۔ شباش میرے بھائی۔“

مسعود نے دیوار کا سہارا لے کر کلثوم کی رانوں پر جب اپنا پورا وزن ڈالا تو اس کے پاؤں کے نیچے مچھلیاں سی تڑپ گئیں۔ بے اختیار وہ نہس پڑی اور دھری ہو گئی۔ مسعود گرتے گرتے بچا، لیکن اس کے تلووں میں مچھلیوں کی وہ تڑپِ محمد سی ہو گئی۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر اسی طرح دیوار کا سہارا لے کر اپنی بہن کی رانیں دبائے، چنانچہ اس نے کہا، ”یہ آپ نے ہنسنا کیوں شروع کر دیا۔ سیدھی لیٹ جائیے۔ میں آپ کی ٹانگیں دبادوں۔“

کلثوم سیدھی لیٹ گئی۔ رانوں کی مچھلیاں ادھر ادھر ہونے کے باعث جو گدگدی پیدا ہوئی تھی اس کا اثر ابھی تک اس کے جسم میں باقی تھا۔ ”ناجھائی میرے گدگدی ہوتی ہے۔ تم اوٹ پلانگ طریقے سے دباتے ہو۔“

مسعود نے خیال کیا کہ شاید اس نے غلط طریقہ استعمال کیا ہے۔ نہیں، اب کی دفعہ میں پورا بوجھ آپ پر نہیں ڈالوں گا۔۔۔ آپ اطمینان رکھیے۔ اب ایسی اچھی طرح دباؤں گا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔“

دیوار کا سہارا لے کر مسعود نے اپنے جسم کو تولا اور اس انداز سے آہستہ آہستہ کلثوم کی رانوں پر اپنے پیر جمائے کہ اس کا آدھا بوجھ کہیں غائب ہو گیا۔ ہولے ہولے بڑی ہوشیاری سے اس نے اپنے پیر چلانے شروع کیے۔ کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب دب کر ادھر ادھر پھسلنے لگیں۔ مسعود نے ایک بار اسکوں میں تنه ہوئے رسم پر ایک بازیگر کو چلتے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بازیگر کے پیروں کے نیچے تناہوار سا اسی طرح پھسلتا ہو گا۔

اس سے پہلے کئی بار اس نے اپنی بہن کلثوم کی ٹانگیں دبائی تھیں مگر وہ لذت جو کہ اسے اب محسوس ہو رہی تھی پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے سوچا، ”کلثوم کو اگر ذبح کر دیا جائے تو کھال اتر جانے پر کیا اس کے گوشت میں سے بھی دھواں نکلے گا؟“ لیکن ایسی بیبودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا جیسے وہ سلیٹ کو سفخ سے صاف کیا کرتا تھا۔

”بس بس۔“ کلثوم تھک گئی۔ ”بس بس۔“

مسعود کو ایک دم شرارت سو جھی۔ وہ پلٹک پر سے نیچے اترنے لگا تو اس نے گلوٹوم کی دونوں گلوٹوم میں گد گدی کرنا شروع کر دی۔ بنسی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ مسعود کے ہاتھوں کو پرے جھٹک دے۔ لیکن جب اس نے ارادہ کر کے اس کے لات جمانی چاہی تو مسعود اچھل کر زد سے باہر ہو گیا اور سلپر پہن کر کمرے سے نفل گیا۔

جب وہ صحن میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ہلکی ہلکی بونداباندی ہو رہی ہے۔ بادل اور بھی جھک آئے تھے۔ پانی کے نہنے نہنے قطرے آواز پیدا کیے بغیر صحن کی اینٹوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہے تھے۔ مسعود کا جسم ایک دل نواز حرارت محسوس کر رہا تھا۔ جب ہوا کا ٹھنڈا ٹھنڈا جھونکا اس کے گالوں کے ساتھ مس ہوا اور دو تین نہنی نہنی بوندیں اس کی ناک پر پڑیں تو ایک جھر جھری سی اس کے بدن میں لہرا اٹھی۔ سامنے کوٹھے کی دیوار پر ایک کبوتر اور کبوتری پاس پاس پرچھلانے بیٹھے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں۔ گل داؤ دی اور ناز بوکے ہرے ہرے پتے اوپر لال لال گملوں میں نہار ہے تھے۔ فضائیں نیندیں گھلی ہوئی تھیں۔ ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے ارد گرد نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔

مسعود ایسی باتیں سوچنے لگا۔ جن کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ ان باتوں کو چھو کر دیکھ سکتا تھا مگر ان کا مطلب اس کی گرفت سے باہر تھا، پھر بھی ایک گمنام سامز اس سوچ بچار میں اسے آرہا تھا۔

بارش میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے باعث جب مسعود کے ہاتھ بالکل تن ہو گئے اور دبانے سے ان پر سفید دھبے پڑنے لگے تو اس نے مٹھیاں کس لیں اور ان کو منہ کی بھاپ سے گرم کرنا شروع کیا۔ ہاتھوں کو اس عمل سے کچھ گرمی تو پہنچی مگر وہ نم آلود ہو گیے۔ چنانچہ آگ تاپنے کے لیے وہ باورچی خانہ میں چلا گیا۔ کھانا تیار تھا، ابھی اس نے پہلا لقمه ہی اٹھایا تھا کہ اس کا باپ قبرستان سے واپس آگیا۔

باپ بیٹے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مسعود کی ماں اٹھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی اور وہاں دیر تک اپنے خاوند کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔

کھانے سے فارغ ہو کر مسعود بیٹھک میں چلا گیا اور کھڑکی کھول کر فرش پر لیٹ گیا۔ بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی کیونکہ اب ہوا بھی چل رہی تھی، مگر یہ سردی ناخوشگوار معلوم نہیں ہوتی تھی۔ تالاب کے پانی کی طرح یہ اوپر ٹھنڈی اور اندر گرم تھی۔

مسعود جب فرش پر لیا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس سردی کے اندر دھنس جائے جہاں اس کے جسم کو راحت افگیر گرمی پہنچے۔ دیر تک وہ ایسی شیر گرم باتوں کے متعلق سوچتا رہا جس کے باعث اس کے پھلوں میں ہلکی ہلکی سی دکھن پیدا ہو گئی۔ ایک دوبار اس نے انگڑائی لی تو اسے مزا آیا۔ اس کے جسم کے کسی حصے میں، یہ اس کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں، کوئی چیز انک سی گئی تھی، یہ چیز کیا تھی۔ اس کے متعلق بھی مسعود کو علم نہیں تھا۔ البتہ اس انکاونے اس کے سارے جسم میں اضطراب، ایک دبے ہوئے اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کا سارا جسم کھینچ کر لمبا ہو جانے کا ارادہ بن گیا تھا۔

دیر تک گد گدے قالین پر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اٹھا اور باورچی خانہ سے ہوتا ہوا صحن میں آنکلا نہ کوئی باورچی خانہ میں تھا اور نہ صحن میں۔ ادھر ادھر جتنے کمرے تھے سب کے سب بند تھے۔ بارش اب رک گئی تھی۔ مسعود نے ہاکی اور گیند نکالی اور صحن میں کھینا شروع کر دیا۔ ایک بار جب اس نے زور سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے دائیں ہاتھ والے کمرے کے دروازے پر لگی۔ اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی، ”کون؟“

”جی میں ہوں مسعود!“

اندر سے آواز آئی، ”کیا کر رہے ہو؟“

”جی کھیل رہا ہوں۔“

”کھیلو۔۔۔“ پھر تھوڑے سے توقف کے بعد اس کے باپ نے کہا، ”تمہاری ماں میر اسرد بارہی ہے۔۔۔ زیادہ شور نہ مچانا۔“

یہ سن کر مسعود نے گیندو ہیں پڑی رہنے دی اور ہاکی ہاتھ میں لیے سامنے والے کمرے کا رخ کیا۔ اس کا ایک دروازہ بند تھا اور دوسرا نیم وال۔۔۔ مسعود کو ایک شرارت سو چھی۔ دبے پاؤں وہ نیم وال دروازے کی طرف بڑھا اور دھماکے کے ساتھ دونوں پٹ کھول دیے۔ دو چینیں بلند ہوئیں اور کلثوم اور اس کی سہیلی بدلانے جو کہ پاس پاس لیٹی تھی، خوف زده ہو کر جھٹ سے لحاف اوڑھ لیا۔

بملاء کے بلاوز کے ٹھن کھلے ہوئے تھے اور کلثوم اس کے عریاں سینے کو گھور رہی تھیں۔

مسعود کچھ سمجھنے سکا، اس کے دماغ میں دھواں سا چھا گیا۔ وہاں سے الٹے قدم لوٹ کر وہ جب بیٹھ کی طرف روانہ ہوا تو اسے مع�ً پنے اندر ایک اتھاہ طاقت کا احساس ہوا۔ جس نے کچھ دیر کے لیے اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت بالکل کمزور کر دی۔ بیٹھ کی کے پاس بیٹھ کر جب مسعود نے ہاکی کو دونوں ہاتھوں سے کپڑا کر گھٹنے پر رکھا تو یہ سوچا کہ ہلاکا سادباوڈا لئے پر ہاکی میں خم پیدا ہو جائے گا، اور زیادہ زور لگانے پر بینڈل چٹا خ سے ٹوٹ جائے گا۔ اس نے گھٹنے پر ہاکی کے بینڈل میں خم تو پیدا کر لیا مگر زیادہ سے زیادہ زور لگانے پر بھی وہ ٹوٹ نہ سکا۔ دیر تک وہ ہاکی کے ساتھ کشتنی لڑتا رہا۔ جب وہ تحک کر ہار گیا تو جھنجھلا کر اس نے ہاکی پرے چھیک دی۔

-[21]-

بارش: سعادت حسن منشو

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور وہ اپنے کمرے میں بیٹھا جل تھل دیکھ رہا تھا۔ باہر بہت بڑا ان تھا، جس میں دودرخت تھے۔ ان کے سبز پتے بارش میں نہار ہے تھے۔ اس کو محسوس ہوا کہ وہ پانی کی اس یورش سے خوش ہو کر ناج رہے ہیں۔

ادھر ٹیلی فون کا ایک کھمبائی گڑا تھا۔ اس کے فلیٹ کے عین سامنے یہ بھی بڑا مسرور نظر آتا تھا، حالانکہ اس کی مسرت کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس بے جان شے کو بھلا مسرور کیا ہونا تھا، لیکن تنیر نے جو کہ بہت مغموم تھا، بھی محسوس کیا کہ اس کے آس پاس جو بھی شے ہے، خوشی سے ناج گار ہی ہے۔

ساون گزر چکا تھا اور باران رحمت نہیں ہوئی تھی۔ لوگوں نے مسجدوں میں اکٹھے ہو کر دعا عین ما نگلیں مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بادل آتے اور جاتے رہے، مگر ان کے تھنوں سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا۔

آخر ایک دن اچانک کالے کالے بادل آسمان پر گھر آئے اور چھابجوں پانی بر سنبھلے لگا۔ تنیر کو بادلوں اور بارشوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔۔۔ اس کی زندگی چیل میدان بن چکی تھی جس کے منہ میں پانی کا ایک قطرہ بھی کسی نے نہ ٹپکایا ہو۔

دوبس پہلے، اس نے ایک لڑکی سے جس کا نام ثریا تھا، محبت کرنا شروع کی۔ مگر کی طرفہ محبت تھی۔ ثریا نے اسے درخواست اتنا ہی نہ سمجھا۔ ساون کے دن تھے، بارش ہو رہی تھی۔ وہ اپنی کوٹھی سے باہر نکلا۔ جانگیہ پہن کر، کہ نہائے اور بارش کا لطف اٹھائے۔ آم بالٹی میں پڑے تھے۔ وہ اکیلا بیٹھا خیس چوس رہا تھا کہ اچانک اسے چینیں اور تھقہے سنائی دیے۔

اس نے دیکھا کہ ساتھ والی کوٹھی کے لان میں دو لڑکیاں بارش میں نہار رہی ہیں اور خوشی میں شور مچا رہی ہیں۔ اس کی کوٹھی اور ساتھ والی کوٹھی کے درمیان صرف ایک جھاڑیوں کی دیوار حائل تھی۔ تنویر اٹھا، آم کا رس چوتھے ہوئے وہ باڑ کے پاس گیا اور غور سے ان دونوں لڑکیوں کو دیکھا۔

دونوں مہین مملک کے کرتے پہنے تھیں، جوان کے بدن کے ساتھ چکپے ہوئے تھے۔ شلوار چونکہ لٹھے کی تھیں، اس لیے تنویر کو ان کے بدن کے نچلے حصے کے صحیح خدو خال کا پہنہ نہ چل سکا۔

اس نے پہلے کسی عورت کو ایسی نظر دیں سے کبھی نہیں دیکھا تھا، جیسا کہ اس روز جب کہ بارش ہو رہی تھی، اس نے ان دونوں لڑکیوں کو دیکھا۔ دیر تک وہ ان کو دیکھتا رہا جو بارش میں بھیگ بھیگ کر خوشی کے نعرے بلند کر رہی تھیں۔

تنویر نے ان کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اس لیے کہ وہ طبعاً کچھ اس قسم کا لڑکا تھا کہ وہ کسی لڑکی کو بری نظر دیں سے دیکھنا گناہ سمجھتا تھا، مگر اس نے اس روز بڑی لچائی نظر دیں سے ان کو دیکھا۔ دیکھا ہی نہیں، بلکہ ان کے گیلے بدن میں انگارہ بن کر برے کی طرح چھید کر تارہ۔

تنویر کی عمر اس وقت میں برس کے قریب ہو گی۔ ناجربہ کار تھا۔ زندگی میں اس نے پہلی مرتبہ جوان لڑکیوں کے شباب کو گیلی مملک میں لپٹ دیکھا، تو اس نے یوں محسوس کیا کہ اس کے خون میں چنگاریاں دوڑ رہی ہیں۔ اس نے ان لڑکیوں میں سے ایک کو منتخب کرنا چاہا۔ دیر تک وہ غور کر تارہ۔ ایک لڑکی بڑی شریر تھی۔ دوسری اس سے کم۔ اس نے سوچا شریر اچھی رہے گی جو اس کو شرارتوں کا سبق دے سکے۔ یہ شریر لڑکی خوبصورت تھی، اس کے بدن کے اعضا بھی بہت مناسب تھے۔ بارش میں نہایت جل پری معلوم ہوتی تھی۔ ہوڑی دیر کے لیے تنویر شاعر بن گیا۔ اس نے کبھی اس طور پر نہیں سوچا تھا۔ لیکن اس لڑکی نے جس کا کرتہ دوسری کے مقابلے میں بہت زیادہ مہین تھا، اس کو ایسے ایسے شعرياد کراديے جن کو عرصہ ہوا بھول چکا تھا۔

اس کے علاوہ ریڈیو پر سنے ہوئے فلمی گانوں کی دھنیں بھی اس کے گانوں میں گونجنے لگیں اور اس نے بڑکے چیچپے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ اشوک کمار ہے۔۔۔ دلیپ کمار ہے۔۔۔ پھر اسے کامنی کوشل اور نلنی جیونٹ کا خیال آیا۔۔۔ مگر اس نے جب اس لڑکی کی طرف اس غرض سے دیکھا کہ اس میں کامنی کوشل اور نلنی جیونٹ کے خدوخال نظر آجائیں تو اس نے ان دونوں ایکٹرسوں پر لعنت بھیجی۔ وہ ان سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ اس کے ململ کے کرتے میں جوشاب تھا، اس کا مقابلہ اس نے سوچا، کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

تلویر نے آم چونے بند کر دیے اور اس لڑکی سے جس کا نام پروین تھا، عشق لڑانا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں اسے بڑی مشکلات پیش آئیں، اس لیے کہ اس لڑکی تک رسائی تلویر کو آسان نہیں معلوم ہوتی تھی۔ پھر اسے اپنے والدین کا بھی ڈر تھا۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ اس سے مقتضی ہو گی یا نہیں؟ بہت دیر تک وہ انہیں الحسنوں میں گرفتار رہا۔۔۔ راتیں جا گئیں۔۔۔ جھاڑیوں کی پست قد جھاڑ کے پاس جاتا مگر وہ نظر نہ آتی۔ گھنٹوں وہاں کھڑا رہتا، اور وہ بارش والا منظر جو اس نے دیکھا تھا، آنکھیں بند کر کے ذہن میں دھرا تھا۔

بہت دنوں کے بعد آخر اس کو ایک روز اس سے ملاقات کا موقع مل گیا، وہ اپنے باپ کی کار میں گھر کے کسی کام کی غرض سے جا رہا تھا کہ پروین سے اس کی مدد بھیڑ ہو گئی۔ وہ کار استارٹ کر چکا تھا کہ ساتھ والی کوٹھی میں سے تلویر کے خوابوں کی شہزادی نکلی۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ موڑ روک لے۔

تلوفیر گھبر آگیا۔۔۔ ہر عاشق ایسے موقع پر گھبرائی جایا کرتا ہے۔ اس نے موڑ کچھ ایسے بینڈے انداز میں روکی کہ اس کو زبردست دھچکا لگا۔ اس کا سرزور سے اسٹرینگ و ہیل کے ساتھ ٹکرایا، مگر اس وقت وہ شراب کے نشے سے زیادہ مجنور تھا۔ اس کو اس کی محبوبہ نے خود مخاطب کیا تھا۔ پروین کے ہونٹوں پر گھرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک تھی ہوئی تھی۔۔۔ اس نے سرخ مسکراہٹ سے کہا، ”معاف فرمائیے گا، میں نے آپ کو تکلیف دی۔ بارش ہو رہی ہے، تاگہ اس دور دراز جگہ ملنا محال ہے، اور مجھے ایک ضروری کام سے جانا تھا۔ آپ میرے ہمسائے ہیں اسی لیے آپ کو یہ زحمت دی۔“ تلویر نے کہا، ”زحمت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ میں تو۔۔۔ میں تو۔۔۔“ اس کی زبان لڑکھڑا گئی، ”آپ سے میرا تعارف تو نہیں لیکن آپ کو ایک بار دیکھا تھا۔“ پروین اپنی سرخ مسکراہٹوں کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی اور تلویر سے پوچھا، ”آپ نے مجھے کب دیکھا تھا۔“ تلویر نے جواب دیا، ”آپ کی کوٹھی کے لان میں۔۔۔ جب آپ۔۔۔ جب آپ اور آپ کے ساتھ ایک اور لڑکی بارش میں نہار رہی تھی۔“ پروین نے اپنے گھرے سرخ لبوں میں سے چیخ نما آواز نکالی، ”ہائے۔۔۔ آپ دیکھ رہے تھے؟“

”یہ گستاخی میں نے ضرور کی۔۔۔ اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔“

پروین نے ایک ادا کے ساتھ اس سے پوچھا؛ ”آپ نے دیکھا کیا تھا؟“

یہ سوال ایسا تھا کہ تنور اس کا جواب نہیں دے سکتا تھا، آئیں بائیں شانکیں کر کے رہ گیا، ”جی کچھ نہیں۔۔۔ بس آپ کو۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ دولڑ کیاں تھیں جو بارش میں نہار ہی تھیں اور۔۔۔ اور خوش ہو رہی تھیں۔۔۔ میں اس وقت آم چوس رہا تھا۔“ پروین کے گھرے سرخ لبوں پر شریر مسکراہٹ پیدا ہوئی، ”آپ آم چوستے کیوں ہیں۔۔۔ کاٹ کر کیوں نہیں کھاتے؟“

تنور نے موڑ اسٹارٹ کر دی، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس سوال کا جواب کیا دے، چنانچہ وہ گول کر گیا، ”آپ کو میں کہاں ڈرپ کر دوں۔“

پروین مسکرائی، آپ مجھے کہیں بھی ڈرپ کر دیں، وہی میری منزل ہو گی۔“

تنور نے یوں محسوس کیا کہ اسے اپنی منزل مل گئی ہے، لڑکی جو اس کے پہلو میں بیٹھی ہے، اب اسی کی ہے لیکن اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اس کا ہاتھ دبائے، یا اس کی کمر میں ایک دو سینٹ کے لیے اپنا بازو حماکل کر دے۔

بارش ہو رہی تھی، موسم بہت خوشنگوار تھا، اس نے کافی دیر سوچا موڑ کی رفتار اس کے خیالات کے ساتھ ساتھ تیز ہوتی گئی۔ آخر اس نے ایک جگہ اسے روک لیا اور جذبات سے مغلوب ہو کر اس کو اپنے ساتھ چمٹالیا، اس کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ پیوست کر دیے۔۔۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ کوئی بہت ہی لذیذ آم چوس رہا ہے۔ پروین نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ لیکن فوراً تنور کو یہ احساس بڑی شدت سے ہوا کہ اس نے بڑی ناشائستہ حرکت کی ہے اور غالباً پروین کو اس کی یہ حرکت پسند نہیں آئی، چنانچہ ایک دم سنجیدہ ہو کر اس نے کہا، ”آپ کو کہاں جانا ہے؟“

پروین کے چہرے پر یوں خنگی کے کوئی آثار نہیں تھے لیکن تنور یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ اس کے خون کی پیاسی ہے۔

پروین نے اسے بتایا کہ اسے کہاں جانا ہے۔۔۔ جب وہ اس جگہ پہنچا تو اسے معلوم ہوا وہ رنڈیوں کا چکلہ ہے۔۔۔ جب اس نے پروین کو موڑ سے اتارا تو اس کے ہونٹوں پر گھرے لال رنگ کی مسکراہٹ بکھر رہی تھی۔ اس نے کوئی مظکا کر ٹھیٹ کسی بیوں کے انداز میں اس سے کہا، ”شام کو میں یہاں ہوتی ہوں۔۔۔ آپ کبھی ضرور تشریف لا لائیں۔“

تو نیر جب بھوچ کا ہو کر اپنی موڑ کی طرف بڑھاتا سے ایسا لگا کہ وہ بھی ایک کبی عورت ہے جسے وہ ہر روز چلاتا ہے، اس کی لال تی لپ استک ہے جو پروین نے ہونٹوں پر تھی ہوئی تھی۔

وہ واپس اپنی کوٹھی چلا آیا۔۔۔ بارش ہو رہی تھی۔۔۔ اور تو نیر بید مغموم تھا۔۔۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ س کی آنکھوں کے آنسو بارش کے قطرے بن کر ٹپک رہے ہیں۔

-[22]-

آمنہ: سعادت حسن منتو

دور تک دھان کے سنہرے کھیت پھیلے ہوئے تھے، جسے کافی جوان لڑکا بندو کٹے ہوئے دھان کے پولے اٹھا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ گا بھی رہا تھا،

دھان کے پولے دھر دھر کاندھے

بھر بھر لائے

کھیت سنہرہ، دھن دولت رے

بندو کا باپ جما گاؤں میں بہت مقبول تھا۔ ہر شخص کو معلوم تھا کہ اس کو اپنی بیوی سے بہت پیار ہے، ان دونوں کا عشق گاؤں کے ہر شخص کو معلوم تھا، ان کے دونپچھے تھے، ایک بندو، جس کی عمر تیرہ برس کے قریب تھی۔۔۔ دوسرا چندو۔ سب خوش و خرم تھے مگر ایک روز اچانک جسے کی بیوی بیمار پڑ گئی، حالت بہت نازک ہو گئی، بہت علاج کیے، ٹونے ٹولکے آزمائے مگر اس کو کوئی افاق نہ ہوا۔ جب مرض مہلک شکل اختیار کر گیا تو اس نے اپنے شوہر سے نحیف لمحے میں کہا، ”تم مجھے کبوتری کہا کرتے تھے اور خود کو کبوتر۔۔۔ ہم دونوں نے دونپچھے پیدا کیے۔۔۔ اب یہ تمہاری کبوتری مر رہی ہے۔۔۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے مرنے کے بعد تم کوئی اور کبوتری اپنے گھر لے آؤ۔“

تحوڑی دیر کے بعد اس پر ہدایانی کیفیت طاری ہو گئی، جسے کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور اس کی بیوی بولے چلی جا رہی تھی، ”تم اور کبوتری لے آؤ گے۔۔۔ وہ سوچے گی کہ جب تک میرے بچے زندہ ہیں تم اس سے محبت نہیں کرو گے۔۔۔ چنانچہ وہ ان کو ذبح کر کے کھا جائے گی۔“ جسے اپنی بیوی سے بڑے پیار کے ساتھ کہا، ”سکینہ! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی بھر دوسری شادی نہیں کروں گا، مگر تمہارے دشمن مریں تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ سکینہ کے ہونٹوں پر مردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس کے فوراً بعد اس کی روح نفس عضری سے پرواز کر گئی۔ جما بہت رویا۔ جب اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کو دفن کیا تو اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اپنی زندگی منوں مٹی کے نیچے گاڑ دی ہے۔

اب وہ ہر وقت مغموم رہتا، کام کا ج میں اسے کوئی دلچسپی نہ رہی، ایک دن اس کے ایک وفادار مزارع نے اس سے کہا، ”سرکار! بہت دنوں سے میں آپ کی یہ حالت دیکھ رہا ہوں اور جی، جی میں کڑھتا رہا ہوں۔ آج مجھ سے نہیں رہا گیا تو آپ سے یہ عرض کرنے آیا ہوں کہ آپ اپنے بچوں کا بہت خیال رکھتے ہیں، اپنی زمینوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ آپ کو اس کا علم بھی نہیں کتنا فقصان ہو رہا ہے۔“ جسے بڑی بے توہینی سے کہا، ”ہونے دو۔۔۔ مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں۔“

”سرکار۔۔۔ آپ ہوش میں آئیے۔۔۔ چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہیں، ایسا نہ ہو وہ آپ کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر آپ کی زمینوں پر قبضہ کر لیں، آپ سے مقدمہ بازی کیا ہو گی۔۔۔ میری توہینی مخلاصنا رائے ہے کہ آپ دوسری شادی کر لیں۔۔۔ اس سے آپ کے غم کا بو جھہ ہلاکا ہو جائے گا اور وہ آپ کے لڑکوں سے پیار محبت بھی کرے گی۔“ جسے کو بہت غصہ آیا، ”بکواس نہ کرو رمضانی، تم سمجھتے نہیں کہ سوتیلی ماں کیا ہوتی ہے، اس کے علاوہ تم یہ بھی تو سوچو، میری بیوی کی روح کو کتنا بڑا صدمہ پہنچے گا۔“

بہت دنوں کے اصرار کے بعد آخر رمضانی اپنے آقا کو دوسری شادی پر رضا مند کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب شادی ہو گئی تو اس نے اپنے لڑکوں کو ایک علیحدہ مکان میں بھیج دیا۔ ہر روز وہاں کئی کئی گھنٹے رہتا اور بندو اور چندو کی دلجوئی کرتا رہتا۔ نئی بیوی کو یہ بات بہت ناگوار گزری، ایک بات اور بھی تھی کہ مکھن دودھ کا پیشتر حصہ اس کے سوتیلے بیٹوں کے پاس چلا جاتا تھا۔ اس سے وہ بہت جلتی، اس کا تو یہ مطلب تھا کہ گھر بار کے مالک وہی ہیں۔ ایک دن جما جب کھیتوں سے واپس آیا تو اس کی نئی بیوی زار و قطار رونے لگی، جسے اس آہ وزاری کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا، ”تم مجھے اپنا نہیں سمجھتے۔ اسی لیے بچوں کو دوسرے مکان میں بھیج دیا۔ میں ان کی ماں ہوں، کوئی دشمن تو نہیں ہوں۔“ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے جب میں سوچتی ہوں کہ بیچارے اکیلے رہتے ہیں۔“

جماع باؤں سے بہت متاثر ہوا اور دوسرے ہی دن بندو اور چندو کو لے آیا اور ان کو سوتیلی ماں کے حوالے کر دیا جس نے ان کو اتنے پیار محبت سے رکھا کہ آس پاس کے تمام لوگ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔ نئی بیوی نے جب اپنے خاوند کے دل کو پوری طرح موہ لیا تو ایک دن ایک مزارعہ کو بلا کر اکیلے میں اس سے بڑے رازدار نہ لجھے میں کہا، ”میں تم سے ایک کام لینا چاہتی ہوں۔۔۔ بولو کرو گے۔“ اس مزارعہ نے جس کا نام شبرا تی تھا، ہاتھ جوڑ کر کہا، ”سر کار! آپ مائی باپ ہیں۔۔۔ جان تک حاضر ہے۔“ نئی بیوی نے کہا، ”دیکھو، کل دریا کے پاس بہت بڑا میلہ لگ رہا ہے۔۔۔ میں اپنے سوتیلے بچوں کو تمہارے ساتھ بھیجن گی، ان کو کشتنی کی سیر کرانا اور کسی نہ کسی طرح جب کوئی اور دیکھتا ہو انھیں گھرے پانی میں ڈبو دینا۔“

شبرا تی کی ذہنیت غلامانہ تھی، اس کے علاوہ اس کو بہت بڑے انعام کا لائچ دیا گیا تھا۔ وہ دوسرے روز بندو اور چندو کو اپنے ساتھ لے گیا۔ انھیں کشتنی میں بٹھایا، اس کو خود کھینا شروع کیا، دریا میں دور تک چلا گیا، جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔۔۔ اس نے چاہا کہ انھیں دھکادے کر ڈبودے مگر ایک دم اس کا ضمیر جاگ اٹھا، اس نے سوچا ان بچوں کا کیا قصور ہے۔۔۔ سوائے اس کے کہ ان کی اپنی ماں مر چکی ہے اور اب یہ سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ میں انھیں کسی شخص کے حوالے کر دوں اور سوتیلی ماں سے جا کر کہہ دوں کہ دونوں ڈوب چکے ہیں۔

دریا کے دوسرے کنارے اتر کر اس نے بندو اور چندو کو ایک تاجر کے حوالے کر دیا۔۔۔ جس نے ان کو ملازم رکھ لیا۔

بڑا لڑکا بندو کھیل کو دکا عادی، محنت مشقت سے بہت گھبر اتا تھا۔ تاجر کے ہاں سے بھاگ نکلا اور پیدل چل کر دوسرے شہر میں پہنچا مگر وہاں اسے ایک دولت مند آدمی کے ہاں جس کا نام قلندر بیگ تھا، پناہ لینا پڑی۔ قلندر بیگ نیک دل آدمی تھا، اس نے چاہا کہ بندو کو اپنے ہاں نوکر رکھ لے، چنانچہ اس نے اس سے پوچھا، ”برخوردار! کیا تختواہ لو گے؟“ بندو نے جواب دیا، ”جناب میں تختواہ نہیں لوں گا۔“ قلندر بیگ کو کسی قدر حیرت ہوئی، لڑکا شکل و صورت کا اچھا تھا، اس میں گوارپن بھی نہیں تھا، اس نے پوچھا، ”تم کس خاندان کے ہو۔۔۔ کس شہر کے باشندے ہو؟“ بندو نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہا، پھر رونے لگا۔ قلندر بیگ نے اس سے مزید استفسار کرنا مناسب نہ سمجھا، جب بندو کو اس کے یہاں رہتے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا تو قلندر بیگ اس کی خوش اطواری سے بہت متاثر ہوا۔ ایک دن اس نے اپنی بیوی سے کہا، ”بندو مجھے بہت پسند ہے۔ میں تو سوچتا ہوں اس سے اپنی ایک لڑکی بیاہ دوں۔۔۔“

بیوی کو اپنے خاوند کی یہ بات بری لگی لیکن آخر اس نے کہا، ”آپ سے اس کے خاندان کے متعلق تو دریافت کیجیے۔“ قلندر بیگ نے کہا، ”میں نے ایک مرتبہ اس سے اس کے خاندان کے متعلق پوچھا تو وہ زار و قطار رونے لگا۔۔۔ پھر میں نے اس موضوع پر اس سے کبھی

گفتگو نہیں کی۔ ”بندو کئی برس قلندر بیگ کے ہاں رہا، جب میں برس کا ہو گیا تو قلندر بیگ نے اپنا سارا کار و بار اس کے سپرد کر دیا۔ کافی عرصہ گزر گیا، ایک دن بندو نے بڑے ادب سے اپنے آقا سے درخواست کی، ”دریا کے اس پار دور جو ایک گاؤں ہے وہاں میں چھوٹا مکان بنوانا چاہتا ہوں۔ کیا مجھے آپ اتنا روپیہ مرحمت فرماسکتے ہیں کہ میری یہ خواہش پوری ہو جائے۔“ قلندر مسکرا یا، ”تم جتنا روپیہ چاہو لے سکتے ہو بیٹا، لیکن یہ بتاؤ کہ تم دریا پار اتنی دور مکان کیوں بنوانا چاہتے ہو۔“ بندو نے جواب دیا، ”یہ راز آپ پر غقریب کھل جائے گا۔“

بندو اور چندو کا باپ اپنے بیٹوں کے فراغ میں گھل کے مرچ کا تھا، مزار عوں کی بڑی ابتر حالت تھی، اس لیے کہ زمینوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی بھی نہ تھا۔ بندو، بہت ساروپیہ لے کر اپنے گاؤں پہنچا، ایک پگامکان بنوایا اور مزار عوں کو خوشحال کر دیا۔ بندو کا بھائی چندو جس شخص کے ہاں ملازم ہوا تھا اس نے اس کو بیٹا بنا لیا تھا، ایک دفعہ وہ خطرناک طور پر بیمار پڑ گیا تو اس شخص کی بیوی نے جس کا نام صمد خان تھا، اپنی بڑی آمنہ سے کہا کہ وہ اس کی تیار داری کرے۔

آمنہ بڑی نازک اندام حسین لڑکی تھی، دن رات اس نے چندو کی خدمت کی، آخر وہ صحت مند ہو گیا، تیار داری کے اس دور میں وہ کچھ اس طرح گھل مل گئے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی۔ مگر چندو سوچتا تھا کہ آمنہ ایک دولت مند کی لڑکی ہے اورہ محض کنگلا۔ ان کا آپس میں کیا جوڑ ہے، اس کے والد بھلا کب ان کی شادی پر راضی ہوں گے لیکن آمنہ کو کسی قدر لیقین تھا کہ اس کے والدین راضی ہو جائیں گے، اس لیے کہ وہ چندو کو بڑی اچھی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ایک دن چندو گائے بھینسوں کے رویوں کو جو ہر پر پانی پلا رہا تھا کہ آمنہ دوڑتی ہوئی آئی، اس کی سانس پھولی ہوئی تھی، نہ خاص سینہ دھڑک رہا تھا اس نے خوش خوش چندو سے کہا، ”ایک اچھی خبر لائی ہوں، آج میری ماں اور باپ میری شادی کی بات کر رہے ہیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ تم بڑے اچھے لڑکے ہو، اس لیے تمھیں میرے ساتھ بیاہ دینا چاہیے۔“

چندو اس قدر خوش ہوا کہ اس نے آمنہ کو اٹھا کر ناچنا شروع کر دیا۔ ان دونوں کی شادی ہو گئی، ایک سال کے بعد ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام جمیل رکھا گیا۔ جب بندو اپنے گاؤں میں اچھی طرح جم گیا تو اس نے بھائی کا پتہ لیا۔ جا کے اس سے ملا، دونوں بہت خوش ہوئے۔ بندو نے اس سے کہا، ”اب اللہ کا فضل ہے چلو میرے ساتھ اور دیوانی سنجاہو، میں چاہتا ہوں تمہاری شادی اپنی سالی سے کرا دوں، بڑی پیاری لڑکی ہے۔“ چندو نے اس کو بتایا کہ وہ پہلے ہی شادی شدہ ہے، سارے حالات سن کر بندو نے اس کو سمجھایا، ”قلندر بیگ بیحد دولت مند آدمی ہے، اس کی لڑکی سے شادی کرلو۔ ساری عمر عیش کرو گے۔ آمنہ کے باپ کے پاس کیا پڑا ہے۔“

چندو اپنے بھائی کی یہ باتیں سن کر لائق میں آگیا اور دولت مند آمنہ کو چھوڑ دیا۔ طلاق نامہ کسی کے ہاتھ بھجوادیا اور اس سے ملے بغیر چلا گیا۔

چند روز کے بعد ہی بندو نے اپنے بھائی کی شادی فلوریٹیک کی چھوٹی لڑکی سے کر دی، آمنہ حیران و پریشان تھی کہ اس کا پیارا چندوا ایک دم کھاں غائب ہو گیا لیکن اس کو یقین تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ ایک دن ضرور واپس آجائے گا۔ بڑی دیر اس نے اس کی واپسی کا انتظار کیا اور اس کی یاد میں آنسو بہاتی رہی۔ جب وہ نہ آیا تو آمنہ کے باپ نے جمیل کو ساتھ لیا اور بندو کے گاؤں پہنچا، اس کی ملاقات چندو سے ہوئی۔ وہ دولت کے نشے میں سب کو بھول چکا تھا۔

آمنہ کے باپ نے اس کی بڑی منت سماجت کی اور اس سے کہا، ”اور کچھ نہیں تو اپنے اس کمسن بیٹھ کا خیال کرو، تمہارے بغیر اس بچے کی زندگی کیا ہے؟“ چندو نے یہ کو راجواب دیا، ”میں اپنی دولت اور عزت اس بچے کے لیے چھوڑ سکتا ہوں؟“ جاؤ اسے لے جاؤ اور میری نظرلوں سے دور کر دو۔“ جب آمنہ کے باپ نے اور زیادہ منت سماجت کی تو چندو نے اس بڑھے کو دھکے دے کر باہر نکلوادیا۔ ساتھ ہی اپنے بچے کو بھی۔

بوڑھا بابا پ غم و اندوہ سے چور گھر پہنچا اور آمنہ کو ساری داستان سنادی۔ آمنہ کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ پاگل ہو گئی۔ چندو پر پے در پے اتنے مصائب آئے کہ اس کی ساری دولت اجڑ گئی، بھائی نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ بیوی بڑھکر اپنے میکے چلی گئی، اب اس کو آمنہ یاد آئی، وہ اس سے ملنے کے لیے گیا، اس کا بیٹا جمیل، بڑیوں کاڑھانچہ، اس سے گھر کے باہر ملا، اس نے اس کو پیار کیا اور آمنہ کے متعلق اس سے پوچھا۔ جمیل نے اس سے کہا، ”اوٹھیں بتاتا ہوں، میری ماں آج کل کھاں رہتی ہے۔“

وہ اسے دور لے گیا اور ایک قبر کی طرف اشارہ کر کے ”یہاں رہتی ہے آمنہ اماں۔“

-[23]-

بانجھ: سعادت حسن منتو

میری اور اس کی ملاقات آج سے ٹھیک دو برس پہلے اپلو بندر پر ہوئی۔ شام کا وقت تھا۔ سورج کی آخری کرنیں سمندر کی ان دراز ہبروں کے پیچے غائب ہو چکی تھیں جو ساحل کے نخ پر بیٹھ کر دیکھنے سے موٹے کپڑے کی تھیں معلوم ہوتی تھیں۔ میں گیٹ آف انڈیا کے اس طرف پہلانچ چھوڑ کر جس پر ایک آدمی چپی والے سے اپنے سر کی ماٹش کراہ تھا، دوسرے نخ پر بیٹھا تھا۔ اور حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سمندر

کو دیکھ رہا تھا۔ دور بہت دور جہاں سمندر اور آسمان گھل مل رہے تھے۔ بڑی بڑی لہریں آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت بڑا گدے رنگ کا قالین ہے جسے ادھر سے ادھر سمیٹا جا رہا ہے۔

ساحل کے سب قمیقے روشن تھے جن کا عکس کنارے کے لزاں پانی پر کپکپاتی ہوئی موٹی لکیروں کی صورت میں جگہ جگہ رینگ رہا تھا۔ میرے پاس پتھر میں دیوار کے نیچے کئی کشیوں کے لپٹے ہوئے بادبان اور بانس ہولے ہولے حرکت کر رہے تھے۔ سمندر کی لہریں اور تمباشا یوں کی آواز ایک گلنگاہٹ بن کر فضائیں گھلی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موڑ کے ہارن کی آواز بلند ہوتی اور یوں معلوم ہوتا کہ بڑی دلچسپ کہانی سننے کے دوران میں کسی نے زور سے 'ہوں' کی ہے۔

ایسے ماحول میں سگریٹ پینے کا بہت مزہ آتا ہے، میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ مگر ماچس نہ ملی۔ جانے کہاں بھول آیا تھا۔ سگریٹ کی ڈبیا والی پس جیب میں رکھنے ہی والا تھا کہ پاس سے کسی نے کہا، "ماچس لیجیے گا۔"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ نیچے کے پیچھے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ یوں تو بمبئی کے عام باشندوں کا رنگ زرد ہوتا ہے۔ لیکن اس کا چہرہ خوفناک طور پر زرد تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا، "آپ کی بڑی عنایت ہے۔" اس نے جواب دیا، "آپ سگریٹ سلاگا لیجیے مجھے جانا ہے۔"

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے۔ کیونکہ اس کے لمحے سے اس بات کا پتہ چلتا تھا کہ اسے کوئی جلدی نہیں ہے اور نہ اسے کہیں جانا ہے۔ آپ کہیں گے کہ لمحے سے ایسی باتوں کا پتہ کیسے چل سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس وقت ایسا محسوس ہوا چنانچہ میں نے ایک بار پھر کہا، "ایسی جلدی کیا ہے۔۔۔ تشریف رکھیے۔" اور یہ کہہ کر میں نے سگریٹ کی ڈبیا اس کی طرف بڑھا دی، "شووق فرمائیے"

اس نے سگریٹ کی چھاپ کی طرف دیکھا۔ اور جواب دیا، "شکریہ، میں صرف اپنا برانڈیا کرتا ہوں۔"

آپ مانیں نہ مانیں۔ مگر میں قسمیہ کہتا ہوں کہ اس بار اس نے پھر چھوٹ بولا۔ اس مرتبہ پھر اس کے لمحے نے چغلی کھائی۔ اور مجھے اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس لیے کہ میں نے اپنے دل میں قصد کر لیا تھا کہ اسے ضرور اپنے پاس بٹھاؤں گا۔ اور اپنا سگریٹ پلواؤں گا۔ میرے خیال کے مطابق اس میں مشکل کی کوئی بات ہی نہ تھی۔ کیونکہ اس کے دو جملوں ہی نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہے۔ اس کا بھی چاہتا ہے کہ میرے پاس بیٹھے اور سگریٹ پیے۔ لیکن بیک وقت اس کے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوا تھا کہ میرے پاس نہ بیٹھے اور

میر اسکریٹ نہ پیے۔ چنانچہ ہاں اور نہ کایہ تصادم اُس کے لبجے میں صاف طور پر مجھے نظر آیا تھا۔ آپ تین جانے کہ اس کا وجود بھی ہونے اور نہ ہونے کے نقش میں لٹکا ہوا تھا۔

اس کا چہرہ جیسا کہ میں بیان کرچکا ہوں بے حد پیلا تھا۔ اس پر اس کی ناک، آنکھوں اور منہ کے خطوط اس قدر مدم تم تھے جیسے کسی نے تصویر بنائی ہے اور اس کو پانی سے دھوڈالا ہے۔ کبھی کبھی اس کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کے ہونٹ ابھر سے آتے لیکن پھر راکھ میں لپٹی ہوئی چنگاری کے مانند سو جاتے۔ اس کے چہرے کے دوسرے خطوط کا بھی یہی حال تھا۔ آنکھیں گدے پانی کی دو بڑی بڑی بوندیں تھیں جن پر اس کی چھدری پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ بال کا لے تھے۔ مگر ان کی سیاہی جلے ہوئے کانڈ کے مانند تھی جن میں بھوسلاپن ہوتا ہے۔ قریب سے دیکھنے پر اس کی ناک کا صحیح نقشہ معلوم ہو سکتا تھا۔ مگر دور سے دیکھنے پر وہ بالکل چیٹ معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ جیسا کہ میں اس سے پیشتر بیان کرچکا ہوں۔ اس کے چہرے کے خطوط بالکل ہی مدم تم تھے۔

اس کا قد عالم لوگوں جتنا تھا۔ یعنی نہ چھوٹا نہ بڑا۔ البتہ جب وہ ایک خاص انداز سے یعنی اپنی کمر کی ہڈی کو ڈھیلا چھوڑ کے کھڑا ہوتا۔ تو اس کے قد میں نمایاں فرق پیدا ہو جاتا۔ اس طرح جب کہ وہ ایک دم کھڑا ہوتا تو اس کا قد جسم کے مقابلے میں بہت بڑا دکھائی دیتا۔

کپڑے اس کے خستہ حالت میں تھے۔ لیکن میلے نہیں تھے۔ کوٹ کی آستینوں کے آخری حصے کثرت استعمال کے باعث گھس گئے تھے اور بھکھوڑے نکل آئے تھے۔ کارکھلا تھا۔ اور قمیں بس ایک اور دھلانی کی مار تھی۔ مگر ان کپڑوں میں بھی وہ خود کو ایک باوقار انداز میں پیش کرنے کی سعی کر رہا تھا۔ میں نے سعی کر رہا تھا! اس لیے کہا کیونکہ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تھا تو اس کے سارے وجود میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی تھی اور مجھے ایسا معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے آپ کو میری نگاہوں سے او جھل رکھنا چاہتا ہے۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور سگریٹ سلاگا کر اس کی طرف ڈیا بڑھادی، ”شووق فرمائیے۔“ یہ میں نے کچھ اس طریقے سے کہا اور فوراً مگر جس سلاگا کر اس انداز سے پیش کی کہ وہ سب کچھ بھول گیا۔ اس نے ڈیا میں سے سگریٹ نکال کر منہ میں دبایا۔ اور اسے سلاگا کر پینا بھی شروع کر دیا۔ لیکن ایکا ایکی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور منہ میں سے سگریٹ نکال کر مصنوعی لہانی کے آثار حق میں پیدا کرتے ہوئے اس نے کہا، ”کیوں نذر مجھے راس نہیں آتے ان کا تمبا کو بہت تیز ہے۔ میرے گلے میں فوراً خراشیں پیدا ہو جاتی ہیں۔“ میں نے اس سے پوچھا، ”آپ کون سے سگریٹ پسند کرتے ہیں؟“ اس نے تلا کر جواب دیا، ”میں۔۔۔ میں۔۔۔ دراصل سگریٹ بہت کم پینا ہوں۔ کیونکہ ڈاکٹر اروکرنے منع کر رکھا ہے۔ ویسے میں تھری فائیو پیتا ہوں جن کا تمبا کو تیز نہیں ہوتا۔“

اس نے جس ڈاکٹر کا نام لیا وہ بمبئی کا بہت بڑا ڈاکٹر ہے۔ اس کی فیس دس روپے ہے۔ اور جن سگریٹوں کا اس نے حوالہ دیا اس کے متعلق آپ کو بھی معلوم ہو گا کہ بہت مہنگے داموں پر ملتے ہیں۔ اس نے ایک ہی سانس میں دوجھوٹ بولے۔ جو مجھے ہضم نہ ہوئے۔ مگر میں خاموش رہا۔ حالانکہ سچ عرض کرتا ہوں اس وقت میرے دل میں یہی خواہش چلتیاں لے رہی تھی کہ اس کا غلاف اتار دوں اور اس کی دروغ گوئی کو بے نقاب کر دوں۔ اور اسے کچھ اس طرح شرمندہ کروں کہ وہ مجھ سے معافی مانے۔ مگر میں نے جب اس کی طرف دیکھا تو اس فیصلے پر پہنچا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اس کا جزو بن کر رہ گیا ہے۔ جھوٹ بول کر چہرے پر جو ایک سرخی سی دوڑ جایا کرتی ہے مجھے نظر نہ آئی بلکہ میں نے یہ دیکھا کہ وہ جو کچھ کہہ چکا ہے اس کو حقیقت سمجھتا ہے۔ اس کے جھوٹ میں اس تدریخ اخلاص تھا۔ یعنی اس نے اتنے پر خلوص طریقے پر جھوٹ بولا تھا کہ اس کی میز ان احساس میں ہلکی سی جنبش بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ خیر اس قصے کو چھوڑ دیے۔ ایسی باریکیاں میں آپ کو بتانے لگوں تو صفحوں کے صفحے کالے ہو جائیں گے۔ اور افسانہ بہت خشک ہو جائے گا۔

تحوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد میں نے اس کو راہ پر لگایا۔ اور ایک اور سگریٹ پیش کر کے سمندر کے دلفریب منظر کی بات چھیڑ دی۔ چونکہ افسانہ نگار ہوں۔ اس لیے کچھ اس دلچسپ طریقے پر اسے سمندر، اپولوبندر اور وہاں آنے جانے والے تماشا یوں کے بارے میں چند باتیں سنائیں۔ کہ چھ سگریٹ پینے پر بھی اس کے حلق میں خرخراہٹ پیدا نہ ہوئی۔ اس نے میرا نام پوچھا۔ میں نے بتایا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا، ”آپ مسٹر۔۔۔ ہیں۔ میں آپ کے کئی افسانے پڑھ چکا ہوں۔ مجھے۔۔۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ آپ۔۔۔ ہیں۔۔۔ مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے واللہ، بہت خوشی ہوئی ہے۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا۔ مگر اس نے اپنی بات شروع کر دی۔۔۔ ”ہاں خوب یاد آیا۔ بھی حال ہی میں آپ کا ایک افسانہ میں نے پڑھا ہے۔ عنوان بھول گیا ہوں۔ اس میں آپ نے ایک لڑکی پیش کی ہے جو کسی مرد سے محبت کرتی تھی۔ مگر وہ اسے دھوکہ دے گیا۔ اسی لڑکی سے ایک اور مرد بھی محبت کرتا تھا۔ جو افسانہ سناتا ہے جب اس کو لڑکی کی افتاد کا پتہ چلتا ہے تو وہ اس سے ملتا ہے اور اس سے کہتا ہے۔ زندہ رہو۔۔۔ ان چند گھٹریوں کی یاد میں اپنی زندگی کی بنیادیں کھڑی کرو۔ جو تم نے اس کی محبت میں گزاری ہیں۔ اس مسٹر کی یاد میں جو تم نے چند لمحات کے لیے حاصل کی تھی۔ مجھے اصل عبارت یاد نہیں رہی۔ لیکن مجھے بتائیے۔ کیا ایسا ممکن ہے۔ ممکن کو چھوڑ دیے۔ آپ یہ بتائیے کہ وہ آدمی آپ تو نہیں تھے؟ مگر کیا آپ ہی نے اس سے کوٹھے پر ملاقات کی تھی اور اس کی تھکی ہوئی جوانی کو او۔ گھٹی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر نیچے اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے آئے تھے۔۔۔ یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم ٹھہر گیا۔ ”مگر مجھے ایسی باتیں نہیں پوچھنی چاہئیں۔۔۔ اپنے دل کا حال کون بتاتا ہے۔“

اس پر میں نے کہا، ”میں آپ کو بتاؤں گا۔۔۔ لیکن پہلی ملاقات میں سب کچھ پوچھ لینا اور سب کچھ بتادینا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“ وہ جوش جو گفتگو کرتے وقت اس کے اندر پیدا ہو گیا تھا ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے دھیمے لمحے میں کہا، ”آپ کافر مانا بالکل درست ہے مگر کیا پتہ ہے کہ آپ سے پھر کبھی ملاقات نہ ہو۔“

اس پر میں نے کہا، ”اس میں شک نہیں بھی بہت بڑا شہر ہے لیکن ہماری ایک نہیں بہت سی ملاقات تیس ہو سکتی ہیں بیکار آدمی ہوں یعنی افسانہ نگار۔۔۔ شام کو ہر روز اسی وقت بشرطیکہ بیمار نہ ہو جاؤں آپ مجھے ہمیشہ اسی جگہ پر پائیں گے۔۔۔ یہاں بے شمار لڑکیاں سیر کو آتی ہیں۔ اور میں اس لیے آتا ہوں کہ خود کو کسی کی محبت میں گرفتار کر سکوں۔۔۔ محبت بری چیز نہیں ہے!“

”محبت۔۔۔ محبت!“ اس نے اس سے آگے کچھ کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکا۔ اور جلتی ہوئی رسمی کی طرح آخری بل کھا کر خاموش ہو گیا۔

میں نے از راہِ مذاق اس سے محبت کا ذکر کیا تھا۔ دراصل اس وقت فضائی دلفریب تھی کہ اگر کسی عورت پر عاشق ہو جاتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا جب دونوں وقت آپس میں مل رہے ہوں۔ نیم تاریکی میں بجلی کے قیمے قطار اندر قطار آنکھیں جھپکنا شروع کر دیں۔ ہوا میں خنکی پیدا ہو جائے اور فضا پر ایک افسانوی کیفیت سی چھا جائے تو کسی اجنبی عورت کی قربت کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے۔ ایک ایسی جس کا احساس تحت شعور میں چھپا رہتا ہے۔

خدامعلوم اس نے کس افسانے کے متعلق مجھ سے پوچھا تھا۔ مجھے اپنے سب افسانے یاد نہیں۔ اور خاص طور پر وہ تو بالکل یاد نہیں جو رومانی ہیں۔ میں اپنی زندگی میں بہت کم عورتوں سے ملا ہوں۔ وہ افسانے جو میں نے عورتوں کے متعلق لکھے ہیں یا تو کسی خاص ضرورت کے ماتحت لکھے گئے ہیں یا مخصوص دماغی عیاشی کے لیے۔ میرے ایسے افسانوں میں چونکہ خلوص نہیں ہے اس لیے میں نے کبھی ان کے متعلق غور نہیں کیا۔ ایک خاص طبقے کی عورتیں میری نظر سے گزری ہیں۔ اور ان کے متعلق میں نے چند افسانے لکھے ہیں۔ مگر وہ رومان نہیں ہیں۔ اس نے جس افسانے کا ذکر کیا تھا وہ یقیناً کوئی ادنیٰ درجے کا رومان تھا۔ جو میں نے اپنے چند جذبات کی پیاس بجھانے کے لیے لکھا ہو گا۔۔۔ لیکن میں نے تو اپنا افسانہ بیان کرنا شروع کر دیا۔

ہاں توجہ وہ محبت کہہ کر خاموش ہو گیا تو میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ محبت کے بارے میں کچھ اور کہوں۔ چنانچہ میں نے کہنا شروع کیا، ”محبت کی یوں توبہت سی قسمیں ہمارے باپ دادا بیان کر گئے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ محبت خواہ ملتان میں ہو یا سا بہریا کے نجاستہ میدانوں میں۔ سردیوں میں پیدا ہو یا گرمیوں میں، امیر کے دل میں پیدا ہو یا غریب کے دل میں۔۔۔ محبت خوبصورت کرے یا بد صورت،

بد کردار کرے یا نیکوکار۔۔۔ محبت محبت ہی رہتی ہے۔ اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا جس طرح بچ پیدا ہونے کی صورت ہمیشہ ہی ایک سی چلی آرہی ہے، اسی طرح محبت کی پیدائش بھی ایک ہی طریقے پر ہوتی ہے۔ یہ جدا بات ہے کہ سعیدہ بیگم ہسپتال میں بچے جنے اور راجکماری جنگل میں۔ غلام محمد کے دل میں بھٹکنے محبت پیدا کر دے، اور نور لال کے دل میں کوئی رانی جس طرح بعض بچے وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں اور کمزور رہتے ہیں اسی طرح وہ محبت بھی کمزور رہتی ہے جو وقت سے پہلے جنم لے بعض دفعہ بچ بڑی تکلیف سے پیدا ہوتے ہیں بعض دفعہ محبت بھی بڑی تکلیف دے کر پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح عورتوں کا حمل گر جاتا ہے اسی طرح محبت بھی گر جاتی ہے بعض دفعہ بانجھ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ ادھر بھی آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملہ میں بانجھ ہیں۔۔۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ محبت کرنے کی خواہش ان کے دل سے ہمیشہ کے لیے مٹ جاتی ہے، یا ان کے اندر وہ جذبہ ہی نہیں رہتا، نہیں، یہ خواہش ان کے دل میں موجود ہوتی ہے۔ مگر وہ اس قابل نہیں رہتے کہ محبت کر سکیں۔ جس طرح عورت اپنے جسمانی نقص کے باعث بچ پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی اسی طرح یہ لوگ چند روحانی نقص کی وجہ سے کسی کے دل میں محبت پیدا کرنے کی قوت نہیں رکھتے۔۔۔ محبت کا اسقاط بھی ہو سکتا ہے۔۔۔“

مجھے اپنی گفتگو دلچسپ معلوم ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں اس کی طرف دیکھے بغیر لیکھر دیے جا رہا تھا۔ لیکن جب میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ سمندر کے اس پار خلایں دیکھ رہا تھا اور اپنے خیالات میں گم تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔

جب زور سے کسی موڑ کا ہارن بجا تو وہ چونکا اور خالی الذہن ہو کر کہنے لگا، ”جی۔۔۔ آپ نے بالکل درست فرمایا ہے!“

میرے جی میں آئی کہ اس سے پوچھوں۔۔۔ درست فرمایا ہے؟ اس کو چھوڑ دیے آپ یہ بتائیے کہ میں نے کیا کہا ہے؟“ لیکن میں خاموش رہا۔ اور اس کو موقع دیا کہ اپنے وزنی خیالات دماغ سے جھٹک دے۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس کے بعد اس نے پھر کہا، ”آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا ہے۔ لیکن۔۔۔ خیر چھوڑ دیئے اس قصے کو۔“

مجھے اپنی گفتگو بہت اچھی معلوم ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی میری باتیں سنتا چلا جائے۔ چنانچہ میں نے پھر سے کہنا شروع کیا، ”تو میں عرض کر رہا تھا کہ بعض آدمی بھی محبت کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں۔ یعنی ان کے دل میں محبت کرنے کی خواہش تو موجود ہوتی ہے لیکن ان کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بانجھ پن کا باعث روحاںی نقص ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

اس کارنگ اور بھی زرد پڑ گیا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ یہ تبدیلی اس کے اندر اتنی جلدی پیدا ہوئی کہ میں نے گھر اکراں سے پوچھا، ”خیریت تو ہے۔۔۔ آپ بیمار ہیں۔“

”نہیں تو۔۔۔ نہیں تو“، اس کی پریشانی اور بھی زیادہ ہو گئی۔

”مجھے کوئی بیماری و میماری نہیں ہے۔۔۔ لیکن آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں بیمار ہوں۔“ میں نے جواب دیا، ”اس وقت آپ کو جو کوئی بھی دیکھے گا، یہی کہے گا کہ آپ بہت بیمار ہیں۔ آپ کارنگ خوفناک طور پر زرد ہورہا ہے۔۔۔ میرا خیال ہے آپ کو گھر چلے جانا چاہیے۔ آئیے میں آپ کو جھوڑ آؤں۔“

”نہیں میں چلا جاؤں گا۔ مگر میں بیمار نہیں ہوں۔۔۔ بھی کبھی میرے دل میں معمولی سادر دپیدا ہو جایا کرتا ہے۔ شاید وہی ہو۔۔۔ میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا آپ اپنی گنتگلو جاری رکھیے۔“

میں تھوڑی دیر خاموش رہا۔ کیونکہ وہ ایسی حالت میں نہیں تھا کہ میری بات غور سے سن سکتا۔ لیکن جب اس نے اصرار کیا تو میں نے کہنا شروع کیا، ”میں آپ سے یہ پوچھ رہا تھا کہ ان لوگوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جو محبت کرنے کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں۔۔۔ میں ایسے آدمیوں کے جذبات اور ان کی اندر وہی کیفیات کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ لیکن جب میں اس بانجھ عورت کا تصور کرتا ہوں جو صرف ایک بیٹی یا بیٹا حاصل کرنے کے لیے دعائیں مانتی ہے۔ خدا کے حضور میں گڑگڑاتی ہے اور جب وہاں سے کچھ نہیں ملتا تو ٹونے ٹوکنوں میں اپنا گوہر مقصود ڈھونڈتی ہے۔ شمشانوں سے راکھ لاتی ہے کئی کئی راتیں جاگ کر سادھوؤں کے بتائے ہوئے منتر پڑھتی ہے۔ منتیں مانتی ہے۔ چڑھاوے چڑھاتی ہے۔ تو میں خیال کرتا ہوں کہ اس آدمی کی بھی یہی حالت ہوتی ہو گی جو محبت کے معاملے میں بانجھ ہو۔۔۔ ایسے لوگ واقعی ہمدردی کے قابل ہیں۔ مجھے اندھوں پر انتار حم نہیں آتا جتنا ان لوگوں پر آتا ہے۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور وہ تھوک نگل کر دنعتاٹھ کھڑا ہوا۔ اور پرلی طرف منہ کر کے کہنے لگا، ”اوہ بہت دیر ہو گئی۔ مجھے ضروری کام کے لیے جانا تھا یہاں باتوں باتوں میں کتنا وقت گزر گیا۔“

میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ پلٹا اور جلدی سے میرا ہاتھ دبا کر لیکن میری طرف دیکھے بغیر اس نے ”اب رخصت چاہتا ہوں“ کہا اور چل دیا۔

دوسری مرتبہ اس سے میری ملاقات پھر اپولوبندر ہی پر ہوئی۔ میں سیر کا عادی نہیں ہوں۔ مگر اس زمانے میں ہر شام اپولوبندر پر جانا میرا دستور ہو گیا تھا۔ ایک مہینے کے بعد جب مجھے آگرہ کے ایک شاعر نے ایک لمبا چڑھات لکھا جس میں اس نے نہایت ہی حریصانہ طور پر اپولوبندر اور وہاں جمع ہونے والی پریوں کا ذکر کیا۔ اور مجھے اس لحاظ سے بہت خوش قسمت کہا کہ میں بھی میں ہوں تو اپولوبندر سے میری دلچسپی ہمیشہ کے لیے فنا ہو گئی۔ اب جب کبھی کوئی مجھے اپولوبندر جانے کو کہتا ہے تو مجھے آگرے کے شاعر کا خط یاد آ جاتا ہے اور میری طبیعت متلا جاتی ہے۔ لیکن میں اس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں جب خط مجھے نہیں ملا تھا۔ اور میں ہر روز جا کر شام کو اپولوبندر کے اس بخ پر بیٹھا کرتا تھا جس کے اُس طرف کئی آدمی چپی والوں سے اپنی کھوپڑیوں کی مرمت کرتے رہتے ہیں۔

دن پوری طرح ڈھل چکا تھا۔ اور اجائے کا کوئی نشان باقی نہیں رہا تھا۔ اکتوبر کی گرمی میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ہوا چل رہی تھی۔۔۔ تھکلے ہوئے مسافر کی طرح۔ سیر کرنے والوں کا ہجوم زیادہ تھا۔ میرے پیچھے موڑیں ہی موڑیں کھڑی تھیں۔ نیچ بھی سب کے سب پر تھے۔ جہاں بیٹھا کرتا تھا وہاں دو باتوں ایک گجراتی اور ایک پارسی نہ جانے کب کے جنم ہوئے تھے۔ دونوں گجراتی بولتے تھے۔ مگر مختلف لب والے جو سے۔ پارسی کی آواز میں دوسرتھے۔ وہ کبھی باریک سر میں بات کرتا تھا کبھی موٹے سر میں۔ جب دونوں تیزی سے بولنا شروع کر دیتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے طو طے میانکی لڑائی ہو رہی ہے۔

میں ان کی لامتناہی گفتگو سے تنگ آکر اٹھا اور ٹہلنے کی خاطر تاج محل ہو ٹل کا رخ کرنے ہی والا تھا کہ سامنے سے مجھے وہ آتا دکھائی دیا۔ مجھے اس کا نام معلوم نہیں تھا۔ اس لیے میں اسے پکارنہ سکا۔ لیکن جب اس نے مجھے دیکھا۔ تو اس کی نگاہیں ساکن ہو گئیں۔ جیسے اسے وہ چیز مل گئی ہو جس کی اسے تلاش تھی۔

کوئی نیچ خالی نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اس سے کہا، ”آپ سے بہت دیر کے بعد ملاقات ہوئی۔۔۔ چلیے سامنے ریستوران میں بیٹھتے ہیں، بہاں کوئی نیچ خالی نہیں۔“

اس نے رسی طور پر چند باتیں کیں اور میرے ساتھ ہو لیا۔ چند گزوں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم دونوں ریستوران میں بید کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چائے کا آرڈر دیکر میں نے اس کی طرف سگر ٹوں کاٹیں بڑھا دیا۔ اتفاق کی بات ہے۔ میں نے اسی روز دس روپے دے کر ڈاکٹر اروکر سے مشورہ لیا تھا۔ اور اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اول تو سگریٹ پینا ہی موقوف کر دو۔ اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو اچھے سگریٹ پیا کرو۔ مثال کے طور پر پانچ سو پچپن۔۔۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق یہ میں اسی شام خریدا تھا۔ اس نے ڈبے کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر میری طرف نگاہیں اٹھائیں، کچھ کہنا چاہا مگر خاموش رہا۔

میں ہنس پڑا۔ ”آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ میں نے آپ کے کہنے پر یہ سگریٹ پینا شروع کیے ہیں۔۔۔ اتفاق کی بات ہے کہ آج مجھے بھی ڈاکٹر اروکر کے پاس جانا پڑا۔ کیونکہ کچھ دنوں سے میرے سینے میں درد ہو رہا ہے چنانچہ اس نے مجھ سے کہا کہ یہ سگریٹ پیا کرو لیکن بہت کم۔۔۔ میں نے یہ کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کو میری یہ باتیں ناگوار معلوم ہوئی ہیں۔ چنانچہ میں نے فوراً جیب سے وہ نسخہ نکالا جو ڈاکٹر اروکر نے مجھے لکھ کر دیا تھا۔ یہ کاغذ میز پر میں نے اس کے سامنے رکھ دیا، ”یہ عبارت مجھ سے پڑھی تو نہیں جاتی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے وہاں من کا سارا خاندان اس نسخے میں جمع کر دیا ہے۔“

اس کا غذ کو جس پر ابھرے ہوئے کالے حروف میں ڈاکٹر اروکر کا نام اور پتہ مندرج تھا اور تاریخ بھی ہوئی تھی۔ اس نے چورنگا ہوں سے دیکھا اور وہ اضطراب جو اس کے چہرے پر پیدا ہو گیا تھا فوراً دور ہو گیا۔ چنانچہ اس نے مسکرا کر کہا، ”کیا وجہ ہے کہ اکثر لکھنے والوں کے اندر وہاں مزخر ختم ہو جاتی ہیں؟“

میں نے جواب دیا، ”اس لیے کہ انھیں کھانے کو کافی نہیں ملتا۔ کام زیادہ کرتے ہیں۔ لیکن اجرت بہت کم ملتی ہے۔“

اس کے بعد چائے آگئی اور دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔

پہلی ملاقات اور اس ملاقات میں غالباً ڈھائی مہینے کا فاصلہ تھا۔ اس کے چہرے کارنگ پبلے سے زیادہ پہلا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقت پیدا ہو رہے تھے۔ اسے غالباً گولی تکلیف تھی جس کا احساس اسے ہر وقت رہتا تھا۔ کیونکہ باتیں کرتے کرتے بعض اوقات وہ ٹھہر جاتا۔ اور اس کے ہونٹوں میں سے غیر ارادی طور پر آہ نکل جاتی۔ اگر ہنسنے کی کوشش بھی کرتا تو اس کے ہونٹوں میں زندگی پیدا نہیں ہوتی تھی۔

میں نے یہ کیفیت دیکھ کر اس سے اچانک طور پر پوچھا، ”آپ اداس کیوں ہیں؟“

”اداس۔۔۔ اداس“ ایک پھیکی سی مسکراہٹ جوان مرنے والوں کے لبوں پر پیدا ہوا کرتی ہے جو ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ وہ موت سے خاکف نہیں، اس کے ہونٹوں پر پھیلی۔ ”میں اداس نہیں ہوں۔ آپ کی طبیعت اداس ہو گی۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک ہی گھونٹ میں چائے کی پیالی خالی کر دی اور اٹھ کھڑا ہوا، ”اچھاتو میں اجازت چاہتا ہوں۔۔۔ ایک ضروری کام سے جاتا ہے۔“

مجھے یقین تھا کہ اسے کسی ضروری کام سے نہیں جانا ہے۔ مگر میں نے اسے نہ روکا اور جانے دیا۔ اس دفعہ پھر اس کا نام دریافت نہ کر سکا۔ لیکن اتنا پتہ چل گیا کہ وہ ذہنی اور روحانی طور پر بے حد پریشان تھا۔ وہ اداس تھا۔ بلکہ یوں کہیے کہ اداسی اس کے رگ و ریشه میں سرایت کر چکی تھی۔ مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی اداسی کا دوسروں کو علم ہو۔ وہ دوزندگیاں بسر کرنا چاہتا تھا۔ ایک وہ جو حقیقت تھی اور ایک وہ جس کی تخلیق میں ہر گھنٹی، ہر لمحہ مصروف رہتا تھا۔ لیکن اس کی زندگی کے یہ دونوں پہلو ناکام تھے۔ کیوں؟ یہ مجھے معلوم نہیں۔

اس سے تیسرا مرتبہ میری ملاقات پھر اپولو بندر پر ہوئی۔ اس دفعہ میں اسے اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں ہماری کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ لیکن گھر پر اس کے ساتھ بہت سی باتیں ہوئیں۔ جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر چند لمحات کے لیے اداسی چھائی۔ مگر وہ فوراً سنبھل گیا۔ اور اس نے اپنی عادت کے خلاف اپنے آپ کو بہت تروتازہ اور بالتوںی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اس کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے اس پر اور بھی ترس آگیا۔ وہ ایک موت جیسی یقینی حقیقت کو جھੁਲارہا تھا۔ اور مزا یہ ہے کہ اس خود فریبی سے کبھی کبھی وہ مطمئن بھی نظر آتا تھا۔

باتوں کے دوران میں اس کی نظر میرے میز پر پڑی۔ شیشے کے فریم میں اس کو ایک لڑکی کی تصویر نظر آئی۔ اٹھ کر اس نے تصویر کی طرف جاتے ہوئے کہا، ”کیا میں آپ کی اجازت سے یہ تصویر دیکھ سکتا ہوں۔“ میں نے کہا، ”صد شوق۔“ اس نے تصویر کو ایک نظر دیکھا اور دیکھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اچھی خوبصورت لڑکی ہے۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی۔۔۔“

”جی نہیں۔۔۔ ایک زمانہ ہوا۔ اس سے محبت کرنے کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا تھا۔ بلکہ یوں کہیے کہ تھوڑی سی محبت میرے دل میں پیدا بھی ہو گئی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ اس کو اس کی خبر تک نہ ہوئی۔ اور میں۔۔۔ میں۔۔۔ نہیں، بلکہ وہ بیاہ دی گئی۔۔۔ یہ تصویر میری پہلی محبت کی یاد گار ہے جو اچھی طرح پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گئی۔۔۔“

”یہ آپ کی محبت کی یاد گار ہے۔۔۔ اس کے بعد تو آپ نے اور بھی بہت سے رومان لڑائے ہوں گے۔“ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”یعنی آپ کی زندگی میں تو کئی ایسی نامکمل اور مکمل محبتیں موجود ہوں گی۔“

میں کہنے ہی والا تھا کہ جی نہیں خاکسار بھی محبت کے معاملے میں آپ جیسا بخوبی ہے۔ مگر جانے کیوں یہ کہتا کہتا رک گیا۔ اور خواہ جھوٹ بول دیا۔ ”جی ہاں۔۔۔ ایسے سلسلے ہوتے رہتے ہیں۔۔۔ آپ کی کتابِ زندگی بھی تو ایسے واقعات سے بھر پور ہو گی۔“

وہ کچھ نہ بولا اور بالکل خاموش ہو گیا۔ جیسے کسی گھرے سمندر میں غوطہ لگا گیا ہے۔ دیر تک جب وہ اپنے خیالات میں غرق رہا اور میں اس کی خاموشی سے اداس ہونے لگا۔ تو میں نے کہا، ”احیٰ حضرت! آپ کن خیالات میں کھو گئے؟“ وہ چونک پڑا، ”میں--- میں--- کچھ نہیں میں ایسے ہی کچھ سوچ رہا تھا۔“ میں نے پوچھا، ”کوئی بیتی کہانی یاد آگئی--- کوئی پھرٹا ہوا سپنال گیا۔--- پرانے زخم ہرے ہو گئے؟“

”زخم--- پرانے--- زخم--- کئی زخم نہیں--- صرف ایک ہی ہے، بہت گہرا، بہت کاری۔--- اور زخم میں چاہتا بھی نہیں۔ ایک ہی زخم کافی ہے“

یہ کہہ کروہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور میرے کمرے میں ٹھلنے کی کوشش کرنے لگا۔ کیونکہ اس چھوٹی سی جگہ میں جہاں کرسیاں، میز اور چارپائی سب کچھ پڑا تھا۔ ٹھلنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ میز کے پاس اسے رکنا پڑا۔ تصویر کواب کی دفعہ گہری نظر وہ سے دیکھا اور کہا، ”اس میں اور اس میں کتنی مشابہت ہے۔--- مگر اس کے چہرے پر ایسی شوخی نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی تھیں۔ مگر ان آنکھوں کی طرح ان میں شرارت نہیں تھی۔ وہ فکر مند آنکھیں تھی۔ ایسی آنکھیں جو دیکھتی بھی ہیں اور سمجھتی بھی ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک سرد آہ بھری اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ موت بالکل ناقابل فہم چیز ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ یہ جوانی میں آئے۔--- میں سمجھتا ہوں کہ خدا کے علاوہ ایک طاقت اور بھی ہے جو بڑی حاصل ہے۔ جو کسی کو خوش دیکھنا نہیں چاہتی۔--- مگر چھوڑ یے اس قطے کو۔“

میں نے اس سے کہا، ”نہیں نہیں، آپ سناتے جائیے۔--- لیکن اگر آپ ایسا مناسب سمجھیں۔۔۔ مجھ پوچھیے تو میں یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ نے کبھی محبت کی ہی نہ ہو گی۔“

”یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں نے کبھی محبت کی ہی نہیں اور ابھی ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ میری کتاب زندگی ایسے کئی واقعات سے بھری پڑی ہو گی۔“ یہ کہہ کر اس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ”میں نے اگر محبت نہیں کی تو یہ دکھ میرے دل میں کہاں سے پیدا ہو گیا ہے؟ میں نے اگر محبت نہیں کی تو میری زندگی کو یہ روگ کہاں سے چٹ گیا ہے؟ میں روز بروز موم کی طرح کیوں پگھلا جا رہا ہوں؟“

بظاہر یہ تمام سوال وہ مجھ سے کر رہا تھا۔ مگر دراصل وہ سب کچھ اپنے آپ ہی سے پوچھ رہا تھا۔

میں نے کہا، ”میں نے جھوٹ بولا تھا کہ آپ کی زندگی میں ایسے کئی واقعات ہوں گے۔ مگر آپ نے بھی جھوٹ بولا تھا کہ میں اداں نہیں ہوں اور مجھے کوئی روگ نہیں ہے۔۔۔ کسی کے دل کا حال جانتا آسان بات نہیں ہے، آپ کی اداں کی اور بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ مگر جب تک مجھے آپ خود نہ بتائیں میں کسی نتیجے پر کیسے پہنچ سکتا ہوں۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ واقعی روز بروز کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کو یقیناً بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے اور۔۔۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔“

”ہمدردی۔۔۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں اس لیے کہ ہمدردی اسے واپس نہیں لاسکتی۔۔۔ اس عورت کو موت کی گہرائیوں سے نکال کر میرے حوالے نہیں کر سکتی جس سے مجھے پیار تھا۔ آپ نے محبت نہیں کی۔ مجھے یقین ہے، آپ نے محبت نہیں کی، اس لیے کہ اس کی ناکامی نے آپ پر کوئی داغ نہیں چھوڑا۔ میری طرف دیکھیے۔“ یہ کہہ کر اس نے خود اپنے آپ کو دیکھا۔ ”کوئی جگہ آپ کو ایسی نہیں ملے گی جہاں میری محبت کے نقش موجود نہ ہوں۔۔۔ میرے وجود خود اس محبت کی ٹوٹی ہوئی عمارت کا ملبہ ہے۔۔۔ میں آپ کو یہ داستان کیسے سناؤں اور کیوں سناؤں جب کہ آپ اسے سمجھ ہی نہیں سکیں گے۔۔۔ کسی کا یہ کہہ دینا کہ میری ماں مر گئی ہے آپ کے دل پر وہ اثر پیدا نہیں کر سکتا جو موت نے بیٹھ پر کیا تھا۔۔۔ میری داستان محبت آپ کو۔۔۔ کسی کو بھی بالکل معمولی معلوم ہو گی مگر مجھ پر جو اثر ہوا ہے اس سے کوئی بھی آگاہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ محبت میں نے کی ہے اور سب کچھ صرف مجھی پر گزارا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے حلق میں تلخی پیدا ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ بار بار تھوک نگلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کیا وہ آپ کو دھوکا دے گئی۔“ میں نے اس سے پوچھا، ”یا کچھ اور حالات تھے؟“

”دھوکا۔۔۔ وہ دھوکا دے ہی نہیں سکتی تھی۔ خدا کے لیے دھوکا نہ کہیے۔ وہ عورت نہیں فرشتہ تھی۔ مگر برآ ہواں موت کا جو ہمیں خوش نہ دیکھ سکی۔ اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنے پروں میں سمیٹ کر لے گئی۔۔۔ آہ! آپ نے میرے دل پر خراشیں پیدا کر دی ہیں۔ سینے۔۔۔ سینے، میں آپ کو دردناک داستان کا کچھ حصہ سنتا ہوں۔۔۔ وہ ایک بڑے اور امیر گھرانے کی لڑکی تھی جس زمانے میں اس کی اور میری پہلی ملاقات ہوئی۔ میں اپنے باپ دادا کی ساری جائیداد عیاشیوں میں بر باد کر چکا تھا۔ میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں تھی۔ پھر بمبئی چھوڑ کر میں لکھنؤ چلا آیا۔ اپنی موڑ چونکہ میرے پاس ہوا کرتی تھی۔ اس لیے میں صرف موڑ چلانے کا کام جانتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسی کو اپنا پیشہ قرار دینے کا فیصلہ کیا۔ پہلی ملازمت مجھے ڈپٹی صاحب کے یہاں ملی۔ جن کی اکلوتی لڑکی تھی۔۔۔ یہ کہتے کہتے وہ اپنے خیالات میں کھو گیا۔ اور دفعتا پچھ ہو گیا، میں بھی خاموش رہا۔

تحوڑی دیر بعد وہ پھر چونکا اور کہنے لگ۔

”میں کیا کہہ رہا تھا؟“

”آپ ڈپٹی صاحب کے یہاں ملازم ہو گئے۔“

”ہاں وہ انہی ڈپٹی صاحب کی اکلوتی لڑکی تھی ہر روز صحیح نوبجے میں زہرہ کو موڑ میں اسکول لے جایا کرتا تھا۔ وہ پردہ کرتی تھی مگر موڑ ڈرائیور سے کوئی کب تک چھپ سکتا ہے۔ میں نے اسے دوسرے روز ہی دیکھ لیا۔۔۔ وہ صرف خوبصورت ہی نہیں تھی۔ اس میں ایک خاص بات بھی تھی۔۔۔ بڑی سنجیدہ اور متین لڑکی تھی۔ اس کی سیدھی مانگ نے اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا وقار پیدا کر دیا تھا۔۔۔ وہ۔۔۔ میں کیا عرض کروں وہ کیا تھی۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں اس کی صورت اور سیرت بیان کر سکوں۔۔۔“

بہت دیر تک وہ اپنی زہرہ کی خوبیاں بیان کرتا رہا۔ اس دوران میں اس نے کئی مرتبہ اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خیالات اس کے دماغ میں ضرورت سے زیادہ جمع ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی بات کرتے کرتے اس کا چہرہ تمتما اٹھتا۔ لیکن پھر ادا سی چھاجاتی۔ اور وہ آہوں میں گفتگو کرنا شروع کر دیتا۔ وہ اپنی داستان بہت آہستہ آہستہ سنارہتا۔ جیسے خود بھی مزائلے رہا ہو۔ ایک ایک ٹکڑا جوڑ کر اس نے ساری کہانی پوری کی جس کا حاصل یہ تھا۔

زہرہ سے اسے بے پناہ محبت ہو گئی۔ کچھ دن تو موقع پا کر اس کا دیدار کرنے اور طرح طرح کے منصوبے باندھنے میں گزر گئے۔ مگر جب اس نے سنجیدگی سے اس محبت پر غور کیا تو خود کو زہرہ سے بہت دور پایا۔ ایک موڑ ڈرائیور اپنے آقا کی لڑکی سے محبت کیسے کر سکتا ہے؟ چنانچہ جب اس تلخ حقیقت کا احساس اس کے دل میں پیدا ہوا تو وہ مغموم رہنے لگا۔ لیکن ایک دن اس نے بڑی جرات سے کام لیا، کاغذ کے ایک پر زے پر اس نے زہرہ کو چند سطریں لکھیں۔۔۔ یہ سطریں مجھے یاد ہیں۔

”زہرہ! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہارا نوکر ہوں! تمہارے والد صاحب مجھے تیس روپے ماہوار دیتے ہیں۔ مگر میں تم سے محبت کرتا ہوں۔۔۔ میں کیا کروں، کیا نہ کروں، میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔“

یہ سطحیں کاغذ پر لکھ کر اس نے کاغذ اس کی کتاب میں رکھ دیا۔ دوسرے روز جب وہ اسے موڑ میں اسکول لے گیا۔ تو اس کے ہاتھ کا نپ رہے تھے۔ بینڈل کئی بار اس کی گرفت سے نکل نکل گیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ کوئی ایکسی ڈنٹ نہ ہوا۔ اس روز اس کی کیفیت عجیب رہی۔ شام کو جب وہ زہرہ کو اسکول سے واپس لا رہا تھا۔ تو راستے میں اس لڑکی نے موڑ روکنے کے لیے کہا۔ اس نے جب موڑ روک لی تو زہرہ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا، ”دیکھو نعیم آئندہ تم ایسی حرکت کبھی نہ کرنا۔ میں نے ابھی تک اباجی سے تمہارے اس خط کا ذکر نہیں کیا جو تم نے میرے کتاب میں رکھ دیا تھا۔ لیکن اگر پھر تم نے ایسی حرکت کی۔ تو مجبوراً ان سے شکایت کرنا پڑے گی۔ سمجھے۔۔۔ چلواب موڑ چلاو۔“

اس گفتگو کے بعد اس نے بہت کوشش کی کہ ڈپٹی صاحب کی نوکری چھوڑ دے اور زہرہ کی محبت کو اپنے دل سے ہمیشہ کے لیے مٹا دے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک مہینہ اسی کشمکش میں گزر گیا۔ ایک روز اس نے پھر جرأت سے کام لے کر خط لکھا اور زہرہ کی ایک کتاب میں رکھ کر اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ دوسرے روز صح کو اسے نوکری سے بر طرف کر دیا جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ شام کو اسکول سے واپس آتے ہوئے زہرہ اس سے ہم کلام ہوئی۔ ایک بار پھر اس کو ایسی حرکتوں سے باز رہنے کے لیے کہا، ”اگر تمہیں اپنی عزت کا خیال نہیں تو کم از کم میری عزت کا تو کچھ خیال تمہیں ہونا چاہیے۔“ یہ اس نے ایک بار پھر، اسے کچھ اس سنجیدگی اور ممتازت سے کہا کہ نعیم کی ساری امیدیں فنا ہو گئیں۔ اور اس نے قصد کر لیا کہ وہ نوکری چھوڑ دے گا۔ اور لکھنؤ سے ہمیشہ کے لیے چلا جائے گا۔ مہینے کے آخر میں نوکری چھوڑنے سے پہلے اس نے اپنی کوٹھری میں لاثین کی مدھم روشنی میں زہرہ کو آخری خط لکھا۔

اس میں اس نے نہایت درد بھرے لمحہ میں اس سے کہا، ”زہرہ! میں نے بہت کوشش کی کہ میں تمہارے کہہ پر عمل کر سکوں مگر دل پر میرا اختیار نہیں ہے۔ یہ میرا آخری خط ہے۔ کل شام کو میں لکھنؤ چھوڑ دوں گا۔ اس لیے تمہیں اپنے والد صاحب سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری خاموشی میری قسمت کا فیصلہ کر دے گی۔ مگر یہ خیال نہ کرنا کہ تم سے دورہ کر تم سے محبت نہیں کروں گا۔ میں جہاں کہیں بھی رہوں گا۔ میرا دل تمہارے قدموں میں ہو گا۔۔۔ میں ہمیشہ ان دونوں کو یاد کرتا رہوں گا۔ جب میں موڑ آہستہ آہستہ چلاتا تھا کہ تمہیں دھکانہ لگے۔۔۔ میں اس کے سوا اور تمہارے لیے کرہی کیا سلتا تھا۔۔۔“

یہ خط بھی اس نے موقع پا کر اس کتاب میں رکھ دیا۔ صح کو زہرہ نے اسکول جاتے ہوئے اس سے کوئی بات نہ کی۔ اور شام کو بھی راستے میں اس نے کچھ نہ کہا۔ چنانچہ وہ بالکل نا امید ہو کر اپنی کوٹھری میں چلا آیا۔ جو تھوڑا بہت اسباب اس کے پاس تھا باندھ کر اس نے ایک طرف رکھ دیا۔ اور لا لٹھن کی اندر ھی روشنی میں چار پائی پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ زہرہ اور اس کے درمیان کتنا بڑا فاصلہ ہے۔

وہ بے حد مغموم تھا۔ اپنی پوزیشن سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ ایک ادنیٰ درجے کا ملازم ہے اور اپنے آقا کی لڑکی سے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی بے اختیار اس سے محبت کرتا ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے اور پھر اس کی محبت فریب تو نہیں۔ وہ اسی ادھیر بن میں تھا کہ آدمی رات کے قریب اس کی کوٹھری کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ لیکن پھر اس نے خیال کیا کہ مالی ہو گا۔ ممکن ہے اس کے گھر میں کوئی ایکا ایکی بیمار پڑ گیا ہو اور وہ اس سے مدد لینے کے لیے آیا ہو۔ لیکن جب اس نے دروازہ کھولا تو زہرہ سامنے کھڑی تھی۔ جی ہاں زہرہ۔ دسمبر کی سردی میں شال کے بغیر وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کہ، چند لمحات قبر کی سی خاموشی میں گزر گئے۔ آخر زہرہ کے ہونٹ والے اور تھرثارتے ہوئے لبجے میں اس نے کہا، ”نعم میں تمہارے پاس آگئی ہوں۔ بتاؤ اب تم کیا چاہتے ہو۔۔۔ لیکن اس سے پہلے کہ تمہاری اس کوٹھری میں داخل ہوں، میں تم سے چند سوال کرنا چاہتی ہوں۔“

نعم خاموش رہا۔ لیکن زہرہ اس سے پوچھنے لگی، ”کیا واقعی تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟“

نعم کو جیسے ٹھیس سی لگی۔ اس کا چہرہ تمباٹھا۔ ”زہرہ تم نے ایسا سوال کیا ہے جس کا جواب اگر میں دوں تو میری محبت کی توہین ہوگی۔۔۔“ میں تم سے پوچھتا ہوں۔ ”کیا میں محبت نہیں کرتا؟“

زہرہ نے اس سوال کا جواب نہ دیا۔ اور تھوڑی دیر خاموش رہ کر اپنا دوسرا سوال ”میرے باپ کے پاس دولت ہے، مگر میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں، جو کچھ میرا کہا جاتا ہے میرا نہیں ہے، ان کا ہے۔ کیا تم مجھے دولت کے بغیر بھی ویسا ہی عزیز سمجھو گے؟“

نعم، بہت جذباتی آدمی تھا۔ چنانچہ اس سوال نے بھی اس کے وقار کو ختم کیا، بڑے دکھ بھرے لبجے میں اس نے زہرہ سے کہا، ”زہرہ خدا کے لیے مجھ سے ایسی باتیں نہ پوچھو جن کا جواب اس قدر عام ہو چکا ہے کہ تمہیں تھرڈ کلاس عشقیہ ناولوں میں بھی مل سکتا ہے۔“ زہرہ اس کی کوٹھری میں داخل ہو گئی۔ اور اس کی چارپائی پر بیٹھ کر کہنے لگی۔ ”میں تمہاری ہوں اور ہمیشہ تمہاری رہوں گی۔“

زہرہ نے اپنا قول پورا کیا جب دونوں لکھنو چھوڑ کر دہلی چلے آئے اور شادی کر کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگے۔ تو ڈپٹی صاحب ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں پہنچ گئے۔ نعم کو نوکری مل گئی تھی۔ اس لیے وہ گھر میں نہیں تھا۔ ڈپٹی صاحب نے زہرہ کو بہت برا بھلا کہا۔ ان کی ساری عزت خاک میں مل گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ زہرہ نعم کو چھوڑ دے اور جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھولا جائے۔ وہ نعم کو دو تین ہزار روپیہ دینے کے لیے بھی تیار تھے۔ مگر انھیں ناکام لوٹنا پڑا۔ اس لیے کہ زہرہ نعم کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوئی۔ اس نے

اپنے باپ سے کہا، ”ابا جی! میں نعیم کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ آپ اس سے اچھا شوہر میرے لیے کبھی تلاش نہیں کر سکتے۔ میں اور وہ آپ سے کچھ نہیں مانگتے۔ اگر آپ ہمیں دعائیں دے سکیں تو ہم آپ کے منون ہوں گے۔“

ڈپٹی صاحب نے جب یہ گفتگو سنی تو بہت خشم آلو دھوئے۔ انہوں نے نعیم کو قید کرادینے کی دھمکی بھی دی مگر زہرہ نے صاف صاف کہہ دیا، ”ابا جی! اس میں نعیم کا کیا قصور ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ہم دونوں بے قصور ہیں۔ البتہ ہم ایک دوسرے سے محبت ضرور کرتے ہیں اور وہ میرا شوہر ہے۔۔۔ یہ کوئی قصور نہیں ہے میں نابالغ نہیں ہوں۔“

ڈپٹی صاحب عقلمند تھے، فوراً سمجھ گئے کہ جب ان کی بیٹی ہی رضامند ہے تو نعیم پر کیسے جرم عائد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ زہرہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد ڈپٹی صاحب نے مختلف لوگوں کے ذریعے سے نعیم پر دباؤ ڈالنے اور اس کو روپے پیسے سے لاقچ دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔

دونوں کی زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی۔ گونیم کی آمدی بہت ہی کم تھی اور زہرہ کو جوانا زو نعم میں پلی تھی، بدن پر کھر درے کپڑے پہننے پڑتے تھے۔ اور اپنے ہاتھ سے سب کام کرنے پڑتے تھے۔ مگر وہ خوش تھی۔ اور خود کو ایک نئی دنیا میں پاتی تھی۔ وہ بہت سکھی تھی۔۔۔ بہت سکھی۔ نعیم بھی بہت خوش تھا۔ لیکن ایک روز خدا کرنا ایسا ہوا کہ زہرہ کے سینے میں موذی درد اٹھا اور پیشتر اس کے کہ نعیم اس کے لیے کچھ کر سکے وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی اور نعیم کی دنیا ہمیشہ کے لیے تاریک ہو گئی۔

یہ داستان اس نے رک رک اور خود مزے لے لے کر قریباً چار گھنٹوں میں سنائی۔ جب وہ اپنا حال دل سنا چکا۔ تو اس کا چہرہ بجائے زرد ہونے کے تھتما اٹھا جیسے اس کے اندر آہستہ آہستہ کسی نے خون داخل کر دیا ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کا حلق سوکھ گیا تھا۔

داستان جب ختم ہوئی تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ جیسے اسے بہت جلدی ہے اور کہنے لگا، ”میں نے بہت غلطی کی۔۔۔ جو آپ کو اپنی داستانِ محبت سنادی۔۔۔ میں نے بہت غلطی کی۔۔۔ زہرہ کا ذکر صرف مجھی تک محدود رہنا چاہیے تھا۔۔۔ لیکن۔۔۔ اس کی آواز بھر گئی۔۔۔ میں زندہ ہوں اور وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا اور جلدی سے میرا ہاتھ دبا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

نعمیم سے پھر میری ملاقات نہ ہوئی۔ اپلو بندر پر کئی مرتبہ اس کی تلاش میں گیا۔ مگر وہ نہ ملا۔ چھ یا سات مہینے کے بعد اس کا ایک خط مجھے ملا۔ جو میں یہاں پر نقل کر رہا ہوں۔

صاحب!

آپ کو یاد ہو گا۔ میں نے آپ کے مکان پر اپنی داستانِ محبت سنائی تھی۔ وہ محض فسانہ تھا۔ ایک جھوٹا فسانہ۔ کوئی زہر ہے نہ نعیم۔۔۔ میں ویسے موجود تو ہوں مگر وہ نعیم نہیں ہوں جس نے زہر ہے سے محبت کی تھی۔ آپ نے ایک بار کہا تھا کہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو محبت کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں۔ میں بھی ان بد قسمت آدمیوں میں سے ایک ہوں جس کی ساری جوانی اپنادل پر چانے میں گزر گئی۔ زہر سے نعیم کی محبت ایک دلی بہلا و تھا اور زہر کی موت۔۔۔ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ میں نے اسے کیوں مار دیا۔ بہت ممکن ہے کہ اس میں بھی میری زندگی کی سیاہی کا دخل ہو۔

مجھے معلوم نہیں آپ نے میرے افسانے کو جھوٹا سمجھایا سچا لیکن میں آپ کو ایک عجیب و غریب بات بتاتا ہوں کہ میں نے۔۔۔ یعنی اس جھوٹے افسانے کے خالق نے اس کو بالکل سچا سمجھا۔ سو فیصدی حقیقت پر مبنی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے واقعی زہر سے محبت کی ہے اور وہ سچ مرجھ مرجھ کی ہے۔ آپ کو یہ سن کر اور بھی تجب ہو گا کہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ اس افسانے کے اندر حقیقت کا عنصر زیادہ ہوتا گیا۔ اور زہر کی آواز، اس کی ہنسی بھی میرے کانوں میں گونجئے گلی۔ میں اس کے سانس کی گرمی تک محسوس کرنے لگا۔ افسانے کا ہر ذرہ جاندار ہو گیا اور میں نے۔۔۔ اور میں نے یوں اپنی قبر اپنے ہاتھوں سے کھودی۔

زہر فسانہ نہ سہی مگر میں تو فسانہ ہوں۔ وہ مرجھ کی ہے۔ اس لیے مجھے بھی مرجانا چاہیے۔ یہ خط آپ کو میری موت کے بعد ملے گا۔۔۔ الوداع۔۔۔ زہر مجھے ضرور ملے گی۔۔۔ کہاں! یہ مجھے معلوم نہیں۔

میں نے یہ چند سطور صرف اس لیے آپ کو لکھ دی ہیں کہ آپ افسانہ نگار ہیں اگر اس سے آپ افسانہ تیار کر لیں تو آپ کو سات آٹھ روپے مل جائیں گے۔ کیونکہ ایک مرتبہ آپ نے کہا تھا کہ افسانے کا معاوضہ آپ کو سات سے دس روپے تک مل جایا کرتا ہے۔ یہ میرا تخفہ ہو گا۔ اچھا الوداع۔

آپ کا ملاقاتی،

”نعم“

نعم نے اپنے لیے زہرہ بنائی اور مر گیا۔۔۔ میں نے اپنے لیے یہ افسانہ تخلیق کیا ہے اور زندہ ہوں۔۔۔ یہ میری زیادتی ہے۔

-[24]-

تماشا: سعادت حسن منشو

دو تین روز سے طیارے سیاہ عقابوں کی طرح پر پھلائے خاموش فضامیں منڈلار ہے تھے، جیسے وہ کسی شکار کی ججو میں ہوں۔ سرخ آندھیاں و قاتفو قاتکی آنے والے خونی حادثے کا پیغام لارہی تھیں۔ سنسان بازاروں میں مسلح پولیس کی گشت ایک عجیب بیت ناک سماں پیش کر رہی تھی۔ وہ بازار جو صبح سے کچھ عرصہ پہلے لوگوں کے ہجوم سے پر ہوا کرتے تھے، اب کسی نامعلوم خوف کی وجہ سے سونے پڑے تھے۔۔۔ شہر کی فضا پر ایک پراسرار خاموشی مسلط تھی۔ بھیانک خوف راج کر رہا تھا۔ خالد گھر کی خاموش و پرسکوت فضاء سے سہا ہوا اپنے والد کے قریب بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

”ابا، آپ مجھے اسکول کیوں نہیں جانے دیتے؟“

”بیٹا آج اسکول میں چھٹی ہے۔“

”ماسٹر صاحب نے تو ہمیں بتایا ہی نہیں۔ وہ تو کل کہہ رہے تھے کہ جو لڑکا آج اسکول کا کام ختم کر کے اپنی کاپی نہ دکھائے گا، اسے سخت سزا دی جائے گی!“

”وہ اطلاع دینی بھول گئے ہوں گے۔“

”آپ کے دفتر میں بھی چھٹی ہو گی؟“

”ہاں، ہمارا دفتر بھی آج بند ہے۔“

”چلو اچھا ہوا۔ آج میں آپ سے کوئی اچھی سی کہانی سنوں گا۔“

یہ بتیں ہو رہی تھیں کہ تین طیارے چیختے ہوئے ان کے سر پر سے گزر گئے۔ خالدان کو دیکھ کر بہت خوف زدہ ہوا، وہ تین چار روز سے ان طیاروں کو بغور دیکھ رہا تھا، مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا۔ وہ جیران تھا کہ یہ جہاز سارا دن دھوپ میں کیوں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ وہ ان کی روزانہ نقل و حرکت سے تنگ آ کر بولا، ”ابا مجھے ان جہازوں سے سخت خوف معلوم ہو رہا ہے۔ آپ ان کے چلانے والوں سے کہہ دیں کہ وہ ہمارے گھر پر سے نہ گزرا کریں۔“

”خوب۔۔۔! کہیں پا گل تو نہیں ہو گئے خالد!“

”ابا، یہ جہاز بہت خوف ناک ہیں۔ آپ نہیں جانتے، یہ کسی نہ کسی روز ہمارے گھر پر گولہ پھینک دیں گے۔۔۔ کل صبح ماما امی جان سے کہہ رہی تھی کہ ان جہاز والوں کے پاس بہت سے گولے ہیں۔ اگر انہوں نے اس قسم کی کوئی شرارت کی، تو یاد رکھیں میرے پاس بھی ایک بندوق ہے۔۔۔ وہی جو آپ نے پچھلی عید پر مجھے دی تھی۔“

خالد کا باپ اپنے لڑکے کی غیر معمولی جسارت پر بحث، ”ماما تو پا گل ہے، میں اس سے دریافت کروں گا کہ وہ گھر میں ایسی بتیں کیا کرتی ہے۔۔۔ اطمینان رکھو، وہ ایسی بات ہرگز نہیں کریں گے۔“

اپنے والد سے رخصت ہو کر خالد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور ہوائی بندوق نکال کر نشانہ لگانے کی مشق کرنے لگا تاکہ اس روز جب ہوائی جہاز والے گولے پھینکیں، تو اس کا نشانہ خطانہ جائے۔ اور وہ پوری طرح انتقام لے سکے۔۔۔ کاش! انتقام کا یہی نتھا جذبہ ہر شخص میں تقسیم ہو جائے۔

اسی عرصے میں جبکہ ایک نھا بچہ اپنے انتقام لینے کی فکر میں ڈوبا ہوا طرح طرح کے منصوبے باندھ رہا تھا، گھر کے دوسرے حصے میں خالد کا باپ اپنی بیوی کے پاس بیٹھا ہوا ماماؤ بھروسہ کر رہا تھا کہ وہ آئندہ گھر میں اس قسم کی کوئی بات نہ کرے جس سے خالد کو دہشت ہو۔

اما اور بیوی کو اسی قسم کی مزیدہ ایات دے کر وہ ابھی بڑے دروازے سے باہر جا رہا تھا کہ خادم ایک دہشت ناک خبر لایا کہ شہر کے لوگ بادشاہ کے منع کرنے پر بھی شام کے قریب ایک عام جلسہ کرنے والے ہیں اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور پیش آکر رہے

۔ گا۔

خالد کا باپ یہ خبر سن کر بہت خوف زدہ ہوا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ فضائیں غیر معمولی سکون، طیاروں کی پرواز، بازاروں میں مسلح پولیس کی گشت، لوگوں کے چہروں پر اداسی کا عالم اور خونی آندھیوں کی آمد کسی خوف ناک حادثہ کا پیش نہیں تھے۔

وہ حادثہ کس نوعیت کا ہو گا۔۔۔ یہ خالد کے باپ کی طرح کسی کو بھی معلوم نہ تھا مگر پھر بھی سارا شہر کسی نامعلوم خوف میں لپٹا ہوا تھا۔

باہر جانے کے خیال کو ملتی کر کے خالد کا باپ ابھی کپڑے تبدیل کرنے بھی نہ پایا تھا کہ طیاروں کا شور بلند ہوا۔ وہ سہم گیا۔۔۔ اسے ایسا معلوم ہوا، جیسے سیکڑوں انسان ہم آہنگ آواز میں درد کی شدت سے کراہ رہے ہیں۔

خالد طیاروں کا شور و غل سن کر اپنی ہوائی بندوق سن بھالتا ہوا کمرے سے باہر دوڑا آیا اور انہیں غور سے دیکھنے لگتا کہ وہ جس وقت گولہ پھینکنے لگیں، تو وہ اپنی ہوائی بندوق کی مدد سے انہیں نیچے گردے۔ اس وقت چھ سال کے بچے کے چہرے پر آہنی ارادہ و استقلال کے آثار نمایاں تھے، جو کم حقیقت بندوق کا کھلونا ہاتھ میں تھامے ایک جری سپاہی کو شرمندہ کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ آج اس چیز کو، جو اسے عرصے سے خوف زدہ کر رہی تھی، مٹانے پر تلا ہوا ہے۔

خالد کے دیکھتے دیکھتے ایک جہاز سے کوئی چیز گردی جو کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے مشابہ تھی۔ گرتے ہی یہ ٹکڑے ہوا میں پتھنگوں کی طرح اڑنے لگے، ان میں سے چند خالد کے مکان کی بالائی چھت پر بھی گرے۔ خالد بھاگا ہوا اوپر گیا اور کاغذ اٹھا لایا۔

”ابا جی۔۔۔ ماما سچ مجھ جھوٹ بک رہی تھی۔ جہاز والوں نے تو گلوں کے بجائے یہ کاغذ پھینکے ہیں۔“

خالد کے باپ نے وہ کاغذ لے کر پڑھنا شروع کیا تو رنگ زرد ہو گیا۔ ہونے والے حادثے کی تصویر اب اسے عیاں طور پر نظر آنے لگی۔ اس اشتہار میں صاف لکھا تھا کہ بادشاہ کسی جلسہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اگر اس کی مرضی کے خلاف کوئی جلسہ کیا گیا تو متاثر کی ذمہ دار خود رعایا ہو گی۔

اپنے والد کو اشتہار پڑھنے کے بعد اس قدر حیران و پریشان دیکھ کر خالد نے گھبراتے ہوئے کہا، ”اس کا غذ میں یہ تو نہیں لکھا کہ وہ ہمارے گھر پر گولے پھینکیں گے؟“

”خالد، اس وقت تم جاؤ۔۔۔! جاؤ اپنی بندوق کے ساتھ کھیلو۔“

”مگر اس پر لکھا کیا ہے؟“

”لکھا ہے کہ آج شام کو ایک تماشا ہو گا۔“ خالد کے باپ نے گفتگو کو مزید طول دینے کے خوف سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

”تماشا ہو گا۔۔۔! پھر تو ہم بھی چلیں گے نا؟“

”کیا کہا؟“

”کیا اس تماشے میں آپ مجھے نہ لے چلیں گے؟“

”لے چلیں گے۔۔۔ اب جاؤ جا کر کھیلو۔“

”کہاں کھیلوں۔۔۔؟ بازار میں آپ جانے نہیں دیتے۔ ما ممحص سے کھیلتی نہیں، میرا ہم جماعت طفیل بھی تو آج کل یہاں نہیں آتا۔ اب میں کھیلوں تو کس سے کھیلوں۔۔۔؟ شام کے وقت تماشاد کیھنے تو ضرور چلیں گے نا؟“ کسی جواب کا انتظار کیے بغیر خالد کمرے سے باہر چلا گیا۔ اور مختلف کروں میں آوارہ پھرتا ہوا اپنے والد کی نشست گاہ میں پہنچا، جس کی کھڑکیاں بازار کی طرف کھلتی تھیں۔ کھڑکی کے قریب بیٹھ کر وہ بازار کی طرف جھانکنے لگا۔

کیا دیکھتا ہے کہ بازار میں دکانیں تو بند ہیں مگر آمد و رفت جاری ہے۔۔۔ لوگ جلسے میں شریک ہونے کے لیے جا رہے تھے۔ وہ سخت حیران تھا کہ دو تین روز سے دکانیں کیوں بند رہتی ہیں۔ اس مسئلہ کے حل کے لیے اس نے اپنے نئے دماغ پر بہتر ازور دیا مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ کر سکا۔

بہت غور و فکر کے بعد اس نے یہ سوچا کہ لوگوں نے اس تماشا کو دیکھنے کی خاطر، جس کے اشتہار جہاز بانٹ رہے تھے، دکانیں بند کر رکھی ہیں۔ اب اس نے خیال کیا کہ وہ کوئی نہایت ہی دلچسپ تماشا ہو گا جس کے لیے تمام بازار بند ہیں۔ اس خیال نے خالد کو سخت بے چین کر دیا اور وہ اس وقت کا نہایت بے قراری سے انتظار کرنے لگا جب اس کا ابا اسے تماشا دکھلانے کو لے چل۔

وقت گزرتا گیا۔۔۔ وہ خوبی گھڑی قریب تر آتی گئی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ خالد، اس کا باپ اور والدہ چمن میں خاموش بیٹھے ایک دوسرے کی طرف خاموش نگاہوں سے تک رہے تھے۔۔۔ ہوا سسکیاں بھرتی ہوئی چل رہی تھیں۔

ترت۔ ترت۔ ترت۔ ترت۔

یہ آواز سنتے ہی خالد کے باپ کے چہرے کا رنگ کاغذ کی طرح سفید ہو گیا۔ زبان سے بمشکل اس قدر کہہ سکا، ”گولی!“

خالد کی ماں فرط خوف سے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکی۔ گولی کا نام سنتے ہی اسے ایسے معلوم ہوا جیسے خود اس کی چھاتی میں گولی اتر رہی ہے۔

خالد اس آواز کو سنتے ہی اپنے والد کی انگلی پکڑ کر کہنے لگا:

”ابا جی چلو چلیں! تماشا تو شروع ہو گیا ہے۔“

”کون سا تماشا؟“ خالد کے باپ نے اپنے خوف کو چھپاتے ہوئے کہا۔

”وہی تماشا جس کے اشتہار آج صبح ہوئی جہاز بانٹ رہے تھے۔۔۔ کھل شروع ہو گیا۔ تھی تو اتنے پیانخوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔“

”ابھی بہت وقت باقی ہے، تم شور مت کرو۔۔۔ خدا کے لیے اب جاؤ، ماما کے پاس جا کر کھلیو!“ خالد یہ سنتے ہی باور پچی خانے کی طرف گیا۔ مگر وہاں ماما کو نہ پا کر اپنے والد کی نشست گاہ میں چلا گیا اور کھڑکی سے بازار کی طرف دیکھنے لگا۔ بازار آمد و فت بند ہو جانے کی وجہ سے سائیں سائیں کر رہا تھا۔۔۔ دور فاصلے سے کتوں کی دردناک چینیں سنائی دے رہی تھیں۔ چند لمحات کے بعد ان چینوں میں انسان کی دردناک آواز بھی شامل ہو گئی۔

خالد کسی کو کہا ہے سن کر بہت حیران ہوا۔ ابھی وہ اس آواز کی ججوکے لیے کوشش ہی کر رہا تھا کہ چوک میں اسے ایک لڑکا دکھائی دیا، جو چیختا، چلاتا، بھاگتا چلا آرہا تھا۔ خالد کے گھر کے عین مقابل وہ لڑکا لڑکھڑا کر گرا، اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔۔۔ اس کی پینڈلی پر ایک زخم تھا، جس سے فواروں خون نکل رہا تھا۔ یہ سماں دیکھ کر خالد بہت خوف زدہ ہوا۔ بھاگ کر اپنے والد کے پاس آیا اور کہنے لگا، ”با، با، بازار میں ایک لڑکا گر پڑا ہے۔۔۔ اس کی ٹانگ سے بہت خون نکل رہا ہے۔“

یہ سنتے ہی خالد کا باپ کھڑکی کی طرف گیا اور دیکھا کہ واقعی ایک نوجوان لڑکا بازار میں اوندوں منہ پڑا ہے۔ بادشاہ کے خوف سے اسے جرأت نہ ہوئی کہ اس لڑکے کو سڑک پر سے اٹھا کر سامنے والی دکان کے پڑے پر لٹا دے۔۔۔ بے ساز و برج افراد کو اٹھانے کے لیے حکومت کے اربابِ حل و عقد نے آہنی گاڑیاں مہیا کر رکھی ہیں۔ مگر اس معصوم بچے کی لغش جوان ہی کی تیغ ستم کا شکار تھی، وہ نہ پا پو دا جو ان ہی کے ہاتھوں مسلماً گیا تھا، وہ کوئی نیل جو کھلنے سے پہلے ان ہی کی عطا کردہ بادی سموں سے جھلس گئی تھی، کسی کے دل کی راحت جوان ہی کے جور و استبداد نے چھین لی تھی، اب ان ہی کی تیار کردہ سڑک پر۔۔۔ آہ! موت بھی انک ہے، مگر ظلم اس سے کہیں زیادہ خوفناک اور بھی انک ہے۔

”ابا اس لڑکے کو کسی نے پیٹا ہے؟“

خالد کا باپ اثبات میں سر ہلاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

جب خالد اکیلا کمرے میں رہ گیا تو سوچنے لگا کہ اس لڑکے کو اتنے بڑے زخم سے کتنی تکلیف ہوئی ہو گی۔ جبکہ ایک دفعہ اسے قلم تراش کی نوک چھیننے سے تمام رات نیند نہ آئی تھی اور اس کا باپ اور مال تمام رات اس کے سرہانے بیٹھے رہے تھے۔ اس خیال کے آتے ہی اسے ایسا

معلوم ہونے لگا کہ وہ خم خود اس کی پنڈلی میں ہے اور اس میں شدت کا درد ہے۔۔۔ یکخت وہ رونے لگ گیا۔ اس کے رونے کی آواز سن کر اس کی والدہ دوڑی آئی۔ اور اسے گود میں لے کر پوچھنے لگی، ”میرے بچے، روکیوں رہے ہو؟“

”امی، اس لڑکے کو کسی نے مارا ہے؟“

”شورارت کی ہو گی اس نے؟“

خالد کی والدہ اپنے خاوند کی زبانی زخمی لڑکے کی داستان سن چکی تھی۔

”مگر اسکول میں تو شورارت کرنے پر چھڑی سے سزا دیتے ہیں، لہو تو نہیں نکالتے۔“ خالد نے روتے ہوئے اپنی والدہ سے کہا۔

”چھڑی زور سے لگ گئی ہو گی۔“

”تو پھر کیا اس لڑکے کا والد اسکول میں جا کر اس استاد پر خفانہ ہو گا، جس نے اس لڑکے کو اس قدر مارا ہے۔ ایک روز جب ماسٹر صاحب نے میرے کان کھینچ کر سرخ کر دیئے تھے تو اب اجی نے ہیڈ ماسٹر کے پاس جا کر شکایت کی تھی نا؟“

”اس لڑکے کا ماسٹر بہت بڑا آدمی ہے۔“

”اللہ میاں سے بھی بڑا؟“

”نہیں ان سے چھوٹا ہے۔“

”تو پھر وہ اللہ میاں کے پاس شکایت کرے گا۔“

”خالد، اب دیر ہو گئی ہے، چلو سوئں۔“

”اللہ میاں! میں دعا کرتا ہوں کہ تو اس ماسٹر کو جس نے اس لڑکے کو پیٹا ہے، اچھی طرح سزادے اور اس چھڑی کو چھین لے جس کے استعمال سے خون نکل آتا ہے۔۔۔ میں نے پہلاں یاد نہیں کیے۔ اس لیے مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہی چھڑی میرے استاد کے ہاتھ نہ آجائے۔۔۔ اگر تم نے میری باتیں نہ مانیں، تو پھر میں بھی تم سے نہ بولوں گا۔“

سوتے وقت خالد دل میں دعائیگ رہا تھا۔

-[25]-

اس کا پتی: سعادت حسن منٹو

لوگ کہتے تھے کہ نہ کو اس لیے گنجابوں ہے کہ وہ ہر وقت سوچتا رہتا ہے۔ اس بیان میں کافی صداقت ہے کیونکہ سوچتے وقت نہ تو سر کھجلایا کرتا ہے۔ چونکہ اس کے بال بہت کھردے اور خشک ہیں اور تیل نہ ملنے کے باعث بہت خستہ ہو گئے ہیں اس لیے بار بار کھجلانے سے اس کے سر کا درمیانی حصہ بالوں سے بالکل بے نیاز ہو گیا ہے۔ اگر اس کا سر ہر روز دھویا جاتا تو یہ حصہ ضرور چکلتا مگر میل کی زیادتی کے باعث اس کی حالت بالکل اس توے کی سی ہو گئی ہے جس پر ہر روز روٹیاں پکائی جائیں مگر اسے صاف نہ کیا جائے۔

نہ تو بھٹے پر اینٹیں بنانے کا کام کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر اپنے خیالات کو کچھ اینٹیں سمجھتا تھا اور کسی پر فوراً ہی ظاہر نہیں کیا کرتا تھا۔ اس کا یہ اصول تھا کہ خیال کو اچھی طرح پکا کر باہر نکالنا چاہیے تاکہ جس عمارت میں بھی وہ استعمال ہو اس کا ایک مضبوط حصہ بن جائے۔ گاؤں والے اس کے خیالات کی قدر کرتے تھے اور مشکل بات میں اس سے مشورہ لیا کرتے تھے لیکن اس قدر حوصلہ افزائی سے نہ تو اپنے آپ کو اہم نہیں سمجھنے لگتا تھا۔ جس طرح گاؤں میں شبھو کا کام ہر وقت لڑتے جھگڑتے رہنا تھا اسی طرح اس کا کام ہر وقت دوسروں کو مشورہ دیتے رہنا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہر شخص صرف ایک کام لیے پیدا ہوتا ہے چنانچہ شبھو کے بارے میں چوپال پر جب کبھی ذکر چھڑتا تو وہ ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا، ”کھاد کتنی بد بودار چیزوں سے بنتی ہے پر کھیتی باڑی اس کے بننا ہو، ہی نہیں سکتی۔ شبھو کے ہر سانس میں گالیوں کی باس آتی ہے، ٹھیک ہے، پر گاؤں کی چہل پہل اور رونق بھی اسی کے دم سے قائم ہے۔۔۔ اگر وہ نہ ہو تو لوگوں کو کیسے معلوم ہو کہ گالیاں کیا ہوتی ہیں۔ اپنے بول جانے کے ساتھ ساتھ برے بول بھی معلوم ہونے چاہئیں۔“

نحو بھٹے سے واپس آ رہا تھا اور حسبِ معمول سر کھلا تا گاؤں کے کسی مسئلے پر غور و فکر کر رہا تھا۔ لاثین کے کھبے کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا ہاتھ سر سے علیحدہ کیا جس کی انگلیوں سے وہ بالوں کا ایک میل بھرا گچھا مر ڈر رہا تھا۔ وہ اپنے جھونپڑے کے تازہ لپے ہوئے چبوترے کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ سامنے سے اسے کسی نے آواز دی۔ نحو پلٹا اور اپنے سامنے والے جھونپڑے کی طرف بڑھا جہاں مادھو سے ہاتھ کے اشارے سے بلارہا تھا۔

جھونپڑے کے چھبے کے نیچے چبوترے پر مادھو، اس کا لنگڑا بھائی اور چوہدری بیٹھے تھے۔ ان کے اندازِ نشست سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی نہایت ہی اہم بات سوچ رہے ہیں۔ سب کے چہرے کچی اینٹوں کے مانند پیلے تھے۔ مادھو تو بہت دنوں کا بیمار دکھائی دیتا تھا۔ ایک کونے میں طا قچے کے نیچے روپا کی ماں بیٹھی ہوئی تھی۔ غلیظ کپڑوں میں وہ میلے کپڑوں کی ایک گٹھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ نحو نے دور ہی سے معاملے کی نزاکت محسوس کی اور قدم تیز کر کے ان کے پاس پہنچ گیا۔

مادھو نے اشارے سے اسے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا۔ نحو بیٹھ گیا اور اس کا ایک ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے بالوں کے اس گچھے کی طرف بڑھ گیا جس کی جڑیں کافی ہل چکی تھیں۔ اب وہ ان لوگوں کی باتیں سننے کے لیے بالکل تیار تھا۔ مادھو اس کو اپنے پاس بٹھا کر خاموش ہو گیا مگر اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹ صاف ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن فوراً نہیں کہہ سکتا۔ مادھو کا لنگڑا بھائی بھی خاموش تھا۔ اور بار بار اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کے آخری ٹنڈ منڈ حصے پر جو گوشت کا ایک بد شکل لو تھر اسابنا ہوا تھا، ہاتھ پھیر رہا تھا۔ روپا کی ماں طا قچے میں رکھی ہوئی مورتی کے مانند گونگی بنی ہوئی تھی۔ اور چوہدری اپنی موچھوں کو تاؤ دینا بھول کر زمین پر لکیریں بنارہا تھا۔

نحو نے خود ہی بات شروع کی، ”تو---“

مادھو بولا، ”نحو بات یہ ہے کہ--- بات یہ ہے کہ--- اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ بات کیا ہے--- میں کچھ کہنے کے قابل نہ رہا---“ چوہدری! تم ہی جی کڑا کر کے سارا قصہ سنادو۔ ” نحو نے گردن اٹھا کر چوہدری کی طرف دیکھا مگر وہ کچھ نہ بولا اور زمین پر لکیریں بناتا رہا۔ دوپہر کی اداس فضا بالکل خاموش تھی البتہ کبھی کبھی چیلوں کی چینیں سنائی دیتی تھیں اور جھونپڑے کے دائیں ہاتھ گھورے پر جو مرغ کوڑے کو کرید رہا تھا، کبھی کبھی کسی مرغی کو دیکھ کر بول اٹھتا تھا۔ چند لمحات تک جھونپڑے کے چھبے کے نیچے سب خاموش رہے اور نحو معاملے کی نزاکت اچھی طرح سمجھ گیا۔

روپا کی ماں نے رونی آواز میں کہا، ”میرے پھوٹے بھاگ---! اس کو توجو کچھ اجڑنا تھا اجڑی، مجھ ابھاگن کی ساری دنیا بر باد ہو گئی---۔۔۔ کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا؟“ مادھونے کندھے ہلا دیئے اور نھسو سے مخاطب ہو کر کہا، ”کیا ہو سکتا ہے---؟“ بھی میں یہ کنک کاٹیکہ اپنے ماتھے پر لگانا نہیں چاہتا۔۔۔ میں نے جب اپنے لا لوکی بات روپا سے پکی کی تھی تو مجھے یہ قصہ معلوم نہیں تھا۔۔۔ اب تم لوگ خود ہی وچار کرو کہ سب کچھ جانتے ہوئے میں اپنے بیٹی کا بیاہ روپا سے کیسے کر سکتا ہوں؟“

یہ سن کر نھوکی گردن اٹھی۔ وہ شاید یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ لا لوکا بیاہ کیا ہو گیا کہ روپا لا لوکے قابل نہیں رہی۔ وہ روپا اور لا لوکو اچھی جانتا تھا اور سچ پوچھو تو گاؤں میں ہر شخص ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ کون سی بات تھی جو اسے ان دونوں کے بارے میں معلوم نہ تھی۔ روپا اس کی آنکھوں کے سامنے پھولی پھلی، بڑھی اور جوان ہوئی۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ اس نے اس کے گال پر ایک زور کا دھپٹا بھی مارا تھا اور اس کو اتنی محال نہ ہوئی تھی کہ چوں بھی کرے۔ حالانکہ گاؤں کے سب چھوکریاں چھوکرے گتائھ تھے اور بڑوں کا بالکل ادب نہ کرتے تھے۔ روپا تو بڑی بھولی بھائی بڑکی تھی۔ با تیں بھی بہت کم کرتی تھی اور اس کے چہرے پر بھی کوئی ایسی علامت نہ تھی جس سے یہ پتہ چلتا کہ وہ کوئی شرارت بھی کر سکتی ہے پھر آج اس کی بابت یہ با تیں کیوں ہو رہی تھیں۔

نھوکو گاؤں کے ہر جھونپڑے اور اس کے اندر رہنے والوں کا حال معلوم تھا۔ مثال کے طور پر اسے معلوم تھا کہ چوہدری کی گائے نے صبح سویرے ایک پھر ادیا ہے اور مادھو کے لنگڑے بھائی کی بیساکھی ٹوٹ گئی ہے۔ گام حلوائی اپنی موچھوں کے بال چنوار ہاتھا کہ اس کے ہاتھ سے آئینہ گر کر ٹوٹ گیا اور ایک سیر دودھ کے پیسے نائی کو بطور قیمت دینا پڑے۔۔۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دوالپوں پر، پر سرام اور گنگوکی چیزیں ہوتے رہ گئی تھیں۔ اور سالگ رام نے اپنے بچوں کو پاپڑ بھون کر کھلائے تھے حالانکہ ویدجی نے منع کیا تھا کہ ان کو مرچوں والی کوئی چیز نہ دی جائے۔ نھوکر ان تھا کہ ایسی کوئی بات ہے جو اسے معلوم نہیں۔ یہ تمام خیالات اس کے دماغ میں ایک دم آئے اور وہ مادھو کا کاسے اپنی حیرت دور کرنے کی خاطر کوئی سوال کرنے ہی والا تھا کہ چوہدری نے زمین پر طوطے کی شکل کرتے ہوئے کہا، ”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ بچے کی ماں بن جائے گی۔“

تو یہ بات تھی۔ نھوکے دل پر ایک گھونسہ سالگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ دوپھر کی دھوپ میں اڑنے والی ساری چیلیں اس کے دماغ میں گھس کر چیننے لگی ہیں۔ اس نے اپنے بال زیادہ تیزی سے مروڑنے شروع کر دیئے۔

مادھو کا کا، نھوکی طرف جھکا اور بڑے دکھ بھرے لبھے میں اس سے کہنے لگا، ”بیٹا تمہیں یہ بات تو معلوم ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کی بات روپا سے پکی کی تھی۔ اب میں تم سے کیا کہوں۔۔۔ ذرا کان ادھر لاؤ۔“ اس نے ہولے سے نھوکے کان میں کچھ کہا اور پھر اسی لبھے میں کہنے

لگا، ”کتنی شرم کی بات ہے، میں تو کہیں کانہ رہا۔ یہ میرا بڑھا پا اور یہ جان لیواد کھ، اور تو اور لا لو کو بتاؤ لتنا د کھ ہوا ہو گا۔۔۔ تمہیں انصاف کرو کہ لا لو کی شادی اب اس سے ہو سکتی ہے۔۔۔ لا لو کی شادی تو ایک طرف رہی، کیا ایسی لڑکی ہمارے گاؤں میں رہ سکتی ہے۔۔۔ کیا اس کے لیے ہمارے یہاں کوئی جگہ ہے؟“

نھو نے سارے گاؤں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور اسے ایسی جگہ نظر نہ آئی جہاں روپا اپنے پاپ سمیت رہ سکتی تھی۔ البتہ اس کا ایک جھونپڑا تھا جس میں وہ چاہے کسی کو بھی رکھتا۔ پچھلے بر س اس نے کوڑھی کو اس میں پناہ دی تھی حالانکہ سارا گاؤں اسے روک رہا تھا اور اسے ڈارہ تھا کہ دیکھو یہ بیماری بڑی چھوت والی ہوتی ہے، ایسا نہ ہو کہ تمہیں چھٹ جائے لیکن وہ اپنی مرضی کا مالک تھا۔ اس نے وہی کچھ کیا جو اس کے من نے اچھا سمجھا۔ کوڑھی اس کے گھر میں پورے چھ مہینے رہ کر مر گیا لیکن اسے بیماری بانکل نہ لگی۔ اگر گاؤں میں روپا کے لیے کوئی جگہ نہ رہے تو کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ اسے ماری پھرنے دیا جائے۔ ہر گز نہیں، نھو اس بات کا قائل نہیں تھا کہ دکھی پر۔۔۔ اور دکھ لاد دیئے جائیں۔ اس کے جھونپڑے میں ہر وقت اس کے لیے جگہ تھی۔

وہ چھ مہینے تک ایک کوڑھی کی تیارداری کر سکتا تھا اور روپا کوڑھی تو نہیں تھی۔۔۔ کوڑھی تو نہیں تھی، یہ سوچتے ہوئے نھو کا دماغ ایک گھری بات سوچنے لگا۔۔۔ روپا کوڑھی نہیں تھی، اس لیے وہ ہمدردی کی زیادہ مستحق بھی نہیں تھی۔ اسے کیا روگ ہے۔۔۔؟ کچھ بھی نہیں جیسا کہ یہ لوگ کہہ رہے تھے وہ تھوڑے ہی دنوں میں بچے کی ماں بننے والی تھی، پر یہ بھی کوئی روگ ہے اور کیا ماں بننا کوئی پاپ ہے؟ ہر لڑکی عورت بننا چاہتی ہے اور عورت ماں، اس کی اپنی استری ماں بننے کے لیے تڑپ رہی تھی اور وہ خود یہ چاہتا تھا کہ وہ جلدی ماں بن جائے۔ اس لحاظ سے بھی روپا کام بنتا کوئی ایسا جرم نہیں تھا جس پر اسے کوئی سزادی جائے یا پھر اسے رحم کا مستحق قرار دیا جائے۔ وہ ایک کے بجائے دو بچے بننے۔ اس سے کسی کا کیا بگڑتا تھا۔

وہ عورت ہی تو تھی۔ مندر میں گڑی ہوئی دیوی تو تھی نہیں اور پھر یہ لوگ خواہ مخواہ کیوں اپنی جان ہلاکان کر رہے تھے۔ مادھو کا کے لڑکے سے اس کی شادی ہوتی تو بھی کبھی نہ کبھی بچے ضرور پیدا ہوتا۔ اب کوئی آفت آگئی تھی۔ یہ بچے جواب اس کے پیٹ میں تھا، کہیں سے اُڑ کر تو نہیں آگیا۔ شادی بیاہ ضرور ہوا ہو گا۔ یہ لوگ باہر بیٹھے آپ ہی فیصلہ کر رہے ہیں اور جس کی بابت فیصلہ ہو رہا ہے، اس سے کچھ پوچھتے ہی نہیں۔ گویا وہ بچہ نہیں بلکہ یہ خود جن رہے ہیں۔ عجیب بات تھی، اور پھر ان کو بچے کی کیا فکر پڑ گئی تھی۔ بچے کی فکر یا قومان کرتی ہے یا اس کا باپ۔۔۔ باپ۔۔۔؟ اور مزہ دیکھیے کہ کوئی بچے کے باپ کی بات ہی نہیں کرتا تھا۔

یہ سوچتے ہوئے نھوکے دماغ میں ایک بات آئی اور اس نے مادھو کا کاسے کہا، ”جو کچھ تم نے کہا، اس سے مجھے بڑا دکھ ہوا، پر تم نے یہ کیسے کہہ دیا کہ روپا کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں۔۔۔ ہم سب اپنے اپنے جھونپڑوں کو تالے لگا دیں تو بھی اس کے لیے ایک دروازہ کھلا رہتا ہے۔“ چودھری نے زمین پر طوطے کی آنکھ بناتے ہوئے کہا، ”توبہ کا!“ نھو نے جواب دیا، ”ان کے لیے جو پاپی ہوں۔۔۔ روپا نے کوئی پاپ نہیں کیا۔ وہ نزد وش ہے!“ چودھری نے حیرت سے مادھو کا کسی طرف دیکھا اور کہا، ”اس نے پوری بات نہیں سنی۔“ مادھو کا لنگڑا بھائی اپنی کٹی ہوئی ٹانگ پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

نھو روپا کی ماں سے مخاطب ہوا، ”ابھی سن لیتا ہوں۔۔۔ روپا کی ماں نے اپنی کھرد ری انگلیوں سے آنسو پوچھے اور کہا، ”اندر بیٹھی اپنے نصیبوں کو رورہی ہے۔“ یہ سن کر نھو نے اپنا سر ایک بار زور سے کھجالا یا اور اٹھ کر کمرے کے اندر چلا گیا۔ روپا اندر ہیری کو ہیری کے ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ میلے کچلے کپڑوں میں اندر وہ گیلی مٹی کا ڈھیر سا دکھائی دے رہی تھی۔ جو با تیں باہر ہو رہی تھیں، ان کا ایک ایک لفظ اس نے سنا تھا حالانکہ اس کے کان اس کے اپنے دل کی باتیں سننے میں لگے ہوئے تھے جو کسی طرح ختم ہی نہ ہوتی تھیں۔ نھو اندر آنے کے لیے اٹھا تو وہ دوڑ کر سامنے کی کھلی پر جا پڑی اور گلدڑی میں اپنا سر منہ چھپا لیا۔

نھو نے جب دیکھا کہ روپا چھپ گئی ہے تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے پوچھا، ”ارے مجھ سے کیوں چھپتی ہو؟“ روپا رونے لگی اور اپنے آپ کو کپڑے میں اور لپیٹ لیا۔ وہ بغیر آواز کے رورہی تھی مگر نھو کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ روپا کے آنسو اس کے تپتے ہوئے دل پر گر رہے ہیں۔ اس نے گلدڑی کے اس حصہ پر ہاتھ پھیرا جس کے نیچے روپا کا سر تھا اور کہا، ”تم مجھ سے کیوں چھپتی ہو؟“

روپا نے سکیوں میں جواب دیا، ”روپا نہیں چھپتی نہو۔۔۔ وہ اپنے پاپ کو چھپا رہی ہے۔“ نھو اس کے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا، ”کیسا پاپ۔۔۔ تم نے کوئی پاپ نہیں کیا۔۔۔ اور اگر کیا بھی ہو تو اسے چھپانا چاہیے، یہ تو خود ایک پاپ ہے۔۔۔ میں تم سے صرف ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔ مجھے یہ بتا دو کہ کس نے تمہاری سداہنستی آنکھوں میں یہ آنسو بھر دیے ہیں۔ کس نے اس بالی عمر میں تمہیں پاپ اور پن کے جگلکرے میں پھنسا دیا ہے؟“

”میں کیا کہوں؟“ روپا یہ کہہ کر گلدڑی میں اور سمت گئی۔ نھو بولتا تھا اور روپا کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی اسے اکٹھا کر رہا ہے، اسے سکیٹر رہا ہے۔

نھتوںے بڑی مشکل سے روپا کے منہ سے کپڑا ہٹایا اور اس کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ روپا نے دونوں ہاتھوں میں اپنے منہ کو چھپالیا اور زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اس سے نھتو کو بہت دکھ ہوا۔ ایک تو پہلے اسے یہ چیز ستارہ تھی کہ ساری بات اس کے ذہن میں مکمل طور پر نہیں آتی۔ اور دوسرے روپا اس کے سامنے رورہی تھی۔ اگر اسے ساری بات معلوم ہوتی تو وہ اس کے یہ آنسو روکنے کی کوشش کر سکتا تھا جو میلی گدڑی میں جذب ہو رہے تھے۔ مگر اس کو سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں تھا کہ روپا تھوڑے ہی دونوں میں بچے کی ماں بننے والی ہے۔

اس نے پھر اس سے کہا، ”روپا تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو۔۔۔ نھتو بھیتا تم سے پوچھ رہا ہے اور وہ کوئی غیر تھوڑی ہے، جو تم یوں اپنے منہ کو چھپا رہی ہو۔۔۔ تم روتنی کیوں ہو۔ غلطی ہو ہی جایا کرتی ہے۔۔۔ لا لوکی کسی اور سے شادی ہو جائے گی اور تم اپنی جگہ خوش رہو گی۔۔۔ تمہیں دنیا کا ڈر ہے تو میں کہوں گا کہ تم بالکل بیوقوف ہو، لوگوں کے جو جی میں آئے کہیں، تمہیں اس سے کیا۔۔۔ رونے دھونے سے کچھ نہیں ہو گا روپا، آنسو بھری آنکھوں سے نہ تم مجھے ہی ٹھیک طور سے دیکھ سکتی ہو اور نہ اپنے آپ کو۔۔۔ رونا بند کرو اور مجھے ساری بات بتاؤ۔“

روپا کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اس سے کیا کہے، وہ دل میں سوچتی تھی کہ اب ایسی کون سی بات رہ گئی ہے جو دنیا کو معلوم نہیں۔ یہی سوچتے ہوئے اس نے نھتو سے کہا، ”نھتو بھیتا، مجھ سے زیادہ تو دوسروں کو معلوم ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ جو کچھ میں سوچتی تھی ایک ایک سپنا تھا، یوں تو ہر چیز سپنا ہوتی تھی پر یہ سپنا بڑا ہی عجیب ہے۔ کیسے شروع ہوا، کیوں کنکر ختم ہوا۔ اس کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام دن جو میں کبھی خوشی سے گزارتی تھی، آنکھوں میں آنسو بننا شروع ہو گئے ہیں۔۔۔ میں گھڑا لے کر اچھلتی کو دتی، گاتی کنوئیں پر پانی بھرنے گئی۔ پانی بھر کر جب واپس آنے لگی تو ٹھوکر لگی اور گھڑا چکنا چور ہو گیا۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں نے چاہا کہ اس ٹوٹے ہوئے گھڑے کے ٹکڑے اٹھا کر جھوپی میں بھر لوں پر لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا، نقصان میرا ہوا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ مجھ سے ہمدردی کرتے، پرانخوں نے الٹا مجھے ہی ڈانٹا شروع کر دیا۔ گویا گھڑا ان کا تھا اور توڑنے والی میں تھی اور اس روڑے کا کوئی قصور ہی نہ تھا جو راستے میں پڑا تھا۔ اور جس سے دوسرے بھی ٹھوکر کھا سکتے تھے۔۔۔ تم مجھ سے کچھ نہ پوچھو مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔“

نھتو کی انگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں کا چھamar روڑنے لگیں۔ اس نے بڑے اضطراب سے کہا، ”میں صرف پوچھتا ہوں کہ وہ ہے کون؟“

”کون؟“

”وہی۔۔۔ وہی۔۔۔“ روپا اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

روپا کے سینے سے ایک بے اختیار آہ نکل گئی، ”وہ پہلے جتنا زدیک تھا ب اتنا ہی دور ہے!“

”میں اس کا نام پوچھتا ہوں۔۔۔ اور جانتی ہو میں تم سے اس کا نام کیوں پوچھتا ہوں۔۔۔ اس لیے کہ وہ تمہارا پتی ہے۔۔۔ اور تم اس کی پتی ہو۔۔۔ تم اس کی ہوا رہہ تمہارا۔۔۔ یہ۔۔۔“

نحواس کے آگے کچھ کہنے ہی والا ہے کہ روپا نے دیوانہوار اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھٹے ہوئے لبجہ میں کہا، ”ہو لے ہو لے بولو نھ تو۔۔۔ ہو لے ہو لے بولو، کہیں وہ۔۔۔ جو میرے ہر دے میں نیا جیو ہے، نہ سن لے کہ اس کی ماں پاپن ہے۔۔۔ نحواسی ڈر کے مارے تو میں زیادہ سوچتی نہیں، زیادہ غم نہیں کرتی کہ اس کو کچھ معلوم نہ ہو۔۔۔ پر بیٹھے بیٹھے کبھی میرے من میں آتا ہے کہ ڈوب مرلوں، اپنا گلا گھونٹ لوں، یا پھر زہر کھا کے مر جاؤ۔۔۔“

نھونے اٹھ کر ٹھلانا شروع کر دیا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ایک دو سینٹ غور کرنے کے بعد اس نے کہا، ”کبھی نہیں، میں تمہیں کبھی مرنے نہ دوں گا۔“ تم کیوں مرلو۔ یوں تو موت سے چھکارا نہیں، سب کو ایک دن مرنा ہے۔ پر اسی لیے تو جینا بھی ضروری ہے۔۔۔ میں کچھ پڑھا نہیں، میں کوئی پنڈت نہیں، پر جو کچھ میں نے کہا ہے ٹھیک ہے، تم مجھے اس کا نام بتا دو۔ میں تمہیں اس کے پاس لے چلوں گا۔ اور اسے مجبور کروں گا کہ وہ تمہارے ساتھ بیاہ کر لے اور تمہیں اپنے پاس رکھے۔۔۔ وہی تمہارا پتی ہے!“

نھوپھر روپا کے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا، ”لو میرے کان میں کہہ دو۔۔۔ وہ کون ہے۔۔۔؟ روپا کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں، کیا تمہیں یقین نہیں آتا کہ میں تمہارے لیے کچھ کر سکوں گا۔“ روپا نے جواب دیا، ”تم میرے لیے سب کچھ کر سکتے ہو نھتو، پر جس آدمی کے پاس تم مجھے لے جانا چاہتے ہو، کیا وہ بھی کچھ کرے گا۔۔۔؟ وہ مجھے بھول بھی چکا ہو گا۔“ نھونے کہا، ”تمہیں دیکھتے ہی اسے سب کچھ یاد آجائے گا۔۔۔ باقی چیزوں کی یاد اسے میں دلا دوں گا۔۔۔ تم مجھے اس کا نام تو بتاؤ۔۔۔ یہ ٹھیک ہے کہ استری اپنے پتی کا نام نہیں لیتی۔ پر ایسے موقع پر تمہیں کوئی لاج نہ آنی چاہیے۔“

روپا خاموش رہی، اس پر نھو اور زیادہ مضطرب ہو گیا، ”میں تمہیں ایک سید ہی سادی بات سمجھاتا ہوں اور تم سمجھتی ہی نہیں ہو، پلگی، جو تمہارے بچے کا باپ ہے وہی تمہارا پتی ہے۔۔۔ اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ تم تو بس آنسو بھائے جاتی ہو، کچھ سنتی ہی نہیں ہو۔۔۔ میں پوچھتا ہوں، اس کا نام بتانے میں ہر ج ہی کیا ہے۔۔۔ لو، تم نے اور وونا شروع کر دیا۔ اچھا بھئی میں زیادہ باتیں نہیں کرتا۔ تم یہ بتا دو کہ وہ ہے کون۔۔۔ تم مان لو۔ میں اس کا کان پکڑ کر سیدھے راستے پر لے آؤں گا۔“

روپانے سکیوں میں کہا، ”تم بار بار پتی نہ کہو نھو۔۔۔ میری جوانی میری آشنا، میری دنیا، کبھی کی ودھوا ہو چکی ہے۔۔۔ تم میری مانگ میں سیندور بھرنا چاہتے ہو اور میں چاہتی ہوں کہ سارے بال ہی نوجہ ڈالوں۔۔۔ نھواب کچھ نہیں ہو سکے گا۔۔۔ میری جھولی کے بیڑ میں پر گر کر۔۔۔ سب کے سب موری میں جا پڑے ہیں۔ اب انھیں باہر نکلنے سے کیا فائدہ۔۔۔ اس کا نام پوچھ کر تم کیا کرو گے۔۔۔ لوگ تو میرا نام بھول جانا چاہتے ہیں۔“

نھوٹنگ آگیا اور تیز لمحے میں کہنے لگا، ”تم۔۔۔ تم یو قوف ہو۔۔۔ میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔“ وہ اٹھ کر جانے لگا تو روپانے ہاتھ کے اشارے سے روا کا۔ ایسا کرتے ہوئے اُس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ نھونے اس کی گیلی آنکھوں کی طرف دیکھا، ”بولو؟“ روپا بولی، ”نھو بھیا، مجھے مارو، خوب پیٹو۔ شاید اس طرح میں اس کا نام بتا دوں۔۔۔ تمہیں یاد ہو گا، ایک بار میں نے بچپن میں مندر کے ایک پیڑ سے کچھ آم توڑے تھے۔ اور تم نے ایک ہی چانڈا مار کر مجھ سے سچی بات کھلوائی تھی۔۔۔ آؤ مجھے مارو۔۔۔ یہ چور جسے میں نے اپنے من میں پناہ دے رکھی ہے بغیر مار کے باہر نہیں نکلے گا۔“

نھو خاموش رہا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے کچھ سوچا پھر ایک ایکی اس نے روپا کے پیلے گال پر اس زور سے تھپٹر مارا کہ چھت کے چند سوکھے اور گرد سے اٹے ٹنکے دھمک کے مارے نیچے گر پڑے۔ نھو کی سخت انگلیوں نے روپا کے گال پر کئی نہریں کھود دیں۔ نھونے گرج کر پوچھا، ” بتاؤ وہ کون ہے؟“

جھونپڑے کے باہر مادھو کے لنگڑے بھائی کی آدمی ٹانگ کا پی۔ چوہدری جس تنکے سے زمین پر ایک اور طوطے کی شکل بنارہا تھا۔ ہاتھ کا نپنے کے باعث دھرا ہو گیا۔ مادھو کا کانے ٹانگ کی طرح اپنی گردن اوپھی کر کے جھونپڑے کے اندر دیکھا۔ اندر سے نھو کی خشم آلو د آواز آرہی تھی مگر یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں مادھو کا کا، چوہدری اور لنگڑے کیشونے آپس میں کئی باتیں کیں۔ آخر میں مادھو کا کا بھائی بیسا کھی ٹیک کر اٹھا۔ وہ جھونپڑے میں جانے ہی والا تھا کہ نھو باہر نکلا۔ کیشو ایک طرف ہٹ گیا۔ نھو نے پلٹ کر اپنے پیچھے دیکھا اور کہا، ”آؤ روپا پھر اس نے روپا کی ماں سے کہا، ”ماں تم بالکل چتنا نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم شام تک لوٹ آئیں گے۔“

کسی نے نہ تو سے یہ نہ پوچھا کہ وہ روپا کو لے کر کدھر جا رہا ہے۔ مادھو کا کاپکھ پوچھنے ہی والا تھا کہ نخوا اور روپا دنوں چبوترے پر سے اتر کر موری کے اس پار جا چکے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی موچھ کے سفید بال نوچنے میں مصروف ہو گیا اور چوہدری نے کبڑے تنکے کو بڑے تنکے کو سیدھا کرنا شروع کر دیا۔

بھٹے کے مالک لالہ گنیش داس کا لڑکا ستیش جسے بھٹے کے مزدور چھوٹے لالہ جی کہا کرتے تھے، اپنے کمرے میں اکیلا چائے پی رہا تھا۔ پاس ہی تپائی پر ایک کھلی ہوئی کتاب رکھی تھی جسے غالباً وہ پڑھ رہا تھا۔ کتاب کی جلد کی طرح اس کا چہرہ بھی جذبات سے خالی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے چہرے پر غلاف چڑھا کر کھا ہے، وہ ہر روز اپنے اندر ایک نیا ستیش پاتا تھا۔ وہ جاڑے اور گرمیوں کے درمیانی موسم کی طرح متغیر تھا۔ وہ گرم اور سرد ہوں کا ایک مجموعہ تھا۔ دوسرے دماغ سے سوچتے تھے لیکن وہ ہاتھوں اور پیروں سے سوچتا تھا۔ جہاں ہرشے کھلیں نظر آتی ہے۔ بہی وجہ ہے کہ اپنی زندگی کو گیند کی مانند اچھال رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اچھل کو دی زندگی کا اصل مقصد ہے، اس کو ملنے میں بہت زیادہ مزا آتا ہے۔ ہرشے کو وہ مسل کر دیکھتا تھا۔

عورتوں کے متعلق اس کا نظر یہ تھا کہ مرد خواہ کتنا ہی بوڑھا ہو جائے مگر اس کو عورت جوان ملنی چاہیے۔ عورت میں جوانی کو وہ اتنا ہی ضروری تھیاں کرتا تھا جتنا اپنے ٹینس کھیلنے والے ریکٹ میں بننے ہوئے جال کے اندر رتا ہو کو۔ دوستوں کو کہا کرتا تھا، ”زندگی کے ساز کا ہر تار ہر وقت تناہونا چاہیے۔ تاکہ ذرا سی جنبش پر بھی وہ لرزنا شروع کر دے۔“ یہ لرزش، یہ کپکاپاہٹ جس سے ستیش کو اس قدر بیمار تھا، دراصل اس کے گندے خون کے کھولا و کا نتیجہ تھی۔ جنسی خواہشات اس کے اندر اس قدر زیادہ ہو گئی تھیں کہ جوان حیوانوں کو دیکھ کر بھی اسے لذت محسوس ہوتی تھی۔ وہ جب اپنی گھوڑی کے جوان بچ کے کپکاپاتے ہوئے بدن کو دیکھتا تھا تو اسے ناقابل بیان مسّرت حاصل ہوتی تھی۔ اس کو دیکھ کر کئی بار اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ اپنا بدن اس کے ترو تازہ بدن کے ساتھ گھسے۔

ستیش چائے پی رہا تھا اور دل ہی دل میں چائے دالی کی تعریف کر رہا تھا جو بے داغ سفید چینی کی بنی ہوئی تھی۔ ستیش کو داغ پسند نہیں تھے۔ وہ ہرشے میں ہمواری پسند کرتا تھا۔ صاف بدن عورتوں کو دیکھ کر وہ اکثر کہا کرتا تھا، ”میری نگاہیں اس عورت پر کئی گھنٹے تیرتی رہیں۔۔۔۔۔ وہ کس قدر ہموار تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شفاف پانی کی چھوٹی سی جھیل ہے۔

یہ کمرہ جس میں اس وقت ستیش بیٹھا ہوا تھا، خاص طور پر اس کے لیے بنایا گیا تھا۔ کمرے کے سامنے ٹینس کو رٹ تھا۔ یہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہر روز شام کو ٹینس کھلیتا تھا۔ آج اس نے اپنے دوستوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ ٹینس کھلینے نہیں آئے گا کیونکہ اسے آج ایک دلچسپ کھیل کھلینا تھا۔ بھگنی کی نوجوان لڑکی جس کے متعلق اس نے ایک روز اپنے دوست سے یہ کہا تھا، ”تم اسے دیکھو۔۔۔۔۔ سچ کہتا ہوں

تمہاری نگاہیں اس کے چہرے پر سے پھسل پھسل جائیں گی۔ میری نگاہیں اس کو دیکھنے سے پہلے، اس کے کھر درے بالوں کو تھام لیتی ہیں تاکہ پھسل نہ جائیں۔۔۔ آج ایک مدت کے بعد ٹینس کورٹ میں اس سے خفیہ ملاقات کرنے کے لیے آ رہی تھی۔ وہ چائے پی رہا تھا اور اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چائے میں اس جوان لڑکی کے سانوں لے رنگ کا عکس پڑ رہا تھا۔

اس کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ باہر سوکھے پتے کھڑکے تو سیش نے پیالی میں سے چائے کا آخری گھونٹ پیا اور اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔۔۔!

ایک لمبا سایہ ٹینس کورٹ کے جھاڑو دیے ہوئے سینے پر متھر ک ہوا اور لڑکی کی بجائے نھو نمودار ہوا۔ سیش نے غور سے اس کی طرف دیکھا کہ آنے والا یعنی کا ایک مزدور ہے۔ نھو اپنے بالوں کا ایک چھپا انگلیوں سے مر ڈرہا تھا اور ٹینس کورٹ کی طرف بڑھا رہا تھا۔ سیش کی کرسی برآمدے میں بچھی تھی۔ پاس پہنچ کر نھو کھڑا ہو گیا اور سیش کی طرف یوں دیکھنے لگا گویا چھوٹے لالہ جی کو اس کی آمد کی غرض و غایت اچھی طرح معلوم ہے۔

سیش نے پوچھا، ”کیا ہے؟“

نھو خاموشی سے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا، ”چھوٹے لالہ جی! میں اسے لے کر آیا ہوں۔ اب آپ اُسے اپنے پاس رکھ لیجئے، گاؤں والے اُسے بہت تنگ کر رہے ہیں۔“ سیش حیران ہو گیا۔ اس کی سمجھی میں نہیں آیا کہ نھو کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے پوچھا، ”کے۔۔۔ کے تنگ کر رہے ہیں۔“ نھو نے جواب دیا، ”آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ روپا کو۔۔۔ آپ کی پتی کو۔“

”میری پتی؟“ سیش چکر اگیا۔ ”میری پتی۔۔۔ تیر ادماغ تو نہیں بہک گیا۔۔۔ یہ کیا بک رہا ہے۔۔۔“ یہ کہتے ہی اس کے اندر۔۔۔ بہت اندر روپا کا خیال پیدا ہوا اور اسے یاد آیا کہ پچھلے ساون میں وہ ایک موٹی موٹی آنکھوں اور گدرائے ہوئے جسم والی ایک لڑکی سے کچھ دنوں کھیلا تھا۔ وہ دودھ لے کر شہر میں جایا کرتی تھی۔ ایک بار اس نے دودھ کی بوندیں اس کے ابھرتے ہوئے سینے پر ٹکتی دیکھی تھیں اور۔۔۔ ہاں ہاں یہ روپا وہی لڑکی تھی۔ جس کے بارے میں اس نے ایک بار یہ خیال کیا تھا کہ وہ دودھ سے زیادہ ملائم ہے۔ اس کو حیرت بھی ہوتی تھی کہ یہ اینٹیں بنانے والے ایسی نرم نازک لڑکیاں کیسے پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ بھتی کی لڑکی کو بھول سکتا تھا۔ سو شیلا کو فراموش کر سکتا تھا، جو ہر روز اس کے ساتھ ٹینس کھیلاتی تھی۔ وہ ہسپتال کی نرس کو بھول سکتا تھا جس کے سفید کپڑوں کا وہ معترض تھا۔ وہ اس۔۔۔ لیکن روپا کو نہیں بھول سکتا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد ہے کہ دوسرا یا تیسرا ملاقات پر جب کہ روپا نے اپنا آپ اس کے حوالے کر دیا تھا۔ تو اس کی ایک بات

پر اسے بہت منی آئی تھی۔ روپا نے اس سے کہا تھا، ”چھوٹے لالہ جی! کل سندری چمارن کہہ رہی تھی، جلدی جلدی بیاہ کر لے ری۔ بڑا مرا آتا ہے۔۔۔ اسے کیا پتہ کہ میں بیاہ کر بھی چکی ہوں۔۔۔“ مگر روپا تھی کہاں؟ ستیش کی حیوانی حس اس کا نام سنتے ہی بیدار ہو چکی تھی۔ گو ستیش کا دماغ معاملہ کی نزاکت کو سمجھ گیا تھا۔ مگر اس کا جسم صرف اپنی دلچسپی کی طرف متوجہ تھا۔

ستیش نے پوچھا، ”کہاں ہے روپا؟“

نھتو اٹھ کھڑا ہوا، ”باہر کھڑی ہے۔۔۔ میں ابھی اسے لاتا ہوں۔“ ستیش نے فوراً رعب دار لمحے میں کہا، ”خبر دار جو اسے تو یہاں لا یا۔۔۔ جا بھاگ جا یہاں سے۔۔۔“

”پر۔۔۔ پر۔۔۔ چھوٹے لالہ جی وہ۔۔۔ وہ آپ کی پتی ہو چکی ہے۔۔۔ بچے کی ماں بننے والی ہے اور بچہ آپ ہی کا تو ہو گا۔۔۔ آپ ہی کا تو ہو گا۔“ نھونے تلاتھے ہوئے کہا۔

تو روپا حاملہ ہو چکی تھی۔۔۔ ستیش کو قدرت کی یہ ستم ظریفی سخت ناپسند تھی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ عورت اور مرد کے تعلقات کے ساتھ ساتھ یہ حمل کا سلسلہ کیوں جوڑ دیا ہے۔ مرد جب کسی عورت کی خاص خوبی کا معرفہ ہوتا ہے تو اس کی سزا بچے کی شکل میں کیوں طرفین کو بھگلتانا پڑتی ہے۔۔۔ روپا بچے کے بغیر کتنی اچھی تھی۔ اور وہ خود اس بچے کے بغیر کتنے اچھے طریقے پر، روپا کے ساتھ تعلقات قائم رکھ سکتا تھا۔ اس سلسلہ تولید کی وجہ سے کئی بار اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ عورت ایک بیکار شے ہے یعنی اس کو ہاتھ لگاؤ اور یہ بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس بچے کا کیا کرے جو پیدا ہو رہا تھا تھوڑی دیر غور کر کے اس نے نھتو کو اپنے پاس بٹھایا اور بڑے آرام سے کہا۔

”تم روپا کے کیا لگتے ہو۔۔۔ خیر چھوڑواں قصے کو۔۔۔ دیکھو، یہ بچے وچے کی بات مجھے پسند نہیں، مفت میں ہم دونوں بدنام ہو جائیں گے، تم ایسا کرو، روپا کو یہاں چھوڑ جاؤ۔۔۔ میں اسے آج ہی کسی ایسی جگہ بھجوادوں گا جہاں یہ بچہ ضائع کر دیا جائے۔۔۔ اور روپا کو میں کچھ روپے دے دوں گا، وہ خوش ہو جائے گی۔۔۔ تمہارا انعام بھی تمہیں مل جائے گا۔۔۔ ٹھہرو۔“

یہ کہہ کر ستیش نے اپنی جیب سے ٹوہ نکلا اور دس روپے کا نوٹ نھوکے ہاتھ میں دے کر کہا، ”یہ رہا تمہارا انعام۔۔۔ جاؤ عیش کرو۔“ نھتو چپکے سے اٹھا۔ دس روپے کا نوٹ اس نے اچھی طرح مٹھی میں دبایا اور وہاں سے چل دیا۔ ستیش نے اطمینان کا سنس لیا کہ چلو چھٹی ہوئی۔

اب وہ بھگی کی لڑکی کی بابت سوچنے لگا کہ اگر اسے بھی۔۔۔ مگر یہ کیا، نخنو روپا کے ساتھ واپس آ رہا تھا۔ روپا کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اور وہ یوں چل رہی تھی جیسے اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ سیش نے سوچا، ”یہ بچہ پیدا کرنا بھی ایک اچھی خاصی مصیبت معلوم ہوتی ہے۔“

نخنو اور روپا دونوں برآمدے کی سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہو گئے۔ سیش نے روپا کی طرف دیکھے بغیر کہا، ”دیکھو روپا، میں نے۔۔۔ اس کو سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ تم فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ سمجھیں۔۔۔ کیوں بھی تم نے سب کچھ بتا دیا نہ؟“

نخنو نے دس روپے کا نوٹ خاموشی سے سیش کی طرف بڑھایا اور کہا، ”چھوٹے لالہ جی! کاغذ کے اس ٹکڑے سے آپ مجھے خریدنا چاہتے ہیں۔ میں تو ایک بہت بڑا سودا کرنے آیا تھا۔“ سیش نے سمجھا کہ نخنو شاید دس روپے سے زیادہ مانگتا ہے، ”کتنے چاہئیں تھے۔۔۔ میرے پاس اس وقت پچاس بیس لینا ہو تو لے جاؤ۔“

نخنو نے روپا کی طرف دیکھا۔ روپا کی آنکھوں سے آنسو نکل کر سینٹ سے لپی ہوئی سیڑھیوں پر ٹکر رہے تھے۔ اس کے دل پر یہ قطرے پھگلے ہوئے سیے کی طرح گر رہے تھے۔ سیش کی طرف اس نے ڈر کر کہا، ”چھوٹے لالہ جی، یہ آپ کی پتی ہے، آپ اس کے بچے کے باپ ہیں۔۔۔ جیسے بڑے لالہ جی آپ کے پتا ہیں۔۔۔ روپا کے لیے اور کوئی جگہ نہیں ہے، وہ آپ کے پاس رہے گی اور آپ اسے پتی بنانا کر کھین گے۔۔۔ سب گاؤں والے اسے دھنکار رہے ہیں، کس لیے۔۔۔ اس لیے کہ وہ آپ کا بچہ اپنے بیٹ میں لے پھرتی ہے۔۔۔ آپ کو تھامنا پڑے گا۔ اس لڑکی کا ہاتھ جس نے آپ کو اپناسب کچھ دے دیا۔۔۔ آپ کا دل پتھر کا نہیں ہے چھوٹے لالہ جی! اور اس چھوکری کا دل بھی پتھر نہیں ہے۔۔۔ آپ نے اس کو سہارا نہ دیا تو اور کون دے گا، یہ آتی نہیں تھی۔ روپو کے اپنی جان ہلاکان کر رہی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا اور کہا، پگلی تو کیوں روتی ہے، تیراپتی جیتا ہے چل میں تجھے اس کے پاس لے چلو۔

سیش کو پتی پتی کا مطلب ہی سمجھ میں نہیں آتا تھا، ”دیکھو بھائی! زیادہ بکواس نہ کرو، تم یوں ڈر ادھم کا کر مجھ سے زیادہ روپیہ وصول نہیں کر سکتے۔ میں ایک سور و پیہ دینے پر راضی ہوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ بچہ ضائع کر دیا جائے۔ اور تم جو مجھ سے یہ کہتے ہو کہ میں اسے اپنے گھر میں بسالوں توبہ نا ممکن ہے۔۔۔ میں اس کا پتی خواب میں بھی نہیں بنانا اور نہ یہ میری کبھی پتی بنی ہے۔۔۔ سمجھے؟ سور و پیہ لینا ہو تو کل آکے یہاں سے لے جانا، اب یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ۔“

نخنو بھٹاگیا، ”اور۔۔۔ اور۔۔۔ یہ بچہ کیا آسمان سے گرا ہے؟ اس کی آنکھوں میں آنسو بھوت پر یوں نے بھردیئے ہیں۔ میرا دل کون مسل رہا ہے۔۔۔ یہ روپے۔۔۔ یہ سور و پے کیا آپ خیرات کے طور پر دے رہے ہیں۔۔۔ کچھ ہوا ہے تو یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔۔۔

کوئی بات ہے تو یہ پہلی بھر ہی ہے۔۔۔ آپ اس بچے کے باپ ہیں تو کیا اس کے پتی نہیں؟ میری عقل کو کچھ ہو گیا ہے یا آپ کی سمجھ کو۔۔۔
”

ستیش یہ تقریر برداشت نہ کر سکا، ”الو کے پڑھے! تو جاتا ہے کہ نہیں، یہاں سے کھڑا اپنی منطق چھانٹ رہا ہے۔ جا، جو کرنا ہے کر لے۔۔۔ دیکھوں تو میرا کیا بگاڑ لے گا۔“ نخونے ہولے سے کہا، ”میں تو سنوارنے آیا تھا چھوٹے اللہ جی۔۔۔ آپ ناقہ کیوں بگڑ رہے ہیں، آپ کیوں نہیں اس کا ہاتھ تھام لیتے یہ آپ کی پتی ہے۔“

”پتی کے بچے! اب تو اپنی بکواس بند کرے گایا نہیں۔۔۔ بچہ بچہ کیا بک رہا ہے۔۔۔ جا لے جا اپنی اس کچھ لکھتی کو، ورنہ یاد رکھ، کھال ادھیر دوں گا۔“

نخنوں کے سب پڑھے اکٹھ گئے، ”بھگوان کی قسم! مجھ میں اتنی شکنتی ہے کہ یوں ہاتھوں میں دبا کر تیر اسارا ہو نچوڑ دوں۔۔۔ میری کھال تیرے ان نازک ہاتھوں سے نہیں ادھرے گی۔۔۔ میں تیری بوٹی بوٹی نوچ سکتا ہوں۔۔۔ پر میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں تجھے ہاتھ تک نہیں لگانا چاہتا۔۔۔ تو روپا کے بچے کا باپ ہے، تو روپا کا پتی ہے۔ اگر میں تجھ پر ہاتھ اٹھایا تو مجھے ڈر ہے کہ روپا کے دل کو دھکا لے گا۔۔۔ تو عورتوں سے ملتا جلتا ہے پر تو عورت کا دل نہیں رکھتا۔“

ستیش آپ سے باہر ہو گیا۔ اور چیختے گا، ”تیری اور تیری روپا کی ایسی تمی۔۔۔ نکل یہاں سے باہر۔“

نخبوڑھ کر روپا کے آگے کھڑا ہو گیا اور ستیش کے پاس۔۔۔ بالکل پاس جا کر کہنے لگا، ”چھوٹے اللہ جی مجھے معاف کر دیجیے گا۔ میں نے ایسی باتیں کہہ دی ہیں جو مجھے نہیں کہنا چاہیے تھیں۔۔۔ مجھے معاف کر دیجیے مگر روپا کا ہاتھ تھام لیجیے۔۔۔ آپ اس کے پتی ہیں، اس کے بھاگ میں آپ کے بنا اور کوئی مرد نہیں لکھا گیا۔ یہ آپ کی ہے۔۔۔ اب آپ اسے اپنا بنالیں۔۔۔ یہ دیکھئے میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔“

”کیسے واهیات آدمی سے واسطہ پڑا ہے۔“ ستیش نے کمرے کے اندر جاتے ہوئے کہا، ”کہتا ہوں میں روپا و پاکو نہیں جانتا۔ مگر یہ خواہ مخواہ اسے میرے پلے باندھ رہا ہے۔۔۔ جاؤ جاؤ ہوش کی دوا کرو۔“

کمرے کا صرف ایک دروازہ کھلا تھا جس میں سے ستیش اندر داخل ہوا تھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے یہ دروازہ بند کر دیا۔ نھونے دروازے کی لکڑی کی طرف دیکھا تو اسے ستیش کے چہرے اور اس میں کوئی فرق نظر نہ آیا۔ نھونے اپنے سر کے بال مردڑ نے شروع کر دیئے اور جب پلٹ کر اس نے روپا سے کچھ کہنا چاہا تو وہ جا پہنچی تھی۔ اور وہ اس کا پیچھا کرنے کے لیے بھاگا۔ مگر وہ جا پہنچی تھی۔ باہر نکل کر اس نے روپا کو بہت دور درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے یہ کہتا ہوا بھاگا، ”روپا۔۔۔ روپا، ٹھہر جا۔۔۔ میں ایک بار پھر اسے سمجھاؤں گا۔۔۔ وہی تیر اپتی ہے۔۔۔ اس کا گھر ہی تیری اصل جگہ ہے۔

وہ بہت دیر تک بھاگتا رہا۔ مگر روپا بہت دور نکل گئی تھی۔۔۔ اس روز سے آج تک نھتو، روپا کی تلاش میں سرگردان ہے مگر وہ اسے نہیں ملتی۔ وہ لوگوں سے کہتا ہے، ”میں روپا کے پتی کو جانتا ہوں۔۔۔ تم اسے ڈھونڈ کر لاو، میں اسے اس کے پتی سے ملا دوں گا۔“

لوگ یہ سن کر ہنس دیتے ہیں۔۔۔ بچ جب بھی نھتو کو دیکھتے ہیں تو اس سے پوچھتے ہیں، ”اس کا پتی کون ہے نھتو بھیا؟“ تو نھتو ان کو مارنے کے لیے دوڑتا ہے۔

-[26]-

بنگی آوازیں: سعادت حسن منٹو

بھولو اور گاما دو بھائی تھے۔ بے حد محنت۔ بھولو قلعی گرتھا۔ صح و ھونکنی سر پر رکھ کر نکلتا اور دن بھر شہر کی گلیوں میں ”بھانڈے قلعی کرالو“ کی صدائیں لگاتا رہتا۔ شام کو گھر لوٹتا تو اس کے تہہ بند کی ڈب میں تین چار روپے کا کربانہ ضرور ہوتا۔

گاماخوانچہ فروش تھا۔ اس کو بھی دن بھر چھا بڑی سر پر اٹھائے گھومنا پڑتا تھا۔ تین چار روپے یہ بھی کمالیتا تھا۔ مگر اس کو شراب کی لات تھی۔ شام کو دینے کے بھٹیار خانے سے کھانا کھانے سے پہلے ایک پاؤ شراب اسے ضرور چاہیے تھی۔ پینے کے بعد وہ خوب چھکتا۔ دینے کے بھٹیار خانے میں رونق لگ جاتی۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ پیتا ہے اور اسی کے سہارے جیتا ہے۔

بھولونے گامکو، جو کہ اس سے دوسال بڑا تھا بہت سمجھایا کہ دیکھو یہ شراب کی لست بہت بری ہے۔ شادی شدہ ہو، بیکار پیسہ بر باد کرتے ہو۔ یہی جو تم ہر روز ایک پاؤ شراب پر خرچ کرتے ہو بچا کر رکھو تو جا بھی ٹھاٹ سے رہا کرے۔ ننگی پنجی اچھی لگتی ہے تمہیں اپنی گھروالی۔ گمانے اس کان سننا کان سے نکال دیا۔ بھولو جب تھک ہار گیا تو اس نے کہنا سننا ہی چھوڑ دیا۔

دونوں مہاجر تھے۔ ایک بڑی بلڈنگ کے ساتھ سروٹ کو اوارٹ تھے۔ ان پر جہاں اور وہ نے قبضہ جما کھاتھا، وہاں ان دونوں بھائیوں نے بھی ایک کوارٹر کو جو کہ دوسری منزل پر تھا اپنی رہائش کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔ سر دیاں آرام سے گزر گئیں۔ گرمیاں آئیں تو گامکو بہت تکلیف ہوئی۔ بھولو تو اپر کوٹھے پر کھاٹ بچھا کر سوجاتا تھا۔ گاما کیا کرتا۔ بیوی تھی اور اپر پر دے کا کوئی بندوبست ہی نہیں تھا۔ ایک گاما ہی کو یہ تکلیف نہیں تھی۔ کوارٹروں میں جو بھی شادی شدہ تھا اسی مصیبت میں گرفتار تھا۔

کلن کو ایک بات سوچی۔ اس نے کوٹھے پر کونے میں اپنی اور اپنی بیوی کی چارپائی کے ارد گرد ٹھاٹ تان دیا۔ اس طرح پر دے کا انتظام ہو گیا۔ کلن کی دیکھاد کیمی دوسروں نے بھی اس ترکیب سے کام لیا۔ بھولو نے بھائی کی مدد کی اور چند دنوں ہی میں بانس وغیرہ گاڑ کر ٹھاٹ اور کمبل جوڑ کر پر دے کا انتظام کر دیا۔ یوں ہوا تور ک جاتی تھی مگر نیچے کوارٹر کے دوزخ سے ہر حالت میں یہ جگہ بہتر تھی۔

اوپر کوٹھے پر سونے سے بھولو کی طبیعت میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہو گیا۔ وہ شادی بیاہ کا بالکل قائل نہیں تھا۔ اس نے دل میں عہد کر کھا تھا کہ یہ جنجال کبھی نہیں پالے گا۔ جب گاما کبھی اس کے بیاہ کی بات چھیڑتا تو وہ کہا کرتا: ناجھائی، میں اپنے نزدے پنڈے پر جو نہیں نہیں لگوانا چاہتا۔ لیکن جب گرمیاں آئیں اور اس نے اوپر کھاٹ بچھا کر سونا شروع کیا تو دس پندرہ دن ہی میں اس کے خیالات بدل گئے۔ ایک شام کو دینے کے بھٹیار خانے میں اس نے اپنے بھائی سے کہا، ”میری شادی کر دو، نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

گمانے جب یہ سننا تو اس نے کہا، ”یہ کیا مذاق سوچتا ہے تمہیں؟“

بھولو بہت سمجھیدہ ہو گیا، ”تمہیں نہیں معلوم۔۔۔ پندرہ راتیں ہو گئی ہیں مجھے جا گئے ہوئے۔۔۔“

گمانے پوچھا، ”کیوں کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں یار۔۔۔ دائیں باسیں جدھر نظر ڈالو کچھ نہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔۔۔ عجیب عجیب آوازیں آتی ہیں۔ نیند کیا آئے گی خاک!“

گمازور سے اپنی گھنی موچھوں میں ہنسا۔ بھولو شر ماگیا، ”وہ جو کلن ہے، اس نے توحد ہی کر دی ہے۔۔۔ سالارات بھر کو اس کرتا رہتا ہے۔۔۔ اس کی بیوی سالی کی زبان بھی تالو سے نہیں لگتی۔۔۔ بچ پڑے رور ہے ہیں مگروہ۔۔۔“

گما حسبِ معمول نشے میں تھا۔ بھولو گیا تو اس نے دینے کے بھٹیار خانے میں اپنے سب واقف کاروں کو خوب چک چک کرتا یا کہ اس کے بھائی کو آج کل نیند نہیں آتی۔ اس کا باعث جب اس نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا تو سننے والوں کے پیٹ میں ہنس کر بل پڑ گئے۔ جب یہ لوگ بھولو سے ملے تو اس کا خوب مذاق اڑایا۔ کوئی اس سے پوچھتا، ”ہاں بھی، کلن اپنی بیوی سے کیا بتیں کرتا ہے۔“ کوئی کہتا، ”میاں مفت میں مزے لیتے ہو۔۔۔ ساری رات فلمیں دیکھتے رہتے ہو۔۔۔ سو فیصدی گالی بولتی۔“

بعضوں نے گندے گندے مذاق کیے۔ بھولو چڑ گیا۔ گما صوفی حالت میں تھا تو اس نے اس سے کہا، ”تم نے تو یار میر انداق بنادیا ہے۔۔۔ دیکھو جو کچھ میں نے تم سے کہایہ جھوٹ نہیں۔ میں انسان ہوں۔ خدا کی قسم مجھے نیند نہیں آتی۔ آج میں دن ہون گئے ہیں جا گئے ہوئے۔۔۔ تم میری شادی کا بندوبست کر دو، ورنہ قسم پنج تن پاک کی میراغانہ خراب ہو جائے گا۔۔۔ بھا بھی کے پاس میرا پانسورو پیہ جمع ہے۔۔۔ جلدی کر دو بندوبست!“ گمانے موچھ مر ڈکر پہلے کچھ سوچا پھر کہا، ”اچھا ہو جائے گا بندوبست۔ تمہاری بھا بھی سے آج ہی بات کرتا ہوں کہ وہ اپنی ملنے والیوں سے پوچھ گچھ کرے۔“

ڈیڑھ ہمینے کے اندر اندر بات پکی ہو گئی۔ صمد قلعی گر کی لڑکی عائشہ گاما کی بیوی کو بہت پسند آئی۔ خوبصورت تھی۔ گھر کا کام کا جانتی تھی۔ ویسے صمد بھی شریف تھا۔ محلے والے اس کی عزت کرتے تھے۔ بھولو محنتی تھی۔ تندرست تھا۔ جون کے وسطے میں شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ صمد نے بہت کہا کہ وہ لڑکی اتنی گرمیوں میں نہیں بیباہے گا مگر بھولو نے جب زور دیا تو وہ مان گیا۔

شادی سے چار دن پہلے بھولو نے اپنی دہن کے لیے اوپر کوٹھے پر ٹاٹ کے پردے کا بندوبست کیا۔ بانس بڑی مضبوطی سے فرش میں گاڑے۔ ٹاٹ خوب کر کس کر لگایا۔ چار پانیوں پر منٹھ کھیس بچھائے۔ نئی صراحی منڈیر پر رکھی، شیشے کا گلاس بازار سے خریدا۔ سب کام اس نے بڑے اہتمام سے کیے۔

رات کو جب وہ ٹاٹ کے پردے میں گھر کر سویا تو اس کو عجیب سا لگا وہ کھلی ہوا میں سونے کا عادی تھا مگر اب اس کو عادت ڈالنی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شادی سے چار دن پہلے ہی اس نے یوں سونا شروع کر دیا۔ پہلی رات جب وہ لیٹا اور اس نے اپنی بیوی کے بارے میں سوچا تو وہ پسینے

میں تربت ہو گیا۔ اس کے کانوں میں وہ آوازیں گو نجھے لگیں جو اسے سونے نہیں دیتی تھیں اور اس کے دماغ میں طرح طرح کے پریشان خیالات دوڑاتی تھیں۔ کیا وہ بھی ایسی ہی آوازیں پیدا کرے گا۔۔۔؟ کیا آس پاس کے لوگ یہ آوازیں سنیں گے۔ کیا وہ بھی اسی کے مانند راتیں جاگ کر کاٹیں گے۔ کسی نے اگر جھانک کر دیکھ لیا تو کیا ہو گا؟

بھولو پہلے سے بھی زیادہ پریشان ہو گیا۔ ہر وقت اس کو یہی بات ستائی رہتی کہ ٹاط کا پردہ بھی کوئی پردہ ہے، پھر چاروں طرف لوگ بکھرے پڑے ہیں۔ رات کی خاموشی میں بلکل سرگوشی بھی دوسرا کانوں تک پہنچ جاتی ہے۔۔۔ لوگ کیسے یہ ننگی زندگی بسر کرتے ہیں۔۔۔ ایک کوٹھا ہے۔ اس چارپائی پر بیوی لیٹی ہے۔ اس چارپائی پر خاوند پڑا ہے۔ سیکڑوں آنکھیں، سیکڑوں کان آس پاس کھلے ہیں۔ نظر نہ آنے پر بھی آدمی سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔ بلکل سی آہٹ پوری تصویر بن کر سامنے آ جاتی ہے۔۔۔ یہ ٹاط کا پردہ کیا ہے، سورج نکلتا ہے تو اس کی روشنی ساری چیزیں بے نقاب کر دیتی ہے۔ وہ سامنے کلپن اپنی بیوی کی چھاتیاں دبارہ ہے، وہ کونے میں اس کا بھائی گالا لیٹا ہے، تھہ بند کھل کر ایک طرف پڑا ہے۔ ادھر عید و حلوائی کی کنواری بیٹی شاداں کا پیٹ چھدرے ٹاط سے جھانک جھانک کر دیکھ رہا ہے۔

شادی کا دن آیا تو بھولو کا جی چاہا کہ وہ کہیں بھاگ جائے مگر کہاں جاتا۔ اب تو وہ جکڑا جا چکا تھا۔ غائب ہو جاتا تو صد ضرور خود کشی کر لیتا۔ اس کی لڑکی پر جانے کیا گزرتی۔ جو طوفان مچتا وہ الگ۔

”اچھا جو ہوتا ہے ہونے دو۔۔۔ میرے ساتھی اور بھی تو ہیں۔ آہستہ آہستہ عادت ہو جائے گی۔ مجھے بھی۔۔۔“ بھولو نے خود کو ڈھارس دی اور اپنی نئی نویلی دہن کی ڈولی گھر لے آیا۔

کوارٹروں میں چہل پہل پیدا ہو گئی۔ لوگوں نے بھولو اور گاما کو خوب مبارک بادیں دیں۔ بھولو کے جو خاص دوست تھے، انہوں نے اس کو چھیڑا اور پہلی رات کے لیے کئی کامیاب گرتباۓ۔ بھولو خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کی بھا بھی نے اوپر کوٹھے پر ٹاط کے پردوں کے پیچھے بستر کا بند و بست کر دیا۔ گمانے چار موتبے کے بڑے بڑے ہار تکیے کے پاس رکھ دیے۔ ایک دوست اس کے لیے جلیبوں والا دودھ لے آیا۔

دیر تک وہ نیچے کوارٹ میں اپنی دہن کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ بے چاری شرم کی ماری، سر نیوڑھائے، گھوٹکٹ کاڑھے، سمٹی ہوئی تھی۔ سخت گرمی تھی۔ بھولو کا نیا کرتا اس کے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ پنکھا جھل رہا تھا مگر ہوا جیسے بالکل غائب ہی ہو گئی تھی۔ بھولو نے پہلے سوچا تھا کہ وہ اوپر کوٹھے پر نہیں جائے گا۔ نیچے کوارٹ ہی میں رات کا ٹے گا مگر جب گرمی انتہا کو پہنچ گئی تو وہ اٹھا اور دہن سے چلنے کو کہا۔

رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ تمام کوارٹر خاموشی میں لپٹے ہوئے تھے۔ بھولو کو اس بات کی تسلیم تھی کہ سب سورہ ہے ہوں گے۔ کوئی اس کو نہیں دیکھے گا۔ چپ چاپ دبے قدموں سے وہ اپنے ٹاٹ کے پردے کے پیچھے اپنی دلہن سمیت داخل ہو جائے گا اور صحیح منہ ادھیرے نیچے اتر جائے گا۔

جب وہ کوٹھے پر پہنچا تو بالکل خاموش تھی۔ دلہن نے شرمائے ہوئے قدم اٹھائے تو پازیب کے نقری گھنگھرو بجنے لگے۔ ایک دم بھولونے محسوس کیا کہ چاروں طرف جو نیند بکھری ہوئی تھی چونکہ رجگ پڑی ہے۔ چار پائیوں پر لوگ کروٹیں بدلنے لگے، کھانے، کھنکارنے کی آوازیں ادھر ادھر ابھریں۔ دبی دبی سر گوشیاں اس تپی ہوئی فضایں تیرنے لگیں۔ بھولونے گھبر اکر اپنی بیوی کا ہاتھ کپڑا اور تیزی سے ٹاٹ کی اوٹ میں چلا گیا۔ دبی دبی ہنسی کی آواز اس کے کانوں کے ساتھ ٹکرائی۔ اس کی گھبر اہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ بیوی سے بات کی توپاس ہی گھسر پھر شروع ہو گئی۔

دور کونے میں جہاں کلن کی جگہ تھی، وہاں چارپائی کی چرچوں چرچوں ہونے لگی، یہ دھیمی پڑی تو گاما کی لوہے کی چارپائی بولنے لگی۔ عید دھلوانی کی کنواری لڑکی شاداں نے دو تین بار اٹھ کر پانی پیا۔ گھرے کے ساتھ اس کا گلاس ٹکراتا تو ایک چھنا کا ساپید اہوتا۔ خیرے قصائی کے لڑکے کی چارپائی سے بار بار ماچس جلانے کی آواز آتی تھی۔

بھولو اپنی دلہن سے کوئی بات نہ کر سکا۔ اسے ڈر تھا کہ آس پاس کے کھلے ہوئے کان فوراً اس کی بات نگل جائیں گے۔ اور ساری چارپائیاں چرچوں چرچوں کرنے لگیں گی۔ دم سادھے وہ خاموش لیٹا رہا۔ کبھی کبھی سہی ہوئی نگاہ سے اپنی بیوی کی طرف دیکھ لیتا جو گھری سی بنی دوسری چارپائی پر لیٹی تھی۔ کچھ دیر جاتی رہی، پھر سو گئی۔ بھولونے چاہا کہ وہ بھی سو جائے مگر اس کو نیندہ آئی۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد اس کے کانوں میں آوازیں آتی تھیں۔ آوازیں جو فوراً تصویر بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتی تھیں۔

اس کے دل میں بڑے ولے تھے، بڑا جوش تھا۔ جب اس نے شادی کا ارادہ کیا تھا تو وہ تمام لذتیں جن سے وہ نا آشنا تھا اس کے دل و دماغ میں چکر لگاتی رہتی تھیں۔ اس کو گرمی محسوس ہوتی تھی، بڑی راحت بخش گرمی۔ مگر اب جیسے پہلی رات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ اس نے رات میں کئی بار یہ دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی مگر آوازیں۔۔۔ وہ تصویریں کھینچنے والی آوازیں سب کچھ درہم کر دیتیں۔ وہ خود کو نیگا محسوس کرتا، الف نگا، جس کو چاروں طرف سے لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔

صحیح چاربجے کے قریب وہ اٹھا، باہر نکل کر اس نے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیا، کچھ سوچا، وہ جو جگ جواس کے دل میں بیٹھ گئی تھی اس کو کسی قدر دور کیا۔ اب ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جو کافی تیز تھی۔۔۔ بھولو کی نگاہیں کونے کی طرف مڑیں۔ کلّن کا گھساہو اٹاٹ ہل رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بالکل نگ دھڑنگ لیتا تھا۔ بھولو کو بڑی گھن آئی، ساتھ ہی غصہ بھی آیا کہ ہوا ایسے کوٹھوں پر کیوں چلتی ہے؟ چلتی ہے تو ٹالوں کو کیوں چھیڑتی ہے؟ اس کے جی میں آئی کہ کوٹھے پر جتنے ٹاٹ ہیں، سب نوجڈا لے اور نگاہو کے ناچنے لگے۔

بھولو نیچے اتر گیا۔ جب کام پر نکلا تو کئی دوست ملے۔ سب نے اس سے پہلی رات کی سرگزشت پوچھی۔ پھوچے درزی نے اس کو دور رہی سے آواز دی، ”کیوں استاد بھولو، کیسے رہے، کہیں ہمارے نام پر بہت تو نہیں لگا دیا تم نے؟“ چھاگے میں سازنے اس سے بڑے رازدار نہ لجھے میں کہا، ”دیکھو اگر کوئی گڑ بڑھے تو بتا دو۔ ایک بڑا اچھا نجف میرے پاس موجود ہے۔“ بالے نے اس کے کاندھے پر زور سے دھپا مارا، ”کیوں پہلوان، کیسار ہادنگل؟“

بھولو خاموش رہا۔

صحیح اس کی بیوی میکے چلی گئی۔ پانچ چھ روز کے بعد واپس آئی تو بھولو کو پھر اسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ کوٹھے پر سونے والے جیسے اس کی بیوی کی آمد کے منتظر تھے۔ چند رات تین خاموش رہی تھی لیکن جب وہ اوپر سوئے تو وہی کھسر پھسر وہی چرچوں چرچوں، وہی کھاننا کھنکارنا۔۔۔ وہی گھرے کے ساتھ گلاس کے ٹکرانے کے چھنانے کے۔۔۔ کروٹوں پر کروٹیں، دبی دبی ہنسی۔۔۔ بھولو ساری رات اپنی چارپائی پر لیٹا آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اپنی دہن کو دیکھ لیتا اور دل میں کڑھتا، ”مجھے کیا ہو گیا ہے۔۔۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔۔۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔“ سات راتوں تک یہی ہوتا رہا، آخر نگ آکر بھولو نے اپنی دہن کو میکے بھیج دیا۔ بیس پچھیں دن گزر گئے تو گامانے بھولو سے کہا، ”یاد تم بڑے عجیب و غریب آدمی ہوئی نئی شادی اور بیوی کو میکے بھیج دیا۔ اتنے دن ہو گئے ہیں اسے گئے ہوئے، تم اکیلے سوتے کیسے ہو؟“

بھولو نے صرف اتنا کہا، ”ٹھیک ہے۔“

گامانے پوچھا، ”ٹھیک کیا ہے۔۔۔ جوبات ہے بتاؤ۔ کیا تمہیں پسند نہیں آئی عائشہ؟“

”یہ بات نہیں ہے۔“

”یہ بات نہیں ہے تو اور کیا ہے؟“

بھولو بات گول کر گیا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس کے بھائی نے پھربات چھیڑی۔ بھولو اٹھ کر کوارٹر کے باہر چلا گیا۔ چارپائی پڑی تھی اس پر بیٹھ گیا۔ اندر سے اس کو اپنی بھا بھی کی آواز سنائی دی۔ وہ گاما سے کہہ رہی تھی، ”تم جو کہتے ہو ناکہ بھولو کو عائشہ پسند نہیں، یہ غلط ہے۔“

گاما کی آواز آئی، ”تو اور کیا بات ہے۔۔۔ بھولو کو اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔“

”دلچسپی کیا ہو۔“

”کیوں؟“

گاما کی بیوی کا جواب بھولنے سن سکا مگر اس کے باوجود اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ساری ہستی کسی نے ہاون میں ڈال کر کوٹ دی ہے۔ ایک دم گاما اونچی آواز میں بولا، ”نہیں نہیں۔۔۔ یہ تم سے کس نے کہا؟“

گاما کی بیوی بولی، ”عائشہ نے اپنی کسی سہیلی سے ذکر کیا۔۔۔ بات اڑتی اڑتی مجھ تک پہنچ گئی۔“

بڑی صدمہ زدہ آواز میں گامانے کہا، ”یہ تو بہت برا ہوا!“

بھولو کے دل میں چھری سی پیوست ہو گئی۔ اس کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ اٹھا اور کوٹھے پر چڑھ کر جتنے ٹاٹ گئے تھے اکھیر نے شروع کر دیے۔ کھٹ کھٹ پھٹ پھٹ سن کر لوگ جمع ہو گئے۔ انہوں نے اس کو روکنے کی کوشش کی تو وہ لڑنے لگا۔ بات بڑھ گئی۔ کلن نے بانس اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ بھولو چکر اکر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو اس کا دماغ چل چکا تھا۔

اب وہ الف ننگا، بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے؛ کہیں ٹاٹ لٹکا دیکھتا ہے تو اس کو اتار کر ٹکڑے کر دیتا ہے۔

ظہیر جب تھرڈ ایئر میں داخل ہوا تو ایک دن اس نے محسوس کیا کہ اسے عشق ہو گیا ہے۔۔۔ اور عشق بھی بہت اشد قسم کا جس میں اکثر انسان اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

وہ کالج سے خوش خوش واپس آیا کہ تھرڈ ایئر میں یہ اس کا پہلا دن تھا۔ جو نہیں وہ اپنے گھر میں داخل ہونے لگا، اس نے ایک بر قع پوش لڑکی دیکھی جو ٹانگے میں سے اتر رہی تھی۔۔۔ اس نے ٹانگے میں سے اترتی ہوئی ہزارہا لڑکیاں دیکھی تھیں۔۔۔ مگر وہ لڑکی جس کے ہاتھ میں چند کتابیں تھیں، سیدھی اس کے دل اتر گئی۔ لڑکی نے ٹانگے والے کو کرایہ ادا کیا اور ظہیر کے ساتھ والے مکان میں چلی گئی۔ ظہیر نے سوچنا شروع کر دیا کہ اتنی دیر وہ اس کی موجودگی سے غافل کیسے رہا؟

اصل میں ظہیر آوارہ منش نوجوان نہیں تھا، اس کو صرف اپنی ذات سے دلچسپی تھی۔ صح اٹھے، کالج گئے، یپھر سنے، گھر واپس آئے، کھانا کھایا، تھوڑی دیر آرام کیا، اور آمونختہ میں مصروف ہو گئے۔

یوں تو کالج میں کئی لڑکیاں تھیں اس کی ہم جماعت مگر ظہیر نے کبھی ان سے بات چیت نہیں کی تھی۔ یہ نہیں کہ وہ بڑا روکھا پھیکا انسان تھا۔ اصل میں وہ ہر وقت اپنی پڑھائی میں مشغول رہتا تھا۔ مگر اس روز جب اس نے اس لڑکی کو ٹانگے پر سے اترتے دیکھا تو وہ پولیٹیکل سائنس کا تازہ سبق بالکل بھول گیا۔ خواجہ حافظ کے تمام نئے اشعار کے معانی اس کے ذہن سے پھسل گئے اور وہ ان ہاتھوں کے متعلق سوچنے لگا جن میں کتابیں تھیں۔۔۔ پتلی پتلی سفید انگلیاں۔۔۔ ایک انگلی میں انگوٹھی۔۔۔ دوسرہ ہاتھ جس نے ٹانگے والے کو کرایہ ادا کیا وہ بھی ویسا ہی خوبصورت تھا۔

ظہیر نے اس کی شکل دیکھنے کی کوشش کی، مگر نقاب اتنی موٹی تھی کہ اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ لڑکی تیز تیز قدم اٹھاتی اس کے ساتھ والے مکان میں داخل ہو گئی اور ظہیر کھڑا دیر تک سوچتا رہا کہ اتنا کم فاصلہ ہونے کے باوجود وہ کیوں اس کی موجودگی سے غافل رہا۔

اپنے گھر میں جا کر اس نے پہلا سوال اپنی ماں سے یہ کیا، ”ہمارے پڑوس میں کون رہتے ہیں؟“

اس کی ماں کے لیے یہ سوال بہت تجھب خیز تھا، ”کیوں؟“

”میں نے ایسے ہی پوچھا ہے۔“

اس کی ماں نے کہا، ”مہاجر ہیں، ہماری طرح۔“

ظہیر نے پوچھا، ”کون ہیں، کیا کرتے ہیں؟“

ماں نے جواب دیا، ”باپ بیچاروں کا مرچکا ہے۔۔۔ ماں تھی، وہ عمر کے ہاتھوں معذور ہے۔ اب تین بہنوں اور ایک بھائی ہے۔۔۔ بھائی سب سے بڑا ہے۔ وہی باپ سمجھو، وہی ماں۔۔۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ اس نے اپنی شادی بھی اس لیے نہیں کہ اتنا بوجھ اس کے کاندھوں پر ہے!“

ظہیر کو تین بہنوں کے اس بوجھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جو اس کے اکلوتے بھائی کے کاندھوں پر تھا۔ وہ صرف اس لڑکی کے بارے میں جانتا چاہتا تھا جو ہاتھ میں کتابیں لیے ساتھ دے لے گھر میں داخل ہوئی تھی۔۔۔ یہ تو ظاہر تھا کہ وہ ان تین بہنوں میں سے ایک تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ پنچھے کے نیچے لیٹ گیا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ گرمیوں میں کھانے کے بعد ایک گھنٹے تک ضرور سویا کرتا تھا۔ مگر اس روز اسے نیند نہ آئی۔۔۔ وہ اس لڑکی کے متعلق سوچتا رہا جو اس کے پڑوس میں رہتی تھی۔

کئی دن گزر گئے، مگر ان کی مدد بھیڑ نہ ہوئی۔ کالج سے آکر اس نے سیکڑوں مرتبہ کوٹھے پر گھنٹوں دھوپ میں کھڑے رہ کر اس کی آمد کا انتظار کیا۔ مگر وہ نہ آئی۔۔۔ ظہیر مایوس ہو گیا۔ وہ بہت جلد مایوس ہو جانے والا آدمی تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ سب بیکار ہے۔ مگر عشق کہتا تھا کہ یہ بیکاری ہی سب سے بڑی چیز ہے۔ عشق میں سب سے پہلے عاشق کو اس چیز سے واسطہ پڑتا ہے، جو گھبرایا، وہ گیا۔ چنانچہ ظہیر نے اپنے دل میں عہد کر لیا کہ پہاڑ بھی ٹوٹ پڑیں تو وہ گھبرائے گا نہیں، اپنے عشق میں ثابت قدم رہے گا۔

بہت دنوں کے بعد جب وہ سائیکل پر کالج سے واپس آ رہا تھا، اس نے اپنے آگے ایک ٹانگہ دیکھا، جس میں ایک برقع پوش لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کا قیاس بالکل درست نکلا، کیونکہ یہ وہی لڑکی تھی۔۔۔ ٹانگہ رکا۔۔۔ ظہیر سائیکل پر سے اتر پڑا۔۔۔ لڑکی کے ایک ہاتھ میں کتابیں

تحیں، دوسرے ہاتھ سے اس نے ٹانگے والے کو کرایہ ادا کیا اور چل پڑی مگر ٹانگے والا پکارا، ”اے بی بی جی۔۔۔ یہ کیا دیا تم نے؟“ اس کے لبھ میں بد تیزی تھی۔۔۔ لڑکی رکی، پلت کر اس نے ٹانگے والے کو اپنے بر قع کی نقاب میں سے دیکھا، ”کیوں، کیبات ہے؟“

ٹانگے والا نیچ اتر آیا اور ہتھیلی پر اٹھنی دکھا کر کہنے لگا، ”یہ آٹھ آنے نہیں چلیں گے۔“ لڑکی نے مہین لرزائ آواز میں کہا، ”میں ہمیشہ آٹھ آنے ہی دیا کرتی ہوں۔“ ٹانگے والا بڑا وہیات قسم کا آدمی تھا۔ بولا، ”وہ آپ سے رعایت کرتے ہوں گے۔۔۔ مگر۔۔۔“ یہ سن کر ظہیر کو طیش آگئی، سائیکل چھوڑ کر آگے بڑھا، آؤ دیکھانہ تاو۔۔۔ ایک مکاٹانگے والے کی ٹھوڑی کے نیچ جمادیا، وہ ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ ایک اور اس کی داہنی کنپٹی پر۔۔۔ اس زور کا کہ وہ بلبلہ اٹھا۔

اس کے بعد ظہیر اس لڑکی سے جو ظاہر ہے کہ گھبرائی تھی، مناطب ہوا، ”آپ تشریف لے جائیے، میں اس حر امزادے سے نمٹ لوں گا۔“

لڑکی نے کچھ کہنا چاہا، شاید شکر یے کے الفاظ تھے جو اس کی زبان کی نوک پر آکر واپس چلے گئے۔۔۔ وہ چلی گئی۔۔۔ دس قدم ہی تو تھے، مگر ظہیر کو پورے بیس منٹ اس ٹانگے والے سے منٹنے میں لگے۔ وہ بڑا ہی لچھر قسم کا ٹانگے والا تھا۔ ظہیر بہت خوش تھا کہ اس نے اپنی محبوبہ کے سامنے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا۔ اس نے ٹانگے والے کو خوب پیٹا تھا اور اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ بر قع پوش لڑکی اپنے گھر سے، چنگی کھڑکی کے پیچھے سے اس کو دیکھ رہی ہے۔ یہ دیکھ کر ظہیر نے دو گھونسے اور اس کو چوان کی ٹھوڑی کے نیچ جمادیے تھے۔

اس کے بعد ظہیر سر سے پیر تک اس بر قع پوش کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اس نے اپنی والدہ سے مزید استفسار کیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس لڑکی کا نام یا سمین ہے۔ تین بہنیں ہیں، باپ ان کا مرچکا ہے، ماں زندہ ہے، معمولی سی جائیداد ہے جس کے کرائے پر ان سب کا گزارہ ہو رہا ہے۔

ظہیر کو اپنی معشوقہ کا نام معلوم ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس نے یا سمین کے نام کئی خط کالج میں بیٹھ کر لکھے مگر پھاڑ ڈالے۔ لیکن ایک روز اس نے ایک طویل خط لکھا اور تہیہ کر لیا کہ وہ اس تک ضرور پہنچا دے گا۔

بہت دنوں کے بعد جب کہ ظہیر سائیکل پر کالج سے واپس آ رہا تھا اس نے یا سمین کو ٹانگے میں دیکھا۔ وہ اتر کر جا رہی تھی، لپک کر وہ آگے بڑھا، جیب سے خط نکالا اور ہمت اور جرأت سے کام لے کر اس نے کاغذ اس کی طرف بڑھا دیے۔۔۔ ”یہ آپ کے کچھ کاغذ ٹانگے میں رہ گئے تھے۔“

یا سمین نے وہ کاغذ لے لیے۔۔۔ نقاب کا کپڑا سر سرا یا۔۔۔ ”شکر یا!“

یہ کہہ کرو وہ چلی گئی۔ ظہیر نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس لیے کہ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے خط کا کیا حشر ہونے والا ہے، وہ ابھی اس حشر کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اور ٹانگہ اس کی سائیکل کے پاس رکا، اس میں سے ایک برقع پوش لڑکی اتری۔۔۔ اس نے ٹانگے والے کو کرایہ ادا کیا۔ یہ ہاتھ جس سے کرا یہ ادا کیا گیا تھا، ویسا ہی تھا، جیسا اس لڑکی کا تھا، جس کو پہلی مرتبہ ظہیر نے دیکھا تھا۔

کرا یہ ادا کرنے کے بعد، یہ لڑکی اس مکان میں چلی گئی جہاں یا سمین گئی تھی۔۔۔ ظہیر سوچتا رہ گیا۔ لیکن اس کو معلوم تھا کہ تین بہنیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لڑکی یا سمین کی چھوٹی بہن ہو۔

خط دے کر ظہیر نے یہ سمجھا تھا کہ آدھامید ان مار لیا ہے۔۔۔ پر جب دوسرے روز اسے کانچ جاتے وقت ایک چھوٹے سے لڑکے نے کاغذ کا ایک پر زدہ دیا تو اسے یقین ہو گیا کہ پورا مید ان مار لیا گیا ہے۔ لکھا تھا، ”آپ کا محبت نامہ ملا۔۔۔ جن جذبات کا اظہار آپ نے کیا ہے، اس کے متعلق میں آپ سے کیا کہوں۔۔۔ میں۔۔۔ میں اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکتی۔۔۔ مجھے اپنی لوندی سمجھیے۔“ یہ رقصہ پڑھ کر ظہیر کی باچھیں کھل گئیں۔۔۔ کانچ میں کوئی پیریڈ اٹنڈنہ کیا۔ بس سارا وقت باغ میں گھومتا اور اس رفعے کو پڑھتا رہا۔

دو دن گزر گئے، مگر یا سمین سے ظہیر کی مدد بھیڑنہ ہوئی۔ اس کو بہت کوفت ہو رہی تھی اس لیے کہ اس نے ایک لمبا چوڑا محبت بھر انخط لکھ دیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد اس تک پہنچا دے۔ تیسرے روز آخر کار وہ ظہیر کو ٹانگے میں نظر آئی جب وہ کرا یہ ادا کر رہی تھی، سائیکل ایک طرف گرا کرو آگے بڑھا، اور یا سمین کا ہاتھ پکڑ لیا، ”حضور! یہ آپ کے چند کاغذات ٹانگے میں رہ گئے تھے!“ یا سمین نے ایک جھٹکے۔۔۔ غصے سے بھرے ہوئے جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ چھڑایا اور تیز لبجے میں کہا، ”بد تمیز کہیں کے۔۔۔ شرم نہیں آتی تمہیں؟“

یہ کہہ کرو وہ چلی گئی۔۔۔ اور ظہیر کے محبت بھرے خط کے کاغذ سڑک پر پھر پھر انے لگے۔ وہ سخت حیرت زدہ تھا کہ وہ لڑکی جس نے یہ کہا تھا کہ مجھے اپنی لوندی سمجھیے، اتنی رعونت سے کیوں پیش آئی ہے لیکن پھر اس نے سوچا کہ شاید یہ بھی اندازِ دربانہ ہے۔ دن گزر تے گئے، مگر ظہیر کے دل و دماغ میں یا سمین کے یہ الفاظ ہر وقت گو نجتے رہتے تھے، ”بد تمیز کہیں کے۔۔۔ شرم نہیں آتی تمہیں۔۔۔“ لیکن اس کے ساتھ ہی اس رفعے کے الفاظ یاد آتے جس میں یہ لکھا تھا، ”مجھے اپنی لوندی سمجھیے۔“ ظہیر نے اس دوران میں کئی خط لکھے اور بچاڑا لے،

وہ چاہتا تھا کہ مناسب و موزوں الفاظ میں یا سمین سے کہے کہ اس نے بد تمیز کہہ کر اس کی اور اس کی محبت کی توہین کی ہے۔ مگر اسے ایسے الفاظ نہیں ملتے تھے۔ وہ خط لکھتا تھا مگر جب اسے پڑھتا تو اسے محسوس ہوتا کہ وہ غیر معمولی طور پر درشت ہے۔

ایک دن جب کہ وہ باہر سڑک پر اپنی سائیکل کے اگلے پہیے میں ہوا بھر رہا تھا، ایک لڑکا آیا اور اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ دے کر بھاگ گیا۔ ہوا بھرنے کا پہپہ ایک طرف رکھ کر اس نے لفافہ کھولا، ایک چھوٹا سار قعہ تھا جس میں یہ چند سطریں مرقوم تھیں، ”آپ اتنی جلدی مجھے بھول گئے۔۔۔ محبت کے اتنے بڑے دعوے کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔۔۔ خیر۔۔۔ آپ بھول جائیں تو بھول جائیں۔۔۔ آپ کی کنیز آپ کو کبھی بھول نہیں سکتی۔“ ظہیر چکر اگیا۔۔۔ اس نے یہ رقعہ بار بار پڑھا۔۔۔ سامنے دیکھا تو یا سمین ٹانگے میں سوار ہو رہی تھی۔ سائیکل وہیں لٹا کر وہ اس کی طرف بھاگا۔ ٹانگہ چلنے ہی والا تھا کہ اس نے پاس پہنچ کر یا سمین سے کہا، ”تمہارا رقعہ ملا ہے۔۔۔ خدا کے لیے تم اپنے کو کنیز اور لوڈنڈی نہ کہا کرو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔“ یا سمین کے بر قعہ کی نقاب اچھی۔۔۔ بڑے غصے سے اس نے ظہیر سے کہا، ”بد تمیز کہیں کے۔۔۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔۔۔ میں آج ہی تمہاری ماں سے کہوں گی کہ تم مجھے چھیڑتے ہو۔“

ٹانگہ چل ہی رہا تھا۔۔۔ تھوڑی دیر میں نگاہوں سے او جھل ہو گیا۔۔۔ ظہیر رقعہ ہاتھ میں پکڑے سوچتا رہ گیا کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ مگر پھر اسے خیال آیا کہ معشووقوں کا رو یہ کچھ اس قسم کا ہوتا ہے، وہ سر بازار اس قسم کے مظاہروں کو پسند نہیں کرتے۔ خط و کتابت کے ذریعے ہی سے، کہ یہ ایک خاموش طریقہ ہے، ساری باتیں طے ہو جایا کرتی ہیں۔

چنانچہ اس نے دوسرے روز ایک طویل خط لکھا اور جب وہ کانج سے واپس آ رہا تھا، ٹانگے میں یا سمین کو دیکھا۔ وہ اتر کر کرایہ ادا کر چکی تھی اور گھر کی جانب جا رہی تھی، خط اس کے ہاتھ میں دے دیا۔۔۔ اس نے کوئی احتجاج نہ کیا۔ ایک نظر اس نے اپنے بر قعہ کی نقاب میں سے ظہیر کی طرف دیکھا اور چلی گئی۔ ظہیر نے محسوس کیا تھا کہ وہ اپنی نقاب کے اندر مسکرا رہی تھی۔۔۔ اور یہ بڑی حوصلہ افزایبات تھی۔۔۔ چنانچہ دوسرے روز صبح جب وہ سائیکل نکال کر کانج جانے کی تیاری کر رہا تھا، اس نے یا سمین کو دیکھا۔ شاید وہ ٹانگے والے کا انتظار کر رہی تھی۔۔۔ داہنے ہاتھ میں کتابیں پکڑے تھی، بیاں ہاتھ بھول رہا تھا۔

میدان خالی تھا یعنی اس وقت بازار میں کوئی آمد و رفت نہ تھی۔ ظہیر نے موقعہ غنیمت سمجھا، جرأت سے کام لے کر اس کے پاس پہنچا اور اس کا ہاتھ جو کہ بھول رہا تھا، پکڑ لیا اور بڑے رومانی انداز میں اس سے کہا، ”تم بھی عجیب لڑکی ہو۔۔۔ خطوں میں محبت کا اظہار کرتی ہو اور بات کریں تو گالیاں دیتی ہو۔“ ظہیر نے بمثکل یہ الفاظ ختم کیے ہوں گے کہ یا سمین نے اپنی سینڈل اتار کر اس کے سر پر دھڑادھڑ مارنا شروع کر دی۔ ظہیر بوكھلا گیا۔۔۔ یا سمین نے اس کو بے شمار گالیاں دیں مگر وہ بوكھلا ہٹ کے باعث سن نہ سکا۔ اس خیال سے کہ کوئی دیکھنے

لے، وہ فوراً اپنے گھر کی طرف پلتا۔ سائکل اٹھائی اور قریب تھا کہ اپنی کتابیں وغیرہ اسٹینڈ کے ساتھ جما کر کا لج کارخ کرے کہ مانگنے آیا۔ یا سمین اس میں بیٹھی اور چلی گئی۔ ظہیر نے اطمینان کا سانس لیا۔ اتنے میں ایک اور بر قع پوش لڑکی نمودار ہوئی، اسی گھر میں سے جس میں سے یا سمین نکلی تھی۔۔۔ اس نے ظہیر کی طرف دیکھا اور اس کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔۔۔ مگر ظہیر ڈراہوا تھا۔۔۔ جب لڑکی نے دیکھا کہ ظہیر نے اس کا اشارہ نہیں سمجھا تو وہ اس سے قریب ہو کے گزری اور ایک رقعہ گرا کر چلی گئی۔

ظہیر نے کاغذ کا وہ پر زدہ اٹھایا، اس پر لکھا تھا، ”تم کب تک مجھے یو نہیں بے وقوف بناتے رہو گے۔۔۔؟ تمہاری ماں میری ماں سے کیوں نہیں ملتیں۔۔۔ آج پلازا سینما پر ملو۔ پہلا شو۔۔۔ تمیں بجے۔۔۔ پروین!“

-[28]-

ٹیوں وال کا کتنا: سعادت حسن منتو

کئی دن سے طرفین اپنے اپنے مورچے برجے ہوئے تھے۔ دن میں ادھر اور ادھر سے دس بارہ فائر کیے جاتے جن کی آواز کے ساتھ کوئی انسانی چیز بلند نہیں ہوتی تھی۔ موسم بہت خوشنگوار تھا۔ ہوا خود روپھولوں کی مہک میں بسی ہوئی تھی۔ پہاڑیوں کی اونچائیوں اور ڈھلوانوں پر جنگ سے بے خبر قدرت اپنے مقررہ اشغال میں مصروف تھی۔ پرندے اسی طرح چھپھاتے تھے۔ پھول اسی طرح کھل رہے تھے اور شہد کی سست روکھیاں اسی پرانے ڈھنگ سے ان پر او نگہ او نگہ کرس چوستی تھیں۔

جب پہاڑیوں میں کسی فائر کی آواز گو نجتی تو چھپھاتے ہوئے پرندے چونک کراڑنے لگتے، جیسے کسی کا ہاتھ ساز کے غلط تار سے جا ٹکرایا ہے اور ان کی سماعت کو صدمہ پہنچانے کا موجب ہوا ہے۔ ستمبر کا انعام اکتوبر کے آغاز سے بڑے گلبی انداز میں بغل گیر ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ موسم سرما اور گرمایں صلح صفائی ہو رہی ہے۔ نیلے نیلے آسمان پر دھنکی ہوئی روئی ایسے پتلے پتلے اور ہلکے ہلکے بادلیوں تیرتے تھے جیسے اپنے سفید بجروں میں تفریح کر رہے ہیں۔

پہاڑی مورچوں میں دونوں طرف کے سپاہی کئی دن سے بڑی کوفت محسوس کر رہے تھے کہ کوئی فیصلہ کن بات کیوں و قوع پذیر نہیں ہوتی۔ اکتا کر ان کا جی چاہتا تھا کہ موقع بے موقع ایک دوسرے کو شعر سنائیں۔ کوئی نہ سنے تو ایسے ہی گنگنا تے رہیں۔ پتھر لیلی زمین پر اوندھے یا سیدھے لیٹھے رہتے تھے اور جب حکم ملتا تھا ایک دو فائر کر دیتے تھے۔

دونوں کے مورچے بڑی محفوظ جگہ تھے۔ گولیاں پوری رفتار سے آتی تھیں اور پتھروں کی ڈھال کے ساتھ ٹکراؤ ہیں چت ہو جاتی تھیں۔ دونوں پہاڑیاں جن پر یہ مورچے تھے، قریب قریب ایک قد کی تھیں۔ درمیان میں چھوٹی سی سبز پوش وادی تھی جس کے سینے پر ایک نالہ موٹے سانپ کی طرح لوٹا رہتا تھا۔

ہوائی جہازوں کا کوئی نظر نہیں تھا۔ تو پیش ان کے پاس تھیں نہ ان کے پاس، اس لیے دونوں طرف بے خوف و خطر آگ جلائی جاتی تھیں۔ ان سے دھوکیں اٹھتے اور ہواں میں گھل مل جاتے۔ رات کو چونکہ بالکل خاموشی ہوتی تھی، اس لیے کبھی کبھی دونوں مورچوں کے سپاہیوں کو ایک دوسرے کی کسی بات پر لگائے ہوئے تھے سنائی دے جاتے تھے۔ کبھی کوئی لہر میں آکے گانے لگتا تو اس کی آواز رات کے سنائے کو جگا دیتی۔ ایک کے پیچے ایک بازگشت صدائیں گو نجتیں تو ایسا لگتا کہ پہاڑیاں آموختہ دہرا رہی ہیں۔

چائے کا دور ختم ہو چکا تھا۔ پتھروں کے چولھے میں چیڑ کے ہلکے ہلکے کوئے قریب قریب سرد ہو چکے تھے۔ آسمان صاف تھا۔ موسم میں خنکی تھی۔ ہوا میں پھولوں کی مہک نہیں تھی جیسے رات کو انھوں نے اپنے عطر دان بند کر لیے تھے، البتہ چیڑ کے پسینے یعنی بروزے کی بو تھی مگر یہ بھی کچھ ایسی ناگوار نہیں تھی۔ سب کمبل اور ہے سور ہے تھے، مگر کچھ اس طرح کہ ہلکے سے اشارے پر اٹھ کر لٹنے کے لیے تیار ہو سکتے تھے۔ جعدا رہنم سنگھ خود پہرے پر تھا۔ اس کی راسکوپ گھڑی میں دو بجے تو اس نے گندسا سنگھ کو جگایا اور پہرے پر متعین کر دیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سو جائے، پر جب لیٹا تو آنکھوں سے نیند کو اتنا دور پایا جتنے کہ آسمان کے ستارے تھے۔ جعدا رہنم سنگھ چٹ لیٹا ان کی طرف دیکھتا رہا۔۔۔ اور گنگنا نے لگا۔

جُتی لینی آں ستاریاں والی۔۔۔ ستاریاں والی۔۔۔ وے ہر نام سنگھا
ہو یارا، بھاویں تیری مہیں وک جائے

اور ہر نام سنگھ کو آسمان پر ہر طرف ستاروں والے جو تے بکھرے نظر آئے۔ جو جملہ جملہ کر رہے تھے،

جتی لے دوں ستاریاں والی۔۔۔ ستاریاں والی۔۔۔ نی ہر نام کو رے
ہونا رے، بھاویں میری مہیں وک جائے

یہ گاکرہ مسکرا یا، پھر یہ سوچ کر کہ نیند نہیں آئے گی، اس نے اٹھ کر سب کو جگا دیا۔ نار کے ذکر نے اس کے دماغ میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اوٹ پٹانگ گفتگو ہو، جس سے اس بولی کی ہر نام کوری کیفیت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ بتائیں شروع ہوئیں مگر اکھڑی اکھڑی رہیں۔ بتائیں گھومنگہ جوان سب میں کم عمر اور خوش آواز تھا، ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گیا۔ باقی اپنی بظاہر پر لطف بتائیں کرتے اور جماں یاں لیتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بتائیں گھومنگہ نے ایک دم اپنی پر سوز آواز میں ہیر گانا شروع کر دی۔

ہیر آکھیا جو گیا جھوٹھ بولیں، کون روٹھڑے یار مناؤندائی
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیڑا گیاں نوں موڑ لیا وندائی
اک باز تو کانگ نے کوئی کھوئی دیکھاں چپ ہے کہ کر لاؤندائی
دکھاں والیاں نوں گلاں سکھدیاں فی قصے جوڑ جہان سناؤندائی

پھر تھوڑے وقفے کے بعد اس نے ہیر کی ان بالوں کا جواب راجھے کی زبان میں گایا،

جیڑے باز توں کانگ نے کوئی کھوئی صبر شکر کر باز فناہ ہو یا
اینوں حال ہے اس فقیر دانی دھن مال گیاتے تباہ ہو یا
کریں صدق تے کم معلوم ہو وے تیر ارب رسول گواہ ہو یا
دنیا چھڈا اسیاں پہن لیاں سیدوارثوں ہن وارث شاہ ہو یا

بتائیں گھومنگہ نے جس طرح ایک دم گانا شروع کیا تھا، اسی طرح وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خاکستری پھاڑیوں نے بھی ادیساں پہن لی ہیں۔ جمداد ار ہر نام سنگھے نے تھوڑی دیر کے بعد کسی غیر مریٰ چیز کو موٹی سی گالی دی اور لیٹ گیا۔ دغتارات کے آخری پھر کی اس اداں فضایں کتے کے بھوکنے کی آواز آئی۔ سب چونک پڑے۔ آواز قریب سے آئی تھی۔ صوبیدار ہر نام سنگھے نے بیٹھ کر کہا، ”یہ کہاں سے آگیا بھوگنکو؟“ کتا پھر بھونکا۔ اب اس کی آواز اور بھی نزدیک سے آئی تھی۔ چند لمحات کے بعد دور جھاڑیوں میں آہٹ ہوئی۔ بتا سنگھ اٹھا اور اس کی طرف بڑھا۔ جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک آوارہ سا کتا تھا جس کی دم ہل رہی تھی۔ وہ مسکرا یا، ”جمداد صاحب! میں ہو کمز، ادھر بولا تو کہنے لگا، میں ہوں چڑھن جھن جھن!“

سب ہنئے لگے۔ جمداد ار ہر نام سنگھے نے کتے کو پچکارا، ”ادھر آچڑھن جھن جھن!“

کتابدار ہلاتا ہر نام سنگھ کے پاس چلا گیا اور یہ سمجھ کر کہ شاید کوئی کھانے کی چیز پھینکی گئی ہے، زمین کے پتھر سو نگھنے لگا۔ جمدادار ہر نام سنگھ نے تھیلا کھول کر ایک بسکٹ نکالا اور اس کی طرف پھینکا۔ کتنے اسے سونگھ کر منہ کھوا، لیکن ہر نام سنگھ نے لپک کر اسے اٹھالیا، ”ٹھہر۔ کہیں پاکستانی تو نہیں!“ سب ہنسنے لگے۔ سردار بتا سنگھ نے آگے بڑھ کر کتنے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور جمدادار ہر نام سنگھ سے کہا، ”نہیں جمدادار صاحب، چپڑ جھن جھن ہندوستانی ہے۔“

جمدادار ہر نام سنگھ ہنسا اور کتنے سے مخاطب ہوا، ”نشانی دکھا اوئے؟“ کتابدار ہلانے لگا۔

ہر نام سنگھ ذرا کھل کے ہنسا، ”یہ کوئی نشانی نہیں، دم تو سارے کتنے ہلاتے ہیں۔“

بتا سنگھ نے کتنے کی لرزائی دم پکڑلی، ”شرناہ تھی ہے بے چارا!“

جمدادار ہر نام سنگھ نے بسکٹ پھینکا جو کتنے نے فوراً بوج لیا۔ ایک جوان نے اپنے بوٹ کی ایڑھی سے زمین کھودتے ہوئے کہا، ”اب کتوں کو بھی یا تو ہندوستانی ہونا پڑے گا یا پاکستانی!“ جمدادار نے اپنے تھیلے سے ایک بسکٹ نکالا اور پھینکا، ”پاکستانیوں کی طرح پاکستانی کتنے بھی گولی سے اڑا دیے جائیں گے!“ ایک نے زور سے نعرہ بلند کیا، ”ہندوستان زندہ باد!“ کتاب جو بسکٹ اٹھانے کے لیے آگے بڑھا تھا ذر کے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی دم ٹانگوں کے اندر رکھ گئی۔ جمدادار ہر نام سنگھ ہنسا، ”اپنے نعرے سے کیوں ڈرتا ہے چپڑ جھن جھن۔۔۔ کھا۔۔۔ لے ایک اور لے۔“ اس نے تھیلے سے ایک اور بسکٹ نکال کر اسے دیا۔

باتوں باتوں میں صبح ہو گئی۔ سورج ابھی نکلنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ چار سو جالا ہو گیا۔ جس طرح بہن دبانے سے ایک دم بجلی کی روشنی ہوتی ہے۔ اسی طرح سورج کی شعاعیں دیکھتے ہی دیکھتے ہی اس پہاڑی علاقے میں پھیل گئی جس کا نام ٹیلووال تھا۔ اس علاقے میں کافی دیر سے لڑائی جاری تھی۔ ایک ایک پہاڑی کے لیے درجنوں جوانوں کی جان جاتی تھی، پھر بھی قبضہ غیر یقینی ہوتا تھا۔ آج یہ پہاڑی ان کے پاس ہے، کل دشمن کے پاس، پرسوں پھر ان کے قبضے میں اس سے دوسرے روز وہ پھر دوسروں کے پاس چلی جاتی تھی۔

صوبیدار ہر نام سنگھ نے دور میں لگا کر آس پاس کا جائزہ لیا۔ سامنے پہاڑی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ چائے وغیرہ تیار ہو رہی ہے، ادھر بھی ناشتے کی فکر ہو رہی تھی۔ آگ سلاگائی جا رہی تھی۔ ادھر والوں کو بھی یقیناً ادھر سے دھواں اٹھتا دکھائی دے رہا

تھا۔ ناشتے پر سب جوانوں نے تھوڑا تھوڑا کئے کو دیا جس کو اس نے خوب پیٹ بھر کے کھایا۔ سب اس سے دلچسپی لے رہے تھے جیسے وہ اس کو اپنادوست بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے آنے سے کافی چہل پہل ہو گئی تھی۔ ہر ایک اس کو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پکار کر ”چپڑ جھن جھن“ کے نام سے پکارتا اور اسے پیار کرتا۔

شام کے قریب دوسری طرف پاکستانی مورپے میں صوبیدار ہمت خان اپنی بڑی بڑی موچھوں کو جن سے بے شمار کہانیاں وابستہ تھیں، مردڑے دے کر ٹیڈوال کے نقشے کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وائر لیں آپریٹر بیٹھا تھا اور صوبیدار ہمت خان کے لیے پلاٹون کمانڈر سے ہدایات وصول کر رہا تھا۔ کچھ دور ایک پتھر سے ٹیک لگائے اور اپنی بندوق لیے بیشہ ہولے ہولے گنگنا رہا تھا۔

چن کتھے گوائی آئی رات وے۔۔۔ چن کتھے گوائی آئی

بیشیر نے مزے میں آکر ذرا اوپنی آواز کی تو صوبیدار ہمت خان کی کڑک بلند ہوئی، ”اوئے کہاں رہا ہے تو رات بھر؟“ بیشیر نے سوالیہ نظر وہ سے ہمت خان کو دیکھنا شروع کیا۔ جو بیشیر کے بجائے کسی اور سے مخاطب تھا۔ ” بتا اوئے۔“ بیشیر نے دیکھا۔ کچھ فاصلے پر وہ آوارہ کتا بیٹھا تھا جو کچھ دن ہوئے ان کے مورپے میں بن بلائے مہمان کی طرح آیا تھا اور وہیں نکل گیا تھا۔ بیشیر مسکرا یا اور کتے سے مخاطب ہو کر بولا، ”چن کتھے گوائی آئی رات وے۔۔۔ چن کتھے گوائی آئی؟ کتنے نے زور سے دم ہلانا شروع کر دی جس سے پتھر ملی زمین پر جھاڑو سی پھرنے لگی۔

صوبیدار ہمت خان نے ایک کنکراٹھا کر کتے کی طرف پھیکا، ”سالے کو دم ہلانے کے سوا اور کچھ نہیں آتا!“ بیشیر نے ایک دم کتے کی طرف غور سے دیکھا، ”اس کی گردن میں کیا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ اٹھا، مگر اس سے پہلے ایک اور جوان نے کتے کو پکڑ کر اس کی گردن میں بندھی ہوئی۔ رسی اتاری۔ اس میں گتے کا ایک ٹکڑا پر ویا ہوا تھا۔ جس پر کچھ لکھا تھا۔ صوبیدار ہمت خان نے یہ ٹکڑا لیا اور اپنے جوانوں سے پوچھا، ”لندے ہیں، جانتا ہے تم میں سے کوئی پڑھنا۔“ بیشیر نے آگے بڑھ کر گتے کا ٹکڑا لیا، ”ہا۔۔۔ کچھ کچھ پڑھ لیتا ہوں۔“ اور اس نے بڑی مشکل سے حرف جوڑ جوڑ کر یہ پڑھا،

”چپ۔۔۔ چپ۔۔۔ جھن جھن۔۔۔ چپ جھن جھن۔۔۔ یہ کیا ہوا؟“

صوبیدار ہمت خان نے اپنی بڑی تاریخی مونچھوں کو زبردست مرور ڈھونڈا، ”کوڈور ڈھونڈا کوئی۔“ پھر اس نے بشیر سے پوچھا، ”کچھ اور لکھا ہے بشیرے؟“ بشیر نے جو حروف شناسی میں مشغول تھا، جواب دیا، ”جی ہاں۔۔۔ یہ۔۔۔ ہند۔۔۔ ہندوستانی۔۔۔ یہ ہندوستانی کتاب ہے!“ صوبیدار ہمت خان نے سوچنا شروع کیا۔ ”مطلوب کیا ہوا اس کا؟ کیا پڑھا تھام نے۔۔۔ چپڑ؟“ بشیر نے جواب دیا، ”چپڑ جھن جھن!“

ایک جوان نے بڑے عاقلانہ انداز میں کہا، ”جبات ہے اسی میں ہے۔“ صوبیدار ہمت خان کو یہ بات معقول معلوم ہوئی، ”ہاں کچھ ایسا لگتا ہے۔“ بشیر نے گتے پر لکھی ہوئی عبارت پڑھی، ”چپڑ جھن جھن۔۔۔ یہ ہندوستانی کتاب ہے!“ صوبیدار ہمت خان نے وائز لیس سیٹ لیا اور کانوں پر ہیڈ فون جا کر پلاٹون کمانڈر سے خود اس کتبے کے بارے میں بات چیت کی۔ وہ کیسے آیا تھا۔ کس طرح ان کے پاس کئی دن پڑا رہا، پھر ایک ایک غائب ہو گیا اور رات بھر غائب رہا۔ اب آیا ہے تو اس کے گلے میں رسی نظر آئی جس میں گتے کا ایک ٹکر اتھا۔ اس پر جو عبارت لکھی تھی وہ اس نے تین چار مرتبہ دھرا کر پلاٹون کمانڈر کو سنائی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

بشیر الگ کتے کے پاس بیٹھ کر اسے کبھی پہکار کر، کبھی ڈرادھم کا کرپوچھتا رہا کہ وہ رات کہاں غائب رہا تھا اور اسکے لگے میں وہ رسی اور گتے کا ٹکڑا کس نے باندھا تھا مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ وہ جو سوال کرتا، اس کے جواب میں کتنا اپنی دم ہلا دیتا۔ آخر غصے میں آکر بشیر نے اسے کپڑا لیا اور زور سے جھکا دیا۔ کتنا تکلیف کے باعث چاؤں چاؤں کرنے لگا۔ وائز لیس سے فارغ ہو کر صوبیدار ہمت خان نے کچھ درست نہیں کاغذ کا بغور مطالعہ کیا پھر فیصلہ کن انداز میں اٹھا اور سکریٹ کی ڈبیا کاڑھکنا کھوں کر بشیر کو دیا۔ ”بشیرے، لکھ اس پر گور کھی میں۔۔۔ ان کیڑے مکوڑوں میں۔۔۔“

بشیر نے سگرٹ کی ڈبیا کا گتا لیا اور پوچھا، ”کیا لکھوں صوبیدار صاحب؟“ صوبیدار ہمت خان نے مونچھوں کو مرور دے کر سوچنا شروع کیا، ”لکھ دے۔۔۔ بس لکھ دے!“ یہ کہہ اس نے جیب سے پنسل نکال کر بشیر کو دی، ”کیا لکھنا چاہیے؟“ بشیر پنسل کے منہ کو لب لگا کر سوچنے لگا۔ پھر ایک دم سوالیہ انداز میں بولا، ”سپڑ سن سن؟“ لیکن فوراً ہی مطمئن ہو کر اس نے فیصلہ کن لمحے میں کہا، ”ٹھیک ہے۔۔۔ چپڑ جھن جھن کا جواب سپڑ سن سن ہی ہو سکتا ہے۔۔۔ کیا یاد رکھیں گے اپنی ماں کے سکھڑے۔“

بشیر نے پنسل سگرٹ کی ڈبیا پر جمائی۔ ”سپڑ سن سن؟“

”سولہ آنے۔۔۔ لکھ۔۔۔ سب۔۔۔ پڑ۔۔۔ سن سن!“ یہ کہہ کر صوبیدار ہمت خاں نے زور کا تھوہہ لگایا، ”اور آگے لکھ۔۔۔ یہ پاکستانی کتا ہے!“ صوبیدار ہمت خاں نے گتابشیر کے ہاتھ سے لیا۔ پنسل سے اس میں ایک طرف چھید کیا اور رسی میں پرو کرتے کی طرف بڑھا، ”لے جا، یہ اپنی اولاد کے پاس!“ یہ سن کر سب خوب ہنسے۔ صوبیدار ہمت خاں نے کتے کے گلے میں رسی باندھ دی۔ وہ اس دوران میں اپنی دم ہلاتا رہا۔ اس کے بعد صوبیدار نے اسے کچھ کھانے کو دیا اور بڑے ناصحانہ انداز میں کہا۔ ”دیکھو دوست غداری مت کرنا۔۔۔ یاد رکھو غدار کی سزا موت ہوتی ہے!“

کتاب دم ہلاتا رہا۔ جب وہ اچھی طرح کھا چکا تو صوبیدار ہمت خاں نے رسی سے کپڑ کر اس کا رخ پہاڑی کی اکلوتی گڈنڈی کی طرف پھیرا اور کہا، ”جاو۔۔۔ ہمارا خط دشمنوں تک پہنچا دو۔۔۔“ مگر دیکھوا اپس آجائنا۔۔۔ یہ تمہارے افسر کا حکم ہے سمجھے؟“ کتنے نے اپنی دم ہلاتی اور آہستہ آہستہ پلٹنڈی پر جو بل کھاتی ہوئے نیچ پہاڑی کے دامن میں جاتی تھی، چلنے لگا۔ صوبیدار ہمت خاں نے اپنی بندوق اٹھائی اور ہوا میں ایک فائر کیا۔

فائر اور اس کی بازگشت دوسری طرف ہندوستانیوں کے مورپھے میں سنی گئی۔ اس کا مطلب ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ جمعدار ہر نام سنگھ معلوم نہیں کس بات پر چڑھا ہو رہا تھا، یہ آواز سن کر اور بھی چڑھا ہو گیا۔ اس نے فائر کا حکم دے دیا۔ آدھے گھنٹے تک چنانچہ دونوں مورچوں سے گولیوں کی پیکار بارش ہوتی رہی۔ جب اس شغل سے اکتا گیا تو جمعدار ہر نام سنگھ نے فائر بند کر دیا اور داڑھی میں سنگھا کرنا شروع کر دیا۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے جالی کے اندر سارے بال بڑے سلیقے سے جمائے اور بتا سنگھ سے پوچھا، ”اوئے بتاں سیاں! چڑھن جھن کھاں گیا؟“

بتا سنگھ نے چڑھ کی خشک لکڑی سے بروزہ اپنے ناخنوں سے جدا کرتے ہوئے کہا، ”مجھے نہیں معلوم۔“

”کتنے کو گھی ہضم نہیں ہوا؟“ ہر نام سنگھ نے کہا۔ بتا سنگھ اس محاورے کا مطلب نہ سمجھا، ”ہم نے تو اسے گھی کی کوئی چیز نہیں کھلائی تھی۔“ یہ سن کر جمعدار ہر نام سنگھ بڑے زور سے ہنسا، ”اوئے ان پڑھ اتیرے ساتھ تو بات کرنا پچاونیں کا گھاٹا ہے!“

اتنے میں وہ سپاہی جو پھرے پر تھا اور دور میں لگائے ادھر سے ادھر دیکھ رہا تھا، ایک دم چلا یا، ”وہ۔۔۔ وہ آرہا ہے!“ سب چونک پڑے۔ جمعدار ہر نام سنگھ نے پوچھا، ”کون؟“ پھرے کے سپاہی نے کہا، ”کیا نام تھا اس کا۔۔۔؟ چڑھن جھن جھن!“

”چپر جھن جھن؟“ یہ کہہ کر جمعدارہ نام سنگھ اٹھا۔ ”کیا کر رہا ہے؟“ پھرے کے سپاہی نے جواب دیا، ”آ رہا ہے۔“ جمعدارہ نام سنگھ نے دور میں اس کے ہاتھ میں لی اور دیکھنا شروع کیا۔ ”ادھر ہی آ رہا ہے۔۔۔ رسمی بندھی ہوئی ہے گلے میں۔۔۔ لیکن۔۔۔ یہ تو ادھر سے آ رہا ہے دشمن کے مورچے سے۔“ یہ کہہ کر اس نے کتے کی ماں کو بہت بڑی گالی دی۔ اس کے بعد اس نے بندوق اٹھائی اور شست باندھ کر فائز کیا۔ نشان چوک گیا۔ گولی کتے سے کچھ فاصلے پر پتھروں کی کرچیں اڑاتی زمین میں دفن ہو گئی۔ وہ سہم کر رک گیا۔

دوسرے مورچے میں صوبیدار ہمت خاں نے دور میں میں سے دیکھا کہ کتا گڈنڈی پر کھڑا ہے۔ ایک اور فائز ہوا تو وہ دم دبا کر الٹی طرف بھاگا۔ صوبیدار ہمت خاں کے مورچے کی طرف۔ وہ زور سے پکارا، ”بہادر ڈرانہیں کرتے۔۔۔ چل واپس۔“ اور اس نے ڈرانے کے لیے ایک فائز کیا۔ کتابک گیا۔ ادھر سے جمعدارہ نام سنگھ نے بندوق چلائی۔ گولی کتے کے کان سے سنساتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے اچھل کر زور زور سے دونوں کان پھٹ پھٹانے شروع کیے۔ ادھر سے صوبیدار ہمت خاں نے دوسرا فائز کیا جو اس کے اگلے پنجوں کے پاس پتھروں میں پیوست ہو گیا۔ بوکھلا کر کبھی وہ ادھر دوڑا، کبھی ادھر۔ اس کی اس بوکھلاہٹ سے ہمت خاں اور ہر نام دونوں مسرور ہوئے اور خوب قبیلہ لگاتے رہے۔ کتے نے جمعدارہ نام سنگھ کے مورچے کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ اس نے یہ دیکھا تو بڑے تاؤ میں آ کر موٹی سی گالی دی اور اچھی طرح شست باندھ کر فائز کیا۔ گولی کتے کی ٹانگ میں لگی۔ ایک فلک شگاف چیخ بلند ہوئی۔ اس نے اپنارخ بدلا۔ لنگڑا لنگڑا کر صوبیدار ہمت خاں کے مورچے کی طرف دوڑنے لگا تو ادھر سے بھی فائز ہوا، مگر وہ صرف ڈرانے کے لیے کیا گیا تھا۔ ہمت خاں فائز کرتے ہی چلایا، ”بہادر پروانہیں کیا کرتے زخموں کی۔۔۔ کھیل جاؤ اپنی جان پر۔۔۔ جاؤ۔۔۔ جاؤ!“

کتاب فائز سے گھبرا کر ٹڑا۔ ایک ٹانگ اس کی بالکل بیکار ہو گئی تھی۔ باقی تین ٹانگوں کی مدد سے اس نے خود کو چند قدم دوسری جانب گھسیتاک جمعدارہ نام سنگھ نے نشانہ تاک کر گولی چلائی جس نے اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔

صوبیدار ہمت خاں نے افسوس کے ساتھ کہا، ”پیچ پیچ۔۔۔ شہید ہو گیا بے چارہ!“

جمعدارہ نام سنگھ نے بندوق کی گرم گرم نالی اپنے ہاتھ میں لی اور کہا، ”وہی موت مراجو کتے کی ہوتی ہے!“

جاوید مسعود سے میر اتنا گھر ادواتیہ تھا کہ میں ایک قدم بھی اس کی مرضی کے خلاف اٹھانیں سکتا تھا۔ وہ مجھ پر ثار تھا میں اس پر۔ ہم ہر روز قریب دس بارہ گھنٹے ساتھ ساتھ رہتے۔

وہ اپنے رشتے داروں سے خوش نہیں تھا اس لیے جب بھی وہ بات کرتا تو کبھی اپنے بڑے بھائی کی برائی کرتا اور کہتا سگ باش برادر خورد مباش اور کبھی کبھی گھنٹوں خاموش رہتا جیسے خلاء میں دیکھ رہا ہے۔ میں اس کے ان لمحات سے تنگ آ کر جب زور سے پکارتا، ”جاوید یہ کیا بے ہودگی ہے؟“

وہ ایک دم چوکتا اور معذرت کرتا اور۔۔۔ سعادت بھائی معاف کرنا۔۔۔ اچھا تو پھر کیا ہوا؟“

وہ اس وقت بالکل خالی الذہن ہوتا۔۔۔ میں کہتا، ”بھائی جاوید دیکھو۔۔۔ مجھے تمہارا یہ وقار فتا معلوم نہیں کہ گھر ایوں میں کھو جانا بالکل پسند نہیں۔۔۔ مجھے تؤڑ لگتا ہے۔۔۔ ایک دن تم پاگل ہو جاؤ گے۔ یہ سن کر جاوید بہت ہنسا، ”پاگل ہونا بہت مشکل ہے سعادت۔“ لیکن آہستہ آہستہ اس کا خلاعیں دیکھنا بڑھتا گیا اور اس کی خاموشی طویل سکوت میں تبدیل ہو گئی اور وہ پیاری سی مسکراہٹ جو اس کے ہونٹوں پر ہر وقت کھلیتی رہتی تھی بالکل پھیکی پڑ گئی۔

میں نے ایک دن اس سے پوچھا، ”آخر بات کیا ہے تم ٹھہرے پانی بن گئے ہو۔۔۔ ہوا کیا ہے تمھیں۔۔۔؟ میں تمہارا دوست ہوں۔۔۔ خدا کے لیے مجھ سے تو اپنا راز نہ چھپاؤ۔“ جاوید خاموش رہا۔ جب میں نے اس کو بہت لعن طعن کی تو اس نے اپنی زبان کھولی، ”میں کا لج سے فارغ ہو کر ڈیڑھ بجے کے قریب آؤں گا۔ اس وقت تمھیں جو پوچھنا ہو گا بتا دوں گا۔“

وعدے کے مطابق وہ ٹھیک ڈیڑھ بجے میرے یہاں آیا۔ وہ مجھ سے چار سال چھوٹا تھا۔ بے حد خوبصورت۔ اس میں نسوانیت کی جھلک تھی۔ پڑھائی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے میں آوارہ گرد تھا لیکن وہ باقاعدگی کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میں اس کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ جب میں نے اس کو سکریٹ پیش کیا تو اس نے مجھ سے کہا، ”تم میرے روگ کے متعلق پوچھنا چاہتے تھے؟“ میں نے کہا، ”مجھے معلوم نہیں روگ ہے یا سوگ، بہر حال تم نارمل حالت میں نہیں ہو۔۔۔ تمھیں کوئی نہ کوئی تکلیف ضرور ہے۔“ وہ مسکرا یا، ”ہے۔۔۔ اس لیے کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔“

محبت---! میں بوکھلا گیا۔۔۔ جاوید کی عمر بمشکل اٹھارہ برس کی ہو گی۔۔۔ وہ خود ایک خوب رو لڑکی کی مانند تھا۔ اس کو کس لڑکی سے محبت ہو سکتی ہے، یا ہو گئی ہے۔ وہ تو کنواری لڑکیوں سے کہیں زیادہ شر میلا اور چکیلا تھا۔ وہ مجھ سے با تین کرتاتو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ ایک دہقانی دوشیزہ ہے جس نے پہلی دفعہ کوئی عشقیہ فلم دیکھا ہے۔ آج وہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔ میں نے پہلے سمجھا شاید مذاق کر رہا ہے مگر اس کا چہرہ بہت سنجیدہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ فکر کی اتحاہ گہرا یوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ آخر میں نے پوچھا، ”کس لڑکی سے محبت ہو گئی ہے تمھیں؟“

اس نے کوئی جھینپ محسوس نہ کی، ”ایک لڑکی ہے زاہدہ۔۔۔ ہمارے پڑوس میں رہتی ہے، بس اس سے محبت ہو گئی ہے۔ عمر سولہ برس کے قریب ہے، بہت خوبصورت ہے اور بھولی بھالی۔۔۔ چوری چھپے اس سے کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں، اس نے میری محبت قبول کر لی ہے۔“ میں نے اس سے پوچھا، ”تو پھر اس اداسی کا مطلب کیا ہے جو تم پر ہر وقت چھائی رہتی ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا، ”سعادت تم نے کبھی محبت کی ہو تو جانو۔۔۔ محبت اداسی کا دوسرا نام ہے۔۔۔ ہر وقت آدمی کھویا کھویا سارہ تاہے، اس لیے کہ اس کے دل و دماغ میں صرف خیال یار ہوتا ہے۔۔۔ میں نے زاہدہ سے تمہارا ذکر کیا اور اس سے کہا کہ تمہارے بعد اگر کوئی ہستی مجھے عزیز ہے تو وہ میرا دوست سعادت ہے۔“ ”یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”بس، میں نے کہہ دیا۔۔۔ اور زاہدہ نے بڑا اشتیاق ظاہر کیا کہ میں تمھیں اس سے ملاوں۔ اسے میری وہ چیز پسند ہے جسے میں پسند کرتا ہوں۔۔۔ بولو، چلو گے اپنی بھابی کو دیکھئے؟“ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اس سے کیا کھوں، اس کے پتلے پتلے نازک ہونٹوں پر لفظ بھابی سمجھا نہیں تھا۔

”میری بات کا جواب دو۔“

میں نے سرسری طور پر کہہ دیا، ”چلیں گے۔۔۔ ضرور چلیں گے۔۔۔ پر کہاں؟“

”اس نے مجھ سے کہا تھا کہ کل وہ شام کو پانچ بجے کسی بہانے سے لارنس گارڈن آئے گی۔۔۔ آپ اپنے پیارے دوست کو ضرور ساتھ لایئے گا۔۔۔ اب تم کل تیار رہنا۔۔۔ بلکہ خود ہی پانچ بجے سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جانا۔ ہم جم خانہ کلب کے اس طرف لان میں تمہارا انتظار کرتے ہوں گے۔“ میں انکار کیسے کرتا، اس لیے کہ مجھے جاوید سے بے حد پیار تھا۔ میں نے وعدہ کر لیا لیکن مجھے اس پر کچھ ترس آرہا تھا۔ میں نے اس سے اچانک پوچھا، ”لڑکی شریف اور پاکباز ہے نا؟“

جاوید کا چہرہ غصے سے تختمانے لگا، ”میں زاہدہ کے بارے میں ایسی باتیں سوچ سکتا ہوں نہ سن سکتا ہوں۔۔۔ تمھیں اگر اس سے ملنا ہے تو کل شام کو ٹھیک پانچ بجے لارنس گارڈن پہنچ جانا۔۔۔ خدا حافظ۔“ جب وہ ایک دم اٹھ کر چلا گیا تو میں نے سوچنا شروع کیا۔ مجھے بڑی ندامت محسوس ہوئی کہ میں نے کیوں اس سے ایسا سوال کیا جس سے اس کے جذبات مجرور ہوئے۔۔۔ آخر وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ اگر کوئی لڑکی کسی سے محبت کرے تو ضروری نہیں وہ بد کردار ہو۔ جاوید مجھے اپنا مخلص ترین دوست یقین کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ ناراضی کے باوجود مجھ سے بہم نہ ہوا اور مجھ کو جاتے ہوئے کہہ گیا کہ وہ شام کو لارنس گارڈن آئے۔

میں سوچتا تھا کہ زاہدہ سے مل کر میں اس سے کس قسم کی باتیں کروں گا۔ بے شمار باتیں میرے ذہن میں آئیں لیکن وہ اس قابل نہیں تھیں کہ کسی دوست کی محبوبہ سے کی جائیں۔ میرے متعلق خدا معلوم وہ اس سے کیا کچھ کہہ چکا تھا۔۔۔ یقیناً اس نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار بڑے والہانہ طور پر کیا ہو گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زاہدہ کے دل میں میری طرف سے حسد پیدا ہو گیا ہو کیونکہ عورتیں اپنے عاشقوں کی محبت بیٹھنہیں دیکھ سکتیں۔ شاید میرا مذاق اڑانے کے لیے اس نے جاوید سے کہا ہو کہ تم مجھے اپنے پیارے دوست سے ضرور ملاؤ۔

بہر حال مجھے اپنے عزیز ترین دوست کی محبوبہ سے ملنا تھا۔۔۔ اس تقریب پر میں نے سوچا، کوئی تختہ تو لے جانا چاہیے۔۔۔ رات بھر غور کرتا رہا۔ آخر ایک تخفہ سمجھ میں آیا کہ سونے کے ٹالپن ٹھیک رہیں گے۔ انارکلی میں گیا تو سب دکانیں بند، معلوم ہوا کہ اتوار کی تعطیل ہے۔۔۔ لیکن ایک جو ہری کی دکان کھلی تھی۔ اس سے ٹالپن خریدے اور واپس گھر آیا۔ چار بجے تک شش و پنج میں بتلارہا کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ مجھے کچھ حجاب سا محسوس ہو رہا تھا۔۔۔ لڑکوں سے بے تکلف باتیں کرنے کا میں عادی نہیں تھا اس لیے مجھ پر گھبرائٹ کا عالم طاری تھا۔

دوپھر کا کھانا کھانے کے بعد میں نے کچھ دیر سونا چاہا مگر کروٹیں بدلتا رہا۔ ٹالپن میرے تکیے کے نیچے پڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ دودھ کتھے ہوئے انگارے ہیں۔۔۔ اٹھا۔۔۔ غسل کیا۔۔۔ اس کے بعد شیو۔۔۔ پھر نہایا اور کپڑے بدلتے کمرے میں کلاک کی تکلیف سننے لگا۔ تین نجھے چکے تھے۔ اخبار اٹھایا۔۔۔ مگر اس کی ایک خبر بھی نہ پڑھ سکا۔۔۔ عجب مصیبت تھی۔ عشق میرا دوست جاوید کر رہا تھا اور میں ایک قسم کا جنزوں بن گیا تھا۔ میرا بہترین سوت رینکن کا سلا ہوا میرے بدن پر تھا۔ رومال نیا، شو بھی نئے۔۔۔ میں نے یہ سلگھار اس لیے کیا تھا کہ جاوید نے جو تعریف کے پل زاہدہ کے سامنے باندھے ہیں کہیں ٹوٹ نہ جائیں۔ ساڑھے چار بجے میں اٹھا۔ اپنی ریلے کی سبز سائیکل لی اور آہستہ آہستہ لارنس گارڈن روانہ ہو گیا۔

جم خانہ کلب کے اس طرف لان میں مجھے جاوید کھائی دیا۔ وہ اکیلا تھا، اس نے زور کا نعرہ بلند کیا۔ میں جب سائیکل پر سے اتر تو وہ میرے ساتھ چھٹ گیا، کہنے لگا، ”تم پہلے ہی پہنچ گئے بہت اچھا کیا۔۔۔ زاہدہ اب آتی ہی ہو گی۔۔۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں اپنی کار بھیج دوں گا مگر وہ رضامند نہ ہوئی۔ تانگے میں آئے گی۔“

جاوید کے باپ کی ایک کار تھی۔ بے بی آسٹن۔ خدا معلوم کس صدی کا ماڈل تھا۔ زیادہ تر یہ جاوید ہی کے استعمال میں آتی تھی۔ لارنس گارڈن میں داخل ہوتے وقت یہ عجوبہ روز گار موڑ دیکھی تھی۔ میں نے اس سے کہا، ”آؤ بیٹھ جائیں۔“ لیکن وہ رضامند نہ ہوا۔ مجھ سے کہنے لگا، ”تم ایسا کرو۔۔۔ باہر گیٹ پر جاؤ۔۔۔ ایک تانگہ آئے گا، جس میں ایک دبی تپلی لڑکی سیاہ بر قع پہنے ہو گی۔ تم تانگے والے کو ٹھہرالینا اور اس سے کہنا، ”جاوید کا دوست سعادت ہوں۔۔۔ اس نے مجھے تمہارے استقبال کے لیے بھیجا ہے۔“

نہیں جاوید۔۔۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں۔“

”لا حول ولا۔۔۔ جب تم نام بتادو گے تو اسے چوں کرنے کی بھی جرأت نہیں ہو گی۔۔۔ تمہاری جرأت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔۔۔ یا، زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی چیز ہونی چاہیے جسے بعد میں یاد کر کے آدمی محفوظ ہو سکے۔۔۔ جب زاہدہ سے میری شادی ہو جائے گی تو ہم آج کے اس واقعے کو یاد کر کے خوب ہنسا کریں گے۔۔۔ جاؤ میرے بھائی۔۔۔ وہ بس اب آتی ہی ہو گی۔“ میں جاوید کا کہنا کیسے موڑ سکتا تھا۔ بادل نخواستہ چلا گیا اور گیٹ سے کچھ دور کھڑا رہ کر اس تانگے کا انتظار کرنے لگا جس میں زاہدہ اکیلی کالے بر قعے میں ہو۔ آدھے گھنٹے کے بعد ایک تانگہ اندر داخل ہوا جس میں ایک لڑکی کالے ریشمی بر قعے میں ملبوس پچھلی نشست پر تانگیں پھیلائے بیٹھی تھی۔

میں جھینپتا، سمٹتا، ڈرتا آگے بڑھا اور تانگے والے کو روکا۔ اس نے فوراً اپنا تانگہ روک لیا۔ میں نے اس سے کہا، ”یہ سواری کہاں سے آئی ہے؟“

تانگے والے نے ذرا سختی سے جواب دیا، ”تمھیں اس سے کیا مطلب۔۔۔ جاؤ اپنا کام کرو۔“ بر قع پوش لڑکی نے مہین سی آواز میں تانگے والے کو ڈالنا، ”تم شریف آدمیوں سے بات کرنا بھی نہیں جانتے۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی، ”آپ نے تانگہ کیوں روکا تھا جناب؟“ میں نے ہکلا کے جواب دیا، ”جاوید۔۔۔ جاوید۔۔۔ میں جاوید کا دوست سعادت ہوں۔۔۔ آپ کا نام زاہدہ ہے نا۔“ اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا، ”جی ہاں! میں آپ کے متعلق ان سے بہت سی باتیں سن چکی ہوں۔“

”اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے اسی طرح ملوں اور دیکھوں کہ آپ مجھ سے کس طرح پیش آتی ہیں۔۔۔ وہ ادھر جم خانہ کلب کے پاس گھاس کے تختے پر بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا ہے۔“ اس نے اپنی نقاب اٹھائی، اچھی خاصی شکل صورت تھی۔ مسکرا کر مجھ سے کہا، ”آپ اگلی نشست پر بیٹھ جائیے، مجھے ایک ضروری کام ہے، ابھی چند منٹوں میں لوٹ آئیں گے، آپ کے دوست کو زیادہ دیر تک گھاس پر نہیں بیٹھنا پڑے گا۔

میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اگلی نشست پر کوچوان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ تانگہ اسمبلی ہال کے پاس سے گزرا تو میں نے تانگے والے سے کہا، ”بھائی صاحب! یہاں کوئی سُگرٹ والے کی دکان ہو تو ذرا دیر کے لیے ٹھہر جانا، میرے سُگرٹ ختم ہو گئے ہیں۔“

ذرا آگے بڑھے تو سڑک پر ایک سُگرٹ پان والا بیٹھا تھا۔ تانگے والے نے اپنا تانگہ روکا۔ میں اتر اتو زاہدہ نے کہا آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔۔۔ یہ تانگے والے آئے گا۔ ”میں نے کہا، ”اس میں تکلیف کی کیا بات ہے؟“ اور اس پان سُگرٹ والے کے پاس پہنچ گیا۔ ایک ڈبی گولڈ فلیک کی لی، ایک ماچس اور دو پان۔ جب پانچ کے نوٹ سے باقی پیسے لے کر مڑا تو کوچوان میرے چیچے کھڑا تھا، اس نے دبی زبان میں مجھ سے کہا، ”حضور اس عورت سے نج کے رہیے گا۔“

میں بڑا حیران ہوا، ”کیوں؟“

کوچوان نے بڑے وثوق سے کہا، ”فاحشہ ہے۔۔۔ اس کا کام ہی یہی ہے کہ شریف اور نوجوان لڑکوں کو پہنچتی رہے۔۔۔ میرے تانگے میں اکثر بیٹھتی ہے۔“

یہ سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے تانگے والے سے کہا، ”خدا کے لیے تم اسے وہیں چھوڑ آؤ جہاں سے لائے ہو، کہہ دینا کہ میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا اس لیے کہ میرا دوست وہاں لارنس گارڈن میں انتظار کر رہا ہے۔“ تانگے والا چلا گیا۔۔۔ معلوم نہیں اس نے زاہدہ سے کیا کہا۔ میں نے ایک دوسرا تانگہ لیا اور سید حالارنس گارڈن پہنچا، دیکھا جاوید ایک خوبصورت لڑکی سے مونگفتگو ہے۔ وہ بڑی شر میلی اور بیکھلی تھی۔ میں جب پاس آیا تو اس نے فوراً اپنے دوپٹہ سے منہ چھپا لیا۔

جاوید نے بڑی خفگی آمیز لمحے میں مجھ سے کہا، ”تم کہاں غارت ہو گئے تھے؟ تمہاری بھابی کب کی آئی بیٹھی ہیں۔“ سمجھ میں نہ آیا کیا کہوں۔۔۔ سخت بوکھلا ہٹ میں یہ کہہ گیا، ”تو وہ کون تھیں جو مجھے تانگے میں ملیں؟“ جاوید نہ کرو مجھ سے۔۔۔ بیٹھ جاؤ اور اپنی بھابی سے بتیں کرو، یہ تم سے ملنے کی بہت مشتاق تھیں۔“

میں بیٹھ گیا اور کوئی سلیقے کی بات نہ کر سکا اس لیے کہ میرے دل و دماغ پر وہ لڑکی یا عورت مسلط ہو گئی تھی جس کے متعلق تانگے والے نے مجھے بڑے غلوص سے بتا دیا تھا کہ فاحشہ ہے۔

-[30]-

بابو گوپی ناتھ: سعادت حسن منشو

بابو گوپی ناتھ سے میری ملاقات سن چالیس میں ہوئی۔ ان دونوں میں بمبئی کا ایک ہفتہ وار پرچہ ایڈٹ کیا کرتا تھا۔ دفتر میں عبدالرحیم سینڈو، ایک نائل قدر کے آدمی کے ساتھ داخل ہوا۔ میں اس وقت لیڈر لکھ رہا تھا۔ سینڈو نے اپنے مخصوص انداز میں باواز بلند مجھے آداب کیا اور اپنے ساتھی سے متعارف کرایا، ”منشو صاحب! بابو گوپی ناتھ سے ملیے۔“

میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ سینڈو نے حسبِ عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیے، ”بابو گوپی ناتھ تم ہندوستان کے نمبر ون رائٹر سے ہاتھ ملارہے ہو۔ لکھتا ہے تو دھڑن تھتنا ہو جاتا ہے لوگوں کا۔ ایسی ایسی کنٹی نیو ٹلی ملاتا ہے کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ پچھلے دونوں وہ کیا چکلا لکھا تھا آپ نے منشو صاحب؟“ مس خورشید نے کار خریدی۔ اللہ بڑا کار ساز ہے۔ کیوں بابو گوپی ناتھ، ہے اپنی کی پینٹی پو؟“

عبدالرحیم سینڈو کے بتیں کرنے کا اندازہ بالکل نرالا تھا۔ کنٹی نیو ٹلی۔ دھڑن تھتنا اور اپنی کی پینٹی پو ایسے الفاظ اس کی اپنی اختراع تھے جن کو وہ گفتگو میں بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ میر اتعارف کرانے کے بعد وہ بابو گوپی ناتھ کی طرف متوجہ ہوا جو بہت مرعوب نظر آتا تھا۔ ”آپ ہیں بابو گوپی ناتھ۔ بڑے خانہ خراب۔ لاہور سے جھک مارتے مارتے بمبئی تشریف لائے ہیں۔ ساتھ کشمیر کی ایک کبوتری ہے۔“ بابو گوپی ناتھ مسکرا یا۔

عبدالرحیم سینڈو نے تعارف کوناکانی سمجھ کر کہا، ”نمبر ون بے وقوف ہو سکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ لوگ ان کے مسکاگا کرو پسیہ ہوتے ہیں۔ میں صرف بتائیں کہ کے ان سے ہر روز پوسن بڑکے دوپیکٹ وصول کرتا ہوں۔ بس منشوا صاحب یہ سمجھ لجیے کہ بڑے اینٹی فلو جسٹین قسم کے آدمی ہیں۔ آپ آج شام کو ان کے فلیٹ پر ضرور تشریف لائیں۔“

بابو گوپی ناتھ نے جو خدا معلوم کیا سوچ رہا تھا، چونک کر کہا، ”ہاں ہاں، ضرور تشریف لائیے منشوا صاحب۔“ پھر سینڈو سے پوچھا، ”کیوں سینڈو کیا آپ کچھ اُس کا شغل کرتے ہیں؟“

عبدالرحیم سینڈو نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ”اجی ہر قسم کا شغل کرتے ہیں۔ تو منشوا صاحب آج شام کو ضرور آئیے گا۔ میں نے بھی پہنچ شروع کر دی ہے، اس لیے کہ مفت ملتی ہے۔“

سینڈو نے مجھے فلیٹ کا پتالکھادیا جہاں میں حسب وعدہ شام کو پچھے کے قریب پہنچ گیا۔ تین کمرے کا صاف ستھرا فلیٹ تھا جس میں بالکل نیا فرنچیز سجا ہوا تھا۔ سینڈو اور بابو گوپی ناتھ کے علاوہ میٹھنے والے کمرے میں دو مرد اور دو عورتیں موجود تھیں جن سے سینڈو نے مجھے متعارف کرایا۔

ایک تھا غفار سائیں، تہہر پوش۔ پنجاب کاٹھیٹ سائیں۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مala۔ سینڈو نے اس کے بارے میں کہا، ”آپ بابو گوپی ناتھ کے لیگل ایڈوانسز ہیں۔ میرا مطلب سمجھ جائیے۔ جس آدمی کی ناک بھتی ہو یا جس کے منہ میں سے لاعب نکلتا ہو، پنجاب میں خدا کو پہنچا ہو اور ولیش بن جاتا ہے یہ بھی بس پہنچے ہوئے ہیں یا پہنچنے والے ہیں۔ لاہور سے بابو گوپی ناتھ کے ساتھ آئے ہیں کیونکہ انھیں وہاں کوئی اور بے وقوف ملنے کی امید نہیں تھی۔ یہاں آپ بابو صاحب سے کریون اے کے سگریٹ اور سکاچ و سکی کے پیک پی کر دعا کرتے رہتے ہیں کہ انجام نیک ہو۔۔۔“

غفار سائیں یہ سن کر مسکرا تا رہا۔

دوسرے مرد کا نام تھا غلام علی۔ لمبا تر نہ گا جوان، کسرتی بدن، منہ پر چیچک کے داغ۔ اس کے متعلق سینڈو نے کہا، ”یہ میرا شاگرد ہے۔ اپنے استاد کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ لاہور کی ایک نامی طواائف کی کنواری لڑکی اس پر عاشق ہو گئی۔ بڑی بڑی کنٹی نیو ٹلیاں ملائی گئیں اس کو

پھانسے کے لیے، مگر اس نے کہاڑا اور ڈائی، میں لنگوٹ کا پکار ہوں گا۔ ایک تکیے میں بات چیت کرتے پیتے بابو گوپی ناتھ سے ملاقات ہو گئی۔
بس اس دن سے ان کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ ہر روز کریون اے کاڑب اور کھانا پینا مقرر ہے۔“

یہ سن کر غلام علی بھی مسکراتا رہا

گول چہرے والی ایک سرخ و سفید عورت تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہی کشمیر کی بوترا ہے جس کے متعلق سینڈو نے دفتر میں ذکر کیا تھا۔ بہت صاف سترہی عورت تھی۔ بال چھوٹے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ہوئے ہیں مگر در حقیقت ایسا نہیں تھا۔ آنکھیں شفاف اور چمکیلی تھیں۔ چہرے کے خطوط سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بے حد الہ اور ناتجربہ کار ہے۔ سینڈونے اس سے تعارف کرتے ہوئے کہا، ”زینت بیگم۔ بابو صاحب پیار سے زینو کہتے ہیں۔ ایک بڑی خرانٹ ناٹکہ کشمیر سے یہ سیب توڑ کر لا ہو رہے آئی۔ بابو گوپی ناتھ کو اپنی سی آئی ڈی سے پتہ چلا اور ایک رات لے اڑے۔ مقدمے بازی ہوئی۔ تقریباً دو مہینے تک پولیس عیش کرتی رہی۔ آخر بابو صاحب نے مقدمہ جیت لیا اور اسے یہاں لے آئے۔۔۔ دھڑن تختہ!“

اب گھرے سانو لے رنگ کی عورت باقی رہ گئی تھی جو خاموش بیٹھی سکریٹ پی رہی تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں جن سے کافی بے حیائی متریخ تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ اور سینڈو سے کہا، ”اس کے متعلق بھی کچھ ہو جائے۔“

سینڈونے اس عورت کی ران پر ہاتھ مارا اور کہا، ”جناب یہ ہے میں پٹوئی، فل فل فوئی۔ مسز عبدالرحیم سینڈو عرف سردار بیگم۔۔۔ آپ بھی لا ہور کی پیداوار ہیں۔ سن چھتیں میں مجھ سے عشق ہوا۔ دوسرے سو ہی میں میرا دھڑن تختہ کر کے رکھ دیا۔ میں لا ہور چھوڑ کر بھاگا۔ بابو گوپی ناتھ نے اسے یہاں بلوالیا ہے تاکہ میرا دل لگا رہے۔ اس کو بھی ایک ڈبہ کریون اے کارا شن میں ملتا ہے ہر روز شام کو ڈھانی روپے کا مور فیا کا انجکشن لیتی ہے۔ رنگ کالا ہے۔ مگر ویسے بڑی ٹٹھ فورٹیٹ قسم کی عورت ہے۔“

سردار نے ایک ادا سے صرف اتنا کہا، ”کو اس نہ کر!“ اس ادا میں پیشہ ور عورت کی بناؤٹ تھی۔

سب سے متعارف کرانے کے بعد سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیے۔ میں نے کہا، ”چھوڑو یار۔ آؤ کچھ بتیں کریں۔“

سینڈو چلایا، ”بواۓ۔۔۔ و سکی اینڈ سوڈا۔۔۔ بابو گوپی ناتھ لگا وہوا، ایک سبزے کو۔“

بابو گوپی ناتھ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سوسو کے نوٹوں کا ایک پندا انکالا اور ایک نوٹ سینڈو کے حوالے کر دیا۔ سینڈو نے نوٹ لے کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور کھڑکھڑا کر کہا، ”او گوڈ۔۔۔ او میرے رب العالمین۔۔۔ وہ دن کب آئے گا جب میں بھی لب لگا کر یوں نوٹ نکال کر وہ گا۔۔۔ جاؤ بھئی غلام علی۔ دوبو تلیں جانی واکر شل گونگ سٹر انگ کی لے آؤ۔“ بو تلیں آئیں تو سب نے پینا شروع کی۔ یہ شغل دو تین گھنٹے تک جاری رہا۔

اس دوران میں سب سے زیادہ باقیں حسب معمول عبد الرحیم نے کیں۔ پہلا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر کے وہ چلایا، ”دھڑن تختہ! منشو صاحب، و سکی ہو تو ایسی۔ حق سے اتر کر پیٹ میں ”انقلاب، زندہ باد“ لکھتی چلی گئی ہے۔۔۔ جیو بابو گوپی ناتھ! جیو۔“

بابو گوپی ناتھ بے چارہ خاموش رہا۔ کبھی کبھی البتہ وہ سینڈو کی ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا۔ میں نے سوچا اس شخص کی اپنی رائے کوئی نہیں ہے۔ دوسرا جو بھی کہے، مان لیتا ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا ثبوت غفار سائیں موجود تھا جسے وہ بقول سینڈو اپنالیگل ایڈواائزربنا کر لایا تھا۔ سینڈو کا اس سے دراصل یہ مطلب تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس سے عقیدت تھی۔ یوں بھی مجھے دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ لاہور میں اس کا اکثر وقت فقیروں اور درویشوں کی صحبت میں کشنا تھا۔ یہ چیز میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ کھو یا کھو یا ساختا، جیسے کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نے چنانچہ اس سے ایک بار کہا، ”بابو گوپی ناتھ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“

وہ چونک پڑا۔ ”جی میں۔۔۔ میں۔۔۔ کچھ نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرا یا اور زینت کی طرف ایک عاشقانہ نگاہ ڈالی۔ ”ان حسینوں کے متعلق سوچ رہا ہوں۔۔۔ اور ہمیں کیا سوچ ہو گی۔“

سینڈو نے کہا، ”بڑے خانہ خراب ہیں، یہ منشو صاحب۔ بڑے خانہ خراب ہیں۔۔۔ لاہور کی کوئی ایسی طوائف نہیں جس کے ساتھ بابو صاحب کی کنٹی نیو ٹلی نہ رہ چکی ہو۔“

بابو گوپی ناتھ نے یہ سن کر بڑے بھونڈے انسار کے ساتھ کہا، ”اب کمر میں وہ دم نہیں منشو صاحب۔“

اس کے بعد وہیات گفتگو شروع ہو گئی۔ لاہور کی طوائف کے سب گھرانے گئے گیے۔

کون ڈیرہ دار تھی، کون نٹنی تھی، کون کس کی نوچی تھی، نتھنی اتارنے کا بابو گوپی ناتھنے کیا دیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ گفتگو سردار، سینڈو، غفار سائیں اور غلام علی کے درمیان ہوتی رہی، ٹھیٹ لاہور کے کوٹھوں کی زبان میں۔ مطلب تو میں سمجھتا رہا مگر بعض اصطلاح میں سمجھ میں نہ آئیں۔

زینت بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی کسی بات پر مسکرا دیتی۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اسے اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ملکی و سکلی کا ایک گلاس بھی نہیں پیا۔ بغیر کسی دلچسپی کے سکریٹ بھی پیتی تھی تو معلوم ہوتا تھا سے تمباکو اور اس کے دھویں سے کوئی رغبت نہیں لیکن اطف یہ ہے کہ سب سے زیادہ سکریٹ اسی نے پی۔ بابو گوپی ناتھنے سے اسے محبت تھی، اس کا پتا مجھے کسی بات سے نہ ملا۔ اتنا البتہ ظاہر تھا کہ بابو گوپی ناتھنے کو اس کا کافی خیال تھا کیونکہ زینت کی آسائش کے لیے ہر سامان مہیا تھا۔ لیکن ایک بات مجھے محسوس ہوئی کہ ان دونوں میں کچھ عجیب سا کھنپا تھا۔ میرا مطلب ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہونے کے بجائے کچھ ہٹے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔

آٹھ بجے کے قریب سردار، ڈاکٹر مسید کے ہاں چلی گئی کیونکہ اسے مور فیا کا انجکشن لینا تھا۔ غفار سائیں تین پیگ پینے کے بعد اپنی تسبیح اٹھا کر قالین پر سو گیا۔ غلام علی کو ہوٹل سے کھانا لینے کے لیے بھیج دیا گیا۔ سینڈو نے اپنی دلچسپ بکواس جب کچھ عرصے کے لیے بند کی تو بابو گوپی ناتھنے جواب نشے میں تھا، زینت کی طرف وہی عاشقانہ نگاہ ڈال کر کہا، ”منٹو! میری زینت کے متعلق آپ کا خیال کیا ہے؟“

میں نے سوچا کیا کہوں۔ زینت کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا، ”بڑا نیک خیال ہے۔“

بابو گوپی ناتھنے خوش ہو گیا۔ ”منٹو صاحب! ہے بھی بڑی نیک لوگ۔ خدا کی قسم نہ زیور کا شوق ہے نہ کسی اور چیز کا۔ میں نے کئی بار کہا جان من مکان بنوادوں؟ جواب کیا دیا، معلوم ہے آپ کو؟ کیا کروں گی مکان لے کر۔ میرا کون ہے---“

”منٹو صاحب موثر کتنے میں آجائے گی۔“ میں نے کہا، ”مجھے معلوم نہیں۔“

بابو گوپی ناتھنے تعجب سے کہا، ”کیا بات کرتے ہیں آپ منٹو صاحب--- آپ کو، اور کاروں کی قیمت معلوم نہ ہو۔ کل چلیے میرے ساتھ، زینو کے لیے ایک موڑ لیں گے۔ میں نے اب دیکھا ہے کہ بمبئی میں موڑ ہونی ہی چاہیے۔“ زینت کا چہرہ رد عمل سے خالی رہا۔

بابو گوپی ناتھ کا نشہ تھوڑی دیر کے بعد بہت تیز ہو گیا۔ ہمہ تن جذبات ہو کر اس نے مجھ سے کہا، ”منٹو صاحب! آپ بڑے لاٹق آدمی ہیں۔ میں تو بالکل گدھا ہوں۔۔۔ لیکن آپ مجھے بتائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ کل باتوں باتوں میں سینڈو نے آپ کا ذکر کیا۔ میں نے اسی وقت ٹیکسی منگوائی اور اس سے کہا مجھے لے چلو منٹو صاحب کے پاس۔ مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معاف کر دیجیے گا۔۔۔ بہت گندہ گار آدمی ہوں۔۔۔ وسکی منگاؤں آپ کے لیے اور؟“ میں نے کہا۔ ”نہیں نہیں۔۔۔ بہت پیچے ہیں۔“

وہ اور زیادہ جذباتی ہو گیا، ”اور پیچے منٹو صاحب!“ یہ کہہ کر جیب سے سوسو کے نوٹوں کا پلند انکالا اور ایک نوٹ جدا کرنے لگا۔ لیکن میں نے سب نوٹ اس کے ہاتھ سے لیے اور واپس اس کی جیب میں ٹھونس دیے، ”سورو پے کا ایک نوٹ آپ نے غلام علی کو دیا تھا۔ اس کا کیا ہوا؟“

مجھے دراصل کچھ ہمدردی سی ہو گئی تھی بابو گوپی ناتھ سے۔ کتنے آدمی اس غریب کے ساتھ جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا بابو گوپی ناتھ بالکل گدھا ہے۔ لیکن وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مسکرا کر کہنے لگا، ”منٹو صاحب! اس نوٹ میں سے جو کچھ باقی مچا، وہ یا تو غلام کی جیب سے گرفڑے گایا۔۔۔“

بابو گوپی ناتھ نے پورا جملہ بھی ادا نہیں کیا تھا کہ غلام علی نے کمرے میں داخل ہو کر بڑے دکھ کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ ہوٹل میں کسی حرام زادے نے اس کی جیب سے سارے روپے نکال لیے۔ بابو گوپی ناتھ میری طرف دیکھ کر مسکرا یا۔ پھر سورو پے کا ایک نوٹ جیب سے نکال کر غلام علی کو دے کر کہا، ”جلدی کھانا لے آؤ۔“

پانچ چھ ملا قاتوں کے بعد مجھے بابو گوپی ناتھ کی صحیح شخصیت کا علم ہوا۔ پوری طرح تو خیر انسان کسی کو بھی نہیں جان سکتا لیکن مجھے اس کے بہت سے حالات معلوم ہوئے جو بے حد چکپ تھے۔

پہلے تو میں یہ کہنا پا ہتا ہوں کہ میرا یہ خیال کہ وہ پر لے درجے کا چغدہ ہے، غلط ثابت ہوا۔ اس کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ سینڈو، غلام علی اور سردار وغیرہ جو اس کے مصاحب بنے ہوئے تھے، مطلی انسان ہیں۔ وہ ان سے جھٹکیاں، گالیاں سب سنتا تھا لیکن غصے کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا، ”منٹو صاحب! میں نے آج تک کسی کا مشورہ رہ نہیں کیا۔ جب بھی کوئی مجھے رائے دیتا ہے، میں کہتا ہوں سمجھا اللہ۔ وہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں لیکن میں انھیں عقل مند سمجھتا ہوں اس لیے کہ ان میں کم از کم اتنی عقل تو تھی جو مجھ میں ایسی بے وقوفی کو شاخت کر لیا جس سے ان کا الوسیدہ ہا ہو سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہوں۔ مجھے

ان سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے سوچ رکھا ہے کہ جب میری دولت بالکل ختم ہو جائے گی تو کسی تکے میں جانیٹھوں گا۔ رندی کا کوٹھا اور پیر کا مزار بس یہ دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ رندی کا کوٹھا تو چھوٹ جائے گا اس لیے کہ جیب خالی ہونے والی ہے لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں۔ کسی ایک کے مزار میں چلا جاؤں گا۔“

میں نے اس سے پوچھا، ”رندی کے کوٹھے اور تکے آپ کو کیوں پسند ہیں؟“

کچھ دیر سوچ کر اس نے جواب دیا، ”اس لیے کہ ان دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر چھپت تک دھو کہ ہی دھو کہ ہوتا ہے جو آدمی خود کو دھو کہ دینا چاہتا ہے اس کے لیے ان سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے۔“

میں نے ایک اور سوال کیا، ”آپ کو طوائفوں کا گانا سننے کا شوق ہے، کیا آپ موسیقی کی سمجھ رکھتے ہیں؟“

اس نے جواب دیا، ”بالکل نہیں اور یہ اچھا ہے کیونکہ میں کن سری سے کن سری طوائف کے ہاں جا کر بھی اپنا سر ہلا سکتا ہوں۔۔۔ منتو صاحب مجھے گانے سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن جیب سے دس یا سوروپے کا نوٹ نکال کر گانے والی کو دکھانے میں بہت مز آتا ہے۔ نوٹ نکالا اور اس کو دکھایا۔ وہ اسے لینے کے لیے ایک ادا سے اٹھی۔ پاس آئی تو نوٹ جراب میں اڑس لیا۔ اس نے جھک کر اسے باہر نکالا تو ہم خوش ہو گئے۔ ایسی بہت فضول فضول سی باتیں ہیں جو ہم ایسے تماش بینوں کو پسند ہیں، ورنہ کون نہیں جانتا کہ رندی کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کرتے ہیں اور مقبروں اور تکیوں میں انسان اپنے خدا سے۔“

بابو گوپی ناتھ کا شجرہ نسب تو میں نہیں جانتا لیکن اتنا معلوم ہوا کہ وہ ایک بہت بڑے کنجوس بننے کا بیٹا ہے۔ باپ کے مرنے پر اسے دس لاکھ روپے کی جائیداد ملی جو اس نے اپنی خواہش کے مطابق اڑانا شروع کر دی۔ بہمنی آتے وقت وہ اپنے ساتھ پچاس ہزار روپے لایا تھا۔ اس زمانے میں سب چیزیں سستی تھیں، لیکن پھر بھی ہر روز تقریباً سو اسوروپے خرچ ہو جاتے ہیں۔

زینو کے لیے اس نے قیمت موڑ خریدی۔ یاد نہیں رہا، لیکن شاید تین ہزار روپے میں آئی تھی۔ ایک ڈرائیور کھا لیکن وہ بھی لفگنے ٹائپ کا۔
بابو گوپی ناتھ کو کچھ ایسے ہی آدمی پسند تھے۔

ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا۔ باپو گوپی ناتھ سے مجھے تو صرف دلچسپی تھی، لیکن اسے مجھ سے کچھ عقیدت ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی بہ نسبت میرا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔

ایک روز شام کے قریب جب میں فلیٹ پر گیا تو مجھے وہاں شفیق کو دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی۔ محمد شفیق طوسی کہوں تو شاید آپ سمجھ لیں کہ میری مراد کس آدمی سے ہے۔ یوں تو شفیق کافی مشہور آدمی ہے۔ کچھ اپنی جدت طراز گاگنی کے باعث اور کچھ اپنی بذله سخ طبیعت کی بدولت۔ لیکن اس کی زندگی کا ایک حصہ اکثریت سے پوشاہ ہے۔ بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ تین سگی ہننوں کو کیے بعد دیگرے تین تین چار چار سال کے وقفے کے بعد داشتہ بنانے سے پہلے اس کا تعلق اس کی ماں سے بھی تھا۔ یہ بہت کم مشہور ہے کہ اس کو اپنی پہلی بیوی جو تھوڑے ہی عرصے میں مر گئی تھی، اس لیے پسند نہیں تھی کہ اس میں طوائفوں کے غمزے اور عشوے نہیں تھے۔

لیکن یہ تو خیر ہر آدمی جو شفیق طوسی سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہے، جانتا ہے کہ چالیس برس (یہ اس زمانے کی عمر ہے) کی عمر میں سیکڑوں طوائفوں نے اسے رکھا۔ اچھے سے اچھا کپڑا اپہنا۔ عمدہ سے عمدہ کھانا کھایا۔ نفس سے نفس موڑ رکھی۔ مگر اس نے اپنی گرد سے کسی طوائف پر ایک دمڑی بھی خرچ نہ کی۔

عورتوں کے لیے، خاص طور پر جو کہ پیشہ ور ہوں، اس کی بذله سخ طبیعت جس میں میراثیوں کے مزاج کی ایک جھلک تھی، بہت ہی جاذب نظر تھی۔ وہ کوشش کے بغیر ان کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ میں نے جب اسے زینت سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا تو مجھے اس لیے حیرت نہ ہوئی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے، میں نے صرف یہ سوچا کہ وہ دفتار یہاں پہنچا کیسے۔ ایک سینڈو اسے جانتا تھا مگر ان کی بول چال تو ایک عرصے سے بند تھی۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سینڈو ہی اسے لایا تھا۔ ان دونوں میں صلح صفائی ہو گئی تھی۔

باپو گوپی ناتھ ایک طرف بیٹھا حقہ پر رہا تھا۔ میں نے شاید اس سے پہلے ذکر نہیں کیا، وہ سگریٹ بالکل نہیں پیتا تھا۔ محمد شفیق طوسی میراثیوں کے لطیفے سنارہاتھا، جس میں زینت کسی قدر کم اور سردار بہت زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ شفیق نے مجھے دیکھا اور کہا، ”او بسم اللہ۔ بسم اللہ۔ کیا آپ کا گزر بھی اس وادی میں ہوتا ہے؟“

سینڈو نے کہا، ”تشریف لے آئیے عزرا میل صاحب یہاں دھڑن تختہ۔“ میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

تحوڑی دیر گپ بازی ہوتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ زینت اور محمد شفیق طوسی کی نگاہیں آپس میں ٹکر اکر کچھ اور بھی کہہ رہی ہیں۔ زینت اس فن میں بالکل کوری تھی لیکن شفیق کی مہارت زینت کی خامیوں کو چھپاتی رہی۔ سردار، دونوں کی نگاہ بازی کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے خلیفہ اکھڑے سے باہر بیٹھ کر اپنے پھتوں کے داؤ بیچ کو دیکھتے ہیں۔

اس دوران میں، میں بھی زینت سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا وہ مجھے بھائی کہتی تھی جس پر مجھے اعتراض نہیں تھا۔ اچھی ملنسارطیعت کی عورت تھی۔ کم گو، سادہ لوح، صاف ستری۔ شفیق سے مجھے اس کی نگاہ بازی پسند نہیں آئی تھی۔ اول تو اس میں بھونڈاپن تھا۔ اس کے علاوہ۔۔۔ کچھ یوں کہیے کہ اس بات کا بھی اس میں دخل تھا کہ وہ مجھے بھائی کہتی تھی۔ شفیق اور سینڈ والٹھ کر باہر گیے تو میں نے شاید بڑی بے رحمی کے ساتھ اس سے نگاہ بازی کے متعلق استفسار کیا کیونکہ فوراً اس کی آنکھوں میں یہ موٹے آنسو آگئے اور روتنی روتنی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بابو گوپی ناتھ جو ایک کونے میں بیٹھا جتھے پی رہا تھا، اٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے گیا۔ سردار نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کچھ کہا لیکن میں مطلب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بابو گوپی ناتھ کمرے سے باہر نکلا اور ”آئیے منٹو صاحب“ کہہ کر مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

زینت پنگ پر بیٹھی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر لیٹ گئی۔ میں اور بابو گوپی ناتھ، دونوں پنگ کے پاس کر سیوں پر بیٹھ گئے۔ بابو گوپی ناتھ نے بڑی سنبھالی گی کے ساتھ کہنا شروع کیا، ”منٹو صاحب!“ مجھے اس عورت سے بہت محبت ہے۔ دوسرے سے یہ میرے پاس ہے۔ میں حضرت غوث اعظم جیلانی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اس کی دوسری بہنیں، میرا مطلب ہے اس پیشے کی دوسری عورت میں دونوں ہاتھوں سے مجھے لوٹ کر کھاتی رہیں مگر اس نے کبھی ایک زائد پیسے مجھ سے نہیں لیا۔ میں اگر کسی دوسری عورت کے ہاں ہفتوں پڑا رہا تو اس غریب نے اپنا کوئی زیور گروئی رکھ کر گزار کیا میں جیسا کہ آپ سے ایک دفعہ کہہ چکا ہوں بہت جلد اس دنیا سے کنارہ کش ہونے والا ہوں۔ میری دولت اب کچھ دن کی مہمان ہے میں نہیں چاہتا اس کی زندگی خراب ہو۔ میں نے لاہور میں اس کو بہت سمجھایا کہ تم دوسری طوائفوں کی طرف دیکھو جو کچھ وہ کرتی ہیں، سیکھو۔ میں آج دولت مند ہوں۔ کل مجھے بھکاری ہونا ہی ہے۔ تم لوگوں کی زندگی میں صرف ایک دولت کافی نہیں۔ میرے بعد تم کسی اور کو نہیں پھانسوگی تو کام نہیں چلے گا۔ لیکن منٹو صاحب اس نے میری ایک نہ سنی۔

سارا دن شریف زادیوں کی طرح گھر میں بیٹھی رہتی۔ میں نے غفار سائیں سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا بمبی لے جاؤ اسے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے ایسا کیوں کہا۔ بمبی میں اس کی دو جانے والی طوائفیں ایکٹر سیں بنی ہوئی ہیں۔ لیکن میں نے سوچا بمبی ٹھیک ہے۔ دو مہینے ہو گئے ہیں اسے یہاں لائے ہوئے۔ سردار کو لاہور سے بلا یا ہے کہ اس کو سب گر سکھائے۔ غفار سائیں سے بھی یہ بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ یہاں مجھے

کوئی نہیں جانتا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ باپو تمہاری بے عزتی ہو گی۔ میں نے کہا تم چھوڑواں کو۔ بھبھی بہت بڑا شہر ہے۔ لاکھوں رہیں ہیں۔ میں نے تمہیں موڑ لے دی ہے۔ کوئی اچھا آدمی تلاش کرلو۔۔۔

منتو صاحب! میں خدا کی قسم کھا کر کھتا ہوں میری دلی خواہش ہے کہ یہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے، اچھی طرح ہوشیار ہو جائے۔ میں اس کے نام آج ہی بنک میں دس ہزار روپیہ جمع کرنے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے دس دن کے اندر اندر یہ باہر بیٹھی ہو گی۔ سردار اس کی ایک ایک پائی اپنی جیب میں ڈال لے گی۔۔۔ آپ بھی اسے سمجھائیے کہ چالاک بننے کی کوشش کرے۔ جب سے موڑ خریدی ہے، سردار اسے ہر روز شام کو اپلو بندر لے جاتی ہے لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ سینڈو آج بڑی مشکلوں سے محمد شفیق کو بیہاں لایا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس کے متعلق؟“

میں نے اپنا خیال ظاہر کرنا مناسب خیال نہ کیا، لیکن باپو گوپی ناتھ نے خود ہی کہا، ”اچھا کھاتا پیتا آدمی معلوم ہوتا ہے اور خوبصورت بھی ہے۔۔۔ کیوں زینو جانی۔۔۔ پسند ہے تمہیں؟“

زینو خاموش رہی۔

باپو گوپی ناتھ سے جب مجھے زینت کو بھبھی لانے کی غرض وغایت معلوم ہوئی تو میرا دماغ چکر اگیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن بعد میں مشاہدے نے میری حیرت دور کر دی۔ باپو گوپی ناتھ کی دلی آرزو تھی کہ زینت بھبھی میں کسی اچھے مالدار آدمی کی داشتہ بن جائے یا ایسے طریقے سیکھ جائے جس سے وہ مختلف آدمیوں سے روپیہ وصول کرتے رہنے میں کامیاب ہو سکے۔

زینت سے اگر صرف چھٹکارا ہی حاصل کرنا ہو تو یہ کوئی اتنی مشکل چیز نہیں تھی۔ باپو گوپی ناتھ ایک ہی دن میں یہ کام کر سکتا تھا۔ چونکہ اس کی نیت نیک تھی، اس لیے اس نے زینت کے مستقبل کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اس کو ایکٹر س بنانے کے لیے اس نے کئی جعلی ڈائریکٹروں کی دعویٰ کیں۔ گھر میں ٹیلی فون لگوایا۔ لیکن اونٹ کسی کروٹ نہ بیٹھا۔

محمد شفیق طوسی تقریباً ڈیڑھ مہینہ آتارہا۔ کئی راتیں بھی اس نے زینت کے ساتھ بسر کیں لیکن وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو کسی عورت کا سہارا بن سکے۔ باپو گوپی ناتھ نے ایک روز افسوس اور رنج کے ساتھ کہا، ”شفیق صاحب تو خالی خالی جنٹلمن ہی نکلے۔ ٹھسے دیکھیے، بے چاری زینت سے چار چادریں، چھ تکیے کے غلاف اور دوسرو پے نقد ہتھیا کر لے گیے۔ سناء ہے آج کل ایک لڑکی الماس سے عشق لڑا رہے ہیں۔“

یہ درست تھا۔ الماس، نذیر جان پٹیا لے والی کی سب سے چھوٹی اور آخری لڑکی تھی۔ اس سے پہلے تین بہنیں شفیق کی داشتہ رہ چکی تھیں۔ دوسروں پے جو اس نے زینت سے لیے تھے، مجھے معلوم ہے الماس پر خرچ ہوئے تھے۔ بہنوں کے ساتھ لڑکوں کو الماس نے زہر کھالیا تھا۔

محمد شفیق طوسی نے جب آنا جانا بند کر دیا تو زینت نے کئی بار مجھے ٹیلی فون کیا اور کہا اسے ڈھونڈ کر میرے پاس لایئے۔ میں نے اسے تلاش کیا، لیکن کسی کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ایک روز اتفاقیہ ریڈ یو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ تمہیں زینت بلا تی ہے تو اس نے جواب دیا، ”مجھے یہ پیغام اور ذریعوں سے بھی مل چکا ہے۔ افسوس ہے، آج کل مجھے بالکل فرصت نہیں۔ زینت بہت اچھی عورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بے حد شریف ہے۔۔۔ ایسی عورتوں سے جو بیویوں جیسی لگیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔“

شفیق سے ماہوی ہوئی تو زینت نے سردار کے ساتھ اپولو بندر جانا شروع کیا۔ پندرہ دنوں میں، بڑی مشکلوں سے، کئی گیلن پڑوں پھونکنے کے بعد سردار نے دو آدمی پھانسے۔ ان سے زینت کو چار سوروپے ملے۔ بابو گوپی نا تھے سمجھا کہ حالات امید افزاییں کیونکہ ان میں سے ایک نے جو ریشمی کپڑوں کی مل کاماں کھا، زینت سے کہا تھا کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ ایک مہینہ گزر گیا لیکن یہ آدمی پھر زینت کے پاس نہ آیا۔

ایک روز میں جانے کس کام سے ہار بی رود پر جا رہا تھا کہ مجھے فٹ پا تھے کے پاس زینت کی موڑ کھڑی نظر آئی۔ پچھلی نشست پر محمدیا میں بیٹھا تھا۔ گنینہ ہو ٹل کاماں۔ میں نے اس سے پوچھا، ”یہ موڑ تم نے کہاں سے لی؟“

یاسین مسکرا یا، ”تم جانتے ہو موڑ والی کو۔“

”میں نے کہا، ”جانتا ہوں۔“

”تو بس سمجھ لو میرے پاس کیسے آئی۔۔۔ اچھی لڑکی ہے یار!“ یاسین نے مجھے آنکھ ماری۔ میں مسکرا دیا۔

اس کے چوتھے روز بابو گوپی ناتھ ٹیکسی پر میرے دفتر میں آیا۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ زینت سے یاسین کی ملاقات کیسے ہوئی۔ ایک شام اپولوبندر سے ایک آدمی لے کر سردار اور زینت نگینہ ہو ٹل گئیں۔ وہ آدمی توکسی بات پر جھگڑا کر کے چلا گیا لیکن ہو ٹل کے مالک سے زینت کی دوستی ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ مطمئن تھا کیونکہ دس پندرہ روز کی دوستی کے دوران میں یاسین نے زینت کو چھ بہت ہی عمدہ اور قیمتی سائزیاں لے دی تھیں۔ بابو گوپی ناتھ اب یہ سوچ رہا تھا کچھ دن اور گزر جائیں، زینت اور یاسین کی دوستی اور مضبوط ہو جائے تو لاہور واپس چلا جائے۔۔۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

نگینہ ہو ٹل میں ایک کر سیچین عورت نے کمرہ کرائے پر لیا۔ اس کی جوان لڑکی میوریل سے یاسین کی آنکھ لڑکئی۔ چنانچہ زینت بے چاری ہو ٹل میں بیٹھی رہتی اور یاسین اس کی موڑ میں صبح شام اس لڑکی کو گھما تارہ۔ بابو گوپی ناتھ کو اس کا علم ہونے پر دکھ ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا، ”منٹو صاحب یہ کیسے لوگ ہیں۔ بھتی دل اچاٹ ہو گیا ہے تو صاف کہہ دو۔ لیکن زینت بھی عجیب ہے۔ اچھی طرح معلوم ہے کیا ہو رہا ہے مگر منہ سے اتنا بھی نہیں کہتی، میاں! اگر تم نے اس کرستان چھو کری سے عشق لڑانا ہے تو اپنی موڑ کار کا بندوبست کرو، میری موڑ کیوں استعمال کرتے ہو۔ میں کیا کروں منٹو صاحب! بڑی شریف اور نیک بخت عورت ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔ تھوڑی سی چالاک تو بننا چاہیے۔“

یاسین سے تعلق قطع ہونے پر زینت نے کوئی صدمہ محسوس نہ کیا۔ بہت دونوں تک کوئی نئی بات و قوع پذیر نہ ہوئی۔ ایک دن ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا بابو گوپی ناتھ، غلام علی اور غفار سائیں کے ساتھ لاہور چلا گیا، روپے کا بندوبست کرنے، کیونکہ پچاس ہزار ختم ہو گیے تھے۔ جاتے وقت وہ زینت سے کہہ گیا تھا کہ اسے لاہور میں زیادہ دن لگیں گے کیونکہ اسے چند مکان فروخت کرنے پڑیں گے۔

سردار کو مورفیا کے ٹیکوں کی ضرورت تھی۔ سینڈ و کوپو لسن مکھن کی۔ چنانچہ دونوں نے متعدد کوشش کی اور ہر روز تین آدمی پھانس کر لے آتے۔ زینت سے کہا گیا کہ بابو گوپی ناتھ واپس نہیں آئے گا، اس لیے اسے اپنی فکر کرنی پا بیسے۔ سوسا سور روپے روز کے ہو جاتے جن میں سے آدھے زینت کو ملتے باقی سینڈ اور سردار دبالتے۔ میں نے ایک دن زینت سے کہا، ”یہ تم کیا کر رہی ہو۔“ اس نے بڑے الہ پن سے کہا، ”مجھے کچھ معلوم نہیں بھائی جان۔ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں مان لیتی ہوں۔“

جی چاہا کہ بہت دیر پاس بیٹھ کر سمجھاؤں کہ جو کچھ تم کر رہی ہو، ٹھیک نہیں، سینڈ اور سردار اپنا الوسیدھا کرنے کے لیے تمہیں بیچ بھی ڈالیں گے مگر میں نے کچھ نہ کہا۔ زینت آتا دینے والی حد تک بے سمجھ، بے امنگ اور بے جان عورت تھی۔ اس کم بخت کو اپنی زندگی کی قدر و قیمت ہی معلوم نہیں تھی۔ جسم پچھتی مگر اس میں بیچنے والوں کا کوئی انداز تو ہوتا۔ واللہ مجھے بہت کوفت ہوتی تھی اسے دیکھ کر۔ سگریٹ سے، شراب سے، کھانے سے، گھر سے، ٹیلی فون سے، حتیٰ کہ اس صوفے سے بھی جس پر وہ اکثر لیٹی رہتی تھی، اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

بابو گوپی ناتھ پورے ایک مہینے کے بعد لوٹا۔ وہاں گیا تو وہاں فلیٹ میں کوئی اور ہی تھا۔ سینڈ اور سردار کے مشورے سے زینت نے باندرہ میں ایک بیٹگلے کا بالائی حصہ کرائے پر لے لیا تھا۔ بابو گوپی ناتھ میرے پاس آیا تو میں نے اسے پورا پتہ بتا دیا۔ اس نے مجھ سے زینت کے متعلق پوچھا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا، میں نے کہہ دیا لیکن یہ نہ کہا کہ سینڈ اور سردار اس سے پیشہ کرا رہے ہیں۔

بابو گوپی ناتھ اب کہ دس ہزار روپیہ اپنے ساتھ لا یا تھا جو اس نے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا تھا۔ غلام علی اور غفار سائیں کو وہ لا ہو رہی چھوڑ آیا تھا۔ ٹیکسی یخچے کھڑی تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اصرار کیا میں بھی اس کے ساتھ چلوں۔ تقریباً ایک گھنٹے میں ہم باندرہ پہنچ گئے۔ بای مل پر ٹیکسی چڑھ رہی تھی کہ سامنے نگر پر سینڈ کھائی دیا۔ بابو گوپی ناتھ نے زور سے پکارا، ”سینڈو!“

سینڈ نے جب بابو گوپی ناتھ کو دیکھا تو اس کے منہ سے صرف اتنا کلا، ”دھڑن تختہ“

بابو گوپی ناتھ نے اس سے کہا آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ اور ساتھ چلو، لیکن سینڈ نے کہا ٹیکسی ایک طرف کھڑی کیجیے، مجھے آپ سے کچھ پر ایسیویٹ باتیں کرنی ہیں۔ ٹیکسی ایک طرف کھڑی کی گئی۔ بابو گوپی ناتھ باہر نکلا تو سینڈ واسے کچھ دور لے گیا دیر تک ان میں باتیں ہوتی رہیں جب ختم ہوئیں تو بابو گوپی ناتھ اکیلا ٹیکسی کی طرف آیا۔ ڈرائیور سے اس نے کہا، ”واپس لے چلو!“

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ہم دادر کے پاس پہنچے تو اس نے کہا، ”منظو صاحب! زینو کی شادی ہونے والی ہے۔“

میں نے حیرت سے کہا، ”کس سے؟“

بابو گوپی ناتھ نے جواب دیا، ”حیدر آباد سندھ کا ایک دولت مندر میندار ہے۔ خدا کرے وہ خوش رہیں۔ یہ بھی اچھا ہوا جو میں عین وقت پر آپنچا۔ جو روپے میرے پاس ہیں، ان سے زینو کا زیور بن جائے گا۔ کیوں، کیا خیال ہے آپ کا؟“

میرے دماغ میں اس وقت کوئی خیال نہ تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ حیدر آباد سندھ کا دولت مندر میندار کون ہے، سینڈ اور سردار کی کوئی جعل سازی تو نہیں، لیکن بعد میں اس کی تصدیق ہو گئی کہ وہ حقیقتاً حیدر آباد کا معمول زمیندار ہے جو حیدر آباد سندھ ہی کے ایک میوزک ٹیچر کی معرفت زینت سے متعارف ہوا۔ یہ میوزک ٹیچر زینت کو گاناسکھانے کی بے سود کوشش کیا کرتا تھا۔ ایک روز وہ اپنے مرتبی غلام حسین (یہ اس حیدر آباد سندھ کے رئیس کا نام تھا) کو ساتھ لے کر آیا۔ زینت نے خوب خاطر مدارات کی۔ غلام حسین کی پر زور فرمائش پر اس نے غالب کی غزل:

نکتہ چیز ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے

گا کر سنائی۔ غلام حسین سوجان سے اس پر فریغہ ہو گیا۔ اس کا ذکر میوزک ٹیچر نے زینت سے کیا۔ سردار اور سینڈو نے مل کر معاملہ پکا کر دیا اور شادی طے ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ایک دفعہ سینڈو کے دوست کی حیثیت سے وہ زینت کے ہاں گیا۔ غلام حسین سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس سے مل کر باپو گوپی ناتھ کی خوشی دگنی ہو گئی۔ مجھ سے اس نے کہا، ”منشو صاحب! خوبصورت، نوجوان اور بڑا لاکن آدمی ہے۔ میں نے یہاں آتے ہوئے داتا نجیخ بخش“ کے حضور جا کر دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی۔ بھگوان کرے دونوں خوش رہیں!

بابو گوپی ناتھ نے بڑے خلوص اور بڑی توجہ سے زینت کی شادی کا انتظام کیا۔ دوہزار کے زیور اور دوہزار کے کپڑے بنادیے اور پانچ ہزار نقد دیے۔ محمد شفیق طوسی، محمد یاسین پروپرائزٹرنگ نیشن ہو ٹیل، سینڈو، میوزک ٹیچر، میں اور گوپی ناتھ شادی میں شامل تھے، لہن کی طرف سے سینڈو کیل تھے۔

ایجاد و قبول ہوا تو سینڈو نے آہستہ سے کہا، ”دھڑن تختہ۔“

غلام حسین سرج کانیلا سوٹ پہنے تھے۔ سب نے اس کو مبارک بادی جو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کی۔ کافی وجہہ آدمی تھا۔ بابو گوپی ناتھ اس کے مقابلے میں اس کے سامنے چھوٹی سی بیٹیر معلوم ہوتا تھا۔ شادی کی دعوتوں پر خور دنوں کا جو سامان بھی ہوتا ہے، بابو گوپی ناتھ

نے مہیا کیا تھا۔ دعوت سے جب لوگ فارغ ہوئے تو بابو گوپی ناتھ نے سب کے ہاتھ دھلوائے۔ میں جب ہاتھ دھونے کے لیے آیا تو اس نے مجھ سے بچوں کے انداز سے کہا، ”منٹو صاحب! ذرا اندر جائیے اور دیکھیے زینو! لہن کے لباس میں کیسی لگتی ہے۔“

میں پر دہٹا کر اندر داخل ہوا۔ زینت سرخ زربفت کا شلوار کرتے پہنے تھی۔۔۔ دوپہر بھی اسی رنگ کا تھا جس پر گوت لگی تھی چہرے پر ہلاکا بکا میک اپ تھا حالانکہ مجھے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سرخی بہت بری معلوم ہوتی ہے مگر زینت کے ہونٹ سے ہوئے تھے۔ اس نے شرم کر مجھے آداب کیا تو بہت پیاری لگی لیکن جب میں نے دوسرے کونے میں ایک مسہری دیکھی جس پر پھول ہی پھول تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے زینت سے کہایہ کیا مسخرہ پن ہے۔

زینت نے میری طرف بالکل معصوم کبوتری کی طرح دیکھا، ”آپ مذاق کرتے ہیں بھائی جان!“ اس نے یہ کہا اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

مجھے ابھی غلطی کا احساس بھی نہ ہوا تھا کہ بابو گوپی ناتھ اندر داخل ہوا۔ بڑے پیار کے ساتھ اس نے اپنے رومال کے ساتھ زینت کے آنسو پوچھے اور بڑے دکھ کے ساتھ مجھ سے کہا، ”منٹو صاحب! میں سمجھا تھا کہ آپ بڑے سمجھدار اور لا اُت آدمی ہیں۔۔۔ زینو کا مذاق اڑانے سے پہلے آپ نے کچھ تو سوچ لیا ہوتا۔“

بابو گوپی ناتھ کے لمحے میں وہ عقیدت جو اسے مجھ سے تھی، زخمی نظر آئی لیکن پیشتر اس کے کہ میں اس سے معافی مانگوں، اس نے زینت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا، ”خدا تمہیں خوش رکھے!“

یہ کہہ کر بابو گوپی ناتھ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں ملامت تھی۔۔۔ بہت ہی دکھ بھری ملامت۔۔۔ اور چلا گیا۔

تلوجن نے پہلی مرتبہ ۔۔۔ چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ اس کی طبیعت سخت گھبرائی ہوئی تھی اور وہ محض کھلی ہوا میں کچھ دیر سوچنے کے لیے اڈوانی چمپیرز کے ٹیرس پر چلا آیا تھا۔

آسمان بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز، بہت بڑے خاکستری تنبو کی طرح ساری بمبی پر تناہوا تھا۔ حدِ نظر تک جگہ جگہ بتیاں روشن تھیں۔ تراویجن نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سارے ستارے حجڑ کر بلڈنگوں سے جورات کے اندر ہیرے میں بڑے بڑے درخت معلوم ہوتی تھیں، انک لگیے ہیں اور جگنوں کی طرح ٹھمٹمار ہے ہیں۔

تلوجن کے لیے یہ بالکل ایک نیا تجربہ، ایک نئی کیفیت تھی۔۔۔ رات کو کھلے آسمان کے نیچے ہونا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک اپنے فلیٹ میں قیدرہا اور قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم۔ قریب قریب تین بجے تھے۔ ہوابے حد تک پہنچ لی تھی۔ تلوجن پہنچ کی مکانگی ہوا کا عادی تھا جو اس کے سارے وجود کو بو جھل کر دیتی تھی۔ صح اٹھ کروہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا، رات بھر اس کو مارا پیٹا گیا ہے۔ پر اب صح کی قدرتی ہوا میں اس کے جسم کا روایں روایں، تروتازگی چوس کر خوش ہو رہا تھا۔ جب وہ اوپر آیا تھا تو اس کا دل و دماغ سخت مضطرب اور ہیجان زدہ تھا۔ لیکن آدھے گھنٹے ہی میں وہ اخطر اب اور ہیجان جو اس کو بہت تنگ کر رہا تھا، کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا وہ اب صاف طور پر سوچ سکتا تھا۔

کرپاں کو را اس کا سارا خاندان محلے میں تھا، جو کئی مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں کئی مکانوں کو آگ لگ چکی تھی، کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ تلوچن ان سب کو لے آیا ہوتا مگر مصیبت یہ تھی کہ کرفیونافز ہو گیا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا۔۔۔ غالباً اڑتا لیں گھنٹوں کا۔۔۔ اور تلوچن لا زماً مغلوب تھا، آس پاس سب مسلمان تھے، بڑے خوناک قسم کے مسلمان۔ اور پنجاب سے دھڑادھڑ خبریں آرہی تھیں کہ وہاں سکھ مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھار ہے ہیں۔ کوئی بھی ہاتھ۔۔۔ مسلمان ہاتھ بڑی آسانی سے نرم و نازک کرپاں کو رکی کلائی کپڑا کر موت کے کنوئیں کی طرف لے جاسکتا تھا۔

کرپال کی ماں اندھی تھی، باپ مفلوج۔ بھائی تھا، وہ کچھ عرصے سے دیوالی میں تھا کہ اسے وہاں اپنے تازہ تازہ لیے ہوئے ٹھیک کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ تزویج کو کرپال کے بھائی نز بھن پر بہت غصہ آتا تھا۔ اس نے جو کہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا، فسادات کی تیزی و تندری کے متعلق ہفتہ بھر پہلے آگاہ کر دیا تھا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔ نز بھن، یہ ٹھیک ویکے ابھی رہنے دو۔ ہم ایک بہت ہی نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ تمہارا اگرچہ رہنا بہت ضروری ہے۔ اول تو یہاں سے اٹھ جاؤ، اور میرے یہاں چلے آؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کم ہے لیکن مصیبت کے دنوں میں آدمی کسی نہ کسی طرح گزار کر لیا کرتا ہے۔۔۔ مگر وہ نہ مانا۔ اس کا انتباہ ایک پھر سن کر صرف اپنی گھنی موچھوں میں

مسکرا دیا، ”تم خواہ تجوہ فکر کرتے ہو۔۔۔ میں نے یہاں ایسے کئی فساد دیکھے ہیں۔ یہ امر تسریالا ہور نہیں بھبھی ہے، بھبھی۔ تمہیں یہاں آئے صرف چار برس ہوئے ہیں اور میں بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں۔۔۔ بارہ برس سے۔“

جانے زنجن بھبھی کو کیا سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایسا شہر ہے، اگر فساد برپا بھی ہوں تو ان کا اثر خود زائل ہو جاتا ہے جیسے اس کے پاس چھو منتر ہے۔۔۔ اوہ کہانیوں کا کوئی ایسا قلعہ ہے جس پر کوئی آفت نہیں آسکتی۔ مگر ترلوچن صح کی ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ۔۔۔ محلہ بالکل محفوظ نہیں۔ وہ صح کے اخباروں میں یہ بھی پڑھنے کے لیے تیار تھا کہ کرپال کو رہا اس کے ماں باپ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کو کرپال کو رکے مغلون باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ مر جاتے اور کرپال کو رنچ جاتی تو ترلوچن کے لیے اچھا تھا۔۔۔ وہاں دیوالی میں اس کا بھائی زنجن بھی مارا جاتا تو وہ بھی اچھا تھا کہ ترلوچن کے لیے میدان صاف ہو جاتا۔ خاص طور پر زنجن اس کے راستے میں ایک روڑا ہی نہیں، بہت بڑا ٹھنگر تھا۔ چنانچہ جب کبھی کرپال کو رہا اس کی بات ہوتی تو وہ اسے زنجن سنگھ کے بجائے ٹھنگر سنگھ کہتا۔

صح کی ہوادھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔۔۔ ترلوچن کا کیسوں سے بے نیاز سر بڑی خوشگوار ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرار ہے تھے۔۔۔ کرپال کو رنچ نہیں اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ پوں توہنے کے ٹھنگر سنگھ کی بہن تھی، مگر بہت ہی نرم و نازک چکلی تھی۔ اس نے دیہات میں پروش پائی تھی۔ وہاں کی کئی گرمیاں سردیاں دیکھی تھیں مگر اس میں وہ سختی، وہ گھاؤ، وہ مردانہ پن نہیں تھا جو دیہات کی عام سکھ لڑکیوں میں ہوتا ہے جنہیں کڑی سے کڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔

اس کے نقش پتلے پتلے تھے، جیسے ابھی نامکمل ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں جن پر بالائیوں کی چند اور تیس چڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کارنگ گورا تھا مگر کورے لٹھے کی طرح، اور بدن چکنا تھا جس طرح مری رائزڈ کپڑے کی سطح ہوتی ہے۔ بے حد شر میلی تھی۔

ترلوچن اسی کے گاؤں کا تھا مگر زیادہ دیر وہاں رہا نہیں تھا۔ پرانمری سے نکل کر جب وہ شہر کے ہائی اسکول میں گیا تو بس پھر وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ اسکول سے فارغ ہوا تو کانج کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ۔۔۔ لا تعداد مرتبہ اپنے گاؤں گیا، مگر اس نے کرپال کو کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سننا، شاید اس لیے کہ وہ ہر بار اس افراتفری میں رہتا تھا کہ جلد از جلد واپس شہر پہنچے۔

کالج کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اڑوانی چیمبرز کے ٹیریں اور کالج کی عمارت میں غالب اس برس کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ ترلوچن کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے پر تھا۔ برماء، سنگاپور، ہانگ کانگ۔۔۔ پھر بمبئی، جہاں وہ چار برس سے مقیم تھا۔ ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کو آسمان کی شکل دیکھی تھی جو بری نہیں تھی۔۔۔ خاکستری رنگ کے تنبو کی چھپت میں ہزارہا دیے روشن تھے اور ہوا لمحڈی اور ہلکی چمکی تھی۔

کرپال کو رکاسو پتے سوچتے وہ موزیل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس یہودی لڑکی کے بارے میں جو اڑوانی چیمبرز میں رہتی تھی۔ اس سے ترلوچن کو، گوڈے گوڈے عشق ہو گیا تھا۔ ایسا عشق جو اس نے اپنی پینتیس برس کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔

جس دن اس نے اڑوانی چیمبرز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دوسرے مالے پر فلیٹ لیا، اسی دن اس کی ٹڈ بھیڑ موزیل سے ہوئی جو پہلی نظر دیکھنے پر اسے خوفناک طور پر دیوانی معلوم ہوئی تھی۔ کٹھوئے بھورے بال اس کے سر پر پریشان تھے۔ بے حد پریشان۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک یوں جمی تھی جیسے گاڑھانخون اور وہ بھی جگہ جگہ سے چھپنے ہوئی تھی۔ ڈھیلاڈھالا لمبا سفید چغہ پہنے تھے جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیل پڑی بڑی چھاتیاں تین چوتحائی کے قریب نظر آ رہی تھیں۔ با نہیں جو کہ ننگی تھیں، مہین مہین بالوں سے الی ہوئی تھیں جیسے وہ ابھی کسی سیلوں سے بال کٹوا کے آئی ہے اور ان کی نفحی نفحی ہوا یا ان پر جنم گئی ہیں۔

ہونٹ اتنے موٹے نہیں تھے مگر گھرے عنابی رنگ کی لپ اسٹک کچھ اس انداز سے لگائی تھی کہ وہ موٹے اور بھینسے کے گوشت کے نکٹے معلوم ہوتے تھے۔

ترلوچن کا فلیٹ اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ بیچ میں ایک تنگ گلی تھی۔۔۔ بہت ہی تنگ۔ جب ترلوچن اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا تو موزیل باہر نکلی۔ کھڑاؤں پہنے تھی۔ ترلوچن ان کی آواز سن کر رک گیا۔ موزیل نے اپنے پریشان بالوں کی چھتوں میں سے بڑی بڑی آنکھوں سے ترلوچن کی طرف دیکھا اور ہنسی۔۔۔ ترلوچن بوکھلا گیا۔ جیب سے چابی نکال کر وہ جلدی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ موزیل کی ایک کھڑاؤں سینٹ کے چکنے فرش پر پھسلی اور اس کے اوپر آ رہی۔

جب ترلوچن سن بھلا تو موزیل اس کے اوپر تھی، کچھ اس طرح کہ اس کا لمبا چغہ اوپر چڑھ گیا تھا اور اس کی دو ننگی۔۔۔ بڑی تگڑی ٹانگیں اس کے ادھر ادھر تھیں اور۔۔۔ جب ترلوچن نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ بوکھلاہٹ میں کچھ اس طرح موزیل۔۔۔ ساری موزیل سے الجھا جیسے وہ صابن کی طرح اس کے سارے بدن پر پھر گیا ہے۔

تلوجن نے ہانپتے ہوئے مناسب و موزوں الفاظ میں سے اس معافی مانگی۔ موزیل نے اپنا الباڈھ ٹھیک کیا اور مسکرا دی، ”یہ کھڑا اؤں ایک دم کنڈم چیز ہے۔“ اور وہ اتری ہوئی کھڑا اؤں میں اپنا انگوٹھا اور اس کی ساتھ والی انگلی پھنساتی کوری ڈور سے باہر چلی گئی۔

تلوجن کا خیال تھا کہ موزیل سے دوستی پیدا کرنا شاید مشکل ہو لیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے گھل مل گئی۔ لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت خود سر تھی۔ وہ تلوجن کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس سے کھاتی تھی، اس سے پیتی تھی، اس کے ساتھ سینما جاتی تھی۔ سارا سارا دن اس کے ساتھ جو ہو پر نہاتی تھی لیکن جب وہ بانخوں اور ہونٹوں سے کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی۔ کچھ اس طور پر اسے گھڑکتی کہ اس کے سارے ولے اس کی داڑھی اور موچھوں میں چکر کاٹتے رہ جاتے۔

تلوجن کو پہلے کسی کے ساتھ محبت نہیں ہوئی تھی۔ لاہور میں، برمائیں، سگاپور میں وہ لڑکیاں کچھ عرصے کے لیے خرید لیا کرتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بمبئی پہنچتے ہی وہ ایک نہایت الھڑ قسم کی یہودی لڑکی کے عشق میں ”گوڈے گوڈے“ دھنس جائے گا۔ وہ اس سے کچھ عجیب قسم کی بے اعتنائی اور بے اتفاقی بر تی تھی۔ اس کے کہنے پر فوراً جن بن کر سینما جانے پر تیار ہو جاتی تھی مگر جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے تو ادھر ادھر نگاہیں دوڑانا شروع کر دیتی۔ کوئی اس کا شناساںکل آتا تو زور سے ہاتھ ہلاتی اور تلوجن سے اجازت لیے بغیر اس کے پہلو میں جا بیٹھتی۔

ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ تلوجن نے خاص طور پر موزیل کے لیے پر تکلف کھانے مغلوبے ہیں، مگر اس کو کوئی اپنا پرانا دوست نظر آگیا ہے اور وہ نوالہ چھوڑ کر اس کے پاس جا بیٹھی ہے اور تلوجن کے سینے پر موگ دل رہی ہے۔

تلوجن بعض اوقات بھنا جاتا تھا کیونکہ وہ اسے قطعی طور پر چھوڑ کر اپنے ان پر اనے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ چلی جاتی تھی اور کئی کئی دن اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ کبھی سر در دکا بہانہ، کبھی پیٹ کی خرابی کا جس کے متعلق تلوجن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ فولاد کی طرح سخت ہے اور کبھی خراب نہیں ہو سکتا۔

جب اس سے ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کہتی، ”تم سکھ ہو۔۔۔ یہ نازک باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔“

تلوجن جمل بھن جاتا اور پوچھتا، ”کون سی نازک باتیں۔۔۔ تمہارے پرانے یاروں کی؟“

مودیل دونوں ہاتھ اپنے چوڑے چکلے کو لہوں پر لٹکا کر اپنی ٹگٹری ٹاگلیں چوڑی کر دیتی اور کہتی، ”یہ تم مجھے ان کے طعنے کیا دیتے ہو۔۔۔ ہاں وہ میرے یار ہیں۔۔۔ اور مجھے اچھے لگتے ہیں۔ تم جلتے ہو تو جلتے رہو۔“

تلوجن بڑے و کیلانہ انداز میں پوچھتا، ”اس طرح تمہاری میری کس طرح نبھے گی؟“

مودیل زور کا قہقہہ لگاتی، ”تم سچ مج سکھ ہو۔۔۔ ایڈیٹ، تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ساتھ نہ جاؤ۔۔۔ اگر نجھانے کی بات ہے تو جاؤ اپنے وطن میں کسی سکھنی سے شادی کرو۔۔۔ میرے ساتھ تو اسی طرح چلے گا۔“

تلوجن نرم ہو جاتا۔ دراصل مودیل اس کی زبردست کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ہر حالت میں اس کی قربت کا خواہش مند تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مودیل کی وجہ سے اس کی اکثر توہین ہوتی تھی۔ معمولی معمولی کرشان لوندوں کے سامنے جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی، اسے خفیف ہونا پڑتا تھا۔ مگر دل سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا تھیہ کر لیا تھا۔

عام طور پر توہین اور ہٹک کا رد عمل انتقام ہوتا ہے مگر تلوجن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی بہت سی آنکھیں مجھ لی تھیں اور کئی کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ اس کو مودیل پسند تھی۔۔۔ پسند ہی نہیں جیسا کہ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا، ”گوڈے گوڈے“ اس کے عشق میں دھنس گیا تھا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا، اس کے جسم کا جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے وہ بھی اس عشق کی دلدل میں چلا جائے اور قصہ ختم ہو۔

دوسرے تک وہ اسی طرح خوار ہوتا رہا لیکن ثابت قدم رہا۔ آخر ایک روز جب کہ مودیل مونج میں تھی، اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا، ”مودیل۔۔۔ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو۔“ مودیل اس کے بازوؤں سے جدا ہو گئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے فراک کا گھیرا دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اپنی موٹی موٹی یہودی آنکھیں اٹھائیں اور گھنی پلکیں جھپکا کر کہا، ”میں سکھ سے محبت نہیں کر سکتی۔“

تلوجن نے ایسا محسوس کیا کہ ٹگٹری کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دہکتی ہوئی چنگاریاں رکھ دی ہیں۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی، ”مودیل! تم ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی ہو۔۔۔ یہ میرا مذاق نہیں، میری محبت کا مذاق ہے۔“

موزیل اٹھی اور اس نے اپنے بھورے تر شے ہوئے بالوں کو ایک دلفریب جھنگا دیا، ”تم شیو کرالا اور اپنے سر کے بال کھلے چھوڑ دو۔۔۔ تو میں شرط لگاتی ہوں کئی لوٹے تمہیں آنکھ ماریں گے۔۔۔ تم خوبصورت ہو۔“

تلوجن کے کیسوں میں مزید چنگاریاں پڑ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر زور سے موزیل کو اپنی طرف گھسیٹا اور اس کے عنابی ہونٹوں میں اپنے موچھوں بھرے ہونٹ پیوست کر دیے۔ موزیل نے ایک دم ”پھوں پھوں“ کی اور اس کی گرفت سے علیحدہ ہو گئی۔

”میں صبح اپنے دانتوں پر برش کر چکی ہوں۔۔۔ تم تکلیف نہ کرو۔“

تلوجن چلا یا، ”موزیل۔“

موزیل وینٹی بیگ سے نخسا آئینہ کال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی جس پر لگی ہوئی گاڑھی لپ اسٹک پر خراشیں آگئی تھیں۔ ”خدا کی قسم۔۔۔ تم اپنی داڑھی اور موچھوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے۔۔۔ ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میرا نیوی بلوسکرٹ بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں۔۔۔ بس تھوڑا سا پڑول لگانے کی ضرورت ہو گی۔“

تلوجن غصے کی اس انتہا تک پہنچ کا تھا جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ موزیل بھی آگئی اور اس نے تلوجن کی داڑھی کھونی شروع کر دی۔۔۔ اس میں جو پنیں لگی تھیں، وہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے دانتوں تلے دبایاں۔

تلوجن خوبصورت تھا۔ جب اس کے داڑھی موچھ نہیں اگی تھی تو واقعی لوگ اس کو کھلے کیسوں کے ساتھ دیکھ کر دھوکا کھاجاتے تھے کہ وہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے۔ مگر بالوں کے اس انبار نے اب اس کے تمام خدو خال جھاڑیوں کے مانند اندر چھپا لیے تھے۔ اس کو اس کا احساس تھا۔ مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرمائ بردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کر دے جن سے اس کے مذہب کی ظاہری تیکیل ہوتی تھی۔

جب داڑھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لٹکنے لگی تو اس نے موزیل سے پوچھا، ”یہ تم کیا کر رہی ہو؟“

دانتوں میں پنیں دبائے وہ مسکرائی، ”تمہارے بال بہت ملائم ہیں۔۔۔ میرا اندازہ غلط تھا کہ ان سے میر اپنی بلو سکرٹ صاف ہو سکے گا۔ ترلوچن تم یہ مجھے دے دو۔ میں انھیں گوندھ کر اپنے لیے ایک فست کلاس ٹاؤناؤں گی۔“

اب ترلوچن کی داڑھی میں چنگاریاں بھڑکنے لگی۔ وہ بڑی سنجیدگی سے موذیل سے مخاطب ہوا، ”میں نے آج تک تمہارے مذہب کا مذاق نہیں اڑایا۔۔۔ تم کیوں اڑاتی ہو۔۔۔ دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھینا اچھا نہیں ہوتا۔۔۔ میں یہ کبھی برداشت نہ کرتا۔ مگر صرف اس لیے کرتا رہا ہوں کہ مجھے تم سے بے بناء محبت ہے۔۔۔ کیا تمہیں اس کا پتہ نہیں۔“ موذیل نے ترلوچن کی داڑھی سے کھینا بند کر دیا، ”مجھے معلوم ہے۔“

”پھر۔“ ترلوچن نے اپنی داڑھی کے بال بڑی صفائی سے تہ کیے اور موذیل کے دانتوں سے پنیں نکال لیں، ”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری محبت بکواس نہیں۔۔۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ بالوں کو ایک خفیف سا جھکا دے کر وہ اٹھی اور دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی، ”میں بھی قریب قریب یہی فیصلہ کر چکلی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی۔“

ترلوچن اچھل پڑا، ”چج!“

موذیل کے عنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید مضبوط دانت ایک لمحے کے لیے چمکے۔ ”ہاں!“ ترلوچن نے اپنی نصف لپٹی ہوئی داڑھی ہی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھیجن لیا۔ ”تو۔۔۔ تو کب؟“ موذیل الگ ہٹ گئی۔ ”جب۔۔۔ تم اپنے یہ بال کٹوادو گے!“ ترلوچن اس وقت جو ہوسو ہو، بنا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا اور کہہ دیا، ”میں کل ہی کٹوادوں گا۔“ موذیل فرش پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی۔ ”تم بکواس کرتے ہوئے ترلوچن۔۔۔ تم میں اتنی ہمت نہیں ہے۔“ اس نے ترلوچن کے دل و دماغ سے مذہب کے رہے سہے خیال کو نکال باہر پھینکا۔

”تم دیکھ لو گی۔“

”دیکھ لوں گی۔“ اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ترلوچن کی موچھوں کو چوما اور ”پھوں پھوں“ کرتی باہر نکل گئی۔

تلوجن نے رات بھر کیا سوچا۔۔۔ وہ کن کن اذیتوں سے گزرا، اس کا تذکرہ فضول ہے، اس لیے کہ دوسرے روز اس نے فورٹ میں اپنے کیس کشوادیے اور داڑھی بھی منڈوادی۔۔۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ آنکھیں میچے رہا۔ جب سارا معاملہ صاف ہو گیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی شکل آئینے میں دیکھتا رہا جس پر بمبئی کی حسین سے حسین لڑکی بھی کچھ دیر کے لیے غور کرنے پر مجبور ہو جاتی۔

تلوجن وہی عجیب و غریب ٹھنڈک محسوس کرنے لگا تھا جو سیلوں سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی۔ اس نے ٹریس پر تیز تیر چلانا شروع کر دیا۔ جہاں ٹینکوں اور نلوں کا ایک ہجوم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس داستان کا باقیا حصہ اس کے دماغ میں نہ آئے۔ مگر وہ آئے بن نہ رہا۔

بال کٹوا کروہ پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے روز چٹ موڈیل کو بھیجی کہ اس کی طبیعت ناساز ہے، تھوڑی دیر کے لیے آجائے۔ موڈیل آئی۔ تلوجن کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پہلے وہ ایک لحظے کے لیے ٹھکی۔ پھر ”مائی ڈارلینگ تلوجن“ کہہ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اس کا سارا چہرہ عنابی کر دیا۔

اس نے تلوجن کے صاف اور ملامم گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے انگریزی وضع کے کٹھے ہوئے بالوں میں اپنی لکھی کی اور عربی زبان میں نعرے مارتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا۔۔۔ موڈیل نے جب اسے محسوس کیا تو اپنی سکرٹ کا گھیر اٹھایا اور اسے پوچھنا شروع کر دیا۔۔۔ تلوجن شرما گیا۔ اس نے سکرٹ پیچی کی اور سرزنش کے طور پر اس سے کہا، ”نیچے کچھ پہن تو میا کرو۔“

موڈیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی لپ اسٹک لگے ہو نہیں سے مسکرا کر اس نے صرف اتنا ہی کہا، ”مجھے بڑی گھبر اہٹ ہوتی ہے۔۔۔ ایسے ہی جلتا ہے۔“

تلوجن کو وہ پہلا دن یاد آگیا۔ جب وہ اور موڈیل دونوں ٹکرائیں گے تھے اور آپس میں کچھ عجیب طرح گذہ ہو گے تھے۔ مسکرا کر اس نے موڈیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگایا، ”شادی کل ہو گی!“

”ضرور۔“ موڈیل نے تلوجن کی ملامم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

ٹلے یہ ہوا کہ شادی پونے میں ہو۔ چونکہ سول میرج تھی اس لیے ان کو دس پندرہ دن کا نوٹس دینا تھا۔ عدالتی کارروائی تھی۔ اس لیے مناسب بھی خیال کیا گیا کہ پونا بہتر ہے۔ پاس ہے اور ترلوچن کے وہاں کئی دوست بھی ہیں۔ دوسرے روز انھیں پروگرام کے مطابق پونا روانہ ہو جانا تھا۔

موزیل، فورٹ کے ایک اسٹور میں سیلز گرل تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا۔ بس بیہیں موزیل نے اس کو انتظار کرنے کے لیے کہا تھا۔۔۔ ترلوچن وقت مقررہ پر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موڑ خریدی ہے، دیوالی چلی گئی ہے اور ایک غیر معین عرصے کے لیے وہیں رہے گی۔

ترلوچن پر کیا گزری۔۔۔؟ یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کڑا کیا اور اس کو بھول گیا۔۔۔ اتنے میں اس کی ملاقات کرپاں کو رہے ہو گئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ موزیل بہت وابیات لڑکی تھی جس کے دل کے ساتھ پتھر لگے ہوئے تھے اور جو چڑوں کے مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ پھد کتا رہتا تھا۔ اس احساس سے اس کو ایک گونہ تسلیم ہوئی تھی کہ وہ موزیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا تھا۔

لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی موزیل کی یاد ایک چنگلی کے مانند اس کے دل کو پکڑ لیتی تھی اور پھر چھوڑ کر کد کڑے لگاتی غائب ہو جاتی تھی۔۔۔ وہ بے حیا تھی۔۔۔ بے مرد تھی، اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا، پھر بھی وہ ترلوچن کو پسند تھی۔ اس لیے کبھی کبھی وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ دیوالی میں اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ ہے جس نے نئی نئی کار خریدی تھی یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے۔ اس کو اس خیال سے سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہو گی۔ حالانکہ اس کو موزیل کے کردار کا بخوبی علم تھا۔

وہ اس پر سیکڑوں نہیں ہزاروں روپے خرچ کر چکا تھا، لیکن اپنی مرضی سے۔ ورنہ موزیل مہنگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترلوچن نے اسے سونے کے ٹوپیں دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے، مگر اسی دکان میں موزیل جھوٹ اور بھڑکیلے اور بہت سستے آدیزوں پر مرمتی اور سونے کے ٹوپیں چھوڑ کر ترلوچن سے منتیں کرنے لگی کہ وہ انھیں خرید دے۔

تلوجن اب تک نہ سمجھ سکا کہ موزیل کس قماش کی لڑکی ہے۔ کس آب و گل سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ لیٹی رہتی تھی۔ اس کو چونے کی اجازت دیتی تھی۔ وہ سارا کاسار اصابن کی مانند اس کے جسم پر پھر جاتا تھا۔ مگر وہ اس کو اس سے آگے ایک انچ بڑھنے نہیں دیتی تھی۔ اس کو چڑانے کی خاطر اتنا کہہ دیتی تھی، ”تم سکھ ہو۔۔۔ مجھے تم سے نفرت ہے!

تلوجن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موزیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کامادہ اس میں رتی بھر بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس تک اس کی صحبت میں نہ گزارتی۔ دو ٹوک فیصلہ کر دیتی۔ انڈرویر اس کو ناپسند تھے۔ اس لیے کہ ان سے اس کو الجھن ہوتی تھی۔ تلوجن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم و حیا کا واسطہ دیا، مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ پہنی۔

تلوجن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا وہ چڑھاتی تھی، ”یہ حیا یا کیا بکو اس ہے۔۔۔ اگر تمہیں اس کا کچھ خیال ہے تو آنکھیں بند کر لیا کرو۔۔۔ تم مجھے یہ بتاؤ کون سال بس ہے جس میں آدمی نہ گا نہیں ہو سکتا۔۔۔ یا جس میں سے تمہاری نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں۔۔۔ مجھ سے ایسی بکو اس نہ کیا کرو۔۔۔ تم سکھ ہو۔۔۔ مجھے معلوم ہے کہ تم پہلوں کے نیچے ایک سلکی سانڈرویر پہنچتے ہو جو نیک سے ملتا جلتا ہے۔۔۔ یہ بھی تمہاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح مذہب میں شامل ہے۔۔۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمہارا نہ ہب انڈرویر میں چھپا بیٹھا ہے!

تلوجن کو شروع شروع میں ایسی باتیں سن کر غصہ آیا تھا۔ مگر بعد میں غور و فکر کرنے پر وہ کبھی کبھی لڑک جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ موزیل کی باتیں شاید نادرست نہیں اور جب اس نے اپنے کیسوں اور داڑھی کا صفائی کر دیا تو اسے قطعی طور پر ایسا محسوس ہوا کہ وہ بیکار اتنے دن بالوں کا انتابو جھ اٹھائے اٹھائے پھرا جس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔

پانی کی ٹلنگی کے پاس پہنچ کر تلوجن رک گیا۔ موزیل کو ایک بڑی موٹی گالی دے کر اس نے اس کے متعلق سوچنا بند کر دیا۔۔۔ کرپال کو۔۔۔ ایک پاکیزہ لڑکی، جس سے اس کو محبت ہوئی تھی، خطرے میں تھی۔ وہ ایسے محلے میں تھی جس میں کثر قسم کے مسلمان رہتے تھے اور وہاں دو تین واردات بھی ہو چکی تھیں۔۔۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس محلے میں اڑتا لیس گھنٹے کا کرفیو کی کون پر واکر تا ہے۔ اس چالی کے مسلمان ہی اگر چاہتے تو اندر رہی اندر کرپال کو، اس کی ماں اور اس کے باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صفائی کر سکتے تھے۔

تلوجن سوچتا سوچتا پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ ایک برس کے اندر اندر یہ پورے کیسون میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس کی داڑھی تیزی سے بڑھی مگر وہ اسے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ فورٹ میں ایک بار براہ، وہ اس صفائی سے اسے تراشتا تھا کہ ترشی ہوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے لمبے اور ملائم بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ایک سرد آہ بھری۔ اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اسے کھڑاؤں کی کرخت آواز سنائی دی، اس نے سوچا کون ہو سکتا ہے۔؟ بلڈنگ میں کئی یہودی عورتیں تھیں جو سب کی سب گھر میں کھڑاؤں پہنچتی تھیں۔ آواز قریب آتی گئی۔ یکنہت اس نے دوسری ٹنکی کے پاس موذیل کو دیکھا، جو یہودیوں کی خاص قطع کا ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتا پہنچ بڑے زور کی انگڑائی لے رہی تھی۔ اس زور کی کہ تلوجن کو محسوس ہوا اس کے آس پاس کی ہوا جنچ جائے گی۔

تلوجن، پانی کے نل پر سے اٹھا۔ اس نے سوچا، ”یہ ایک ایکی کہاں سے نمودار ہو گئی۔ اور اس وقت ٹیرس پر کیا کرنے آئی ہے؟“ موذیل نے ایک اور انگڑائی لی۔ اب تلوجن کی ہڈیاں چھٹھنے لگیں۔

ڈھیلے ڈھالے کرتے میں اس کی مضبوط چھاتیاں دھڑکیں۔ تلوجن کی آنکھوں کے سامنے کئی گول گول اور چپے چپے نیل ابھر آئے۔ وہ زور سے کھانسا۔ موذیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا رد عمل بالکل خفیف تھا۔ کھڑاؤں گھستی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی ننھی منی داڑھی دیکھنے لگی، ”تم پھر سکھ بن گئے تلوجن؟“

داڑھی کے بال تلوجن کو چھٹھنے لگے۔

موذیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت رگڑی اور مسکرا کر کہا، ”اب یہ برش اس قابل ہے کہ میری نیو بلوسکرٹ صاف کر سکے۔ مگر وہ تو وہیں دیوالی میں رہ گئی ہے۔“

تلوجن خاموش رہا۔ موذیل نے اس کے بازو کی چکلی لی، ”بولتے کیوں نہیں سردار صاحب؟“

تلوجن اپنی پچھلی بیو قوئیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اس نے صبح کے ملکے اندر ہیرے میں موذیل کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایک صرف وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔ تلوجن نے اس سے پوچھا، ”بیمار ہی ہو؟“

”نہیں۔“ موزیل نے اپنے ترشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

”پہلے سے کمزور دکھائی دیتی ہو؟“

”میں ڈائینگ کر رہی ہوں۔“ موزیل پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گئی اور کھڑا اؤں فرش کے ساتھ بجانے لگی۔ ”تم گویا کہ--- اب پھر--- نئے سرے سے سکھ بن رہے ہو۔“

تلوجن نے کسی قدر ڈھٹائی کے ساتھ کہا، ”ہاں!“

”مبارک ہو۔“ موزیل نے ایک کھڑا اؤں پیر سے اتار لی اور پانی کے نل پر بجانے لگی۔ ”کسی اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کی؟“

تلوجن نے آہستہ سے کہا، ”ہاں!“

”مبارک ہو--- اسی بلڈنگ کی ہے کوئی؟“

”نہیں---“

”یہ بہت بری بات ہے۔“ موزیل کھڑا اؤں اپنی انگلیوں میں اڑس کر اٹھی، ”ہمیشہ آدمی کو اپنے ہمسایوں کا خیال رکھنا چاہیے۔“

تلوجن خاموش رہا۔ موزیل نے اٹھ کر اس کی داڑھی کو اپنی پانچوں انگلیوں سے چھیڑا، ”کیا اسی لڑکی نے تمہیں یہ بال بڑھانے کا مشورہ دیا ہے؟“

”نہیں۔“

ترلوچن بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا جیسے کنگھا کرتے کرتے اس کی داڑھی کے بال آپس میں الجھ گیے ہیں۔ جب اس نے ”نبیں“ کہا تو اس کے لجھے میں تیکھا پن تھا۔

موزیل کے ہونٹوں پر لپ اسٹک باسی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکرائی تو ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گاؤں میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے چھری سے موٹی رگ کے گوشت کے دو ٹکڑے کر دیے ہیں۔ مسکرانے کے بعد وہ ہنسی، ”تم اب یہ داڑھی منڈاڑا لو تو کسی کی بھی قسم لے لو، میں تم سے شادی کر لوں گی۔“

ترلوچن کے جی میں آئی کہ اس سے کہے کہ وہ ایک بڑی شریف، باعصمت اور پاک طینت کنواری لڑکی سے محبت کر رہا ہے اور اسی سے شادی کرے گا۔۔۔ موزیل اس کے مقابلے میں فاحشہ ہے، بد صورت ہے، بے وفا ہے، بے مروت ہے مگر وہ اس قسم کا گھٹیا آدمی نہیں تھا۔ اس نے موزیل سے صرف اتنا کہا، ”موزیل! میں اپنی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ میرے گاؤں کی ایک سید ہمی سادی لڑکی ہے۔۔۔ جو مذہب کی پابند ہے۔ اسی کے لیے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

موزیل سوچ بچار کی عادی نہیں تھی، لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑا اول پر نصف دائرے میں گھوم کر ترلوچن سے کہا، ”وہ مذہب کی پابند ہے تو تمہیں کیسے قبول کرے گی؟ کیا اسے معلوم نہیں کہ تم ایک دفعہ اپنے بال کٹواچکے ہو؟“

”اس کو ابھی تک معلوم نہیں۔۔۔ داڑھی میں نے تمہارے دیوالی جانے کے بعد ہی بڑھانی شروع کر دی تھی۔۔۔ محض انتقامی طور پر۔۔۔ اس کے بعد میری کرپال کور سے ملاقات ہوئی۔ مگر میں یگڑی اس طریقے سے باندھتا ہوں کہ سو میں سے ایک ہی آدمی مشکل سے جان سکتا ہے کہ میرے کیس کٹھے ہوئے ہیں۔۔۔ مگر اب یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔“ ترلوچن نے اپنے لمبے ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی۔

موزیل نے لمبا کرتہ اٹھا کر اپنی گوری دیز ران کھجلانی شروع کی، ”یہ بہت اچھا ہے۔۔۔ مگر یہ کم بخت مھریہاں بھی موجود ہے۔۔۔ دیکھو، کس زور سے کاٹا ہے۔“

ترلوچن نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ موزیل نے اس جگہ جہاں مچھر نے کاٹا تھا، انگلی سے لب لگائی اور کرتہ چھوڑ کر سید ہمی کھڑی ہو گئی۔ ”کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟“

”ابھی کچھ پتہ نہیں۔“ یہ کہہ کر ترلوچن سخت متفرگ ہو گیا۔

چند لمحات تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد موزیل نے اس کے تفکر کا اندازہ لگا کر اس سے بڑے سنجیدہ انداز میں پوچھا، ”ترلوچن! تم کیا سوچ رہے ہو؟“

ترلوچن کو اس وقت کسی ہمدرد کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ موزیل ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کو سارا ماجرہ اسنادیا۔ موزیل ہنسی، ”تم اول درجے کے ایڈیٹ ہو۔۔۔ جاؤ اس کو لے آؤ۔ ایسی کیا مشکل ہے؟“

”مشکل! موزیل، تم اس معاملے کی نزاکت کو کبھی نہیں سمجھ سکتیں۔۔۔ کسی بھی معاملے کی نزاکت۔۔۔ تم ایک لاابالی قسم کی لڑکی ہو۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ تمہارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے، جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا۔“

موزیل نے زور سے اپنی کھڑائی پانی کے ٹل کے ساتھ ماری۔ ”افسوس بی ڈیمڈ۔۔۔ سملی ایڈیٹ۔۔۔ تم یہ سوچو کہ تمہاری اس۔۔۔ کیانام ہے اس کا۔۔۔ اس محلے سے بچا کر لانا کیسے ہے۔۔۔ تم بیٹھ گئے ہو تعلقات کارونا رونے۔۔۔ تمہارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے۔۔۔ تم ایک سملی قسم کے آدمی ہو۔۔۔ اور بہت ڈرپوک۔ مجھے نذر مرد چاہیے۔۔۔ لیکن چھوڑ داں با توں کو۔۔۔ چلو آؤ، تمہاری اس کو رکھ کو لے آئیں!“

اس نے ترلوچن کا بازو پکڑ لیا۔۔۔ ترلوچن نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا، ”کہاں سے؟“

”وہیں سے، جہاں وہ ہے۔۔۔ میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں۔۔۔ چلو آؤ، میرے ساتھ۔“

”مگر سنو تو۔۔۔ کرفیو ہے۔۔۔“

”موزیل کے لیے نہیں۔۔۔ چلو آؤ۔“

وہ ترلوچن کو بازو سے کپڑ کر کھینچتی اس دروازے تک لے گئی تھی جو نیچے سیڑھیوں کی طرح کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ اترنے والی تھی کہ رک گئی اور ترلوچن کی داڑھی کی طرف دیکھنے لگی۔

ترلوچن نے پوچھا، ”کیا بات ہے؟“

موزیل نے کہا، ”یہ تمہاری داڑھی۔۔۔ لیکن خیر ٹھیک ہے۔۔۔ انی بڑی نہیں ہے۔۔۔ ننگے سر چلو گے تو کوئی نہیں سمجھے گا کہ تم سکھ ہو۔“

”ننگے سر!“ ترلوچن نے کسی قدر بوکھلا کر کہا، ”میں ننگے سر نہیں جاؤں گا۔“

موزیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا، ”کیوں؟“

ترلوچن نے اپنے بالوں کی ایک لٹ ٹھیک کی۔ ”تم سمجھتی نہیں ہو۔ میرا وہاں پگڑی کے بغیر جانا ٹھیک نہیں۔“

”کیوں ٹھیک نہیں۔“

”تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک ننگے سر نہیں دیکھا۔۔۔ وہ یہی سمجھتی ہے کہ میرے کیس ہیں۔ میں اس پر یہ راز افشا نہیں کرنا چاہتا۔“

موزیل نے زور سے اپنی کھڑڑاں دروازے کی دہلیز پر ماری، ”تم واقعی اول درجے کے ایڈیٹ ہو۔۔۔ گدھے کہیں کے۔۔۔ اس کی جان کا سوال ہے۔۔۔ کیا نام ہے، تمہاری اس کورکا، جس سے تم محبت کرتے ہو۔“

ترلوچن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی، ”موزیل، وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے۔۔۔ اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔“

موزیل چڑھی، ”اوہ، تمہاری محبت بیڈیمڈ۔۔۔ میں پوچھتی ہوں۔ کیا سارے سکھ تمہارے طرح کے بے وقوف ہوتے ہیں۔۔۔ اس کی جان کو خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ پگڑی ضرور پہنو گے۔۔۔ اور شاید وہ اپنا انڈرویر بھی جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔“

ترلوچن نے کہا، ”وہ تو میں ہر وقت پہنے ہوتا ہوں۔“

”بہت اچھا کرتے ہو۔۔۔ مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس مسئلے کا ہے جہاں میاں بھائی ہی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی۔۔۔ تم پگڑی پہن کر گئے تو وہیں ذبح کر دیے جاؤ گے۔“

ترلوچن نے مختصر سا جواب دیا، ”مجھے اس کی پروا نہیں۔۔۔ اگر میں تمہارے ساتھ وہاں جاؤں گا تو پگڑی پہن کر جاؤں گا۔۔۔ میں اپنی محبت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا!“

موزیل جھنجھلا گئی۔ اس زور سے اس نے پیچہ و تاپ کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑ بھڑ لگئیں۔ ”گدھے۔۔۔ تمہاری محبت ہی کہاں رہے گی۔ جب تم نہ ہو گے۔۔۔ تمہاری وہ۔۔۔ کیا نام ہے اس بھڑوی کا۔۔۔ جب وہ بھی نہ رہے گی۔ اس کا خاندان تک نہ رہے گا۔۔۔ تم سکھ۔۔۔ خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو!“

ترلوچن بھنا گیا، ”بکواس نہ کرو!“

موزیل زور سے ہنسی۔ مہین مہین بالوں کے غبار سے اٹی ہوئی بانخیں اس نے ترلوچن کے گلے میں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھوول کر کہا، ”ڈار لنگ چلو، جیسے تمہاری مرضی۔۔۔ جاؤ پگڑی پہن آؤ۔ میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں۔“

یہ کہہ کروہ نیچے جانے لگی۔ ترلوچن نے اسے روکا، ”تم کپڑے نہیں پہنو گی!“

موزیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا، ”نہیں۔۔۔ چلے گا اسی طرح۔“

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اتر گئی۔ ترلوچن نخلی منزل کی سیڑھیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کی چوبی آواز سنتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لمبے بال انگلیوں سے پیچھے کی طرف سمیٹے اور نیچے اتر کر اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ جلدی جلدی اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ پگڑی بندھی بندھائی رکھی تھی۔ اسے اچھی طرح سر پر جمایا اور فلیٹ کا دروازہ مغل کر کے نیچے اتر گیا۔

باہر فٹ پا تھا پر موذیل اپنی ٹنگڑی ٹالگیں چوڑی کیے سگرٹ پی رہی تھی۔ بالکل مردانہ انداز میں۔ جب ترلوچن اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے شرارت کے طور پر منہ بھر کے دھواں اس کے چہرے پر دے مارا۔ ترلوچن نے غصے میں کہا، ”تم بہت ذلیل ہو۔“

موذیل مسکرائی، ”یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کی۔۔۔ اس سے پہلے اور کئی مجھے ذلیل کہہ چکے ہیں۔“ پھر اس نے ترلوچن کی پگڑی کی طرف دیکھا، ”یہ پگڑی تم نے واقعی بہت اچھی طرح باندھی ہے۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے کیس ہیں۔“

بازار بالکل سنسنائی تھا۔ ایک صرف ہوا چل رہی تھی اور وہ بھی بہت دھیرے دھیرے۔ جیسے کرنیو سے خوف زدہ ہے۔ بیال روشن تھیں مگر ان کی روشنی یمار سی معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت ٹریمیں چلنی شروع ہو جاتی تھیں اور لوگوں کی آمد و رفت بھی جاری ہو جاتی تھی۔ اچھی خاصی گہما گہما ہوتی تھی۔ پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک پر کوئی انسان گزرائے نہ گزرے گا۔

موذیل آگے آگے تھی۔ فٹ پا تھے کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کرتی کر رہی تھی۔ یہ آواز، اس خاموش فضائیں ایک بہت بڑا شور تھی۔ ترلوچن دل ہی دل میں موذیل کو بر اجھلا کہہ رہا تھا کہ دو منٹ میں اور کچھ نہیں تو اپنی واہیات کھڑاؤں ہی اتنا کر کوئی دوسرا چیز پہن سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موذیل سے کہے کھڑاؤں اتنا دو اور ننگے پاؤں چلو۔ مگر اس کو یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی۔ اس لیے خاموش رہا۔

ترلوچن سخت خوف زدہ تھا۔ کوئی پتا کھڑک تا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ مگر موذیل بالکل بے خوف چلی جا رہی تھی۔ سگرٹ کا دھواں اڑاتی جیسے وہ بڑی بے فکری سے چھل قدمی کر رہا ہے۔

چوک میں پہنچے تو پولیس میں کی آواز گرجی، ”اے۔۔۔ کدھر جا رہا ہے۔“

تلوجن سہم گیا۔ موزیل آگے بڑھی اور پویس مین کے پاس پہنچ گئی اور بالوں کو ایک خفیف سا جھکادے کر کہا، ”اوہ، تم--- ہم کو پہچانا نہیں تم نے--- موزیل---“ پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا، ”ادھر اس باجو--- ہمارا بہن رہتا ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہے--- ڈاکٹر لے کر جا رہا ہے---“

سپاہی اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے خدا معلوم کہاں سے سکریٹ کی ڈیانکالی اور ایک سکرٹ نکال کر اس کو دیا، ”لو بیو۔“

سپاہی نے سکرٹ لے لیا۔ موزیل نے اپنے منہ سے سلاگا ہوا سکرٹ نکالا اور اس سے کہا، ”ہیر از لائٹ!“

سپاہی نے سکرٹ کا کش لیا۔ موزیل نے داہنی آنکھ اس کو اور بائیں آنکھ تلوجن کوماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف چل دی۔--- جس میں سے گزر کر انھیں--- محلے جانا تھا۔

تلوجن خاموش تھا، مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ موزیل کر فیو کی خلاف ورزی کر کے ایک عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس کر رہی ہے۔--- خطروں سے کھلینا اسے پسند تھا۔ جب جو ہو پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لیے ایک مصیبت بن جاتی تھی۔ سمندر کی پیل تن لہروں سے ٹکراتی، بھڑتی وہ دور تک نکل جاتی تھی اور اس کو ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ وہ کہیں ڈوب نہ جائے۔ جب واپس آتی تو اس کا جسم سپیوں اور زخموں سے بھرا ہوتا تھا مگر اسے ان کی کوئی پرانی نہیں ہوتی تھی۔

موزیل آگے آگے تھی۔ تلوجن اس کے پیچھے پیچھے۔ ڈر ڈر کے ادھر ادھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی بغل سے کوئی چھری مار نمودار نہ ہو جائے۔ موزیل رک گئی۔ جب تلوجن پاس آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا، ”تلوجن ڈیئر۔“ اس طرح ڈرنا اچھا نہیں۔--- تم ڈروگے تو ضرور کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا۔--- سچ کہتی ہوں، یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے۔“

تلوجن خاموش رہا۔

جب وہ گلی طے کر کے دوسری گلی میں پہنچے جو اس محلے کی طرف نکلتی تھی، جس میں کرپال کور رہتی تھی تو موزیل چلتے چلتے ایک دم رک گئی۔--- کچھ فاصلے پر بڑے اطمینان سے ایک مارواڑی کی دکان لوٹی جا رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے معاملے کا جائزہ لیا اور تلوجن سے کہا، ”کوئی بات نہیں۔--- چلو آؤ۔“

دونوں چلنے لگے۔۔۔ ایک آدمی جو سر پر بہت بڑی پرات اٹھائے چلا آ رہا تھا، ترلوچن سے ٹکرایا۔ پرات گر گئی۔ اس آدمی نے غور سے ترلوچن کی طرف دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ اس آدمی نے جلدی سے اپنے نینے میں ہاتھ ڈالا۔۔۔ کہ موذیل آگئی۔ لڑکھڑاتی ہوئی جیسے نشے میں چور ہے اس نے زور سے اس کو آدمی کو دھکا دیا اور مخمور لجھے میں کہا، ”اے کیا کرتا ہے۔۔۔ اپنے بھائی کو مارتا ہے۔۔۔ ہم اس سے شادی بنانے کو ملتا ہے۔“ پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئی، ”کریم۔۔۔ اٹھاؤ، یہ پرات اور کھداوس کے سر پر۔“

اس آدمی نے نینے میں سے ہاتھ نکال لیا اور شہوانی آنکھوں سے موذیل کی طرف دیکھا، پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹھوکا دیا، ”عیش کر سالی۔۔۔ عیش کر“ پھر اس نے پرات اٹھائی اور یہ جا، وہ جا۔

ترلوچن بڑھا یا، ”کیسی ذلیل حرکت کی ہے حرامزادے نے!“

موذیل نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا، ”کوئی ذلیل حرکت نہیں۔۔۔ سب چلتا ہے۔۔۔ آؤ۔“

اور وہ تیز تیز چلنے لگی۔۔۔ ترلوچن نے بھی قدم تیز کر دیے۔ یہ گلی طے کر کے دونوں اس محلے میں پہنچ گئے جہاں کرپال کور رہتی تھی۔ موذیل نے پوچھا، ”کس گلی میں جانا ہے؟“

ترلوچن نے آہستہ سے کہا، ”تیسرا گلی میں۔۔۔ نکڑواںی بلڈنگ!“

موذیل نے اس طرف چلا شروع کر دیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا۔ آس پاس اتنی گنجان آبادی تھی مگر کسی بچے تک کے رونے کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑ بڑ دکھائی دی۔۔۔ ایک آدمی اس کنارے والی بلڈنگ سے نکلا اور دوسرے کنارے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔ اس بلڈنگ سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔ فٹ پا تھک پرانھوں نے ادھر ادھر دیکھا اور بڑی پھرتی سے دوسری بلڈنگ میں چلے گئی۔ موذیل ٹھٹک گئی تھی۔ اس نے ترلوچن کو اشارہ کیا کہ اندر ہیرے میں ہو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا، ”ترلوچن ڈیئر۔۔۔ یہ پگڑی اتنا دو!“

تلوجن نے جواب دیا، ”میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں اتنا سکتا!“

موذیل جھنجلا گئی، ”تمہاری مرضی۔۔۔ لیکن تم دیکھتے نہیں، سامنے کیا ہو رہا ہے۔۔۔“

سامنے جو کچھ ہو رہا تھا دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا۔۔۔ صاف گڑ بڑھو رہی تھی اور بڑی پر اسرار قسم کی۔ دائیں ہاتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر بوریاں اٹھائے نکلے تو موذیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ ان میں سے کچھ گاڑھی گاڑھی سیال سی چیز ٹپک رہی تھی۔ موذیل اپنے ہونٹ کا ٹھنڈا گلی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی۔ جب یہ دونوں آدمی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے تلوچن سے کہا، ”دیکھو، ایسا کرو۔۔۔ میں بھاگ کر نکڑواں بلڈنگ میں جاتی ہوں۔۔۔ تم میرے پیچے آنا۔۔۔ بڑی تیزی سے، جیسے تم میرا پیچھا کر رہے ہو۔۔۔ سمجھے۔۔۔ مگر یہ سب ایک دم جلدی جلدی میں ہو۔“

موذیل نے تلوچن کے جواب کا انتظار نہ کیا اور نکڑواں بلڈنگ کی طرف کھڑا اُن کھنکھاتی بڑی تیزی سے بھاگی۔ تلوچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ چند لمحوں میں وہ بلڈنگ کے اندر تھے۔۔۔ سیڑھیوں کے پاس۔ تلوچن ہانپ رہا تھا۔ مگر موذیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے تلوچن سے پوچھا، ”کون ساما لا؟“

تلوجن نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری، ”دوسراء۔“

”چلو۔“

یہ کہہ کروہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ تلوچن اس کے پیچھے ہو لیا۔ زینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ ان کو دیکھ کر اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔ دوسرے مالے پر پہنچ تو کوری ڈور میں کچھ دور جا کر تلوچن نے ہولے سے ایک دروازے پر دستک دی۔ موذیل دور سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔ تلوچن نے ایک بار پھر دستک دی اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی۔

”مہنگا سنگھ جی۔۔۔ مہنگا سنگھ جی!“

اندر سے مہین آواز آئی، ”کون؟“

”تلوجن!“

دروازہ دھیرے سے کھلا۔۔۔ تلوچن نے موزیل کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آئی دونوں اندر داخل ہوئے۔۔۔ موزیل نے اپنی بغل میں ایک دبی پتکی لڑکی کو دیکھا۔۔۔ جو بے حد سہی ہوئی تھی۔ موزیل نے اس کو ایک لحظے کے لیے غور سے دیکھا۔ پتکے پتکے نقش تھے۔ ناک بہت ہی پیاری تھی مگر زکام میں مبتلا۔ موزیل نے اس کو اپنے چوڑے چکلے سینے کے ساتھ لگایا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کادا من اٹھا کر اس کی ناک پوچھی۔ تلوچن سرخ ہو گیا۔ موزیل نے کرپال کو رے بڑے پیار کے ساتھ کہا، ”ڈر نہیں، تلوچن تمہیں لینے آیا ہے۔“

کرپال کو نے تلوچن کی طرف اپنی سہی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موزیل سے الگ ہو گئی۔ تلوچن نے اس سے کہا، ”سردار صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہو جائیں۔۔۔ اور اپنی ماتا جی سے بھی۔۔۔ لیکن جلدی کرو۔“ اتنے میں اوپر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی چیخ چلا رہا ہے اور دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔ کرپال کو رکے حلق سے دبی دبی چیخ بلند ہوئی، ”اسے پکڑ لیا انہوں نے!“

تلوجن نے پوچھا، ”کے؟“

کرپال کو رجواب دینے ہی والی تھی کہ موزیل نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کونے میں لے گئی۔ ”پکڑ لیا تو اچھا ہوا۔۔۔ تم یہ کپڑے اتارو۔“

کرپال کو رابھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موزیل نے آنا فانا اس کی قمیص اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ کرپال کو نے اپنی بانہوں میں اپنے ننگے جسم کو چھپالیا اور سخت وحشت زدہ ہو گئی۔ تلوچن نے منہ دوسرا طرف منہ موڑ لیا۔ موزیل نے اپنا ڈھیلہ ڈھالا کر تا اتار اور اس کو پہنا دیا۔ خود وہ ننگ دھڑنگ تھی۔ جلدی جلدی اس نے کرپال کو کا ازار بند ڈھیلہ کیا اور اس کی شلوار اتار کر، تلوچن سے کہنے لگی، ”جاو، اسے لے جاؤ۔۔۔ لیکن ٹھہرو۔“ یہ کہہ کر اس نے کرپال کو رکے بال کھول دیے اور اس سے کہا، ”جاو۔۔۔ جلدی نکل جاؤ۔“

تلوجن نے اس سے کہا، ”آؤ۔۔۔“ مگر فوراً ہی رک گیا۔ پلٹ کر اس نے موزیل کی طرف دیکھا جو دھوئے دیدے کی طرح ننگی کھڑی تھی۔ اس کی بانہوں پر مہین مہین بال سردی کے باعث جاگے ہوئے تھے۔

”تم جاتے کیوں نہیں ہو؟“ موزیل کے لبھے میں چڑھا پن تھا۔

تلوجن نے آہستہ سے کہا، ”اس کے ماں باپ بھی تو ہیں۔“

”جہنم میں جائیں وہ--- تم اسے لے جاؤ۔“

”اور تم؟“

”میں آجائیں گی۔“

ایک دم اوپر کی منزل سے کئی آدمی دھڑادھڑ نیچے اترنے لگے۔ دروازے کے پاس آ کر انہوں نے اسے کوٹنا شروع کر دیا جیسے وہ اسے توڑھی ڈالیں گے۔ کرپال کور کی اندھی ماں اور اس کا مغلون باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔ موزیل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیف سا جھٹکا دے کر اس نے تلوچن سے کہا، ”سنو۔ اب صرف ایک ہی ترکیب سمجھ میں آتی ہے--- میں دروازہ کھولتی ہوں---“

کرپال کور کے خشک حلقت سے چینچنگتی نکلتی دب گئی، ”دروازہ۔“

موزیل، تلوچن سے مخاطب رہی، ”میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوں، تم میرے پیچھے بھاگنا۔ میں اوپر چڑھ جاؤں گی۔ تم بھی اوپر چلے آنا۔ یہ جو لوگ جو دروازہ توڑ رہے ہیں، سب کچھ بھول جائیں گے اور ہمارے پیچھے چلے آئیں گے---“

تلوجن نے پھر پوچھا، ”پھر؟“

موزیل نے کہا، ”یہ تمہاری--- کیا نام ہے اس کا--- موقعہ پا کر نکل جائے--- اس لباس میں اسے کوئی کچھ نہ کہے گا۔“

تلوجن نے جلدی جلدی کرپال کو رکوساری بات سمجھا دی۔ موزیل زور سے چلائی۔ دروازہ کھولا اور دھڑام سے باہر کے لوگوں پر گری۔ سب بوکھلا گئے۔ اٹھ کر اس نے اپر کی سیڑھیوں کا رخ کیا۔ تلوجن اس کے پیچھے بھاگا۔ سب ایک طرف ہٹ گئے۔

موزیل اندر ہند سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ کھڑاؤں اس کے پیروں میں تھی۔ وہ جو لوگ جو دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے سنجل کر ان کے تعاقب میں دوڑے۔ موزیل کا پاؤں پھسلا۔ اپر کے زینے سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ ہر پتھر میلے زینے کے ساتھ ٹکراتی، لوہے کے جنگل کے ساتھ اجھتی وہ نیچے آ رہی۔ پتھر میلے فرش پر۔

تلوجن ایک دم نیچے اتر۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ کانوں کے رستہ بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ جو دروازہ توڑنے آئے تھے ار گرد جمع ہو گئے۔ کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔ سب خاموش تھے اور موزیل کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے۔ جس پر جا بجا خراشیں پڑی تھیں۔

تلوجن نے اس کا بازو ہلايا اور آواز دی، ”موزیل۔۔۔ موزیل۔۔۔“

موزیل نے اپنی بڑی بڑی یہودی آنکھیں کھولیں جو لال بوٹی ہو رہی تھیں اور مسکرائی۔ تلوجن نے اپنی پگڑی اتاری اور کھول کر اس کا نگا جسم ڈھک دیا۔ موزیل پھر مسکرائی اور آنکھ مار کر اس نے تلوجن سے منہ میں خون کے بلبلہ اڑاتے ہوئے کہا، ”جائے، دیکھو۔۔۔ میرا اندر ویڑوہاں ہے کہ نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے وہ۔۔۔“

تلوجن اس کا مطلب سمجھ گیا مگر اس نے اٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موزیل نے غصے میں کہا، ”تم سچ مج سکھ ہو۔۔۔ جاؤ دیکھ کر آؤ۔“

تلوجن اٹھ کر کرپال کو رکے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ موزیل نے اپنی دھنڈی آنکھوں سے آس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا اور کہا، ”یہ میاں بھائی ہے۔۔۔ لیکن بہت دادا قسم کا۔۔۔ میں اسے سکھ کہا کرتی ہوں۔“

تلوجن واپس آگیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں موزیل کو بتا دیا کہ کرپال کو رجا بھی ہے۔۔۔ موزیل نے اطمینان کا سانس لیا۔۔۔ لیکن ایسا کرنے سے بہت ساخون اس کے منہ سے بہہ نکلا، ”اوہ ڈیم اٹ۔۔۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی کلامی سے اپنا منہ پوچھا اور تلوجن سے مخاطب ہوئی، ”آل رائٹ ڈارنگ۔۔۔ بائی بائی۔“

تلوجن نے کچھ کہنا چاہا، مگر لفظ اس کے حلق میں اٹک گیے۔ موذیل نے اپنے بدن پر سے تلوچن کی گلڑی ہٹائی۔

”لے جاؤ اس کو۔۔۔ اپنے اس مذہب کو۔“ اور اس کا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بے حس ہو کر گر پڑا۔

-[32]-

بد صورتی: سعادت حسن منٹو

ساجدہ اور حامدہ دو بہنیں تھیں۔ ساجدہ چھوٹی اور حامدہ بڑی۔ ساجدہ خوش شکل تھی۔ ان کے ماں باپ کو یہ مشکل در پیش تھی کہ ساجدہ کے رشتے آتے مگر حامدہ کے متعلق کوئی بات نہ کرتا۔ ساجدہ خوش شکل تھی مگر اس کے ساتھ اسے بننا سونرا بھی آتا تھا۔

اس کے مقابلے میں حامدہ بہت سیدھی سادی تھی۔ اس کے خدوخال بھی پر کشش نہ تھے۔ ساجدہ بڑی چنچل تھی۔ دونوں جب کالج میں پڑھتی تھیں تو ساجدہ ڈراموں میں حصہ لیتی۔ اس کی آواز بھی اچھی تھی، سر میں گاسکتی تھی۔ حامدہ کو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔

کالج کی تعلیم سے فراغت ہوئی تو ان کے والدین نے ان کی شادی کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ ساجدہ کے لیے کئی رشتے تو آپکے تھے، مگر حامدہ بڑی تھی، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ پہلے اس کی شادی ہو۔ اسی دوران میں ساجدہ کی ایک خوبصورت لڑکے سے خط و کتابت شروع ہو گئی، جو اس پر بہت دنوں سے مرتا تھا۔ یہ لڑکا امیر گھرانے کا تھا۔ ایم اے کرپکا تھا اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس کے ماں باپ چاہتے تھے کہ اس کی شادی ہو جائے تاکہ وہ بیوی کو اپنے ساتھ لے جائے۔

حامدہ کو معلوم تھا کہ اس کی چھوٹی بہن سے وہ لڑکا بے پناہ محبت کرتا ہے۔ ایک دن جب ساجدہ نے اس لڑکے کا عشقیہ جذبات سے لبریز خط دکھایا تو وہ دل ہی دل میں بہت کڑھی، اس لیے کہ اس کا چاہنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے اس خط کا ہر لفظ بار بار پڑھا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے دل میں سوئاں چھر رہی ہیں، مگر اس نے اس درود کرب میں بھی ایک عجیب قسم کی لذت محسوس کی، لیکن وہ اپنی چھوٹی بہن پر بر سر پڑی:

”تمہیں شرم نہیں آتی کہ غیر مردوں سے خط و کتابت کرتی ہو؟“

ساجدہ نے کہا، ”باجی--- اس میں کیا عیب ہے؟“

”عیب---! سراسر عیب ہے۔ شریف گھر انوں کی لڑکیاں کبھی ایسی بیہودہ حرکتیں نہیں کرتیں--- تم اس لڑکے حامد سے محبت کرتی ہو؟“

”ہاں!“

”لعنۃ ہے تم پر۔“

ساجدہ بھنا گئی، ”دیکھو باجی مجھ پر لعنۃ نہ سمجھو--- محبت کرنا کوئی جرم نہیں۔“

حامدہ چلائی، ”محبت، محبت--- آخر یہ کیا بکواس ہے۔“

ساجدہ نے بڑے طنزیہ انداز میں کہا، ”جو آپ کو نصیب نہیں۔“

حامدہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔ چنانچہ کھوکھلے غصے میں آکر اس نے چھوٹی بہن کے منہ پر زور کا تھپٹہ مار دیا۔۔۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے الجھ گئیں۔ دیر تک ان میں ہاتھا پائی ہوتی رہی۔ حامدہ اس کو یہ کوئے دیتی رہی کہ وہ ایک نا محترم مرد سے عشق لڑا رہی ہے، اور ساجدہ اس سے یہ کہتی رہی کہ وہ جلتی ہے، اس لیے کہ اس کی طرف کوئی مرد آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔

حامدہ ڈیل ڈول کے لحاظ سے اپنی چھوٹی بہن کے مقابلے میں کافی ٹگڑی تھی، اس کے علاوہ اسے خار بھی تھی جس نے اس کے اندر اور بھی قوت پیدا کر دی تھی۔۔۔ اس نے ساجدہ کو خوب پیٹا۔ اس کے گھنے بالوں کی کئی خوبصورت لٹیں نوج ڈالیں اور خود ہانپتی ہانپتی اپنے کمرے میں جا کر زار و قطار رونے لگی۔

ساجدہ نے گھر میں اس حادثے کے بارے میں کچھ نہ کہا۔۔۔ حامدہ شام تک روتی رہی۔ بے شمار خیالات اس کے دماغ میں آئے۔ وہ نادم تھی کہ اس نے محض اس لیے کہ اس سے کوئی محبت نہیں کرتا، اپنی بہن کو، جو بڑی نازک ہے، پیٹ ڈالا۔ وہ ساجدہ کے کمرے میں گئی۔

دروازے پر دستک دی اور کہا، ”ساجدہ!“

ساجدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

حامدہ نے پھر زور سے دستک دی اور رونی آواز میں پکاری، ”سامجی! میں معافی مانگنے آئی ہوں۔۔۔ خدا کے لیے دروازہ کھولو۔“

حامدہ دس پندرہ منٹ تک دلہیز کے پاس آنکھوں میں ڈبڈ بائے آنسو لیے کھڑی رہی، اسے یقین نہیں تھا کہ اس کی بہن دروازہ کھولے گی، مگر وہ کھل گیا۔ ساجدہ باہر نکلی اور اپنی بڑی بہن سے ہم آغوش ہو گئی، ”کیوں باجی۔۔۔ آپ روکیوں رہی ہیں؟“

حامدہ کی آنکھوں میں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، ”مجھے افسوس ہے کہ تم سے آج بے کار لڑائی ہو گئی۔“

”باجی۔۔۔ میں بہت نادم ہوں کہ میں نے آپ کے متعلق ایسی بات کہہ دی جو مجھے نہیں کہنی چاہیے تھی۔“

”تم نے اچھا کیا ساجدہ۔۔۔ میں جانتی ہوں کہ میری شکل و صورت میں کوئی کشش نہیں۔۔۔ خدا کرے تمہارا حسن قائم رہے۔“

”باجی۔۔۔ میں قطعاً حسین نہیں ہوں۔ اگر مجھ میں کوئی خوبصورتی ہے تو میں دعا کرتی ہوں کہ خدا اسے مٹا دے۔۔۔ میں آپ کی بہن ہوں۔۔۔ اگر آپ مجھے حکم دیں تو میں اپنے چہرے پر تیزاب ڈالنے کے لیے تیار ہوں۔“

”کسی فضول باتیں کرتی ہو۔۔۔ کیا بگزے ہوئے چہرے کے ساتھ تمہیں حامد قبول کر لے گا؟“

”مجھے یقین ہے۔۔۔“

”کس بات کا؟“

”وہ مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اگر میں مر جاؤں تو وہ میری لاش سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو گا۔“

”یہ محض بکواس ہے۔“

”ہو گی۔۔۔ لیکن مجھے اس کا لقین ہے۔۔۔ آپ اس کے سارے خط پڑھتی رہی ہیں۔۔۔ کیا ان سے آپ کو یہ پتہ نہیں چلا کہ وہ مجھ سے کیا کیا پیمان کر چکا ہے۔“

”سامجی۔۔۔“ یہ کہہ کر حامدہ رک گئی۔ تھوڑے وقفے کے بعد اس نے لرزائ آواز میں کہا، ”میں عہد و پیمان کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔۔۔“ اور روناشر ورع کر دیا۔

اس کی چھوٹی بہن نے اسے گلے سے لگایا۔ اس کو پیار کیا اور کہا، ”باجی۔۔۔ آپ اگر چاہیں تو میری زندگی سنور سکتی ہے۔“

”کسے؟“

”مجھے حامد سے محبت ہے۔۔۔ میں اس سے وعدہ کر چکی ہوں کہ اگر میری کہیں شادی ہو گی تو تمہیں سے ہو گی۔“

”تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

”میں یہ چاہتی ہوں۔۔۔ کہ آپ اس معاملے میں میری مدد کریں۔ اگر وہاں سے پیغام آئے تو آپ اس کے حق میں گفتگو کیجیے۔۔۔ امی اور ابا آپ کی ہربات مانتے ہیں۔“

”میں انشاء اللہ تمہیں نا امید نہیں کروں گی۔“

ساجدہ کی شادی ہو گئی، حالانکہ اس کے والدین پہلے حامدہ کی شادی کرنا چاہتے تھے۔۔۔ مجبوری تھی، کیا کرتے۔ ساجدہ اپنے گھر میں خوش تھی۔ اس نے اپنی بڑی بہن کو شادی کے دوسرا دن خط لکھا جس کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا:

”میں بہت خوش ہوں۔۔۔ حامد مجھ سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ باہی۔۔۔ محبت عجیب و غریب چیز ہے۔۔۔ میں بے حد مسرور ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا صحیح مطلب اب میری سمجھ میں آیا ہے۔۔۔ خدا کرے کہ آپ بھی اس مسرت سے محفوظ ہوں۔۔۔“

اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں اس خط میں تھیں، جو ایک بہن اپنی بہن کو لکھ سکتی ہے۔

حامدہ نے یہ پہلا خط پڑھا اور بہت روئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا ہر لفظ ایک ہتھوار ہے جو اس کے دل پر ضرب لگا رہا ہے۔

اس کے بعد اس کو اور بھی خط آئے جن کو پڑھ پڑھ کے اس کے دل پر چھریاں چلتی رہیں۔ رو رو کہ اس نے اپنا براحال کر لیا تھا۔۔۔ اس نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ کوئی راہ چلتا جوان لڑکا اس کی طرف متوجہ ہو، مگر ناکام رہی۔

اسے اس عرصے میں ایک ادھیر عمر کا مرد ملا۔ بس میں مذہبیت ہوئی۔ وہ اس سے مراسم قائم کرنا چاہتا تھا مگر حامدہ نے اسے پسند نہ کیا۔ وہ بہت بد صورت تھا۔

دو برس کے بعد اس کی بہن ساجدہ کا خط آیا کہ وہ اور اس کا خاوند آرہے ہیں۔

وہ آئے۔ حامدہ نے مناسب و موزوں طریقہ پر ان کا خیر مقدم کیا۔ ساجدہ کے خاوند کو اپنے کاروبار کے سلسلے میں ایک ہفتے تک قیام کرنا تھا۔

ساجدہ سے مل کر اس کی بڑی بہن بہت خوش ہوئی۔۔۔ حامد بڑی خوش اخلاقی سے پیش آیا۔ وہ اس سے بھی متاثر ہوئی۔

وہ گھر میں اکیلی تھی، اس لیے کہ اس کے والدین کسی کام سے سر گودھا چلے گئے تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ حامدہ نے نوکروں سے کہا کہ وہ بستروں کا انتظام ٹھنڈا میں کر دیں اور بڑا پکھا لگا دیا جائے۔

یہ سب کچھ ہو گیا۔۔۔ لیکن ہو ایہ کہ ساجدہ کسی حاجت کے تحت اوپر کوٹھے پر گئی اور دیر تک وہیں رہی۔ حامد کوئی ارادہ کرچکا تھا۔ آنکھیں نیند سے بو جھل تھیں۔ اٹھ کر ”ساجدہ“ کے پاس گیا اور اس کے ساتھ لیٹ گیا۔۔۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ غیر سی کیوں لگتی ہے۔ کیوں کہ وہ شروع شروع میں بے اعتنائی بر تی رہی۔۔۔ آخر میں وہ ٹھیک ہو گئی۔

ساجدہ کوٹھے سے اتر کر نیچے آئی اور اس نے دیکھا۔۔۔

صحیح کو دونوں بہنوں میں سخت لڑائی ہوئی۔۔۔ حامد بھی اس میں شامل تھا۔ اس نے گرمگرمی میں کہا، ”تمہاری بہن، میری بہن ہے۔۔۔ تم کیوں مجھ پر شک کرتی ہو۔“

حامد نے دوسرے روز اپنی بیوی ساجدہ کو طلاق دے دی اور دو تین مہینوں کے بعد حامدہ سے شادی کر لی۔۔۔ اس نے اپنے ایک دوست سے جس کو اس پر اعتراض تھا، صرف اتنا کہا، ”تو بصورتی میں خلوص ہونانا ممکن ہے۔۔۔ بد صورتی ہمیشہ پر خلوص ہوتی ہے۔“

-[33]-

انقلاب پسند: سعادت حسن منٹو

میری اور سلیم کی دوستی کو پانچ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس زمانے میں ہم نے ایک ہی اسکول سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا، ایک ہی کالج میں داخل ہوئے اور ایک ہی ساتھ ایف۔ اے۔ کے امتحان میں شامل ہو کر فیل ہوئے۔ پھر پرانا کالج چھوڑ کر ایک نئے کالج میں داخل ہوئے۔ اس سال میں تو پاس ہو گیا۔ مگر سلیم سوئے قسم سے پھر فیل ہو گیا۔

سلیم کی دوبارہ ناکامیابی سے لوگ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ وہ آوارہ مزاج اور نالائق ہے۔ یہ بالکل افتراء ہے۔ سلیم کا بغلی دوست ہونے کی حیثیت سے میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ سلیم کا دماغ بہت روشن ہے۔ اگر وہ کالج کی پڑھائی کی طرف ذرا بھی توجہ دیتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ صوبہ بھر میں اول نہ رہتا۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے پڑھائی کی طرف کیوں توجہ نہ دی؟

جہاں تک میرا ذہن کام دیتا ہے مجھے اس کی تمام ترویج وہ خیالات معلوم ہوتے ہیں جو ایک عرصے سے اس کے دل و دماغ پر آہستہ آہستہ چھا رہے تھے۔ دسویں جماعت اور کالج میں داخل ہوتے وقت سلیم کا دماغ ان تمام الحسنوں سے آزاد تھا۔ جس نے اسے ان دنوں پاگل خانے کی چار دیواری میں قید کر کھا ہے۔ ایام کالج میں وہ دیگر طلبہ کی طرح کھلیل کو دیں حصہ لیا کرتا تھا۔ سب لڑکوں میں ہر دلعزیز تھا۔ مگر یا کیک اس کے والد کی ناگہانی موت نے اس کے متنبسم چہرے پر غم کی نقاب اڑھادی۔۔۔ اب کھلیل کو دی جگہ غور و فکر نے لے لی۔

وہ کیا خیالات تھے، جو سلیم کے مضطرب دماغ میں پیدا ہوئے۔۔۔؟ یہ مجھے معلوم نہیں۔ سلیم کی نفیت کا مطالعہ کرنا بہت اہم کام ہے۔ اس کے علاوہ وہ خود اپنی دلی آواز سے نا آشنا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ گفتگو کرتے وقت یا یوں ہی سیر کرتے ہوئے اچانک میرا بازو پکڑ کر کہا ہے، ”عباس جی چاہتا ہے کہ۔۔۔“

”ہا۔ ہا، کیا جی چاہتا ہے۔“ میں نے اس کی طرف تمام توجہ مبذول کر کے پوچھا ہے۔ مگر میرے اس استفسار پر اس کے چہرے کی غیر معمولی تبدیلی اور گلے میں سانس کے تصاصم نے صاف طور پر ظاہر کیا ہے کہ وہ اپنے دل مدعماً کو خود نہ پہچانتے ہوئے الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتا۔

وہ شخص جو اپنے احساسات کو کسی شکل میں پیش کر کے دوسرا ذہن پر منتقل کر سکتا ہے، وہ دراصل اپنے دل کا بوجھ ہاکا کرنے کی قدرت کا مالک ہے اور وہ شخص جو محسوس کرتا ہے مگر اپنے احساس کو خود آپ اچھی طرح نہیں سمجھتا اور پھر اس اضطراب کو بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، اُس شخص کے مراد ف ہے جو اپنے حلق میں ٹھنڈی ہوئی چیز کو باہر نکالنے کی کوشش کر رہا ہو مگر وہ گلے سے یونچ اترنی چلی جا رہی ہو۔۔۔ یہ ایک ذہنی عذاب ہے جس کی تفصیل لفظوں میں نہیں آ سکتی۔

سلیم شروع ہی سے اپنی آواز سے نا آشارہ ہے اور ہوتا بھی کیوں نکر، جب اس کے سینے میں خیالات کا ایک ہجوم چھایا رہتا تھا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ بیٹھا بیٹھا اٹھ کھڑا ہوا ہے اور کمرے میں چکر لگا کر لمبے سانس بھرنے شروع کر دیے۔۔۔ غالباً وہ اپنے اندر ورنی انتشار سے شگ آ کر ان خیالات کو جو اس کے سینے میں بھاپ کے مانند چکر لگا رہے ہوتے، سانسوں کے ذریعے باہر نکالنے کا کوشش ہوا کرتا تھا۔ اضطراب کے ان ہی نکلیف دلخواحت میں اس نے اکثر اوقات مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، ”عباس! یہ خاکی کشتنی کسی روز تُند موجودوں کی تاب نہ لا کر، چٹاؤں سے ٹکر اکر پاش پاش ہو جائے گی۔۔۔ مجھے اندیشہ ہے کہ۔۔۔“ وہ اپنے اندیشے کو پوری طرح بیان نہیں کر سکتا تھا۔

سلیم کسی متوقع حادثے کا منتظر ضرور تھا۔ مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ حادثہ کس شکل میں پرداہ ظہور پر نمودار ہو گا۔ اس کی نگاہیں ایک عرصے سے دھنڈ لے خیالات کی صورت میں ایک موہوم سایہ دیکھ رہی تھیں جو اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ عمر وہ یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس تاریک شکل کے پردے میں کیا نہیں ہے۔ میں نے سلیم کی نفیسات سمجھنے کی بہت کوشش کی ہے۔ مگر مجھے اس کی منقلب عادات کے ہوتے ہوئے کبھی معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کن گہرائیوں میں غوطہ زن ہے اور وہ اس دنیا میں رہ کر اپنے مستقبل کے لیے کیا کرنا چاہتا ہے جبکہ اپنے والد کے انتقال کے بعد وہ ہر قسم کے سرمائے سے محروم کر دیا گیا تھا۔

میں ایک عرصے سے سلیم کو منقلب ہوتے دیکھ رہا تھا، اس کی عادات دن بدن بدل رہی تھیں۔۔۔ کل کا کھلندڑ را لڑکا، میرا، تم جماعت، ایک مفکر میں تبدیل ہو رہا تھا۔۔۔ یہ تبدیلی میرے لیے سخت باعثِ حرمت تھی۔ کچھ عرصے سے سلیم کی طبیعت پر ایک غیر معمولی سکون چھا گیا تھا۔ جب دیکھوا پنے گھر میں خاموش بیٹھا ہوا ہے اور اپنے بھاری سر کو گھنون میں تھا میں کچھ سوچ رہا ہے۔۔۔ وہ کیا سوچ رہا ہوتا یہ میری طرح خود اسے بھی معلوم نہ تھا۔ ان لمحات میں، میں نے اسے اکثر اوقات اپنی گرم آنکھوں پر دوات کا آہنی ڈھکنا یا گلاس کا یہر و نی حصہ پھیرتے دیکھا ہے۔۔۔ شاید وہ اس عمل سے اپنی آنکھوں کی حرارت کم کرنا چاہتا تھا۔

سلیم نے کالج چھوڑتے ہی غیر ملکی مصنفوں کی بھاری بھر کم تصانیف کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ شروع شروع میں مجھے اس کی میز پر ایک کتاب نظر آئی۔ پھر آہستہ اس الماری میں جس میں وہ شطرنج، تاش اور اسی قسم کی دیگر کھلیلیں رکھا کرتا تھا، کتابیں ہی کتابیں نظر آنے لگیں۔۔۔ اس کے علاوہ وہ کئی کئی دنوں تک گھر سے کہیں باہر چلا جایا کرتا تھا۔

جہاں تک میرا خیال ہے، سلیم کی طبیعت کا غیر معمولی سکون ان کتابوں کے انتہاک مطالعہ کا نتیجہ تھا جنہیں اس نے بڑے قرینے سے الماری میں سجار کھا تھا۔ سلیم کا عزیز ترین دوست ہونے کی حیثیت میں، میں اس کی طبیعت کے غیر معمولی سکون سے سخت پریشان تھا۔ مجھے اندریشہ تھا کہ یہ سکون کسی وحشت خیز طوفان کا پیش نیمہ ہے۔ اس کے علاوہ مجھے سلیم کی صحت کا بھی بہت خیال تھا۔ وہ پہلے ہی بہت کمزور جئے کا واقع ہوا تھا۔ اس پر اس نے خواخواہ اپنے آپ کو خدا معلوم کن کن اجھنوں میں پھنسا لیا تھا۔

سلیم کی عمر بمشکل بیس سال کی ہو گی۔ مگر اس کی آنکھوں کے نیچے شب بیداری کی وجہ سے سیاہ حلقة پڑ گئے تھے۔ پیشانی جو اس سے قبل بالکل ہموار تھی اب اس پر کئی شکن پڑے رہتے تھے۔۔۔ جو اس کی ذہنی پریشانی کو ظاہر کرتے تھے۔۔۔ چہرہ جو کچھ عرصہ پہلے بہت شنگفتہ ہوا کرتا تھا، اب اس پر ناک اور لب کے درمیان گہری لکیریں پڑ گئی تھیں، جنہوں نے سلیم کو قبل از وقت معمّر بنادیا تھا۔۔۔ اس غیر معمولی

تبدیلی کو میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوتے دیکھا ہے جو مجھے ایک شعبدے سے کم معلوم نہیں ہوتی۔۔۔ یہ کیا تجہب کی بات ہے کہ میری عمر کا لڑکا میری نظر وہ کے سامنے بوڑھا ہو جائے۔

سلیم پاگل خانے میں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ وہ سڑی اور دیوانہ ہے۔ اسے غالباً اس بنابر پاگل خانے بھیجا گیا ہے کہ وہ بازاروں میں بلند بانگ تقریریں کرتا ہے۔ راہ گزروں کو پکڑ پکڑ کر انہیں زندگی کے مشکل مسائل بتا کر جواب طلب کرتا ہے اور امراء کے حریر پوش بچوں کا لباس اتنا کرنے لگے بچوں کو پہنادیتا ہے۔۔۔ ممکن ہے یہ حرکات ڈاکٹروں کے نزدیک دیوانگی کی علامتیں ہوں۔ مگر میں تیقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سلیم پاگل نہیں ہے۔ بلکہ وہ لوگ جھنوں نے اسے امن عامہ میں خلل ڈالنے والا تصور کرتے ہوئے آہنی سلاخوں کے پنجھرے میں قید کر دیا ہے، کسی دیوانے حیوان سے کم نہیں ہیں۔

اگر وہ اپنی غیر مربوط تقریر کے ذریعے لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانا چاہتا ہے تو کیا ان کا فرض نہیں کہ وہ اس کے ہر لفظ کو غور سے سنیں؟ اگر وہ راہ گزروں کے ساتھ فلسفہ حیات پر تبادلہ خیالات کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کے یہ معنی یہے جائیں گے کہ اس کا وجود مجلسی دائرہ کے لیے نقصان دہ ہے؟ کیا زندگی کے حقیقی معانی سے باخبر ہونا ہر انسان کا فرض نہیں ہے؟

اگر وہ متمول اشخاص کے بچوں کا لباس اتنا کرنے ڈھانپنا چاہتا ہے تو کیا یہ عمل ان افراد کو ان کے فرائض سے آگاہ نہیں کرتا جو فلک بوس عمارتوں میں دوسرے لوگوں کے بل بوتے پر آرام کی زندگی بس رکر رہے ہیں؟ کیا نگلوں کی ستر پوشی کرنا ایسا فعل ہے کہ اسے دیوانگی پر محمول کیا جائے؟ سلیم ہر گز پاگل نہیں ہے۔ مگر مجھے یہ تسلیم ہے کہ اس کے انکار نے اسے بے خود ضرور بنا رکھا ہے۔ دراصل وہ دنیا کو کچھ پیغام دینا چاہتا ہے مگر دے نہیں سکتا۔ ایک کم منبع کی طرح وہ متلاشنا کر اپنے قلبی احساسات بیان کرنا چاہتا ہے مگر الفاظ اسکی زبان پر آتے ہی بکھر جاتے ہیں۔

وہ اس سے قبل ہی ذہنی اذیت میں مبتلا ہے مگر اب اسے اور اذیت میں ڈال دیا گیا ہے۔ وہ پہلے ہی سے اپنے انکار کی الحجنوں میں گرفتار ہے اور اب اسے زندگی کا نماکوٹھری میں قید کر دیا گیا ہے۔۔۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے؟ میں نے آج تک سلیم کی کوئی بھی ایسی حرکت نہیں دیکھی جس سے میں یہ نتیجہ نکال سکوں کہ وہ دیوانہ ہے۔ ہاں البتہ کچھ عرصے سے میں اس کے ذہنی انقلابات کا مشاہدہ ضرور کرتا رہا ہوں۔

شروع شروع میں جب میں نے اس کے کمرے کے تمام فرنچپر کو اپنی اپنی جگہ سے ہٹا ہوا پایا تو میں نے اس تبدیلی کی طرف خاص توجہ نہ دی۔ دراصل میں نے اس وقت یہ خیال کیا کہ شاید سلیم نے فرنچپر کی موجودہ جگہ کو زیادہ موزوں خیال کیا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ میری نظروں کو جو کرسیوں اور میزوں کو کئی سالوں سے ایک جگہ دیکھنے کی عادی تھیں وہ غیر متوقع تبدیلی بہت بھلی معلوم ہوئی۔

اس واقعے کے چند روز بعد جب میں کانج سے فارغ ہو کر سلیم کے کمرے میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ فلمی ممثلوں کی دو تصاویر جو ایک عرصے سے کمرے کی دیواروں پر آؤیزاں تھیں اور جنہیں میں نے اور سلیم نے بہت مشکل کے بعد فراہم کیا تھا، باہر ٹوکری میں بھٹپڑی ہیں اور ان کی جگہ انہی چوکھٹوں میں مختلف مصنفوں کی تصویریں لٹک رہی ہیں، چونکہ میں خود ان تصاویر کا اتنا مشتاق نہ تھا اس لیے مجھے سلیم کا یہ انتخاب بہت پسند آیا۔ چنانچہ ہم اس روز دیر تک ان تصویروں کے متعلق گفتگو بھی کرتے رہے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے، اس واقعے کے بعد سلیم کے کمرے میں ایک ماہ تک کوئی خاص قابل ذکر تبدیلی واقع نہیں ہوئی مگر اس عرصے کے بعد میں نے ایک روز اچانک کمرے میں بڑا سخت پڑا پایا۔۔۔ جس پر سلیم نے کپڑا بچا کر کتابیں جੁن رکھی تھیں۔ اور آپ قریب ہی زمین پر ایک تکیے کا سہارا لیے کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ میں یہ دیکھ کر سخت متعجب ہوا اور کمرے میں داخل ہوتے ہی سلیم سے یہ سوال کیا، ”کیوں میاں! اس تخت کے کیا معنی؟“ سلیم جیسا کہ اس کی عادت تھی، مسکرا یا اور کہنے لگا، ”کرسیوں پر روزانہ بیٹھتے بیٹھتے طبیعت اکتا گئی ہے۔ اب یہ فرش والا سلسہ ہی رہے گا۔“

بات معقول تھی۔ میں چپ رہا۔ واقعی روزانہ ایک ہی چیز کا استعمال کرتے کرتے طبیعت ضرور اچاٹ ہو جایا کرتی ہے۔ مگر جب پدرہ میں روز کے بعد میں نے وہ تخت مع تکیے کے غائب پایا تو میرے تعجب کی کوئی انتہائی رہی اور مجھے شبہ سا ہوا کہ کہیں میرا دوست واقعی خبطی تو نہیں ہو گیا ہے۔ سلیم سخت گرم مزاج واقع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے وزنی انکار نے اسے معمول سے زیادہ چڑھا بنا رکھا تھا۔ اس لیے میں عموماً اس سے ایسے سوالات نہیں کیا کرتا جو اس کے دماغی توازن کو درہم برہم کر دیں یا جن سے وہ خونخواہ کھج جائے۔

فرنچپر کی تبدیلی، تصویروں کا انتقال، تخت کی آمد اور پھر اس کا غائب ہو جانا، واقعی کسی حد تک تعجب خیز ضرور ہیں اور واجب تھا کہ میں ان امور کی وجہ دریافت کرتا۔ مگر چونکہ مجھے سلیم کو آزر دہ خاطر کرنا اور اس کے کام میں دخل دینا منظور نہ تھا اس لیے میں خاموش رہا۔

تحوڑے عرصے کے بعد سلیم کے کمرے میں ہر دوسرے تیسرا دن کوئی نہ کوئی تبدیلی دیکھنا میرا معمول ہو گیا۔۔۔ اگر آج کمرے میں تخت موجود ہے تو ہفتے کے بعد وہاں سے اٹھا دیا گیا ہے۔ اس کے دورہ بعد وہ میز جو کچھ عرصہ پہلے کمرے کے دائیں طرف پڑی تھی رات

رات میں وہاں سے اٹھا کر دوسرا طرف رکھ دی گئی ہے۔ انگیٹھی پر رکھی ہوئی تصاویر کے زاویے بدلتے جا رہے ہیں۔ کپڑے لٹکانے کی کھونٹیاں ایک جگہ سے اکھیڑ کر دوسرا جگہ پر جڑ دی گئی ہیں۔ کرسیوں کے رخ تبدیل کیے گئے ہیں۔۔۔ گویا کمرے کی ہرشے سے ایک قسم کی قواعد کرائی جاتی تھی۔

ایک روز جب میں نے کمرے کے تمام فرنچیپ کو مخالف رخ میں پایا تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے سلیم سے دریافت کر لیا، ”سلیم میں ایک عرصے سے اس کمرے کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھ رہا ہوں۔ آخر بتاؤ تو سہی یہ تمہارا کوئی نیا فلسفہ ہے؟“

”تم جانتے نہیں ہو، میں انقلاب پسند ہوں“ سلیم نے جواب دیا۔

یہ سن کر میں اور بھی متعجب ہوا۔ اگر سلیم نے یہ الفاظ اپنی حسبِ معمول مسکراہٹ کے ساتھ کہے ہوتے تو میں یقینی طور پر یہ خیال کرتا کہ وہ صرف مذاق کر رہا ہے۔ مگر یہ جواب دیتے وقت اس کا چہرہ اس امر کا شاہد تھا کہ وہ سنجیدہ ہے اور میرے سوال کا جواب وہ انہی الفاظ میں دینا چاہتا ہے۔ لیکن پھر بھی میں تذبذب کی حالت میں تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا، ”مذاق کر رہے ہو یا ر؟“

”تمہاری قسم بہت بڑا انقلاب پسند۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

مجھے یاد ہے کہ اس کے بعد اس نے ایسی گفتگو شروع کی تھی مگر ہم دونوں کسی اور موضوع پر اظہار خیالات کرنے لگ گئے تھے۔ یہ سلیم کی عادت ہے کہ وہ بہت سی باتوں کو دلچسپ گفتگو کے پردے میں چھپالیا کرتا ہے۔

ان دونوں جب کبھی میں سلیم کے جواب پر غور کرتا ہوں، مجھے معلوم ہوتا ہے کہ سلیم درحقیقت انقلاب پسند واقع ہوا ہے۔۔۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ کسی سلطنت کا تختہ اللٹنے کے درپے ہے یا وہ دیگر انقلاب پسندوں کی طرح چورا ہوں میں بم پھینک کر دہشت پھیلانا چاہتا ہے۔ بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے وہ ہر چیز میں انقلاب دیکھنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نظریں اپنے کمرے میں پڑی ہوئی اشیا کو ایک ہی جگہ پر نہ دیکھ سکتی تھیں۔ ممکن ہے میرا یہ قیافہ کسی حد تک غلط ہو مگر میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کی جستجو کسی ایسے انقلاب کی طرف رجوع کرتی ہے جس کے آثار اس کے کمرے کی روزانہ تبدیلیوں سے ظاہر ہیں۔

بادی انظر میں کمرے کی اشیا کو روز الٹ پلٹ کرتے رہنا، دیوانگی کے مراد فہرست ہے۔ لیکن اگر سلیم کی ان بے معنی حرکات کا عین مطالعہ کیا جائے تو یہ امر روشن ہو جائیگا کہ ان کے پس پر وہ ایک ایسی قوت کام کر رہی تھی جس سے وہ خود نا آشنا تھا۔۔۔ اسی قوت نے جسے میں ذہنی تعصّب کا نام دیتا ہوں، سلیم کے دماغ میں تلاطم پا کر دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس طوفان کی تاب نہ لا کر از خود رفتہ ہو گیا اور پا گل خانے کی چار دیواری میں قید کر دیا گیا۔

پا گل خانے جانے سے کچھ روز پہلے سلیم مجھے اچانک شہر کے ایک ہوٹل میں چائے پیتا ہوا ملا۔ میں اور وہ دونوں ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ گئے۔ اس لیے کہ میں اس سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے بازار کے چند کان داروں سے سنا تھا کہ اب سلیم ہوٹلوں میں پا گلوں کی طرح تقریریں کرتا ہے۔۔۔ میں یہ چاہتا تھا کہ اس سے فوراً مل کر اسے اس قسم کی حرکات کرنے سے منع کر دوں۔ اس کے علاوہ یہ اندیشہ تھا کہ شاید وہ کہیں سچ محبوب الحواس ہی نہ ہو گیا ہو۔ چونکہ میں اس سے فوراً ہی بات کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے ہوٹل میں گفتگو کرنا مناسب سمجھا۔

کرسی پر بیٹھتے وقت میں غور سے سلیم کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے اس طرح گھورتے دیکھ کر سخت متوجہ ہوا۔ وہ کہنے لگا، ”شاید میں سلیم نہیں ہوں۔“ آواز میں کس قدر درد تھا۔ گویہ جملہ آپ کی نظر وہ میں بالکل سادہ معلوم ہو مگر خدا گواہ ہے میری آنکھیں بے اختیار نہ ماننا ک ہو گئیں۔ ”شاید میں سلیم نہیں ہوں۔۔۔“ گویا وہ ہر وقت اس بات کا موقع تھا کہ کسی روز اس کا بہترین دوست بھی اسے نہ پچھاں سکے گا، شاید اسے معلوم تھا کہ وہ بہت حد تک تبدیل ہو چکا ہے۔

میں نے ضبط سے کام لیا اور اپنے آنسوؤں کو رومال میں چھپا کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ”سلیم میں نے سنا ہے کہ تم نے میرے لاہور جانے کے بعد یہاں بازاروں میں تقریریں کرنی شروع کر دی ہیں۔۔۔ جانتے بھی ہو، اب تمہیں شہر کا بچہ بچہ پا گل کے نام سے پکارتے ہے۔۔۔“

”پا گل! شہر کا بچہ بچہ مجھے پا گل کے نام سے پکارتا ہے۔۔۔ پا گل! ہاں عباس، میں پا گل ہوں۔۔۔ پا گل۔۔۔ دیوانہ۔۔۔ خرد باختہ۔۔۔ لوگ مجھے دیوانہ کہتے ہیں۔۔۔ معلوم ہے کیوں؟“ یہاں تک کہہ کر وہ میری طرف سرتاپ استغفہ امام بن کر دیکھنے لگا۔ مگر میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ گویا ہوا، ”اس لیے کہ میں انہیں غریبوں کے نگکے بچے دکھلا دکھلا کر یہ پوچھتا ہوں کہ اس بڑھتی ہوئی غربت کا کیا علان ہو سکتا ہے؟ وہ مجھے کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ اس لیے وہ مجھے پا گل تصور کرتے ہیں۔۔۔ آہ! اگر مجھے صرف یہ معلوم ہو کہ ظلمت کے اس زمانے میں روشنی کی ایک شعاع کیونکر فراہم کی جاسکتی ہے۔ ہزاروں غریب بچوں کا تاریک مستقبل کیونکر مثور بنایا جا سکتا ہے۔“

وہ مجھے پاگل کہتے ہیں۔۔۔ وہ جن کی نبضِ حیات دوسروں کے خون کی مر ہوں منت ہے، وہ جن کا فردوس غربا کے جہنم کی مستعار اینٹوں سے استوار کیا گیا ہے، جن کے سازِ عشرت کے ہر تار کے ساتھ بیواؤں کی آہیں، تیمیوں کی عریانی، لاوارث بچوں کی صدائے گریہ لپٹی ہوئی ہے۔۔۔ کہیں، مگر ایک زمانہ آنے والا ہے جب یہی پروردہ غربت اپنے دلوں کے مشتر کہ لہو میں انگلیاں ڈبوڈبو کر ان لوگوں کی پیشانیوں پر اپنی لعنتیں لکھیں گے۔۔۔ وہ وقت نزدیک ہے جب ارضی جست کے دروازے ہر شخص کے لیے واہوں گے۔

میں پوچھتا ہوں کہ اگر میں آرام میں ہوں تو کیا وجہ ہے کہ تم تکلیف کی زندگی بس رکرو؟ کیا یہی انسانیت ہے کہ میں کارخانے کا مالک ہوتے ہوئے ہر شب ایک نئی رقصہ کا نانج دیکھتا ہوں، ہر روز کلب میں سینکڑوں روپے قمار بازی کی نذر کر دیتا ہوں اور اپنی نکمی سے نکمی خواہش پر بے دریغ روپیہ بہا کر اپنا دل خوش کرتا ہوں، اور میرے مزدوروں کو ایک وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ ان کے بچ مٹی کے ایک کھلونے کے لیے ترستے ہیں۔۔۔ پھر لطف یہ ہے کہ میں مہذب ہوں، میری ہر جگہ عزت کی جاتی ہے، اور وہ لوگ جن کا پسند میرے لیے گوہر تیار کرتا ہے، مجلسی دائرے میں حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ میں خود ان سے نفرت کرتا ہوں۔۔۔ تم ہی بتاؤ، کیا یہ دونوں ظالم و مظلوم اپنے فرائض سے نآشنا نہیں ہیں؟

”میں ان دونوں کو ان کے فرائض سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ مگر کس طرح کروں؟ یہ مجھے معلوم نہیں۔“

سلیم نے اس قدر کہہ کر ہانپتے ہوئے ٹھنڈی چائے کا ایک گھونٹ بھرا اور میری طرف دیکھے بغیر پھر بولنا شروع کر دیا، ”میں پاگل نہیں ہوں۔۔۔ مجھے ایک وکیل سمجھو۔ بغیر کسی امید کے، جو اس چیز کی وکالت کر رہا ہے جو بالکل گم ہو چکی ہے۔۔۔ میں ایک دبی ہوئی آواز ہوں۔۔۔ انسانیت ایک منہ ہے اور میں ایک چیخ۔ میں اپنی آواز دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں مگر وہ میرے خیالات کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔

میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر اسی لیے کچھ کہہ نہیں سکتا کہ مجھے بہت کچھ کہنا ہے۔ میں اپنا پیغام کہاں سے شروع کروں۔۔۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔ میں اپنی آواز کے بکھرے ہوئے ٹکڑے فراہم کرتا ہوں۔ ذہنی اذیت کے دھنڈے غبار میں سے چند خیالات تمہید کے طور پر پیش کرنے کی سعی کرتا ہوں۔ اپنے احساسات کی عینیت گہرائیوں سے چند احساس سطح پر لاتا ہوں کہ دوسراے اذہان پر منتقل کر سکوں مگر میری آواز کے ٹکڑے پھر منتشر ہو جاتے ہیں۔ خیالات پھر تار کی میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ احساسات پھر غوطہ لگا جاتے ہیں۔۔۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ میرے خیالات منتشر ہونے کے بعد پھر جمع ہو رہے ہیں تو جہاں کہیں میری قوتِ گویائی کام دیتی ہے میں شہر کے رو سماں سے مخاطب ہو کر یہ کہنے لگ جاتا ہوں، مرمریں محلات کے مکینو! تم اس وسیع کائنات میں صرف سورج کی روشنی دیکھتے ہو۔ مگر یقین جانو، اس کے سامنے بھی ہوتے ہیں۔ تم مجھے سلیم کے نام سے جانتے ہو، یہ غلطی ہے۔ میں وہ کپکی ہوں جو ایک کنواری لڑکی کے جسم پر طاری ہوتی ہے جب وہ غربت سے نگ آ کر پہلی دفعہ ایوانِ گناہ کی طرف قدم بڑھانے لگے۔۔۔ آؤ ہم سب کا نپیں!

تم ہستے ہو۔ مگر نہیں، تمہیں مجھے ضرور سننا ہو گا۔ میں ایک غوطہ خور ہوں۔ قدرت نے مجھے تاریک سمندر کی گھر ایسوں میں ڈبو دیا۔ کہ میں کچھ ڈھونڈھ کر لاؤں۔ میں ایک بے بہاموتی لایا ہوں۔۔۔ وہ سچائی ہے۔۔۔ اس تلاش میں، میں نے غربت دیکھی ہے، گرسنگی برداشت کی ہے، لوگوں کی نفرت سے دوچار ہوا ہوں، جاڑے میں غریبوں کی رگوں میں خون کو منجمد ہوتے دیکھا ہے، نوجوان لڑکیوں کو عشرت کدوں کی زینت بڑھاتے دیکھا ہے، اس لیے کہ وہ مجبور تھیں۔۔۔ اب میں یہی کچھ تمہارے منہ پر قے کر دینا چاہتا ہوں کہ تمہیں تصویر زندگی کا تاریک پہلو نظر آجائے۔

انسانیت ایک دل ہے۔ ہر شخص کے پہلو میں ایک ہی قسم کا دل موجود ہے۔ اگر تمہارے بوٹ غریب مزدوروں کے نگے سینوں پر ٹھوکریں لگاتے ہیں۔ اگر تم اپنے شہوانی جذبات کی بھڑکتی ہوئی آگ کسی ہمسایہ نادار لڑکی کی عصمت دری سے ٹھنڈی کرتے ہو۔ اگر تمہاری غفلت سے ہزار ہاتھیم بچے گھوارہ جہالت میں پل کر جیلوں کو آباد کرتے ہیں۔ اگر تمہارا دل کا جمل کے مانند سیاہ ہے تو یہ تمہارا قصور نہیں۔ ایوان معاشرت ہی کچھ ایسے ڈھب پر استوار کیا گیا ہے کہ اس کی ہر چھت اپنی ہمسایہ چھت کو دابے ہوئے ہے۔۔۔ ہر اینٹ دوسری اینٹ کو۔

جانتے ہو، موجودہ نظام کے کیا معنی ہیں؟ یہ کہ لوگوں کے سینوں کو جہالت کہہ بنائے۔ انسانی تعزز کی کشتنی، ہوا اور ہوس کی موجودوں میں بہا دے۔ جو ان لڑکیوں کی عصمت چھین کر انہیں ایوان تجارت میں کھلے بندوں حسن فروشی پر مجبور کر دے۔ غریبوں کا خون چُوس کر انہیں جلی ہوئی راکھ کی مانند قبر کی مٹی میں یکساں کر دے۔۔۔ کیا اسی کو تم تہذیب کا نام دیتے ہو۔۔۔ بھیانک قسابی! تاریک شیطنتی!

آہ اگر تم صرف وہ دیکھ سکو۔ جس کا میں نے مشاہدہ کیا ہے۔۔۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو قبر نما جھونپڑوں میں زندگی کے سانس پورے کر رہے ہیں۔ تمہاری نظروں کے سامنے ایسے افراد موجود ہیں جو موت کے منہ میں جی رہے ہیں۔ ایسی لڑکیاں ہیں جو بارہ سال کی عمر میں عصمت فروشی شروع کرتی ہیں اور میں سال کی عمر میں قبر کی سردی سے پٹ جاتی ہیں۔۔۔ مگر تم۔۔۔ ہاں تم، جو اپنے لباس کی تراش کے

متعلق گھنٹوں غور کرتے رہتے ہو۔ یہ نہیں دیکھتے بلکہ الٹا غریبوں سے چھین کر امر اکی دولتوں میں اضافہ کرتے ہو۔ مزدور سے لے کر کاہل کے حوالے کر دیتے ہو۔ گودڑی پہنے انسان کا لباس اتار کر حریر پوش کے سپرد کر دیتے ہو۔

تم غربا کے غیر مختتم مصائب پر ہنتے ہو مگر تمہیں یہ معلوم نہیں کہ اگر درخت کا نچلا حصہ لا غر و مردہ ہو رہا ہے تو کسی روز وہ بالائی حصے کے بوجھ کو برداشت نہ کرتے ہوئے گر پڑے گا۔ ”یہاں تک بول کر سلیم خاموش ہو گیا اور ٹھنڈی چائے کو آہستہ آہستہ پینے لگا۔

تقریر کے دوران میں، میں سحر زدہ آدمی کی طرح چپ چاپ بیٹھا اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ جو بارش کی طرح برس رہے تھے، بغور سنتر ہا۔ میں سخت حیران تھا کہ وہ سلیم جو آج سے کچھ عرصہ پہلے بالکل خاموش ہوا کرتا تھا، اتنی طویل تقریر کیوں کنکر جاری رکھ سکا ہے۔ اس کے علاوہ خیالات کس قدر حق پر بنتی تھے۔ اور آواز میں کتنا اثر تھا۔۔۔ میں ابھی اس کی تقریر کے متعلق کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ پھر بولا، ”خاندان کے خاندان، شہر کے یہ نہنگ نگل جاتے ہیں۔ عوام کے اخلاق، قوانین سے مسخر کیے جاتے ہیں۔ لوگوں کے زخم جرم انوں سے کریدے جاتے ہیں۔ مکسوں کے ذریعے دامن غربت کرتا جاتا ہے۔ تباہ شدہ ذہنیت، جہالت کی تاریکی سیاہ بنادیتی ہے۔۔۔ ہر طرف حالت نزع کے سانس کی لرزائ آوازیں، عریانی، گناہ اور فریب ہے۔ مگر دعویٰ یہ ہے کہ عوام امن کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔۔۔ کیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہماری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی جا رہی ہے۔ ہمارے کانوں میں پکھلا ہوا سیسیہ اتارا جا رہا ہے۔ ہمارے جسم مصائب کے کوڑے سے بے حس بنائے جا رہے ہیں کہ ہم نہ دیکھ سکیں، نہ سن سکیں اور نہ محسوس کر سکیں!

انسان جسے بلندیوں پر پرواز کرنا تھا کیا اس کے بال و پر نوچ کر اسے زمین پر رینگنے کے لیے مجبور نہیں کیا جا رہا۔۔۔؟ کیا امر اکی نظر فریب عمارتیں مزدوروں کے گوشت پوست سے تیار نہیں کی جاتیں۔۔۔؟ کیا عوام کے مکتب حیات پر جرام کی مہر ثبت نہیں کی جاتی؟ کیا مجلسی بدن کی رگوں میں بدی کاخون موجزن نہیں ہے؟ کیا جہوڑ کی زندگی کشمکش پیغم، انتہک محنت اور قوت برداشت کا مرکب نہیں ہے؟ بتاؤ بتاؤ، بتاتے کیوں نہیں؟“

”درست ہے۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”تو پھر اس کا علاج کرنا تمہارا فرض ہے۔۔۔ کیا تم کوئی طریقہ نہیں بتاسکتے کہ اس انسانی تزلیل کو کیوں کنکر رکا جاسکتا ہے۔۔۔ مگر آہ! تمہیں معلوم نہیں، مجھے خود معلوم نہیں!“

تحوڑی دیر کے بعد وہ میرا ہاتھ پکڑ کر رازدارانہ لمحے میں یوں کہنے لگا، ”عباس! عوام سخت تکلیف برداشت کر رہے ہیں۔ بعض اوقات جب کبھی میں کسی سوتھے حال انسان کے سینے سے آہ بلند ہوتے دیکھتا ہوں تو مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں شہر نہ جل جائے۔۔۔! اچھا بہ میں جاتا ہوں، تم لاہور واپس کب جارہے ہو؟“

یہ کہہ کروہ اٹھا اور ٹوپی سنبھال کر باہر چلنے لگا۔ ”مٹھرہ و! میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔۔۔ کہاں جاؤ گے اب؟“ اسے یک لخت کہیں جانے کے لیے تیار دیکھ کر میں نے اسے فوراً ہی کہا۔ ”مگر میں اکیلا جانا چاہتا ہوں۔۔۔ کسی باغ میں جاؤں گا۔“ میں خاموش ہو گیا اور وہ ہوٹل سے نکل کر بازار کے ہجوم میں گم ہو گیا۔

اس گفتگو کے چوتھے روز مجھے لاہور میں اطلاع میں کہ سلیم نے میرے جانے کے بعد بازاروں میں دیوانہ وار شور برپا کرنا شروع کر دیا تھا۔
اس لئے اسے پاگل خانے میں داخل کر لیا گیا ہے۔

-[34]-

جسم اور روح: سعادت حسن منشو

مجیب نے اچانک مجھ سے سوال کیا، ”کیا تم اس آدمی کو جانتے ہو؟“

گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ دنیا میں ایسے کئی اشخاص موجود ہیں جو ایک منٹ کے اندر اندر لاکھوں اور کروڑوں کو ضرب دے سکتے ہیں، ان کی تقسیم کر سکتے ہیں۔ آنے پائی کا حساب چشم زدن میں آپ کو بتا سکتے ہیں۔

اس گفتگو کے دوران میں مخفی یہ کہہ رہا تھا، ”انگستان میں ایک آدمی ہے جو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد فوراً بتا دیتا ہے کہ اس قطعہ زمین کا طول و عرض کیا ہے۔۔۔ رقبہ کتنا ہے۔۔۔ اس نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ وہ اپنی اس خداداد صلاحیت سے تنگ آ گیا ہے۔ وہ جب بھی کہیں باہر، کھلے کھیتوں میں نکلتا ہے تو ان کی ہر یا اور ان کا حسن اس کی نگاہوں سے او جھل ہو جاتا ہے اور وہ اس قطعہ زمین کی پیمائش اپنی آنکھوں کے ذریعے شروع کر دیتا ہے۔ ایک منٹ کے اندر وہ اندازہ کر لیتا ہے کہ زمین کا یہ ٹکڑا کتنا رقبہ رکھتا ہے، اس کی لمبائی کتنی ہے چوڑائی کتنی ہے، پھر اسے مجبوراً اپنے اندازے کا امتحان لینا پڑتا ہے۔ فیٹر سٹیپ کے ذریعے سے اس خطہ زمین کو ماتا اور وہ اس کے اندازے

کے عین مطابق نکلتا۔ اگر اس کا اندازہ غلط ہوتا تو اسے بہت تسلیں ہوتی۔ بعض اوقات فتح اپنی شکست سے بھی ایسی لذت محسوس کرتا ہے جو اسے فتح سے نہیں ملتی۔ اصل میں شکست دوسری شاندار فتح کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

میں نے مخفی سے کہا، ”تم درست کہتے ہو۔۔۔ دنیا میں ہر قسم کے عجائب موجود ہیں۔۔۔“

میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ مجیب نے جو اس گفتگو کے دوران کافی پی رہا تھا، اچانک مجھ سے سوال کیا، ”کیا تم اس آدمی کو جانتے ہو؟“

میں سوچنے لگا کہ مجیب کس آدمی کے متعلق مجھ سے پوچھ رہا ہے، حامد۔۔۔ نہیں، وہ آدمی نہیں میرا دوست ہے۔

عباس، اس کے متعلق کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو سکتی تھی۔ شبیر، اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ آخر یہ کس آدمی کا حوالہ دیا گیا تھا۔

میں نے مجیب سے کہا، ”تم کس آدمی کا حوالہ دے رہے ہو؟“

مجیب مسکرا کیا، ”تمہارا حافظہ بہت کمزور ہے۔“

”بھی، میرا حافظہ تو چکپن سے ہی کمزور رہا ہے۔ تم پہلیوں میں باتیں نہ کرو۔۔۔ بتاؤ وہ کون آدمی ہے جس سے تم میرا تعارف کرانا چاہتے ہو۔۔۔“

مجیب کی مسکراہٹ میں اب ایک طرح کا اسرار تھا، ”بوجھ لو!“

”میں کیا بوجھوں گا جبکہ وہ آدمی تمہارے پیٹ میں ہے۔“

عارف، اصغر اور مسعود بے اختیار ہنس پڑے۔ عارف نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، ”وہ آدمی اگر مجیب کے پیٹ میں ہے تو آپ کو اس کی پیدائش کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

میں نے مجیب کی طرف ایک نظر دیکھا اور عارف سے مخاطب ہوا، ”میں اپنی ساری عمر اس مہدی کی ولادت کا انتظار نہیں کر سکتا ہوں۔“

مسعود نے اپنے سگریٹ کو ایش ٹرے کے قبرستان میں دفن کرتے ہوئے کہا، ”دیکھیے صاحبان! ہمیں اپنے دوست مسٹر مجیب کی بات کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔“ یہ کہہ کر وہ مجیب سے مخاطب ہوا، ”مجیب صاحب فرمائیے آپ کو کیا کہنا ہے۔۔۔ ہم سب بڑے غور سے سنیں گے۔“

مجیب تھوڑی دیر خاموش رہا۔ اس کے بعد اپنا بجھا ہوا چڑھا کر بولا، ”معذرت چاہتا ہوں کہ میں نے اس آدمی کے متعلق آپ سے پوچھا جسے آپ جانتے نہیں۔“

میں نے کہا، ”مجیب تم کیسی باتیں کرتے ہو، بہر حال، تم اس آدمی کو جانتے ہو۔۔۔؟“

مجیب نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا، ”بہت اچھی طرح۔۔۔ جب ہم دونوں برمائیں تھے تو دن رات اکٹھے رہتے تھے۔ عجیب و غریب آدمی تھا۔“

مسعود نے پوچھا، ”کس لحاظ سے؟“

مجیب نے جواب دیا، ”ہر لحاظ سے۔۔۔ اس جیسا آدمی آپ نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔“

میں نے کہا، ”بھی مجیب اب بتا بھی دو وہ کون حضرت تھے؟“

”بس حضرت ہی تھے۔“

عارف مسکرا یا، چلو قصہ ختم ہوا۔۔۔ وہ حضرت تھے، اور بس۔۔۔“

مسعود یہ جاننے کے لیے بیتاب تھا کہ وہ حضرت کون تھا، ”بھتی مجیب، تمہاری ہربات نرالی ہوتی ہے۔ تم بتاتے کیوں نہیں ہو کہ وہ کون آدمی تھا جس کا ذکر تم نے اچانک چھپیر دیا!“

مجیب طبعاً خاموشی پسند تھا۔ اس کے دوست احباب ہمیشہ اس کی طبیعت سے نالاں رہتے۔۔۔ لیکن اس کی باتیں بچی تلی ہوتی تھیں۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا، ”معذرت خواہ ہوں کہ میں نے خواہ خواہ آپ کو اس مخصوصے میں گرفتار کر دیا۔۔۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب یہ گفتگو شروع ہوئی تو میں کھو گیا۔ مجھے وہ زمانہ یاد آگیا جس کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔“

میں نے پوچھا، ”وہ ایسا زمانہ کون سا تھا؟“

مجیب نے ایک لمبی کہانی بیان کرنا شروع کر دی، ”اگر آپ سمجھتے ہوں کہ اس زمانے سے میری زندگی کے کسی رومان کا تعلق ہے تو میں آپ سے کہوں گا کہ آپ کم فہم ہیں۔“

میں نے مجیب سے کہا، ”ہم تو آپ کے فیصلے کے منتظر ہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کم فہم ہیں تو ٹھیک ہے۔ لیکن وہ آدمی۔“

مجیب مسکرا یا، ”وہ آدمی آدمی تھا۔۔۔ لیکن اس میں خدا نے بہت سی قوتیں بخشی تھیں۔“

مسعود نے پوچھا، ”مثال کے طور پر۔۔۔“

”مثال کے طور پر یہ کہ وہ ایک نظر دیکھنے کے بعد بتا سکتا تھا کہ آپ نے کس رنگ کا سوٹ پہنانا تھا، ٹائی کیسی تھی، آپ کی ناک ٹیڈھی تھی یا سیدھی۔۔۔ آپ کے کس گال پر کہاں اور کس جگہ تل تھا، آپ کے ناخن کیسے ہیں، آپ کی داہنی آنکھ کے نیچے زخم کا نشان ہے، آپ کی بھنویں منڈی ہوئی ہیں، موزے فلاں ساخت کے پہنے ہوئے تھے، قیمیں پوپلین کی تھی مگر گھر میں دھلی ہوئی۔“

یہ سن کر میں نے واقعتاً محسوس کیا کہ جس شخص کا ذکر مجیب کر رہا ہے، عجیب و غریب ہستی کا مالک ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا، ”بڑا معرکہ خیز آدمی تھا۔“

”جی ہاں، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔۔۔ اس کو اس بات کا زعم تھا کہ اگر وہ کوئی منظر، کوئی مرد، کوئی عورت صرف ایک نظر دیکھ لے تو اسے ممن و عن اپنے الفاظ میں بیان کر سکتا ہے جو کبھی غلط نہیں ہوں گے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا اندازہ ہمیشہ درست ثابت ہوتا تھا۔“

میں نے پوچھا، ”کیا یہ واقعی درست تھا۔“

”سو فیصد۔۔۔“ ایک مرتبہ میں نے اس سے بازار میں پوچھا، ”یہ لڑکی جو ابھی ابھی ہمارے پاس سے گزری ہے، کیا تم اس کے متعلق بھی تفصیلات بیان کر سکتے ہو؟“

میں اس لڑکی سے ایک گھنٹہ پہلے مل چکا تھا۔ وہ ہمارے ہمسائے مسٹر لو جوائے کی بیٹی تھی۔ اور میری بیوی سے سلامی کے مستعار لینے آئی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا، اس لیے بغرض امتحان میں نے مجیب سے یہ سوال کیا تھا۔

مجیب مسکرا یا، ”تم میرا امتحان لینا چاہتے ہو؟“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ بات نہیں۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔“

”نہیں تم میرا امتحان لینا چاہتے ہو۔ خیر سنو! وہ لڑکی جو ابھی ابھی ہمارے پاس سے گزری ہے اور جسے میں اچھی طرح نہیں دیکھ سکا، مگر لباس کے متعلق کچھ کہنا نصیول ہے، اس لیے کہ ہر وہ شخص جس کی آنکھیں سلامت ہوں اور ہوش و حواس درست ہوں کہہ سکتا ہے کہ وہ کس قسم کا تھا۔ ویسے ایک چیز جو مجھے اس میں خاص طور پر دکھائی دی، وہ اس کے دامنے ہاتھ کی چہنگلی تھی۔ اس میں کسی قدر رحم ہے، باسیں ہاتھ کے انگوٹھے کا ناخن مضرub تھا۔ اس کے لپ اسٹک لگے ہو نہیں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آرائش کے فن سے محض کوری ہے۔“

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس نے ایک معمولی سی نظر میں یہ سب چیزیں کیسے بھانپ لیں۔۔۔ میں ابھی اس حیرت میں غرق تھا کہ مجیب نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، ”اس میں جو خاص چیز مجھے نظر آئی وہ اس کے دامنے گال کا داغ تھا۔۔۔ غالباً کسی پھوٹے کا ہے۔“

مجیب کا کہنا درست تھا۔۔۔ میں نے اس سے پوچھا، ”یہ سب باتیں جو تم اتنے وثوق سے کہتے ہو، تمہیں کیونکر معلوم ہو جاتی ہیں؟“

مجیب مسکرا یا، ”میں اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں ہر آدمی کو صاحبِ نظر ہونا چاہیے۔ صاحبِ نظر سے میری مرد اہر اس شخص سے ہے جو ایک ہی نظر میں دوسرے آدمی کے تمام خدوخال دیکھ لے۔“

”میں نے اس سے پوچھا، ”خدو خال دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟“

”بہت کچھ ہوتا ہے۔۔۔ خدو خال ہی تو انسان کا صحیح کردار بیان کرتے ہیں۔“

”کرتے ہوں گے۔ میں تمہارے اس نظر یے سے متفق نہیں ہوں۔“

”نہ ہو۔۔۔ مگر میرا نظر یہ اپنی جگہ قائم رہے گا۔“

”رہے۔۔۔ مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ بہر حال، میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انسان غلطی کا پتلا ہے۔۔۔ ہو سکتا ہے تم غلطی پر ہو۔“

”یا، غلطیاں درستیوں سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں۔“

”یہ تمہارا عجیب فلسفہ ہے۔“

”فلسفہ گائے کا گوب رہے۔“

”اور گوب رہے؟“

مجیب مسکرا یا، ”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ اپلا کہہ لجئے، جو ایندھن کے کام آتا ہے۔“

ہمیں معلوم ہوا کہ مجیب ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے۔ پہلی ہی نگاہ میں اس نے اس کے جسم کے ہر خود خال کا صحیح جائزہ لے لیا تھا۔ وہ لڑکی بہت متاثر ہوئی جب اسے معلوم ہوا کہ دنیا میں ایسے آدمی بھی موجود ہیں جو صرف ایک نظر میں سب چیزیں دیکھ جاتے ہیں تو وہ مجیب سے شادی کرنے کے لیے رضامند ہو گئی۔

ان کی شادی ہو گئی۔۔۔ لہن نے کیسے کپڑے پہنے تھے، اس کی دائیں کلائی میں کس ڈیزائن کی دست پچھی تھی۔۔۔ اس میں کتنے نگینے تھے۔۔۔ یہ سب تفصیلات اس نے ہمیں بتائیں۔

ان تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں میں طلاق ہو گئی۔

-[35]-

بادشاہت کا خاتمہ: سعادت حسن منشو

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ من موہن پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور کہا، ”ہیلو۔۔۔ فور فور فور فائیو سیوون۔“

دوسری طرف سے تپی سی نسوانی آواز آئی، ”سوری۔۔۔ روگ نمبر۔“

من موہن نے ریسیور کھدا اور کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

یہ کتاب وہ تقریباً بیس مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اس میں کوئی خاص بات تھی۔ دفتر میں جو ویران پڑا تھا، ایک صرف بھی کتاب تھی جس کے آخری اور اقل کرم خورده تھے۔ ایک ہفتے سے دفتر من موہن کی تحویل میں تھا کیونکہ اس کا مالک جو کہ اس کا دوست تھا، کچھ روپیہ قرض لینے کے لیے کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ من موہن کے پاس چونکہ رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی، اس لیے فٹ پاٹھ سے عارضی طور پر وہ اس دفتر میں منتقل ہو گیا تھا اور اس ایک ہفتے میں وہ دفتر کی اکلوتی کتاب تقریباً بیس مرتبہ پڑھ چکا تھا۔

دفتر میں وہ اکیلا پڑا رہتا۔ نو کری سے اسے نفرت تھی۔ اگر وہ چاہتا تو کسی بھی فلم کمپنی میں بطور فلم ڈائریکٹر کے ملازم ہو سکتا تھا۔ مگر وہ غلامی نہیں چاہتا تھا۔ نہایت ہی بے ضر اور مخلص آدمی تھا۔ اس لیے دوست یار اس کے وزانہ اخراجات کا بندوبست کر دیتے تھے۔ یہ اخراجات بہت ہی کم تھے۔ صحیح کو چائے کی پیالی اور دو توں۔ دو پھر کو دو پھلے اور تھوڑا سا سالن سارے دن میں ایک پیکٹ سگریٹ اور بس!

من موہن کا کوئی عزیز یار شتہ دار نہیں تھا۔ بے حد خاموشی پسند تھا۔ جفاش تھا۔ کئی کئی دن فاقہ سے رہ سکتا تھا۔ اس کے متعلق اس کے دوست اور توپکھنے نہیں لیکن اتنا جانتے تھے کہ وہ بچپن ہی سے گھر چھوڑ چھاڑ کے نکل آیا تھا اور ایک مدت سے ببنتی کے فٹ پا تھوں پر آباد تھا۔ زندگی میں صرف اس کو ایک چیز کی حسرت تھی۔۔۔ عورت کی محبت کی۔ ”اگر مجھے کسی عورت کی محبت مل گئی تو میری ساری زندگی بدل جائے گی۔“ دوست اس سے کہتے، ”تم کام پھر بھی نہ کرو گے۔“

من موہن آہ بھر کا جواب دیتا، ”کام۔۔۔؟ میں جسم کام بن جاؤں گا۔“

دوست اس سے کہتے، ”تو شروع کر دو کسی سے عشق۔“

من موہن جواب دیتا، ”نہیں۔۔۔ میں ایسے عشق کا قابل نہیں جو مرد کی طرف سے شروع ہو۔“

دوپھر کے کھانے کا وقت قریب آرہا تھا۔ من موہن نے سامنے دیوار پر کلاک کی طرف دیکھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ اس نے رسیسور اٹھایا اور کہا، ”ہیلو۔۔۔ فور فور فور فائیسیوں۔“

دوسری طرف سے ٹیلی سی آواز آئی، ”فور فور فور فائیسیوں؟“

بر ج موہن نے جواب دیا، ”جی ہاں!“

نسوانی آواز نے پوچھا، ”آپ کون ہیں؟“

”من موہن۔۔۔ فرمائیے!“

دوسری طرف سے آواز آئی تو من موہن نے کہا، ”فرمائیے کس سے بات کرنا چاہتی ہیں آپ؟“

آواز نے جواب دیا، ”آپ سے!“

من موہن نے ذرا حیرت سے پوچھا، ”مجھ سے؟“

”جی ہاں--- آپ سے--- کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے۔“

من موہن سپٹا ساگیا، ”جی---؟ جی نہیں!“

آواز مسکراتی، ”آپ نے اپنانام مدن موہن بتایا تھا۔“

”جی نہیں--- من موہن۔“

”من موہن؟“

چند لمحات خاموشی میں گزر گئے تو من موہن نے کہا، ”آپ بتیں کرنا چاہتی تھیں مجھ سے؟“

”آواز آئی، ”جی ہاں!“

”تو کیجیے!“

تحوڑے و قٹے کے بعد آواز آئی، ”سمجھ میں نہیں آتا کیا بات کروں--- آپ ہی شروع کیجیے نہ کوئی بات۔“

”بہت بہتر“ یہ کہہ کر مون موہن نے تھوڑی دیر سوچا، ”نام اپنا بتا چکا ہوں۔ عارضی طور پر ٹھکانہ میرا یہ دفتر ہے۔۔۔ پہلے فٹ پاتھ پر سوتا تھا۔ اب ایک ہفتہ سے اس دفتر کے بڑے میز پر سوتا ہوں۔“

آواز مسکراتی، ”فٹ پاتھ پر آپ مسہری لگا کر سوتے تھے؟“

من موہن ہنسا، ”اس سے پہلے کہ میں آپ سے مزید گفتگو کروں، میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ فٹ پاتھوں پر سوتے مجھے ایک زمانہ ہو گیا ہے۔ یہ دفتر تقریباً ایک ہفتے سے میرے قبضے میں ہے۔ آج کل عیش کر رہا ہوں۔“

آواز مسکراتی، ”کیسی عیش؟“

من موہن نے جواب دیا، ”ایک کتاب مل گئی تھی یہاں سے۔۔۔ آخری اور اگم ہیں لیکن میں اسے میں مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔۔۔ سالم کتاب کبھی ہاتھ لگی تو معلوم ہوا گا ہیر و ہیر و ن کے عشق کا انعام کیا ہوا۔“

آواز ہنسی، ”آپ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔“

من موہن نے تکلف سے کہا، ”آپ کی ذرہ نوازی ہے۔“

آواز نے تھوڑے توقف کے بعد پوچھا، ”آپ کا شغل کیا ہے؟“

”شغل؟“

”میرا مطلب ہے آپ کرتے کیا ہیں؟“

”کیا کرتا ہوں۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔ ایک بیکار انسان کیا کر سکتا ہے۔ سارا دن آوارہ گردی کرتا ہوں۔ رات کو سو جاتا ہوں۔“

آواز نے پوچھا، ”یہ زندگی آپ کو اچھی لگتی ہے۔“

من موہن سوچنے لگا۔ ”مٹھر یئے۔۔۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اس پر کبھی غور ہی نہیں کیا۔ اب آپ نے پوچھا ہے تو میں اپنے آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ یہ زندگی تمہیں اچھی لگتی ہے یا نہیں؟“

”کوئی جواب ملا؟“

تحوڑے و قفے کے بعد من موہن نے جواب دیا، ”جی نہیں۔۔۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایسی زندگی مجھے اچھی لگتی ہی ہو گی۔ جب کہ ایک عرصے سے بسر کر رہا ہوں۔“

آواز ہنسی۔ من موہن نے کہا، ”آپ کی ہنسی بڑی مترنم ہے۔“

آواز شرما گئی۔ ”مشکر یہ!“ اور سلسلہ گفتگو منقطع کر دیا۔

من موہن تھوڑی دیر رسیور ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔ پھر مسکرا کر اسے رکھ دیا اور دفتر بند کر کے چلا گیا۔ دوسرے روز صبح آٹھ بجے جب کہ من موہن دفتر کے بڑے میز پر سور ہاتھا، ٹیلیفون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ جمائیاں لیتے ہوئے اس نے رسیور اٹھایا اور کہا، ”ہلو فور فور فور فائیو سیوں۔“

دوسری طرف سے آواز آئی، ”آداب عرض من موہن صاحب!“

”آداب عرض!“ من موہن ایک دم چوٹکا۔ ”اوہ، آپ۔۔۔ آداب عرض۔“

”تسلیمات!“

آواز آئی، ”آپ غالباً سور ہے تھے؟“

”جی ہاں--- یہاں آکر میری عادات کچھ بگڑ رہی ہیں۔ واپس فٹ پاتھر پر گیا تو بڑی مصیبت ہو جائے گی۔“

آواز مسکراتی۔ ”کیوں؟“

”وہاں صحیح پانچ بجے سے پہلے پہلے اٹھنا پڑتا ہے۔“

آواز ہنسی۔ من موہن نے پوچھا، ”کل آپ نے ایک دم ٹیلی فون بند کر دیا۔“

آواز شرمائی۔ ”آپ نے میری ہنسی کی تعریف کیوں کی تھی۔“

من موہن نے کہا، ”لو صاحب، یہ بھی عجیب بات کہی آپ نے--- کوئی چیز جو خوبصورت ہو تو اس کی تعریف نہیں کرنی چاہیے؟“

”بالکل نہیں۔“

”یہ شرط آپ مجھ پر عائد نہیں کر سکتیں--- میں نے آج تک کوئی شرط اپنے اوپر عائد نہیں ہونے دی۔ آپ نہیں گی تو میں ضرور تعریف کروں گا۔“

”میں ٹیلی فون بند کر دوں گی۔“

”بڑے شوق سے۔“

”آپ کو میری ناراضگی کا کوئی خیال نہیں۔“

”میں سب سے پہلے اپنے آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔۔۔ اگر میں آپ کی بُنگی کی تعریف نہ کروں تو میرا ذوق مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔۔۔ یہ ذوق مجھے بہت عزیز ہے!“

تحوڑی دیر خاموشی رہی۔ اس کے بعد دوسرا طرف سے آواز آئی، ”معاف کیجیے گا، میں ملازمہ سے کچھ کہہ رہی تھی۔۔۔ آپ کا ذوق آپ کو بہت عزیز ہے۔۔۔ ہاں یہ تو بتائیے آپ کو شوق کس چیز کا ہے؟“

”کیا مطلب؟“

”یعنی۔۔۔ کوئی شغل۔۔۔ کوئی کام۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ کو آتا کیا ہے؟“

من موہن ہنسا، ”کوئی کام نہیں آتا۔۔۔ فوٹو گرافی کا تھوڑا سا شوق ہے۔۔۔“

”یہ بہت اچھا شوق ہے۔۔۔“

”اس کی اچھائی یا برائی کامیں نے کبھی نہیں سوچا۔۔۔“

آواز نے پوچھا، ”کیسرہ تو آپ کے پاس بہت اچھا ہو گا؟؟؟“

من موہن ہنسا، ”میرے پاس اپنا کوئی کیسرہ نہیں۔ دوست سے مانگ کر شوق پورا کر لیتا ہوں۔ اگر میں نے کبھی کچھ کمایا تو ایک کیسرہ میری نظر میں ہے۔ وہ خریدوں گا۔۔۔“

آواز نے پوچھا، ”کون سا کیسرہ؟“

من موہن نے جواب دیا، ”ایگز کٹا۔۔۔ رینگلکس کیسرہ ہے۔۔۔ مجھے بہت پسند ہے۔۔۔“

تحوڑی دیر خاموشی رہی۔ اس کے بعد آواز آئی، ”میں کچھ سوچ رہی تھی۔“

”کیا؟“

”آپ نے میرا نام پوچھانہ ٹیلی فون نمبر دریافت کیا۔“

”مجھے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔“

”کیوں؟“

”نام آپ کا کچھ بھی ہو کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔ آپ کو میرا نمبر معلوم ہے بس ٹھیک ہے۔۔۔ آپ گرچاہیں گی تو میں آپ کو ٹیلی فون کروں تو نام اور نمبر بتا دیجیے گا۔“

”میں نہیں بتاؤں گی۔“

”لو صاحب یہ بھی خوب رہی۔۔۔ میں جب آپ سے پوچھوں گا ہی نہیں قوتانے نہ بتانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔“

”آواز مسکراتی، آپ عجیب و غریب آدمی ہیں۔“

من موہن مسکرا دیا، ”جی ہاں کچھ ایسا ہی آدمی ہوں۔“

چند سینٹ خاموشی رہی۔ ”آپ پھر سوچنے لگیں۔“

”جی ہاں، کوئی اور بات اس وقت سوچ نہیں رہی تھی۔“

”ٹیلی فون بند کر دیجیے۔۔۔ پھر سہی۔“

آواز کسی قدر تیکھی ہو گئی، ”آپ بہت روکھے آدمی ہیں۔۔۔ ٹیلی فون بند کر دیجیے۔ لیجیے میں بند کرتی ہوں۔“

من موہن نے ریسیور کھل دیا اور مسکرانے لگا۔

آدھے گھنٹے کے بعد جب من موہن ہاتھ دھو کر کپڑے پہن کر باہر نکلنے کے لیے تیار ہوا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور کہا،
”فور فور فور فائیوسیون!“

آواز آئی، ”مسٹر من موہن؟“

من موہن نے جواب دیا، ”جی ہاں من موہن۔ ارشاد؟“

آواز مسکرائی۔ ”ارشاد یہ ہے کہ میری ناراضگی دور ہو گئی ہے۔“

من موہن نے بڑی شگفتگی سے کہا، ”مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔“

”ناشته کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ آپ کے ساتھ بگاڑنی نہیں چاہیے۔۔۔ ہاں آپ نے ناشته کر لیا؟“

”جی نہیں، باہر نکلنے ہی والا تھا کہ آپ نے ٹیلی فون کیا۔“

”اوہ۔۔۔ تو آپ جائیے۔“

”جی نہیں، مجھے کوئی جلدی نہیں، میرے پاس آج پیسے نہیں ہیں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ آج ناشته نہیں ہو گا۔“

”آپ کی باتیں سن کر--- آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں--- میرا مطلب ہے ایسی باتیں آپ اس لیے کرتے ہیں کہ آپ کو دکھ ہوتا ہے؟“

من موہن نے ایک لمحہ سوچا، ”جی نہیں--- میرا اگر کوئی دکھ درد ہے تو میں اس کا عادی ہو چکا ہوں۔“

آواز نے پوچھا، ”میں کچھ روپے آپ کو بھیج دوں؟“

من موہن نے جواب دیا، ”بھیج دیجیے۔ میرے فانسرول میں ایک آپ کا بھی اضافہ ہو جائے گا!“

”نہیں، میں نہیں بھیجوں گی!“

”آپ کی مرضی!“

”میں ٹیلی فون بند کرتی ہوں۔“

”بہتر!“

من موہن نے ریسیور کھداور مسکراتا ہوا دفتر سے نکل گیا۔ رات کو دس بجے کے قریب واپس آیا اور کپڑے بدلتے میز پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ یہ کون ہے جو اسے فون کرتی ہے۔ آواز سے صرف اتنا پتہ چلتا تھا کہ جوان ہے۔ ہنسی بہت ہی متزمم تھی۔ گفتگو سے یہ صاف ظاہر ہے کہ تعلیم یافتہ اور مہذب ہے۔ بہت دیر تک وہ اس کے متعلق سوچتا رہا۔ ادھر کلاک نے گیارہ بجائے ادھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

من موہن نے ریسیور اٹھایا۔ ”ہلو۔“

دوسری طرف سے وہی آواز آئی، ”مسٹر من موہن۔“

”جی ہاں--- من موہن--- ارشاد۔“

”ارشاد یہ ہے کہ میں نے آج دن میں کئی مرتبہ رنگ کیا۔ آپ کہاں غائب تھے؟“

”صاحب بیکار ہوں، لیکن پھر بھی کام پر جاتا ہوں۔“

”کس کام پر؟“

”آوارہ گردی۔“

”واپس کب آئے؟“

”دس بجے۔“

”اب کیا کر رہے تھے؟“

”میز پر لیٹا آپ کی آواز سے آپ کی تصویر بن رہا تھا۔“

”بنی؟“

”جی نہیں۔“

”بنانے کی کوشش نہ کیجیے۔۔۔ میں بڑی بد صورت ہوں۔“

”معاف کیجیے گا، اگر آپ واقعی بد صورت ہیں تو ٹیلی فون بند کر دیجیے، بد صورتی سے مجھے نفرت ہے۔“

آواز مسکرائی، ”ایسا ہے تو چلیے میں خوبصورت ہوں، میں آپ کے دل میں نفرت نہیں پیدا کرنا چاہتی۔“

تحوڑی دیر خاموشی رہی۔ من موہن نے پوچھا، ”کچھ سوچنے لگیں؟“

آواز چونکی ”جی نہیں۔۔۔ میں آپ سے پوچھنے والی تھی کہ۔۔۔“

”سوچ لیجیے اچھی طرح۔“

آواز ہنس پڑی۔ ”آپ کو گانساناؤں؟“

”ضرور۔۔۔“

”مکھر ہیے!“

گلہ صاف کرنے کی آواز آئی۔ پھر غالب کی یہ غزل شروع ہوئی

نکتہ چیں ہے غمِ دل۔۔۔

سہگل والی نئی دھن تھی۔ آواز میں درد اور خلوص تھا۔ جب غزل ختم ہوئی تو من موہن نے داد دی۔ ”بہت خوب۔۔۔ زندہ رہو۔“

آواز شرماگئی۔ ”شکر یہ!“ اور ٹیلی فون بند کر دیا۔

دفتر کے بڑے میز پر من موہن کے دل و دماغ میں ساری رات غالب کی غزل گو نجتی رہی۔ صحیح جلدی اٹھا اور ٹیلی فون کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے کر سی پر بیٹھا رہا مگر ٹیلی فون کی گھنٹی نہ بجی۔ جب ماہوس ہو گیا تو ایک عجیب سی تلنگی اس نے اپنے حلق میں محسوس کی۔ اٹھ کر

ٹھینے لگا۔ اس کے بعد میز پر لیٹ گیا اور کڑھنے لگا۔ وہی کتاب جس کو وہ متعدد مرتبہ پڑھ چکا تھا اٹھائی اور ورنق گردانی شروع کر دی۔ یوں نبی
لیٹے لیٹے شام ہو گئی۔ تقریباً سات بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ من موہن نے ریسیور اٹھایا اور تیزی سے پوچھا، ”کون ہے؟“

”وہی آواز آئی، ”میں!“

من موہن کا لمحہ تیز رہا، ”اتنی دیر تم کہاں تھیں؟“

آواز لرزی، ”کیوں؟“

”میں صبح سے یہاں جھک مار رہا ہوں۔۔۔ ناشتہ کیا ہے نہ دوپہر کا کھانا کھایا ہے حالانکہ میرے پاس پیسے موجود تھے۔“

آواز آئی، ”میری جب مرضی ہو گی ٹیلی فون کروں گی۔۔۔ آپ۔۔۔“

من موہن نے بات کاٹ کر کہا، ”دیکھو جی یہ سلسلہ بند کرو۔ ٹیلی فون کرنا ہے تو ایک وقت مقرر کرو۔ مجھ سے انتظار برداشت نہیں ہوتا۔“

آواز مسکرائی۔ ”آج کی معافی چاہتی ہوں۔ کل سے باقاعدہ صبح اور شام فون آیا کرے گا آپ کو۔“

”یہ ٹھیک ہے!“

آواز ہنسی ”مجھے معلوم نہیں تھا آپ اس قدر بگڑے دل ہیں۔“

من موہن مسکرا یا۔ ”معاف کرنا۔ انتظار سے مجھے بہت کوفت ہوتی ہے اور جب مجھے کسی بات سے کوفت ہوتی ہے تو اپنے آپ کو سزا دینا
شروع کر دیتا ہوں۔“

”وہ کیسے؟“

”صحیح تمہارا ٹیلی فون نہ آیا۔۔۔ چاہیے تو یہ تھا کہ میں چلا جاتا۔۔۔ لیکن بیٹھا دن بھر اندر ہی اندر کڑھتا رہا۔ پہنچنا ہے صاف۔“

آواز ہمدردی میں ڈوب گئی، ”ماش مجھ سے یہ غلطی نہ ہوتی۔۔۔ میں نے قصدً صحیح ٹیلی فون نہ کیا!“

”کیوں؟“

”یہ معلوم کرنے کے لیے آپ انتظار کریں گے یا نہیں؟“

من موہن ہنسا۔ ”بہت شریر ہو تم۔۔۔ اچھا اب ٹیلی فون بند کرو۔ میں کھانا کھانے جا رہا ہوں۔“

”بہتر، کب تک لوٹیے گا؟“

”آدھے گھنٹے تک۔“

من موہن آدھے گھنٹے کے بعد کھانا کھا کر لوٹا تو اس نے فون کیا۔ دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد اس نے غالباً کی ایک غزل سنائی۔ من موہن نے دل سے داد دی۔ پھر ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اب ہر روز صحیح اور شام من موہن کو اس کا ٹیلی فون آتا۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی وہ ٹیلی فون کی طرف لپکتا۔ بعض اوقات گھنٹوں با تیں جاری رہتیں۔ اس دوران میں من موہن نے اس سے ٹیلی فون کا نمبر پوچھا، نہ اس کا نام۔ شروع شروع میں اس نے اس کی آواز کی مدد سے تخیل کے پر دے پر اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی تھی مگر اب وہ جیسے آواز ہی سے مطمئن ہو گیا تھا۔ آواز ہی شکل تھی۔ آواز ہی صورت تھی۔ آواز ہی جسم تھا۔ آواز ہی روح تھی۔

ایک دن اس نے پوچھا، ”موہن۔ تم میر انام کیوں نہیں پوچھتے؟“

من موہن نے مسکرا کر کہا، ”تمہارا نام تمہاری آواز ہے۔“

”جو کہ بہت مترنم ہے۔“

”اس میں کیا شک ہے؟“

ایک دن وہ بڑا ٹیڈھا سوال کر پڑھی۔ ”موہن تم نے کبھی کسی لڑکی سے محبت کی ہے؟“

من موہن نے جواب دیا، ”نہیں!“

”کیوں؟“

موہن ایک دم ادا سہو گیا، ”اس کیوں کا جواب چند لفظوں میں نہیں دے سکتا۔ مجھے اپنی زندگی کا سارا الملہ اٹھانا پڑے گا۔۔۔ اگر کوئی جواب نہ ملے تو بڑی کوفت ہو گی۔“

”جانے دیجیے۔“

ٹیلی فون کا رشتہ قائم ہوئے تقریباً ایک مہینہ ہو گیا۔ بلاناغ دن میں دو مرتبہ اس کا فون آتا۔ من موہن کو اپنے دوست کا خط آیا کہ قرضے کا بندوبست ہو گیا ہے۔ سات آٹھ روز میں وہ بکبیٹی پہنچنے والا ہے۔ من موہن یہ خط پڑھ کر افسر دہ ہو گیا۔ اس کا ٹیلیفون آیا تو من موہن نے اس سے کہا میری دفتر کی بادشاہی اب چند دنوں کی مہمان ہے۔

اس نے پوچھا، ”کیوں؟“

من موہن نے جواب دیا۔ ”قرضے کا بندوبست ہو گیا ہے۔۔۔ دفتر آباد ہونے والا ہے۔“

”تمہارے کسی اور دوست کے گھر میں ٹیلی فون نہیں۔“

”کئی دوست ہیں جن کے ٹیلی فون ہیں۔ مگر میں تمہیں ان کا نمبر نہیں دے سکتا۔“

”کیوں؟“

”میں نہیں چاہتا تمہاری آواز کوئی اور سنے۔“

”وچہ؟“

”میں بہت حاسد ہوں۔“

”وہ مسکرائی۔“ یہ توبڑی مصیبت ہوئی۔

”کیا کیا جائے؟“

”آخری دن جب تمہاری بادشاہت ختم ہونے والی ہوگی۔ میں تمہیں اپنا نمبر دوں گی۔“

”یہ ٹھیک ہے!“

من موہن کی ساری افسردگی دور ہو گئی۔ وہ اس دن کا انتظار کرنے لگا کہ دفتر میں اس کی بادشاہت ختم ہو۔ اب پھر اس نے اس کی آواز کی مدد سے اپنے تخيّل کے پر دے پر اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش شروع کی۔ کئی تصویریں بنیں مگر وہ مطمئن نہ ہوا۔ اس نے سوچا چند دنوں کی بات ہے۔ اس نے ٹیلی فون نمبر بتا دیا تو وہ اسے دیکھ بھی سکے گا۔ اس کا خیال آتے ہی اس کا دل و دماغ ٹੂن ہو جاتا۔ ”میری زندگی کا وہ لمحہ کتنا بڑا لمحہ ہو گا جب میں اس کو دیکھوں گا۔“

دوسرے روز جب اس کا ٹیکلی فون آیا تو من موہن نے اس سے کہا، ”تمہیں دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا ہے۔“

”کیوں؟“

”تم نے کہا تھا کہ آخری دن جب یہاں میری بادشاہت ختم ہونے والی ہو گی، تو تم مجھے اپنا نمبر بتا دو گی۔“

”کہا تھا۔“

”اس کا یہ مطلب ہے تم مجھے اپنا ایڈریس دے دو گی۔۔۔ میں تمہیں دیکھ سکوں گا۔“

”تم مجھے جب چاہو دیکھ سکتے ہو۔۔۔ آج ہی دیکھ لو۔“

نہیں نہیں۔۔۔ پھر کچھ سوچ کر کہا، ”میں ذرا اچھے لباس میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔۔۔ آج ہی ایک دوست سے کہہ رہا ہوں۔ وہ مجھے سوٹ دلوادے گا۔“

وہ بنس پڑی۔ ”بالکل بچھ ہو تم۔۔۔ سنو۔ جب تم مجھ سے ملوگ تو میں تمہیں ایک تخفہ دوں گی۔“

من موہن نے جذباتی انداز میں کہا، ”تمہاری ملاقات سے بڑھ کر اور کیا تخفہ ہو سکتا ہے؟“

”میں نے تمہارے لیے ایگز کٹا کیمرہ خرید لیا ہے۔“

”اوہ!“

”اس شرط پر دوں گی کہ پہلے میرا فوٹو اتارو۔“

من موہن مسکرایا۔ ”اس شرط کا فیصلہ ملاقات پر کروں گا۔“

تحوڑی دیر اور گفتگو ہوئی اس کے بعد ادھر سے وہ بولی، ”میں کل اور پرسوں تمہیں ٹیلی فون نہیں کر سکوں گی۔“

من موہن نے تشویش بھرے لبجے میں پوچھا، ”کیوں؟“

”میں اپنے عزیزوں کے ساتھ کہیں باہر جا رہی ہوں۔ صرف دو دن غیر حاضر رہوں گی۔ مجھے معاف کر دینا۔“

یہ سننے کے بعد من موہن سارا دن دفتر ہی میں رہا۔ دوسرے دن صبح اٹھا تو اس نے حرارت محسوس کی۔ سوچا کہ یہ اضھال شاید اس لیے ہے کہ اس کا ٹیلی فون نہیں آئے گا لیکن دوپہر تک حرارت نیز ہو گئی۔ بدن تپنے لگا۔ آنکھوں سے شرارے پھونٹنے لگے۔ من موہن میز پر لیٹ گیا۔ پیاس بار بارستائی تھی۔ اٹھتا اور ٹل سے منہ لگا کر پانی پیتا۔ شام کے قریب اسے اپنے سینے پر بوجھ محسوس ہونے لگا۔ دوسرے روز وہ بالکل نہ ڈھال تھا۔ سانس بڑی وقت سے آتا تھا۔ سینے کی دکھن بہت بڑھ گئی تھی۔

کئی بار اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہوئی۔ بخار کی شدت میں وہ گھنٹوں ٹیلی فون پر اپنی محبوب آواز کے ساتھ باقیں کرتا رہا۔ شام کو اس کی حالت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ دھنڈ لائی ہوئی آنکھوں سے اس نے کلاک کی طرف دیکھا، اس کے کانوں میں عجیب و غریب آوازیں گونج رہی تھیں۔ جیسے ہزار ہائیلی فون بول رہے ہیں، سینے میں گھنگھروں کرنے رہے تھے۔ چاروں طرف آوازیں ہی آوازیں تھیں۔ چنانچہ جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو اس کے کانوں تک اس کی آواز نہ پہنچی۔ بہت دیر تک گھنٹی بجتی رہی۔ ایک دم من موہن چونکا۔ اس کے کان اب ٹن رہے تھے۔ لڑکھڑا تھا اور ٹیلی فون تک گیا۔ دیوار کا سہارا لے کر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رسیور اٹھایا اور خشک ہونٹوں پر لڑکی جیسی زبان پھیپھیر کر کہا، ”ہلو“

دوسری طرف سے وہ لڑکی بولی، ”ہلو۔۔۔ موہن؟“

من موہن کی آواز لڑکھڑا لی۔ ”ہاں موہن!“

”ذراؤ نجی بولو۔۔۔“

من موہن نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر وہ اس کے حلقہ ہی میں خشک ہو گیا۔

آواز آئی، ”میں جلدی آگئی۔۔۔ بڑی دیر سے تمہیں رنگ کر رہی ہوں۔۔۔ کہاں تھے تم؟“

من موہن کا سر گھونٹنے لگا۔

آواز آئی، ”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

من موہن نے بڑی مشکل سے اتنا کہا، ”میری بادشاہت ختم ہو گئی ہے آج۔“

اس کے منہ سے خون نکلا اور ایک پتلی لکیر کی صورت میں گردن تک دوڑتا چلا گیا۔

آواز آئی، ”میرا نمبر نوٹ کر لو۔۔۔ فائیونوٹ تھری ون فور۔۔۔ صفحون کرنا۔“ یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ من موہن اوندھے منہ ٹیلی فون پر گرا۔۔۔ اس کے منہ سے خون کے بلبلے پھوٹنے لگے۔

-[36]-

جھمکے: سعادت حسن منتو

منار کی انگلیاں جھمکوں کو برش سے پاٹش کر رہی ہیں جھمکے چکنے لگتے ہیں ستار کے پاس ہی ایک آدمی بیٹھا ہے جھمکوں کی چک دیکھ کر اس کی آنکھیں تمباٹھتی ہیں بڑی بے تابی سے وہ اپنے ہاتھ ان جھمکوں کی طرف بڑھاتا ہے اور منار کہتا ہے، ”بس اب رہنے دو مجھے“ منار اپنے گاہک کو اپنی ٹوٹی ہوئی عینک میں سے دیکھتا ہے اور مسکرا کر کہتا ہے، ”چھ میینے سے الماری میں بننے پڑے تھے آج آئے ہو تو کہتے ہو کہ ہاتھوں پر سرسوں جماڑوں۔“

گاہک جس کا نام چرخی ہے کچھ شرمندہ ہو کر کہتا ہے، ”کیا تاؤں لالہ کروڑی مل۔ اتنی رقم جمع ہونے میں آتی ہی نہیں تھی تم سے الگ شرمندہ جورو سے الگ شرمندہ عجب آفت میں جان پھنسنی ہوئی تھی۔ جانے اس سونے میں کیا کشش ہے کہ عورتیں اس پر جان دیتی ہیں۔“

سنارپا لش کرنے کے بعد جھمکے بڑی صفائی سے کاغذ میں لپیٹا ہے اور چرخی کے ہاتھوں میں رکھ دیتا ہے۔ چرخی کا غذ کھول کر جھمکے نکالتا ہے جب وہ جھمر جھمر کرتے ہیں تو وہ مسکراتا ہے۔ بھنی کیا کاریگری کی ہے لالہ کروڑی مل۔ دیکھے گی تو پھر ک اٹھے گی۔ یہ کہہ کروہ جلدی جلدی اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکالتا ہے اور سنار سے یہ کہہ کر ”کھرے کر لو بھائی“ دکان سے باہر نکلتا ہے۔

دکان کے باہر ایک تانگہ کھڑا ہے گھوڑا ہنہنا تا ہے تو چرخی اس کی پیٹھ پر تھکی دیتا ہے، ”تمھیں بھی دو جھمکے بناؤں گا میری جان فکر مت کرو“ یہ کہہ کروہ خوش خوش گھوڑے کی باگیں تھامتا ہے، ”چل میری جان ہوا سے باتیں کر کے دکھادے۔“

چرخی خوش خوش اپنے طویلے پینچتا ہے دھیمے دھیمے سروں میں کوئی گیت گلنگا تا اور یوں اپنی خوشی کا اظہار کرتا وہ گھوڑے کو تھکی دیتا اور کہتا ہے،

”ابھی چھٹی نہیں ملے گی میری جان تیری مالکن یہ جھمکے پہن کر کیا باغ کی سیر کو نہیں جائے گی۔“

چرخی جلدی گھر کا زینہ طے کرتا ہے اور زور سے آواز دیتا ہے۔ مُنیٰ مُنی ایک چھوٹی سی لڑکی بھاگتی ہوئی اندر سے نکلتی ہے اور چرخی کے ساتھ لپٹ جاتی ہے چرخی جھمکے نکال کر اس کی کان کی لوؤں کے ساتھ لگاتا ہے اور کہتا ہے، ”ماں کہاں ہے تیری۔ جواب کا انتظار کیے بغیر وہ گھر کے سارے کروں میں ہاتھ میں جھمکے لیے پھرتا ہے مُنیٰ کی ماں۔ مُنیٰ کی ماں کہتا۔ لڑکی اس کے پیچے پیچے بھاگتی ہے---“ مُنیٰ ماں کہاں ہے تیری۔ لڑکی جواب دیتی ہے، وہاں گئی ہے: لڑکی کا اشارہ سامنے بلڈنگ کی طرف تھا۔ چرخی اور دیکھتا ہے کھڑکی کے شیشوں میں سے ایک مرد اور ایک عورت کا سایہ نظر آتا ہے مرد عورت کے کانوں میں بندے پہنراہا ہے لمبے لمبے بندے یہ منظر دیکھ کر چرخی کے منہ سے دبی ہوئی چیزی نکلتی ہے وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی نہیں بچی کو اٹھا کر سینے کے ساتھ بھیختی لیتا ہے اور اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتا ہے جیسے وہ نہیں چاہتا کہ اس کی بچی اس خوفناک سائے کو دیکھے سینے کے ساتھ اس طرح اپنی بچی کو بھینچے وہ آہستہ آہستہ نیچے اترتا ہے وہ جھمکے جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اس کے ہاتھوں سے فرش پر گر پڑتے ہیں۔

نیچے طویلے میں آکر وہ اپنی بچی کو جو کہ سخت پریشان ہو رہی ہے تانگے میں بٹھاتا ہے اور خود گھوڑے کی باگیں تھام کرتا نگے کو باہر نکالتا ہے۔

چرخی بالکل خاموش ہے جیسے اسے سانپ ٹوٹ گیا ہے اُس کی تختی بچی سہے ہوئے لبجے میں بار بار پوچھتی ہے، ”ماتا جی کے جھمکے کہاں ہیں پتا جی۔۔۔ ماتا جی کے جھمکے کہاں ہیں پتا جی؟“

چرخی کی بیوی اپنے گھر واپس آگئی ہے اور ایک آئینہ سامنے رکھے اپنے جھمکوں کو پسندیدہ نظر وہ دیکھ رہی ہے اور گارہی ہے۔ آئینہ دیکھتے وہ اپنی بچی کو آواز دیتی ہے مُنیِ ادھر آتھے ایک چیز دکھاؤ۔۔۔ کوئی جواب نہیں ملتا کہاں چلی گئی تو۔۔۔ یہ کہہ کروہ اٹھتی ہے اور ادھر ادھر اسے ڈھونڈتی ہے جب وہ نہیں ملتی تو باہر نکلتی ہے سیڑھیوں کے اختتامی سرے پر جو چبوترہ سا بنائے ہے اس پر کھلے ہوئے کاغذ میں دو جھمکے دکھائی دیتے ہیں چرخی کی بیوی ان کو اٹھاتی ہے ایک دم اسے خوفناک حقیقت کا احساس ہوتا ہے۔ ان جھمکوں کو مٹھی میں بھینچ کروہ چھینتی ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے دیوانوں کی طرح دوڑی دوڑی اندر جاتی ہے سب کمروں میں پاگلوں کی طرح چکراتی ہے اور مُنی کو آوازیں دیتی ہے جب اس کے دماغ کا طوفان کچھ کم ہوتا ہے تو وہ وہیں بیٹھ جاتی ہے جہاں پہلے بیٹھی تھی۔ سامنے اس کے سامنے آئینہ پڑا ہے اس میں وہ غیر ارادی طور پر اپنی شکل دیکھتی ہے۔ پرخی کی بیوی جب اپنی شکل اس زاویے میں دیکھتی ہے تو اس سے متفر ہو کر آئینہ اٹھاتی ہے اور زمین پر پٹک دیتی ہے آئینہ چکنا چور ہو جاتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی باہر نکلتی ہے۔

سامنے والی بلڈنگ کا ایک کمرہ۔۔۔ یہ کمرہ پر تکلف طریقے سے سجا ہوا ہے ایک لڑکی اور ایک لڑکا جس کی عمر میں تقریباً دو برس کا فرق ہے لڑکی چھ برس کی اور لڑکا آٹھ برس کا ہے دونوں اپنے باپ کے پاس بیٹھے ہیں اور اس سے کھیل رہے ہیں اتنے میں دروازے پر ہولے ہوئے دشک ہوتی ہے پہلی بار جب دشک ہوتی ہے تو پچوں کا باپ نہیں سنتا۔ جب دوسرا بار پھر ہوتی ہے تو وہ پوچنکتا ہے پچوں کی طرف دیکھتا ہے پھر ان کی آیا کی طرف اور کہتا ہے ان کو باہر لے جاؤ۔ کوئی میرا ملنے والا آیا ہے جلدی جلدی پچوں کو نکال کر دروازہ بند کرتا ہے دوسرے دروازے کی طرف بڑھتا ہے جب دروازہ کھلتا ہے تو چرخی کی بیوی اندر داخل ہوتی ہے اس کو دیکھ کر پچوں کے باپ کو سخت حیرت ہوتی ہے۔ وہ اس سے کہتا ہے، ”تم تو کہہ رہی تھیں مجھے جلدی گھر جانا ہے اب واپس کیسے آگئیں۔“ چرخی کی بیوی کچھ جواب نہیں دیتی۔ ساکت جامد کھڑی رہتی ہے اُس کو خاموش دیکھ کر وہ پھر اس سے پوچھتا ہے، ”وہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔“

چرخی کی بیوی کچھ جواب نہیں دیتی وہ پھر اس سے سوال کرتا ہے۔ تم خاموش کیوں ہو۔ جھمکے پسند نہیں آئے۔ چرخی کی بیوی کے ہونٹ کھلتے ہیں۔ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہتی ہے کیوں نہیں آئے۔ بہت پسند آئے۔ کیا اور لا دو گے مجھے؟ پچوں کا باپ مسکرا تا ہے جتنے کہوں بس یہی بات تھی۔۔۔ ”بڑے تلخ لبجے میں چرخی کی بیوی کہتی ہے بس یہی بات تھی لیکن مجھے صرف جھمکے ہی نہیں چاہئیں ناک کے لیے کیل۔۔۔ ہاتھوں کے لیے کنگنیاں کڑے گلے کے لیے ہار ماتھے کے لیے جھومر پاؤں کے لیے پازیب مجھے اتنے زیور چاہئیں کہ میرا پاپ ان کے

بوجھ تلے دب جائے اپنی عصمت کا زیور تو اُتار چکلی ہوں اب یہ گہنے نہ پہنؤں گی تو لوگ کیا کہیں گے۔ ”بچوں کا باپ یہ گفتگو سن کر سخت مختصر ہوتا ہے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا وہ چرخی کی بیوی سے کہتا ہے۔ یہ تو کیا بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔ چرخی کی بیوی جواب دیتی ہے۔ بہکی پہلے تھے اب تو ہوش کی باتیں کر رہی ہوں سنو۔ میں تمہارے پاس اس لیے آئی ہوں کہ وہ چلا گیا ہے میری بچی کو بھی ساتھ لے گیا ہے اُسے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے اب وہ بکھی واپس نہیں آئے گا جس طرح میری لٹی ہوئی آبرو واپس نہیں آئے گی۔۔۔ بولو مجھے پناہ دیتے ہو۔۔۔ میں تمہیں اس پاپ کا واسطہ دے کر اتنا کرتی ہوں کہ جو تم نے اور میں نے مل کر لیا ہے کہ مجھے پناہ دو۔۔۔ بچوں کا باپ چرخی کی بیوی کی سب التجاہیں سنتا ہے مگر وہ کیسے اس عورت کو پناہ دے سکتا ہے جس نے اپنے آپ کو جھمکے کے بد لے بیجا۔ ایک سودا تھا جو ختم ہو گیا چرخی کی بیوی کو یہ سن کر بہت صدمہ ہوتا ہے ناکام اور ماپوس ہو کر وہ چل جاتی ہے۔

چرخی اب ایک نئے گھر میں ہے رات کا وقت ہے۔ وہ اپنی بچی مُنی کو سلانے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ سوتی نہیں بار بار اپنی ماں کے بارے میں پوچھتی ہے چرخی اس کو نالنے کی کوشش کرتا ہے مگر بچی کی معصوم باتیں اُسے پریشان کر دیتی ہیں آخر میں گھبرا کر اُس کے منہ سے یہ نکلتا ہے، ”مُنی تمہاری ماتاجی مر گئی ہیں راستہ بھول کر وہ ایسی جگہ چلی گئی ہیں جہاں سے واپس آنا بڑا شکل ہوتا ہے۔“ دروازہ ہلتا ہے۔ چرخی فوراً منی کا چہرہ کمبل سے ڈھانپ دیتا ہے چرخی کی بیوی داخل ہوتی ہے چرخی اٹھتا ہے اور اسے باہر دھکیل کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیتا ہے۔ ”چلی جاؤ یہاں سے۔۔۔“ وہ اُس سے کہتا ہے چرخی کی بیوی جواب دیتی ہے، ”چلی جاتی ہوں میری بچی مجھے دیدو“ چرخی غصے اور نفرت بھرے لجھ میں اُس سے کہتا ہے وہ عورت جو مرد کی بیوی نہیں بن سکتی اولاد کی ماں کیسے ہو سکتی ہے اپنے پاپ بھرے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھیں منی کی ماں کہلانے کا حق حاصل ہے کیا اس دن کے بعد جب تم نے یہ جھمکے لے کر ایک غیر مرد تو ہاتھ لگانے دیا تم اپنی اولاد کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیپھیر سکتی ہو کیا تمہاری مامتا اُس دن جل کر راکھ نہیں ہو گئی تھی جب تمہارے قدم ڈمگا گئے تھے اپنی بچی لینے آئی ہو وہ جھمکے پہن کر جنہوں نے تمہاری زندگی کے سب سے قیمتی زیور کو اُتار کر گندی موری میں پھینک دیا ہے۔ میں یہ پوچھتا ہوں جب یہ جھمکے ہلتے ہیں تو تمہارے کانوں میں یہ آواز نہیں آتی کہ نہ تم ماں رہی ہونہ بیوی۔ جاؤ تمہاری مانگ سیندھو سے اور تمہاری گود اولاد سے ہمیشہ خالی رہے گی۔۔۔ جن قدموں سے آئی ہوا نہیں قدموں سے واپس چلی جاؤ۔ چرخی اپنی بیوی کی التجاویں کو ٹھکرایا ہے تو وہ چلی جاتی ہے افسردا اور خاموش۔

تالگے کا پہیہ گھوم رہا ہے یہ بتانے کے لیے کہ وقت گزر رہا ہے اور کئی سال بیت رہے ہیں تالگے کا پہیہ مڑتا ہے اور بڑے دروازے میں داخل ہوتا ہے یہ دروازہ گور نمنٹ کا لج کا ہے اور لڑکیاں گزر رہی ہیں تالگے کا لج کے کمپاؤنڈ میں ٹھہرتا ہے چرخی اب کافی بدھا ہو چکا ہے۔ تقریباً آدھے بال سفید ہیں۔ اس کی نہیں بچی اب جوان ہے تالگے کی پچھلی نشست پر سے جب اٹھتی ہے تو چرخی اس کو بہت نصیحتیں کرتا ہے۔ بڑے صاحب کو ہاتھ جوڑ کر نہستے کہنا جو سوال پوچھیں ان کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔ وغیرہ وغیرہ لڑکی اپنے باپ کی

ان باتوں سے پریشان ہو جاتی ہے اور اچھا اچھا کہتی وہاں سے چلتی ہے لیکن فور آئی چرخی اس کو روکتا ہے اور جیب سے برلنی نکال کر اس کو دیتا ہے اور کہتا ہے۔ پہلا دن ہے منہ میٹھا کر لوز بردستی وہ اپنی لڑکی کے ہاتھ میں برلنی رکھ دیتا ہے۔

سامنے کا لج کے برآمدے میں دو تین لڑکے کھڑے ہیں جو آنے جانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کو گھور رہے ہیں جب کرشنا کماری (چرخی کی بیٹی) برآمدے کی طرف آتی ہے تو ایک لڑکا جس کا نام جگدیش ہے اپنے ساتھی کی پسلیوں میں کہنی سے ٹھونکا دیتا ہے اور کہتا ہے۔

”لو بھی ایک فرسٹ کلاس چیز آئی ہے۔ طبیعت صاف ہو جائے گی تمہاری۔ یہ کہہ کر جب وہ کرشنا کماری کی طرف اشارہ کرتا ہے تو اس کے دوست سب ادھر متوجہ ہوتے ہیں مگر انھیں بجائے ایک دیہاتی لڑکا نظر آتا ہے جو بڑا انہماں سے اپنے فارم کا مطالعہ کرتا ہوا ان کی طرف چلا آ رہا ہے سب لڑکے اس دیہاتی کو دیکھ کر ہنسنے ہیں اور کہتے ہیں۔ بھی کیا چیز ہے طبیعت واقعی صاف ہو گئی۔ کرشنا کماری اس دوران میں ایک طرف ہو گئی تھی۔ یہ دیہاتی لڑکا جس کا نام کرشن کمار ہے کا لج کے ان پر آنے شریر طالب علموں کی طرف بڑھتا ہے جگدیش سے وہ بڑے سادہ لمحے میں پوچھتا ہے کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ مجھے کہاں جانا ہے جگدیش ذرا پچھے ہٹ کر اسے بڑے پیار سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے چڑیا گھر۔“
کرشن کمار اسی طرح سادہ لوحی سے جواب دیتا ہے جی نہیں چڑیا گھر میں کل جاؤں گا میں یہاں داخل ہونے آیا ہوں۔ سب لڑکے بے چارے کرشن کمار کا مذاق اڑاتے ہیں اُسے چھیڑتے ہیں اتنے میں ایک لڑکی کرشنا کماری کو ساتھ لیے ان لڑکوں کے پاس آتی ہے اور ان میں سے ایک لڑکے کو جس کا نام ستیش ہے مخاطب کر کے کہتی ہے ستیش میرا پیریڈ خالی نہیں تم انھیں بتا دو کہ کہاں داخلہ ہو رہا ہے کرشنا کماری کا فارم ستیش کو دے کر وہ تیز قدمی سے چل جاتی ہے ستیش فارم دیکھتا ہے اور کہتا ہے آپ کا نام کرشنا کماری ہے۔ کرشن کمار بول اٹھتا ہے جی نہیں میرا نام کرشن کمار ہے سب ہنسنے ہیں ستیش کرشن کمار کا فارم بھی لیتا ہے اور دونوں سے کہتا ہے آئیے کمار اور کماری صاحبہ میں آپ کو راستہ بتا دوں سب چلتے ہیں۔

اس کمرے کے باہر جہاں داخلہ ہو رہا ہے ستیش ٹھہر جاتا ہے اور ایک فارم کرشن کمار اور دوسرا کرشنا کو دے کر کہتا ہے، ”اندر چلے جائیں۔“

کرشن کماری اور کرشنا کمار دونوں اندر داخل ہوتے ہیں کرشن کمار ایک میز کی طرف بڑھتا ہے کرشن کماری دوسرے میز کی طرف ادھر کرشنا کماری کا انٹرو یو شروع ہوتا ہے ادھر کرشن کمار کا۔ کرشن کماری کا نام پڑھ کر پڑھ فیسر کہتا ہے آپ کبڑی کھیلتے ہیں۔ کشتی لڑتے ہیں، گولہ پھینکتے ہیں۔

ادھر دوسرا پروفیسر کرشن کمار سے کہتا ہے، ”آپ کو کشیدہ کاری کرو شیئے اور سلامی کے کام کا شوق ہے۔“ کرشن کمار اور کرشا جران رہ جاتے ہیں کرشن کماری پروفیسر سے کہتی ہے جی نہیں مجھے تو کشیدہ کاری کرو شیئے اور سلامیوں کا شوق ہے اُدھر کرشن کمار پر بیشان ہو کر پروفیسر سے کہتا ہے جی نہیں مجھے تو کبڑی کھلینے گولہ پھینکنے اور کشتی لڑنے کا شوق ہے دونوں کے فارم تبدیل ہو گئے تھے ہال میں تھقہے بلند ہوتے ہیں ہال کی کھڑکیوں کے باہر جگدیش اور سنتیش اور ان کی پارٹی کھڑی یہ سب تماشا دیکھتی رہتی ہے۔

بازار میں تانگہ کھڑا ہے چرخی اس کو صاف کر رہا ہے اتنے میں ایک پٹھان آتا ہے اور چرخی سے ان دوسروں پوں کا تقاضہ شروع کر دیتا ہے جو اُس نے قرض لے رکھے ہیں پٹھان روز روکے وعدوں سے نگ آیا ہوا ہے چنانچہ وہ چرخی سے بڑے ڈرست بجے میں بتائیں کرتا ہے چرخی پٹھان سے معافی مانگتا ہے اور کہتا کہ وہ بہت جلد اس کا قرضہ ادا کر دے گا پٹھان چرخی سے کہتا ہے کہ وہ تانگہ گھوڑا بیچ کر قرض ادا کر دے گا اس سے چرخی کو صدمہ ہوتا ہے تانگہ گھوڑا وہ کبھی بیچنے کے لیے تیار نہیں اس لیے کہ وہ اسے بہت عزیز ہے اتنے میں کرشا کماری کی آواز آتی ہے، ”پتابھی“ میری کتابیں آپ ساتھ لے گئے ہیں نا۔۔۔ چرخی اپنی لڑکی جواب دیتا ہے۔ ہاں بیٹی لے آیا ہوں اپنے ساتھ۔۔۔ یہ کہ کروہ پٹھان کی ٹھوڑی کوہاٹھ لگاتا ہے اور کہتا ہے خان میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے میری لڑکی کے سامنے اپنے روپوں کا تقاضہ نہ کرنا۔۔۔ خان کا دل کچھ پیختا ہے چنانچہ جب کرشن کماری آتی ہے اور تانگہ میں بیٹھتی ہے تو چرخی سے کچھ نہیں کہتا خان کو سلام کر کے چرخی تانگہ چلاتا ہے۔

دیہاتی لڑکے کرشن کمار کا نداق اڑایا جا رہا ہے، جگدیش نے اس کے پرانی وضع کے کوٹ کے ساتھ فرست ائیر فول کی چٹ لگار کھی ہے جدھر سے وہ بے چارہ گزرتا ہے لڑکے اُس کی طرف دیکھ کر ہنستے ہیں کرشن کمار جب سب کو ہنستے دیکھتا ہے تو خود بھی ہنسنا شروع کر دیتا ہے۔

اس دوران میں چرخی کا تانگہ اور ایک موڑ آتی ہے اس میں سے سنتیش اور اس کی بہن آنکھتی ہے یہ وہ لڑکی ہے جس نے کرشا کماری کا فارم سنتیش کو دیا تھا کرشن کماری جب سنتیش کی بہن نرملاء کو دیکھتی ہے تو ان کو نہستے کرتی ہے نرملاء نہستے کا جواب دیتی ہے اور اپنے بھائی کا تعارف کراتے ہوئے کہتی ہے یہ میرے بھائی سنتیش ہیں مگر آپ کی ایک بار پہلے ملاقات ہو چکی ہے سنتیش کرشا کماری کی طرف دیکھ کر مسکرا تا ہے اور کہتا ہے آپ کبڑی کھلتی ہیں، کشتی لڑتی ہیں اور گولہ پھینکتی ہیں، کرشا کماری اس روز کا واقعہ یاد کر کے شرمائی ہی گرساتھ ہی ہنس پڑتی ہے تینوں کا لنج کی طرف بڑھتے ہیں کچھ دُور جاتے ہیں تو ایک شور منائی دیتا ہے۔

جگدیش اور اُس کے ساتھیوں نے کرشن کمار کو کچھ بھرے گڑھے میں دھکا دیکھ گرا دیا تھا کچھ میں بے چارہ لٹ پت ہے لڑکے چھپڑ رہے ہیں جگدیش آگے بڑھ کر جب اُسے اٹھانے لگتا ہے تو اُس کا کوٹ پھٹ جاتا ہے کرشن کمار سے اب برداشت نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ کوٹ اسے

بے حد عزیز ہے یہ اُس کے مرحوم باپ کا تھا جو اُس کی ماں نے سنچال کر اُس کے لیے رکھا ہوا تھا جب اُس کا کوٹ پھٹ جاتا ہے تو وہ دیوانوں کی طرح اٹھتا ہے اور جگدیش کو پیننا شروع کر دیتا ہے کالج میں جگدیش کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ وہ بہت لڑاکا ہے کوئی اس کے مقابل میں نہیں ٹھہر سکتا مگر جب کرشن کمار اسے بری طرح لڑاتا ہے تو سب لڑکے حیران رہ جاتے ہیں اور جگدیش اور کرشن کمار دونوں کشتی لڑتے لڑتے سیش کرشا کماری اور زملا کے پاس آ جاتے ہیں تو زبردست گھونسہ مار کر جب کرشن کمار جگدیش کو گرا تھا ہے تو بے اختیار کرشا کماری کے منہ سے نکلتا ہے، ”یہ کیا وحشیانہ پن ہے“ کرشن کمار یہ آواز سنتا ہے اور اپنا ہاتھ روک لیتا ہے سیش جگدیش کو انٹھا کر ایک طرف لے جاتا ہے اتنے میں گھنٹی بجتی ہے سب لوگ چلے جاتے ہیں صرف کرشن کمار۔ کرشا کماری اکیلے رہ جاتے ہیں دونوں چند لمحات خاموش کھڑے رہتے ہیں آخر میں کرشن کمار نداamt بھرے لبجھ میں کرشا کماری سے کہتا ہے، ”مجھے معاف کرو۔ آئندہ مجھ سے کبھی ایسی وحشیانہ حرکت نہیں ہوگی“ کرشا کماری اس کی سادگی سے بہت متاثر ہوتی ہے جب وہ اس سے کہتا ہے میں کسی سے کچھ نہیں کہتا لیکن یہ لڑکے میری طرف دیکھ دیکھ کر کیوں ہنتے ہیں۔ کیوں چھیڑتے ہیں کیوں نگ کرتے ہیں۔ مجھے کچھ میں لٹ پت کر دیا ہے۔ یہ میرا کوٹ پھاڑ دیا ہے۔ جو میرے باپ کا ہے۔

کرشا کماری اُس سے ہمدردی کرتی ہے اور اُسے بتاتی ہے کہ لڑکے اس کو صرف اس لیے چھیڑتے ہیں کہ اس کا لباس پرانی وضاحت کا ہے۔ اگر وہ اس طرح کا لباس پہننا شروع کر دے جیسا کہ دوسرا پہنچتے ہیں تو اسے کوئی نہیں ستائے گا۔

کرشا کماری کی باتیں کرشن کمار کے ذہن میں بیٹھ جاتی ہیں جگدیش اور اُس کے ساتھی جھاڑیوں کے پیچھے سے ان دونوں کو باتیں کرتے دیکھ لیتے ہیں۔

ہو سٹل۔۔۔ کرشن کمار اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑا ہے اور ٹوٹ کا معاشرہ کر رہا ہے اس دوران میں وہ ایک گانا گاتا ہے بڑے جذبات بھرے انداز میں، اُس کے گانے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے۔ ساتھ والے کمرے میں جگدیش ڈنٹر پیل رہا ہے اور ڈسیل پھیر رہا ہے جب اُسے گانے کی آواز آتی ہے تو وہ بہت حیران ہوتا ہے۔ دروازہ کھول کر وہ باہر نکلتا ہے اور یہ معلوم کرتا ہے کہ ساتھ والے کمرے میں کوئی گارہا ہے باہر نکلتا ہے اور کمرے کے دروازے پر دستک دیتا ہے اندر سے آواز آتی ہے آجائے، ”جگدیش دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ کرشن کمار نیا سوت پہنے کھڑا ہے جب دونوں کی آنکھیں چار ہوتی ہیں تو کرشن کمار کہتا ہے۔ آپ لڑنے آئے ہیں تو مہربانی کر کے یہاں سے چلے جائیے کیونکہ میں اب کسی پر راتھ نہیں اُٹھاؤں گا۔۔۔ جگدیش مسکراتا ہے اور اپنے تیل لگے بدن کی طرف دیکھتا ہے۔۔۔ نہیں میں لڑنے نہیں آیا صلح کرنے آیا ہوں۔۔۔ یہ کہہ کروہ اپنے ہاتھ بڑھاتا ہے جسے کرشن کمار قبول کر لیتا ہے اس کے بعد جگدیش اس کے گانے کی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے دوست

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے دل کو گلی ہے آواز میں بہت درد ایسے ہی پیدا نہیں ہوا ضرور کسی کی ترچھی نظر نے تمھیں گھائی کیا ہے۔ کرشن کمار بہت سادہ لوح ہے فوراً ہی اپنے دل کا راز جگدیش کو بتا دیتا ہے۔ ”اب تم نے دوست کہا ہے تو تم سے پردہ۔۔۔ اُس لڑکی کرشا کماری نے ایسی پیاری پیاری باتیں کی ہیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میرے دل کو کیا ہو گیا ہے بڑی شریف اور بڑی ہمدرد لڑکی ہے اُس نے مجھے بتایا کہ تم لوگ مجھے کیوں چھیڑتے ہو اب دیکھ لو اُس کے کہنے پر میں نے تین ٹوٹ بنا لیے ہیں۔ جگدیش اس کا ہمراز بن جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے تمھیں عشق ہو گیا ہے سمجھے یعنی تمہارا دل جو ہے نا وہ اس لڑکی پر آگیا ہے اب تمھیں یہ چاہئیے کہ تم اس لڑکی پر اپنے عشق کا اظہار کر دو اگر تم نے اپنی محبت کو اپنے پہلو میں دبائے رکھا تو اسے زنگ لگ جائے گا اور دیکھو عورت کو اپنی طرف مائل کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ تم اُسے کوئی تحفہ دو انگوٹھی بندے جھمکے کچھ بھی۔

سادہ لوح کرشن کمار جگدیش کی یہ سب باتیں اپنے پلے باندھ لیتا ہے۔

کالج کے باعیچے میں کرشا کماری ایک نیچ پر بیٹھی ہے کرشن کمار آہستہ آہستہ اُس کے پاس جاتا ہے جس طرح جگدیش نے کہا تھا اس طرح وہ اس پر اپنے عشق کا اظہار کرتا ہے بڑے خام انداز میں۔۔۔ اس کے بعد وہ اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی ڈبیاں کالتا ہے اور کرشا کماری کو سونے کے جھمکے تحفے کے طور پر پیش کرتا ہے کرشا کماری یہ ڈبیا غصے میں آکر ایک طرف پھینک دیتی ہے۔ کرشن کمار کو صدمہ پہنچتا ہے اور جیرت بھی ہوتی ہے چونکہ وہ بے حد سادہ لوح ہے اس لیے وہ ساری بات کرشا کو بتا دیتا ہے مجھے جگدیش نے کہا تھا کہ دل میں کوئی بات نہیں رکھنی چاہیے، مجھے کئی راتوں سے نیند نہیں آئی میں ہر وقت تمہارے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔ تم نے کیوں مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا اگر میرے دل میں تمہارے لیے محبت پیدا ہوئی ہے تو یہ تمہارا قصور ہے میرا نہیں۔ یہ جھمکے تو میں نے تمھیں دینے ہیں ان سے میری محبت ظاہر نہیں ہوتی یہ تو مجھ سے جگدیش نے کہا تھا کہ ایسے موقع پر تحفہ ضرور دینا چاہیے میں تو اپنی ساری زندگی تمھیں تحفے کے طور پر دینے کے لیے تیار ہوں۔

جب کرشا کماری کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جگدیش نے اسے بیو قوف بنانے کی کوشش کی تھی اور وہ کرشن کمار کی صاف گوئی سے متاثر ہوتی ہے تو وہ جھمکوں کی ڈبیاٹھا لیتی ہے اور اپنے پاس رکھ لیتی ہے اور اس سے کہتی ہے مجھے تمہارا یہ تحفہ قبول ہے۔ کرشن کمار بہت خوش ہوتا ہے جھمکے لے کر کرشن کماری کچھ اور کہہ سنبھلی جاتی ہے کرشن کمار چند لمحات خاموش کھڑا رہتا ہے اتنے میں جگدیش اور ستیش دونوں جھلاڑیوں کے پیچھے سے نکلتے ہیں اور کرشن کمار کو مبارکباد دیتے ہیں کرشن کمار بہت جھینپتا ہے اس کے ساتھ ہی وہ جگدیش سے کہتا ہے۔۔۔ ”مگر یا تم نے تو کہا تھا کہ میں یہ بات کسی کو نہیں بتاؤں گا۔“

ستیش کی طرف دیکھ کر وہ پھر کہتا ہے ان کو بھی پتہ لگ گیا ہے جگدیش کرشن کمار کو تسلی دیتا ہے کہ ستیش اپنا آدمی ہے وہ کسی سے کچھ نہیں کہے گا چنانچہ ستیش بھی کرشن کمار کوہر ممکن تسلی دیتا ہے کہ وہ اس کے عشق کاراز کسی کو نہیں بتائے گا۔

طولیے میں چرخی ساز پالش کر رہا ہے۔ تانگے کی پیٹل کی چیزیں پالش کر رہا ہے گھوڑے کو ماش کر رہا ہے جب ماش کرتا ہے تو اس سے پیارہ محبت کی باتیں کرتا ہے۔ دوست تم نے میری بہت خدمت کی ہے اگر تم نہ ہوتے تو جانے زندگی کتنی کٹھن ہو جاتی تم نے اور میں نے دونوں نے مل کر مُنی کو پڑھایا ہے اتنے میں اس کے دو تین دوست جو تانگے والے ہیں، آتے ہیں ان میں ایک چرخی سے کہتا ہے یہ تم گھوڑے سے کیا باتیں کر رہے ہو جیسے یہ سب کچھ سمجھتا ہے۔ چرخی گھوڑے کی پیٹھ پر تھکی دیتا ہے اور کہتا ہے انسانوں سے حیوانوں کی دوستی اچھی میرے بھائی۔ انھیں کوئی ورغلاتونہیں سکتا۔ غلام محمد تیری جان کی قسم سچ کہتا ہوں اس جانور نے میری بڑی خدمت کی ہے تانگے میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے جوتے رکھا ہے غریب۔۔۔ اتنے میں پٹھان آتا ہے چرخی اس کو سلام کرتا ہے اور اپنے تہمند کے ڈب سے نوٹ نکالتا ہے اور کہتا ہے۔

—

”خان صاحب یہ رہے آپ کے سوروپ کھرے کر لیجیے۔ باقی رہے سواس کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔ یہ میرا گھوڑا اسلامت رہے۔“

یہ کہہ کروہ بڑے فخر سے اپنے گھوڑے کی طرف دیکھتا ہے پٹھان نوٹ لے کر چلا جاتا ہے اتنے میں ایک تانگے والا چونجی سے کہتا ہے تم لڑکی کو پڑھانا شروع کر کے خواہ مخواہ ایک جنجوال میں پھنس گئے ہو۔ کوئی نہ کوئی قرض خواہ تمہارے پیچھے لگا ہی رہتا ہے۔ چرخی ہنستا ہے سب سے بڑی قرض خواہ میری بیٹی ہے اس کا قرض ادا ہو جائے تو ایسے لاکھ قرض لینے والے میرے پیچھے پھرتے ہیں مجھے کوئی پرواہ نہیں تم میں سے کوئی افیم کا نشہ کرتا ہے کوئی شراب کا مجھے بھی ایک نشہ ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ میری لڑکی دولت مند آدمیوں کی لڑکیوں کی طرح پڑھ رہی ہے تو میرا دل و دماغ ایک عجیب نشے سے جھومنے لگتا ہے عورت کو ضرور تعلیم حاصل کرنی چاہیے میرے بھائی اس کے قدم مضبوط ہو جاتے ہیں۔۔۔ یہ کہہ کروہ گھوڑے کو تھکی دیتا ہے اور خوش خوش باہر نکلتا ہے تاکہ گھر جائے۔

—

اندر آئینہ سامنے رکھے کرشنا کماری اپنے کافلوں میں کرشن کمار کے دیجے ہوئے جھمکے پہنے میٹھی ہے اور انھیں پسندیدہ نظروں سے دیکھ رہی ہے گیت گارہی ہے اور جیسے بے خود سی ہو رہی ہے جھمکے اسے بہت پسند آئے ہیں اس پسندیدگی کا اٹھارا اس کی ہر حرکت سے معلوم ہوتا ہے۔

چرخی آتا ہے گھر کے اندر داخل ہوتے ہی وہ گانے کی آواز سنتا ہے۔

کر شناکماری بدستور گانے میں مشغول ہے۔۔۔ دفتاراً گلوں کی طرح چرخی اندر داخل ہوتا ہے کر شن کماری ایک دم گانا بند کر کے دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کو ڈھانپ لیتی ہے چرخی آگے بڑھتا ہے زور سے کر شناکماری کے دونوں ہاتھ نیچے جھٹک دیتا ہے۔ قریب ہے کہ جھمکوں کو اس کے کانوں سے نوج لے۔ کر شن کماری خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹتی ہے چرخی پا گلوں کی طرح اُس کی طرف بڑھتا ہے اور چلانا شروع کر دیتا ہے، ”کہاں سے لیے ہیں تو نے جھمکے۔۔۔ کہاں سے لیے ہیں یہ جھمکے۔۔۔“ وہ اس قدر زور سے چلاتا ہے کہ ایک دم اسے چکر آ جاتا ہے۔ جذبات سے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا جاتا ہے اس کی بلند آواز بالکل دھمکی ہو جاتی ہے کہاں سے لیے ہیں یہ جھمکے۔ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کروہ چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے اس کی لڑکی فوراً اپنکھا لے کر جھلنا شروع کر دیتی ہے۔

چند لمحات کی خاموشی کے بعد وہ ایک گلاس پانی مانگتا ہے۔ کر شن کماری اس کو پانی پلاتی ہے پانی پینے کے بعد وہ کر شناکماری سے پھر پوچھتا ہے منی یہ جھمکے تو نے کہاں سے لیے ہیں کر شناکماری تھوڑے سے توقف کے بعد ذرا حکمت سے جھوٹ بولتے ہوئے جواب دیتی ہے، ”ماں ج کی ایک سیکل نے دیئے ہیں۔“ چرخی اپنی لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے اپنی سیکل کو واپس دے آؤ۔ لڑکی پوچھتی ہے کیوں پتا جی چرخی جواب دیتا ہے۔ تمہاری ماں کو یہ زیور پسند نہیں تھا یہ کہہ کروہ اٹھتا ہے اور بیاروں کی طرح قدم اٹھاتا باہر چلا جاتا ہے اُس کی لڑکی اُس سے پوچھتی ہے، ”کھانا نہیں کھائیں گے آپ؟“

چرخی جواب دیتا ہے۔۔۔ ”نہیں۔“

باہر نکل کر چرخی گھوڑے کی بائیں تھامتا ہے۔ اور تانگہ چلاتا ہے اور (گھوڑے کو) مخاطب کر کے اُس سے کہتا ہے آج میری لڑکی نے پہلی بار جھوٹ بولا ہے اور افسردگی کے عالم میں وہ تانگے پر کئی بازاروں کے چکر لگاتا ہے حتیٰ کہ رات ہو جاتی ہے۔

ایک نیم روشن بازار میں سے اُس کا تانگہ گزر رہا ہے اچانک ایک عورت چند مردوں کی جھپٹ سے نکل کر تیزی سے چرخی کے تانگے کی جانب بڑھتی ہے وہ لڑکھراتے ہوئے قدموں سے بھاگتی تانگے کی پچھلی نشت پر بیٹھ جاتی ہے یہ عورت شراب کے نشے میں چور ہے۔ زیورات سے لدی ہوئی ہے تانگے میں بیٹھتے ہی وہ چرخی سے باتیں شروع کر دیتی ہے، ”مجھے چھیڑتے تھے الوکے پٹھے پر میں دام لیے بغیر کسی کو ہاتھ لگانے دیتی ہوں۔۔۔ کیوں تانگے والے تمہارا کیا خیال ہے۔ دنیا میں پیسہ ہی تو ہے تم کچھ بولتے نہیں۔ مجھے یاد آیا میرا پتی ایک تانگے والا ہی تھا پر اُس کے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ مجھے گھوڑے جھمکے لادیتا لیکن اب دیکھو میری طرف یہ کڑے یہ گلو بندی یہ انگوٹھیاں۔۔۔ ایک سے ایک بڑھ کر۔۔۔ یہ کہہ کروہ درد بھرے انداز میں ہنستی ہے۔ عصمت کا گہنا اتر جائے تو یہ زیور پہنے ہی چاہئیں۔“

چرخی پیچان لیتا ہے کہ یہ عورت کون ہے اُس کی بیوی تھی جو اس حالت کو پہنچ چکی تھی۔ چرخی کمبل سے اپنا چہرہ قریب قریب چھپا لیتا ہے اس پر طائف اُس سے کہتی ہے تم کیوں اپنا چہرہ چھپاتے ہو چھپانا تو مجھے چاہیے یہ چہرہ جس پر کئی پھٹکاریں پڑی ہیں یہ کہہ کروہ پھر ہنسنے ہے تم خاموش کیوں ہوتا نگہ روک دو میرا گھر آگیا ہے چرخی تانگہ روک دیتا ہے طوائف پائیدان پر بااؤں رکھ کر اُترنے لگتی ہے کہ لڑکھڑا کر گرتی ہے اوندھے منہ چرخی دوڑ کر اُٹھاتا ہے طوائف ہنسنے ہے گرنے والوں کو اٹھایا نہیں کرتے میری جان یہ کہہ کر جب وہ گھر کی طرف چلنے لگتی ہے تو لڑکھڑا کر پھر گرتی ہے۔ چرخی اس کو تحام لیتا ہے اور اُس کے گھر تک چھوڑ آتا ہے جب چلنے لگتا ہے تو طوائف اس کو کرایہ دیتی ہے چرخی کرایہ لے لیتا ہے طوائف اس کا بازو پکڑ کر اندر گھسٹتی ہے، ”آؤ میری جان آؤ۔۔۔ آج کی رات میرے مہمان رہو۔۔۔ میں تم سے ایک پیسہ بھی نہیں لوں گی۔۔۔ آؤ شراب کی پوری بوتل پڑی ہے اوپر۔۔۔ آؤ۔“

چرخی تانگہ میں بیٹھ کر چلا جاتا ہے۔ طوائف ہنسنے ہے اور کہتی ہے بیو تو ف کہیں کا۔۔۔ مفت کی قاضی بھی نہیں چھوڑتا۔

چرخی گھر پہنچتا ہے جب اندر داخل ہوتا ہے تو اسے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے کمرے میں جا کر دیکھتا ہے کہ اس کی لڑکی بستر پر اوندھے منہ لیٹی ہے اور زار زار رورہی ہے چرخی اُس کے پاس جاتا ہے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے اور رونے کا سبب پوچھتا ہے اس کی لڑکی اور زیادہ رونا شروع کر دیتی ہے جب چرخی دوبارہ اس سے رونے کا سبب پوچھتا ہے تو وہ کہتی ہے مجھے ماں یاد آرہی ہے اگر وہ آج زندہ ہو تو میں تو میں۔۔۔ میں۔۔۔ وہ اس کے آگے کچھ نہیں کہہ سکی اور باپ کے پاؤں پکڑ کر کہتی ہے مجھے معاف کر دیجیے بتا جی میں نے آج آپ سے جھوٹ بولا ہے۔۔۔ چرخی کہتا ہے مجھے معلوم ہے۔ اس پر اس کی لڑکی کہتی ہے اگر آج میری ماتا جی ہو تو میں نے یہ جھوٹ کبھی نہ بولا ہوتا بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو لڑکیاں صرف اپنی مااؤں کو ہی بتاسکتی ہیں۔۔۔ چرخی اپنی لڑکی کو اُٹھاتا ہے اور اپنے پاس بٹھاتا ہے میں تمہاری ماں ہوں۔۔۔ ”بولو کیا بات ہے۔۔۔ شرماؤ نہیں۔“ کرشنا کماری جھینپ جاتی ہے اور شرما کر کہتی ہے، ”یہ جھمکے مجھے کالج کے ایک لڑکے نے دیئے ہیں بتا جی۔۔۔ وہ بہت ہی اچھا ہے۔“ یہ کہہ کروہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل جاتی ہے سکیاں لیتی ہوئی۔۔۔ چرخی بستر پر پڑے ہوئے جھمکوں کو اُٹھاتا ہے اور اُن کی طرف دیکھتا ہے۔

چرخی کا تانگہ کالج کے دروازے میں داخل ہوتا ہے کرشنا کماری اپنی کتابیں لے کر نیچے اُترتی ہے چرخی اپنی جیب سے جھمکوں کی ڈبیا کاتا ہے اور لڑکی کو دے کر کہتا ہے اسے آج واپس کر دینا، ”کرشنا کماری ڈبیا لے کر خاموشی سے چلی جاتی ہے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی وہ کالج کے باعنچے کی طرف بڑھتی ہے۔“ باعنچے میں ایک نیچ پر کرشن کمار بیٹھا ہے اور ایک خط پڑھ رہا ہے کرشنا کماری کو دیکھ کروہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس سے باتیں شروع کر دیتا ہے۔ ماتا جی کا نیٹ آیا ہے لوپڑھو۔۔۔ نہیں ٹھہرو۔۔۔ میں پڑھ کے سناتا ہوں۔۔۔ پر تم ہنسنا نہیں، میری ماں بے

چاری سید ھی سادی دیہاتی ہے میں نے ان کو تمہاری بات لکھی ہے میں اُن سے کوئی بات چھپا کر نہیں رکھتا سنوا نہوں نے کیا لکھا ہے---۔۔۔ بیٹا کمار---۔۔۔ ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے اس لڑکی کی بد نامی ہواں کے ماں باپ سے ملو اور کہو جیسی وہ ان کی بیٹی ہے ویسے ہی تم ان کے بیٹے ہو میری طرف سے اُس کو آشیر واد دینا تم جگ جگ جو۔۔۔ اور باقی احوال یہ ہے کہ میں نے خاص گھی کی اپنے ہاتھ سے یہ مٹھائی بنائی ہے جو تمہیں بھیج رہی ہوں اس میں آدھا حصہ تمہاری کرشنا کماری کا ہے۔ کہنا تمہاری ماتا جی نے بھیجا ہے۔ کرشنا کماری دم بخودیہ باقی سنتی رہتی ہے کرشن کمار اس رو میں باقی کرتا رہتا ہے اور کرشنا کماری کو موقع ہی نہیں ملتا کہ وہ کچھ کہہ سکے۔۔۔ دیکھا میری ماں کتنی سید ھی ساد ھی ہے انہوں نے مٹھائی بھیجی ہے بالکل خراب تھی۔ پر میں ساری کی ساری کھا گیا ہوں۔۔۔ کیا کرتا اگر نہ کھاتا تو ناراض ہو جاتیں۔۔۔ میں بھی بالکل ان جیسا ہوں۔۔۔ اگر تم نے اس روز میرا تحفہ قبول نہ کیا ہوتا تو میرا دل ٹوٹ جاتا جانے میں کیا کر بیٹھتا۔۔۔ کرشنا کماری کچھ کھانا چاہتی ہے مگر اس کی آواز رندھ جاتی ہے جھکے واپس دینا چاہتی ہے نہیں دے سکتی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں ایک دم تیزی سے مڑتی ہے اور کرشن کمار کو وہیں چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔

کرشنا کماری تیزی سے جا رہی ہے کہ اس کی ٹڈ بھیڑ جگدیش اور ستیش سے ہوتی ہے دونوں اُس کی طرف غور سے دیکھتے ہیں کیونکہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہیں کرشنا کماری چلی جاتی ہے جگدیش اور ستیش ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظر دیں سے دیکھتے ہوئے اُس طرف بڑھتے ہیں جدھر کرشنا کمار بیٹھا ہے۔

جگدیش اور ستیش دونوں کمار سے ملتے ہیں جگدیش اُس سے کہتا ہے، ”کمار---۔۔۔ تم نے یہ کیا غصب کر دیا ہے چاری رور ہی تھی۔۔۔ بھی یہ رومانس اچھا ہاما را دارا تو نہیں تم نے۔۔۔“

کرشن کمار سادہ لوحی کے ساتھ مسکراتا ہے اور کہتا ہے ایک خاص بات تھی جگدیش نے اُس سے یہ خاص بات دریافت کی تو کرشن کمار کہتا ہے ایک خاص بات تھی۔۔۔ جگدیش پھر اُس سے یہ خاص بات دریافت کرتا ہے کرشن کمار کہتا ہے۔ بھی سب باقی تمہیں نہیں بتا سکتا کہہ جو دیا ایک خاص بات تھی یہ کہہ کروہ چلا جاتا ہے جگدیش اور ستیش دونوں اکیلے رہ جاتے ہیں دونوں بیٹھ پر بیٹھ جاتے ہیں اور کرشنا کماری کے متعلق باقی شروع کر دیتے ہیں جگدیش کہتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ فلرٹ ہے اُس کو حاصل کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ تانگے والے سے بات چیت کی جائے وہ اُس کے سارے بھیج جانتا ہو گا باہر ہی باہر معاملہ طے ہو جائے گا اور یہاں کالج میں کسی کو کانوں کا ن خبر نہ ہوگی۔ ستیش کو یہ بات پسند آتی ہے چنانچہ طے ہوتا ہے کہ جگدیش تانگے والے سے بات چیت کرے۔

چرخی کالج کے باہر تاگہ لیے کھڑا ہے پاس، ہی پان سکریٹ والے کی دوکان ہے یہاں جگدیش کھڑا ہے پان والے سے پان اور سکریٹ لیتا ہے اور چرخی کی طرف بڑھتا ہے گھوڑے کو تھکی دیتا ہے پھر اس کی تعریف کرتا ہے اس طرح وہ چرخی سے آہستہ گفتگو شروع کر دیتا ہے آخر میں وہ باتوں میں چرخی سے کہتا ہے، ”استاد ہر عیش کرتے ہو ہر روز ایک پٹانہ سی لوڈیا اس تاگہ میں بٹھا کر لاتے ہو اور لے جاتے ہو۔۔۔ اچھا میں نے کہا۔ کچھ ہماری دال گل سکتی ہے اور استاد تم چاہو تو سب کچھ کر سکتے ہو تمہارے دائیں ہاتھ کا کام ہے ایسا ہی ایک تاگہ گھوڑا بن جائے گا۔ اگر ہمارا کام ہو جائے، چرخی ہنستار ہتا ہے جگدیش کو اور شہہ ملتی ہے ”ماں ہم سب جانتے ہیں کہ لوڈیا ایسی نہیں کہ ہاتھ نہ آسکے۔ کالج میں اس کا ایک لڑکے سے سلسلہ جاری ہے۔ چرخی اب کچھ دلچسپی لیتا ہے اور جگدیش سے چند باتیں دریافت کرتا ہے جگدیش اسے بتاتا ہے کہ اس لڑکی کرشنا کماری پر کالج میں ایک لڑکا جو بہت بد معاش ہے ڈورے ڈال رہا ہے اور اس لڑکے سے وہ کانوں کے جھکے بھی لے چکی ہے۔

یہ سب باتیں بتانے کے بعد جگدیش چرخی سے کہتا ہے، ”دیکھو اگر اس کو زیوروں کا ہی شوق ہے تو ہم بڑھیا بڑھیا چیز دے سکتے ہیں تم یہ باتیں اپنے طور سے اس کے ساتھ کرنا سمجھے۔ اس قسم کی چند باتیں ہونے کے بعد طے ہوتا ہے کہ جگدیش شام کو کمپنی باغ کے پاس فلاں فلاں مقام پر چرخی کا انتظار کرے جب لڑکی جھٹ مان جانے والی ہے تو چرخی سارا معاملہ ٹھیک کر دے گا۔“

اسی روز شام کو جگدیش مقررہ جگہ پر پہنچ جاتا ہے کھبے کے ساتھ کھڑا سکریٹ پی رہا ہے اتنے میں عین وقت پر چرخی کا تاگہ سڑک پر نمودار ہوتا ہے چرخی کھبے کے پاس اپنا تاگہ روکتا ہے جگدیش بہت خوش ہو کر چرخی سے کہتا ہے۔۔۔ ”بھئی بالکل انگریز ہو۔۔۔ ٹھیک وقت پر آئے ہونہ ایک منٹ اُدھرنہ ایک منٹ اُدھر۔۔۔ چرخی مسکراتا ہے اور کہتا ہے، اب آپ وقت ضائع نہ کیجیے اور بیٹھ جائے تاگہ میں میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں جگدیش خوش خوش تاگہ میں بیٹھ جاتا ہے اور چرخی کو ایک سکریٹ پیش کرتا ہے تاگہ چلتا ہے۔“

جگدیش چرخی کے ساتھ لڑکی کی باتیں کرتا رہتا ہے تاگہ مختلف سڑکیں طے کرنے کے بعد ایک ویران سی جگہ پر پہنچتا ہے چرخی باگیں کھینچ کر گھوڑا ٹھہرا ہتا ہے بڑے اطمینان سے اپنا کمبل اور پیڑی اتار کر اگلی نشست پر رکھتا ہے اور آستینیں چڑھا کر جگدیش سے کہتا ہے آئیے آپ کی لڑکی سے ملاقات کرادوں، ”جگدیش چرخی کی طرف ٹک کی نظر وہ سے دیکھتا ہے گرچہ چرخی اس کا بازو پکڑتا ہے اور کھینچ کر جھاڑیوں کے پیچے لے جاتا ہے چند لمحوں کے بعد جگدیش کا ہیئت سڑک پر آگرتا ہے۔“

کالج کا ہو سٹل۔۔۔ جگدیش کا کمرہ۔۔۔ باہر دروازے پر جگدیش کا نام پیٹل کے بورڈ پر لکھا ہوا ہے سٹیش آتا ہے اور دروازے پر دستک دیتا ہے دروازہ کھلتا ہے سٹیش اندر داخل ہوتا ہے کیا دیکھتا ہے کہ جگدیش کا سر منہ سو جا ہوا ہے اور کئی پیٹاں اس کے جسم پر بندھی ہیں۔ سٹیش

اس سے پوچھتا ہے یہ کیا ہو گیا ہے تھیں۔۔۔ جگدیش اسے کسی پر بھاتا ہے اور سارا قصہ سنتا ہے بھی یہ تو برسوں کی ورزش کام آگئی ورنہ بندے کا توکل کام تمام ہو گیا ہوتا۔ میں نے تانگے والے سے تمام معاملہ طے کر لیا چنانچہ وہ مجھے کمپنی باغ میں ملاڑکی وہاں موجود تھی اُس سے باتیں بھی ہو سکیں لیکن ستیش کے ہمراہ وہاں تین چار اور چاہنے والے آگئے۔ مجھے اُس کے ساتھ دیکھ کر جل ہی تو گئے ان میں سے ایک نے مجھ پر کوئی ریمارکس کس۔ لڑکی میرے ساتھ تھی میں نے دل میں کہا جگدیش یہاں خاموش نہیں رہنا چاہیے۔ چنانچہ میں اٹھا اور ایک ایسا گھونسہ اُس سالے کی ٹھوڑی کے نیچے جمایا کہ دن کو تارے ہی نظر آگئے ہوں گے بچ جی کو بس پھر کیا تھا۔ باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔

چاروں مجھ پر پڑے مگر ستیش میں نے بھی وہ باتھ دکھائے کہ یاد ہی کرتے ہوں گے ایک ایک کوفرش کر کے رکھ دیا۔ کچھ چوٹیں مجھے بھی آگئیں ساتھ والے کمرے میں یہ سب باتیں کرشن کمار سنتا ہے کیونکہ دونوں کمروں کے درمیان لکڑی کا ایک پردہ ہے جو اوپر سے خالی ہے ستیش جگدیش کی سب باتیں سن کر کہتا ہے اور بھائی ایسے موقعوں پر کون کس کی مدد کرتا ہے تم کیا بچوں ایسی باتیں کرتے ہو اتنے میں جگدیش کے کمرے کا دروازہ کھلتا ہے اور کرشن کمار غصے میں بھرا ہوا داخل ہوتا ہے جگدیش سے کہتا ہے۔۔۔ ”تم نے جو کچھ کہا ہے جھوٹ ہے تم ایک شریف لڑکی پر بہتان باندھ رہے ہو۔“ جگدیش سنتا ہے اور کہتا ہے، ”میرا کچور نکل گیا ہے اور تم کہتے ہو بہتان باندھ رہا ہوں۔۔۔ یقین نہ ہوتا نگے والے سے پوچھ لو جو مجھے لے گیا تھا غصے میں آکر جو نکل اُس کی محبوبہ کی عزت پر حملہ کیا گیا ہے۔“ کرشن کمار زور سے ایک چاننا جگدیش کے منہ پر مارتا ہے اور کہتا ہے کواس مت کرو۔۔۔ لیکن فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے، ”مجھے معاف کر دو جگدیش یہ چنان تمہارے منہ پر نہیں اس تانگے والے کے منہ پر مارنا چاہیے تھا جو اس کی زندگی تباہ کر رہا ہے۔۔۔ یہ کہہ کر چلا جاتا ہے۔۔۔“

کرشن کمار اپنے کمرے میں آتا ہے میز پر بیٹھتا ہے کاغذ لے کر خط لکھنا شروع کر دیتا ہے مگر چند سطر میں لکھ کر کاغذ پھاڑ دیتا ہے کسی پر سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے کمرے میں اضطراب کے ساتھ ادھر ادھر زور سے ٹھلتا ہے سامنے کھوٹ پر اپنا سوٹ دیکھتا ہے اُسے اُتار کر اپنے پیروں میں روند دیتا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تو پینگ پر اوندھے منہ لیٹ جاتا ہے پھر اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے اور کھڑکی کے پاس جا کر درد بھری دھن میں کوئی گیت گاتا ہے چرخی کھانا کھا رہا ہے پاس ہی اس کے اس کی لڑکی بیٹھی ہے چرخی منہ میں نوالہ ڈالنے ہی والا تھا کہ اسے کوئی بات یاد آتی ہے چنانچہ وہ اپنی لڑکی سے پوچھتا ہے، ”مُنی تم نے جھمکے واپس کیے، کرشا کماری جھوٹ نہیں بولتی“ پتاجی میں اس کو واپس دینے کی پر دے نہ سکی۔ چرخی نوالہ وہیں تھاں میں رکھ دیتا ہے اور پوچھتا ہے، ”کیوں؟ کرشا کماری کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں وہ صرف اتنا کہہ سکتی ہے مجھے معلوم نہیں۔“ چرخی اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کھانا کھائے بغیر باہر چلا جاتا ہے۔

ایک آدمی عینک لگائے ڈیک کے ساتھ بیٹھا ہے چرخی سے کہتا ہے یہاں انگوٹھا لگا گا۔ چرخی اپنا انگوٹھا آگے بڑھا دیتا ہے اس پر وہ آدمی سیاہی لگاتا ہے اور پکڑ کر کاغذ پر جمادیتا ہے انگوٹھا لگانے کے بعد وہ ڈیک سے نوٹ نکالتا ہے اور چرخی کے حوالے کر دیتا ہے چرخی نوٹ لے کر باہر نکلتا ہے۔

باہر ایک شیڈ کے نیچے اس کا ایک تانگہ گھوڑا کھڑا ہے چرخی اپنے انگوٹھے کی سیاہی دیکھتا اس کی جانب بڑھتا ہے ایک ہاتھ میں اس نے نوٹ پکڑے ہوئے ہیں آہستہ آہستہ گھوڑے کے پاس جاتا ہے اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر گلوگیر آواز میں کہتا ہے، ”بیچ آیا ہوں تجھے دوست--- یہ دیکھے اپنی قیمت“ یہ کہہ کروہ گھوڑے کے منہ کے آگے اپنا وہ ہاتھ پھیلا دیتا ہے جس میں نوٹ ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو ہیں لوگ اپنا ایمان بیچتے ہیں میں تجھے بیچ آیا ہوں تو جو کہ میر اسچا دوست تھا آواز چرخی کے گلے میں رندھ جاتی ہے تو بول نہیں سکتا تو تیری زبان ہوتی تو میں تیرے منہ سے نہ بغير کبھی نہ جاتا کہ چرخی تو جھوٹا ہے مطلبی ہے۔ دغا باز ہے جس طرح وقت پڑنے پر لوگ گلے کا کنٹھا انگلی کی انگوٹھی بیچ دیتے ہیں اس طرح تو نے مجھے بیچ دیا ہے لعنت ہے تجھ پر یہ کہہ کروہ اپنا انگوٹھا دیکھتا ہے اور گھوڑے سے کہتا ہے یہ سیاہی دیکھی تم نے اس سودے کی مالک ہے مگر میں تیرے ساتھ کیوں باتیں کروں تو اب میرا نہیں مجھے تجھ پر کوئی حق نہیں رہا۔ آخری بار چرخی منہ پرے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر تھکی دیتا ہے۔

رات کا وقت ہے چرخی کمبل اوڑھے پیدل چلا آرہا ہے راستے میں ایک تانگے والا تانگہ ٹھہرا کر اس سے پوچھتا ہے، ”آج تانگہ گھوڑا نہیں جوتا چرخی۔ چرخی جواب دیتا ہے آج نہیں جوتا۔ میری طبیعت اچھی نہیں تھی۔ یہ کہہ کروہ چلن اشروع کر دیتا ہے۔ گھر میں چرخی کی لڑکی کرشنا کماری لاٹھیں جلاۓ انتظار کر رہی ہے۔ کبھی اٹھتی ہے اسے کسی پہلو چین نہیں اتنے میں دروازہ پر دستک ہوتی ہے وہ انھ کر دروازہ کھولتی ہے چرخی اندر داخل ہوتا ہے کرشنا کماری اُس سے پوچھتی ہے پتا جی آج آپ اتنی دیر سے آئے ہیں کہاں چلے گئے تھے۔ چرخی اپنے کمبل سے ایک پوٹلی نکالتا ہے اور اسے کھول کر اپنی لڑکی کو دیتا ہے یہ زیور لانے گیا تھا تیرے لیے تجھے شوق جو ہے ان کا اب تو تیر ادل نہیں لچائے گا تو کہے گی تو میں ایسے اور زیور بھی لا دوں گا اپنا آپ بھی بیچ ڈالوں گا تیرے دل میں لچاہٹ پیدا نہ ہونے ڈوں گا۔ کرشنا کماری کبھی زیوروں کی طرف دیکھتی اور کبھی اپنے باپ کی طرف۔۔۔ آخر میں کہتی ہے کوئی چیز نیچی ہے آپ نے یہ گہنے خریدنے کے لیے اگر آپ نے ایسا کیا ہے تو سخت غلطی کی ہے یہ کہتے ہوئے اُس کے ہاتھ سے زیور فرش پر گرپڑتے ہیں پتا جی میں نے کبھی ان چیزوں کو لچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھا یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ مجھے ان چیزوں کا شوق ہے چرخی اُس سے کہتا ہے تو نے وہ جھمکے واپس کیوں نہیں کیے۔“

کرشاں کماری کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں کاش میری ماں ہوتی اور میری بات سمجھ سکتیں کہ آپ سمجھتے ہیں کہ میں سونے چاندی کے لیے اپنا آپ پیچ دوں گی آپ نے مجھے تعلیم دی ہے میرے قدم مضبوط کیے ہیں پتا جی میں آپ کی بیٹی ہوں آپ نے میر انہیں اپنا اپمان کیا ہے یہ کہہ کروہ روتی پاس پڑے ہوئے صندو قچے سے جھمکوں کی ڈیانکالتا ہے اور اپنے باپ کو دے کر کہتی ہے، ”لبجے یہ جھمکے جس نے مجھے دیے تھے اُس کو آپ ہی واپس دے آئیے اگر آپ کہیں گے تو میں اُس کی یاد کو بھی اپنے دل سے نکال کر آپ کے قدموں میں رکھ دوں گی یہ کہہ کروہ روتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ چرخی فرش پر پڑے ہوئے زیوروں کی طرف دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔“

کالج کا صدر دروازہ کرشن کمار خاموشی سے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہے اُس کی نظریں دروازہ پر جمی ہوئی ہیں جگدیش اور ستیش آتے ہیں ستیش اس سے پوچھتا ہے بڑی دیر سے یہاں خاموش کھڑے ہو کیا بات ہے۔ کرشن کمار ایک عزم کے ساتھ جواب دیتا ہے اُس بدمعاش تالگے والے کا انتظار کر رہا ہوں آج اُس کو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ ساری عمر یاد رکھے گا۔ جگدیش کرشن کمار کوتائے گے والے کے خلاف اور زیادہ مشتعل کرتا ہے دفعاتاً سب کی نظریں دروازے کی طرف اٹھتی ہیں تالگے والا چرخی کرشاں کماری دونوں پیدل اندر داخل ہوتے ہیں جگدیش یہ دیکھ کر کہتا ہے آج تالگہ کہاں گیا اور کمپاؤنڈ میں داخل ہو کر چرخی اپنی لڑکی کو ستایں دیتا ہے کرشاں کماری ڈور سے کرشن کمار کو دیکھتی ہے اور اُس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ چرخی سر ہلا دیتا ہے کرشن کمار کرشاں کماری کا اشارہ دیکھ لیتا ہے کرشاں کماری ایک طرف چلی جاتی ہے کرشن کمار غصے میں بھر اسیدھا تالگے والے کی طرف بڑھتا ہے چرخی بھی اُس کی طرف آرہا ہوتا ہے چرخی کے پاس پہنچ کر کرشن کمار نہ آؤ دیکھانہ تاؤ کھینچ کر ایک چان查ڑن جی کے منہ پر مارتا ہے اور کہتا ہے کہ اشارے ہو رہے تھے میری طرف کیا مجھے بھی تم اپنے جیسا بدمعاش سمجھتے ہو۔ ایک چانداہ چرخی کے منہ پر جمادیتا ہے۔ الوکے پٹھے۔۔۔ شرم نہیں آتی تھے پر اُن لڑکیوں کو بڑے راستے پر لگاتے ہوئے کیا تیری کوئی لڑکی نہیں جو پیسے کے لائچ میں آکر بھڑوے بننے ہوئے ہو چرخی کے منہ سے خون بہنا شروع ہو جاتا ہے وہ آگے بڑھتا ہے کرشن کمار یہ سمجھ کر کہ وہ اُسے مارنا چاہتا ہے گھونسے بازی شروع کر دیتا ہے چرخی اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیتا ہے کرشن کمار گھونسے چلاتا رہتا ہے اتنے میں بہت سے لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں جن میں جگدیش بھی شامل ہے ایک دوپیاں ابھی تک اسی کے سر پر بند گی ہوئی ہیں کرشاں کماری چیختی ہوئی آگے بڑھتی ہے اور کرشن کمار سے کہتی ہے، ”کمار۔۔۔ یہ تم کیا کر رہے ہو۔ یہ میرے بتا جی ہیں۔“ کرشن کمار متینگر ہو کر کہتا ہے، ”بتا جی۔ چرخی کے منہ سے خون جاری ہے وہ مسکراتا ہے ہاں بیٹا میں اس کا پتا ہوں اور تمہارا بھی یہ کہہ کروہ کرشن کمار کو سینے سے گالیتا ہے جیتے رہو۔۔۔ میں نے تم سے مار کھائی ہے لیکن اس جوان سے پوچھو کہ وہ جگدیش کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ میرے بازوؤں میں کتنا بل ہے جگدیش وہاں سے کھسک جاتا ہے کرشن کمار نہ امت بھرے لجھ میں چرخی سے معافی مانگتا ہے اپنی لڑکی اور کرشن کمار کے سر پر پیار کا ہاتھ پھیر کر چرخی جیب سے جھمکوں کی ڈیانکالتا ہے اور کرشاں کماری کو دے کر کہتا ہے لواسے اپنے پاس رکھو۔“

شہنائیاں نج رہی ہیں کرشاکماری اور کرشن کمار کی شادی ہو چکی ہے چون جی اپنی لڑکی اور کرشن کمار کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیر رہا ہے اپنی لڑکی سے کہتا ہے تم اپنی ماں کو یاد کیا کرتی تھیں تمھیں ماں بھی مل گئی ہے یہ کہہ کروہ کرشاکماری کی ماں کی طرف دیکھتا ہے جو ایک سید ہی ساد ہی دیہاتی ہے اور کرشاکماری کی طرف ہاتھ بڑھا کر سر پر ہاتھ پھیرتی ہے اور بڑی سادہ لوحی کے ساتھ کہتی ہے بیٹی میں نے تیرے لیے اپنے ہاتھ سے مٹھائی بنانے کی بھی تھی کیا تو نے کھائی تھی۔ کرشاکماری ذرا جھینپ کر کہتی ہے کھائی تھی ماتابی۔۔۔ بہت ہی مزے دار تھی۔

ایک تالگے میں چرخی کی بیوی شراب کے نشے میں ڈھت بیٹھی ہے تالگہ چل رہا ہے اُس کے ساتھ ہی ایک مرد بیٹھا ہے۔ چرخی کی بیوی پان تھوک دیتی ہے بہت بد مزہ ہے۔ اتنے میں تالگہ وہاں پہنچتا ہے جہاں کرشاکماری اور کرشن کمار کی شادی ہو رہی ہے۔ تالگے والا تالگہ ٹھہرا دیتا ہے اور اپنے گاہک سے کہتا ہے معاف کیجیے گا میں ابھی حاضر ہوا۔ چون جی کی بیوی پوچھتی ہے کہاں جا رہے ہو تم تالگے والا کہتا ہے جرخی تالگے والے کی لڑکی کی شادی ہو رہی ہے میں اُسے مبارکباد دے آؤں۔ یوں چکلیوں میں آیا۔ یہ کہہ کر تالگے والا چلا جاتا ہے۔ چرخی کی بیوی چند لمحات کے لیے پھر کی مورتی سی بن جاتی ہے لیکن لڑکھراتی ہوئی اٹھتی ہے اور تالگے سے اُتر کر ادھر جاتی ہے جہاں سے شہنائیوں کی آواز آتی ہے۔ بارش ہو رہی ہے چرخی کی بیوی جو شراب کے نشے میں مدھوش ہے لڑکھراتے ہوئے قدموں سے شادی منڈل کی طرف بڑھتی ہے بارش ہو رہی ہے باہر تماشائیوں کے ساتھ کھڑے ہو کروہ دلوہاں لہن کو دیکھتی ہے اچھی طرح دیکھنے کے لیے جب وہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہے تو ایک آدمی اسے پیچھے ہٹا دیتا ہے اور کہتا ہے اے کیا دیکھ رہی ہے ٹو۔ تیری ماں نے کبھی شادی نہیں کی ہو گی۔ چرخی کی بیوی اس آدمی سے چھڑنا شروع کر دیتی ہے۔۔۔ میں ماں ہوں۔۔۔ تو نہیں جانتا میں ماں ہوں۔ سارے تماشائی ہنسنے ہیں چرخی کی بیوی دیکھ رہی ہے کرشاکماری بھی کسی بات پر ہنس رہی ہے چرخی کی بیوی کی ماتاجاگ اٹھتی ہے وہ چلانا شروع کر دیتی ہے مجھے اندر جانے دو مجھے اندر جانے دو۔۔۔ کچھ گڑ بڑھتی ہے اتنے میں چرخی باہر نکلتا ہے اور اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے اور اُس سے کہتا ہے کیا چاہتی ہو۔ تم چرخی کی بیوی کہتی ہے میں اپنی لڑکی سے ملنا چاہتی ہوں چرخی کہتا ہے آؤ میں تمھیں اُس سے ملا دیتا ہوں یہ کہہ کروہ اُسے ایک طرف لے جاتا ہے جہاں اس کا تالگہ کھڑا ہے چرخی اسے تالگے تک لے جاتا ہے۔

تالگہ چلا جا رہا۔۔۔ چرخی کی بیوی شراب کے نشے میں بار بار چرخی سے پوچھتی ہے مجھے میری بیٹی سے ملاو۔ مجھے میری بیٹی سے ملاو۔ میں اُس کی ماں ہوں میں اُسے ایک تحفہ دینا چاہتی ہوں۔ چرخی خاموش رہتا ہے تالگے کی رفتار تیز ہوتی رہتی ہے ایک بار تنگ آ کروہ چرخی سے پوچھتی ہے، ”کہاں لے جا رہے ہو مجھے“ چرخی جواب دیتا ہے جہاں پتی اور پتی کو جانا چاہیے، گھوڑا سر پٹ دوڑتا ایک کھائی میں گرتا ہے۔

تالنگ کے پُر زے اڑ جاتے ہیں کھائی کے نیچے چرخی اور اس کی بیوی پڑے ہیں اور دونوں بُری طرح زخمی ہوئے ہیں چرخی مرچکا ہے مگر اس کی بیوی ابھی زندہ ہے وہ اپنی آنکھیں کھولتی ہے اُسے اپنی جوانی کا وہ دن یاد آتا ہے جب جھمکے پہنے گارہی تھی۔ وہ جوان ہے اور جھمکے اپنے کانوں میں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی ہے اور گارہی ہے اپنی بُنگی کو آواز دیتی ہے۔ اور کہتی ہے مُمنی۔۔۔ منی آتھے ایک چیز دیکھاؤ۔۔۔ اس کی بند مُٹھی کھلتی ہے اُس کی ہتھیلی پر وہی جھمکے نظر آتے ہیں جو چرخی اس کے لیے لا یاتھا۔

-[37]-

اُلوکا پٹھا: سعادت حسن منظو

قاسم صبح سات بجے لحاف سے باہر نکلا اور غسل خانے کی طرف چلا۔ راستے میں، یہ اس کو ٹھیک طور پر معلوم نہیں، سونے والے کمرے میں، صحن میں یا غسل خانے کے اندر اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی کو الوکا پٹھا کہے۔ بس صرف ایک بار غصے میں یا طنزیہ انداز میں کسی کو الوکا پٹھا کہہ دے۔

قاسم کے دل میں اس سے پہلے کئی بار بڑی بڑی انوکھی خواہشیں پیدا ہو چکی تھیں مگر یہ خواہش سب سے نرالی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ رات اس کو بڑی پیاری نیند آئی تھی۔ وہ خود کو بہت تروتازہ محسوس کر رہا تھا۔ لیکن پھر یہ خواہش کیسے اس کے دل میں داخل ہو گئی۔ دانت صاف کرتے وقت اس نے ضرورت سے زیادہ وقت صرف کیا جس کے باعث اس کے مسوڑھے چھل گئے۔ دراصل وہ سوچتا رہا کہ یہ عجیب و غریب خواہش کیوں پیدا ہوئی مگر وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

بیوی سے وہ بہت خوش تھا۔ ان میں کبھی لڑائی نہ ہوئی تھی، نوکروں پر بھی وہ ناراض نہیں تھا۔ اس لیے کہ غلام محمد اور نبی بخش دونوں خاموشی سے کام کرنے والے مستعد نوکر تھے، موسم بھی نہایت خوشگوار تھا، فروری کے سہانے دن تھے جن میں کنوار پنے کی تازگی تھی، ہوانچک اور ہلکی، دن چھوٹ نہ راتیں لمبی، نیچر کا تو ازن بالکل ٹھیک تھا اور قاسم کی صحت بھی خوب تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسی کو بغیر وجہ کے الوکا پٹھا کہنے کی خواہش اس کے دل میں کیوں کر پیدا ہو گئی۔

قاسم نے اپنی زندگی کے اٹھائیں بر سوں میں متعدد لوگوں کو الوکا پٹھا کہا ہو گا اور بہت ممکن ہے کہ اس سے بھی کڑے لفظ اس نے بعض موقعوں پر استعمال کیے ہوں اور گندی گالیاں بھی دی ہوں مگر اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایسے موقعوں پر خواہش بہت پہلے اس کے دل میں

پیدا نہیں ہوئی تھی مگر اب اچانک طور پر اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ کسی کو الا کا پڑھا کہنا چاہتا ہے اور یہ خواہش لمحہ بہ شدت اختیار کرتی چلی گئی جیسے اس نے اگر کسی کو الا کا پڑھانہ کہا تو بہت بڑا ہرج ہو جائے گا۔

دانت صاف کرنے کے بعد اس نے چھلے ہوئے مسوڑ ہوں کو اپنے کمرے میں جا کر آئینے میں دیکھا۔ مگر دیر تک ان کو دیکھتے رہنے سے بھی وہ خواہش نہ دبی جو ایکا ایکی اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ قاسم منطقی قسم کا آدمی تھا۔ وہ بات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کا عادی تھا۔ آئینہ میز پر رکھ کر وہ آرام کر سی پر بیٹھ گیا اور ٹھنڈے دماغ سے سوچنے لگا۔

”مان لیا کہ میرا کسی کو الا کا پڑھا کہنے کو بھی چاہتا ہے۔۔۔ مگر یہ کوئی بات تو نہ ہوئی۔۔۔ میں کسی کو الا کا پڑھا کیوں کہوں؟ میں کسی سے ناراض بھی تو نہیں ہوں۔۔۔“ یہ سوچتے سوچتے اس کی نظر سامنے دروازے کے بیچ میں رکھے ہوئے حقہ پر پڑی۔ ایک دم اس کے دل میں یہ بتیں پیدا ہوئیں، عجیب و اہمیات نو کر ہے۔ دروازے کے عین بیچ میں یہ حقہ لکا دیا ہے۔ میں بھی اس دروازے سے اندر آیا ہوں، اگر ٹھوک سے بھری ہوئی چلم گر پڑتی تو پا انداز جو کہ موئخ کا بنا ہوا ہے جلنا شروع ہو جاتا اور ساتھ ہی قالین بھی۔۔۔

اس کے جی میں آئی کہ غلام محمد کو آواز دے۔ جب وہ بھاگا ہوا اس کے سامنے آجائے تو وہ بھرے ہوئے حقہ کی طرف اشارہ کر کے اس سے صرف اتنا کہے، ”تم نزے الا کے پڑھے ہو۔“ مگر اس نے تامل کیا اور سوچا پیوں بگڑنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ اگر غلام محمد کو اب بلا کر الا کا پڑھا کہہ بھی دیا تو وہ بات پیدا نہ ہو گی اور پھر۔۔۔ اور پھر اس بچارے کا کوئی قصور بھی تو نہیں ہے۔ میں دروازے کے پاس بیٹھ کر ہی تو ہر روز حقہ پیتا ہوں۔

چنانچہ وہ خوشی جو ایک لمحہ کے لیے قاسم کے دل میں پیدا ہوئی تھی کہ اس نے الا کا پڑھا کہنے کے لیے ایک اچھا موقع تلاش کر لیا، غائب ہو گئی۔

دفتر کے وقت میں ابھی کافی دیر تھی۔ پورے دو گھنٹے پڑے تھے، دروازے کے پاس کر سی رکھ کر قاسم اپنے معمول کے مطابق بیٹھ گیا اور حقہ نوشی میں مصروف ہو گیا۔

کچھ دیر تک وہ سوچ بچار کے بغیر حقے کا دھواں پیتا رہا اور دھوکیں کے انتشار کو دیکھتا رہا۔ لیکن جو نہیں وہ حقے کو چھوڑ کر کپڑے تبدیل کرنے کے لیے ساتھ والے کمرے میں گیا تو اس کے دل میں وہی خواہش نئی تازگی کے ساتھ پیدا ہوئی۔ قاسم گھبر اگیا۔ بھی حد ہو گئی۔۔۔ الا کا

پڑھا۔۔۔ میں کسی کو الوکا پڑھا کیوں کہوں اور بغرضِ محال میں نے کسی کو الوکا پڑھا کہہ بھی دیا تو کیا ہو گا۔۔۔ قاسم دل ہی دل میں ہنسا۔ وہ صحیح الدماغ آدمی تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ خواہش جو اس کے دل میں پیدا ہوئی ہے بالکل بیہودہ اور بے سروپا ہے لیکن اس کا کیا علاج تھا کہ دبانے پر وہ اور بھی زیادہ ابھر آتی تھی۔ قاسم اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بغیر کسی وجہ کے الوکا پڑھانے کہے گا۔ خواہ یہ خواہش صدیوں تک اس کے دل میں تملقاً رہے، شاید اسی احساس کے باعث یہ خواہش جو بھکی ہوئی چگاڈ کی طرح اس کے روشن دل میں چلی آئی تھی، اس قدر تڑپ رہی تھی۔

پتلون کے بٹن بند کرتے وقت جب اس نے دماغی پریشانی کے باعث اوپر کا بٹن نچلے کاج میں داخل کر دیا تو وہ جھلا اٹھا۔ بھکی ہو گا۔۔۔ یہ کیا بیہودگی ہے۔۔۔ دیوانہ پن نہیں تو اور کیا ہے۔۔۔ الوکا پڑھا کہو اور یہ پتلون کے سارے بٹن مجھے پھر سے بند کرنے پڑیں گے۔ لباس پہن کر وہ میز پر آبیٹھا۔ اس کی بیوی نے چائے بننا کر پیا اس کے سامنے رکھ دی اور تو س پر مکھن لگانا شروع کر دیا۔ روزانہ معمول کی طرح ہر چیز ٹھیک ٹھاک تھی، تو س اتنے اچھے سنکھے ہوئے تھے کہ بست کی طرح کر کرے تھے اور ڈبل روٹی بھی اعلیٰ قسم کی تھی، خمیر میں سے خوشبو آرہی تھی، مکھن بھی صاف تھا، چائے کی کیتی بے داع تھی۔ اس کی بھتی کے ایک کونے پر قاسم ہر روز میل دیکھا کرتا تھا۔ مگر آج وہ دھبہ بھی نہیں تھا۔

اس نے چائے کا ایک گھونٹ پیا۔ اس کی طبیعت خوش ہو گئی۔ خالص دار جنگ کی چائے تھی، جس کی مہک پانی میں بھی برقرار تھی۔ دودھ کی مقدار بھی صحیح تھی۔

قاسم نے خوش ہو کر اپنی بیوی سے کہا، ”آج چائے کارنگ بہت ہی بیمارا ہے اور بڑے سلیقے سے بنائی گئی ہے۔“ بیوی تعریف سن کر خوش ہوئی۔ مگر اس نے منہ بناؤ کر ایک ادا سے کہا، ”جی ہاں، بس آج اتفاق سے اچھی بن گئی ہے ورنہ ہر روز تو آپ کو نیم گھوول کے پلاٹی جاتی ہے۔۔۔ مجھے سلیقہ کھاں آتا ہے۔۔۔ سلیقے والیاں تو وہ موئی ہو ٹل کی چھو کریاں ہیں جن کے آپ ہر وقت گن گایا کرتے ہیں۔“

یہ تقریر سن کر قاسم کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ ایک لمحہ کے لیے اس کے جی میں آئی کہ چائے کی پیالی میز پر الٹ دے اور وہ نہیں جو اس نے اپنے بچے کی پھنسیاں دھونے کے لیے غلام محمد سے منگوائی تھی اور سامنے بڑے طاقچے میں پڑی تھی گھوول کر پی لے مگر اس نے بردباری سے کام لیا ”یہ عورت میری بیوی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی بات بہت ہی بھونڈی ہے مگر ہندوستان میں سب لڑکیاں بیوی بن کر ایسی ہی بھونڈی باتیں کرتی ہیں۔ اور بیوی بننے سے پہلے اپنے گھروں میں وہ اپنی ماوں سے کیسی باتیں سنتی ہیں؟ بالکل ایسی ادنی قسم کی باتیں اور

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ عورتوں کو عمومی زندگی میں اپنی حیثیت کی خبر ہی نہیں۔۔۔ میری بیوی تو پھر بھی غنیمت ہے یعنی صرف ایک ادا کے طور پر ایسی بھونڈی بات کہہ دیتی ہے، اس کی نیت نیک ہوتی ہے۔ بعض عورتوں کا تو یہ شعار ہوتا ہے کہ ہر وقت بکواس کرتی رہتی ہیں۔

یہ سوچ کر قاسم نے اپنی نگاہیں اس طبقے پر سے ہٹالیں جس میں نیم کے پتے دھوپ میں سوکھ رہے تھے اور بات کا رخ بدل کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا، ”دیکھو، آج نیم کے پانی سے بچے کی ٹانگیں ضرور دھو دینا، نیم زخموں کے لیے بڑی اچھی ہوتی ہے۔۔۔ اور دیکھو، تم موسمبیوں کا رس ضرور پیا کرو۔۔۔ میں دفتر سے لوٹتے ہوئے ایک درجن اور لے آؤں گا۔ یہ رس تمہاری صحبت کے لیے بہت ضروری ہے۔“ بیوی مسکرا دی، ”آپ کو تو بس ہر وقت میری ہی صحبت کا خیال رہتا ہے۔ اچھی بھلی تو ہوں، کھاتی ہوں، پیتی ہوں، دوڑتی ہوں، بھاگتی ہوں۔۔۔ میں نے جو آپ کے لیے بادام منگوا کے رکھے ہیں۔۔۔ بھئی آج دس میں آپ کی جیب میں ڈالے بغیر نہ رہوں گی۔۔۔ لیکن دفتر میں کہیں بانٹ نہ دیجیے گا۔“

قاسم خوش ہو گیا کہ چلو موسمبیوں کے رس اور باداموں نے اس کی بیوی کے مصنوعی غصے کو دور کر دیا اور یہ مرحلہ آسانی سے طے ہو گیا۔ دراصل قاسم ایسے مرحلوں کو آسانی کے ساتھ ان طریقوں ہی سے طے کیا کرتا تھا۔ جو اس نے پڑوس کے پرانے شوہروں سے سیکھے تھے اور اپنے گھر کے ماحول کے مطابق ان میں تھوڑا بہت روبدل کر لیا تھا۔

چائے سے فارغ ہو کر اس نے جیب سے سکریٹ نکال کر سلاگایا اور اٹھ کر دفتر جانے کی تیاری کرنے ہی والا تھا کہ پھر وہی خواہش نمودار ہو گئی۔ اس مرتبہ اس نے سوچا اگر میں کسی کو الوکا پٹھا کہہ دوں تو کیا ہرج ہے۔ زیرِ لب بالکل ہولے سے کہہ دوں، الو۔۔۔ کا۔۔۔ پٹھا۔۔۔ تو میرا خیال ہے کہ مجھے دلی تسلیں ہو جائے گی۔ یہ خواہش میرے سینے میں بوجھ بن کر بیٹھ گئی ہے کیوں نہ اس کو ہلکا کر دوں۔۔۔ دفتر میں۔ اس کو صحن میں بچے کا کمود نظر آیا۔ یوں صحن میں کمود رکھنا سخت بد تیزی تھی اور خصوصاً اس وقت جب کہ وہ ناشتہ کر چکا تھا اور خوشبودار کر کرے تو س اور تنے ہوئے انڈوں کا ذائقہ ابھی تک اسکے منہ میں تھا۔۔۔ اس نے زور سے آواز دی، ”غلام محمد!“

قاسم کی بیوی جو ابھی تک ناشتہ کر رہی تھی بولی، ”غلام محمد باہر گوشت لینے گیا ہے۔۔۔ کوئی کام تھا آپ کو اس سے؟“ ایک سینڈ کے اندر اندر قاسم کے دماغ میں بہت سی باتیں آئیں کہہ دوں، یہ غلام محمد الوکا پٹھا ہے۔۔۔ اور یہ کہہ کر جلدی سے باہر نکل جاؤں۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ خود تو موجود ہی نہیں، پھر۔۔۔ بالکل بیکار ہے۔۔۔ لیکن سوال یہ ہے کہ بچارے غلام محمد ہی کو کیوں نشانہ بنایا جائے۔ اس کو تو میں ہر وقت الوکا پٹھا کہہ سکتا ہوں۔ قاسم نے ادھ جلا سکریٹ گردیا اور بیوی سے کہا، ”کچھ نہیں، میں اس سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ دفتر میں میرا کھانا بے شک ڈیڑھ بجے لے آیا کرے۔۔۔ تمہیں کھانا جلدی سمجھنے میں بہت تکلیف کرنا پڑتی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے بیوی کی طرف دیکھا جو

فرش پر اس کے گرائے ہوئے سگریٹ کو دیکھ رہی تھی۔ قاسم کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہ سگریٹ اگر بچھ گیا اور یہاں پڑا رہا تو اس کا بچھ رینگتا رینگتا آئے گا اور اسے اٹھا کر منہ میں ڈال لے گا جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کے پیٹ میں گڑ بڑ مج جائے گی۔ قاسم نے سگریٹ کا ٹکڑا اٹھا کر غسل خانے کی موری میں پھینک دیا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر غلام محمد کو الوکا پٹھا نہیں کہہ دیا۔ اس سے اگر ایک غلطی ہوئی ہے تو ابھی ابھی مجھ سے بھی تو ہوئی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ میری غلطی زیادہ شدید تھی۔

قاسم بڑا صحیح الدماغ آدمی تھا۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ صحیح خطوط پر غور و فکر کرنے والا انسان ہے مگر اس احساس نے اس کے اندر برتری کا خیال کبھی پیدا نہیں کیا تھا۔ یہاں پر پھر اس کی صحیح الدماغی کو دخل تھا کہ وہ احساس برتری کو اپنے اندر دبادیا کرتا تھا۔

موری میں سگریٹ کا ٹکڑا پھینکنے کے بعد اس نے بلا ضرورت صحن میں ٹھہنٹا شروع کر دیا۔ وہ دراصل کچھ دیر کے لیے بالکل خالی الذہن ہو گیا تھا۔

اس کی بیوی ناشتہ کا آخری توں کھا چکی تھی۔ قاسم کو یوں ٹھہلتے دیکھ کر وہ اس کے پاس آئی اور کہنے لگی، ”کیا سوچ رہے ہیں آپ۔“ قاسم چونک پڑا۔ ”کچھ نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ دفتر کا وقت ہو گیا کیا؟“ یہ لفظ اس کی زبان سے نکلے اور دماغ میں وہی الوکا پٹھا کہنے کی خواہش تڑپنے لگی۔

اس کے جی میں آئی کہ بیوی سے صاف صاف کہہ دے کہ یہ عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہو گئی ہے جس کا سر ہے نہ پیر، بیوی ضرور سنے گی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کو بیوی کا ساتھ دینا پڑے گا، چنانچہ یوں ہنسی ہنسی میں الوکا پٹھا کہنے کی خواہش اس کے دماغ سے نکل جائے گی۔ مگر اس نے غور کیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ بیوی بنے گی اور میں خود بھی ہنسوں گا لیکن ایسا نہ ہو کہ یہ بات مستقل مذاق بن جائے۔۔۔ ایسا ہو سکتا ہے۔۔۔ ہو سکتا ہے کیا، ضرور ہو جائے گا اور بہت ممکن ہے کہ انجام کارنا خوشگواری پیدا ہو، چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کچھ نہ کہا اور ایک لمحہ تک اس کی طرف یوں بھی دیکھتا رہا۔

بیوی نے بچے کا کموڈ اٹھا کر کونے میں رکھ دیا اور کہا، ”آج صحیح آپ کے برخوردار نے وہ ستایا ہے کہ اللہ کی پناہ۔۔۔ بڑی مشکلوں کے بعد میں نے اسے کموڈ پر بٹھایا۔ اس کی مرضی یہ تھی کہ بستر ہی کو خراب کرے۔۔۔ آخر لڑکا کس کا ہے؟“ قاسم کو اس قسم کی بچھ پسند تھی۔ ایسی باتوں میں وہ تیکھے مزاح کی جھلک دیکھتا تھا۔ مسکرا کر اس نے بیوی سے کہا، ”لڑکا میرا ہی ہے مگر۔۔۔ میں نے تو آج تک کبھی بستر خراب نہیں کیا۔ یہ عادت اس کی اپنی ہو گی۔“ بیوی نے اس کی بات کا مطلب نہ سمجھا۔ قاسم کو مطلقاً افسوس نہ ہوا، اس لیے کہ ایسی باتیں وہ صرف

اپنے منہ کا ذائقہ درست رکھنے کے لیے کیا کرتا تھا۔ وہ اور بھی خوش ہوا جب اس کی بیوی نے جواب نہ دیا اور خاموش ہو گئی۔ ”اچھا، بھتی میں اب چلتا ہوں۔ خدا حافظ!“

یہ لفظ جو ہر روز اس کے منہ سے نکلتے تھے آج بھی اپنی پرانی آسانی کے ساتھ نکلے اور قسم دروازہ کھول کر باہر چل دیا۔

کشمیری گیٹ سے نکل کر جب وہ نکسن پارک کے پاس سے گزر رہا تھا تو اسے ایک داڑھی والا آدمی نظر آیا۔ ایک ہاتھ میں کھلی ہوئی شلوار تھا میں وہ دوسرے ہاتھ سے استخراج رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر قاسم کے دل میں پھر الوکا پٹھا کہنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ لو بھتی، یہ آدمی ہے جس کو الوکا پٹھا کہہ دینا چاہیے یعنی جو صحیح معنوں میں الوکا پٹھا ہے۔۔۔ ذرا انداز ملاحظہ ہو۔۔۔ کس انہاک سے ڈرائی کلین کیے جا رہا ہے۔۔۔ جیسے کوئی بہت اہم کام سر انجام پا رہا ہے۔۔۔ لعنت ہے۔

لیکن قاسم صحیح الدماغ آدمی تھا۔ اس نے تعییل سے کام نہ لیا اور تھوڑی دیر غور کیا۔ میں اس فٹ پا تھوڑا پر جا رہا ہوں اور وہ دوسرے فٹ پا تھوڑا پر، اگر میں نے بلند آواز میں بھی اس کو الوکا پٹھا کہا تو وہ چونکے گا نہیں۔ اس لیے کہ کم بخت اپنے کام میں بہت بری طرح مصروف ہے۔ چاہیے تو یہ کہ اس کے کان کے پاس زور سے نعرہ بلند کیا جائے اور جب وہ چونک اٹھنے تو اسے بڑے شریفانہ طور پر سمجھایا جائے، قبلہ آپ الو کے پڑھے ہیں۔۔۔ لیکن اس طرح بھی خاطر خواہ نتیجہ برآمدہ ہو گا۔ چنانچہ قاسم نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

اسی اثنائیں اس کے چیچھے سے ایک سائیکل نمودار ہوئی۔ کالج کی ایک لڑکی اس پر سوار تھی۔ اس لیے کہ چیچھے بستہ بندھا تھا۔ آنا فاناً اس لڑکی کی ساڑھی فری و ہیل کے دانتوں میں چھنسی، لڑکی نے گھبرا کر اگلے پیسے کا بریک دبایا۔ ایک دم سائیکل بے قابو ہوئی اور ایک جھٹکے کے ساتھ لڑکی سائیکل سمیت سڑک پر گر پڑی۔

قاسم نے آگے بڑھ کر لڑکی کو اٹھانے میں عجلت سے کام نہ لیا۔ اس لیے کہ اس نے حادثہ کے رد عمل پر غور کرنا شروع کر دیا تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ لڑکی کی ساڑھی فری و ہیل کے دانتوں نے چباؤا ہے اور اس کا بورڈ بہت بری طرح ان میں الجھ گیا ہے تو وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ لڑکی کی طرف دیکھے بغیر اس نے سائیکل کا پچھلا پہیہ ذرا اونچا اٹھایا تاکہ اسے گھما کر ساڑھی کو وہیل کے دانتوں میں سے نکال لے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ پہیہ گھمانے سے ساڑھی کچھ اس طرح تاروں کی لپیٹ میں آئی کہ ادھر پیٹی کوٹ کی گرفت سے باہر نکل آئی۔ قاسم بوکھلا گیا۔ اس کی اس بوکھلاہٹ نے لڑکی کو بہت زیادہ پریشان کر دیا۔ زور سے اس نے ساڑھی کو اپنی طرف کھینچا۔ فری و ہیل کے دانتوں میں ایک ٹکڑا اڑاہ گیا اور ساڑھی باہر نکل آئی۔

لڑکی کا رنگ لال ہو گیا۔ قاسم کی طرف اس نے غضبناک نگاہوں سے دیکھا اور بھپٹھے ہوئے الجہہ میں کہا، ”اُلوکا پٹھا۔“

ممکن ہے کچھ دیر لگی ہو مگر قاسم نے ایسا محسوس کیا کہ لڑکی نے جھٹ پٹ نہ جانے اپنی ساڑی کو کیا کیا۔ اور ایک دم سائیکل پر سوار ہو کر یہ جا وہ جا، نظر وہ سے غائب ہو گئی۔ قاسم کو لڑکی کی گالی سن کر بہت دکھ ہوا۔ خاص کر اس لیے کہ وہ بہی گالی خود کسی کو دینا چاہتا تھا۔ مگر وہ بہت صحیح الدماغ آدمی تھا۔ ٹھنڈے دل سے اس نے حادث پر غور کیا اور اس لڑکی کو معاف کر دیا۔ ”اس کو معاف ہی کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ عورتوں کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے اور ان عورتوں کو سمجھنا تو اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جو سائیکل پر سے گری ہوئی ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس نے اپنی لمبی جراب میں اوپر ران کے پاس تین چار کاغذ کیوں اڑس رکھے تھے؟“

-[38]-

عشقیہ کہانی: سعادت حسن منٹو

میرے متعلق عام لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ میں عشقیہ کہانیاں نہیں لکھتا۔ میرے انسانوں میں چونکہ عشق و محبت کی چاشنی نہیں ہوتی، اس لیے وہ بالکل ساٹ ہوتے ہیں۔ میں اب یہ عشقیہ کہانی لکھ رہا ہوں تاکہ لوگوں کی یہ شکایت کسی حد تک دور ہو جائے۔

جمیل کا نام اگر آپ نے پہلے نہیں سن اتواب سن لیجیے۔ اس کا تعارف مختصر طور پر کرائے دیتا ہوں۔ وہ میرا لگوٹیا تھا۔ ہم اکٹھے اسکوں میں پڑھے، پھر کانج میں ایک ساتھ داخل ہوئے۔ میں ایف اے میں فیل ہو گیا اور وہ پاس۔ میں نے پڑھائی چھوڑ دی مگر اس نے جاری رکھی۔ ڈبل ایم۔ اے کیا اور معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ صرف اتنا سنئے میں آیا تھا کہ اس نے ایک پانچ بچوں والی ماں سے شادی کر لی تھی اور آبادان چلا گیا تھا۔ وہاں سے واپس آیا یا وہیں رہا، اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔

جمیل بڑا عاشق مزاج تھا۔ اسکوں کے دنوں میں اس کا جی بے قرار رہتا تھا کہ وہ کسی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔ مجھے ایسی گرفتاری سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن اس کی سرگرمیوں میں جو عشق سے متعلق ہوتیں، برابر کا حصہ لیا کرتا تھا۔ جمیل دراز قدر نہیں تھا مگر اچھے خدو خال کا مالک تھا۔ میرا مطلب ہے کہ اسے خوبصورت نہ کہا جائے تو اس کے قبول صورت ہونے میں شک و شایبہ نہیں تھا۔ رنگ

گورا اور سرخی مائل، تیز تیز باتیں کرنے والا، بلا کا ذہین، انسانی نفیسیات کا طالب علم، بڑا صحت مند۔ اس کے دل و دماغ میں سن بلوغت تک پہنچنے سے کچھ عرصہ پہلے ہی عشق کرنے کی زبردست خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ اس کو غالب کے اس شعر کا مفہوم اچھی طرح معلوم تھا،

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب

کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

مگر اس کے بر عکس وہ یہ آگ خود اپنی ماچس سے لگانا چاہتا تھا۔ اس نے اس کو شش میں کئی ماچیں جلاکیں۔ میرا مطلب ہے کہ کئی لڑکیوں کے عشق میں گرفتار ہو جانے کے لیے نت نئے سوت سلوائے، بڑھیا سے بڑھیا تائیاں خریدیں، سینٹ کی سینکڑوں قیمتی شیشیاں استعمال کیں مگر یہ سوت، تائیاں اور سینٹ اس کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ میں اور وہ، دونوں شام کو کمپنی باغ کارخ کرتے۔ وہ خوب سجا بنا ہوتا۔ اس کے کپڑوں سے بہترین خوشبو نکل رہی ہوتی۔ باغ کی روشنوں پر متعدد لڑکیاں بد صورت، خوبصورت، قبول صورت موحDRAM ہوتی تھیں۔ وہ ان میں سے کسی ایک کو اپنے عشق کے لیے منتخب کرنے کی کوشش کرتا مگر ناکام رہتا۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا، ”سعادت! میں نے آخر کار ایک لڑکی چن ہی لی ہے۔ خدا کی قسم چندے آفتاب، چندے ماہ تاب ہے۔ میں کل صح سیر کے لیے نکلا۔ بہت سی لڑکیاں مائی کے ساتھ اسکوں جارہی تھیں۔ ان میں ایک برق قع پوش لڑکی نے جو اپنی نقاب ہٹائی تو اس کا چہرہ دیکھ کر میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ کیا حسن و جمال تھا! بس میں نے وہیں فیصلہ کر لیا کہ جبکیل اب مزید تگ و دو چھوڑو، اس حسینہ ہی کے عشق میں تمہیں گرفتار ہونا چاہیے۔ ہونا کیا ”تم ہو چکے ہو۔“

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر روز صح اٹھ کر اس مقام پر جہاں اس نے اس کا فرجمال حسینہ کو دیکھا تھا، پہنچ جایا کرے گا اور اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے لیے اس کے ذہین دماغ نے بہت سے پلیں سوچے تھے۔ ایک جو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ قابل عمل اور زود اثر تھا، اس نے مجھے بتا دیا تھا۔ اس نے حساب لگا کر سوچا تھا کہ دس دن متواتر اس لڑکی کو ایک ہی مقام پر کھڑے رہ کر دیکھنے اور گھورنے سے اتنا معلوم ہو جائے گا کہ اس کا مطلب کیا ہے یعنی وہ کیا چاہتا ہے۔ اس مدت کے بعد وہ اس کا رد عمل ملاحظہ کرے گا اور اس تجزیے کے بعد کوئی فیصلہ مرتب کرے گا۔ یہ اغلب تھا کہ وہ لڑکی اس کا دیکھنا گھورنا پسند نہ کرے۔ مائی سے یا اپنے والدین سے اس کے غیر اخلاقی رویے کی شکایت کر دے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ راضی ہو جاتی۔ اس کی ثابت قدی اس پر اتنا اثر کرتی کہ اس کے ساتھ بھاگ جانے کو تیار ہو جاتی۔

جمیل نے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لیا تھا۔ شاید ضرورت سے زیادہ۔ اس لیے کہ دوسرے روز جب وہ الارم بننے پر اٹھا تو اس نے اس مقام پر جہاں اس لڑکی سے اس کی پہلی مرتبہ مذہبیہ ہوئی تھی، جانے کا خیال ترک کر دیا۔ اس نے مجھ سے کہا، ”سعادت! میں نے یہ سوچا ہے کہ ہو سکتا ہے اسکوں میں چھٹی ہو کیوں کہ جمعہ ہے۔ معلوم نہیں اسلامی اسکوں میں بڑھتی ہے یا کسی گورنمنٹ اسکوں میں۔ پھر یہ بھی ممکن تھا کہ اگر میں اسے زیادہ شدت سے گھورتا تو وہ بھنا جاتی۔ اس کے علاوہ اس بات کی کیاضانت تھی کہ دس دن کے اندر اندر مجھے اس کا رد عمل یقین طور پر معلوم ہو جائے گا۔ بغرض حال وہ رضامند ہو جاتی، میرا مطلب ہے مجھے بالمشافہ گنتگو کا موقع دے دیتی، تو میں اس سے کیا کہتا!“ میں نے کہا، ”یہی کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔“

جمیل سنجیدہ ہو گیا۔ ”یار، مجھ سے کبھی کہانے جاتا۔۔۔ تم سوچوں اگر یہ سن کروہ میرے منہ پر تھپڑ دے مارتی کہ جناب آپ کو اس کا کیا حق حاصل ہے، تو میں کیا جواب دیتا۔ زیادہ سے زیادہ میں کہہ سکتا کہ حضور محبت کرنے کا حق ہر انسان کو حاصل ہے مگر وہ ایک اور تھپڑ میرے مار سکتی تھی کہ تم بکواس کرتے ہو، کون کہتا ہے کہ تم انسان ہو۔

قصہ مختصر یہ کہ جمیل اس حسین و جمیل لڑکی کی محبت میں خود کو اپنے تجربیہ خودی کے باعث گرفتار نہ کر اسکا۔ مگر اس کی خواہش بدستور موجود تھی۔ ایک اور خوب رو لڑکی اس کی تلاش کرنے والی نگاہوں کے سامنے آئی اور اس نے فوراً تھیہ کر لیا کہ اس سے عشق لڑانا شروع کر دے گا۔

جمیل نے سوچا کہ اس سے خط و کتابت کی جائے، چنانچہ اس نے پہلے خط کے کئی مسودے پھاڑنے کے بعد ایک آخری، عشق و محبت میں شرابور، تحریرِ مکمل کی، جو میں یہاں من و عن نقل کرتا ہوں۔

جان جمیل!

اپنے دل کی دھڑکنیں سلام کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ حیران نہ ہوئے گا کہ یہ کون ہے جو آپ سے یوں بے دھڑک ہم کلام ہے۔ میں عرض کیے دیتا ہوں۔ کل شام کو سواچھ بجے۔۔۔ نہیں، چھنج کر گیا رہ منٹ پر جب آپ امرت سینما کے پاس ٹانگے میں سے اتریں تو میں نے آپ کو دیکھا۔ بس ایک ہی نظر میں آپ نے مجھے مسحور کر لیا۔ آپ اپنی سہیلیوں کے ساتھ پکھر دیکھنے چلی گئیں اور میں باہر کھڑا آپ کو

اپنی تصور کی آنکھوں سے مختلف روپوں میں دیکھتا رہا۔ دو گھنٹے کے بعد آپ باہر نکلیں۔ پھر زیارت نصیب ہوئی اور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ کا غلام ہو گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا میں آپ کو اور کیا لکھوں۔ بس اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کیا آپ میری محبت کو اپنے حسن و جمال کے شایان سمجھیں گی یا نہیں۔ اگر آپ نے مجھے ٹھکرایا تو میں خود کشی نہیں کروں گا، زندہ رہوں گا تاکہ آپ کے دیدار ہوتے رہیں۔

آپ کے حسن و جمال کا پرستار
جمیل

یہ خط اس نے میرے گھر میں ایک خوشبودار کاغذ پر اپنی تحریر سے منتقل کیا تھا۔ لفافہ چھوٹ دار اور خوشبودار تھا جس کو جمالیاتی ذوق نے پسند نہیں کیا تھا۔ چند روز کے بعد جمیل مجھ سے ملا تو معلوم ہوا کہ اس نے یہ خط اس لڑکی تک نہیں پہنچایا۔ اولاً اس لیے کہ عشق کا آغاز خط سے کرنا نامناسب ہے۔ ثانیاً اس لیے کہ اس خط کی تحریر بے ربط اور بے اثر ہے۔ اس نے خود کو لڑکی متصور کر کے یہ خط پڑھا اور اس کو بہت مصکحہ خیز معلوم ہوا۔

ثالثاً اس لیے کہ تفتیش کرنے کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ لڑکی ہندو ہے۔ یہ مرحلہ بھی شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔

اس کے گھر میں میرا آنا جانا تھا۔ مجھ سے کوئی پر دہ وغیرہ نہیں تھا۔ ہم گھنٹوں بیٹھے پڑھائیا گپ بازیوں میں مشغول رہتے۔ اس کی دو بہنیں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی۔ ان سے بڑی بپکانہ قسم کی پر لطف باتیں ہوتیں۔ اس کی موسیٰ کی ایک انتہاد رجی کی سادہ لوح لڑکی عذر رکھی۔ عمر یہی کوئی سترہ اٹھا رہ بر س ہو گی۔ اس کا ہم دونوں بہت مذاق اڑایا کرتے تھے۔

جمیل کی جب دوسری کوشش بھی بار آور ثابت نہ ہوئی تو وہ دو مینیٹ تک خاموش رہا۔ اس دوران میں اس نے عشق میں گرفتار ہونے کی کوئی نئی کوشش نہ کی۔ لیکن اس کے بعد اس کو ایک دم دورہ پڑا اور اس نے ایک ہفتے کے اندر اندر پانچ چھ لڑکیاں اپنی عشق کی بندوق کے لیے نشانے کے طور پر منتخب کر لیں۔ پر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ صرف چار لڑکیوں کے متعلق مجھے اس کی عشقیہ مہم کے بارے میں علم

ہے۔

پہلی نے جو اس کی دور دراز کی رشتہ دار تھی، اپنی ماں کے ذریعے اس کی ماں تک یہ الٹی میٹم بھجوادیا کہ اگر جمیل نے اس کو پھر بری نظر سے دیکھا تو اس کے حق میں اچھا نہ ہو گا۔ دوسری غور سے دیکھنے پر چچک کے داغوں والی نکلی۔ تیسری کی چھٹے، ساتویں روز ایک قصائی سے منگنی ہو گئی۔ چوتھی کو اس نے ایک لمبا عشقی خط لکھا جو اس کی موسی کی بیٹی عذر را کے ہاتھ آگیا۔ معلوم نہیں کس طرح۔ پہلے جمیل اس کا مذاق اڑایا کرتا تھا، اب اس نے اڑانا شروع کر دیا، اتنا کہ جمیل کانک میں دم آگیا۔

جمیل نے مجھے بتایا، ”سعادت! یہ عذر اجسے ہم بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح سمجھتے ہیں، سخت ظالم ہے، سب سمجھتی ہے۔ جس لڑکی کو میں نے خط لکھا تھا اور غلطی سے اپنے میر کے دراز میں رکھ کر یہ سوچنے میں مشغول تھا کہ وہ اس کا کیا جواب لکھے گی، یہ کم بخت جانے کیسے لے اڑی۔ اب اس نے میر اناطقہ بند کر دیا۔ بعض اوقات ایسی تلخ باتیں کرتی ہے کہ مجھے رلاتی ہے اور خود بھی روتی ہے۔ میں تو تنگ آگیا ہوں۔“

اس سے بہت زیادہ تنگ آ کر اس نے اپنے عشق کی مہم اور تیز کر دی۔ اب کی اس نے چودہ لڑکیاں چنیں مگر اچھی طرح غور کرنے کے بعد ان میں سے صرف ایک باقی رہ گئی۔ دس اس کے مکان سے بہت دور ہتی تھیں، جن کو ہر روز حتی طور پر دیکھنے کے متعلق اس کا دل گواہی نہیں دیتا تھا۔ دو ایسی تھیں، جن کا خاند اُنی ہونے کے بارے میں اسے شبہ تھا۔ بارہ ہوئیں۔ تیرھویں نے ایک دن ایسی بڑی طرح گھورا کہ اس کے اوسمان خط ہو گئے۔

چودھویں جو کہ چودھویں کا چاند تھی، ملتقت ہو جاتی مگر وہ کم بخت کیوں نہ تھی۔ جمیل نے سوچا کہ اس کا التفات حاصل کرنے کے لیے وہ ضرور کیوں نہ بن جاتا، کھادی کے کپڑے پہن کر مزدوروں کے حق میں دس بارہ تقریریں بھی کر دیتا، مگر مصیبت یہ تھی کہ اس کے والد صاحب ریٹائرڈ انجینئر تھے، ان کی پیش نیقیناً بند ہو جاتی۔ یہاں سے نامیدی ہوئی تو اس نے سوچا کہ عشق بازی فضول ہے، شرافت یہی ہے کہ وہ کسی سے شادی کر لے۔ اس کے بعد اگر طبیعت چاہے تو اپنی بیوی کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔ چنانچہ اس نے مجھے اس فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ طے یہ ہوا کہ وہ اپنی اُمی جان اور اپنے اباجان سے بات کرے۔

بہت دنوں کی سوچ بچار کے بعد اس نے اس گفتگو کا مسودہ تیار کیا۔ سب سے پہلے اس نے اپنی اُمی سے بات کی۔ وہ خوش ہو گیں۔۔۔ ادھر ادھر اپنے عزیزوں میں انھوں نے جمیل کے لیے موزوں رشتہ ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔۔۔ پڑوس میں خان بہادر صاحب کی لڑکی تھی۔۔۔ ایم۔۔۔ اے۔ بڑی ذہین اور طبیعت کی بہت اچھی۔۔۔ مگر اس کی ناک چپٹی تھی۔ خالہ کی بیٹی حسن آراء تھی پر بے حد کالی۔ صغیر تھی مگر اس کے والدین بڑے خسیں تھے۔ جہیز میں جتنے جوڑے جمیل کی ماں چاہتی تھی، اس سے وہ آدھے دینے پر بھی رضامند نہیں تھے۔ عذر کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

جمیل کی ماں نے بڑی کوششوں کے بعد راولپنڈی کے ایک معزز اور متمول خاندان کی لڑکی سے بات چیت طے کر لی۔ جمیل اپنی ناکام عشق بازیوں سے اس قدر تنگ آگیا تھا کہ اس نے اپنی ماں سے یہ بھی نہ پوچھا کہ شکل و صورت کیسی ہے۔ ویسے اس نے اپنے زندہ تصور میں اس کا اندازہ لگایا تھا اور مفصل طور پر سوچ لیا تھا کہ وہ اس کی محبت میں کس طرح گرفتار ہو گا۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ میں خوش تھا کہ جمیل کی شادی ہو رہی ہے۔ اس کے مرض متعلقہ بے عشق کا ایک فقط یہی واحد علاج تھا۔ چھ مہینے گزر گئے، آخر راولپنڈی کے اس معزز اور متمول خاندان کی لڑکی سے، جس کا نام غالباً شریفہ تھا، اس کی متنگی ہو گئی۔

اس تقریب پر اسے سرال کی طرف سے ہیرے کی انگوٹھی ملی، جو وہ ہر وقت پہنے رہتا تھا۔ اس پر اس نے ایک نظم بھی لکھی جس کا کوئی شعر مجھے یاد نہیں۔ ایک برس تک سوچتا رہا کہ اسے اپنی دلہن کو کب اپنے یہاں لانا چاہیے۔ آدمی چونکہ آزاد اور روشن خیال قسم کا تھا اس لیے اس کی خواہش تھی کہ ماں باپ سے علیحدہ اپنا گھر بنائے۔ یہ کیسا ہونا چاہیے، اس میں کس ڈیزائن کا فرنیچر ہو، نوکر کتنے ہوں، ماہوار خرچ کتنا ہو گا، ساس کے ساتھ اس کا لیا سلوک ہو گا، ان تمام امور کے بارے میں اس نے کافی سوچ بچار کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکی والے تنگ آگئے۔ وہ چاہتے تھے کہ رخصتی کا مرحلہ جلد از جلد طے ہو۔

جمیل اس بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ لیکن اس کی امی نے ایک تاریخ مقرر کر دی۔ کارڈ وارڈ چھپ گئے۔ ویسے کی دعوت کے لیے ضروری سامان کا بندوبست کر لیا گیا۔ اس کے والد بزرگوار شیخ محمد اسماعیل صاحب ریٹائرڈ انجینئر بہت مسرورات تھے مگر جمیل بہت پریشان تھا۔ اس لیے کہ وہ اپنے بننے والے گھر کا آخری نقشہ تیار نہیں کر سکا تھا۔

رخصتی کی تاریخ ۱۹ اکتوبر کی صبح کو۔۔ منہ ادھیرے جمیل میرے پاس سخت اضطراب اور کرب کے عالم میں آیا اور اس نے مجھے یہ خبر سنائی کہ اس کی موسی کی لڑکی عذر انے جو بیوی قوئی کی حد تک سادہ لوح تھی، خود کشی کر لی ہے، اس لیے کہ اس کو جمیل سے والہانہ عشق تھا۔ وہ برداشت نہ کر سکی کہ اس کے محبوب و معبدوں کی شادی کسی اور لڑکی سے ہو۔ اس ضمن میں اس نے جمیل کے نام خط لکھا جس کی عبارت بہت دردناک تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ تحریر یاد گار کے طور پر اس کے پاس محفوظ ہو گی۔

”پاپوں کی گھری“ کی شوٹنگ تمام شب ہوتی رہی تھی، رات کے تھکے ماندے ایکٹر، لکڑی کے کمرے میں جو کمپنی کے ولن نے اپنے میک اپ کے لیے خاص طور پر تیار کرایا تھا اور جس میں فرصت کے وقت سب ایکٹر اور ایکٹر سیں سیٹھ کی مالی حالت پر تبصرہ کیا کرتے تھے، صوفوں اور کرسیوں پر اوگھر رہے تھے۔ اس چوبی کمرے کے ایک کونے میں میلی سی تپائی کے اوپر دس پندرہ چائے کی خالی پیالیاں اونڈھی سیدھی پڑی تھیں جو شاید رات کو نیند کا غلبہ دور کرنے کے لیے ان ایکٹروں نے پی تھیں۔ ان پیالوں پر سیکڑوں کھیاں بھجنھنا رہی تھیں۔ کمرے کے باہر ان کی بھجنھنا ہٹ سن کر کسی نوادرد کو یہی معلوم ہوتا کہ اندر بھلی کا پنکھا چل رہا ہے۔

دراز قد ولن جو شکل و صورت سے لاہور کا کوچوان معلوم ہوتا تھا، ریشمی سوٹ میں ملبوس صوفے پر دراز تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں اور منہ بھی نیم واتھا مگر وہ سورا تھا۔ اسی طرح اس کے پاس ہی آرام کر سی پر ایک موچھوں والا دھیر عمر کا ایکٹر اوگھر رہا تھا۔ کھڑکی کے پاس ڈنڈے سے ٹیک لگائے ایک اور ایکٹر سونے کی کوشش میں معروف تھا۔ کمپنی کے مکالہ نویس یعنی منتشری صاحب ہونٹوں میں بیڑی دبائے اور ٹانگیں میک اپ ٹیبل پر رکھے، شاید وہ گیت بنانے میں معروف تھے جو انھیں چار بجے سیٹھ صاحب کو دکھانا تھا۔

”اوی، اوی، اوی۔۔۔ ہائے۔۔۔ ہائے۔۔۔“

دفعتاً یہ آواز باہر سے اس چوبی کمرے میں کھڑکیوں کے راستے اندر داخل ہوئی۔ ولن صاحب جھٹ سے اٹھ بیٹھے اور اپنی آنکھیں ملنے لگے۔ موچھوں والے ایکٹر کے لمبے لمبے کان ایک ارتقاش کے ساتھ اس نسوانی آواز کو پہچاننے کے لیے تیار ہوئے۔ منتشر نے میک اپ ٹیبل پر سے اپنی ٹانگیں اور ولن صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔

”اوی، اوی، اوی۔۔۔ ہائے۔۔۔ ہائے۔۔۔“

اس پر، ولن، منتشر اور دوسرے ایکٹر جو نیم غنودگی کی حالت میں تھے چونک پڑے، سب نے کامٹھ کے اس بکس نما کمرے سے اپنی گرد نیں باہر نکالیں۔

”ارے، کیا ہے بھتی۔“

”خیر تو ہے!“

”کیا ہوا؟“

”اماں، یہ تو۔۔۔ دیوی ہیں!“

”کیا بات ہے! دیوی؟“

جتنے منہ اتنی باتیں۔۔۔ کھڑکی میں سے نکلی ہوئی ہر گردن بڑے اضطراب کے ساتھ متحرک ہوئی اور ہر ایک کے منہ سے گھبراہٹ میں ہمدردی اور استفسار کے ملے جذبات کا اظہار ہوا۔

”ہائے، ہائے، ہائے۔۔۔ اُوئی۔۔۔ اُوئی!“

دیوی، کمپنی کی ہر داعزیز ہیر و نکن کے چھوٹے سے منہ سے چینیں نکلیں اور بانہوں کو انتہائی کرب و اضطراب کے تحت ڈھیلا چھوڑ کر اس نے اپنے چپل پہنے پاؤں کو زور زور سے اسٹوڈیو کی پتھر لیلی زمین پر مارتے ہوئے چینا چلانا شروع کر دیا۔ ٹھما کا ٹھما کا بونا ساقد، گول گول گدرایا ہوا ڈیل، کھلتی ہوئی گندی رنگت، خوب خوب کالی کالی تیکھی بھنویں، کھلی پیشانی پر گہر اکسوم کا ٹیکا۔۔۔ بال کالے بھوزرا سے جو سیدھی مانگ نکال کر پیچھے جوڑے کی صورت میں لپیٹ دے کر کنگھی کیے ہوئے تھے، ایسے معلوم ہوتے تھے، جیسے شہد کی بہت سی کمیاں چھتے پر بیٹھی ہوئی ہیں۔

کنارے دار سفید سوتی ساڑھی میں لپٹی ہوئی، چولی گجراتی تراش کی تھی، بغیر آستینوں کے، جن میں سے جوبن پھٹا پڑتا تھا، ساڑھی بمبئی کے طرز سے بندھی تھی۔ چاروں طرف میٹھا میٹھا جھول دیا ہوا تھا۔۔۔ گول گول کلائیاں جن میں کھلی جاپانی ریشمیں چوڑیاں کھنکناری ہی تھیں۔ ان ریشمیں چوڑیوں میں ملی ہوئی ادھر ادھر ولا یتی سونے کی پتی پتی کنگنیاں جھم کر رہی تھیں، کان موزوں اور لویں بڑی خوابصورتی کے ساتھ یخچے جھکی ہوئیں، جن میں ہیرے کے آویزے، شبنم کی دو تھراتی ہوئی بوندیں معلوم ہو رہی تھیں۔ چینی چلاتی، اور زمین کو چپل پہنے پیروں سے کوٹتی، دیوی نے داہنی آنکھ کو نخنے سے سفید رومال کے ساتھ ملنا شروع کر دیا۔

”ہائے میری آنکھ---ہائے میری آنکھ---ہائے!“

کاٹھ کے بکس سے باہر نکلی ہوئی کچھ گرد نیں اندر کو ہو گئیں اور جو باہر تھیں، پھر سے ہلنے لگیں۔

”آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے؟“

”یہاں کنکر بھی تو بے شمار ہیں۔۔۔ ہوا میں اڑتے پھرتے ہیں۔“

”یہاں جھاڑو بھی تو چھ مہینے کے بعد دی جاتی ہے۔“

”اندر آ جاؤ دیوی!“

”ہاں، ہاں، آؤ۔۔۔ آنکھ کو اس طرح نہ ملو۔“

”ارے بابا۔۔۔ بولانا! اتفکیف ہو جائے گی۔۔۔ تم اندر تو آؤ۔“

آنکھ ملتی ملتی، دیوی کمرے کے دروازے کی جانب بڑھی۔

ولن نے پک کرتا پائی پرسے بڑی صفائی کے ساتھ ایک رومال میں چائے کی پیالیاں سمیٹ کر میک اپ ٹیبل کے آئینے کے پیچھے چھپا دیں اور اپنی پرانی پتلون سے ٹیبل کو جھاڑ پوچھ کر صاف کر دیا۔ باقی ایکٹروں نے کر سیاں اپنی جگہ پر جمادیں اور بڑے سلیقے سے بیٹھ گئے۔ منشی صاحب نے پرانی ادھ جلی بیڑی پچینک کر جیب سے ایک سگرٹ نکال کر سلگانا شروع کر دیا۔

دیوی اندر آئی۔ صوفے پر سے منشی صاحب اور ولن اٹھ کھڑے ہوئے۔ منشی صاحب نے بڑھ کر کہا، ”آؤ، دیوی یہاں بیٹھو۔“ دروازے کے پاس بڑی بڑی سیاہ و سفید موچھوں والے بزرگ بیٹھے تھے، ان کی موچھوں کے لئے اور بڑھے ہوئے بال تھر تھرائے اور انہوں نے اپنی نشست پیش کرتے ہوئے گجراتی لہجے میں کہا، ”ادھر بیسو۔“

دیوی ان کی تھر تھراتی ہوئی موچھوں کی طرف دھیان دیے بغیر آنکھ ملتی اور ہائے ہائے کرتی آگے بڑھ گئی۔ ایک نوجوان نے جو ہیر و سے معلوم ہو رہے تھے اور کھنپنی کھنپنی قمیں پہنے ہوئے تھے، جھٹ سے ایک چوکی نما کرسی سر کا کر آگے بڑھادی اور دیوی نے اس پر بیٹھ کر اپنی ناک کے بانسے کو رومال سے رگڑنا شروع کر دیا۔ سب کے چہرے پر دیوی کی تکلیف کے احساس نے ایک عجیب و غریب رنگ پیدا کر دیا تھا۔ منشی صاحب کی قوتِ احساس چونکہ دوسرا مردوں سے زیادہ تھی، اس لیے چشمہ ہٹا کر انھوں نے اپنی آنکھ ملنا شروع کر دی تھی۔ جس نوجوان نے کرسی پیش کی تھی، اس نے جھک کر دیوی کی آنکھ کا ملاحظہ کیا اور بڑے مفکرانہ انداز میں کہا، ”آنکھ کی سرخی بتارہی ہے کہ تکلیف ضرور ہے۔“ ان کا لہجہ پھٹا ہوا تھا۔ آوازا تنی بلند تھی کہ کمرہ گونج اٹھا۔

یہ کہنا تھا کہ دیوی نے اور زور زور سے چلانا شروع کر دیا اور سفید ساڑھی میں اس کی ٹانگیں اضطراب کا بے پناہ مظاہرہ کرنے لگیں۔ ولن صاحب آگے بڑھے اور بڑی ہمدردی کے ساتھ اپنی سخت کمر جھکا کر دیوی سے پوچھا، ”جلن محسوس ہوتی ہے یا چسبھن؟“ ایک اور صاحب جو اپنے سولاہیٹ سمیت کرے میں ابھی ابھی تشریف لائے تھے، آگے بڑھ کے پوچھنے لگے، ”پپوٹوں کے نیچے رگڑی محسوس تو نہیں ہوتی۔“ دیوی کی آنکھ سرخ ہو رہی تھی۔ پپوٹے ملنے اور آنسوؤں کی نمی کے باعث میلے میلے نظر آرہے تھے۔ چتوںوں میں سے لاال لاال ڈوروں کی جھلک، چک میں سے غروبِ آفتاب کا سرخ سرخ منظر پیش کر رہی تھی۔ داہنی آنکھ کی پلکیں نمی کے باعث بھاری اور گھنی ہو گئی تھیں، جس سے ان کی خوبصورتی میں چارچاند لگ گئے تھے۔ باہیں ڈھیلی کر کے دیوی نے دھکتی آنکھ کی تسلی نچاتے ہوئے کہا۔

”آں--- بڑا تکلیف پھ ہوتا ہے--- ہائے--- اوئی!“ اور پھر سے آنکھ کو گیلے رومال سے ملنا شروع کر دیا۔

سیاہ و سفید موچھوں والے صاحب نے جو کونے میں بیٹھے تھے، بلند آواز میں کہا، ”اس طرح آنکھ نہ رگڑو، خالی پیلی کوئی اور تکلیف پھ ہو جائے گا۔“

”ہاں، ہاں--- ارے، تم پھروہی کر رہی ہو۔“ پھٹی آواز والے نوجوان نے کہا۔

ولن جو فوراً ہی دیوی کی آنکھ کو ٹھیک حالت میں دیکھنا چاہتے تھے، بگڑ کر بولے، ”تم سب بیکارباتیں بنارہے ہو--- کسی سے ابھی تک یہ بھی نہیں ہوا کہ دوڑ کر ڈاکٹر کو ملا لائے--- اپنی آنکھ میں یہ تکلیف ہو تو پتہ چلے۔“ یہ کہہ کر انھوں نے مڑ کر کھڑکی میں سے باہر گردناکالی اور زور زور سے پکارنا شروع کیا، ”ارے، کوئی ہے--- کوئی ہے--- گلاب--- گلاب!“

جب ان کی آواز صداب صحر اثابت ہوئی تو انھوں نے گردن اندر کو کرلی اور بڑا ناشر وع کر دیا، ”خد اجانے ہو ٹل والے کا یہ چھو کر اکھاں غائب ہو جاتا ہے۔۔۔ پڑا لوگھ رہا ہو گا اسٹوڈیو میں کسی تختے پر۔۔۔ مردوں ناکار۔“ پھر فوراً ہی دور اسٹوڈیو کے اس طرف گلب کو دیکھ کر چلائے، جوانگیوں میں چائے کی پیالیاں لٹکائے چلا آرہا تھا، ”ارے گلب۔۔۔ گلب!“

غلاب بھاگتا ہوا آیا اور کھڑکی کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گیا۔ ولن صاحب نے گھبراۓ ہوئے لہجہ میں اس سے کہا، ”دیکھو! ایک گلاس میں پانی لاو۔ جلدی سے۔۔۔ بھاگو!“ گلب نے کھڑے کھڑے اندر جھانکا، دیکھنے کے لیے کہ یہاں گڑ بڑ کیا ہے۔۔۔ اس پر ہیر و صاحب لکارے، ”ارے دیکھتا کیا ہے۔۔۔ لا، ناگلاس میں تھوڑا سا پانی۔۔۔ بھاگ کے جا، بھاگ کے!“

غلاب، سامنے ٹین کی چھت والے ہو ٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ دیوی کی آنکھ میں چھپن اور بھی زیادہ بڑھ گئی اور اس کی بنارسی لنگڑے کی کیری ایسی ننھی منی ٹھوڑی روتے بچے کی طرح کانپنے لگی اور وہ اٹھ کر درد کی شدت سے کراہتی ہوئی صوف پر پیٹھ گئی۔ دستی ہٹوے سے ماچس کی ڈبیا کے برابر ایک آئینہ نکال کر اس نے اپنی دکھتی آنکھ کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اتنے میں مشی صاحب بولے، ”غلاب سے کہہ دیا ہوتا۔۔۔ پانی میں تھوڑی سی برف بھی ڈالتا لائے!“

”ہاں، ہاں، سرد پانی اچھا رہے گا۔“ یہ کہہ کر ولن صاحب کھڑکی میں سے گردن باہر نکال کر چلائے، ”غلاب۔۔۔ ارے گلب۔۔۔ پانی میں تھوڑی سی برف چھوڑ کے لانا۔“

اس دوران میں ہیر و صاحب جو کچھ سوچ رہے تھے، کہنے لگے، ”میں بولتا ہوں کہ رومال کو سانس کی بھانپ سے گرم کرو اور اس سے آنکھ کو سینک دو۔۔۔ کیوں دادا؟“

”ایک دم ٹھیک رہے گا!“ سیاہ و سفید موچھوں والے صاحب نے سر کو اثبات میں بڑے زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔

ہیر و صاحب کھونٹیوں کی طرف بڑھے۔ اپنے کوٹ میں سے ایک سفید رومال نکال کر دیوی کو سانس کے ذریعے سے اس کو گرم کرنے کی ترکیب بتائی اور الگ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ دیوی نے رومال لے لیا اور اسے منہ کے پاس لے جا کر گال پھلا پھلا کر سانس کی گرمی پہنچائی، آنکھ کو نکلور دی مگر کچھ افاق نہیں ہوا۔

”کچھ آرام آیا؟“ سولاہیت والے صاحب نے دریافت کیا۔ دیوی نے روئی آواز میں جواب دیا، ”نہیں۔۔۔ ابھی نہیں نکلا۔۔۔ میں مر گئی۔۔۔!“ اتنے میں گلاب پانی کا گلاس لے کر آگیا۔ ہیر و اورولن دوڑ کر بڑھے اور دونوں نے مل کر دیوی کی آنکھ میں پانی چوایا۔ جب گلاس کا پانی آنکھ کو غسل دینے میں ختم ہو گیا، تو دیوی پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور آنکھ جھپکانے لگی۔

”کچھ افاقہ ہوا؟“

”اب تکلیف تو نہیں ہے؟“

”کنکری نکل گئی ہو گی۔“

”بس تھوڑی دیر کے بعد آرام آجائے گا!“

آنکھ دھل جانے پر پانی کی ٹھنڈک نے تھوڑی دیر کے لیے دیوی کی آنکھ میں چھپن رفع کر دی، مگر فوراً ہی پھر سے اس نے درد کے مارے چلانا شروع کر دیا۔

”کیا بات ہے؟“ یہ کہتے ہوئے ایک صاحب باہر سے اندر آئے اور دروازے کے قریب کھڑے ہو کر معاملے کی اہمیت کو سمجھنا شروع کر دیا۔

نووارد کہنے سال ہونے کے باوجود چست و چالاک معلوم ہوتے تھے۔ موچھیں سفید تھیں، جو بیڑی کے دھونیں کے باعث سیاہی مائل زرد رنگت اختیار کر چکی تھیں، ان کے کھڑے ہونے کا انداز بتارہا تھا کہ فون میں رہ چکے ہیں۔ سیاہ رنگ کی ٹوپی سر پر ذرا اس طرف تر چھی پہنے ہوئے تھے۔ پتلون اور کوٹ کا کپڑا معمولی اور خاکستری رنگ کا تھا۔ کوٹھوں اور رانوں کے اوپر پتلون میں پڑے ہوئے جھوول اس بات پر چغلیاں کھا رہے تھے کہ ان کی ٹانگوں پر گوشت بہت کم ہے۔ کالر میں بندھی ہوئی میلی کمٹائی کچھ اس طرح نیچے لٹک رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ ان سے روٹھی ہوئی ہے، پتلون کا کپڑا اگھٹنوں پر کھنچ کر آگے بڑھا ہوا تھا، جو یہ بتارہا تھا کہ وہ اس بے جان چیز سے بہت کڑا کام لیتے رہے ہیں، گال بڑھا پے کے باعث بے چکے ہوئے، آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں، جو بار بار شانوں کی عجیب جنبش کے ساتھ سکیڑ لی جاتی تھیں۔

آپ نے کاندھوں کو جنبش دی اور ایک قدم آگے بڑھ کر کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا، ”کنکر پڑ گیا ہے کیا؟“ اور اثبات میں جواب پا کر دیوی کی طرف بڑھے۔ ہیر و اورولن کو ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کر کے آپ نے کہا، ”پانی سے آرام نہیں آیا۔۔۔ خیر۔۔۔ رومال ہے کسی کے پاس؟“

نصف درجن رومال ان کے ہاتھ میں دے دیئے گئے۔ بڑے ڈرامائی انداز میں آپ نے ان پیش کردہ رومالوں میں سے ایک منتخب کیا، اور اس کا ایک کنارہ پکڑ کر دیوی کو آنکھ پر سے ہاتھ ہٹالینے کا حکم دیا۔ جب دیوی نے ان کے حکم کی تعمیل کی، تو انھوں نے جیب میں سے مداری کے سے انداز میں ایک چرمی بٹوانکلا اور اس میں سے اپنا چشمہ نکال کر کمال احتیاط سے ناک پر چڑھایا۔ پھر چنسٹے کے شیشوں میں سے دیوی کی آنکھ کا دورہ سے اکڑ کر معاشرہ کیا۔ پھر دفعتاً فوٹو گرافر کی سی پھرتی دکھاتے ہوئے آپ نے اپنی ٹانگیں چوڑی کیں اور جب انھوں نے اپنی پتلی پتنی انگلیوں سے دیوی کے پپلوں کو واکرنا چاہا تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ فوٹو لیتے وقت کیسرے کا لینس بند کر رہے ہیں۔

دو تین مرتبہ ڈرامائی انداز سے اپنے کھڑے ہونے کا رخدال کر انھوں نے دیوی کی آنکھوں کا معائنہ کیا اور پھر پوٹے کھول کر بڑی آہستگی سے رومال کا کنارہ ان کے اندر داخل کر دیا۔۔۔ حاضرین خاموشی سے اس عمل کو دیکھتے رہے۔ پانچ منٹ تک کمرے میں قبر کی سی خاموشی طاری رہی۔ آنکھ صاف کرنے کے بعد اسی ڈرامائی انداز میں فوٹو گرافر صاحب نے۔۔۔ چونکہ وہ بزرگ فوٹو گرافر ہی تھے۔۔۔ چشمہ اتار کر چرمی بٹوے میں رکھ کر دیوی سے کہا، ”اب نکل گیا ہے۔۔۔ تھوڑی دیر میں آرام آجائے گا!“ دیوی نے انگلیوں سے آنکھ کے پپلوں کو چھوا اور نخاس آئینہ نکال کر اپنا اطمینان کرنے لگی۔

”کنکری نکل گئی نا؟“

”اب درد محسوس تو نہیں ہوتا!“

”سالا، اب نکل گیا ہو گا، بہت دکھ دیا ہے اس نے۔“

”دیوی۔۔۔ اب طبیعت کیسی ہے؟“

یہ شور سن کر فوٹوگرافر صاحب نے کاندھوں کو زور سے جنبش دی اور کہا، ”تم سارا دن کو شش کرتے رہتے مگر کچھ نہ ہوتا۔۔۔ ہم فوج میں پچھیں برس بھاڑ نہیں جھونکتا رہا۔۔۔ یہ سب کام جانتا ہے۔۔۔ کنکر نکل گیا ہے، اب صرف جلن باقی ہے، وہ بھی دور ہو جائے گی۔“ یہ بتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دیوی جو آئینے میں رونی صورت بنائے اپنا اطمینان کر رہی تھی، ایکا ایکی مسکرائی اور کھل کھلا کر ہنس دی۔۔۔ چوبی کمرے میں متر نم تارے بکھر گئے۔

”اب آرام ہے۔۔۔ اب آرام ہے!“ یہ کہہ کر دیوی سیٹھ کی جانب رو انہ ہو گئی جو ہوٹل کے پاس اکیلا کھڑا تھا، اور سب لوگ دیکھتے رہ گئے۔ ہیر و جب صوفے پر بیٹھنے لگا تو منشی صاحب کی ران یچے دب گئی۔ آپ بھنا گئے، ”اب کیا پھر سونے کا رادا ہے۔۔۔ چلو بیٹھو، مجھے کل والے سین کے ڈالاگ سناؤ۔“

ہیر و کے دماغ میں اس وقت کوئی اور ہی سین تھا۔

-[40]-

گورکھ سنگھ کی وصیت: سعادت حسن منٹو

پہلے چھرا بھوکنے کی اکاڈ کا واردات ہوتی تھیں، اب دونوں فریقوں میں باقاعدہ لڑائی کی خبریں آنے لگیں جن میں چاقو چھریوں کے علاوہ کرپانیں، تکواریں اور بندوقیں عام استعمال کی جاتی تھیں۔ کبھی کبھی دیسی ساخت کے بم پھٹنے کی اطلاع بھی ملتی تھی۔

امر تسر میں قریب ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ یہ فرقہ وارانہ فسادات دیر تک جاری نہیں رہیں گے۔ جوش ہے، جو نبی ٹھنڈا ہوا، فضا پھر اپنی اصلی حالت پر آجائے گی۔ اس سے پہلے ایسے کئی فساد امر تسر میں ہو چکے تھے جو دیر پا نہیں تھے۔ دس سے پندرہ روز تک مارکٹائی کا ہنگامہ رہتا تھا، پھر خود بخود فرو ہو جاتا تھا۔ چنانچہ پرانے تجربے کی بنابر لغوں کا یہی خیال تھا کہ یہ آگ ٹھوڑی دیر کے بعد اپنا زور ختم کر کے ٹھنڈی ہو جائے گی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ بلوں کا زور دن بڑھتا ہی گیا۔

ہندوؤں کے محلے میں جو مسلمان رہتے تھے بھاگنے لگے۔ اسی طرح وہ ہندو جو مسلمانوں کے محلے میں تھے اپنا گھر بار چھوڑ کے محفوظ مقاموں کا رخ کرنے لگے۔ مگر یہ انتظام سب کے نزدیک عارضی تھا، اس وقت تک کے لیے جب فضافسادات کے تکدر سے پاک ہو جانے والی تھی۔

میاں عبدالحیٰ ریٹائرڈ سب نجح کو تو سونی صدی یقین تھا کہ صورتحال بہت جلد درست ہو جائے گی، بھی وجہ ہے کہ وہ زیادہ پریشان نہیں تھے۔ ان کا ایک لڑکا تھا گیارہ برس کا۔ ایک لڑکی تھی سترہ برس کی۔ ایک پرانا ملازم تھا جس کی عمر ستر کے لگ بھگ تھی۔ مختصر ساخانداں تھا۔ جب فسادات شروع ہوئے تو میاں صاحب نے بطور حفظہ ماقدم کافی راشن گھر میں جمع کر لیا تھا۔ اس طرح سے وہ بالکل مطمئن تھے کہ اگر خدا نخواستہ حالات کچھ زیادہ بگڑ گئے اور دکانیں وغیرہ بند ہو گئیں تو انھیں کھانے پینے کے معاملے میں ترد و نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن ان کی جوان لڑکی صغریٰ بہت متعدد تھی۔ ان کا گھر تین منزلہ تھا۔ دوسری عمارتوں کے مقابلے میں کافی اوپر۔ اس کی مٹی سے شہر کا تین چو تھائی حصہ بخوبی نظر آتا تھا۔ صغریٰ اب کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ نزدیک دور کہیں نہ کہیں آگ لگی ہوتی ہے۔ شروع شروع میں تو فائز بریگیڈ کی ٹن ٹن سنائی دیتی تھی پر اب وہ بھی بند ہو گئی تھی، اس لیے کہ جگہ جگہ آگ بھڑکنے لگی تھی۔

رات کو اب کچھ اور ہی سماں ہوتا۔ گھپ اندر ہیرے میں آگ کے بڑے بڑے شعلے اٹھتے جیسے دیو ہیں جو اپنے منہ سے آگ کے فوارے سے چھوڑ رہے ہیں۔ پھر عجیب عجیب سی آوازیں آتیں جو ہر ہر مہادیو اور اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ مل کر بہت ہی وحشت ناک بن جاتیں۔

صغریٰ باپ سے اپنے خوف وہ راس کا ذکر نہیں کرتی تھی۔ اس لیے کہ وہ ایک بار گھر میں کہہ چکے تھے کہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ میاں صاحب کی باتیں اکثر درست ہوا کرتی تھیں۔ صغریٰ کو اس سے ایک گونہ اطمینان تھا۔ مگر جب بچلی کا سلسہ منقطع ہو گیا اور ساتھ ہی نلوں میں پانی آنابند ہو گیا تو اس نے میاں صاحب سے اپنی تشویش کا اظہار کیا اور ڈرتے ڈرتے رائے دی تھی کہ چند روز کے لیے شریف پورے اٹھ جائیں جہاں اڑوں پڑوں کے سارے مسلمان آہستہ آہستہ جا رہے تھے۔ میاں صاحب نے اپنا فیصلہ نہ بدلا اور کہا، ”بیکار گھبرا نے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حالات بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔“

مگر حالات بہت جلدی ٹھیک نہ ہوئے اور دن بدن بگڑتے گئے۔ وہ محلہ جس میں میاں عبدالحیٰ کا مکان تھا مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میاں صاحب پر ایک روز اچانک فانج گرا جس کے باعث وہ صاحب فراش ہو گئے۔ ان کا لڑکا بشارت بھی جو پہلے اکیلا گھر میں اوپر نیچے طرح طرح کے کھیلوں میں مصروف رہتا تھا اب باپ کی چارپائی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور حالات کی نزاکت سمجھنے لگا۔

وہ بازار جوان کے مکان کے ساتھ ملحت تھا سنسنان پڑا تھا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کی ڈسپنسری مدت سے بند پڑی تھی۔ اس سے کچھ دور ہٹ کر ڈاکٹر گوراند تاول تھے۔ صغریٰ نے شہنشیں سے دیکھا تھا کہ ان کی دکان میں بھی تالے پڑے ہیں۔ میاں صاحب کی حالت بہت مخدوش تھی۔ صغریٰ اس قدر پریشان تھی کہ اس کے ہوش و حواس بالکل جواب دے گئے تھے۔ بشارت کو الگ لے جا کر اس نے کہا، ”خدا کے

لیے، تم ہی کچھ کرو۔ میں جانتی ہوں کہ باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں، مگر تم جاؤ۔۔۔ کسی کو بھی بلا لاؤ۔ اب اجی کی حالت بہت خطرناک ہے۔“

بشارت گیا، مگر فوراً ہی واپس آگیا۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ چوک میں اس نے ایک لاش دیکھی تھی، خون سے تربتر۔۔۔ اور پاس ہی بہت سے آدمی ٹھائے باندھے ایک دکان لوٹ رہے تھے۔ صغری نے اپنے خوفزدہ بھائی کو سینے کے ساتھ لگایا اور صبر شکر کر کے بیٹھ گئی۔ مگر اس سے اپنے باپ کی حالت نہیں دیکھی جاتی تھی۔ میاں صاحب کے جسم کا داہنا حصہ بالکل سن ہو گیا تھا جیسے اس میں جان ہی نہیں۔ گویا میں بھی فرق پڑ گیا تھا اور وہ زیادہ تر اشاروں ہی سے باتیں کرتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ صغری اُبھر انے کی کوئی بات نہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

کچھ بھی نہ ہوا۔ روزے ختم ہونے والے تھے۔ صرف دورہ گئے تھے۔ میاں صاحب کا خیال تھا کہ عید سے پہلے پہلے فضاباکل صاف ہو جائے گی مگر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید عید ہی کا روز روز قیامت ہو، کیونکہ ممٹی پر سے اب شہر کے قریب قریب ہر حصے سے دھوکیں کے بادل اٹھتے دکھائی دیتے تھے۔ رات کو بم پھٹنے کی ایسی ایسی ہولناک آوازیں آتی تھیں کہ صغری اور بشارت ایک لحظے کے لیے بھی سو نہیں سکتے تھے۔ صغری کو یوں بھی باپ کی تیارداری کے لیے جا گنا پڑتا تھا، مگر اب یہ دھماکے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دماغ کے اندر ہو رہے ہیں۔ کبھی وہ اپنے مفلونج باپ کی طرف دیکھتی اور کبھی اپنے وحشت زدہ بھائی کی طرف۔۔۔ ستر بر س کا بدھا ملازم اکبر تھا جس کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ سارا دن اور ساری رات اپنی کوٹھری میں کھانتا کھنکارتا اور بلغم نکالتا رہتا تھا۔ ایک روز تنگ آکر صغری اس پر بر س پڑی، ”تم کس مرض کی دوا ہو۔ دیکھتے نہیں ہو، میاں صاحب کی کیا حالت ہے۔ اصل میں تم پر لے درجے کے نمک حرام ہو۔ اب خدمت کا موقع آیا ہے تو میے کا بہانہ کر کے یہاں پڑے رہتے ہو۔۔۔ وہ بھی خادم تھے جو آقا کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیتے تھے۔“

صغری اپنا جی ہلا کر کے چلی گئی۔ بعد میں اس کو افسوس ہوا کہ ناحق اس غریب کو اتنی لعنت ملامت کی۔ رات کا کھانا تھاں میں لگا کر اس کی کوٹھری میں گئی تو دیکھا خالی ہے۔ بشارت نے گھر میں ادھر ادھر تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔ باہر کے دروازے کی کنڈی کھلی تھی جس کا یہ مطلب تھا کہ وہ میاں صاحب کے لیے کچھ کرنے گیا ہے۔ صغری نے بہت دعائیں مانگیں کہ خدا اسے کامیاب کرے لیکن دو دن گزر گئے اور وہ نہ آیا۔

شام کا وقت تھا۔ ایسی کئی شامیں صغری اور بشارت دیکھ پکھے تھے۔ جب عید کی آمد آمد کے ہنگامے برپا ہوتے تھے، جب آسمان پر چاند دیکھنے کے لیے ان کی نظریں جمی رہتی تھیں۔ دوسرے روز عید تھی۔ صرف چاند کو اس کا اعلان کرنا تھا۔ دونوں اس اعلان کے لیے کتنے بے تاب

ہوا کرتے تھے۔ آسمان پر چاند والی جگہ پر اگر بادل کا کوئی بیلیا ٹکڑہ جم جاتا تو کتنی کوفت ہوتی تھی انھیں مگر اب چاروں طرف دھوئیں کے بادل تھے۔ صغریٰ اور بشارت دونوں ممٹی پر چڑھے۔ دور کہیں کہیں کوٹھوں پر لوگوں کے سائے دھبوں کی صورت میں دکھائی دیتے تھے، مگر معلوم نہیں یہ چاند دیکھ رہے تھے یا جگہ جگہ سلگتی اور بھڑکتی ہوئی آگ۔

چاند بھی کچھ ایسا ڈھیٹ تھا کہ دھوئیں کی چادر میں سے بھی نظر آگیا۔ صغریٰ نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ خدا اپنا فضل کرے اور اس کے باپ کو تندروتی عطا فرمائے۔ بشارت دل ہی دل میں کوفت محسوس کر رہا تھا کہ گٹھ بڑ کے باعث ایک اچھی بھلی عید غارت ہو گئی۔

دن ابھی پوری طرح ڈھلانیں تھا۔ یعنی شام کی سیاہی ابھی گھری نہیں ہوئی تھی۔ میاں صاحب کی چار پائی چھڑ کاؤ کیے ہوئے ہوئے چون میں بچھی تھی۔ وہ اس پر بے حس و حرکت لیتے تھے اور دور آسمان پر نگاہیں جمائے جانے کیا سوچ رہے تھے۔ عید کا چاند دیکھ کر جب صغریٰ نے پاس آکر انھیں سلام کیا تو انہوں نے اشارے سے جواب دیا۔ صغریٰ نے سر جھکایا تو انہوں نے وہ بازو جو ٹھیک تھا اٹھایا اور اس پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ صغریٰ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تو میاں صاحب کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں، مگر انہوں نے تسلی دینے کی خاطر بمشکل اپنی نیم مغلوج زبان سے یہ الفاظ نکالے، ”اللہ تبارک و تعالیٰ سب ٹھیک کر دے گا۔“

عین اسی وقت باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ صغریٰ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے بشارت کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میاں صاحب صغریٰ سے مخاطب ہوئے، ”دیکھو، کون ہے؟“

صغریٰ نے سوچا کہ شاید بڑھا اکبر ہو۔ اس خیال ہی سے اس کی آنکھیں تمتما ٹھیں۔ بشارت کا بازو پکڑ کر اس نے کہا، ”جاوہ دیکھو۔۔۔ شاید اکبر آیا ہے۔“ یہ سن کر میاں صاحب نے نفی میں یوں سر ہلا کیا جیسے وہ یہ کہہ رہے ہیں۔ ”نہیں۔۔۔ یہ اکبر نہیں ہے۔“ صغریٰ نے کہا۔ ”تو اور کون ہو سکتا ہے اباجی؟“

میاں عبدالجی نے اپنی قوتِ گویائی پر زور دے کر کچھ کہنے کی کوشش کی کہ بشارت آگیا۔ وہ سخت خوفزدہ تھا۔ ایک سانس اوپر، ایک نیچے، صغریٰ کو میاں صاحب کی چار پائی سے ایک طرف ہٹا کر اس نے ہولے سے کہا، ”ایک سکھ ہے!“ صغریٰ کی چیخ نکل گئی۔ ”سکھ؟ کیا کہتا ہے؟“ بشارت نے جواب دیا، ”کہتا ہے دروازہ کھولو۔“

صغریٰ نے کاپنے ہوئے بشارت کو ٹھیک کر اپنے ساتھ چمٹالیا اور باپ کی چار پائی پر بیٹھ گئی اور اپنے باپ کی طرف ویران نظر وہ سے دیکھنے لگی۔

میاں عبدالحی کے پتلے پتلے بے جان ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پیدا ہو گئی۔ ”جاو۔۔۔ گورمکھ سنگھ ہے!“

بشارت نے نفی میں سر ہلایا، ”کوئی اور ہے؟“

میاں صاحب نے فیصلہ کرنے انداز میں کہا، ”جاو صغریٰ وہی ہے!“

صغریٰ اٹھی۔ وہ گورمکھ سنگھ کو جانتی تھی۔ پنشن لینے سے کچھ دیر پہلے اس کے باپ نے اس نام کے ایک سکھ کا کوئی کام کیا تھا۔ صغریٰ کو اچھی طرح یاد نہیں تھا۔ شاید اس کو ایک جھوٹے مقدمے سے نجات دلائی تھی۔ جب سے وہ ہر چھوٹی عید سے ایک دن پہلے رومانی سویوں کا ایک تھیلا لے کر آیا کرتا تھا۔ اس کے باپ نے کئی مرتبہ اس سے کہا تھا، ”سردار جی، آپ یہ تکلیف نہ کیا کریں۔“ مگر وہ ہاتھ جوڑ کر جواب دیا کرتا تھا، ”میاں صاحب واگورو جی کی کرپاسے آپ کے پاس سب کچھ ہے۔ یہ تو ایک تھفہ ہے جو میں جناب کی خدمت میں ہر سال لے کر آتا ہوں۔ مجھ پر جو آپ نے احسان کیا تھا اس کا بدلہ تو میری سوپشت بھی نہیں چکا سکتی۔۔۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔“

سردار گورمکھ سنگھ کو ہر سال عید سے ایک روز پہلے سویوں کا تھیلا لاتے اتنا عرصہ ہو گیا تھا کہ صغریٰ کو حیرت ہوئی کہ اس نے دستک سن کر یہ کیوں خیال نہ کیا کہ وہی ہو گا، مگر بشارت بھی تو اس کو سیکڑوں مرتبہ دیکھ چکا تھا، پھر اس نے کیوں کہا کوئی اور ہے۔۔۔ اور کون ہو سکتا ہے۔ یہ سوچتی صغریٰ ڈیوڑھی تک پہنچی۔ دروازہ کھولے یا اندر ہی سے پوچھئے، اس کے متعلق وہ ابھی فیصلہ ہی کر رہی تھی کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ صغریٰ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بمشکل تمام اس نے حلق سے آواز نکالی ہے، ”کون ہے؟“ بشارت پاس کھڑا تھا۔ اس نے دروازے کی ایک درز کی طرف اشارہ کیا اور صغریٰ سے کہا، ”اس میں سے دیکھو؟“

صغریٰ نے درز میں سے دیکھا۔ گورمکھ سنگھ نہیں تھا۔ وہ تو بہت بوڑھا تھا، لیکن یہ جو باہر تھڑے پر کھڑا تھا جو ان تھا۔ صغریٰ ابھی درز پر آنکھ جمائے اس کا جائزہ لے رہی تھی کہ اس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ صغریٰ نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کاغذ کا تھیلا تھا ویسا ہی جیسا گورمکھ سنگھ لاپا کرتا تھا۔

صغریٰ نے درز سے آنکھ ہٹائی اور ذرا بند آواز میں دستک دینے والا سے پوچھا۔ ”کون ہیں آپ؟“ باہر سے آواز آئی، ”جی۔۔۔ جی میں۔۔۔ میں سردار گور کلھ سنگھ کا بیٹا ہوں۔۔۔ سنتو کھ!“

صغریٰ کا خوف بہت حد تک دور ہو گیا۔ بڑی شاشتگی سے اس نے پوچھا، ”فرمائیے۔ آپ کیسے آئے ہیں؟“ باہر سے آواز آئی، ”جی۔۔۔ نجح صاحب کہاں ہیں۔“ صغریٰ نے جواب دیا، ”بیمار ہیں۔“ سردار سنتو کھ سنگھ نے افسوس آمیز لمحے میں کہا، ”اوہ۔۔۔ پھر اس نے کاغذ کا تحیلا کھڑ کھڑایا۔ ”جی یہ سویاں ہیں۔۔۔ سردار جی کا دیپہانت ہو گیا ہے۔۔۔ وہ مر گئے ہیں!“ صغریٰ نے جلدی سے پوچھا، ”مر گئے ہیں؟“ باہر سے آواز آئی، ”جی ہاں، ایک مہینہ ہو گیا ہے۔“ مرنے سے پہلے انھوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ دیکھو بیٹھا، میں نجح صاحب کی خدمت میں پورے دس برسوں سے ہر چھوٹی عید پر سویاں لے جاتا رہا ہوں۔ یہ کام میرے مرنے کے بعد اب تمہیں کرنا ہو گا۔ میں نے انھیں پکن دیا تھا۔ جو میں پورا کر رہا ہوں۔۔۔ لے لیجئے سویاں۔“

صغریٰ اس قدر متاثر ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ سردار گور کلھ سنگھ کے لڑکے نے سویاں کا تحیلا آگے بڑھا دیا جو صغریٰ نے کپڑا لیا اور کہا، ”خدا سردار جی کو جنت نصیب کرے۔“ گور کلھ سنگھ کا لڑکا کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”نجح صاحب بیمار ہیں؟“ صغریٰ نے جواب دیا۔ ”جی ہاں!“

”کیا بیماری ہے؟“

”فانج“

”اوہ۔۔۔ سردار جی زندہ ہوتے تو یہ انھیں یہ سن کر بہت دکھ ہوتا۔۔۔ مرتے دم تک انھیں نجح صاحب کا احسان یاد تھا۔ کہتے تھے کہ وہ انسان نہیں دیوتا ہے۔۔۔ اللہ میاں انھیں زندہ رکھے۔۔۔ انھیں میر اسلام۔“

اور یہ کہہ کروہ تھڑے سے اتر گیا۔۔۔ صغریٰ سوچتی ہی رہ گئی کہ وہ اسے ٹھہرائے اور کہے کے نجح صاحب کے لیے کسی ڈاکٹر کا بندوبست کر دے۔

سردار گورمکھ سنگھ کا لڑکا سنتو کھنچ صاحب کے مکان کے تھڑے سے اتر کر چند گز آگے بڑھا تو چار ٹھاناباں دھی ہوئے آدمی اس کے پاس آئے۔ دو کے پاس جتنی مشعلیں تھیں اور دو کے پاس مٹی کے تیل کے کنفتر اور کچھ دوسرا آتش خیز چیزیں۔ ایک نے سنتو کھنچ سے پوچھا،

”کیوں سردار جی، اپنا کام کر آئے؟“

سنتو کھنچ سر ہلا کر جواب دیا، ”ہاں کر آیا۔“

اس آدمی نے ٹھانے کے اندر ہنس کر پوچھا، ”تو کر دیں معاملہ ٹھنڈا نجح صاحب کا۔“

”ہاں۔۔۔ جیسے تمہاری مرضی!“ یہ کہہ کر سردار گورمکھ سنگھ کا لڑکا چل دیا۔

-[41]-

اصلی جن: سعادت حسن منٹو

لکھنؤ کے پہلے دنوں کی یاد نواب نوازش علی، اللہ کو پیارے ہوئے تو ان کی اکلوتی لڑکی کی عمر زیادہ سے زیادہ آٹھ برس تھی۔ اکھرے جسم کی، بڑی دبلي پتلی، نازک، پتلے پتلے نشتوں والی، گڑیاں۔ نام اس کا فرنخندہ تھا۔

اس کو اپنے والد کی موت کا دکھ ہوا۔ مگر عمر ایسی تھی کہ بہت جلد بھول گئی۔ لیکن اس کو اپنے دکھ کا شدید احساس اس وقت ہوا جب اس کو میٹھا بر سر لگا اور اس کی ماں نے اس کا باہر آنا جانا قطعی طور پر بند کر دیا اور اس پر کڑے پر دے کی پابندی عائد کر دی۔ اس کو اب ہر وقت گھر کی چار دیواری میں رہنا پڑتا۔ اس کا کوئی بھائی تھا نہ بہن۔ اکثر تھائی میں روٹی اور خدا سے یہ گلہ کرتی کہ اس نے بھائی سے اسے کیوں محروم رکھا اور پھر اس کا اب امیاں اس سے کیوں چھین لیا۔

ماں سے اس کو محبت تھی، مگر ہر وقت اس کے پاس بیٹھی وہ کوئی تسکین محسوس نہیں کرتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کوئی اور ہو جس کے وجود سے اس کی زندگی کی یہ آہنگی دور ہو سکے۔ وہ ہر وقت اکتائی اکتائی سی رہتی۔ اب اس کو اٹھا رواں بر سر لگ رہا تھا۔ سا لگرہ میں دس بارہ روز باقی تھے کہ پڑوس کا مکان جو کچھ دیر سے خالی پڑا تھا، پنجابیوں کے ایک خاندان نے کرائے پر اٹھا لیا۔ ان کے آٹھ لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔

آٹھ لڑکوں میں سے دو بیا ہے جاپکے تھے۔ باقی اسکول اور کالج میں پڑھتے تھے۔ لڑکی ان چھیوں سے ایک برس بڑی تھی۔ بڑی تونمند، ہٹی کٹی، اپنی عمر سے دواڑھائی برس زیادہ ہی دکھائی دیتی تھی۔ اندر نس پاس کرچکی تھی، اس کے بعد اس کے والدین نے یہ مناسب نہ سمجھا تھا کہ اسے مزید تعلیم دی جائے۔ معلوم نہیں کیوں؟

اس لڑکی کا نام نیسمہ تھا۔ لیکن اپنے نام کی رعایت سے وہ نرم و نازک اور سست رفتار نہیں تھی۔ اس میں بلاکی پھرتی اور گرمی تھی۔ فرخندہ کو اس مہین مہین موچھوں والی لڑکی نے کوٹھے پر سے دیکھا، جب کہ وہ بے حد آتا کر کوئی ناول پڑھنے کی کوشش کرنا چاہتی تھی۔

دونوں کوٹھے ساتھ ساتھ تھے۔ چنانچہ چند جملوں ہی میں دونوں متعارف ہو گئیں۔

فرخندہ کو اس کی شکل و صورت پہلی نظر میں قطعاً پرکشش معلوم نہ ہوئی لیکن جب اس سے تھوڑی دیر گنتگو ہوئی تو اسے اس کا ہر خدو خال پسند آیا۔ موٹے موٹے نقشوں والی تھی، جیسے کوئی جوان لڑکا ہے جس کی میں بھیگ رہی ہیں۔ بڑی صحت مند، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، کشاور سینہ مگر ابھاروں سے بہت حد تک خالی۔ فرخندہ کو اس کے بالائی لب پر مہین مہین بالوں کا غبار خاص طور پر بہت پسند آیا۔ چنانچہ ان میں فوراً دوستی ہو گئی۔

نیسمہ نے اس کے ہاتھ میں کتاب دیکھی تو پوچھا، ”یہ ناول کیسا ہے؟“

فرخندہ نے کہا، ”بڑا ذیل قسم کا ہے۔ ایسے ہی مل گیا تھا۔ میں تہائی سے گھبرائی تھی، سوچا کہ چند صفحے پڑھ لوں۔“

نیسمہ نے یہ ناول فرخندہ سے لیا، واقعی بڑا گھٹیا ساتھا۔ مگر اس نے رات کو بہت دیر جاگ کر پڑھا۔ صح نو کر کے ہاتھ فرخندہ کو واپس بھیج دیا۔ وہ ابھی تک تہائی محسوس کر رہی تھی اور کوئی کام نہیں تھا۔ اس لیے اس نے سوچا کہ چلو چمد اور اتاق دیکھ لوں۔ کتاب کھولی تو اس میں سے ایک رقعہ نکلا جو اس کے نام تھا۔ یہ نیسمہ کا لکھا ہوا تھا۔

اسے پڑھتے ہوئے فرخندہ کے تن بدن میں کپکیاں دوڑتی رہیں۔ فوراً گوٹھے پر گئی۔ نیسمہ نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ اسے بلانا چاہے تو اینٹ جو منڈیر سے اکھڑی ہوئی تھی زور زور سے کسی اور اینٹ کے ساتھ بجادیا کرے۔ وہ فوراً آجائے گی۔

فرخنده نے ایسٹ بجائی تو نیسمہ سچ مجھ ایک منٹ میں کوٹھے پر آگئی۔ شاید وہ اپنے رفتے کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ آتے ہی وہ چار ساڑھے چارفت کی کی منڈیر پر مردانہ انداز میں چڑھی اور دوسرا طرف کو د کر فرخنده سے لپٹ گئی اور چٹ سے اس کے ہونٹوں کا طول بوسے لے لیا۔

فرخنده بہت خوش ہوئی۔ دیر تک دونوں گھل مل کے با تین کرتی رہیں۔ نیسمہ اب اسے اور زیادہ خوبصورت دکھائی دی۔ اس کی ہر اداجو مردانہ طرز کی تھی، اسے بے حد پسند آئی اور وہیں فیصلہ ہو گیا کہ وہ تادم آخر سہیلیاں بنی رہیں گی۔

ساگرہ کا دن آیا تو فرخنده نے اپنی ماں سے اجازت طلب کی کہ وہ اپنی ہمسائی کو جو اس کی سہیلی بن چکی ہے بلا سکتی ہے۔ اس نے اپنے ٹھیٹ لکھنؤی انداز میں کہا، ”کوئی مضائقہ نہیں، بلا لو۔۔۔ لیکن وہ مجھے پسند نہیں۔ میں نے دیکھا ہے لوٹوں کی طرح کد کڑے لگاتی رہتی ہے۔“

فرخنده نے وکالت کی، ”نہیں امی جان۔۔۔ وہ تو بہت اچھی ہے۔ جب ملتی ہے بڑے اخلاق سے پیش آتی ہے۔“

نواب صاحب کی بیگم نے کہا، ”ہو گا، مگر بھی مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں لڑکیوں کی کوئی نزاکت نہیں۔ لیکن تم اصرار کرتی ہو تو بلا لو۔ لیکن اس سے زیادہ ربط نہیں ہونا چاہیے۔“

فرخنده اپنی ماں کے پاس تخت پر بیٹھ گئی اور اس کے ہاتھ سے سرو تالے کر چھالیا کاٹنے لگی، ”لیکن امی جان! ہم دونوں تو قسم کھاچکی ہیں کہ ساری عمر سہیلیاں رہیں گی۔۔۔ انسان کو اپنے وعدے سے کبھی پھرنا نہیں چاہیے۔“

بیگم صاحبہ اصول کی کی تھیں اس لیے انہوں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور صرف یہ کہہ کر خاموش ہو گئیں، ”تم جانو۔۔۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔۔۔“

ساگرہ کے دن نیسمہ آئی۔ اس کی تمیص دھاری دار پولپلیں کی تھی۔ چست پاچجامہ جس میں سے اس کی مضبوط پنڈ لیاں اپنی تمام مضبوطی دکھاری تھیں۔ فرخنده کو وہ اس لباس میں بہت پیاری لگی۔ چنانچہ اس نے اپنی تمام نسوانی نزاکتوں کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور اس سے چند ناز خزرے بھی کیے۔ مثال کے طور پر جب میز پر چائے آئی تو اس نے خود بنا کر نیسمہ کو پیش کی۔ اس نے کہا، ”میں نہیں پیتی“ تو فرخنده

رونے لگی۔ بلکہ اپنے دانتوں سے توڑا تو اس کو مجبور کیا کہ وہ اس کا بھایا حصہ کھائے۔ سموسہ منہ میں رکھا تو اس سے کہا کہ وہ آدھا اس کے منہ کے ساتھ منہ لگا کر کھائے۔

ایک آدھ مرتبہ معمولی معمولی باتوں پر لڑائی ہوتے ہوئے رہ گئی، مگر فرخندہ خوش تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ نیسمہ ہر روز آئے۔ وہ اس سے چہل کرے اور ایسی نرم و نازک لڑائیاں ہوتی رہیں جن سے اس کی ٹھہرے پانی ایسی زندگی میں چند لہریں پیدا ہوتی رہیں۔ لہریں پیدا ہونا شروع ہو گئیں۔ اور ان میں فرخندہ اور نیسمہ دونوں لہرانے لگیں۔ اب فرخندہ نے بھی اپنی امی سے اجازت لے کر نیسمہ کے گھر جانا شروع کر دیا۔ دونوں اس کمرے میں جو نیسمہ کا تھادر وازے بند کر کے گھنٹوں بیٹھی رہتیں۔ جانے کیا باتیں کرتی تھیں؟

ان کی محبت اتنی شدت اختیار کر گئی کہ فرخندہ جب کوئی چیز خریدتی تو نیسمہ کا ضرور خیال رکھتی۔ اس کی امی اس کے خلاف تھی۔

چونکہ اکلوتی تھی، اس لیے وہ اسے رنجیدہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دولت کافی تھی اس لیے کیا فرق پڑتا تھا کہ ایک کے بجائے دو قیصوں کے لیے کپڑا خرید لیا جائے۔ فرخندہ کی دس شلواروں کے لیے سفید ساٹن میں تو نیسمہ کے لیے پانچ شلواروں کے لیے لٹھا لے لیا جائے۔

نیسمہ کو ریشمی ملبوس پسند نہیں تھے۔ اس کو سوتی کپڑے پہننے کی عادت تھی۔ وہ فرخندہ سے یہ تمام چیزوں لیتی مگر شکریہ ادا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتی، صرف مسکرا دیتی اور یہ تحفے تھائے وصول کر کے فرخندہ کو اپنی بانھوں کی مضبوط گرفت میں بھینچ لیتی اور اس سے کہتی، ”میرے ماں باپ غریب ہیں۔ اگر نہ ہوتے تو میں تمہارے خوبصورت بالوں میں ہر روز اپنے ہاتھوں سے سونے کی کنگنھی کرتی، تمہاری سینڈ لیں چاندی کی ہوتیں، تمہارے غسل کے لیے معطر پانی ہوتا، تمہاری بانھوں میں میری بانھیں ہوتیں اور ہم جنت کی تمام منز لیں طے کر کے دوزخ کے دہانے تک پہنچ جاتے۔“

معلوم نہیں وہ جنت سے جہنم تک کیوں پہنچنا چاہتی تھی۔ وہ جب بھی فردوس کا ذکر کرتی تو دوزخ کا ذکر ضرور آتا۔ فرخندہ کو شروع شروع میں تھوڑی سی حیرت اس کے متعلق ضرور ہوئی مگر بعد میں جب وہ نیسمہ سے گھل مل گئی تو اس نے محسوس کیا کہ ان دونوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔ سردی سے نکل اگر آدمی گرمی میں جائے تو اسے ہر لحاظ سے راحت ملتی ہے اور فرخندہ کو یہ حاصل ہوتی تھی۔ ان کی دوستی دن بدن زیادہ استوار ہوتی گئی بلکہ یوں کہیے کہ بڑی شدت اختیار کر گئی جو نواب نوازش علی مر حوم کی بیگم کو بہت کھلتی تھی۔ بعض اوقات وہ یہ محسوس کرتی کہ نیسمہ اس کی موت ہے۔ لیکن یہ احساس اس کو با وقار معلوم نہ ہوتا۔

فرخنده اب زیادہ تر نیسمہ ہی کے پاس رہتی۔ صح اٹھ کر کوٹھے پر جاتی۔ نیسمہ اسے اٹھا کر منڈیر کے اس طرف لے جاتی اور دونوں کمرے میں بندگھٹوں جانے کن باتوں میں مشغول رہتیں۔

فرخنده کی دو سہیلیاں اور بھی تھیں، بڑی مردار قسم کی، یوپی کی رہنے والی تھیں، جسم پھیپھڑا سا، دو پلی ٹوپیاں سی معلوم ہوتی تھیں۔ چونک مارو تو اڑ جائیں۔

نیسمہ سے تعارف ہونے سے پہلے یہ دونوں اس کی جان و گраб فرخنده کو ان سے کوئی لگاؤ نہیں رہا تھا۔ بلکہ چاہتی تھی کہ وہ نہ آیا کریں اس لیے کہ ان میں کوئی جان نہیں تھی۔ نیسمہ کے مقابلے میں وہ نغمی نغمی چوہیاں تھیں جو کتنہ بھی نہیں جانتیں۔

ایک بار اسے مجبوراً اپنی ماں کے ساتھ کراچی جانا پڑا، وہ بھی فوری طور پر۔ نیسمہ گھر میں موجود نہیں تھی، اس کا فرخنده کو بہت افسوس ہوا۔ چنانچہ کراچی پہنچتے ہی اس نے اس کو ایک طویل معدودت نامہ لکھا۔ اس سے پہلے وہ تاریخچہ چکی تھی۔ اس نے خط میں سارے حالات درج کر دیے اور لکھا کہ تمہارے بغیر میری زندگی یہاں بے کیف ہے۔ کاش تم بھی میرے ساتھ آتیں۔

اس کی والدہ کو کراچی میں بہت کام تھے۔ مگر اس نے اسے کچھ بھی نہ کرنے دیا۔ دن میں کم از کم سو مرتبہ کہتی، ”میں اداس ہو گئی ہوں۔ یہ بھی کوئی شہروں میں شہر ہے۔ یہاں کا پانی پی کر میرا ہاضمہ خراب ہو گیا ہے۔۔۔ اپنا کام جلدی ختم کیجیے اور چلیے لاہور۔“

نواب نوازش علی کی بیگم نے سارے کام ادھورے چھوڑے اور واپس چلنے پر رضامند ہو گئی۔ مگر اب فرخنده نے کہا، ”جانا ہے تو ذرا شاپنگ کر لیں۔۔۔ یہاں کپڑا اور دوسری چیزیں سستی اور اچھی ملتی ہیں۔“

شاپنگ ہوئی۔ فرخنده نے اپنی سہیلی نیسمہ کے دس سلیکس کے لیے بہترین ڈیزائن کا کپڑا خریدا، واکنگ شو لیے، ایک گھٹری خریدی، جو نیسمہ کی چوڑی کلائی کے لیے مناسب و موزوں تھی۔۔۔ ماں خاموش رہی کہ وہ ناراض نہ ہو جائے۔

کراچی سے لاہور پہنچی تو سفر کی تکان کے باوجود فوراً نیسمہ سے ملی مگر اس کا منہ سو جا ہوا تھا۔ سخت ناراض تھی کہ وہ اس سے ملے بغیر چلی گئی۔ فرخنده نے بڑی معافیاں مانگیں۔ ہر سطح سے اس کی دلジョئی کی مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ اس پر فرخنده نے زار و قطار رونا شروع کر دیا اور نیسمہ سے

کہا کہ اگر وہ اسی طرح ناراض رہی تو وہ کچھ کھا کر مرجائے گی۔ اس کا فوری اثر ہوا اور نیسمہ نے اس کو اپنے مضبوط بازوں میں سمیٹ لیا اور اس کو چومنے پکپکارنے لگی۔

دیر تک دونوں سہیلیاں کمرہ بند کر کے بیٹھی پیار محبت کی باتیں کرتی رہیں۔ اس دن کے بعد ان کی دوستی اور زیادہ مضبوط ہو گئی۔ مگر فرخندہ کی ماں نے محسوس کیا کہ اس کی اکلوتی بیٹی کی صحت دن بدن خراب ہو رہی ہے۔ چنانچہ اس نے اس کا گھر سے نکلا بند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرخندہ پر ہستیر یا ایسے دورے پڑنے لگے۔

بیگم صاحبہ نے اپنی جان پہچان والی عورتوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ لڑکی کو آسیب ہو گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کوئی جن اس پر عاشق ہے جو اس کو نہیں چھوڑتا۔ چنانچہ فوراً ٹونے ٹوٹکے کیے گئے۔ جھاڑ پھونک کرنے والے بلائے گئے۔ تعزیز گندے ہوئے مگر بے سود۔

فرخندہ کی حالت دن بدن غیر ہوتی گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ عارضہ کیا ہے۔ دن بدن دلبی ہو رہی تھی۔ کبھی گھنٹوں خاموش رہتی۔ کبھی زور زور سے چلانا شروع کر دیتی اور اپنی سہیلی نیسمہ کو یاد کر کے پھروں آنسو بھاتی۔ اس کی ماں جو زیادہ ضعیف الاعتقاد نہیں تھی، اپنی جان پہچان کی عورتوں کی اس بات پر یقین نہیں ہوا کہ لڑکی پر کوئی جن عاشق ہے۔ اس لیے کہ فرخندہ عشق و محبت کی بہت زیادہ باتیں کرتی تھی اور بڑے ٹھنڈے ٹھنڈے سانس بھرتی تھی۔

ایک مرتبہ پھر کو شش کی گئی۔ بڑی دور دور سے جھاڑنے والے بلائے گئے۔ دو داروں بھی کیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ فرخندہ بار بار انتباہ کرتی کہ اس کی سہیلی نیسمہ کو بلا جائے مگر اس کی ماں ٹالتی رہی۔

آخر ایک روز فرخندہ کی حالت بہت بگڑ گئی۔ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کی والدہ جو کبھی باہر نہیں نکلی تھی بر قعہ اوڑھ کر ایک ہمسائی کے ہاں گئی اور اس سے کہا کہ کچھ کرے۔ دونوں بھائی بھاگ فرخندہ کے کمرے میں پہنچیں مگر وہ موجود نہیں تھی۔

نواب نوازش علی مرحوم کی بیگم نے چینا چلانا اور دیوانہ وار ”فرخندہ بیٹی، فرخندہ بیٹی“ کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔ سارا گھر چھان مارا مگر وہ نہ ملی، اس پر وہ اپنے بال نوچنے لگی۔ ہمسائی نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے مگر وہ بر ابر و اویلا کرتی رہی۔

فرخنده نیم دیوالی کے عالم میں اوپر کوٹھے پر کھڑی تھی۔ اس نے منڈیر کی اکھڑی ہوئی اینٹ اٹھائی اور زور زور سے اسے دوسری اینٹ کے ساتھ بجا لیا۔

کوئی نہ آیا۔

اس نے پھر اینٹ کو دوسری اینٹ کے ساتھ ملکر لایا۔ چند لمحات کے بعد ایک خوبصورت نوجوان جو نیسمہ کے چھ کنوارے بھائیوں میں سے سب سے بڑا تھا اور بر ساتی میں بیٹھا بے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا، باہر نکلا۔ اس نے دیکھا منڈیر کے اس طرف ایک دلی پتی نازک اندام اڑکی کھڑی ہے۔ بڑی پریشان حال، بال کھلے ہیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جھی ہیں، آنکھوں میں سیکڑوں زخمی امیگیں سمٹی ہیں۔ قریب آ کر اس نے فرخنده سے پوچھا، ”کسے بلا رہی ہیں آپ؟“

فرخنده نے اس نوجوان کو بڑے گہرے اور دلچسپ غور سے دیکھا، ”میں نیسمہ کو بلا رہی تھی۔“

نوجوان نے صرف اتنا کہا، ”اوہ چلو آؤ!“ اور یہ کہہ کر منڈیر کے اس طرف سے بلکل پچکلی فرخنده کو اٹھایا اور بر ساتی میں لے گیا جہاں وہ امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ دوسرے دن جن غائب ہو گیا۔ فرخنده بالکل ٹھیک تھی۔ اگلے مہینے اس کی شادی نیسمہ کے اس بھائی سے ہو گئی۔ جس میں نیسمہ شریک نہ ہوئی۔

-[42]-

یزید: سعادت حسن منٹو

سن سیتا لیں کے ہنگامے آئے اور گزر گئے۔ بالکل اسی طرح جس طرح موسم میں خلاف معمول چند دن خراب آئیں اور چلے جائیں۔ یہ نہیں کہ کریم داد، مولا کی مرضی سمجھ کر خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے اس طوفان کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔ مخالف قوتوں کے ساتھ وہ کئی بار بھڑاکتا۔ شکست دینے کے لیے نہیں، صرف مقابلہ کرنے کے لیے نہیں۔ اس کو معلوم تھا کہ دشمنوں کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ مگر ہتھیار ڈال دینا وہ اپنی ہی نہیں ہر مرد کی توہین سمجھتا تھا۔

چچ پوچھیے تو اس کے متعلق یہ صرف دوسروں کا خیال تھا، ان کا، جنہوں نے اسے وحشی نما انسانوں سے بڑی جان بازی سے لڑتے دیکھا تھا۔ ورنہ اگر کریمداد سے اس بارے میں پوچھا جاتا کہ مختلف قوتوں کے مقابلے میں ہتھیار ڈالنا کیا وہ اپنی یامردی کی توبین سمجھتا ہے تو وہ یقیناً سوچ میں پڑ جاتا۔ جیسے آپ نے اس سے حساب کا کوئی بہت ہی مشکل سوال کر دیا ہے۔

کریمداد، جمع، تفریق اور ضرب تقسیم سے بالکل بے نیاز تھا۔ سن سینتا ہیں کے ہنگامے آئے اور گزر گئے۔ لوگوں نے بیٹھ کر حساب لگاتا شروع کیا کہ کتنا جانی نقصان ہوا، کتنا مالی، مگر کریمداد اس سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ اس کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا باپ رحیمداد اس جنگ میں کام آیا ہے۔ اس کی لاش خود کریمداد نے اپنے کندھوں پر اٹھائی تھی۔ اور ایک کنوئیں کے پاس گڑھا کھود کر فنا تھی۔

گاؤں میں اور بھی کئی وارداتیں ہوئی تھیں، سینکڑوں جوان اور بوڑھے قتل ہوئے تھے، کئی لڑکیاں غائب ہو گئی تھیں۔ کچھ کی بہت ہی ظالمانہ طریقے پر بے آبروئی ہوئی تھی۔ جس کے بھی یہ زخم آئے تھے، روتا تھا، اپنے پھوٹے نصیبوں پر اور دشمنوں کی بے رحمی پر، مگر کریمداد کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ لکلا۔ اپنے باپ رحیمداد کی شہزادی پر اسے ناز تھا۔ جب وہ پیچیں تیس بر چھیوں اور کھلائیوں سے مسلح ہوا یوں کا مقابلہ کرتے کرتے نڈھال ہو کر گر پڑا تھا اور کریمداد کو اس کی موت کی خبر ملی تھی تو اس نے اس کی روح کو مخاطب کر کے صرف اتنا کہا تھا، ”یا تم نے یہ ٹھیک نہ کیا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک ہتھیار اپنے پاس ضرور رکھا کرو۔“

اور اس نے رحیمداد کی لاش اٹھا کر، کنوئیں کے پاس گڑھا کھود کر فادی تھی اور اس کے پاس کھڑے ہو کر فاتحہ کے طور پر صرف یہ چند الفاظ کہے تھے، ”گناہ ثواب کا حساب خدا جانتا ہے۔ اچھا جھے بہشت نصیب ہو!“

رحیمداد جونہ صرف اس کا باپ تھا بلکہ ایک بہت بڑا دوست بھی تھا، بلوائیوں نے بڑی بے دردی سے قتل کیا تھا۔ لوگ جب اس کی افسوسناک موت کا ذکر کرتے تھے تو قاتلوں کو بڑی گالیاں دیتے تھے، مگر کریمداد خاموش رہتا تھا۔ اس کی کئی کھڑی فصلیں تباہ ہوئی تھیں۔ دو مکان جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ مگر اس نے اپنے ان نقصانوں کا کبھی حساب نہیں لگایا تھا۔ وہ کبھی کبھی صرف اتنا کہا کرتا تھا، ”جو کچھ ہوا ہے، ہماری اپنی غلطی سے ہوا ہے۔“ اور جب کوئی اس سے اس غلطی کے متعلق استفسار کرتا تو وہ خاموش رہتا۔

گاؤں کے لوگ ابھی سوگ میں مصروف تھے کہ کریمداد نے شادی کر لی۔ اسی ٹیکر جیناں کے ساتھ جس پر ایک عرصے سے اس کی نگاہ تھی۔ جیناں سوگوار تھی۔ اس کا شہتیر جیسا کڑیں جوان بھائی بلوؤں میں مارا گیا تھا۔ ماں، باپ کی موت کے بعد ایک صرف وہی اس کا سہارا

تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جیناں کو کریم داد سے بے پناہ محبت تھی مگر بھائی کی موت کے غم نے یہ محبت اس کے دل میں سیاہ پوش کر دی تھی، اب ہر وقت اس کی سدا مسکراتی آنکھیں نمناک رہتی تھیں۔

کریم داد کو رونے دھونے سے بہت چڑھتی۔ وہ جیناں کو جب بھی سوگ زدہ حالت میں دیکھتا تو دل ہی دل میں بہت کڑھتا۔ مگر وہ اس سے اس بارے میں کچھ کہتا نہیں تھا، یہ سوچ کر کہ عورت ذات ہے۔ ممکن ہے اس کے دل کو اور بھی دکھ پہنچے، مگر ایک روز اس سے نہ رہا گیا۔ کھیت میں اس نے جیناں کو پکڑ لیا اور کہا، ”مردوں کو کفناۓ دفاترے پورا ایک سال ہو گیا ہے اب تو وہ بھی اس سوگ سے گھبرانے ہوں گے۔۔۔ چھوڑ میری جان! ابھی زندگی میں جانے اور کتنی متیں دیکھنی ہیں۔ کچھ آنسو تو اپنی آنکھوں میں جمع رہنے دیں۔“

جیناں کو اس کی یہ باتیں بہت ناگوار معلوم ہوئی تھیں مگر وہ اس سے محبت کرتی تھی، اس لیے اکیلے میں اس نے کئی گھنٹے سوچ سوچ کر اس کی ان باتوں میں معنی پیدا کیے اور آخر خود کو یہ سمجھنے پر آمادہ کر لیا کہ کریم داد جو کچھ کہتا ہے ٹھیک ہے۔۔۔!

شادی کا سوال آیا تو بڑے بوڑھوں نے مخالفت کی مگر یہ مخالفت بہت ہی کمزور تھی۔ وہ لوگ سوگ منامنا کر اتنے نجیف ہو گئے تھے کہ ایسے معاملوں میں سو فیصدی کامیاب ہونے والی مخالفتوں پر بھی زیادہ دیر تک نہ جئے رہ سکے۔۔۔ چنانچہ کریم داد کا بیاہ ہو گیا۔ باجے گاجے آئے، ہر ستم ادا ہوئی اور کریم داد اپنی محبوبہ جیناں کو دلہن بنانکر گھر لے آیا۔

فسادات کے بعد قریب قریب ایک برس سے سارا گاؤں قبرستان سا بنا تھا۔ جب کریم داد کی برات چلی اور خوب دھوم دھڑ کا ہوا تو گاؤں میں کئی آدمی سہم سہم گئے۔ ان کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ کریم داد کی نہیں، کسی بھوت پریت کی برات ہے۔ کریم داد کے دوستوں نے جب اس کو یہ بات بتائی تو وہ خوب ہنسا۔ ہنستے ہنستے ہی اس نے ایک روز اس کا ذکر اپنی نئی نویلی دلہن سے کہا تو وہ ڈر کے مارے کانپ اٹھی۔

کریم داد نے جیناں کی سوہے چوڑے والی کلاں اپنے ہاتھ میں لی اور کہا، ”یہ بھوت تو اب ساری عمر تمہارے ساتھ چھٹا رہے گا۔۔۔ رحمان سائیں کی جھاڑ پھونک بھی اتار نہیں سکے گی۔“ جیناں نے اپنی مہنڈی میں رچی ہوئی انگلی دانتوں تلے دبا کر اور ذرا شرما کر صرف اتنا کہنا، ”کیسے، تجھے تو کسی سے بھی ڈر نہیں لگتا۔“ کریم داد نے اپنی ہلکی ہلکی سیاہی مائل بھوری موچھوں پر زبان کی نوک پھیری اور مسکرا دیا، ”ڈر بھی کوئی لگنے کی چیز ہے!“

جیناں کا غم اب بہت حد تک دور ہو چکا تھا۔ وہ مان بننے والی تھی۔ کریمداد اس کی جوانی کا نکھار دیکھتا تو بہت خوش ہوتا اور جیناں سے کہتا، ”خدا کی قسم جیناں، تو پہلے کبھی اتنی خوبصورت نہیں تھی۔ اگر تو اتنی خوبصورت اپنے ہونے والے بچے کے لیے بنی ہے تو میری اس سے لڑائی ہو جائے گی۔“ یہ سن کر جیناں شرم کر اپنا ٹھلیا سا پیٹ چادر سے چھپا لیتی۔ کریمداد ہنستا اور اسے چھپاتا، ”چھپاتی کیوں ہواں چور کو۔۔۔ میں کیا جانتا نہیں کہ یہ سب بناوں سلکھار صرف تم نے اسی سور کے بچے کے لیے کیا ہے۔“

جیناں ایک دم سنجیدہ ہو جاتی، ”کیوں گالی دیتے ہو اپنے کو؟“

کریمداد کی سیاہی مائل بھوری موچھیں ہنسی سے تحریر ہرانے لگتیں، ”کریمداد بہت بڑا سور ہے۔“

چھوٹی عید آئی، بڑی عید آئی، کریمداد نے یہ دونوں تہوار بڑے ٹھٹھ سے منائے۔ بڑی عید سے بارہ روز پہلے اس کے گاؤں پر بلوایوں نے حملہ کیا تھا اور اس کا باپ رحیمداد اور جیناں کا بھائی فضل الہی قتل ہوئے تھے، جیناں ان دونوں کی موت کو یاد کر کے بہت روئی تھی، مگر کریمداد کی صد موں کو یاد نہ رکھنے والی طبیعت کی موجودگی میں اتنا غم نہ کر سکی، جتنا سے اپنی طبیعت کے مطابق کرنا چاہیے تھا۔

جیناں کبھی سوچتی تھی تو اس کو بڑا تجھب ہوتا تھا کہ وہ اتنی جلدی اپنی زندگی کا اتنا بڑا صدمہ کیسے بھولتی جا رہی ہے۔ ماں باپ کی موت اس کو قطعاً یاد نہیں تھی۔ فضل الہی اس سے چھ سال بڑا تھا۔ وہی اس کا باپ تھا وہی اس کی ماں اور وہی اس کا بھائی۔ جیناں اچھی طرح جانتی تھی کہ صرف اسی کی خاطر اس نے شادی نہیں کی۔ اور یہ تو سارے گاؤں کو معلوم تھا کہ جیناں ہی کی عصمت بچانے کے لیے اس نے اپنی جان دی تھی۔ اس کی موت جیناں کی زندگی کا یقیناً بہت بڑا حادثہ تھا۔ ایک قیامت تھی جو بڑی عید سے ٹھیک بارہ روز پہلے اس پر یا کیا ٹوٹ پڑی تھی۔ اب وہ اس کے بارے میں سوچتی تھی تو اس کو بڑی حیرت ہوتی تھی کہ وہ اس کے اثرات سے کتنی دور ہوتی جا رہی ہے۔

محرم قریب آیا تو جیناں نے کریمداد سے اپنی پہلی فرمائش کا اظہار کیا۔ اسے گھوڑا اور تعزیتے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ ان کے متعلق بہت کچھ سن چکی تھی۔ چنانچہ اس نے کریمداد سے کہا، ”میں ٹھیک ہوئی تو لے چلو گے مجھے گھوڑا دکھانے؟“

کریمداد نے مسکرا کر جواب دیا، ”تم ٹھیک نہ بھی ہوئیں تو لے چلوں گا۔۔۔ اس سور کے بچے کو بھی!“

جیناں کو یہ گالی بہت ہی بڑی لگتی تھی۔ چنانچہ وہ اکثر بگڑ جاتی تھی۔ مگر کریم داد کی گفتگو کا انداز کچھ ایسا پر خلوص تھا کہ جیناں کی تلخی فوراً ہی ایک ناقابل بیان مٹھاں میں تبدیل ہو جاتی تھی اور وہ سوچتی کہ سور کے پچھے میں کتنا پیار کوت کوت کے بھرا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کی افواہیں ایک عرصے سے اڑ رہی تھیں۔ اصل میں تو پاکستان بننے ہی بات گویا ایک طور پر طے ہو گئی تھی کہ جنگ ہو گی اور ضرور ہو گی۔ کب ہو گی، اس کے متعلق گاؤں میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔ کریم داد سے جب کوئی اس کے متعلق سوال کرتا تو وہ یہ مختصر ساجواب دیتا، ”جب ہونی ہو گی ہو جائے گی۔ فضول سوچنے سے کیا فائدہ!“

جیناں جب اس ہونے والی لڑائی بھڑائی کے متعلق سننی تو اس کے اوسان خطاب ہو جاتے تھے۔ وہ طبعاً بہت ہی امن پسند تھی۔ معمولی تو تو میں سے بھی سخت گھبراتی تھی۔ اس کے علاوہ گزشتہ بلوں میں اس نے کئی کشت و خون دیکھے تھے اور انہی میں اس کا پیارا بھائی فضل الہی کام آیا تھا۔ بے حد سہم کروہ کریم داد سے صرف اتنا کہتی، ”کیمیے، کیا ہو گا!“

کریم داد مسکرا دیتا، ”مجھے کیا معلوم، لڑکا ہو گا یا لڑکی۔“

یہ سن کر جیناں بہت ہی زیچ نکھر ہوتی مگر فوراً ہی کریم داد کی دوسری باتوں میں لگ کر ہونے والی جنگ کے متعلق سب کچھ بھول جاتی۔ کریم داد طاقت ور تھا، نذر تھا، جیناں سے اس کو بے حد محبت تھی۔ بندوق خریدنے کے بعد وہ تھوڑے ہی عرصے میں نشانے کا بہت پاک ہو گیا تھا۔ یہ سب باقی جیناں کو حوصلہ دلاتی تھیں مگر اس کے باوجود ترنجنوں میں جب وہ اپنی کسی خوف زدہ بھولی سے جنگ کے بارے میں گاؤں کے آدمیوں کی اڑائی ہوئی ہولناک افواہیں سننی تو ایک دم سن سی ہو جاتی۔

بختودائی جوہ روز جیناں کو دیکھنے آتی تھی۔ ایک دن یہ خبر لائی کہ ہندوستان والے دریابند کرنے والے ہیں۔ جیناں اس کا مطلب نہ سمجھی۔ وضاحت کے لیے اس نے بختودائی سے پوچھا، ”دریابند کرنے والے ہیں۔۔۔ کون سے دریابند کرنے والے ہیں۔“

بختودائی نے جواب دیا، ”وہ جو ہمارے کھیتوں کو پانی دیتے ہیں۔“

جیناں نے کچھ دیر سوچا اور ہنس کر کہا، ”موسیٰ تم بھی کیا پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو، دریا کون بند کر سکتا ہے۔۔۔ وہ بھی کوئی سوریاں ہیں۔“
بختونے جیناں کے پیٹ پر ہولے ہولے ماش کرتے ہوئے کہا، ”لبی مجھے معلوم نہیں۔۔۔ جو کچھ میں نے سنا تھیں بتادیا۔ یہ بات اب تو
خبروں میں بھی آگئی ہے۔“

”کون سی بات؟“ جیناں کو یقین نہیں آتا تھا۔

بختونے اپنے جھریوں والے ہاتھوں سے جیناں کا پیٹ ٹھوٹتے ہوئے کہا، ”یہی دریا بند کرنے والی۔“ پھر اس نے جیناں کے پیٹ پر اس کی
تمیص کھینچی اور اٹھ کر بڑے ماہر انداز میں کہا، ”اللہ خیر رکھے تو بچہ آج سے پورے دس روز کے بعد ہو جانا چاہیے!“

کریمداد گھر آیا تو سب سے پہلے جیناں نے اس سے دریاؤں کے متعلق پوچھا۔ اس نے پہلے بات ٹالنی چاہی، پر جب جیناں نے کئی بار اپنا
سوال دھرا یا تو کریمداد نے کہا، ”ہاں کچھ ایسا ہی سنا ہے۔“

جیناں نے پوچھا، ”کیا؟“

”یہی کہ ہندوستان والے ہمارے دریا بند کر دیں گے۔“

”کیوں؟“

کریمداد نے جواب دیا، ”کہ ہماری فصلیں تباہ ہو جائیں۔“

یہ سن کر جیناں کو یقین ہو گیا کہ دریا بند کیے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ نہایت بے چارگی کے عالم میں اس نے صرف اتنا کہا، ”کتنے طالم ہیں یہ
لوگ۔“ کریمداد اس دفعہ کچھ دیر کے بعد مسکرا یا، ”ہٹاواں کو، یہ بتاؤ موسیٰ بختو آئی تھی۔“

جیناں نے بے دلی سے جواب دیا، ”آئی تھی!“

”کیا کہتی تھی؟“

”کہتی تھی آج سے پورے دس روز کے بعد بچہ ہو جائے گا۔“

کریمداد نے زور کا نعرہ لگایا، ”زندہ باد!“

جیناں نے اسے پسند نہ کیا اور بڑھا کیا، ”تمہیں خوشی سو جھتی ہے، جانے یہاں کیسی کربلا آنے والی ہے۔“

کریمداد پوپال چلا گیا۔ وہاں قریب قریب سب مرد جمع تھے۔ چودھری نتوکو گھیرے، اس سے دریابند کرنے والی خبر کے متعلق باتیں پوچھ رہے تھے، کوئی پنڈت نہر و کوپیٹ بھر کے گالیاں دے رہا تھا۔ کوئی بد دعائیں مانگ رہا تھا۔ کوئی یہ ماننے ہی سے یکسر منکر تھا کہ دریاؤں کا رخ بدلا جاسکتا ہے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کا یہ خیال تھا کہ جو کچھ ہونے والا ہے وہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔ اسے ٹالنے کے لیے سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ مل کر مسجد میں دعا مانگی جائے۔

کریمداد ایک کونے میں خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ ہندوستان والوں کو گالیاں دینے میں چودھری نتو سب سے پیش پیش تھا۔ کریمداد کچھ اس طرح بار بار اپنی نشست بدل رہا تھا جیسے اسے بہت کوفت ہو رہی ہے۔ سب یک زبان ہو کر یہ کہہ رہے تھے کہ دریابند کرنا بہت ہی اوپھا انتھیار ہے، انتہائی کمینہ پن ہے، رذالت ہے، عظیم ترین ظلم ہے، بدترین گناہ ہے، یزید پن ہے۔

کریمداد دو تین مرتبہ اس طرح کھانا جیسے وہ کچھ کہنے کے لیے خود کو تیار کر رہا ہے۔ چودھری نتو کے منہ سے جب ایک اور لہر موٹی موٹی گالیوں کی انٹھی تو کریمداد چنپ پڑا، ”گالی نہ دے چودھری کسی کو۔“ ماں کی ایک بہت بڑی گالی چودھری نتو کے حلق میں پھنسی کی پھنسی رہ گئی، اس نے پلٹ کر ایک عجیب انداز سے کریمداد کی طرف دیکھا جو سر پر اپنا صافہ ٹھیک کر رہا تھا، ”کیا کہا؟“

کریمداد نے آہستہ مگر مضبوط آواز میں کہا، ”میں نے کہا گالی نہ دے کسی کو۔“

حلق میں پھنسنی ہوئی ماں کی گالی بڑے زور سے باہر نکال کر چودھری نھونے بڑے تیکھے لبجے میں کریم داد سے کہا، ”کسی کو؟ کیا لگتے ہیں وہ تمہارے؟“ اس کے بعد وہ چوپال میں جمع شدہ آدمیوں سے مخاطب ہوا، ”سنا تم لوگوں نے۔۔۔ کہتا ہے گالی نہ دو کسی کو۔۔۔ پوچھو اس سے وہ کیا لگتے ہیں اس کے؟“

کریم داد نے بڑے تحمل سے جواب دیا، ”میرے کیا لگتے ہیں؟ میرے دشمن لگتے ہیں۔“ چودھری کے حلق سے پھٹا پھٹا ساقہ پہ بلند ہوا۔ اس قدر زور سے کہ اس کی موچھوں کے بال بکھر گئے، ”سنا تم لوگوں نے۔۔۔ دشمن لگتے ہیں۔ اور دشمن کو پیار کرنا چاہیے۔ کیوں برخوردار؟“ کریم داد نے بڑے برخوردانہ انداز میں جواب دیا، ”نہیں چودھری! میں یہ نہیں کہتا کہ پیار کرنا چاہیے۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ گالی نہیں دینی چاہیے۔“ کریم داد کے ساتھ ہی اس کا لگنو ٹیا دوست میراں بخش بیٹھا تھا۔ اس نے پوچھا، ”کیوں؟“

کریم داد صرف میراں بخش سے مخاطب ہوا، ”کیا فائدہ ہے یار۔۔۔ وہ پانی بند کر کے تمہاری زمینیں بخربنا چاہتے ہیں۔ اور تم انھیں گالی دے کر یہ سمجھتے ہو کہ حساب بیباق ہوا۔ یہ کہاں کی عقائدی ہے۔ گالی تو اس وقت دی جاتی ہے۔ جب اور کوئی جواب پاس نہ ہو۔“

میراں بخش نے پوچھا، ”تمہارے پاس جواب ہے؟“

کریم داد نے تھوڑے توقف کے بعد کہا، ”سوال میرا نہیں۔ ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں کا ہے۔ اکیلا میرا جواب سب کا جواب نہیں ہو سکتا۔۔۔ ایسے معاملوں میں سوچ سمجھ کر ہی کوئی پختہ جواب تیار کیا جا سکتا ہے۔۔۔ وہ ایک دن میں دریاؤں کا رخ نہیں بدلتے۔ کئی سال لگیں گے۔ لیکن یہاں تو تم لوگ گالیاں دے کر ایک منٹ میں اپنی بھڑاس نکال باہر کر رہے ہو۔“ پھر اس نے میراں بخش کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا، ”میں تو اتنا جانتا ہوں یار کہ ہندوستان کو کمیونی، رذیل اور ظالم کہنا بھی غلط ہے۔“

میراں بخش کے بجائے چودھری نھونے چلایا، ”لو اور سنو؟“

کریم داد، میراں بخش ہی سے مخاطب ہوا، ”دشمن سے میرے بھائی رحم و کرم کی توقع رکھنا بے وقوفی ہے۔ لڑائی شروع ہوا اور یہ رونارویا جائے کہ دشمن بڑے بور کی روپیں استعمال کر رہا ہے۔ ہم چھوٹے بھائیوں کی طرح گراتے ہیں، وہ بڑے گراتا ہے۔ تو اپنے ایمان سے کہو یہ شکایت بھی کوئی شکایت ہے۔ چھوٹا چاقو بھی مارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور بڑا چاقو بھی۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں۔“

میراں بخش کی بجائے چودھری نقو نے سوچنا شروع کیا مگر فوراً ہی جھخلا گیا، ”لیکن سوال یہ ہے کہ وہ پانی بند کر رہے ہیں۔۔۔ ہمیں بھوکا اور پیاسا مارنا چاہتے ہیں۔“

کریم داد نے میراں بخش کے کاندھے سے اپنا ہاتھ علیحدہ کیا اور چودھری نقو سے مخاطب ہوا، ”چودھری جب کسی کو دشمن کہہ دیا تو پھر یہ گلہ کیسا کہ وہ ہمیں بھوکا پیاسا مارنا چاہتا ہے۔ وہ تمہیں بھوکا پیاسا نہیں مارے گا۔ تمہاری ہری بھری زمینیں ویران اور بخوبی نہیں بنائے گا تو کیا وہ تمہارے لیے پلاٹ کی دیگیں اور ثربت کے مٹکے وہاں سے بھیج گا۔ تمہاری سیر، تفریح کے لیے یہاں باعث بھیجے گا۔“

چودھری نقو بھنا گیا، ”یہ تو کیا بکواس کر رہا ہے؟“

میراں بخش نے بھی ہولے سے کریم داد سے پوچھا، ”ہاں یا ریہ کیا بکواس ہے؟“

”بکواس نہیں ہے میراں بخش۔“ کریم داد نے سمجھانے کے انداز میں میراں بخش سے کہا، ”تو ذرا سوچ تو سہی کہ لڑائی میں دونوں فریق ایک دوسرے کو پچھاڑنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے، پہلو ان جب لٹکر لنگوٹ کس کے اکھاڑے میں اتر آئے تو اسے ہر داد استعمال کرنے کا حق ہوتا ہے۔۔۔“

میراں بخش نے اپنا گھٹا ہوا سر ہلایا، ”یہ تو ٹھیک ہے!“

کریم داد مسکرا یا، ”تو پھر دریا بند کرنا بھی ٹھیک ہے۔ ہمارے لیے یہ ظلم ہے، مگر ان کے لیے روایہ۔“

”روایا ہے۔۔۔ جب تیری جیب پیاس کے مارے لٹک کر زمین تک آجائے گی تو میں پھر پوچھوں گا کہ ظلم روایہ یا ناروا۔۔۔ جب تیرے بال بچ انداز کے ایک ایک دانے کو ترسیں گے تو پھر بھی یہ کہنا کہ دریا بند کرنا بالکل ٹھیک تھا۔“

کریم داد نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا، ”میں جب بھی کہوں گا چودھری۔۔۔ تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ صرف وہ ہمارا دشمن ہے۔ کیا ہم اس کے دشمن نہیں۔ اگر ہمارے اختیار میں ہوتا، تو ہم نے بھی اس کا دانہ پانی بند کیا ہوتا۔۔۔ لیکن اب کہ وہ کر سکتا ہے، اور کرنے والا ہے تو ہم ضرور اس کا کوئی توڑ سوچیں گے۔۔۔ بیکار گالیاں دینے سے کیا ہوتا ہے۔۔۔ دشمن تمہارے لیے دودھ کی نہریں

جاری نہیں کرے گا چودھری نھو۔۔۔ اس سے اگر ہوس کا تواہ تمہارے پانی کی ہربوند میں زہر ملادے گا، تم اسے ظلم کھو گے، وحشیانہ پن کھو گے اس لیے کہ مارنے کا یہ طریقہ تمہیں پسند نہیں۔۔۔ عجیب سی بات ہے کہ لڑائی شروع کرنے سے پہلے دشمن سے نکاح کی سی شرطیں بندھوائی جائیں۔۔۔ اس سے کہا جائے کہ دیکھو مجھے بھوکا پیاسانہ مارنا، بندوق سے اور وہ بھی اتنے بور کی بندوق سے، البتہ تم مجھے شوق سے ہلاک کر سکتے ہو۔ اصل بکواس تو یہ ہے۔۔۔ ذرا اٹھنڈے دل سے سوچو۔“

چودھری نھو جنگلہٹ کی آخری حد تک پہنچ گیا، ”برفل کے رکھ میرے دل پر۔“

”یہ بھی میں ہی لاوں۔“ یہ کہہ کر کریم داد ہنسا۔ میراں بخش کے کاندھے پر تھکلی دے کر اٹھا اور چوپال سے چلا گیا۔

گھر کی ڈیورٹھی میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ اندر سے بختو دائی باہر نکلی۔ کریم داد کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پوپلی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

”مبارک ہو کیمی۔ چاند سا بیٹا ہوا ہے، اب کوئی اچھا سانام سوچ اس کا؟“

”نام؟“ کریم داد نے ایک لختے کے لیے سوچا، ”یزید۔۔۔ یزید!“

بختو دائی کامنہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کریم داد نفرے لگاتا اندر گھر میں داخل ہوا۔ جیناں چارپائی پر لیٹی تھی۔۔۔ پہلے سے کسی قدر زرد، اس کے پبلو میں ایک گل گو تھنا سا بچہ چپڑا گلوٹھا چوں رہا تھا۔ کریم داد نے اس کی طرف پیار بھری فخریہ نظروں سے دیکھا اور اس کے ایک گال کو انگلی سے چھیڑتے ہوئے کہا، ”اوے میرے یزید!“

جیناں کے منہ سے ہلکی سی متوجب چیخ نکلی۔۔۔ ”یزید؟“

کریم داد نے غور سے اپنے بیٹے کا ناک نقشہ دیکھتے ہوئے کہا، ”ہاں یزید۔۔۔ یہ اس کا نام ہے۔“

جیناں کی آواز بہت نجف ہو گئی، ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو کیمی۔۔۔ یزید!“

کریم داد مسکرا یا، ”کیا ہے اس میں؟ نام ہی تو ہے!“

جیناں صرف اس قدر کہہ سکی، ”مگر کس کا نام؟“

کریم داد نے سنجیدگی سے جواب دیا، ”ضروری نہیں کہ یہ بھی وہی یزید ہو۔۔۔ اس نے دریا کا پانی بند کیا تھا۔۔۔ یہ کھو لے گا!“

-[43]-

اللہ دتا: سعادت حسن منشو

دو بھائی تھے۔ اللہ رکھا اور اللہ دتا۔ دونوں ریاست پیالہ کے باشدے تھے۔ ان کے آباء و اجداد البتہ لاہور کے تھے مگر جب ان دو بھائیوں کا دادا ملازمت کی تلاش میں پیالہ آیا تو ہیں کا ہوا۔ اللہ رکھا اور اللہ دتا دونوں سرکاری ملازم تھے۔ ایک چیف سیکرٹری صاحب بہادر کا اردنی تھا، دوسرا کنٹرولر آف اسٹورز کے دفتر کا چپر اسی۔

دونوں بھائی ایک ساتھ رہتے تھے تاکہ خرچ کم ہو۔ بڑی اچھی گزر رہی تھی۔ ایک صرف اللہ رکھا کو جو بڑا تھا، اپنے چھوٹے بھائی کے چال چلن کے متعلق شکایت تھی۔ وہ شراب پیتا تھا۔ رشوت لیتا تھا اور کبھی کبھی کسی غریب اور نادار عورت کو پھانس بھی لیا کرتا تھا۔ مگر اللہ رکھا نے ہمیشہ چشم پوشی سے کام لیا تھا کہ گھر کا امن و سکون درہم برہم نہ ہو۔ دونوں شادی شدہ تھے۔ اللہ رکھا کی دو لڑکیاں تھیں۔ ایک بیاہی جا چکی تھی اور اپنے گھر میں خوش تھی۔ دوسری جس کا نام صغری تھا، تیرہ برس کی تھی اور پر ائمہ اسکول میں پڑھتی تھی۔

اللہ دتا کی ایک لڑکی تھی، زینب۔۔۔ اس کی شادی ہو چکی تھی مگر اپنے گھر میں اتنی خوش نہیں تھی۔ اس لیے کہ اس کا خاوند او باش تھا۔ پھر بھی وہ جوں توں بھائے جارہی تھی۔ زینب اپنے بھائی طفیل سے تین سال بڑی تھی۔ اس حساب سے طفیل کی عمر اٹھا رہ انیس برس کے قریب ہوتی تھی۔ وہ لوہے کے ایک چھوٹے سے کارخانے میں کام سیکھ رہا تھا۔ لڑکا ذہین تھا، چنانچہ کام سیکھنے کے دوران میں بھی پندرہ روپے ماہوار سے مل جاتے تھے۔

دونوں بھائیوں کی بیویاں بڑی اطاعت شعار، محنت اور عبادت گزار عورتیں تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہروں کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ زندگی بڑی ہموار گزر رہی تھی کہ ایکا ایکی ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ دونوں بھائیوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کے مال و جان اور عزت و آبرو پر حملہ ہو گا اور انھیں افراتفری اور کسپر سی کے عالم میں ریاست پیالہ چھوڑنا پڑے گی۔۔۔ مگر ایسا ہوا۔

دونوں بھائیوں کو قطعاً معلوم نہیں کہ اس خونیں طوفان میں کون سادر خست گرا، کون سے درخت سے کون سی ٹھنی ٹوٹی۔۔۔ جب ہوش و حواس کسی قدر درست ہوئے تو چند حقیقیں سامنے آئیں اور وہ لرز گئے۔ اللہ رکھا کی لڑکی کا شوہر شہید کر دیا گیا تھا اور اس کی بیوی کو بلوائیوں نے بڑی بے دردی سے ہلاک کر دیا تھا۔ اللہ دتا کی بیوی کو بھی سکھوں نے کرپانوں سے کاٹ ڈالا تھا۔ اسکی لڑکی زینب کا بد چلن شوہر بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

رونادھونا بیکار تھا۔ صبر شکر کر کے بیٹھ رہے۔ پہلے تو کمپوں میں گلتے سڑتے رہے۔ پھر گلی کوچوں میں بھیک مانگا کیے۔ آخر خدا نے سنی۔ اللہ دتا کو گوجرانوالہ میں ایک چھوٹا سا مشکلتہ مکان سرچھانے کو مل گیا۔ طفیل نے دوڑھوپ کی تواسے کام مل گیا۔

اللہ رکھا لہور ہی میں دیر تک در بدر پھر تارہا۔ جوان لڑکی ساتھ تھی۔ گویا ایک پہاڑ کا پہاڑ اس کے سر پر تھا۔ یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس غریب نے کس طرح ڈیڑھ برس گزارا۔ بیوی اور بڑی لڑکی کا غم وہ بالکل بھول چکا تھا۔ قریب تھا کہ وہ کوئی خطرناک قدم اٹھائے کہ اسے ریاست پیالہ کے ایک بڑے افسر مل گئے جو اس کے بڑے مہربان تھے۔ اس نے ان کو اپنی حالت زار الف سے لے کر یہ تک کہہ سنائی۔ آدمی رحم دل تھا۔ اس کو بڑی وقت کے بعد لہور کے ایک عارضی دفتر میں اچھی ملازمت مل گئی تھی، چنانچہ انہوں نے دوسرے روز ہی اس کو چالیس روپیہ ماہوار پر ملازم رکھ لیا اور ایک چھوٹا سا کوارٹر بھی رہائش کے لیے دوا دیا۔

اللہ رکھا نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے اس کی مشکلات دور کیں۔ اب وہ آرام سے سانس لے سکتا تھا اور مستقبل کے متعلق اطمینان سے سوچ سکتا تھا۔ صغیر بڑے سلیقے والی سگھڑ لڑکی تھی، سارا دن گھر کے کام کا ج میں مصروف رہتی۔ ادھر ادھر سے لکڑیاں چن کے لاتی۔ چو لہا سلگاتی اور مٹی کی ہندیاں میں ہر روز اتنا سالن پکاتی جو دو وقت کے لیے پورا ہو جائے۔ آٹا گندھتی۔ پاس ہی تصور تھا، وہاں جا کر روٹیاں لگو لیتی۔

تہائی میں آدمی کیا کچھ نہیں سوچتا۔ طرح طرح کے خیالات آتے ہیں۔ صغیری عام طور پر دن میں تہاہوتی تھی اور اپنی بہن اور ماں کو یاد کر کے آنسو بھاتی رہتی تھی، پر جب باپ آتا تو وہ اپنی آنکھوں میں سارے آنسو خشک کر لیتی تھی تاکہ اس کے زخم ہرے نہ ہوں۔ لیکن وہ

اتنا جانتی تھی کہ اس کا باپ اندر ہی اندر گلا جا رہا ہے۔ اس کا دل ہر وقت رو تارہتا ہے مگر وہ کسی سے کہتا نہیں۔ صغیری سے بھی اس نے کبھی اس کی ماں اور بہن کا ذکر نہیں کیا تھا۔

زندگی افتاب و خیز اس گزر رہی تھی۔ ادھر گو جرانوالہ میں اللہ دتا اپنے بھائی کے مقابلہ میں کسی قدر خوش حال تھا، کیوں کہ اسے بھی ملازمت مل گئی تھی اور زینب بھی تھوڑا بہت سلائی کام کر لیتی تھی۔ مل ملا کے کوئی ایک سورو پے ماہوار ہو جاتے تھے جو تینوں کے لیے بہت کافی تھے۔

مکان چھوٹا تھا، مگر ٹھیک تھا۔ اوپر کی منزل میں طفیل رہتا تھا، پچھلی منزل میں زینب اور اس کا باپ۔ دونوں ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اللہ دتا سے زیادہ کام نہیں کرنے دیتا تھا۔ چنانچہ منہ اندھیرے اٹھ کروہ سخن میں جھاڑو دے کر چو لہا سلاگا دیتا تھا کہ زینب کا کام کچھ ہلاکا ہو جائے۔ وقت ملتا تو دو تین گھنٹے بھر کر گھر و پنجی پر رکھ دیتا تھا۔ زینب نے اپنے شہید خاوند کو کبھی یاد نہیں کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس کی زندگی میں کبھی تھا ہی نہیں۔ وہ خوش تھی۔ اپنے باپ کے ساتھ بہت خوش تھی۔ بعض اوقات وہ اس سے لپٹ جاتی تھی۔۔۔ طفیل کے سامنے بھی اور اس کو خوب چومتی تھی۔

صغیری اپنے باپ سے ایسے چہل نہیں کرتی تھی۔۔۔ اگر ممکن ہوتا تو وہ اس سے پردہ کرتی۔ اس لیے نہیں کہ وہ کوئی نامحرم تھا۔ نہیں۔۔۔ صرف احترام کے لیے۔۔۔ اس کے دل سے کئی دفعہ یہ دعا ٹھتی تھی، ”یا پروردگار۔۔۔ میرا باپ میرا جنازہ اٹھائے۔“

بعض اوقات کئی دعائیں اللہ ثابت ہوتی ہیں۔ جو خدا کو منظور تھا، وہی ہونا تھا۔ غریب صغیری کے سر پر غم و اندوہ کا ایک اور پہاڑ ٹوٹنا تھا۔ جوں کے مہینے دوپہر کو دفتر کے کسی کام پر جاتے ہوئے تیقی ہوئی سڑک پر اللہ رکھا کو ایسی لوگی کہ بے ہوش ہو کر گرپڑا۔ لوگوں نے اٹھایا۔ ہسپتال پہنچایا مگر دواداروں نے کوئی کام نہ کیا۔ صغیری باپ کی موت کے صدمے سے نیم پاگل ہو گئی۔ اس نے قریب قریب آدھے بال نوچ ڈالے۔ ہمسایوں نے بہت دم دلا سادیا مگر یہ کارگر کیسے ہوتا۔۔۔ وہ تو ایسی کشتمی کے مانند تھی جس کا باد بان ہونہ کوئی پتوار اور بیچ منجد حمار کے آن پھنسنی ہو۔

پیالہ کے وہ افسر جنہوں نے مر حوم اللہ رکھا کو ملازمت دلوائی تھی، فرشتہ رحمت ثابت ہوئے۔ ان کو جب اطلاع میں تودھ لے آئے۔ سب سے پہلے انہوں نے یہ کام کیا کہ صغیری کو موڑ میں بٹھا کر گھر چھوڑ آئے اور بیوی سے کہا کہ وہ اس کا خیال رکھے۔ پھر ہسپتال میں جا کر انہوں نے اللہ رکھا کے غسل وغیرہ کا وہیں انتظام کیا اور دفتر والوں سے کہا کہ وہ اس کو دفن آئیں۔

اللہ دتا کو اپنے بھائی کے انتقال کی خبر بڑی دیر کے بعد ملی۔ بہر حال وہ لا ہور آیا اور پوچھتا پا چھتا وہاں پہنچ گیا جہاں صغری تھی۔ اس نے اپنی بھتیجی کو بہت دم دلا سادیا، بہلایا، سینے کے ساتھ لگایا، پیار کیا، دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کیا۔ بہادر بننے کو کہا، مگر صغری کے پھٹے ہوئے دل پر ان تمام باتوں کا کیا اثر ہوتا۔ غریب خاموش اپنے آنسو دوپٹے میں خشک کرتی رہی۔

اللہ دتا نے افسر صاحب سے آخر میں کہا، ”میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ میری گردن آپ کے احسانوں تلے ہمیشہ دبی رہے گی۔ مرحوم کی تجهیز و تکفین کا آپ نے بندوبست کیا۔ پھر یہ بچی جو بالکل بے آسرار ہے تھی، اس کو آپ نے اپنے گھر میں جگہ دی۔۔۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے۔۔۔ اب میں اسے اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں۔ میرے بھائی کی بڑی قیمتی نشانی ہے۔“

افسر صاحب نے کہا، ”ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن تم ابھی اسے کچھ دیر اور یہاں رہنے دو۔۔۔ طبیعت سنجل جائے تو لے جانا۔“

اللہ دتا نے کہا، ”حضور! میں نے ارادہ کیا ہے کہ اس کی شادی اپنے لڑکے سے کروں گا اور بہت جلد!“

افسر صاحب بہت خوش ہوئے، ”بڑا نیک ارادہ ہے۔۔۔ لیکن اس صورت میں جب کہ تم اس کی شادی اپنے لڑکے سے کرنے والے ہو، اس کا اس گھر میں رہنا مناسب نہیں، تم شادی کا بندوبست کرو۔ مجھے تاریخ سے مطلع کر دینا۔ خدا کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

بات درست تھی۔ اللہ دتا اپس گو جرانوالہ چلا گیا۔ زینب اس کی غیر موجودگی میں بڑی اداس ہو گئی تھی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو وہ اس سے لپٹ گئی اور کہنے لگی کہ اس نے اتنی دیر کیوں لگائی؟

اللہ دتا نے پیار سے اسے ایک طرف ہٹایا، ”ارے بابا، آنا جانا کیا ہے۔۔۔ قبر پر فاتح پڑھنی تھی۔ صغری سے ملنا تھا، اسے یہاں لانا تھا۔“

زینب نہ معلوم کیا سوچنے لگی۔ ”صغری کو یہاں لانا تھا۔“ ایک دم چونک کر۔ ”ہاں۔۔۔ صغری کو یہاں لانا تھا۔ پروہ کہاں ہے؟؟“

”وہیں ہے۔۔۔ پیالے کے ایک بڑے نیک دل افسر ہیں، ان کے پاس ہے۔ انھوں نے کہا جب تم اس کی شادی کا بندوبست کر لو گے تو لے جانا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے بیڑی سلاگائی۔

زینب نے بڑی دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا، ”اس کی شادی کا بندوبست کر رہے ہو۔۔۔ کوئی لڑکا ہے تمہاری نظر میں؟“

اللہ دتا نے زور کا کش لگایا، ”ارے بھائی، اپنا طفیل۔۔۔ میرے بڑے بھائی کی صرف ایک ہی نشانی تو ہے۔۔۔ میں اسے کیا غیر وہ کے حوالے کر دوں گا؟“

زینب نے ٹھنڈی سانس بھری، ”تو صغری کی شادی تم طفیل سے کرو گے؟“

اللہ دتا نے جواب دیا، ”ہاں۔۔۔ کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“

زینب نے بڑے مضبوط لمحہ میں کہا، ”ہاں۔۔۔ اور تم جانتے ہو کیوں ہے۔۔۔ یہ شادی ہرگز نہیں ہوگی!“

اللہ دتا مسکرا یا۔۔۔ زینب کی ٹھوڑی پکڑ کر اس نے اس کامنہ چوما، ”پلگی۔۔۔ ہربات پر شک کرتی ہے۔۔۔ اور باتوں کو چھوڑ، آخر میں تمہارا باپ ہوں۔۔۔“

زینب نے بڑے زور سے ہونہ کی، ”باپ!“ اور اندر کمرے میں جا کر رونے لگی۔

اللہ دتا اس کے پیچھے گیا اور اس کو پیکارنے لگا۔

دن گزرتے گئے۔ طفیل فرمانبردار لڑکا تھا۔ جب اس کے باپ نے صغری کی بات کی تودہ فوراً آن گیا۔ آخر تین چار میینے کے بعد تاریخ مقرر ہو گئی۔ افسر صاحب نے فوراً صغری کے لیے ایک بہت اچھا جوڑ اسلوایا جو اسے شادی کے دن پہننا تھا۔ ایک انگوٹھی بھی لے دی۔ پھر اس نے محلے والوں سے اپیل کی کہ وہ ایک یتیم لڑکی کی شادی کے لیے جو بالکل بے سہارا ہے، حسب توفیق کچھ دیں۔ صغری کو قریب قریب سمجھی جانتے تھے اور اس کے حالات سے واقف تھے، چنانچہ انہوں نے مل ملا کر اس کے لیے بڑا اچھا جہیز تیار کر دیا۔

صغری دلہن بنی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ تمام دکھ جمع ہو گئے ہیں اور اس کو پیس رہے ہیں۔ بہر حال، وہ اپنے سرال پکنچی جہاں اس کا استقبال زینب نے کیا، کچھ اس طرح کہ صغری کو اسی وقت معلوم ہو گیا کہ وہ اس کے ساتھ بہنوں کا ساسلوک نہیں کرے گی بلکہ ساس کی

طرح پیش آئے گی۔ صغری کا اندریشہ درست تھا۔ اس کے ہاتھوں کی مہندی ابھی اچھی طرح اترنے بھی نہ پائی تھی کہ زینب نے اس سے نوکروں کے کام لینے شروع کر دیے۔ جھاڑ وہ دیتی، برتن وہ ماخحتی، چولہا وہ جھونکتی، پانی وہ بھرتی۔ یہ سب کام وہ بڑی پھرتی اور بڑے سلیقے سے کرتی لیکن پھر بھی زینب خوش نہ ہوتی۔ بات بات پر اس کو ڈامٹی ڈپٹی، جھڑ کتی رہتی۔

صغری نے دل میں تہیہ کر لیا تھا، وہ یہ سب کچھ برداشت کرے گی اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے گی، کیوں کہ اگر اسے یہاں سے دھکا مل گیا تو اس کے لیے اور کوئی مذکانہ نہیں تھا۔

اللہ دتا کا سلوک البتہ اس سے بر انہیں تھا۔ زینب کی نظر بچا کر کبھی کبھار وہ اس کو پیار کر لیتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ کچھ فکر نہ کرے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ صغری کو اس سے بہت ڈھارس ہوتی۔ زینب جب کبھی اپنی کسی سیمیلی کے ہاں جاتی اور اللہ دتا اتفاق سے گھر پر ہوتا تو وہ اس سے دل کھول کر پیار کرتا، اس سے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتا، کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا۔ اس کے واسطے اس نے جو چیزیں چھپا کر کھی ہوتی تھیں، دیتا اور سینے کے ساتھ لگا کر اس سے کہتا، ”صغری، تم بڑی پیاری ہو!“

صغری جھینپ جاتی۔ دراصل وہ اتنے پر جوش پیار کی عادی نہیں تھی۔ اس کا مر حوم باپ اگر کبھی اسے پیار کرنا چاہتا تو صرف اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا کر تھا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا دیا کرتا تھا، ”خدامیری بیٹی کے نصیب اچھے کرے۔“

صغری طفیل سے بہت خوش تھی۔ وہ بڑا اچھا خاوند تھا۔ جو کہا تھا، اس کے حوالے کر دیتا تھا، مگر صغری زینب کو وہ دیتی تھی، اس لیے کہ وہ اس کے قہر و غضب سے ڈرتی تھی۔ طفیل سے صغری نے زینب کی بد سلوکی اور اس کے ساس ایسے بر تاؤ کا کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ صلح کل تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے باعث گھر میں کسی قسم کی بد مزگی پیدا ہو۔ اور بھی کئی باتیں تھیں جو وہ طفیل سے کہنا چاہتی تو کہہ دیتی مگر اسے ڈر تھا کہ طوفان برپا ہو جائے گا۔ اور تو اس میں سے بچ کر نکل جائیں گے مگر وہ اکیلی اس میں پھنس جائے گی، اور اس کی تاب نہ لاسکے گی۔

یہ خاص باتیں اسے چند روز ہوئے معلوم ہوئی تھیں اور وہ کانپ کانپ گئی تھی۔ اب اللہ دتا اسے پیار کرنا چاہتا تو وہ الگ ہٹ جاتی، یادو ڈر کر اوپر چلی جاتی، جہاں وہ اور طفیل رہتے تھے۔

طفیل کو جمعہ کی چھٹی ہوتی تھی۔ اللہ دتا کو اتوار کی۔ اگر زینب گھر پر ہوتی تو وہ جلدی جلدی کام کا ج ختم کر کے اوپر چلی جاتی۔ اگر اتفاق سے اتوار کو زینب کہیں باہر گئی ہوتی تو صغریٰ کی جان پر بھی رہتی۔ ڈر کے مارے اس سے کام نہ ہوتا، لیکن زینب کا خیال آتا تو اسے مجبوراً کاپنے ہاتھوں سے دھڑکتے دل سے طوعاً و کرہاً سب کچھ کرنا پڑتا۔ اگر وہ کھانا وقت پر نہ پکائے تو اس کا خاوند بھوکار ہے کیوں کہ وہ ٹھیک بارہ بجے اپنا شاگر دروٹی کے لئے بیجھ دیتا تھا۔

ایک دن اتوار کو جب کہ زینب گھر پر نہیں تھی، اور وہ آٹا گوند رہی تھی، اللہ دتا پیچھے سے دبے پاؤں آیا اور کھلنڈرے انداز میں اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ وہ ترپ کر اٹھی، مگر اللہ دتا نے اسے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ صغریٰ نے چیننا شروع کر دیا مگر وہاں سننے والا کون تھا۔ اللہ دتا نے کہا، ”شور مت مچا۔ یہ سب بے فائدہ ہے۔۔۔ چلو آؤ!“

وہ چاہتا تھا کہ صغریٰ کو اٹھا کر اندر لے جائے۔ کمزور تھی مگر خدا جانے اس میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ اللہ دتا کی گرفت سے نکل گئی اور ہانپتی کاپنی اور پہنچ گئی۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے اندر سے کٹدی چڑھادی۔

تحوڑی دیر کے بعد زینب آگئی۔ اللہ دتا کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اندر کمرے میں لیٹ کر اس نے زینب کو پکارا۔ وہ آئی تو اس سے کہا۔ ”ادھر آؤ، میری ٹانگیں دباؤ۔۔۔ زینب اچک کر پینگ پر بیٹھ گئی اور اپنے باپ کی ٹانگیں دبانے لگیں۔۔۔ تحوڑی دیر کے بعد دونوں کے سانس تیز تیز چلنے لگے۔

زینب نے اللہ دتا سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ آج تم اپنے آپ میں نہیں ہو؟“

اللہ دتا نے سوچا کہ زینب سے چھپانا ضرور ہے، چنانچہ اس نے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ زینب آگ بگولا ہو گئی، ”کیا ایک کافی نہیں تھی۔۔۔ تمہیں تو شرم نہ آئی، پر اب تو آئی چاہیے تھی۔۔۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہو گا، اسی لیے میں شادی کے خلاف تھی۔۔۔ اب سن لو کہ صغریٰ اس گھر میں نہیں رہے گی!“

اللہ دتا نے بڑے مسکین لجھے میں پوچھا، ”کیوں؟“

زینب نے کھلے طور پر کہا، ”میں اس گھر میں اپنی سوت دیکھنا نہیں چاہتی!“

اللہ دتا کا حلق خشک ہو گیا۔ اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔

زینب باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ صغری صحن میں جھاؤ دے رہی ہے۔ چاہتی تھی کہ اس سے کچھ کہے مگر خاموش رہی۔

اس واقعے کو دو مہینے گزر گئے۔ صغری نے محسوس کیا کہ طفیل اس سے کچھ کھپار ہتا تھا۔ ذرا ذرا اسی بات پر اس کو شک کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ آخر ایک دن آیا کہ اس نے طلاق نامہ اس کے ہاتھ میں دیا اور گھر سے باہر نکال دیا۔

-[44]-

چودھویں کا چاند: سعادت حسن منظو

اکثر لوگوں کا طرزِ زندگی، ان کے حالات پر منحصر ہوتا ہے اور بعض بیکار اپنی تقدیر کارونا روتے ہیں۔ حالانکہ اس سے حاصل وصول کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتے ہیں اگر حالات بہتر ہوتے تو وہ ضرور دنیا میں کچھ کر دکھاتے۔ پیشتر ایسے بھی ہیں جو مجبور یوں کے باعث قسمت پر شاکر رہتے ہیں۔ ان کی زندگی ان ٹرام کاروں کی طرح ہے جو ہمیشہ ایک ہی پڑی پر چلتی رہتی ہیں۔ جب کنڈم ہو جاتی ہیں تو انہیں محض لوہا سمجھ کر کسی کبایزی کے پاس فروخت کر دیا جاتا ہے۔

ایسے انسان بہت کم ہیں جنہوں نے حالات کی پرواہ کرتے ہوئے زندگی کی باغ ڈور اپنے ہاتھ میں سنبھال لی۔ ٹامسون و لسن بھی اسی قبل سے تھا۔ اس نے اپنی زندگی بدلنے کیلئے انوکھا تقدم اٹھایا، پر اس کی منزل کا چونکہ کوئی بتا نہیں تھا، اس لیے اس کی کامیابی کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل تھا۔

اس کے اس انوکھے پن کے متعلق میں نے بہت کچھ سنा۔ سب سے پہلے لوگ یہی کہتے کہ وہ خلوت پسند ہے لیکن میں نے دل میں تھیہ کر لیا کہ کسی نہ کسی حیلے اسے اپنی داستانِ زندگی بیان کرنے پر آمادہ کر لوں گا کیونکہ مجھے دوسرے آدمیوں کے بیان کی صداقت پر اعتماد نہیں تھا۔

میں چند روز کے لیے ایک صحت افرامقام پر گیا، وہیں اس سے ملاقات ہوئی۔ میں دریا کنارے اپنے میزبان کے ساتھ کھڑا تھا کہ وہ ایک دم پکار اٹھا، ”لسن!“

میں نے پوچھا، ”کہاں ہے؟“

میرے میزبان نے جواب دیا، ”ارے بھتی! وہی جو منڈیر پر نیلی قمیص پہنے ہماری طرف پیٹھ کیے بیٹھا ہے۔“

میں نے اس کی طرف دیکھا اور مجھے نیلی قمیص اور سفید بالوں والا سر نظر آیا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ وہ مڑ کر دیکھے اور ہم اسے سیر و تفریح کے لیے ساتھ لے جائیں۔ اس وقت سورج کا عکس دریا میں ڈوب رہا تھا۔ سیر کرنے والے چچمار ہے تھے۔ اتنے میں گرجے کی یک آہنگ گھٹیاں بختے لگیں۔ میں اس وقت قدرت کی دل فریبیوں سے اس قدر مسحور ہو چکا تھا کہ لسن کو اپنی طرف آتے نہ دیکھ سکا۔ جب وہ میرے پاس سے گزر ا تو میرے دوست نے اسے روک لیا اور اس کا مجھ سے تعارف کرایا۔ اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا، لیکن کسی قدر بے اعتنائی سے۔۔۔ میرے دوست نے اس کو محسوس کیا اور اس کو شراب کی دعوت دی۔

مدعو کیے جانے پر وہ مسکرا یا۔ اگرچہ اس کے دانت خوبصورت نہ تھے پھر بھی اس کی مسکراہٹ دلکش تھی۔۔۔ وہ نیلی قمیص اور خاکستری پتلون پہنے تھا جو کسی حد تک میلی تھی۔ اس کے لباس کو اس کے جسم کی ساخت سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔ اس کا چہرہ لمبوڑا، پتلے ہونٹ اور آنکھیں بھورے رنگ کی تھیں۔ چہرے کے خطوط نمایاں، جن سے نمایاں تھا کہ جوانی میں وہ ضرور قبول صورت ہو گا۔ وضع قطع کے اعتبار سے وہ کسی بیمه کمپنی کا اینجینر معلوم ہوتا تھا۔

ہم چھل قدمی کرتے، ایک ریستوران میں پہنچ کر، اس سے ملحقة باغیچے میں بیٹھ گئے اور بیرے کو شراب لانے کے لیے کہا۔ ہوٹل والے کی بیوی بھی وہاں موجود تھی۔ ادھیر پن کی وجہ سے اب اس میں وہ بات نہیں رہی لیکن چہرے کا نکھاراب بھی گزری ہوئی کرداری جوانی کی چغلیاں کھارہاتھا۔ تیس سال پہلے بڑے بڑے آرٹسٹ اس کے دیوانے تھے، اس کی بڑی بڑی شرابی آنکھوں اور شہد بھری مسکراہٹوں میں عجب دل کشی تھی۔

ہم تینوں بیٹھے یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ چونکہ موضوع دلچسپ نہیں تھے، اس لیے و سن تھوڑی دیر کے بعد رخصت مانگ کر چلا گیا۔ ہم بھی اس کے رخصت ہونے پر اداس ہو گئے۔ راستے میں میرے دوست نے و سن کے بارے میں کہا، ”مجھے تو تمہاری سنائی ہوئی کہانی بے سرو پا معلوم ہوتی ہے۔“

”کیوں؟“

”وہ اس قسم کی حرکت کا مر تکب نہیں ہو سکتا۔“

اس نے کہا، ”کوئی شخص کسی کی فطرت کے متعلق صحیح اندازہ کیسے لگا سکتا ہے؟“

”مجھے تو وہ عام انسان دکھائی دیتا ہے۔ جو چند محفوظ کفالتوں کے سہارے کاروبار سے علیحدہ ہو چکا ہے۔“

”تم یہی سمجھو، ٹھیک ہے۔“

دوسرے دن دریا کنارے و سن ہمیں پھر دکھائی دیا۔ بھورے رنگ کا لباس پہنے، دانتوں میں پاسپ دبائے کھڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پھرے کی جھریلوں اور سفید بالوں سے بھی جوانی پھوٹ رہی ہے۔ ہم کپڑے اتار کر پانی کے اندر چلے گئے۔ جب میں نہا کر باہر نکلا تو و سن زمین پر اونڈھے منہ لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ میں سکریٹ سلاگا کر اس کے پاس گیا۔ اس نے کتاب سے نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھا اور پوچھا، ”بس، نہا چکے۔“

میں نے جواب دیا، ”ہاں۔۔۔ آج تواطف آگیا۔۔۔ دنیا میں اس سے بہتر نہانے کی اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔۔۔ تم یہاں کتنی مدت سے ہو؟“

اس نے جواب دیا، ”پندرہ برس سے۔“

یہ کہہ کر وہ دریا کی مچتی ہوئی نیلی لہروں کی طرف دیکھنے لگا، اس کے باریک ہونٹوں پر لطیف سی مسکراہٹ کھینے لگی، ”پہلی بار یہاں آتے ہی مجھے اس جگہ سے محبت ہو گئی۔۔۔ تمہیں اس جرمن کا قصہ معلوم ہے، جو ایک بار یہاں لنج کھانے آیا اور یہیں کا ہو کے رہ گیا۔۔۔ وہ چالیس سال یہاں رہا۔۔۔ میرا بھی یہی حال ہو گا۔ چالیس برس نہیں تو پچھیں تو کہیں نہیں گئے۔“

میں چاہتا تھا کہ وہ اپنی گفتگو جاری رکھی۔ اس کے الفاظ سے ظاہر تھا کہ اس کے افسانے کی حقیقت ضرور کچھ ہے۔ اتنے میں میرا دوست بھیگا ہوا ہماری طرف آیا۔ بہت خوش تھا کیونکہ وہ دریا میں ایک میل تیر کر آ رہا تھا۔ اس کے آتے ہی ہماری گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ اور بات ادھوری رہ گئی۔ اس کے بعد وہ لسن سے متعدد بار ملاقات ہوئی، اس کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتیں۔ وہ اس جزیرے کے چھپے سے چھپے سے واقف تھا۔

ایک دن چاندنی رات کا لطف اٹھانے کے بعد، میں نے اور میرے دوست نے سوچا کہ چلو موئی سلاادو کی پہاڑی کی سیر کریں۔ میں نے وہ لسن سے کہا، ”آؤ یار تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔“ وہ لسن نے میری دعوت قبول کر لی۔ لیکن میرا دوست ناسازی طبع کا بہانہ کر کے ہم سے جدا ہو گیا۔ خیر، ہم دونوں پہاڑی کی جانب چل دیئے اور اس سیر کا خوب لطف اٹھایا۔ شام کے دھنڈ لکھے میں تھکے ماندے، بھوکے سرانے میں آئے۔

کھانے کا انتظام پہلے ہی کر رکھا تھا جو بہت لذیذ ثابت ہوا۔ شراب انگور کی تھی۔ پہلی بوتل تو سویاں کھانے کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ دوسری کے آخری جام پینے کے بعد میرے اور وہ لسن کے دماغ میں بیک وقت یہ خیال سمانے لگا کہ زندگی کچھ ایسی دشوار نہیں۔ ہم اس وقت باغیچے میں انگوروں سے لدی ہوئی بیل کے نیچے بیٹھے تھے۔ رات کی خاموش فضائیں ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سرانے کی خادمہ ہمارے لیے پنیر اور انجیریں لے آئی۔

وہ لسن تھوڑے سے وقٹے کے بعد مجھ سے مناطب ہوا، ”ہمارے چلنے میں ابھی کافی دیر ہے۔ چاند کم از کم ایک گھنٹے تک پہاڑی کے اوپر آئے گا۔“ میں نے کہا، ”ہمارے پاس فرصت ہی فرصت ہے۔۔۔ یہاں آکر کوئی انسان بھی عجلت کے متعلق نہیں سوچ سکتا۔“ وہ لسن مسکرا یا، ”فرصت۔۔۔ کاش لوگ اس سے واقف ہوتے۔ ہر انسان کو یہ چیز مفت میسر ہو سکتی ہے۔ لیکن لوگ کچھ ایسے بے وقوف ہیں کہ وہ اسے حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔۔۔ کام۔۔۔؟ کم بخت، اتنا سمجھنے کے بھی اہل نہیں کہ کام کرنے سے غرض صرف فرصت حاصل کرنا ہے۔“

شراب کا اثر عموماً بعض لوگوں کو غور و فکر کی طرف لے جاتا ہے۔ وسن کا خیال اپنی جگہ درست تھا۔ مگر کوئی اچھوتی اور انوکھی بات نہیں تھی۔ اس نے سکریٹ سلگا یا اور کہنے لگا، ”جب میں پہلی بار یہاں آیا، تو چاندنی رات کا سماں تھا۔۔۔ آج بھی وہی چودھویں کا چاند آسمان پر نظر آئے گا۔“

میں مسکرا دیا، ”ضرور نظر آئے گا۔“

وہ بولا، ”دوست، میرا مذاق نہ اڑاؤ۔۔۔ جب میں اپنی زندگی کے پچھلے پندرہ برسوں پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے یہ طویل عرصہ ایک مہینے کا دھندا لکا وقفہ سالگتا ہے۔۔۔ آہ، وہ رات، جب پہلی بار میں نے چبوترے پر بیٹھ کر چاند کا نظارہ کیا۔ کر نیں دریا کی سطح پر چاند کے پتے چڑھا رہی تھیں۔ میں نے اس وقت شراب ضرور پی رکھی تھی لیکن دریا کے نظارے اور آس پاس کی فضائے جو نشہ پیدا کیا، وہ شراب کبھی پیدا نہ کر سکتی۔“

اس کے ہونٹ خشک ہونے لگے۔ اس نے اپنا گلاس اٹھایا، مگر وہ خالی تھا، ایک بوتل منگوائی گئی، وسن نے دو چار بڑے بڑے گھونٹ پیے اور کہنے لگا، ”اگلے دن میں دریا کنارے نہیا اور جزیرے میں ادھر ادھر گھومتا رہا۔۔۔ بڑی رونق تھی۔۔۔ معلوم ہوا کہ حسن و عشق کی دیوبی افروڈائٹ کا تیوار ہے۔۔۔ اگر میری تقدیر میں سدا بینک کا منتظم ہونا ہی لکھا ہو تو یقیناً مجھے ایسی سیر کبھی نصیب نہ ہوتی۔“ میں نے اس سے پوچھا، ”میا تم کسی بینک کے میجر تھے؟“

”ہاں بھائی تھا۔۔۔ وہ رات میرے قیام کی آخری رات تھی کیونکہ پیر کی صبح مجھے بینک میں حاضر ہونا تھا۔ پر جب میں نے چاند دریا اور کشتیوں کو دیکھا تو ایسا بے خود ہوا کہ واپس جانے کا خیال میرے ذہن سے اتر گیا۔“

اس کے بعد اس نے اپنے گزشتہ واقعات تفصیل سے بتائے اور کہا کہ وہ جزیرے میں پندرہ سال سے مقیم ہے اور اب اس کی عمر انچاس برس کی تھی۔ پہلی بار جب وہ یہاں آیا تو اس نے سوچا کہ ملازمت کا طوق گلے سے اتار دینا چاہیے اور زندگی کے باقی ایام یہاں کی مسحور کن فضاوں میں گزارنے چاہئیں۔ جزیرے کی فضائی اور چاند کی روشنی و سن کے دماغ پر اس قدر غالب آئی کہ اس نے بینک کی ملازمت ترک کر دی۔ اگر وہ چند برس اور وہاں رہتا تو اسے معقول پیش نہیں جاتی۔ مگر اس نے اس کی مطلقاً پرواہ کی۔ البتہ بینک والوں نے اس کی خدمات کے عوض انعام دیا۔ وسن نے اپنا گھر بیچا اور جزیرے کا رخ کیا۔ اس کے اپنے حساب کے مطابق وہ پچھلی برس تک زندگی بسر کر سکتا تھا۔

میری اس سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اس دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بڑا اعتدال پسند ہے۔ اسے کوئی ایسی بات گوار نہیں جو اس کی آزادی میں خلل ڈالے، اسی وجہ سے عورت بھی اس کو ممتاز نہ کر سکی۔ وہ صرف قدرتی مناظر کا پرستار تھا۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد صرف اپنے لیے خوشی تلاش کرنا تھا اور اسے یہ نایاب چیز مل گئی تھی۔ بہت کم انسان خوشی کی تلاش کرنا جانتے ہیں، میں نہیں کہہ سکتا وہ سمجھدار تھا یاب و قوف۔ اتنا ضرور ہے کہ اپنی ذات کے ہر پہلو سے بخوبی واقف تھا۔

آخری ملاقات کے بعد میں نے اپنے میزبان دوست سے رخصت چاہی اور اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ اس دوران میں جنگ چھڑ گئی اور میں تیرہ برس تک اس جزیرے پر نہ جاسکا۔ تیرہ برس کے بعد جب میں جزیرے پر پہنچا تو میرے دوست کی حالت بہت خستہ ہو چکی تھی۔ میں نے ایک ہوٹل میں کمرا کرائے پر لیا، کھانے پر اپنے دوست سے ولسن کے متعلق بات ہوئی۔

وہ خاموش رہا۔ اس کی یہ خاموشی بڑی افسردہ تھی۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھا، ”کہیں اس نے خود کشی تو نہیں کر لی۔“ میرے دوست نے آہ بھری، ”یہ درد بھری داستان میں تمہیں کیا سناؤں۔۔۔ ولسن کی ایکیم معقول تھی کہ وہ پہچیں برس آرام سے گزار سکتا ہے۔ پر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ آرام کے پہچیں برس گزارنے کے ساتھ ہی اس کی قوتِ ارادی ختم ہو جائے گی۔ قوتِ ارادی کو زندہ رکھنے کے لیے کشش ضروری ہے۔ ہمارا زمین پر چلنے والے پہاڑیوں پر نہیں چڑھ سکتے۔۔۔ اس کا تمام روپیہ ختم ہو گیا۔ ادھار لیتا رہا۔ لیکن یہ سلسلہ کب تک جاری رہتا۔ قرض خواہوں نے اسے تنگ کرنا شروع کیا۔ آخر ایک روز اس نے اپنی جھونپڑی کے اس کمرے میں جہاں وہ سوتا تھا، بہت سے کوئلے جلائے اور دروازہ بند کر دیا۔

صحیح جب اس کی نوکرانی ناشتہ تیار کرنے آئی تو اسے بے ہوش پایا۔۔۔ لوگ اسے ہسپتال لے گئے۔ نیچے گیا پر اس کا دماغ قریب قریب ماڈاف ہو گیا۔۔۔ میں اس سے ملنے گیا لیکن وہ کچھ اس طرح حیران نظر وں سے میری طرف دیکھنے لگا جیسے مجھے پہچان نہیں سکا۔

میں نے اپنے دوست سے پوچھا، ”اب کہاں رہتا ہے؟“

”گھر بار تو اس کا نیلام ہو گیا ہے۔۔۔ پہاڑیوں پر آوارہ بھر تارہ تھا ہے۔ میں نے ایک دو مرتبہ اسے پکارا، مگر وہ میری شکل دیکھتے ہی جنگلی ہرنوں کی طرح قلا نچیں بھرتا دوڑ گیا۔“

دو تین دن کے بعد جب میں اور میرا دوست چھل قدمی کر رہے تھے کہ میرا دوست زور سے پکارا، ”لسن!“

میری نگاہوں نے اسے زیتون کے درخت کے پیچھے چھپتے دیکھا۔ ہمارے قریب پہنچنے پر اس نے کوئی حرکت نہ کی، بس ساکت و صامت کھڑا رہا۔ پھر ایک ایک جوانوں کے مانند بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد میں نے پھر اس کو کبھی نہ دیکھا۔

گھروالپس آیا تو ایک برس کے بعد میرے دوست کا خط آیا کہ وسن مر گیا۔ اس کی لاش پہاڑی کے کنارے پڑی تھی۔ چہرے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ سوتے میں دم نکل گیا ہے۔۔۔ اس رات چودھویں کا چاند تھا۔۔۔ میرا خیال ہے، شاید یہ چودھویں کا چاند ہی اس کی موت کا سبب ہو۔

-[45]-

عقل داڑھ: سعادت حسن منظو

”آپ منہ سجائے کیوں بیٹھے ہیں؟“

”بھی دانت میں درد ہوا ہے۔۔۔ تم تو خواہ مخواہ۔۔۔“

”مخواہ مخواہ کیا۔۔۔ آپ کے دانت میں کبھی درد ہو ہی نہیں سکتا۔“

”وہ کیسے؟“

”آپ بھول کیوں جاتے ہیں کہ آپ کے دانت مصنوعی ہیں۔۔۔ جو اصلی تھے وہ تو کبھی کے رخصت ہو چکے ہیں۔“

”لیکن میگم بھولتی تم ہو۔۔۔ میرے بیس دانتوں میں صرف نو دانت مصنوعی ہیں باقی اصلی اور میرے اپنے ہیں۔ اگر تمھیں میری بات پر لیقین نہ ہو تو میرا منہ کھول کر اچھی طرح معائنة کرلو۔“

”مجھے یقین آگیا۔۔۔ مجھے آپ کی ہربات پر یقین آ جاتا ہے۔۔۔ پرسوں آپ نے مجھے یقین دلایا کہ آپ سینما نہیں گئے تھے تو میں مان گئی پر آپ کے کوٹ کی جیب میں ٹکٹ پڑا تھا۔“

”وہ کسی اور دن کا ہو گا۔۔۔ میرا مطلب ہے آج سے کوئی دوڑھائی مہینے پہلے کاجب میں کسی دوست کے ساتھ پچھر دیکھنے چلا گیا ہوں گا۔۔۔ ورنہ تم جانتی ہو، مجھے فلموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔۔۔ تم تو خیر ہر فلم دیکھتی ہو۔“

”خاک! مجھے فرصت ہی کہاں ہوتی ہے۔“

”فرصت ہی فرصت ہے۔۔۔ بچیوں کو اسکول بھیجا۔۔۔ پھر سارا دن تم کیا کرتی ہو۔“

”نوکران کو اسکول سے لے آتا ہے، کھانا کھلا دیتا ہے۔ تم یا تو اپنی کسی سہیلی یا رشتہ دار کے ہاں چلی جاتی ہو یا میٹنی شو دیکھنے۔۔۔ شام کو پھر دورہ پڑتا ہے اور چلی جاتی ہو پھر کوئی اور فلم دیکھنے۔“

”یہ سفید جھوٹ ہے۔“

”یہ سفید ہے نہ کالا۔۔۔ حقیقت ہے۔“

”آپ کے دانت کا درد بھی کیا حقیقت ہے؟ چٹاخ پٹاخ با تین کر رہے ہیں۔“

”سب سے بڑا درد تو تم ہو۔۔۔ اس کے سامنے دانت کا درد کیا حقیقت رکھتا ہے۔“

”تو آپ نے جس طرح اپنے دانت نکلوائے تھے اسی طرح مجھے بھی نکال باہر پکھنیکے۔“

”مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔۔۔ اس کے لیے بڑی جرأت کی ضرورت ہے۔“

”آپ جرأت کی بات نہ کریں۔۔۔ آپ کو مفت میں ایک نوکرانی مل گئی ہے جو دن رات آپ کی خدمت کرتی ہے، اسے آپ بر طرف کیسے کر سکتے ہیں۔“

”غصب خدا کا۔۔۔ تم نے دن رات میری کیا خدمت کی ہے۔۔۔ پچھلے مہینے، مجھے جب نمونیہ ہو گیا تھا تو تم مجھے بیماری کی حالت ہی میں چھوڑ کر سیالکوٹ چل گئی تھیں۔“

”وہ توبائکل جدا بات ہے۔“

”جدابات کیا ہے؟“

”مجھے، آپ کو معلوم ہے اپنی عزیزترین سہیلی نے بلا یا تھا کہ اس کی بہن کی شادی ہو رہی ہے۔“

”اوہ یہاں جو میری بربادی ہو رہی تھی۔“

”آپ اچھے بھلے تھے۔۔۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھ لیا تھا۔ اس نے میری تشغی کر دی تھی کہ تشویش کی کوئی ضرورت نہیں۔ نمونیہ کا ایک کوئی اتنا سیریس نہیں۔ پھر پنسلین کے ٹیکے دیے جا رہے ہیں۔۔۔ انشاء اللہ دو ایک روز میں تند رست ہو جائیں گے۔“

”تم سیالکوٹ میں کتنے دن رہیں؟“

”کوئی دس پندرہ دن۔“

”اس دوران میں تم نے مجھے کوئی خط لکھا؟ میری خیریت کے متعلق پوچھا؟“

”اتی فرصت ہی نہیں تھی کہ آپ کو ایک سطر بھی لکھ سکتی۔“

”لیکن تم نے اپنی والدہ مکرمہ کو چار خط لکھے۔“

”وہ تو بہت ضروری تھے۔“

”میں نے سب پڑھے ہیں۔“

”آپ نے کیوں پڑھے؟ یہ بہت بد تیزی ہے۔“

”یہ بد تیزی میں نے نہیں کی، تمہاری والدہ مکرمہ نے مجھے خود ان کو پڑھنے کے لیے کہا۔۔۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ کس قدر ضروری تھے۔“

”کیا ضروری تھے؟“

”بہت ضروری تھے۔۔۔ اس لیے کہ خاوند کے پھیپھڑوں کے مقابلے میں دلہن کے جہیز کی تفصیلات بہت اہم تھیں۔۔۔ اس کے بالوں کی اشتال، اس کے گالوں پر لگایا گیا غازہ، اس کے ہونٹوں کی سرخی، اس کی زربفت کی تیزی، اور جانے کیا کیا۔۔۔ یہ تمام اطلاعیں پہچانا واقعی اشد ضروری تھا ورنہ دنیا کے تمام کاروبار رک جاتے۔۔۔ چاند اور سورج کی گردش بند ہو جاتی۔ دلہن کے گھونگھٹ کے متعلق اگر تم نہ لکھتیں کہ وہ کس طرح بار بار جھنجھلا کر اٹھادیتی تھی تو میر انھیں ہے یہ ساری دنیا ایک بہت بڑا گھونگھٹ بن جاتی۔“

”آج آپ بہت بھونڈی شاعری کر رہے ہیں۔“

”بجا ہے۔۔۔ تمہاری موجودگی میں اگر غالب مر حوم بھی ہوتے تو وہ اسی قسم کی شاعری کرتے۔“

”آپ میری توہین کر رہے ہیں۔“

”تم ناٹش کر دو۔۔۔ مقدمہ دائر کر دو۔“

”میں ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہتی۔“

”تو پھر کن چکروں میں پڑنا چاہتی ہو۔۔۔ مجھے بتا دو۔“

”آپ سے جو میری شادی ہوئی تو اس سے بڑا چکر اور کون ہو سکتا ہے۔ میرے بس میں ہو تو اس میں سے نکل بھاگوں۔“

”تمہارے بس میں کیا کچھ نہیں۔۔۔ تم چاہو تو آج ہی اس چکر سے نکل سکتی ہو۔“

”کیسے؟“

”یہ مجھے معلوم نہیں۔۔۔ تم ماشاء اللہ عقل مند ہو۔۔۔ کوئی نہ کوئی رستہ نکال لوتا کہ یہ روز روکی بک بک اور جھک جھک ختم ہو۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ خود یہ چاہتے ہیں کہ مجھے نکال باہر کریں۔“

”لا حول ولا۔۔۔ میں خود باہر نکالے جانے کے لیے تیار ہوں۔“

”کہاں رہیں گے آپ؟“

”کہیں بھی رہوں۔۔۔ کسی دوست کے ہاں کچھ دیر ٹھہر جاؤں گا۔۔۔ یا شاید کسی ہوٹل میں چلا جاؤں ۔۔۔ اکیلی جان ہو گی۔۔۔ میں تو بھی فٹ پاتھ پر بھی سو کر گزارہ کر سکتا ہوں۔۔۔ کپڑے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔۔۔ ان کو کسی لانڈری کے حوالے کر دوں گا۔ وہاں وہ اس گھر کے مقابلے میں کہیں زیادہ محفوظ رہیں گے۔ شیشے کی الماریوں میں بجے ہوں گے۔۔۔ جب گئے ایک سوٹ نکلوایا اس کی دھلانی یا ڈرائی کلینگ کے پیسے ادا کیے اور خرماں خرماں۔“

”خراں خراں، کہاں گئے؟“

”کہیں بھی--- لارنس گارڈن ہے--- سینما ہیں--- ریستوران ہیں--- بس جہاں جی چاہا چلے گئے--- کوئی پابندی تو نہیں ہو گی اس وقت۔“

”یہاں میں نے آپ پر کون سی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں؟ کھلے بندوں جو چاہے کرتے ہیں--- میں نے آپ کو کبھی ٹوکا ہے؟“

”ٹوکا تو نہیں ہے لیکن میرا ہر بار ایسا جھٹکا کیا ہے کہ مہینوں طبیعت صاف رہی۔“

”اگر طبیعت صاف رہے تو اس میں کیا قباحت ہے، طبیعت ہمیشہ صاف رہنی چاہیے۔“

”مانتا ہوں کہ طبیعت ہمیشہ صاف رہنی چاہیے مگر طبیعت صاف کرنے والے کو اتنا خیال ضرور مد نظر رکھنا چاہیے کہ وہ ضرورت سے زیادہ صاف نہ ہو جائے۔“

”آپ کے دانت میں درد ہو رہا تھا؟“

”وہ درد اب دل میں چلا گیا ہے۔“

”کیسے؟“

”آپ کی گفتگو ہر قسم کے کرشمے کر سکتی ہے--- داڑھ میں شدت کا درد تھا لیکن آپ خدا معلوم کیوں تشریف لے آئیں اور مجھ سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا کہ وہ داڑھ کا درد دل میں منتقل ہو گیا۔“

”میں یہ صرف پوچھنے آئی تھی کہ آپ کامنہ کیوں سو جا ہوا ہے۔ بس اس اتنی بات کا آپ نے بتگلڑ بنادیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کس کھوپڑی کے انسان ہیں۔“

”کھوپڑی تو میری ولیسی ہے جیسی تمہاری یادو سرے انسانوں کی--- تمھیں اس میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے۔“

”فرق، ساخت کے متعلق کچھ محسوس نہیں ہوتا لیکن میں یہ وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ کی کھوپڑی میں یقیناً کوئی نقص ہے۔“

”کس قسم کا؟“

”میں قسم کہاں بتا سکتی ہوں--- کسی ڈاکٹر سے پوچھیے۔“

”پوچھ لوں گا--- لیکن اب میرے دل میں درد ہو رہا ہے۔“

”یہ سب جھوٹ ہے--- آپ کا دل مضبوط ہے۔“

”تمھیں کیسے معلوم ہوا؟“

”آج سے دوسرس پہلے جب آپ ہسپتال میں داخل ہوئے تھے تو آپ کا ایکس رے لیا گیا تھا۔“

”مجھے معلوم نہیں۔“

”آپ کو اتنا ہوش ہی کہاں تھا۔ مجھے آپ کوئی نرس سمجھتے تھے۔ عجیب عجیب باتیں کرتے تھے۔“

”بیماری میں ہر خطا معاف کر دینی چاہیے۔ جب تم کہتی ہو کہ میں غشی کے عالم میں تھا تو بتاؤ میں صحیح باتیں کیسے کر سکتا تھا۔“

”میں آپ کے دل کے متعلق کہہ رہی تھی۔۔۔ ہسپتال میں جب آپ کے پانچ چھ ایکس رے لیے گئے تو۔۔۔ ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یہ شخص صرف اپنے مضبوط دل کی وجہ سے جی رہا ہے۔۔۔ اس کے گردے کمزور ہیں۔۔۔ اس کی انتڑیوں میں ورم ہے۔ اس کا جگر خراب ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا؟“

”انھوں نے یہ کہا تھا کہ نہیں مرے گا، اس لیے کہ اس کے پھیپھڑے اور دل صحیح حالت میں ہیں۔“

”دل میں تو خیر تم بس رہی ہو۔۔۔ پھیپھڑوں میں معلوم نہیں کون رہتا ہے۔“

”رہتی ہو گی، آپ کی کوئی۔۔۔“

”کون؟“

”میں کیا جانوں۔“

”خدا کی قسم تمہارے سوا میں نے کسی اور عورت کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔“

”آنکھ جھکا کر دیکھا ہو گا۔“

”وہ تو خیر، دیکھنا ہی پڑتا ہے۔۔۔ مگر کبھی برے خیال سے نہیں۔۔۔ بس ایک نظر دیکھا اور چل دیئے۔“

”لیکن ایک نظر دیکھنا کیا بہت ضروری ہے۔۔۔ شریعت میں لکھا ہے؟“

”اس بحث کو چھوڑو۔۔۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کہنے کیا آئی تھیں۔۔۔ تمہاری عادت ہے کہ اپنا مطلب بیان کرنے سے پہلے تم جھگٹا ضرور شروع کر دیا کرتی ہو۔“

”مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا تھا۔“

”تو آپ تشریف لے جائے۔۔۔ مجھے دفتر کے چند کام کرنے ہیں۔“

”میں نہیں جاؤں گی۔“

”تو پھر تم خاموش بیٹھی رہو۔۔۔ میں کام ختم کر لوں تو جو تمھیں اول جلوں کبنا ہے بک لینا۔۔۔ میری داڑھ میں شدت کا درد ہو رہا ہے۔“

”میں کس لیے آپ کے پاس آئی؟“

”مجھے کیا معلوم۔“

”میری عقل داڑھ نکل رہی ہے؟“

”خدا کا شکر ہے۔۔۔ تم کو اب کچھ عقل تو آجائے گی۔“

”بہت درد ہو رہا ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔۔۔ اس درد، ہی سے عقل آرہی ہے۔“

مختار نے شاردا کو پہلی مرتبہ جھرنوں میں سے دیکھا۔ وہ اوپر کوٹھے پر کٹا ہوا پینگ لینے گیا تو اسے جھرنوں میں سے ایک جھلک دکھائی دی۔ سامنے والے مکان کی بالائی منزل کی کھڑکی کھلی تھی۔ ایک لڑکی ڈونگا ہاتھ میں لیے نہار ہی تھی۔ مختار کو یہ تجھب ہوا کہ یہ لڑکی کہاں سے آگئی، کیونکہ سامنے والے مکان میں کوئی لڑکی نہیں تھی۔ جو تھیں، بیاہی جا چکی تھیں۔ صرف روپ کور تھی۔ اس کا پلپلا غاوند کا لو مل تھا۔ اس کے تین لڑکے تھے اور بس۔

مختار نے پینگ اٹھایا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔۔۔ لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ اس کے ننگے بدن پر سنہرے روئیں تھے۔ ان میں کچھی ہوئی پانی کی ننھی ننھی بوند نیاں چمک رہی تھیں۔ اس کا رنگ ہاکا سانو لا تھا، سانو لا بھی نہیں۔ تانبے کے رنگ جیسا، پانی کی ننھی ننھی بوند نیاں ایسی لگتی تھیں جیسے اس کا بدن پگھل کر قطرے قطرے بن کر گر رہا ہے۔

مختار نے جھرنے کے سوراخوں کے ساتھ اپنی آنکھیں جمادیں اور اس لڑکی کو، جو ڈونگا ہاتھ میں لیے نہار ہی تھی، دلچسپی اور غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ سولہ برس کی تھی۔ گلے سینے پر اس کی چھوٹی چھوٹی گول چھاتیاں جن پر پانی کے قطرے پھسل رہے تھے بڑی دل فریب تھیں۔ اس کو دیکھ کر مختار کے دل و دماغ میں سفلی جذبات پیدا نہ ہوئے۔ ایک جوان، خوبصورت اور بالکل ننگی لڑکی اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ مختار کے اندر شہوانی یہجان برپا ہو جاتا، مگر وہ بڑے ٹھنڈے انہاک سے اسے دیکھ رہا تھا، جیسے کسی مصور کی تصویر دیکھ رہا ہے۔

لڑکی کے نچلے ہونٹ کے اختتامی کونے پر بڑا سائل تھا۔۔۔ بے حد متین، بے حد سنجیدہ، جیسے وہ اپنے وجود سے بے خبر ہے، لیکن دوسرا سے اس کے وجود سے آگاہ ہیں، صرف اس حد تک کہ اسے وہیں ہونا چاہیے تھا جہاں کہ وہ تھا۔ باخھوں پر سنہرے روئیں پانی کی بوندیوں کے ساتھ لپٹے ہوئے چمک رہے تھے۔ اس کے سر کے بال سنہرے نہیں، بھو سلے تھے جنہوں نے شاید سنہرے ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ جسم سڈوں اور گدریا ہوا تھا لیکن اس کو دیکھنے سے اشتعال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مختار دیر تک جھرنے کے ساتھ آنکھیں جمائے رہا۔

لڑکی نے بدن پر صابن ملا۔ مختار تک اس کی خوب شبو پہنچی۔ سلو نے، تانبے جیسے رنگ والے بدن پر سفید سفید جھاگ بڑے سہانے معلوم ہوتے تھے۔ پھر جب یہ جھاگ پانی کے بہاؤ سے پھسلے تو مختار نے محسوس کیا جیسے اس لڑکی نے اپنا بلبلوں کا لباس بڑے اطمینان سے اتار کر ایک طرف رکھ دیا ہے۔ غسل سے فارغ ہو کر لڑکی نے تو لیے سے اپنا بدن پوچھا۔ بڑے سکون اور اطمینان سے آہستہ آہستہ کپڑے پہنے۔

کھڑکی کے ڈنڈے پر دونوں ہاتھ رکھے اور سامنے دیکھا۔ ایک دم اس کی آنکھیں شرماہٹ کی چیلیوں میں غرق ہو گئیں۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔ مختار بے اختیار ہنس پڑا۔

لڑکی نے فوراً کھڑکی کے پٹ کھولے اور بڑے غصے میں جھرنے کی طرف دیکھا۔ مختار نے کہا، ”میں قصوروار بالکل نہیں۔۔۔ آپ کیوں کھڑکی کھول کر نہار ہی تھیں؟“ لڑکی نے کچھ نہ کہا۔ غیض آلو دنگا ہوں سے جھرنے کو دیکھا اور کھڑکی بند کر لی۔

چوتھے دن روپ کو رآئی۔ اس کے ساتھ یہی لڑکی تھی۔ مختار کی ماں اور بہن دونوں سلاسلی اور کروشیے کے کام کی ماہر تھیں، گلی کی اکثر لڑکیاں ان سے یہ کام سیکھنے کے لیے آیا کرتی تھیں۔ روپ کو رہبھی اس لڑکی کو اسی غرض سے لائی تھی کیونکہ اس کو کروشیے کے کام کا بہت شوق تھا۔ مختار اپنے کمرے سے نکل کر صحن میں آیا تو اس نے روپ کو پورا نام کیا۔ لڑکی پر اس کی نگاہ پڑی تو وہ سمٹ سی گئی۔ مختار مسکرا کر وہاں سے چلا گیا۔ لڑکی روزانہ آنے لگی۔ مختار کو دیکھتی تو سمٹ جاتی۔ آہستہ آہستہ اس کا یہ رد عمل دور ہوا اور اس کے دماغ سے یہ خیال کسی قدر محوج ہوا کہ مختار نے اسے نہاتے دیکھا تھا۔

مختار کو معلوم ہوا کہ اس کا نام شاردا ہے۔ روپ کو رکھ کر چھپا کی لڑکی ہے یتیم ہے۔ چھپو کی ملیاں میں ایک غریب رشتہ دار کے ساتھ رہتی تھی۔ روپ کو رنے اس کو اپنے پاس بلا لیا۔ انٹرنس پاس ہے۔ بڑی ذہین ہے، کیونکہ اس نے کروشیے کا مشکل سے مشکل کام یوں چلکیوں میں سیکھ لیا تھا۔

دن گزرتے گیے۔ اس دوران میں مختار نے محسوس کیا کہ وہ شاردا کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ یہ سب کچھ دھیرے دھیرے ہوا۔ جب مختار نے اس کو پہلی بار جھرنے میں سے دیکھا تھا تو اس وقت اس کے سامنے ایک نظارہ تھا بڑا فرحت ناک نظارہ۔ لیکن اب شاردا آہستہ آہستہ اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی، مختار نے کئی دفعہ سوچا تھا کہ یہ محبت کا معاملہ بالکل غلط ہے، اس لیے کہ شاردا ہندو ہے۔ مسلمان کیسے ایک ہندو لڑکی سے محبت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ مختار نے اپنے آپ کو بہت سمجھایا لیکن وہ اپنے محبت کے جذبے کو مٹانے سکا۔ شاردا اب اس سے با�یں کرنے لگی تھی مگر کھل کر نہیں۔ اس کے دماغ میں مختار کو دیکھتے ہی یہ احساس بیدار ہو جاتا تھا کہ وہ ننگی نہار ہی تھی اور مختار جھرنے میں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

ایک روز گھر میں کوئی نہیں تھا۔ مختار کی ماں اور بہن دونوں کسی عزیز کے چالیسویں پر گئی ہوئی تھیں۔ شاردا حسب معمول اپنا تھیلا اٹھائے صحیح دس بجے آئی۔ مختار صحن میں چارپائی پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔ شاردا نے اس سے پوچھا، ”بہن جی کہاں ہیں؟“

مختار کے ہاتھ کا نپنے لگے، ”وہ۔۔۔ وہ کہیں باہر گئی ہیں۔“

شاردا نے پوچھا، ”ماتا جی؟“

مختار اٹھ کر بیٹھ گیا، ”وہ۔۔۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی گئی ہیں۔“

”اچھا!“ یہ کہہ کر شاردا نے کسی قدر گھبرائی ہوئی نگاہوں سے مختار کو دیکھا اور نمستے کر کے چلنے لگی۔ مختار نے اس کو روکا، ”مظہر و شاردا!“

شاردا کو جیسے بھلی کے کرنٹ نے چھولیا۔ چونکہ رک گئی، ”جی؟“

مختار چارپائی پر سے اٹھا، ”بیٹھ جاؤ۔۔۔ وہ لوگ ابھی آجائیں گے۔“

”جی نہیں۔۔۔ میں جاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر بھی شاردا کھڑی رہی۔

مختار نے بڑی جرات سے کام لیا۔ آگے بڑھا۔ اس کی ایک کلاںی پکڑی اور کھینچ کر اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ مختار اور شادا دونوں کو ایک لختے کے لیے بالکل پتا نہ چلا کہ کیا ہوا ہے۔۔۔ اس کے بعد دونوں لرزنے لگے۔ مختار نے صرف اتنا کہا، ”مجھے معاف کر دینا!“

شاردا خاموش کھڑی رہی۔ اس کا تابنے جیسا رنگ سرخی مائل ہو گیا۔ ہونٹوں میں خفیف سی کپکاپاہٹ تھی جیسے وہ چھیڑے جانے پر شکایت کر رہے ہیں۔ مختار اپنی حرکت اور اس کے نتائج بھول گیا۔ اس نے ایک بار پھر شاردا کو اپنی طرف کھینچا اور سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔۔۔ شاردا نے مزاحمت نہ کی۔ وہ صرف مجسمہ حیرت بنی ہوئی تھی۔ وہ ایک سوال بن گئی تھی۔۔۔ ایک ایسا سوال جو اپنے آپ سے کیا گیا ہو۔ وہ شاید خود سے پوچھ رہی تھی یہ کیا ہوا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔۔۔ کیا اسے ہونا چاہیے تھا۔۔۔ کیا ایسا کسی اور سے بھی ہوا ہے؟

مختار نے اسے چارپائی پر بٹھالیا اور پوچھا، ”تم بولتی کیوں نہیں ہو شاردا؟“

شاردا کے دوپٹے کے پیچھے اس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مختار کو اس کا یہ سکوت بہت پریشان کرنے محسوس ہوا، ”بولا شاردا۔۔۔ اگر تمہیں میری یہ حرکت بری لگی ہے تو کہہ دو۔۔۔ خدا کی قسم میں معافی مانگ لوں گا۔۔۔ تمہاری طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھوں گا۔ میں نے کبھی ایسی جرات نہ کی ہوتی، لیکن جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔۔۔ دراصل۔۔۔ دراصل مجھے تم سے محبت ہے۔“

شاردا کے ہونٹ ہلے جیسے انھوں نے لفظ ”محبت“ ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مختار نے بڑی گرم جوش سے کہنا شروع کیا، ”مجھے معلوم نہیں تم محبت کا مطلب سمجھتی ہو کہ نہیں۔۔۔ میں خود اس کے متعلق زیادہ واقفیت نہیں رکھتا، صرف اتنا جانتا ہوں کہ تمہیں چاہتا ہوں۔۔۔ تمہاری ساری ہستی کو اپنی اس مٹھی میں لے لینا چاہتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں اپنی ساری زندگی تمہارے حوالے کر دوں گا۔۔۔ شاردا تم بولتی کیوں نہیں ہو؟“

شاردا کی آنکھیں خواب گیس ہو گئیں۔ مختار نے پھر بولنا شروع کر دیا، ”میں نے اس روز جھرنے میں سے تمہیں دیکھا۔۔۔ نہیں۔ تم مجھے خود دکھائی دیں۔۔۔ وہ ایک ایسا نظارہ تھا جو میں تاقیامت نہیں بھول سکتا۔۔۔ تم شرماتی کیوں ہو۔۔۔ میری نگاہوں نے تمہاری خوبصورتی چراکی تو نہیں۔۔۔ میری آنکھوں میں صرف اس نظارے کی تصویر ہے۔۔۔ تم اسے زندہ کر دو تو میں تمہارے پاؤں چوم لوں گا۔“ یہ کہہ کر مختار نے شاردا کا ایک پاؤں چوم لیا۔

وہ کانپ گئی۔ چار پاؤں پر سے ایک دم الٹھ کر اس نے لرزائ آواز میں کہا، ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔۔۔ ہمارے دھرم میں۔۔۔“

مختار خوشی سے اچھل پڑا، ”دھرم ورم کو چھوڑو۔۔۔ پریم کے دھرم میں سب ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے شاردا کو چومنا چاہا مگر وہ تڑپ کر ایک طرف ہٹی اور بڑے شر میلے انداز میں مسکراتی بھاگ گئی۔ مختار نے چاہا کہ وہ اڑ کر مٹی پر پکنچ جائے۔ وہاں سے نیچے سمجھ میں کو دے اور ناچنا شروع کر دے۔

مختار کی والدہ اور بہن آنکھیں تو شاردا آئی۔ مختار کو دیکھ کر اس نے فوراً انگاہیں نیچی کر لیں۔ مختار وہاں سے کھسک گیا کہ راز افشا نہ ہو۔ دوسرے روز اپر کوٹھے پر چڑھا۔ جھرنے میں سے جھانکا تو دیکھا کہ شاردا کھڑکی کے پاس کھڑی بالوں میں آنکھی کر رہی ہے۔ مختار نے اس کو آواز دی، ”شاردا!“

شادر اچو گئی۔ کنگھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گلی میں جا گری۔ مختار نہ سا۔ شاردا کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ مختار نے اس سے کہا، ”کتنی ڈرپوک ہوتا ہے۔۔۔ ہولے سے آواز دی اور تمہاری کنگھی چھوٹ گئی۔“

شاردرانے کہا، ”اب لایکے دیکھئے نئی کنگھی مجھے۔۔۔ یہ تو موری میں جا گری ہے۔“

مختار نے جواب دیا، ”ابھی لااؤں۔“

شاردرانے فوراً کہا، ”نبیس نبیس۔۔۔ میں نے تو مذاق کیا ہے۔“

”میں نے بھی مذاق کیا تھا۔ تمہیں چھوڑ کر میں میں کنگھی لینے جاتا۔۔۔؟ کبھی نبیس!“

شاردرامسکراہی، ”میں بال کیسے بناؤں۔“

مختار نے جھرنے کے سوراخوں میں اپنی انگلیاں ڈالیں، ”یہ میری انگلیاں لے لو!“

شاردرانہی۔۔۔ مختار کا جی چاہا کہ وہ اپنی ساری عمر اس ہنسی کی چھاؤں میں گزار دے، ”شاردا، خدا کی قسم، تم ہنسی ہو، میرا روائی رواں شاد ماں ہو گیا ہے۔۔۔ تم کیوں اتنی پیاری ہو۔۔۔؟ کیا دنیا میں کوئی اور لڑکی بھی تم جتنی پیاری ہوگی۔۔۔ یہ کم بخت جھرنے۔۔۔ یہ مٹی کے ذلیل پر دے۔ جی چاہتا ہے ان کو توڑ پھوڑ دوں۔“

شاردا پھر ہنسی۔ مختار نے کہا، ”یہ ہنسی کوئی اور نہ دیکھے، کوئی اور نہ سنے۔ شاردا صرف میرے سامنے ہنسنا۔۔۔ اور اگر کبھی ہنسنا ہو تو مجھے بلا لیا کرو۔ میں اس کے ارد گرد اپنے ہونٹوں کی دیواریں کھڑی کر دوں گا۔“

شاردا نے کہا، ”آپ باتیں بڑی اچھی کرتے ہیں۔“

”تو مجھے انعام دو۔۔۔ محبت کی ایک بہلی سی نگاہ ان جھرنوں سے میری طرف چھینک دو۔۔۔ میں اسے اپنی پکلوں سے اٹھا کر اپنی آنکھوں میں چھپالوں گا۔“ مختار نے شاردا کے عقب میں دور ایک سایہ سادیکھا اور فوراً جھرنے سے ہٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو کھڑکی خالی تھا۔ شاردا جاپکھی تھی۔

آہستہ آہستہ مختار اور شاردا دونوں شیر و شکر ہو گئے۔ تہائی کا موقعہ ملتا تو دیر تک پیار محبت کی باتیں کرتے رہتے۔۔۔ ایک دن روپ کور اور اس کا خاوند لالہ کا لول کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ مختار گلی میں سے گزر رہا تھا کہ اس کو ایک کنکر لگا۔ اس نے اوپر دیکھا شاردا تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا۔ مختار اس کے پاس پہنچ گیا۔ پورا تخلیہ تھا۔ خوب گھل مل کے باتیں ہوئیں۔ مختار نے اس سے کہا، ”اس روز مجھ سے گستاخی ہوئی تھی اور میں نے معافی مانگ لی تھی۔ آج پھر گستاخی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، لیکن معافی نہیں مانگوں گا۔“ اور اپنے ہونٹ شاردا کے کپکپاتے ہوئے ہو نؤں پر رکھ دیے۔

شاردا نے شر میلی شرارت سے کہا، ”اب معافی مانگیے۔“

”جی نہیں۔۔۔ اب یہ ہونٹ آپ کے نہیں۔۔۔ میرے ہیں۔۔۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟“

شاردا نے نگاہیں پنجی کر کے کہا، ”یہ ہونٹ کیا۔ میں ہی آپ کی ہوں۔“

مختار ایک دم سنجیدہ ہو گیا، ”دیکھو شاردا۔ ہم اس وقت ایک آتش فشاں پہاڑ پر کھڑے ہیں تم سوچ لو، سمجھ لو۔۔۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارے سوامیری زندگی میں اور کوئی عورت نہیں آئے گی۔۔۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ زندگی بھر میں تمہارا رہوں گا۔ میری محبت ثابت قدم رہے گی۔۔۔ کیا تم بھی اس کا عہد کرتی ہو؟“

شاردا نے اپنی نگاہیں اٹھا کر مختار کی طرف دیکھا، ”میرا پر یہم سچا ہے۔“

مختار نے اس کو سینے کے ساتھ بھیج لیا اور کہا، ”زندہ رہو۔۔۔ صرف میرے لیے، میری محبت کے لیے وقف رہو۔۔۔ خدا کی قسم شاردا۔ اگر تمہارا التفات مجھے نہ ملتا تو میں یقیناً خود کشی کر لیتا۔۔۔ تم میری آغوش میں ہو۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری دنیا کی خوشیوں سے میری جھوٹی بھری ہوئی ہے۔ میں بہت خوش نصیب ہوں۔“

شاردا نے اپنا سر مختار کے کندھے پر گرا دیا، ”آپ باتیں کرنا جانتے ہیں۔۔۔ مجھ سے اپنے دل کی بات نہیں کہی جاتی۔“

دیر تک دونوں ایک دوسرے میں مد غم رہے۔ جب مختار وہاں سے گیاتو اس کی روح ایک نئی اور سہانی لذت سے معمور تھی۔ ساری رات وہ سوچتا رہا۔ دوسرے دن ٹکلتے چلا گیا جہاں اس کا باپ کاروبار کرتا تھا۔ آٹھ دن کے بعد واپس آیا۔ شاردا حسبِ معمول کروشیے کا کام سیکھنے مقررہ وقت پر آئی۔ اس کی نگاہوں نے اس سے کئی باتیں کیں۔ کہاں غائب رہے اتنے دن۔۔۔؟ مجھ سے کچھ نہ کہا اور ٹکلتے چلے گئے۔۔۔؟ محبت کے بڑے دعوے کرتے تھے۔۔۔؟ میں نہیں بولوں گی تم سے۔۔۔ میری طرف کیا دیکھتے ہو، کیا کہنا چاہتے ہو مجھ سے؟

مختار بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر تنہائی نہیں تھی۔ وہ کافی طویل گفتگو اس سے کرنا چاہتا تھا۔ دو دن گزر گئے، موقع نہ ملا۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں گونگی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر تیرے روز شاردا نے اسے بلایا۔ مختار بہت خوش ہوا۔ روپ کو را اس کا خاوند لالہ کا لومل گھر میں نہیں تھے۔

شاردا سیڑھیوں میں ملی۔ مختار نے وہیں اس کو اپنے سینے کے ساتھ لگانا چاہا، وہ ترپ کراوپر چلی گئی۔ ناراض تھی۔ مختار نے اس سے کہا، ”دیکھو میری جان، میرے پاس بیٹھو، میں تم سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ایسی باتیں جن کا ہماری زندگی سے بڑا گہر اعلقہ ہے۔“

شاردا اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی، ”تم بات ٹالو نہیں۔۔۔ بتاؤ، مجھے بتائے بغیر ٹکلتے کیوں گئے۔۔۔ یق میں بہت روئی۔“ مختار نے بڑھ کر اس کی آنکھیں چو میں، ”اس روز میں جب سے گیاتو ساری رات سوچتا رہا۔۔۔ جو کچھ اس روز ہوا اس کے بعد یہ سوچ بچار لازمی تھی۔ ہماری حیثیت میاں بیوی کی تھی۔ میں نے غلطی کی۔ تم نے کچھ نہ سوچا۔ ہم نے ایک ہی جست میں کئی منزلیں طے کر لیں اور یہ غور ہی نہ کیا کہ ہمیں جانا کس طرف ہے۔۔۔ سمجھ رہی ہو نا شاردا۔“

شاردا نے آنکھیں جھکالیں، ”جی ہا۔“

”میں ٹکلتے اس لیے گیا تھا کہ اباجی سے مشورہ کروں۔ تمہیں سن کر خوشی ہو گی میں نے ان کو راضی کر لیا ہے، ”مختار کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ شاردا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس نے کہا، ”میرے دل کا سارا بوجھ ہلاکا ہو گیا ہے۔۔۔ میں اب تم سے شادی کر سکتی ہوں۔“

شاردانے ہولے سے کہا، ”شادی!“

”ہاں شادی۔“

شاردانے پوچھا، ”کیسے ہو سکتی ہے ہماری شادی؟“

مختار مسکرا�ا، ”اس میں مشکل ہی کیا ہے۔۔۔ تم مسلمان ہو جانا۔“

شاردا ایک دم چونکی، ”مسلمان!“

مختار نے بڑے اطمینان سے کہا، ”ہاں ہاں۔۔۔ اس کے علاوہ اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔۔۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے گھروالے بڑا ہنگامہ مچائیں گے لیکن میں نے اس کا انتظام کر لیا ہے۔ ہم دونوں یہاں سے غائب ہو جائیں گے، سید ہے ملکتے چلیں گے۔ باقی کام اباجی کے سپرد ہے۔ جس روز وہاں پہنچیں گے اسی روز مولوی بلا کر تمہیں مسلمان بنادیں گے۔ شادی بھی اسی وقت ہو جائے گی۔“

شاردا کے ہونٹ جیسے کسی نے سی دیے۔ مختار نے اس کی طرف دیکھا، ”خاموش کیوں ہو گئیں؟“

شاردانہ بولی۔ مختار کو بڑی لمحن ہوئی، ”بتاؤ شاردا کیا بات ہے؟“

شاردانے بہ مشکل اتنا کہا، ”تم ہندو ہو جاؤ۔“

”میں ہندو ہو جاؤ؟“ مختار کے لجھے میں حیرت تھی۔ وہ ہنسا، ”میں ہندو کیسے ہو سکتا ہوں؟“

”میں کیسے مسلمان ہو سکتی ہوں؟“ شاردا کی آواز مدھم تھی۔

”تم کیوں مسلمان نہیں ہو سکتیں۔۔۔ میر امطلب ہے کہ۔۔۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ اس کے علاوہ اسلام سب سے اچھا مذہب ہے۔۔۔ ہندو مذہب بھی کوئی مذہب ہے۔ گائے کا پیشاب پیتے ہیں، بت پوچتے ہیں۔۔۔ میر امطلب ہے کہ ٹھیک ہے اپنی جگہ یہ مذہب بھی۔ مگر اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“ مختار کے خیالات پریشان تھے، ”تم مسلمان ہو جاؤ گی تو بس۔۔۔ میر امطلب ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

شاردا کے چہرے کا تابنے جیسا رنگ زرد پڑ گیا، ”آپ ہندو نہیں ہوں گے؟“

مختار ہنسا، ”پاگل ہو تم؟“

شاردا کا رنگ اور زرد پڑ گیا، ”آپ جائیے۔۔۔ وہ لوگ آنے والے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ پنگ پر سے اٹھی۔

مختار متھیر ہو گیا، ”لیکن شاردا۔۔۔“

”نہیں نہیں جائیے آپ۔۔۔ جلدی جائیے۔۔۔ وہ آجائیں گے۔“ شاردا کے لجھے میں بے اعتنائی کی سردی تھی۔

مختار نے اپنے خشک حلق سے بہ مشکل یہ الفاظ نکالے، ”هم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، شاردا تم ناراض کیوں ہو گئیں؟“

”جاو۔۔۔ چلے جاو۔۔۔ ہمارا ہندو مذہب بہت برا ہے۔۔۔ تم مسلمان بہت اچھے ہو۔“

شاردا کے لجھے میں نفرت تھی۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر دیا۔ مختار اپنا اسلام سینے میں دبائے وہاں سے چلا گیا۔

-[47]-

اوپر نیچے اور درمیان: سعادت حسن منٹو

میاں صاحب: بہت دیر کے بعد آج مل بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

بیگم صاحبہ: جی ہاں!

میاں صاحب: مصروفیتیں۔۔۔ بہت پیچھے ہم تا ہوں مگرنا اہل لوگوں کا خیال کر کے قوم کی پیش کی ہوئی ذمہ داریاں سنبھالنی ہی پڑتی ہیں۔

بیگم صاحبہ: اصل میں آپ ایسے معاملوں میں بہت نرم دل واقع ہوئے ہیں، بالکل میری طرح۔

میاں صاحب: ہاں! مجھے آپ کی سو شل ایکٹی و ٹیز کا علم ہوتا ہتا ہے۔ فرصت ملے تو مجھی اپنی وہ تقریریں بھجواد بجئے گا جو پچھلے دنوں آپ نے مختلف موقعوں پر کی ہیں۔۔۔ میں فرصت کے اوقات میں ان کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔

بیگم صاحبہ: بہت بہتر۔

میاں صاحب: ہاں بیگم! وہ میں نے آپ سے اس بات کا ذکر کیا تھا!

بیگم صاحبہ: کس بات کا؟

میاں صاحب: میرا خیال ہے، ذکر نہیں کیا۔۔۔ کل اتفاق سے میں بخھلے صاحبزادے کے کمرے میں جائکلا، وہ لیڈی چڑلیز لور پڑھ رہا تھا۔

بیگم صاحبہ: وہ رسوانے زمانہ کتاب!

میاں صاحب: ہاں بیگم

بیگم صاحبہ: آپ نے کیا کیا؟

میاں صاحب: میں نے اس سے کتاب چھین کر غائب کر دی۔

بیگم صاحبہ: بہت اچھا کیا آپ نے۔

میاں صاحب: اب میں سوچ رہا ہوں کہ ڈاکٹر سے مشورہ کروں اور اس کی روزانہ غذا میں تبدیلی کراؤں۔

بیگم صاحبہ: بڑا صحیح قدم اٹھائیں گے آپ۔

میاں صاحب: مزاج کیسا ہے آپ کا؟

بیگم صاحبہ: ٹھیک ہے۔

میاں صاحب: میرا خیال تھا کہ آج آپ سے ۔۔۔ درخواست کروں۔

بیگم صاحبہ: اوہ! آپ بہت بگڑتے جا رہے ہیں۔

میاں صاحب: یہ سب آپ کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

بیگم صاحبہ: لیکن آپ کی صحت؟

میاں صاحب: صحت؟ اچھی ہے لیکن ڈاکٹر سے مشورہ کیے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔۔۔ اور آپ کی طرف سے بھی مجھے پورا اطمینان ہونا چاہیے۔

بیگم صاحبہ: میں آج ہی مس سلڈھانا سے پوچھ لوں گی۔

میاں صاحب: اور میں ڈاکٹر جلال سے

بیگم صاحبہ: قاعدے کے مطابق ایسا ہی ہونا چاہیے۔

میاں صاحب: اگر ڈاکٹر جلال نے اجازت دے دی؟

بیگم صاحبہ: اگر مس سلڈھانا نے اجازت دے دی۔۔۔ مفلک اچھی طرح لپیٹ لجھتے۔ باہر سردی ہے۔

میاں صاحب: شکریہ

ڈاکٹر جلال: تم نے اجازت دے دی؟

مس سلڈھانا: جی ہاں

ڈاکٹر جلال: میں نے بھی اجازت دے دی۔۔۔ حالانکہ شرارت کے طور پر۔۔۔

مس سلڈھانا: حالانکہ شرارت کے طور پر میں بھی چاہتی تھی کہ اجازت نہ دوں۔

ڈاکٹر جلال: لیکن مجھے ترس آگیا۔

مس سلڈھانا: مجھے بھی۔

ڈاکٹر جلال: پورے ایک برس کے بعد وہ۔۔۔

مس سلڈھانا: ہاں پورے ایک برس کے بعد۔

ڈاکٹر جلال: میری انگلیوں کے نیچے اس کی نبض تیز ہو گئی، جب میں نے اس کو اجازت دی۔

مس سلڈھانا: اس کی بھی یہی کیفیت تھی۔

ڈاکٹر جلال: اس نے مجھ سے ڈرتے ہوئے کہا، ڈاکٹر! ایسا معلوم ہوتا ہے، میرا دل کمزور ہو گیا ہے۔۔۔ آپ کا روڈیو گرام لیجئے۔۔۔

مس سلڈھانا: اس نے بھی مجھ سے بھی کہا۔

ڈاکٹر جلال: میں نے اس کے ٹیکہ لگادیا۔

مس سلڈھانا: میں نے بھی۔۔۔ صرف سادہ پانی کا۔

ڈاکٹر جلال: سادہ پانی بہترین چیز ہے۔

مس سلڈھانا: جلال! اگر تم اس بیگم کے شوہر ہوتے؟

ڈاکٹر جلال: اگر تم اس میاں کی بیوی ہو تویں؟

مس سلڈھانا: میرا کیر کیٹر خراب ہو گیا ہوتا!

ڈاکٹر جلال: میرا جنازہ اٹھ گیا ہوتا!

مس سلڈھانا: یہ بھی تمہارے کیر کیٹر کی خرابی کہلاتی۔

ڈاکٹر جلال: ہم جب بھی سوسائٹی کے ان الودع کو دیکھنے آتے ہیں، ہمارا کیرکٹر خراب ہو جاتا ہے۔

مس سلڈھانا: آج بھی ہو گا؟

ڈاکٹر جلال: بہت زیادہ۔

مس سلڈھانا: مگر مصیبت یہ ہے کہ ان کا لبے لبے و قفوں کے بعد ہوتا ہے۔

بیگم صاحبہ: لیدی چڑیز لور، یہ آپ نے تیکے کے نیچے کیوں رکھی ہوئی ہے؟

میاں صاحب: میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ کتاب کتنی بے ہودہ اور وابحیات ہے۔

بیگم صاحبہ: میں بھی آپ کے ساتھ دیکھوں گی۔

میاں صاحب: میں جستہ جستہ دیکھوں گا، پڑھتا جاؤں گا۔ آپ بھی سنتی جائیے۔

بیگم صاحبہ: بہت اچھا رہے گا۔

میاں صاحب: میں نے مدخلے صاحبزادے کی روزانہ غذا میں ڈاکٹر کے مشورے سے تبدیلیاں کرائی ہیں۔

بیگم صاحبہ: مجھے یقین تھا کہ آپ نے اس معاملے میں غفلت نہیں بر تی ہو گی۔

میاں صاحب: میں نے اپنی زندگی میں کبھی آج کا کام کل پر نہیں چھوڑا۔

بیگم صاحبہ: میں جانتی ہوں۔۔۔ اور خاص کر آج کا کام تو آپ کبھی۔۔۔

میاں صاحب: آپ کا مزاج کتنا شگفتہ ہے۔۔۔

بیگم صاحبہ: یہ سب آپ کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

میاں صاحب: میں بہت محفوظ ہوا ہوں۔۔۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو۔۔۔

بیگم صاحبہ: ٹھہر یئے! کیا آپ نے دانت صاف کیے؟

میاں صاحب: جی ہاں! میں دانت صاف کر کے اور ڈیٹول کے غارے کر کے آیا تھا۔

بیگم صاحبہ: میں بھی

میاں صاحب: اصل میں ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بنائے گئے تھے

بیگم صاحبہ: اس میں کیا شک ہے

میاں صاحب: میں جستہ جستہ یہ بے ہود کتاب پڑھنا شروع کروں۔

بیگم صاحبہ: ٹھہر یئے! ذرا میری نبض دیکھئے۔

میاں صاحب: کچھ تیز چل رہی ہے۔۔۔ میری دیکھئے۔

بیگم صاحبہ: آپ کی بھی تیز چل رہی ہے

میاں صاحب: وجہ؟

بیگم صاحبہ: دل کی کمزوری!

میاں صاحب: بھی وجہ ہو سکتی ہے۔۔۔ لیکن ڈاکٹر جلال نے کہا تھا کوئی خاص بات نہیں۔

بیگم صاحبہ: مس سلڈھانے بھی بھی کہا تھا۔

میاں صاحب: اچھی طرح امتحان کر کے اس نے اجازت دی تھی؟

بیگم صاحبہ: بہت اچھی طرح امتحان کر کے اجازت دی تھی۔

میاں صاحب: تو میرا خیال ہے کوئی حرج نہیں

بیگم صاحبہ: آپ بہتر سمجھتے ہیں۔۔۔ ایسا نہ ہو، آپ کی صحت۔۔۔

میاں صاحب: اور آپ کی صحت بھی۔۔۔

بیگم صاحبہ: اچھی طرح سوچ سمجھ کر ہی قدم اٹھانا چاہیے۔

میاں صاحب: مس سلڈھانے اس کا تو بندوبست کر دیا ہے نا؟

بیگم صاحبہ: کس کا۔۔۔؟ ہاں، ہاں، اس کا تو بندوبست کر دیا ہے اس نے۔

میاں صاحب: یعنی اس طرف سے تو پورا اطمینان ہے۔

بیگم صاحبہ: جی ہاں!

میاں صاحب: ذرا اب دیکھئے نبض؟

بیگم صاحبہ: اب تو۔۔۔ ٹھیک چل رہی ہے۔۔۔ میری؟

میاں صاحب: آپ کی بھی نور مل ہے۔

بیگم صاحبہ: اس بے ہودہ کتاب کا کوئی پیر اوپڑھیے۔

میاں صاحب: بہتر۔۔۔ نبض پھر تیز ہو گئی۔

بیگم صاحبہ: میری بھی۔

میاں صاحب: نوکروں سے مطلوبہ سامان رکھوادیا آپ نے کمرے میں؟

بیگم صاحبہ: جی ہاں! سب چیزیں موجود ہیں۔

میاں صاحب: اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو میرا اُمپر پھر لے لجھے۔

بیگم صاحبہ: کیا آپ تکلیف نہیں کر سکتے۔۔۔ اسٹاپ و اچ موجود ہے۔ نبض کی رفتار بھی دیکھ لجھے۔

میاں صاحب: ہاں! یہ بھی نوٹ ہونی چاہیے۔

بیگم صاحبہ: سملنگ سالٹ کہاں ہے؟

میاں صاحب: دوسری چیزوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔

بیگم صاحبہ: جی ہاں! پڑا ہے تپائی پر۔

میاں صاحب: کمرے کا ٹمپر پھر میرا خیال ہے تھوڑا سا بڑھا دینا چاہیے۔

بیگم صاحبہ: میرا بھی یہی خیال ہے۔

میاں صاحب: نقاہت زیادہ ہو گئی تو مجھے دوادینانہ بھولیے گا۔

بیگم صاحبہ: میں کوشش کروں گی اگر۔۔۔

میاں صاحب: ہاں ہاں۔۔۔! بصورت دیگر آپ تکلیف نہ اٹھائیے گا۔

بیگم صاحبہ: آپ یہ صفحہ۔۔۔ یہ پورا صفحہ پڑھیے۔۔۔

میاں صاحب: سنئے!

بیگم صاحبہ: یہ آپ کو چھینک کیوں آئی؟

میاں صاحب: معلوم نہیں۔

بیگم صاحبہ: حیرت ہے۔

میاں صاحب: مجھے خود حیرت ہے۔

بیگم صاحبہ: اوہ۔۔۔ میں نے کمرے کا ٹمپر بچ بڑھانے کے بجائے گھٹا دیا تھا۔۔۔ معافی چاہتی ہوں۔

میاں صاحب: یہ اچھا ہوا کہ چھینک آگئی اور بروقت پتہ چل گیا۔

بیگم صاحبہ: مجھے بہت افسوس ہے۔

میاں صاحب: کوئی بات نہیں۔ بارہ قطربے برانڈی اس کی تلافی کر دیں گے۔

بیگم صاحبہ: ٹھہریئے۔۔۔! مجھے ڈالنے دیں۔ آپ سے گنے میں غلطی ہو جایا کرتی ہے۔

میاں صاحب: یہ تو درست ہے۔ آپ ڈال دیجئے۔

بیگم صاحبہ: آہستہ آہستہ پیچھے

میاں صاحب: اس سے زیادہ آہستہ اور کیا ہو گا؟

بیگم صاحبہ: طبیعت بحال ہوئی؟

میاں صاحب: ہورہی ہے۔

بیگم صاحبہ: آپ تھوڑی دیر آرام کر لیں۔

میاں صاحب: ہاں--- میں خود اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔

نوکر: کیا بات ہے، آج بیگم صاحبہ نظر نہیں آئیں؟

نوکرانی: طبیعت ناساز ہے ان کی۔

نوکر: میاں صاحب کی طبیعت بھی ناساز ہے۔

نوکرانی: ہمیں معلوم تھا۔

نوکر: ہاں! لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

نوکرانی: کیا؟

نوکر: یہ قدرت کا تماشا--- ہمیں تو آج بستر مرگ پر ہونا چاہیے تھا۔

نوکرانی: کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہو۔ بستر مرگ پر ہوں وہ---

نوکر: نہ چھیڑوان کے بستر مرگ کا ذکر--- بڑا شاندار ہو گا--- خواہ مخواہ میرا جی چاہے گا کہ اٹھا کر اپنی کوٹھری میں لے جاؤ۔

نوکرانی: کہاں چلے؟

نوکر بنڈھنی ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔۔۔ چارپائی اب بالکل جواب دے چکی ہے۔

نوکرانی: ہاں! اس سے کہنا، مضبوط لکڑی لگائے۔

-[48]-

عزت کے لیے: سعادت حسن منٹو

چونی لال نے اپنی موڑ سائیکل اسٹال کے ساتھ روکی اور گدی پر بیٹھے بیٹھے صبح کے تازہ اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔ سائیکل رکتے ہی اسٹال پر بیٹھے ہوئے دونوں ملازموں نے اسے نمستے کہی تھی جس کا جواب چونی لال نے اپنے سرکی خفیف جنبش سے دے دیا تھا۔ سرخیوں پر سرسری نظر ڈال کر چونی لال نے ایک بندھے ہوئے بندھل کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اسے فوراً دے دیا گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی بی ایس اے موڑ سائیکل کا انجمن اسٹارٹ کیا اور یہ جاوہ جا۔

موڈرن نیوز ایجنٹی قائم ہوئے پورے چار بر سہ ہو چلے تھے۔ چونی لال اس کا مالک تھا لیکن ان چار بر سوں میں وہ ایک دن بھی اسٹال پر نہیں بیٹھا تھا۔ وہ ہر روز صبح اپنی موڑ سائیکل پر آتا، ملازموں کی نمستے کا جواب سرکی خفیف جنبش سے دیتا۔ تازہ اخباروں کی سرخیاں ایک نظر دیکھتا، ہاتھ بڑھا کر بندھا ہوا بندھل لیتا اور چلا جاتا۔

چونی لال کا اسٹال معمولی اسٹال نہیں تھا۔ حالانکہ امر تسری میں لوگوں کو انگریزی اور امریکی رسالوں اور پرچوں سے کوئی اتنی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن موڈرن نیوز ایجنٹی ہر اچھا انگریزی اور امریکی رسالہ منگواتی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ چونی لال منگواتا تھا۔ حالانکہ اسے پڑھنے وڑھنے کا بالکل شوق نہیں تھا۔

شہر میں بہت کم آدمی جانتے تھے کہ موڈرن نیوز ایجنٹی کھولنے سے چونی لال کا اصل مقصد کیا تھا۔ یوں تو اس سے چونی لال کو خاصی آمدن ہو جاتی تھی اس لیے کہ وہ قریب قریب ہر بڑے اخبار کا ایجنت تھا لیکن سمندر پار سے جو اخبار اور رسالے آتے بہت ہی کم بکتے، پھر بھی ہر ہفتے ولائب کی ڈاک سے موڈرن نیوز ایجنٹی کے نام سے کئی خوبصورت بندھل اور پیکٹ آتے ہی رہتے۔ اصل میں چونی لال یہ پرے اور

رسالے بیچنے کیلئے نہیں بلکہ مفت بانٹنے کے لیے منگو اتنا تھا چنانچہ ہر روز صبح سوریرے وہ ان ہی پر چوں کا بندل لینے آتا تھا جو اس کے ملازموں نے باندھ کر الگ چھوڑے ہوتے تھے۔

شہر کے جتنے بڑے افسر تھے سب چونی لال کے واقف تھے۔ بعض کی واقفیت صرف یہیں تک محدود تھی کہ ہر ہفتے ان کے یہاں جو انگریزی اور امریکی پرچے آتے ہیں، شہر میں کوئی ایک موڈرن نیوز ایجنسی ہے، اس کا مالک چونی لال ہے، وہ بھیجتا ہے اور مل کبھی روانہ نہیں کرتا۔ بعض ایسے بھی تھے جو اس کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ مثال کے طور پر ان کو معلوم تھا کہ چونی لال کا گھر بہت ہی خوبصورت ہے۔ ہے تو چھوٹا سا مگر بہت ہی نفس طریقے پر سجا ہے۔ ایک نو کرہے راما، بڑا صاف سترہ اور سونی صدی نو کر۔ سمجھدار، معمولی سا اشارہ سمجھنے والا جس کو صرف اپنے کام سے غرض ہے۔ دوسرا کیا کرتے ہیں کیا نہیں کرتے اس سے اس کو دلچسپی نہیں۔ چونی لال گھر پر موجود ہو جب بھی ایک بات ہے۔ موجود نہ ہو جب بھی ایک بات ہے۔ مہماں کس غرض سے آیا ہے۔۔۔ یہ اس کو اس کی شکل دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ کبھی ضرورت محسوس نہیں ہو گی کہ اس سے سوٹے برف کے لیے کہا جائے یا پانوں کا آرڈر دیا جائے۔ ہر چیز خود بخود وقت پر مل جائے گی اور پھر تاک جھانک کا کوئی خدشہ نہیں۔ اس بات کا بھی کوئی کھانا نہیں کہ بات کہیں باہر نکل جائے گی۔ چونی لال اور اس کا نوکر راما دونوں کے ہونٹ دریا کے دریاپینے پر بھی خشک رہتے تھے۔

مکان بہت ہی چھوٹا تھا۔ بمبئی اسٹائل کا۔ یہ چونی لال نے خود بنوایا تھا۔ باپ کی وفات پر اسے دس ہزار روپیہ ملا تھا۔ جس میں سے پانچ ہزار اس نے اپنی چھوٹی بہن روپا کو دے دیے تھے اور جدی مکان بھی اور خود علیحدہ ہو گیا تھا۔ روپا اپنی ماں کے ساتھ اس میں رہتی تھی اور چونی لال اپنے بیسے اسٹائل کے مکان میں۔ شروع شروع میں ماں بہن نے بہت کوشش کی کہ وہ ان کے ساتھ رہے۔ ساتھ نہ رہے تو کم از کم ان سے ملتا ہی رہے مگر چونی لال کو ان دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے اپنی ماں اور بہن سے نفرت تھی۔ دراصل اسے شروع ہی سے ان دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ باپ سے ضرور تھی کہ وہ تھانیدار تھا۔ لیکن جب وہ ریٹائر ہوا تو چونی لال کو اس سے بھی کوئی دلچسپی نہ رہی۔ جس وقت اسے کانٹے میں کسی سے کہنا پڑتا کہ اس کے والد ریٹائر ڈپلیس انسپکٹر ہیں تو اسے بہت کوفت ہوتی۔

چونی لال کو اچھی پوشش اور اچھے کھانے کا بہت شوق تھا۔ طبیعت میں نفاست تھی۔ چنانچہ وہ لوگ جو اس کے مکان میں ایک دفعہ بھی گئے، اس کے سلیقے کی تعریف اب تک کرتے ہیں۔ این ڈبلیو آر کے ایک نیلام میں اس نے ریل کے ڈبے کی ایک سیٹ خریدی تھی۔ اس کو اس نے اپنے دماغ سے بہت ہی عمدہ دیوان میں تبدیل کروالیا تھا۔ چونی لال کو یہ اس قدر پسند تھا کہ اسے اپنی خوابگاہ میں رکھوایا ہوا تھا۔

شراب اس نے کبھی چھوئی نہیں تھی لیکن دوسروں کو پلانے کا بہت شوق تھا۔ ایرے غیرے کو نہیں، خاص اخاص آدمیوں کو، جن کی سوسائٹی میں اوپری پوزیشن ہو، جو کوئی مرتبہ رکھتے ہوں، چنانچہ ایسے لوگوں کی وہ اکثر دعوت کرتا۔ کسی ہو ٹل یا قہوہ خانے میں نہیں، اپنے گھر میں جو اس نے خاص اپنے لیے بنایا تھا۔

زیادہ پینے پر اگر کسی کی طبیعت خراب ہو جائے تو اسے کسی تردود کی ضرورت نہ ہوتی کیونکہ چونی لال کے پاس ایسی چیزیں ہر وقت موجود ہتی تھیں۔ جن سے نشہ کم ہو جاتا تھا۔ ڈر کے مارے کوئی گھرنہ جانا چاہے تو علیحدہ بجے سجائے دوکرے موجود تھے۔۔۔ چھوٹا سا ہال تھا۔ اس میں کبھی کبھی مجرے بھی ہوتے تھے۔

اکثر ایسا بھی ہوا کہ چونی لال کے اس مکان میں اس کے دوست کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں اپنی سہیلیوں سمیت رہے۔ لیکن اس نے ان کو مطلق خبر نہ ہونے دی کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ البتہ جب اس کا کوئی دوست ان کی ان نوازشوں کا شکریہ ادا کرتا تو چونی لال غیر متوقع طور پر بے تکلف ہو کر کہتا، ”کیا کہتے ہو یار۔۔۔ مکان تمہارا اپنا ہے۔“ عام گنتگو میں وہ اپنے دوستوں کے اوپرے مرتبے کے پیش نظر ایسا تکلف کبھی نہیں بر تھا۔

چونی لال کا باپ لاہ گردھاری لال عین اس وقت ریٹائر ہوا جب چونی لال تھرڈ ڈوڑھن میں اٹھ نس پاس کر کے کالج میں داخل ہوا۔ پہلے تو یہ تھا کہ صبح شام گھر پہ ملنے والوں کا تانتا بندھار ہتا تھا۔ ڈالیوں پر ڈالیاں آرہی ہیں۔ رشوت کا بازار گرم ہے۔ تختواہ بونس سیدھی بنک میں چلی جاتی تھی۔ لیکن ریٹائر ہونے پر کچھ ایسا پانسہ پلٹا کہ لاہ گردھاری لال کا نام جیسے بڑے آدمیوں کے رجسٹر سے کٹ گیا۔ یوں تو جمع پونجھی کافی تھی لیکن لاہ گردھاری لال نے بیکار مباش کچھ کیا کر، مکانوں کا سٹھ کھلینا شروع کر دیا اور دو برسوں ہی میں آدھی سے زیادہ جائیداد گنوا دی، پھر لمبی بیماری نے آگھیر۔ ان تمام واقعات کا چونی لال پر عجیب و غریب اثر ہوا۔ لاہ گردھاری لال کا حال پتلا ہونے کے ساتھ چونی لال کے دل میں اپنا پرانا ٹھاٹ اور اپنی پرانی ساکھ قائم رکھنے کی خواہش بڑھتی گئی اور آخر میں اس کے ذہن نے آہستہ آہستہ کچھ ایسی کروٹ بدی کہ وہ بڑے آدمیوں کا بظاہر ہم جلیں تھا، ہم پیالہ و ہم نوالہ تھا لیکن اصل میں وہ ان سے بہت دور تھا۔ ان کے رتبے سے، ان کی جاہ و منزلت سے البتہ اس کا وہی رشتہ تھا جو ایک بت سے چباری کا ہو سکتا ہے یا ایک آقا سے ایک غلام کا۔

ہو سکتا ہے کہ چونی لال کے وجود کے کسی گوشے میں بہت ہی بڑا آدمی بننے کی خواہش تھی جو وہیں کی وہیں دب گئی اور یہ صورت اختیار کر گئی جواب اس کے دل و دماغ میں تھی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جو کچھ بھی وہ کرتا، اس میں انتہائی درجے کا خلوص تھا۔ کوئی بڑا آدمی اس سے ملے نہ ملے یہی کافی تھا کہ وہ اس کے دیے ہوئے امر کی اور انگریزی پر پہ ایک نظر دیکھ لیتا ہے۔

فسادات ابھی شروع نہیں ہوئے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تقسیم کی بات بھی ابھی نہیں چلی تھی کہ چونی لال کی بہت دونوں کی مراد پوری ہوتی نظر آئی۔ ایک بہت ہی بڑے افسر تھے جس سے چونی لال کی جان پہچان نہ ہو سکی تھی۔ ایک دفعہ اس کے مکان پر شہر کی سب سے خوبصورت طوائف کا مجرہ ہوا۔ چند دوستوں کے ہمراہ اس بڑے افسر کا شر میلا بیٹا ہر بنس بھی چلا آیا۔ چنانچہ جب چونی لال کی اس نوجوان سے دوستی ہو گئی تو اس نے سمجھا کہ ایک نہ ایک دن اس کے باپ سے بھی راہ و رسم پیدا ہو ہی جائے گی۔

ہر بنس جس نے تعیش کی زندگی میں نیانیا قدم رکھا تھا بہت ہی الھڑ تھا۔ چونی لال خود تو شراب نہیں پیتا تھا لیکن ہر بنس کا شوق پورا کرنے کے لیے اور اسے شراب نوشی کے ادب آداب سکھانے کے لیے ایک دو دفعہ اسے بھی پینی پڑی۔ لیکن بہت ہی قلیل مقدار میں۔ لڑکے کو شراب پینی آگئی۔ تو اس کا دل کسی اور چیز کو چاہا۔ چونی لال نے یہ بھی مہما کر دی اور کچھ اس انداز سے کہ ہر بنس کو جھینپنے کا موقع نہ ملنے دیا۔ جب کچھ دن گزر گئے تو چونی لال کو محسوس ہوا کہ ہر بنس ہی کی دوستی کافی ہے کیونکہ اسی کے ذریعے سے وہ لوگوں کی سفارشیں پوری کر لیتا تھا۔ ویسے تو شہر میں چونی لال کے اثر و رسوخ کا ہر شخص قائل تھا۔ لیکن جب سے ہر بنس اس کے حلقة واقفیت میں آیا تھا اس کی دھاک اور بھی زیادہ بیٹھ گئی تھی۔

اکثر یہی سمجھتے تھے کہ چونی لال اپنے اثر و رسوخ سے ذاتی فائدہ اٹھاتا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اس نے اپنے لیے کبھی کسی سے سفارش نہیں کی تھی۔ اس کو شوق تھا دوسروں کے کام کرنے کا اور انھیں اپنا ممنون احسان بنانے کا بلکہ یوں کہیے کہ ان کے دل و دماغ پر کچھ ایسے خیالات۔۔۔ طاری کرنے کا کہ بھئی کمال ہے۔۔۔ ایک معمولی سی نیوز ایجنسی کا ماں کہے لیکن بڑے بڑے حامکوں تک اس کی رسائی ہے۔ بعض یہ سمجھتے تھے کہ وہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔۔۔ جتنے منہ اتنی باتیں، لیکن چونی لال حقیقت میں جو کچھ تھا بہت ہی کم آدمی جانتے تھے۔ ایک کو خوش کیجیے تو بہت سوں کو ناراض کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ چونی لال کے جہاں احسان مند تھے وہاں دشمن بھی تھے اور اس تک میں رہتے تھے کہ موقع ملے اور اس سے بدلا لیں۔

فسادات شروع ہوئے تو چونی لال کی مصروفیات زیادہ ہو گئیں۔ مسلمان اور ہندوؤں دونوں کے لیے اس نے کام کیا لیکن صرف ان ہی کے لیے جن کا سوسائٹی میں کوئی درجہ تھا۔ اس کے گھر کی رونق بھی بڑھ گئی۔ قریب قریب ہر روز کوئی نہ کوئی سلسلہ رہتا۔ اسٹور روم جو سیڑھیوں کے نیچے تھا، شراب اور بیسر کی خالی بو تلوں سے بھر گیا تھا۔

ہر بنس کا الٹر پن اب بہت حد تک دور ہو چکا تھا۔ اب اسے چونی لال کی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ بڑے آدمی کا لڑکا تھا۔ فسادات نے دستز خوان بچھا کر نئی نئی چیزیں اس کے لیے چن دی تھیں۔ چنانچہ قریب قریب ہر روز وہ چونی لال کے مکان میں موجود ہوتا۔

رات کے بارہ بجے ہوں گے۔ چونی لال اپنے کمرے میں ریل گاڑی کی سیٹ سے بنائے ہوئے دیوان پر بیٹھا اپنے لپس تو پرانگی گھمارہ تھا کہ دروازے پر زور کی دستک ہوئی۔ چونی لال چونک پڑا اور سوچنے لگا۔ بلوائی۔۔۔؟ نہیں۔۔۔! راما۔۔۔؟ نہیں! وہ تو کئی دنوں سے کرفیو کے باعث نہیں آ رہا تھا۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی اور ہر بنس کی سہی ہوئی ڈری ہوئی آواز آئی۔۔۔ چونی لال نے دروازہ کھولا۔ ہر بنس کا رنگ ہلدی کے گائھے کی طرح زرد تھا۔ ہونٹ تک پیلے تھے چونی لال نے پوچھا، ”کیا ہوا؟“

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔“ آواز ہر بنس کے سوکھے ہوئے گلے میں اٹک گئی۔

چونی لال نے اس کو دلا سادیا، ”گھبرائیے نہیں۔۔۔ بتائیے کیا ہوا ہے۔“

ہر بنس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری، ”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ لہو۔۔۔ بندھی نہیں ہوتا لہو۔“

چونی لال سمجھا تھا کہ شاید لڑکی مر گئی ہے۔ چنانچہ یہ سن کر اسے نا امیدی سی ہوئی۔ کیونکہ وہ لاش کو ٹھکانے لگانے کی پوری اسکیم اپنے ہوشیار دماغ میں تیار کر چکا تھا۔ ایسے موقعوں پر جب اس کے گھر میں اس کے مہمان کسی مشکل میں گرفتار ہو جائیں چونی لال کا دماغ غیر معمولی طور پر مستعد ہو جاتا تھا۔ مسکرا کر اس نے ہر بنس کی طرف دیکھا جو کہ لرز رہا تھا، ”میں سب ٹھیک کیے دیتا ہوں۔ آپ گھبرائیے نہیں۔“

یہ کہہ اس نے اس کمرے کا رنج کیا۔ جس میں ہر بنس تقریباً سات بجے سے ایک لڑکی کے ساتھ جانے کیا کرتا رہا تھا۔ چونی لال نے ایک دم بہت سی باتیں سوچیں۔ ڈاکٹر۔۔۔ نہیں۔ بات باہر نکل جائے گی۔ ایک بہت بڑے آدمی کی عزت کا سوال ہے اور یہ سوچتے ہوئے اسے عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس ہوتی کہ وہ ایک بہت بڑے آدمی کے نگ و ناموس کا محافظ ہے۔

راما۔۔۔؟ کرفیو کے باعث وہ کئی دنوں سے نہیں آ رہا تھا۔۔۔ برف۔۔۔؟ ہال بر فٹھیک ہے۔ ریفری چرپٹر موجود تھا۔۔۔ لیکن سب سے بڑی پریشانی چونی لال کو یہ تھی کہ وہ لڑکیوں اور عورتوں کے ایسے معاalon سے بالکل بے خبر تھا۔ لیکن اس نے سوچا کچھ بھی ہو۔ کوئی نہ کوئی اوپارے نکالنا ہی پڑے گا۔

چونی لال نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ ساگوان کے اسپرنگوں والے پینگ پر ایک لڑکی لیٹی تھی اور سفید چادرخون میں لقطری ہوئی تھی۔ چونی لال کو بہت گھن آئی لیکن وہ آگے بڑھا۔ لڑکی نے کروٹ بدی اور ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی، ”بھیا!

چونی لال نے چینچی ہوئی آواز میں کہا، ”روپا!“ اور اس کے دماغ میں اوپر تلے سینکڑوں باتوں کا انبار سالگ گیا۔ ان میں سب سے ضروری بات یہ تھی کہ ہر بنس کو پتا نہ چلے کہ روپا اس کی بہن ہے، چنانچہ اس نے منہ پر انگلی رکھ کر روپا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور باہر نکل کر معاملے پر غور کرنے کیلئے دروازہ کی طرف بڑھا۔ دلیز میں ہر بنس کھڑا تھا۔ اس کارنگ اب پہلے سے بھی زرد تھا۔ ہونٹ بالکل بے جان ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں وحشت تھی۔ چونی لال کو دو بدد دیکھ کر وہ چیچے ہٹ گیا۔ چونی لال نے دروازہ بھیڑ دیا۔ ہر بنس کی ٹانگیں کا نیچے لگیں۔

چونی لال خاموش تھا۔ اس کے چہرے کا کوئی خط بگڑا ہوا نہیں تھا۔ اصل میں وہ سارے معاملے پر غور کر رہا تھا۔ اس قدر تعقیق سے غور کر رہا تھا کہ وہ ہر بنس کی موجودگی سے بھی غافل تھا مگر ہر بنس کو چونی لال کی غیر معمولی خاموشی میں اپنی موت دکھائی دے رہی تھی۔ چونی لال اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو ہر بنس زور سے چیخا اور دوڑ کر اس میں داخل ہوا۔ بہت ہی زور سے کا پتتے ہوئے ہاتھوں سے ریل گاڑی کی سیٹ والے دیوان پر سے پستول اٹھایا اور باہر نکل کر چونی لال کی طرف تان دیا۔ چونی لال پھر بھی کچھ نہ بولا وہ ابھی تک معاملہ سلب جانے میں مستغرق تھا۔ سوال ایک بہت بڑے آدمی کی عزت کا تھا۔

پستول ہر بنس کے ہاتھ میں کپکپانے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد فیصلہ ہو جائے لیکن وہ اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہتا تھا۔ دونوں چونی لال اور ہر بنس کچھ دیر خاموش رہے۔۔۔ لیکن ہر بنس زیادہ دیر تک چپ نہ رہ سکا۔ اس کے دل و دماغ میں بڑی ہلچل پھی ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک دم اس نے بولنا شروع کیا، ”میں۔۔۔ میں۔۔۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔۔۔ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ یہ۔۔۔ کہ یہ تمہاری بہن ہے۔۔۔ یہ ساری شرارت اس مسلمان کی ہے۔۔۔ اس مسلمان سب انسپکٹر کی۔۔۔ کیانام ہے اس کا۔۔۔ کیانام ہے اس کا۔۔۔ محمد طفیل۔۔۔ ہاں ہاں محمد طفیل۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ بشیر احمد۔۔۔ نہیں نہیں محمد طفیل۔۔۔ وہ طفیل جس کی ترقی تم نے رکوئی تھی۔۔۔ اس نے مجھے یہ لڑکی لا کر دی اور کہا مسلمان ہے۔۔۔ مجھے معلوم ہوتا تمہاری بہن ہے تو کیا میں اسے یہاں لے کر آتا۔۔۔ تم۔۔۔ تم۔۔۔ تم بولتے کیوں نہیں۔۔۔ تم

بولتے کیوں نہیں۔“ اور اس نے چلانا شروع کر دیا، ”تم بولتے کیوں نہیں۔۔۔ تم مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہو۔۔۔ تم مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہو۔۔۔ لیکن میں کہتا ہوں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔۔۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔۔۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔“

چونی لال نے ہولے سے کہا، ”مگر ایسے نہیں۔۔۔ آپ کے پتابجی کی عزت کا سوال ہے۔“ لیکن ہر بنس پچھ چلا رہا تھا۔ اس نے کچھ نہ سنا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پستول داغ دیا۔

تیرے روز کر فیو ہٹنے پر چونی لال کے دونوں کروں نے موڈرن نیوز ایجنٹی کا اسٹال کھولا۔ تازہ اخبار اپنی اپنی جگہ پر رکھے۔ چونی لال کے لیے اخباروں اور رسالوں کا ایک بندل باندھ کر الگ رکھ دیا مگر وہ نہ آیا۔ کئی راہ چلتے آدمیوں نے تازہ اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالتے ہوئے معلوم کیا کہ موڈرن نیوز ایجنٹی کے مالک چونی لال نے اپنی سگنی بہن کے ساتھ منہ کالا کیا اور بعد میں گولی مار کر خود کشی کر لی۔

-[49]-

برمی لڑکی: سعادت حسن منشو

گیان کی شوٹنگ تھی اس لیے کفایت جلدی سو گیا۔ فلیٹ میں اور کوئی نہیں تھا۔ یہوی بچے را ولپنڈی چلے گئے تھے۔ ہمسایوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یوں بھی بھبھی میں لوگوں کو اپنے ہمسایوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ کفایت نے اکیلے برائٹی کے چارپیگ پیے۔ کھانا کھایا۔ نوکروں کو رخصت کیا اور دروازہ بند کر کے سو گیا۔

رات کے پانچ بجے کے قریب کفایت کے خمار آلود کانوں کو دھک کی آواز سنائی دی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ نیچے بازار میں ایک ٹریم دندناتی ہوئی گزری۔ چند لمحات کے بعد دروازے پر بڑے زوروں کی دستک ہوئی۔ کفایت اٹھا۔ پلنگ سے اتر تو اس کے ننگے پیر ٹخنوں تک پانی میں چلے گئے۔ اس کو سخت حریت ہوئی کہ کمرے میں اتنا پانی کہاں سے آیا اور باہر کوئی ڈور میں اس سے بھی زیادہ پانی تھا۔ دروازے پر دستک جاری تھی، اس نے پانی کے متعلق سوچنا چھوڑا اور دروازہ کھولا۔

گیان نے زور سے کہا، ”یہ کیا ہے؟“

کفایت نے جواب دیا، ”پانی“

”پانی نہیں۔۔۔ عورت!“ یہ کہہ کر گیان نیم اندر ہیرے کو روی ڈور میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ایک چھوٹے سے قد کی لڑکی تھی۔ گیان کو فرش پر پھیلے ہوئے پانی کا کچھ احساس نہ ہوا۔ لڑکی نے پائیجا مہ اور اٹھالیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی گیان کے پیچھے چلی گئی۔ کفایت کے ذہن میں پہلے پانی تھا۔ اب یہ لڑکی اس میں داخل ہو گئی اور ڈکیاں لگانے لگی۔ سب سے پہلے اس نے سوچا کہ یہ کون ہے؟ شکل صورت اور لباس کے اعتبار سے برمی معلوم ہوتی ہے لیکن گیان اسے کہاں سے لے آیا؟

گیان اندر کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کیے بغیر پینگ پر لیٹا اور لیٹتے ہی سو گیا۔ کفایت نے اس سے بات کرنا چاہی مگر اس نے صرف ہوں ہاں میں جواب دیا اور آنکھیں نہ کھولیں۔ کفایت نے اس لڑکی کی طرف ایک نظر دیکھا جو سامنے والے پینگ پر بیٹھی تھی اور باہر نکل گیا۔ باور پچی خانے میں جا کر اسے معلوم ہوا کہ رہڑکا وہ پائپ جورات کو بڑا اور بھرا کرتا تھا بہر نکلا ہوا ہے۔ تین بجے جب نیل میں پانی آیا تو اس نے نہماں کمرے سیراب کر دیے۔ تینوں نو کرباہر گلی میں سور ہے تھے۔ کفایت نے ان کو جگا دیا اور پانی خارج کرنے کے کام پر لگا دیا وہ خود بھی ان کے ساتھ شریک تھا۔ سب چلو وؤں سے پانی اٹھاتے تھے اور بالیوں میں ڈالتے جاتے تھے۔ اس برمی لڑکی نے جب ان کو یہ کام کرتے دیکھا تو حجھٹ پٹ سینڈل اتار کر ان کا ہاتھ بٹانے لگی۔

اس کے چھوٹے چھوٹے گورے ہاتھ انگلیوں کے ناخن بڑھائے ہوئے اور سرخی لگے نہیں تھے۔ چھوٹے چھوٹے کٹے ہوئے بال تھے جن میں پلکی بلکل لہریں تھیں۔ مردار موضع کا مگر کھلا ریشمی پاجامہ پہنے تھی۔ اس پر سیاہ رنگ کاریشمی کرتا تھا جس میں اس کی چھوٹی چھوٹی چھاتیاں چھپی ہوئی تھیں۔

جب اس نے ان لوگوں کا ہاتھ بنانا شروع کیا تو کفایت نے اسے منع کیا، ”آپ تکلیف نہ کبھی یہ کام ہو جائے گا۔“ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چھوٹے چھوٹے سرخی لگے ہوئوں سے مسکرائی اور کام میں لگی رہی۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر تینوں کمروں سے پانی نکل گیا۔ کفایت نے سوچا چلو یہ بھی اچھا ہوا اسی بہانے سارا گھر دھل کر صاف ہو گیا۔

وہ برمی لڑکی ہاتھ دھونے کے لیے غسل خانے میں چلی گئی۔ کفایت کر سیدھی کرنے کے لیے بستر پر لیٹا، نیند پوری نہیں ہوئی تھی، سو گیا۔

تقریباً نوبجے وہ جاگا اور جاگتے ہی اسے سب سے پہلے پانی کا خیال آیا۔ پھر اس نے بر می لڑکی کے متعلق سوچا جو گیاں کے ساتھ آئی تھی، ”کہیں خواب تو نہیں تھا لیکن یہ سامنے گیاں سورہا ہے اور فرش بھی دھلا ہوا ہے۔“

کفایت نے غور سے گیاں کی طرف دیکھا۔ وہ پتلون کوٹ بلکہ جوتے سمیت اوندھا سورہا تھا۔ کفایت نے اس کو جگایا۔ اس نے ایک آنکھ کھولی اور پوچھا، ”کیا ہے؟“

”یہ لڑکی کون ہے؟“

گیاں ایک دم چونکا، ”لڑکی۔۔۔ کہاں ہے؟“ پھر فوراً ہی چت لیٹ گیا۔

”اوہ۔۔۔ بکواس نہ کرو۔۔۔ ٹھیک ہے۔“

کفایت نے اسے پھر جگانے کی کوشش کی مگر وہ خاموش سویا رہا۔ اس کو ساڑھے نوبجے اپنے کام پر جانا تھا۔ اس نے جلدی جلدی غسل کیا۔ شیو بھی غسل خانے کے اندر ہی کر لیا۔ باہر نکل کر ڈرائیگ روم میں گیا تو اس کو میز سبی ہوئی نظر آئی۔

صحن ناشستہ پر عام طور پر کفایت کے ہاں بہت سی منتشر چیزیں ہوتی تھیں۔ دوابلے ہوئے انڈے۔ دلوس۔ مکھن اور چائے۔۔۔ مگر آج میز رنگین تھی۔ اس نے غور سے دیکھا، جھلکے ہوئے انڈے عجیب و غریب انداز میں کٹے ہوئے تھے کہ پھول معلوم ہوتے تھے۔ سلااد تھا بڑے خوابصورت طریقے سے پلیٹ میں سجا ہوا۔ تو سوں پر بھی مینا کاری کی ہوئی تھی۔ کفایت چکر اگیا۔ باور پچی خانے میں گیا تو وہ بر می لڑکی چوکی پر بیٹھی سامنے اٹکنیٹھی رکھ کر کچھ کہ رہی تھی۔ تینوں نوکراں کے ارد گرد تھے اور ہنس ہنس کر اس سے باتیں کر رہے تھے۔ کفایت کو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ بر می لڑکی نے آنکھیں گھما کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔

کفایت نے اس سے بات کرنا چاہی لیکن وہ کیسے کرتا۔ اس سے کیا کہتا، وہ اس کو جانتا تک نہیں تھا۔ اس نے اپنے ایک نوکر سے صرف اتنا پوچھا، ”یہ ناشستہ آج کس نے تیار کیا ہے بشیر؟“

بشير نے اس بر می لڑکی کی طرف اشارہ کیا، ”بائی جی نے۔“

وقت بہت کم تھا۔ کفایت نے جلدی بانکا سجیلانا شستہ کھایا اور کپڑے پہن کر اپنے دفتر روانہ ہو گیا۔ شام کو واپس آیا تو وہ بر می لڑکی اس کے سلپینگ سوٹ کا اکلوتا پاجامہ پہنے اپنا کرتہ استری کر رہی تھی۔ کفایت پیچھے ہٹ گیا، کیونکہ وہ صرف پاجامہ پہنے تھی۔

”آجائیے۔“

لبھہ بڑا صاف ستھرا تھا۔ کفایت نے سوچا کہ بر می لڑکی کی بجائے شاید کوئی اور بولا ہے۔ جب وہ اندر گیا تو اس لڑکی نے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کر کے اس کو سلام کیا۔ کفایت کی موجودگی میں اس نے کوئی حجاب محسوس نہ کیا۔ بڑے سکون سے وہ اپنا سیاہ کرتا استری کرتی رہی۔ کفایت نے دیکھا اس کی چھوٹی چھوٹی گول چھاتیوں کے درمیانی حصے میں استری کی گرمی کے باعث پسینے کی نہیں نہیں بوندیں جمع ہو گئی تھیں۔

کفایت نے گیان کے بارے میں پوچھنے کے لیے بشیر کو آواز دینا چاہی مگر رک گیا۔ اس نے مناسب خیال نہ کیا کیونکہ وہ لڑکی آدمی ننگی تھی۔ اس نے ہیٹ اتار کر ایک طرف رکھا۔ تھوڑی دیر اس نیم عربی کو دیکھا مگر کوئی یہ جان محسوس نہ کیا۔ لڑکی کا بدنبے داغ تھا۔ جلد نہایت ہی ملائم تھی اتنی ملائم کہ نگاہیں پھسل پھسل جاتی تھیں۔

کرتا استری ہو گیا تو اس نے سوچ کچھ اوف کیا۔ ایک کرتا اور بھی تھا سفید بو سکی کا، جو تمہہ کیا ہو اسٹری شدہ پاجامے پر رکھا، اس نے یہ سب کپڑے اٹھائے اور کفایت سے مخاطب ہوئی، ”میں نہانے چلی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ کفایت ٹوپی اتار کر سر کھجلانے لگا، ”کون ہے یہ؟“

اس کے داغ میں بڑی کھبدہ ہو رہی تھی۔ جب وہ اس لڑکی کے متعلق سوچتا سارا واقعہ اس کے سامنے آ جاتا۔ رات کو اس کا اٹھنا۔ پانی ہی پانی۔ اس کا دروازہ کھولنا اور کہنا ”پانی“ اور گیان کا یہ جواب دینا ”پانی نہیں عورت“ اور ایک نہیں سی گڑیا کا چھم سے اندر آ جانا۔

کفایت نے دل میں کہا، ہٹاؤ جی۔ گیان آئے گا تو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ لوندیا ہے دلچسپ۔۔۔ اتنی چھوٹی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ آدمی جیب میں رکھ لے۔۔۔ چلو بر انڈی پیسیں۔

بشیر نے گلاس، برانڈی اور برف وغیرہ سب کچھ ملاقاتی کمرے میں تپائی پر رکھ دیا تھا۔ کفایت نے کپڑے بدے اور پینا شروع کر دی۔ پہلا پیک ختم کیا تو اسے غسل خانے کا دروازہ کھلنے کی ”چوں“ سنائی دی۔ دوسرا پیک ڈال کروہ انتظار کرنے لگا کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ بر می لڑکی ضرور ادھر آئے گی۔ اس کے مقررہ چار پیک ختم ہونے مگر وہ آئی۔ گیان بھی نہ آیا۔ کفایت جھنجھلا گیا۔ اندر بیدر روم میں جا کر اس نے دیکھا وہ لڑکی استری کیے ہوئے کپڑے پہنے اپنی گول گول چھاتیوں پر ہاتھ رکھے بڑے اطمینان سے سورہی تھی۔۔۔ استری والی میز پر اس کے سلیپنگ سوت کا ٹکلوتاپ اجسامہ بڑی اچھی طرح تہہ کیا ہوا رکھا تھا۔

کفایت نے واپس جا کر برانڈی کا ایک ڈبل پیک گلاس میں ڈالا اور نیٹ ہی چڑھا گیا۔۔۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا سر گھومنے لگا۔ اس نے بر می لڑکی کے متعلق سوچنے کی کوشش کی مگر اس نے ایسا محسوس کیا کہ وہ چلوؤں میں پانی بھر بھر کے اس کے دماغ میں ڈال رہی ہے۔ کھانا کھائے بغیر وہ صوفے پر لیٹ گیا اور اس بر می لڑکی کے متعلق کچھ سوچنے کی کوشش کرتے ہوئے سو گیا۔

صحیح ہوئی تو اس نے دیکھا کہ وہ صوفے کی بجائے اندر اپنے پلنگ پر ہے اس نے حافظے پر زور دیا، ”میں رات کب آیا یہاں۔۔۔ کیا میں نے کھانا کھایا تھا؟“

کفایت کو کوئی جواب نہ ملا۔ سامنے والا پلنگ خالی تھا۔ اس نے زور سے بشیر کو آواز دی۔ وہ بھاگا اندر آیا۔ کفایت نے اس سے پوچھا، ”گیان صاحب کہاں ہیں؟“

بشیر نے جواب دیا، ”رات کو نہیں آئے۔“

”کیوں؟“

”معلوم نہیں صاحب۔“

”وہ بائی جی کہاں ہیں؟“

”مچھی تل رہی ہیں۔“

کفایت کے دماغ میں مجھلیاں تلی جانے لگیں۔ اٹھ کر باورچی خانے میں گیاتوہ چوکی پر بیٹھی سامنے انگیٹھی رکھے مچھی تل رہی تھی۔ کفایت کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک چھوٹی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ ہاتھ اٹھا کر اس نے سلام کیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔۔۔ کفایت نے دیکھا تینوں نوکر بے حد مسرور تھے اور بڑی مستعدی سے اس لڑکی کا ہاتھ بٹارہے تھے۔

بشیر کو کچھ دنوں کی چھٹی پر اپنے وطن جانا تھا۔ کئی دنوں سے وہ بار بار کہتا تھا کہ صاحب مجھے تختواہ دے دیجیے، مجھے گھر سے کئی خط آچکے ہیں۔ والدہ بیمار ہے۔ رات کو وہ اسے تختواہ دینا بھول گیا تھا۔ اب اسے یاد آیا تو اس نے بشیر سے کہا، ”ادھر آؤ بشیر! اپنی تختواہ لے لو۔۔۔ میں کل دفتر سے روپے لے آیا تھا۔“

بشیر نے تختواہ لے لی۔ کفایت نے اس سے پوچھا، ”نوبے گاڑی جاتی ہے۔ اس سے چلے جاؤ۔“

”اچھا جی!“ یہ کہہ کر بشیر چلا گیا۔

ناشٹہ بے حد لذیز تھا، خاص طور پر مجھلی کے ٹکڑے۔ اس نے کھانا شروع کرنے سے پہلے بشیر کے ذریعہ سے اس بر می لڑکی کو بلا بھیجا مگر وہ نہ آئی۔ بشیر نے کہا، ”جی وہ کہتی ہیں کہ بعد میں کریں گی وہ ناشٹہ“

کفایت کی مالی حالت بہت پتلی تھی۔ گیان بھی آسودہ حال نہیں تھا۔ دونوں ادھر ادھر سے پکڑ کر گزارہ کر رہے تھے۔ برانڈی کا بندو بست گیان کر دیتا تھا۔ باقی کھانے پینے کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی طرح چل ہی رہا تھا۔ جس فلم کمپنی میں گیان کام کر رہا تھا، اس کا دیوالہ نکلنے کے قریب تھا مگر اس کو یقین تھا کہ کوئی مஜزہ ضرور و نما ہو گا اور اس کی کمپنی سنبھل جائے گی۔ شوٹنگ ہو رہی تھی غالباً اسی لیے گیان رات کونہ آس کا تھا۔

ناشٹہ کرنے کے بعد کفایت نے جھانک کر باورچی خانے میں دیکھا۔ لڑکی اپنے کام میں مشغول تھی۔ تینوں ملازم لڑکے اس سے ہنس کر باقیں کر رہے تھے۔ کفایت نے بشیر نے سے کہا، ”مجھلی بہت اچھی تھی۔“

لڑکی نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر چھوٹی سی مسکراہٹ تھی۔

کفایت دفتر چلا گیا۔ اس کو امید تھی کہ کچھ روپوں کا بندوبست ہو جائے گا لیکن خالی جیب واپس آیا۔ بر می لڑکی اندر بیڈ روم میں لیٹی تصویر وں والار سالہ دیکھ رہی تھی۔ کفایت کو دیکھ کر بیٹھ گئی اور سلام کیا۔

کفایت نے سلام کا جواب دیا اور اس سے پوچھا، ”گیان صاحب آئے تھے؟“

”آئے تھے دوپہر کو۔۔۔ کھانا کھا کر چلے گئے۔۔۔ پھر شام کو آئے چند منٹوں کے لیے“ یہ کہہ کر اس نے ایک طرف ہٹ کر تکیہ اٹھایا اور کاغذ میں لپٹی ہوئی بوتل نکالی، ”یہ دے گئے تھے کہ میں آپ کو دے دوں۔“

میں نے بوتل کپڑی۔ کاغذ پر گیان کے یہ چند الفاظ تھے، ”کم بخت یہ چیز کسی نہ کسی طرح مل جاتی ہے لیکن پیسہ نہیں ملتا۔۔۔ بہر حال عیش کرو۔۔۔ تمہارا گیان۔“

اس نے کاغذ کھولا۔ بر انڈی کی بوتل تھی۔ بر می لڑکی نے کفایت کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا، ”آپ پتی ہیں؟“

لڑکی نے زور سے اپنا سر ہلایا، ”نہیں!“

کفایت نے نظر بھر کر اس کو دیکھا اور سوچا، ”کیا چھوٹی سی ننھی منھی گڑیا ہے!“

اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر با تین کرے۔ چنانچہ اس سے مخاطب ہوا، ”آئیے، ادھر دوسرے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔“

”نہیں۔۔۔ میں کپڑے دھوؤں گی۔“

”اس وقت؟“

”اس وقت اچھا ہوتا ہے۔۔۔ رات دھوئے، صحیح سوکھ گئے۔ اٹھتے ہی استری کر لیے۔“

کفایت تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ اسے کوئی بات نہ سو جبھی تو ملاقاتی کمرے میں بیٹھ کر برانڈی پینا شروع کر دی۔ کھانے کا وقت ہو گیا۔ اس نے برمی لڑکی کو بلایا مگر اس نے کہا، ”میں گیان صاحب کے ساتھ کھاؤں گی۔“

کفایت نے کھانا کھایا اور اپنے پلنگ پر سو گیا۔ رات کے تقریباً ایک بجے اس کی آنکھ کھلی، چاندنی رات تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا بھی بڑے مزے کی چل رہی تھی۔ کروٹ بدلتی تو دیکھا سامنے پلنگ پر ایک چھوٹی سی سُدُول گڑیا گیان کے چوڑے بالوں بھرے سینے کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے۔ کفایت نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑے وقٹے کے بعد گیان کی آواز آئی، ”جاواب مجھے سونے دو۔۔۔ کپڑے پہن لو۔“

اسپرنگوں والے پلنگ کی آواز کے ساتھ ساتھ ریشم کی سرسر اہمیں کفایت کے کانوں میں داخل ہوئیں۔۔۔ تھوڑی دیر کے بعد کفایت سو گیا۔ صحیح بجے اٹھا، کیونکہ وہ رات کو یہ سوچ کر سویا تھا کہ صحیح جلدی اٹھے گا۔ اسے ٹرام کا بہت لمبا سفر طے کر کے ایک آدمی کے پاس جانا تھا جس سے اسے کچھ ملنے کی امید تھی۔ پلنگ پر سے اترتا اس نے دیکھا کہ برمی لڑکی ننگے فرش پر اس کے سلیپنگ سوٹ کا اکٹوپاچجامہ پہنے اپنے چھوٹے سے سُدُول بازو کو سر کے نیچے رکھے بڑے سکون سے سورہی ہے۔ کفایت نے اس کو جگایا۔ اس نے اپنی کالی کالی آنکھیں کھولیں۔ کفایت نے اس سے کہا، ”آپ یہاں کیوں لیٹی ہیں؟“

اس کے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر ننھی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اٹھ کر اس نے جواب دیا، ”گیان کو عادت نہیں کسی کو اپنے ساتھ سلانے کی۔“

کفایت کو گیان کی اس عادت کا علم تھا۔ اس نے لڑکی سے کہا، ”جائیے میرے پلنگ پر لیٹ جائیے۔“

لڑکی اٹھی اور کفایت کے پلنگ پر لیٹ گئی۔

کفایت غسل خانے میں گیا وہاں رسی پر برمی لڑکی کے کپڑے لٹک رہے تھے۔ کفایت صابن مل کر نہانے لگا تو اس کا نیا اس لڑکی کے ملائم جسم کی طرف چلا گیا جس پر سے نگاہیں پھسل پھسل جاتی تھیں۔ غسل سے فارغ ہو کر کفایت نے کپڑے پہنے چونکہ جلدی میں تھا، اس نے

گیان کو جگا کر اس سے کوئی بات نہ کرسکا۔ صبح کا انکارات کے گیارہ بجے واپس آیا۔ جیسیں خالی تھیں۔ بیڈروم میں گیا تو گیان اور بربری لڑکی دونوں اکٹھے لیٹے ہوئے تھے۔ کفایت نے ملاقاتی کمرے میں بیٹھ کر برانڈی پینی شروع کر دی۔ بہت تھا ہوا تھا۔ ماہیوس واپس آیا تھا۔ بربری لڑکی کے متعلق سوچتے سوچتے وہیں صوفے پر سو گیا۔ صبح پانچ بجے اٹھا۔ تپائی پر اس کا چوتھا پیگ پانی میں پڑا بسی ہوا تھا۔

کفایت اٹھا۔ بیڈروم کے ننگے فرش پر بربری لڑکی سورہی تھی۔ گیان الماری کے آئینے کے ساتھ کھڑا تائی باندھ رہا تھا۔ ٹائی کی گردھیک کر کے اس نے دونوں ہاتھوں میں لڑکی کو اٹھایا اور اپنے پلنگ پر لٹادیا۔ مرا تو اس نے کفایت کو دیکھا، ”کیوں بھتے۔ کچھ بندوبست ہوا روپوں کا؟“

کفایت نے بڑی مایوسی سے کہا، ”نبیس۔“

”تو میں جاتا ہوں۔۔۔ دیکھو شاید کچھ ہو جائے۔“

پیشتر اس کے کہ کفایت اسے روکے گیان تیزی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ کھلا تو اس کی آواز تیکی، ”تم بھی کوشش کرنا کفایت!“

کفایت نے پلٹ کر پلنگ کی طرف دیکھا۔ لڑکی بڑے سکون کے ساتھ سورہی تھی۔ اس کے ننھے سے سینے پر چھوٹی چھوٹی گول چھاتیاں چمک رہی تھیں۔ کفایت کمرے سے نکل کر غسل خانے میں چلا گیا۔ اندر رسی پر لڑکی کے دھلے ہوئے کپڑے لٹک رہے تھے۔ غسل خانے سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ لڑکی نوکروں کے ساتھ ناشتا تیار کرنے میں مصروف تھی۔ ناشتا کر کے باہر نکل گیا۔

چار روز اسی طرح گزر گئے۔ کفایت کو اس لڑکی کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ گیان کبھی رات کو دیر سے آتا تھا، کبھی دن کو بہت جلدی نکل جاتا تھا۔ یہی حال کفایت کا تھا۔ دونوں پریشان تھے۔ پانچویں روز جب وہ صبح اٹھا تو بشیر نے کفایت کو گیان کا رقمہ دیا۔ اس میں لکھا تھا ”خدا کے لیے کسی نہ کسی طرح دس روپے پیدا کر کے بربری لڑکی کو دے دو۔“

لڑکی کھڑی استری کر رہی تھی۔ بلاوز کی صرف ایک آستین باقی رہ گئی تھی جس پر وہ بڑے سلیقے سے استری پھیر رہی تھی۔ کفایت نے اس کی طرف دیکھا جب اس کی نگاہیں چار ہوئیں تو لڑکی مسکرا دی۔ کفایت سوچنے لگا کہ وہ دس روپے کہاں سے پیدا کرے۔ بشیر پاس کھڑا تھا۔ اس نے کفایت سے کہا، ”صاحب ادھر آئیے!“

کفایت نے پوچھا، ”کیا بات ہے؟“

”جی کچھ کہنا ہے۔“

بیشیر نے ایک طرف ہٹ کر دس روپے کا نوٹ نکالا اور کفایت کو دے دیا، ”میں نہیں گیا بھی تک صاحب۔“

کفایت نوٹ لے کر سوچنے لگا، ”نبیں نہیں۔۔۔ تم رکھو۔۔۔ لیکن تم گئے کیوں نہیں ابھی تک؟“

”صاحب چلا جاؤں گا کل پرسوں۔۔۔ آپ رکھیے یہ روپے۔“

کفایت نے نوٹ جیب میں ڈال لیا، ”اچھا میں شام کو لوٹا دوں گا تمہیں۔“

کپڑے و پڑے پہن کر جب بر می لڑکی ناشتہ کر چکی تو کفایت نے اس کو دس روپے کا نوٹ دیا اور کہا، ”گیان صاحب نے دیا تھا کہ آپ کو
دے دوں۔“

لڑکی نے نوٹ لے لیا اور بیشیر کو آواز دی۔ بیشیر آیا تو اس سے کہا، ”جاوہیکسی لے آؤ۔“

بیشیر چلا گیا تو کفایت نے اس سے پوچھا، ”آپ جا رہی ہیں؟“

”جی ہاں!“

یہ کہہ کروہ اٹھی اور بیدروم میں چلی گئی۔ وہ اپنارومال استری کرنا بھول گئی تھی۔ کفایت نے اس سے باتیں کرنے کا ارادہ کیا تو ٹیکسی آگئی۔
رومال ہاتھ میں لے کر روہ روانہ ہونے لگی۔ کفایت کو سلام کیا اور کہا، ”اچھا جی۔۔۔ میں چلتی ہوں۔ گیان کو میر اسلام بول دینا۔“ پھر اس نے
تینوں نوکروں سے ہاتھ ملایا اور چلی گئی۔ سب کے چہروں پر ادا سی چھا گئی۔

پونے گھنٹے کے بعد گیان آیا۔ وہ کچھ لے کر آیا تھا۔ آتے ہی اس نے کفایت سے پوچھا، ”کہاں ہے وہ برمی لڑکی؟“

”چلی گئی۔“

”کیسے؟ دس روپے دیے تھے تم نے اسے؟“

”ہاں!“

”تو ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے!“ گیان کرسی پر بیٹھ گیا۔

کفایت نے پوچھا، ”کون تھی یہ لڑکی؟“

”معلوم نہیں۔“

کفایت سرتاپا حیرت بن گیا، ”کیا مطلب؟“

گیان نے جواب دیا، ”مطلوب یہ کہ میں نہیں جانتا کون تھی۔۔۔“

”جھوٹ!“

”تمہاری قسم سچ کہتا ہوں۔“

کفایت نے پوچھا، ”کہاں سے مل گئی تمہیں؟“

گیان نے ٹانگیں میز پر رکھ دیں اور مسکرا کیا، ”عجیب داستان ہے یار۔۔۔ پانی کا سیلا ب آنے والی رات میں شنکر کے ہاں چلا گیا۔ وہاں بہت پی۔۔۔ اندھیری اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوا تو سو گیا۔ گاڑی مجھے سیدھی چرچ گیٹ لے گئی، وہاں مجھے چوکیدار نے جگایا کہ اٹھو۔۔۔ میں نے کہا بھی مجھے گرانٹ روڈ جانا ہے۔ چوکیدار ہنسا، آپ پانچ اسٹیشن آگے چلے آئے ہیں۔ اتر، دوسرا پلیٹ فارم پر اندھیری جانے والی آخری گاڑی کھڑی تھی۔ اس میں سوار ہو گیا۔ گاڑی چلی تو پھر مجھے نیند آگئی۔ سیدھی اندھیری پہنچ گئی۔“

کفایت نے پوچھا، ”مگر اس سے لڑکی کا کیا تعلق؟“

تم سن تو لو، گیان نے سگریٹ سلاکیا، ”اندھیری پہنچا یعنی جب میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں میں ایک چھوٹی سی لوڈیا کے ساتھ چمٹا ہوں۔ پہلے تو میں ڈرا، وہ جاگ رہی تھی میں نے پوچھا، کون ہو تم؟۔۔۔ وہ مسکرائی۔ میں نے پھر پوچھا، کون ہو بھی تم۔۔۔ وہ مسکرائی اور کہنے لگی، لو اتنی دیر سے مجھے چومتے رہے اور اب پوچھتے ہو، میں کون ہوں۔۔۔ میں نے حیرت سے کہا، اچھا۔۔۔ وہ ہنسنے لگی میں نے دماغ پر زور دے کر سوچنا مناسب خیال نہ کیا اور اس کو اپنے ساتھ بھیخ لیا۔۔۔ صحیح تین بجے تک ہم دونوں۔۔۔ پلیٹ فارم کی ایک نیچ پر سوئے رہے۔ ساڑھے تین بجے پہلی گاڑی آئی تو اس میں سوار ہو گئے۔ میرا ارادہ تھا کہ بندوبست کر کے اس کو کچھ روپے دوں گا۔۔۔ یہاں پہنچے تو پانی کا طوفان آیا ہوا تھا۔۔۔ ہے نادل چسپ داستان۔“

کفایت نے کہا، ”خاصی دلچسپ ہے۔۔۔ مگر وہ اتنے دن کیوں رہی یہاں؟“

گیان نے سگریٹ فرش پر پھیکا، ”وہ کہاں رہی۔۔۔ میں نے اسے رکھا۔۔۔ اصل میں وہ یوں رہی کہ میرے پاس کچھ تھا، ہی نہیں جو اسے دیتا۔ بس دن گزر تھے۔۔۔ میں بے حد شرم نہ کھلے، کل رات میں نے اس سے صاف کہہ دیا کہ دیکھو بھی، دن بڑھتے جا رہے ہیں۔ تم ایسا کرو مجھے اپنا ایڈریس دے دو، میں تمہارا حق وہاں پہنچا دوں گا۔ آج کل میرا حال بہت بتلا ہے۔“

کفایت نے پوچھا، ”یہ سن کر اس نے کیا کہا؟“

گیان نے سر کو جنبش دی، ”عجیب ہی لڑکی تھی۔۔۔ کہنے لگی، یہ کیا کہتے ہو۔۔۔ میں نے تم سے کب مانگا ہے۔۔۔ لیکن دس روپے مجھے دے دینا۔۔۔ میرا اگر یہاں سے بہت دور ہے، ٹیکسی میں جاؤں گی۔ میرے پاس ایک بھی پیسہ نہیں“

کفایت نے سوال کیا، ”نام کیا تھا اس کا؟“

گیان سوچنے لگا۔

”بھول گئے؟“

گیان نے اپنی ٹانگ میں میز پر سے ہٹائیں، ”نبیں یار--- میں نے اس سے نام نبیں پوچھا۔ حد ہو گئی--- یہ کہہ کروہ ہنسنے لگا۔

-[50]-

فرض کی پیتے تھے--- سعادت حسن منٹو

ایک جگہ محفل جمی تھی۔ مرزا غالب وہاں سے آکتا کر اٹھے۔ باہر ہوادار موجود تھا۔ اس میں بیٹھے اور اپنے گھر کا رخ کیا۔ ہوادار سے اتر کر جب دیوان خانے میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ متھرا داس مہاجن بیٹھا ہے۔

غالب نے اندر داخل ہوتے ہی کہا، ”اخاہ متھرا داس! بھئی تم آج بڑے وقت پر آئے--- میں تمہیں بلوانے ہی والا تھا!“ متھرا داس نے ٹھیک مہاجنوں کے انداز میں کہا، ”حضور روپوں کو بہت دن ہو گئے۔ فقط وو قطط آپ نے بھجوائے تھے--- اس کے بعد پانچ مہینے ہو گئے، ایک پیسہ بھی آپ نے نہ دیا۔“

اسد اللہ خان غالب سماں کرائے، ”بھئی متھرا داس! دینے کو میں سب دے دوں گا۔ گلے گلے پانی دوں گا۔--- دو ایک جائیدادا بھی میری باقی ہے۔“

”اچی سرکار! اس طرح یو پار ہو چکا۔ نہ اصل میں سے نہ سود میں سے، پہلا ہی ڈھائی ہزار وصول نبیں ہوا۔ چھ سو چھپن سو دو کے ہو گئے ہیں۔“

مرزا غالب نے حق کی نئے پکڑ کر ایک کش لیا، ”الله، جس درخت کا پھل کھانا منظور ہوتا ہے، اس کو پہلے پانی دیتے ہیں۔۔۔ میں تمہارا درخت ہوں پانی دو تو انج پیدا ہو۔“

متحرا داس نے اپنی دھوٹی کی لانگ ٹھیک کی، ”جی، دیوالی کو بارہ دن باقی رہ گئے ہیں۔ کھاتہ بند کیا جائے گا۔ آپ پہلے روپے کا اصل سود ملا کر دستاویز بنادیں تو آگے کا نام لیں۔“ مرزا غالب نے حق کی نئے ایک طرف کی، ”لو، ابھی دستاویز لکھے دیتا ہوں۔ پر شرط یہ ہے کہ دو ہزار ابھی ابھی مجھے اور دو۔“ متحرا داس نے تھوڑی دیر غور کیا، ”اچھا، میں اشام منگواتا ہوں۔۔۔ بھی ساتھ لا یا ہوں۔ آپ منشی غلام رسول عرضی نویس کو بلا لیں۔ پر سود وہی سوار و پیہہ سینکڑہ ہو گا۔“

”الله کچھ تو انصاف کرو۔ بارہ آنے سود لکھوائے دیتا ہوں۔“ متحرا داس نے اپنی دھوٹی کی لانگ دوسری بار درست کی، ”سر کار بارہ آنے پر بارہ برس بھی کوئی مہاجن قرض نہیں دے گا۔۔۔ آج کل تو خود بادشاہ سلامت کو روپے کی ضرورت ہے۔“ ان دونوں واقعی بہادر شاہ ظفر کی حالت بہت نازک تھی، اس کو اپنے اخراجات کے لیے روپے پیسے کی ہر وقت ضرورت رہتی تھی۔ بہادر شاہ تو خیر بادشاہ تھا لیکن مرزا غالب محض شاعر تھے۔ گوہ اپنے شعروں میں اپنارشتہ سپاہ گری سے جوڑتے تھے۔

یہ مرزا صاحب کی زندگی کے چالیسویں اور پینتالیسویں سال کے درمیانی عرصے کی بات ہے جب متحرا داس مہاجن نے ان پر عدم ادائیگی قرضہ کے باعث عدالت دیوانی میں دعویٰ دائر کیا۔۔۔ مقدمے کی سماعت مرزا صاحب کے مربی اور دوست مفتی صدر الدین آزردہ کو کرنا تھی جو خود بہت اچھے شاعر اور غالب کے مدح تھے۔ مفتی صاحب کے مردھانے عدالت کے کمرے سے باہر نکل کر آواز دی، ”الله متحرا داس مہاجن مدعا اور مرزا سعد اللہ خان غالب مدعا علیہ حاضر ہیں؟“

متحرا داس نے مرزا غالب کی طرف دیکھا اور مردھے سے کہا، ”جی دونوں حاضر ہیں۔“

مردھے نے روکھے پن سے کہا، ”تو دونوں حاضر عدالت ہوں۔“

مرزا غالب نے عدالت میں حاضر ہو کر مفتی صدر الدین آزردہ کو سلام کیا۔۔۔ مفتی صاحب مسکرائے۔ ”مرزانو شہ، یہ آپ اس قدر قرض کیوں لیا کرتے ہیں۔۔۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟“ غالب نے تھوڑے توقف کے بعد کہا، ”کیا عرض کروں۔۔۔ میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں

آتا۔ ”مفتی صدر الدین مسکراۓ، کچھ تو ہے، جس کی پر دہ داری ہے۔“ غالب نے برجستہ کہا، ”ایک شعر موزوں ہو گیا ہے مفتی صاحب۔۔۔ حکم ہو توجہ اپنے عرض کرو۔“

”فرمائیے!“

غالب نے مفتی صاحب اور متحر اداس مہاجن کو ایک لحظے کے لیے دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں یہ شعر پڑھا

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی، ایک دن

مفتی صاحب بے اختیار ہنس پڑے۔ ”خوب، خوب۔۔۔ کیوں صاحب! رسی جل گئی، پربل نہ گلیا۔۔۔ آپ کے اس شعر کی میں تو ضرور داد دوں گا۔ مگر چونکہ آپ کو اصل اور سود، سب سے اقرار ہے۔ عدالت مدعی کے حق میں فیصلہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ مرزا غالب نے بڑی سنجیدگی سے کہا، ”مدعی سچا ہے، تو کیوں فیصلہ اس کے حق میں نہ ہوا وہ میں نے بھی سچی بات نہیں کہا، نظم میں کہہ دی۔“

مفتی صدر الدین آزر دہ نے کاغذات قانون ایک طرف رکھے اور مرزا غالب سے مخاطب ہوئے، ”اچھا، تو زر ڈگری میں ادا کر دوں گا کہ ہماری آپ کی دوستی کی لانچ رہ جائے۔“ مرزا غالب بڑے خود دار تھے۔ انہوں نے مفتی صاحب سے کہا، ”حضور ایسا نہیں ہو گا۔۔۔ مجھے متحر اداس کا روپیہ دینا ہے۔ میں بہت جلد ادا کر دوں گا۔“

مفتی صاحب مسکراۓ، ”حضرت، روپے کی ادائیگی، شاعری نہیں۔۔۔ آپ تکلف کو بر طرف رکھیے۔۔۔ میں آپ کا مداح ہوں۔۔۔ مجھے آج موقع دیجیے کہ آپ کی کوئی خدمت کر سکوں۔“ غالب بہت خفیف ہوئے، ”لا حول ولا۔۔۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔۔۔ مجھے کوئی سزا دے دیجیے کہ آپ صدرالصدور ہیں۔“

”دیکھو، تم ایسی باتیں مت کرو۔۔۔“

”تو اور کیسی باتیں کرو؟“

”کوئی شعر سنائے۔“

”سوچتا ہوں۔۔۔ ہاں ایک شعر رات کو ہو گیا تھا۔۔۔ عرض کیے دیتا ہوں۔۔۔“

”فرمائیے“

”ہم اور وہ سبب رنج آشنا دشمن“

مفتی صاحب نے اپنے قانونی قلم سے قانونی کاغذ پر یہ حروف لکھے

”ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن، کہ رکھتا ہے۔“

مفتی صاحب بہت محظوظ ہوئے۔ یہ شعر آسانی سے سمجھ آسکنے والا نہیں لیکن وہ خود بہت بڑے شاعر تھے، اس لیے غالب کی دقیقہ بیانی کو فوراً سمجھ گئے۔

مقدمہ کی باقاعدہ ساعت ہوئی۔ مفتی صڈر الدین آزردہ نے مرزا غالب سے کہا، ”آپ آئیدہ قرض کی نہ پیا کریں۔“ غالب جو شاید کسی شعر کی فکر کر رہے تھے، کہا، ”ایک شعر ہو گیا، اگر آپ اجات دیں تو عرض کروں۔“ مفتی صاحب نے کہا، ”فرمائیے۔۔۔ فرمائیے۔۔۔“

مرزا غالب کچھ دیر خاموش رہے۔ غالب ان کو اس بات سے بہت کوفت ہوئی تھی کہ مفتی صاحب ان پر ایک احسان کر رہے ہیں۔ مفتی صاحب نے ان سے پوچھا، ”حضرت آپ خاموش کیوں ہو گئے؟“

”جی کوئی خاص بات نہیں۔“

”بے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں“

ورنہ کیا بات کرن نہیں آتی

”آپ کو با تمیں کرنا تو ماشاء اللہ آتی ہیں۔“

غالب نے جواب دیا، ”جی ہاں۔۔۔ لیکن بنانا نہیں آتیں۔“ مفتی صدر الدین مسکراۓ ”اب آپ جاسکتے ہیں۔۔۔ زرڈ گری میں ادا کر دوں گا۔“ مرزا غالب نے مفتی صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ ”آج آپ نے دوستی کے تمک پر مہر لگادی۔ جب تک زندہ ہوں، بندہ ہوں۔“

مفتی صدر الدین آزردہ نے ان سے کہا، ”اب آپ تشریف لے جائیے۔۔۔ پر خیال رہے کہ روز رو زرڈ گری میں ادا نہیں کر سکتا، آئندہ احتیاط رہے۔“

مرزا غالب سٹھوڑی دیر کے لیے سوچ میں غرق ہو گئے۔ مفتی صاحب نے ان سے پوچھا، ”کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“ مرزا غالب چونک کر بولے، ”جی! میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔۔۔ شاید کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ

میوت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

مفتی صاحب نے ان سے پوچھا، ”کیا آپ کورات بھرنید نہیں آتی؟“ مرزا غالب نے مسکرا کر کہا، ”کسی خوش نصیب ہی کو آتی ہو گی۔“ مفتی صاحب نے کہا، ”آپ شاعری چھوڑیے۔۔۔ بس آئندہ احتیاط رہے۔“ مرزا غالب آپنے انگر کھے کی شکنیں درست کرتے ہوئے بولے، ”آپ کی نصیحت پر چل کر ثابت قدم رہنے کی خدا سے دعا کروں گا۔۔۔ مفتی صاحب! مفت کی زحمت آپ کو ہوئی۔ لقد اسواۓ ”شکر ہے“ کے اور کیا ادا کر سکتا ہوں۔ خیر خدا آپ کو دس گناہ نیا میں، اور ستر گناہ آخرت میں دے گا۔“

یہ سن کر مفتی صدر الدین آزردہ زیر لب مسکراۓ ”آخرت والے میں تو آپ کو شریک کرنا محال ہے۔۔۔ دنیا کے دس گنے میں بھی آپ کو ایک کوڑی نہیں دوں گا کہ آپ مے خواری کیجیے۔“

مرزا غالب نہیں، ”مے خواری کیسی مفتی صاحب!“

ہے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

اور یہ شعر سننا کر مرزا غالب، عدالت کے کمرے سے باہر چلے گئے۔

-[51]-

میر انام رادھا ہے: سعادت حسن منشو

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب اس جگ کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ غالباً آٹھ نوبرس پہلے کی بات ہے۔ جب زندگی میں ہنگامے بڑے سیقتے سے آتے تھے؛ آج کی کل طرح نہیں۔ بے ہنگم طریقے پر پے در پے حادثے برپا ہو رہے ہیں، کسی ٹھوس وجہ کے بغیر۔

اس وقت میں چالیس روپے ماہوار پر ایک فلم کمپنی میں ملازم تھا اور میری زندگی بڑے ہموار طریقے پر افتاب و خیز اس گزر رہی تھی؛ یعنی صح دس بجے استوڈیو گئے، نیاز محمد ولن کی بیلوں کو دوپیسے کا دودھ پلایا، چالو فلم کے مکالمے لکھے، بنگالی ایکٹر س سے جو اس زمانے میں بلبل بنگال کھلاتی تھی، تھوڑی دیر مذاق کیا اور دادا گورے کی جو اس عہد کا سب سے بڑا فلم ڈائریکٹر تھا، تھوڑی سی خوشامد کی اور گھر چلے آئے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، زندگی بڑے ہموار طریقے پر افتاب و خیز اس گزر رہی تھی۔ استوڈیو کا مالک ہر مز جی فرام جی، جو موٹے موٹے لال گالوں والا موجی قسم کا ایرانی تھا، ایک او ہیٹر عمر کی خوجہ ایکٹر س کی محبت میں گرفتار تھا؛ ہر نووارڈ اڑکی کے پستان ٹھوٹ کر دیکھنا اس کا شغل تھا۔ کلکتہ کے بازار کی ایک مسلمان رنڈی تھی جو اپنے ڈائریکٹر، ساوونڈر یا کارڈسٹ اور استوری رائٹر تینوں سے بیک وقت عشق لڑا رہی تھی؛ اس عشق کا مطلب یہ تھا کہ ان تینوں کا التفات اس کے لیے خاص طور پر محفوظ رہے۔

”بن کی سندھی“ کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ نیاز محمد ولن کی جنگلی بیلوں کو جو اس نے خدا معلوم استوڈیو کے لوگوں پر کیا اثر پیدا کرنے کے لیے پال رکھی تھیں، دوپیسے کا دودھ پلا کر میں ہر روز اس ”بن کی سندھی“ کے لیے ایک غیر مانوس زبان میں مکالمے لکھا کرتا تھا۔ اس فلم کی کہانی

کیا تھی، پلاٹ کیسا تھا، اس کا علم جیسا کہ ظاہر ہے، مجھے بالکل نہیں تھا کیونکہ میں اس زمانے میں ایک منشی تھا جس کا کام صرف حکم ملنے پر جو کچھ کہا جائے، غلط سلط اردو میں، جوڈا ریکٹر صاحب کی سمجھ میں آجائے، پسل سے ایک کاغذ پر لکھ کر دینا ہوتا تھا۔ نیر ”بن کی سندھی“ کی شوٹنگ چل رہی تھی اور یہ افواہ گرم تھی کہ دیسپ کا پارٹ ادا کرنے کے لیے ایک نیا چڑہ سیٹھ ہر مرد جی فرام جی کہیں سے لا رہے ہیں۔ ہیرو کا پارٹ راج کشور کو دیا گیا تھا۔

راج کشور راولپنڈی کا ایک خوش شکل اور صحت مند نوجوان تھا۔ اس کے جسم کے متعلق لوگوں کا یہ خیال تھا کہ بہت مردانہ اور سڈول ہے۔ میں نے کئی مرتبہ اس کے متعلق غور کیا مگر مجھے اس کے جسم میں جو یقیناً گستاخی اور متناسب تھا، کوئی کشش نظر نہ آئی۔۔۔ مگر اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں بہت ہی دبلا اور مریل قسم کا انسان ہوں اور اپنے ہم جنسوں کے متعلق اتنا زیادہ غور کرنے کا عادی نہیں جتنا ان کے دل و دماغ اور روح کے متعلق سوچنے کا عادی ہوں۔

مجھے راج کشور سے نفرت نہیں تھی، اس لیے کہ میں نے اپنی عمر میں شاد و نادر ہی کسی انسان سے نفرت کی ہے، مگر وہ مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں تھا۔ اس کی وجہ میں آہستہ آہستہ آپ سے بیان کروں گا۔

راج کشور کی زبان، اس کا لالب و لجھ جو ٹھیٹ راولپنڈی کا تھا، مجھے بے حد پسند تھا۔ میر اخیال ہے کہ پنجابی زبان میں اگر کہیں خوبصورت قسم کی شیرینی ملتی ہے تو راولپنڈی کی زبان ہی میں آپ کو مل سکتی ہے۔ اس شہر کی زبان میں ایک عجیب قسم کی مردانہ نسایت ہے جس میں بیک وقت مٹھاں اور گھلاؤٹ ہے۔ اگر راولپنڈی کی کوئی عورت آپ سے بات کرے تو ایسا لگتا ہے کہ لذیذ آم کا رس آپ کے منہ میں چوایا جا رہا ہے۔۔۔ مگر میں آموں کی نہیں راج کشور کی بات کر رہا تھا جو مجھے آم سے بہت کم عزیز تھا۔

راج کشور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، ایک خوش شکل اور صحت مند نوجوان تھا۔ بیباں تک بات ختم ہو جاتی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا مگر مصیبت یہ ہے کہ اسے یعنی کشور کو خود اپنی صحت اور اپنے خوش شکل ہونے کا احساس تھا۔ ایسا احساس جو کم از کم میرے لیے ناقابلِ قبول تھا۔

صحت مند ہونا بڑی اچھی چیز ہے مگر دوسروں پر اپنی صحت کو بیماری بنا کر عائد کرنا بالکل دوسرا چیز ہے۔ راج کشور کو یہی مرض لاحق تھا کہ وہ اپنی صحت، اپنی تند رستی، اپنے متناسب اور سڈول اعضا کی غیر ضروری نمائش کے ذریعے ہمیشہ دوسرے لوگوں کو جو اس سے کم صحت مند تھے، مروع کرنے کی کوشش میں مصروف رہتا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں دائیٰ مریض ہوں، کمزور ہوں، میرے ایک پھیپھڑے میں ہوا کھینچنے کی طاقت بہت کم ہے مگر خدا واحد شاہد ہے کہ میں نے آج تک اس کمزوری کا کبھی پروپیگنڈا نہیں کیا، حالانکہ مجھے اس کا پوری طرح علم ہے کہ انسان اپنی کمزوریوں سے اسی طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے جس طرح کہ اپنی طاقتیوں سے اٹھا سکتا ہے مگر میرا ایمان ہے کہ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

خوبصورتی، میرے نزدیک، وہ خوبصورتی ہے جس کی دوسرے بلند آواز میں نہیں بلکہ دل ہی دل میں تعریف کریں۔ میں اس صحت کو بیماری سمجھتا ہوں جو نگاہوں کے ساتھ پتھر بن کر ٹکراتی رہے۔

راج کشور میں وہ تمام خوبصورتیاں موجود تھیں جو ایک نوجوان مرد میں ہونی چاہتیں۔ مگر افسوس ہے کہ اسے ان خوبصورتیوں کا نہایت ہی بھونڈ امظاہرہ کرنے کی عادت تھی: آپ سے بات کر رہا ہے اور اپنے ایک بازو کے پٹھے اکٹھا رہا ہے، اور خود ہی داد دے رہا ہے، نہایت ہی اہم گفتگو ہو رہی ہے یعنی سوراج کا مسئلہ چھڑا رہا ہے اور وہ اپنے کھادی کے کرتے کے بیٹن کھول کر اپنے سینے کی چوڑائی کا اندازہ کر رہا ہے۔

میں نے کھادی کے کرتے کا ذکر کیا تو مجھے یاد آیا کہ راج کشور پاکا نگریسی تھا، ہو سکتا ہے وہ اسی وجہ سے کھادی کے کپڑے پہنتا ہو، مگر میرے دل میں ہمیشہ اس بات کی کھٹک رہی ہے کہ اسے اپنے وطن سے اتنا پیار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی ذات سے تھا۔

بہت لوگوں کا خیال تھا کہ راج کشور کے متعلق جو میں نے رائے قائم کی ہے، سراسر غلط ہے۔ اس لیے کہ اسٹوڈیو اور اسٹوڈیو کے باہر ہر شخص اس کا مدام تھا: اس کے جسم کا، اس کے خیالات کا، اس کی سادگی کا، اس کی زبان کا جو خاص راوی پنڈی کی تھی اور مجھے بھی پسند تھی۔ دوسرے ایکٹروں کی طرح وہ الگ تھلگ رہنے کا عادی نہیں تھا۔ کافریں پارٹی کا کوئی جلسہ ہو تو راج کشور کو آپ وہاں ضرور پائیں گے۔۔۔ کوئی ادبی مینگ ہو رہی ہے تو راج کشور وہاں ضرور پہنچے گا اپنی مصروف زندگی میں سے وہ اپنے ہمسایوں اور معمولی جان پچان کے لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہونے کے لیے بھی وقت نکال لیا کرتا تھا۔

سب فلم پروڈیوسر اس کی عزت کرتے تھے کیونکہ اس کے کیرکیٹر کی پاکیزگی کا بہت شہرہ تھا۔ فلم پروڈیوسروں کو چھوڑ دیئے، پبلک کو بھی اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ راج کشور ایک بہت بلند کردار کا مالک ہے۔

فلی دنیا میں رہ کر کسی شخص کا گناہ کے دھبou سے پاک رہنا، بہت بڑی بات ہے۔ یوں تواج کشور ایک کامیاب ہیر و تھا مگر اس کی خوبی نے اسے ایک بہت ہی اوپرے رتبے پر پہنچا دیا تھا۔ ناگ پاڑے میں جب میں شام کو پان والے کی دکان پر بیٹھتا تھا تو اکثر ایکٹر ایکٹر سوں کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ قریب قریب ہر ایکٹر اور ایکٹر س کے متعلق کوئی نہ کوئی اسکینڈل مشہور تھا مگر راج کشور کا جب بھی ذکر آتا، شام لال پنوادری بڑے فخر یہ لمحے میں کہا کرتا، ”منٹو صاحب! راج بھائی ہی ایسا ایکٹر ہے جو لنگوٹ کا پاک ہے۔“

معلوم نہیں شام لال اسے راج بھائی کیسے کہنے لگتا۔ اس کے متعلق مجھے اتنی زیادہ حیرت نہیں تھی، اس لیے کہ راج بھائی کی معمولی سے معمولی بات بھی ایک کارنامہ بن کر لوگوں تک پہنچ جاتی تھی۔ مثلاً، باہر کے لوگوں کو اس کی آمدن کا پورا حساب معلوم تھا۔ اپنے والد کو ماہوار خرچ کیا دیتا ہے، یتیم خانوں کے لیے کتنا چندہ دیتا ہے، اس کا اپنا جیب خرچ کیا ہے؛ یہ سب باتیں لوگوں کو اس طرح معلوم تھیں جیسے انھیں از بریاد کرائی گئی ہیں۔

شام لال نے ایک روز مجھے بتایا کہ راج بھائی کا اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک ہے۔ اس زمانے میں جب آمدن کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، باپ اور اس کی نئی بیوی اسے طرح طرح کے دکھ دیتے تھے۔ مگر مر جاتا ہے راج بھائی کا کہ اس نے اپنا فرض پورا کیا اور ان کو سر آنکھوں پر جگہ دی۔ اب دونوں چھپر کھٹوں پر بیٹھے راج کرتے ہیں، ہر روز صبح سویرے راج اپنی سوتیلی ماں کے پاس جاتا ہے اور اس کے چون چھوتا ہے۔ باپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو جاتا ہے اور جو حکم ملے، فوراً بجا لاتا ہے۔

آپ برانہ مانیے گا، مجھے راج کشور کی تعریف و توصیف سن کر ہمیشہ الجھن سی ہوتی ہے، خدا جانے کیوں؟

میں جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، مجھے اس سے، حاشا و کلا، نفرت نہیں تھی۔ اس نے مجھے کبھی ایسا موقع نہیں دیا تھا، اور پھر اس زمانے میں جب مشیوں کی کوئی عزت و قوت ہی نہیں تھی وہ میرے ساتھ گھٹوں باتیں کیا کرتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کیا وجہ تھی، لیکن ایمان کی بات ہے کہ میرے دل و دماغ کے کسی اندھیرے کو نہیں میں یہ شک بھلی کی طرح کوند جاتا کہ راج بن رہا ہے۔۔۔ راج کی زندگی بالکل مصنوعی ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ میرا کوئی ہم خیال نہیں تھا۔ لوگ دیوتاؤں کی طرح اس کی پوجا کرتے تھے اور میں دل ہی دل میں اس سے کڑھتا رہتا تھا۔

راج کی بیوی تھی، راج کے چار بچے تھے، وہ اچھا خاوند اور اچھا باپ تھا۔ اس کی زندگی پر سے چادر کا کوئی کونا بھی اگر ہٹا کر دیکھا جاتا تو آپ کو کوئی تاریک چیز نظر نہ آتی۔ یہ سب کچھ تھا، مگر اس کے ہوتے ہوئے بھی میرے دل میں شک کی گدگدی ہوتی ہی رہتی تھی۔

خدا کی قسم میں نے کئی دفعہ اپنے آپ کو لعنت ملامت کی کہ تم بڑے ہی وابحیات ہو کہ ایسے اپنے انسان کو جسے ساری دنیا اچھا کہتی ہے اور جس کے متعلق تمہیں کوئی شکایت بھی نہیں، کیوں بے کار شک کی نظر وہ سے دیکھتے ہو۔ اگر ایک آدمی اپنا سُدول بدن بار بار دیکھتا ہے تو یہ کون سی بُری بات ہے۔ تمہارا بدن بھی اگر ایسا ہی خوبصورت ہو تا تو بہت ممکن ہے کہ تم بھی یہی حرکت کرتے۔

کچھ بھی ہو، مگر میں اپنے دل و دماغ کو بھی آمادہ نہ کر سکا کہ وہ راج کشور کو اسی نظر سے دیکھے جس سے دوسرا دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں دورانِ گفتگو میں اکثر اس سے الجھ جایا کرتا تھا۔ میرے مزاج کے خلاف کوئی بات کی اور میں ہاتھ دھو کر اس کے پیچے پڑ گیا لیکن ایسی چپقلشوں کے بعد ہمیشہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور میرے حلق میں ایک ناقابل بیان تلخی رہی، مجھے اس سے اور بھی زیادہ الجھن ہوتی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی زندگی میں کوئی اسکینڈل نہیں تھا۔ اپنی بیوی کے سوا کسی دوسری عورت کا میلا یا اجلاداً من اس سے وابستہ نہیں تھا۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ وہ سب ایکٹر سوں کو بہن کہہ کر پکارتا تھا اور وہ بھی اسے جواب میں بھائی کہتی تھیں۔ مگر میرے دل نے ہمیشہ میرے دماغ سے یہی سوال کیا کہ یہ رشتہ قائم کرنے کی ایسی اشد ضرورت ہی کیا ہے؟

بہن بھائی کا رشتہ کچھ اور ہے مگر کسی عورت کو اپنی بہن کہنا، اس انداز سے جیسے یہ بورڈ لگایا جا رہا ہے کہ ”سڑک بند ہے“ یا ”یہاں پیشتاب کرنا منع ہے“ بالکل دوسری بات ہے۔ اگر تم کسی عورت سے جنسی رشتہ قائم نہیں کرنا چاہتے تو اس کا اعلان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر تمہارے دل میں تمہاری بیوی کے سوا اور کسی عورت کا خیال داخل نہیں ہو سکتا تو اس کا اشتہار دینے کی کیا ضرورت ہے۔ یہی اور اسی قسم کی دوسری باتیں چونکہ میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں، اس لیے مجھے عجیب قسم کی الجھن ہوتی تھی۔

خیر!

”بن کی سند ری“ کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ اسٹوڈیو میں خاصی چہل پہل تھی، ہر روز ایکسٹرائز کیاں آتی تھیں، جن کے ساتھ ہمارا دن ہنسی مذاق میں گزر جاتا تھا۔ ایک روز نیاز محمد لون کے کمرے میں میک اپ ماسٹر، جسے ہم استاد کہتے تھے، یہ خبر لے کر آیا کہ ویپ کے روں کے لیے جو نئی لڑکی آنے والی تھی، آگئی ہے اور بہت جلد اس کا کام شروع ہو جائے گا۔ اس وقت چائے کا دور چل رہا تھا، کچھ اس کی حرارت تھی،

کچھ اس خبر نے ہم کو گرمادیا۔ اسٹوڈیو میں ایک نئی لڑکی کا داخلہ ہمیشہ ایک خوش گوار حادثہ ہوا کرتا ہے، چنانچہ ہم سب نیازِ محدودن کے کمرے سے نکل کر باہر چلے آئے تاکہ اس کا دیدار کیا جائے۔

شام کے وقت جب سیٹھ ہر مرجی فرام جی، آفس سے نکل کر عیسیٰ طلبجی کی چاندی کی ڈبیا سے دخوش بودار تمباکو والے پان اپنے چوڑے کلے میں دبا کر، بلیرڈ کھینے کے کمرے کا درخ کر رہے تھے کہ ہمیں وہ لڑکی نظر آئی۔ سانو لے رنگ کی تھی، بس میں صرف اتنا ہی دیکھ سکا کیونکہ وہ جلدی جلدی سیٹھ کے ساتھ ہاتھ ملا کر اسٹوڈیو کی موڑ میں بیٹھ کر چلی گئی۔۔۔ کچھ دیر کے بعد مجھے نیازِ محمد نے بتایا کہ اس عورت کے ہونٹ مولے تھے۔ وہ غالباً صرف ہونٹ ہی دیکھ سکا تھا۔ استاد، جس نے شاید اتنی جھلک بھی نہ دیکھی تھی، سر ہلاکر بولا، ”ہونہہ۔۔۔ کنڈم۔۔۔“ یعنی بکواس ہے۔

چار پانچ روز گزر گئے مگر یہ نئی لڑکی اسٹوڈیو میں نہ آئی۔ پانچویں یا چھٹے روز جب میں گلاب کے ہوٹل سے چائے پی کر نکل رہا تھا، اچانک میری اور اس کی مذہبیت ہو گئی۔ میں ہمیشہ عورتوں کو چور آنکھ سے دیکھنے کا عادی ہوں۔ اگر کوئی عورت ایک دم میرے سامنے آجائے تو مجھے اس کا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ چونکہ غیر متوقع طور پر میری اس کی مذہبیت ہوئی تھی، اس لیے میں اس کی شکل و شباهت کے متعلق کوئی اندازہ نہ کر سکا، البتہ پاؤں میں نے ضرور دیکھے جن میں نئی وضع کے سلیپر تھے۔

لیبوریٹری سے اسٹوڈیو تک جو روشن جاتی ہے، اس پر مالکوں نے بجری بچھار کھی ہے۔ اس بجری میں بے شمار گول گول بیان ہیں جن پر سے جو تابار بار پھسلتا ہے۔ چونکہ اس کے پاؤں میں کھلے سلیپر تھے، اس لیے چلنے میں اسے کچھ زیادہ تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔

اس ملاقات کے بعد آہستہ آہستہ مس نیلم سے میری دوستی ہو گئی۔ اسٹوڈیو کے لوگوں کو تو خیر اس کا علم نہیں تھا مگر اس کے ساتھ میرے تعلقات بہت ہی بے تکلف تھے۔ اس کا اصلی نام رادھا تھا۔ میں نے جب ایک بار اس سے پوچھا کہ تم نے اتنا پیارا نام کیوں چھوڑ دیا تو اس نے جواب دیا، ”یو نہی۔“ مگر پھر کچھ دیر کے بعد کہا، ”یہ نام اتنا پیارا ہے کہ فلم میں استعمال نہیں کرنا چاہیے۔“

آپ شاید خیال کریں کہ رادھا مذہبی خیال کی عورت تھی۔ جی نہیں، اسے مذہب اور اس کے توبہات سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ لیکن جس طرح میں ہر نئی تحریر شروع کرنے سے پہلے کاغذ پر ”بسم اللہ“ کے اعداد ضرور لکھتا ہوں، اسی طرح شاید اسے بھی غیر ارادی طور پر رادھا کے نام سے بے حد پیار تھا۔ چونکہ وہ چاہتی تھی کہ اسے رادھانہ کہا جائے۔ اس لیے میں آگے چل کر اسے نیلم ہی کہوں گا۔

نیلم بناں کی ایک طوائف زادی تھی۔ وہیں کالب والجہ جو کافوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ میر انام سعادت ہے مگر وہ مجھے ہمیشہ صادق ہی کہا کرتی تھی۔ ایک دن میں نے اس سے کہا، ”نیلم! میں جانتا ہوں تم مجھے سعادت کہہ سکتی ہو، پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اپنی اصلاح کیوں نہیں کرتیں۔“ یہ سن کر اس کے سانوں پر جو بہت ہی پتلے تھے، ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے جواب دیا، ”جو غلطی مجھ سے ایک بار ہو جائے، میں اسے ٹھیک کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔“

میر اخیال ہے کہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ عورت جسے اسٹوڈیو کے تمام لوگ ایک معمولی ایکٹر س سمجھتے تھے، عجیب و غریب قسم کی انفرادیت کی مالک تھی۔ اس میں دوسری ایکٹر سوں کا سا اور چھاپن بالکل نہیں تھا۔ اس کی سنجیدگی جسے اسٹوڈیو کا ہر شخص اپنی عنینک سے غلط رنگ میں دیکھتا تھا، بہت پیاری چیز تھی۔ اس کے سانوں لے چہرے پر جس کی جلد بہت ہی صاف اور ہموار تھی؛ یہ سنجیدگی، یہ ملتحہ متانت موزوں و مناسب غازہ بن گئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے اس کی آنکھوں میں، اس کے پتلے ہونٹوں کے کونوں میں، غم کی بے معلوم تلخیاں گھل گئی تھیں مگر یہ واقعہ ہے کہ اس چیز نے اسے دوسری عورتوں سے بالکل مختلف کر دیا تھا۔

میں اس وقت بھی حیران تھا اور اب بھی ویسا ہی حیران ہوں کہ نیلم کو ”بن کی سند ری“ میں ویپکے روں کے لیے کیوں منتخب کیا گیا؟ اس لیے کہ اس میں تیزی و طراری نام کو بھی نہیں تھی۔ جب وہ پہلی مرتبہ اپنا اہمیات پارٹ ادا کرنے کے لیے تنگ چوپی پہن کر سیٹ پر آئی تو میری نگاہوں کو بہت صدمہ پہنچا۔ وہ دوسروں کا ردد عمل فوراً تاثر جاتی تھی۔ چنانچہ مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا، ”ڈائریکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ تمہارا پارٹ چونکہ شریف عورت کا نہیں ہے، اس لیے تمہیں اس قسم کا لباس دیا گیا ہے۔ میں نے ان سے کہا اگر یہ لباس ہے تو میں آپ کے ساتھ نگی چلنے کے لیے تیار ہوں۔“

میں نے اس سے پوچھا، ”ڈائریکٹر صاحب نے یہ سن کر کیا کہا؟“

نیلم کے پتلے ہونٹوں پر ایک خفیف سی پراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی، ”انھوں نے تصور میں مجھے نگی دیکھنا شروع کر دیا۔۔۔ یہ لوگ بھی کتنے احمق ہیں۔ یعنی اس لباس میں مجھے دیکھ کر، بے چارے تصور پر زور ڈالنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟“

ذہین قاری کے لیے نیلم کا اتنا تعارف ہی کافی ہے۔ اب میں ان واقعات کی طرف آتا ہوں جن کی مدد سے میں یہ کہانی مکمل کرنا چاہتا ہوں۔

بمبئی میں جون کے مہینے سے بارش شروع ہو جاتی ہے اور ستمبر کے وسط تک جاری رہتی ہے۔ پہلے دو ڈھائی مہینوں میں اس قدر پانی برستا ہے کہ اسٹوڈیو میں کام نہیں ہو سکتا۔ ”بن کی سندری“ کی شو ٹنگ اپریل کے اوآخر میں شروع ہوئی تھی۔ جب پہلی بارش ہوئی تو ہم اپنا تمیر اسیٹ کمل کر رہے تھے۔ ایک چھوٹا سا سینے باقی رہ گیا تھا جس میں کوئی مکالمہ نہیں تھا، اس لیے بارش میں بھی ہم نے اپنا کام جاری رکھا۔ مگر جب یہ کام ختم ہو گیا تو ہم ایک عرصے کے لیے بے کار ہو گئے۔

اس دوران میں اسٹوڈیو کے لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بیٹھنے کا بہت موقع ملتا ہے۔ میں تقریباً سارا دن گلاب کے ہوٹل میں بیٹھا چاۓ پیتا رہتا تھا۔ جو آدمی بھی اندر آتا تھا، یا تو سارے کا سارا بھیگا ہوتا تھا یا آدھا۔۔۔ باہر کی سب لمبیاں پناہ لینے کے لیے اندر رجع ہو گئی تھیں۔ اس قدر غلیظ فضا تھی کہ الاماں۔ ایک کرسی پر چاۓ نے نچوڑنے کا کپڑا اپڑا ہے، دوسری پر پیاز کاٹنے کی بد بودار چھری پڑی جھک مار رہی ہے۔ گلاب صاحب پاس کھڑے ہیں اور اپنے گوشت خورہ لگے دانتوں تلے بمبئی کی اردو چبار ہے ہیں، ”تم ادھر جانے کو نہیں سکتا۔۔۔ ہم ادھر سے جا کے آتا۔۔۔ بہت لفڑا ہو گا۔۔۔ ہاں۔۔۔ بڑا واندہ ہو جائیں گا۔۔۔“

اس ہوٹل میں جس کی چھت کو رو گیٹیڈ اسٹیل کی تھی، سیٹھ ہر مز جی فرام جی، ان کے سالے ایڈل جی اور ہیر و نیوں کے سواب لوگ آتے تھے۔ نیاز محمد کو تون میں کئی مرتبہ یہاں آنا پڑتا تھا کیونکہ وہ چنی منی نام کی دو بلیالاں پال رہا تھا۔

راج کشور دن میں ایک چکر لگاتا تھا۔ جو نہیں وہ اپنے لمبے قد اور کسرتی بدنا کے ساتھ دلمیز پر نمودار ہوتا، میرے سوا ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کی آنکھیں تتماٹھتیں۔ اکثر اڑکے اٹھ اٹھ کر راج بھائی کو کرسی پیش کرتے اور جب وہ ان میں سے کسی کی پیش کی ہوئی کرسی پر بیٹھ جانا تو سارے پرونوں کی مانند اس کے گرد جمع ہو جاتے۔ اس کے بعد دو قسم کی باتیں سننے میں آتیں، اکثر اڑکوں کی زبان پر پرانی فلموں میں راج بھائی کے کام کی تعریف کی، اور خود راج کشور کی زبان پر اس کے اسکول چھوڑ کر کانچ اور کانچ چھوڑ کر فلمی دنیا میں داخل ہونے کی تاریخ۔۔۔ چونکہ مجھے یہ سب باتیں زبانی یاد ہو چکی تھیں اس لیے جو نہیں راج کشور ہوٹل میں داخل ہوتا میں اس سے علیک سلیک کرنے کے بعد باہر نکل جاتا۔

ایک روز جب بارش تھی اور ہر مز جی فرام جی کا ایلیشیں کتا، نیاز محمد کی دو بلیوں سے ڈر کر، گلاب کے ہوٹل کی طرف دم دبائے بھاگا آرہا تھا، میں نے مولسری کے درخت کے نیچے بننے ہوئے گول چبوترے پر نیلم اور راج کشور کو باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ راج کشور کھڑا حسبِ عادت ہو لے ہو لے جھوول رہا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے خیال کے مطابق نہایت ہی دلچسپ باتیں کر رہا ہے۔ مجھے یاد

نہیں کہ نیلم سے راج کشور کا تعارف کب اور کس طرح ہوا تھا، مگر نیلم تو اسے فلمی دنیا میں داخل ہونے سے پہلے ہی اچھی طرح جانتی تھی اور شاید ایک دو مرتبہ اس نے مجھ سے بر سیل تذکرہ اس کے متناسب اور خوبصورت جسم کی تعریف بھی کی تھی۔

میں گلاب کے ہوٹل سے نکل کر ریکارڈنگ روم کے چھپے تک پہنچا تو راج کشور نے اپنے چوڑے کاندھے پر سے کھادی کا تھیله ایک جھلکے کے ساتھ اتارا اور اسے کھول کر ایک موٹی کاپی باہر نکالی۔ میں سمجھ گیا۔۔۔ یہ راج کشور کی ڈائری تھی۔

ہر روز تمام کاموں سے فارغ ہو کر، اپنی سوتیلی ماں کا آشیر واد لے کر، راج کشور سونے سے پہلے ڈائری لکھنے کا عادی ہے۔ یوں تو اسے پنجابی زبان بہت عزیز ہے مگر یہ روز نامچہ انگریزی میں لکھتا ہے جس میں کہیں بیگور کے نازک اسٹائل کی اور کہیں گاندھی کے سیاسی طرز کی جملک نظر آتی ہے۔۔۔ اس کی تحریر پر شیکسپیر کے ڈراموں کا اثر بھی کافی ہے۔ مگر مجھے اس مرکب میں لکھنے والے کا خلوص کبھی نظر نہیں آیا۔ اگر یہ ڈائری آپ کو کبھی مل جائے تو آپ کو راج کشور کی زندگی کے دس پندرہ برسوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے؛ اس نے کتنے روپے چندے میں دیے، کتنے غریبوں کو کھانا کھلایا، کتنے جلوسوں میں شرکت کی، کیا پہنا، کیا اتارا۔۔۔ اور اگر میرا قیافہ درست ہے تو آپ کو اس ڈائری کے کسی ورق پر میرے نام کے ساتھ پینتیس روپے بھی لکھے نظر آجائیں گے جو میں نے اس سے ایک بار قرض لیے تھے اور اس خیال سے ابھی تک واپس نہیں کیے کہ وہ اپنی ڈائری میں ان کی واپسی کا ذکر کبھی نہیں کرے گا۔

خیر۔۔۔ نیلم کو وہ اس ڈائری کے چند اور اق پڑھ کر سنارہ تھا۔ میں نے دور ہی سے اس کے خوبصورت ہونٹوں کی جنبش سے معلوم کر لیا کہ وہ شیکسپیرین انداز میں پر بھوکی حمد بیان کر رہا ہے۔ نیلم، مولسری کے درخت کے نیچے گول سینٹ لگ چوتے پر، خاموش میٹھی تھی۔ اس کے چہرے کی ملحفہ متنانت پر راج کشور کے الفاظ کوئی اش پیدا نہیں کر رہے تھے۔ وہ راج کشور کی ابھری ہوئی چھاتی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے کرتے کے بٹن کھلے تھے، اور سفید بدن پر اس کی چھاتی کے کالے بال، بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتے تھے۔

اسٹوڈیو میں چاروں طرف ہر چیز دھلی ہوئی تھی۔ نیاز محمد کی دو بلیاں بھی جو عام طور پر غلیظ رہا کرتی تھیں، اس روز بہت صاف ستھری دکھائی دے رہی تھیں۔ دونوں سامنے بخ پر لیٹی نرم زم بخوں سے اپنانہ دھور رہی تھیں۔ نیلم جارجٹ کی بے داغ سفید سائز ہی میں ملبوس تھی، بلاوز سفید لنین کا تھا جو اس کی سانوں اور سڈوں بانخوں کے ساتھ ایک نہایت ہی خوشنگوار اور مضم مسانصداد پیدا کر رہا تھا۔

”نیلم اتنی مختلف کیوں دکھائی دے رہی ہے؟“

ایک لحظے کے لیے یہ سوال میرے دماغ میں پیدا ہوا اور ایک دم اس کی اور میری آنکھیں چار ہوئیں تو مجھے اس کی نگاہ کے اضطراب میں اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ نیلم مجبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ جب راج کشور چلا گیا تو اس نے مجھ سے کہا، ”آن آپ میرے ساتھ چلے گا!“

شام کوچھ بجے میں نیلم کے مکان پر تھا۔ جو نہیں ہم اندر داخل ہوئے اس نے اپنا بیگ صوفے پر پھینکا اور مجھ سے نظر ملائے بغیر کہا، ”آپ نے جو کچھ سوچا ہے غلط ہے۔“ میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ چنانچہ میں نے جواب دیا، ”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں نے کیا سوچا تھا؟“

اس کے پتے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

”اس لیے ہم دونوں نے ایک ہی بات سوچی تھی۔۔۔ آپ نے شاید بعد میں غور نہیں کیا۔ مگر میں بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ہم دونوں غلط تھے۔“

”اگر میں کہوں کہ ہم دونوں صحیح تھے۔“

اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا، ”تو ہم دونوں بیو قوف ہیں۔“

یہ کہہ کر فوراً ہی اس کے چہرے کی سنجیدگی اور زیادہ سنواراگئی، ”صادق یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں پچھی ہوں جو مجھے اپنے دل کا حال معلوم نہیں۔۔۔ تمہارے خیال کے مطابق میری عمر کیا ہو گی؟“

”بائیکس بر س۔“

”بالکل درست۔۔۔ لیکن تم نہیں جانتے کہ دس برس کی عمر میں مجھے مجبت کے معنی معلوم تھے۔۔۔ معنی کیا ہوئے جی۔۔۔ خدا کی قسم میں مجبت کرتی تھی۔ دس سے لے کر رسولہ بر س تک میں ایک خطرناک مجبت میں گرفتار رہی ہوں۔ میرے دل میں اب کیاخاں کسی کی مجبت پیدا ہو گی۔۔۔“ یہ کہہ کر اس نے میرے محمد چہرے کی طرف دیکھا اور مضطرب ہو کر کہا، ”تم کبھی نہیں مانو گے، میں تمہارے سامنے اپنا

دل نکال کر رکھ دوں، پھر بھی تم یقین نہیں کرو گے، میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔۔۔ بھتی خدا کی قسم، وہ مر جائے جو تم سے جھوٹ بولے۔۔۔ میرے دل میں اب کسی کی محبت پیدا نہیں ہو سکتی، لیکن اتنا ضرور ہے کہ۔۔۔ ”یہ کہتے کہتے وہ ایک دم رک گئی۔

میں نے اس سے کچھ نہ کہا کیونکہ وہ گھرے فکر میں غرق ہو گئی تھی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ ”اتنا ضرور“ کیا ہے؟

تحوڑی دیر کے بعد اس کے پتلے ہو نٹوں پر وہی خفیف پر اسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی جس سے اس کے چہرے کی سبجدگی میں تھوڑی سی عالمانہ شرارت پیدا ہو جاتی تھی۔ صوفے پر سے ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر اس نے کہنا شروع کیا، ”میں اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ یہ محبت نہیں ہے اور کوئی بلا ہو تو میں کہہ نہیں سکتی۔۔۔ صادق میں تمہیں یقین دلاتی ہوں۔“

میں نے فوراً ہی کہا، ”یعنی تم اپنے آپ کو یقین دلاتی ہو۔“

وہ جل گئی، ”تم بہت کہینے ہو۔۔۔ کہنے کا ایک ڈھنگ ہوتا ہے۔ آخر تمہیں یقین دلانے کی مجھے ضرورت ہی کیا پڑی ہے۔۔۔ میں اپنے آپ کو یقین دلار ہی ہوں، مگر مصیبت یہ ہے کہ آنھیں رہا۔۔۔ کیا تم میری مدد نہیں کر سکتے۔۔۔“ یہ کہہ کروہ میرے پاس بیٹھ گئی اور اپنے دانتے ہاتھ کی چھنگلیا کپڑ کر مجھ سے پوچھنے لگی، ”راج کشور کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔ میرا مطلب ہے تمہارے خیال کے مطابق راج کشور میں وہ کون سی چیز ہے جو مجھے پسند آئی ہے۔“ چھنگلیا چھوڑ کر اس نے ایک ایک کر کے دوسرا انگلیاں کپڑنی شروع کیں۔

”مجھے اس کی باتیں پسند نہیں۔۔۔ مجھے اس کی ایکٹنگ پسند نہیں۔۔۔ مجھے اس کی ڈائری پسند نہیں، جانے کیا خرافات سنارہ تھا۔“

خود ہی نگ آ کروہ اٹھ کھڑی ہوئی، ”سبھ میں نہیں آتا مجھے کیا ہو گیا ہے۔۔۔ بس صرف یہ جی چاہتا ہے کہ ایک ہنگامہ ہو۔۔۔ بلیوں کی لڑائی کی طرح شور پچ، دھول اڑے۔۔۔ اور میں پسینہ پسینہ ہو جاؤں۔۔۔“ پھر ایک دم وہ میری طرف پڑی، ”صادق۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔ میں کیسی عورت ہوں؟“

میں نے مسکرا کر جواب دیا، ”بلیلاں اور عورتیں میری سبھ سے ہمیشہ بالاتر رہی ہیں۔“

اس نے ایک دم پوچھا، ”کیوں؟“

میں نے تھوڑی دیر سوچ کر جواب دیا، ”ہمارے گھر میں ایک بُلی رہتی تھی، سال میں ایک مرتبہ اس پر رونے کے دورے پڑتے تھے۔۔۔ اس کاروناد ہونا سن کر کہیں سے ایک بلا آجایا کرتا تھا۔ پھر ان دونوں میں اس قدر لڑائی اور خون خراب ہوتا کہ الامان۔۔۔ مگر اس کے بعد وہ خالہ بُلی چار بچوں کی ماں بن جایا کرتی تھی۔“

نیلم کا جیسے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا، ”خو۔۔۔ تم کتنے گندے ہو۔“ پھر تھوڑی دیر بعد الاصحی سے منہ کا ذائقہ درست کرنے کے بعد اس نے کہا، ”مجھے اولاد سے نفرت ہے۔ خیر ہٹاوجی اس قصے کو۔“ یہ کہہ کر نیلم نے پاند ان کھول کر اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے میرے لیے پان لگانا شروع کر دیا۔ چاندی کی چھوٹی چھوٹی کھلکھلیوں سے اس نے بڑی نفاست سے پچھی کے ساتھ چونا اور کھانا کال کر رکیں نکالے ہوئے پان پر پھیلایا اور گلوری بنا کر مجھے دی، ”صادق! تمہارا کیا خیال ہے؟“

یہ کہہ کروہ خالی الذہن ہو گئی۔

میں نے پوچھا، ”کس بارے میں؟“

اس نے سروتے سے بھنی ہوئی چھالیا کاٹتے ہوئے کہا، ”اس بکواس کے بارے میں جو خواہ مخواہ شروع ہو گئی ہے۔۔۔ یہ بکواس نہیں تو کیا ہے، یعنی میری سمجھ میں کچھ آتا ہی نہیں۔۔۔ خود ہی پھاڑتی ہوں، خود ہی رفوکرتی ہوں۔ اگر یہ بکواس اسی طرح جاری رہے تو جانے کیا ہو گا۔۔۔ تم جانتے ہو، میں بہت زبردست عورت ہوں۔“

”زبردست سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

نیلم کے پتلے ہو نٹوں پر وہی خفیف پر اسرار مسکراہٹ پیدا ہوئی، ”تم بڑے بے شرم ہو۔ سب کچھ سمجھتے ہو مگر مہین مہین چکنیاں لے کر مجھے اکساوگے ضرور۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں کی سفیدی گلابی رنگت اختیار کر گئی۔

”تم سمجھتے کیوں نہیں کہ میں بہت گرم مزاج کی عورت ہوں۔“ یہ کہہ کروہ اٹھ کھڑی ہوئی، ”اب تم جاؤ۔ میں نہاننا چاہتی ہوں۔“

میں چلا گیا۔

اس کے بعد نیلم نے بہت دنوں تک راج کشور کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ کہا۔ مگر اس دوران میں ہم دونوں ایک دوسرے کے خیالات سے واقف تھے۔ جو کچھ وہ سوچتی تھی، مجھے معلوم ہو جاتا تھا اور جو کچھ میں سوچتا تھا اسے معلوم ہو جاتا تھا۔ کئی روز تک یہی خاموش تبادلہ جاری رہا۔

ایک دن ڈائریکٹر کرپلانی جو ”بن کی سند ری“ بنارہا تھا، ہیر وئ کی ریہر سل سن رہا تھا۔ ہم سب میوزک روم میں جمع تھے۔ نیلم ایک کرسی پر بیٹھی اپنے پاؤں کی جنبش سے ہولے ہولے تال دے رہی تھی۔ ایک بازاری قسم کا گانا مگر دھن اچھی تھی۔ جب ریہر سل ختم ہوئی تو راج کشور کا ندھر ہے پر کھادی کا تھیلار کھے کمرے میں داخل ہوا۔ ڈائریکٹر کرپلانی، میوزک ڈائریکٹر گھوش، ساؤنڈ ریکارڈسٹ پی اے این موگھا۔۔۔ ان سب کو فرد آفر دا اس نے انگریزی میں آداب کیا۔ ہیر وئ مس عیدن بائی کوہا تھ جوڑ کر نمسکار کیا اور کہا، ”عیدن بہن! کل میں نے آپ کو کرا فرڈار کیٹ میں دیکھا۔ میں آپ کی بجا بھی کے لیے موسیباں خرید رہا تھا کہ آپ کی موڑ نظر آئی۔۔۔“ جھولتے جھولتے اس کی نظر نیلم پر پڑی جو پیانو کے پاس ایک پست قد کی کرسی میں دھنسی ہوئی تھی۔ ایک دم اس کے ہاتھ نمسکار کے لیے، اٹھے یہ دیکھتے ہی نیلم اٹھ کھڑی ہوئی، ”راج صاحب! مجھے بہن نہ کہیے گا۔“

نیلم نے یہ بات کچھ اس انداز سے کہی کہ میوزک روم میں بیٹھے ہوئے سب آدمی ایک لحظے کے لیے مبہوت ہو گئے۔ راج کشور کھسیانا سا ہو گیا اور صرف اس تدر کہہ سکا، ”کیوں؟“

نیلم جواب دیے بغیر باہر نکل گئی۔

تیسرا روز، میں ناگ پاڑے میں سہ پہر کے وقت شام لال پنواڑی کی دکان پر گیا تو وہاں اسی واقعے کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔۔۔ شام لال بڑے فخر یہ لجھے میں کہہ رہا تھا، ”سالی کا اپنا من میلا ہو گا۔۔۔ ورنہ راج بھائی کسی کو بہن کہے، اور وہ بر امانے۔۔۔ کچھ بھی ہو، اس کی مراد کبھی پوری نہیں ہو گی۔ راج بھائی لنگوٹ کا بہت پکا ہے۔“ راج بھائی کے لنگوٹ سے میں بہت تنگ آگیا تھا۔ مگر میں نے شام لال سے کچھ نہ کہا اور خاموش بیٹھا اس کی اور اس کے دوست گاہکوں کی باتیں سن تارہ جن میں مبالغہ زیادہ اور اصلیت کم تھی۔

اسٹوڈیو میں ہر شخص کو میوزک روم کے اس حادثے کا علم تھا، اور تین روز سے گفتگو کا موضوع بس بھی چیز تھی کہ راج کشور کو مس نیلم نے کیوں ایک دم بہن کہنے سے منع کیا۔ میں نے راج کشور کی زبانی اس بارے میں کچھ نہ سنا مگر اس کے ایک دوست سے معلوم ہوا کہ اس نے اپنی ڈائری میں اس پر نہایت پر دلچسپ تبصرہ لکھا ہے اور پر ارتھنا کی ہے کہ مس نیلم کا دل و دماغ پاک و صاف ہو جائے۔ اس حادثے کے بعد کئی دن گزر گئے مگر کوئی قابل ذکر بات وقوع پذیر نہ ہوئی۔

نیلم پہلے سے کچھ زیادہ سخیدہ ہو گئی تھی اور راج کشور کے کرتے کے بڑن اب ہر وقت کھلے رہتے تھے، جس میں سے اس کی سفید اور ابھری ہوئی چھاتی کے کالے بال باہر جھانکتے رہتے تھے۔ چونکہ ایک دو روز سے بارش تھی ہوئی تھی اور ”بن کی سندری“ کے چوتھے سیٹ کارنگ خشک ہو گیا تھا، اس لیے ڈائریکٹر نے نوٹس بورڈ پر شوٹنگ کا اعلان چسپاں کر دیا۔ یہ سین جواب لیا جانے والا تھا، نیلم اور راج کشور کے درمیان تھا۔ چونکہ میں نے ہی اس کے مکالمے لکھتے تھے، اس لیے مجھے معلوم تھا کہ راج کشور بتائیں کرتے کرتے نیلم کا ہاتھ چومنے گا۔ اس سین میں چومنے کی بالکل گنجائش نہ تھی۔ مگر چونکہ عوام کے جذبات کو اکسانے کے لیے عام طور پر فلموں میں عورتوں کو ایسے لباس پہنانے جاتے ہیں جو لوگوں کو ستائیں، اس لیے ڈائریکٹر کرپلانی نے، پرانے نسخے کے مطابق، دست بوسی کا یہ ٹھیک کر کر دیا تھا۔

جب شوٹنگ شروع ہوئی تو میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سیٹ پر موجود تھا۔ راج کشور اور نیلم، دونوں کارڈ عمل کیا ہو گا، اس کے تصور ہی سے میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی۔ مگر سارے سین مکمل ہو گیا، اور کچھ نہ ہوا۔ ہر مکالمے کے بعد ایک تھکادیں والی آہنگی کے ساتھ بر قی لیپ روشن اور گل ہو جاتے۔ اسٹارٹ اور کٹ کی آوازیں بلند ہوتیں اور شام کو جب سین کے کلامکیس کا وقت آیا تو راج کشور نے بڑے رومانی انداز میں نیلم کا ہاتھ پکڑا مگر کیمرے کی طرف پیچھے کر کے اپنا ہاتھ چومن کر، الگ کر ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ نیلم اپنا ہاتھ کھینچ کر راج کشور کے منہ پر ایک ایسا چانٹا جڑے گی کہ ریکارڈنگ روم میں پی این موگھا کے کانوں کے پر دے پھٹ جائیں گے۔ مگر اس کے بر عکس مجھے نیلم کے پتلے ہو نٹوں پر ایک تخلیل شدہ مسکراہٹ دکھائی دی۔ جس میں عورت کے مجروح جذبات کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔ مجھے سخت نا امیدی ہوئی تھی۔ میں نے اس کا ذکر نیلم سے نہ کیا۔ دو تین روز گزر گئے اور جب نے اس نے بھی مجھ سے اس بارے میں کچھ نہ کہا۔ تو میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس ہاتھ چومنے والی بات کی اہمیت کا علم ہی نہیں تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کے ذکر الحس دماغ میں اس کا خیال تک بھی نہ آیا تھا اور اس کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اس وقت راج کشور کی زبان سے جو عورت کو بہن کہنے کا عادی تھا، عاشقانہ الفاظ سن رہی تھی۔

نیلم کا ہاتھ چومنے کی بجائے راج کشور نے اپنا ہاتھ کیوں چوما تھا۔۔۔ کیا اس نے انتقام لیا تھا۔۔۔ کیا اس نے اس عورت کو ذمیل کرنے کی کوشش کی تھی، ایسے کئی سوال میرے دماغ میں پیدا ہوئے مگر کوئی جواب نہ ملا۔

چوتھے روز، جب میں حسبِ معمول ناگ پاڑے میں شام لال کی دکان پر گیا تو اس نے مجھ سے شکایت بھرے لجھے میں، ”منظوم صاحب! آپ تو ہمیں اپنی کمپنی کی کوئی بات سناتے ہی نہیں۔۔۔ آپ بتانا نہیں چاہتے یا پھر آپ کو کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا؟ پتا ہے آپ کو، راج بھائی نے کیا کیا؟“ اس کے بعد اس نے اپنے انداز میں یہ کہانی شروع کی کہ ”بن کی سندھری“ میں ایک سینی تھا جس میں ڈائریکٹر صاحب نے راج بھائی کو مس نیلم کا منہ چومنے کا آرڈر دیا لیکن صاحب، کہاں راج بھائی اور کہاں وہ سالی تھا۔۔۔ راج بھائی نے فوراً کہہ دیا، ”نا صاحب میں ایسا کام کبھی نہیں کروں گا۔ میری اپنی پتی ہے، اس گندی عورت کا منہ چوم کر کیا میں اس کے پوتھوں سے اپنے ہونٹ ملا سکتا ہوں۔۔۔“ بس صاحب فوراً ڈائریکٹر صاحب کو سینی بد لنا پڑا اور راج بھائی سے کہا گیا کہ اچھا بھی تم منہ نہ چو موباتھ چوم لو، مگر راج صاحب نے بھی کچھ گولیاں نہیں کھلیلیں۔ جب وقت آیا تو اس نے اس صفائی سے اپنا ہاتھ چوما کہ دیکھنے والوں کو یہی معلوم ہوا کہ اس نے اس سالی کا ہاتھ چوما ہے۔“

میں نے اس گفتوگ کا ذکر نیلم سے نہ کیا، اس لیے کہ جب وہ اس سارے قصے ہی سے بے خبر تھی، تو اسے خواہ نجیدہ کرنے سے کیا فائدہ۔

بہبی میں میری یا عام ہے۔ معلوم نہیں، کون سا مہینہ تھا اور کون سی تاریخ تھی۔ صرف اتنا یاد ہے کہ ”بن کی سندھری“ کا پانچواں سیٹ لگ رہا تھا اور بارش بڑے زوروں پر تھی کہ نیلم اچانک بہت تیز بخار میں مبتلا ہو گئی۔ چونکہ مجھے اسٹوڈیو میں کوئی کام نہیں تھا، اس لیے میں گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا اس کی تیار داری کرتا رہتا۔ میریا نے اس کے چہرے کی سنواراہٹ میں ایک عجیب قسم کی درد آنگیز زردی پیدا کر دی تھی۔۔۔ اس کی آنکھوں اور اس کے پتلے ہونٹوں کے کونوں میں جو ناقابل بیان تکھیاں گھلی رہتی تھیں، اب ان میں ایک بے معلوم بے بسی کی جھلک بھی دکھائی دیتی تھی۔ کونیں کے ٹیکوں سے اس کی سماعت کسی قدر کمزور ہو گئی تھی۔ چنانچہ اسے اپنی نحیف آواز اوپنجی کرنا پڑتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید میرے کان بھی خراب ہو گئے ہیں۔

ایک دن جب اس کا بخار بالکل دور ہو گیا تھا، اور وہ بستر پر لیٹی نقابت بھرے لجھے میں عین بائی کی بیمار پر سی کا شکریہ ادا کر رہی تھی؛ یونچے سے موڑ کے ہارن کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا کہ یہ آواز سن کر نیلم کے بدن پر ایک سرد جھر جھری سی دوڑ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد کمرے کا دبیز سا گوانی دروازہ کھلا اور راج کشور کھادی کے سفید کرنے اور تنگ پائچا میں اپنی پرانی وضع کی بیوی کے ہم راہ اندر داخل ہوا۔

عیدن بائی کو عیدن بہن کہہ کر سلام کیا۔ میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور اپنی بیوی کو جو تیکھے تیکھے نقوش والی گھریلو قسم کی عورت تھی، ہم سب سے متعارف کراکے وہ نیلم کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ چند لمحات وہ ایسے ہی خلایں مسکراتا رہا۔ پھر اس نے بیمار نیلم کی طرف دیکھا اور میں نے پہلی مرتبہ اس کی دھلی ہوئی آنکھوں میں ایک گرد آلو د جذبہ تیرتا ہوا پایا۔

میں ابھی پورح طرح متیر بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اس نے کھلنڈرے آواز میں کہنا شروع کیا ”بہت دنوں سے ارادہ کر رہا تھا کہ آپ کی بیمار پرسی کے لیے آؤں، مگر اس کم بخت موڑ کا نجن کچھ ایسا خراب ہوا کہ دس دن کارخانے میں پڑی رہی۔ آج آئی تو میں نے (اپنی بیوی کی طرف اشارہ کر کے) شانتی سے کہا کہ بھی چلو اسی وقت اٹھو۔۔۔ رسولی کا کام کوئی اور کرے گا، آج اتفاق سے رکھشا بندھن کا تھوا ر بھی ہے۔۔۔ نیلم بہن کی خیر و عافیت بھی پوچھ آئیں گے اور ان سے رکھشا بھی بندھوائیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے کھادی کے کرتے سے ایک ریشمی پھندنے والا گجر انکالا۔ نیلم کے چہرے کی زردی اور زیادہ درد انگیز ہو گئی۔

راج کشور جان بوجھ کر نیلم کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا، چنانچہ اس نے عیدن بائی سے کہا۔ مگر ایسے نہیں۔ خوشی کا موقع ہے، بہن بیمار بن کر رکھشا نہیں باندھے گی۔ شانتی، چلو اٹھو، ان کو لپ اسٹک وغیرہ لگاؤ۔“

”میک اپ بکس کہاں ہے؟“

سامنے میٹھل پیس پر نیلم کامیک اپ بکس پڑا تھا۔ راج کشور نے چند لبے لمبے قدم اٹھائے اور اسے لے آیا۔ نیلم خاموش تھی۔۔۔ اس کے پتلے ہونٹ بھینچ گئے تھے جیسے وہ چینی بڑی مشکل سے روک رہی ہے۔ جب شانتی نے پتی ورتا استری کی طرح اٹھ کر نیلم کامیک اپ کرنا چاہا تو اس نے کوئی مزاحمت پیش نہ کی۔ عیدن بائی نے ایک بے جان لاش کو سہارا دے کر اٹھایا اور جب شانتی نے نہایت ہی غیر صناعانہ طریق پر اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگانا شروع کی تو وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔۔۔ نیلم کی یہ مسکراہٹ ایک خاموش چیز تھی۔

میرا خیال تھا۔۔۔ نہیں، مجھے یقین تھا کہ ایک دم کچھ ہو گا۔۔۔ نیلم کے بھنپھے ہوئے ہونٹ ایک دھماکے کے ساتھ واہوں گے اور جس طرح بر سات میں پھاڑی نالے بڑے بڑے مضبوط بند توڑ کر دیوانہ وار آگے نکل جاتے ہیں، اسی طرح نیلم اپنے رکے ہوئے جذبات کے طوفانی بہاؤ میں ہم سب کے قدم اکھیڑ کر خدا معلوم کن گہرائیوں میں دھکیل لے جائے گی۔ مگر تعجب ہے کہ وہ بالکل خاموش رہی۔ اس کے

چہرے کی درد انگیز ردی غازے اور سرخی کے غبار میں چھپتی رہی اور وہ پتھر کے بت کی طرح بے حس بنی رہی۔ آخر میں جب میک اپ کمل ہو گیا تو اس نے راج کشور سے حیرت انگیز طور پر مضبوط لمحے میں کہا، ”لایئے! اب میں رکھشا باندھ دوں۔“

ریشمی پھندنوں والا گجر اتھوڑی دیر میں راج کشور کی کلائی میں تھا اور نیلم جس کے ہاتھ کا نپنے چاہئیں تھے، بڑے سنگین سکون کے ساتھ اس کا تنکہ بند کر رہی تھی۔ اس عمل کے دوران میں ایک مرتبہ پھر مجھے راج کشور کی دھلی ہوئی آنکھ میں ایک گرد آلود جذبے کی جھلک نظر آئی جو فوراً اس کی منی میں تحلیل ہو گئی۔

راج کشور نے ایک لفافے میں رسم کے مطابق نیلم کو کچھ روپے دیے جو اس نے شکریہ ادا کر کے اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیے۔۔۔ جب وہ لوگ چلے گئے، میں اور نیلم اکیلے رہ گئے تو اس نے مجھ پر ایک اجڑی ہوئی نگاہ ڈالی اور تکلیٰ پر سر رکھ کر خاموش یٹ گئی۔ پنگ پر راج کشور اپنا تھیلا بھول گیا تھا۔ جب نیلم نے اسے دیکھا تو پاؤں سے ایک طرف کر دیا۔ میں تقریباً دو گھنٹے اس کے پاس بیٹھا اخبار پڑھتا رہا۔ جب اس نے کوئی بات نہ کی تو میں رخصت لیے بغیر چلا آیا۔

اس واقعہ کے تین روز بعد میں ناگ پاڑے میں اپنی نور روپے ماہوار کی کھولی کے اندر بیٹھا شیو کر رہا تھا اور دوسری کھولی سے اپنی ہمسائی مسز فرنینڈیز کی گالیاں سن رہا تھا کہ ایک دم کوئی اندر داخل ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، نیلم تھی۔ ایک لحظے کے لیے میں نے خیال کیا کہ نہیں، کوئی اور ہے۔۔۔ اس کے ہونٹوں پر گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک کچھ اس طرح پھیلی ہوئی تھی جیسے منہ سے خون نکل کر بہترہ اور اس پوچھا نہیں گیا۔۔۔ سر کا ایک بال بھی صحیح حالت میں نہیں تھا۔ سفید سماڑی کی بوٹیاں اڑی ہوئی تھیں۔ بلاوز کے تین چار ہک کھلے تھے اور اس کی سانوں چھاتیوں پر خراشیں نظر آرہی تھیں۔ نیلم کو اس حالت میں دیکھ کر مجھ سے پوچھا ہی نہ گیا کہ تمہیں کیا ہوا، اور میری کھولی کا پتہ لگا کر تم کیسے کپٹھی ہو۔

پہلا کام میں نے یہ کیا کہ دروازہ بند کر دیا۔ جب میں کرسی کھینچ کر اس کے پاس بیٹھا تو اس نے اپنے لپ اسٹک سے لٹھرے ہوئے ہونٹ کھولے اور کہا، ”میں سید ہمی یہاں آرہی ہوں۔“

”میں نے آہستہ سے پوچھا،“ کہا سے؟“

”اپنے مکان سے۔۔۔ اور میں تم سے یہ کہنے آئی ہوں کہ اب وہ بکواس جو شروع ہوئی تھی، ختم ہو گئی ہے۔“

”کیسے؟“

”مجھے معلوم تھا کہ وہ پھر میرے مکان پر آئے گا، اس وقت جب اور کوئی نہیں ہو گا! چنانچہ وہ آیا۔۔۔ اپنا تھیلا لینے کے لیے۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے پتلے ہونٹوں پر جولپ اسٹک نے بالکل بے شکل کر دیے تھے، وہی خفیف سی پر اسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی، ”وہ اپنا تھیلا لینے آیا تھا۔۔۔ میں نے کہا، چیلے، دوسرے کمرے میں پڑا ہے۔ میرا لہجہ شاید بدلا ہوا تھا کیونکہ وہ کچھ گھبر اسائگیا۔۔۔ میں نے کہا گھبرائیے نہیں۔۔۔ جب ہم دوسرے کمرے میں داخل ہوئے تو میں تھیلا دینے کی بجائے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئی اور میک اپ کرنا شروع کر دیا۔“

یہاں تک بول کرو وہ خاموش ہو گئی۔۔۔ سامنے، میرے ٹوٹے ہوئے میز پر، شیشے کے گلاس میں پانی پڑا تھا۔ اسے اٹھا کر نیلم غنا غلط پی گئی۔۔۔ اور سائزی کے پلوسے ہونٹ پوچھ کر اس نے پھر اپنا سلسلہ کلام جاری کیا، ”میں ایک گھنٹے تک میک اپ کرتی رہی۔ جتنی لپ پ اسٹک ہونٹوں پر تھپ سکتی تھی، میں نے تھوپی، جتنی سرخی میرے گالوں پر چڑھ سکتی تھی، میں نے چڑھائی۔ وہ خاموش ایک کونے میں کھڑا آئینے میں میری شکل دیکھا رہا۔ جب میں بالکل چڑیل بن گئی تو مضبوط قدموں کے ساتھ چل کر میں نے دروازہ بند کر دیا۔“

”پھر کیا ہوا؟“

میں نے جب اپنے سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے نیلم کی طرف دیکھا تو وہ مجھے بالکل مختلف نظر آئی۔ سائزی سے ہونٹ پوچھنے کے بعد اس کے ہونٹوں کی رنگت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا لہجہ اتنا ہی تپاہوا تھا جتنا سرخ گرم کیے ہوئے لوہے کا، جسے ہٹھوڑے سے کوٹا جا رہا ہو۔ اس وقت تو وہ چڑیل نظر نہیں آ رہی تھی، لیکن جب اس نے میک اپ کیا ہو گا تو ضرور چڑیل دکھائی دیتی ہو گی۔

میرے سوال کا جواب اس نے فوراً ہند دیا۔۔۔ ٹاٹ کی چار پائی سے اٹھ کر وہ میرے میز پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی، ”میں نے اس کو جھنجور دیا۔۔۔ چنگلی بلی کی طرح میں اس کے ساتھ چھٹ گئی۔ اس نے میرا منہ نوچا، میں نے اس کا۔۔۔ بہت دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کشتی لڑتے رہے۔ اوہ۔۔۔ اس میں بلا کی طاقت تھی۔۔۔ لیکن۔۔۔ جیسا کہ میں تم سے ایک بار کہہ چکی ہوں۔۔۔ میں بہت زبردست عورت ہوں۔۔۔ میری کمزوری۔۔۔ وہ کمزوری جو میریا نے پیدا کی تھی، مجھے بالکل محسوس نہ ہوئی۔ میرا بدن تپ رہا تھا۔ میری آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔۔۔ میری ہڈیاں سخت ہو رہی تھیں۔ میں نے اسے کپڑا لیا۔ میں نے اس سے بیلوں کی طرح لڑنا شروع

کیا۔۔۔ مجھے معلوم نہیں کیوں۔۔۔ مجھے پتا نہیں کس لیے۔۔۔ بے سوچ سمجھے میں اس سے بھر گئی۔۔۔ ہم دونوں نے کوئی بھی ایسی بات زبان سے نہ نکالی جس کا مطلب کوئی دوسرا سمجھ سکے۔۔۔ میں چیختی رہی۔۔۔ وہ صرف ہوں گرتا رہا۔۔۔ اس کے سفید کھادی کے کرتے کی کئی بوٹیاں میں نے ان انگلیوں سے نوچیں۔۔۔ اس نے میرے بال، میری کئی لٹیں جڑ سے نکال ڈالیں۔۔۔ اس نے اپنی ساری طاقت صرف کر دی۔۔۔ مگر میں نے تبیہ کر لیا تھا کہ فتح میری ہو گی۔۔۔ چنانچہ وہ قالین پر مردے کی طرح لیٹا تھا۔۔۔ اور میں اس قدر ہانپر رہی تھی کہ ایسا لگتا تھا کہ میر انس ایک دمرک جائے گا۔۔۔ اتنا ہانپتے ہوئے بھی میں نے اس کے کرتے کو چندی چندی کر دیا۔۔۔ اس وقت میں نے اس کا چوڑا چکلا سینہ دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ بکواس کیا تھی۔۔۔ وہی بکواس جس کے متعلق ہم دونوں سوچتے تھے اور کچھ سمجھ نہیں سکتے تھے۔۔۔

یہ کہہ کرو وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سر کی جنبش سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہنے لگی، ”صادق۔۔۔ کم بخت کا جسم واقعی خوبصورت ہے۔۔۔ جانے مجھے کیا ہوا۔۔۔ ایک دم میں اس پر جھکی اور اسے کاٹنا شروع کر دیا۔۔۔ وہ سی کرتا رہا۔۔۔ لیکن جب میں نے اس کے ہونٹوں سے اپنے لہو بھرے ہونٹ پیوست کیے اور اسے ایک خطرناک جلتا ہوا بوسہ دیا تو وہ انجمام رسیدہ عورت کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔۔۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔۔۔ مجھے اس سے ایک دم نفرت پیدا ہو گئی۔۔۔ میں نے پورے غور سے اس کی طرف نیچے دیکھا۔۔۔ اس کے خوبصورت بدن پر میرے لہو اور لپ اسٹک کی سرخی نے بہت ہی بد نما بیل بوٹے بنادیے تھے۔۔۔ میں نے اپنے کرے کی طرف دیکھا تو ہر چیز مصنوعی نظر آئی۔۔۔ چنانچہ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا کہ شاید میر ادم گھٹ جائے اور رسید ہی تمہاری پاس چلی آئی۔۔۔

یہ کہہ وہ خاموش ہو گئی۔۔۔ مردے کی طرح خاموش۔۔۔ میں ڈر گیا، اس کا ایک ہاتھ جو چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا، میں نے چھووا۔۔۔ آگ کی طرح گرم تھا۔

”نیلم۔۔۔ نیلم۔۔۔“

میں نے کئی دفعہ اسے زور زور سے پکارا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔۔۔ آخر جب میں نے بہت زور سے خوف زدہ آواز میں نیلم کہا تو وہ چوکنی، اور اٹھ کر جاتے ہوئے اس نے صرف اس قدر کہا، ”سعادت میر انام رادھا ہے!“

باستط بالکل رضامند نہیں تھا، لیکن ماں کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ چلی۔ اول اول تو اس کو اتنی جلدی شادی کرنے کی کوئی خواہش نہیں تھی، اس کے علاوہ وہ لڑکی بھی اسے پسند نہیں تھی جس سے اس کی ماں اس کی شادی کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ بہت دیر تک ٹال تارہ۔ جتنے بہانے بنائے تھے۔ اس نے بنائے، لیکن آخر ایک روز اس کو ماں کی اٹل خواہش کے سامنے سرتسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ دراصل انکار کرتے کرتے وہ بھی تنگ آگیا تھا۔ چنانچہ اس نے دل میں سوچا، ”یہ بک بک ختم ہی ہو جائے تو اچھا ہے، ہونے دو شادی۔ کوئی قیامت تو نہیں ٹوٹ پڑے گی۔۔۔ میں نجھالوں گا۔“

اس کی ماں بہت خوش ہوئی۔ لڑکی والے اس کے عزیز تھے اور وہ عرصہ ہوا ان کو زبان دے چکی تھی۔ جب باسط نے ہاں کی تودہ تارنچ پکی کرنے کے لیے لڑکی والوں کے ہاں گئی۔ انہوں نے ٹال مٹول کی تو باسط کی ماں کو بہت غصہ آیا۔ ”سعیدہ کی ماں، میں نے اتنی مشکلوں سے باسط کو رضامند کیا ہے، اب تم تارنچ پکی نہیں کر رہی ہو۔ شادی ہو گی تو اسی مہینے کی بیس کو ہو گی۔ نہیں تو نہیں ہو گی۔ اور یہ بات سولہ آنے پکی ہے۔ سمجھ لیا۔“

دھمکی نے کام کیا۔ لڑکی کی ماں بالآخر راضی ہو گئی۔ سب تیاریاں مکمل ہوئیں۔ بیس کو دہن گھر میں تھی۔ باسط کو گو وہ پسند نہیں تھی لیکن وہ اس کے ساتھ نبھانے کا فیصلہ کر چکا تھا، چنانچہ وہ اس سے بڑی محبت سے پیش آیا۔ اس پر بالکل ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اس سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اور یہ کہ وہ زبردستی اس کے سرمنڈھ دی گئی ہے۔

نئی دہنیں عام طور پر بہت شر میلی ہوتی ہیں لیکن باسط نے محسوس کیا کہ سعیدہ ضرورت سے زیادہ شر میلی ہے۔ اس کے اس شر میلے پن میں کچھ خوف بھی تھا جیسے وہ باسط سے ڈرتی ہے۔ شروع شروع میں باسط نے سوچا کہ یہ چیز دو رہو جائے گی مگر وہ بڑھتی ہی گئی۔ باسط نے اس کو چند روز کے لیے میکے بھیج دیا۔ واپس آئی تو اس کا خوف آکو دش میلا پن ایک حد تک دور ہو چکا تھا۔ باسط نے سوچا ایک دو مرتبہ اور میکے جائے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔ مگر اس کا یہ قیاس غلط تکلا۔ سعیدہ پھر خوف زدہ رہنے لگی۔

باسط نے ایک روز اس سے پوچھا، ”سعیدہ تم ڈری کیوں رہتی؟“ سعیدہ یہ سن کر چوکی، ”نہیں تو۔۔۔ نہیں تو۔“ باسط نے اس سے بڑے پیار بھرے لمحے میں کہا، ”آخر بات کیا ہے۔۔۔ خدا کی قسم مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔۔۔ کس بات کا ڈر ہے تمہیں۔۔۔ میری ماں اتنی اچھی

ہے۔۔۔ وہ تم سے ساسوں کا ساسلوک نہیں کرتی۔ میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں۔۔۔ پھر تم ایسی صورت کیوں بنائے رکھتی ہو کہ معلوم ہوتا ہے تمہیں یہ خوف ہے کہ کوئی تمہیں پیٹے گا۔ ” یہ کہہ کر اس نے سعیدہ کا منہ چوما۔ سعیدہ خاموش رہی۔ اس کی آنکھیں البتہ اور زیادہ خوف زدہ ہو گئیں۔

باسط نے اس کو اور پیار کیا اور کہا، ”تمہیں ہر وقت ہنسنی رہنا چاہیے۔۔۔ لو، اب ذرا ہنسو۔۔۔ ہنسو میری جان۔“ سعیدہ نے ہنسنے کی کوشش کی۔
باسط نے یہاں سے اس کو تھکل دی۔ ”شباش۔۔۔ اسی طرح مسکرا تا پھر ہونا چاہیے ہر وقت!“

باسط کی یہ محبت ظاہر ہے کہ بالکل مصنوعی تھی، کیونکہ سعیدہ کے لیے اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی، لیکن وہ صرف اپنی ماں کی خاطر چاہتا تھا کہ سعیدہ سے اس کا رشتہ ناکام ثابت نہ ہو۔۔۔ اس کی ماں اپنی شکست کبھی برداشت نہ کر سکتی۔ اس نے اپنی زندگی میں شکست کا منہ دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس لیے باسط کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ سعیدہ سے اس کی بھج جائے، چنانچہ اپنے دل میں سعیدہ کے لیے اس نے بڑے خلوص کے ساتھ مصنوعی محبت پیدا کر لی تھی۔ اس کی ہر آسائش کا خیال رکھتا تھا۔ اپنی ماں سے سعیدہ کی چھوٹی سی بات کی بھی تعریف کرتا تھا۔ جب وہ یہ محسوس کرتا کہ اس کی ماں بہت مطمئن ہے، اس بات سے مطمئن ہے کہ اس نے باسط کا رشتہ ٹھیک جگہ کیا ہے تو اس کو دلی خوشی ہوتی۔

شادی کو ایک مہینہ ہو گیا۔ اس دوران میں سعیدہ کئی مرتبہ میکے گئے۔ باسط کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یوں اس کا خوف آسودہ شر میلا پن دور ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ یہ دن بہ دن بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اب تو سعیدہ وحشت زدہ دکھائی دیتی تھی۔ باسط حیران تھا کہ بات کیا ہے۔ اس کے بارے میں اس نے ماں سے کوئی بات نہ کی اس لیے کہ اسے یقین تھا کہ وہ اس کو ڈانٹ پلاتیں، ”بکواس نہ کرو۔ مجھے معلوم تھا تم ضرور ایک روز اس میں کیڑے ڈالو گے۔“ باسط نے سعیدہ ہی سے کہا، ”میری جان، تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو۔“ سعیدہ چونکہ اٹھی۔ ”جی؟“

اس کے چونکنے پر باسط نے یوں محسوس کیا جیسے اس نے سعیدہ کی کسی دھکتی رگ پر زور سے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ لمحے میں اور زیادہ پیار بھر کے اس نے کہا، ”میں نے پوچھا تھا کہ اب تم اور زیادہ خوف زدہ رہنے لگی ہو۔ آخر بات کیا ہے؟“

سعیدہ نے تھوڑے توقف کے بعد جواب دیا، ”بات تو کچھ بھی نہیں۔۔۔ میں ذرا بیمار ہوں۔“

”کیا بیماری ہے--- تم نے مجھ سے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔“

سعیدہ نے دوپٹے کے کنارے کو انگلی پر لپیٹتے ہوئے جواب دیا، ”امی جان علاج کر رہی ہے میرا۔ جلدی ٹھیک ہو جاؤں گی۔“ باسط نے سعیدہ سے اور زیادہ دلچسپی لینا شروع کی تو اس نے دیکھا کہ وہ ہر روز چھپ کر کوئی دوا کھاتی ہے۔ ایک دن جب کہ وہ اپنے قفل لگے ٹرنک سے دوا نکال کر کھانے والی تھی۔ وہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ زور سے چونکی۔ سفوف کی کھلی ہوئی پڑیا اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ باسط نے اس سے پوچھا، ”یہ دوا کھاتی ہو؟“ سعیدہ نے ٹھوک نگل کر جواب دیا، ”جی ہاں--- امی جان نے حکیم صاحب سے منگوانی تھی۔“

”کچھ افاقہ ہے اس سے؟“

”جی ہاں!“

”تو کھاؤ--- اگر آرام نہ آئے تو مجھ سے کہنا۔ میں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔“ سعیدہ نے پڑیا فرش پر سے اٹھائی اور سر ہلا کر کہا، ”جی اچھا۔“

باسط چلا گیا۔ اس نے سوچا، ”اچھا ہے، کوئی علاج تو ہورہا ہے۔ خدا کرے اچھی ہو جائے۔ میرا خیال ہے یہ ڈرور کچھ نہیں۔ بیماری ہے--- دور ہو جائیگی انشاء اللہ!“

اس نے سعیدہ کی اس بیماری کا اپنی ماں سے پہلی بار ذکر کیا تو کہنے لگی، ”بکواس ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے اچھی بھلی ہے۔ کیا بیماری ہے اسے؟“ باسط نے کہا، ”مجھے کیا معلوم امی جان---؟ یہ تو سعیدہ ہی بتاسکتی ہے آپ کو۔“ باسط کی ماں نے بڑی بے پرواںی سے کہا، ”میں پوچھوں گی اس سے---“

جب سعیدہ سے دریافت کیا تو اس نے جواب دیا، ”کچھ نہیں خالہ جان، سر میں در در ہتا تھا۔ امی جان نے حکیم صاحب سے دوامگادی تھی۔ اصل میں باسط صاحب بڑے وہی ہیں--- ہر وقت کہتے رہتے ہیں تم ڈری ڈری سی دکھائی دیتی ہو--- مجھے ڈر کس بات کا ہو گا بھلا۔“ باسط کی ماں نے کہا، ”بکواس کرتا ہے۔ تم اس کی فضول بالتوں کا خیال نہ کرو۔“ چند روز کے بعد باسط نے محسوس کیا کہ سعیدہ بہت ہی زیادہ گھبرائی

ہوئی ہے۔ اس کا اضطراب اس کے روئیں روئیں سے ظاہر ہوتا تھا۔ شام کے قریب اس نے باسط سے کہا، ”امی جان سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔۔۔ مجھے وہاں چھوڑ آئیے۔“

باسط نے جواب دیا، ”نہیں سعیدہ۔ آج تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ سعیدہ نے اصرار کیا، ”آپ مجھے وہاں چھوڑ آئیے۔ ٹھیک ہو جاؤں گی۔“ باسط نے انکار کر دیا۔ ”وہاں طبیعت ٹھیک ہو سکتی ہے تو یہاں بھی ٹھیک ہو سکتی ہے۔ جاؤ آرام سے لیٹ جاؤ۔“ باسط کی ماں آگئی۔ باسط نے اس سے کہا، ”امی جان، دیکھیے سعیدہ ضد کر رہی ہے طبیعت اس کی ٹھیک نہیں، کہتی ہے مجھے امی جان کے پاس لے چلو۔“ باسط کی ماں نے بڑی بے پرواںی سے کہا، ”کل چلی جان سعیدہ۔“

سعیدہ نے اور کچھ نہ کہا۔ خاموش ہو کر باہر صحن میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد باسط باہر نکلا۔ سعیدہ صحن میں نہیں تھی۔ اس نے ادھر اُدھر تلاش کیا۔ مگر وہ نہ ملی۔ باسط نے سوچا اور پر کوٹھے پر ہو گی۔ اوپر گیا تو غسل خانے کا دروازہ بند تھا۔ کھٹکھٹا کر اس نے آواز دی، ”سعیدہ!“ کوئی جواب نہ ملا تو پھر پکارا، ”سعیدہ!“ اندر سے بڑی نحیف آواز آئی۔ ”جی!“ باسط نے پوچھا، ”کیا کر رہی ہو۔“ اور زیادہ نحیف آواز آئی، ”نہار ہی ہوں۔“

باسط نیچے آگیا۔ سعیدہ کے بارے میں سوچتا سوچتا باہر گلی میں نکلا۔ موری کی طرف نظر پڑی تو اس میں خون ہی خون تھا اور یہ خون اس غسل خانے سے آرہا تھا۔ جس میں سعیدہ نہار ہی تھی۔ باسط کے ذہن میں تلے اور کئی خیالات اوندوں ہے سیدھے گرے۔ پھر یہ گردان شروع ہو گئی۔ ”دوا۔۔۔ خون۔۔۔ خون۔۔۔ دوا۔۔۔ ڈر۔۔۔ دوا۔۔۔ خون۔۔۔ ڈر!“

پھر اس نے آہستہ آہستہ سوچنا شروع کیا۔ سعیدہ کی ماں شادی کی تاریخ کی پکی نہیں کرتی تھی۔ اس نے کہا تھا ایک دو مہینے ٹھہر جاؤ۔۔۔ سعیدہ کا بار بار اپنی ماں سے ملتے جانے۔۔۔ اس کا ہر وقت خوفزدہ رہنا، دوا کھانا اور خاص طور پر آج بہت ہی زیادہ و حشمت زدہ رہنا۔ باسط سارا معاملہ سمجھ گیا۔ سعیدہ پیٹ سے تھی۔ جب وہ لہن بن کر اس کے پاس آئی تھی۔ اس کی ماں کی یہ کوشش تھی کہ حمل گر جائے۔ چنانچہ آج وہ چیز ہو گئی۔ باسط نے سوچا، ”لیا میں اور جاؤں۔ جا کر سعیدہ کو دیکھوں۔۔۔ اپنی ماں سے بات کروں۔“ ماں کا سوچا تو اس کو خیال آیا کہ وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گی۔ وہ اپنے بیٹے کی آنکھوں میں ذلیل ہونا کبھی گوارا نہیں کرے گی۔ ضرور کچھ کھا کر مر جائے گی۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اپنے کمرے میں گیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

کئی بار اس کو سعیدہ کا خیال آیا کہ وہ خدا معلوم کس حالت میں ہوگی۔ اس کے جسم پر، اس کے دل و دماغ پر کیا کچھ بینتا ہو گا اور کیا بیت رہا ہو گا۔ کیسے اتنا بڑا راز چھپائے گی۔ کیا لوگ پہچان نہیں جائیں گے۔ جوں جوں وہ سعیدہ کے بارے میں سوچتا اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ بڑھتا جاتا۔ اس کو سعیدہ پر ترس آنے لگا، ”بے چاری، معلوم نہیں بے ہوش پڑی ہے یا ہوش میں ہے۔ ہوش میں بھی اس پر جانے کیا گزر رہی ہوگی۔۔۔ کیا وہ نیچے آسکے گی؟“

تحوڑی دیر کے بعد وہ اٹھ کر صحن میں گیا تو سعیدہ نیچے آئی۔ اس کا رنگ بے حد زرد تھا، اتنا زرد کہ وہ بالکل مردہ معلوم ہوتی تھی۔ اس سے بکشکل چلا جاتا تھا۔ ٹانگ میں لڑکھڑا رہی تھیں۔ کمر میں جیسے جان ہی نہیں تھی۔ باسط نے اس کو دیکھا تو اس پر بہت ترس آیا۔ اندر سے بر قع اٹھایا اور اس سے کہا، ”چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔“ سعیدہ نے بہت بہت سے کام لیا۔ باسط کے ساتھ چل کر باہر سڑک تک گئی۔ باسط نے ٹانگ لیا اور اس کو اس کی ماں کے پاس چھوڑ آیا۔ ماں نے اس سے پوچھا، ”سعیدہ کہاں ہے؟“ باسط نے جواب دیا، ”ضد کرتی تھی۔ میں اسے چھوڑ آیا ہوں۔“

باسط کی ماں نے اس کو ڈالنا، ”بکو اس کرتے ہو۔ ضد کرنے دی ہوتی۔ تم اسی طرح اس کی عادتیں خراب کرو گے اور پھر مجھ سے کہو کہ میں نے غلط جگہ تمہارا رشتہ کیا تھا۔“

باسط نے کہا، ”نہیں امی جان۔ سعیدہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔“ اس کی ماں مسکراتی، ”میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ وہ بہت نیک لڑکی ہے تم اسے ضرور پسند کرو گے۔“ پھر تھوڑی دیر چھالیا کاٹنے کے بعد ایک دم باسط سے مخاطب ہوئی، ”اور ہاں باسط، یہ اوپر غسل خانے میں خون کیسا تھا؟“

باسط سٹپٹا سا گیا۔ ”وہ۔۔۔ کچھ نہیں امی جان۔ میری نکسیر پھوٹی تھی۔“ ماں نے بڑے غصے کے ساتھ کہا، ”کم بخت گرم چیزیں نہ کھایا کرو۔۔۔ جب دیکھو جیبیں موںگ پھلی سے بھری ہیں۔“

باسط کچھ دیر اپنی ماں کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ وہ اٹھ کر کہیں گئی تو باسط اوپر غسل خانے میں گیا۔ پانی ڈال کر اس کو اچھی طرح صاف کیا۔ اس کے دل کو اس بات کا بڑا اطمینان تھا کہ اس نے اپنی ماں سے سعیدہ کے متعلق کوئی بات نہیں کی اور نہ اس نے سعیدہ پر یہ ظاہر ہونے دیا کہ وہ اس کا راز جانتا ہے۔

وہ دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ سعیدہ کاراز ہمیشہ اس کے سینے میں دفن رہیگا۔ وہ کافی تکلیف اٹھا چکی تھی۔ باسط کے خیال کے مطابق اس کو اپنے کیے کی سزا مل چکی تھی۔ مزید سزاد یعنی کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ”خدا کرے وہ جلد تدرست ہو جائے۔ اب اس کے چہرے پر وہ الجھن پیدا کرنے والا خوف نہیں رہے گا۔“ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نیچے اس کی ماں کی چیخ کی آواز آئی۔ باسط لوٹا کر دوڑا نیچے گیا۔ سب کمرے دیکھے ڈیورٹھی میں گیا تو اس کی ماں فرش پر اوندھی پڑی تھی، مردہ۔ اس کے سامنے کوڑے والے لکڑی کے بکس میں ایک چھوٹا بہت ہی چھوٹا سانا مکمل بچہ کپڑے میں لپٹا پڑا تھا۔

باسط کو بے حد صدمہ ہوا۔ اس نے پہلے اس بچے کو اٹھایا۔ کپڑے میں اچھی طرح لپیٹا اور اندر جا کر بوٹ کے خالی ڈبے میں بند کر دیا۔ پھر ماں کو اٹھا کر اندر چارپائی پر لٹایا اور اس کے سر ہانے بیٹھ کر دیر تک رو تارہ۔ سعیدہ کو اطلاع پہنچی تو اس کو اپنی ماں کے ساتھ آنا پڑا۔ وہ اسی طرح زرد تھی۔ پہلے سے زیادہ مذہمال۔ باسط کو بہت ترس آیا۔ اس سے کہا، ”سعیدہ جو اللہ کو منظور تھا، ہو گیا۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ رونا بندر کرو اور جاؤ اندر لیٹ جاؤ۔“

اندر جانے کے بعد جائے سعیدہ ڈیورٹھی میں گئی۔ جب واپس آئی تو اس کا چہرہ بدلی کی طرح زرد تھا۔ باسط خاموش رہا۔ سعیدہ نے اس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ آنسو صاف بتارہ ہے تھے کہ وہ باسط کا شکریہ ادا کر رہی ہے۔۔۔ باسط نے اس سے بڑے پیارے کہا، ”زیادہ رونا اچھا نہیں سعیدہ۔۔۔ جو خدا کو منظور تھا ہو گیا۔“

دوسرے روز اس نے بچے کو نہر کے کنارے گڑھا کھود کر دفاتر دیا۔

-[53]-

انجام بخیر: سعادت حسن منشو

بُوارے کے بعد جب فرقہ دارانہ فسادات شدت اختیار کر گئے اور جگہ جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے خون سے زین رنگی جانے لگی تو نیم اختر جو دہلی کی نو خیز طوائف تھی اپنی بوڑھی ماں سے کہا، ”چلو ماں بیہاں سے چلیں۔“ بوڑھی ناگلہ نے اپنے پوپلے منہ میں پاندان سے چھالیہ کے باریک باریک ٹکڑے ڈالتے ہوئے اس سے پوچھا، ”کہاں جائیں گے بیٹا۔۔۔“

پاکستان۔ یہ کہہ کر وہ اپنے استاد خان صاحب اچھن خاں سے مخاطب ہوئی، ”خان صاحب! آپ کا کیا خیال ہے؟ یہاں رہنا بخطرے سے خالی نہیں۔“

خان صاحب نے نیم اختر کی ہاں میں ہاں ملائی، ”تم کہتی ہو مگر بائی جی کو منالو تو سب چلیں گے۔“

نیم اختر نے اپنی ماں سے بتایا کہ چلواب یہاں ہندوؤں کا راج ہو گا۔ کوئی مسلمان باقی نہیں چھوڑیں گے۔

بڑھیانے کہا، ”تو کیا ہوا، ہمارا دھندرہ تو ہندوؤں کی بدولت ہی چلتا ہے اور تمہارے چاہنے والے بھی سب کے سب ہندو ہی ہیں، مسلمانوں میں رکھا ہی کیا ہے۔“

”ایسا نہ کہو، ان کا نہ ہب اور ہمارا نہ ہب ایک ہے۔ قائدِ اعظم نے اتنی محنت سے مسلمانوں کے لیے پاکستان بنایا ہے ہمیں اب وہیں رہنا چاہیے۔“

مانڈو میراثی نے افیم کے نشہ میں اپنا سر ہلا کیا اور غنودگی بھری آواز میں کہا، ”چھوٹی بائی، اللہ سلامت رکھے تمھیں۔۔۔ کیا بات کہی ہے۔ میں تو ابھی چلنے کے لیے تیار ہوں، میری قبر وہاں بننے تو میری روح ہمیشہ خوش رہے گی۔“

دوسرے میراثی تھے، وہ بھی تیار ہو گئے، لیکن بڑی بائی دلی چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ بالاخانے پر اسی کا حکم چلتا تھا، اس لیے سب خاموش ہو گئے۔

بڑی بائی نے سیٹھ گوبند پر کاش کی کوٹھی پر آدمی بھیجا اور اس کو بلا کر کہا، ”میری بچی آج کل بہت ڈری ہوئی ہے۔ پاکستان جانا چاہتی تھی۔ مگر میں نے سمجھایا، وہاں کیا دھرا ہے۔ یہاں آپ ایسے مہربان سیٹھ لوگ موجود ہیں، وہاں جا کر ہم اپلے تھاپیں گے۔ آپ ایک کرم کیجیے۔“

سیٹھ بڑی بائی کی باتیں سن رہا تھا مگر اس کا دماغ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ ایک دم چونک کراس نے بڑی بائی سے پوچھا، ”تو کیا چاہتی ہے؟“

”ہمارے کوٹھے کے نیچے دو تین بندوقوں والے سپاہیوں کا پہر اکھڑا کر دیجیے تاکہ بچی کا سہم دور ہو۔“

سیٹھ گوبند پر کاش نے کہا، ”یہ کوئی مشکل نہیں۔ میں ابھی جا کر سپریٹنڈنٹ پولیس سے ملتا ہوں، شام سے پہلے پہلے سپاہی موجود ہوں گے۔“

نسیم اختر کی ماں نے سیٹھ کو بہت دعاکیں دیں۔ جب وہ جانے لگتا تو اس نے کہا ہم آج اپنی بائی کا مجرما سننے آئیں گے۔ بڑھیا نے اٹھ کر تغطیماً کہا، ”ہائے جم جم آئیے، آپ کا اپنا گھر ہے، پچی کو آپ اپنی قمیص سمجھیے، کھانا بیسیں کھائیے گا۔“

”نہیں میں آج کل پرہیزی کھانا کھارہا ہوں۔۔۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی توند پر ہاتھ پھیرتا چلا گیا۔

شام کو نسیم کی ماں نے چاند نیاں بدلوائیں، گاؤں تکیوں پرنے غلاف چڑھوائے، زیادہ روشنی کے بلب لگوائے، اعلیٰ قسم کے سگر ٹوں کا ڈبہ منگوانے بھیجا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد نوکر حواس باختہ ہانپتا کا نپتا واپس آگیا۔ اس کے منہ سے ایک بات نہ لکھتی تھی۔ آخر جب وہ کچھ دیر کے بعد سنبھالا تو اس نے بتایا کہ چوک میں پانچ چھ سکھوں نے ایک مسلمان خوانچہ فروش کو کرپانوں سے اس کی آنکھوں کے سامنے ٹکٹرے کر ڈالا ہے، جب اس نے یہ دیکھا تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور یہاں آن کے دم لیا۔

نسیم اختر یہ خبر سن کر بے ہوش ہو گئی۔ بڑی مشکلوں سے خان صاحب اچھن خال اسے ہوش میں لائے مگر وہ بہت دیر تک نہ حال رہی اور خاموش خلامیں دیکھتی رہی۔ آخر اس کی ماں نے کہا، ”خون خرابے ہوتے ہی رہتے ہیں، کیا اس سے پہلے قتل نہیں ہوتے تھے؟“ دم دلاسہ دینے کے بعد نسیم اختر سنبھل گئی تو اس کی ماں نے اس سے بڑے دلار اور بیار سے کہا، ”اٹھو میری پچی، جاؤ پشاور پہنو، سیٹھ آتے ہی ہوں گے۔“

نسیم نے بادل خواستہ پشاور پہنی، سولہ سنگھار کیے اور مندر پر بیٹھ گئی۔ اس کا جی بھاری بھاری تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس مقتول خوانچہ فروش کا سارا خون اس کے دل و دماغ میں جم گیا ہے، اس کا دل ابھی تک دھڑک رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ زرق برق پشاور کی بجائے سادہ شلوار قمیص پہن لے اور اپنی ماں سے ہاتھ جوڑ کر بلکہ اس کے پاؤں پڑ کر کہے کہ خدا کے لیے میری بات سنو اور بھاگ چلو یہاں سے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ہم پر کوئی نہ کوئی آفت آنے والی ہے۔

بڑھیا نے جھنجھلا کر کہا، ”ہم پر کیوں آفت آنے لگی، ہم نے کسی کا کیا رکڑا ہے؟“

نسیم نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا، ”اس غریب خوانچہ فروش نے کسی کا کیا بگاڑا تھا جو ظالموں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ بگاڑنے والے نج جاتے ہیں۔ مارے جاتے ہیں جنہوں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا ہوتا۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“

”ایسے حالات میں کس کا دماغ درست رہ سکتا ہے۔ چاروں طرف خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھی، بالکل وہی میں کھڑی ہو گئی اور ینچے بازار میں دیکھنے لگی۔ اسے بجلی کے کھبے کے پاس چار آدمی کھڑے دکھائی دیے۔ جن کے پاس بندوقیں تھیں، اس نے خان اچھن کو بتایا اور وہ آدمی دکھائے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہی سپاہی ہیں جن کو سمجھنے کا وعدہ سیٹھ کر گیا تھا۔

خان صاحب نے غور سے دیکھا۔

”نہیں یہ سپاہی نہیں۔ سپاہیوں کی تواریخ ہوتی ہے، مجھے تو یہ غنڈے معلوم ہوتے ہیں۔“

نسیم اختر کا لکھجہ دھک سے رہ گیا، ”غمڈے!“

”اللہ بہتر جانتا ہے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لو یہ تمہارے کوٹھے کی طرف آ رہے ہیں۔ دیکھو نسیم، کسی بہانے سے اوپر کوٹھے پر چلی جاؤ، میں تمہارے پیچے آتا ہوں۔ مجھے دال میں کالا نظر آتا ہے۔“

نسیم اختر پکے سے باہر نکلی اور اپنی ماں سے نظر بچا کر اوپر کی منزل پر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد خان صاحب اچھن خال اپنی چند ھی آنکھیں جھپکاتا اوپر آیا اور جلدی سے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔

نسیم اختر جس کا دل جیسے ڈوب رہا تھا، خان صاحب سے پوچھا، ”کیا بات ہے؟“

”وہی جو میں نے سمجھا تھا۔ تمہارے متعلق پوچھ رہے تھے، کہتے تھے سیٹھ گوبندر پر کاش نے کار بھیجی ہے اور بلوایا ہے۔ تمہاری ماں بڑی خوش ہوئی۔ بڑی مہربانی ہے ان کی۔ میں دیکھتی ہوں کہاں ہے شاید غسل خانے میں ہو۔ اتنی دیر میں میں تیار ہو جاؤں۔ ان غنڈوں میں سے ایک

نے کہا، تھیس کیا شہد لگا کر چاٹیں گے، بیٹھی رہو جہاں بیٹھی ہو، خبردار! جو تم وہاں سے ہیں۔ ہم خود تمہاری بیٹی کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ میں نے جب یہ بتیں سنیں اور ان غنڈوں کے گڑے ہوئے تو پور دیکھے تو کھستا کھستا یہاں پہنچ گیا ہوں۔“

نسیم اختر حواس باختہ تھی، ”اب کیا کیا جائے؟“

خان نے اپنا سر کھایا اور جواب دیا، ”ذیکھو میں کوئی ترکیب سوچتا ہوں بس یہاں سے نکل بھاگنا چاہیے۔“

”اور ماں؟“

”اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا، اس کو اللہ کے حوالے کر کے خود باہر نکلنا چاہیے۔“

اوپر چارپائی پر دو چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ خان صاحب نے ان کو گانڈھ دے کر رسہ سا بنا کیا اور مضبوطی سے ایک کنڈے کے ساتھ باندھ کر دوسرا طرف لٹکایا۔ نیچے لانڈری کی چھت تھی، وہاں اگر وہ پہنچ جائیں تو راستہ آگے صاف ہے۔ لانڈری کی چھت کی سیڑھیاں دوسری طرف تھیں اس کے ذریعے سے وہ طویلے میں پہنچ جاتے اور وہاں سائیکس سے جو مسلمان تھا، تانگہ لیتے اور اسٹیشن کا رخ کرتے۔

نسیم اختر نے بڑی بہادری دکھائی۔ آرام آرام سے نیچے اتر کر لانڈری کی چھت تک پہنچ گئی۔ خان صاحب اچھن خان بھی بحفاظت تمام اتر گئے۔ اب وہ طویلے میں تھے۔ سائیکس اتفاق سے تانگہ میں گھوڑا جوت رہا تھا۔ دونوں اس میں بیٹھے اور اسٹیشن کا رخ کیا مگر راستے میں ان کو ملٹری کاڑک مل گیا، اس میں مسلح فوجی مسلمان تھے جو ہندوؤں کے خطرناک محلوں سے مسلمانوں کو نکال کر محفوظ مقامات پر پہنچا رہے تھے جو پاکستان جانا چاہتے، ان کو اسپیشل ٹرینوں میں جگہ دلوادیتے۔

تانگہ سے اتر کر نسیم اختر اور اس کا استاد ڈر ک میں بیٹھے اور چند ہی منٹوں میں اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ اسپیشل ٹرین اتفاق سے تیار تھی اس میں ان کو اچھی جگہ مل گئی اور وہ بخیریت لا ہور پہنچ گئے۔ یہاں وہ قریب ایک مہینے تک واللہ یکمپ میں رہے، نہایت کسپرسی کی حالت میں۔ اس کے بعد وہ شہر چلے آئے۔ نسیم اختر کے پاس کافی زیور تھا جو اس نے اس رات پہنچا ہوا تھا جب سیٹھ گوبند پر کاش اس کا مجر اسنے آرہا تھا۔ یہ اس نے اتار کر خان صاحب اچھن خان کے حوالے کر دیا تھا۔ ان زیوروں میں سے کچھ بیچ کر انھوں نے ہوش میں رہنا شروع کر دیا لیکن

مکان کی تلاش جاری رہی۔ آخر بدق塘 تمام ہیر امنڈی میں ایک مکان مل گیا جو اچھا خاص تھا۔ اب خان صاحب اچھن خاں نے نسیم اختر سے کہا، ”گدے اور چاندنیاں وغیرہ خرید لیں اور تم بسم اللہ کر کے مجر اشروع کر دو۔“

نسیم نے کہا، ”نہیں خان صاحب! میرا جی اکتا گیا ہے میں تو اس مکان میں بھی رہنا پسند نہیں کرتی، کسی شریف محلے میں کوئی چھوٹا سا مکان تلاش کیجیے کہ میں وہاں اٹھ جاؤں۔ میں اب خاموش زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔“

خان صاحب کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی، ”کیا ہو گیا ہے تمھیں؟“

”بس جی اچھا ہو گیا ہے۔ میں اس زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتی ہوں۔ دعا کیجیے خدا مجھے ثابت قدم رکھے۔“ یہ کہتے ہوئے نسیم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

خان صاحب نے اس کو بہت ترغیب دی پر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ایک دن اس نے اپنے اتنا دسے صاف کہہ دیا کہ وہ شادی کر لینا چاہتی ہے، اگر کسی نے اسے قبول نہ کیا تو وہ کنواری رہے گی۔

خان صاحب بہت حیران تھا کہ نسیم میں یہ تبدیلی کیسے آئی۔ فسادات تو اس کا باعث نہیں ہو سکتے۔ پھر کیا وجہ تھی کہ وہ پیشہ ترک کرنے پر تلی ہوئی ہے۔

جب وہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا تو اسے ایک محلے میں جہاں شر فاء رہتے تھے، ایک چھوٹا سا مکان لے دیا اور خود ہیر امنڈی کی ایک مالدار طواائف کو تعلیم دیئے لگا۔ نسیم نے تھوڑے سے برتن خریدے، ایک چارپائی اور بستہ وغیرہ بھی۔ ایک چھوٹا لڑکا نوکر کھلایا اور سکون کی زندگی بسر کرنے لگی۔ پانچوں نمازیں پڑھتی، روزے آئے تو اس نے سارے کے سارے رکھے۔ ایک دن وہ غسل خانے میں نہار ہی تھی کہ سب کچھ بھول کر اپنی سریلی آواز میں گانے لگی۔ اس کے ہاں ایک اور عورت کا آنا جانا تھا۔ نسیم اختر کو معلوم نہیں تھا کہ یہ عورت شریفوں کے محلے کی بہت بڑی پچھاٹنی ہے۔ شریفوں کے محلے میں کئی گھر تباہ و بر باد کر چکی ہے، کئی لڑکیوں کی عصمت اونے پونے داموں یکواچکی ہے، کئی نوجوانوں کو غلط راستے پر لگا کر اپنا الوسید ہا کرتی رہتی ہے۔

جب اس عورت نے جس کا نام جنتے ہے، نیم کی سریلی اور منجھی ہوئی آواز سنی تو اس کو فوراً خیال آیا کہ اس لڑکی کا آگاہ ہے نہ پچھا، بڑی معرکے کی طوائف بن سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے اس پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے۔ اس کو اس نے کئی سبز باغ دکھائے مگر وہ اس کے قابو میں نہ آئی۔ آخر اس نے ایک روز اس کو گلے لگایا اور چٹ چٹ اس کی بلا کیں لینا شروع کر دیں۔ جیتنی رہو بیٹا۔ میں تمہارا امتحان لے رہی تھی، تم اس میں سولہ آنے پوری اتری ہو۔ نیم اختر اس کے فریب میں آگئی۔ ایک دن اس کو یہاں تک بتا دیا کہ وہ شادی کرنا چاہتی ہے کیونکہ ایک یتیم کنوواری لڑکی کا اکیلے رہنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔

جنتے کو موقع ہاتھ آیا۔ اس نے نیم سے کہا، ”بیٹا یہ کیا مشکل ہے میں نے یہاں کئی شادیاں کرائی ہیں، سب کی سب کامیاب رہی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو تمہارے حسب منشامیاں مل جائے گا جو تمہارے پاؤں دھو دھو کر پے گا۔“

جنتے کئی فرضی رشتے لائی مگر اس نے ان کی کوئی زیادہ تعریف نہ کی۔ آخر میں وہ ایک رشتہ لائی جو اس کے کہنے کے مطابق فرشتہ سیرت اور صاحب جائیداد تھا، نیم مان گئی، تاریخ مقرر کی گئی اور اس کی شادی انجام پائی۔

نیم اختر خوش تھی کہ اس کامیاں بہت اچھا ہے، اس کی ہر آسائش کا خیال رکھتا ہے لیکن اس دن اس کے ہوش و حواس گم ہو گئے جب اس کو دوسرا کمرے سے عورتوں کی آوازیں سنائی دیں۔ دروازے میں سے جھانک کر اس نے دیکھا کہ اس کا شوہر دوبڑھی طوائفوں سے اس کے متعلق باتیں کر رہا ہے، جنتے بھی پاس بیٹھی تھی۔ سب مل کر اس کا سوداٹے کر رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ بہت دیر روئی اور سوچتی رہی۔ آخر اٹھی اور اپنی پشاور نکال کر پہنی اور باہر نکل کر سیدھی اپنے استاد اچھن خاں کے پاس پہنچی اور مجرے کے ساتھ ساتھ پیشہ بھی شروع کر دیا۔ ایک انتقامی قسم کے جذبے کے تحت وہ کھلینے لگی۔

-[54]-

بھگن: سعادت حسن منتو

”پرے ہیئے۔۔۔“

”کیوں؟“

”مجھے آپ سے بوآتی ہے۔“

”ہر انسان کے جسم کی ایک خاص بوجوئی ہے۔۔۔ آج بیس برسوں کے بعد تمہیں اس سے تنفر کیوں محسوس ہونے لگا؟“

”بیس برس۔۔۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ میں نے اتنا طویل عرصہ کیسے بسر کیا ہے۔“

”میں نے کبھی آپ کو اس عرصے میں تکلیف پہنچائی؟“

”جب کبھی نہیں۔“

”تو پھر آج اچانک آپ کو مجھ سے ایسی بوکیوں آنے لگی جس سے آپ کی ناک جو ماشاء اللہ کافی بڑی ہے، اتنی غصب ناک ہو رہی ہے؟“

”آپ اپنی ناک تو دیکھیے۔۔۔ پکوڑا سی ہے۔“

”میں اس سے انکار نہیں کرتا۔۔۔ کوڑے، تم جانتی ہو، مجھے بہت پسند ہیں۔“

”آپ کو تو ہر وابیات چیز پسند ہوتی ہے۔۔۔ کوڑے کر کٹ میں بھی آپ دلچسپی لیتے ہیں۔“

”کوڑا کر کٹ ہمارا ہی تو پھیلا یا ہوا ہوتا ہے۔۔۔ اس سے آدمی دلچسپی کیوں نہ لے۔۔۔ اور تم جانتی ہو، آج سے دس سال پہلے جب تمہاری ہیرے کی انگوٹھی گم ہو گئی تھی تو اسی کوڑے کے ڈھیر سے میں نے تمہیں تلاش کر کے دی تھی۔“

”بڑا کرم کیا تھا آپ نے مجھ پر۔“

”بھی کرم کا سوال نہیں۔۔۔ فارسی کا ایک شعر ہے۔“

خاکساراں را بہ حقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

”میں خاک بھی نہیں سمجھی۔“

”یہی وجہ ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے نہیں سمجھا۔۔۔ ورنہ میں برس ایک آدمی کو پہچاننے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔“

”ان میں برسوں میں آپ نے کون سا سکھ پہنچایا ہے مجھے؟“

”تم دکھ کی بات کرو۔۔۔ بتاؤ میں نے کون سا دکھ تمہیں اس عرصے میں پہنچایا؟“

”ایک بھی نہیں۔“

”تو پھر یہ کہنے کا کیا مطلب تھا۔۔۔ ان میں برسوں میں آپ نے کون سا سکھ پہنچایا ہے مجھے؟“

”آپ میرے قریب نہ آئیے۔۔۔ میں سونا چاہتی ہوں۔“

”اس غصے میں نیند آجائے گی تمہیں؟“

”خاک آئے گی۔۔۔ بہر حال۔۔۔ آنکھیں بند کر کے لیٹی رہوں گی اور۔۔۔“

”اور کیا کریں گی؟“

”لیٹی اس روز پر آنسو بھاؤں گی جب میں آپ کے پلے باندھی گئی۔“

”تمہیں یاد ہے وہ دن کیا تھا۔۔۔ سن کیا تھا۔۔۔ وقت کیا تھا؟“

”میں کبھی وہ دن بھول سکتی ہوں۔۔۔ خدا کرے وہ کسی اڑکی پرنہ آئے۔“

”تم بتاؤ دو۔۔۔ میں تمہاری یادداشت کا امتحان لینا چاہتا ہوں۔“

”اب آپ میرا امتحان کیا لیں گے۔۔۔ پرے ہٹیے۔۔۔ مجھے آپ سے بو آرہی ہے۔“

”بھی حد ہو گئی ہے۔۔۔ تمہاری اتنی لمبی ناک جو کہیں ختم ہونے ہی میں نہیں آتی، اس کو آخر کیا ہو گیا ہے۔۔۔ مجھ سے تو اس کو بڑی بھینی خوشبو آنا چاہیے۔۔۔ تم نے مجھ سے ان بیک برسوں میں ہزاروں مرتبہ کہا کہ آپ جب کسی کمرے میں داخل ہوں اور وہاں سے نکل جائیں تو میں پہچان جایا کرتی ہوں کہ آپ وہاں آئے تھے۔“

”آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔“

”ذکر ہو۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں آج تک جھوٹ نہیں بولا۔۔۔ تم مجھ پر یہ الزام نہ دھرو۔“

”واہ جی واه، بڑے آئے آپ کہیں کے سچ۔۔۔ میرا سوروپے کا نوٹ آپ نے چرایا اور صاف کر گئے۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“

”دوجوں سن انیس سو بیالیں کو۔۔۔ جب سلمی میرے پیٹ میں تھی۔“

”یہ تاریخ تمہیں خوب یاد رہی۔“

”کیوں یاد نہ رہتی۔ جب آپ سے میری اتنی زبردست لڑائی ہوئی تھی۔ میں اندر کمرے میں پڑی تھی۔ آپ نے چابی بڑی صفائی سے میرے نکنے کے نیچے سے نکالی۔ دوسرا کمرے میں جا کر الماری کھولی اور اس میں جو سات سو پڑے تھے، ان میں سے ایک نوٹ اڑا کر لے گئے۔ میں نے جب دوڑھائی گھنٹوں کے بعد اٹھ کر دیکھا تو آپ سے چھ ہوئی، مگر آپ تھے کہ پروں پر پانی ہی نہیں لیتے تھے۔ آخر میں خاموش ہو گئی۔“

”یہ دوجوں سن انہیں سوبیالیس کی بات ہے۔۔۔ آج کل سن چون چل رہا ہے۔ اب اس کے ذکر کا کیا فائدہ؟“

”فائدہ تو ہر حالت میں آپ ہی کا رہتا ہے۔۔۔ میری ایک نیلم کی انگوٹھی بھی آپ نے غائب کر دی تھی، لیکن میں نے آپ سے کچھ نہیں کہا تھا۔“

”ذیکھو، میں تمہاری جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں، اس نیلم کی انگوٹھی کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔۔۔“

”اور اس سوروپے کے نوٹ کے متعلق۔“

”اب تمہاری جان کی قسم کھائی تو چیختانا ہی پڑے گا۔۔۔ میں نے۔۔۔ میں نے چرا یا ضرور تھا، مگر صرف اس لیے کہ اس مہینے مجھے تنخواہ دیر سے ملنے والی تھی اور تمہاری سالگرد تھی۔ تمہیں کوئی تحفہ تو دینا تھا۔ ان بیس برسوں میں تمہاری ہر سالگرد پر میں اپنی استطاعت کے مطابق کوئی نہ کوئی تحفہ پیش کرتا رہا ہوں۔“

”بڑے تھے تھائے دیے ہیں آپ نے مجھے۔“

”ناشکری تو نہ بنو!“

”میں کئی دفعہ کہہ چکی ہوں، آپ پرے ہٹ جائیے۔۔۔ مجھے آپ سے بو آتی ہے۔“

”کس کی؟“

”یہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔“

”میں نے خود کو کئی مرتبہ سو نگھا ہے، مگر میری پکوڑا ایسی ناک میں ایسی کوئی بونہیں گھسی جس پر کسی بیوی کو اعتراض ہو سکے۔“

”آپ باتیں بنانا خوب جانتے ہیں۔“

”اور با تین بگاڑنا تم۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، آج تم اس قدر ناراض کیوں ہو؟“

”اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیے!“

”میں اس وقت قیص پہنے نہیں ہوں۔“

”کیوں؟“

”سخت گرمی ہے۔“

”سخت گرمی ہو یا نرم۔۔۔ آپ کو قیص تو نہیں اتارنا چاہیے تھی، یہ کوئی شرافت نہیں۔“

”محترمہ! آپ نے بھی تو قیص اتار رکھی ہے۔۔۔ اپنے ننگے بدن کو ملاحظہ فرمائیے۔“

”اوہ۔۔۔ یہ میں نے کیا وابحیات پن کیا ہے!“

”یہ وابحیات پن تو آپ گرمیوں میں برس سے کر رہی ہوں۔“

”آپ جھوٹ بولتے ہیں۔“

”خیر، جھوٹ توہر مرد کی عادت ہوتی ہے۔“

”آپ مجھ سے دور ہی رہیں۔“

”کیوں؟“

”توہہ--- لاکھ بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے آپ سے بہت گندی بو آرہی ہے۔“

”پہلے صرف بو تھی--- اب گندی ہو گئی۔“

”خبردار! جو آپ نے مجھے ہاتھ لگایا!“

”اس قدر بیز اری آخر کیوں؟“

”میں اب آپ سے قطعاً بیز ار ہو چکی ہوں۔“

”ان میں برسوں میں تم نے کبھی ایسی بیز اری کا اظہار نہیں کیا تھا۔“

”اب تو کر دیا ہے۔“

”لیکن مجھے معلوم تو ہو کہ اس کی وجہ کیا ہے؟“

”میں کہتی ہوں، مجھے مت چھوپیئے۔“

”تمہیں مجھ سے اتنی کراہت کیوں ہو رہی ہے؟“

”آپ ناپاک ہیں۔۔۔ بے حد ذلیل ہیں۔“

”دیکھو، تم بہت زیادتی کر رہی ہو۔“

”آپ نے کم کی ہے۔ کوئی شریف آدمی آپ کی طرح ایسی ذلیل حرکت نہیں کر سکتا تھا۔“

”کون سی؟“

”آج صبح کیا ہوا تھا؟“

”آج صبح۔۔۔ بارش ہوئی تھی۔“

”بارش ہوئی تھی۔۔۔ لیکن اس بارش میں آپ نے کس کو اپنی آغوش میں دبایا ہوا تھا؟“

”اوہ!“

”بس اس کا جواب اب ’اوہ‘ ہی ہو گا۔۔۔ میں نے کپڑا جو لیا تھا آپ کو۔“

”دیکھو میری جان۔۔۔“

”مجھے اپنی جان و ان مت کہیے۔۔۔ آپ کو شرم آنی چاہیے۔“

”کس بات پر--- کس گناہ پر؟“

”میں کہتی ہوں آدمی گناہ کرے--- لیکن ایسی گندگی میں نہ گرے۔“

”میں کس گندگی میں گرا ہوں؟“

”آج صبح آپ نے اس--- اس---“

”کیا؟“

”اس بھنگن کو--- جوان بھنگن کو جو مٹھائی والے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔“

”لاحول ولا--- تم بھی عجیب عورت ہو--- وہ غریب حاملہ ہے۔ بارش میں جھاڑو دیتے ہوئے اس کو غش آیا اور گرپڑی۔ میں نے اس کو اٹھایا اور اس کے کوارٹر میں لے گیا۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”تمہیں معلوم نہیں کہ وہ مر گئی؟“

”ہائے--- بے چاری--- میں تو ٹھنڈی برف ہو گئی ہوں۔“

”میرے قریب آجائے۔“

”میں تمیص پہن لوں؟“

”اس کی کیا ضرورت ہے، تمہاری قیص میں ہوں۔“

- [55]-

بیگو: سعادت حسن منٹو

”تسیاں اور دلائے بیکار ہیں۔ لوہے اور سونے کے یہ مرکب میں چھٹا نکوں پھانک چکا ہوں۔ کون سی دوا ہے جو میرے حلق سے نہیں اتاری گئی، میں آپ کے اخلاق کا ممنون ہوں مگر ڈاکٹر صاحب میری موت یقینی ہے۔ آپ کیسے کہہ رہے ہیں کہ میں دق کام ریاض نہیں۔ کیا میں ہر روز خون نہیں تھوکتا؟ آپ یہی کہیں گے کہ میرے لگے اور دانتوں کی خرابی کا نتیجہ ہے مگر میں سب کچھ جانتا ہوں۔ میرے دونوں پھیپھڑے خانہ زنبور کی طرح مشک ہو چکے ہیں۔ آپ کے انجکشن مجھے دوبارہ زندگی نہیں بخش سکتے۔ دیکھیے میں اس وقت آپ سے بتیں کر رہا ہوں مگر سینے پر ایک وزنی انحن دوڑتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک تاریک گڑھے میں اتر رہا ہوں۔

قبہ بھی تو ایک تاریک گڑھا ہے۔ آپ میری طرف اس طرح نہ دیکھیے ڈاکٹر صاحب، مجھے اس چیز کا کامل احساس ہے کہ آپ اپنے ہسپتاں میں کسی مریض کا مرننا پسند نہیں کرتے مگر جو چیز اٹل ہے وہ ہو کے رہے گی۔ آپ ایسا کیجیے کہ مجھے یہاں سے رخصت کر دیجیے۔ میری ٹانگوں میں تین چار میل چلنے کی قوت ابھی باقی ہے۔ کسی قریب کے گاؤں میں چلا جاؤں گا۔ اور۔۔۔ مگر میں تور رہا ہوں۔ نہیں نہیں۔ ڈاکٹر صاحب یقین کیجیے۔ میں موت سے خائف نہیں۔ یہ میرے جذبات ہیں، جو آنسوؤں کی شکل میں باہر نکل رہے ہیں۔

آہ! آپ کیا جانیں۔ اس مد قوق کے سینے سے کیا کچھ باہر نکلنے کو مچل رہا ہے۔ میں اپنے انعام سے باخبر ہوں۔ آج سے پانچ برس پہلے بھی میں اس وحشت ناک انعام سے باخبر تھا۔ اور اچھی طرح جانتا تھا کہ کچھ عرصہ کے بعد میری زندگی کی دوڑ ختم ہو جائے گی۔ میں نے اس گیند کو جسے آپ زندگی کے نام سے پکارتے ہیں، خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار کر کاٹا ہے۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ میں اس کھیل میں لذت محسوس کر رہا ہوں۔ لذت۔۔۔ ہاں لذت۔۔۔ میں نے اپنی زندگی کی کئی راتیں حسن فروش عورتوں کے تاریک اڑوں پر گزاری ہیں۔ شراب کے نشے میں چور میں نے کس بے دردی سے خود کو اس حالت میں پہنچایا۔ مجھے یاد ہے، انہی اڑوں کی سیاہ پیشہ عورت۔۔۔ کیا نام تھا اس کا۔۔۔؟ ہاں گزار، مجھے اس بری طرح اپنی جوانی کو کچڑ میں لٹ پٹ کرتے دیکھ کر مجھ سے ہمدردی کرنے لگ گئی تھی۔ بیو قوف عورت، اس کو کیا بتاتا کہ میں اس کچڑ میں کس کا عکس دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے گلزار اور اس کی

دیگر ہم پیشہ عورتوں سے نفرت تھی اور اب بھی ہے لیکن کیا آپ مریضوں کو زہر نہیں کھلاتے اگر اس سے اچھے نتائج کی امید ہو۔ میرے درد کی دواہی تاریک زندگی تھی۔ میں نے بڑی کوشش اور مصیبتوں کے بعد اس انجام کو بلا یا ہے جس کی کچھ رومندا آپ نے میرے سرہانے ایک تختی پر لکھ کر لٹکار کھلی ہے۔ میں نے اس کے انتظار میں ایک ایک گھری کس بے تابی سے کائلی ہے، آہ! کچھ نہ پوچھیے! لیکن اب مجھے دلی تسلیں حاصل ہو چکی ہے۔ میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔

میں دل اور سل کا مریض ہوں۔ اس مرض نے مجھے کھوکھلا کر دیا ہے۔۔۔ آپ حقیقت کا اٹھار کیوں نہیں کر دیتے۔ بخدا اس سے مجھے اور تسلیں حاصل ہو گی۔ میرا آخری سانس آرام سے نکلے گا۔۔۔ ہاں ڈاکٹر صاحب یہ توبتا یے، کیا آخری لمحات واقعی تکلیف دہ ہوتے ہیں؟ میں چاہتا ہوں میری جان آرام سے نکلے۔ آج میں واقعی بچوں کی سی باتیں کر رہا ہوں۔ آپ اپنے دل میں یقیناً مسکراتے ہوں گے کہ میں آج معمول سے بہت زیادہ باتوں ہو گیا ہوں۔۔۔ دیا جب بچھنے کے قریب ہوتا ہے تو اس کی روشنی تیز ہو جایا کرتی ہے۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔۔۔ آپ توبو لتے ہی نہیں اور میں ہوں کہ بولے جا رہا ہوں۔ ہاں ہاں بیٹھیے، میرا جی چاہتا ہے آج کسی سے باتیں کیے جاؤں۔ آپ نہ آتے تو خدا معلوم میری کیا حالت ہوتی۔۔۔ آپ کا سفید سوت آنکھوں کو کس قدر بھلا معلوم ہو رہا ہے۔ کفن بھی اسی طرح صاف ستھرا ہوتا ہے پھر آپ میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں۔

آپ کو کیا معلوم کہ میں مرنے کے لیے کس قدر بے تاب ہوں۔ اگر مرنے والوں کو کفن خود پہننا ہو تو آپ دیکھتے میں اس کو کتنی جلدی اپنے گرد پیٹ لیتا۔ میں کچھ عرصہ اور زندہ رہ کر کیا کروں گا؟ جب کہ وہ مر چکی ہے۔ میرا زندہ رہنا فضول ہے۔ میں نے اس موت کو بہت مشکلوں کے بعد اپنی طرف آمادہ کیا ہے اور اب میں اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتا۔ وہ مر چکی ہے اور اب میں بھی مر رہا ہوں۔ میں نے اپنی سنگ دلی۔۔۔ وہ مجھے سنگ دل کے نام سے پکارا کرتی تھی، کی قیمت ادا کر دی ہے۔ اور خدا گواہ ہے کہ اس کا کوئی بھی سکھ کھوٹا نہیں۔ میں پانچ سال تک ان کو پرکھتا رہا ہوں، میری عمر اس وقت پچیس برس کی ہے۔ آج سے ٹھیک سات برس پہلے میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ آہ ان سات برسوں کی رومندا کتنی جیرت افزائی۔ اگر کوئی شخص اس کی تفصیل کاغذوں پر پھیلا دے تو انسانی دلوں کی داستانوں میں کیسا لچپ اضافہ ہو۔ دنیا ایک ایسے دل کی دھڑکن سے آشنا ہو گی جس نے اپنی غلطی کی قیمت خون کی ان تھوکوں میں ادا کی ہے۔ جنہیں آپ ہر روز جلاتے رہتے ہیں کہ ان کے جرأۃ شیم دوسروں تک نہ پہنچیں۔

آپ میری بکواس سنتے سنتے کیا تنگ تو نہیں آگئے۔ خدا معلوم کیا کیا کچھ بکتا رہوں۔ تکلف سے کام نہ بیجی، آپ واقعی کچھ نہیں سمجھ سکتے، میں خود نہیں سمجھ سکا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ بٹوت سے واپس آکر میرے دل و دماغ کا ہر جوڑا مل گیا تھا۔ اب یعنی آج جب کہ میرے جنون کا دورہ ختم ہو چکا ہے اور موت کو چند قدم کے فاصلے پر دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ وزن جو میری چھاتی کو دا بے ہوئے تھا، بالکا

ہو گیا ہے اور میں پھر زندہ ہو رہا ہوں۔ موت میں زندگی۔۔۔ کیسی دلچسپ چیز ہے! آج میرے ذہن سے دھنڈ کے تمام بادل اٹھ گئے ہیں۔ میں ہر چیز کو روشنی میں دیکھ رہا ہوں۔ سات برس پہلے کے تمام واقعات اس وقت میری نظروں کے سامنے ہیں۔

دیکھیے۔۔۔ میں لاہور سے گرمیاں گزارنے کے لیے کشمیر کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ سوت سلوائے جا رہے ہیں۔ بوٹ ڈبوں میں بند کیے جا رہے ہیں۔ ہولڈال اور ٹرنک کپڑوں سے پر کیے جا رہے ہیں۔ میں رات کی گاڑی سے جموں روانہ ہوتا ہوں۔ شیم میرے ساتھ ہے۔ گاڑی کے ڈبے میں بیٹھ کر ہم عرصہ تک باقی کرتے رہتے ہیں۔ گاڑی چلتی ہے۔ شیم چلا جاتا ہے۔ میں سو جاتا ہوں۔ دماغ ہر قسم کی فکر سے آزاد ہے۔ صبح جموں کے اسٹیشن پر جا گتا ہوں۔ کشمیر کی حسین وادی کی ہونے والی سیر کے خیالات میں مگن لاری پر سوار ہوتا ہوں۔ بٹوت سے ایک میل کے فاصلے پر لاری کا پہیہ پنچھر ہو جاتا ہے۔ شام کا وقت ہے اس لیے رات بٹوت کے ہوٹل میں کاٹنی پڑتی ہے۔ اس ہوٹل کا کمرہ بے حد غلیظ معلوم ہوتا ہے مگر کیا معلوم تھا کہ مجھے وہاں پورے دو مینے رہنا پڑے گا۔ صبح سویرے اٹھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ لاری کے انجن کا ایک پر زہ بھی خراب ہو گیا ہے۔ اس لیے مجبوراً ایک دن اور بٹوت میں ٹھہرنا پڑے گا۔ یہ سن کر میری طبیعت کس قدر افسردہ ہو گئی تھی! اس افسرڈگی کو دور کرنے کے لیے میں۔۔۔ میں اس روز شام کو سیر کے لیے نکلتا ہوں۔ چیڑ کے درختوں کا تنفس، جنگلی پرندوں کی نغمہ سرائیاں، سیب کے لدے ہوئے درختوں کا حسن اور غروب ہوتے ہوئے سورج کا دلکش سماں، لاری والے کی بے احتیاطی اور رنگ میں بھنگ ڈالنے والی تقدیر کی گستاخی کا رنج افزاییاں محو کر دیتا ہے۔

میں نیچر کے مسرت افزایمناظر سے لطف اندوں ہوتا سڑک کے ایک موڑ پر پہنچتا ہوں۔۔۔ دفعتاً میری نگاہیں اس سے دوچار ہوتی ہیں۔ بیگو مجھ سے بیس قدم کے فاصلے پر اپنی بھیں کے ساتھ کھڑی ہے۔۔۔ جس داستان کا انجمام اس وقت آپ کے پیش نظر ہے۔ اس کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔

وہ جوان تھی۔ اس کی جوانی پر بٹوت کی فضائپوری شدت کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ سبز لباس میں ملبوس وہ سڑک کے درمیان کمٹی کا ایک دراز قد بوٹا معلوم ہو رہی تھی۔ چہرے کے تابے ایسے تاباں رنگ پر اس کی آنکھوں کی چمک نے ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی۔ جو چشمے کے پانی کی طرح صاف اور شفاف تھیں۔۔۔ میں اس کو کتنا عرصہ دیکھتا ہا۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ میں نے دفعتاً اپنا سینہ مو سیقی سے لبریز پایا اور پھر میں مسکرا دیا۔ اس کی بہکی ہوئی نگاہوں کی توجہ بھیں سے ہٹ کر میرے تبسم سے ٹکرائی۔ میں گھبر آگیا۔ اس نے ایک تیز تجسس سے میری طرف دیکھا جیسے وہ کسی بھولے ہوئے خواب کو یاد کر رہی ہے۔ پھر اس نے اپنی چھڑی کو دانتوں میں دبا کر کچھ سوچا اور مسکرا دی، اس کا سینہ چشمے کے پانی کی طرح دھڑک رہا تھا۔ میرا دل بھی میرے پہلو میں انگڑائیاں لے رہا تھا۔۔۔ اور یہ پہلی ملاقات کس قدر لذیذ تھی۔ اس کا ذائقہ بھی میرے جنم کی ہرگز میں موجود ہے۔۔۔ وہ چلی گئی۔۔۔ میں اس کو آنکھوں سے او جھل

ہوتے دیکھتا رہا۔ وہ اس انداز سے چل رہی تھی جیسے کچھ یاد کرتی ہے مگر پھر بھول جاتی ہے۔ اس نے جاتے ہوئے پانچ پچھ مرتبہ میری طرف مڑ کر دیکھا۔ لیکن فوراً سر پھیر لیا۔

جب وہ اپنے گھر میں داخل ہو گئی جو سڑک کے نیچے مکنی کے چھوٹے سے کھیت کے ساتھ بنا ہوا تھا، میں اپنی طرف متوجہ ہوا۔ میں اس کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اس احساس نے مجھے سخت تحریر کیا۔ میری عمر اس وقت اٹھا رہ سال کی تھی۔ کالج میں اپنے ہم جماعت طلبہ کی زبانی میں محبت کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ عشقیہ داستانیں بھی اکثر میرے زیر مطالعہ رہی تھیں۔ مگر محبت کے حقیقی معانی میری نظر وہ سے پوشیدہ تھے۔ اس کے جانے کے بعد جب میں نے ایک ناقابل بیان تلخی اپنے دل کی دھڑکنوں میں حل ہوتی ہوئی محسوس کی تو میں نے خیال کہ شاید اسی کا نام محبت ہے۔۔۔ یہ محبت ہی تھی۔۔۔ عورت سے محبت کرنے کا پہلا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ مرد کی ہو جائے یعنی وہ اس سے شادی کر لے اور آرام سے اپنی بقا یا زندگی گزار دے۔ شادی کے بعد یہ محبت کروٹ بدلتی ہے۔ پھر مرد اپنی محبوبہ کے کاندھوں پر ایک گھر تعمیر کرتا ہے۔ میں نے جب بیگو سے اپنے دل کو وابستہ ہوتے محسوس کیا تو فطری طور پر میرے دل میں اس رفیقة حیات کا خیال پیدا ہوا جس کے متعلق میں اپنے کمرے کی چار دیواری میں کئی خواب دیکھ چکا تھا۔

اس خیال کے آتے ہی میرے دل سے یہ صد اٹھی، ”دیکھو سعید! یہ لڑکی ہی تمہارے خوابوں کی پری ہے۔“ چنانچہ میں تمام واقعے پر غور کرتا ہوا ہو ٹھیل واپس آیا اور ایک ماہ کے لیے ہو ٹھیل کا وہ کمرہ کرائے پر اٹھا لیا جو مجھے بے حد غلیظ محسوس ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہو ٹھیل کا مالک میرے اس ارادے کو سن کر بہت تحریر ہوا تھا۔ اس لیے کہ میں صح اس کی غلاظت پسندی پر ایک طویل لیکھر دے چکا تھا۔

داستان کتنی طویل ہوتی جا رہی ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ آپ اسے غور سے سن رہے ہیں۔۔۔ ہاں ہاں آپ سگریٹ سلاگا سکتے ہیں۔ میرے گلے میں آج کھانسی کے آثار محسوس نہیں ہوتے۔ آپ کی ڈبیادیکھ کر میرے ذہن میں ایک اور واقعہ کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ بیگو بھی سگریٹ پیا کرتی تھی۔ میں نے کئی بار اسے گولڈ فلیک کی ڈبیاں لا کر دی تھیں۔ وہ بڑے شوق سے ان کو منہ میں دبا کر دھونیں کے بادل اڑایا کرتی تھیں۔ دھواں۔۔۔! میں اس نیلے ڈھونکیں کو اب بھی دیکھ رہا ہوں جو اس کے گلیے ہو نٹوں پر رقص کیا کرتا تھا۔۔۔ ہاں تو دوسرے روز میں شام کو اسی وقت ادھر سیر کو گیا۔ جہاں مجھے وہ سڑک پر ملی تھی۔ دیر تک سڑک کے ایک کنارے پتھروں کی دیوار پر بیٹھا رہا گروہ نظر نہ آئی۔

اٹھا اور ٹھہرنا ٹھہرنا آگے نکل گیا۔ سڑک کے دائیں ہاتھ ڈھلوان تھی۔ جس پر چیڑ کے درخت اگے ہوئے تھے۔ دائیں ہاتھ بڑے بڑے پتھروں کے کٹے پھٹے سرا بھر رہے تھے۔ ان پر جبی ہوئی مٹی کے ڈھیلوں میں گھاس اگی ہوئی تھی۔ ہوا ٹھنڈی اور تیز تھی۔ چیڑ کے

تاتا گانہ پتوں کی سرسر اہٹ کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جب موڑ مر اتوڈ فتاہیمیری نگاہیں سامنے اٹھیں۔ مجھ سے سو قدم کے فاصلے پر وہ اپنی بھینس کو ایک سگین حوض سے پانی پلا رہی تھی۔ میں قریب پہنچا مگر اس کو نظر بھر کے دیکھنے کی جرأت نہ کر سکا اور آگے نکل گیا اور جب واپس مر اتوڈ گھر جا چکی تھی۔ اب ہر روز اس طرف سیر کو جانا میرا معمول ہو گیا مگر میں روز تک میں اس سے ملاقات نہ کر سکا۔

میں نے کئی بار باوی پر پانی پیتے وقت اس سے ہم کلام ہونے کا ارادہ کیا۔ مگر زبان گنگ ہو گئی۔ کچھ بول نہ سکا۔ قریباً ہر روز میں اس کو دیکھتا
مگر رات کو جب میں تصور میں اس کی شکل دیکھنا چاہتا تو ایک دھند سی چھا جاتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ میں اس کی شکل کو اس کے باوجود کہ اسے ہر روز دیکھتا تھا بھول جاتا تھا۔ بیس دنوں کے بعد ایک روز چار بجے کے قریب جب کہ میں ایک باوی کے اوپر چیڑ کے سائے میں لیٹا تھا۔ وہ خور دسال لڑکے کو لے کر اوپر چڑھی۔ اس کو اپنی طرف آتا دیکھ کر میں سخت گھبر آگیا۔ دل میں یہی آئی کہ وہاں سے بھاگ جاؤں لیکن اس کی سکت بھی نہ رہی۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر آگے نکل گئی۔ چونکہ اس کے قدم تیز تھے اس لیے لڑکا پیچھے رہ گیا۔ میں انٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ دفتار لڑکے نے ایک چینچماری اور چشم زدن میں چیڑ کے خشک پتوں پر سے پھسل کر نیچے آ رہا۔ میں فوراً اٹھا اور بھاگ کر اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔ چینچ سن کروہ مڑی اور دوڑنے کے لیے بڑھے ہوئے قدم روک کر آہستہ آہستہ میری طرف آئی۔ اپنی جوان آنکھوں سے مجھے دیکھا اور لڑکے سے یہ کہا، ”خدا جانے تم کیوں گر پڑتے ہو؟“

میں نے گفتگو شروع کرنے کا ایک موقع پا کر اس سے کہا، ”بچہ ہے اس کی انگلی پکڑ لیجیے۔ ان پتوں نے خود مجھے کئی بار اوندھے منہ گرا دیا ہے۔“

یہ سن کروہ کھکھلا کر ہنسی پڑی، ”آپ کے ہیٹ نے تو خوب لڑکنیاں کھائی ہوں گی۔“

”آپ ہنستی کیوں ہیں؟ کسی کو گرتے دیکھ کر آپ کی طبیعت اتنی شاد کیوں ہوتی ہے اور جو کسی روز آپ گر پڑیں تو۔۔۔ وہ گھٹ اجوہ روز شام کے وقت آپ گھر لے جاتی ہے کس بری طرح زمین پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔“

”میں نہیں گر سکتی۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے دفتار نیچے باوی کی طرف دیکھا۔ اس کی بھینس نالے پر بندھے ہوئے پل کی طرف خرماں خرماں جا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اس نے اپنے حلق سے ایک عجیب قسم کی آواز نکالی۔ اس کی گونج ابھی تک میرے کانوں میں محفوظ ہے۔ کس قدر جوان تھی یہ آواز۔ اس نے بڑھ کر لڑکے کو کاندھے پر اٹھایا۔ اور بھینس کو ”اے چھلاں، اے چھلاں“ کے نام سے پکارتی ہوئی چشم زدن میں نیچے اتر گئی۔ بھینس کو واپس موڑ کر اس نے میری طرف دیکھا اور گھر کو چل دی۔

اس ملاقات کے بعد اس سے ہم کلام ہونے کی جھجک دور ہو گئی۔ ہر روز شام کے وقت باولی پر یا چیڑ کے درختوں تلے میں اس سے کوئی نہ کوئی بات شروع کر دیتا۔ شروع شروع میں ہماری گفتگو کا موضوع بھیس تھا۔ پھر میں نے اس سے اس کا نام دریافت کیا اور اس نے میرا۔ اس کے بعد گفتگو کا رخ اصل مطلب کی طرف آگیا۔ ایک روز دوپہر کے وقت جب وہ نالے میں ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھی اپنے کپڑے دھورہی تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے کسی خاص بات کا اظہار کرنے پر تیار دیکھ کر اس نے جگلی بلی کی طرح میری طرف گھور کر دیکھا۔ اور زور زور سے اپنی شلوار کو پتھر پر جھکلتے ہوئے کہا، ”آپ کشمیر کب جا رہے ہیں۔ یہاں ٹوٹ میں کیا صراہ ہے جو آپ یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“

یہ سن کر میں نے مستفسر انہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ گویا میں اس کے سوال کا جواب خود اس کی زبان سے چاہتا ہوں۔ اس نے نگاہیں نیچی کر لیں اور مسکراتے ہوئے کہا، ”آپ سیر کرنے کے لیے آئے ہیں۔ میں نے سنائے کشمیر میں بہت سے باغ ہیں۔ آپ وہاں کیوں نہیں چلے جاتے؟“

موقع اچھا تھا۔ چنانچہ میں نے دل کے تمام دروازے کھول دیے۔ وہ میرے جذبات کے بہتے ہوئے دھارے کا شور خاموشی سے سنتی رہی۔ میری آواز نالے کے پانی کی گنگناہٹ میں جو ننھے ننھے سنگ ریزوں سے کھلیتا ہوا بہہ رہا تھا ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔ ہمارے سروں کے اوپر اخروٹ کے گھنے درخت میں چڑیاں چچھاہر رہی تھیں۔ ہوا اس قدر تروتازہ اور لطیف تھی کہ اس کا ہر جھونکا بدن پر ایک خوشنگوار کپکپی طاری کر دیتا تھا۔ میں اس سے پورا ایک گھنٹہ گفتگو کرتا رہا۔ اس سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور شادی کا خواہش مند ہوں۔ یہ سن کر وہ بالکل متغیر نہ ہوئی۔ لیکن اس کی نگاہیں جو دور پہاڑیوں کی سیاہی اور آسمان کی نیلاہٹ کو آپس میں ملتا ہوا دیکھ رہی تھیں، اس بات کی مظہر تھیں کہ وہ کسی گھرے خیال میں مستغرق ہے۔ کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد اس نے میرے اصرار پر صرف اتنا جواب دیا۔

”اچھا آپ کشمیر نہ جائیں۔“

یہ جواب اختصار کے باوجود حوصلہ افزاتھا۔۔۔ اس ملاقات کے بعد ہم دونوں بے تکلف ہو گئے۔ اب پہلا سا جواب نہ رہا۔ ہم گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے رہتے۔ ایک روز میں نے اس سے نشانی کے طور پر کچھ مانگا تو اس نے بڑے بھولے انداز میں اپنے سر کے کلپ اتار کر میری ہتھیلی پر رکھ دیئے اور مسکرا کر کہا، ”میرے پاس یہی کچھ ہے۔“ یہ کلپ میرے پاس ابھی تک محفوظ ہیں۔

خیر کچھ دنوں کی طول طویل گفتگوؤں کے بعد میں نے اس کی زبان سے کہلوالیا کہ وہ مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب اس روز شام کو اس نے اپنے گھرے کو سر پر سنبھالتے ہوئے اپنی رضامندی کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ ”ہاں میں چاہتی ہوں۔“ تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ہوٹل کو واپس آتے ہوئے میں کچھ گایا بھی تھا۔ اس پر مسرت شام کے چوتھے روز جب کہ میں آنے والی ساعتِ سعید کے خواب دیکھ رہا تھا، یا کیا اس مکان کی تمام دیواریں گردیں جن کو میں نے بڑے پیار سے استوار کیا تھا۔ بستر میں پڑا تھا کہ صبح سیالکوٹ کے ایک صاحب جو بغرض تبدیلی آب و ہوا ٹوٹ میں قیام پذیر تھے۔ اور ایک حد تک بیگو سے میری محبت کو جانتے تھے۔ میری۔۔۔ چار پائی پر بیٹھ گئے اور نہایت ہی مفکرانہ لہجہ میں کہنے لگے۔

”وزیر بیگم سے آپ کی ملاقاتوں کا ذکر آج ٹوٹ کے ہر بچے کی زبان پر ہے۔ میں وزیر بیگم کے کیر بکٹر سے ایک حد تک واقف تھا۔ اس لیے کہ سیالکوٹ میں اس لڑکی کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔ مگر یہاں ٹوٹ میں اس کی تصدیق ہو گئی ہے۔ ایک ہفتہ پہلے یہاں کا قصائی اس کے متعلق ایک طویل حکایت سارا ہاتھ۔ پرسوں پان والا آپ سے ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا کہ آپ عصمت باختہ لڑکی کے دام میں پھنس گئے ہیں۔ کل شام کو ایک اور صاحب کہہ رہے تھے کہ آپ ٹوٹی ہوئی ہندیا خرید رہے ہیں۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ بعض لوگ اس سے آپ کی گفتگو پسند نہیں کرتے۔ اس لیے کہ جب سے آپ ٹوٹ میں آئے ہیں وہ ان کی نظر وہ اسے او جھل ہو گئی ہے۔ میں نے آپ سے حقیقت کا اظہار کر دیا ہے۔ اب آپ بہتر سوچ سکتے ہیں۔“

عصمت باختہ لڑکی، ٹوٹی ہوئی ہندیا، لوگ اس سے میری گفتگو کو پسند نہیں کرتے، مجھے اپنی ساعت پر یقین نہ آتا تھا۔ بیگو اور۔۔۔ اس کا خیال ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مگر جب دوسرے روز مجھے ہوٹل والے نے نہایت ہی رازدارانہ لمحے میں چند باتیں کہیں تو میری آنکھوں کے سامنے تاریک دھنڈ سی چھائی، ”بابو جی، آپ ٹوٹ میں سیر کے لیے آئے ہیں مگر دیکھتا ہوں کہ آپ یہاں کی ایک حسن فروش لڑکی کی محبت میں گرفتار ہیں، اس کا خیال اپنے دل سے نکال دیجیے۔“ میرا اس لڑکی کے گھر آنا جانا ہے، مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اس کو کچھ کپڑے بھی خرید دیے ہیں۔ آپ نے یقیناً اور بھی روپے خرچ کیے ہوں گے، معاف کیجیے مگر یہ سراسر جماقت ہے۔ میں آپ سے یہ باتیں ہرگز نہ کرتا کیونکہ یہاں بیسیوں عیش پسند مسافر آتے ہیں مگر آپ کا دل ان سیاہیوں سے پاک نظر آتا ہے۔ آپ ٹوٹ سے چلے جائیں، اس تماش کی لڑکی سے گفتگو کرنا اپنی عزت خطرے میں ڈالنا ہے۔“

ظاہر ہے کہ ان باتوں نے مجھے بے حد افسر دہ بنا دیا تھا۔ وہ مجھ سے سگریٹ، مٹھائی اور اسی قسم کی دوسری معمولی اشیاء طلب کیا کرتی تھی اور میں بڑے شوق اور محبت سے اس کی یہ خواہش پوری کیا کرتا تھا۔ اس میں ایک خاص لطف تھا۔ مگر اب ہوٹل والے کی بات نے میرے

ذہن میں مہیب خیالات کا ایک تلاطم برپا کر دیا۔ گزشتہ ملاقاتوں کے جتنے نقوش میرے دل و دماغ میں محفوظ تھے اور جنہیں میں ہر روز بڑے پیار سے اپنے تصور میں لا کر ایک خاص قسم کی مٹھاں محسوس کیا کرتا تھا، دفعتاً تاریک شکل اختیار کر گئے۔ مجھے اس کے نام ہی سے عفونت آنے لگی۔ میں نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔ میرا دل جو ایک کالج کے طالب علم کے سینے میں دھڑکتا تھا، اپنے خوابوں کی یہ بھی اور بھیانک تعمیر دیکھ کر چلا اٹھا۔ اس کی باتیں جو کچھ عرصہ پہلے بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں ریا کاری میں ڈوبی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔

میں نے گزشتہ واقعات، بیگو کی نقل و حرکت، اس کی جنبش اور اپنے گرد و پیش کے ماحول کو پیش نظر کھکھ کر عین مطالعہ کیا تو تمام چیزیں روشن ہو گئیں، اس کا ہر شام کو ایک مریض کے ہاں دو دھنے کر جانا اور وہاں ایک عرصہ تک بیٹھی رہنا، باولی پر ہر کس و ناکس سے بیباکانہ گفتگو، دوپٹے کے بغیر ایک پتھر سے دوسرے پر اچھل کو د، اپنی ہم عمر لڑکیوں سے کہیں زیادہ شوخ اور آزاد روی۔۔۔ وہ یقیناً عصمت باختہ لڑکی ہے۔“

میں نے یہ رائے مرتب تو کر لی۔ مگر آنسوؤں سے میری آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ خوب رویا مگر دل کا بوجھ ہاکانہ ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک بار، آخری بار اس سے ملوں اور اس کے منہ پر اپنے تمام غصے کو تھوک دوں۔ یہی صورت تھی جس سے مجھے کچھ سکون حاصل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں شام کو باولی کی طرف گیا۔ وہ بگذرندی پر انار کی جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھی میرا منتظر کر رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر میرا دل کسی قدر کثرہا۔ میرا حلق اس روز کی تینی کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اس کے قریب پہنچا اور پاس ہی ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ چھلان اس کی بھیں اور اس کا پچھڑا چند گزوں کے فاصلے پر بیٹھے جگائی کر رہے تھے۔ میں نے گفتگو کا آغاز کرنا چاہا مگر کچھ نہ کہہ سکا۔ غصے اور افسردگی نے میری زبان پر قفل لگا دیا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی، جیسے چشمے کے پانی میں کسی نے اپنے مٹی بھرے ہاتھ دھو دیئے ہیں۔ پھر وہ مسکرائی، یہ مسکراہٹ مجھے کسی قدر مصنوعی اور پھیلی معلوم ہوئی۔ میں نے سر جھکا لیا اور سنگ ریزوں سے کھلینا شروع کر دیا تھا۔ شاید میرا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور کہا، ”آپ بیمار ہیں؟“

اس کا یہ کہنا تھا کہ میں برس پڑا، ”ہاں بیمار ہوں، اور یہ بیماری تمہاری دی ہوئی ہے، تمہیں نے یہ روگ لگایا ہے بیگو! میں تمہارے چال چلن کی سب کہانی سن چکا ہوں اور تمہارے سارے حالات سے باخبر ہوں۔“

میری چھبھتی ہوئی باتیں سن کر اور بد لے ہوئے تیور دیکھ کر وہ بھونچکا سی رہ گئی اور کہنے لگی، ”اچھا تو میں اچھی لڑکی نہیں ہوں۔ آپ کو میرے چال چلن کے متعلق سب کچھ معلوم ہو چکا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔“

میں چلایا، ”گویا تم کو معلوم ہی نہیں۔ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو تو اپنی سیہ کاریوں کا سارا نقشہ تمہاری آنکھوں تلے گھوم جائے گا۔“ میں طیش میں آگیا، کتنی بھولی بنتی ہو۔ جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔ پروں پر پانی پڑنے ہی نہیں دیتیں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں، بھلام کیا سمجھو، جاؤ جاؤ بیگو، تم نے مجھے سخت دکھ پہنچایا ہے۔“ یہ کہتے کہتے میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ وہ بھی سخت مضطرب ہو گئی اور جل کر بول اٹھی، ”آخر میں بھی تو سنوں کہ آپ نے میرے بارے میں کیا کیا سننا ہے۔ پر آپ تورور ہے ہیں۔“

”ہاں، رو رہا ہوں۔ اس لیے کہ تمہارے افعال ہی اتنے سیاہ ہیں کہ ان پر ما تم کیا جائے۔ تم پاکبازوں کی قدر کیا جانو۔ اپنا جسم یچنے والی لڑکی محبت کیا جانے۔ تم صرف اتنا جانتی ہو کہ کوئی مرد آئے اور تمہیں اپنی چھاتی سے بھینچ کر چومنا چاٹنا شروع کر دے اور جب سیر ہو جائے تو اپنی راہ لے۔ کیا یہی تمہاری زندگی ہے۔“

میں غصے کی شدت سے دیوانہ ہو گیا تھا۔ جب اس نے میری زبان سے اس قسم کے سخت کلمات سنے تو اس نے ایسا ظاہر کیا جیسے اس کی نظر میں یہ سب گفتگو ایک معتمد ہے۔ اس وقت طیش کی حالت میں میں نے اس کی حالت کو نمائشی خیال کیا اور ایک قہقهہ لگاتے ہوئے کہا، ”جاو! میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ تم ناپاک ہو۔“

یہ سن کر اس نے ڈری ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا، ”آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“

”مجھے کیا ہو گیا۔۔۔ کیا ہو گیا ہے۔“ میں پھر برس پڑا، ”اپنی زندگی کی سیاہ کاریوں پر نظر دوڑاؤ۔۔۔“ تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ تم میری بات اس لیے نہیں سمجھتی ہو کہ میں تم سے شادی کرنے کا خواہش مند تھا، اس لیے کہ میرے سینے میں شہوانی خیالات نہیں، اس لیے کہ میں تم سے صرف محبت کرتا ہوں۔ جاؤ مجھے تم سے سخت نفرت ہے۔“

جب میں بول چکا تو اس نے تھوک نگل کر اپنے حلق کو صاف کیا اور تھر تھرائی ہوئی آواز میں کہا، ”شاید آپ یہ خیال کرتے ہوں گے کہ جان بوجھ کر انجان بن رہی ہوں۔ مگر سچ جانیے مجھے کچھ معلوم نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک شام آپ سڑک پر سے گزر رہے تھے، آپ نے میری طرف دیکھا تھا اور مسکرا دیئے تھے۔ یہاں میسیوں لوگ ہم لڑکیوں کو دیکھتے ہیں اور مسکرا کر چلے جاتے ہیں۔ پھر آپ متواتر باولی کی طرف آتے رہے۔ مجھے معلوم تھا آپ میرے لیے آتے ہیں مگر اسی قسم کے کئی واقعے میرے ساتھ گزر چکے ہیں۔ ایک روز آپ نے میرے ساتھ باقیں کیں اور اس کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ آپ نے شادی کے لیے کہا میں۔۔۔ مان گئی۔۔۔“

مگر اس سے پہلے اس قسم کی کئی درخواستیں سن چکی ہوں۔ جو مرد بھی مجھ سے ملتا ہے دوسرے تیرے روز میرے کان میں کہتا ہے، ”بیگو دیکھ میں تیری محبت میں گرفتار ہوں۔ رات دن تو ہی میرے دل و دماغ میں بستی رہتی ہے۔“ آپ نے بھی مجھ سے یہی کہا۔ اب بتائیے محبت کیا چیز ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ آپ نے دل میں کیا چھپا رکھا ہے۔ یہاں آپ جیسے کئی لوگ ہیں جو مجھ سے یہی کہتے ہیں، بیگو تمہاری آنکھیں لکھنی خوبصورت ہیں جی چاہتا ہے کہ صدقے ہو جاؤں۔ تمہارے ہونٹ کس قدر پیارے ہیں جی چاہتا ہے ان کو چوم لوں۔۔۔ وہ مجھے چوتے رہے ہیں کیا یہ محبت نہیں ہے؟

کئی بار میرے دل میں خیال آیا ہے کہ محبت کچھ اور ہی چیز ہے مگر میں پڑھی لکھی نہیں، اس لیے مجھے کیا معلوم ہو سکتا ہے۔ میں نے قاعدہ پڑھنا شروع کیا مگر چھوڑ دیا۔ اگر میں پڑھوں تو پھر چھلاں اور اس کے پچھڑے کا پیٹ کون بھرے، آپ اخبار پڑھ لیتے ہیں اس لیے آپ کی باتیں بڑی ہوتی ہیں۔ میں کچھ نہیں سمجھ سکتی چھوڑ دیئے۔ اس قصے کو آئیے کچھ اور باتیں کریں مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ میری ماں کہہ رہی تھیں کہ بیگو توہینے والے بابو کے پچھے دیوانی ہو گئی ہے۔“

میری نظروں کے سامنے سے وہ تاریک پر دہ اٹھنے لگا تھا جو اس انجام کا باعث تھا۔ مگر دفعتاً میرے جوش اور غصے نے پھر اسے گردادیا۔ بیگو کی گفتگو بے حد سادہ اور معصومیت سے پر تھی مگر مجھے اس کا ہر لفظ بناوٹ میں لپٹا نظر آیا۔ میں ایک لمحہ بھی اس کی اہمیت پر غور نہ کیا۔

”بیگو، میں بچہ نہیں ہوں کہ تم مجھے چکنی چیڑی باتوں سے بیوقوف بنالوگی۔“ میں نے غصہ میں اس سے کہا، ”یہ فریب کسی اور کو دینا۔ کہتے ہیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، تم نے ابھی اپنی زبان سے اس بات کا اعتراف کیا ہے اب میں کیا کہوں۔“

”نہیں نہیں کہیے!“ اس نے کہا۔

”کئی لوگ تمہارے منہ کو چومنتے رہے ہیں۔ تمہیں شرم آنی چاہیے!“

”ہاں آپ تو سمجھتے ہی نہیں۔ اب میں کیا جھوٹ بولتی ہوں۔ میں خود تھوڑا ہی ان کے پاس جاتی ہوں اور منہ بڑھا کر چومنے کو کہتی ہوں۔ اگر آپ اس روز میرے بالوں کو چومنا چاہتے جبکہ آپ ان کی تعریف کر رہے تھے، تو کیا میں انکار کر دیتی؟ میں کس طرح انکار کر سکتی ہوں، مجھے چھلاں بہت پیاری لگتی ہے اور میں ہر روز اس کو چومنتی ہوں۔ اس میں کیا ہر ج ہے میں چاہتی ہوں کہ لوگ میرے بالوں، میرے ہونٹوں اور میرے گالوں کی تعریف کریں اس سے مجھے خوشی ہوتی ہے، خبر نہیں کیوں؟ میں صحیح سویرے اٹھتی ہوں اور چھلاں کو لے کر

گھاس چرانے کے لیے باہر چلی جاتی ہوں، دوپھر کو روٹی کھا کر پھر گھر سے نکل آتی ہوں۔ شام کو پانی بھرتی ہوں۔ ہر روز میرا یہی کام ہے، مجھے یاد ہے کہ آپ نے مجھ سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ میں پانی بھرنے نہ آیا کروں۔ بھینس نہ چرایا کروں۔ شاید آپ اسی وجہ سے ناراض ہو رہے ہیں۔ مگر یہ تو بتائیے کہ میں گھر پر رہوں تو پھر آپ ملاقات کیوں نکر کر سکیں گے؟ میں نے سنا ہے کہ پنجاب میں لڑکیاں گھر سے باہر نہیں نکلتیں مگر ہم پہاڑی لوگ ہیں، ہمارا یہی کام ہے۔

”تمہارا یہی کام ہے کہ ہر رہ گذر سے لپٹنا شروع کر دو۔ تم پہاڑی لوگوں کے چلن مجھ سے چھپے ہوئے نہیں، یہ تقریر کسی اور کو سنا۔ گھر پر رہو یا باہر رہو۔ اب مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ان پہاڑیوں میں رہ کر جو سابق تم نے سیکھا ہے وہ مجھے پڑھانے کی کوشش نہ کرو“

”آپ بہت تیز ہو جاتے جا رہے ہیں، بہت چل نکلے ہیں۔“ اس نے قدرے بگڑ کر کہا، ”معلوم ہوتا ہے لوگوں نے آپ کے بہت کان بھرے ہیں۔ مجھے بھی تو پتہ لگے کہ وہ کون؟“ ”مرن جو گے“ ہیں جو میرے متعلق آپ کو ایسی باتیں سناتے رہے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ اتنے گرم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ میں مردوں کے ساتھ باتیں کرتی ہوں ملتی ہوں مگر۔۔۔ یہ کہتے ہوئے اس کے گال سرخ ہو گئے۔ مگر میں نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔

ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولی۔ آپ کہتے ہیں کہ میں بری لڑکی ہوں یہ غلط ہے۔ میں پلکی ہوں۔۔۔ سچ مجھ پلکی ہوں۔ کل آپ کے چلنے کے بعد میں پتھر پر بیٹھ کر دیر تک روئی رہی۔ جانے کیوں۔ ایسا کئی دفعہ ہوا ہے کہ میں گھنٹوں رویا کرتی ہوں۔ آپ ہنسیں گے مگر اس وقت بھی میرا جی چاہتا ہے کہ بیباں سے اٹھ بھاگوں اور اس پہاڑی کی چوٹی پر بھاگتی ہوئی پڑھ جاؤں اور پھر کو دی پھانڈتی نیچ اتر جاؤں۔ میرے دل میں ہر وقت ایک بے چینی سی رہتی ہے۔ بھینس چراتی ہوں، پانی بھرتی ہوں، لکڑیاں کاٹتی ہوں۔ لیکن یہ سب کام میں اوپرے دل سے کرتی ہوں۔ میرا جی کسی کو ڈھونڈتا ہے۔ معلوم نہیں کس کو۔۔۔ میں دیوانی ہوں۔“

بیگوکی یہ عجیب و غریب باتیں جو درحقیقت اس کی زندگی کا ایک نہایت الجھاہو اباب تھیں اور جسے بغور مطالعہ کرنے کے بعد سب راز حل ہو سکتے تھے، اس وقت مجھے کسی مجرم کا غیر مربوط بیان معلوم ہوئیں، بیگو اور میرے درمیان اس قدر تاریک اور موٹا پر دھاکل ہو گیا تھا کہ حقیقت کی نقاب کشائی بہت مشکل تھی۔

”تم دیوانی ہو۔“ میں نے اس سے کہا، ”کیا مردوں کے ساتھ بیٹھ کر جھاڑیوں کے پیچھے پھرول باتیں کرتے رہنا بھی اس دیوانگی ہی کی ایک شاخ ہے۔۔۔؟ بیگو، تم پلکی ہو مگر اپنے کام میں آٹھوں گانٹھ ہوشیار!“

”میں بتیں کرتی ہوں، ان سے ملتی ہوں، میں نے اس سے کب انکار کیا ہے۔ ابھی ابھی میں نے آپ سے اپنے دل کی سچی بات کہی تو آپ نے مذاق اڑانا شروع کر دیا اب اگر میں کچھ اور کہوں تو اس سے کیا فائدہ ہو گا۔ آپ کبھی مانیں گے ہی نہیں۔“

”نہیں، نہیں، کہو، کیا آہتی ہو، تمہارا نیا فلسفہ بھی سن لوں۔“

”سینے پھر۔“ یہ کہہ کر اس نے تھکی ہوئی ہرنی کی طرح میری طرف دیکھا اور آہ بھر کر بولی، ”یہ بتیں جو میں آج آپ کو سنانے لگی ہوں میری زبان سے پہلے کبھی نہیں نکلیں۔ میں یہ آپ کو بھی نہ سناتی مگر مجبوری ہے۔ آپ عجیب و غریب آدمی ہیں۔ میں بہت سے لوگوں سے ملتی رہی ہوں۔ مگر آپ بالکل زراں ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے آپ سے --- وہ پچکچائی، ہاں آپ سے پیار ہو گیا ہے۔ آپ نے کبھی مجھ سے غیر بات نہیں کہی۔ حالانکہ میں جس سے ملتی رہی ہوں وہ مجھ سے کچھ اور ہی کہتا تھا۔ میری اماں جانتی ہے کہ میں گھر میں ہر وقت آپ ہی کی بتیں کرتی رہتی ہوں میرا منہ تھکتا ہی نہیں۔ آپ نے نہیں کہا، پر میں نے گاہوں کے پاس دودھ لے جانا چھوڑ دیا۔ لوگوں سے بتیں کرنا چھوڑ دیں۔ پانی بھرنے کے لیے بھی زیادہ چھوٹی بہن ہی کو بھیجتی رہی ہوں۔ آپ کے آنے سے پہلے میں لوگوں سے ملتی رہی ہوں۔ اب میں آپ کو بتاؤں کہ میں ان سے کیوں ملتی تھی۔۔۔ مجھے کوئی مرد بھی بلا تاویں اسی سے بتیں کرنے لگتی تھی۔ اس لیے --- نہیں نہیں میں نہیں بتاؤں گی۔۔۔ میرا دل جو چاہتا تھا وہ ان لوگوں کے پاس نہیں تھا، میں بری نہیں، اللہ کی قسم، بے گناہ ہوں، خدا معلوم لوگ مجھے برا کیوں کہتے ہیں۔ آپ بھی مجھے برا کہتے ہیں۔

جس طرح آپ نے آج میرے منہ پر اتنی گالیاں دی ہیں اگر آپ کے بجائے کوئی اور ہوتا تو میں اس کا منہ نوچ لیتی مگر آپ۔۔۔ اب میں کیا کہوں، میں بہت بدل گئی ہوں، آپ بہت اپنھے آدمی ہیں۔ میں خیال کرتی تھی کہ آپ مجھے کچھ سکھائیں گے، مجھے اچھی اچھی بتائیں گے۔ لیکن آپ مجھ سے خواہ مخواہ لڑ رہے ہیں۔۔۔ آپ کو کیا معلوم کہ میں آپ کی کتنی عزت کرتی ہوں۔ میں نے آپ کے سامنے کبھی گالی نہیں دی۔ حالانکہ ہمارے گھر سارا دن گالی گلوچ ہوتی رہتی ہے۔“

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے ڈاکٹر صاحب! اس پہاڑی لڑکی کی گفتگو کس قدر سادہ تھی۔ مگر افسوس ہے کہ اس وقت میرے کانوں میں روئی ٹھننسی ہوئی تھی۔ اس کے ہر لفظ سے مجھے عصمت فروشی کی بو آرہی تھی۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔

”بیگو! تم ہزار قسمیں کھاؤ۔ مگر مجھے یقین نہیں آتا۔ اب جو تمہارے جی میں آئے کرو۔ میں کل بیوت چھوڑ کر جا رہا ہوں میں نے تم سے محبت کی، مگر تم نے اس کی قدر نہ کی۔ تم نے میرے دل کو بہت دکھ دیا ہے۔۔۔ خیر اب جاتا ہوں، مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔“

مجھے جاتا دیکھ کر وہ سخت مضطرب ہو گئی اور میرا بازو پکڑ کر اپنے پھر اسے فوراً درتے ہوئے چھوڑ کر تھرائی ہوئی آواز میں صرف اس قدر کہا،

”آپ جا رہے ہیں؟“

میں نے جواب دیا، ”ہاں جا رہا ہوں تاکہ تمہارے چاہنے والوں کے لیے میدان صاف ہو جائے۔“

”آپ نہ جائیے، اللہ کی قسم میرا کوئی چاہنے والا نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں، ”نہ جانئے، نہ جائیے نہ۔۔۔“ آخری الفاظ اس کی گلوگیر آواز میں دب گئے۔ اس کا رونا میرے دل پر کچھ اثر نہ کر سکا۔ میں چل پڑا۔ مگر اس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور روٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آپ خفا کیوں ہو گئے ہیں۔ میں آئندہ کسی آدمی سے بات نہ کروں گی۔ اگر آپ نے مجھے کسی مرد کے ساتھ دیکھا تو آپ اس چھڑی سے جتنا چاہیے پیٹ بجیے گا۔ آئیے گھر چلیں۔ میں آپ کے لیے حقہ تازہ کر کے لاوں گی۔“

میں خاموش رہا اور اس کا ہاتھ چھوڑ کر پھر چل پڑا۔ اس وقت بیگو سے ایک منٹ کی گفتگو کرنا بھی مجھے گراں گزر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ لڑکی میری نظروں سے ہمیشہ کے لیے او جھل ہو جائے، میں نے بمشکل دو گز کا فاصلے طے ہو گا کہ وہ میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس کے بال پر بیشان تھے، آنکھوں کے ڈورے سرخ اور ابھرے ہوئے تھے، سینہ آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔

اس نے پوچھا، ”کیا آپ واقعی جا رہے ہیں؟“

میں نے نیزی سے جواب دیا، ”تو اور کیا جھوٹ بک رہا ہوں۔“

”جائیے۔“

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے اشک روائ تھے اور گال آنسوؤں کی وجہ سے میلے ہو رہے تھے مگر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک ناج رہی تھی۔

”جائیے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھے پاؤں مرٹی۔ اس کا قد پہلے سے لمبا ہو گیا تھا۔

میں نے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دور جا کر میں نے جھاڑیوں کے پیچھے سے رونے کی آواز سنی۔ وہ تھرائی ہوئی آوازا بھی تک میرے کانوں میں آ رہی ہے۔ یہ ہے میری داستان ڈاکٹر صاحب، میں نے اس پھاڑی لڑکی کی محبت کو ٹھکرایا۔ اس غلطی کا احساس مجھے پورے دوسال بعد ہوا۔ جب میرے ایک دوست نے مجھے یہ بتایا کہ بیگونے میرے جانے کے بعد اپنے شباب کو دونوں ہاتھوں سے لٹانا شروع کر دیا اور دف کے مريضوں سے ملنے کی وجہ سے وہ خود اس کا شکار ہو گئی۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ اس مرض نے بالآخر اسے قبر کی گود میں سلا دیا۔۔۔ اس کی موت کا باعث میرے سوا اور کوئی ہو سکتا ہے۔ وہ زندگی کی شاہراہ پر اپنا راستہ تلاش کرتی تھی مگر میں اس کو بھول جھلیوں میں چھوڑ کر بھاگ آیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھٹک گئی، میں مجرم تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے لیے وہی موت تجویز کی جس سے وہ دوچار ہوئی۔ وہ وزن جو میں پانچ سال اپنی چھاتی پر اٹھائے پھر تارہ ہوں، خدا کا شکر ہے کہ اب ہلاکا ہو گیا ہے۔

میں مريض کی داستان خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ بول چکا تو پھر بھی خاموش رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے جذبات پر رائے زنی کروں۔ چنانچہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ مجھے کئی مريضوں کی داستانیں سننے کا اتفاق ہوا ہے مگر یہ نہایت عجیب و غریب اور پر اثر داستان تھی۔ گو مريض بیماری کی وجہ سے ڈیوبول کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ مگر حیرت ہے کہ اس نے اپنے طویل بیان کو کس طرح جاری رکھا۔

صحیح کے وقت میں اس کا ٹمپرچر دیکھنے کے لیے آیا مگر وہ مر چکا تھا۔ سفید چادر اوڑھے وہ بڑے سکون سے سوراہا تھا۔ جب اس کو غسل دینے لگے تو ہسپتال کے ایک نوکرنے مجھے بلایا، ”ڈاکٹر صاحب اس کی مٹھی میں پکھھ ہے۔“ میں نے اس کی بند مٹھی کو آدھا کھول کر دیکھا، لوہے کے دو کلپ تھے۔ اس کی بیگلو کی یاد گار!

”ان کو نکالنا نہیں، یہ اس کے ساتھ ہی دفن ہوں گے۔ میں نے غسل دینے والوں سے کہا اور دل میں غم کی ایک عجیب و غریب کیفیت لیے دفتر چلا گیا۔“

یہی دن تھے، آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے۔ دھلا ہوا، نظر اہوا، اور دھوپ بھی ایسی ہی گلنگی تھی۔ سہانے خوابوں کی طرح۔ مٹی کی بس بھی ایسی ہی تھی جیسی کہ اس وقت میرے دل و دماغ میں رچ رہی ہے، اور میں نے اسی طرح لیٹے لیئے اپنی پھر پھڑاتی ہوئی روح اس کے حوالے کر دی تھی۔“

اس نے مجھ سے کہا تھا، ”تم نے مجھے جو یہ لمحات عطا کیے ہیں لیکن جانو۔ میری زندگی ان سے خالی تھی۔۔۔ جو خالی جگہیں تم نے آج میری ہستی میں پر کی ہیں، تمہاری شکر گزار ہیں۔ تم میری زندگی میں نہ آتیں تو شاید وہ ہمیشہ ادھوری رہتی۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں تم سے اور کیا کہوں۔۔۔ میری تکمیل ہو گئی ہے۔ ایسے کامل طور پر کہ محسوس ہوتا ہے مجھے اب تمہاری ضرورت نہیں رہی۔۔۔ اور وہ چلا گیا۔۔۔ ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔“

”میری آنکھیں روئیں۔۔۔ میرا دل رویا۔۔۔ میں نے اس کی منت سماجت کی۔ اس سے لاکھ مرتبہ پوچھا کہ میری ضرورت اب تمہیں کیوں نہیں رہی۔۔۔ جبکہ تمہاری ضرورت۔۔۔ اپنی تمام شدت کے ساتھ اب شروع ہوئی ہے۔ ان لمحات کے بعد جنہوں نے بقول تمہارے، تمہاری ہستی کی خالی جگہیں پُر کی ہیں۔“

اس نے کہا، ”تمہارے وجود کے جس جس ذرے کی میری ہستی کی تعمیر و تکمیل کو ضرورت تھی، یہ لمحات چن چن کر دیتے رہے۔۔۔ اب کہ تکمیل ہو گئی ہے تمہارا میرارشتہ خود خود ختم ہو گیا ہے۔“

کس قدر ظالمانہ لفظ تھے۔ مجھ سے یہ پتھر اور داشت نہ کیا گیا۔ میں چیخ چیخ کر رونے لگی۔ مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ میں نے اس سے کہا، ”یہ ذرے جن سے تمہاری ہستی کی تکمیل ہوئی ہے، میرے وجود کا ایک حصہ تھے۔۔۔ کیا ان کا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں۔۔۔ کیا میرے وجود کا بقا یا حصہ ان سے اپناناطہ توڑ سکتا ہے؟ تم کامل ہو گئے ہو۔۔۔ لیکن مجھے ادھورا کر کے۔۔۔ کیا میں نے اسی لیے تمہیں اپنا معبود بنایا تھا؟“

اس نے کہا، ”بھونزے، پھولوں اور کلیوں کا رس چوس چوس کر شہد کشید کرتے ہیں، مگر وہ اس کی تنگھٹ تک بھی ان پھولوں اور کلیوں کے ہونٹوں تک نہیں لاتے۔۔۔ خدا اپنی پرستش کرتا ہے، مگر خود بندگی نہیں کرتا۔۔۔ عدم کے ساتھ خلوت میں چند لمحات بسر کر کے اس نے وجود کی تکمیل کی۔۔۔ اب عدم کہاں ہے۔۔۔ اس کی اب وجود کو کیا ضرورت ہے۔ وہ ایک ایسی ماں تھی جو وجود کو جنم دیتے ہی زچلی کے بستر پر فنا ہو گئی تھی۔“

عورت رو سکتی ہے، دلیلیں پیش نہیں کر سکتی۔ اس کی سب سے بڑی دلیل اس کی آنکھ سے ڈھلا کا ہوا آنسو ہے۔۔۔ میں نے اس سے کہا۔
 ”دیکھو۔۔۔ میں رورہتی ہوں۔۔۔ میری آنکھیں آنسو بر سار ہی ہیں تم جاہے ہو تو جاؤ، مگر ان میں سے کچھ آنسوؤں کو تو اپنے رومال کے
 کفن میں لپیٹ کر ساتھ لیتے جاؤ۔۔۔ میں تو ساری عمر رو تی رہوں گی۔۔۔ مجھے اتنا قویاد رہے گا کہ چند آنسوؤں کے کفن دفن کا سامان تم نے
 بھی کیا تھا۔۔۔ مجھ خوش کرنے کے لیے!“

اس نے کہا، ”میں تمہیں خوش کر چکا ہوں۔ تمہیں اس ٹھوس مسرت سے ہمکنار کر چکا ہوں۔ جس کے تم سراب ہی دیکھا کرتی تھیں۔ کیا
 اس کا لطف اس کا کیف، تمہاری زندگی کے بقا یا لمحات کا سہارا نہیں بن سکتا۔ تم کہتی ہو کہ میری تکمیل نے تمہیں ادھورا کر دیا ہے۔ لیکن یہ
 ادھورا پن ہی کیا تمہاری زندگی کو متھر ک رکھنے کے لیے کافی نہیں۔ میں مرد ہوں۔۔۔ آج تم نے میری تکمیل کی ہے۔ کل کوئی اور کرے
 گا۔ میرا وجود کچھ ایسے آب و گل سے بناء ہے جس کی زندگی میں ایسے کئی لمحات آئیں گے جب وہ خود کو تشنہ تکمیل سمجھے گا۔ اور تم ایسی کئی
 عورتیں آئیں گی جو ان لمحات کی پیدا کی ہوئی خالی جگہیں پُر کریں گی۔“

میں رو تی رہی۔ جھنجھلاتی رہی۔

میں نے سوچا، یہ چند لمحات جو ابھی میری مٹھی میں تھے۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں ان لمحات کی مٹھی میں تھی۔۔۔ میں نے کیوں خود کو ان کے
 حوالے کر دیا۔ میں نے کیوں اپنی پھر پھر اتنی روح ان کے منہ کھولے قفس میں ڈال دی۔ اس میں مزرا تھا۔ ایک لطف تھا۔۔۔ ایک کیف
 تھا۔۔۔ تھا، ضرور تھا۔۔۔ اور یہ اس کے اور میرے تصادم میں تھا۔ لیکن۔۔۔ یہ کیا کہ وہ ثابت و سالم رہا۔۔۔ اور مجھ میں تریڑے پڑ
 گئے۔۔۔ یہ کیا، کہ وہ اب میری ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ لیکن میں اور بھی شدت سے اس کی ضرورت محسوس کرتی ہوں۔ وہ طاقتوں بن
 گیا ہے۔ میں نحیف ہو گئی ہوں۔۔۔ یہ کیا کہ آسمان پر دو بادل ہم آنخوش ہوں۔۔۔ ایک رورو کر بر سے لگا، دوسرا بھلی کا کونداہن کر اس
 بارش سے کھلیتا، کد کڑے لگاتا بھاگ جائے۔ یہ کس کا قانون ہے؟ آسمانوں کا؟ زمینوں کا؟ یا ان کے بنانے والوں کا؟

میں سوچتی رہی اور جھنجھلاتی رہی۔

دوروں کا سمت کر ایک ہو جانا اور ایک ہو کروالہانہ و سعت اختیار کر جانا۔۔۔ کیا یہ سب شاعری ہے۔۔۔ نہیں، دوروں میں سمت کر ضرور اس نئھے سے نکتے پر پہنچتی ہیں جو پھیل کر کائنات بنتا ہے۔۔۔ لیکن اس کائنات میں ایک روح کیوں کبھی کبھی گھائل چھوڑ دی جاتی ہے۔۔۔ کیا اس قصور پر کہ اس نے دوسری روح کو اس نئھے سے نکتے پر پہنچنے میں مدد تھی۔

یہ کیسی کائنات ہے۔

یہی دن تھے۔ آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے۔ اور دھوپ بھی ایسی ہی کٹانی تھی۔ اور میں نے اسی طرح لیٹے اپنی پھر پھر اتی ہوئی روح اس کے حوالے کر دی تھی۔ وہ موجود نہیں ہے۔ بھل کا کونداہن کر جانے وہ کن بدلوں کی گریہ وزاری سے کھیل رہا ہے۔ اپنی تکمیل کر کے چلا گیا۔۔۔ ایک سانپ تھا جو مجھے ڈس کر چلا گیا۔۔۔ لیکن اب اس کی چھوڑی ہوئی لکیر کیوں میرے پیٹ میں کروٹیں لے رہی ہے۔۔۔ کیا یہ میری تکمیل ہو رہی ہے؟

نہیں، نہیں۔۔۔ یہ کیسے تکمیل ہو سکتی ہے۔۔۔ یہ تو تخریب ہے۔۔۔

لیکن یہ میرے جسم کی خالی جگہیں پُر ہو رہی ہیں۔۔۔ یہ جو گڑھے تھے کس ملبے سے پُر کیے جا رہے ہیں۔ میری رگوں میں یہ کیسی سر سراہیں دوڑ رہی ہیں۔ میں سمت کر اپنے پیٹ میں کس نئھے سے نکتے پر پہنچنے کے لیے بیچ و تاب کھار رہی ہوں۔ میری ناؤڑوب کرا بکن سمندر روں میں ابھرنے کے لیے اٹھ رہی ہے؟

یہ میرے اندر دہکتے ہوتے چولھوں پر کس مہماں کے لیے دودھ گرم کیا جا رہا ہے۔ یہ میرا دل میرے خون کو دھنک دھنک کر کس کے لیے نرم و نازک رضائیاں تیار کر رہا ہے۔ یہ میرا دماغ میرے حالات کے رنگ برنگ دھاگوں سے کس کے لیے نئھی منی پوشاکیں بن رہا ہے؟

میرا رنگ کس کے لیے نکھر رہا ہے۔۔۔ میرے انگ اور روم روم میں پھنسی ہوئی ہچکیاں لوریوں میں کیوں تبدیل ہو رہی ہیں۔

یہی دن تھے۔۔۔ آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے۔۔۔ لیکن یہ آسمان اپنی بلندیوں سے اتر کر کیوں میرے پیٹ میں تن گیا ہے۔۔۔ اس کی نیلی نیلی آنکھیں کیوں میری رگوں میں دوڑتی پھرتی ہیں؟

میرے سینے کی گولائیوں میں مسجدوں کے محرابوں ایسی تقدیس کیوں آرہی ہے؟

نہیں، نہیں۔۔۔ یہ تقدیس کچھ بھی نہیں۔ میں ان محرابوں کو ڈھادوں گی۔۔۔ میں اپنے اندر تمام چولھے سرد کردوں گی جن پر بن بلائے مہمان کی خاطر داریاں چڑھی ہیں۔۔۔ میں اپنے خیالات کے تمام رنگ برنگ دھاگے آپس میں الجھادوں گی۔

یہی دن تھے۔۔۔ آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے۔۔۔ لیکن میں وہ دن کیوں یاد کرتی ہوں جن کے سینے پر سے وہ اپنے نقش قدم بھی اٹھا کر لے گیا تھا۔۔۔

لیکن یہ۔۔۔ یہ نقش قدم کس کا ہے۔۔۔ یہ جو میرے پیٹ کی گہرائیوں میں تڑپ رہا ہے۔۔۔ کیا یہ میرا جانا پہچانا نہیں۔۔۔

میں اسے کھڑج دوں گی۔۔۔ اسے مٹا دوں گی۔۔۔ یہ رسولی ہے۔۔۔ پھوڑا ہے۔۔۔ بہت خوفناک پھوڑا۔

لیکن مجھے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ پھاہا ہے۔۔۔ پھاہا ہے تو کس زخم کا؟ اس زخم کا جو وہ مجھے لگا کر چلا گیا تھا؟ نہیں نہیں۔۔۔ یہ تو ایسا لگتا ہے کسی پیدا آئشی زخم کے لیے ہے۔۔۔ ایسے زخم کے لیے جو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔۔۔ جو میری کو کھ میں جانے کب سے سورہ تھا۔

یہ کو کھ کیا۔۔۔ فضول سی مٹی کی ہندل کلیا۔۔۔ پکوں کا کھلوانا۔ میں اسے توڑ پھوڑ دوں گی۔

لیکن یہ کون میرے کان میں کہتا ہے، ”یہ دنیا ایک چورا ہے۔۔۔ اپنا بھانڈا کیوں اس میں پھوڑتی ہے۔۔۔ یاد کر کہ تجھ پر انگلیاں اٹھیں گی۔

انگلیاں۔۔۔ ادھر کیوں نہ اٹھیں گی، جدھروہ اپنی ہستی مکمل کر کے چلا گیا تھا۔۔۔ کیا ان انگلیوں کو وہ راستہ معلوم نہیں۔۔۔ یہ دنیا ایک چورا ہے۔۔۔ لیکن اس وقت تو وہ مجھے ایک دورا ہے پر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔۔۔ ادھر بھی ادھورا پن تھا۔ ادھر بھی ادھورا پن۔۔۔ ادھر بھی آنسو، ادھر بھی آنسو۔“

لیکن یہ کس کا آنسو، میرے سیپ میں موٹی بن رہا ہے۔۔۔ یہ کہاں بند ہے گا؟

انگلیاں اٹھیں گی۔۔۔ جب سیپ کامنہ کھلے اور موتی پھسل کر باہر چورا ہے میں گر پڑے گا تو انگلیاں اٹھیں گی۔۔۔ سیپ کی طرف بھی اور موتی کی طرف بھی۔۔۔ اور یہ انگلیاں سپولیاں بن بن کر ان دونوں کوڈ سیں گی اور اپنے زہر سے ان کو نیلا کر دیں گی۔

آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے۔ یہ گر کیوں نہیں پڑتا۔۔۔ وہ کون سے ستون ہیں جو اس کو تھامے ہوئے ہیں۔۔۔ کیا اس دن جوز لزلہ آیا تھا وہ ان ستونوں کی بنیادیں ہلا دینے کے لیے کافی نہیں تھا۔۔۔ یہ کیوں اب تک میرے سر کے اوپر اسی طرح تباہو اے؟

میری روح پسینے میں غرق ہے۔۔۔ اس کا ہر مسام کھلا ہوا ہے۔ چاروں طرف آگ دکھ رہی ہے۔ میرے اندر کٹھالی میں سونا پگھل رہا ہے۔ دھونکنیاں چل رہی ہیں۔ شعلے بھڑک رہے ہیں۔ سونا، آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح ابل رہا ہے۔ میری رگوں میں نیلی آنکھیں دوڑ دوڑ کرہانپ رہی ہیں۔۔۔ گھنٹیاں نج رہی ہیں۔۔۔ کوئی آرہا ہے۔۔۔ بند کر دو۔۔۔ بند کر دو کو اڑ۔۔۔

کٹھالی الٹ گئی ہے۔ پگھلا ہوا سونا بہہ رہا ہے۔ گھنٹیاں نج رہی ہیں۔ وہ آرہا ہے۔۔۔ میری آنکھیں مندر رہی ہیں۔۔۔ نیلا آسمان گدلا ہو کر نیچے آرہا ہے۔۔۔

یہ کس کے رونے کی آواز ہے۔ اسے چپ کراؤ۔۔۔ اس کی چینیں میرے دل پر ہتھوڑے مار رہی ہیں۔ چپ کراؤ۔۔۔ اسے چپ کراؤ۔۔۔ اسے چپ کراؤ۔۔۔ میں گود بن رہی ہوں۔۔۔ میں کیوں گود بن رہی ہوں۔۔۔

میری بانہیں کھل رہی ہیں۔۔۔ چولھوں پر دودھ ابل رہا ہے۔ میرے سینے کی گولا بیاں بیالیاں بن رہی ہیں۔۔۔ لاہو اس گوشت کے لو تھڑے کو میرے دل کے دھنکے ہوئے خون کے نرم زرم گالوں میں لٹادو۔۔۔ مت چھینو۔۔۔ مت چھینو اسے۔۔۔ مجھ سے جدا نہ کرو۔ خدا کے لیے مجھ سے جدا نہ کرو۔

انگلیاں۔۔۔ انگلیاں۔۔۔ اٹھنے والے انگلیاں۔۔۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔۔۔ یہ دنیا چورا ہا ہے۔۔۔ پھوٹنے والے میری زندگی کے تمام بھانڈے۔۔۔

میری زندگی تباہ ہو جائے گی؟ ہو جانے دو! مجھے میرا گوشت واپس دے دو۔۔۔ میری روح کا یہ ٹکڑا مجھ سے مت چھینو۔۔۔ تم نہیں جانتے یہ کتنا قیمتی ہے۔۔۔ یہ گوہر ہے جو مجھے ان چند لمحات نے عطا کیا ہے۔۔۔ ان چند لمحات نے جنہوں نے میرے وجود کے کئی ذرے چن چن کر کسی کی تکمیل کی تھی اور مجھے اپنے خیال میں ادھورا چھوڑ کے چلے گئے تھے۔۔۔ میری تکمیل آج ہوئی ہے۔

مان لو۔۔۔ مان لو۔۔۔ میرے پیٹ کے خلا سے پوچھو۔۔۔ میری دودھ بھری ہوئی چھاتیوں سے پوچھو۔۔۔ ان لوریوں سے پوچھو، جو میرے اگ اگ اور روم روم میں تمام بچکیاں سلا کر آگے بڑھ رہی ہیں۔۔۔ ان جھولوں سے پوچھو جو میرے بازوؤں میں ڈالے جا رہے ہیں۔ میرے چہرے کی زردیوں سے پوچھو جو گوشت کے اس لوٹھڑے کے گالوں کو اپنی تمام سرخیاں چساتی رہی ہیں۔۔۔ ان سانسوں سے پوچھو، جو چھپے چوری اس کو اس کا حصہ پہنچاتے رہے ہیں۔

انگلیاں۔۔۔ اٹھنے والے انگلیاں۔۔۔ میں انھیں کاٹ ڈالوں گی۔۔۔ شور پچ گا۔۔۔ میں یہ انگلیاں اٹھا کر اپنے کانوں میں ٹھونس لوں گی۔۔۔ میں گوئی ہو جاؤں گی، بہری ہو جاؤں گی، اندھی ہو جاؤں گی۔۔۔ میرا گوشت، میرے اشارے سمجھ لیا کرے گا۔۔۔ میں اسے ٹھوٹ ٹھوٹ کر پہچان لیا کروں گی۔۔۔

مت چھینو۔۔۔ مت چھینو اسے۔۔۔ یہ میری کوکھ کی مانگ کا سیندھو رہے۔۔۔ یہ میری ممتاز کے ماتھے کی بندیا ہے۔۔۔ میرے گناہ کا کڑوا پھل ہے؟ لوگ اس پر تھوڑو کریں گے؟ میں چاٹ لوں گی یہ سب تھوکیں۔۔۔ آنول سمجھ کر صاف کر دوں گی۔۔۔ دیکھو، میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔۔۔ تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔

میرے بھرے ہوئے دودھ کے برتن اوندھے نہ کرو۔۔۔ میرے دل کے دھنکے ہوئے خون کے نرم نرم گالوں میں آگ نہ لگاؤ۔۔۔ میری بانہوں کے جھولوں کی رسیاں نہ توڑو۔۔۔ میرے کانوں کو ان گیتوں سے محروم نہ کرو جو اس کے رو نے میں مجھے سنائی دیتے ہیں۔

مت چھینو۔۔۔ مت چھینو۔۔۔ مجھ سے جدانہ کرو۔۔۔ خدا کے لیے مجھے اس سے جدانہ کرو۔

دھوپی منڈی سے پولیس نے ایک نوزائیدہ بچی کو سردی سے ٹھہر تے سڑک کے کنارے پڑی ہوئی پایا اور اپنے قبضے میں لے لیا۔ کسی عتمدال نے بچی کی گردن کو مضبوطی سے کپڑے میں جگڑ رکھا تھا اور عریاں جسم کو پانی سے گیلے کپڑے میں باندھ رکھا تھا تاکہ وہ سردی سے مر جائے۔ مگر وہ زندہ تھی۔ بچی بہت خوبصورت ہے۔ آنکھیں نیلی ہیں۔ اس کو ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔

-[57]-

جانکی: سعادت حسن منتو

پونامیں ریسوں کا موسم شروع ہونے والا تھا کہ پشاور سے عزیز نے لکھا کہ میں اپنی ایک جان پہچان کی عورت جانی کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں، اس کو یا تو پونہ میں یا بے کی کسی فلم کمپنی میں ملازمت کراؤ۔ تمہاری واقفیت کافی ہے، امید ہے تمہیں زیادہ دقت نہیں ہو گی۔

دقت کا تو اتنا زیادہ سوال نہیں تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ میں نے ایسا کام کبھی کیا ہی نہیں تھا۔ فلم کمپنیوں میں اکثر وہی آدمی عورتیں لے کر آتے ہیں جنہیں ان کی کمائی کھانی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ میں بہت گھبرایا لیکن پھر میں نے سوچا عزیز اتنا پر انادوست ہے، جانے کس لیقین کے ساتھ بھیجا ہے، اس کو ماپوس نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سوچ کر بھی ایک گونہ تسلیم ہوئی کہ عورت کے لیے اگر وہ جوان ہو، ہر فلم کمپنی کے دروازے کھلے ہیں۔ اتنی تردید کی بات ہی کیا ہے، میری مدد کے بغیر ہی اسے کسی نہ کسی فلم کمپنی میں جگہ مل جائے گی۔

خط ملنے کے چوتھے روز وہ پونا پہنچ گئی۔ کتنا ملباس فرطے کر کے آئی تھی، پشاور سے بمبئی اور بمبئی سے پونہ۔۔۔ پلیٹ فارم پر چونکہ اس کو مجھے پہچاننا تھا، اس لیے گاڑی آنے پر میں نے ایک سرے سے ڈبوں کے پاس سے گزرنا شروع کیا۔ مجھے زیادہ دور نہ چلانا پڑا کیونکہ سینئنڈ کلاس کے ڈبے سے ایک متوسط قد کی عورت جس کے ہاتھ میں میری تصویر تھی، اتری۔ میری طرف وہ پیٹھ کر کے کھڑی ہو گئی اور ایڑیاں اوپنگی کر کے مجھے ہجوم میں تلاش کرنے لگی۔ میں نے قریب جا کر کہا، ”جسے آپ ڈھونڈ رہی ہیں وہ غالباً میں ہی ہوں۔“

وہ پلیٹ، ”اوہ، آپ!“ ایک نظر میری تصویر کی طرف دیکھا اور بڑے بے تکلف انداز میں کہا، ”سعادت صاحب، سفر بہت ہی لمبا تھا۔ بے میں فرنٹیئر میل سے از کر اس گاڑی کے انتظار میں جو وقت کا ٹھانپڑا اس نے طبیعت صاف کر دی۔“

میں نے کہا، ”اسباب کہاں ہے آپ کا؟“

”لاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ڈبے کے اندر داخل ہوئی۔ دوسوٹ کیس اور ایک بستر نکالا۔ میں نے قلی بلوایا۔ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا، ”میں ہوٹل میں ٹھہر ووں گی۔“ میں نے اسٹیشن کے سامنے ہی اس کے لیے ایک کمرے کا بندوست کر دیا۔ اسے غسل و سل کر کے کپڑے تبدیل کرنے تھے اور آرام کرنا تھا، اس لیے میں نے اسے اپنا ایڈریس دیا اور یہ کہہ کر کہ صحیح دس بجے مجھ سے ملے، ہوٹل سے چل دیا۔

صحیح ساڑھے دس بجے وہ پر بھات نگر، جہاں میں ایک دوست کے یہاں ٹھہر اہوا تھا، آئی۔ جگہ تلاش کرتے ہوئے اسے دیر ہو گئی تھی۔ میرا دوست اس چھوٹے سے فلیٹ میں، جو نیانیا تھا موجود نہیں تھا۔ میں رات دیر تک لکھنے کا کام کرنے کے باعث صحیح دیر سے جا گا تھا، اس لیے ساڑھے دس بجے نہاد ہو کر چائے پی رہا تھا کہ وہ اچانک اندر داخل ہوئی۔

پلیٹ فارم پر اور ہوٹل میں تھکاؤٹ کے باوجود وہ جاندار عورت تھی مگر جوں ہی وہ اس کمرے میں جہاں میں، صرف بنیان اور پا جامہ پہنے چائے پی رہا تھا داخل ہوئی تو اس کی طرف دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی بہت ہی پریشان اور خستہ حال عورت مجھ سے ملنے آئی ہے۔ جب میں نے اسے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا تو وہ زندگی سے بھر پور تھی لیکن جب پر بھات نگر کے نمبر گیارہ فلیٹ میں آئی تو مجھے محسوس ہوا کہ یا تو اس نے خیرات میں اپنا دس پندرہ اونس خون دے دیا ہے یا اس کا اسقاط ہو گیا ہے۔

جیسا کہ میں آپ سے کہہ چکا ہوں، گھر میں اور کوئی موجود نہیں تھا، سوائے ایک بے وقوف نوکر کے۔ میرے دوست کا گھر جس میں ایک فلمی کہانی لکھنے کے لیے میں ٹھہر اہوا تھا، بالکل سنسان تھا اور مجید ایک ایسا نوکر تھا جس کی موجودگی ویرانی میں اضافہ کرتی تھی۔ میں نے چائے کی ایک پیالی بنا کر جائی کو دی اور کہا، ”ہوٹل سے تو آپ ناشتہ کر کے آئی ہوں گی، پھر بھی شوق فرمائیے!“

اس نے اضطراب سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے چائے کی پیالی اٹھائی اور پینا شروع کی۔ اس کی داہنی ٹانگ بڑے زور سے ہل رہی تھی۔ اس کے ہوتھوں کی کلکپاہٹ سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا پاہتی ہے لیکن بچکپاہتی ہے۔ میں نے سوچا شاید ہوٹل میں رات کو کسی مسافر نے اسے چھیڑا ہے چنانچہ میں نے کہا، ”آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ہوٹل میں؟“

”جب---؟ جی نہیں!“

میں یہ مختصر جواب سن کر خاموش رہا۔ چائے ختم ہوئی تو میں نے سوچا اب کوئی بات کرنی چاہیے۔ چنانچہ میں نے پوچھا، ”عزیز صاحب کیسے ہیں؟“ اس نے میرے سوال کا جواب نہ دیا۔ چائے کی پیالی تپائی پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور لفظوں کو جلدی جلدی ادا کر کے کہا، ”منشو صاحب آپ کسی اچھے ڈاکٹر کو جانتے ہیں؟“

میں نے جواب دیا، ”پونامیں تو میں کسی کو نہیں جانتا۔“

”اوہ!“

میں نے پوچھا، ”کیوں، بیار ہیں آپ؟“

”جی ہاں۔“ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے دریافت کیا، ”کیا تکلیف ہے؟“

اس کے تیکھے ہونٹ جو مسکراتے تھے یا سکر لیے جاتے تھے واہوئے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی اور اٹھ کھڑی ہوئی پھر میرا سگریٹ کا ڈبہ اٹھایا اور ایک سگریٹ سلاکا کر کہا، ”معاف کیجیے گا میں سگریٹ پیا کرتی ہوں۔“ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ صرف سگریٹ پیا ہی نہیں کرتی بلکہ پھونکا کرتی تھی۔ بالکل مردوں کی طرح سگریٹ انگلیوں میں دبا کر وہ زور زور سے کش لیتی اور ایک دن میں تقریباً بیچھتر سگریٹوں کا دھواں کھینچتی تھی۔

میں نے کہا، ”آپ بتائی کیوں نہیں کہ آپ کو تکلیف کیا ہے؟“

اس نے کنواری لڑکیوں کی طرح جھنجھلا کر اپنا ایک پاؤ فرش پر مارا۔ ”ہائے اللہ! میں کیسے بتاؤں آپ کو؟“ یہ کہہ کروہ مسکراتی۔ مسکراتے ہوئے تیکھے ہونٹوں کی محراب میں سے مجھے اس کے دانت نظر آئے جو غیر معمولی طور پر صاف اور چمکیلے تھے۔ وہ بیٹھ گئی اور میری آنکھوں میں اپنی ڈگ گاتی آنکھوں کو نہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا، ”بات یہ ہے کہ پندرہ بیس دن اوپر ہو گئے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ---“ پہلے تو میں مطلب نہ سمجھا لیکن جب وہ بولتے بولتے رک گئی تو میں کسی قدر سمجھ گیا۔ ”ایسا اکثر ہوتا ہے۔“

اس نے زور سے کش لیا اور مردوں کی طرح زور سے دھویں کو باہر نکالتے ہوئے کہا، ”نہیں۔۔۔ یہاں معاملہ کچھ اور ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں کچھ ٹھہرنا گیا ہو۔“

میں نے کہا، ”اوہ!“

اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اس کی گردان چائے کی طشتہ ری میں دبائی، ”اگر ایسا ہو گیا ہے تو بڑی مصیبت ہو گی۔ ایک دفعہ پشاور میں ایسی ہی گڑبرہ گئی تھی۔ لیکن عزیز صاحب اپنے ایک حکیم دوست سے ایسی دوالائے تھے جس سے چند دن ہی میں سب صاف ہو گیا تھا۔“

میں نے پوچھا، ”آپ کو بچے پسند نہیں؟“

وہ مسکرائی، ”پسند ہیں۔۔۔ لیکن کون پالتا پھرے۔“

میں نے کہا، ”آپ کو معلوم ہے اس طرح بچے ضائع کرنا جرم ہے۔“

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔۔۔ پھر اس نے حیرت بھرے لمحہ میں کہا، ”مجھ سے عزیز صاحب نے بھی یہی کہا تھا۔ لیکن سعادت صاحب میں پوچھتی ہوں اس میں جرم کی کون سی بات ہے۔ اپنی ہی تو چیز ہے اور ان قانون بنانے والوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ بچے ضائع کراتے ہوئے تکلیف کرتی ہوتی ہے۔۔۔ بڑا جرم ہے!“

میں بے اختیار ہنس پڑا، ”عجیب و غریب عورت ہو تم جانکی!“

جانکی نے بھی ہنسنا شروع کر دیا، ”عزیز صاحب بھی یہی کہا کرتے تھے۔“

ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میر امشاہدہ ہے جو آدمی پر خلوص ہوں، ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو ضرور آ جاتے ہیں۔ اس نے اپنا بیگ کھول کر رومال نکالا اور آنکھیں خشک کر کے بھولے بچوں کے انداز میں پوچھا، ”سعادت صاحب! بتائیے، کیا میری باتیں دلچسپ ہوتی ہیں؟“

میں نے کہا، ”بہت۔“

”جھوٹ!“

”اس کا شوت؟“

اس نے سگریٹ سلاگا نا شروع کر دیا، ”بھئی شاید ایسا ہو، میں تو اتنا جانتی ہوں کہ کچھ کچھ بے قوف ہوں۔ زیادہ کھاتی ہوں، زیادہ بولتی ہوں، زیادہ ہنستی ہوں۔ اب آپ ہی دیکھیے نا، زیادہ کھانے سے میرا پیٹ کتنا بڑھ گیا ہے۔ عزیز صاحب ہمیشہ کہتے رہے جانکی کم کھایا کرو پر میں نے ان کی ایک نہ سنبھالی۔ سعادت صاحب! بات یہ ہے کہ میں کم کھاؤں تو ہر وقت ایسا لگتا ہے کہ میں کسی سے کوئی بات کہنا بھول گئی ہوں۔“

اس نے پھر ہنسنا شروع کیا۔ میں بھی اس کے ساتھ شریک ہو گیا۔ اس کی ہنسی بالکل الگ قسم کی تھیں۔ چاقچاق میں گھنگھرو سے بجھتے تھے۔

پھر وہ اسقاط حمل کے متعلق باتیں شروع کرنے ہی والی تھی کہ میرا دوست، جس کے بیہاں میں ٹھہرا ہوا تھا، آگیا۔ میں نے جانکی سے اس کا تعارف کرایا اور بتایا کہ وہ فلم لائن میں آنے کا شوق رکھتی ہے۔ میرا دوست اسے اسٹوڈیو لے گیا کیونکہ اس کو یقین تھا کہ وہ ڈائریکٹر جس کے ساتھ وہ بھیتیت اسٹینٹ کے کام کر رہا تھا، اپنے نئے فلم میں جانکی کو ایک خاص روپ کے لیے ضرور لے لے گا۔

پونامیں جتنے سٹوڈیو تھے، میں نے سب میں مختلف ذرائع سے جانکی کے لیے کوشش کی۔ کسی نے اس کا ساؤنڈ ٹسٹ لیا، کسی نے کیمرہ ٹسٹ۔ ایک فلم کمپنی میں اس کو مختلف قسم کے لباس پہنانا کر دیکھا گیا مگر نتیجہ کچھ نہ تکل۔ ایک تو جانکی ویسے ہی دن اوپر ہو جانے کے باعث پریشان تھی، چار پانچ روز متواتر جب اسے مختلف فلم کمپنیوں کے اکٹا دینے والے ماحول میں بے نتیجہ گزارنے پڑے تو وہ اور زیادہ پریشان ہو گئی۔

بچہ ضائع کرنے کے لیے وہ روز بیس بیس گرین کو نین کھاتی تھی۔ اس سے بھی اس کی طبیعت پر گرانی سی رہتی تھی۔ عزیز صاحب کے دن پشاور میں اس کے بغیر کیسے گزرتے ہیں، اس کے متعلق بھی اس کو ہر وقت فکر رہتی تھی۔ پونا پہنچتے ہی اس نے ایک تار بھیجا تھا۔ اس کے بعد وہ بلاناغہ ہر روز ایک خط لکھ رہی تھی۔ ہر خط میں یہ تاکید ہوتی تھی کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور دو باقاعدگی کے ساتھ پیتے رہیں۔

عزیز صاحب کو کیا بیماری تھی، اس کا مجھے علم نہیں۔۔۔ لیکن جانکی سے مجھے اتنا معلوم ہوا کہ عزیز صاحب کو چونکہ اس سے محبت ہے، اس لیے وہ فوراً اس کا کہنامان لیتے ہیں گریں کئی بار بیوی سے ان کا جھگڑا ہوا کہ وہ دوانہیں پیتے لیکن جانکی سے اس معاملے میں انہوں نے کبھی چوں بھی نہ کی۔

شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ جانکی عزیز کے متعلق جو اتنی فکر مندر رہتی ہے، محض بکواس ہے، بناوٹ ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ میں نے اس کی بے تکلف باتوں سے محسوس کیا کہ اسے حقیقتاً عزیز کا خیال ہے۔ اس کا جب بھی خط آیا، جانکی پڑھ کر ضرور روئی۔

فلم کمپنیوں کے طواف کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ لیکن ایک روز جانکی کو یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ اس کا اندیشہ غلط تھا۔ دن واقعی اور ہو گئے تھے لیکن وہ بات جس کا اسے کھلا تھا، نہیں تھی۔

جانکی کو پونا آئے بیس روز ہو چلے تھے۔ عزیز کو وہ خط پر خط لکھ رہی تھی۔ اس کی طرف سے بھی لمبے لمبے محبت نامے آتے تھے۔ ایک خط میں عزیز نے مجھ سے کہا تھا کہ پونا میں اگر جانکی کے لیے کچھ نہیں ہوتا تو میں بے میں کوشش کروں کیونکہ وہاں بے شمار اسٹوڈیو ہیں۔ بات معقول تھی لیکن میں سینیریو لکھنے میں مصروف تھا، اس لیے جانکی کے ساتھ بے جانا بہت مشکل تھا، لیکن میں نے پونا سے اپنے دوست سعید کو جو ایک فلم میں ہیر و کاپارٹ ادا کر رہا تھا، ٹیلی فون کیا۔ اتفاق سے وہ اس وقت اسٹوڈیو میں موجود تھا۔ آفس میں زائن کھڑا تھا اسے جب معلوم ہوا کہ میں پونا سے بول رہا ہوں تو ٹیلی فون لے لیا اور زور سے چلایا، ”ہلو منشو۔۔۔ زائن اسپیلنگ فرام دس اینڈ۔۔۔ کہو کیا بات ہے؟ سعید اس وقت اسٹوڈیو میں نہیں ہے۔ گھر میں بیٹھا رضیہ سے آخری حساب کتاب کر رہا ہے۔“

میں نے پوچھا، ”کیا مطلب؟“ زائن نے ادھر سے جواب دیا، کھٹ پٹ ہو گئی ہے ان میں، اصل میں رضیہ نے ایک اور آدمی سے ٹائکاملا لیا ہے۔ ”میں نے کہا، ”لیکن یہ حساب کتاب کیسا ہو رہا ہے؟“

زائن بولا، ”بڑا کمینہ ہے یار، سعید۔۔۔ اس سے کپڑے لے رہا ہے جو اس نے خرید کر دیے تھے۔ خیر چھوڑو اس بات کو، بتاؤ بات کیا ہے؟“

میں نے اس سے کہا، ”بات یہ ہے کہ پشاور سے میرے ایک عزیز نے ایک عورت بیہاں بھیجی ہے جسے فلموں میں کام کرنے کا شوق ہے۔“

جانکی میرے پاس ہی کھڑی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے مناسب و موزوں لفظوں میں اپنام عایان نہیں کیا۔ میں تصحیح کرنے ہی والا تھا کہ نرائیں کی بلند آواز کانوں کے اندر گھسی، ”عورت! پشاور کی عورت۔ خو، بجواں کو جلدی۔ خو، ہم بھی قصور کا پڑھان ہے۔ میں نے کہا، ”کو اس نہ کرو نرائیں! سنو، کل دکن کوئی سے میں انھیں ببے بھیج رہا ہوں۔ سعید یا تم کوئی بھی اسے استیشن پر لینے کے لیے آ جانا، کل دکن کوئی سے۔ یاد رہے۔“

نرائیں کی آواز آئی، ”پر ہم اسے پچانیں گے کیسے؟“

میں نے جواب دیا، ”وہ خود تمہیں بچان لے گی۔۔۔ لیکن دیکھو کوشش کر کے اسے کسی نہ کسی جگہ ضرور رکھوادیں۔“

تین منٹ گزر گئے۔ میں نے ٹیلی فون بند کیا اور جانکی سے کہا، ”کل دکن کوئی سے تم ببے چلی جانا۔ سعید اور نرائیں دونوں کی تصویریں دکھاتا ہوں۔ لمبے تڑنے کے بعد صورت جوان ہیں۔ تمہیں پہچاننے میں دقت نہیں ہو گی۔“ میں نے الیم میں جانکی کو سعید اور نرائیں کے مختلف فوٹوں دکھائے۔ دیر تک وہ انھیں دیکھتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ سعید کا فوٹو اس نے زیادہ غور سے دیکھا۔ الیم ایک طرف رکھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈالنے کی ڈگگاتی کو شش کرتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا، ”دونوں کیسے آدمی ہیں؟“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ دونوں کیسے آدمی ہیں۔۔۔؟ میں نے سنا ہے کہ فلموں میں اکثر آدمی برے ہوتے ہیں۔“ اس کے لمحے میں ایک ٹوہ لینے والی سنبھیگی تھی۔ میں نے کہا، ”یہ تو درست ہے لیکن فلموں میں نیک آدمیوں کی ضرورت ہی کہاں ہوتی ہے؟“

”کیوں؟“

”دنیا میں دو قسم کے انسان ہیں۔ ایک قسم ان انسانوں کی ہے جو اپنے زخموں سے درد کا اندازہ کرتے ہیں۔ دوسری قسم ان کی ہے جو دوسروں کے زخم دیکھ کر درد کا اندازہ کرتے ہیں۔ تمہارا خیال کیا ہے، کون سی قسم کے انسان زخم کے درد اور اس کی تہ کی جلن کو صحیح طور پر محسوس کرتے ہیں۔“

اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا، ”وہ جن کے زخم لگے ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا، ”بالکل درست۔ فلموں میں اصل کی اچھی نقل وہی اتار سکتا ہے جسے اصل سے واقعیت ہو۔ ناکام محبت میں دل کیسے ٹوٹتا ہے، یہ ناکام محبت ہی اچھی طرح بتا سکتا ہے۔ وہ عورت جو پانچ وقت جانماز بچھا کر نماز پڑھتی ہے اور عشق و محبت کو سورکے برابر سمجھتی ہے، کیمرے کے سامنے کسی مرد کے ساتھ اظہارِ محبت کیا خاک کرے گی!“

اس نے پھر سوچا، ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ فلم لائے میں داخل ہونے سے پہلے عورت کو سب چیزیں جانی چاہئیں۔“ میں نے کہا، ”یہ ضروری نہیں۔ فلم لائے میں آکر بھی وہ چیزیں جان سکتی ہے۔“ اس نے میری بات پر غور نہ کیا اور جو پہلا سوال کیا تھا، پھر اسے دہرا یا۔ ”سعید صاحب اور نرائن صاحب کیسے آدمی ہیں؟“

”تم تفصیل سے پوچھنا چاہتی ہو؟“

”تفصیل سے آپ کا کیا مطلب؟“

”یہ کہ دونوں میں سے آپ کے لیے کون بہتر ہے گا!“

جانکی کو میری یہ بات ناگوار گزری۔

”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟“

”جیسی تم چاہتی ہو۔“

”ہٹائیے بھی۔“ یہ کہہ وہ مسکرائی۔ ”میں اب آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا، ”جب پوچھو گی تو میں نرائن کی سفارش کروں گا۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ سعید کے مقابلے میں بہتر انسان ہے۔“

میرا بھی یہی خیال ہے۔ سعید شاعر ہے، ایک بہت بے رحم قسم کا شاعر۔ مرغیٰ پکڑے گاتو ذبح کرنے کی بجائے اس کی گردن مرود ر دے گا۔ گردن مرود کراس کے پر نوچے گا۔ پر نوچے کے بعد اس کی بینخی نکالے گا۔ بینخی پی کر اور ہڈیاں چبا کر وہ بڑے آرام اور سکون سے ایک کونے میں بیٹھ کر اس کی مرغیٰ کی موت پر ایک نظم لکھے گا جو اس کے آنسوؤں میں بھیگی ہو گی۔

شراب پیے گا تو کبھی بہکے گا نہیں؛ مجھے اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے کیونکہ شراب کا مطلب ہی فوت ہو جاتا ہے۔ صح بہت آہستہ آہستہ بستر پر سے اٹھے گا۔ نوکر چائے کی پیالی بن کر لائے گا۔ اگر رات کی بچی ہوئی رم سرہانے پڑی ہے تو اسے چائے میں انڈیل لے گا اور اس کمپھر کو ایک ایک گھونٹ کر کے ایسے پیے گا جیسے اس میں ذاتی کی کوئی حس ہی نہیں۔

بدن پر کوئی پھوڑا لکلا ہے؛ خطرناک شکل اختیار کر گیا ہے، مگر مجال ہے جو وہ اس کی طرف متوجہ ہو۔ پیپ نکل رہی ہے، گل سڑگیا ہے، ناسور بننے کا خطرہ ہے، لیکن سعید کبھی کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں جائے گا۔ آپ اس سے کچھ کہیں گے تو یہ جواب ملے گا، ”اکثر اوقات بیماریاں انسان کی جزو بدن ہو جاتی ہیں۔ جب مجھے یہ زخم تکلیف نہیں دیتا تو علاج کی کیا ضرورت ہے۔“ اور یہ کہتے ہوئے وہ زخم کی طرف اس طرح دیکھے گا جیسے کوئی اچھا شعر نظر آگیا ہے۔

ایکنگ وہ ساری عمر نہیں کر سکے گا، اس لیے کہ وہ لطیف جذبات سے قریب قریب عاری ہے۔ میں نے اسے ایک فلم میں دیکھا جو ہیر و نئ کے گانوں کے باعث بہت مقبول ہوا تھا۔ ایک جگہ اسے اپنی محبوبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت کا اظہار کرنا تھا۔ خدا کی قسم اس نے ہیر و نئ کا ہاتھ کچھ اس طرح اپنے ہاتھ میں لیا جیسے کتے کا پنجہ کپڑا جاتا ہے۔ میں اس سے کئی بار کہہ چکا ہوں ایکٹر بننے کا خیال اپنے دماغ سے نکال دو، اچھے شاعر ہو، گھر بیٹھو اور نظمیں لکھا کرو۔ مگر اس کے دماغ پر ابھی تک ایکنگ کی دھن سوار ہے۔

نزائن مجھے بہت پسند ہے۔ اسٹوڈیو کی زندگی کے جواصول اس نے اپنے لیے وضع کر کرکے ہیں، مجھے ابھے لگتے ہیں۔

(۱) ایکٹر جب تک ایکٹر ہے، اسے شادی نہیں کرنی چاہیے۔ شادی کر لے تو فوراً فلم کو طلاق دے کر دودھ دہی کی دکان کھول لے۔ اگر مشہور ایکٹر رہا تو کافی آدمی ہو جایا کرے گی۔

(۲) کوئی ایکٹر س تھمیں بھیا یا بھائی صاحب کہے تو فوراً اس کے کان میں کھو، آپ کی انگلیاں کاسائز کیا ہے۔

(۳) کسی ایکٹر س پر اگر تمہاری طبیعت آگئی ہے تو تمہیدیں باندھنے میں وقت ضائع نہ کرو۔ اس سے تخلیے میں ملوادر کہو کہ میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں، اس کا یقین نہ آئے تو پوری جیب باہر نکال کر دکھادو۔

(۴) اگر کوئی ایکٹر س تمہارے حصے میں آجائے تو اس کی آدمی میں سے ایک پیسہ بھی نہ لو۔ ایکٹر سوں کے شوہروں اور بھائیوں کے لیے یہ پیسہ حلال ہے۔

(۵) اس بات کا خیال رکھنا کہ ایکٹر س کے بطن سے تمہاری کوئی اولاد نہ ہو۔ سوراج ملنے کے بعد البتہ تم اس کی اولاد پیدا کر سکتے ہو۔

(۶) یاد رکھو کہ ایکٹر کی بھی عاقبت ہوتی ہے۔ اسے ریزراور سٹھن سے سنوارنے کے بجائے کبھی کبھی غیر مہذب طریقے سے بھی سنوارنے کی کوشش کیا کرو، مثال کے طور پر کوئی نیک کام کر کے۔

(۷) اسٹوڈیو میں سب سے زیادہ احترام پڑھان چوکیدار کا کرو۔ صحیح اسٹوڈیو میں آتے وقت اسے سلام کرنے سے تمہیں فائدہ ہو گا۔ یہاں نہیں تو دوسرا دنیا میں، جہاں فلم کمپنیاں نہیں ہوں گی۔

(۸) شراب اور ایکٹر س کی عادت ہر گز نہ ڈالو۔ بہت ممکن ہے کہ کسی روز کا نگر میں گور نمنٹ لہر میں آکر یہ دونوں چیزیں منوع قرار دے دے۔

(۹) سوداگر، مسلمان سوداگر ہو سکتا ہے۔ لیکن ایکٹر ہندو ایکٹر، یا مسلم ایکٹر نہیں ہو سکتا۔

(۱۰) جھوٹ نہ بولو۔

یہ سب باتیں ”زائن کے دس احکام“ کے عنوان تسلی اس نے اپنی ایک نوٹ بک میں لکھ رکھی ہیں جن سے اس کے کیریکٹر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ان سب پر عمل نہیں کرتا۔ مگر یہ حقیقت نہیں۔ سعید اور زائن کے متعلق جو میرے خیالات تھے۔ میں نے جانکی کے پوچھے بغیر اشارہ بتا دیے اور آخر میں اس سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اگر تم اس لائن میں آگئیں تو کسی نہ کسی مرد کا سہارا تمہیں لینا ہی پڑے گا۔ زائن کے متعلق میرے خیال ہے کہ اچھادوست ثابت ہو گا۔

میرا مشورہ اس نے سن لیا اور بے چلی گئی۔ دوسرے روز خوش خوش واپس آئی کیونکہ زائن نے اپنے استوڈیو میں ایک سال کے لیے پانچ سو روپے ماہوار پر اسے ملازم کر دیا تھا۔ یہ ملازمت اسے کیسی ملی، دیر تک اس کے متعلق باتیں ہوئیں۔ جب اور کچھ سننے کو نہ رہا تو میں نے اس سے پوچھا، ”سعید اور زائن، دونوں سے تمہاری ملاقات ہوئی، ان میں سے کس کو تم نے زیادہ پسند کیا؟“

جانکی کے ہونٹوں پر ہلکی مسکر اہٹ پیدا ہوئی۔ لغزش بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے اس نے کہا، ”سعید صاحب کو۔“ یہ کہہ کروہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی، ”سعادت صاحب، آپ نے کیوں اتنے پل باندھے تھے زائن کی تعریفوں کے؟“

میں نے پوچھا، ”کیوں؟“

”بڑا ہی وابحیات آدمی ہے۔ شام کو باہر کر سیاں بچھا کر سعید صاحب اور وہ شراب پینے کے لیے بیٹھے تو باتوں باتوں میں میں نے زائن بھیا کہا۔ اپنا منہ میرے کان کے پاس لا کر پوچھا۔ ”تمہاری انگلیا کا سائز کیا ہے۔۔۔؟ بھگوان جانتا ہے میرے تن بدن میں تو آگ ہی لگ گئی۔۔۔ کیسا لچر آدمی ہے۔“ جانکی کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔

میں زور زور سے ہنسنے لگا۔

اس نے نیزی سے کہا، ”آپ کیوں ہنس رہے ہیں؟“

”اس کی بیوی توفی پر۔“ یہ کہہ کر میں نے ہنسنا بند کر دیا۔

تھوڑی دیر نزائن کو بر اجلا کہنے کے بعد جانکی نے عزیز کے متعلق فکر مند لمحے میں با تین شروع کر دیں۔ کئی دنوں سے اس کا خطا نہیں آیا تھا۔ اس لیے طرح طرح کے خیال اسے ستار ہے تھے۔ کہیں انھیں پھر زکام نہ ہو گیا ہو۔ اندھاد ہند سائکل چلاتے ہیں، کہیں حادثہ ہی نہ ہو گیا ہو۔ پوناہی نہ آرہے ہوں، کیونکہ جانکی کو رخصت کرتے وقت انھوں نے کہا تھا ایک روز میں چپ چاپ تمہارے پاس چلا آؤں گا۔

باتیں کرنے کے بعد اس کا ترد کم ہوا تو اس نے عزیز کی تعریفیں شروع کر دیں۔ گھر میں بچوں کا بہت نیاں رکھتے ہیں۔ ہر روز صبح ان کو ورزش کرتے ہیں اور نہلا دھلا کر اسکول چھوڑنے جاتے ہیں۔ بیوی بالکل پھوہڑ ہے، اس لیے رشتہ داروں سے سمارا کھر کھاؤ خود انھیں کو کرنا پڑتا ہے۔ ایک دفعہ جانکی کو ٹائی فائٹ ہو گیا تھا تو ہیں دن تک متواتر نسوان کی طرح اس کی تیارداری کرتے رہے وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے روز مناسب و موزوں الفاظ میں میرا شگریہ ادا کرنے کے بعد وہ بمبئی چلی گئی۔ جہاں اس کے لیے ایک نئی اور چمکیلی دنیا کے دروازے کھل گئے تھے۔

پونا میں مجھے تقریباً دو مہینے کہانی کا منتظر نامہ تیار کرنے میں لگے۔ حق الخذ مت وصول کر کے میں نے بمبئی کارخ کیا جہاں مجھے ایک نیا کونٹریکٹ مل رہا تھا۔ میں صبح پانچ بجے کے قریب اندر ہیری پہنچا جہاں ایک معمولی بیٹگلے میں سعید اور نزائن دونوں اکٹھے رہتے تھے۔ برآمدے میں داخل ہوا دروازہ بند پایا۔ میں نے سوچا سور ہے ہوں گے، تکلیف نہیں دینا چاہیے۔ پچھلی طرف ایک دروازہ ہے جو نوکروں کے لیے اکثر کھلارہتا ہے، میں اس میں سے اندر داخل ہوا۔ باورچی خانہ اور ساتھ والا کمرہ جس میں کھانا کھایا جاتا ہے، حسب معمول بے حد غلیظ تھے۔ سامنے والا کمرہ مہماںوں کے لیے مخصوص تھا۔ میں نے اس کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ کمرے میں دو پینگ تھے۔ ایک پر سعید اور اس کے ساتھ کوئی اور لحاف اوڑھے سورہ تھا۔

مجھے سخت نیند آرہی تھی۔ دوسرے پینگ پر میں کپڑے اتارے بغیر لیٹ گیا۔ پانچ پر کمبل پڑا تھا۔ یہ میں نے ٹال گوں پر ڈال لیا۔ سونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ سعید کے پیچھے سے ایک چوڑیوں والا ہاتھ نکلا اور پینگ کے پاس رکھی ہوئی کرسی کی طرف بڑھنے لگا۔ کرسی پر لٹھے کی سفید شلوار لٹک رہی تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سعید کے ساتھ جانکی لیٹی تھی۔ میں نے کرسی پر سے شلوار اٹھائی اور اس کی طرف پھینک دی۔

زائن کے کمرے میں جا کر میں نے اسے جگایا۔ رات کے دو بجے اس کی شوٹنگ ختم ہوئی تھی، مجھے افسوس ہوا کہ خواہ اس غریب کو جگایا۔ لیکن وہ مجھ سے با تین کرنا چاہتا تھا۔ کسی خاص موضوع پر نہیں۔ مجھے اچانک دیکھ کر بقول اس کے وہ کچھ بیہودہ بکواس کرنا چاہتا تھا، چنانچہ صحیح نوبت تک ہم بیہودہ بکواس میں مشغول رہے جس میں بار بار جائی کا بھی ذکر آیا۔

جب میں نے انگیوالی بات چھیری تو زائن بہت ہنسا۔ ہنسنے ہنسنے اس نے کہا، ”سب سے مزے دار بات تو یہ ہے کہ جب میں نے اس کے کان کے ساتھ منہ لگا کر پوچھا۔ تمہاری انگیوالا سائز کیا ہے تو اس نے بتا دیا؟ کہا، ”پھو بیس۔“

”اس کے بعد اچانک اسے میرے سوال کی بیہودگی کا احساس ہوا۔ مجھے کو سنا شروع کر دیا۔ بالکل بچھی ہے۔ جب کبھی مجھ سے مذکور ہوتی ہے تو سینے پر دوپٹہ رکھ لیتی ہے۔ لیکن منٹو! بڑی وفادار عورت ہے۔“

میں نے پوچھا، ”یہ تم نے کیسے جانا؟“

زائن مسکرا یا، ”عورت، جو ایک بالکل اجنی آدمی کو اپنی انگیوالا صحیح سائز بتا دے، دھو کے باز ہرگز نہیں ہو سکتی۔“

عجیب و غریب منطق تھی۔ لیکن زائن نے مجھے بڑی سنجیدگی سے یقین دلایا کہ جانکی بڑی پر خلوص عورت ہے۔ اس نے کہا، ”منٹو تمہیں معلوم نہیں سعید کی کتنی خدمت کر رہی ہے۔ ایسے انسان کی خبر گیری جو پر لے درجے کا بے پرواہ، آسان کام نہیں۔ لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ جائیکی اس مشکل کو بڑی آسانی سے نجھا رہی ہے۔ عورت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک پر خلوص اور ایماندار آیا بھی ہے۔ صحیح اٹھ کر اس خردات کو جگانے میں آدھا گھنٹہ صرف کرتی ہے۔ اس کے دانت صاف کرتی ہے، کپڑے پہناتی ہے، ناشستہ کرتی ہے اور رات کو جب وہ رمپی کر بستر پر لیٹتا ہے تو سب دروازے بند کر کے اس کے ساتھ لیٹ جاتی ہے۔۔۔ اور جب اسٹوڈیو میں کسی سے ملتی ہے تو صرف سعید کی باتیں کرتی ہیں۔ سعید صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ سعید صاحب بہت اچھا گاتے ہیں۔ سعید صاحب کا وزن بڑھ گیا ہے۔ سعید صاحب کا پل اور تیار ہو گیا ہے۔ سعید صاحب کے لیے پشاور سے پوٹھوہاری سینٹل منگوائی ہے۔ سعید صاحب کے سر میں ہاکا ہاکا درد ہے۔ ایپر و لینے جا رہی ہوں۔ سعید صاحب نے آج مجھ پر ایک شعر کہا۔ اور جب مجھ سے مذکور ہوتی ہے تو انگیوالی بات یاد کر کے تیوری چڑھا لیتی ہے۔“

میں تقریباً دن سعید اور نرائن کا مہمان رہا۔ اس دوران میں سعید نے جانکی کے متعلق مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ شاید اس لیے کہ ان کا معاملہ کافی پر انا ہو چکا تھا۔ جانکی سے البتہ کافی باتیں ہوئیں۔ وہ سعید سے بہت خوش تھی لیکن اسے اس کی بے پرواٹیت کا بہت گلہ تھا، ”سعادت صاحب! اپنی صحت کا بالکل ہی خیال نہیں رکھتے۔ بہت بے پرواہیں۔ ہر وقت سوچنا، جو ہوا اس لیے کسی بات کا خیال ہی نہیں رہتا۔ آپ نہیں گے، لیکن مجھے ہر روزان سے پوچھنا پڑتا ہے کہ آپ سنڈاں گئے تھے یا نہیں؟“

نرائن نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا، ٹھیک لکلا۔ جانکی ہر وقت سعید کی خبر گیری میں منہمک رہتی تھی۔ میں دس دن اندر ہیری کے بنگلے میں رہا۔ ان دس دنوں میں جانکی کی بے لوث خدمت نے مجھے بہت متاثر کیا۔ لیکن یہ خیال بار بار آتا رہا کہ عزیز کا کیا ہوا۔ جانکی کو اس کا بھی تو بہت خیال رہتا تھا۔ کیا سعید کو پا کروہ اس کو بھول چکی تھی۔

میں نے اس سوال کا جواب جانکی ہی سے پوچھ لیا ہوتا اگر میں کچھ دن اور وہاں ٹھہرتا۔ جس کمپنی سے میرا کونٹریکٹ ہونے والا تھا، اس کے مالک سے میری کسی بات پر بچنے ہو گئی اور میں داماغی تکدر در در کرنے کے لیے پوناچلا گیا۔ دو ہی دن گزرے ہوں گے کہ بیسے عزیز کا تار آیا کہ میں آ رہا ہوں۔ پانچ چھ گھنٹے کے بعد وہ میرے پاس تھا۔ اور دوسرے روز صبح سویرے جانکی میرے کمرے پر دستک دے رہی تھی۔

عزیز اور جانکی جب ایک دوسرے سے ملے تو انہوں نے دیر سے نچھڑے ہوئے عاشق معموق کی سرگرمی ظاہر نہ کی۔ میرے اور عزیز کے تعلقات شروع سے بہت سمجھیدہ اور متین رہے ہیں، شاید اسی وجہ سے وہ دونوں معتدل رہے۔

عزیز کا خیال تھا ہو ٹل میں اٹھ جائے لیکن میرا دوست جس کے یہاں میں ٹھہر اتھا، آٹھ ڈور شوٹنگ کے لیے کوہاپور گیا تھا، اس لیے میں نے عزیز اور جانکی کو اپنے پاس ہی رکھا۔ تین کمرے تھے۔ ایک میں جانکی سو سکتی تھی، دوسرے میں عزیز۔ یوں تو مجھے ان دونوں کو ایک ہی کمرہ دینا چاہیے تھا لیکن عزیز سے میری اتنی بے تکلفی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اس نے جانکی سے اپنے تعلق کو مجھ پر ظاہر بھی نہیں کیا تھا۔

رات کو دونوں سینما دیکھنے چلے گئے۔ میں ساتھ نہ گیا، اس لیے کہ میں فلم کے لیے ایک نئی کہانی شروع کرنا چاہتا تھا۔ دو بجے تک میں جا گتا رہا۔ اس کے بعد سو گیا۔ ایک چابی میں نے عزیز کو دے دی تھی۔ اس لیے مجھے ان کی طرف سے اطمینان تھا۔

رات کو میں چاہیے، بہت دیر تک کام کروں، ساڑھے تین اور چار بجے کے درمیان ایک دفعہ ضرور جا گتا ہوں اور اٹھ کر پانی پیتا ہوں۔ حسب عادت اس رات کو بھی میں پانی پینے کے لیے اٹھا۔ اتفاق سے جو کمرہ میرا تھا، یعنی جس میں میں نے اپنابستر جمایا ہوا تھا، عزیز کے پاس تھا اور

اس میں میری صراحی پڑی تھی۔ اگر مجھے شدت کی پیاس نہ لگی ہوتی تو عزیز کو تکلیف نہ دیتا۔ لیکن زیادہ و سکی پینے کے باعث میر احتق باکل خشک ہو رہا تھا، اس لیے مجھے دستک دینی پڑی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ جانکی نے آنکھیں ملتے دروازہ کھولا اور کہا، ”سعید صاحب!“ اور جب مجھے دیکھا تو ایک بُلکی سی ”اوہ“ اس کے منہ سے نکل گئی۔ اندر کے پلنگ پر عزیز سورہ تھا۔ میں بے اختیار مسکرا یا۔ جانکی بھی مسکرائی اور اس کے تیکھے ہونٹ ایک کونے کی طرف سکڑ گئے۔ میں نے پانی کی صراحی لی اور چلا آیا۔

صحیح اٹھاؤ کمرے میں دھواں جمع تھا۔ باورچی خانے میں جا کر دیکھا تو جانکی کاغذ جلا جلا کر عزیز کے غسل کے لیے پانی گرم کر رہی تھی۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور انگدی بھی میں پھونکنیں مارتی ہوئی کہنے لگی، ”عزیز صاحب ٹھنڈے پانی سے نہائیں تو انھیں زکام ہو جاتا ہے۔ میں نہیں تھی پشاور میں تو ایک مہینہ بیمار رہے، اور رہتے بھی کیوں جب دو اپنی ہی چھوڑ دی تھی۔۔۔ آپ نے دیکھا نہیں کتنے دلے ہو گئے ہیں۔“

اور عزیز نہاد ہو کر جب کسی کام کی غرض سے باہر گیا تو جانکی نے مجھ سے سعید کے نام تارکھنے کے لیے کہا، ”مجھے کل یہاں پہنچتے ہی انھیں تار بھیجننا چاہیے تھا۔ لتنی غلطی ہوئی مجھ سے۔ انھیں بہت تشویش ہو رہی ہو گی۔“ اس نے مجھ سے تار کا مضمون بنوایا جس میں اپنی بخیریت پہنچنے کی اطلاع تو تھی لیکن سعید کی خیریت دریافت کرنے کا اضطراب زیادہ تھا۔ نجاشن لگوانے کی تاکید بھی تھی۔

چار روز گزر گئے۔ سعید کو جانکی نے پانچ تار روانہ کیے پر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ بے جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اچانک شام کو عزیز کی طبیعت خراب ہو گئی۔ مجھ سے سعید کے نام ایک اور تار لکھوا کر وہ ساری رات عزیز کی تیارداری میں مصروف رہی۔ معمولی بخار تھا لیکن جانکی کو بے حد تشویش تھی۔ میر اخیال ہے اس تشویش میں سعید کی خاموشی کا پیدا کر دہ وہ اضطراب بھی شامل تھا۔ وہ مجھ سے اس دوران میں کئی بار کہہ چکی تھی، ”سعادت صاحب میر اخیال ہے سعید صاحب ضرور بیمار ہیں ورنہ وہ مجھے میرے تاروں اور خطوط کا جواب ضرور لکھتے۔“

پانچویں روز شام کو، عزیز کی موجودگی میں سعید کا تار آیا جس میں لکھا تھا میں بہت بیمار ہوں فوراً چلی آؤ۔ تار آنے سے پہلے جانکی میری کسی بات پر بے تحاشاہنس رہی تھی۔ لیکن جب اس نے سعید کی بیماری کی خبر سنی تو ایک دم خاموش ہو گئی۔ عزیز کو یہ خاموشی بہت ناگوار معلوم ہوئی کیونکہ جب اس نے جانکی کو مخاطب کیا تو اس کے لمحے میں تیزی تھی۔ میں اٹھ کر چلا گیا۔

شام کو جب واپس آیا تو جانکی اور عزیز کچھ اس طرح علاحدہ علاحدہ بیٹھے تھے جیسے ان میں کافی بھگڑا ہو چکا ہے۔ جانکی کے گالوں پر آنسوؤں کا میل تھا جب میں کمرے میں داخل ہوا تو ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جانکی نے اپنا بینڈ بیگ اٹھایا اور عزیز سے کہا، ”میں جاتی ہوں، لیکن بہت جلد واپس آجائوں گی۔“ پھر مجھ سے مناطب ہوئی، ”سعادت صاحب ان کا نیاں رکھیے، ابھی تک بخار دور نہیں ہوا۔“

میں اسٹیشن تک اس کے ساتھ گیا۔ بلیک مارکیٹ سے ٹکٹ خرید کر اسے گاڑی پر بٹھایا اور گھر چلا آیا۔ عزیز کو ہلکا ہلکا بخار تھا۔ ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے لیکن جانکی کا ذکر نہ آیا۔

تیسرا روز صبح سڑھے پانچ بجے کے قریب مجھے باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد جانکی کی۔ جلدی جلدی لفظوں کو اوپر تلتے کرتی ہوئی وہ عزیز سے پوچھ رہی تھی کہ اس کی طبیعت اب کیسی ہے اور کیا اس کی غیر موجودگی میں اس نے باقاعدہ دو اپی تھی یا نہیں۔ عزیز کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچی لیکن آدھ گھنٹے بعد جب کہ نیند سے میری آنکھیں مندر رہی تھیں، عزیز کی خفگی آمیز باتوں کا دبادبا شور سنائی دیا۔ سمجھ میں تو پچھنہ آیا لیکن اتنا پتہ چل گیا کہ وہ جانکی سے اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔

صبح دس بجے عزیز نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور جانکی کا گرم کیا ہوا پانی ویسے ہی غسل خانے میں پڑا رہا۔ جب میں نے جانکی سے اس بات کا ذکر کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ نہاد ہو کر عزیز باہر چلا گیا۔ جانکی کمرے میں پلٹنگ پر لیٹی رہی۔ سہ پہر کو تین بجے کے قریب جب میں اس کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ اسے بہت تیز بخار ہے۔ ڈاکٹر بلانے کے لیے باہر نکلا تو عزیز اسکے میں اس باب رکھوا رہا تھا۔ میں نے پوچھا، ”ہماں جا رہے ہو۔ تو اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا، ببے! انشاء اللہ پھر ملاقات ہو گی۔“ یہ کہہ کر وہ اسکے میں بیٹھا اور چلا گیا۔ مجھے یہ بتانے کا موقع ہی نہ ملا کہ جانکی کو بہت تیز بخار ہے۔

ڈاکٹر نے جانکی کو اچھی طرح دیکھا اور مجھے بتایا کہ اسے برونا کا مٹس ہے، اگر احتیاط نہ بر قی تو نمونیا ہونے کا خطرہ ہے۔ ڈاکٹر نسخہ دے کر چلا گیا تو جانکی نے عزیز کے بارے میں پوچھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے نہ بتاؤں لیکن چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا، اس لیے میں نے کہہ دیا کہ چلا گیا ہے۔ یہ سن کر اسے بہت صدمہ ہوا۔ دیر تک وہ تینیے میں سردے کر روتی رہی۔

دوسرے روز صبح گیارہ بجے کے قریب جب کہ جانکی کا بخار ایک ڈگری ہلکا تھا اور طبیعت بھی کسی قدر درست تھی، ببے سے سعید کا تار آیا جس میں بڑے درشت لفظوں میں لکھا تھا، ”یاد رہے کہ تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔“ میں بہت منع کر تارہ لیکن وہ تیز بخار ہی میں پونا ایک پریس سے ببے روانہ ہو گئی۔

پانچ چھ دنوں کے بعد نرائن کا تار آیا، ”ایک ضروری کام ہے، فوراً بے چلے آؤ۔“ میر اخیال تھا کہ کسی پروڈیوسر سے اس نے میرے کو نظر یکٹ کی بات کی ہو گی، لیکن بے پہنچ کر معلوم ہوا کہ جائیکی کی حالت بہت نازک ہے۔ برونا کا ٹسٹ گلٹ کر نمویا میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ جب وہ پونا سے بے پہنچی تھی تو انہی ہیری جانے کے لیے چلتی ٹرین میں چڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے گر پڑی تھی جس کے باعث اس کی دونوں رانیں بہت بری طرح چھل گئی تھیں۔

جائیکی نے اس جسمانی تکلیف کو بڑی بہادری سے برداشت کیا۔ لیکن جب وہ انہی ہیری پہنچی اور سعید نے اس کے بندھے ہوئے اسباب کی طرف اشارہ کر کے کہا، ”مہربانی کر کے یہاں سے چلی جاؤ۔“ تو اسے بہت روحانی تکلیف ہوئی۔ نرائن نے مجھے بتایا، ”سعید کے منہ سے یہ برف جیسے ٹھنڈے لفظ سن کرو وہ ایک لمحے کے لیے بالکل پتھر ہو گئی۔ میر اخیال ہے اس نے تھوڑی دیر کے بعد یہ ضرور سوچا ہو گا میں گاڑی کے نیچے آکر کیوں نہ مر گئی۔ سعادت تم کچھ بھی کہو مگر سعید عورتوں سے جیسا سلوک کرتا ہے بہت ہی نامردانہ ہے۔ بے چاری کو بخار تھا۔ چلتی ریل سے گر پڑی تھی اور وہ بھی اس خرذات کے پاس جلدی پہنچنے کے باعث۔۔۔ لیکن اس نے ان بالتوں کا خیال ہی نہ کیا اور ایک بار پھر اس سے کہا۔ مہربانی کر کے یہاں سے چلی جاؤ۔۔۔ اس کے لمحے میں منٹو، کسی جذبے کا اظہار نہیں تھا۔ بس ایسا تھا جیسے لاکینوٹاپ مشین سے اخبار کی ایک سطر ڈھل کر باہر نکل آئے۔ مجھے بہت دکھ ہوا، چنانچہ میں وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ شام کو جب واپس آیا تو جائیکی موجود نہیں تھی لیکن سعید پنگ پر بیٹھا، رم کا گلاس سامنے رکھے ایک نظم لکھنے میں مصروف تھا۔

میں نے اس سے کوئی بات نہ کی اور اپنے کمرے میں چلا گیا دوسرا روز اسٹوڈیو سے معلوم ہوا کہ جائیکی ایک اکٹھراٹ کی کے گھر خطرناک حالت میں پڑی ہے۔ میں نے اسٹوڈیو کے مالک سے بات کی اور اسے ہسپتال بھجوادیا۔ کل سے وہیں ہے، بتاؤ اب کیا کیا جائے۔ میں تو اسے دیکھنے جانیں سکتا اس لیے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔۔۔ تم جاؤ اور دیکھ کر آؤ کس حالت میں ہے؟“

میں ہسپتال گیا تو اس نے سب سے پہلے عزیز اور سعید کے متعلق پوچھا۔ جو سلوک ان دونوں نے اس کے ساتھ کیا تھا، اس کے بعد اس کے پر خلوص استفسار نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کی حالت نازک تھی۔ ڈاکٹروں نے مجھے بتایا کہ دونوں پھیپھڑوں پر دروم ہے اور جان کا خطروہ ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ جائیکی اتنی بڑی تکلیف مردانہ وار برداشت کر رہی تھی۔ ہسپتال سے لوٹا اور اسٹوڈیو میں نرائن کو تلاش کیا تو معلوم ہوا وہ صحیح ہی سے غائب ہے۔ شام کو جب وہ گھر واپس آیا تو اس نے مجھے تین چھوٹی چھوٹی شیشیاں دکھائیں جن کا منہ ربرٹ سے بند تھا، ”جانتے ہو یہ کیا ہے؟“

میں نے کہا، ”معلوم نہیں، انجکشن سے لگتے ہیں۔“

نرائی مسکراایا، ”انجکشن ہی ہیں لیکن پنسلین کے۔“

مجھے سخت حیرت ہوئی کیونکہ پنسلین اس وقت بہت ہی قلیل مقدار میں تیار ہوتی تھی۔ امریکہ اور انگلستان میں جتنی بنتی ہے، تھوڑی تھوڑی ملٹری ہسپتاں میں تقسیم کردی جاتی تھی۔ چنانچہ میں نے نرائی سے پوچھا، ”یہ تو بالکل نایاب چیز ہے، تمہیں کیسے مل گئی؟“ اس نے مسکرا کر جواب دیا، ”بچپن میں گھر کی تجویز کھول کر روپے چرانا میرے باعث ہاتھ کا کام تھا۔ آج دائیں ہاتھ سے ملٹری ہو سپٹل کار یونیورسٹری کھول کر میں نے یہ تین بلب چڑائے ہیں۔۔۔ چلو جلدی کرو جائیں کو ہسپتال سے ہوٹل میں لے چلیں۔“

ٹیکسی لے کر میں ہسپتال گیا اور جانکی کو اس ہوٹل میں لے گیا جس میں نرائی دوکروں کا پہلے ہی بندوبست کر چکا تھا۔ جانکی نے مجھ سے کئی بار نحیف آواز میں پوچھا کہ میں اسے ہوٹل میں کیوں لا یا ہوں۔ ہر بار میں نے یہی جواب دیا، ”تمہیں معلوم ہو جائے گا۔“ اور جب اسے معلوم ہوا، یعنی جب نرائی سرخ ہاتھ میں لیے اسے ٹیکہ لگانے کے لیے اس کمرے میں آیا تو نفرت سے ایک طرف اس نے منہ پھیر لیا اور مجھ سے کہا، ”سعادت صاحب، اس سے کہنے چلا جائے یہاں سے۔“

نرائی مسکراایا، ”جانِ من غصہ تھوک دو۔ یہاں تمہاری جان کا سوال ہے۔“ جانکی کو طیش آگیا۔ نفاہت کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گئی، ”سعادت صاحب، میں جاتی ہوں یہاں سے یا آپ اس حرام خور کو نکالیے باہر۔“

نرائی نے دھکا دے کر اسے لٹا دیا اور مسکراتے ہوئے کہا، ”یہ حرام زادہ تمہیں انجکشن لگا کر ہی رہے گا۔۔۔ خبردار جو تم نے مراحت کی۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک ہاتھ سے مضبوطی کے ساتھ جانکی کا بازو پکڑا، سرخ مجھے دے کر اس نے اسپرٹ میں روئی بھگوئی اور اس کا ڈنٹر صاف کیا۔ اس کے بعد روئی مجھے دے کر اس نے سرخ کی سوئی اس کے بازو کی مچھلی میں داخل کر دی وہ چیزیں، لیکن پنسلین اس کے جسم میں جا چکی تھی۔ جب نرائی نے جانکی کا بازو اپنی مضبوط گرفت سے علاحدہ کیا تو اس نے رونا شروع کر دیا۔ نرائی نے اس کی بالکل پرواہ کی اور اسپرٹ لگی روئی سے انجکشن والا حصہ پوچھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

پہلا انجکشن رات کے نوبے دیا تھا۔ دوسرا تین گھنٹے بعد دینا تھا۔ نرائی نے مجھے بتایا اگر تین کے ساتھے تین گھنٹے ہو گئے تو پنسلین کا اثر بالکل زائل ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ جاگتا رہا، تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اس نے اسٹووجلایا، سرخ ابالی اور اس میں دوا بھری۔ جانکی خر خراہٹ بھرے

سانس لے رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ زرائن نے دوسرے بازو کو اسپرٹ سے صاف کیا اور سرخ کی سوئی اندر کھبودی۔ جانکی کے ہونٹوں سے پتلی سی چیز نکلی۔ زرائن نے دوا جسم کے اندر بھیج کر سوئی باہر نکالی اور اسپرٹ سے انجکشن والی جگہ صاف کرتے ہوئے مجھ سے کہا، ”اب تیسرا تین بجے۔“

مجھے معلوم نہیں اس نے تیسرا اور چوتھا انجکشن کب دیا۔ لیکن جب بیدار ہوا تو اسٹوو جلنے کی آواز آرہی تھی اور زرائن ہوٹل کے بیرون سے برف کے لیے کہہ رہا تھا کیونکہ اسے پنسلین کو ٹھنڈا رکھنا تھا۔

نوبجے پانچواں انجکشن دینے کے لیے جب ہم دونوں جانکی کے کمرے میں گئے تو وہ آنکھیں کھولے لیٹی تھی۔ اس نے نفرت بھری نگاہوں سے زرائن کی دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔ زرائن مسکرایا، ”کیوں جان من! کیا حال ہے؟“

جانکی خاموش رہی۔

زرائن اس کے پاس کھڑا ہو گیا، ”یہ انجکشن جو میں تمہیں دے رہا ہوں عشق کے انجکشن نہیں۔ تمہارا نمونیہ دور کرنے کے انجکشن ہیں جو میں نے ملٹری ہوسپیٹ سے بڑی صفائی کے ساتھ چڑائے ہیں۔ اب ذرا الٹی لیٹ جاؤ اور کوئی پرسے شلوار کو ذرا نیچے کھسکا دو۔۔۔ کبھی لیا ہے یہاں انجکشن؟“ یہ کہہ کر اس نے جانکی کے کوئی پر ایک جگہ گوشت کے اندر انگلی کھبوئی جانکی کی آنکھوں میں مرعوب سی نفرت پیدا ہوئی۔ جب اس نے کروٹ بدلتے تو زرائن نے کہا، ”شتابش!“ پیشتر اس کے کہ جانکی کوئی مزاحمت کرے زرائن نے ایک ہاتھ سے اس کی شلوار نیچے کھسکائی اور مجھ سے کہا، ”اسپرٹ لگاؤ!“ جانکی نے ٹانگیں چلانا شروع کیں تو زرائن نے کہا، ”جانکی! ٹانگیں وانگیں مت چلاو۔۔۔ میں انجکشن لگا کے رہوں گا۔“ غرضیکہ پانچواں انجکشن دے دیا گیا۔ پندرہ اور باقی تھے جو زرائن کو ہر تین گھنٹے کے بعد دینے تھے اور یہ پینتالیس گھنٹے کا کام تھا۔

پانچاں انجکشن سے گو جانکی کو ظاہر کوئی نمایاں فائدہ نہیں پہنچا تھا لیکن زرائن کو پنسلین کے اعجاز کا لیکھن تھا اور اسے پوری پوری امید تھی کہ وہ نکجھ جائے گی۔ ہم دونوں بہت دیر تک اس نئی دوا کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ گیارہ بجے کے قریب زرائن کا نوکر میرے نام ایک تارے کر آیا۔ پونا سے تھا۔ ایک فلم کمپنی نے مجھے فوراً بلا یا تھا اس لیے مجھے جانا پڑا۔

دس پندرہ دنوں کے بعد کمپنی ہی کے کام سے میں بہبیت آیا۔ کام ختم کر کے جب میں اندھیری پہنچا تو سعید سے معلوم ہوا کہ نرائن ابھی تک ہو ٹل ہی میں ہے۔ ہو ٹل بہت دور، شہر میں تھا اس لیے رات میں وہیں اندھیری میں رہا۔

صحح آٹھ بجے وہاں پہنچا تو نرائن کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر داخل ہوا تو کمرہ خالی پایا۔ دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا تو ایک دم آنکھوں کے سامنے کچھ ہوا۔ جانکی مجھے دیکھتے ہی لحاف کے اندر گھس گئی۔ اور نرائن جو اس کے ساتھ لیا تھا، مجھے واپس جاتے دیکھ کر کہا، ”آؤ منشو آؤ۔۔۔ میں ہمیشہ دروازہ بند کرنا بھول جاتا ہوں۔۔۔ آؤ یار۔۔۔ بیٹھو اس کرسی پر، لیکن یہ جانکی کی شلوار دے دینا۔“

-[58]-

گولی: سعادت حسن منٹو

شفقت دوپہر کو دفتر سے آیا تو گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے۔ عورتیں تھیں جو بڑے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ شفقت کی بیوی عائشہ ان کی مہمان نوازی میں مصروف تھی۔ جب شفقت صحن میں داخل ہوا تو اس کی بیوی باہر نکلی اور کہنے لگی، ”عزیز صاحب کی بیوی اور ان کی لڑکیاں آئی ہیں۔“

شفقت نے ہبیٹ اتار کر ماتھے کا پسینہ پوچھا، ”کون عزیز صاحب؟“

عائشہ نے آواز دبا کر جواب دیا، ”ہائے، آپ کے ابا جی کے دوست۔“

”اوہ۔۔۔ عزیز چچا۔“

”ہاں، ہاں وہی۔“

شفقت نے ذرا حیرت سے کہا، ”مگر وہ تو افریقہ میں تھے۔“

عاںشہ نے منہ پر انگلی رکھی، ”ذرا آہستہ بات کیجیے۔ آپ تو چلانا شروع کر دیتے ہیں۔۔۔ وہ افریقہ ہی میں تھے، لیکن جو افریقہ میں ہو کیا وہ اپنے نہیں آ سکتا۔“

لو، اب تم لگیں میں مجھ کرنے۔“

”آپ تو لڑنے لگے، عاںشہ نے ایک نظر اندر کمرے میں ڈالی، عزیز صاحب افریقہ میں ہیں، لیکن ان کی بیوی اپنی لڑکی کی شادی کرنے آئی ہیں۔ کوئی اچھا بڑھونڈ رہی ہیں۔“

اندر سے عزیز کی بیوی کی آواز آئی، ”عاںشہ تم نے روک کیوں لیا شفقت کو۔ آنے دو۔۔۔ آؤ شفقت بیٹا، آؤ۔۔۔ تمہیں دیکھے اتنی مدت ہو گئی ہے۔“

”آیا چھی جان“ شفقت نے ہیٹ اسٹینڈ کی کھوٹی پر رکھا اور اندر کمرے میں داخل ہوا، ”آداب عرض چھی جان۔“

عزیز کی بیوی نے اٹھ کر اس کو دعا کیں دیں، سر پر ہاتھ پھیرا اور بیٹھ گئی۔ شفقت بیٹھنے لگا تو اس نے دیکھا کہ سامنے صوفے پر دو گوری گوری لڑکیاں بیٹھی ہیں۔ ایک چھوٹی تھی، دوسرا بڑی۔ دونوں کی شکل آپس میں ملتی تھی۔ عزیز صاحب بڑے وجہہ آدمی تھے۔ ان کی یہ وجہت ان لڑکیوں میں بڑے دلکش طور پر تقسیم ہوئی تھی۔

آنکھیں ماں کی تھیں نیلی۔ بال بھورے اور کافی لمبے۔ دونوں کی دو چوٹیاں تھیں۔ چھوٹی کا چہرہ بڑی کے مقابلے میں زیادہ نکھرا ہوا تھا۔ بڑی کا چہرہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھا۔

ان کی ماں ان سے مخاطب ہوئی، ”بیٹا سلام کرو جائی کو۔“

چھوٹی نے اٹھ کر شفقت کو آداب عرض کیا۔ بڑی نے بیٹھے بیٹھے ذرا جھک کر کہا، ”تسیمات۔“

شفقت نے مناسب و موزوں جواب دیا۔ اس کے بعد عزیز صاحب اور افریقہ کے متعلق باقاعدہ کا لامناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ نیروی، ٹانگانیکا، دارالسلام، کراتینا، یونگنڈا، ان سب کی باتیں ہوئیں۔ کہاں کا موسم اچھا ہے، کہاں کا خراب ہے، پھل کہاں اچھے ہوتے ہیں۔۔۔ پھلوں کا ذکر چھپیر اتوچھوٹی نے کہا، ”یہاں ہندوستان میں تونہایت ہی ذلیل پھل ملتے ہیں۔“

”جی نہیں، بڑے اچھے پھل ملتے ہیں، بشرطیکہ موسم ہو۔“ شفقت نے اپنے ہندوستان کی آبرو بچانا چاہی۔

”غلط ہے۔“ چھوٹی نے ناک چڑھائی، ”امی جان، یہ جو کل آپ نے مارکٹ سے مالٹے لیے تھے، کیا وہاں کے مچنگوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔“

لڑکیوں کی ماں بولی، ”شفقت بیٹا، یہ صحیح کہتی ہے۔ یہاں کے مالٹے وہاں کے مچنگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

عاکشہ نے چھوٹی سے پوچھا، ”طلعت، یہ مچنگا کیا ہوتا ہے۔۔۔ نام تو بڑا عجیب و غریب ہے۔“

طلعت مسکرائی، ”آپ، ایک پھل ہے، مالٹے اور میٹھے کی طرح۔۔۔ اتنا لذیذ ہوتا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔۔۔ اور رس۔۔۔ ایک نچوڑ ریئے۔۔۔ یہ گلاس جو تپائی پر پڑا ہے، لمبا بھر جائے۔“

شفقت نے گلاس کی طرف دیکھا اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ پھل کتنا بڑا ہو گا، ”ایک مچنگ سے اتنا بڑا گلاس بھر جاتا ہے؟“

طلعت نے بڑے فخر یہ انداز میں جواب دیا، ”جی ہاں!“

شفقت نے یہ سن کر کہا، ”تو پھل یقیناً بہت بڑا ہو گا۔“

طلعت نے سر ہلایا، ”جی نہیں۔۔۔ بڑا ہوتا ہے نہ چھوٹا۔۔۔ بس آپ کے یہاں کے بڑے مالٹے کے برابر ہوتا ہے۔۔۔ یہی تو اس کی خوبی ہے کہ رس ہی رس ہوتا ہے اس میں۔۔۔ اور امی جان وہاں کا انناس۔۔۔ بڑی روٹی کے برابر اس کی ایک قاش ہوتی ہے۔“

دیر تک انس کی باتیں ہوتی رہیں۔ طاعت بہت باتوں تھی۔ افریقہ سے اس کو عشق تھا۔ وہاں کی ہر چیز اس کو پسند تھی۔ بڑی جس کا نام غمہت تھا، بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے گفتگو میں حصہ نہ لیا۔ شفقت کو جب محسوس ہوا کہ وہ خاموش بیٹھی رہی ہے تو وہ اس سے مخاطب ہوا، ”آپ کو غالباً ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

غمہت نے اپنے ہونٹ کھولے، ”جی نہیں۔۔۔ سنتی رہی ہوں بڑی دلچسپی سے۔“

شفقت نے کہا، ”لیکن آپ بولیں نہیں۔“

عزیز کی بیوی نے جواب دیا، ”شفقت بیٹا اس کی طبیعت ہی ایسی ہے۔“

شفقت نے ذرا بے تکلفی سے کہا، ”چھی جان۔۔۔ اس عمر میں لڑکیوں کو خاموشی پسند نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہو۔ پھر وہ غمہت سے مخاطب ہوا، ”جناب آپ کو بولنا پڑے گا۔“

غمہت کے ہونٹوں پر ایک شر میلی مسکراہٹ پیدا ہوئی، ”بول تو رہی ہوں بھائی جان۔“

شفقت مسکرا یا، ”تصویروں سے دلچسپی ہے آپ کو۔“

غمہت نے نگاہیں پنجی کر کے جواب دیا، ”جی ہے۔“

”تو اٹھیے میں آپ کو اپنا اہم دکھاؤ۔۔۔ دوسرے کمرے میں ہے۔ یہ کہہ کر شفقت اٹھا، ”چلیے۔“

عاشرہ نے شفقت کا ہاتھ دبایا۔ پلٹ کر اس نے اپنی بیوی کی طرف سوالیہ نظر وہ سے دیکھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا جسے شفقت نہ سمجھ سکا۔ وہ متیر تھا کہ خدا معلوم کیا بات تھی کہ اس کی بیوی نے اس کا ہاتھ دبایا اور اشارہ بھی کیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ طاعت کھٹ سے اٹھی، ”چلیے بھائی جان۔۔۔ مجھے دوسروں کے اہم دیکھنے کا شوق ہے۔۔۔ میرے پاس بھی ایک کوکشن ہے۔“

شفقت، طلعت کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ نگہت، خاموش بیٹھی رہی۔ شفقت، طلعت کو تصویریں دکھاتارہا، حسب عادت طلعت بولتی رہی۔ شفقت کا دماغ کسی اور طرف تھا۔ وہ نگہت کے متعلق سوچ رہا تھا کہ وہ اس قدر خاموش کیوں ہے۔ تصویریں دیکھنے اس کے ساتھ کیوں نہ آئی۔ جب اس نے اس کو چلنے کے لیے کہا تو عائشہ نے اس کا ہاتھ کیوں دبایا۔ اس اشارے کا کیا مطلب تھا جو اس نے آنکھوں کے ذریعے کیا تھا۔

تصویریں ختم ہو گئیں۔ طلعت نے الہم اٹھایا اور شفقت سے کہا، ”باجی کو دکھاتی ہوں۔ ان کو بہت شوق ہے تصویریں جمع کرنے کا۔“

شفقت پوچھنے ہی والا تھا کہ اگر ان کو شوق ہے تو وہ اس کے ساتھ کیوں نہ آئیں مگر طلعت الہم اٹھا کر کر کمرے سے نکل گئی۔ شفقت بڑے کمرے میں داخل ہوا تو نگہت بڑی دلچسپی سے الہم کی تصویریں دیکھ رہی تھیں۔ ہر تصویر اس کو مسرت پہنچاتی تھی۔

عائشہ لڑکیوں کی ماں سے باقی نہیں کرنے میں مشغول تھی۔ شفقت نکھیوں سے دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ جو پہلے ضرورت سے زیادہ سنجیدگی کی دھندر میں لپٹا تھا، اب بشاش تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ تصویریں جو آرت کا بہترین نمونہ تھیں اس کو راحت بخش رہی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں اب چمک تھی۔ لیکن جب ایک گھوڑے اور صحت مند عورت کی تصویر آئی تو یہ چمک ماند پڑ گئی۔ ایک ملکی سی آہ اس کے سینے میں لرزی اور وہیں دب گئی۔ تصویریں ختم ہوئیں تو نگہت نے شفقت کی طرف دیکھا اور بڑے پیارے انداز میں کہا، ”بھائی جان شکر یہ!“

شفقت نے الہم نگہت کے ہاتھ سے لیا اور میثیل پیس پر رکھ دیا۔ اس کے دماغ میں کھد بد ہو رہی تھی۔ اس کو ایسا لگتا تھا کہ کوئی بہت بڑا اسرار اس لڑکی کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس نے سوچا، شاید کوئی ناکمل رومان ہو، یا کوئی نفسیاتی حادثہ۔

چائے آئی تو شفقت، نگہت سے مخاطب ہوا، ”اٹھیے، چائے بنائیے۔۔۔ یہ پروٹ لیڈریز کا ہے۔“

نگہت خاموش رہی لیکن طلعت پھدک کر اٹھی، ”بھائی جان میں بنائی ہوں۔“

نگہت کا چہرہ پھر دھندر میں ملغوف ہو گیا۔ شفقت کا تجسس بڑھتا گیا۔ ایک بار جب اس نے غیر ارادی طور پر نگہت کو گھور کے دیکھا تو وہ ٹپٹا سی گئی۔ شفقت کو دل میں اس بات کا افسوس ہوا کہ اس نے کیوں ایسی نازیبا حرکت کی۔

چائے پر ادھر ادھر کی بے شمار باتیں ہوئیں۔ طلعت نے ان میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ ٹینس کا ذکر آیا تو اس نے شفقت کو بڑے فخر یہ انداز میں جو شیخی کی حد تک جا پہنچا تھا، بتایا کہ وہ نیر و بی میں نمبر ون ٹینس پلیسٹر تھی اور پندرہ میں کپ جیت چکی تھی۔۔۔ نگہت بالکل خاموش رہی، اس کی خاموشی بڑی ادا س تھی۔ صاف عیاں تھا کہ اس کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ خاموش ہے۔

ایک بات جو شفقت نے خاص طور پر نوٹ کی، یہ تھی کہ عزیز کی بیوی کی ممتاکارخ زیادہ تر نگہت کی طرف تھا۔ اس نے خود اٹھ کر بڑے پیار محبت سے اس کو کریم روں دیے۔ منہ پونچھنے کے لیے اپناروں وال دیا۔ اس سے کوئی بات کرتی تھی تو اس میں پیار بھی ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ باتوں کے ذریعے سے بھی اس کے سر پر محبت بھرا تھا پھیر رہی ہے یا اس کو چکار رہی ہے۔ رخصت کا وقت آیا تو عزیز کی بیوی اٹھی، بر قع اٹھایا، عائشہ سے گلے ملی۔ شفقت کو دعا میں دیں اور نگہت کے پاس جا کر آنکھوں میں آنسو لاد دینے والے پیار سے کہا، ”چلو بیٹا چلیں۔“

طلعت پھد کر اٹھی۔ عزیز کی بیوی نے نگہت کا ایک بازو تھا، دوسرا بازو طلعت نے کپڑا۔ اس کو اٹھایا گیا۔۔۔ شفقت نے دیکھا کہ اس کا نچلا دھڑک بالکل بے جان ہے۔۔۔ ایک لمحے کے لیے شفقت کا دل و دماغ ساکت ہو گیا جب وہ سنبھلاتوں سے اپنے اندر ایک ٹیک میں سی اٹھتی محسوس ہوئی۔

لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں پر ماں اور بہن کا سہارا لیے نگہت غیر یقینی قدم اٹھا رہی تھی۔ اس نے ماتھے کے قریب ہاتھ لے جا کر شفقت اور عائشہ کو آداب عرض کیا۔ کتنا پیار انداز تھا۔ مگر اس کے ہاتھ نے شفقت کے دل پر جیسے گھونسہ مارا۔۔۔ سارا اسرار اس پر واضح ہو گیا تھا۔ سب سے پہلا خیال اس کے دماغ میں یہ آیا، ”قدرت کیوں اتنی بے رحم ہے۔۔۔ ایسی پیاری لڑکی اور اس کے ساتھ اس تدر ظالمانہ بھیانہ سلوک۔۔۔ اس معصوم کا آخر گناہ کیا تھا۔ جس کی سزا اتنی کڑی دی گئی؟“

سب چلے گئے۔ عائشہ ان کو باہر تک چھوڑنے لگئی۔ شفقت ایک فلسفی بن کر سوچتا رہ گیا، اتنے میں شفقت کے دوست آگئے اور وہ بھی اپنی بیوی سے نگہت کے بارے میں کوئی بات نہ کر سکا۔۔۔ اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں ایسا مشغول ہوا کہ نگہت اور اس کے روگ کو بھول گیا۔ جب رات ہو گئی اور عائشہ نے اسے نوکر کے ذریعے سے کھانے پر بلوا یا تو اسے افسوس ہوا کہ اس نے محض ایک کھیل کی خاطر نگہت کو فراموش کر دیا، چنانچہ اس کا ذکر اس نے عائشہ سے بھی کیا، لیکن اس نے کہا، ”آپ کھانا کھائیے، مفصل باتیں پھر ہو جائیں گی۔“

میاں بیوی دونوں اکٹھے سوتے تھے۔ جب سے ان کی شادی ہوئی تھی وہ کبھی رات کو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے تھے، اور ان کی شادی کو قریب قریب چھ برس ہو گئے تھے، مگر اس دوران میں کوئی بچہ نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹروں کا یہ کہنا تھا کہ عائشہ میں کچھ قصور ہے جو صرف

آپریشن سے دور ہو سکتا ہے، مگر وہ اس سے بہت خائن تھی۔ میاں بیوی بہت پیار محبت کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے درمیان کوئی رنجش نہیں تھی۔

رات کو وہ اکٹھے لیتے۔ حسب معمول جب ایک دوسرے کے ساتھ لیئے تو شفقت کو نگہت یاد آئی۔ اس نے ایک آہ بھر کر اپنی بیوی سے پوچھا، ”عائشہ، مگہت بے چاری کو کیا روگ ہے؟“ عائشہ نے بھی آہ بھری اور بڑے افسوس ناک لجھے میں کہا، ”تین برس کی نئی منی بچی تھی کہ تپ پ مرقد ہوا۔ خلاصہ مفلوج ہو گیا۔“

شفقت کے دل میں نگہت کے لیے ہمدردی کا بے پناہ جذبہ پیدا ہوا۔ اس نے اپنی بیوی کی پیٹھ کو اپنے سینے کے ساتھ لگالیا اور کہا، ”عائشہ، خدا کیوں اتنا ظالم ہے؟“

عائشہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ شفقت کو دن کے واقعات یاد آنے لگے۔ جب میں نے اس سے کہا تھا کہ چلو، میں تمہیں ابم دکھاتا ہوں تو تم نے میرا ہاتھ اسی لیے دبایا تھا کہ---“

”ہاں ہاں، اور کیا---؟ آپ تو بار بار---“

”خدا کی قسم مجھے معلوم نہ تھا۔“

”اس کو اس کا بہت احساس ہے کہ وہ اپاٹج ہے۔“

”تم نے یہ کہا ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوا ہے کہ میرے سینے میں کسی نے تیر مارا ہے۔“

”جب وہ آئی، تو خدا کی قسم مجھے بہت دکھ ہوا۔۔۔ بے چاری کو پیشتاب کرنا تھا۔ ماں اور چھوٹی بہن ساتھ گئیں۔ ازابند کھولا۔۔۔ پھر بند کیا۔۔۔ کتنی خوب صورت ہے۔۔۔ بیٹھی ہو۔۔۔“

”تو خدا کی قسم بالکل پتا نہیں چلتا کہ فانچ زدہ ہے۔“

”بڑی ذہین لڑکی ہے۔“

”اچھا؟“

”ماں کہتی تھی کہ اس نے کہا تھا کہ امی جان میں شادی نہیں کروں گی، کنواری رہوں گی۔“

شفقت تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے انتہائی دکھ محسوس کرتے ہوئے کہا، ”تو اس کو اس بات کا احساس ہے کہ اس سے شادی کرنے کے لیے کوئی رضا مند نہیں ہو گا۔“

عاشرہ نے شفقت کی چھاتی کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا، ”شفقت صاحب کون شادی کرے گا ایک اپانج سے؟“

”نہیں نہیں، ایسا نہ کہو عاشرہ!“

”اتی بڑی قربانی کون کر سکتا ہے شفقت صاحب؟“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔“

”خوبصورت ہے، اچھے کھاتے پیتے ماں باپ کی لڑکی ہے۔۔۔ سب ٹھیک ہے، مگر۔۔۔“

”میں سمجھتا ہوں۔۔۔ لیکن۔۔۔“

”مردوں کے دل میں رحم کہاں؟“

شفقت نے کروٹ بدی، ”ایسا نہ کہو، عاشرہ!“

عاںشہ نے بھی کروٹ بدلتی۔ دونوں روپرو ہو گئے، ”میں سب جانتی ہوں، کوئی ایسا مرد ڈھونڈیے جو اس بیچاری سے شادی کرنے پر آمادہ ہو۔“

”مجھے معلوم نہیں، لیکن---“

”بڑی بہن ہے، غریب کو کتنا بڑا دکھ ہے کہ اس کی چھوٹی بہن کی شادی کی بات چیت ہو رہی ہے۔“

”صحیح کہتی ہو تم۔“

عاںشہ نے ایک بھی آہ بھری، ”کیا بے چاری اسی طرح ساری عمر کڑھتی رہے گی۔“

”نہیں!“ یہ کہہ کر شفقت اٹھ کر بیٹھ گیا۔

عاںشہ نے پوچھا، ”کیا مطلب؟“

”تمہیں اس سے ہمدردی ہے؟“

”کیوں نہیں؟“

”خدا کی قسم کھا کر کھو۔“

”ہائے، یہ بھی کوئی قسم کھلوانے کی بات ہے، ہر انسان کو اس سے ہمدردی ہونی چاہیے۔“

شفقت نے چند لمحات خاموش رہنے کے بعد کہا، ”تو میں نے ایک بات سوچی ہے؟“

عاںشہ نے خوش ہو کر کہا، ”کیا؟“

”مجھے ہمیشہ اس بات کا احساس رہا ہے تم بہت بلند خیال عورت ہو۔ آج تم نے میرے اس خیال کو ثابت کر دیا ہے۔۔۔ میں نے۔۔۔ خدا میرے اس ارادے کو استقامت بخشے۔۔۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ میں نگہت سے شادی کروں گا۔۔۔ سارا ثواب تمہیں ملے گا۔“

تحوڑی دیر خاموشی رہی، پھر ایک دم جیسے گولہ سا پھٹا۔۔۔

”شفقت صاحب! میں گولی مار دوں گی اسے، اگر آپ نے اس سے شادی کی۔“

شفقت نے ایسا محسوس کیا کہ اسے زبردست گولی لگی ہے۔ اور وہ مر کر اپنی بیوی کی آنکھ میں دفن ہو گیا ہے۔

- [59]-

پانچ دن: سعادت حسن منشو

جوں توی کے راستے کشمیر جائے تو گد کے آگے ایک چھوٹا سا پہاڑی گاؤں بُوت آتا ہے۔ بڑی پر نصافی گلہ ہے۔ یہاں دق کے مریضوں کے لیے ایک چھوٹا سا سینی ٹوریم ہے۔ یوں تو آج سے آٹھ نوبت میں پورے تین مہینے گزار چکا ہوں، اور اس صحت افزامقام سے میری جوانی کا ایک ناپختہ رومان بھی وابستہ ہے مگر اس کہانی سے میری کسی بھی کمزوری کا تعلق نہیں۔

چھ سات مہینے ہوئے، مجھے بُوت میں اپنے ایک دوست کی بیوی کو دیکھنے کے لیے جانا پڑا جو وہاں سینی ٹوریم میں زندگی کے آخری سانس لے رہی تھی۔ میرے وہاں پہنچتے ہی ایک مریض چل بسا اور بے چاری پدماء کے سانس جو پہلے اکھڑے ہوئے تھے اور بھی غیر یقینی ہو گئے۔ میں نہیں کہہ سکتا وہ کیا تھی لیکن میرا خیال ہے کہ محض اتفاق تھا کہ چار روز کے اندر اندر اس چھوٹے سے سینی ٹوریم میں تین مریض اور پر تکلے مر گئے۔ جوں ہی کوئی بستر خالی ہو تا یا تمارداری کرتے کرتے تھکے ہوئے انسانوں کی تھکی ہوئی چیخ پکار سنائی دیتی، سارے سینی ٹوریم پر ایک

عجیب قسم کی خاکستری ادا سی چھا جاتی اور وہ مریض جو امید کے پتلے دھاگے کے ساتھ چھٹے ہوتے تھے، یاں کی اتھاگہر ایوں میں ڈوب جاتے۔

میرے دوست کی بیوی پدماتو بالکل دم بخود ہو جاتی۔ اس کے پتلے ہونٹوں پر موت کی زردیاں کانپنے لگتیں اور اس کی گھری آنکھوں میں ایک نہایت ہی رحم انگیز استفسار پیدا ہو جاتا۔ سب سے آگے ایک خوف زدہ ”کیوں؟“ اور اس کے پیچے بہت سے ڈرپوک ”نہیں!“

تیرے مریض کی موت کے بعد میں باہر برآمدے میں بیٹھ کر زندگی اور موت کے متعلق سوچنے لگا۔۔۔ سینی ٹوریم ایک مرتبان سالگتائے ہے جس میں یہ مریض، پیاز کی طرح، سر کے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ایک کانٹا آتا ہے اور جو پیاز اچھی طرح گل گئی ہے، اسے ڈھونڈتا ہے اور نکال کر لے جاتا ہے۔ یہ کتنی مختلکہ خیز تشبیہ تھی۔ لیکن جانے کیوں بار بار یہی میرے ذہن میں آئی۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ سوچ سکا کہ موت ایک بہت ہی بھونڈی چیز ہے۔۔۔ یعنی آپ اچھے بھلے جی رہے ہیں، ایک مرض کہیں سے آن چھٹتا ہے اور مر جاتے ہیں۔ افسانوی نقطہ نظر سے بھی زندگی کی کہانی کا یہ انجام کچھ چھست معلوم نہیں ہوتا۔

برآمدے سے اٹھ کر اندر داخل ہوا۔ دس پندرہ قدم اٹھائے ہوں گے کہ پیچھے سے آواز آئی۔

”دفنا آئے آپ نمبر بائیس کو!“

میں نے مڑ کر دیکھا۔ سفید بستر پر دوکالی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ یہ آنکھیں جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ ایک بگالی عورت کی تھیں جو دوسرے مریضوں سے بالکل الگ طریقے پر اپنی موت کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے جب یہ کہا ”دفنا آئے آپ نمبر بائیس کو؟“ تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہم انسان کو نہیں بلکہ ایک عدد دفنا کر آ رہے ہیں۔ اور سچ پوچھیے تو اس مریض کو قبر کے سپرد کرتے ہوئے میرے دل و دماغ کے کسی کونے میں بھی یہ احساس پیدا نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک انسان تھا، اور اس کی موت سے دنیا میں ایک خلاپیدا ہو گیا ہے۔

میں جب مزید گفتگو کرنے کے لیے اس بگالی عورت کے پاس بیٹھا جس کی سیاہ فام آنکھیں ایسی ہوں ناک بیماری کے باوجود تروتازہ اور چمکیلی تھیں تو اس نے ٹھیک اسی طرح مسکرا کر کہا، ”میرا نمبر چار ہے۔“ پھر اس نے اپنی سفید چادر کی چند سلوٹیں اپنے استخوانی ہاتھ سے درست کیں اور بڑے بے تکلف انداز میں کہا، ”آپ مردوں کو جلانے دفاترے میں کافی دلچسپی لیتے ہیں۔“ میں نے یونہی ساجواب دیا، ”نہیں تو۔۔۔“ اس کے بعد یہ مختصر گفتگو ختم ہو گئی اور میں اپنے دوست کے پاس چلا گیا۔

دوسرے روز میں حسب معمول سیر کو نکلا۔ بلکی ہلکی پھوار گر رہی تھی۔ جس سے فضابہت ہی پیاری اور معصوم ہو گئی تھی، یعنی جیسے اس کو ان مریضوں سے کوئی سروکار ہی نہیں جو اس میں جرا شیم بھرے سانس لے رہے تھے۔۔۔ چیڑ کے لانبے لانبے درخت، نیلی نیلی دھنڈ میں لپٹی ہوئی پہاڑیاں، سڑک پر لڑھکتے ہوئے پھر۔۔۔ پست قد مگر صحت مند بھینسیں۔۔۔ ہر طرف خوبصورتی تھی۔۔۔ ایک پر اعتماد خوبصورتی جسے کسی چور کا کھٹکا نہیں تھا۔

میں سیر سے لوٹ کر سینی ٹوریم میں داخل ہوا تو مریضوں کے اترے ہوئے چہروں ہی سے مجھے معلوم ہو گیا کہ ایک اور عدد چل بسا ہے۔۔۔ گیارہ نمبر، یعنی پدم۔

اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں جو کھلی رہ گئی تھیں میں نے بہت سے خوفزدہ ”کیوں“ اور ان کے پیچھے بے شمار ڈرپوک ”نہیں“ ” Menged پائے۔۔۔ بے چاری !!

پانی بر س رہا تھا، اس لیے خشک ایندھن جمع کرنے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ بہر حال، اس غریب کی لاش کو آگ کے سپرد کر دیا گیا۔ میر ادوست و بیس چتا کے پاس بیٹھا رہا اور میں اس کا سامان ٹھیک کرنے کے لیے سینی ٹوریم آگیا۔۔۔ اندر داخل ہوتے ہوئے مجھے پھر اس بنگالی عورت کی آواز آئی۔

”بہت دیر لگ گئی آپ کو۔“

”جی ہاں، بارش کی وجہ سے خشک ایندھن نہیں مل رہا تھا اس لیے دیر ہو گئی۔“

”اور جگہوں پر تو ایندھن کی دکانیں ہوتی ہیں، پر میں نے سنا ہے یہاں ادھر ادھر سے خود ہی لکڑیاں کاٹتی اور چنپتی پڑتی ہیں۔“

”جی ہاں۔“

”ذرابیٹھ جائیے۔“

میں اس کے پاس اسٹول پر بیٹھ گیا۔ تو اس نے ایک عجیب ساسوال کیا، ”تلاش کرتے کرتے جب آپ کو خشک لکڑی کا ٹکر امل جاتا ہو گا تو آپ بہت خوش ہوتے ہوں گے؟“ اس نے میرے جواب کا انتظار نہ کیا اور اپنی چکلی آنکھوں سے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا، ”موت کے متعلق آپ کا کیا نتیجہ ہے؟“

”میں نے کئی بار سوچا ہے لیکن سمجھ نہیں سکا۔“

وہ دناؤں کی طرح مسکرائی اور بچوں کے سے انداز میں کہنے لگی، ”میں کچھ کچھ سمجھ سکی ہوں۔۔۔ اس لیے کہ بہت متین دیکھ چکی ہوں۔۔۔ اتنی کہ آپ شاید ہزار برس بھی زندہ رہ کرنے دیکھ سکیں۔۔۔ میں بیگال کی رہنے والی ہوں جہاں کا قحط آج کل بہت مشہور ہے۔۔۔ آپ کو تو پتہ ہی ہو گا۔ لاکھوں آدمی وہاں مر چکے ہیں۔۔۔ بہت سی کہانیاں چھپ چکی ہیں۔ سیکڑوں مضمون لکھے جا چکے ہیں۔ پھر بھی سنائے کہ انسان کی اس بیتا کا اچھی طرح نقشہ نہیں کھینچا جا سکا۔۔۔ موت کی اسی منڈی میں، موت کے متعلق میں نے سوچا۔“

میں نے پوچھا، ”کیا؟“

اس نے اسی انداز سے جواب دیا، ”میں نے سوچا کہ ایک آدمی کا مرنا موت ہے۔۔۔ ایک لاکھ آدمیوں کا مرنا تماشا ہے۔۔۔ یقین کہتی ہوں موت کا وہ خوف جو کبھی مرے دل پر ہوا کرتا تھا، بالکل دور ہو گیا۔۔۔ ہر بازار میں دس بیس ار تھیاں اور جنازے نظر آئیں تو کیا موت کا اصلی مطلب فوت نہیں ہو جائے گا۔۔۔ میں صرف اتنا سمجھ سکی ہوں کہ ایسی بے تحاشا موتوں پر رونا بیکار ہے۔۔۔ یہ قوñی ہے۔۔۔ اول تو اتنے آدمیوں کا مر جانا ہی سب سے بڑی حماقت ہے۔“

میں نے فوراً ہی پوچھا، ”کس کی؟“

”کسی کی بھی ہو۔۔۔ حماقت، حماقت ہے۔۔۔ ایک بھرے شہر پر آپ اوپر سے بم گرد بیجیے۔۔۔ لوگ مر جائیں گے۔۔۔ کنوں میں زہر ڈال دیجیے۔۔۔ جو کبھی ان کا پانی پیے گا مر جائے گا۔۔۔ یہ کال، قحط، جنگ اور بیماریاں سب وابحیات ہیں۔۔۔ ان سے مر جانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے اوپر سے چھٹ آگرے۔ لیکن، دل کی ایک جائز خواہش کی موت، بہت بڑی موت ہے۔۔۔ انسان کو مرنا کچھ نہیں، لیکن اس کی فطرت کو ہلاک کرنا بہت بڑا ظلم ہے۔“

یہ کہہ کرو وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئی۔ لیکن پھر کروٹ بدل کر کہنے لگی، ”میرے خیالات پہلے ایسے نہیں تھے۔ سچ پوچھیے تو مجھے سوچنے کا وقوف ہی نہیں تھا۔ لیکن اس قحط نے مجھے ایک بالکل نئی دنیا میں پھینک دیا۔“ رک کر ایک دم وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ میں اپنی کاپی میں یاداشت کے طور پر اس کی چند باتیں نوٹ کر رہا تھا۔

”یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں؟“

میں نے صاف گوئی سے کام لیا اور کہا، ”میں افسانہ نگار ہوں۔۔۔ جو باتیں مجھے دلچسپ معلوم ہوں، نوٹ کر لیا کرتا ہوں۔“

”اوہ۔۔۔ تو پھر میں آپ کو اپنی پوری کہانی سناؤں گی۔“

تین گھنٹے تک، نحیف آواز میں وہ مجھے اپنی کہانی سناتی رہی۔ میں اب اپنے الفاظ میں اسے بیان کرتا ہوں۔ غیر ضروری تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بیگال میں جب قحط پھیلا اور لوگ دھڑادھڑ مرنے لگے تو سکینہ کواس کے چچا نے ایک اوباش آدمی کے پاس پانچ سورو پے میں پیچ دیا جو اسے لاہور لے آیا۔ اور ایک ہو ٹل میں ٹھہرا کر اس سے روپیہ کمانے کی کوشش کرنے لگا۔ پہلا آدمی جو اس کے پاس اس غرض سے لایا گیا، ایک خوبصورت اور تندرست نوجوان تھا۔ قحط سے پہلے جب روٹی کپڑے کی فکر نہیں تھی، وہ ایسے ہی نوجوان کے خواب دیکھا کرتی تھی جو اس کا شوہر بنے۔ مگر یہاں اس کا سودا کیا جا رہا تھا۔ ایک ایسے فعل کے لیے اسے مجبور کیا جا رہا تھا جس کے تصور ہی سے وہ کانپ کانپ اٹھتی تھی۔

جب وہ لکلتے سے لاہور لائی گئی تو اسے معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ وہ باشمور اڑکی تھی کہ چند ہی روز میں اسے ایک سکھ بنائے جگہ بھنا یا جائے گا۔ اس کو یہ سب کچھ معلوم تھا لیکن اس قیدی کی طرح جور حرم کی امید نہ ہونے پر بھی آس گائے رہتا ہے، وہ کسی ناممکن حادثے کی متوقع تھی۔۔۔ یہ حادثہ تونہ ہوا لیکن خود اس میں اتنی ہمت پیدا ہو گئی کہ وہ رات کو کچھ اپنی ہوشیاری سے اور کچھ اس نوجوان کی خامکاری کی بدولت ہو ٹل سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔

اب لاہور کی سڑکیں اور ان کے نئے خطرے۔ قدم قدم پر ایسا لگتا تھا کہ لوگوں کی نظریں اسے کھا جائیں گی۔ لوگ اسے کم دیکھتے تھے، لیکن اس کی جوانی کو جو چھپنے والی چیز نہیں تھی، کچھ اتنا زیادہ گھورتے تھے، جیسے برے سے اس کے اندر سوراخ کر رہے ہیں۔ سونے

چاندی کا کوئی زیور یا موتی ہوتا تو وہ شاید لوگوں کی نظر وہ سے بچا لیت۔ مگر وہ ایک ایسی چیز کی حفاظت کر رہی تھی جس پر کوئی بھی آسانی کے ساتھ ہاتھ مار سکتا تھا۔

تین دن اور تین راتیں وہ کبھی ادھر کبھی ادھر گھومتی بھٹکتی رہی۔ بھوک کے مارے اس کا بر احوال تھا مگر اس نے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلا�ا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اس کا یہ پھیلا ہوا ہاتھ، اس کی عصمت سمیت، کسی اندر ہیری کو ٹھری میں کھینچ لیا جائے گا۔۔۔ دکانوں میں بھی ہوئی مٹھائیاں دیکھتی تھیں۔ بھٹکار خانوں میں لوگ بڑے بڑے نوالے اٹھاتے تھے۔ اس کے ہر طرف کھانے پینے کی چیزوں کا بڑی بے دردی سے استعمال ہوتا تھا۔۔۔ لیکن جیسے دنیا میں اس کے مقصوم کا کوئی دانہ ہی نہیں رہا تھا۔

اسے زندگی میں پہلی بار کھانے کی اہمیت معلوم ہوئی۔ پہلے اس کو کھانا ملتا تھا، اب وہ کھانے سے ملنا چاہتی تھی اور مل نہیں سکتی تھی۔ چار روز کے فاقوں نے اسے اپنی ہی نظر وہ میں ایک بہت بڑا شہید توبنادیا لیکن اس کے جسم کی ساری بنیادیں ہل گئیں۔ وہ جو روحانی تسکین ہوتی ہے ایک وقت آگیا کہ وہ بھی سکرنے لگی۔

چوتھے روز شام کو وہ ایک گلی میں سے گزر رہی تھی۔ جانے کیا جی میں آئی کہ ایک مکان کے اندر گھس گئی۔ اندر چل کر نیال آیا کہ نہیں، کوئی پکڑ لے گا۔۔۔ اور تمام کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ اب اس میں اتنی طاقت بھی تو نہیں۔ لیکن سوچتے سوچتے وہ صحن کے پاس پہنچ چکی تھی۔۔۔ ملکجے اندر ہیرے میں اس نے گھڑو نیچیوں پر دو صاف گھڑے دیکھے۔ اور ان کے ساتھ ہی پھلوں سے بھرے ہوئے دو تھال۔۔۔ سیب۔۔۔ ناشپاتیاں۔۔۔ انار۔۔۔ اس نے سوچا انار بکواس ہے۔۔۔ سیب اور ناشپاتیاں ٹھیک ہیں۔۔۔ گھڑے کے اوپر چپنی کے بجائے ایک پیالہ پڑا تھا۔۔۔ اس نے طشتہ اٹھا کر دیکھا تو ملائی سے پر تھا۔

اس نے اٹھا لیا اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ سوچ سکے، جلدی جلدی اس نے نوالے اٹھانے شروع کیے۔ ساری ملائی اس کے پیٹ میں تھی۔۔۔ کتنا راحت بخش لمحہ تھا! بھول گئی کہ کسی غیر کے مکان میں ہے۔۔۔ وہیں بیٹھ کر اس نے سیب اور ناشپاتیاں کھانا شروع کر دیں۔۔۔ گھڑو نیچی کے نیچے کچھ اور بھی تھا۔۔۔ یعنی۔۔۔ ٹھنڈی تھی لیکن اس نے ساری پتی ختم کر دی۔۔۔ ایک دم جانے کیا ہوا۔ پیٹ کی گہرائیوں سے غبار سا اٹھا اور اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کہیں سے کھانسی کی آواز آئی۔ بھاگنے کی کوشش کی مگر چکرا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔

جب ہوش آیا تو وہ ایک صاف سترے بستر میں لیٹی تھی۔ سب سے پہلے اسے خیال آیا۔ کہیں میں لوٹی تو نہیں گئی۔۔۔ لیکن فوراً ہی اسے اطمینان ہو گیا کہ وہ صحیح سلامت تھی۔۔۔ کچھ اور سوچنے ہی لگی تھی کہ پتلی پتلی کھانی کی آواز آئی۔ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ کمرے میں داخل ہوا۔

سکینہ نے اپنے گاؤں میں بہت سے قحط کے مارے انسان دیکھے تھے مگر یہ انسان ان سے بہت مختلف تھا۔ بے چارگی اس کی آنکھوں میں بھی تھی مگر اس میں وہ انداز کی ترسی ہوئی خواہش نہیں تھی۔ اس نے پیٹ کے بھوکے دیکھے تھے جن کی نگاہوں میں ایک ننگی اور بھونڈی للچاہٹ تھی لیکن اس مرد کی نگاہوں میں اسے ایک چلن سی نظر آئی۔۔۔۔۔۔ ایک دھنلاپرده جس کے پیچھے سے وہ ڈر ڈر کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

خوف زدہ سکینہ کو ہونا چاہیے لیکن سہا ہوا وہ تھا۔۔۔ اس نے رک رک کر کچھ جھینپتے ہوئے عجیب قسم کا جا جاب محسوس کرتے ہوئے اس سے کہا، ”جب تم کھارہی تھیں تو میں تم سے دور کھڑا تھا۔۔۔ اف امیں نے کن مشکلوں سے اپنی کھانی روکے رکھی کہ تم آرام سے کھاسکو اور میں یہ خوبصورت منظر زیادہ دیر تک دیکھ سکوں۔ بھوک بڑی پیاری چیز ہے۔ لیکن ایک میں ہوں کہ اس نعمت سے محروم ہوں۔ نہیں، محروم نہیں کہنا چاہیے کیونکہ میں نے خود اس کو ہلاک کیا ہے۔

سکینہ کچھ بھی سمجھنے سکی۔۔۔ وہ ایک پہلی تھی جو بوجھتے بوجھتے ایک اور پہلی بن جاتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود سکینہ کو اس کی باتیں اچھی لگیں جن میں انسانیت کی گرمی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی ساری آپ بیتی اس کو سنا دی۔ وہ خاموش ستارہا جیسے اس پر اڑھی نہیں ہوا۔ لیکن جب سکینہ اس کا شکریہ ادا کرنے لگی تو اس کی آنکھیں جو آنسوؤں سے بے نیاز معلوم ہوتی تھیں ایک دم نمناک ہو گئیں اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، ”یہیں رہ جاؤ سکینہ۔۔۔ میں دل کا بیمار ہوں۔۔۔ مجھے کوئی کھانا۔۔۔ کوئی پھل اچھا نہیں لگتا۔ تم کھایا کرنا اور میں تمہیں دیکھا کروں گا۔۔۔“ لیکن فوراً ہی وہ مسکرانے لگا، ”کیا حماقت ہے۔۔۔ کوئی اور ستارہ تو کیا کہتا۔۔۔ یعنی دوسرا کھایا کرے اور میں دیکھا کروں گا۔۔۔ نہیں سکینہ۔۔۔ ویسے میری دلی خواہش ہے کہ تم یہیں رہو۔۔۔“

سکینہ کچھ سوچنے لگی، ”جی نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ اس گھر میں اکیلے ہیں اور میں۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ بات یہ ہے کہ میں۔۔۔“ یہ سن کر اس کو کچھ ایسا صدمہ پہنچا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے بالکل کھوسا گیا۔ جب بولا تو اس کی آواز کھو کھلی تھی، ”میں دس برس تک اسکوں میں لڑکیاں پڑھاتا رہوں ہمیشہ میں نے ان کو اپنی بچیاں سمجھا۔۔۔ تم۔۔۔ تم ایک اور ہو جاؤ گی۔“ سکینہ کے لیے کوئی اور جگہ ہی نہیں تھی چنانچہ وہ اس پروفیسر کے ہاں ٹھہر گئی۔

وہ ایک برس اور چند مہینے زندہ رہا۔ اس دوران میں، بجائے اس کے کہ سکینہ اس کی خبر گیری کرتی، الملا وہ جو کہ بیمار تھا، اس کو آسانش و آرام پہنچانے میں کچھ اس بے کلی سے مصروف رہا جیسے ڈاک جانے والی ہے اور وہ جلدی جلدی ایک خط میں جوبات اس کے ذہن میں آتی ہے لکھتا جا رہا ہے۔ اس کی اس توجہ نے سکینہ کو جسے توجہ کی ضرورت تھی۔ چند مہینوں میں نکھار دیا۔ اب پروفیسر اس سے کچھ دور رہنے لگا۔ مگر اس کی توجہ میں کوئی فرق نہ آیا۔ آخری دنوں میں اچانک اس کی حالت خراب ہو گئی۔ ایک رات جب کہ سکینہ اس کے پاس ہی سور ہی تھی، وہ ہٹ بڑا کر اٹھا اور زور سے چلانے لگا، ”سکینہ۔۔۔ سکینہ۔۔۔“

یہ چیخیں سن کر سکینہ گھبر گئی۔ پروفیسر کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں وہ جو چلمیں سی ہوا کرتی تھی، موجود نہیں تھی۔ اب ایک اتحاد کو سکینہ کو ان میں نظر آیا۔۔۔ پروفیسر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سکینہ کے ہاتھ پکڑے اور کہا، ”میں مر رہا ہوں۔۔۔ لیکن اس موت کا مجھے دکھ نہیں۔۔۔ کیونکہ بہت سی متیں میرے اندر واقع ہو چکی ہیں۔ تم سنا چاہتی ہو میری داستان۔۔۔ جانا چاہتی ہو میں کیا ہوں۔۔۔ سنو۔۔۔ ایک جھوٹ ہوں۔۔۔ بہت بڑا جھوٹ۔۔۔ میری ساری زندگی اپنے آپ سے جھوٹ بولنے اور پھر اسے سچ بنانے میں گزری ہے۔۔۔ اف کتنا ایکلیف دہ، غیر فطری اور غیر انسانی کام تھا۔۔۔ میں نے ایک خواہش کو مارتا تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس قتل کے بعد مجھے اور بہت سے خون کرنے پڑیں گے۔ میں سمجھتا تھا کہ ایک مسام بند کر دینے سے کیا ہو گا۔۔۔ لیکن مجھے اس کی خبر نہیں تھی کہ پھر مجھے اپنے جسم کے سارے دروازے بند کرنے پڑیں گے۔

سکینہ! یہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں فلسفیانہ کو اس ہے، سید ہی بات یہ ہے کہ میں اپنا کیر بکٹر او نچا کرتا رہا اور خود انہیانی پستیوں کے دلدل میں دھنستا چلا گیا۔ میں مر جاؤں گا اور یہ کیر یکٹر۔۔۔ یہ بے رنگ پھریر امیری خاک پر اڑتا رہے گا۔۔۔ وہ تمام لڑکیاں جنہیں میں اسکوں میں پڑھایا کرتا تھا۔۔۔ کبھی مجھے یاد کریں گی تو کہیں گی ایک فرشتہ تھا جو انسانوں میں چلا آیا تھا۔ تم بھی میری نیکیوں کو نہیں بھولو گی۔۔۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب سے تم اس گھر میں آئی ہو۔۔۔ ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا جب میں نے تمہاری جوانی کو دزدیدہ نگاہوں سے نہ دیکھا ہو۔۔۔ میں نے تصور میں کئی بار تمہارے ہونٹوں کو چوما ہے۔۔۔ کئی بار میں نے تمہاری بانہوں پر اپنا سر رکھا ہے۔۔۔ لیکن ہر بار مجھے ان تصویروں کو پر زے پر زے کرنا پڑا۔ پھر ان پرزوں کو جلا کر میں نے راکھ بنائی کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔ میں مر جاؤں گا۔۔۔ کاش مجھ میں اتنی ہمت ہوتی کہ اپنے اس اونچے کیر یکٹر کو ایک لمبے بانس پر لنگوڑ کی طرح بٹھا دیتا، اور ڈگڈگی بجا کر لوگوں کو اکٹھا کرتا کہ آؤ دیکھو اور عبرت حاصل کرو۔“

اس واقعہ کے بعد پروفیسر صرف پانچ روز زندہ رہا۔۔۔ سکینہ کا بیان ہے کہ مرنے سے پہلے وہ بہت خوش تھا۔۔۔ جب وہ آخری سانس لے رہا تھا تو اس نے سکینہ سے صرف اتنا کہا، ”سکینہ! میں لاچی نہیں۔۔۔ زندگی کے یہ آخری پانچ دن میرے لیے بہت ہیں۔۔۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔۔۔“

-[60]-

ممد بھائی: سعادت حسن منٹو

فارس روڈ سے آپ اس طرف گلی میں چلے جائیے جو سفید گلی کہلاتی ہے تو اس کے آخری سرے پر آپ کو چند ہو ٹل ملیں گے۔ یوں تو بمبی میں قدم قدم پر ہو ٹل اور ریستوران ہوتے ہیں مگر یہ ریستوران اس لحاظ سے بہت دلچسپ اور منفرد ہیں کہ یہ اس علاقے میں واقع ہیں جہاں بھانت بھانت کی لو نڈیاں بستی ہیں۔

ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ بس آپ یہی سمجھیے کہ میں برس کے قریب، جب میں ان ریستورانوں میں چائے پیا کرتا تھا اور کھانا کھایا کرتا تھا۔ سفید گلی سے آگے نکل کر ’پلے ہاؤس‘ آتا ہے۔ ادھر دن بھر ہاؤ ہو رہی ہے۔ سینما کے شودن بھر چلتے رہتے تھے۔ چمپیاں ہوتی تھیں۔ سینما گھر غالباً چارتھے۔ ان کے باہر گھنٹیاں بجاتے کہ بڑے ساعت پاش طریقے پر لوگوں کو مدعو کرتے، ”آؤ آؤ۔۔۔ دو آنے میں۔۔۔ فٹ کلاس کھیل۔۔۔ دو آنے میں!“

بعض اوقات یہ گھنٹیاں بجائے والے زبردستی لوگوں کو اندر ڈھکیل دیتے تھے۔ باہر کر سیوں پر چمپی کرانے والے بیٹھتے ہوتے تھے جن کی کھوپڑیوں کی مرمت بڑے سائنسٹیک طریقے پر کی جاتی تھی۔ ماش اچھی چیز ہے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بمبی کے رہنے والے اس کے اتنے گرویدہ کیوں ہیں۔ دن کو اور رات کو، ہر وقت انھیں تیل ماش کی ضرورت محسوس ہوتی۔ آپ اگر چاہیں تورات کے تین بجے بڑی آسانی سے تیل ماشیا بل سکتے ہیں۔ یوں بھی ساری رات، آپ خواہ بمبی کے کسی کونے میں ہوں، یہ آواز آپ یقیناً سنتے رہیں گے۔ پی۔۔۔ پی۔۔۔ یہ ’پی‘ چمپی کا مخفف ہے۔

فارس روڈیوں تو ایک سڑک کا نام ہے لیکن دراصل یہ اس پورے علاقے سے منسوب ہے جہاں بیسوائیں بستی ہیں۔ یہ بہت بڑا علاقہ ہے۔ اس میں کئی گلیاں ہیں جن کے مختلف نام ہیں، لیکن سہولت کے طور پر اس کی ہر گلی کو فارس روڈ یا سفید گلی کہا جاتا ہے۔ اس میں سینکڑوں

جنگل لگی دکانیں ہیں جن میں مختلف رنگ و سن کی عورتیں بیٹھ کر اپنا جسم پچتی ہیں۔ مختلف داموں پر، آٹھ آنے سے آٹھ روپے تک، آٹھ روپے سے سوروپے تک۔۔۔ ہر دام کی عورت آپ کو اس علاقے میں مل سکتی ہے۔

یہودی، پنجابی، مرہٹی، کشمیری، گجراتی، بنگالی، اینگلو انڈین، فرانسیسی، چینی، جاپانی غرضیکہ ہر قسم کی عورت آپ کو یہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے۔۔۔ یہ عورتیں کیسی ہوتی ہیں۔۔۔ معاف کیجیے گا، اس کے متعلق آپ مجھ سے کچھ نہ پوچھیے۔۔۔ بس عورتیں ہوتی ہیں۔۔۔ اور ان کو گاہک مل ہی جاتے ہیں۔

اس علاقے میں بہت سے چینی بھی آباد ہیں۔ معلوم نہیں یہ کیا کاروبار کرتے ہیں، مگر ہتھے اسی علاقے میں ہیں۔ بعض توریستوران چلاتے ہیں جن کے باہر بورڈوں پر اوپر نیچے کیڑے کوڑوں کی شکل میں کچھ لکھا ہوتا ہے۔۔۔ معلوم نہیں کیا۔۔۔

اس علاقے میں بُنس میں اور ہر قوم کے لوگ آباد ہیں۔ ایک گلی ہے جس کا نام عرب سین ہے۔ وہاں کے لوگ اسے عرب گلی کہتے ہیں۔ اس زمانے میں جس کی میں بات کر رہا ہوں، اس گلی میں غالباً بیس پکپیس عرب رہتے تھے جو خود کو موتیوں کے بیوپاری کہتے تھے۔ باقی آبادی پنجابیوں اور رامپوریوں پر مشتمل تھی۔

اس گلی میں مجھے ایک کمرہ مل گیا تھا جس میں سورج کی روشنی کا داخلہ بند تھا، ہر وقت بجلی کا بلب روشن رہتا تھا۔ اس کا کرایہ ساڑھے نوروپے ماہوار تھا۔

آپ کا اگر بھی میں قیام نہیں رہا تو شاید آپ مشکل سے یقین کریں کہ وہاں کسی کو کسی اور سے سروکار نہیں ہوتا۔ اگر آپ اپنی کھولی میں مر رہے ہیں تو آپ کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ آپ کے پڑوس میں قتل ہو جائے، مجال ہے جو آپ کو اس کی خبر ہو جائے۔ مگر وہاں عرب گلی میں صرف ایک شخص ایسا تھا جس کو اڑوس پڑوس کے ہر شخص سے دلچسپی تھی۔ اس کا نام مدبھائی تھا۔ مدبھائی رام پور کا رہنے والا تھا۔ اول درجے کا چکلیت، گتکے اور بنوٹ کے فن میں کیتا۔ میں جب عرب گلی میں آیا تو ہو ٹلوں میں اس کا نام اکثر سننے میں آیا، لیکن ایک عرصے تک اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔

میں صحیح سویرے اپنی کھولی سے نکل جاتا تھا اور بہت رات گئے لوٹا تھا۔ لیکن مجھے مدبھائی سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ کیوں کہ اس کے متعلق عرب گلی میں بے شمار دستانیں مشہور تھیں کہ بیس پکپیس آدمی اگر لاٹھیوں سے مسلخ ہو کر اس پر ٹوٹ پڑیں تو وہ اس کا بال تک بیکا

نہیں کر سکتے۔ ایک منٹ کے اندر اندر وہ سب کو چلت کر دیتا ہے۔ اور یہ کہ اس جیسا چھری مار ساری بمبی میں نہیں مل سکتا۔ ایسے چھری مارتا ہے کہ جس کے لگتی ہے اسے پتہ بھی نہیں چلتا۔ سو قدم بغیر احساس کے چلتا رہتا ہے اور آخر ایک دم ڈھیر ہو جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس کے ہاتھ کی صفائی ہے۔

اس کے ہاتھ کی صفائی دیکھنے کا مجھے اشتیاق نہیں تھا لیکن یوں اس کے متعلق اور باقی سن سن کر میرے دل میں یہ خواہش ضرور پیدا ہو چکی تھی کہ میں اسے دیکھوں۔ اس سے باقی نہ کروں لیکن قریب سے دیکھوں کہ وہ کیسا ہے۔ اس تمام علاقے پر اس کی شخصیت چھائی ہوئی تھی۔ وہ بہت بڑا دا لیعنی بدمعاش تھا۔ لیکن اس کے باوجود لوگ کہتے تھے کہ اس نے کسی کی بہو بیٹی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ لنگوٹ کا بہت پکا ہے۔ غریبوں کے دکھ درد کا شریک ہے۔ عرب گلی۔۔۔ صرف عرب گلی ہی نہیں، آس پاس جتنی گلیاں تھیں، ان میں جتنی نادار عورتیں تھیں، سب مدد بھائی کو جانتی تھیں کیوں کہ وہ اکثر ان کی مالی امداد کرتا رہتا تھا۔ لیکن وہ خود ان کے پاس کبھی نہیں جاتا تھا۔ اپنے کسی خورد سال شاگرد کو بھیج دیتا تھا اور ان کی خیریت دریافت کر لیا کرتا تھا۔

مجھے معلوم نہیں اس کی آمد نی کے کیا ذرائع تھے۔ اچھا کھاتا تھا، اچھا پہنچتا تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا تانگہ تھا جس میں بڑا تدرست طبوختا ہوتا تھا، اس کو وہ خود چلا تھا۔ ساتھ دو یا تین شاگردوں تھے، بڑے با ادب۔۔۔ بھئی بazaar کا ایک چکر لگایا کسی درگاہ میں ہو کر وہ اس تانگے میں واپس عرب لگی آ جاتا تھا اور کسی ایرانی کے ہوٹل میں بیٹھ کر اپنے شاگردوں کے ساتھ گتکے اور بنوٹ کی باتوں میں مصروف ہو جاتا تھا۔

میری کھولی کے ساتھ ہی ایک اور کھولی تھی جس میں مارواڑا کا ایک مسلمان رقص رہتا تھا۔ اس نے مجھے مد جھائی کی سیکڑوں کہانیاں سنائیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ مد جھائی ایک لاکھ روپے کا آدمی ہے۔ اس کو ایک مرتبہ ہیضہ ہو گیا تھا۔ مد جھائی کو پتہ چلا تو اس نے فارس روڈ کے تمام ڈاکٹر اس کی کھولی میں اکٹھے کر دیے اور ان سے کہا، ”دیکھو، اگر عاشق حسین کو کچھ ہو گیا تو میں سب کا صفائیا کر دوں گا۔“ عاشق حسین نے بڑے عقیدت مندانہ لمحے میں مجھ سے کہا، ”منظور صاحب! مد جھائی فرشتہ ہے۔۔۔ فرشتہ۔۔۔ جب اس نے ڈاکٹروں کو دھمکی دی تو وہ سب کا نپنے لگے۔ ایسا لگ کے علاج کیا کہ میں دودن میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔“

مدد بھائی کے متعلق میں عرب گلی کے گندے اور وہیات ریستورانوں میں اور بھی بہت کچھ سن چکا تھا۔ ایک شخص نے جو غالباً اس کا شاگرد تھا اور خود کو بہت بڑا پھرکیت سمجھتا تھا، مجھ سے یہ کہا تھا کہ مدد دادا اپنے نینفے میں اپک ایسا آبدار نجمر اڑس کے رکھتا ہے جو استرے کی طرح

شیو بھی کر سکتا ہے اور یہ خبر نیام میں نہیں ہوتا، کھلارہتا ہے۔ بالکل ننگا، اور وہ بھی اس کے پیٹ کے ساتھ۔ اس کی نوک اتنی تیکھی ہے کہ اگر بتیں کرتے ہوئے، جھکتے ہوئے اس سے ذرا سی غلطی ہو جائے تو مدد بھائی کا ایک دم کام تمام ہو کے رہ جائے۔

ظاہر ہے کہ اس کو دیکھنے اور اس سے ملنے کا اشتباہ دن بدن میرے دل و دماغ میں بڑھتا گیا۔ معلوم نہیں میں نے اپنے تصور میں اس کی شکل و صورت کا کیا نقشہ تیار کیا تھا، بہر حال اتنی مدت کے بعد مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں ایک قوی ہیکل انسان کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا تھا جس کا نام مدد بھائی تھا۔ اس قسم کا آدمی جو ہر کو لیس سائیکلوں پر اشتہار کے طور پر دیا جاتا ہے۔

میں صحیح سویرے اپنے کام پر نکل جاتا تھا اور رات کو دس بجے کے قریب کھانے والے سے فارغ ہو کر واپس آ کر فوراً سوچاتا تھا۔ اس دوران میں مدد بھائی سے کیسے ملاقات ہو سکتی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ کام پر نہ جاؤں اور سارا دن عرب گلی میں گزار کر مدد بھائی کو دیکھنے کی کوشش کروں، مگر افسوس کہ میں ایسا نہ کر سکا اس لیے کہ میری ملازمت ہی بڑی وابیات قسم کی تھی۔

مدد بھائی سے ملاقات کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک انفلوئنزا نے مجھ پر زبردست حملہ کیا۔ ایسا حملہ کہ میں بوکھلا گیا۔ خطرہ تھا کہ یہ بگڑ کر نہ نہیں میں تبدیل ہو جائے گا، کیوں کہ عرب گلی کے ایک ڈاکٹر نے یہی کہا تھا۔ میں بالکل تن تھا۔ میرے ساتھ جو ایک آدمی رہتا تھا، اس کو پونہ میں نوکری مل گئی تھی، اس لیے اس کی رفاقت بھی نصیب نہیں تھی۔ میں بخار میں پھنسنا جا رہا تھا۔ اس قدر بیاس تھی کہ جو پانی کھوئی میں رکھا تھا، وہ میرے لیے ناکافی تھا۔ اور دوست یار کوئی پاس نہیں تھا جو میری دیکھ بھال کرتا۔

میں بہت سخت جان ہوں، دیکھ بھال کی مجھے عموماً نسرورت محسوس نہیں ہوا کرتی۔ مگر معلوم نہیں کہ وہ کس قسم کا بخار تھا۔ انفلوئنزا تھا، ملیریا تھا کیا تھا۔ لیکن اس نے میری ریڑھ کی ٹھی توڑ دی۔ میں بلبلانے لگا۔ میرے دل میں پہلی مرتبہ خواہش پیدا ہوئی کہ میرے پاس کوئی ہو جو مجھے دلا سہ دے۔ دلا سہ نہ دے تو کم از کم ایک سینڈ کے لیے اپنی شکل دکھا کے چلا جائے تاکہ مجھے یہ خوشنگوار احساس ہو کہ مجھے پوچھنے والا بھی کوئی ہے۔

دو دن تک میں پڑا تکلیف بھری کرو ٹھیں لیتارہا، مگر کوئی نہ آیا۔ آنا بھی کسے تھا۔ میری جان پیچان کے آدمی ہی کلتے تھے۔ دو تین یا چار۔ اور وہ اتنی دور رہتے تھے کہ ان کو میری موت کا علم بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور پھر وہاں بہمی میں کون کس کو پوچھتا ہے۔ کوئی مرے یا جیے۔ ان کی بلاسے۔

میری بہت ب瑞 حالت تھی۔ عاشق حسین ڈانسر کی بیمار تھی اس لیے وہ اپنے وطن جا چکا تھا۔ یہ مجھے ہوٹل کے چھوکرے نے بتایا تھا۔ اب میں کس کو بلاتا۔۔۔ بڑی نڈھال حالت میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ خود نیچے اتروں اور کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ ہوٹل کا چھوکر اجسے بمبئی کی زبان میں ’بابر والا‘ کہتے ہیں، ہو گا۔ بڑی مریل آواز میں کہا، ”آ جاؤ!“ دروازہ کھلا اور ایک چھریرے بدن کا آدمی، جس کی موچھیں مجھے سب سے پہلے دکھائی دیں، اندر داخل ہوا۔

اس کی موچھیں ہی سب کچھ تھیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کی موچھیں نہ ہوتیں تو بہت ممکن ہے کہ وہ کچھ بھی نہ ہوتا۔ اس کی موچھوں ہی نے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سارے وجود کو زندگی بخش رکھی ہے۔

وہ اندر آیا اور اپنی قیصر ولیم جیسی موچھوں کو ایک انگلی سے ٹھیک کرتے ہوئے میری کھات کے قریب آیا۔ اس کے پیچھے پیچے تین چار آدمی تھے، عجیب و غریب وضع قطع کے۔ میں بہت حیران تھا کہ یہ کون ہیں اور میرے پاس کیوں آئے ہیں۔

قیصر ولیم جیسی موچھوں اور چھریرے بدن والے نے مجھ سے بڑی نرم و نازک آواز میں کہا، ”و مٹو صاحب! آپ نے حد کر دی۔ سالا مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟“ منٹو کا و مٹو بن جانا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس کے علاوہ میں اس موڑ میں بھی نہیں تھا کہ میں اس کی اصلاح کرتا۔ میں نے اپنی نحیف آواز میں اس کی موچھوں سے صرف اتنا کہا، ”آپ کون ہیں؟“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ”مد بھائی!“ میں اٹھ کر بیٹھ گیا، ”مد بھائی۔۔۔ تو۔۔۔ تو آپ مد بھائی ہیں۔۔۔ مشہور دادا!“

میں نے یہ کہہ تو دیا۔ لیکن فوراً مجھے اپنے بینڈے پن کا احساس ہوا اور رک گیا۔ مد بھائی نے چھوٹی انگلی سے اپنی موچھوں کے کرخت بال ذرا اوپر کیے اور مسکرا کیا، ”ہاں و مٹو بھائی۔۔۔ میں مٹو ہوں۔۔۔ یہاں کا مشہور دادا۔۔۔ مجھے باہر والے سے معلوم ہوا کہ تم بیمار ہو۔۔۔ سالا یہ بھی کوئی بات ہے کہ تم نے مجھے خبر نہ کی۔ مد بھائی کا مستک پھر جاتا ہے، جب کوئی ایسی بات ہوتی ہے۔“

میں جواب میں کچھ کہنے والا تھا کہ اس نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک سے مخاطب ہو کر کہا، ارے۔۔۔ کیا نام ہے تیرا۔۔۔ جا بھاگ کے جا، اور کیا نام ہے اس ڈاکٹر کا۔۔۔ سمجھ گئے نا اس سے کہہ کہ مد بھائی تجھے بلا تا ہے۔۔۔ ایک دم جلدی آ۔۔۔ ایک دم سب کام چھوڑ دے اور جلدی آ۔۔۔ اور دیکھ سالے سے کہنا، سب دوائیں لیتا آئے۔“

محمد بھائی نے جس کو حکم دیا تھا، وہ ایک دم چلا گیا۔ میں سوچ رہا تھا۔ میں اس کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ وہ تمام داتا نیں میرے بخار آلو دماغ میں چل پھر رہی تھیں جو میں اس کے متعلق لوگوں سے سن چکا تھا۔۔۔ لیکن گذشت صورت میں۔ کیوں کہ بار بار اس کو دیکھنے کی وجہ سے اس کی موچھیں سب پر چھا جاتی تھیں۔ بڑی خوفناک، مگر بڑی خوبصورت موچھیں تھیں۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس چہرے کو جس کے خدوخال بڑے ملام اور نرم و نازک ہیں، صرف خوفناک بنانے کے لیے یہ موچھیں رکھی گئی ہیں۔ میں نے اپنے بخار آلو دماغ میں یہ سوچ کہ یہ شخص درحقیقت اتنا خوفناک نہیں جتنا اس نے خود کو ظاہر کر رکھا ہے۔

”کھولی میں کرسی نہیں“ میں نے محمد بھائی سے کہا وہ میری چارپائی پر بیٹھ جائے۔ مگر اس نے انکار کر دیا اور بڑے روکھے سے لجھے میں کہا، ”ٹھیک ہے۔۔۔ ہم کھڑے رہیں گے۔“

پھر اس نے ٹھہلتے ہوئے۔۔۔ حالانکہ اس کھولی میں اس عیاشی کی کوئی گنجائش نہیں تھی، کرتے کا دامن اٹھا کر پاجامے کے نیفے سے ایک خیز نکالا۔۔۔ میں سمجھا چاندی کا ہے۔ اس قدر چمک رہا تھا کہ میں آپ سے کیا کہوں۔ یہ خیز نکال کر پہلے اس نے اپنی کلانی پر پھیرا۔ جو بال اس کی زد میں آئے، سب صاف ہو گئے۔ اس نے اس پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا اور ناخن تراشنے لگا۔

اس کی آمد ہی سے میرا بخار کئی درجے نیچے اتر گیا تھا۔ میں نے اب کسی قدر ہوش مند حالت میں اس سے کہا، ”محمد بھائی۔۔۔ یہ چھری تم اس طرح اپنے۔۔۔ نیفے میں۔۔۔ یعنی بالکل اپنے پیٹ کے ساتھ رکھتے ہو اتنی تیز ہے، کیا تمہیں خوف محسوس نہیں ہوتا؟“

مدد نے خیز سے اپنے ناخن کی ایک قاش بڑی صفائی سے اڑاتے ہوئے جواب دیا، ”مٹو بھائی۔۔۔ یہ چھری دوسروں کے لیے ہے۔ یہ اچھی طرح جانتی ہے۔ سالی، اپنی چیز ہے، مجھے نقصان کیسے پہنچائے گی؟“

چھری سے جو رشتہ اس نے قائم کیا تھا وہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی ماں یا باپ کہے کہ یہ میرا بیٹا ہے، یا بیٹی ہے۔ اس کا ہاتھ مجھ پر کیسے اٹھ سکتا ہے۔

ڈاکٹر آگیا۔۔۔ اس کا نام پٹھو تھا اور میں وٹھو۔۔۔ اس نے محمد بھائی کو اپنے کر سچن انداز میں سلام کیا اور پوچھا کہ معاملہ کیا ہے۔ جو معاملہ تھا، وہ محمد بھائی نے بیان کر دیا۔ مختصر، لیکن کڑے الفاظ میں، جن میں تحکم تھا کہ دیکھو اگر تم نے وٹھو جائی تو تمہاری خیر نہیں۔

ڈاکٹر پنڈو نے فرمانبردار لڑکے کی طرح اپنا کام کیا۔ میری نبض دیکھی۔ سٹیشن ہو سکوپ لگا کر میرے سینے اور پیٹھ کا معائنہ کیا۔ بلڈ پریشر دیکھا۔ مجھ سے میری بیماری کی تمام تفصیل پوچھی۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے نہیں، مدبھائی سے کہا، ”کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ میریا ہے۔ میں انجکشن لگادیتا ہوں۔“

mdbhain مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس نے ڈاکٹر پنڈو کی بات سنی اور خبر سے اپنی کلاں کے بال اڑاتے ہوئے کہا، ”میں کچھ نہیں جانتا۔ انجکشن دینا ہے تو دے، لیکن اگر اسے کچھ ہو گیا تو۔۔۔“

ڈاکٹر پنڈو کا نپ گیا، ”نہیں مدبھائی۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

mdbhain نے خبر اپنے نیفے میں اڑس لیا، ”تو ٹھیک ہے۔“

”تو میں انجکشن لگاتا ہوں،“ ڈاکٹر نے اپنا بیگ کھولا اور سرخ نکالی۔

”ٹھہرو۔۔۔ ٹھہرو۔۔۔“

mdbhain گھبرا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے سرخ فوراً بیگ میں واپس رکھی دی اور ممیاتے ہوئے مدبھائی سے مخاطب ہوا، ”کیوں؟“

”بس۔۔۔ میں کسی کے سوئی لگتے نہیں دیکھ سکتا۔“ یہ کہہ کر وہ کھولی سے باہر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ساتھی بھی چلے گئے۔

ڈاکٹر پنڈو نے میرے کونین کا انجکشن لگایا، بڑے سلیقے سے۔ ورنہ میریا کا یہ انجکشن بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں نے اس سے فیس پوچھی۔ اس نے کہا، ”دس روپے!“ میں تکیے کے نیچے سے اپنا بڑا نکال رہا تھا کہ مدبھائی اندر آگیا۔ اس وقت میں دس روپے کا نوٹ ڈاکٹر پنڈو کو دے رہا تھا۔

ممدبھائی نے غضب آؤ دنگا ہوں سے مجھے اور ڈاکٹر کو دیکھا اور گرج کر کہا، ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے کہا، ”فیں دے رہا ہوں۔“ ”ممدبھائی ڈاکٹر پنٹو سے مخاطب ہوا، ”سالے یہ فیں کیسی لے رہے ہو؟“ ڈاکٹر پنٹو بوكھلا گیا، ”میں کب لے رہا ہوں--- یہ دے رہے تھے!“

”سالا--- ہم سے فیں لیتے ہو--- واپس کرو یہ نوٹ!“ ممدبھائی کے لجھ میں اس کے خبرداری تیزی تھی۔ ڈاکٹر پنٹو نے مجھے نوٹ واپس کر دیا اور بیگ بند کر کے ممدبھائی سے مذکور طلب کرتے ہوئے چلا گیا۔

ممدبھائی نے ایک انگلی سے اپنی کاٹوں ایسی موچھوں کو تاکہ دیا اور مسکرا یا، ”موٹوبھائی۔“ یہ بھی کوئی بات ہے کہ اس علاقے کا ڈاکٹر تم سے فیں لے--- تمہاری قسم، اپنی موچھیں منڈوادیتا اگر اس سالے نے فیں لی ہوتی۔ یہاں سب تمہارے غلام ہیں۔“

تحوڑے سے توقف کے بعد میں نے اس سے پوچھا، ”ممدبھائی! تم مجھے کیسے جانتے ہو؟“ ممدبھائی کی موچھیں تھر تھرائیں۔ ”ممدبھائی کے نہیں جانتا۔ ہم یہاں کے بادشاہ ہیں پیارے--- اپنی رعایا کا خیال رکھتے ہیں۔ ہماری سی آئی ڈی ہے۔ وہ ہمیں بتانی رہتی ہے۔ کون آیا ہے، کون گیا ہے، کون اچھی حالت میں ہے، کون بڑی حالت میں۔۔۔ تمہارے متعلق ہم سب کچھ جانتے ہیں۔“

میں نے از راہ تفنن پوچھا، ”کیا جانتے ہیں آپ؟“

”سالا--- ہم کیا نہیں جانتے۔۔۔ تم امر تسر کا رہنے والا ہے۔۔۔ کشمیری ہے۔۔۔ یہاں اخباروں میں کام کرتا ہے۔۔۔ تم نے بسم اللہ ہوٹل کے دس روپے دینے ہیں، اسی لیے تم ادھر سے نہیں گزرتے۔ بھنڈی بازار میں ایک پان والا تمہاری جان کرو تو تاہے۔ اس سے تم بیس روپے دس آنے کے سگریٹ لے کر پھونک چکے ہو۔“

میں پانی پانی ہو گیا۔

ممدبھائی نے اپنی کرخت موچھوں پر ایک انگلی پھیری اور مسکرا کر کہا ”موٹوبھائی! کچھ فکرناہ کرو۔ تمہارے سب قرض چکا دیے گئے ہیں۔ اب تم نئے سرے سے معاملہ شروع کر سکتے ہو۔ میں نے ان سالوں سے کہہ دیا ہے کہ خبردار! اگر وہ مٹوبھائی کو تم نے تنگ کیا۔۔۔ اور مہد بھائی تم سے کہتا ہے کہ انشاء اللہ کوئی تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔“

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے کیا ہوں۔ بیمار تھا، کوئی نہیں کاٹیکہ لگ چکا تھا۔ جس کے باعث کانوں میں شائیں شائیں ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ میں اس کے خلوص کے نیچے اتنا دب چکا تھا کہ اگر مجھے کوئی نکالنے کی کوشش کرتا تو اسے بہت محنت کرنی پڑتی۔۔۔ میں صرف اتنا کہہ سکا، ”مدد بھائی! خدا تمہیں زندہ رکھے۔۔۔ تم خوش رہو۔“

مدد بھائی نے اپنی موچھوں کے بال ذرا اوپر کیے اور کچھ کہے بغیر چلا گیا۔

ڈاکٹر پنڈو ہر روز صبح شام آتا رہا۔ میں نے اس سے کئی مرتبہ فیس کا ذکر کیا مگر اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا، ”نہیں، مسٹر منڈو! مدد بھائی کا معاملہ ہے میں ایک ڈبڑھیا بھی نہیں لے سکتا۔“

میں نے سوچا یہ مدد بھائی کوئی بہت بڑا آدمی ہے۔ یعنی خوفناک قسم کا جس سے ڈاکٹر پنڈو جو بڑا خسیں قسم کا آدمی ہے، ڈرتا ہے اور مجھ سے فیس لینے کی جرأت نہیں کرتا۔ حالانکہ وہ اپنی حیب سے انجکشنوں پر خرچ کر رہا ہے۔

بیماری کے دوران میں مدد بھائی بھی بلاناغہ آتا رہا۔ کبھی صبح آتا، کبھی شام کو، اپنے چھ سات شاگردوں کے ساتھ۔ اور مجھے ہر ممکن طریقے سے ڈھارس دیتا تھا کہ معمولی ملیریا ہے، تم ڈاکٹر پنڈو کے علاج سے انشاء اللہ بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔

پندرہ روز کے بعد میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ اس دوران میں مدد بھائی کے ہر خود خال کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔

جیسا کہ میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں، وہ چھریرے بدن کا آدمی تھا۔ عمر یہی پچھیں تیس کے درمیان ہو گی۔ تسلی تسلی بانہیں، ٹانگیں بھی ایسی ہی تھیں۔ ہاتھ بلا کے پھر تیلے تھے۔ ان سے جب وہ چھوٹا تیز دھار چاقو کسی دشمن پر پھینکتا تھا تو وہ سیدھا اس کے دل میں کھبٹا تھا۔ یہ مجھے عرب کی گلی نے بتایا تھا۔

اس کے متعلق بے شمار باتیں مشہور تھیں، اس نے کسی کو قتل کیا تھا، میں اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ چھری ماروہ اول درجے کا تھا۔ بنوٹ اور گنگتے کا ماہر۔ یوں سب کہتے تھے کہ وہ سینکڑوں قتل کر چکا ہے، مگر میں یہ اب بھی ماننے کو تیار نہیں۔

لیکن جب میں اس کے خبر کے متعلق سوچتا ہوں تو میرے تن بدن پر جھر جھری سی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ خوفناک ہتھیار وہ کیوں ہر وقت اپنی شلوار کے نیفے میں اڑ سے رہتا ہے۔

میں جب اچھا ہو گیا تو ایک دن عرب گلی کے ایک تھرڈ کلاس چینی ریستوران میں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ اپنا وہی خوفناک خبر نکال کر اپنے ناخن کاٹ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا، ”مدبھائی۔ آج کل بندوق پستول کا زمانہ ہے۔ تم یہ خبر کیوں لیے پھرتے ہو؟“

مدبھائی نے اپنی کرخت موچھوں پر ایک انگلی پھیری اور کہا، ”و مٹوبھائی! بندوق پستول میں کوئی مزانہیں۔ انھیں کوئی بچہ بھی چلا سکتا۔ گھوڑا دبایا اور ٹھاہ۔ اس میں کیا مزا ہے۔ یہ چیز۔ یہ خبر۔ یہ چھری۔ یہ چاقو۔ مرا آتا ہے نا، خدا کی قسم۔۔۔ یہ وہ ہے۔۔۔ تم کیا کہا کرتے ہو۔۔۔ ہا۔۔۔ آرٹ۔۔۔ اس میں آرٹ ہوتا ہے میری جان۔۔۔ جس کو چاقو یا چھری چلانے کا آرٹ نہ آتا ہو وہ ایک دم کنڈم ہے۔ پستول کیا ہے۔۔۔ کھلونا ہے۔۔۔ جو نقصان پہنچا سکتا ہے۔۔۔ پر اس میں کیا لطف آتا ہے۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ تم یہ خبیر دیکھو۔۔۔ اس کی تیز دھار دیکھو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے انگوٹھے پر لب لگایا اور اس کی دھار پر پھیرا۔ ”اس سے کوئی دھماکہ نہیں ہوتا۔۔۔ بس، یوں پیٹ کے اندر داخل کر دو۔۔۔ اس صفائی سے کہ اس سالے کو معلوم تک نہ ہو۔۔۔ بندوق، پستول سب بکواس ہے۔“

مدبھائی سے اب ہر روز کسی نہ کسی وقت ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں اس کا ممنون احسان تھا۔۔۔ لیکن جب میں اس کا ذکر کیا کرتا تو وہ ناراض ہو جاتا۔ کہتا تھا کہ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا، یہ تو میرا فرض تھا۔

جب میں نے کچھ تفتیش کی تو مجھے معلوم ہوا کہ فارس روڈ کے علاقے کا وہ ایک قسم کا حاکم ہے۔ ایسا حاکم جو ہر شخص کی خبر گیری کرتا تھا۔ کوئی بیمار ہو، کسی کے کوئی تکلیف ہو، مدبھائی اس کے پاس پہنچ جاتا تھا اور یہ اس کی سی آئی ڈی کا کام تھا جو اس کو ہر چیز سے باخبر رکھتی تھی۔

وہ دادا تھا یعنی ایک خطرناک غنڈہ۔ لیکن میری سمجھ میں اب بھی نہیں آتا کہ وہ کس لحاظ سے غنڈہ تھا۔ خدا واحد شاہد ہے کہ میں نے اس میں کوئی غنڈہ پن نہیں دیکھا۔ ایک صرف اس کی موچھیں تھیں جو اس کو بیت ناک بنائے رکھتی تھیں۔ لیکن اس کو ان سے پیار تھا۔ وہ ان کی اس طرح پروردش کرتا تھا جس طرح کوئی اپنے بچے کی کرے۔

اس کی موچھوں کا ایک ایک بال کھڑا تھا، جیسے خار بشت کا۔۔۔ مجھے کسی نے بتایا کہ مدبھائی ہر روز اپنی موچھوں کو بالائی کھلاتا ہے۔ جب کھانا کھاتا ہے تو سالن بھری انگلیوں سے اپنی موچھیں ضرور مر وڑتا ہے کہ بزرگوں کے کہنے کے مطابق یوں بالوں میں طاقت آتی ہے۔

میں اس سے پیشتر غالباً کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ اس کی مونچھیں بڑی خوفناک تھیں۔ دراصل مونچھوں کا نام ہی مدبھائی تھا۔۔۔ یا اس خبر کا جو اس کی تنگ گھیرے کی شلوار کے نیفے میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔ مجھے ان دونوں چیزوں سے ڈر لگتا تھا، نہ معلوم کیوں۔۔۔

mdbhainyipos تو اس علاقے کا بہت بڑا دادا تھا، لیکن وہ سب کا ہمدرد تھا۔ معلوم نہیں اس کی آدمی کے کیا ذرا رائع تھے، پر وہ ہر حاجت مند کی بروقت مدد کرتا تھا۔ اس علاقے کی تمام رنٹیاں اس کو اپنا پیر مانتی تھی۔ چونکہ وہ ایک مانا ہوا غمذہ تھا، اس لیے لازم تھا کہ اس کا تعلق وہاں کی کسی طوائف سے ہوتا، مگر مجھے معلوم ہوا کہ اس قسم کے سلسلے سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں رہا تھا۔

میری اس کی بڑی دوستی ہو گئی تھی۔ ان پڑھ تھا، لیکن جانے کیوں وہ میری اتنی عزت کرتا تھا کہ عرب گلی کے تمام آدمی رشک کرتے تھے۔ ایک دن صح سویرے، دفتر جاتے وقت میں نے چینی کے ہوٹل میں کسی سے سنا کہ مدبھائی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ مجھے بہت تعجب ہوا، اس لیے کہ تمام تھانے والے اس کے دوست تھے۔ کیا وجہ ہو سکتی تھی۔۔۔ میں نے اس کے آدمی سے پوچھا کہ کیا بات ہوئی جو مدبھائی گرفتار ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اسی عرب گلی میں ایک عورت رہتی ہے، جس کا نام شیریں بائی ہے۔ اس کی ایک جوان لڑکی ہے، اس کو کل ایک آدمی نے خراب کر دیا۔ یعنی اس کی عصمت دری کر دی۔ شیریں بائی روئی ہوئی مدبھائی کے پاس آئی اور اس سے کہا، ”تم یہاں کے دادا ہو۔ میری بیٹی سے فلاں آدمی نے یہ برآ کیا ہے۔۔۔ لعنت ہے تم پر کہ تم گھر میں بیٹھے ہو۔“ مدبھائی نے یہ موٹی گالی اس بڑھیا کو دی اور کہا۔ ”تم چاہتی کیا ہو؟“ اس نے کہا، ”میں چاہتی ہوں کہ تم اس حرمازادے کا پیٹ چاک کر دو۔“

mdbhainyipos مدبھائی اس وقت ہوٹل میں سیس پاؤ کے ساتھ قیمه کھارہا تھا۔ یہ سن کر اس نے اپنے نیفے میں سے خبر نکالا۔ اس پر انگوٹھا پھیر کر اس کی دھار دیکھی اور بڑھیا سے کہا، ”جا۔۔۔ تیرا کام ہو جائے گا۔“

اور اس کا کام ہو گیا۔۔۔ دوسرے معنوں میں جس آدمی نے اس بڑھیا کی لڑکی کی عصمت دری کی تھی، آدھ گھنٹے کے اندر اندر اس کا کام تمام ہو گیا۔

mdbhainyipos مدبھائی گرفتار تو ہو گیا تھا، مگر اس نے کام اتنی ہوشیاری اور چاک دستی سے کیا تھا کہ اس کے خلاف کوئی شہادت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی عینی شاہد موجود بھی ہوتا تو وہ کبھی عدالت میں بیان نہ دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔

دودن حوالات میں رہا تھا، مگر اس کو وہاں کوئی تکلیف نہ تھی۔ پولیس کے سپاہی، انسپکٹر، سب انسپکٹر سب اس کو جانتے تھے۔ لیکن جب وہ ضمانت پر رہا ہو کر باہر آیا تو میں نے محسوس کیا کہ اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھچکا پہنچا ہے۔ اس کی موچھیں جو خوفناک طور پر اور کوئی اٹھی ہوتی تھیں اب کسی قدر جھکی ہوئی تھیں۔

چینی کے ہوٹل میں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کے کپڑے جو ہمیشہ اجلے ہوتے تھے، میلے تھے۔ میں نے اس سے قتل کے متعلق کوئی بات نہ کی لیکن اس نے خود کہا، ”مٹو صاحب! مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ سالادیر سے مر۔۔۔ چھری مارنے میں مجھ سے غلطی ہو گئی، ہاتھ ٹیڑھا پڑا۔۔۔ لیکن وہ بھی اس سالے کا تصور تھا۔۔۔ ایک دم مر گیا اور اس وجہ سے سارا معاملہ کنڈم ہو گیا۔۔۔ لیکن مر گیا۔۔۔ ذرا تکلیف کے ساتھ، جس کا مجھے افسوس ہے۔“

آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ میرا د عمل کیا ہو گا۔ یعنی اس کو افسوس تھا کہ وہ اسے بطریق احسن قتل نہ کر سکا، اور یہ کہ مر نے میں اسے ذرا تکلیف ہوئی ہے۔

مقدمہ چلنا تھا۔۔۔ اور مدد بھائی اس سے بہت گھبراتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں عدالت کی شکل کبھی نہیں دیکھی تھی۔ معلوم نہیں اس نے اس سے پہلے کبھی قتل کیے تھے کہ نہیں لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق تھا وہ مجرمیت، وکیل اور گواہ کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا، اس لیے کہ اس کا سابقہ ان لوگوں سے کبھی پڑا نہیں تھا۔

وہ بہت فکر مند تھا۔ پولیس نے جب کیس پیش کرنا چاہا اور تاریخ مقرر ہو گئی تو مدد بھائی بہت پریشان ہو گیا۔ عدالت میں مجرمیت کے سامنے کیسے حاضر ہو جاتا ہے، اس کے متعلق اس کو قطعاً معلوم نہیں تھا۔ بار بار وہ اپنی کرخت موچھوں پر انگلیاں پھیرتا اور مجھ سے کہتا تھا، ”وٹو صاحب! میں مر جاؤں گا پر کوئی نہیں جاؤں گا۔۔۔ سالی، معلوم نہیں کیسی جگہ ہے۔“

عرب گلی میں اس کے کئی دوست تھے۔ انہوں نے اس کو ڈھارس دی کہ معاملہ نگینے نہیں ہے۔ کوئی گواہ موجود نہیں، ایک صرف اس کی موچھیں ہیں جو مجرمیت کے دل میں اس کے خلاف یقینی طور پر کوئی مخالف جذبہ پیدا کر سکتی ہیں۔

جبسا کہ میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں کہ اس کی صرف موچھیں ہی تھیں جو اس کو خوفناک بناتی تھیں۔۔۔ اگر یہ نہ ہو تین تو وہ ہرگز ہرگز ”دادا“ دکھائی نہ دیتا۔

اس نے بہت غور کیا۔ اس کی صفات تھانے ہی میں ہو گئی تھی۔ اب اسے عدالت میں پیش ہونا تھا۔ مجسٹریٹ سے وہ بہت گھبراتا تھا۔ ایرانی کے ہوٹل میں جب میری ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت پریشان ہے۔ اس کو اپنی موچھوں کے متعلق بڑی فکر تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ ان کے ساتھ اگر وہ عدالت میں پیش ہو تو بہت ممکن ہے اس کو سزا ہو جائے۔

آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کہانی ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ بہت پریشان تھا۔ اس کے تمام شاگرد حیران تھے، اس لیے کہ وہ کبھی حیران و پریشان نہیں ہوا تھا۔ اس کو موچھوں کی فکر تھی کیوں کہ اس کے بعض قریبی دوستوں نے اس سے کہا تھا، ”مدبھائی۔۔۔ کورٹ میں جانا ہے تو ان موچھوں کے ساتھ کبھی نہ جانا۔۔۔ مجسٹریٹ تم کو اندر کر دے گا۔“

اور وہ سوچتا تھا۔۔۔ ہر وقت سوچتا تھا کہ اس کی موچھوں نے اس آدمی کو قتل کیا ہے یا اس نے۔۔۔ لیکن کسی نتیجے پر پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنا خبیر معلوم نہیں جو پہلی مرتبہ خون آشنا ہوا تھا یا اس سے پہلے کئی مرتبہ ہو چکا تھا، اپنے نیفے سے نکلا اور ہوٹل کے باہر گلی میں پھینک دیا۔ میں نے حیرت بھرے لمحے میں اس سے پوچھا، ”مدبھائی۔۔۔ یہ کیا؟“

”کچھ نہیں و مٹوبھائی۔۔۔ بہت گھوٹالا ہو گیا ہے۔ کورٹ میں جانا ہے۔۔۔ یار دوست کہتے ہیں کہ تمہاری موچھیں دیکھ کر وہ ضرور تم کو سزادے گا۔۔۔ اب بولو، میں کیا کروں؟“

میں کیا بول سکتا تھا۔ میں نے اس کی موچھوں کی طرف دیکھا جو واقعی بڑی خوفاک تھیں۔ میں نے اس سے صرف اتنا کہا، ”مدبھائی! بات تو ٹھیک ہے۔۔۔ تمہاری موچھیں مجسٹریٹ کے فیصلے پر ضرور اثر انداز ہوں گی۔۔۔ سچ پوچھو تو جو کچھ ہو گا، تمہارے خلاف نہیں۔۔۔ موچھوں کے خلاف ہو گا۔“

”تو میں منڈوادوں؟“ مدبھائی نے اپنی چینیتی موچھوں پر بڑے پیار سے انگلی پھیری۔

میں نے اس سے پوچھا، ”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میر اخیال جو کچھ بھی ہو، وہ تم نہ پوچھو۔۔۔ لیکن یہاں ہر شخص کا یہی خیال ہے کہ میں انھیں منڈوادوں تاکہ وہ سالا مجسٹریٹ مہربان ہو جائے۔ تو منڈوادوں و مٹو بھائی؟“

میں نے کچھ تو قف کے بعد اس سے کہا، ”ہاں، اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو منڈوادو۔۔۔ عدالت کا سوال ہے اور تمہاری موچھیں واقعی بڑی خوفناک ہیں۔۔۔“

دوسرے دن محمد بھائی نے اپنی موچھیں۔۔۔ اپنی جان سے عزیز موچھیں منڈوادا لیں۔ کیوں کہ اس کی عزت خطرے میں تھی۔۔۔ لیکن صرف دوسرے کے مشورے پر۔۔۔

مسٹر ایف، ایچ، ٹیک کی عدالت میں اس کا مقدمہ پیش ہوا۔ موچھوں کے بغیر محمد بھائی پیش ہوا۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ اس کے خلاف کوئی شہادت موجود نہیں تھی، لیکن مجسٹریٹ صاحب نے اس کو خطرناک غنڈہ قرار دیتے ہوئے تڑپار یعنی صوبہ بدر کر دیا۔ اس کو صرف ایک دن ملا تھا جس میں اسے اپنا تمام حساب کتاب طے کر کے بمبئی چھوڑ دینا تھا۔

عدالت سے باہر نکل کر اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ اس کی چھوٹی بڑی انگلیاں بار بار بالائی ہونٹ کی طرف بڑھتی تھیں۔۔۔ مگر وہاں کوئی بال ہی نہیں تھا۔

شام کو جب اسے بمبئی چھوڑ کر کہیں اور جانا تھا، میری اس کی ملاقات ایرانی کے ہوٹل میں ہوئی۔ اس کے دس بیس شاگرد آس پاس کر سیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ جب میں اس سے ملا تو اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔۔۔ موچھوں کے بغیر وہ بہت شریف آدمی دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت مغموم ہے۔

اس کے پاس کرسی پر بیٹھ کر میں نے اس سے کہا، ”کیا بات ہے محمد بھائی؟“

اس نے جواب میں ایک بہت بڑی گالی خدا معلوم کس کو دی اور کہا، ”سالا، اب محمد بھائی ہی نہیں رہا۔“

مجھے معلوم تھا کہ وہ صوبہ بدر کیا چکا ہے۔ ”کوئی بات نہیں محمد بھائی!۔۔۔ یہاں نہیں تو کسی اور جگہ سکی!“

اس نے تمام جگہوں کو بے شمار گالیاں دیں۔ ”سالا۔۔۔ اپن کو یہ غم نہیں۔۔۔ یہاں رہیں یا کسی اور جگہ رہیں۔۔۔ یہ سالا مونچھیں کیوں
منڈوا سکیں؟“

پھر اس نے ان لوگوں کو جنہوں نے اس کو مونچھیں منڈوانے کا مشورہ دیا تھا، ایک کروڑ گالیاں دیں اور کہا۔ ”سالا اگر مجھے تڑی پار ہی ہونا تھا
تو مونچھوں کے ساتھ کیوں نہ ہوا۔۔۔“

مجھے ہنسی آگئی۔ وہ آگ بکولا ہو گیا۔ ”سالا تم کیسا آدمی ہے، وہ مٹو۔۔۔ ہم سچ کہتا ہے، خدا کی قسم۔۔۔ ہمیں چنانی لگا دیتے۔۔۔ پر۔۔۔ یہ بے
وقوفی تو ہم نے خود کی۔۔۔ آج تک کسی سے نہ ڈرا تھا۔۔۔ سالا اپنی مونچھوں سے ڈر گیا۔“ یہ کہہ کر اس نے دو ہتر اپنے منہ پر مارا۔ ”مد بھائی
لعنت ہے تجھ پر۔۔۔ سالا۔۔۔ اپنی مونچھوں سے ڈر گیا۔۔۔ اب جا اپنی ماں کے۔۔۔“

اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے جو اس کے مونچھوں بغیر چھرے پر کچھ عجیب سے دکھائی دیتے تھے۔

-[61]-

سہاۓ: سعادت حسن منٹو

”یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں، یہ کہو کہ دولاکھ انسان مرے ہیں۔ اور یہ اتنی بڑی ٹریجیڈی نہیں کہ دولاکھ
انسان مرے ہیں، ٹریجیڈی اصل میں یہ ہے کہ مارنے اور مرنے والے کسی بھی کھاتے میں نہیں گئے۔ ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ
سمجھا ہو گا کہ ہندو مذہب مر گیا ہے، لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کر کے ہندوؤں نے بغایب بجائی
ہوں گی کہ اسلام ختم ہو گیا ہے، مگر حقیقت آپ کے سامنے ہے کہ اسلام پر ایک بلکل سی خراش بھی نہیں آئی۔ وہ لوگ بے وقوف ہیں جو
سمجھتے ہیں کہ بندوں سے مذہب شکار کیے جاسکتے ہیں۔۔۔ مذہب، دین، ایمان، دھرم، یقین، عقیدت۔۔۔ یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم
میں نہیں، روح میں ہوتا ہے۔۔۔ چھرے، چاقو اور گولی سے یہ کیسے فنا ہو سکتا ہے؟“

ممتاز اس روز بہت ہی پر جوش تھا۔ ہم صرف تین تھے جو اسے جہاز پر چھوڑنے کے لیے آئے تھے۔۔۔ وہ ایک غیر معین عرصے کے لیے ہم سے جدا ہو کر پاکستان جا رہا تھا۔۔۔ پاکستان، جس کے وجود کے متعلق ہم میں سے کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔

ہم تینوں ہندو تھے۔ مغربی پنجاب میں ہمارے رشتہ داروں کو بہت مالی اور جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ممتاز ہم سے جدا ہو رہا تھا۔ جگل کو لاہور سے خط ملا کہ فسادات میں اسکا چیمارا گیا ہے تو اس کو بہت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اسی صدمے کے زیر اثر باتوں باتوں میں ایک دن اس نے ممتاز سے کہا، ”میں سوچ رہا ہوں اگر ہمارے محلے میں فساد شروع ہو جائے تو میں کیا کروں گا۔“

ممتاز نے اس سے پوچھا، ”کیا کرو گے؟“ جگل نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا، ”میں سوچ رہا ہوں، بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں۔“

یہ سن کر ممتاز بالکل خاموش ہو گیا اور اس کی یہ خاموشی تقریباً آٹھ روز تک قائم رہی اور اس وقت ٹوٹی جب اس نے اچانک ہمیں بتایا کہ وہ پونے چار بجے سمندری جہاز سے کراچی جا رہا ہے۔

ہم تینوں میں سے کسی نے اس کے اس ارادے کے متعلق بات چیت نہ کی۔ جگل کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ ممتاز کی روائی کا باعث اس کا یہ جملہ ہے، ”میں سوچ رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے، میں تمہیں مار ڈالوں۔“ غالباً وہ اب تک یہی سوچ رہا تھا کہ وہ مشتعل ہو کر ممتاز کو مار سکتا ہے یا نہیں۔۔۔ ممتاز کو جو کہ اس کا جگری دوست تھا۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہم تینوں میں سب سے زیادہ خاموش تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ممتاز غیر معمولی طور پر باقونی ہو گیا تھا۔۔۔ خاص طور پر روائی سے چند گھنٹے پہلے۔

صحیح اٹھتے ہی اس نے پیشہ شروع کر دی۔ اسباب وغیرہ کچھ اس انداز سے باندھا اور بندھوایا جیسے وہ کہیں سیر و تفریخ کے لیے جا رہا ہے۔۔۔ خود ہی بات کرتا تھا اور خود ہی ہستا تھا۔ کوئی اور دیکھتا تو سمجھتا کہ وہ بمبئی چھوڑنے میں ناقابل بیان مسرت محسوس کر رہا ہے، لیکن ہم تینوں اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ صرف اپنے جذبات پھپانے کیلئے ہمیں اور اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔

میں نے بہت چاہا کہ اس سے اس کی یک لخت روائی کے متعلق بات کروں۔ اشارہ میں نے جگل سے بھی کہا کہ وہ بات چھیڑے مگر ممتاز نے ہمیں کوئی موقعہ ہی نہ دیا۔

جگل تین چار پگ پی کر اور بھی زیادہ خاموش ہو گیا اور دوسرا سرے کمرے میں لیٹ گیا۔ میں اور برج موہن اس کے ساتھ رہے۔ اسے کئی بل ادا کرنے تھے۔ ڈاکٹروں کی فیسیں دینی تھیں۔ لانڈری سے کپڑے لانے تھے۔۔۔ یہ سب کام اس نے ہنستے کھلیتے کیے، لیکن جب اس نے ناکے کے ہوٹل کے بازو والی دکان سے ایک پان لیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ برج موہن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر وہاں سے چلتے ہوئے اس نے ہولے سے کہا، ”یاد ہے برج۔۔۔ آج سے دس برس پہلے جب ہمارا حال بہت پتلا تھا، گوبند نے ہمیں ایک روپیہ ادھار دیا تھا۔“

راتستے میں ممتاز خاموش رہا۔ مگر گھر پہنچتے ہی اس نے پھر باتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا، ایسی باتوں کا جن کا سر تھا نہ پیر، لیکن وہ کچھ ایسی پر خلوص تھیں کہ میں اور برج موہن برابر ان میں حصہ لیتے رہے۔ جب روائی کا وقت قریب آیا تو جگل بھی شامل ہو گیا، لیکن جب ٹیکسی بندر گاہ کی طرف چلی تو سب خاموش ہو گئے۔

متاز کی نظریں بمبی کے وسیع اور کشادہ بازاروں کو الوداع کہتی رہیں۔ حتیٰ کہ ٹیکسی اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئی۔ بے حد بھیڑ تھی۔ ہزارہا ریفیو جی جارہے تھے۔ خوشحال بہت کم اور بدحال بہت زیادہ۔۔۔ بے پناہ ہجوم تھا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اکیلا ممتاز جا رہا ہے۔ ہمیں چھوڑ کر ایسی جگہ جا رہا ہے جو اس کی دیکھی بھالی نہیں۔ جو اس کے manus بنانے پر بھی اجنبی رہے گی۔ لیکن یہ میرا اپنا خیال تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ممتاز کیا سوچ رہا تھا۔

جب کیہن میں سارا سامان چلا گیا تو ممتاز ہمیں عرش پر لے گیا۔۔۔ ادھر جہاں آسمان اور سمندر آپس میں مل رہے تھے، ممتاز دیر تک دیکھتا رہا، پھر اس نے جگل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا، ”یہ محض فریب نظر ہے۔۔۔ آسمان اور سمندر کا آپس میں ملنا۔۔۔ لیکن یہ فریب نظر کس قدر دلکش ہے۔۔۔ یہ ملاپ!“

جگل خاموش رہا۔ غالباً اس وقت بھی اس کے دل و دماغ میں اس کی یہ کہی ہوئی بات چکلیاں لے رہی تھی، ”میں سوچ رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں۔“

متاز نے جہاز کے بار سے برائی میگوائی، کیونکہ وہ صحیح سے بھی پی رہا تھا۔۔۔ ہم چاروں گلاس ہاتھ میں لیے جنگلے کے ساتھ کھڑے تھے۔ ریفیو جی ادھر ادھر جہاز میں سوار ہو رہے تھے اور قریب قریب ساکن سمندر پر آبی پرندے منڈلارہے تھے۔

جگل نے دفعتاً ایک ہی جرے میں اپنا گلاس ختم کیا اور نہایت ہی بھونڈے انداز میں ممتاز سے کہا، ”مجھے معاف کر دینا ممتاز۔۔۔ میر اخیال ہے میں نے اس روز تمہیں دکھ پہنچایا تھا۔“

ممتاز نے تھوڑے توقف کے بعد جگل سے سوال کیا، ”جب تم نے کہا تھا میں سوچ رہا ہوں۔۔۔ بہت ممکن ہے میں تمہیں مارڈالوں۔۔۔ کیا اس وقت واقعی تم نے یہی سوچا تھا۔۔۔ نیک دلی سے اسی نتیجے پر پہنچے تھے۔“

جگل نے اثبات میں سر ہلا کیا، ”لیکن مجھے افسوس ہے۔“

”تم مجھے مارڈا لتے تو تمہیں زیادہ افسوس ہوتا۔“ ممتاز نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”لیکن صرف اس صورت میں اگر تم نے غور کیا ہوتا کہ تم نے ممتاز کو۔۔۔ ایک مسلمان کو۔۔۔ ایک دوست کو نہیں بلکہ ایک انسان کو مارا ہے۔۔۔ وہ اگر حرامزادہ تھا تو تم نے اس کی حرمازدگی کو نہیں بلکہ خود اس کو مارڈا ہے۔۔۔ وہ اگر مسلمان تھا تو تم نے اس کی مسلمانی کو نہیں اس کی ہستی کو ختم کیا ہے۔۔۔ اگر اس کی لاش مسلمانوں کے ہاتھ آتی تو قبرستان میں ایک قبر کا اضافہ ہو جاتا۔ لیکن دنیا میں ایک انسان کم ہو جاتا۔“

تھوڑی دیر خاموش رہنے اور کچھ سوچنے کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا، ”ہو سکتا ہے، میرے ہم مذہب مجھے شہید کہتے، لیکن خدا کی قسم اگر ممکن ہوتا تو میں قبر پھاڑ کر چلانا شروع کر دیتا۔ مجھے شہادت کا یہ رتبہ قبول نہیں۔۔۔ مجھے یہ ڈگری نہیں چاہیے جس کا امتحان میں نے دیا ہی نہیں۔۔۔ لاہور میں تمہارے چچا کو ایک مسلمان نے مارڈا۔۔۔ تم نے یہ خبر بھی میں سنی اور مجھے قتل کر دیا۔۔۔ بتاؤ، تم اور میں کس تمنگ کے مستحق ہیں؟ اور لاہور میں تمہارا چچا اور اس کا قاتل کس خلعت کا حقدار ہے۔۔۔ میں تو یہ کہوں گا، مرنے والے کے کی موت میرے اور مارنے والوں نے بیکار۔۔۔ بالکل بیکار اپنے ہاتھ خون سے رنگے۔۔۔“

باتیں کرتے کرتے ممتاز بہت جذباتی ہو گیا۔ لیکن اس زیادتی میں خلوص برابر کا تھا۔ میرے دل پر خصوصاً اس کی اس بات کا بہت اثر ہوا کہ مذہب، دین، ایمان، لیقین، دھرم، عقیدت۔۔۔ یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم کے بجائے روح میں ہوتا ہے۔ جو چھرے، چاقو اور گولی سے فنا نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ میں نے اس سے کہا، ”تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔“

یہ سن کر ممتاز نے اپنے خیالات کا جائزہ لیا اور قدرے بے چینی سے کہا، ”نہیں بالکل ٹھیک نہیں۔۔۔ میر امطلب ہے کہ یہ سب ٹھیک تو ہے۔ لیکن شاید میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اچھی طرح ادا نہیں کر سکا۔۔۔ مذہب سے میری مراد، یہ مذہب نہیں، یہ دھرم نہیں، جس میں

ہم میں سے نانوے فی صدی بٹلا ہیں۔۔۔ میری مراد اس خاص چیز سے ہے جو ایک انسان کو دوسراے انسان کے مقابلے میں جدا گانہ حیثیت بخشتی ہے۔۔۔ وہ چیز جو انسان کو حقیقت میں انسان ثابت کرتی ہے۔۔۔ لیکن یہ چیز کیا ہے؟ افسوس ہے کہ میں اسے ہتھیلی پر رکھ کر نہیں دکھان سکتا۔” یہ کہتے کہتے ایک دم اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی اور اس نے جیسے خود سے پوچھنا شروع کیا، ”لیکن اس میں وہ کون سی خاص بات تھی؟ کٹھنے والا۔۔۔ پیشہ نہایت ہی ذلیل لیکن اس کے باوجود اس کی روح کس قدر روشن تھی؟“

میں نے پوچھا، ”کس کی؟“

”ایک بھڑوے کی۔“ ہم تینوں چونک پڑے۔ ممتاز کے لبھے میں کوئی تکف نہیں تھا، اس لیے میں نے سنجیدگی سے پوچھا، ”ایک بھڑوے کی؟“

ممتاز نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”مجھے حیرت ہے کہ وہ کیسا انسان تھا اور زیادہ حیرت اس بات کی ہے کہ وہ عرفِ عام میں ایک بھڑوا تھا۔۔۔ عورتوں کا دلال۔۔۔ لیکن اس کا ضمیر بہت صاف تھا۔“

ممتاز تھوڑی دیر کے لیے رک گیا، جیسے وہ پرانے واقعات اپنے دماغ میں تازہ کر رہا ہے۔۔۔ چند لمحات کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا، ”اس کا پورا نام مجھے یاد نہیں۔۔۔ کچھ سہائے تھا۔۔۔ بنارس کا رہنے والا۔۔۔ بہت ہی صفائی پسند۔۔۔ وہ جگہ جہاں وہ رہتا تھا گو بہت ہی چھوٹی تھی مگر اس نے بڑے سلیقے سے اسے مختلف خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔۔۔ پردے کا معقول انتظام تھا۔۔۔ چار پائیاں اور پنکھ نہیں تھے۔ لیکن گدیلے اور گاؤں تکیے موجود تھے۔۔۔ چادریں اور غلاف وغیرہ ہمیشہ اجلے رہتے تھے۔۔۔ نوکر موجود تھا مگر صفائی وہ خود اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔۔۔ صرف صفائی ہی نہیں، ہر کام۔۔۔ اور وہ سر سے بلا کبھی نہیں ٹالتا تھا۔۔۔ دھوکا اور فریب نہیں کرتا تھا۔۔۔ رات زیادہ گزر گئی ہے اور آس پاس سے پانی ملی شراب ملتی ہے تو وہ صاف کہہ دیتا تھا کہ صاحب اپنے میے صالح نہ کیجیے۔۔۔ اگر کسی لڑکی کے متعلق اسے شک ہے تو وہ چھپا تا نہیں تھا۔۔۔ اور تو اور اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ تین برس کے عرصے میں میں ہزار روپے کماچکا ہے۔۔۔ ہر دس میں سے ڈھانی کمیشن کے لے کر۔۔۔ اسے صرف دس ہزار اور بنانے تھے۔۔۔ معلوم نہیں صرف دس ہزار اور کیوں، زیادہ کیوں نہیں۔۔۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تیس ہزار روپے پورے کر کے وہ واپس بنارس چلا جائے گا اور بزاں کی دکان کھولے گا۔۔۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ صرف بزاں کی دکان کھولنے کا آرزو مند کیوں تھا۔“

میں یہاں تک سن چکا تو میرے منہ سے نکلا، ”عجب و غریب آدمی تھا۔“

ممتاز نے اپنی گفتگو جاری رکھی، ”میرا خیال تھا کہ وہ سرتاپا بناوٹ ہے۔۔۔ ایک بہت بڑا فراڈ ہے۔ کون یقین کر سکتا ہے کہ وہ ان تمام لڑکوں کو جو اس کے دھنے میں شریک تھیں، اپنی بیٹیاں سمجھتا تھا۔ یہ بھی اس وقت میرے لیے بعید از وہم تھا کہ اس نے ہر لڑکی کے نام پر پوسٹ آفس میں سیوگ اکاؤنٹ کھول رکھا تھا اور ہر مہینے کل آمدنی وہاں جمع کر اتا تھا۔ اور یہ بات تو بالکل ناقابل یقین تھی کہ وہ دوسرے لڑکیوں کے کھانے پینے کا خرچ اپنی جیب سے ادا کرتا ہے۔۔۔ اس کی ہر بات مجھے ضرورت سے زیادہ بناؤٹی معلوم ہوتی تھی۔۔۔ ایک دن میں اس کے یہاں گیا تو اس نے مجھ سے کہا، امینہ اور سکینہ دونوں چھٹی پر ہیں۔۔۔ میں ہر ہفتے ان دونوں کو چھٹی دے دیتا ہوں تاکہ باہر جا کر کسی ہوٹل میں ماس وغیرہ کھا سکیں۔۔۔ یہاں تو آپ جانتے ہیں سب ویشوہیں۔۔۔ میں یہ سن کر دل ہی دل میں مسکرا یا کہ مجھے بنارہا ہے۔۔۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ احمد آباد کی اس ہندو لڑکی نے جس کی شادی اس نے ایک مسلمان گاہک سے کرادی تھی، لاہور سے خط لکھا ہے کہ داتا صاحب کے دربار میں اس نے ایک منت مانی تھی جو پوری ہوئی۔ اب اس نے سہائے کے لیے منت مانی ہے کہ جلدی جلدی اس کے تیس ہزار روپے پورے ہوں اور وہ بنارس جا کر بزاںی کی دکان کھول سکے۔ یہ سن کر تو میں ہنس پڑا۔ میں نے سوچا، چونکہ میں مسلمان ہوں۔ اس لیے مجھے خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

میں نے ممتاز سے پوچھا، ”تمہارا خیال غلط تھا؟“

”بالکل۔۔۔ اس کے قول و فعل میں کوئی بعد نہیں تھا۔۔۔ ہو سکتا ہے اس میں کوئی خامی ہو، بہت ممکن ہے اس سے اپنی زندگی میں کئی لغزشیں سرزد ہوئی ہوں۔۔۔ مگر وہ ایک بہت ہی عمدہ انسان تھا۔“ جگل نے سوال کیا۔ ”یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”اس کی موت پر“ یہ کہہ کر ممتاز کچھ عرصے کے لیے خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے ادھر دیکھنا شروع کیا جہاں آسمان اور سمندر ایک دھنڈلی سی آنغوш میں سمٹے ہوئے تھے۔ ”فسادات شروع ہو چکے تھے۔۔۔ میں علی الصبح اٹھ کر بجنڈی بازار سے گزر رہا تھا۔۔۔ کرفیو کے باعث بازار میں آمد و رفت بہت ہی کم تھی۔ ٹرام بھی نہیں چل رہی تھی۔۔۔ ٹیکسی کی تلاش میں چلتے چلتے جب میں جے جے ہسپتال کے پاس پہنچا، توف پا تھ پر ایک آدمی کو میں نے بڑے سے ٹوکرے کے پاس گھری سی بنتے ہوئے دیکھا۔ میں نے سوچا کوئی پائی والا (مزدور) سورہا ہے۔۔۔ لیکن جب میں نے پتھر کے ٹکڑوں پر خون کے لو تھڑے دیکھے تو رک گیا۔۔۔ واردات قتل کی تھی، میں نے سوچا اپناراستہ لوں، مگر لاش میں حرکت پیدا ہوئی۔۔۔ میں پھر رک گیا آس پاس کوئی نہ تھا۔ میں نے جھک کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے سہائے کا جانا پہچانا چہرہ نظر آیا، مگر خون کے دھبیوں سے بھرا ہوا۔ میں اس کے پاس فٹ پا تھ پر بیٹھ گیا اور غور سے دیکھا۔۔۔ اس کی ٹول کی سفید قمیص جو ہمیشہ بے داغ ہوا کرتی تھی لہو سے لتھڑی ہوئی تھی۔۔۔ زخم شاید پسلیوں کے پاس تھا۔ اس نے ہولے ہولے کر اہنا شروع کر دیا تو

میں نے احتیاط سے اس کا کندھا پکڑ کر ہلا یا جیسے کسی سوتے کو جگایا جاتا ہے۔ ایک دوبار میں نے اس کو نام سے بھی پکارا۔۔۔ میں اٹھ کر جانے ہی والا تھا کہ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔۔۔ دیر تک وہ ان ادھ کھلی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا۔۔۔ پھر ایک دم اس کے سارے بدن میں تنخ کی سی کیفیت پیدا ہوئی اور اس نے مجھے پہچان کر کہا، ”آپ؟۔۔۔ آپ؟“

میں نے اس سے تلنے اوپر بہت سی باتیں پوچھنا شروع کر دی۔ وہ کیسے ادھر آیا۔ کس نے اس کو زخمی کیا۔ کب سے وہ فٹ پا تھوڑا پڑا ہے۔۔۔ سامنے ہسپتال ہے، کیا میں وہاں اطلاع دوں؟

”اس میں بولنے کی طاقت نہیں تھی۔ جب میں نے سارے سوال کر ڈالے تو کراہتے ہوئے اس نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ کہے۔ میرے دن پورے ہو چکے تھے۔۔۔ بھگوان کو بھی منظور تھا!“

بھگوان کو جانے کیا منظور تھا، لیکن مجھے یہ منظور نہیں تھا کہ میں مسلمان ہو کر، مسلمانوں کے علاقے میں ایک آدمی کو جس کے متعلق میں جانتا تھا کہ ہندو ہے، اس احساس کے ساتھ مرتے دیکھوں کہ اس کا مارنے والا مسلمان تھا اور آخری وقت میں اس کی موت کے سرہانے جو آدمی کھڑا تھا، وہ بھی مسلمان تھا۔۔۔ میں ڈرپوک تو نہیں، لیکن اس وقت میری حالت ڈرپوکوں سے بدتر تھی۔ ایک طرف یہ خوف دامن گیر تھا، ممکن ہے میں ہی کپڑا جاؤں، دوسری طرف یہ ڈر تھا کہ کپڑا نہ گیا تو پوچھ گچھ کے لیے دھیر لیا جاؤں گا۔ ایک بار خیال آیا، اگر میں اسے ہسپتال لے گیا تو کیا پتا ہے اپنابدلہ لینے کی خاطر مجھے پہنسادے۔ سوچے، مرناؤ ہے، کیوں نہ اسے ساتھ لے کر مروں۔۔۔ اسی قسم کی باتیں سوچ کر میں چلنے ہی والا تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ بھاگنے والا تھا کہ سہائے نے مجھے پکارا، میں تھہر گیا۔ نہ تھہرنے کے ارادے کے باوجود میرے قدم رک گئے۔ میں نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا، گویا اس سے کہہ رہا ہوں، جلدی کرو میاں مجھے جانا ہے۔ اس نے درد کی تکلیف سے دوہر اہوتے ہوئے بڑی مشکلوں سے اپنی تمیص کے بٹن کھولے اور اندر ہاتھ ڈالا، مگر جب کچھ اور کرنے کی اس میں ہمت نہ رہی تو مجھ سے کہا، ”نیچے بندی ہے۔۔۔ ادھر کی جیب میں کچھ زیور اور بارہ سوروپے ہیں۔ یہ۔۔۔ یہ سلطانہ کمال ہے۔۔۔ میں نے۔۔۔ میں نے ایک دوست کے پاس رکھا ہوا تھا۔۔۔ آج اسے۔۔۔ آج اسے بھینے والا تھا۔۔۔ کیونکہ۔۔۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں خطرہ بہت بڑھ گیا ہے۔۔۔ آپ اسے دے دیجیے گا اور۔۔۔ کہئے گافوراً چلی جائے۔۔۔ لیکن۔۔۔ اپنا خیال رکھیے گا!“

ممتاز خاموش ہو گیا، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آواز، سہائے کی آواز میں جو بے بے ہسپتال کے فٹ پا تھوڑا بھری تھی، دور، ادھر جہاں آسمان اور سمندر ایک دھنڈلی سی آغوش میں مدغم تھے، حل ہو رہی ہے۔

جہازنے و سل دیا تو ممتاز نے کہا، ”میں سلطانہ سے ملا۔۔۔ اس کو زیور اور روپیہ دیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔۔۔“

جب ہم ممتاز سے رخصت ہو کر نیچے اترے تو وہ عرش پر جنگلے کے ساتھ کھڑا تھا۔۔۔ اس کا داہنا ہاتھ بیل رہا تھا۔۔۔ میں جگل سے مخاطب ہوا، ”کیا تمہیں ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ ممتاز، سہائے کی روح کو بلار ہا ہے۔۔۔ ہم سفر بنانے کے لیے؟“

جگل نے صرف اتنا کہا، ”ماش، میں سہائے کی روح ہوتا!“

-[62]-

دیکھ کبیر ارویا: سعادت حسن منتو

نگر نگر ڈھنڈو را پیٹا گیا کہ جو آدمی بھیک مانگے گا اس کو گرفتار کر لیا جائے۔ گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ لوگ خوشیاں منانے لگے کہ ایک بہت پرانی لعنت دور ہو گئی۔ کبیر نے یہ دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ لوگوں نے پوچھا، ”اے جوالا ہے تو کیوں روتا ہے؟“

کبیر نے روکر کہا، ”کپڑا دو چیزوں سے بتتا ہے۔ تانے اور پیٹے سے۔ گرفتاریوں کا تانا تو شروع ہو گیا پر پیٹ بھرنے کا پیٹا کھا ہے؟“

ایک ایم اے۔ ایل ایل بی کو دوسو کھڈیاں الٹ ہو گئیں۔ کبیر نے یہ دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ایم اے۔ ایل ایل بی نے پوچھا، ”اے جوالا ہے کے بچے تو کیوں روتا ہے۔۔۔؟ کیا اس لیے کہ میں نے تیرا حق غصب کر لیا ہے؟“

کبیر نے روتے ہوئے جواب دیا، ”تمہارا قانون تمہیں یہ نکتہ سمجھاتا ہے کہ کھڈیاں پڑی رہنے دو، دھاگے کا جو کوٹا ملے اسے پیچ دو۔ مفت کی کھٹ کھٹ سے کیا فائدہ۔۔۔ لیکن یہ کھٹ کھٹ ہی جوالا ہے کی جان ہے!“

چھپی ہوئی کتاب کے فرمے تھے، جن کے چھوٹے بڑے لفافے بنائے جا رہے تھے۔ کبیر کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے وہ تین لفافے اٹھائے اور ان پر چھپی ہوئی تحریر پڑھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ لفافے بنانے والے نے جیرت سے پوچھا، ”میاں کبیر تم کیوں رونے لگے؟“

کبیر نے جواب دیا، ”ان کاغذوں پر بھگت سورداس کی کویتاچھی ہے۔ لفافے بنائے کاراس کی بے عزتی نہ کرو۔“

لفافے بنانے والے نے حیرت سے کہا، ”جس کا نام سورداس ہے۔ وہ بھگت کبھی نہیں ہو سکتا۔“

کبیر نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

ایک اوپنی عمارت پر لکشمی کا بہت خوبصورت بت نصب تھا۔ چند لوگوں نے جب اسے اپنا دفتر بنایا تو اس بت کوٹاٹ کے ٹکڑوں سے ڈھانپ دیا۔ کبیر نے یہ دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو اماد آئے۔ دفتر کے آدمیوں نے اسے ڈھارس دی اور کہا، ”ہمارے مذہب میں یہ بت جائز نہیں۔“

کبیر نے ٹاٹ کے ٹکڑوں کی طرف اپنی نمناک آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا، ”خوبصورت چیز کو بد صورت بنادینا بھی کسی مذہب میں جائز نہیں۔“

دفتر کے آدمی ہنسنے لگے۔ کبیر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

صف آرافوجوں کے سامنے جرنیل نے تقریر کرتے ہوئے کہا، ”انج کم ہے، کوئی پروا نہیں۔ فصلیں تباہ ہو گئی ہیں، کوئی فکر نہیں۔۔۔ ہمارے سپاہی دشمن سے بھوکے ہی لڑیں گے۔“

دولاکھ فوجیوں نے زندہ باد کے نفرے لگانے شروع کر دیے۔

کبیر چلا چلا کے رونے لگا۔ جرنیل کو بہت غصہ آیا۔ چنانچہ وہ پکارا ٹھا، ”اے شخص، بتاسکتا ہے تو کیوں روتا ہے؟“ کبیر نے روپی آواز میں کہا، ”اے میرے بہادر جرنیل۔۔۔ بھوک سے کون لڑے گا؟“ دولاکھ آدمیوں نے کبیر مردہ باد کے نفرے لگانے شروع کر دیے۔

”بھائیو، داڑھی رکھو، موچھیں کتروا اور شر عی پاجامہ پہنو۔۔۔ بہنو، ایک چوٹی کرو، سرخی سفیدہ نہ لگاؤ، بر قع پہنوا!“ بازار میں ایک آدمی چلا رہا تھا۔ کبیر نے یہ دیکھا تو اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ چلانے والے آدمی نے اور زیادہ چلا کر پوچھا، ”کبیر تو کیوں رونے لگا؟“ کبیر نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا، ”تیر ابھائی ہے نہ تیری بہن، اور یہ جو تیری داڑھی ہے۔ اس میں تو نے وسمہ کیوں لگا رکھا ہے۔۔۔ کیا سفید اچھی نہیں تھی۔“

چلانے والے نے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ کبیر کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

ایک جگہ بحث ہو رہی تھی۔

”ادب برائے ادب ہے۔“

”محض بکو اس ہے، ادب برائے زندگی ہے۔“

”وہ زمانہ لد گیا۔۔۔ ادب، پروپیگنڈے کا دوسرا نام ہے۔“

”تمہاری ایسی کی تیسی۔۔۔“

”تمہارے اسٹائل کی ایسی کی تیسی۔۔۔“

”تمہارے رجعت پسند اور فلاں فلاں بیماریوں کے مارے ہوئے فلاں بیسر اور باد لیسر کی ایسی کی تیسی۔“

کبیر نے لگا۔ بحث کرنے والے بحث چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایک نے اس سے پوچھا، ”تمہارے تحت الشعور میں ضرور کوئی ایسی چیز تھی جسے ٹھیک پہنچی۔“

دوسرے نے کہا، ”یہ آنسو بورژوائی صدمے کا نتیجہ ہیں۔“

کبیر اور زیادہ رونے لگا۔ بحث کرنے والوں نے ٹگ آکر بیک زبان سوال کیا، ”میاں، یہ بتاؤ کہ تم روتنے کیوں ہو؟“

کبیر نے کہا، ”میں اس لیے رویا تھا کہ آپ کی سمجھ میں آجائے، ادب برائے ادب ہے یا ادب برائے زندگی۔“

بحث کرنے والے ہنسنے لگے۔ ایک نے کہا، ”یہ پرولتاری مسخرہ ہے۔“

دوسرے نے کہا، ”نہیں یہ بورڈوائی بہروپیا ہے۔“

کبیر کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے۔

حکم ناند ہو گیا کہ شہر کی تمام کبی عورتیں ایک مہینے کے اندر رشادی کر لیں اور شریفانہ زندگی بسر کریں۔ کبیر ایک چکلے سے گزراتو کسیوں کے اڑے ہوئے چہرے دیکھ کر اس نے رونا شروع کر دیا۔ ایک مولوی نے اس سے پوچھا، ”مولانا! آپ کیوں رور ہے ہیں؟“ کبیر نے روتنے ہوئے جواب دیا، ”اخلاق کے معلم ان کسیوں کے شوہروں کے لیے کیا بندوبست کریں گے؟“

مولوی، کبیر کی بات نہ سمجھا اور ہنسنے لگا۔ کبیر کی آنکھیں اور زیادہ اشک بار ہو گئیں۔

دس بارہ ہزار کے مجمع میں ایک آدمی تقریر کر رہا تھا، ”بھائیو! بازیافتہ عورتوں کا مسئلہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس کا حل ہمیں سب سے پہلے سوچنا ہے۔ اگر ہم غافل رہے تو یہ عورتیں قبھے خانوں میں چلی جائیں گی، فاحشہ بن جائیں گی۔ سن رہے ہو، فاحشہ بن جائیں گی۔۔۔ تمہارا فرض ہے کہ تم ان کو اس خوفناک مستقبل سے بچاؤ اور اپنے گھروں میں ان کے لیے جگہ پیدا کرو۔۔۔ اپنے اپنے بھائی، یا اپنے بیٹے کی شادی کرنے سے پہلے تمہیں ان عورتوں کو ہر گز ہر گز فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

کبیر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ تقریر کرنے والا رک گیا۔ کبیر کی طرف اشارہ کر کے اس نے بلند آواز میں حاضرین سے کہا، ”دیکھو اس شخص کے دل پر کتنا اثر ہوا ہے۔“

کبیر نے لگو گیر آواز میں کہا، ”لفظوں کے بادشاہ، تمہاری تقریر نے میرے دل پر کچھ اثر نہیں کیا۔۔۔ میں نے جب سوچا کہ تم کسی مالدار عورت سے شادی کرنے کی خاطرا بھی تک کنوارے بیٹھے ہو تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔“

ایک دکان پر یہ بورڈ لگا تھا، ”جناب یوٹ ہاؤس۔“ کبیر نے اسے دیکھا تو زار و قطار رونے لگا۔

لوگوں نے دیکھا کہ ایک آدمی کھڑا ہے۔ بورڈ پر آنکھیں جمی ہیں اور روئے جا رہا ہے۔ انھوں نے تالیاں بجانا شروع کر دیں، ”پاگل ہے۔۔۔ پاگل ہے۔“

ملک کا سب سے بڑا قائد چل بسا تو چاروں طرف ماتم کی صفائی بچھ گئیں۔ اکثر لوگ بازوؤں پر سیاہ بلے باندھ کر پھرنا لگے۔ کبیر نے یہ دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سیاہ بلے والوں نے اس سے پوچھا، ”کیا دکھ پہنچا جو تم روئے لگے؟“

کبیر نے جواب دیا، ”یہ کالے رنگ کی چندیاں اگر جمع کر لی جائیں تو سیکڑوں کی ستر پوشی کر سکتی ہیں۔“

سیاہ بلے والوں نے کبیر کو پیٹنا شروع کر دیا، ”تم کمیونسٹ ہو، فتح کا لمسٹ ہو، پاکستان کے غدار ہو۔“

کبیر ہنس پڑا، ”لیکن دوستو، میرے بازو پر تو کسی رنگ کا بلا نہیں۔“

-[63]-

دیوانہ شاعر: سعادت حسن منشو

(اگر مقدس حق دنیا کی نگاہوں سے او جھل کر دیا جائے تو رحمت ہواں دیوانے پر جوانسانی دماغ پر سنبھر اخواب طاری کر دے۔۔۔ حکیم گور کی)

میں آہوں کا بیو پاری ہوں،

لہو کی شاعری میرا کام ہے،
چمن کی واماندہ ہواو!

اپنے دامن سمیٹ لو۔۔۔ کہ
میرے آتشیں گیت،
دبے ہوئے سینوں میں تلاطم برپا کرنے والے ہیں۔

یہ بے باک نغمہ درد کی طرح اٹھا، اور باغ کی فضائیں چند لمحے تھر تھر اکر ڈوب گیا۔ آواز میں ایک قسم کی دیوالی گئی تھی۔۔۔ ناقابل بیان،
میرے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ میں نے آواز کی جستجو میں ادھر ادھر نگاہیں اٹھائیں۔ سامنے چبوترے کے قریب گھاس کے تنخے پر چند پچ
اپنی ماماوں کے ساتھ کھیل کو دیں محو تھے، پاس ہی دو تین گنوар بیٹھے ہوئے تھے۔ باکیں طرف نیم کے درختوں کے نیچے مالی زمین کھودنے
میں مصروف تھا۔ میں ابھی اسی جستجو میں ہی تھا کہ وہی درد میں ڈوبی ہوئی آواز پھر بلند ہوئی۔

میں ان لاشوں کا گیت گاتا ہوں،
جن کی سردی دسمبر مستعار لیتا ہے۔
میرے سینے سے نکلی ہوئی آہ
وہ لو ہے جو جون کے مینے میں چلتی ہے۔
میں آہوں کا بیوپاری ہوں۔
لہو کی شاعری میرا کام ہے

آواز کنوئیں کے عقب سے آرہی تھی۔ مجھ پر ایک رقت سی طاری ہو گئی۔ میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ سرد اور گرم اہریں بیک وقت میرے
جسم سے لپٹ رہی ہیں۔ اس خیال نے مجھے کسی قدر خوف زدہ کر دیا کہ آواز اس کنوئیں کے قریب سے بلند ہو رہی ہے جس میں آج سے کچھ
سال پہلے لاشوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرے دماغ میں جلیاںوالہ باغ کے خونی حادثے کی ایک تصویر کھنچ گئی۔ تھوڑی دیر
کے لیے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ باغ کی فضا گولیوں کی سنسناہٹ اور بھاگتے ہوئے لوگوں کی چیخ پکار سے گونج رہی ہے۔ میں لرز گیا۔ اپنے
کاندھوں کو زور سے جھٹکا دے کر اور اس عمل سے اپنے خوف کو دور کرتے ہوئے میں اٹھا اور کنوئیں کا رخ کیا۔

سارے باغ پر ایک پر اسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میرے قدموں کے نیچے خشک پتوں کی سر سراہٹ سوکھی ہوئی ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آواز پیدا کر رہی تھی۔ کوشش کے باوجود میں اپنے دل سے وہنا معلوم خوف دور نہ کر سکا جو اس آواز نے پیدا کر دیا تھا۔ ہر قدم پر مجھے یہی معلوم ہوتا تھا کہ گھاس کے سر سبز بستر پر بے شمار لاشیں پڑی ہوئی ہیں جن کی بو سیدہ ہڈیاں میرے پاؤں کے نیچے ٹوٹ رہی ہیں۔ یک ایک میں نے اپنے قدم تیز کیے اور دھڑکتے ہوئے دل سے اس چھوڑتے پر بیٹھ گیا جو کنوئیں کے ارد گرد بن ہوا تھا۔

میرے دماغ میں بار بار یہ عجیب سا شعر گونج رہا تھا۔

میں آہوں کا بیوپاری ہوں
لہو کی شاعری میرا کام ہے

کنوئیں کے قریب کوئی تنفس موجود نہ تھا۔ میرے سامنے چھوٹے پھانک کی ساتھ واپسی دیوار پر گولیوں کے نشان تھے۔ چوکور جالی منڈھی ہوئی تھی۔ میں ان نشانوں کو بیسیوں مرتبہ دیکھ چکا تھا مگر اب وہ نشان جو میری نگاہوں کے عین بال مقابل تھے، دونوں نیں آنکھیں معلوم ہو رہے تھے۔ جو دور۔۔۔ بہت دور کسی غیر مریٰ چیز کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی ہوں۔ بلا ارادہ میری نگاہیں ان دو چشم نما سوراخوں پر جنم کر رہ گئیں۔ میں ان کی طرف، مختلف خیالات میں کھویا ہوا خدا معلوم کرنے عرصے تک دیکھتا رہا کہ دغنا پاس والی روشن پر کسی کے بھاری قدموں کی چاپ نے مجھے اس خواب سے بیدار کر دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، گلاب کی جھاڑیوں سے ایک دراز قد آدمی سر جھکائے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کے بڑے کوٹ کی جیبوں میں ٹھنڈے ہوئے تھے۔ چلتے ہوئے وہ زیر لب کچھ گنگانہ رہا تھا۔ کنوئیں کے قریب پہنچ کر وہ یکا یک ٹھنکا اور گردن اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”پانی پیوں گا۔“

میں فوراً چھوڑتے پر سے اٹھا اور پس کاہینڈل ہلاتے ہوئے اس اجنبی سے کہا، ”آئیے۔“

اچھی طرح پانی پی چکنے کے بعد اس نے اپنے کوٹ کی میلی آستین سے منہ پوچھا اور واپس چلنے کو ہی تھا کہ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے دریافت کیا، ”کیا بھی ابھی آپ ہی گارہ ہے تھے؟“

”ہا۔۔۔ مگر آپ کیوں دریافت کر رہے ہیں؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سر پھر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں جن میں سرخ ڈورے غیر معمولی طور پر نمایاں تھے، میری قلبی واردات کا جائزہ لیتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ میں گھبرا گیا۔

”آپ ایسے گیت نہ گایا کریں۔۔۔ یہ سخت خوفناک ہیں۔“

”خوفناک۔۔۔! نہیں، انہیں بیت ناک ہونا چاہیے۔ جب کہ میرے راگ کے ہر سر میں رستے ہوئے زخمیوں کی جلن اور رکی ہوئی آہوں کی تپش مستور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرے شعلوں کی زبانیں آپ کی برفائی ہوئی روح کو اچھی طرح چاٹ نہیں سکیں۔“ اس نے اپنی نوکلی ٹھوڑی کو انگلیوں سے کھجالاتے ہوئے کہا۔ یہ الفاظ اس شور کے مشابہ تھے۔ جو برف کے ڈھیلے میں پتی ہوئی سلاخ گزارنے سے پیدا ہوتا ہے۔

”آپ مجھے ڈرار ہے ہیں؟“

”میرے یہ کہنے پر اس مرد عجیب کے حلق سے ایک تھقہہ نما شور بلند ہوا۔ ہا، ہا، ہا۔۔۔ آپ ڈر رہے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ اس وقت اس منڈیر پر کھڑے ہیں جو آج سے کچھ عرصہ پہلے بے گناہ انسانوں کے خون سے لหڑھی ہوئی تھی۔ یہ حقیقت میری گفتگو سے زیادہ وحشت خیز ہے۔“

یہ سن کر میرے قدم ڈگمگا گئے، میں واقعی خونیں منڈیر پر کھڑا تھا۔ مجھے خوف زده دیکھ کر وہ پھر بولا، ”تھرائی ہوئی رگوں سے بہا ہو الہو کبھی فنا نہیں ہوتا۔۔۔ اس خاک کے ذرے ذرے میں مجھے سرخ بوندیں ترپتی نظر آرہی ہیں۔ آؤ، تم بھی دیکھو۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی نظریں زمین میں گاڑ دیں۔ میں کنوں پر سے نیچے اتر آیا اور اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میرا دل دھک کر رہا تھا۔ دفعتاً اس نے اپنا ہاتھ میرے کاندھے پر رکھا اور بڑے دھمے لجھ میں کہا، ”مگر تم اسے نہیں سمجھ سکو گے۔۔۔ یہ بہت مشکل ہے۔“

میں اس کا مطلب بخوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ غالباً مجھے اس خونی حادثے کی یاد دلا رہا تھا جو آج سے سولہ سال قبل اس باغ میں واقع ہوا تھا۔ اس وقت میری عمر قریباً پانچ سال کی تھی۔ اس لیے میرے دماغ میں اس کے بہت دھنڈے نقوش باقی تھے۔ لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم تھا کہ اس باغ میں عوام کے ایک جلسے پر گولیاں بر سائی گئی تھیں۔ جس کا نتیجہ قریباً دو ہزار اموات تھیں۔ میرے دل میں ان لوگوں کا بہت احترام تھا جنہوں نے اپنی ما در وطن اور جذبہ آزادی کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دی تھیں۔ بس اس احترام کے علاوہ میرے دل میں حادثے کے

متعلق اور کوئی خاص جذبہ نہ تھا۔ مگر آج اس مردِ عجیب کی گفتگونے میرے سینے میں ایک یہ جان سا برپا کر دیا۔ میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ گولیاں تڑاٹربرس رہی ہیں اور بہت سے لوگ و حشت کے مارے ادھر ادھر بھاگتے ہوئے ایک دوسرے پر گر کر مر رہے ہیں۔

”میں سمجھتا ہوں۔۔۔ میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔ موت بھی انک ہے۔“ یہ کہتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے سب کچھ کہہ ڈالا ہے۔ اور میرا سینہ بالکل خالی رہ گیا ہے۔ مجھ پر ایک مردنی سی چھاؤئی۔ غیر ارادی طور پر میں نے اس شخص کے کوٹ کو پکڑ لیا اور تھرائی ہوئی آواز میں کہا، ”آپ کون ہیں۔۔۔ آپ کون ہیں؟“

”آہوں کا بیوپاری۔۔۔ ایک دیوانہ شاعر۔“

”آہوں کا بیوپاری۔۔۔ دیوانہ شاعر“ اس کے الفاظ زیرِ لب گنگاتے ہوئے میں کنوئیں کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اس وقت میرے دماغ میں اس دیوانے شاعر کا گیت گونج رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ سامنے سپیدے کے دودرخت ہیبت ناک دیوؤں کی طرح انگڑائیاں لے رہے تھے۔ پاس ہی چنبیلی اور گلاب کی خاردار جھاڑیوں میں ہوا آہیں بکھیر رہی تھی۔ دیوانہ شاعر خاموش کھڑا سامنے والی دیوار کی ایک کھڑکی پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا، شام کے خاکستری دھنڈ کے میں وہ ایک سایہ ساد کھائی دیتا تھا، کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ گنگنا یا۔

”آہ! یہ سب کچھ خوفناک حقیقت ہے۔۔۔ کسی صحرائیں جنگلی انسان کے پیروں کے نشانات کی طرح خوفناک!“

”کیا کہا؟“

میں ان الفاظ کو اچھی طرح سن نہ سکا تھا۔ جو اس نے منہ ہی منہ میں ادا کیے تھے۔

”کچھ بھی نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ میرے پاس آ کر چبوترے پر بیٹھ گیا۔

”مگر آپ گنگنا رہے تھے۔“

اس پر اس نے اپنی آنکھیں ایک عجیب انداز میں سکیریں اور ہاتھوں کو آپس میں زور زور سے ملتے ہوئے کہا، ”سینے میں قید کے ہوئے الفاظ باہر نکلنے کے لیے مضطرب ہوتے ہیں۔ اپنے آپ سے بولنا اس الوہیت سے گفتگو کرنا ہے۔ جو ہمارے دل کی پہنائیوں میں مستور ہوتی ہے۔“ پھر ساتھ ہی گفتگو کا رخ بدل دیا، ”کیا آپ نے وہ کھڑکی دیکھی ہے؟“

اس نے اپنی انگلی اس کھڑکی کی طرف اٹھائی جسے وہ چند لمحے پہلے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس جانب دیکھا۔ چھوٹی سی کھڑکی تھی جو سامنے دیوار کی خستہ اینٹوں میں سوئی معلوم ہوتی تھی۔

”یہ کھڑکی جس کا ڈنڈا نیچے لٹک رہا ہے؟“ میں نے اس سے کہا، ”ہاں۔۔۔ یہی، جس کا ایک ڈنڈا نیچے لٹک رہا ہے، کیا تم اس پر اس معصوم لڑکی کے خون کے چھینٹے نہیں دیکھ رہے ہو جس کو صرف اس لیے ہلاک کیا گیا تھا کہ ترکش استبداد کو اپنے تیروں کی قوت پرواز کا امتحان لینا تھا۔۔۔ میرے عزیز! تمہاری اس بہن کا خون ضرور نگ لائے گا میرے گیتوں کے زیر و بم میں اس کم سن روح کی پھر پھر اہٹ اور اس کی دل دوز چینیں ہیں۔ یہ سکون کے دامن کو تار کر دیں گی۔ ایک ہنگامہ ہو گا۔ سینہ گیتی شق ہو جائے گا۔ میری بے لگام آواز بلند سے بلند تر ہوتی جائے گی۔۔۔ پھر کیا ہو گا۔۔۔؟ یہ مجھے معلوم نہیں۔۔۔ آؤ، دیکھو، اس سینے میں کتنی آگ سلگ رہی ہے!“

یہ کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ کپڑا اور اسے کوٹ کے اندر لے جا کر اپنے سینے پر رکھ دیا۔ اس کے ہاتھوں کی طرح اس کا سینہ بھی غیر معمولی طور پر گرم تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں کے ڈورے بہت ابھرے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا ہاتھ ہٹالیا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا، ”آپ علیل ہیں۔ کیا میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں؟“

”نہیں میرے عزیز، میں علیل نہیں ہوں۔“ اس نے زور سے اپنے سر کو ہلایا۔ ”یہ انتقام ہے جو میرے اندر گرم سانس لے رہا ہے، میں اس دبی ہوئی آگ کو اپنے گیتوں کے دامن سے ہوادیتا ہوں کہ یہ شعلوں میں تبدیل ہو جائے۔“

”یہ درست ہے مگر آپ کی طبیعت واقعًا خراب ہے۔ آپ کے ہاتھ بہت گرم ہیں۔ اس سردی میں آپ کو زیادہ بخار ہو جانے کا اندیشہ ہے۔“

اس کے ہاتھوں کی غیر معمولی گرمی اور آنکھوں میں ابھرے ہوئے سرخ ڈورے صاف طور پر ظاہر کر رہے تھے کہ اسے تیز بخار ہے۔“

اس نے میرے کہنے کی کوئی پروانہ کی اور جیبیوں میں ہاتھ ٹھونس کر میری طرف بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا، ”یہ کیوں نکر ہو سکتا ہے کہ لکڑی جلے اور دھواں نہ دے۔۔۔ میرے عزیز! ان آنکھوں نے ایسا سماں دیکھا ہے کہ انہیں ابل کر باہر آ جانا چاہیے تھا۔ کیا کہہ رہے تھے کہ میں علیل ہوں۔۔۔ ہا، ہا۔۔۔ علاالت۔۔۔ کاش کہ سب لوگ میری طرح علیل ہوتے۔۔۔ جائیے، آپ ایسے نازک مزانج میری آہوں کے خریدار نہیں ہو سکتے۔“

”مگر۔۔۔“

”مگر و گر کچھ نہیں۔“ وہ دفعتاً جوش میں چلا نے لگا، ”انسانیت کے بازار میں صرف تم لوگ باقی رہ گئے ہو جو کھو کھلے قہقہوں اور پھیکے تعبسموں کے خریدار ہو۔ ایک زمانے سے تمہارے مظلوم بھائیوں اور بہنوں کی فلک شگاف چینیں تمہارے کانوں سے ٹکرائی ہیں مگر تمہاری خوابیدہ سماعت میں ارتباش پیدا نہیں ہوا۔ آؤ، اپنی روحوں کو میری آہوں کی آنچ دو۔ یہ انہیں حساس بنادے گی۔“

میں اس کی گفتگو غور سے سن رہا تھا۔ مجھے حرمت تھی کہ وہ چاہتا کیا ہے اور اس کے خیالات اس قدر پریشان و مضطرب کیوں ہیں۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ شاید وہ پاگل ہے، اس کی گفتگو با معنی ضرور تھی مگر لبھے میں ایک عجیب قسم کی دیواری تھی۔ اس کی عمر یہی کوئی پچیس برس کے قریب ہو گی، داڑھی کے بال جو ایک عرصہ سے مونڈے نہ گئے تھے، کچھ اس انداز میں اس کے پہرے پر اگے ہوئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کسی خشک روٹی پر بہت سی چیزوں پیاس جھٹی ہوئی ہیں۔ گال اندر کو پچکے ہوئے، ماتھا باہر کی طرف ابھرا ہوا، ناک نوکیلی، آنکھیں بڑی جن سے وحشت پیکتی تھی۔ سر پر خشک اور خاک آلو دہ بالوں کا ایک ہجوم۔ بڑے سے بھورے کوٹ میں وہ واقعی شاعر معلوم ہو رہا تھا۔۔۔ ایک دیوانہ شاعر، جیسا کہ اس نے خود اس نام سے اپنے آپ کو متعارف کرایا تھا۔

میں نے اکثر اوقات اخباروں میں ایک جماعت کا حال پڑھا تھا۔ اس جماعت کے خیالات دیوانے شاعر کے خیالات سے بہت حد تک ملتے جلتے تھے۔ میں نے خیال کیا کہ شاید وہ بھی اسی جماعت کا رکن ہے۔

”آپ انقلابی معلوم ہوتے ہیں۔“

اس پر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ ”آپ نے یہ بہت بڑا اکٹشاف کیا ہے۔۔۔ میاں، میں تو کو ٹھوں کی چھتوں پر چڑھ چڑھ کر پکارتا ہوں۔ میں انقلابی ہوں۔۔۔ میں انقلابی ہوں۔۔۔ مجھے روک لے جس سے بن پڑتا ہے۔۔۔ آپ نے واقعی بہت بڑا اکٹشاف کیا ہے۔“ وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔

”اسکول کے طالب علموں کی طرح انقلاب کے حقیقی معانی سے تم بھی نا آشنا ہو، انقلابی وہ ہے جو ہر نا انصافی اور ہر غلطی پر چلا اٹھے۔ انقلابی وہ ہے جو سب زمینوں، سب آسمانوں، سب زبانوں اور سب وقوف کا ایک مجسم گیت ہو، انقلابی، سماج کے قصاص خانے کی ایک بیمار اور فاقوں مری بھیڑ نہیں، وہ ایک مزدور ہے، تنومند، جو اپنے آہنی ہتھوڑے کی ایک ضرب سے ہی ارضی جنت کے دروازے واکر سکتا ہے۔ میرے عزیز! یہ منطق، خوابوں اور نظریوں کا زمانہ نہیں، انقلاب ایک ٹھوس حقیقت ہے، یہ یہاں پر موجود ہے۔ اس کی اہریں بڑھ رہی ہیں۔ کون ہے جواب اس کو روک سکتا ہے۔ یہ بند باندھنے پر نہ رک سکیں گی!“

اس کا ہر لفظ ہتھوڑے کی اس ضرب کے مانند تھا جو سرخ لوہے پر پڑ کر اس کی شکل تبدیل کر رہا ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ میری روح کسی غیر مریٰ چیز کو سجدہ کر رہی ہے۔

شام کی تاریکی بذریعہ بڑھ رہی تھی، نیم کے درخت کپکپا رہے تھے، شاید میرے سینے میں ایک نیا جہاں آباد ہو رہا تھا۔ اچانک میرے دل سے کچھ الفاظ اٹھے اور لبوں سے باہر نکل گئے۔

”اگر انقلاب یہی ہے، تو میں بھی انقلابی ہوں۔“

شاعر نے اپنا سر اٹھایا اور میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ”تو پھر اپنے خون کو کسی طشتیری میں نکال کر رکھ چھوڑو، کہ ہمیں آزادی کے کھیت کے لیے اس سرخ کھاد کی بہت ضرورت ہے۔۔۔ آہ! وہ وقت کس قدر خوشنگوار ہو گا جب میری آہوں کی زردی تبّم کارنگ اختیار کر لے گی۔“

یہ کہہ کروہ کنوئیں کی منڈیر سے اٹھا اور میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا، ”اس دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو حال سے مطمئن ہیں۔ اگر تمہیں اپنی روح کی بالیدگی منظور ہے تو ایسے لوگوں سے ہمیشہ دور رہنے کی سمجھی کرنا۔ ان کا احساس پتھرا گیا ہے۔ مستقبل کے جان بخش مناظر ان کی نگاہوں سے ہمیشہ او جمل رہیں گے۔۔۔ اچھا، اب میں چلتا ہوں۔“

اس نے بڑے پیار سے میرا ہاتھ دبایا اور پیشتر اس کے کہ میں اس سے کوئی اور بات کرتا وہ لمبے ڈگ بھرتا جھاڑیوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔

بانگ کی فضا پر خاموشی طاری تھی۔ میں سر جھکائے ہوئے خدا معلوم کتنا عرصہ اپنے خیالات میں غرق رہا کہ اچانک اس شاعر کی آواز رات کی رانی کی دل نواز خوشبو میں گھلی ہوئی میرے کانوں تک پہنچی۔ وہ بانگ کے دوسرا گوشے میں گارہ تھا۔

زمین ستاروں کی طرف لچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔

اٹھوا اور ان گلینوں کو اس کے ننگے سینے پر جڑ دو۔

ڈھاؤ، کھودو، چپرو، مارو۔

نئی دنیا کے معمارو! کیا تمہارے بازوں میں قوت نہیں ہے۔

میں آہوں کا بیوپاری ہوں۔

لہو کی شاعری میرا کام ہے۔

گیت ختم ہونے پر میں بانگ میں کتنے عرصے تک بیٹھا رہا۔ یہ مجھے قطعاً یاد نہیں۔ والد کا بیان ہے کہ میں اس روز گھر بہت دیر سے آیا تھا۔

-[64]-

عشق حقیقی: سعادت حسن منٹو

عشق و محبت کے بارے میں اخلاق کا نظریہ وہی تھا جو اکثر عاشقوں اور محبت کرنے والوں کا ہوتا ہے۔ وہ راجحہ پیر کا چیلہ تھا۔ عشق میں مر جانا اس کے نزدیک ایک عظیم الشان موت مرتاحا۔

اخلاق تیس برس کا ہو گیا۔ مگر باوجود کوششوں کے اس کو کسی سے عشق نہ ہوا لیکن ایک دن انگرڈ برگ میں کی پکچر ”فور ہوم دی بل ٹولز“ کا میٹن شود کیھنے کے دوران میں اس نے محسوس کیا کہ اس کا دل اس بر قع پوش لڑکی سے وابستہ ہو گیا ہے جو اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی اور سارا وقت اپنی ٹانگ ہلاتی رہی تھی۔

پردے پر جب سائے کم اور روشنی زیادہ ہوئی تو اخلاق نے اس لڑکی کو ایک نظر دیکھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے نئے نئے قطرے تھے۔ ناک کی پھنگ پر چند یونڈیں تھیں۔ جب اخلاق نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی ٹانگ ہلانا بند ہو گئی۔ ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنے سیاہ بر قع کی جالی سے اپنا پھرہ ڈھانپ لیا۔ یہ حرکت کچھ ایسی تھی کہ اخلاق کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

اس لڑکی نے اپنی سیمیلی کے کان میں کچھ کہا۔ دونوں ہولے ہولے ہنسیں۔ اس کے بعد اس لڑکی نے نقاب اپنے چہرے سے ہٹالیا۔ اخلاق کی طرف تیکھی تیکھی نظروں سے دیکھا اور ٹانگ ہلا کر فلم دیکھنے میں مشغول ہو گئی۔

اخلاق سگریٹ پر رہا تھا۔ انگرڈ برگ میں اس کی محبوب ایکٹر س تھی۔ ”فور ہوم دی بل ٹولز“ میں اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ فلم کے آغاز میں جب اخلاق نے اسے دیکھا تو وہ بہت ہی پیاری معلوم ہوئی۔ لیکن ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی لڑکی دیکھنے کے بعد وہ انگرڈ برگ میں کو بھول گیا۔ یوں تو قریب قریب سارا فلم اس کی نگاہوں کے سامنے چلا مگر اس نے بہت ہی کم دیکھا۔ سارا وقت وہ لڑکی اس کے دل و دماغ پر چھائی رہی۔

اخلاق سگریٹ پر سگریٹ پیتا رہا۔ ایک مرتبہ اس نے راکھ جھاڑی تو اس کا سگریٹ انگلیوں سے نکل کر اس لڑکی کی گود میں جا پڑا۔ لڑکی فلم دیکھنے میں مشغول تھی اس لیے اس کو سگریٹ گرنے کا کچھ پتہ نہ تھا۔ اخلاق بہت گھبرا یا۔ اسی گھبراہٹ میں اس نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ اس کے بر قع پر سے اٹھایا اور فرش پر پھینک دیا۔ لڑکی ہڑ بڑا کراٹھ کھڑی ہوئی۔ اخلاق نے فوراً کہا، ”معافی چاہتا ہوں آپ پر سگریٹ گر گیا تھا۔“

لڑکی نے تیکھی تیکھی نظروں سے اخلاق کی طرف دیکھا اور بیٹھ گئی۔ بیٹھ کر اس نے اپنی سہیلی سے سرگوشی میں کچھ کہا۔ دونوں ہو لے ہو لے ہنسیں اور فلم دیکھنے میں مشغول ہو گئیں۔ فلم کے اختتام پر جب قائد اعظم کی تصویر نمودار ہوئی تو اخلاق اٹھا۔ خدا معلوم کیا ہوا کہ اس کا پاؤں لڑکی کے پاؤں کے ساتھ ٹکرایا۔ اخلاق ایک بار پھر سرتاپ معدرت بن گیا، ”معانی چاہتا ہوں۔۔۔ جانے آج کیا ہو گیا ہے۔“

دونوں سہیلیاں ہو لے ہو لے ہنسیں۔ جب بھیڑ کے ساتھ باہر نکلیں تو اخلاق ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ لڑکی جس سے اس کو پہلی نظر کا عشق ہوا تھا، مژہ کر دیکھتی رہی۔ اخلاق نے اس کی پرواہ نہ کی اور ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس لڑکی کا مکان دیکھ کر رہے گا۔ مال روڈ کے فٹ پاٹھ پرواہی ایم سی اے کے سامنے اس لڑکی نے مژہ کر اخلاق کی طرف دیکھا اور اپنی سہیلی کا ہاتھ کپڑ کر رک گئی۔ اخلاق نے آگے نکلا چاہا تو وہ لڑکی اس سے مخاطب ہوئی، ”آپ ہمارے پیچھے پیچھے کیوں آرہے ہیں؟“

اخلاق نے ایک لمحہ سوچ کر جواب دیا، ”آپ میرے آگے آگے کیوں جا رہی ہیں؟“

لڑکی کھکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے بعد اس نے اپنی سہیلی سے کچھ کہا۔ پھر دونوں چل پڑیں۔ بس اسٹینڈ کے پاس اس لڑکی نے جب مژہ کر دیکھا تو اخلاق نے کہا، ”آپ پیچھے آجائیے۔ میں آگے بڑھ جاتا ہوں۔“ لڑکی نے منہ موڑ لیا۔

انارکلی کا موڑ آیا تو دونوں سہیلیاں ٹھہر گئیں۔ اخلاق پاس سے گزرنے لگا تو اس لڑکی نے اس سے کہا، ”آپ ہمارے پیچھے نہ آیئے۔ یہ بہت بری بات ہے۔“

لبھج میں بہت سنجیدگی تھی۔ اخلاق نے ”بہت بہتر“ کہا اور واپس چل دیا۔ اس نے مژہ کر بھی ان کونہ دیکھا۔ لیکن دل میں اس کو افسوس تھا کہ وہ کیوں اس کے پیچھے نہ گیا۔ اتنی دیر کے بعد اس کو اتنی شدت سے محسوس ہوا تھا کہ اس کو کسی سے محبت ہوئی ہے۔ لیکن اس نے موقعہ ہاتھ سے جانے دیا۔ اب خدا معلوم پھر اس لڑکی سے ملاقات ہو یانہ ہو۔ جب وائی ایم سی اے کے پاس پہنچا تو رک کر اس نے انارکلی کے موڑ کی طرف دیکھا مگر اب وہاں کیا تھا۔ وہ تو اسی وقت انارکلی کی طرف چل گئی تھیں۔

لڑکی کے نقش بڑے پتلے پتلے تھے۔ باریک ناک، چھوٹی سی ٹھوڑی، پھول کی پیوں جیسے ہونٹ، جب پردے پر سائے کم اور روشنی زیادہ ہوتی تھی تو اس نے اس کے بالائی ہونٹ پر ایک تل دیکھا تھا جو بے حد پیار الگتا تھا۔ اخلاق نے سوچا تھا کہ اگر یہ تل نہ ہوتا تو شاید وہ لڑکی ناکمل رہتی۔ اس کا وہاں پر ہونا اشد ضروری تھا۔

چھوٹے چھوٹے قدم تھے جن میں کنوار پن تھا۔ چونکہ اس کو معلوم تھا کہ ایک مرد میرے پیچے پیچے آ رہا ہے۔ اس لیے ان کے ان چھوٹے چھوٹے قدموں میں ایک بڑی پیاری لڑکھڑاہٹ سی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا مرڑ کر تو دیکھنا غصب تھا۔ گردان کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ پیچھے اخلاق کی طرف دیکھتی اور تیزی سے منہ موڑ لیتی۔

دوسرے روز وہ انگرڈ برگ میں کا فلم پھر دیکھنے لگا۔ شو شروع ہو چکا تھا۔ والٹ ڈزنی کا کار ٹون چل رہا تھا کہ وہ اندر ہال میں داخل ہوا۔ ہاتھ کو ہاتھ سمجھائی نہیں دیتا تھا۔ گیٹ کیپر کی بیٹری کی اندھی روشنی کے سہارے اس نے ٹشول ٹشول کر ایک غالی سیٹ تلاش کی اور اس پر بیٹھ گیا۔ ڈزنی کا کار ٹون بہت مزاحیہ تھا۔ ادھر ادھر کئی تماشائی ہنس رہے تھے۔ دفعتاً بہت ہی قریب سے اخلاق کو ایسی ہنسی سنائی دی جس کو وہ پیچانتا تھا۔ مر کر اس نے پیچھے دیکھا تو وہی لڑکی بیٹھی تھی۔ اخلاق کا دل دھک کرنے لگا۔ لڑکی کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا بیٹھا تھا۔ شکل و صورت کے اعتبار سے وہ اس کا بھائی لگتا تھا۔ اس کی موجودگی میں وہ کس طرح بار بار مرڑ کر دیکھ سکتا تھا۔

انڑوں ہو گیا۔ اخلاق کو شش کے باوجود فلم اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ روشنی ہوئی تو وہ اٹھا۔ لڑکی کے چہرے پر نقاب تھا۔ مگر اس مہین پر دے کے پیچھے اس کی آنکھیں اخلاق کو نظر آئیں جن میں مسکراہٹ کی چمک تھی۔ لڑکی کے بھائی نے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اخلاق نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس سے مخاطب ہوا، ”ذرما چس عنایت فرمائیے۔“

لڑکی کے بھائی نے اس کو ماچس دے دی۔ اخلاق نے اپنا سگریٹ سلگایا اور ماچس اس کو واپس دے دی، ”شکریہ!“

لڑکی کی ٹانگ بیل رہی تھی۔ اخلاق اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ فلم کا بقايا حصہ شروع ہوا۔ ایک دو مرتبہ اس نے مرڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کر سکا۔ فلم ختم ہوا۔ لوگ باہر نکلنے شروع ہوئے۔ لڑکی اور اس کا بھائی ساتھ تھے۔ اخلاق ان سے ہٹ کر پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

اسٹینڈرڈ کے پاس بھائی نے اپنی بہن سے کچھ کہا۔ ایک ٹانگے والے کو بلا یا لڑکی اس میں بیٹھ گئی۔ لڑکا اسٹینڈرڈ میں چلا گیا۔ لڑکی نے نقاب میں سے اخلاق کی طرف دیکھا۔ اس کا دل دھک کرنے لگا۔ ٹانگہ چل پڑا۔

اسٹینڈرڈ کے باہر اس کے تین چار دوست کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کی سائیکل اس نے جلدی جلدی پکڑی اور ٹانگے کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔

یہ تعاقب بڑا لچسپ رہا۔ زور کی ہوا چل رہی تھی، لڑکی کے چہرے پر سے نقاب اٹھا اٹھا جاتی۔ سیاہ جارجٹ کا پردہ پھر پھر اکر اس کے سفید چہرے کی جھلکیاں دکھاتا تھا۔ کانوں میں سونے کے بڑے بڑے جھومر تھے۔ پتلے پتلے ہونٹوں پر سیاہی مائل سرفی تھی۔۔۔ اور بالائی ہونٹ پر تل۔۔۔ وہ اشد ضروری تل۔

بڑے زور کا جھونکا آیا تو اخلاق کے سر پر سے ہیئت اتر گیا اور سڑک پر دوڑنے لگا۔ ایک ٹرک گزر رہا تھا۔ اس کے وزنی پیسے کے نیچے آیا اور وہیں چت ہو گیا۔ لڑکی ہنسی، اخلاق مسکرا دیا۔ گردن موڑ کر ہیئت کی لاش دیکھی جو بہت پیچھے رہ گئی تھی اور لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا، ”اس کو تو شہادت کا رتبہ مل گیا۔“ لڑکی نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

اخلاق تھوڑی دیر کے بعد پھر اس سے مخاطب ہوا، ”آپ کو اعتراض ہے تو وہ اپس چلے جاتا ہوں۔“ لڑکی نے اس کی طرف دیکھا مگر کوئی جواب نہ دیا۔

انارکلی کی ایک گلی میں ٹانگہ رکا اور وہ لڑکی اتر کر اخلاق کی طرف بار بار دیکھتی نقاب اٹھا کر ایک مکان میں داخل ہو گئی۔ اخلاق ایک پاؤں سائیکل کے پیڈل پر اور دوسرا پاؤں دکان کے تھوڑے پر رکھے تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ سائیکل چلانے ہی والا تھا کہ اس مکان کی پہلی منزل پر ایک کھڑکی کھلی۔ لڑکی نے جھانک کر اخلاق کو دیکھا۔ مگر فوراً ہی شرما کر پیچھے ہٹ گئی۔ اخلاق تقریباً آدھا گھنٹہ وہاں کھڑا رہا۔ مگر وہ پھر کھڑکی میں نمودار نہ ہوئی۔

دوسرے روز اخلاق صح سویرے انارکلی کی اس گلی میں پہنچا۔ پندرہ بیس منٹ تک اوہر ادھر گھومتا رہا۔ کھڑکی بند تھی۔ مایوس ہو کر لوٹنے والا تھا کہ ایک فالے سے یہیں والا صد الگاتا آیا۔ کھڑکی کھلی، لڑکی سر سے ننگی نمودا ہوئی۔ اس نے فالے والے کو آواز دی۔

”بھائی فالے والے ذرا ٹھہرنا!“ پھر اس کی نگاہیں ایک دم اخلاق پر پڑیں۔ چونک کروہ پیچھے ہٹ گئی۔ فالے والے نے سر پر سے چھا بڑی اتاری اور بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکی سر پر دوپٹہ لیے نیچے آئی۔ اخلاق کو اس نے ٹککھیوں سے دیکھا۔ شر ماںی اور فالے لیے بغیر

واپس چلی گئی۔ اخلاق کو یہ اداہت پسند آئی۔ تھوڑا ساتر س بھی آیا۔ فالے والے نے جب اس کو گھور کے دیکھا تو وہ وہاں سے چل دیا، ”چلو آج اتنا ہی کافی ہے۔“

چند دن ہی میں اخلاق اور اس لڑکی میں اشارے شروع ہو گئے۔ ہر روز صبح وہ انارکلی کی اس گلی میں پہنچتا۔ کھڑکی کھلتی وہ سلام کرتا، وہ جواب دیتی، مسکراتی۔ ہاتھ کے اشاروں سے کچھ باتیں ہوتیں۔ اس کے بعد وہ چلی جاتی۔

ایک روز انگلیاں گھما کر اس نے اخلاق کو بتایا کہ وہ شام کے چھ بجے کے شو سینما دیکھنے جا رہی ہے۔ اخلاق نے اشاروں کے ذریعہ سے پوچھا، ”کون سے سینما ہاؤس میں؟“ اس نے جواب میں کچھ اشارے کیے مگر اخلاق نہ سمجھا۔ آخر میں اس نے اشاروں میں کہا، ”کاغذ پر لکھ کر نیچے پھینک دو۔“

لڑکی کھڑکی سے ہٹ گئی۔ چند لمحات کے بعد اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کاغذ کی ایک مژووری سی نیچے پھینک دی۔ اخلاق نے اسے کھولا۔ لکھا تھا۔

”پلازا۔۔۔ پروین۔“

شام کو پلازا میں اس کی ملاقات پروین سے ہوئی۔ اس کے ساتھ اس کی سیلی تھی۔ اخلاق اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ فلم شروع ہوا تو پروین نے نقاب اٹھا لیا۔ اخلاق سارا وقت اس کو دیکھتا رہا۔ اس کا دل دھک دھک کرتا تھا۔ انشروں سے کچھ پہلے اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ کانپ اٹھی۔ اخلاق نے فوراً ہاتھ اٹھا لیا۔

در اصل وہ اس کو انگوٹھی دینا چاہتا تھا، بلکہ خود پہنانا چاہتا تھا جو اس نے اسی روز خریدی تھی۔ انشروں ختم ہوا تو اس نے پھر اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا وہ کانپ لیکن اخلاق نے ہاتھ نہ ہٹایا۔ تھوڑی سی دیر کے بعد اس نے انگوٹھی نکالی اور اس کی ایک انگلی میں چڑھا دی۔۔۔ وہ بالکل خاموش رہی۔ اخلاق نے اس کی طرف دیکھا۔ پیشانی اور ناک پر پسینے کے نئے نئے قطرے تھر تھر ارہے تھے۔

فلم ختم ہوا تو اخلاق اور پروین کی یہ ملاقات بھی ختم ہو گئی۔ باہر نکل کر کوئی بات نہ ہو سکی۔ دونوں سہمیلیاں ٹانگے میں بیٹھیں۔ اخلاق کو دوست مل گئے۔ انہوں نے اسے روک لیا لیکن وہ بہت خوش تھا، اس لیے کہ پروین نے اس کا تحفہ قبول کر لیا تھا۔

دوسرے روز مقررہ اوقات پر جب اخلاق پروین کے گھر کے پاس پہنچا تو گھر کی کھلی تھی۔ اخلاق نے سلام کیا۔ پروین نے جواب دیا۔ اس کے دامنے ہاتھ کی انگلی میں اس کی پہنائی ہوئی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ ٹھوڑی دیر اشارے ہوتے رہے اس کے بعد پروین نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک لفافہ نیچے پھینک دیا۔ اخلاق نے اٹھایا۔ کھولا تو اس میں ایک خط تھا۔ انگوٹھی کے شکریے کا۔

گھر پہنچ کر اخلاق نے ایک طویل جواب لکھا۔ اپنادل ٹکال کر کاغذوں میں رکھ دیا۔ اس خط کو اس نے پھول دار لفافے میں بند کیا۔ اس پر سینٹ لگایا اور دوسرے روز صبح نوبجے پروین کو دکھا کر نیچے لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ اب ان میں باقاعدہ خط و کتابت شروع ہو گئی۔ ہر خط عشق و محبت کا ایک دفتر تھا۔ ایک خط اخلاق نے اپنے خون سے لکھا جس میں اس نے قسم کھائی کہ وہ ہمیشہ اپنی محبت میں ثابت قدم رہے گا۔ اس کے جواب میں خونی تحریر ہی آئی۔ پروین نے بھی حلف اٹھایا کہ وہ مر جائے گی لیکن اخلاق کے سوا اور کسی کو شریک حیات نہیں بنائے گی۔

ہمینوں گزر گئے۔ اس دوران میں کبھی کبھی کسی سینما میں دونوں کی ملاقات ہو جاتی تھیں۔ مل کر بیٹھنے کا موقعہ انھیں نہیں ملتا تھا۔ پروین پر گھر کی طرف سے بہت کڑی پابندیاں عائد تھیں۔ وہ باہر نکلتی تھی یا تو اپنے بھائی کے ساتھ یا اپنی سیمیلی زہرہ کے ساتھ۔ ان دو کے علاوہ اس کو اور کسی کے ساتھ باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اخلاق نے اسے کئی مرتبہ لکھا کہ زہرہ کے ساتھ وہ کبھی اسے بارہ دری میں جہانگیر کے مقبرے میں ملے۔ مگر وہ نہ مانی۔ اس کو ڈر تھا کہ کوئی دیکھے لے گا۔

اس اشنا میں اخلاق کے والدین نے اس کی شادی کی بات چیت شروع کر دی۔ اخلاق ٹانٹرا، جب انہوں نے شنگ آ کر ایک جگہ بات کر دی تو اخلاق بگڑ گیا، بہت ہنگامہ ہوا۔ یہاں تک کہ اخلاق کو گھر سے نکل کر ایک رات اسلامیہ کانج کی گراونڈ میں سونا پڑا۔ ادھر پروین روئی رہی۔ کھانے کو ہاتھ تک نہ لگایا۔

اخلاق دھن کا بہت پکا تھا۔ ضدی بھی پر لے درجے کا تھا۔ گھر سے باہر قدم نکالا تو پھر ادھر رخ تک نہ کیا۔ اس کے والد نے اس کو بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانا۔ ایک دفتر میں سوروپے ماہوار پرنوکری کر لی اور ایک چھوٹا سامان کان کرایہ پر لے کر رہنے لگا۔ جس میں مل تھانہ بھلی۔

ادھر پروین اخلاق کی تکلیفوں کے دکھ میں گھل رہی تھی۔ گھر میں جب اچانک اس کی شادی کی بات چیت شروع ہوئی تو اس پر بھلی سی گری۔ اس نے اخلاق کو لکھا۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ لیکن پروین کو اس نے تسلی دی کہ وہ گھبرائے نہیں۔ ثابت قدم رہے۔ عشق ان کا امتحان لے رہا ہے۔

بارہ دن گزر گئے۔ اخلاق کئی بار گیا۔ مگر پروین کھڑکی میں نظر نہ آئی۔ وہ صبر و قرار کھو بیٹھا، نینداں کی غائب ہو گئی۔ اس نے دفتر جانا چھوڑ دیا۔ زیادہ نانے ہوئے تو اس کو ملازمت سے بر طرف کر دیا گیا۔ اس کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ بر طرفی کانوٹس ملاتوہ سیدھا پروین کے مکان کی طرف چل پڑا۔ پندرہ دنوں کے طویل عرصے کے بعد اسے پروین نظر آئی وہ بھی ایک لختے کے لیے۔ جلدی سے لفافہ پھینک کر وہ چل گئی۔

خط بہت طویل تھا۔ پروین کی غیر حاضری کا باعث یہ تھا کہ اس کا باپ اس کو ساتھ گو جرانوالے گیا تھا جہاں اس کی بڑی بہن رہتی تھی۔ پندرہ دن وہ خون کے آنسو روئی رہی۔ اس کا جیز تیار کیا جا رہا تھا لیکن اس کو محسوس ہوتا تھا کہ اس کے لیے رنگ برلنگے کفن بن رہے ہیں۔ خط کے آخر میں لکھا۔ تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔۔۔ میری موت کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ میں مر جاؤں گی۔۔۔ میں ضرور کچھ کھا کے مر جاؤں گی۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ مجھے دکھائی نہیں دیتا۔۔۔ نہیں نہیں ایک اور راستہ بھی ہے۔۔۔ لیکن میں کیا اتنی ہمت کر سکوں گی۔ تم بھی اتنی ہمت کر سکو گے۔۔۔ میں تمہارے پاس چلی آؤں گی۔۔۔ مجھے تمہارے پاس آنا ہی پڑے گا۔ تم نے میرے لیے گھر بار چھوڑا۔ میں تمہارے لیے یہ گھر نہیں چھوڑ سکتی جہاں میری موت کے سامان ہو رہے ہیں۔۔۔ لیکن میں بیوی بن کر تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ تم شادی کا بندوبست کرلو۔ میں صرف تین کپڑوں میں آؤں گی۔ زیورو غیرہ سب اتار کر یہاں پھینک دوں گی۔۔۔ جواب جلدی دو، ہمیشہ تمہاری۔ پروین۔

اخلاق نے کچھ نہ سوچا، فوراً اس کو لکھا، ”میری بابیں تمہیں اپنے آغوش میں لینے کے لیے تڑپ رہی ہیں۔ میں تمہاری عزت و عصمت پر کوئی حرف نہیں آنے دوں گا۔ تم میری رفیقة حیات بن کے رہو گی۔ زندگی بھر میں تمہیں خوش رکھوں گا۔“ ایک دو خط اور لکھنے کے ساتھ اس کے بعد طے کیا کہ پروین بدھ کو صحیح سویرے گھر سے سے نکلے گی۔ اخلاق ٹانگ لے کر گلی کے نکٹ پر اس کا انتظار کرے۔

بدھ کو منہ اندر ہیرے اخلاق ٹانگے میں وہاں پہنچ کر پروین کا انتظار کرنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ اخلاق کا اضطراب بڑھ گیا۔ لیکن وہ آگئی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ گلی میں نمودار ہوئی۔ چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ جب وہ ٹانگے میں اخلاق کے ساتھ بیٹھی تو سرتاپا کا نپ رہی تھی۔ اخلاق خود بھی کاپنے لگا۔ گھر پہنچ تو اخلاق نے بڑے پیار سے اس کے بر قلع کی نقاب اٹھائی اور کہا، ”میری دو بہن کب تک مجھ سے پردہ کرے گی۔“

پروین نے شرم کر آنکھیں جھکا لیں، اس کا رنگ زرد تھا، جسم ابھی تک کانپ رہا تھا۔ اخلاق نے بالائی ہونٹ کے تل کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں میں ایک بوسہ ترپنے لگا۔ اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تحام کر اس نے تل والی جگہ کو چوما۔ پروین نے نہ کی، اس کے ہونٹ

کھلے۔ داتوں میں گوشت خورہ تھا۔ مسوز ہے گہرے نیلے رنگ کے تھے۔ گلے ہوئے۔ سڑاند کا ایک بھبکا اخلاق کی ناک میں گھس گیا۔ ایک دھکا سا اس کو لگا۔ ایک اور بھبکا پروین کے منہ سے نکلا تو وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

پروین نے حیا آلو د آواز میں کہا، ”شادی سے پہلے آپ کو ایسی باتوں کا حق نہیں پہنچتا۔“

یہ کہتے ہوئے اس کے گلے ہوئے مسوز ہے نمایاں ہوئے۔ اخلاق کے ہوش و حواس غائب تھے، دماغ سن ہو گیا تھا۔ دیر تک وہ دونوں پاس بیٹھے رہے۔ اخلاق کو کوئی بات نہیں سو جھتی تھی۔ پروین کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ جب اس نے انگلی کا ناخن کامنے کے لیے ہونٹ کھولے تو پھر ان گلے ہوئے مسوزوں کی نمائش ہوئی۔ بوکا ایک بھبکا نکلا۔ اخلاق کو متلبی آنے لگی۔ اٹھا اور ”ابھی آیا“ کہہ کر باہر نکل گیا۔ ایک تھڑے پر بیٹھ کر اس نے بہت دیر سوچا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو لا کل پور روانہ ہو گیا۔ جہاں اس کا ایک دوست رہتا تھا۔ اخلاق نے سارا واقعہ سنایا تو اس نے بہت لعن طعن کی اور اس سے کہا، ”فوراً واپس چاؤ۔ کہیں بے چاری خود کشی نہ کر لے۔“

اخلاق رات کو واپس لا ہو ر آیا۔ گھر میں داخل ہوا تو پروین موجود نہیں تھی۔۔۔ پلنگ پر تکیہ پڑا تھا۔ اس پر دو گول گول نشان تھے۔ گیلے!

اس کے بعد اخلاق کو پروین کہیں نظر نہ آئی۔

-[65]-

خدائی کی قسم: سعادت حسن منشو

ادھر سے مسلمان اور ادھر سے ہندو ابھی تک آجارتے تھے۔ کیمپ بھرے پڑے تھے۔ جن میں ضرب المثل کے مطابق قتل دھرنے کے لیے واقعی کوئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان میں ٹھونسے جارتے تھے۔ غله ناکافی ہے۔ حفظان صحت کا کوئی انتظام نہیں۔ بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ اس کا ہوش کس کو تھا۔ ایک افراط و تفریط کا عالم تھا۔

سن اڑتا لیس کا آغاز تھا۔ غالباً مارچ کا مہینہ۔ ادھر اور ادھر دونوں طرف رضاکاروں کے ذریعے سے ”مفتوحہ“ عورتوں اور بچوں کی برآمدگی کا مستحسن کام شروع ہو چکا تھا۔ سیکڑوں مرد، عورتیں، اڑکے اور اڑکیاں اس کا رخیر میں حصہ لے رہی تھیں۔ میں جب ان کو سرگرم عمل

دیکھتا تو مجھے بڑی تعجب خیز سرست حاصل ہوتی، یعنی خود انسان انسان کی برائیوں کے آثار مٹانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ جو عصمتیں لٹ پھلی تھیں، ان کو مزید لوٹ کھسوٹ سے بچانا چاہتا تھا۔ کس لیے۔۔۔؟ اس لیے کہ اس کا دامن مزید دھبوں اور داغوں سے آلو دہنہ ہو؟ اس لیے کہ وہ جلدی جلدی اپنی خون سے لھڑری ہوئی انگلیاں چاٹ لے اور ہم اپنے ہم جنسوں کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھ کر روٹی کھائے؟ اس لیے کہ وہ انسانیت کا سوئی دھاگا لے کر، جب تک دوسرے آنکھیں بند کیے ہیں، عصموں کے چاک ر فو کر دے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔۔۔ لیکن ان رضاکاروں کی جدوجہد پھر بھی قابل قدر معلوم ہوتی تھی۔

ان کو سیکڑوں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہزاروں کھیکھڑے تھے جو انھیں اٹھانے پڑتے تھے کیونکہ جنہوں نے عورتیں اور لڑکیاں اڑائی تھیں، سیما بپا تھے، آج ادھر، کل ادھر، ابھی اس محلے میں، ابھی اس محلے میں اور پھر آس پاس کے آدمی بھی ان کی مدد نہیں کرتے تھے۔

عجیب عجیب داستانیں سننے میں آتی تھیں۔۔۔ ایک لیاڑان افسر نے مجھے بتایا کہ سہارن پور میں دو لڑکیوں نے پاکستان میں اپنے والدین کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ دوسرے نے بتایا کہ جب جالندھر میں زبردستی ہم نے ایک لڑکی کو نکالا تو قابض کے سارے خاندان نے اسے یوں الوداع کہی جیسے وہ ان کی بہو ہے، اور کسی دور راز سفر پر جا رہی ہے۔۔۔ کئی لڑکیوں نے راستہ میں والدین کے خوف سے خود کشی کر لی، بعض صدموں کی تاب نہ لا کر پا گل ہو چکی تھیں، کچھ ایسی بھی تھیں جن کو شراب کی لست پڑ چکی تھی، ان کو یہاں لگتی تو پانی کی بجائے شراب مانگتیں اور ننگی ننگی گالیاں بکتیں۔

میں ان برآمد کی ہوئی لڑکیوں اور عورتوں کے متعلق سوچتا تو میرے ذہن میں صرف پھولے ہوئے پیٹ ابھرتے۔۔۔ ان پیٹوں کا کیا ہو گا؟ ان میں جو کچھ بھرا ہے اس کا مالک کون ہے؟ پاکستان یا ہندوستان؟ اور وہ نو مہینوں کی بار برداری۔۔۔ اس کی اجرت پاکستان ادا کرے گا یا ہندوستان؟ کیا یہ سب ظالم فطرت یا قدرت کے بھی کھاتے میں درج ہو گا؟ مگر کیا اس میں کوئی صفحہ خالی رہ گیا ہے؟

برآمدہ عورتیں آرہی تھیں۔ برآمدہ عورتیں جا رہی تھیں۔

میں سوچتا تھا کہ یہ عورتیں مفویہ کیوں کھلائی جاتی تھیں۔۔۔ انھیں انگو اکب کیا گیا ہے۔۔۔؟ انگو تو ایک بڑا و مانگل فعل ہے جس میں مرد اور عورتیں دونوں شریک ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک ایسی کھائی ہے جس کو پھاندنے سے پہلے دونوں روحوں کے سارے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں، لیکن یہ انگو اکیسا ہے کہ ایک نہتی کو پکڑ کر کوٹھری میں قید کر لیا۔

لیکن وہ زمانہ ایسا تھا کہ منطق، استدلال اور فلسفہ بے کار چیزیں تھیں۔۔۔ ان دونوں جس طرح گر میوں میں بھی دروازے اور کھڑکیاں بند کرتے سوتے تھے اسی طرح میں نے بھی، اپنے دل و دماغ کی بھی سب کھڑکیاں دروازے بند کر دیے تھے، حالانکہ انھیں کھلا رکھنے کی زیادہ ضرورت اسی وقت تھی۔ لیکن میں کیا کرتا، مجھے کچھ سوچتا نہیں تھا۔

برآمدہ عورتیں آرہی تھیں۔ برآمدہ عورتیں جارہی تھیں۔

یہ درآمد اور برآمد جاری تھی۔۔۔ تمام تاجر انہ خصوصیات کے ساتھ!

صحافی، افسانہ نگار اور شاعر اپنے قلم اٹھائے شکار میں مصروف تھے۔۔۔ لیکن افسانوں اور نظموں کا ایک سیلا ب تھا جو امداد اچلا آرہتا۔ فلموں کے قدم اکھڑا کھڑا جاتے تھے۔ اتنے صید تھے کہ سب بوکھلانے تھے۔

ایک لیاثان افسر مجھ سے ملا، کہنے لگا، ”تم کیوں گم سم رہتے ہو؟“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے مجھے ایک داستان سنائی،

”مغولیہ عورتوں کی تلاش میں ہم مارے مارے پھرتے ہیں۔ ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں، پھر تیرے گاؤں، پھر چوتھے۔ گلی گلی، محلہ محلہ۔۔۔ کوچ کوچ۔۔۔ بڑی مشکلوں سے گوہر مقصود ہاتھ آتا ہے۔“

میں نے دل میں کہا، ”کیسے گوہر۔۔۔ کیسے زاستہ۔۔۔ یاسفتہ؟“

تمہیں معلوم نہیں، ہمیں کتنا دقتون کا سامنا کرنا پڑتا ہے، میں تمہیں ایک بات بتلانے والا تھا۔۔۔ ہم بارڈر کے اس پارسیکڑوں پھیرے کر پکھے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ میں نے ہر پھیرے میں ایک مسلمان بڑھیا کو دیکھا۔۔۔ ادھیڑ عمر کی تھی۔۔۔ پہلی مرتبہ میں نے اسے جاندہ ہر کی بستیوں میں دیکھا، پریشان حال۔۔۔ ماوف دماغ، ویران ویران آنکھیں، گرد و غبار سے اٹھے ہوئے بال، پھٹے ہوئے کپڑے، اسے تن کا ہوش تھا نہ من کا، لیکن اس کی نگاہوں سے یہ صاف ظاہر تھا کہ کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔

مجھے بہن نے بتایا کہ یہ عورت صدمہ کے باعث پاگل ہو گئی ہے۔ پیالہ کی رہنے والی ہے۔ اس کی اکتوبر کی تھی جو اسے نہیں ملتی، ہم نے بہت جتن کیے ہیں اسے ڈھونڈنے کے لیے مگر ناکام رہے ہیں۔ غالباً بلوؤں میں ماری گئی ہے لیکن یہ بڑھیا نہیں ملتی۔

دوسری مرتبہ میں نے اس پگلی کو سہارن پور کے لاریوں کے اوپرے پر دیکھا، اس کی حالت پہلے سے کہیں زیادہ ابتر اور خستہ تھی۔ اس کے ہونٹوں پر موٹی موٹی پیڑیاں جھی تھیں، بال ساد ہوؤں کے سے بننے تھے۔ میں نے اس سے بات چیت کی اور چاہا کہ وہ اپنی موہوم تلاش چھوڑ دے۔ چنانچہ میں نے اس سے بہت سنگدل بن کر کہا، ”ماں تیری لڑکی قتل کردی گئی تھی۔“

پگلی نے میری طرف دیکھا، ”قتل۔۔۔؟ نہیں نہیں۔“ اس کے لمحے میں فولادی تیقین پیدا ہو گیا، ”اسے کوئی قتل نہیں کر سکتا۔۔۔ میری بیٹی کو کوئی قتل نہیں کر سکتا۔“ اور وہ چلی گئی، اپنی موہوم تلاش میں۔۔۔

میں نے سوچا: ایک تلاش اور پھر موہوم۔۔۔! لیکن پگلی کو کیوں اتنا نقین تھا کہ اس کی بیٹی پر کوئی کرپان نہیں اٹھ سکتی، کوئی تیز دھاریا کند چھرا اس کی گردن کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ کیا وہ امر تھی یا اس کی مامتا امر تھی۔۔۔ مامتا تو خیر امر ہوتی ہے۔ پھر کیا وہ اپنی ممتا ڈھونڈ رہی تھی۔۔۔ کیا اس نے اسے کہیں کھو دیا۔۔۔؟

تیرے پھیرے پر پھر میں نے اسے دیکھا۔ اب وہ بالکل چیختہوں میں تھی، قریب قریب نگی، میں نے اسے کپڑے دیے۔ لیکن اس نے قبول نہ کیے۔ میں نے اس سے کہا، ”ماں میں سچ کہتا ہوں، تیری لڑکی پیالہ ہی میں قتل کر دی گئی تھی۔“ اس نے پھر اسی فولادی تیقین کے ساتھ کہا، ”تو جھوٹ کہتا ہے۔“ میں نے اس سے اپنی بات منوانے کی خاطر کہا، ”نہیں میں سچ کہتا ہوں، کافی روپیٹ لیا ہے تم نے۔۔۔ چلو میرے ساتھ میں تم کو پاکستان لے چلوں گا۔“

اس نے میری بات نہ سنی اور بڑھانے لگی۔ بڑھاتے بڑھاتے وہ ایک دم پوکنگی، اب اس کے لمحے میں تیقین فولاد سے بھی زیادہ ٹھوس تھا، ”نہیں میری بیٹی کو کوئی قتل نہیں کر سکتا!“ میں نے پوچھا، ”کیوں؟“ بڑھیا نے ہولے ہولے کہا، ”وہ خوبصورت ہے۔۔۔ اتنی خوبصورت کہ اسے کوئی قتل نہیں کر سکتا۔۔۔ اسے ٹھانچہ تک نہیں مار سکتا۔“

میں سوچنے لگا، ”کیا وہ واقعی اتنی خوبصورت تھی۔۔۔؟ ہر ماں کی آنکھوں میں اس کی اولاد چندے آفتاب و چندے ماہتاب ہوتی ہے۔۔۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ لڑکی درحقیقت خوبصورت ہو۔۔۔ مگر اس طوفان میں کون سی خوبصورتی ہے جو انسان کے کھر درے ہاتھوں سے بچی

ہے۔۔۔ ہو سکتا ہے پگلی اس خیال خام کو دھوکا دے رہی ہو۔۔۔ فرار کے لاکھوں راستے ہیں۔۔۔ دکھ ایک ایسا چوک ہے جو اپنے گرد لاکھوں بلکہ کروڑوں سڑکوں کا جال بن دیتا ہے۔۔۔“

بادر کے اس پارکئی پھیرے ہوئے۔۔۔ ہر بار میں نے اس پگلی کو دیکھا۔ اب وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی۔ پینائی کمزور ہو چکی تھی، ٹھول کر چلتی تھی، مگر اس کی تلاش جاری تھی بڑی شدود مدد سے۔ اس کا یقین اسی طرح مستحکم تھا کہ اس کی بیٹی زندہ ہے، اس لیے کہ اسے کوئی مار نہیں سکتا۔

بہن نے مجھ سے کہا کہ ”اس عورت سے مغزماری فضول ہے۔ اس کا دماغ چل چکا ہے بہتر یہی ہے کہ تم اسے پاکستان لے جاؤ اور پاگل خانہ میں داخل کر ادو۔“

میں نے مناسب نہ سمجھا۔ میں اس کی موہوم تلاش جو اس کی زندگی کا واحد سہارا تھی، میں اس سے چھیننا نہیں چاہتا تھا۔ میں اسے ایک وسیع و عریض پاگل خانے سے، جس میں وہ میلوں کی مسافت طے کر کے، اپنے پاؤں کے آبلوں کی پیاس بجھا سکتی تھی، اٹھا کر ایک محصر سی چار دیواری میں قید کرانا نہیں چاہتا تھا۔

آخری بار میں نے اسے امر تسری میں دیکھا۔ اس کی شکستہ حالی کا یہ عالم تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے، میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اسے پاکستان لے جاؤں گا اور پاگل خانے میں داخل کر ادوں گا۔

وہ فرید کے چوک میں کھڑی اپنی نیم اندر ہی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ چوک میں کافی چہل پہل تھی۔۔۔ میں بہن کے ساتھ ایک دکان پر بیٹھا ایک معمولی لڑکی کے متعلق بات چیت کر رہا تھا، جس کے متعلق ہمیں یہ اطلاع ملی تھی کہ وہ بازار صبوٰنیاں میں ایک ہندو بنیے کے گھر موجود ہے۔ یہ گفتگو ختم ہوئی تو میں اٹھا کہ اس پگلی سے جھوٹ بیج کہہ کر اسے پاکستان جانے کے لیے آمادہ کروں کہ ایک جوڑا ادھر سے گزرا۔۔۔ عورت نے گھونگٹ کاڑھا ہوا تھا۔۔۔ چھوٹا سا گھونگٹ۔ اس کے ساتھ ایک سکھ نوجوان تھا۔ بڑا چھیل چھیلا، بڑا تند رست اور تیکھے تیکھے نقشوں والا۔۔۔

جب یہ دونوں اس پگلی کے پاس سے گزرے تو نوجوان ایک دم ٹھنک گیا۔۔۔ وہ قدم پیچھے ہٹ کر عورت کا ہاتھ کپڑ لیا، کچھ اس اچانک طور پر کہ لڑکی نے اپنا چھوٹا سا گھونٹ اٹھایا۔ لٹھنے کی دھلی ہوئی چادر کے چوکھے میں مجھے ایک ایسا گلابی چہرہ نظر آیا جس کا حسن بیان کرنے سے میری زبان عاجز ہے۔

میں ان کے بالکل پاس تھا، سکھ نوجوان نے اس حسن و جمال کی دیوبھی سے اس پگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سر گوشی میں کہا، ”تمہاری ماں!“

لڑکی نے ایک لمحنے کے لیے پگلی کی طرف دیکھا اور گھونٹ چھوڑ لیا اور سکھ نوجوان کا بازو کپڑ کر بھینچنے ہوئے لجھے میں کہا، ”چلو!“ اور وہ دونوں سڑک سے ادھر ڈراہٹ کر تیزی سے آگے نکل گئے۔۔۔ پگلی چلائی، ”بھاگ بھری۔۔۔ بھاگ بھری۔“ وہ سخت مضطرب تھی۔۔۔ میں نے پاس جا کر پوچھا، ”کیا بات ہے مائی؟“ وہ کانپ رہی تھی، ”میں نے اس کو دیکھا ہے۔۔۔ میں نے اس کو دیکھا ہے۔“

”میں نے پوچھا، ”کسے؟“

اس کے ماتھے کے نیچے دو گڑھوں میں اس کی آنکھوں کے بے نور ڈھیلے متحرک تھے، ”اپنی بیٹی کو۔۔۔ بھاگ بھری کو۔۔۔!“ میں نے پھر سے کہا، ”وہ مر چکپ چکی ہے مائی۔“

اس نے چیخ کر کہا، ”تم جھوٹ کہتے ہو!“

میں نے اس مرتبہ اس کو پورا یقین دلانے کی خاطر کہا، ”میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں، وہ مر چکی ہے۔“

یہ سنتے ہی وہ پگلی چوک میں ڈھیر ہو گئی۔

نذریں بلیک مار کیتے سے وسکی کی بوتل لانے گیا۔ بڑک ڈاک خانے سے کچھ آگے بندر گاہ کے پھانک سے کچھ ادھر سگرٹ والے کی دکان سے اس کو اسکاچ مناسب داموں پر مل جاتی تھی۔ جب اس نے پینتیس روپے ادا کر کے کاغذ میں لپٹی ہوئی بوتل لی تو اس وقت گیارہ بجے تھے دن کے۔ یوں تو وہ رات کو پینے کا عادی تھا مگر اس روز موسم خوشگوار ہونے کے باعث وہ چاہتا تھا کہ صبح ہی سے شروع کر دے اور رات تک پیتا رہے۔

بوتل ہاتھ میں کپڑے وہ خوش گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا رادہ تھا کہ بوری بندر کے اسٹینڈ سے ٹیکسی لے گا۔ ایک پیگ اس میں بیٹھ کر پیے گا اور ہلکے ہلکے سرو مریں گھر پہنچ جائے گا۔ بیوی منع کرے گی تو وہ اس سے کہے گا، ”موسم دیکھ کتنا اچھا ہے۔“ پھر وہ اسے وہ بھونڈ اسا شعر سنائے گا،

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند
جو گناہ کبجے ثواب ہے آج

وہ کچھ دیر ضرور چھ کرے گی، لیکن بالآخر خاموش ہو جائے گی اور اس کے کہنے پر قیمے کے پر اٹھے بنانا شروع کر دے گی۔

دکان سے بیس پچھیں گز دور گیا ہو گا کہ ایک آدمی نے اس کو سلام کیا۔ نذریں کا حافظہ کمزور تھا۔ اس نے سلام کرنے والی آدمی کو نہ پہچانا، لیکن اس پر یہ ظاہرنہ کیا کہ وہ اس کو نہیں جانتا، چنانچہ بڑے اخلاق سے کہا، ”کیوں بھی کہاں ہوتے ہو۔ کبھی نظر ہی نہیں آئے۔“

اس آدمی نے مسکرا کر کہا، ”حضور، میں تو یہیں ہوتا ہوں۔ آپ ہی کبھی تشریف نہیں لائے۔“

نذریں نے اس کو پھر بھی نہ پہچانا، ”میں اب جو تشریف لے آیا ہوں۔“

”تو چلیے میرے ساتھ۔“

نذر اس وقت بڑے اچھے مودیں تھا، ”پلو۔“ اس آدمی نے نذر کے ہاتھ میں بوتل دیکھی اور معنی خیز طریقے پر مسکراایا، ”باقی سامان تو آپ کے پاس موجود ہے۔“ یہ فقرہ سن کر نذر نے فوراً ہی سوچا کہ وہ دلال ہے، ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”کریم۔۔۔ آپ بھول گئے تھے!“

نذر کو یاد آگیا کہ شادی سے پہلے ایک کریم اس کے لیے اچھی اچھی لڑکیاں لایا کرتا تھا۔ بڑا ایمان دار دلال تھا۔ اس کو غور سے دیکھا تو صورت جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ پھر پچھلے تمام واقعات اس کے ذہن میں ابھر آئے۔ کریم سے اس نے معدترت چاہی، ”یار میں نے تمہیں پہچانا نہیں تھا۔ میرا خیال ہے۔ غالباً چھ برس ہو گئے ہیں تم سے ملے ہوئے۔“

”جی ہاں۔“

”تمہارا اڈہ تو پہلے گرانٹ روڈ کا ناکا ہوا کرتا تھا؟“

کریم نے بڑی سلگائی اور ذرا فخر سے کہا، ”میں نے وہ چھوڑ دیا ہے۔ آپ کی دعا سے اب یہاں ایک ہوٹل میں دھندا شروع کر رکھا ہے۔“ نذر نے اس کو داد دی، ”یہ بہت اچھا کیا تم نے؟“ کریم نے اور زیادہ فخر یہ لمحے میں کہا، ”دس چھو کریاں ہیں۔۔۔ ایک بالکل نئی ہے۔“ نذر نے اس کو چھیڑنے کے انداز میں کہا، ”تم لوگ یہی کہا کرتے ہو۔“

کریم کو برالگا، ”قسم قرآن کی، میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ سور کھاؤں اگر وہ چھو کری بالکل نئی نہ ہو۔“ پھر اس نے اپنی آواز دھیمی کی اور نذر کے کان کے ساتھ منہ لگا کر کہا، ”آٹھ دن ہوئے ہیں جب پہلا پینجر آیا تھا۔ جھوٹ بولوں تو میرا منہ کالا ہو۔“

نذر نے پوچھا، ”کنواری تھی؟“

”جی ہاں۔۔۔ دوسرو پے لیے تھے اس پینجر سے۔“

نذر نے کریم کی پسلیوں میں ایک ٹھونکا دیا، ”لو، یہیں بھاؤ پکارنے لگے۔“

کریم کو نذیر کی یہ بات پھر بری لگی، ”قسم قرآن کی، سورہ جو آپ سے بھاؤ کرے آپ تشریف لے چلے۔ آپ جو بھی دیں گے مجھے قبول ہو گا۔“ کریم نے آپ کا بہت نمک کھایا ہے۔ ”نذیر کی جیب میں اس وقت ساڑھے چار سوروپے تھے۔ موسم اچھا تھا۔ موڈ بھی اچھا تھا۔ وہ چھ برس چھپے کے زمانے میں چلا گیا۔ بن پئے مسرور تھا، ”چلو یار آج تمام عیاشیاں رہیں۔۔۔۔۔ ایک بوتل کا اور بندوبست ہو جانا چاہیے۔“

کریم نے پوچھا، ”آپ کتنے میں لائے ہیں یہ بوتل؟“

”پینتیس روپے میں۔“

”کون سا برانڈ ہے؟“

”جونی واکر!“

کریم نے چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا، ”میں آپ کو تیس میں لا دوں گا۔“

نذیر نے دس دس کے تین نوٹ نکالے اور کریم کے ہاتھ میں دے دیے، ”نیکی اور پوچھ پوچھ۔۔۔۔۔ یہ لو۔ مجھے وہاں بھاکر تم پہلا کام بھی کرنا۔ تم جانتے ہو، میں ایسے معاملوں میں اکیلانہیں پیا کرتا۔“ کریم مسکرا یا، ”اور آپ کو یاد ہو گا۔ میں ڈیڑھ پیگ سے زیادہ نہیں پیا کرتا۔“ نذیر کو یاد آگیا کہ کریم واقعی آج سے چھ برس پہلے صرف ڈیڑھ پیگ لیا کرتا تھا۔ یہ یاد کر کے نذیر بھی مسکرا یا، ”آج دور ہیں۔“

”جی نہیں۔ ڈیڑھ سے زیادہ ایک قطرہ بھی نہیں۔“

کریم ایک تھرڈ کلاس بلڈنگ کے پاس ٹھہر گیا، جس کے ایک کونے میں چھوٹے سے میلے بورڈ پر ”میرینا ہو ٹل“ لکھا تھا۔ نام تو خوبصورت تھا مگر عمارت نہایت ہی غلیظ تھی، سیڑھیاں شکستہ۔ نیچے سودخور پٹھان بڑی شلواریں پہنے کھاؤں پر لیٹے ہوئے تھے۔ پہلی منزل پر کر سچین آباد تھے۔ دوسری منزل پر جہاز کے بے شمار خلاصی۔ تیسرا منزل ہو ٹل کے مالک کے پاس تھی۔ چوتھی منزل پر کونے کا ایک کمرہ کریم کے پاس تھا جس میں کئی لڑکیاں مرغیوں کی طرح اپنے ڈر بے میں بیٹھی تھیں۔

کریم نے ہوٹل کے مالک سے چابی مانگوائی۔ ایک بڑا لیکن بے ہنگام سا کمرہ کھولا جس میں لو ہے کی ایک چارپائی، ایک کرسی اور ایک تپائی پڑی تھی۔ تین اطراف سے یہ کمرہ کھلا تھا، یعنی بے شمار کھڑکیاں تھیں، جن کے شیئے ٹوٹے ہوئے تھے اور کچھ نہیں، لیکن ہوا کی بہت افراط تھی۔

کریم نے آرام کر سی جو کہ بے حد مبلى تھی، ایک اس سے زیادہ مبلى کپڑے سے صاف کی اور نذیر سے کہا، ”تشریف رکھئے، لیکن میں یہ عرض کر دوں، اس کمرے کا کرایہ دس روپے ہو گا۔“ نذیر نے کمرے کو بذراغور سے دیکھا، ”دس روپے زیادہ ہیں یار؟“ کریم نے کہا، ”بہت زیادہ ہیں، لیکن کیا کیا جائے۔ سالا ہوٹل کا مالک ہی بنیا ہے۔ ایک بیسہ کم نہیں کرتا۔ اور نذیر صاحب موجود شوق کرنے والے آدمی بھی زیادہ کی پروانہیں کرتے۔“ نذیر نے کچھ سوچ کر کہا، ”تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔ کرایہ بیٹھی دے دوں؟“

”جی نہیں۔۔۔ آپ پہلے چھو کری تو دیکھئے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے ڈربے میں چلا گیا۔ ٹھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک نہایت ہی شر میلی لڑکی تھی۔ گھر بیوی قسم کی ہندو لڑکی سفید دھوتی باندھے تھی۔ عمر چودہ برس کے لگ بھگ ہو گی۔ خوش شکل تو نہیں تھی، لیکن بھولی بھالی تھی۔ کریم نے اس سے کہا، ”بیٹھ جاؤ۔ یہ صاحب میرے دوست ہیں۔ بالکل اپنے آدمی ہیں۔“ لڑکی نظریں نیچے کیے لو ہے کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ کریم یہ کہہ کر چلا گیا، ”پناہی طینان کر لیجئے نذیر صاحب۔۔۔ میں گلاس اور سوڈا لاتا ہوں۔“ نذیر آرام کر سی پر سے اٹھ کر لڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ سمت کر ایک طرف ہٹ گئی۔ نذیر نے اس سے چھ برس پہلے کے انداز میں پوچھا، ”آپ کا نام؟“ لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ نذیر نے آگے سرک کراس کے ہاتھ پکڑے اور پھر پوچھا، ”آپ کا نام کیا ہے جناب؟“

لڑکی نے ہاتھ چھڑا کر کہا، ”شکننلا۔“ اور نذیر کو شکننلا یاد آگئی، جس پر راجہ دشمنیت عاشق ہوا تھا، ”میرا نام دشمنیت ہے۔“ نذیر کامل عیاشی پر تلا ہوا تھا۔ لڑکی نے اس کی بات سنی اور مسکر ادی۔ اتنے میں کریم آگیا۔ اس نے نذیر کو سوڈے کی چاربو تلیں دکھائیں جو ٹھنڈی ہونے کے باعث پسینہ چھوڑ رہی تھیں، ”مجھے یاد ہے کہ آپ کو وجر کا سوڈا پسند ہے، برف میں لگا ہوا لے کر آیا ہوں۔“

نذیر بہت خوش ہوا، ”تم کمال کرتے ہو۔“ پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہوا، ”جناب آپ بھی شوق فرمائیں گی؟“ لڑکی نے کچھ نہ کہا۔ کریم نے جواب دیا، ”نذیر صاحب۔ یہ نہیں پتی۔ آٹھ دن تو ہوئے ہیں اس کو یہاں آئے ہوئے۔“ یہ سن کر نذیر کو افسوس سا ہوا، ”یہ تو بہت بڑی بات ہے۔“ کریم نے وسکی کی بوتل کھول کر نذیر کے لیے ایک بڑا پیگ بنایا اور اس کو آنکھ مار کر کہا، ”آپ راضی کر لیجئے اسے۔“ نذیر نے

ایک ہی جرے میں گلاس ختم کیا۔ کریم نے آدھا پیگ بیا۔ فوراً ہی اس کی آواز نشہ آلو دھو گئی۔ ذرا جھوم کر اس نے نذیر سے پوچھا،
”چھو کری پسند ہے نا آپ کو؟“ نذیر نے سوچا کہ لڑکی اسے پسند ہے کہ نہیں۔ لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

اس نے شکنٹلا کی طرف غور سے دیکھا۔ اگر اس کا نام شکنٹلانہ ہوتا تو بہت ممکن ہے وہ اسے پسند کر لیتا۔ وہ شکنٹلا جس پر راجہ دشمنیت شکار
کھلیتے کھلتے عاشق ہوا تھا، بہت ہی خوبصورت تھی۔ کم از کم کتابوں میں یہی درج تھا کہ وہ چندے آفتاب چندے ماہتاب تھی۔ آہو چشم تھی۔
نذیر نے ایک بار پھر اپنی شکنٹلا کی طرف دیکھا۔

اس کی آنکھیں بری نہیں تھیں۔ آہو چشم تو نہیں تھی، لیکن اس کی آنکھیں اس کی اپنی آنکھیں تھیں۔ کالی کالی اور بڑی بڑی۔ اس نے اور
کچھ سوچا اور کریم سے کہا، ”ٹھیک ہے یار۔۔۔ بولو معاملہ کہاں ملے ہوتا ہے؟“ کریم نے آدھا پیگ اپنے لیے اور انڈیلا اور کہا، ”سور و پے!“
نذیر نے سوچنا بند کر دیا تھا، ”ٹھیک ہے!“

کریم اپنا دوسرا آدھا پیگ پی کر چلا گیا۔ نذیر نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ شکنٹلا کے پاس بیٹھا تو وہ گھبر اسی گئی۔ نذیر نے اس کا پیار لینا چاہا تو وہ
اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ نذیر کو اس کی یہ حرکت ناگوار محسوس ہوئی لیکن اس نے پھر کوشش کی۔ بازو سے پکڑ کر اس کو اپنے پاس بٹھایا۔
زبردستی اس کو چوچا۔ بہت ہی بے کیف سلسلہ تھا۔ البتہ وہ سکنی کا نشہ اچھا تھا۔ وہ اب تک چھپیگ پی چکا تھا اور اس کو افسوس تھا کہ اتنی مہنگی چیز
بالکل بے کار گئی ہے، اس لیے کہ شکنٹلا بالکل الھڑ تھی۔ اس کو ایسے معاملوں کے آداب کی کوئی واقفیت ہی نہیں تھی۔ نذیر ایک اندازی
تیر اک کے ساتھ ادھر ادھر بے کار ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ آخر آلتا گیا۔ دروازہ کھول کر اس نے کریم کو آواز دی جو اپنے ڈربے میں مرغیوں
کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آواز سن کر دوڑا آیا، ”کیا بات ہے نذیر صاحب؟“

نذیر نے بڑی نا امیدی سے کہا، ”کچھ نہیں یار۔ یہ اپنے کام کی نہیں ہے؟“

”کیوں؟“

”کچھ سمجھتی ہی نہیں۔“

کریم نے شکنلا کو الگ لے جا کر بہت سمجھایا مگر وہ سمجھ سکی۔ شرمائی، لجائی، دھوتی سنجالتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کریم نے اس پر کہا، ”میں ابھی حاضر کرتا ہوں۔“

نذیر نے اس کو روکا، ”جانے دو۔۔۔ کوئی اور لے آؤ۔ لیکن اس نے فوراً ہی ارادہ بدل لیا، ”وہ جو تمہیں روپے دیے تھے، اس کی بوتل لے آؤ اور شکنلا کے سوا جتنی لڑکیاں اس وقت موجود ہیں انھیں یہاں بھیج دو۔۔۔ میرا مطلب ہے جو پیتی ہیں۔ آج اور کوئی سلسلہ نہیں ہو گا۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کروں گا اور بس!“

کریم نذیر کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے چار لڑکیاں کمرے میں بھیج دیں۔ نذیر نے ان سب کو سرسری نظر سے دیکھا، کیونکہ وہ اپنے دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ پروگرام صرف پینے کا ہو گا۔ چنانچہ اس نے ان لڑکیوں کے لیے گلاں منگوائے اور ان کے ساتھ پینا شروع کر دیا۔ دوپہر کا کھانا ہوٹل سے منگو اکر کھایا اور شام کے چھ بجے تک ان لڑکیوں سے باتیں کرتا رہا۔ بڑی فضول قسم کی باتیں، لیکن نذیر خوش تھا۔ جو کوفت شکنلا نے پیدا کی تھی، دور ہو گئی تھی۔

آدھی بوتل باقی تھی، وہ ساتھ لے کر گھر چلا گیا۔ پندرہ روز کے بعد پھر موسم کی وجہ سے اس کا جی چاہا کہ سارا دن پی جائے۔ سگرٹ والے کی دکان سے خریدنے کے بجائے اس نے سوچا کیوں نہ کریم سے ملوں، وہ تیس میں دے دے گا۔ چنانچہ وہ اس کے ہوٹل میں پہنچا۔ اتفاق سے کریم مل گیا۔ اس نے ملتے ہی بہت ہو لے سے کہا، ”نذیر صاحب، شکنلا کی بڑی بہن آئی ہوئی ہے۔ آج صبح ہی گاڑی سے پہنچی ہے۔۔۔ بہت ہیلی ہے۔ مگر آپ اس کو ضرور راضی کر لیں گے۔“

نذیر کچھ سوچنے سکا۔ اس نے اپنے دل میں اتنا کہا، ”چلو دیکھ لیتے ہیں۔“ لیکن اس نے کریم سے کہا، ”تم پہلے یارو سکی لے آؤ۔“ یہ کہہ کر اس نے تیس روپے جیب سے نکال کر کریم کو دیے۔ کریم نے نوٹ لے کر نذیر سے کہا، ”میں لے آتا ہوں۔ آپ اندر کمرے میں بیٹھے۔“ نذیر کے پاس صرف دس روپے تھے، لیکن وہ کمرے کا دروازہ کھلوا کر بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ کی کی بوتل لے کر ایک نظر شکنلا کی بہن کو دیکھ کر چل دے گا۔ جاتے وقت دوروپے کریم کو دے دے گا۔

تین طرف سے کھلے ہوئے ہوادر کمرے میں نہایت ہی میلی کرسی پر بیٹھ کر اس نے سگریٹ سلاگایا اور اپنی ٹانگیں رکھ دیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد آہٹ ہوئی۔ کریم داخل ہوا۔ اس نے نذیر کے کان کے ساتھ منہ لگا کر ہو لے سے کہا، ”نذیر صاحب آرہی ہے۔ لیکن آپ ہی رام کیجیے گا سے۔“

یہ کہہ کروہ چلا گیا۔ پانچ منٹ کے بعد ایک لڑکی جس کی شکل و صورت قریب قریب شکنٹلا سے ملتی تھی۔ تیوری چڑھائے، شکنٹلا کے سے انداز میں سفید دھوتی پہننے کمرے میں داخل ہوئی۔ بڑی بے پرواںی سے اس نے ماتھے کے قریب ہاتھ لے جا کر ”آداب“ کہا اور لوہے کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ نذیر نے یوں محسوس کیا کہ وہ اس سے لڑنے آئی ہے۔ چھ برس پیچھے کے زمانے میں ڈیکی لگا کروہ اس سے مخاطب ہوا، ”آپ شکنٹلا کی بہن ہیں؟“

اس نے بڑے تیکھے اور خفیٰ آمیز لمحے میں کہا، ”جی ہاں۔“ نذیر تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اس لڑکی کو جس کی عمر شکنٹلا سے غالباً تین برس بڑی تھی۔ بڑے غور سے دیکھا۔ نذیر کی یہ حرکت اس کو بہت ناگوار محسوس ہوئی۔ وہ بڑے زور سے ٹانگ ہلا کر اس سے مخاطب ہوئی، ”آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

نذیر کے ہونٹوں پر چھ برس پیچھے کی مسکراہٹ نمودار ہوئی، ”جناب آپ اس قدر ناراض کیوں ہیں؟“ وہ برس پڑی، ”میں ناراض کیوں نہ ہوں۔۔۔ یہ آپ کا کریم میری بہن کو جسے پور سے اڑالایا ہے۔ بتائیے آپ، میراخون نہیں کھولے گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو بھی وہ پیش کی گئی تھی؟“

نذیر کی زندگی میں ایسا معاملہ کبھی نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر سوچ کر اس نے اس لڑکی سے بڑے خلوص کے ساتھ کہا، ”شکنٹلا کو دیکھتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لڑکی میرے کام کی نہیں۔ بہت اھڑ رہے، مجھے ایسی لڑکیاں بالکل پسند نہیں۔ آپ شاید برانامیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں ان عورتوں کو بہت زیادہ پسند کرتا ہوں جو مرد کی ضروریات کو سمجھتی ہوں۔“

اس نے کچھ نہ کہا۔ نذیر نے اس سے دریافت کیا، ”آپ کا نام؟“

شکنٹلا کی بہن نے مختصر گھا، ”شاردار۔“

نذیر نے پھر اس سے پوچھا، ”آپ کا وطن؟“

”جے پور۔“ اس کا لہجہ بہت تیکھا اور خفیٰ آسود تھا۔

نذیر نے مسکرا کر اس سے کہا، ”دیکھیے آپ کو مجھ سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں۔۔۔ کریم نے اگر کوئی زیادتی کی ہے تو آپ اس کو سزا دے سکتی ہیں، لیکن میر اکوئی تصور نہیں۔“ یہ کہہ کروہ اٹھا اور اس کو اچانک اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر اس کے ہونٹوں کو چدم لیا۔ وہ کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ نذیر اس سے مخاطب ہوا، ”یہ قصور البتہ میرا ہے۔ اس کی سزا میں بھگنے کے لیے تیار ہوں۔“

لڑکی کے ماتھے پر بے شمار تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ اس نے تین چار مرتبہ زمین پر تھوکا۔ غالباً گالیاں دینے والی تھی، لیکن چپ ہو گئی۔ اٹھ کھڑی ہوئی تھی لیکن فوراً ہی بیٹھ گئی۔ نذیر نے چاہا کہ وہ کچھ کہے، ” بتائیے، آپ مجھے کیا سزا دینا چاہتی ہیں۔“ وہ کچھ کہنے والی تھی کہ ڈربے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ لڑکی اٹھی، نذیر نے اسے روکا، ”کہاں جا رہی ہیں آپ؟“ وہ ایک دم مان بن گئی، ”منی رو رہی ہے، دودھ کے لیے۔“ یہ کہہ کروہ چلی گئی۔

نذیر نے اس کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی مگر کچھ سوچ نہ سکا۔ اتنے میں کریم و سکی کی بوتل اور سوڈے لے کر آگئی۔ اس نے نذیر کے لیے سوڈا ڈالا۔ اپنا گلاس ختم کیا اور نذیر سے رازدارانہ لمحے میں کہا، ”کچھ بتیں ہوئیں شاردا سے؟“

”میں نے تو سمجھا تھا کہ آپ نے پٹالیا ہو گا؟“

نذیر نے مسکرا کر جواب دیا، ”بڑی غصیل عورت ہے!“

”جی ہاں۔۔۔ صحیح آئی ہے، میری جان کھا گئی۔ آپ ذرا اس کو رام کریں۔۔۔ شکنٹا خود یہاں آئی تھی۔ اس لیے کہ اس کا باپ اس کی ماں کو چھوڑ چکا ہے اور اس شاردا کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اس کا پتی شادی کے فوراً بعد ہی اس کو چھوڑ کر خدا معلوم کہاں چلا گیا تھا۔۔۔ اب اکیلی اپنی بچی کے ساتھ ماں کے پاس رہتی ہے۔۔۔ آپ منابعِ ناس کو؟“

نذیر نے اس سے کہا، ”منانے کی کیا بات ہے؟“

کریم نے اس کو آنکھ ماری، ”سامی مجھ سے تو مانتی نہیں۔ جب سے آئی ہے ڈانٹ رہی ہے۔“

اتئے میں شاردا اپنی ایک سال کی بچی کو گود میں اٹھائے اندر کمرے میں آئی۔ کریم کو اس نے غصے سے دیکھا۔ اس نے آدھا پیک پیا اور باہر چلا گیا۔

منی کو بہت زکام تھا۔ ناک بہت بری طرح بہر رہی تھی۔ نذیر نے کریم کو بلایا اور اس کو پانچ کانوٹ دے کر کہا، ”جائے، ایک وکس کی بوتل لے آؤ۔“ کریم نے پوچھا، ”وہ کیا ہوتی ہے؟“ نذیر نے اس سے کہا، ”زکام کی دوا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک پر زے پر اس دوا کا نام لکھ دیا، ”کسی بھی استھور سے مل جائے گی۔“

”جی اچھا۔“ کہہ کر کریم چلا گیا۔ نذیر منی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کو بچے بہت اچھے لگتے تھے۔ منی خوش شکل نہیں تھی لیکن کم سنی کے باعث نذیر کے لیے دلکش تھی۔ اس نے اس کو گود میں لیا۔ ماں سے سو نہیں رہی تھی۔ سر میں ہولے ہولے انگلیاں پھیر کر اس کو سلا دیا اور شاردا سے کہا، ”اس کی ماں تو میں ہوں۔“

شاردا مسکرائی، ”لایئے، میں اس کو اندر چھوڑ آؤں۔“

شاردا اس کو اندر لے گئی اور چند منٹ کے بعد واپس آگئی۔ اب اس کے چہرے پر غصے کے آثار نہیں تھے۔ نذیر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر وہ خاموش رہا۔ اس کے بعد اس نے شاردا سے پوچھا، ”کیا آپ مجھے اپنا پتی بننے کی اجازت دے سکتی ہیں؟“ اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس کو اپنے سینے کے ساتھ لگالیا۔ شاردا نے غصے کا اظہار نہ کیا، ”جواب دیجیے جناب۔“

شاردا خاموش رہی۔ نذیر نے اٹھ کر ایک پیک پیا، تو شاردا نے ناک سکوڑ کر اس سے کہا، ”مجھے اس چیز سے نفرت ہے۔“ نذیر نے ایک پیک گلاس میں ڈالا۔ اس میں سوڈا حل کر کے اٹھایا اور شاردا کے پاس بیٹھ گیا، ”آپ کو اس سے نفرت ہے۔۔۔ کیوں؟“ شاردا نے مختصر ساجواب دیا، ”بس ہے۔“

”تو آج سے نہیں رہے گی۔۔۔ یہ بیجی۔“ یہ کہہ کر اس نے گلاس شاردا کی طرف بڑھا دیا۔

”میں ہر گز نہیں پیوں گی۔“

”میں کہتا ہوں، تم ہر گز انکار نہیں کرو گی۔“

شاردا نے گلاس کپڑا لیا۔ تھوڑی دیر تک اس کو عجیب نگاہوں سے دیکھتی رہی، پھر نذیر کی طرف مظلومانہ نگاہوں سے دیکھا۔ اور ناک انگلیوں سے بند کر کے سارا گلاس غٹا گئی۔ قے آنے کو تھی مگر اس نے روک لی۔ دھوتی کے پلو سے اپنے آنسو پوچھ کے اس نے نذیر سے کہا، ”یہ پہلی اور آخری بار ہے۔“

”لیکن میں نے کیوں پی؟“ نذیر نے اس کے گیلے ہونٹ چو مے اور کہا، ”یہ مت پوچھو۔“ یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ شام کو سات بجے اس نے دروازہ کھولا۔ کریم آیا تو شاردا انظریں جھکائے باہر چلی گئی۔ کریم بہت خوش تھا۔ اس نے نذیر سے کہا، ”آپ نے کمال کر دیا۔ آپ سے سوتونہیں مانگتا، بچا س دے دیجیے۔“

نذیر شاردا سے بے حد مطمئن تھا۔ اس قدر مطمئن کہ وہ گزشتہ تمام عورتوں کو بھول پکا تھا۔ وہ اس کے جنسی سوالات کا سو فی صدی صحیح جواب تھی۔ اس نے کریم سے کہا، ”میں کل ادا کر دوں گا۔۔۔ ہو ٹل کا کرایہ بھی کل چکاؤں گا۔ آج میرے پاس وسکی منگانے کے بعد صرف دس روپے باقی تھے۔“

کریم نے کہا، ”کوئی واندہ نہیں ہے۔۔۔ میں تو اس بات سے بہت خوش ہوں کہ آپ نے شاردا سے معاملے طے کر لیا۔۔۔ حضور، میری جان کھا گئی تھی۔ اب شکنستا سے وہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ کریم چلا گیا۔ شاردا آئی۔ اس کی گود میں منی تھی۔ نذیر نے اس کو پانچ روپے دیے لیکن شاردا نے انکار کر دیا۔ اس پر نذیر نے اس سے مسکرا کر کہا، ”میں اس کا باپ ہوں۔ تم یہ کیا کر رہی ہو۔“

شاردا نے روپے لے لیے۔ بڑی خاموشی کے ساتھ۔ شروع شروع میں وہ بہت باقونی معلوم ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ باتوں کے دریا بہادے گی۔ مگر اب وہ بات کرنے سے گریز کرتی تھی۔ نذیر نے اس کی بچی کو گود میں لے کر پیار کیا اور جاتے وقت شاردا سے کہا، ”لو بھی شاردا، میں چلا۔ کل نہیں تو پرسوں ضرور آؤں گا۔“

لیکن نذیر دوسرے روز ہی آگیا۔ شاردا کے جسمانی خلوص نے اس پر جادو سا کر دیا تھا۔ اس نے کریم کو پچھلے روپے ادا کیے۔ ایک بو تل منگوائی اور شاردا کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کو پینے کے لیے کہا تو وہ بولی، ”میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ پہلا اور آخری گلاس تھا۔“

نذر اکیلا پیتا رہا۔ صبح گیارہ بجے سے وہ شام کے سات بجے تک ہوٹل کے اس کمرے میں شاردا کے ساتھ رہا۔۔۔ جب کھر لوٹا تو وہ بے حد مطمئن تھا، پہلے روز سے بھی زیادہ مطمئن۔ شاردا اپنی واجبی شکل و صورت اور کم گوئی کے باوجود اس کے شہوانی حواس پر چھائی تھی۔ نذر بار بار سوچتا تھا، ”یہ کیسی عورت ہے۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی خاموش، مگر جسمانی طور پر ایسی پر گو عورت نہیں دیکھی۔“

نذرینے ہر دوسرے دن شاردا کے پاس جانا شروع کر دیا۔ اس کو روپے پیسے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نذر سماں روپے کریم کو دیتا تھا۔ دس روپے ہو ٹل والا لے جاتا تھا۔ باقی چچاں میں سے قرباً تیرہ روپے کریم اپنی کمیشن کے وضع کر لیتا تھا مگر شاردا نے اس کے متعلق نذر سے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔

دو مہینے گزر گئے۔ نذیر کے بھٹ نے جواب دے دیا۔ اس کے علاوہ اس نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ شاردا اس کی ازدواجی زندگی میں بہت بری طرح حائل ہو رہی ہے۔ وہ بیوی کے ساتھ سوتا ہے تو اس کو ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ چانتا کہ اس کے بجائے شاردا ہو۔ یہ بہت بری بات تھی۔ نذیر کو چونکہ اس کا احساس تھا اس لیے اس نے کوشش کی کہ شاردا کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح ختم ہو جائے۔ چنانچہ اس نے شاردا ہی سے کہا، ”شاردا میں شادی شدہ آدمی ہوں۔ میری جتنی جمع پونچی تھی، ختم ہو گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، میں کیا کروں۔ تمہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا، حالانکہ میں چاہتا ہوں کہ ادھر کا کبھی رخ نہ کروں۔“

شاردانے یہ سنا تو خاموش ہو گئی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کہا، ”جتنے روپے میرے پاس ہیں آپ لے سکتے ہیں۔ صرف مجھے بے پور کا کرایہ دے دیجئے تاکہ میں شنستلا کو لے کر واپس چلی جاؤں۔“

شاردانے کوئی جواب نہ دیا۔ نذیر ایک دوست سے قرض لے کر جب دوسرے روز ہو ٹل میں پہنچا تو کریم نے بتایا کہ وہ جے پور جانے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ نذیر نے اس کو بلا یا مگر وہ نہ آئی۔ کریم کے ہاتھ اس نے بہت سے نوٹ بھجوائے اور یہ کہا، ”آپ یہ روپے لے لیجیے۔۔۔ اور مجھے اپنا ایڈر میں دے دیجیے۔“

نذیر نے کریم کو اپنا ایڈریس لکھ کر دے دیا اور روپے واپس کر دیے۔ شاردا آئی۔ گود میں منی تھی۔ اس نے آداب عرض کیا، اور کہا، ”میں آج شام کو جے پور جائی ہوں۔“

نذیر نے پوچھا، ”کیوں؟“ شاردا نے یہ مختصر جواب دیا، ”مجھے معلوم نہیں“ اور یہ کہہ کروہ چلی گئی۔ نذیر نے کریم سے کہا اسے بلا کر لائے۔ مگروہ نہ آئی۔ نذیر چلا گیا۔ اس کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے بدن کی حرارت چلی گئی ہے۔ اس کے سوال کا جواب چلا گیا ہے۔ وہ چلی گئی، واقعی چلی گئی۔ کریم کو اس کا بہت افسوس تھا۔ اس نے نذیر سے شکایت کے طور پر کہا، ”نذیر صاحب! آپ نے کیوں اس کو جانے دیا؟“

نذیر نے اس سے کہا، ”بھائی، میں کوئی سیٹھ تو ہوں نہیں۔۔۔ ہر دوسرے روز پچاس ایک، دس ہوٹل کے، تیس بوتل، اور اوپر کا خرچ علیحدہ۔ میرا تودیوالہ بیٹ گیا۔۔۔ خدا کی قسم مقروض ہو گیا ہوں۔“ یہ سن کر کریم خاموش ہو گیا۔ نذیر نے اس سے کہا، ”بھی میں مجبور تھا، کہاں تک یہ قصہ چلاتا۔“ کریم نے کہا، ”نذیر صاحب اس کو آپ سے محبت تھی۔“

نذیر کو معلوم نہیں تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ وہ فقط اتنا جانتا تھا کہ شاردا میں جسمانی خلوص ہے۔ وہ اس کے مردانہ سوالات کا بالکل صحیح جواب ہے۔ اس کے علاوہ وہ شاردا کے متعلق اور کچھ نہیں جانتا تھا، البتہ اس نے مختصر الفاظ میں اس سے یہ ضرور کہا تھا کہ اس کا خاوند عیاش تھا اور اس کو صرف اس لیے چھوڑ گیا تھا کہ دو بر س تک اس کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی۔ لیکن جب وہ اس سے علیحدہ ہو تو نو مہینے کے بعد میں پیدا ہوئی جو بالکل اپنے باپ پر ہے۔

شکنستلا کو وہ اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ اس کا بیاہ کرنا چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ شریفانہ زندگی بسر کرے۔ کریم نے نذیر کو بتایا کہ وہ اس سے بہت محبت کرتی ہے۔ کریم نے بہت کوشش کی تھی کہ شکنستلا سے پیشہ کرائے۔ کئی پیشجر آئے تھے۔ ایک رات کے دو دو سوروپے دینے کے لیے تیار تھے۔ مگر شاردا نہیں مانتی تھی، کریم سے لڑنا شروع کر دیتی تھی۔ کریم اس سے کہتا تھا، ”تم کیا کر رہی ہو؟“ وہ جواب دیتی، ”اگر تم پیچ میں نہ ہوتے تو میں ایسا کبھی نہ کرتی۔ نذیر صاحب کا ایک پیسہ خرچ نہ ہونے دیتی۔“

شاردا نے نذیر سے ایک بار اس کا فٹو مانگا تھا۔ جو اس نے گھر سے لا کر اس کو دے دیا تھا۔ یہ اپنے ساتھ بجے پورے لے گئی تھی۔ اس نے نذیر سے کبھی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔۔۔ جب دونوں بستر پر لیٹے ہوتے تو وہ بالکل خاموش رہتی۔ نذیر اس کو بولنے پر اکساتا مگر وہ کچھ نہ کہتی۔ لیکن نذیر اس کے جسمانی خلوص کا قائل تھا۔ جہاں تک اس بات کا تعلق تھا، وہ اخلاص کا مجسمہ تھی۔

وہ چلی گئی، نذیر کے سینے کا بوجھ ہلاکا ہو گیا۔ کیونکہ اس کی گھریلو زندگی میں بہت بری طرح حائل ہو گئی تھی۔ اگر وہ کچھ دیر اور رہتی تو بہت ممکن تھا کہ نذیر اپنی بیوی سے بالکل غافل ہو جاتا۔ کچھ دن گزرے تو وہ اپنی اصلی حالت پر آنے لگا۔ شاردا کا جسمانی لمس اس کے جسم سے آہستہ آہستہ دور ہونے لگا۔

ٹھیک پندرہ دن کے بعد جب کہ نذیر گھر میں بیٹھا فتر کا کام کر رہا تھا، اس کی بیوی نے صح کی ڈاک لا کر اسے دی۔ سارے خطوں کی کھولا کرتی تھی۔ ایک خط اس نے کھولا اور دیکھ کر نذیر سے کہا، ”معلوم نہیں گھر آتی ہے یا ہندی۔“ نذیر نے خط لے کر دیکھا۔ اس کو معلوم نہ ہو سکا کہ ہندی ہے یا گھر آتی۔ الگ ٹرے میں رکھ دیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد نذیر کی بیوی نے اپنی چھوٹی بہن نعیمہ کو آواز دی۔ وہ آئی تو وہ خط اٹھا کر اسے دیا، ”ذرا پڑھو تو کیا لکھا ہے۔ تم تو ہندی اور گھر آتی پڑھ سکتی ہو۔“

نعیمہ نے خط دیکھا اور کہا، ”ہندی ہے ہے“ اور یہ کہہ کر پڑھنا شروع کیا۔

”جے پور--- پرے نذیر صاحب۔“ اتنا پڑھ کر وہ رک گئی۔ نذیر چونکا۔ نعیمہ نے ایک سطر اور پڑھی، ”آداب۔ آپ تو مجھے بھول چکے ہوں گے۔ مگر جب سے میں یہاں آئی ہوں، آپ کو یاد کرتی رہتی ہوں۔“ نعیمہ کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اس نے کاغذ کا دوسرا رنگ دیکھا، ”کوئی شاردا ہے۔“

نذیر اٹھا۔ جلدی سے اس نے نعیمہ کے ہاتھ سے خط لیا اور اپنی بیوی سے کہا، ”خدا معلوم کون ہے۔۔۔ میں باہر جا رہا ہوں۔ اس کو پڑھا کر اردو میں لکھوں گا۔“ اس نے بیوی کو کچھ کہنے کا موقعہ ہی نہ دیا اور چلا گیا۔ ایک دوست کے پاس جا کر اس نے شاردا کے خط جیسے کاغذ منگوائے اور ہندی میں ولی ہی روشنائی سے ایک خط لکھوایا۔ پہلے فقرے وہی رکھے۔ مضمون یہ تھا کہ بمبئی سنٹرل پر شاردا اس سے ملی تھی۔ اس کو اتنے بڑے مصور سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی وغیرہ وغیرہ۔

شام کو گھر آیا۔ اس نے نیا خط بیوی کو دیا اور اردو کی نقل پڑھ کر سنادی۔ بیوی نے شاردا کے متعلق اس سے دریافت کیا تو اس نے کہا، ”عرصہ ہوا ہے میں ایک دوست کو چھوڑنے گیا تھا۔ شاردا کو یہ دوست جانتا تھا۔ وہاں پلیٹ فارم پر میر العارف ہوا۔ مصوری کا اسے بھی شوق تھا۔“

بات آئی گئی ہو گئی لیکن دوسرے روز شاردا کا ایک اور خط آگیا۔ اس کو بھی نذیر نے اسی طریقے سے گول کیا۔ اور فوراً شاردا کو تار دیا کہ وہ خط لکھنا بند کر دے اور اس کے نئے پتے کا انتظار کرے۔ ڈاک خانے جا کر اس نے متعلقہ پوسٹ میں کوتاکید کر دی کہ جے پور کا خط وہ اپنے پاس

رکھے، صحیح آگروہ اس سے پوچھ لیا کرے گا۔ تین خط اس نے اس طرح وصول کیے۔ اس کے بعد شاردا اس کو اس کے دوست کے پتے سے خط بھیجنے لگی۔

شاردا بہت کم گو تھی، لیکن خط بہت لمبے لکھتی تھی۔ اس نے نذیر کے سامنے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا، لیکن اس کے خط اس اظہار سے پر ہوتے تھے۔ گلے شکوئے، ہجر و فراق، اس قسم کی عام باتیں جو عشقی خطوط میں ہوتی ہیں۔ نذیر کو شاردا سے وہ محبت نہیں تھی جس کا ذکر افسانوں اور ناولوں میں ہوتا ہے، اس لیے اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ جواب میں کیا لکھے، اس لیے یہ کام اس کا دوست ہی کرتا تھا۔ ہندی میں جواب لکھ کر وہ نذیر کو سنادیتا تھا اور نذیر کہہ دیتا تھا، ”ٹھیک ہے۔“

شاردا بسمی آنے کے لیے بے قرار تھی۔ لیکن وہ کریم کے پاس نہیں ٹھہرنا چاہتی تھی۔ نذیر اس کی رہائش کا اور کہیں بندوبست نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ مکان ان دنوں ملتے ہی نہیں تھے۔ اس نے ہوٹل کا سوچا۔ مگر خیال آیا، ایسا نہ ہو کہ راز فاش ہو جائے، چنانچہ اس نے شاردا کو لکھوا دیا کہ وہ ابھی کچھ دیر انتظار کرے۔

اتنے میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گئے۔ بتوارے سے پہلے عجیب افراتفری مچی تھی۔ اس کی بیوی نے کہا کہ وہ لاہور جانا چاہتی ہے، ”میں کچھ دیر وہاں رہوں گی اگر حالات ٹھیک ہو گئے تو واپس آجائیں گی، ورنہ آپ بھی وہیں چلے آئیے گا۔“

نذیر نے کچھ دیر اسے روکا۔ مگر جب اس کا بھائی لاہور جانے کے لیے تیار ہوا تو وہ اس کی بہن اس کے ساتھ چل گئیں اور وہ اکیلا رہ گیا۔ اس نے شاردا کو سر سری طور پر لکھا کہ وہ اب اکیلا ہے۔ جواب میں اس کا تار آیا کہ وہ آرہی ہے۔ اس تار کے مضمون کے مطابق وہ جے پور سے چل پڑی تھی۔ نذیر بہت سپیٹا یا۔ مگر اس کا جسم بہت خوش تھا۔ وہ شاردا کے جسم کا خلوص چاہتا تھا۔ وہ دن پھر سے مانگتا تھا جب وہ شاردا کے ساتھ چلتا ہوتا تھا۔ صحیح گیارہ بجے سے لے کر شام کے سات بجے تک۔ اب روپے کے خرچ کا سوال ہی نہیں تھا۔ کریم بھی نہیں تھا۔ ہوٹل بھی نہیں تھا۔ اس نے سوچا، ”میں اپنے نوکر کو راز دار بنالوں گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دس پندرہ روپے اس کا منہ بند کر دیں گے۔ میری بیوی واپس آئی تو وہ اس سے کچھ نہیں کہے گا۔“

دوسرے روز وہ اسٹیشن پہنچا۔ فرنٹیر میل آئی مگر شاردا، تلاش کے باوجود اسے نہ ملی۔ اس نے سوچا، شاید کسی وجہ سے رک گئی ہے۔ دوسرا تار بھیجے گی۔ اس سے اگلے روز وہ حسب معمول صحیح کی ٹرین سے اپنے دفتر روانہ ہوا۔ وہ مہا لکشمی اتر تھا۔ گاڑی وہاں رکی تو اس نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر شاردا کھڑی ہے۔ اس نے زور سے پکارا، ”شاردا!“

شاردا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، ”نذیر صاحب!“

”تم یہاں کہاں؟“

شاردا نے شکایتیا کہا، ”آپ مجھے لینے نہ آئے تو میں یہاں آپ کے دفتر پہنچی۔ پتا چلا کہ آپ ابھی تک نہیں آئے۔ یہاں پلیٹ فارم پر اب آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“ نذیر نے کچھ دیر سوچ کر اس سے کہا، ”تم یہاں ٹھہرو۔ میں دفتر سے چھٹی لے کر ابھی آتا ہوں۔“

شاردا کو نیچ پر بٹھا کر جلدی دفتر گیا۔ ایک عرضی لکھ کر وہاں چڑھا اسی کو دے آیا اور شاردا کو اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں دونوں نے کوئی بات نہ کی، لیکن ان کے جسم آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ ایک دوسرے کی طرف کھنچتے رہے۔

گھر پہنچ کر نذیر نے شاردا سے کہا، ”تم نہالو، میں ناشتہ کا بندوبست کر اتا ہوں۔“ شاردا نہ انہانے لگی۔ نذیر نے نوکر سے کہا، ”کہ اس کے ایک دوست کی بیوی آئی ہے۔ جلدی ناشتہ تیار کر دے۔ اس سے یہ کہہ کر نذیر نے الماری سے بوتل نکالی۔ ایک پیک جو دو کے برابر تھا گلاس میں انڈیلا اور پانی میں ملا کر پی گیا۔ وہ اسی ہوٹل والے ڈھنگ سے شاردا سے اختلاط چاہتا تھا۔

شاردا نہادھو کر باہر نکلی اور ناشتہ کرنے لگی۔ اس نے ادھر ادھر کی بے شمار باتیں کیں۔ نذیر نے محسوس کیا جیسے وہ بدلتی ہے۔ وہ پہلے بہت کم گو تھی۔ اکثر خاموش رہتی تھی، مگر اب وہ بات پر اپنی محبت کا اظہار کرتی تھی۔ نذیر نے سوچا، ”یہ محبت کیا ہے۔۔۔ اگر یہ اس کا اظہار نہ کرے تو کتنا چھا ہے، مجھے اس کی خاموشی زیادہ پسند تھی۔ اس کے ذریعے سے مجھ تک بہت سی باتیں پہنچ جاتی تھیں، مگر اب اس کو جانے کیا ہو گیا ہے۔ باتیں کرتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے اپنے عشقیہ خط پڑھ کر سنارہی ہے۔“

ناشتہ ختم ہوا تو نذیر نے ایک پیک تیار کیا اور شاردا کو پیش کیا۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ نذیر نے اصرار کیا تو شاردا نے اس کو خوش کرنے کی خاطر، ناک بند کر کے وہ پیک پی لیا۔ براسمنہ بنایا۔ پانی لے کر کلکی کی۔ نذیر کو افسوس سا ہوا کہ شاردا نے کیوں پی۔ اس کے اصرار پر بھی انکار کیا ہوا تو زیادہ اچھا تھا۔ مگر اس نے اس کے بارے میں زیادہ غور نہ کیا۔ نوکر کو بہت دور ایک کام پر بھیجا۔ دروازہ بند کیا اور شاردا کے ساتھ بستر پر لیٹ گیا، ”تم نے لکھا تھا کہ وہ دن پھر کب آئیں گے۔ لو آگئے ہیں پھر وہی دن، بلکہ راتیں بھی۔ ان دونوں راتیں نہیں ہوتی۔“

تحیں صرف دن ہوتے تھے۔ ہوٹل کے میلے کھیلے دن، یہاں ہر چیز اجملی ہے، ہر چیز صاف ہے، ہوٹل کا کراچی بھی نہیں، کریم بھی نہیں۔
یہاں ہم اپنے مالک آپ ہیں۔

شاردا نے اپنے فراغ کی باتیں شروع کر دیں۔ یہ زمانہ اس نے کیسے کاٹا۔ وہی کتابوں اور افسانوں والی فضول باتیں، گلے، شکوئے، آہیں، راتیں تارے گن گن کر کاٹنا۔ نذیر نے ایک اور پیگ پیا اور سوچا، ”کون تارے گنتا ہے۔ گن کیسے سکتا ہے اتنے سارے تاروں کو۔۔۔ بالکل فضول ہے، بے ہودہ بکواس ہے۔“

یہ سوچتے ہوئے اس نے شاردا کو اپنے ساتھ لگا گیا۔ بستر صاف تھا، شاردا صاف تھا، کمرے کی فضا بھی صاف تھی، لیکن کیا وجہ تھی، نذیر کے دل و دماغ پر وہ کیفیت طاری نہیں ہوتی تھی جو اس غلیظ ہوٹل میں لو ہے کی چار پائی پر شاردا کی قربت میں ہوتی تھی۔

نذیر نے سوچا۔ شاید اس نے کم پی ہے۔ اٹھ کر اس نے ایک پیگ بنایا اور ایک ہی جرعے میں ختم کر کے شاردا کے ساتھ لیٹ گیا۔ شاردا نے پھر وہی لاکھ مرتبہ کہی ہوئی باتیں شروع کر دیں۔ وہی بھروسہ فراغ کی باتیں، وہی گلے شکوئے۔ نذیر اکتا گیا اور اس اکتاہٹ نے اس کے جسم کو کند کر دیا۔ اس کو محسوس ہونے لگا کہ شاردا کی سان گھس کر بیکار ہو گئی ہے۔ اس کے جسم کے جذبات اب وہ تیز نہیں کر سکتی لیکن وہ پھر بھی اس کے ساتھ دیر تک لیٹا رہا۔

فارغ ہوا تو اس کا جی چاہا کہ ٹیکسی پکڑے اور اپنے گھر چلا جائے، اپنی بیوی کے پاس، مگر جب اس نے سوچا کہ وہ تو اپنے گھر میں ہے، اور اس کی بیوی لاہور میں تو دل ہی دل میں بہت جھنجھلا یا۔ اس کو یہ خواہش ہوئی کہ اس کا گھر ہوٹل بن جائے۔ وہ دس روپے کرائے کے دے۔ کریم کو پچاس روپے ادا کرے اور چلا جائے۔

شاردا کے جسم کا خلوص بدستور برقرار تھا، مگر وہ فضانہیں تھی، وہ سودے بازی نہیں تھی۔ یہ سب چیزیں مل ملا کر جو ایک ماحول بناتی تھیں، وہ نہیں تھا۔ نذیر اپنے گھر میں تھا، اس بستر پر تھا جس پر اس کی سادہ لوح بیوی اس کے ساتھ سوتی تھی۔ یہ احساس اس کے تحت الشعور میں تھا، اسی لیے وہ سمجھنہ سکتا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ کبھی وہ یہ سوچتا تھا کہ وہ سکی خراب ہے، کبھی یہ سوچتا تھا کہ شاردا نے التفات نہیں بر تا، اور کبھی یہ خیال کرتا تھا کہ وہ خاموش رہتی تو سب ٹھیک ہوتا۔ پھر وہ یہ سوچتا، اتنی دیر کے بعد ملی ہے۔ دل کی بھڑاس تو نکالنا تھی بے چاری کو۔ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گی، وہی پرانی شاردا بن جائے گی۔

پندرہ دن گزر گئے، مگر نذیر کو شارداہ پرانی ہو ٹل والی شاردا محسوس نہ ہوئی۔ اس کی بچی بے پور میں تھی۔ ہو ٹل میں وہ اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ نذیر اس کے زکام کے لیے، اس کی پھنسیوں کے لیے، اس کے گلے کے لیے دوائیں منگوایا کرتا تھا۔ اب یہ چیز نہیں تھی۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔ نذیر اس کی منی کو بالکل ایک سمجھتا تھا۔

ایک بار شاردا کی دودھ سے بھری ہوئی چھاتیوں پر دباوڑا لئے کے باعث نذیر کے بالوں بھرے سینے پر دودھ کے کئی قطرے چمٹ گئے تھے اور اس نے ایک عجیب قسم کی لذت محسوس کی تھی۔ اس نے سوچا تھا، ماں بننا کتنا اچھا ہے۔۔۔ اور یہ دودھ۔ مردوں میں یہ کتنی بڑی کمی ہے کہ وہ کھاپی کر سب ہضم کر جاتے ہیں، عورتیں کھاتی ہیں اور کھلاتی بھی ہیں۔۔۔ کسی کو پالنا۔۔۔ اپنے بچے ہی کو سہی کتنی شاندار چیز ہے۔

اب منی، شاردا کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ ناکمل تھی۔ اس کی چھاتیاں بھی ناکمل تھیں، اب ان میں دودھ نہیں تھا۔ وہ سفید سفید آپ حیات۔ نذیر اب اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینپتا تھا تو وہ اس کو منع نہیں کرتی تھی۔ شاردا، اب وہ شاردا نہیں تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاردا، وہی شاردا تھی، بلکہ اس سے کچھ زیادہ تھی۔ یعنی اتنی دیر جدار ہنے کے بعد اس کا جسمانی خلوص تیز ہو گیا تھا۔ وہ روحانی طور پر بھی نذیر کو چاہتی تھی لیکن نذیر کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاردا میں اب وہ پہلی سی کشش یا جو کچھ بھی تھا نہیں رہا۔

پندرہ دن لگاتار اس کے ساتھ گزارنے پر وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ پندرہ دن دفتر سے غیر حاضری بہت کافی تھی۔ اس نے اب دفتر جانا شروع کر دیا۔ صح اٹھ کر دفتر جاتا اور شام کو لوٹتا۔ شاردا نے بالکل بیویوں کی طرح اس کی خدمت شروع کر دی۔ بازار سے اون خرید کر اس کے لیے ایک سویٹر بن دیا۔ شام کو دفتر سے آتا تو اس کے لیے سوڈے منگو اکر رکھے ہوتے۔ برف، تھرموس میں ڈالی ہوتی۔ صح اٹھ کر اس کا شیو کا سامان میز پر رکھتی، پانی گرم کر کے اس کو دیتی، وہ شیو کر چکتا تو سارا سامان صاف کر دیتی، گھر کی صفائی کرتی، خود جھاڑو دیتی، نذیر اور بھی زیادہ الٹا گیا۔

رات کو وہ اکٹھے سوتے تھے مگر اب اس نے یہ بہانہ کیا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے، اس لیے اکیلا سونا چاہتا ہے۔ شاردا دوسرے پنگ پر سونے لگی۔ مگر یہ نذیر کے لیے ایک اور الجھن ہو گئی۔ وہ گھری نیند سوئی ہوتی اور وہ جا گتا تھا اور سوچتا کہ آخر یہ سب کچھ ہے کیا۔ یہ شاردا یہاں کیوں ہے؟ کریم کے ہو ٹل میں اس نے اس کے ساتھ چند دن بڑے اچھے گزارے تھے، مگر یہ اس کے ساتھ کیوں چمٹ گئی ہے۔ آخر اس کا انجمام کیا ہو گا۔۔۔ محبت وغیرہ سب بکواس ہے۔ جو ایک چھوٹی سی بات تھی وہ اب نہیں رہی۔ اس کو واپس بے پور جانا چاہیے۔

پچھوں کے بعد اس نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ وہ گناہ کر رہا ہے۔ وہ کریم کے ہوٹل میں بھی کرتا تھا۔ اس نے شادی سے پہلے بھی ایسے بے شمار کیے تھے، مگر ان کا اس کو احساس ہی نہیں تھا لیکن اب اس نے بڑی شدت سے محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے بے وفائی کر رہا ہے، اپنی سادہ لوح بیوی سے جس کو اس نے کئی بار شاردا کے خطوں کے سلسلے میں چکھہ دیا تھا۔ شاردا اب اور بھی زیادہ بے کش ہو گئی۔ وہ اس سے روکھا برتاؤ کرنے لگا، مگر اس کے التفات میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اتنا جانتی تھی کہ آرٹسٹ لوگ موجی ہوتے ہیں، اسی لیے وہ اس سے اس کی بےاتفاقی کا گلہ نہیں کرتی تھی۔

پورا ایک مہینہ ہو گیا۔ جب نذیر نے دن گئے تو اس کو بہت الجھن ہوئی، ”یہ عورت کیا پورا ایک مہینہ یہاں رہی ہے۔۔۔ میں کس قدر ذلیل آدمی ہوں۔۔۔ اور ادھر ہر روز میں اپنی بیوی کو خلط لکھتا ہوں، جیسے بڑا افادار شوہر ہوں۔۔۔ جیسے مجھے اس کا بہت خیال ہے۔ جیسے اس کے بغیر میری زندگی اجیرن ہے۔ میں کتنا بڑا فراڈ ہوں۔ ادھر اپنی بیوی سے غداری کر رہا ہوں، ادھر شاردا سے۔ میں کیوں اس سے صاف صاف نہیں کہہ دیتا کہ بھی اب مجھے تم سے لگاؤ نہیں رہا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مجھے لگاؤ نہیں رہا، یا شاردا میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی؟“

وہ اس کے متعلق سوچتا مگر اسے کوئی جواب نہ ملتا۔ اس کے ذہن میں عجیب افراتفری پھیلی تھی۔ وہ اب اخلاقیات کے متعلق سوچتا تھا۔ بیوی سے جو وہ غداری کر رہا تھا، اس کا احساس ہر وقت اس پر غالب رہتا تھا۔ کچھ دن اور گزرے تو یہ احساس اور بھی زیادہ شدید ہو گیا۔ اور نذیر کو خود سے نفرت ہونے لگی، ”میں بہت ذلیل ہوں۔ یہ عورت میری دوسری بیوی کیوں بن گئی ہے۔ مجھے اس کی کب ضرورت تھی۔ یہ کیوں میرے ساتھ چپک گئی ہے۔ میں نے کیوں اس کو یہاں آنے کی اجازت دی، جب اس نے تار بھیجا تھا۔ لیکن وہ تار ایسے وقت پر ملا تھا کہ میں اس کو روک ہی نہیں سکتا تھا۔“

پھر وہ سوچتا کہ شاردا جو کچھ کرتی ہے، بناوٹ ہے۔ وہ اس بناوٹ سے اپنی بیوی سے جد اکرنا چاہتی ہے۔ اس سے اس کی نظر وہ میں شاردا اور بھی گر گئی۔ اس سے نذیر کا سلوک اور زیادہ روکھا ہو گیا۔ اس روکھے پن کو دیکھ کر شاردا بہت زیادہ ملائم ہو گئی۔ اس نے نذیر کے آرام و آسائش کا زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا۔ لیکن نذیر کو اس کے اس روئی سے بہت الجھن ہوئی۔ وہ اس سے بے حد نفرت کرنے لگا۔

ایک دن اس کی جیب خالی تھی۔ بینک سے روپے نکلوانے اس کو یاد نہیں رہے تھے۔ دفتر بہت دیر سے گیا، اس لیے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ جاتے وقت شاردا نے اس سے کچھ کہا تو وہ اس پر برس پڑا، ”کبواس نہ کرو۔ میں ٹھیک ہوں۔ بینک سے روپے نکلوانے بھول گیا ہوں اور سکریٹ میرے سارے ختم ہیں۔“

دفتر کے پاس کی دکان سے اس کو گولڈ فلیک کا ڈبہ ملا۔ یہ سگریٹ اس کو ناپسند تھے مگر ادھار مل گئے تھے۔ اس لیے دو تین مجبوراً پینے پڑے۔ شام کو گھر آیا تو دیکھا تپائی پر اس کا من بھاتا سگریٹ کا ڈبہ پڑا ہے۔ خیال کیا کہ خالی ہے۔ پھر سوچا شاید ایک دواں میں پڑے ہوں۔ کھول کر دیکھا تو بھرا ہوا تھا۔ شاردا سے پوچھا، ”یہ ڈبہ کہاں سے آیا؟“

شاردا نے مسکرا کر جواب دیا، ”اندر الماری میں پڑا تھا۔“

نذیر نے کچھ نہ کہا۔ اس نے سوچا، شاید میں نے کھول کر اندر الماری میں رکھ دیا تھا اور بھول گیا۔ لیکن دوسرے دن پھر تپائی پر سالم ڈبہ موجود تھا۔ نذیر نے جب شاردا سے اس کی بابت پوچھا تو اس نے مسکرا کرو ہی جواب دیا، اندر الماری میں پڑا تھا۔“

نذیر نے بڑے غصے کے ساتھ کہا، ”شاردا، تم بکواس کرتی ہو۔ تمہاری یہ حرکت مجھے پسند نہیں۔ میں اپنی چیزیں خود خرید سکتا ہوں۔ میں بھکاری نہیں ہوں جو تم میرے لیے ہر روز سگریٹ خرید اکرو۔“ شاردا نے بڑے پیار سے کہا، ”آپ بھول جاتے ہیں، اسی لیے میں نے دو مرتبہ گستاخی کی۔“ نذیر نے بے وجہ اور زیادہ غصے سے کہا، ”میرا دماغ خراب ہے۔۔۔ لیکن مجھے یہ گستاخی ہرگز پسند نہیں۔“ شاردا کا الجھ بہت ہی ملائم ہو گیا، ”میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔“

نذیر نے ایک لحظے کے لیے خیال کیا کہ شاردا کی کوئی غلطی نہیں۔ اسے آگے بڑھ کر اس کا منہ چوم لینا چاہیے اس لیے کہ وہ اس کا اتنا خیال رکھتی تھی۔ مگر فوراً ہی اس کو اپنی بیوی کا خیال آیا کہ وہ غداری کر رہا تھا، چنانچہ اس نے شاردا سے بڑے نفرت بھرے لمحے میں کہا، ”بکواس نہ کرو۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں کل یہاں سے روانہ کر دوں۔ کل صبح تمہیں جتنے روپے درکار ہوں گے، دے دوں گا۔“ لیکن یہ کہہ کر نذیر نے محسوس کیا جیسے وہ بڑا کمینہ اور رذیل ہے۔

شاردا نے کچھ نہ کہا، ”رات کو وہ نذیر کے ساتھ سوئی۔ ساری رات اس سے پیار کرتی رہی۔ نذیر کو اس سے الجھن ہوتی رہی مگر اس نے شاردا پر اس کا اظہار نہ کیا۔ صبح اٹھا تو ناشتے پر بے شمار لذیذ چیزیں تھی۔ پھر بھی اس نے شاردا سے کوئی بات نہ کی۔ فارغ ہو کر وہ سیدھا بنک گیا۔ جانے سے پہلے اس نے شاردا سے صرف اتنا کہا، ”میں بنک جا رہا ہوں۔ ابھی واپس آتا ہوں۔“

بک کی وہ شاخ جس میں نذر کاروپیہ جمع تھا بالکل نزدیک تھا۔ وہ دوسروے پے نکلا کر فوراً ہی واپس آگیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ سب روپیہ شاردا کے حوالے کر دے گا اور اس کو نکل دغیرہ لے کر رخصت کر دے گا۔ مگر وہ جب گھر پہنچا تو اس کے نو کرنے بتایا کہ وہ چلی گئی ہے۔ اس نے پوچھا، ”کہاں؟“

نو کرنے بتایا، ”جی مجھ سے انھوں نے کچھ نہیں کہا۔۔۔ اپناٹر نک اور بستر ساتھ لے گئی ہیں۔“

نذر اندر کمرے میں آیا تو اس نے دیکھا کہ تپائی پر اس کے پسندیدہ سگر ٹوں کا ڈبہ پڑا ہے۔ بھرا ہوا۔

-[67]-

لال ٹین: سعادت حسن منتو

میرا قیام ”بُوت“ میں گو مختصر تھا۔ لیکن گوناگوں روحانی مسرتوں سے پر۔ میں نے اس کی صحت افراد فہما میں جتنے دن گزارے ہیں ان کے ہر لمحہ کی یاد میرے ذہن کا ایک جزو بن کے رہ گئی ہے۔ جو بھلانے نہ بھولے گی۔۔۔ کیا دن تھے۔۔۔! بار بار میرے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز بلند ہوتی ہے اور میں کئی کئی گھنٹے اس کے زیر اثر بے خود و مدد ہوش رہتا ہوں۔

کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ انسان اپنی گزشتہ زندگی کے کھنڈروں پر مستقبل کی دیواریں استوار کرتا ہے۔ ان دنوں میں بھی یہی کر رہا ہوں یعنی بیتے ہوئے ایام کی یاد کو اپنی مضمحل رگوں میں زندگی بخش انجلشن کے طور پر استعمال کر رہا ہوں۔

جو کل ہوا تھا سے اگر آج دیکھا جائے تو اس کے اور ہمارے درمیان صدیوں کا فاصلہ نظر آئے گا اور جو کل ہونا ہے اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے اور نہ جان سکتے ہیں۔ آج سے پورے چار مہینے پہلے کی طرف دیکھا جائے تو بُوت میں میری زندگی ایک افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ ایسا افسانہ جس کا مسودہ صاف نہ کیا گیا ہو۔ اس کھوئی ہوئی چیز کو حاصل کرنا دوسراے انسانوں کی طرح میرے بس میں بھی نہیں۔ جب میں استقبال کے آئینہ میں اپنی آنے والی زندگی کا عکس دیکھنا چاہتا ہوں تو اس میں مجھے حال ہی کی تصویر نظر آتی ہے اور کبھی کبھی اس تصویر کے پس منظر میں ماضی کے دھنڈے نقش نظر آ جاتے ہیں۔ ان میں بعض نقش اس قدر تیکھے اور شوخ رنگ ہیں کہ شاید ہی انھیں زمانہ کا ہاتھ کامل طور پر مٹا سکے۔

زندگی کے اس کھوئے ہوئے ٹکڑے کو میں اس وقت زمانہ کے ہاتھ میں دیکھ رہا ہوں جو شریر بچے کی طرح مجھے بار بار اس کی جھلک دکھا کر اپنی پیٹھ پیچھے چھپا لیتا ہے۔۔۔ اور میں اس کھلیل ہی سے خوش ہوں۔ اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں۔

ایسے واقعات کو جن کی یاد میرے ذہن میں اب تک تازہ ہے، میں عام طور پر دھراتا رہتا ہوں، تاکہ ان کی تمام شدت برقرار رہے۔ اور اس غرض کے لیے میں کئی طریقے استعمال کرتا رہتا ہوں۔ بعض اوقات میں یہ بیتے ہوئے واقعات اپنے دوستوں کو سنائ کر اپنا مطلب حل کر لیتا ہوں۔

اگر آپ کو میرے ان دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہو تو وہ آپ سے یقیناً بھی کہیں گے کہ میں قصہ گوئی اور آپ بیتیاں سنانے کا بالکل سلیقہ نہیں رکھتا۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ داستان سنانے کے دوران میں مجھے سامعین کے تیوروں سے ہمیشہ اس بات کا احساس ہوا ہے کہ میرابیان غیر مربوط ہے اور میں جانتا ہوں کہ چونکہ میری داستان میں ہواری کم اور جھٹکے زیادہ ہوتے ہیں اس لیے میں اپنے محسوسات کو اچھی طرح کسی کے دماغ پر منتقل نہیں کر سکتا اور مجھے اندیشہ ہے کہ میں ایسا شاید ہی کر سکوں۔

اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ میں اکثر اوقات اپنی داستان سنانے سنتے جب ایسے مقام پر پہنچتا ہوں جس کی یاد میرے ذہن میں موجود نہ تھی اور وہ خیالات کی رو میں خود بخوبی کر چلی آئی تھی تو میں غیر ارادی طور پر اس نئی یاد کی گہرا یوں میں گم ہو جاتا ہوں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میرے بیان کا تسلسل یک لخت منتشر ہو جاتا ہے اور جب میں ان گہرا یوں سے نکل کر داستان کے ٹوٹے ہوئے دھاگے کو جوڑنا چاہتا ہوں تو عجلت میں وہ ٹھیک طور سے نہیں جڑتا۔

کبھی کبھی میں یہ داستان میں رات کو سوتے وقت اپنے ذہن کی زبانی خود سنتا ہوں، لیکن اس دوران میں مجھے بہت تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ میرے ذہن کی زبان بہت تیز ہے اور اس کو قابو میں رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات چھوٹے چھوٹے واقعات اتنی تفصیل کے ساتھ خود بخوبی ان ہونا شروع ہو جاتے ہیں کہ طبیعت اکتا جاتی ہے اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ کی یاد کسی دوسرے واقعہ کی یاد تازہ کر دیتی ہے اور اس کا احساس کسی دوسرے احساس کو اپنے ساتھ لے آتا ہے اور پھر احساسات و افکار کی بارش زوروں پر شروع ہو جاتی ہے اور اتنا شور مچتا ہے کہ نیند حرام ہو جاتی ہے۔ جس روز صبح کو میری آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقة نظر آئیں آپ سمجھ لیا کریں کہ ساری رات میں اپنے ذہن کی قصہ گوئی کا شکار بن رہا ہوں۔

جب مجھے کسی بیتے ہوئے وقت کو اس کی تمام شد توں سمیت محفوظ کرنا ہوتا ہے تو میں قلم اٹھاتا ہوں اور کسی گوشے میں پیچ کر کاغذ پر اپنی زندگی کے اس ٹکڑے کی تصویر کھینچ دیتا ہوں۔ یہ تصویر بھدی ہوتی ہے یا خوبصورت، اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارے ادبی نقاد میری ان قلمی تصویروں کے متعلق کیا رائے مرتب کرتے ہیں۔ دراصل مجھے ان لوگوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ اگر میری تصویر کشی سقیم اور خام ہے تو ہوا کرے مجھے اس سے کیا اور اگر یہ ان کے مقرر کردہ معیار پر پورا اترتی ہے تو بھی مجھے اس سے کیا سروکار ہو سکتا ہے۔ میں یہ کہانیاں صرف اس لیے لکھتا ہوں کہ مجھے کچھ لکھنا ہوتا ہے۔ جس طرح عادی شراب خور، دن ڈھلنے شراب خانہ کا رخ کرتا ہے ٹھیک اسی طرح میری انگلیاں بے اختیار قلم کی طرف بڑھتی ہیں اور میں لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ میرا روئے سخن یا تو اپنی طرف ہوتا ہے یا ان چند افراد کی طرف جو میری تحریروں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ میں ادب سے دور اور زندگی کے نزدیک تر ہوں۔

زندگی---زندگی---! آہ زندگی!

میں زندگی زندگی پکارتا ہوں مگر مجھے میں زندگی کہاں۔۔۔؟ اور شاید یہی وجہ ہے کہ میں اپنی عمر کی پیاری کھول کر اس کی ساری چیزیں باہر نکالتا ہوں اور جھاڑ پوچھ کر بڑے قرینے سے ایک قطار میں رکھتا ہوں اور اس آدمی کی طرح جس کے گھر میں بہت تھوڑا سامان ہواں کی نمائش کرتا ہوں۔ بعض اوقات مجھے اپنایہ فعل بہت برا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں، مجبور ہوں۔ میرے پاس اگر زیادہ نہیں ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اگر مجھے میں سفلہ پن پیدا ہو گیا ہے تو اس کا ذمہ دار میں کیسے ہو سکتا ہوں۔ میرے پاس تھوڑا بہت جو کچھ بھی ہے غنیمت ہے۔ دنیا میں تو ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کی زندگی چٹیل میدان کی طرح خشک ہے اور میری زندگی کے ریگستان پر تو ایک بار بارش ہو چکی ہے۔

گو میر اشباب ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا ہے مگر میں ان دونوں کی یاد پر جو رہا ہوں جب میں جوان تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ سہارا بھی کسی روز جواب دے جائے گا اور اس کے بعد جو کچھ ہو گا، میں بتا نہیں سکتا۔ لیکن اپنے موجودہ انتشار کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میر انعام چشم فلک کو بھی نم ناک کر دے گا۔ آہ! خرابہ فلک کا انعام!

وہ شخص جسے انعام کا راپنے وزنی افکار کے نیچے پس جانا ہے، یہ سطور لکھ رہا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ایسی اور بہت سی سطریں لکھنے کے تمنا اپنے دل میں رکھتا ہے۔

میں ہمیشہ مغموم و ملوں رہا ہوں۔ لیکن شیر جانتا ہے کہ بٹوت میں میری آہوں کی زردی اور پیش کے ساتھ ساتھ ایک خوش گوار مسرت کی سرخی اور ٹھنڈک بھی تھی۔ وہ آب و آتش کے اس باہمی ملاپ کو دیکھ کر متعجب ہوتا تھا اور غالباً یہی چیز تھی جس نے اس کی نگاہوں میں میرے وجود کو ایک معما بنادیا تھا۔ کبھی کبھی مجھے وہ سمجھنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کو شش میں وہ میرے قریب بھی آ جاتا تھا۔ مگر دفعتاً کوئی ایسا حادثہ و قوع پذیر ہوتا جس کے باعث اسے پھر پرے ہٹا پڑتا تھا اور اس طرح وہ نئی شدت سے مجھے پر اسرار اور کبھی پر لصنع انسان سمجھنے لگتا۔

اکرام صاحب حیران تھے کہ بٹوت جیسی غیر آباد اور غیر دلچسپ دیہات میں پڑے رہنے سے میرا کیا مقصد ہے۔ وہ ایسا کیوں سوچتے تھے؟ اس کی وجہ میرے خیال میں صرف یہ ہے کہ ان کے پاس سوچنے کے لیے اور کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اسی مسئلے پر غور و فکر کرتے رہتے تھے۔

وزیر کا گھر ان کے بنگلے کے سامنے بند پہاڑی پر تھا اور جب انہوں نے اپنے نوکر کی زبانی یہ سنائے میں اس پہاڑی لڑکی کے ساتھ پھروں باقی کر تارہتا ہوں تو انہوں نے یہ سمجھا کہ میری دکھتی ہوئی رگ ان کے ہاتھ آگئی ہے اور انہوں نے ایک ایسا راز معلوم کر لیا ہے جس کے افشا پر تمام دنیا کے دروازے مجھ پر بند ہو جائیں گے۔ لوگوں سے جب وہ اس ”مسئلے“ پر باتیں کرتے تھے تو یہ کہا کرتے تھے کہ میں تعیش پسند ہوں اور ایک بھولی بھالی لڑکی کو پھانس رہا ہوں اور ایک بار جب انہوں نے مجھ سے بات کی تو کہا، ”دیکھیے یہ پہاڑی لوندیا بڑی خطرناک ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ اس کے جال میں پھنس جائیں۔“

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں یا کسی اور کو میرے معاملات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وزیر کا کیریکٹر بہت خراب تھا اور میرا کریکٹر بھی کوئی خاص اچھا نہیں تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ لوگ کیوں میری فکر میں مبتلا تھے اور پھر جوان کے من میں تھا صاف کیوں نہیں کہتے تھے۔ وزیر پر میرا کوئی حق نہیں تھا اور نہ وہ میرے دباؤ میں تھی۔ اکرام صاحب یا کوئی اور صاحب اگر اس سے دوستانہ پیدا کرنا چاہتے تو مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ دراصل ہماری تہذیب و معاشرت ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ عام طور پر صاف گوئی کو معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ کھل کر بات ہی نہیں کی جاتی اور کسی کے متعلق اگر اظہار خیال کیا بھی جاتا ہے تو غلاف چڑھا کر۔

میں نے صاف گوئی سے کام لیا اور اس پہاڑی لوندیا سے جسے بڑا خطرناک کہا جاتا تھا، اپنی دلچسپی کا اعتذاف کیا۔ لیکن چونکہ یہ لوگ اپنے دل کی آواز کو دل ہی میں دبادینے کے عادی تھے اس لیے میری سچی باتیں ان کو بالکل جھوٹی معلوم ہوئیں اور ان کا شک بدستور قائم رہا۔

میں انھیں کیسے لقین دلاتا کہ میں اگر وزیر سے دلچسپی لیتا ہوں تو اس کا باعث یہ ہے کہ میرا ماضی و حال تاریک ہے۔ مجھے اس سے محبت نہیں تھی اسی لیے میں اس سے زیادہ وابستہ تھا۔ وزیر سے میری دلچسپی اس محبت کا ریہر سل تھی جو میرے دل میں اس عورت کے لیے موجود ہے جو ابھی میری زندگی میں نہیں آئی۔۔۔ میری زندگی کی انگوٹھی میں وزیر ایک جھوٹا نگینہ تھی لیکن یہ نگینہ مجھے عزیز تھا اس لیے کہ اس کی تراش، اس کام پ بالکل اس اصلی نگینہ کے مطابق تھا جس کی تلاش میں میں بیمیشہ ناکام رہا ہوں۔

وزیر سے میری دل بستگی بے غرض نہیں تھی اس لیے میں غرض مند تھا۔ وہ شخص جو اپنے غم افراما جوں کو کسی کے وجود سے رونق بخشندا چاہتا ہو، اس سے زیادہ خود غرض اور کون ہو سکتا ہے۔۔۔؟ اس لحاظ سے میں وزیر کا ممنون بھی تھا اور خدا گواہ ہے کہ میں جب کبھی اس کو یاد کرتا ہوں تو بے اختیار میرا دل اس کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

شہر میں مجھے صرف ایک کام تھا۔۔۔ اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے گھپ اندھیرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہنا اور بس! مگر بُوت میں اس تاریکی کے اندر روشنی کی ایک شعاع تھی۔ وزیر کی لال میں!

بھٹیاڑے کے یہاں رات کو کھانا کھانے کے بعد میں اور شیر، ٹھیکنے ٹھیکنے اکرام صاحب کے بنگلے کے پاس پہنچ جاتے۔ یہ بُنگہ ہوٹل سے قریباً تین جریب کے فاصلے پر تھا۔ رات کی خنک اور بیم مر طوب ہوا میں اس چہل قدمی کا بہت لطف آتا تھا۔ سڑک کے دائیں بائیں پھاڑوں اور ڈھلوانوں پر مکنی کے کھیت رات کے دھنڈ لکے میں خاکستری رنگ کے بڑے بڑے قالین معلوم ہوتے تھے۔ اور جب ہوا کے جھونکے مکنی کے پودوں میں لرزش پیدا کر دیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ آسمان سے بہت سی پریاں ان قالینوں پر اتر آئی ہیں اور ہولے ہولے ناچ رہی ہیں۔

آدھار استے طے کرنے پر جب ہم سڑک کے بائیں ہاتھ ایک چھوٹے سے دو منزلہ چوبی مکان کے قریب پہنچتے تو شیر اپنی مخصوص دھن میں یہ شعر گاتا،

ہر قدم فتنہ ہے قیامت ہے
آسمان تیری چال کیا جانے

یہ شعر گانے کی خاص وجہ یہ تھی کہ اس چوبی مکان کے رہنے والے اس غلط فہمی میں بتلاتھے کہ میرے اور وزیر کے تعلقات اخلاقی نقطہ نگاہ سے ٹھیک نہیں، حالانکہ وہ اخلاق کے معانی سے بالکل نا آشنا تھے۔ یہ لوگ مجھ سے اور شیر سے بہت دلچسپی لیتے تھے اور میری نقل و

حرکت پر خاص طور پر نگرانی رکھتے تھے۔ وہ تفریح کی غرض سے ٹوٹ آئے ہوئے تھے اور انھیں تفریح کا کافی سامان مل گیا تھا۔ شبیر اور پر والا شعر گا کر ان کی تفریح میں مزید اضافہ کیا کرتا تھا۔ اس کو چھپیر چھاڑ میں خاص لطف آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی رہائش گاہ کے عین سامنے پہنچ کر اس کو یہ شعر یاد آ جاتا تھا اور وہ فوراً اسے بلند آواز میں گا دیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اس کا عادی ہو گیا تھا۔

یہ شعر کسی خاص واقعے یا تاثر سے متعلق نہ تھا۔ میر انھیں ہے کہ اسے صرف یہی شعر یاد تھا، یا ہو سکتا ہے کہ وہ صرف اسی شعر کو گا سکتا تھا، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ بار بار یہی شعر دھرا تا۔

شرع شروع میں اندھیری راتوں میں سنسان سڑک پر ہماری چبیل قدی چوبی مکان کے چوبی سا کنوں پر (وہ غیر معمولی طور پر اجد اور گنوار واقع ہوئے تھے) کوئی اثر پیدا نہ کر سکی۔ مگر کچھ دنوں کے بعد ان کے بالائی کمرے میں روشنی نظر آنے لگی اور وہ ہماری آمد کے منتظر رہنے لگے اور جب ایک روز ان میں سے ایک نے اندھیرے میں ہمارا رخ معلوم کرنے کے لیے بیٹری روشن کی میں نے شبیر سے کہا، ”آن ہمارا رومان مکمل ہو گیا ہے۔“ مگر میں نے دل میں ان لوگوں کی قابلِ رحم حالت پر بہت افسوس کیا، کیونکہ وہ بے کار دودو تین ٹین گھنٹے تک جا گتے رہتے تھے۔

حسبِ معمول ایک رات شبیر نے اس مکان کے پاس پہنچ کر شعر گایا اور ہم آگے بڑھ گئے۔ بیٹری کی روشنی حسبِ معمول چکنی اور ہم با تین کرتے ہوئے اکرام صاحب کے بینگلے کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے دس بجے ہوں گے، ہو کا عالم تھا، ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی، آسمان ہم پر مرتبان کے ڈھنکنے کی طرح جھکا ہوا تھا اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ ہم کسی بند بوتل میں چل پھر رہے ہیں۔ سکوت اپنی آخری حد تک پہنچ کر منتظم ہو گیا تھا۔

بینگلے کے باہر برآمدے میں ایک چھوٹی سی میز پر یہ پہلی بارہ تھا اور پاس ہی بینگل پر اکرام صاحب لیٹے کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ شبیر نے دور سے ان کی طرف دیکھا اور دغناً سادھوؤں کا مخصوص نعرہ متنانہ ”الکھزنجن بلند کیا۔“ اس غیر متوقع شور نے مجھے اور اکرام صاحب دنوں کو چوڑکا دیا۔ شبیر کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ پھر ہم دنوں برآمدے میں داخل ہو کر اکرام صاحب کے پاس بیٹھ گئے۔ میرا منہ سڑک کی جانب تھا۔ عین اس وقت جب میں نے حقہ کی نے منہ میں دبائی۔ مجھے سامنے سڑک کے اوپر تاریکی میں روشنی کی ایک جھلک دکھائی دی۔ پھر ایک تحرک سایہ نظر آیا اور اس کے بعد روشنی ایک جگہ ساکن ہو گئی۔ میں نے خیال کیا کہ شاید وزیر کا بھائی اپنے کتے کو ڈھونڈ رہا ہے۔ چنانچہ ادھر دیکھنا چھوڑ کر میں شبیر اور اکرام صاحب کے ساتھ با تین کرنے میں مشغول ہو گیا۔

دوسرے روز شیر کے نعرہ بلند کرنے کے بعد پھر اخروٹ کے درخت کے عقب میں روشنی نمودار ہوئی اور سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ تیسرا روز بھی ایسا ہوا۔ چوتھے روز صبح کو میں اور شیر چشمے پر غسل کو جاری ہے تھے کہ اوپر سے ایک کنکر گرا، میں نے بیک وقت سڑک کے اوپر جھاڑیوں کی طرف دیکھا۔ وزیر سر پر پانی کا گھڑا اٹھائے ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسی اور شیر سے کہنے لگی، ”کیوں جناب، یہ آپ نے کیا وظیرہ اختیار کیا ہے کہ ہر روز ہماری نیند خراب کریں۔“

شیر حیرت زده ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں وزیر کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ شیر نے اس سے کہا ”آج آپ پہلیوں میں بات کر رہی ہیں۔“

وزیر نے سر پر گھڑے کا توازن قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ”میں اتنی اتنی دیر تک لال ٹین جلا کر اخروٹ کے نیچے بیٹھی رہتی ہوں اور آپ سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ پھوٹ منہ سے شکریہ ہی ادا کر دیں۔ بھلا آپ کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے۔۔۔ یہ چو کیداری تو میرے ہی ذمے ہے۔۔۔ آپ ٹھلنے کو نکلیں اور اکرام صاحب کے بنگلے میں گھنٹوں باقی کرتے رہیں اور میں سامنے لال ٹین لیے اوپھتی رہوں۔“

شیر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، ”یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ بھی میں تو کچھ نہ سمجھا، یہ کس دھن میں الاپ رہی ہیں؟“

میں نے شیر کو جواب نہ دیا اور وزیر سے کہا، ”ہم کئی دنوں سے رات گئے اکرام صاحب کے بیہاں آتے ہیں۔ دو تین مرتبہ میں نے اخروٹ کے پیچھے تمہاری لال ٹین دیکھی، پر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم غاص ہمارے لیے آتی ہو۔۔۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔۔۔ تم ناچ اپنی نیند کیوں خراب کرتی ہو؟“

وزیر نے شیر کو مخاطب کر کے کہا، ”آپ کے دوست بڑے ہی ناشکرے ہیں، ایک تو میں ان کی حفاظت کروں اور اوپر سے یہی مجھ پر اپنا احسان جاتائیں۔ ان کو اپنی جان پیاری نہ ہو پر۔۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی اور بات کارخیوں بدل دیا، ”آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ بیہاں ان کے بہت دشمن پیدا ہو گئے ہیں۔ پھر آپ انھیں کیوں نہیں سمجھاتے کہ رات کو باہر نہ نکلا کریں۔“

وزیر کو واقعی میری بہت فکر تھی۔ بعض اوقات وہ مجھے بالکل بچہ سمجھ کر میری حفاظت کی تدبیریں سوچا کرتی تھی، جیسے وہ خود محفوظ و مامون ہے اور میں بہت سی بلاوں میں گھرا ہوا ہوں۔ میں نے اسے کبھی نہ ٹوکا تھا اس لیے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس شغل سے باز رکھوں

جس سے وہ لطف اٹھاتی ہے، اس کی اور میری حالت بعینہ ایک جیسی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی منزل کی طرف جانے والے مسافر تھے جو ایک لق و دق صحرائیں ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ اسے میری ضرورت تھی اور مجھے اس کی۔ تاکہ ہمارا سفر اچھی طرح کٹ سکے۔ میر اور اس کا صرف یہ رشتہ تھا جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

ہم ہر شب مقررہ وقت پر ٹھلنے کو نکلتے۔ شیئر چوبی مکان کے پاس پہنچ کر شعر گاتا، پھر اکرام صاحب کے پنگلے سے کچھ دور کھڑے ہو کر نعرہ بلند کرتا، وزیر لال ٹین روشن کرتی اور اس کی روشنی کو ہوا میں لہرا کر ایک جھاڑی کے پیچھے بیٹھ جاتی۔ شیئر اور اکرام صاحب با تین کرنے میں مشغول ہو جاتے۔ اور میں لال ٹین کی روشنی میں اس روشنی کے ذرے ڈھونڈھتار ہتا جس سے میری زندگی منور ہو سکتی تھی۔ وزیر جھاڑیوں کے پیچے بیٹھی نہ جانے کیا سوچتی رہتی؟

-[68]-

ہر نام کور: سعادت حسن منٹو

نہال سنگھ کو بہت ہی الجھن ہو رہی تھی۔ سیاہ و سفید اور تلی موچھوں کا ایک چھا اپنے منہ میں چوستے ہوئے وہ برابر دوڑھائی گھنٹے سے اپنے جوان بیٹھے بہادر کی بابت سوچ رہا تھا۔

نہال سنگھ کی ادھیر مگر تیز آنکھوں کے سامنے وہ کھلامیدان تھا جس پر وہ بچپن میں برٹوں سے کبڑی تک تمام کھیل کھیل چکا تھا۔ کسی زمانے میں وہ گاؤں کا سب سے نڈ اور جیلا جوان تھا۔ کماڈ اور کمٹی کے کھیتوں میں اس نے کئی بیٹلی میاروں کو کلائی کے ایک ہی جھنکے سے اپنی مر رضی کا تابع بنایا۔ تھوک پھیکتا تھا تو پندرہ گز دور جا کے گرتی تھی۔ کیا رنگیلا سبجلا جوان تھا۔ لہریا گڑی باندھ کر اور ہاتھ میں چھوی لے کر جب میلے ٹھیلے کو نکلتا تو بڑے بوڑھے پکارا ٹھنتے، ”کسی کو سندراجاٹ دیکھنا ہے تو سردار نہال سنگھ کو دیکھ لے۔“

سندراجاٹ تو ڈاکو تھا، بہت بڑا ڈاکو جس کے گانے ابھی تک لوگوں کی زبان پر تھے لیکن نہال سنگھ ڈاکو نہیں تھا۔ اس کی جوانی میں دراصل کرپان کی سی تیزی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عورتیں اس پر مررتی تھیں۔ ہر نام کور کا قصہ تو ابھی تک گاؤں میں مشہور تھا کہ اس بیکی نے کیسے ایک دفعہ سردار نہال سنگھ کو قریب قریب بھرم کر ڈالا تھا۔

نہال سنگھ نے ہر نام کو رکے متعلق سوچا تو ایک لمحے کے لیے اس کی ادھیر ہڈیوں میں بیتی ہوئی جوانی کر کر اٹھی۔ کیا پتی چھمک حیسی نہ تھی۔ چھوٹے چھوٹے لال ہونٹ جن کو وہ ہر وقت چوتی رہتی۔۔۔ ایک روز جب کہ بیریوں کے بیر پکے ہوئے تھے، سردار نہال سنگھ سے اس کی مدد بھیڑ ہو گئی۔۔۔ وہ زمین پر گرے ہوئے بیر چن رہی تھی اور اپنے چھوٹے چھوٹے لال ہونٹ چو سرہی تھی۔ نہال سنگھ نے آوازہ کسما۔۔۔ کیہڑے یار داتا دادھ پیتا۔۔۔ سڑگیاں لال بلیاں؟

ہر نام کو رنے پتھر اٹھایا اور تان کر اس کو مارا۔ نہال سنگھ نے چوٹ کی پروانہ کی اور آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ لیکن وہ بچی کی سی تیزی سے مجھلی کی طرح ترپ کر الگ ہو گئی اور یہ جاوہ جا۔ نہال سنگھ کو جیسے کسی نے چاروں شانے چت گرا دیا۔ شکست کا یہ احساس اور بھی زیادہ ہو گیا جب یہ بات سارے گاؤں میں پھیل گئی۔

نہال سنگھ خاموش رہا۔ اس نے دوستوں دشمنوں سب کی باتیں سنیں پر جواب نہ دیا۔ تیسرا روز دوسری بار اس کی مدد بھیڑ گور دوارہ صاحب سے کچھ دور بڑی گھنی چھاؤں میں ہوئی۔ ہر نام کو راینٹ پر بیٹھی اپنی گرگابی کی کیلیں اندر ٹھونک رہی تھی۔ نہال سنگھ کو پاس دیکھ کر وہ بد کی۔ پر اب کے اس کوئی پیش نہ چلی۔

شام کو جب لوگوں نے نہال سنگھ کو بہت خوش خوش اونچے سروں میں۔ فی ہر نام کو رے، او نارے۔۔۔ گاتے سنا تو ان کو معلوم ہو گیا کون سا قلعہ سر ہوا ہے۔۔۔ لیکن دوسرے روز نہال سنگھ زنا بالجبر کے الزام میں گرفتار ہوا اور تھوڑی سی مقدمے بازی کے بعد اسے چھ سال کی سزا ہو گئی۔

چھ سال کے بجائے نہال سنگھ کو ساڑھے سات کی قید بھکتنی پڑی کیونکہ جیل میں اسکا دو دفعہ جھگڑا ہو گیا تھا۔ لیکن نہال سنگھ کو اس کی کچھ پروا نہ تھی۔ قید کاٹ کر جب گاؤں روانہ ہوا اور ریل کی پٹری طے کر کے مختلف پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا گور دوارے کے پاس سے گزر کر بڑے گھنے درخت کے قریب پہنچا تو اس نے کیا دیکھا کہ ہر نام کو رکھری ہے۔۔۔ اور اپنے ہونٹ چو سرہی ہے۔ اس سے پیشتر کہ نہال سنگھ کچھ سوچنے یا کہنے پائے۔ وہ آگے بڑھی اور اس کی چوڑی چھاتی کے ساتھ چٹ گئی۔

نہال سنگھ نے اس کو اپنی گود میں اٹھایا اور گاؤں کے بجائے کسی دوسری طرف چل دیا۔۔۔ ہر نام کو رنے پوچھا، ”کہاں جا رہے ہو؟“

نہال سنگھ نے نعرہ لگایا، ”جو بولے سونہال ست سری اکاں۔“ دونوں لکھ ملا کر ہنس پڑے۔

نہال سنگھ نے ہر نام کو رسمی شادی کرنی اور چالیس کوس کے فاصلے پر دوسرا گاؤں میں آباد ہو گیا۔ یہاں بڑی منتوں سے چھ برس کے بعد بہادر پیدا ہوا اور بیساکھی کے روز جب کہ وہ ابھی پورے ڈھانی مہینے کا بھی نہیں ہوا تھا، ہر نام کو رکھ کے ماتا نگلی اور وہ مرگئی۔ نہال سنگھ نے بہادر کی پرورش اپنی بیوہ بہن کے سپرد کر دی جس کی چار لڑکیاں تھیں چھوٹی چھوٹی۔۔۔ جب بہادر آٹھ برس کا ہوا تو نہال سنگھ اسے اپنے پاس لے آیا۔ چار برس ہو چکے تھے کہ بہادر اپنے باپ کی نگرانی میں تھا۔ ننکل صورت میں وہ بالکل اپنی ماں جیسا تھا، اسی طرح دبلا پتلا اور نازک۔ کبھی کبھی اپنے پتلے پتلے لال لال ہونٹ چوتھا تو نہال سنگھ اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔

نہال سنگھ کو بہادر سے بہت محبت تھی۔ چار برس اس نے بڑے چاؤ سے نہلا یاد حلا لیا۔ ہر روز وہ ہی سے خود اس کے کیس دھوتا، اسے کھلاتا، باہر سیر کے لیے لے جاتا، کہانیاں سناتا، ورزش کرتا۔ مگر بہادر کو ان چیزوں سے کوئی رغبت نہ تھی۔ وہ ہمیشہ اداں رہتا۔ نہال سنگھ نے سوچا اتنی دیر اپنی پھوپھی کے پاس جو رہا ہے، اس لیے اداں ہے۔ چنانچہ پھر اس کو اپنی بہن کے پاس بھیج دیا اور خود فوج میں بھرتی ہو کر لام پر چلا گیا۔

چار برس اور گزر گئے۔ لڑائی بند ہوئی اور نہال سنگھ جب واپس آیا تو وہ بچپاں برس کے بجائے ساٹھ باسٹھ برس کا گلتا تھا۔ اس لیے کہ اس نے جاپانیوں کی قید میں ایسے دکھ جھیلے تھے کہ سن کر آدمی کے روئے کھڑے ہوتے تھے۔

اب بہادر کی عمر نہال سنگھ کے حساب کے مطابق سولہ کے لگ بھگ تھی مگر وہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا چار برس پہلے تھا۔۔۔ دبلا پتلا۔۔۔ لیکن خوبصورت۔

نہال سنگھ نے سوچا کہ اس کی بہن نے بہادر کی پرورش دل سے نہیں کی۔ اپنی چار لڑکیوں کا دھیان رکھا جو بچھیریوں کی طرح ہر وقت آنکن میں کڈ کڑے لگاتی رہتی ہیں۔ چنانچہ جھگڑا ہوا اور وہ بہادر کو وہاں سے اپنے گاؤں لے گیا۔

لام پر جانے سے اس کے کھیت کھلیاں اور گھر بار کاستیاں اس ہو گیا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے نہال سنگھ نے ادھر دھیان دیا اور بہت ہی تھوڑے عرصہ میں سب ٹھیک ٹھاک کر لیا، اس کے بعد اس نے بہادر کی طرف توجہ دی۔ اس کے لیے ایک بھوری بھینس خریدی۔ مگر نہال سنگھ کو اس بات کا دکھ ہی رہا کہ بہادر کو دودھ، دہی اور مکھن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جانے کیسی اوٹ پٹاگنگ چیزیں اسے بھاتی تھیں۔ کئی دفعہ نہال سنگھ کو غصہ آیا مگر وہ پی گیا، اس لیے کہ اسے اپنے لڑکے سے بے انتہا محبت تھی۔

حالانکہ بہادر کی پرورش زیادہ تر اس کی پھوپھی نے کی تھی مگر اس کی بگڑی ہوئی عادتیں دیکھ کر لوگ یہی کہتے تھے کہ نہال سنگھ کے لائپیار نے اسے خراب کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ہم عمر نوجوانوں کی طرح محنت مشقت نہیں کرتا۔ گونہال سنگھ کی ہر گز خواہش نہیں تھی کہ اس کا لڑکا مزدوروں کی طرح کھیتوں میں کام کرے اور صبح سے لے کر دن ڈھلنے تک ہل چلائے۔ واگروہی کی کرپاسے اس کے پاس بہت کچھ تھا۔ زمینیں تھیں، جن سے کافی آمدن ہو جاتی تھی۔ سرکار سے جواب پنٹن مل رہی تھی، وہ الگ تھی۔ لیکن پھر بھی اس کی خواہش تھی۔۔۔ دلی خواہش تھی کہ بہادر کچھ کرے۔۔۔ کیا؟ یہ نہال سنگھ نہیں بتا سکتا تھا۔

چنانچہ کئی بار اس نے سوچا کہ وہ بہادر سے کیا چاہتا ہے۔ مگر ہر بار بجائے اس کے کہ اسے کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملتا، اس کی بیتی ہوئی جوانی کے دن ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگتے اور وہ بہادر کو بھول کر اس گزرے ہوئے زمانے کی یادوں میں کھو جاتا۔

لام سے آئے نہال سنگھ کو دو برس ہو چکے تھے۔ بہادر کی عمر اب اٹھارہ کے لگ بھگ تھی۔۔۔ اٹھارہ برس کا مطلب یہ ہے کہ بھرپور جوانی۔۔۔ نہال سنگھ جب یہ سوچتا تو جھنجھلا جاتا۔ چنانچہ ایسے وقوں میں کئی دفعہ اس نے اپنا سر جھٹک کر بہادر کو ڈالنا، ”نام تیرا میں نے بہادر رکھا ہے۔۔۔ کبھی بہادری تود کھا۔“ اور بہادر ہونٹ چوس کر مسکرا دیتا۔

نہال سنگھ نے ایک دفعہ سوچا کہ بہادر کی شادی کر دے۔ چنانچہ اس نے ادھر ادھر کئی لڑکیاں دیکھیں۔ اپنے دوستوں سے بات چیت بھی کی۔ مگر جب اسے جوانی یاد آئی تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ نہیں، بہادر میری طرح اپنی شادی آپ کرے گا۔ کب کرے گا؟ یہ اس کو معلوم نہیں تھا۔ اس لیے کہ بہادر میں ابھی تک اس نے وہ چمک نہیں دیکھی تھی جس سے وہ اندازہ لگاتا کہ اس کی جوانی کس مرحلے میں ہے۔۔۔ لیکن بہادر خوبصورت تھا۔ سندراجات نہیں تھا، لیکن سندر ضرور تھا۔ بڑی بڑی کالی آنکھیں، پتلے پتلے لال ہونٹ، ستواں ناک، پتلی کمر، کالے بھونزا ایسے کیس مگر بال بہت ہی مہیں۔۔۔ گاؤں کی جوان لڑکیاں دور سے اسے گھور گھور کے دیکھتیں۔ آپس میں کاناپھوسی کر تیں مگر وہ ان کی طرف دھیان نہ دیتا۔

بہت سوچ بچار کے بعد نہال سنگھ اس نتیجے پر پہنچا۔ شاید بہادر کو یہ تمام لڑکیاں پسند نہیں اور یہ خیال آتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے ہر نام کو رکنی تصویر آگئی۔ بہت دیر تک وہ اسے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس کو ہٹا کر اس نے گاؤں کی لڑکیاں لیں۔ ایک ایک کر کے وہ ان تمام

کو اپنی آنکھوں کے سامنے لا یا مگر ہر نام کور کے مقابلے میں کوئی بھی پوری نہ اتری۔۔۔ نہال سنگھ کی آنکھیں تمثماً تھیں، ”بہادر میر ایٹا ہے۔ ایسی ویسیوں کی طرف تو وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔“

دن گزرتے گئے۔ میریوں کے بیرونی دفعہ پکر۔ ملئی کے بوڑھیتوں میں کئی دفعہ نہال سنگھ کے قد کے برابر جوان ہوئے۔ کئی ساون آئے مگر بہادر کی یاری کسی کے ساتھ نہ لگی اور نہال سنگھ کی لجھن پھر بڑھنے لگی۔

تحک ہار کرنہال سنگھ دل میں ایک آخری فیصلہ کر کے بہادر کی شادی کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ایک گڑبرڑ شروع ہو گئی۔ بھانت بھانت کی خبریں گاؤں میں دوڑنے لگیں۔ کوئی کہتا انگریز جا رہا ہے۔ کوئی کہتا وسیوں کا راج آنے والا ہے۔ ایک خبر لاتا کا انگریں جیت گئی ہے۔ دوسرا کہتا نہیں، ریڈیو میں آیا ہے کہ ملک بٹ جائے گا۔ جتنے منہ، اتنی باتیں۔ نہال سنگھ کا تودماغ چکر اگیا۔ اسے ان خبروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سچ پوچھئے تو اس جنگ سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی جس میں وہ پورے چار برس شامل رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ آرام سے بہادر کی شادی ہو جائے اور گھر میں اس کی بہو آجائے۔

لیکن ایک دم جانے کیا ہوا۔ خبر آئی کہ ملک بٹ گیا ہے۔ ہندو مسلمان الگ الگ ہو گئے ہیں۔ بس پھر کیا تھا چاروں طرف بھگدڑ سی مجگئی۔ چل چلا شروع ہو گیا اور پھر سننے میں آیا کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ مارے جا رہے ہیں۔ سیکڑوں لڑکیاں انغوکی جا رہی ہیں۔ لاکھوں کا مال لوٹا جا رہا ہے۔

کچھ دن گزر گئے تو پکی سڑک پر قافلوں کا آنا جانا شروع ہوا۔ گاؤں والوں کو جب معلوم ہوا تو میلے کا سماں پیدا ہو گیا۔ لوگ سوسو، دودو سوکی ٹولیاں بناؤ کر جاتے۔ جب لوٹتے تو ان کے ساتھ کئی چیزیں ہوتیں۔ گائے، بھیس، بکریاں، گھوڑے، ٹرنک، بستر اور جوان لڑکیاں۔

کئی دنوں سے یہ سلسلہ جاری تھا۔ گاؤں کا ہر جوان کوئی نہ کوئی کارنامہ دکھا پکا تھا حتیٰ کہ کھیا کانٹا اور کبڑا لڑکا دریام سنگھ بھی۔۔۔ اس کی پیڑھ پر بڑا کوہاں تھا۔ ٹانگیں ٹیڑھی تھیں، مگر یہ بھی چار روز ہوئے پکی سڑک پر سے گزرنے والے ایک قافلے پر حملہ کر کے ایک جوان لڑکی اٹھا لایا تھا۔ نہال سنگھ نے اس لڑکی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ خوبصورت تھی۔ بہت ہی خوبصورت تھی لیکن نہال سنگھ نے سوچا کہ ہر نام کور جتنی خوبصورت نہیں ہے۔

گاؤں میں کئی دنوں سے خوب چہل پہل تھی۔ چاروں طرف جوان شراب کے نشے میں دھت بولیاں گاتے پھرتے تھے۔ کوئی لڑکی بھاگ نکلتی تو سب اس کے پیچھے شور مچاتے دوڑتے، کبھی لوٹے ہوئے مال پر جھگڑا ہو جاتا تو نوبت مرنے مارنے پر آ جاتی۔ چیخ و پکار توہر گھڑی سنائی دیتی تھی۔ غرضیکہ بڑا مزیدار ہنگامہ تھا۔ لیکن بہادر خاموش گھر میں بیٹھا رہتا۔

شروع شروع میں تو نہال سنگھ بہادر کی اس خاموشی کے متعلق بالکل غافل رہا۔ لیکن جب ہنگامہ اور زیادہ بڑھ گیا اور لوگوں نے مذاقیہ لجھ میں اس سے کہنا شروع کیا، ”کیوں سردار نہال سیاں، تیرے بہادر نے سنائے بڑی بہادر یاں دکھائی ہیں؟“ تو وہ پانی پانی ہو گیا۔

چوپال پر ایک شام کویر قان کے مارے ہوئے حلوائی بشیشتر نے دون کی پھینکی اور نہال سنگھ سے کہا، ”دو تو میرا گند اسنگھ لا لایا ہے۔۔۔ ایک میں لایا ہوں بند بو تل، اور یہ کہتے ہوئے بشیشتر نے زبان سے پٹالنے کی آواز پیدا کی جیسے بو تل میں سے کاگ اڑتا ہے، ”نصبیوں والا ہی کھولتا ہے ایسی بند بو تل میں سردار نہال سیاں۔“

نہال سنگھ کا جی جل گیا۔ کیا تھا بشیشتر اور کیا تھا گند اسنگھ؟ ایک یہ قان کامرا ہوا، دوسرا تپ دق کا۔۔۔ مگر جب نہال سنگھ نے ٹھنڈے دل سے سوچا تو اس کو بہت دکھ ہوا۔ کیونکہ جو کچھ بشیشتر نے کہا حقیقت تھی۔ بشیشتر اور اس کا لڑکا گند اسنگھ کیسے بھی تھے۔ مگر تین جوان لڑکیاں، ان کے گھر میں واقعی موجود تھیں اور چونکہ بشیشتر کا گھر اس کے پڑوس میں تھا۔ اس لیے کئی دنوں سے نہال سنگھ ان تینوں لڑکیاں کے مسلسل رونے کی آواز سن رہا تھا۔

گور دوارے کے پاس ایک روز دو جوان باتیں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔

”نہال سنگھ کے بارے میں تو بڑی باتیں مشہور ہیں۔“

”اڑے چھوڑ۔ بہادر تو چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھا ہے۔“

نہال سنگھ سے اب نہ رہا گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے بہادر کو بہت غیرت دلائی اور کہا، ”تو نے سنالوگ کیا کہتے پھرتے ہیں۔۔۔ چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھا ہے تو۔۔۔ قسم واگرو جی کی، تیری عمر کا تھا تو سیکڑوں لڑکیاں میری ان نالگوں۔۔۔“

نہال سنگھ ایک دم خاموش ہو گیا۔ کیونکہ شرم کے مارے بہادر کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ باہر نکل کروہ دیر تک سوچتا چلا گیا اور سوچتا سوچتا کنوں کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔۔۔ اس کی ادھیڑ مگر تیز آنکھوں کے سامنے وہ کھلامیدان تھا جس پر بر نٹوں سے لے کر کبڑی تک تمام کھل کھیل چکا تھا۔

بہت دیر تک نہال سنگھ اس نتیجے پر پہنچا کہ بہادر شر میلا ہے اور یہ شر میلا پن اس میں غلط پرورش کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے دل ہی دل میں اپنی بہن کو بہت گالیاں دیں اور فیصلہ کیا کہ بہادر کے شر میلے پن کو کسی نہ کسی طرح توڑا جائے اور اس کے لیے نہال سنگھ کے ذہن میں ایک ہی ترکیب آئی۔

خبر آئی کہ رات کو کچی سڑک پر سے ایک قافلہ گزرنے والا ہے۔ اندھیری رات تھی۔ جب گاؤں سے ایک ٹولی اس قافلے پر حملہ کرنے کے لیے نکلی تو نہال سنگھ بھی ٹھاٹھا باندھ کر ان کے ساتھ ہو لیا۔ حملہ ہوا۔ قافلے والے نہتے تھے۔ پھر بھی تھوڑی سی جھپٹ ہوئی۔ لیکن فوراً ہی قافلے والے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ حملہ کرنے والی ٹولی نے اس افراد فری سے فائدہ اٹھایا اور لوٹ مار شروع کر دی۔ لیکن نہال سنگھ کو مال و دولت کی خواہش نہیں تھی۔ وہ کسی اور ہی چیز کی تاک میں تھا۔

سخت اندھیرا تھا، گو گاؤں والوں نے مشعلیں روشن کی تھیں مگر بھاگ دوڑ اور لوٹ کھوٹ میں بہت سی بجھ گئی تھیں۔ نہال سنگھ نے اندھیرے میں کئی عورتوں کے سامنے دوڑتے دیکھے مگر فیصلہ نہ کر سکا کہ ان میں سے کس پر ہاتھ ڈالے۔ جب کافی دیر ہو گئی اور لوگوں کی چینچ و پکار مدمحم پڑنے لگی تو نہال سنگھ نے بے چینی کے عالم میں ادھر ادھر دوڑنا شروع کیا۔ ایک دم تیزی سے ایک سایہ بغلوں میں گھری دبائے اس کے سامنے سے گزرا۔

نہال سنگھ نے اس کا تعاقب کیا۔ جب پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ لڑکی ہے اور جوان۔۔۔ نہال سنگھ نے فوراً اپنے گاڑھے کی چادر نکالی اور اس پر جال کی طرح پھیکنی۔ وہ پھنس گئی۔ نہال سنگھ نے اسے کاندھوں پر اٹھایا اور ایک ایسے راستے سے گھر کا رخ کیا کہ اسے کوئی دیکھنے لے۔

مگر گھر پہنچا تو بتی گل تھی۔ بہادر اندر کو ٹھری میں سورہا تھا۔ نہال سنگھ نے اسے جگانا مناسب خیال نہ کیا۔ کواڑ کھولا۔ چادر میں سے لڑکی نکال کر اندر دھکیل، باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ پھر زور زور سے کواڑ پیٹے۔ تاکہ بہادر جاگ پڑے۔ جب نہال سنگھ نے مکان کے باہر کھٹیا جچھائی اور بہادر اور اس لڑکی کی ٹھیک پہٹ پیدا کرنے والی باتیں سوچنے کے لیے لیٹنے لگا تو اس نے دیکھا کہ بہادر کی کو ٹھری کے روشن دانوں

میں دیے کی روشنی ٹھہرائی ہے۔ نہال سنگھ اچھل پڑا۔ اور ایک لمحے کیلئے محسوس کیا کہ وہ جوان ہے۔ کماڈ کے کھینتوں میں ٹیاروں کو کلامی سے کپڑنے والا نوجوان۔

ساری رات نہال سنگھ جا گتار ہا اور طرح طرح کی باتیں سوچتا رہا۔ صحیح جب مرغ بولنے لگے تو وہ اٹھ کر کوٹھری میں جانے لگا۔ مگر ڈیورٹھی سے لوٹ آیا۔ اس نے سوچا کہ دونوں تھک کر سوچکے ہوں گے اور ہو سکتا ہے۔۔۔ نہال سنگھ کے بدن پر جھر جھری سی دوڑگئی اور وہ کھاث پر پیٹھ کر موخچوں کے بال منہ میں ڈال کر چونے اور مسکرانے لگا۔

جب دن چڑھ گیا اور دھوپ نکل آئی تو اس نے اندر جا کر کنڈی کھوئی۔ سڑپڑ کی آوازیں سی آئیں۔ کواڑ کھولے تو اس نے دیکھا کہ لڑکی چارپائی پر کیسری دوپٹہ اوڑھے بیٹھی ہے۔ پیٹھ اس کی طرف تھی۔ جس پر یہ موئی کالی چیساں پ کی طرح لٹک رہی تھی۔ جب نہال سنگھ نے کوٹھری کے اندر قدم رکھا تو لڑکی نے پاؤں اور پر اٹھا لیے اور سمت کر بیٹھ گئی۔

طاق میں دیا بھی تک جل رہا تھا۔ نہال سنگھ نے پھونک مار کر اسے بجھایا اور دفتار سے بہادر کا خیال آیا۔۔۔ بہادر کہاں ہے۔۔۔؟ اس نے کوٹھری میں ادھر ادھر نظر دوڑائی مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ دو قدم آگے بڑھ کر اس نے لڑکی سے پوچھا، ”بہادر کہاں ہے؟“

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک دم سڑپڑ سی ہوئی اور چارپائی کے نیچے سے ایک اور لڑکی نکلی۔۔۔ نہال سنگھ ہکابکارہ گیا۔۔۔ لیکن اس نے دیکھا۔۔۔ اس کی حیرت زدہ آنکھوں نے دیکھا کہ جو لڑکی چارپائی سے نکل کر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ باہر دوڑ گئی تھی۔ اس کے داڑھی تھی، منڈی ہوئی داڑھی۔ نہال سنگھ چارپائی کی طرف بڑھا۔ لڑکی جو کہ اس پر بیٹھی تھی اور زیادہ سمت گئی مگر نہال سنگھ نے ہاتھ کے ایک جھٹکے سے اس کا منہ اپنی طرف کیا۔ ایک چین نہال سنگھ کے حلق سے نکلی اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”ہر نام کور!“

زنانہ لباس، سیدھی مانگ، کالی چیساں۔۔۔ اور بہادر ہونٹ بھی چوس رہا تھا۔

کچھ عرصے سے اقلیتیں اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے بیدار ہو رہی تھیں۔ ان کو خوابِ گراں سے جگانے والی اکثریتیں تھیں جو ایک مدت سے اپنے ذاتی فائدے کے لیے ان پر دباؤ ڈالتی رہی تھیں۔ اس بیداری کی لہر نے کئی انجمنیں پیدا کر دی تھیں۔ ہوٹل کے بیرون کی انجمن، جاموس کی انجمن، کلر کوں کی انجمن، اخبار میں کام کرنے والے صحافیوں کی انجمن۔ ہر اقلیت اپنی انجمن یا تو بنا جکی تھی یا بنارہی تھی تاکہ اپنے حقوق کی حفاظت کر سکے۔

ایسی ہر انجمن کے قیام پر اخباروں میں تبصرے ہوتے تھے۔ اکثریت کے جماعتی ان کی مخالفت تھے اور اقلیت کے طرف دار موافق تھے۔ غرضیکہ کچھ عرصے سے ایک اچھا خاصا ہنگامہ برپا تھا جس سے رونق لگی رہتی تھی، مگر ایک روز جب اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ملک کے دس نمبر یہ غنڈوں نے اپنی انجمن قائم کی ہے تو اکثریتیں اور اقلیتیں دونوں سنسنی زدہ ہو گئیں۔ شروع شروع میں تو لوگوں نے خیال کر بے پر کی ازادی ہے کسی نے۔ پر جب بعد میں اس انجمن نے اپنے اغراض و مقاصد شائع کیے اور ایک باقاعدہ منشور ترتیب دیا تو پتا چلا کہ یہ کوئی مذاق نہیں۔ غنڈے اور بدمعاش واقعی خود کو اس انجمن کے ساتھ تلے متھد اور منظم کرنے کا پورا پورا تہبیہ کرچکے ہیں۔

اس انجمن کی ایک دو میئنگیں ہو چکی تھیں، ان کی رواداد اخباروں میں شائع ہو چکی تھی۔ لوگ پڑھتے اور دم بخود ہو جاتے۔ بعض کہتے کہ بس اب قیامت آنے میں زیادہ دیر باقی نہیں۔ اغراض و مقاصد کی ایک لمبی چوڑی فہرست تھی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ غنڈوں اور بدمعاشوں کی یہ انجمن سب سے پہلے تو اس بات پر صدائے احتجاج بلند کرے گی کہ معاشرے میں ان کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ بھی دوسروں کی طرح بلکہ ان کے مقابلے میں کچھ زیادہ امن پسند شہری ہیں۔ ان کو غنڈے اور بدمعاش نہ کہا جائے اس لیے کہ اس سے ان کی ذلیل و توهین ہوتی ہے۔ وہ خود اپنے لیے کوئی مناسب اور معزز نام تجویز کر لیتے مگر اس خیال سے کہ اپنے منہ میاں مٹھوکی کہاوت ان پر چسپاں نہ ہو، وہ اس کا فیصلہ عوام و خواص پر چھوڑتے ہیں۔ چوری چکاری، ڈکیتی اور ہرزنی، جیب تراشی اور جعل سازی، پتے بازی اور بلیک مار کیٹنگ وغیرہ، افعال قبیحہ کے بجائے فنونِ لطینہ میں شمار ہونے چاہئیں۔ ان لطیف فنون کے ساتھ اب تک جو بر اسلوک روا رکھا گیا ہے اس کی مکمل تلافی اس یونین کا نصب اعین ہے۔

ایسے ہی کئی اور اغراض و مقاصد تھے جو سننے اور پڑھنے والوں کو بڑے عجیب و غریب معلوم ہوتے تھے۔ بظاہر ایسا تھا کہ چند بے فکر ظریفوں نے لوگوں کی تفتیح کے لیے یہ سب باتیں گڑھی ہیں۔ یہ چیلہ ہی تو معلوم ہوتا تھا کہ یونین اپنے ممبروں کی قانونی حفاظت کا ذمہ لے گی اور ان کی سرگرمیوں کے لیے سازگار اور خوشگوار فضاضا پیدا کرنے کے لیے پوری پوری جدوجہد کرے گی۔ وہ حکام وقت پر زور دے گی کہ

یو نین کے ہر کن پر اس کے مقام اور رتبے کے لحاظ سے مقدمہ چلا یا جائے اور سزادیتے وقت بھی اس کو پیش نظر رکھا جائے۔ حکومت لوگوں کو اپنے گھروں میں چوروں کا برقی الارم نہ لگانے دے اس لیے کہ بعض اوقات یہ ہلاکت خیز ثابت ہوتا ہے۔ جس طرح سیاسی قیدیوں کو جیل میں اے اور بی کلاس کی مراعات دی جاتی ہیں، اسی طرح یو نین کے ممبروں کو دی جائیں۔ یو نین اس بات کا بھی ذمہ لیتی تھی کہ وہ اپنے ممبروں کو ضعیف اور ناکارہ یا کسی حادثے کا شکار ہو جانے کی صورت میں ہر ماہ گزارے کے لیے معقول رقم دے گی۔ جو ممبر کسی خاص شعبے میں مہارت حاصل کرنے کے لیے باہر کے ممالک میں جانا چاہے گا اسے وظیفہ دے گی وغیرہ وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ اخباروں میں اس یو نین کے قیام پر خوب تبرہ بازی ہوئی۔ قریب قریب سب اس کے خلاف تھے۔ بعض رجعت پسند کہتے تھے کہ یہ کیونزم کی انتہائی شکل ہے اور اس کے بنیوں کے ڈانڈے کر میلن سے ملاتے تھے۔ حکومت سے چنانچہ بار بار درخواست کی جاتی کہ وہ اس فتنے کو فوراً کچل دے، کیونکہ اگر اس کو ذرا بھی پہنچ کا موقعہ دیا گیا تو معاشرے میں ایسا زہر پھیلے گا کہ اس کا تریاق مانا مشکل ہو جائے گا۔

خیال تھا کہ ترقی پسند اس یو نین کی طرف داری کریں گے کہ اس میں ایک جدت تھی اور پرانی قدروں سے ہٹ کر اس نے اپنے لیے ایک بالکل نیاراستہ تلاش کیا تھا۔ اور پھر یہ کہ رجعت پسند اسے کیونسوں کی اختراع سمجھتے تھے مگر حیرت یہ کہ اقلیتوں کے یہ سب سے بڑے طرفدار پہلے تو اس معاطلے میں خاموش رہے اور بعد میں دوسروں کے ہم نواہو گئے اور اس یو نین کی تیج ہنسی پر زور دینے لگے۔ اخباروں میں ہنگامہ برپا ہوا تو ملک کے گوشے گوشے میں اس یو نین کے قیام کے خلاف جلسے ہونے لگے۔ قریب قریب ہر پارٹی کے نامی و گرامی لہدروں نے پلیٹ فارم پر آ کر اس نگ نگ تہذیب و تمدن جماعت کو ملعون قرار دیا اور کہا کہ یہی وقت ہے جب تمام لوگوں کو اپنے آپ کے جھگڑے چھوڑ کر اس فتنہ عظیم کا مقابلہ کرنے کے لیے اتحاد، نظم اور یقین حکم کو اپنا مولو بنا کر ڈٹ جانا چاہیے۔

اس سارے ہنگامے کا جواب یو نین کی طرف سے ایک پوستر کے ذریعے سے دیا گیا جس میں بڑے اختصار کے ساتھ یہ کہا گیا کہ پریس اکثریت کے ہاتھ میں ہے۔ قانون اس کی پشت پر ہے، مگر انہم کے حوصلے اور ارادے پست نہیں ہوئے، وہ کوشش کر رہی ہے کہ بہت سی رقم دے کر کچھ اخبار خرید لے اور ان کو اپنے حق میں کر لے۔ یہ پوستر ملک کے درودیوار پر نمودار ہوا تو فوراً بعد کئی شہروں سے بڑی بڑی چوریوں اور ڈکیتیوں کی اطلاعیں وصول ہوئیں۔ اور اس کے چند روز بعد جب ایک ایکی دو اخباروں نے دبی زبان میں غنڈوں اور بد کاروں کی یو نین کے اغراض و مقاصد میں اصلاحی پہلو کریدنا شروع کیا تو لوگ سمجھ گئے کہ پس پردہ کیا ہوا ہے۔

پہلے ان دو اخباروں کی اشاعت ہونے نہ ہونے کے برابر تھی۔ نہایت ہی گھٹیا کاغذ پر چھپتے تھے۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے کچھ ایسی کا یا کلپ ہوئی کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ سب سے اچھا ایڈ یوریل اسٹاف ان دو پر چوں کے پاس تھا۔ دفتر میں ایک کے بجائے دو دو ٹیکی پر مژتھے۔ تنخوا

مقررہ وقت سے پہلے مل جاتی تھی۔ بوس الگ ملتا تھا۔ گھر کا الاؤنس، ٹانگے کا الاؤنس، سگر ٹوں کا الاؤنس، چائے کا الاؤنس، مہگائی الاؤنس۔ یہ سب الاؤنس مل کر تنخواہ سے دو گنے ہو جاتے تھے۔ جو ذخیرہ رز کے رسیا تھے، ان کو مفت پر مست ملتا تھا اور بہترین اسکاچ و سکی کنٹروالڈ قیمت پر دستیاب ہوتی تھی۔ عملے کے ہر آدمی سے باقاعدہ کنٹریکٹ کیا گیا تھا جس میں مالک کی طرف سے یہ اقرار تھا کہ اس کے گھر میں کبھی چوریٰ ہوئی، یا اس کی جیب کاٹ لی گئی تو اسے نقصان کے علاوہ ہر جانہ بھی ادا کیا جائے گا۔

ان دو اخباروں کی اشاعت دیکھتے ہزاروں تک پہنچ گئی۔ تعجب ہے کہ پہلے جب ان کی اشاعت کچھ بھی نہیں تھی تو یہ ہر روز کثیر اشاعت ہونے کے بلند بانگ دعوے کرتے تھے، مگر جب ان کی کایا کلپ ہوئی تو اس معاملے میں بالکل خاموش ہو گئے۔ بیک وقت البتہ ان دونوں اخباروں نے کچھ عرصے کے بعد یہ اعلان چھاپا کہ ہماری اشاعت اس حد تک جا پہنچی ہے کہ اگر ہم نے اس سے تجاوز کیا تو تجارتی نقطہ نظر سے نقصان ہی نقصان ہے۔

ان کے علمی و ادبی اڈیشنوں میں عجیب و غریب موضوعات پر مضمون شائع ہوتے تھے، یہ چار پانچ توبڑے ہی سننی خیز تھے۔

بلیک مارکیٹ کے فوائد۔۔۔ معاشیات کی روشنی میں

معاشرتی اور مجلسی دائرے میں قبہ خانوں کی اہمیت۔

دروع گورا حافظہ باشد۔۔۔ جدید سائنسی تحقیق

بچوں میں قتل و غارت گری کے فطری رجحانات۔۔۔ سیادت پر سیر حاصل تبرہ

دنیا کے خوفناک ڈاکو اور لقتار مذہب

اشتہار بھی کم عجیب و غریب نہیں تھے۔ ان میں مشتہر کنام اور پتا نہیں ہوتا تھا۔ سرخیاں دے کر مطلب کی بات مختصر لفظوں میں ادا کر دی جاتی تھی۔ چند سرخیاں ملاحظہ ہوں۔

چوری کے زیورات خریدنے سے پہلے ہمارا نشان ضرور دیکھ لیا کریں۔ جو کھرے مال کی ضمانت ہے۔

بیک مارکیٹ میں صرف اسی فلم کے ٹکٹ فروخت کیے جاتے ہیں جو تفریح کا بہترین سامان پیش کرتا ہے۔

دودھ میں کن طریقوں سے ملاوٹ کی جاتی ہے۔ رسالہ دودھ کا دودھ کا پانی کا پانی مطالعہ فرمائیے۔

ٹونے، ٹوٹکے، گندے اور تعویز، عمل ہزار اور تنخیر محبوب کے جنتر منتر سب جھوٹے ہیں۔ خود کو دھو کا دینے کے بجائے معشوق کو دھو کا دیجیے۔

کھانے پینے کی صرف وہ چیزیں خیریدیے جن میں ضرر رساں چیزوں کی ملاوٹ نہ ہو۔

ایک الگ کالم میں ”بیک مارکیٹ کے آج کے بھاؤ“ کے عنوان تلے ان تمام چیزوں کی کنٹرولڈ قیمت درج ہوتی تھی جو صرف بیک مارکیٹ سے دستیاب ہوتی تھیں۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ان قیمتوں میں ایک پائی کی بھی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ جوچھے چوری، چوری کا خاص نشان لگایا ہوا مال خریدتے تھے انھیں ارزاز قیمت پر سولہ آنے کھرا مال ملتا تھا۔

غندوں، چوروں اور بد کاروں کی انجمن جب آہستہ آہستہ نیک نامی حاصل کرنے لگی تو اربابِ بست و کشاد کی تشویش دوچند ہو گئی۔ حکومت نے اپنی طرف سے خفیہ طور پر بہت کوشش کی کہ اس کے اڑے کا سراغ لگائے مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ یو نین کی تمام سرگرمیاں زیر زمین یعنی انڈر گراونڈ تھیں۔ اوچی سوسائٹی کے چند اراکین کا خیال تھا کہ پولیس کے بعض بد مقاش افسروں یو نین سے ملے ہوئے ہیں بلکہ اس کے باقاعدہ ممبر ہیں اور ہر ماہ اپنی ناجائز ذرائع سے پیدا کی ہوئی آمدنی کا پیشتر حصہ بطور جزیے کے دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قانون کا نشرت معاشرے کے اس نہایت ہی مہلک پھوٹے تک نہیں پہنچ سکا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر یہ بات قبل غور تھی کہ عوام میں جو اس یو نین کے قیام سے بے چینی پھیلی تھی اب بالکل مفقود تھی۔ متوسط طبقہ اس کی سرگرمیوں میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔ صرف اوچی سوسائٹی تھی جو دن بدن خائف ہوتی جا رہی تھی۔

اس یو نین کے خلاف یوں تو آئے دن تقریریں ہوتی تھیں اور جگہ جگہ جلسے منعقد ہوئے تھے، مگر اب وہ پہلا ساجوش و خروش نہیں تھا۔ چنانچہ اس کو اس نو شدید بنانے کے لیے ٹاؤن ہال میں ایک عظیم الشان جلسے کے انعقاد کا اعلان کیا گیا۔ قریب قریب ہر شہر کی معزز

ہستیوں کو نامانندگی کے لیے مدعو کیا گیا۔ مقصد اس جلسے کا یہ تھا کہ اتفاق رائے سے غنڈوں، شہدوں اور بدقاروں کی اس یونین کے خلاف مذمت کا ووٹ پاس کیا جائے اور عوامِ الناس کو ان خوفناک جراثیم سے کما حلقہ آگاہ کیا جائے جو اس کے وجود سے معاشرتی و مجلسی دائرے میں پھیل چکے ہیں اور بڑی سرعت سے پھیل رہے ہیں۔

جلسے کی تیاری پر ہزاروں روپے خرچ کیے گئے۔ مجلسِ انتظامیہ اور مجلسِ استقبالیہ نے مندوین کے آرام و آسائش کے لیے ہر ممکن سہولت مہیا کی۔ کئی اجلاس ہوئے اور بڑے کامیاب رہے۔ ان کی روپوٹ یونین کے پرچوں میں من و عن شائع ہوتی رہی۔ مذمت کے جتنے ووٹ پاس ہوئے بلا تبصرہ چھپتے رہے۔ دونوں اخباروں میں ان کو نمایاں جگہ دی جاتی تھی۔

آخری اجلاس بہت اہم تھا۔ ملک کی تمام مکرم و معظم ہستیاں جمع تھیں۔ امراء و وزراء سب موجود تھے۔ حکومت کے اعلیٰ اعلیٰ افسر بھی مدعو تھے۔ بڑے زور دار الفاظ میں تقریریں ہوئیں اور مذہبی، مجلسی، معاشی، جمالیاتی اور نفسیاتی، غرض کے ہر ممکن نقطہ نظر سے غنڈوں اور بدمعاشوں کی تنظیم کے خلاف دلائل و برائین پیش کیے گئے اور ثابت کر دیا گیا کہ اس طبقہ اسفل کا وجود حیاتِ انسانی کے حق میں زہر قاتل ہے۔ مذمت کا آخری ریزو لیشن جو بڑے باثر الفاظ پر مشتمل تھا، اتفاق رائے سے پاس ہوا تو ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ جب تھوڑا سکون ہوا تو پہلے بچوں میں ایک شخص کھڑا ہوا۔ اس نے صدر سے مخاطب ہو کر کہا، ”صاحب صدر، اجازت ہو تو میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔“

سارے ہال کی نگاہیں اس آدمی پر جگئیں۔ صدر نے بڑی تمکنت سے پوچھا، ”میں پوچھ سکتا ہوں آپ کون ہیں؟“ اس شخص نے جو بڑے سادہ مگر خوش وضع کپڑوں میں مبوس تھا، تعظیم کے ساتھ کہا، ”ملک و ملت کا ایک ادنیٰ ترین خادم“ اور کورنش بجالایا۔ صدر نے چشمہ لگا کر اسے غور سے دیکھا اور پوچھا، ”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ اس معما نام مرد نے مسکرا کر کہا، ”کہ۔۔۔ ہم بھی منه میں زبان رکھتے ہیں۔“ اس پر سارے ہال میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ڈائس پر خصوصاً سب کے سب معززیں اور قائدین سوالیہ نشان بن کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

صدر نے اپنی تمکنت کو ذرا اور تمکین بنانے کا پوچھا، ”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

”میں ابھی عرض کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک بے داعن سفید رومال نکالا۔ اپنا منہ صاف کیا اور اسے واپس جیب میں رکھ کر بڑے پار لیمانی انداز میں گویا ہوا، ”صاحب صدر اور معزز حضرات---“ ڈائس کے ایک طرف دیکھ کر وہ رک گیا، ”معافی کا طلب گار ہوں--- محترمہ بیگم مرزا بن خلافِ معمول آج پچھلے صوفے پر تشریف فرمائیں--- صاحب صدر، خاتونِ مکرم اور معزز حضرات!“

بیگم مرزا بن نے دے نیستی بیگ میں سے آئینہ نکال کر اپنا میک اپ دیکھا اور غور سے سننے لگی۔ باقی بھی ہمہ تن گوش تھے۔

”حریفِ مطلب مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز“

پچھے دیر رک کر وہ ایک ادا سے مسکرا یا۔ ”حضرت غالب---! اس اجلاس میں اور اس سے پہلے مجلسی دائرے کے ایک مفروضہ طبقہ اسفل کے بارے میں جو زہر فشانی کی گئی ہے، آپ کے اس خاکسار نے بڑے غور سے سنی ہے۔ ”سارے ہال میں کھسپھسہ ہونے لگی۔ صدر کی ناک کے بانے پر چشمہ پھسل گیا، ”آپ ہیں کون؟“ سر کے ایک ہلکے سے خم کے ساتھ اس شخص نے جواب دیا، ”ملک و ملت کا ایک ادنی خادم--- مجلسی دائرے کے مفروضہ طبقہ اسفل کی جماعت کا ایک رکن ہے اس کی نمائندگی کا فخر حاصل ہے!“

ہال میں کسی نے زور سے ”واہ“ کہا اور تالی بجائی۔ چوروں، اچکوں اور غنڈوں کی یونین کے نمائندے نے سر کو پھر بلکی سی جنبش دی اور کہنا شروع کیا، ”کیا عرض کروں۔ پچھہ کہا نہیں جاتا۔

وال گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

اس اجلاس میں اس جماعت کے خلاف جس کا یہ خاکسار نمائندہ ہے اس قدر گالیاں دی گئی ہیں، اس قدر لعنت ملامت کی گئی ہے کہ صرف اتنا کہنے کو جی چاہتا ہے

لو وہ بھی کہتے ہیں یہ بے نگ و نام ہے۔“

صاحب صدر، محترم بیگم مرزبان اور معزز حضرات!

بیگم مرزبان کی لپ اسٹک مسکرائی۔ بولنے والے نے آنکھیں اور سر جھکا کر تسلیم عرض کیا، ”محترم بیگم مرزبان اور معزز حضرات--- میں جانتا ہوں کہ یہاں میری جماعت کا کوئی ہمدرد موجود نہیں۔ آپ میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو ہمارا طرف دار ہو۔

دوست گر کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری
نہ سہی ایک تمنانے دوا ہے تو سہی۔“

ڈاکس پر ایک اچکن پوش رینیس گلے میں پان دبا کر بولے، ”مکر!“

صدر نے جب ان کی طرف سرزنش بھری نظروں سے دیکھا تو وہ خاموش ہو گئے۔

چوروں اور بد کاروں کی یونین کے نمائندے کے پتلے پتلے ہو نٹوں پر شفاف مسکراہٹ نمودار ہوئی، ”میں اپنی مختصریر تقریر میں جو شعر بھی استعمال کروں گا۔۔۔ حضرت غالب کا ہو گا!“

بیگم مرزبان نے بڑے بھولپن سے کہا، ”آپ تو بڑے لائق معلوم ہوتے ہیں۔“ بولنے والا کورنش بجایا لیا اور مسکرا کر کہنے لگا،

”سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصویری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے!“

ساراہال قہقہوں اور تالیوں سے گوچھ اٹھا۔ بیگم مرزبان نے اٹھ کر صدر کے کان میں کچھ کہا جس نے حاضرین کو چپ رہنے کا حکم دیا۔ خاموشی ہوئی تو چوروں اور لفگلوں کی یونین کے نمائندے پھر بولنا شروع کیا، ”صاحب صدر، محترم بیگم مرزبان اور معزز حضرات! گرچہ ہے کس کس برائی سے دلے با ایں ہمہ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

لیکن سچ پوچھیے تو اس سے تسلی نہیں ہوتی۔ میں تاسف کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس طبقے کے ساتھ جس کی نمائندگی میری جماعت کرتی ہے نہایت بے انصافی ہوئی ہے۔ اس کو اب تک بالکل غلط رنگ میں دیکھا جاتا رہا ہے اور یہی کوشش کی جاتی رہی کہ اسے ملعون و مطعون قرار دے کر خارج از سماج کر دیا جائے۔ میں ان مطہر ہستیوں کو کیا کہوں جنہوں نے اس شریف اور معزز طبقے کو سنگسار کرنے کے لیے پتھر اٹھائے ہیں

آتش کدھ ہے سینہ مر اڑ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے۔

صدر نے دفعتاً گرج کر کہا، ”خاموش۔۔۔ بس اب آپ کو مزید بولنے کی اجازت نہیں ہے۔“ مقرر نے مسکرا کر کہا، ”حضرت غالب کی اسی غزل کا ایک شعر ہے،

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستم گر
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ صدر نے اجلاس برخاست کرنا چاہا مگر لوگوں نے کہا کہ نہیں چوروں اور غنڈوں کی یونین کے نمائندے کی تقریر ختم ہو جائے تو کارروائی بند کی جائے۔ صدر اور دوسرے اراکین اجلاس نے پہلے آمدگی ظاہرنہ کی لیکن بعد میں رائے عامہ کے سامنے انھیں جھکنا پڑا۔ مقرر کو بولنے کی اجازت مل گئی۔

اس نے صاحب صدر کا مناسب و موزوں الفاظ میں شکریہ ادا کیا اور کہنا شروع کیا، ”ہماری یونین کو صرف اس لیے نفرت و تحیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ یہ چوروں، اٹھائی گیروں، رہزوں اور ڈاکوؤں کی انجمن ہے جو ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے قائم کی گئی ہے۔ میں آپ لوگوں کے جذبات بخوبی سمجھتا ہوں۔ آپ کافوری رد عمل کس قسم کا تھا، میں اس کا تصور بھی کر سکتا ہوں، مگر چوروں، ڈاکوؤں اور رہزوں کے حقوق کیا نہیں ہوتے؟ یا نہیں ہو سکتے؟ میں سمجھتا ہوں کوئی سلیم الدماغ آدمی ایسا نہیں سوچ سکتا۔۔۔ جس طرح سب سے پہلے انسان ہیں، بعد میں سیٹھ ہیں، رئیس اعظم ہیں، میونسل کمشنر ہیں، وزیر داخلہ ہیں یا خارجہ۔ اسی طرح وہ بھی سب سے پہلے آپ ہی کی طرح انسان ہے۔ چور، ڈاکو، اٹھائی گیر، جیب کتر اور بلیک مار کیٹر بعد میں ہے۔ جو حقوق دوسرے انسانوں کو اس سقفِ نیلو فری کے نیچے مہیا ہیں، وہ اسے بھی مہیا اور ہونے چاہئیں۔ جن نعمتوں سے دوسرے انسان ممتنع ہوتے ہیں ان سے وہ بھی مستغصیض ہونے کا حق رکھتا ہے۔

میں یہ سمجھتے سے قاصر ہوں کہ ایک چور یا ڈاکو کیوں شے لطیف سے خالی سمجھا جاتا ہے۔ کیوں اسے ایک ایسا شخص متصور کیا جاتا ہے جو معمولی حیات سے بھی عاری ہے۔۔۔ معاف فرمائیے وہ اچھا شعر سن کر اسی طرح پھر کاٹھتا ہے جس طرح کوئی دوسرا سخن فہم۔ صحیح بناس اور شام اودھ سے صرف آپ ہی لطف انداز نہیں ہوتے۔ وہ بھی ہوتا ہے۔ سرتال کی اس کو بھی خبر ہے۔ وہ صرف پولیس کے ہاتھوں ہی گرفتار ہونا نہیں جانتا۔ کسی حسینہ کے دام الفت میں گرفتار ہونے کا سلیقہ بھی جانتا ہے۔ شادی کرتا ہے، بچ پیدا کرتا ہے۔ ان کو چوری سے منع کرتا ہے۔ جھوٹ بولنے سے روکتا ہے۔۔۔ خدا نخواستہ اگر ان میں سے کوئی مر جائے تو اس کے دل کو بھی صدمہ پہنچتا ہے۔ ”یہ کہتے ہوئے اس کی آواز کسی قدر گلور گیر ہو گئی۔ لیکن فوراً ہی اس نے رخ بدلا اور مسکراتے ہوئے کہا، ”حضرت غالب کے اس شعر کا جو مزادہ لے سکتا ہے، معاف کبھی آپ میں سے کوئی بھی نہیں لے سکتا۔

نہ لشنا دن کو توکب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھکانہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہن کو!

سارا ہاں شگفتہ ہو کر ہٹنے لگا۔ بیگم مر زبان بھی جو تقریر کے آخری حصے پر کچھ افسرده سی ہو گئی تھیں مسکرائیں، مقرر نے اسی طرح پتی پتی شفاف مسکراہٹ کے ساتھ کہنا شروع کیا، ”مگر اب ایسے دعا دینے والے کہاں!“ بیگم مر زبان نے بڑے بھولپن کے ساتھ آہ بھر کر کہا، ”اور وہ رہن بھی کہاں؟“

مقرر نے تسلیم کیا، ”آپ نے بجا ارشاد فرمایا بیگم مر زبان۔“ میں اس افسوس ناک حقیقت کا کامل احساس ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم نے مل کر اپنی انجمن بناؤالی ہے۔ مرور زمانہ کے ساتھ رہن، چور اور جیب کترے قریب قریب سب اپنی پرانی روشن اور وضع داری بھول گئے ہیں۔ لیکن مقام مسرت ہے کہ وہ اب بہت تیزی سے اپنے اصل مقام کی طرف لوٹ رہے ہیں۔۔۔ لیکن میں ان حضرات سے جوان غریبوں کی بیخ کنی میں مصروف ہیں یہ گتاخانہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی اصلاح کے لیے اب تک انہوں نے کیا کیا ہے۔ مجھے کہنا تو نہیں چاہیے مگر مقابل کے لیے کہنا پڑتا ہے کہ ہمیں نہایت ذلیل، چوری اور سفاک ڈاکو کہا جاتا ہے، گروہ لوگ کیا ہیں۔۔۔ کچھ اس عالت مرتبہ ڈاکس پر بھی بیٹھے ہیں جو عوام کا مال و متناع دونوں ہاتھوں سے لوٹتے رہے ہیں۔“

ہال میں ”شیم شیم“ کے نعرے بلند ہوئے۔

مقرر نے کچھ تو قف کے بعد کہنا شروع کیا۔ ”ہم چوری کرتے ہیں، ڈاکے ڈالتے ہیں، مگر اسے کوئی اور نام نہیں دیتے۔ یہ معزز ہستیاں بدترین قسم کی ڈاکہ زنی کرتی ہیں مگر یہ جائز سمجھتی ہے۔ اپنی آنکھ کے اس طویل و عریض اور بھاری بھر کم شہتیر کو کوئی نہیں دیکھتا اور نہ دیکھنا چاہتا ہے۔۔۔ کیوں۔۔۔؟ یہ بڑا گستاخ سوال ہے۔ میں اس کا جواب سننا چاہتا ہوں چاہے وہ اس سے بھی زیادہ گستاخ ہو۔۔۔“

تحوڑے تو قف کے بعد وہ مسکرا یا، ”وزیر صاحب ان اپنی مندرجہ وزارت کی سان پر اسٹرائیز کر کے ملک کی ہر روز جامت کرتے رہیں۔ یہ کوئی جرم نہیں، لیکن کسی کی جیب سے بڑی صفائی کے ساتھ بُوہ چرانے والا قابل تحریر ہے۔۔۔ تعزیر کو چھوڑ دیئے مجھے اس پر کوئی زیادہ اعتراض نہیں۔۔۔ وہ آپ کی نظر وہ میں گردان زدنی ہے۔“

ڈائس پر بہت سے حضرات بے چینی اور اضطراب محسوس کرنے لگے۔۔۔ بیگ مرزاں مسرور تھیں۔

مقرر نے اپنا گلا صاف کیا، پھر کہنا شروع کیا، ”تمام محکموں میں اوپر سے لے کر نیچے تک رشوت ستانی کا سلسلہ قائم ہے، یہ کسے معلوم نہیں۔ کیا یہ بھی کوئی راز ہے جس کے اکشاف کی ضرورت ہے کہ خویش پروری اور کنبہ نوازی کی بدولت سخت نااہل، خردماغ اور بد مقاش بڑے بڑے عہدے سننجالے بیٹھے ہیں۔ معاف فرمائیے گا ادھر ہمارے طبقے میں ایسے افسوس ناک حالات موجود نہیں۔ کوئی چورا پنے کسی عزیز کو بڑی چوری کے لیے منتخب کرے گا۔ ہمارے ہاں لوگ اس قسم کی رعائتوں سے فائدہ اٹھانا بھی چاہیں تو نہیں اٹھاسکتے۔ اس لیے کہ چوری کرنے، جیب کاٹنے یا ڈاکہ ڈالنے کے لیے دل گردے اور مہارت و قابلیت کی ضرورت ہے۔ یہاں کوئی سفارش کام نہیں آتی۔ ہر شخص کا کام ہی خود اس کا امتحان ہے جو اس کو فوراً نتیجے سے باخبر کر دیتا ہے۔“

ہال میں سب خاموش تھے اور بڑے غور سے تقریر سن رہے تھے۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد مقرر کی آواز پھر بلند ہوئی، ”میں بدکاری معاف کر سکتا ہوں۔ لیکن خام کاری ہر گز ہرگز معاف نہیں کر سکتا۔۔۔ وہ لوگ یقیناً قبل مو اخذہ ہیں جو نہایت ہی بھونڈے طریقے پر ملک کی دولت کو لوٹتے ہیں۔ ایسے بھونڈے طریقے پر کہ ان کے کروتوں کے بھانڈے ہر دوسرے روز چورا ہوں میں پھوٹتے ہیں۔ وہ کپڑے جاتے ہیں مگر فیکٹے ہیں کہ ان کے نام و نمبر کے بستے الف میں درج ہیں نہ بستے ب میں۔۔۔ یہ کس قدر نا انصافی ہے۔۔۔ میں تو سمجھتا ہوں بیچارے انصاف کا۔۔۔ اندھے انصاف کا خون بیکیں پر ہوتا ہے۔۔۔ نہیں۔۔۔ ایسے اور بھی کئی مقتل ہیں۔ جہاں انصاف، انسانیت، شرافت و نجابت، تقدیس و طہارت، دین و نیا، سب کو ایک پہنچے میں ڈال کر ہر روز پھانسی دی جاتی ہے۔۔۔ میں پوچھتا ہوں انسانوں کی خام کھالوں کی تجارت کرنے والے ہم ہیں یا آپ۔۔۔ میں سوال کرتا ہوں، از منہ عقیق کی برابریت کی طرف امن پسند انسانوں کو کشاں

کشاں کچنگ کر لے جانے والے ہم ہیں یا آپ--- اور استفسار کرتا ہوں کہ دوسری اجناس کی طرح ملاٹ کر کے اپنے ایمان کو آپ بیچتے ہیں یا ہم؟“

ہال پر قبر کی سی خاموشی طاری تھی۔ مقرر نے جیب سے اپنا سفید رومال نکال کر منہ صاف کیا اور اسے ہوا میں لہرا کر کہا، ”صاحب صدر، خاتون مکرم اور معزز حضرات! مجھے معاف فرمائیے کہ میں ذرا جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ عرض ہے کہ جدھر نظر اٹھائی جائے۔ ایمان فروش ہوتا ہے یا ضمیر فروش، وطن فروش ہوتا یا ہے ملت فروش۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بھی کوئی فروخت کرنے کی چیزیں ہیں۔ انسان تو انھیں نہایت ہی مشکل وقت میں ایک لمحے کے لیے گروئی نہیں رکھ سکتا۔ مگر میں انسانوں کی بات کر رہا ہوں۔ معاف کیجیے۔ میرے لمحے میں پھر تنخی پیدا ہو گئی

رکھیو غالب مجھے اس تنخ نوائی سے معاف آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے۔

یہ کہتا وہ ڈاکس کی طرف بڑھا، ”صاحب صدر، محترم بیگم مر زبان اور معزز حضرات! میں اپنی یونین کی طرف سے آپ کا سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے لب کشاں کا موقعہ دیا۔“ ڈاکس کے پاس پہنچ کر اس نے صدر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”میں اب ایک دوست کی حیثیت سے رخصت چاہتا ہوں۔“

صدر نے پہنچاتے ہوئے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد اس نے بیگم مر زبان کی طرف ہاتھ بڑھایا، ”اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔۔۔“

بیگم مر زبان نے بڑے بھولپن سے اپنا ہاتھ پیش کر دیا۔ باقی معززین اور رؤسائے ہاتھ ملا کر جب فارغ ہوا تو خدا حافظ کہہ کر چلنے لگا۔ لیکن فوراً ہی رک گیا۔ اپنی دونوں جیبوں سے اس نے بہت سی چیزیں نکالیں اور صدر کی میز پر ایک ایک کر کے رکھ دیں۔ پھر وہ مسکرایا، ”ایک عرصے سے جیب تراشی چھوڑ چکا ہوں آج کل سیف توڑنا میرا پیشہ ہے۔۔۔ آج صرف از راہ تفریح آپ لوگوں کی جیبوں پر ہاتھ صاف کر دیا۔“ یہ کہہ کر وہ بیگم مر زبان سے مخاطب ہوا، ”خاتون مکرم معاف کیجیے۔ آپ کے ویسیٹی بیگ سے بھی میں نے ایک چیز نکالی تھی۔ مگر وہ ایسی ہے کہ سب کے سامنے آپ کو واپس نہیں کر سکتا۔“

اور وہ تیزی کے ساتھ ہال سے باہر نکل گیا۔

-[70]-

خود کشی کا اقدام: سعادت حسن منشو

اقبال کے خلاف یہ الزام تھا کہ اس نے اپنی جان کو اپنے ہاتھوں ہلاک کرنے کی کوشش کی، گوہ اس میں ناکام رہا۔ جب وہ عدالت میں پہلی مرتبہ پیش کیا گیا تو اس کا چہرہ بدلی کی طرح زرد تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موت سے مذہبی ہوتے وقت اس کی رگوں میں تمام خون خشک ہو کر رہ گیا ہے جس کی وجہ سے اس کی تمام طاقت سلب ہو گئی ہے۔

اقبال کی عمر بیس بائیس برس کے قریب ہو گی مگر مر جھائے ہوئے چہرے پر کھنڈی ہوئی زردی نے اس کی عمر میں دس سال کا اضافہ کر دیا تھا اور جب وہ اپنی کمر کے پیچھے ہاتھ رکھتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ واقعی بوڑھا ہے۔ سنگیا ہے کہ جب شباب کے ایوان میں غربت داخل ہوتی ہے تو تازگی بھاگ جایا کرتی ہے۔ اس کے پیچے پرانے اور میلے کچیلے کپڑوں سے یہ عیاں تھا کہ وہ غربت کا شکار ہے اور غالباً حد سے بڑھی ہوئی مفلسوں ہی نے اسے اپنی پیاری جان کو ہلاک کرنے پر مجبور کیا تھا۔

اس کا قد کافی لمبا تھا جو کاندھوں پر زرا آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اس جھکاؤ میں اس کے وزنی سر کو بھی دخل تھا جس پر سخت اور موٹے بال، جیل خانے کے سیاہ اور کھر درے کمبل کا نمونہ پیش کر رہے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں جو بہت گہری اور اتحاد معلوم ہوتی تھیں۔ جھکی ہوئی نگاہوں سے یہ پتا چلتا تھا کہ وہ عدالت کے سینگین فرش کی موجودگی کو غیر لقینی سمجھ رہا ہے اور یہ ماننے سے انکار کر رہا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ ناک پتلی اور تیکھی، اس کے ماتھے پر تھوڑا سا چکنا میل جما ہوا تھا جس کو دیکھ کر زنگ آلو تلوار کا تصور آنکھوں میں پھر جاتا تھا۔ پتلے پتلے ہونٹ جو کناروں پر ایک لکیر بن کر رہ گئے تھے، آپس میں سلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ شاید اس نے ان کو اس لیے بھیجنے رکھا تھا کہ وہ اپنے سینے کی آگ اور دھونکیں کو باہر نکالنا نہیں چاہتا تھا۔

میلے پائچجاءے میں اس کی سوکھی ہوئی ٹانگیں اوپر کے دھڑکے ساتھ اس طرح جڑی ہوئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا دو خشک لکڑیاں تور کے منہ میں ٹھنڈی ہوئی ہیں۔ سینہ چڑا چکلا تھا مگر بڈیوں کے ڈھانچے پر، جس کی پسلیاں پھٹے ہوئے گریبان میں سے جھانک رہی تھیں، گوشت سانوں لے رنگ کی جملی معلوم ہوتا تھا، سانس کی آمد و شد سے یہ جملی بار بار پھولتی اور دہنی تھی۔

پیروں میں کپڑے کا جاپانی جوتا تھا جو جگہ جگہ سے بے حد میلا ہوا تھا۔ دونوں جو تے انگوٹھوں کے مقام پر سے پھٹے ہوئے تھے۔ ان سوراخوں میں سے اس کے انگوٹھوں کے بڑھے ہوئے ناخن نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔ وہ کوٹ پہنچے ہوئے تھا جو اس کے بدن پر بہت ڈھیلا تھا، اس میلے اور سال خوردہ کوٹ کی خالی پھٹی ہوئی جیسیں بے جان مردوں کی طرح منہ کھولے ہوئے تھیں۔

وہ کٹھرے کے ڈنڈے پر ہاتھ رکھے اور سرجھ کائے نجح کے سامنے بالکل خاموش اور بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

”تم نے ۲۰ جون کو ہفتے کے دن ماناوالہ اسٹیشن کے قریب ریل کی پٹری پر لیٹ کر اپنی جان ہلاک کرنے کی کوشش کی اور اس طرح ایک شدید جرم کے مرتكب ہوئے۔“ نجح نے ضمنی کاغذات پڑھتے ہوئے کہا، ” بتاؤ، یہ جرم جو تم پر عائد کیا گیا ہے کہاں تک درست ہے؟“

” جرم!“ اقبال اپنے گھرے خواب سے گویا چونک ساپڑا لیکن فوراً ہی اس کا وزنی سرجو ایک لمحے کے لیے اٹھا تھا، پھر بیل کی تلی ٹھنک کے بو جھل پھل کی طرح لٹک گیا۔

” بتاؤ، یہ جرم جو تم پر عائد کیا گیا ہے کہاں تک درست ہے؟“ نجح نے سکول کے استاد کی طرح وہی سوال دھرا جو وہ اس سے پہلے ہزارہا لوگوں سے پوچھ چکا تھا۔ اقبال نے اپنا سراٹھا یا اور نجح کی طرف اپنی بے حس آنکھوں سے دیکھنا شروع کر دیا، پھر تھوڑی دیر کے بعد دھیمے لمحے میں کہا، ” میں نے آج تک کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔“

عدالت کے کمرے میں کامل سکوت طاری تھا، شاید اس کا باعث اقبال کا داشت نما سر اپا تھا جس میں بلاکی ہیبت تھی، نجح اس کی نگاہوں کے خوف ناک خلاسے خوف کھارا تھا۔ کورٹ انسپکٹر نے، جو جنگل سے باہر بلند کر سی پر بیٹھا تھا، کمرے کے سکوت کے دھشت ناک اثر کو دور کرنے کے لیے یوں ہی دو تین مرتبہ اپنا گلا صاف کیا۔ ریڈر نے، جو پلیٹ فارم پر بکھے ہوئے تخت پر، نجح کے قریب بیٹھا تھا، مثلوں کے کاغذات ادھر ادھر رکھتے ہوئے اپنی پریشانی اور ڈر در کرنے کی سعی کی۔

نجح نے ریڈر کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور ریڈر نے کورٹ انسپکٹر کی طرف اور کورٹ انسپکٹر جواب میں اپنا حلق صاف کرنے کے لیے دو مرتبہ کھانسا۔ جب کمرے کا خوف آمیز سکوت ٹوٹا تو نجح نے میز پر کہنیاں ٹکا کر سامنے پڑے ہوئے قلم دان کے ایک خانے میں سے لوہے کی چمکتی ہوئی پن کمال کر اپنے دانتوں کی رنخ میں گاڑتے ہوئے اقبال سے کہا، ” کیا تم نے خود کشی کا اقدام کیا تھا؟“

”جی ہاں!“ یہ جواب اقبال نے ایسے لمحے میں دیا کہ اس کی آواز ایک لرزائی سرگوشی معلوم ہوئی۔ نج نے فوراً ہی کہا، ”تو پھر اپنے جرم کا اقبال کرتے ہو؟“

”جرم!“ وہ پھر چونک پڑا اور تیز لمحے میں بولا، ”آپ کس جرم کا ذکر کر رہے ہیں؟ اگر کوئی خدا ہے تو وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میں ہمیشہ اس سے پاک رہا ہوں۔“

نج نے اپنے لبوں پر زور دے کر ایک بیمار مسکراہٹ پیدا کی، ”تم نے خود کشی کا اقدام کیا اور یہ جرم ہے۔ اپنی یا کسی غیر کی جان لینے میں کوئی فرق نہیں۔ ہر صورت میں وار انسان پر ہوتا ہے۔“

اقبال نے جواب دیا، ”اس جرم کی سزا کیا ہے؟ یہ کہتے ہوئے اس کے پتلے ہونٹوں پر ایک طنزیہ تبسم ناج رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سان پر چاٹو کی دھار تیز کرتے وقت چگاریوں کی پھوار گر رہی ہے۔ نج نے جلدی سے کہا، ”ایک دو یا تین ماہ کی قید۔۔۔“

اقبال نے یہی لفظ تول تول کر دھرانے، گویا وہ اپنے پستول کے میگزین کی نام گولیوں کو بڑے اطمینان سے ایک نشانے پر خالی کرنا چاہتا ہے، ”ایک دو یا تین ماہ کی قید۔۔۔!“ یہ لفظ دھرانے کے بعد وہ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد تیز و تندر لمحے میں بولا، ”آپ کا قانون صریحًا موت کو طویل بنانا چاہتا ہے، ایک آدمی جو چند لمحات کے اندر اپنی دکھ بھری زندگی کو موت کے سکون میں تبدیل کر سکتا ہے آپ اسے مجبور کرتے ہیں وہ کچھ عرصے تک اور دکھ کے تلخ جام پیتا ہے۔ جو آسمان سے گرتا ہے آپ اسے کھجور پر لٹکا دیتے ہیں، آگ سے نکال کر کڑا ہی میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ کیا قانون اسی ستم طریقی کا نام ہے؟“

نج نے بارہ بار عرب لمحے میں جواب دیا، ”عدالت ان فضول سوالات کا جواب نہیں دے سکتی۔“

”عدالت ان فضول سوالات کا جواب نہیں دے سکتی، تو بتائیے وہ کن متین اور سخیدہ سوالوں کا جواب دے سکتی ہے؟“ اقبال کے ماتھے پر پسینے کے سرد قطرے لرزنے لگے، ”کیا عدالت بتا سکتی ہے کہ عدالت کے معنی کیا ہیں؟ کیا عدالت بتا سکتی ہے کہ جوں اور مسجد کے ملاوں میں کیا فرق ہے جو مرنے والوں کے سرہانے رٹی ہوئی سورہ پیغمبر کی تلاوت کرتے ہیں؟ کیا عدالت بتا سکتی ہے کہ اس کے قوانین اور مٹی کے کھلونوں میں کیا فرق ہے۔۔۔؟ عدالت اگر ان فضول سوالوں کا جواب نہیں دے سکتی تو اس سے کہیے کہ وہ ان معقول سوالوں کا جواب دے؟“

نج کے تیروں پر خفگی کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے تیزی سے کہا، ”اس قسم کی بے باکانہ گفتگو عدالت کی توجیہ ہے جو ایک سنگین جرم ہے۔“

اقبال نے کہا، ”تو گفتگو کا کوئی ایسا انداز بتائیے جس سے آپ کی نیک چلن عدالت کی توجیہ نہ ہو۔“

نج نے جھلا کر جواب دیا، ”جو سوال تم سے کیا جائے صرف اسی کا جواب دو، عدالت تمہاری تقریر سننا نہیں چاہتی۔“

”پوچھیے! آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“ اقبال کے چہرے پر یاس کی آواز اس گجر کی ڈومتی ہوئی گونج معلوم ہوتی تھی جورات کی تاریکیوں میں لوگوں کو وقت سے باخبر رکھتا ہے۔ یہ سوال کچھ اس انداز سے کیا گیا تھا کہ نج کے چہرے پر گھبراہٹ سی پیدا ہو گئی اور اس نے ایسے ہی میز پر سے کاغذات اٹھائے اور پھر وہیں کے وہیں رکھ دیئے اور دانت کی رخ میں سے پن کال کر، پن کشن میں گاڑتے ہوئے کہا، ”تم نے اپنی جان لینے کی کوشش کی اس لیے تم ازروئے قانون مستوجب سزا ہو۔ کیا اپنی صفائی میں تم کوئی بیان دینا چاہتے ہو؟“

اقبال کے بے جان اور نیلے ہونٹ فرط حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اس نے کہا، ”بیان! آپ کس قسم کا بیان لینا چاہتے ہیں؟ کیا میں سر اپا بیان نہیں ہوں۔۔۔؟ کیا میرے گالوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں یہ بیان نہیں دے رہیں کہ غربت کی دیکھ میرے گوشت کو چاٹتی رہی ہے۔۔۔؟ کیا میری بے نور آنکھیں یہ بیان نہیں دے رہیں کہ میری زندگی کی بیشتر اتنی لکڑی اور تیل کے دھوکیں کے اندر گزری ہیں؟ کیا میر اس کھا ہوا جسم یہ بیان نہیں دے رہا کہ اس نے کڑے سے کڑاد کھبر داشت کیا ہے۔۔۔؟ کیا میری زرد بے جان اور کانپتی ہوئی انگلیاں یہ بیان نہیں دے رہیں کہ وہ ساز حیات کے تاروں میں امید افزانگہ پیدا کرنے میں ناکام رہی ہیں۔۔۔؟ بیان۔۔۔!

بیان۔۔۔! صفائی کا بیان۔۔۔! کس صفائی کا بیان۔۔۔؟ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا خاتمه کر رہا تھا اس لیے کہ مجھے جینے کی خواہش نہ تھی اور جسے جینے کی خواہش نہ ہو، جو ہر جینے والے کو تجھ سے دیکھتا ہو، کیا آپ اس سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ اس سنگین عمارت میں آکر دو تین برس کی قید سے بچنے کے لیے جھوٹ بولے۔۔۔؟ نج صاحب آپ اس سے بات کر رہے ہیں جس کی زندگی قید سے بدتر رہی ہے!“

نج پر زرد رو اقبال کی بے جوڑ جذباتی لگنگو کچھ اثر نہ کر سکی اور چار پانچ پیشیوں کی یک آہنگ سماعت کے بعد اسے دو ماہ قید محض کا حکم سنادیا گیا۔ سزا کا حکم مجرم نے بڑے اطمینان سے سنائیں یا کیا اس کے استخوانی چہرے پر زہر میلے طنز کے آثار نمودار ہوئے اور اس کے باریک ہونٹوں کے سرے بھنج گئے، مسکراتے ہوئے اس نے نج کو مخاطب کر کے کہا:

”آپ نے مقدمے کی تمام کارروائی میں بہت محنت کی ہے جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ مقدمہ کی روئنداد کو آپ نے جس نفاست سے ان لمبے کاغزوں پر اپنے ہاتھوں سے ٹائپ کیا ہے وہ بھی داد کے قابل ہے اور آپ نے بات بات میں تحریرات کی بھاری بھر کم کتاب سے دفعات کا حوالہ جس پھر تی سے دیا ہے اس سے آپ کے حافظے کی خوبی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ قانون، جہاں تک میں نے اندازہ کیا ہے، ایک پر دہ نشین خاتون ہے جس کی عصمت کے تحفظ کے لیے آپ لوگ مقرر کیے گئے ہیں اور مجھے اعتراف ہے کہ آپ نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ آپ ایک ایسی عورت کی حفاظت کر رہے ہیں جسے ہر چالاک آدمی اپنی داشتہ بنانے کر سکتا ہے۔“

یہ لفظ عدالت کی توہین خیال کیے گئے اور اس جرم کے ارتکاب میں اقبال کی زندانی میں دو ماہ اور بڑھادیے گئے۔ یہ حکم سن کر اقبال کے پتلے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ پیدا ہوئے۔

اقبال نے زیر لب کہا، ”پہلے دو ماہ تھے، اب چار ہو گئے“ اور پھر نج سے مخاطب ہو کر پوچھا، ”آپ کو تعزیرات ہند کی تمام دفعات از بریاد ہیں۔ کیا آپ مجھے کوئی اسی توہین کی قسم کا بے ضرر جرم بتا سکتے ہیں، جس کے ارتکاب سے آپ کی عدالت میری گردن جلا دے کے ہوائے کر سکے۔ میں اس دنیا میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ جہاں غریبوں کو جینے کے لیے ہوا کے چند پاکیزہ جھونکے بھی نصیب نہیں ہوتے اور جس کے بنائے قانون میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ کیا آپ کا یہ قانون عجیب و غریب نہیں جس نے اس بات کی تحقیق کیے بغیر کہ میں نے خود کشی کا اقدام کیوں کیا، مجھے جیل میں ٹھونس دیا ہے۔۔۔؟ مگر ایسے سوال پوچھنے سے فائدہ ہی کیا۔ تعزیرات ہند میں غالباً ان کا کوئی جواب نہیں۔“

اقبال نے اپنے تھک ہوئے مردہ کا نہ ہوں کو ایک جنبش دی اور خاموش ہو گیا۔ عدالت نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔

جو گندر سنگھ کے افسانے جب مقبول ہونا شروع ہوئے تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ مشہور ادیبوں اور شاعروں کو اپنے گھر بلائے اور ان کی دعوت کرے۔ اس کا خیال تھا کہ یوں اس کی شہرت اور مقبولیت اور بھی زیادہ ہو جائے گی۔

جو گندر سنگھ بڑا خوش فہم انسان تھا۔ مشہور ادیبوں اور شاعروں کو اپنے گھر بلا کر اور ان کی خاطر تواضع کرنے کے بعد جب وہ اپنی بیوی امرت کو کے پاس بیٹھتا تو کچھ دیر کے لیے بالکل بھول جاتا کہ اس کا کام ڈاک خانے میں چھپیوں کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ اپنی تین گزی پٹیاں فیشن کی رنگی ہوئی گپڑی اتنا کر جب وہ ایک طرف رکھ دیتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کے لمبے لمبے کالے گیسوؤں کے یونچے جو چوتا سا سر چھپا ہوا ہے اس میں ترقی پسند ادب کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اس احساس سے اس کے دماغ میں ایک عجیب قسم کی اہمیت پیدا ہو جاتی اور وہ یہ سمجھتا کہ دنیا میں جس قدر افسانہ نگار اور ناول نویس موجود ہیں سب کے سب اس کے ساتھ ایک نہایت ہی لطیف رشتے کے ذریعے سے منسلک ہیں۔

امرت کو کسی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اس کا خاوند لوگوں کو مدد کرنے پر اس سے ہر بار یہ کیوں کہا کرتا ہے، ”امرت، یہ جو آج چائے پر آرہے ہیں، ہندوستان کے بہت بڑے شاعر ہیں۔“ سمجھیں، بہت بڑے شاعر۔ دیکھو ان کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ رہے۔ ”آنے والا کبھی ہندوستان کا بہت بڑا شاعر ہوتا تھا یا بہت بڑا افسانہ نگار۔ اس سے کم پائے کا کوئی آدمی وہ کبھی بلا تاہی نہیں تھا۔ اور پھر دعوت میں اونچے اونچے شروں میں جو باتیں ہوتی تھیں ان کا مطلب وہ آج تک نہ سمجھ سکی تھی۔ ان گفتگوؤں میں ترقی پسندی کا ذکر عام ہوتا تھا۔ اس ترقی پسندی کا مطلب بھی امرت کو معلوم نہیں ہوتا تھا۔

ایک دفعہ جب جو گندر سنگھ ایک بہت بڑے افسانہ نگار کو چائے پلا کر فارغ ہوا اور اندر رسوئی میں آکر بیٹھا تو امرت کو نے پوچھا، ”یہ موئی ترقی پسندی کیا ہے؟“

جو گندر سنگھ نے گپڑی سمیت اپنے سر کو ایک خفیف سی جنبش دی اور کہا، ”ترقی پسندی۔۔۔ اس کا مطلب تم فوراً ہی نہیں سمجھ سکو گی۔ ترقی پسند اس کو کہتے ہیں جو ترقی پسند کرے۔ یہ لفظ فارسی کا ہے۔ انگریزی میں ترقی پسند کو ریڈیکل کہتے ہیں۔ وہ افسانہ نگار، یعنی کہانیاں لکھنے والے، جو افسانہ نگاری میں ترقی چاہتے ہوں ان کو ترقی پسند افسانہ نگار کہتے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں صرف تین چار ترقی پسند افسانہ نگار ہیں جن میں میر انام بھی شامل ہے۔“

جو گندر سگھے عادتاً، انگریزی لفظوں اور جملوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اس کی یہ عادت پک کر، اب طبیعت بن گئی تھی۔ چنانچہ اب وہ بلا تکلف ایک ایسی انگریزی زبان میں سوچتا تھا جو چند مشہور انگریزی ناول نویسوں کے اچھے اچھے چست فقروں پر مشتمل تھی۔ عام گفتگو میں وہ بیچاں فیصلی انگریزی لفظ اور انگریزی کتابوں سے چلنے ہوئے فقرے استعمال کرتا تھا۔ افلاطون کو وہ ہمیشہ پلیٹھو کہتا تھا۔ اسی طرح ارسطو کو ار سٹو میں۔ ڈاکٹر سگمنڈ فرانڈ، شوپنہار اور ناطے کا ذکر وہ اپنی ہر معمر کے کی گفتگو میں کیا کرتا تھا۔ عام بات چیت میں وہ ان فلسفیوں کا نام نہیں لیتا تھا اور بیوی سے گفتگو کرتے وقت وہ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا کہ انگریزی لفظ اور یہ فلسفی نہ آنے پائیں۔

جو گندر سگھے سے جب اس کی بیوی نے ترقی پسندی کا مطلب سمجھا تو اسے بہت مایوسی ہوئی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ترقی پسندی کوئی بہت بڑی چیز ہو گی جس پر بڑے بڑے شاعر اور افسانہ نگار اس کے خاوند کے ساتھ مل کر بحث کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب اس نے یہ سوچا کہ ہندستان میں صرف تین چار ترقی پسند افسانہ نگار ہیں تو اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی۔ یہ چمک دیکھ کر جو گندر سگھے کے موچھوں بھرے ہونٹ ایک دبی سی مسکراہٹ کے باعث کپکپائے، ”امرт۔۔۔ تمہیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ ہندستان کا ایک بہت بڑا آدمی مجھ سے ملنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس نے میرے افسانے پڑھے ہیں اور بہت پسند کیے ہیں۔“

امرت کرنے پوچھا، ”یہ بڑا آدمی گوئی ہے یا آپ کی طرح کہانیاں لکھنے والا۔“

جو گندر سگھے نے جیب سے ایک لفافہ نکلا اور اسے اپنے دوسرے ہاتھ کی پشت پر تھپتھپاتے ہوئے کہا، ”یہ آدمی گوئی بھی ہے افسانہ نگار بھی ہے، لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی جو اس کی نہ مٹنے والی شہرت کا باعث ہے، اور ہی ہے۔“

”وہ خوبی کیا ہے؟“

”وہ ایک آوارہ گرد ہے۔“

”آوارہ گرد؟“

”ہاں، وہ ایک آوارہ گرد ہے جس نے آوارہ گردی کو اپنی زندگی کا نصب لعین بنالیا ہے۔۔۔ وہ ہمیشہ گھومتار ہتا ہے۔۔۔ کبھی کشمیر کی ٹھنڈی وادیوں میں ہوتا ہے اور کبھی ملتان کے تپتے ہوئے میدانوں میں۔۔۔ کبھی لکا میں کبھی تبت میں۔۔۔“

امر کو رکی دلچسپی بڑھ گئی، ”مگر یہ کرتا کیا ہے؟“

”گیت اکٹھے کرتا ہے۔۔۔ ہندستان کے ہر حصے کے گیت۔۔۔ پنجابی، گجراتی، مرہٹی، پشاوری، سرحدی، کشمیری، مارواڑی۔۔۔ ہندستان میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں، ان کے جتنے گیت اس کو ملتے ہیں اکٹھے کر لیتا ہے۔“

”اتنے گیت اکٹھے کر کے کیا کرے گا؟“

”کتابیں چھاپتا ہے، مضمون لکھتا ہے تاکہ دوسرا بھی یہ گیت سن سکیں۔ انگریزی زبان کے کئی رسالوں میں اس کے مضمون چھپ چکے ہیں۔ گیت اکٹھے کرنا اور پھر ان کو سلیقے کے ساتھ پیش کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ وہ بہت بڑا آدمی ہے امرت، بہت بڑا آدمی ہے اور دیکھو اس نے مجھے خط کیسا لکھا ہے۔“

یہ کہہ کر جو گندر سنگھ نے اپنی بیوی کو وہ خط پڑھ کر سنایا جو ہر نرنا تھا ترپاٹھی نے اس کو اپنے گاؤں سے ڈاک خانے کے پتے سے بھیجا تھا۔ اس خط میں ہر نرنا تھا ترپاٹھی نے بڑی میٹھی زبان میں جو گندر سنگھ کے افسانوں کی تعریف کی تھی اور لکھا تھا کہ آپ ہندوستان کے ترقی پسند افسانہ نگار ہیں۔ جب یہ فقرہ جو گندر سنگھ نے پڑھا تو بول اٹھا، ”لو دیکھو ترپاٹھی صاحب بھی لکھتے ہیں کہ میں ترقی پسند ہوں۔“

جو گندر سنگھ نے پورا خط سنانے کے بعد ایک دو سیکنڈ اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور اثر معلوم کرنے کے لیے پوچھا، ”کیوں۔۔۔؟“

امر کو راپنے خاوند کی تیز ٹکاہی کے باعث کچھ جھینپ سی گئی اور مسکرا کر کہنے لگی، ”مجھے کیا معلوم۔۔۔ بڑے آدمیوں کی باتیں بڑے ہی سمجھ سکتے ہیں۔“

جو گندر سنگھ نے اپنی بیوی کی اس ادا پر غور نہ کیا۔ وہ دراصل ہر ندرنا تھر ترپاٹھی کو اپنے یہاں بلانے اور اسے کچھ دیر بھر انے کی بابت سوچ رہا تھا، ”امر ت، میں کہتا ہوں ترپاٹھی صاحب کو دعوت دے دی جائے، کیا خیال ہے تمہارا۔۔۔ لیکن میں یہ سوچتا ہوں کیا پتہ ہے وہ انکار کر دے۔۔۔ بہت بڑا آدمی ہے، ممکن ہے وہ ہماری اس دعوت کو خوشامد سمجھے۔“

ایسے موقع پر وہ بیوی کو اپنے ساتھ شامل کر لیا کرتا تھا تاکہ دعوت کا بوجھ دو آدمیوں میں بٹ جائے۔ چنانچہ جب اس نے ”ہماری“ کہا تو امرت کو نے جو اپنے خاوند جو گندر سنگھ کی طرح بے حد سادہ لوح تھی، ہر ندرنا تھر ترپاٹھی سے دلچسپی لینا شروع کر دی۔ حالانکہ اس کا نام ہی اس کے لیے ناقابل فہم تھا اور یہ بات بھی اس کی سمجھتے بالاتر تھی کہ ایک آوارہ گرد گیت جمع کر کر کے کیسے بہت بڑا آدمی بن سکتا ہے۔ جب اس سے یہ کہا گیا تھا کہ ہر ندرنا تھر ترپاٹھی گیت جمع کرتا ہے تو اسے اپنے خاوند کی ایک سنائی ہوئی بات یاد آگئی تھی کہ ولایت میں کئی لوگ تیتریاں پکڑنے کا کام کرتے ہیں اور یوں کافی روپیہ کماتے ہیں۔ چنانچہ اس نے خیال کیا تھا کہ شاید ترپاٹھی صاحب نے گیت جمع کرنے کا کام ولایت کے کسی آدمی سے سیکھا ہو گا۔

جو گندر سنگھ نے پھر اپنا اندیشہ ظاہر کیا، ”ممکن ہے وہ ہماری اس دعوت کو خوشامد سمجھے۔“

”اس میں خوشامد کی کیا بات ہے۔ اور بھی تو کئی بڑے آدمی آپ کے پاس آتے ہیں۔ آپ ان کو خط لکھ دیجیے، میرا خیال ہے وہ آپ کی دعوت ضرور قبول کر لیں گے اور پھر ان کو بھی تو آپ سے ملنے کا بہت شوق ہے۔۔۔ ہاں، یہ تو بتائیے کیا ان کی بیوی بچے ہیں؟“

”بیوی بچے؟“ جو گندر سنگھ نے خط کا مضمون انگریزی زبان میں سوچتے ہوئے کہا، ”ہونگے۔۔۔ ضرور ہوں گے۔۔۔ ہاں ہیں، میں نے ان کے ایک مضمون میں پڑھا تھا، ان کی بیوی بھی ہے اور ایک بچی بھی ہے۔“

یہ کہہ کر جو گندر سنگھ اٹھا، خط کا مضمون اس کے دماغ میں مکمل ہو چکا تھا۔ دوسرے کمرے میں جا کر اس نے چھوٹے سائز کا پیڈ نکالا جس پر وہ خاص خاص آدمیوں کو خط لکھا کرتا تھا اور ہر ندرنا تھر ترپاٹھی کے نام اردو میں دعوت نامہ لکھا۔ یہ اس مضمون کا ترجمہ تھا جو اس نے اپنی بیوی سے گفتگو کرتے وقت سوچ لیا تھا۔

تیسرا روز ہر ندرنا تھر ترپاٹھی کا جواب آیا۔ جو گندر سنگھ نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ لفافہ کھولا۔ جب اس نے پڑھا کہ اس کی دعوت قبول کر لی گئی ہے تو اس کا دل اور بھی دھڑکنے لگا۔ اس کی بیوی امرت کو دھوپ میں اپنے چھوٹے بچے کے کیسوں میں دھی ڈال کر مل رہی

تھی کہ جو گندر سنگھ لفافہ ہاتھ میں لے کر اس کے پاس پہنچا، ”انھوں نے ہماری دعوت قبول کر لی، کہتے ہیں کہ وہ لاہوریوں بھی ایک ضروری کام سے آرہے تھے۔۔۔ اپنی تازہ کتاب چھپوانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔۔۔ اور ہاں، انھوں نے تم کو پر نام کہا ہے۔“ امرت کو اس احساس سے بہت خوشی ہوئی کہ اتنے بڑے آدمی نے جس کا کام گیت اکٹھے کرنا ہے اس کو پر نام کہا ہے۔ چنانچہ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کا بیباہ ایسے آدمی سے ہوا جس کو ہندوستان کا ہر بڑا آدمی جانتا ہے۔

سردیوں کا موسم تھا۔ نومبر کے پہلے دن تھے۔ جو گندر سنگھ صحیح سات بجے بیدار ہو گیا اور دیر تک بستر میں آنکھیں کھولے پڑا رہا۔ اس کی بیوی امرت کو اور اس کا بچہ دونوں لاحف میں لیٹے پاس والی چار پائی پر پڑے تھے۔ جو گندر سنگھ نے سوچنا شروع کیا: ترپاٹھی صاحب سے مل کر اسے کتنی خوشی ہو گی اور خود ترپاٹھی صاحب کو بھی یقیناً اس سے مل کر بڑی مسرت حاصل ہو گی۔ کیوں کہ وہ ہندوستان کا جوال افکار افسانہ نویس اور ترقی پسند ادیب ہے۔ ترپاٹھی صاحب سے وہ ہر موضوع پر گفتگو کرے گا۔ گیتوں پر، دیہاتی بولیوں پر، افسانوں پر اور تازہ جنگی حالات پر۔۔۔ وہ ان کو بتائے گا کہ دفتر کا ایک محنتی کلرک ہونے پر بھی وہ کیسے اچھا افسانہ نگار بن گیا۔ کیا یہ عجیب سی بات نہیں کہ ڈاک خانے میں چھپیوں کی دیکھ بھال کرنے والا انسان طبعاً آرٹسٹ ہو۔

جو گندر سنگھ کو اس بات پر بہت ناز تھا کہ ڈاک خانے میں مزدوروں کی طرح چھ سات گھنٹے کام کرنے کے بعد بھی وہ اتنا وقت نکال لیتا ہے کہ ایک ماہن پر چھ مرتب کرتا ہے اور دو تین پر چوں کے لیے ہر مہینے ایک افسانہ بھی لکھتا ہے۔ دوستوں کو ہر ہفتے جو لمبے چوڑے نٹ لکھتے جاتے تھے، ان کا ذکر الگ رہا۔

دیر تک وہ بستر پر لیٹا ہر ندر ناتھ ترپاٹھی سے اپنی پہلی ملاقات کی ذہنی تیاریاں کرتا رہا۔ جو گندر سنگھ نے اس کے افسانے اور مضمون پڑھے تھے اور اس کا فوٹو بھی دیکھا تھا اور کسی کے افسانے پڑھ اور فوٹو دیکھ کر وہ عام طور پر یہی محسوس کیا کرتا تھا کہ اس نے اس آدمی کو اچھی طرح جان لیا ہے۔ لیکن ہر ندر ناتھ ترپاٹھی کے معاملے میں اس کو اپنے اوپر اعتبار نہیں آتا تھا۔ کبھی اس کا دل کہتا تھا کہ ترپاٹھی اس کے لیے بالکل اجنہی ہے۔ اس کے افسانہ نگار دماغ میں بعض اوقات ترپاٹھی ایک ایسے آدمی کی صورت میں پیش ہوتا تھا جس نے کپڑوں کے بجائے اپنے جسم پر کاغذ لپیٹ رکھے ہوں۔ اور جب وہ کاغذوں کے متعلق سوچتا تو اسے انارکلی کی وہ دیوار یاد آ جاتی تھی جس پر سینما کے اشتہار اوپر تلے اتنی تعداد میں چپکے ہوئے تھے کہ ایک اور دیوار بن گئی تھی۔

جو گندر سنگھ بستر پر لیٹا دیر تک سوچتا رہا کہ اگر وہ ایسا ہی آدمی نکل آیا تو اس کو سمجھنا بہت دشوار ہو جائے گا۔ مگر بعد میں جب اس کو اپنی ذہانت کا خیال آیا تو اس کی مشکلیں آسان ہو گئیں اور وہ اٹھ کر ہر ندر ناتھ ترپاٹھی کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ خط و کتابت

کے ذریعے سے یہ طے ہو گیا تھا کہ ہر ندرنا تھہ ترپاٹھی خود جو گندر سنگھ کے مکان پر چلا آئے گا۔ کیونکہ ترپاٹھی یہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ وہ لاری سے سفر کرے گا یا ریلوے ٹرین سے۔ بہر حال یہ بات تو قطعی طور پر طے ہو گئی تھی کہ جو گندر سنگھ سوموار کو ڈاک خانے سے چھٹی لے کر سارا دن اپنے مہمان کا انتظار کرے گا۔

نہاد ہو کر اور کپڑے بدل کر جو گندر سنگھ دیر تک باورچی خانے میں اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا رہا۔ دونوں نے چائے دیر سے پی، اس خیال سے کہ شاید ترپاٹھی آجائے۔ لیکن جب وہ آیا تو انہوں نے کیک وغیرہ سنبھال کر الماری میں رکھ دیے اور خود خالی چائے پی کر مہمان کے انتظار میں بیٹھ گئے۔

جو گندر سنگھ باورچی خانے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر جب اس نے اپنی داڑھی کے بالوں میں لوہے کے چھوٹے چھوٹے کلپ اٹکانے شروع کیے کہ وہ یونچ کی طرف تھہ ہو جائیں تو باہر دروازہ پر دستک ہوئی۔ داڑھی کو دیسے ہی نا مکمل حالت میں چھوڑ کر اس نے ڈیوڑھی کا دروازہ ہکولا۔ جیسا کہ اس کو معلوم تھا سب سے پہلے اس کی نظر ہر ندرنا تھہ ترپاٹھی کی سیاہ گھنی داڑھی پر پڑی جو اس کی داڑھی سے بیس گناہڑی تھی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔

ہر ندرنا تھہ کے ہونٹوں پر جو بڑی بڑی موچھوں کے اندر چھپ ہوئے تھے، مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس کی ایک آنکھ جو قدرے ٹیڑھی تھی زیادہ ٹیڑھی ہو گئی اور اس نے اپنی لمبی لمبی زلفوں کو ایک طرف جھٹک کر اپنا ہاتھ جو کسی کسان کا ہاتھ معلوم ہوتا تھا جو گندر سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔ جو گندر سنگھ نے جب اس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت محسوس کی اور اس کو ترپاٹھی کا وہ چرمی تھیلا نظر آیا جو حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھولتا ہوا تھا تو وہ بہت متاثر ہوا۔ وہ صرف اس قدر کہہ سکا، ”ترپاٹھی صاحب آپ سے مل کر مجھے بے حد ہوشی ہوئی ہے۔“

ہر ندرنا تھہ ترپاٹھی کو آئے اب پندرہ روز ہو چکے تھے۔ اس کی آمد کے دوسرے روز ہی اس کی بیوی اور بھی بھی آگئی تھیں۔ یہ دونوں ترپاٹھی کے ساتھ ہی گاؤں سے آئی تھیں مگر دو روز کے لیے مزگ میں ایک دور کے رشتے دار کے ہاں ٹھہر گئی تھیں اور چونکہ ترپاٹھی نے اس رشتے دار کے پاس ان کا زیادہ دیر تک ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اس لیے اس نے ان کو اپنے پاس بلوایا تھا۔

پہلے چار دن بڑی دلچسپ باتوں میں صرف ہوئے۔ ہر ندرنا تھہ ترپاٹھی سے اپنے افسانوں کی تعریف سن کر جو گندر بہت خوش ہوتا رہا۔ اس نے ایک مکمل افسانہ جو کہ غیر مطبوعہ تھا، ترپاٹھی کو سنا یا اور داد حاصل کی۔ دونا مکمل افسانے بھی سنائے جن کے متعلق ترپاٹھی نے اچھی رائے کا اظہار کیا۔ ترقی پسند ادب پر بھی بحثیں ہوتی رہیں۔ مختلف افسانہ نگاروں کی فنی کمزوریاں نکالی گئیں۔ نئی اور پرانی شاعری کا مقابلہ کیا

گیا۔ غرضیکہ یہ چار دن بڑی اچھی طرح گزرے اور جو گندر سنگھ، ترپاٹھی کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ اس کی گفتگو کا انداز جس میں بیک وقت بچپنا اور بڑھا پا تھا جو گندر کو بہت پسند آیا۔ اس کی لمبی داڑھی جو اس کی اپنی داڑھی سے بیس گناہ بڑی تھی اس کے خیالات پر چھاگئی اور اس کی کالمی کالی زلفیں جن میں دیہاتی گیتوں کی سی روانی تھی ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رہنے لگیں۔ ڈاک خانے میں چھپیوں کی دیکھ بھال کرنے کے دوران میں بھی ترپاٹھی کی یہ زلفیں اسے نہ بھولتیں۔

چار دن میں ترپاٹھی نے جو گندر سنگھ کو مودہ لیا۔ وہ اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اس کی ٹیڑھی آنکھ میں بھی اس کو خوبصورتی نظر آنے لگی، بلکہ ایک بار تو اس نے سوچا، ”اگر ان کی آنکھ میں ٹیڑھاپن نہ ہوتا تو چہرے پر یہ بزرگی کبھی پیدا نہ ہوتی۔“ ترپاٹھی کے موٹے موٹے ہونٹ جب ترپاٹھی کی گھنی موچھوں کے پیچھے ملتے تو جو گندر ایسا محسوس کرتا کہ جھاڑیوں میں پرندے بول رہے ہیں۔ ترپاٹھی ہو لے ہو لے بولتا تھا اور بولتے بولتے جب وہ اپنی لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا تو جو گندر کے دل کو بہت راحت پہنچتی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کے دل پر پیار سے ہاتھ پھیرا جا رہا ہے۔

چار روز تک جو گندر ایسی فضائیں رہا جس کو اگر وہ اپنے کسی افسانے میں بھی بیان کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔ لیکن پانچویں روز ایکا ایکی ترپاٹھی نے اپنا چرمی تھیلا کھولا اور اس کو اپنے افسانے سنانے شروع کیے اور دس روز تک وہ متواتر اس کو اپنے افسانے سناتا رہا۔ اس دوران میں ترپاٹھی نے جو گندر کو کئی کتابیں سنادیں۔

جو گندر سنگھ ننگ آگیا۔ اب اس کو افسانوں سے نفرت پیدا ہو گئی۔ ترپاٹھی کا چرمی تھیلا جس کا پیٹ بنیوں کی قوند کی طرح پھولا ہوا تھا، اس کے لیے ایک مستقل عذاب بن گیا۔ ہر روز شام کو فتر سے لوٹتے ہوئے اسے اس بات کا گھکارہ نہ لگا کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی ترپاٹھی سے ملاقات ہو گی۔ ادھر ادھر کی چند سرسری باقیں ہوں گی، وہ چرمی تھیلا کھولا جائے گا اور اس کو ایک یادو طویل افسانے سنادیے جائیں گے۔

جو گندر سنگھ ترقی پسند تھا۔ یہ ترقی پسندی اگر اس کے اندر نہ ہوتی تو وہ صاف لفظوں میں ترپاٹھی سے کہہ دیتا، ”بس۔۔۔ بس۔۔۔ ترپاٹھی صاحب بس۔۔۔ بس اب مجھ میں آپ کے افسانے سننے کی طاقت نہیں رہی۔“ مگر وہ سوچتا، ”نہیں نہیں۔۔۔ میں ترقی پسند ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ دراصل یہ میری کمزوری ہے کہ اب ان کے افسانے مجھے اچھے نہیں لگتے۔ ان میں ضرور کوئی نہ کوئی خوبی ہو گی۔۔۔ اس لیے کہ ان کے پہلے افسانے مجھے خوبیوں سے بھرے نظر آتے تھے۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ متعصب ہو گیا ہوں۔“

ایک ہفتے سے زیادہ عرصے تک جو گندر سنگھ کے ترقی پسند دماغ میں یہ کشمکش جاری رہی اور وہ سوچ سوچ کر اس حد تک پہنچ گیا جہاں سوچ بچا رہو ہی نہیں سکتا۔ طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے مگر وہ ان کی ٹھیک طور پر جانچ پڑتاں نہ کر سکتا۔ اس کی ذہنی افرا تفری آہستہ آہستہ بڑھتی گئی اور وہ ایسا محسوس کرنے لگا کہ ایک بہت بڑا مکان ہے جس میں بے شمار کھڑکیاں ہیں۔ اس مکان کے اندر وہ اکیلا ہے۔ آندھی آگئی ہے، کبھی اس کھڑکی کے پڑ بجتے ہیں، کبھی اس کھڑکی کے، اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اتنی کھڑکیوں کو ایک دم بند کیے کرے۔

جب ترپاٹھی کو اس کے یہاں آئے میں روز ہو گئے تو اسے بے چینی محسوس ہونے لگی۔ ترپاٹھی اب شام کو نیا افسانہ لکھ کر جب اسے سناتا تو جو گندر کو ایسا محسوس ہوتا کہ بہت سی کھیاں اس کے کانوں کے پاس بھینٹھا رہی ہیں۔ وہ کسی اور ہی سوچ میں غرق ہوتا۔

ایک روز ترپاٹھی نے جب اس کو اپنا تازہ افسانہ سنایا جس میں کسی عورت اور مرد کے جنسی تعلقات کا ذکر تھا تو یہ سوچ کر اس کے دل کو دھکا سا لگا کہ پورے اکیس دن اپنی بیوی کے پاس سونے کے بجائے وہ ایک لمڈھیل کے ساتھ ایک ہی لحاف میں سوتا رہا ہے۔ اس احساس نے جو گندر کے دل و دماغ میں ایک لمحہ کے لیے انقلاب برپا کر دیا، ”یہ کیسا مہمان ہے کہ جو نک کی طرح چمٹ کر ہی رہ گیا ہے۔ یہاں سے ملنے کا نام ہی نہیں لیتا۔۔۔ اور۔۔۔ میں ان کی بیوی صاحبہ کو توجہوں ہی گیا تھا اور ان کی پچی۔۔۔ سارا گھر اٹھ کر یہاں چلا آیا ہے۔ ذرہ بھر خیال نہیں کہ ایک غریب آدمی کا کچو مر نکل جائے گا۔۔۔ میں ڈاک خانے میں ملازم ہوں، صرف بچا س روپے ماہوار کماتا ہوں، آخر کب تک ان کی خاطر تواضع کرتا رہوں گا اور پھر افسانے۔۔۔ اس کے افسانے جو کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتے۔ میں انسان ہوں۔ لوہے کا ٹرک نہیں ہوں جو ہر روز اس کے افسانے سنتا رہوں۔۔۔ اور کس قدر غضب ہے کہ میں اپنی بیوی کے پاس تک نہیں گیا۔۔۔ سردیوں کی یہ راتیں ضائع ہو رہی ہیں۔“

اکیس دنوں کے بعد جو گندر، ترپاٹھی کو ایک نئی روشنی میں دیکھنے لگا۔ اب اس کو ترپاٹھی کی ہر چیز معیوب نظر آنے لگی۔ اس کی ٹیڑھی آنکھ جس میں جو گندر پہلے خوبصورتی دیکھتا تھا اب صرف ایک ٹیڑھی آنکھ تھی۔ اس کی کالی زلفوں میں بھی اب جو گندر کو وہ ملائی دکھائی نہیں دیتی تھی اور اس کی داڑھی دیکھ کر اب وہ سوچتا تھا کہ اتنی لمبی داڑھی رکھنا بہت بڑی حماقت ہے۔

جب ترپاٹھی کو اس کے یہاں آئے پچیس دن ہو گئے تو ایک عجیب و غریب کیفیت اس کے اوپر طاری ہو گئی۔ وہ اپنے آپ کو اجنبی سمجھنے لگا، اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ کبھی جو گندر سنگھ کو جانتا تھا مگر اب نہیں جانتا۔ اپنی بیوی کے متعلق وہ سوچتا، ”جب ترپاٹھی چلا جائے گا اور

سب ٹھیک ہو جائے گا تو میری نئے سرے سے شادی ہو گی۔۔۔ میری وہ پرانی زندگی جس کوٹاٹ کے طور پر یہ لوگ استعمال کر رہے ہیں پھر عود کر آئے گی۔۔۔ میں پھر اپنی بیوی کے ساتھ سو سکوں گا۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔“

اس کے آگے جب وہ سوچتا تو جو گندر سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور اس کے حلق میں کوئی تلخ سی چیز پھنس جاتی۔ اس کا جی چاہتا کہ دوڑا دوڑا اندر جائے اور امرت کو روک جو کبھی اس کی بیوی ہوا کرتی تھی اپنے گلے سے لگائے اور رونا شروع کر دے۔ مگر ایسا کرنے کی ہمت اس میں نہیں تھی کیونکہ وہ ترقی پسند افسانہ نگار تھا۔

کبھی کبھی جو گندر سنگھ کے دل میں یہ خیال دو دھ کے ابال کی طرح اٹھتا کہ ترقی پسندی کا لحاف جو اس نے اور ڈھر کھا ہے اتنا چیز کے اور چلانا شروع کر دے۔ ”ترپاٹھی، ترقی پسندی کی ایسی نیسی۔ تم اور تمہارے اکٹھے کیے ہوئے گیت سب بکواس ہیں۔۔۔ مجھے اپنی بیوی چاہیے۔۔۔ تمہاری خواہشیں تو ساری گیتوں میں جذب ہو چکی ہیں مگر میں ابھی جوان ہوں۔۔۔ میری حالت پر رحم کرو۔۔۔ ذرا غور تو کرو میں جو ایک منٹ اپنی بیوی کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا پچیس دنوں سے تمہارے ساتھ ایک ہی لحاف میں سورہا ہوں۔۔۔ کیا یہ ظلم نہیں۔“

جو گندر سنگھ بس گھول کے رہ جاتا۔ ترپاٹھی اس کی حالت سے بے خبر ہر روز شام کو اسے اپنا تازہ افسانہ سنادیتا اور اس کے ساتھ لحاف میں سو جاتا۔ جب ایک مہینہ گزر گیا تو جو گندر سنگھ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ موقع پا کر غسل خانے میں وہ اپنی بیوی سے ملا۔ ڈھر کتے ہوئے دل کے ساتھ اس ڈر کے مارے کہ ترپاٹھی کی بیوی نہ آ جائے اس نے جلدی سے اس کا یوں بوسہ لیا جیسے ڈاک خانے میں لفافوں پر مہر لگائی جاتی ہے اور کہا، ”آج رات تم جاگتی رہنا۔ میں ترپاٹھی سے یہ کہہ کر باہر جا رہا ہوں کہ رات کے ڈھانی بجے واپس آؤں گا۔ لیکن میں جلدی آ جاؤں گا۔ بارہ بجے۔۔۔ پورے بارہ بجے، میں ہو لے دستک دوں گا، تم چپکے سے دروازہ کھول دینا اور پھر ہم۔۔۔ ڈیوڑھی بالکل الگ تھلگ ہے۔ لیکن تم احتیاط کے طور پر وہ دروازہ جو غسل خانے کی طرف کھلتا ہے بند کر دینا۔“

بیوی کو اچھی طرح سمجھا کر وہ ترپاٹھی سے ملا اور اس سے رخصت لے کر چلا گیا۔ بارہ بجے میں چار سرد گھنٹے باقی تھے جن میں سے دو جو گندر سنگھ نے اپنی سائیکل پر ادھر ادھر گھونٹے میں کاٹے۔ اس کو سردی کی شدت کا بالکل احساس نہ ہوا اس لیے کہ بیوی سے ملنے کا خیال کافی گرم تھا۔ دو گھنٹے سائیکل پر گھونٹے کے بعد وہ اپنے مکان کے پاس میدان میں بیٹھ گیا اور محسوس کرنے لگا کہ وہ رومانی ہو گیا ہے۔ جب اس نے سر درات کی دھنڈیاں خاموشی کا خیال کیا تو اسے یہ ایک جانی پہچانی چیز معلوم ہوئی۔ اوپر ٹھٹھڑے ہوئے آسمان پر تارے چمک رہے تھے جیسے پانی کی موٹی موٹی بوندیں جم کر موٹی بن گئی ہیں۔ کبھی کبھی ریلوے انجن کی چیخ خاموشی کو چھپڑ دیتی اور جو گندر سنگھ کا افسانہ نگار دماغ یہ سوچتا کہ خاموشی بہت بڑا برف کا ڈھیلا ہے اور سیٹی کی آواز میخ ہے جو اس کے سینے میں کھب گئی ہے۔

بہت دیر تک جو گندر ایک نے قسم کے رومان کو اپنے دل و دماغ میں پھیلاتا رہا اور رات کی اندر ہیاری خوبصورتیوں کو گنتا رہا۔ ایک ایکی ان خیالات سے چونک کراس نے گھری میں وقت دیکھا تو بارہ بننے میں دو منٹ باقی تھے۔ اٹھ کر اس نے گھر کا رخ کیا اور دروازے پر ہولے سے دستک دی۔ پانچ سینڈ گزر گئے، دروازہ نہ کھلا۔ ایک بار اس نے پھر دستک دی۔

دروازہ کھلا، جو گندر سنگھ نے ہولے سے کہا، ”امر ت۔۔۔“ اور جب نظریں اٹھا کر اس نے دیکھا تو امرت کو رکے بجائے ترپاٹھی کھڑا تھا۔ اندر ہیرے میں جو گندر سنگھ کو ایسا معلوم ہوا کہ ترپاٹھی کی داڑھی اتنی لمبی ہو گئی ہے کہ زمین کو چھوڑ رہی ہے۔ اس کو پھر ترپاٹھی کی آواز سنائی، ”تم جلدی آگئے۔۔۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔۔۔ میں نے ابھی ابھی ایک افسانہ مکمل کیا ہے۔۔۔ آؤ سنو۔“

-[72]-

چوری: سعادت حسن منٹو

اسکول کے تین چار لڑکے الاؤ کے گرد حلقة بنائے بیٹھ گئے۔ اور اس بوڑھے آدمی سے جو ٹاث پر بیٹھا اپنے استخوانی ہاتھ تاپنے کی خاطر الاؤ کی طرف بڑھائے تھا کہنے لگے، ”بابا جی کوئی کہانی سنائیے؟“

مردِ معمر نے جو غالباً کسی گھری سوچ میں غرق تھا۔ اپنا بھاری سر اٹھایا جو گردن کی لاغری کی وجہ سے نیچے کو جھکا ہوا تھا، ”کہانی۔۔۔ میں خود ایک کہانی ہوں مگر۔۔۔“ اس کے بعد کے الفاظ اس نے اپنے پوپلے منہ ہی میں بڑھائے۔۔۔۔۔۔ شاید وہ اس جملے کو لڑکوں کے سامنے ادا کرنا نہیں چاہتا تھا جن کی سمجھ اس قابل نہ تھی کہ وہ فلسفیانہ نکات حل کر سکیں۔

لکڑی کے نکڑے ایک شور کے ساتھ جل جل کر آتشیں شکم کو پر کر رہے تھے۔ شعلوں کی عنابی روشنی لڑکوں کے معموم چہروں پر ایک عجیب انداز میں رقص کر رہی تھی۔ ننھی ننھی چیگاریاں سپید راکھ کی نقاب الٹ کر حیرت میں سر بلند شعلوں کا منہ تک رہی تھیں۔ بوڑھے آدمی نے الاؤ کی روشنی میں سے لڑکوں کی طرف نگاہیں اٹھا کر کہا، ”کہانی۔۔۔ ہر روز کہانی۔۔۔! کل سناؤں گا۔“

لڑکوں کے تھنگتے ہوئے چہروں پر افسردگی چھائی۔ ناامیدی کے عالم میں وہ ایک دوسرے کامنہ تکنے لگے۔ گویا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے تھے، ”آج رات کہانی سنے بغیر سونا ہو گا۔“ یکاکی ان میں سے ایک لڑکا جو دوسروں کی بہ نسبت بہت ہوشیار اور ذہین معلوم ہوتا تھا، الاؤ کے قریب سر کر بلند آواز میں بولا، ”مگر کل آپ نے وعدہ کیا تھا اور وعدہ خلافی کرنا درست نہیں۔۔۔ کیا آپ کو کل والے حادم کا انجام یاد نہیں ہے جو ہمیشہ اپنا کہا بھول جایا کرتا تھا۔“

”درست۔۔۔! میں بھول گیا تھا۔“ بوڑھے آدمی نے یہ کہہ کر اپنا سر جھکا لیا جیسے وہ اپنی بھول پر نادم ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس دلیر لڑکے کی جرأت کا خیال کر کے مسکرا یا، ”میرے بچے! مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے معاف کر دو۔۔۔ مگر میں کون سی کہانی سناؤں؟ ٹھہر و۔ مجھے یاد کر لینے دو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ سر جھکا کر گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔

اسے جن اور پریوں کی لا یعنی داستانوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ بچوں کو ایسی کہانیاں سنایا کرتا تھا جو ان کے دل و دماغ کی اصلاح کر سکیں۔ اسے بہت سے فضول قصے یاد تھے جو اس نے بچپن میں سنے تھے یا کتابوں میں پڑھے تھے۔ مگر اس وقت وہ اپنے بربط پیری کے بو سیدہ تار چھیڑ رہا تھا کہ شاید ان میں کوئی خوابیدہ راگ جاگ اٹھے۔

لڑکے باباجی کو خاموش دیکھ کر آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ غالباً اس لڑکے کی باہت جسمے کتاب چرانے پر بید کی سزا ملی تھی۔ باقتوں باقتوں میں ان میں سے کسی نے بلند آواز میں کہا، ”ماستر جی کے لڑکے نے بھی تو میری کتاب چڑا لی تھی۔ مگر اسے سزا وزانہ ملی۔“

”کتاب چڑا لی تھی۔“ ان چار لفظوں نے جو بلند آواز میں ادا کیے گئے تھے، بوڑھے کی خفتہ یاد میں ایک واقعہ کو جگا دیا۔ اس نے اپنا سپید سر اٹھایا اور اپنی آنکھوں کے سامنے بھولی بسری داستان کو انگڑایاں لیتے پایا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی مگر وہیں غرق ہو گئی۔۔۔ اضطراب کی حالت میں اس نے اپنے نحیف جسم کو جنبش دے کر الاؤ کے قریب کیا۔ اس کے چہرے کے تغیر و تبدل سے صاف طور پر عیاں تھا کہ وہ کسی واقعہ کو دوبارہ یاد کر کے بہت تکلیف محسوس کر رہا ہے۔

الاؤ کی روشنی بدستور لڑکوں کے چہروں پر ناچ رہی تھی۔ دفعتاً بوڑھے نے آخری ارادہ کرتے ہوئے کہا، ”بچو! آج میں اپنی کہانی سناؤں گا۔“

لڑکے فوراً اپنی باتیں چھوڑ کر ہمہ تن گوش ہو گئے۔ الاؤ کی چھٹی ہوئی لکڑیاں ایک شور کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر ابھر کر خاموش ہو گئیں۔۔۔ ایک لمحہ کے لیے فضا پر مکمل سکوت طاری رہا۔

”بابا جی اپنی کہانی سنائیں گے؟“ ایک لڑکے نے خوش ہو کر کہا۔ باقی سرک کر آگ کے قریب خاموشی سے بیٹھ گئے۔

”ہاں، اپنی کہانی۔“ یہ کہہ کر بوڑھے آدمی نے اپنی جھکی ہوئی گھنی بھوؤں میں سے کوٹھری کے باہر تاریکی میں دیکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکوں سے پھر مخاطب ہوا، ”میں آج تمہیں اپنی پہلی چوری کی داستان سناؤں گا۔“ لڑکے حیرت سے ایک دوسرے کامنہ تکنے لگے۔ انھیں اس بات کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ بابا جی کسی زمانہ میں چوری بھی کرتے رہے ہیں۔۔۔ بابا جی جو ہر وقت انھیں برے کاموں سے بچنے کے لیے نصیحت کیا کرتے ہیں۔

لڑکا جو ان میں دلیر تھا، اپنی حیرت نہ چھپا سکا، ”پر کیا آپ نے واقعی چوری کی؟“

”واقعی!“

”آپ اس وقت کس جماعت میں پڑھا کرتے تھے؟“

”نویں میں۔“

یہ سن کر لڑکے کی حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ اسے اپنے بھائی کا خیال آیا جو نویں جماعت میں تعلیم پارتا تھا۔ وہ اس سے عمر میں دو گناہ بڑا تھا۔ اس کی تعلیم اس سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ انگریزی کی کئی کتابیں پڑھ چکا تھا اور اسے ہر وقت نصیحتیں کیا کرتا تھا۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ اس عمر کا اور اچھا پڑھا لکھا لڑکا چوری کرے۔۔۔ اس کی عقل اس معہ کو حل نہ کر سکی۔ چنانچہ اس نے پھر سوال کیا، ”آپ نے چوری کیوں کی؟“ اس مشکل سوال نے بڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے گھبرا دیا۔۔۔ آخر وہ اس کا کیا جواب دے سکتا تھا کہ فلاں کام اس نے کیوں کیا؟ بظاہر اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا، ”اس لیے کہ اس وقت اس کے دماغ میں یہی خیال آیا۔“ اس نے دل میں یہی جواب سوچا۔ مگر اس نے مطمئن نہ ہو کر یہ بہتر خیال کیا کہ تمام داستان من و عن بیان کر دے۔

”اس کا جواب میری کہانی ہے۔ جو میں اب تمہیں سنانے والا ہوں۔“

”سنائیے!

لڑکے اس بوڑھے آدمی کی چوری کا حال سننے کے لیے اپنی اپنی جگہ پر جم کر بیٹھ گئے۔ جو الاؤ کے سامنے اپنے سپید بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہا تھا اور جسے وہ ایک بہت بڑا آدمی خیال کرتے تھے۔ بڑھا کچھ عرصے تک اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ پھر اس بھولے ہوئے واقعہ کے تمام منتشر لکڑے فراہم کر کے بولا، ”ہر شخص خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کرتا ہے جس پر وہ تمام عمر نادم رہتا ہے۔ میری زندگی میں سب سے برابر ایک کتاب کی چوری ہے۔۔۔“

یہ کہہ کر وہ رک گیا۔ اس کی آنکھیں جو ہمیشہ چمکتی رہتی تھیں، دھنڈلی پڑ گئیں۔ اس کے چہرے کی تبدیلی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے زبردست ذہنی تکلیف کا سامنا کر رہا ہے۔ چند لمحات کے توقف کے بعد وہ پھر بولا، ”سب سے مکروہ فعل کتاب کی چوری ہے۔ یہ میں نے ایک کتب فروش کی دکان سے چڑائی۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے۔ جب میں نویں جماعت میں تعلیم پاتا تھا۔ قدرتی طور پر جیسا کہ اب تمہیں کہانی سننے کا شوق ہے مجھے افسانے اور ناول پڑھنے کا شوق تھا۔۔۔ دوستوں سے مانگ کر یا خود خرید کر میں ہر ہفتے ایک نہ ایک کتاب ضرور پڑھا کر تھا۔ وہ کتابیں عموماً عشق و محبت کی بے معنی داستانیں یا فضول جاسوسی قصے ہوا کرتے تھے۔ یہ کتابیں میں ہمیشہ چھپ کر پڑھا کر تھا۔ والدین کو اس کا علم نہ تھا۔ اگر انھیں معلوم ہوتا تو وہ مجھے ایسا ہر گز ہر گز نہ کرنے دیتے۔ اس لیے کہ اس قسم کی چھپ کر پڑھا کر تھا۔ کتابیں اسکوں کے لڑکے کے لیے بہت نقصان دہ ہوتی ہیں۔ میں ان کے مہلک نقصان سے غافل تھا۔ چنانچہ مجھے اس کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔ میں نے چوری کی اور پکڑا گیا۔۔۔“

ایک لڑکے نے حیرت زده ہو کر کہا، ”آپ پکڑے گئے؟“

”ہاں پکڑا گیا۔۔۔ چونکہ میرے والدین اس واقعہ سے بالکل بے خبر تھے۔ یہ عادت کلتے کلتے میری طبیعت بن گئی۔ گھر سے جتنے پیسے ملتے انھیں جوڑ جوڑ کر بازار سے افسانوں کی کتابیں خریدنے میں صرف کر دیتا۔ اسکوں کی پڑھائی سے رفتہ رفتہ مجھے نفرت ہونے لگی۔ ہر وقت میرے دل میں یہی خیال سماں رہتا کہ فلاں کتاب جو فلاں ناول نویس نے لکھی ہے ضرور پڑھنی چاہیے۔ یا فلاں کتب فروش کے پاس نئی ناولوں کا جوڑ خیرہ موجود ہے، ایک نظر ضرور دیکھنا چاہیے۔

شوک کی یہ انتہا دوسرے معنوں میں دیوانگی ہے۔ اس حالت میں انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کرنے والا ہے یا کیا کر رہا ہے۔ اس وقت وہ بے عقل بچے کے مانند ہوتا ہے جو اپنی طبیعت خوش کرنے یا شوق پورا کرنے کے لیے جلتی ہوئی آگ میں بھی ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ اسے یہ

پتہ نہیں ہوتا کہ چکنے والی شے جسے وہ پکڑ رہا ہے اس کا ہاتھ جلا دے گی۔ ٹھیک یہی حالت میری تھی۔ فرق اتنا ہے کہ بچہ شعور سے محروم ہوتا ہے۔ اس لیے وہ بغیر سمجھے بوچھے بری سے بری حرکت کر بیٹھتا ہے مگر میں نے عقل کا مالک ہوتے ہوئے چوری ایسے مکروہ جرم کا ارتکاب کیا۔۔۔ یہ آنکھوں کی موجودگی میں میرے اندر ہے ہونے کی دلیل ہے۔ میں ہر گز ایسا کام نہ کرتا اگر میری عادت مجھے مجبور نہ کرتی۔ ہر انسان کے دماغ میں شیطان موجود ہوتا ہے جو تو قیاقاً سے بُرے کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ یہ شیطان مجھ پر اس وقت غالب آیا جبکہ سوچنے کے لیے میرے پاس بہت کم وقت تھا۔۔۔ خیر“

لڑکے خاموشی سے بوڑھے کے ہلتے ہوئے لبوں کی طرف نگاہیں گاڑے ان کی داستان سن رہے تھے۔ داستان کا تسلسل اس وقت ٹوٹا دیکھ کر جب کہ اصل مقصد بیان کیا جانے والا تھا، وہ بڑی بے قراری سے بقايا تفصیل کا انتظار کرنے لگے۔

”مسعود بیٹا! یہ سامنے والا دروازہ تو بند کر دینا۔۔۔ سرد ہوا آرہی ہے۔“ بوڑھے نے اپنا کمبل گھٹنوں پر ڈال لیا۔

مسعود، ”اچھا بابا جی۔“ کہہ کر اٹھا اور کوٹھری کا دروازہ بند کرنے کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

”ہاں تو ایک دن جبکہ والد گھر سے باہر تھے۔“ بوڑھے نے اپنی داستان کا بقايا حصہ شروع کیا، ”مجھے بھی کوئی خاص کام نہ تھا۔ اور وہ کتاب جو میں ان دنوں پڑھ رہا تھا ختم ہونے کے قریب تھی۔ اس لیے میرے جی میں آئی کہ چلو اس کتب فروش تک ہو آئیں جس کے پاس بہت سی جا سو سی ناویں پڑی تھیں۔ میری جیب میں اس وقت اتنے پیسے موجود تھے جو ایک معمولی ناول کے دام ادا کرنے کے لیے کافی ہوں۔ چنانچہ میں گھر سے سیدھا اس کتب فروش کی دکان پر گیا۔۔۔ یوں تو اس دکان پر ہر وقت بہت سی اچھی اچھی ناویں موجود رہتی تھیں۔ مگر اس دن خاص طور پر بالکل نئی کتابوں کا ایک ڈھیر باہر تھتے پر رکھا تھا۔ ان کتابوں کے رنگ برنگ سر ورق دیکھ کر میری طبیعت میں ایک یہجان سا براپا ہو گیا۔ دل میں اس خواہش نے گد گدی کی کہ وہ تمام میری ہو جائیں۔

میں دکاندار سے اجازت لے کر ان کتابوں کو ایک نظر دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ ہر کتاب کے شوخ رنگ سر ورق پر اس قسم کی کوئی نہ کوئی عبارت لکھی ہوئی تھی۔

”نا ممکن ہے کہ اس کا مطالعہ آپ پر سفنسی طاری نہ کر دے۔“

”مصور اسرار کالا شانی شاہکار۔“

”تمثیل! یہجان! رومان۔۔۔!! سب سمجھا۔“

اس قسم کی عبارتیں شوق بڑھانے کے لیے کافی تھیں۔ مگر میں نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اس لیے کہ میری نظروں سے اکثر ایسے الفاظ گزر چکے تھے۔ میں تھوڑا عرصہ کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اس وقت میرے دل میں چوری کرنے کا خیال مطلقانہ تھا، بلکہ میں نے خریدنے کے لیے ایک کم قیمت کی ناول چن کر الگ بھی رکھ لی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دل میں یہ ارادہ کر کے میں دوسرے ہفتے ان ناولوں کو دوبارہ دیکھنے آؤں گا۔۔۔ میں نے اپنی چنی ہوئی کتاب اٹھائی۔۔۔ کتاب کا اٹھانا تھا کہ میری نگاہیں ایک مجلد ناول پر گڑ گئیں۔ سرورق کے کونے پر میرے محبوب ناول سٹ کا نام سرخ لفظوں میں چھپا تھا۔ اس کے ذرا اوپر کتاب کا نام تھا۔

”متفہم شعاعیں۔۔۔ کس طرح ایک دیوانے ڈاکٹر نے لندن کو تباہ کرنے کا ارادہ کیا۔“

یہ سطور پڑھتے ہی میرے اشتیاق میں طغیانی سی آگئی۔۔۔ کتاب کا مصنف وہی تھا جس نے اس سے پیشتر مجھ پر راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ ناول کو دیکھتے ہی میرے دماغ میں خیالات کا ایک گروہ داخل ہو گیا۔

”متفہم شعاعیں۔۔۔ دیوانے ڈاکٹر کی ایجاد۔۔۔ کیسا دلچسپ افسانہ ہو گا!“

”لندن تباہ کرنے کا ارادہ۔۔۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟“

”اس مصنف نے فلاں فلاں کتابیں کتنی سنسنی خیز لکھی ہیں!“

”یہ کتاب ضرور ان سب سے بہتر ہو گی!“

میں خاموش اشتیاق کے ساتھ اس کتاب کی طرف دیکھ رہا تھا اور یہ خیالات یکے بعد دیگرے میرے کانوں میں شور برپا کر رہے تھے۔ میں نے اس کتاب کو اٹھایا اور کھوں کر دیکھا تو پہلے ورق پر یہ عبارت نظر آئی، ”مصنف اس کتاب کو اپنی بہترین تصنیف قرار دیتا ہے۔“

”ان الفاظ نے میرے اشتیاق میں آگ پر ایندھن کا کام دیا۔ ایک ایکی میرے دماغ کے خدا معلوم کس گوشے سے ایک خیال کو دپڑا۔۔۔ وہ یہ کہ میں اس کتاب کو اپنے کوٹ میں چھپا کر لے جاؤں۔ میری آنکھیں بے اختیار کتب فروش کی طرف مڑیں۔ جو کاغذ پر کچھ لکھنے میں مشغول تھا۔ دوکان کی دوسری طرف دونوں جوان کھڑے میری طرح کتابیں دیکھ رہے تھے۔۔۔ میں سر سے پیر تک لرز گیا۔“

یہ کہتے ہوئے بوڑھے کا نحیف جسم اس واتعہ کی یاد سے کانپا۔۔۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر اس نے پھر اپنی داستان شروع کر دی، ”ایک لمحہ کے لیے میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ چوری کرنا بہت برآ کام ہے مگر ضمیر کی آواز سروق پر بنی ہوئی لانبی شاعروں میں غرق ہو گئی۔ میرا دماغ ”متفق شاعریں“، ”متفق شاعریں“ کی گردان کر رہا تھا۔ میں نے ادھر ادھر جھانکا اور جھٹ سے وہ کتاب کوٹ کے اندر بغل میں دبایی مگر میں کانپنے لگا۔

اس حالت پر قابو پا کر میں کتب فروش کے قریب گیا۔ اور اس کتاب کے دام ادا کر دیئے جو میں نے پہلے خریدی تھی۔ قیمت لیتے وقت اور روپے میں سے باقی پیسے واپس کرنے میں اس نے غیر معمولی تاخیر سے کام لیا۔ میری طرف اس نے گھور کر بھی دیکھا۔ جس سے میری طبیعت سخت پریشان ہو گئی۔ جی میں بھی آئی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں سے بھاگ نکلوں۔

میں نے اس دوران میں کئی بار اس جگہ پر جو کتاب کی وجہ سے ابھری ہوئی تھی، نگاہ ڈالی۔۔۔ اور شاید اسے چھپانے کی بے سود کوشش بھی کی۔ میری ان عجیب و غریب حرکتوں کو دیکھ کر اسے شک ضرور ہوا۔ اسے لیے کہ وہ بار بار کچھ کہنے کی کوشش کر کے پھر خاموش ہو جاتا تھا۔ میں نے باقی پیسے جلدی سے لیے اور وہاں سے چل دیا۔ دوسو قدم کے فاصلے پر میں نے کسی کی آواز سنی۔ مڑ کر دیکھا تو کتب فروش نگے پاؤں چلا آرہا تھا اور مجھے ٹھہرنا کے لیے کہہ رہا تھا۔۔۔ میں نے انہاد ہند بھاگنا شروع کر دیا۔ مجھے معلوم نہ تھا میں کہ در بھاگ رہا ہوں۔ میرا رخ اپنے گھر کی جانب نہ تھا۔ میں شروع ہی سے اس طرف بھاگ رہا تھا جدھر بازار کا اختتام تھا۔ اس غلطی کا مجھے اس وقت احساس ہوا جب دو تین آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔“

بوڑھا تنہ کہہ کر اضطراب کی حالت میں اپنی خشک زبان، لبوں پر پھیرنے لگا۔ کچھ توقف کے بعد وہ ایک لڑکے سے مخاطب ہوا، ”مسعود! پانی کا ایک گھونٹ پلوانا۔“

مسعود خاموشی سے اٹھا اور کوٹھری کے ایک کونے میں پڑے ہوئے گھڑے سے گلاس میں پانی انڈیل کر لے آیا۔ بوڑھے نے گلاس لیتے ہی منه سے لگالیا اور ایک گھونٹ میں سارا پانی پی گیا اور خالی گلاس زمین پر رکھتے ہوئے کہا، ”ہاں میں کیا بیان کر رہا تھا؟“

ایک لڑکے نے جواب دیا، ”آپ بھاگے جا رہے تھے۔“

”میرے چیچے کتب فروش ”پورچور“ کی آواز بلند کرتا چلا آرہا تھا۔ جب میں نے دو تین آدمیوں کو اپنا تعاقب کرتے دیکھا تو میرے ہوش ٹھکانے نہ رہے۔ جیل کی آہنی سلاخیں، پولیس اور عدالت کی تصویریں ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ بے عزتی کے خیال سے میری پیشانی عرق آلو دھوگئی۔ میں لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ اٹھنا چاہاتا تو انگوں نے جواب دے دیا۔ اس وقت میرے دماغ کی عجیب حالت تھی۔ ایک تند دھواں سامیرے سینے میں کروٹیں لے رہا تھا۔ آنکھیں فرط خوف سے ابل رہی تھیں۔ اور کانوں میں ایک زبردست شور برپا تھا۔ جیسے بہت سے لوگ آہنی چادریں ہتھوڑوں سے کوٹ رہے ہیں۔ میں ابھی اٹھ کر بھاگنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ کتب فروش اور اس کے ساتھیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ اس وقت میری کیا حالات تھی، اس کا بیان کرنا بہت دشوار ہے۔ سیکڑوں خیالات پتھروں کی طرح میرے دماغ سے ٹکرائیں کر مختلف آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ جب انھوں نے مجھے پکڑا تو ایسا معلوم ہوا کہ آہنی پنج نے میرے دل کو مسل ڈالا ہے۔۔۔ میں بالکل خاموش تھا۔ وہ مجھے دکان کی طرف کشاں کشاں لے گئے۔

جیل خانے کی کوٹھری اور عدالت کا منہ دیکھنا یقینی تھا۔ اس خیال پر میرے ضمیر نے لعنت ملامت شروع کر دی۔ چونکہ اب جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ اور میرے پاس اپنے ضمیر کو جواب دینے کے لیے کوئی الفاظ موجود نہ تھے۔ اس لیے میری گرم آنکھوں میں آنسو اتر آئے اور میں نے بے اختیار روشن اثر شروع کر دیا۔“

یہ کہتے ہوئے بوڑھے کی دھنڈلی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

”کتب فروش نے مجھے پولیس کے حوالے نہ کیا۔ اپنی کتاب لے لی اور نصیحت کرنے کے بعد چھوڑ دیا۔“ بوڑھے نے اپنے آنسو کھرد رے کمبل سے خشک کیے، ”خد اس کو جزاۓ خیر دے۔ میں عدالت کے دروازے سے تو قبیل گیا۔ مگر اس واقعہ کی والد اور اسکوں کے لڑکوں کو خبر ہو گئی۔ والد مجھ پر سخت خفا ہوئے لیکن انھوں نے بھی اخیر میں مجھے معاف کر دیا۔

دو تین روز مجھے اس ندامت کے باعث بخار آتارا، اس کے بعد جب میں نے دیکھا میرا دل کسی کروٹ آرام نہیں لیتا اور مجھ میں اتنی قوت نہیں کہ میں لوگوں کے سامنے اپنی نگاہیں اٹھا سکوں تو میں شہر چھوڑ کر وہاں سے ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک میں نے مختلف شہروں کی خاک چھانی ہے، ہزاروں مصائب برداشت کیے ہیں۔ صرف اس کتاب کی چوری کی وجہ سے جو مجھے تادم مرگ نادم و شرمسار کھے گی۔ اس آوارہ گردی کے دوران میں، میں نے اور بھی بہت سی چوریاں کیں۔ ڈاکے ڈالے اور ہمیشہ پکڑا گیا۔ مگر ان پر نادم نہیں ہوں۔۔۔ مجھے فخر ہے۔“

بوڑھے کی دھنڈلی آنکھوں میں پھر پہلی سی چمک نمودار ہو گئی۔ اور اس نے الاؤ کے شعلوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کر دیا، ”ہاں مجھے فخر ہے۔“ یہ لفظ اس نے تھوڑے توقف کے بعد دوبارہ کہے۔

الاؤ میں آگ کا ایک شعلہ بلند ہوا۔۔۔ اور ایک لمحہ فضایں تھر تھر اکروہیں سو گیا۔ بوڑھے نے شعلے کی جرأت دیکھی اور مسکرا دیا۔ پھر لڑکوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا، ”کہانی ختم ہو گئی، اب تم جاؤ، تمہارے ماں باپ انتظار کرتے ہوں گے۔“

مسعود نے سوال کیا، ”مگر آپ کو اپنی دوسری چوریوں پر کیوں فخر ہے؟“

”فخر کیوں ہے۔۔۔؟“ بوڑھا مسکرا دیا، ”اس لیے کہ وہ چوریاں نہیں تھیں۔۔۔ اپنی مسرور قہ چیزوں کو دوبارہ حاصل کرنا چوری نہیں ہوتی میرے عزیز! بڑے ہو کر تمہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”ہر وہ چیز جو تم سے چراں گئی ہے، تمہیں حق حاصل ہے کہ اسے ہر ممکن طریقہ سے اپنے قبضہ میں لے آؤ۔ پر یاد رہے تمہاری کوشش کا میاب ہونی چاہیے۔ ورنہ ایسا کرتے ہوئے پکڑے جانا اور اذیتیں اٹھانا عبث ہے۔“

لڑکے اٹھے اور بابا جی کو شب بخیر کہتے ہوئے کوٹھری کے دروازہ سے باہر چلے گئے۔ بوڑھے کی نگاہیں ان کو تاریکی میں گم ہوتے دیکھتی رہیں۔ تھوڑی دیر اسی طرح دیکھنے کے بعد وہ اٹھا اور کوٹھری کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا، ”کاش کہ یہ بڑے ہو کر اپنی کھوئی ہوئی چیزوں پر لے سکیں۔“

بوڑھے کو خدا معلوم ان لڑکوں سے کیا امید تھی؟

-[73]-

شریفِن: سعادت حسن منٹو

جب قاسم نے اپنے گھر کا دروازہ کھولا تو اسے صرف ایک گولی کی جلن تھی جو اس کی دہنی پنڈلی میں گڑ گئی تھی۔ لیکن اندر داخل ہو کر جب اس نے اپنی بیوی کی لاش دیکھی تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ قریب تھا کہ وہ لکڑیاں پھاڑنے والے گندے سے کو اٹھا کر دیوانہ وار نکل جائے اور قتل و گری کا بازار گرم کر دے کہ دفتار سے اپنی لڑکی شریفِن کا خیال آیا۔

”شریفِن، شریفِن!“ اس نے بلند آواز میں پکارنا شروع کیا۔

سامنے دالان کے دونوں دروازے بند تھے۔ قاسم نے سوچا، شاید ڈر کے مارے اندر چھپ گئی ہو گی۔ چنانچہ وہ اس طرف بڑھا اور درز کے ساتھ منه لگا کر کہا، ”شریفِن، شریفِن... میں ہوں تمہارا باپ۔“ مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ قاسم نے دونوں ہاتھوں سے کواڑ کو دھکا دیا۔ پہٹ کھلے اور وہ اوندھے منه دالان میں گر پڑا۔ سنبھل کر جب اس نے اٹھنا چاہا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ کسی... قاسم چیخ کے ساتھ بیٹھا۔

ایک گزر کے فاصلے پر ایک جوان لڑکی کی لاش پڑی تھی۔ نگی۔۔۔ بالکل نگی۔ گورا گورا سڈوں جسم، چھت کی طرف اٹھے ہوئے چھوٹے چھوٹے پستان۔۔۔ ایک دم قاسم کا سارا وجود ہل گیا۔ اس کی آنکھیں خود بخوبی بند ہو گئی تھیں۔ پھر بھی اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ مردہ سی آواز اس کے منہ سے نکلی، ”شریفِن۔“ اور اس نے آنکھیں بند کیے دالان میں ادھر ادھر ہاتھ مار کر کچھ کپڑے اٹھائے اور انھیں شریفِن کی لاش پر گرا کر وہ یہ دیکھے بغیر ہی باہر نکل گیا کہ وہ اس سے کچھ دور گرے تھے۔

باہر نکل کر اس نے اپنی بیوی کی لاش نہ دیکھی۔ بہت ممکن ہے اسے نظر ہی نہ آئی ہو۔ اس لیے کہ اس کی آنکھیں شریفین کی ننگی لاش سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے کونے میں پڑا ہوا لکڑیاں چھاڑنے والا گند اساٹھایا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ قاسم کی داہنی پنڈلی میں گولی گڑی ہوئی تھی۔ اس کا احساس گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اس کے دل و دماغ سے محو ہو گیا تھا۔ اس کی وفادار بیماری بیوی ہلاک ہو چکی تھی۔ اس کا صدمہ بھی اس کے ذہن کے کسی گوشے میں موجود نہیں تھا۔ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ہی تصویر آتی تھی۔۔۔ شریفین کی۔۔۔ ننگی شریفین کی۔۔۔ اور وہ نیزے کی انی بن بن کر اس کی آنکھوں کو چھیدتی ہوئی اس کی روح میں بھی شگاف ڈال دیتی۔

گند اساٹھ میں لیے قاسم سنسان بازاروں میں ابیتے ہوئے لاوے کی طرح بہتا چلا جا رہا تھا۔ چوک کے پاس اس کی ڈبھیڑ ایک سکھ سے ہوئی۔ بڑا کڑیل جوان تھا۔ لیکن قاسم نے کچھ ایسے بے تکنے پن سے حملہ کیا اور ایسا بھر پور ہاتھ مارا کہ وہ تیز طوفان میں اکھڑے ہوئے درخت کی طرح زمین پر آ رہا۔

قاسم کی رگوں میں اس کا خون اور زیادہ گرم ہو گیا اور بجھنے لگا۔ تڑ تڑ تڑ۔۔۔ جیسے جوش کھاتے ہوئے تیل پر پانی کا ہلاکا سا چھینا پڑ جائے۔

دور سڑک کے اس پارے چند آدمی نظر آئے۔ تیر کی طرح وہ ان کی طرف بڑھا سے دیکھ کر ان لوگوں نے، ”ہر ہر مہادیو“ کے نعرے لگائے۔ قاسم نے جواب میں اپنا نعرہ لگانے کے بجائے انھیں ماں باپ کی موٹی موٹی گالیاں دیں اور گند اساتانے ان میں گھس گیا۔

چند منٹوں ہی کے اندر تین لاشیں سڑک پر تڑپ رہی تھیں۔ دوسرے بھاگ گئے لیکن قاسم کا گند اسادیر تک ہوا میں چلتا رہا۔ اصل میں اس کی آنکھیں بند تھیں۔ گند اساٹھ ماتے گھماتے وہ ایک لاش کے ساتھ ٹکرایا اور گر پڑا۔ اس نے سوچا کہ شاید اسے گرالیا گیا ہے۔ چنانچہ اس نے گندی گندی گالیاں دے کر چلانا شروع کیا، ”مارڈا لو مجھے، مارڈا لو مجھے۔“

لیکن جب کوئی ہاتھ اسے گردن پر محسوس نہ ہوا اور کوئی ضرب اس کے بدن پر نہ پڑی تو اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ سڑک پر تین لاشوں اور اس کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک لحظے کے لیے قاسم کو مایوسی ہوئی کیونکہ شاید وہ مر جانا چاہتا تھا لیکن ایک دم شریفین۔۔۔ ننگی شریفین کی تصویر اس کی آنکھوں میں پچھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر گئی اور اس کے سارے وجود کو بار و د کا جلتا ہوا فلیتہ بنا گئی۔۔۔ وہ فوراً اٹھا۔ ہاتھ میں گند اسالیا اور پھر کھولتے ہو لے لاوے کی طرح سڑک پر بہنے لگا۔

جتنے بازار قاسم نے طے کیے، سب خالی تھے۔ ایک گلی میں وہ داخل ہوا لیکن اس میں سب مسلمان تھے۔ اس کو بہت کوفت ہوئی۔ چنانچہ اس نے اپنے لاوے کا رخ دوسری طرف پھیر دیا۔ ایک بازار میں پہنچ کر اس نے اپنا گند اسما اونچا ہوا میں لہرایا اور ماں بہن کی گالیاں الگنا شروع کیں۔

لیکن ایک دن اسے بہت ہی تکلیف دہ احساس ہوا کہ اب تک وہ صرف ماں بہن کی گالیاں ہی دیتا رہا تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً بیٹی کی گالی دینا شروع کی اور ایسی چتنی گالیاں اسے یاد تھیں سب کی سب ایک ہی سانس میں باہر الٹ دیں۔۔۔ پھر بھی اس کی تشغی نہ ہوئی۔ جھنجلا کروہ ایک مکان کی طرف بڑھا، جس کے دروازے کے اوپر ہندی میں کچھ لکھا تھا۔

دروازہ اندر سے بند تھا۔ قاسم نے دیوانہ وار گند اسما چلانا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں دونوں کواٹر ریزہ ریزہ ہو گئے۔ قاسم اندر داخل ہوا۔

چھوٹا سا گھر تھا۔ قاسم نے اپنے سوکھے ہوئے حلق پر زور دے کر پھر گالیاں دینا شروع کیں، ”باہر نکلو۔۔۔ باہر نکلو۔“

سامنے دلالاں کے دروازے میں چرچاہت پیدا ہوئی۔ قاسم اپنے سوکھے ہوئے حلق پر زور دے کر گالیاں دیتا رہا۔ دروازہ کھلا۔ ایک لڑکی نمودار ہوئی۔ قاسم کے ہونٹ بھینچ گئے۔ گرج کر اس نے پوچھا، ”کون ہوتا ہے؟“ لڑکی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور جواب دیا، ”ہندو۔“

قاسم تن کر کھڑا ہو گیا۔ شعلہ بار آنکھوں سے اس نے لڑکی کی طرف دیکھا جس کی عمر چودہ یا پندرہ برس کی تھی اور ہاتھ سے گند اسما گرا دیا۔ پھر وہ عقاب کی طرح جھپٹا اور اس لڑکی کو دھکیل کر اندر دلالاں میں لے گیا۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے دیوانہ وار کپڑے نوچنے شروع کیے، دھجیاں اور چندیاں یوں اڑنے لگیں جیسے کوئی روئی دھنک رہا ہے۔

تقریباً آدھ گھنٹہ قاسم اپنا انتقام لینے میں مصروف رہا۔ لڑکی نے کوئی مراجحت نہ کی۔ اس لیے کہ وہ فرش پر گرتے ہی بیہوش ہو گئی تھی۔ جب قاسم نے آنکھیں کھولیں تو اس کے دونوں ہاتھ لڑکی کی گرد میں دھنسے ہوئے تھے۔ ایک جھٹکے کے ساتھ انھیں علیحدہ کر کے وہ اٹھا۔ پسینے میں غرق اس نے ایک نظر اس لڑکی کی طرف دیکھا تاکہ اس کی اور تشغی ہو سکے۔

ایک گز کے فاصلے پر اس جوان لڑکی کی لاش پڑی تھی۔۔۔ ننگی۔۔۔ بالکل ننگی۔ گورا گورا سڈول جسم، چھت کی طرف اٹھے ہوئے چھوئے پستان۔۔۔ قاسم کی آنکھیں ایک دم بند ہو گئیں۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ بدن پر گرم گرم پسینہ برف ہو گیا اور اس کی رگوں میں کھولتا ہوا لاوا پتھر کی طرح مخدود ہو گیا۔

تحوڑی دیر کے بعد ایک آدمی تلوار سے مسلح مکان کے اندر داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ دالان میں کوئی شخص آنکھیں بند کیے لرزتے ہاتھوں سے فرش پر پڑی ہوئی چیز پر کمبل ڈال رہا ہے۔ اس نے گرج کر اس سے پوچھا، ”کون ہوتا؟“ قاسم چونکا۔۔۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔

مسلح آدمی چلایا، ”قاسم!“

قاسم ایک بار پھر چونکا۔ اس نے اپنے سے کچھ دور کھڑے آدمی کو پہچاننے کی کوشش کی مگر اس کی آنکھوں نے اس کی مدد نہ کی۔ مسلح آدمی نے گھبراتے ہوئے لجھے میں پوچھا، ”کیا کر رہے ہو تم یہاں؟“

قاسم نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے فرش پر پڑے ہوئے کمبل کی طرف اشارہ کیا اور کھوکھلی آواز میں صرف اتنا کہا، ”شریف ان۔۔۔“

جلدی سے آگے بڑھ کر مسلح آدمی نے کمبل ہٹایا۔ ننگی لاش دیکھ کر پہلے وہ کانپا، پھر ایک دم اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر وہ ”بملابملا“ کہتا لڑکھراتے ہوئے قدموں سے باہر نکل گیا۔

-[74]-

بد تیزی: سعادت حسن منتو

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیسے سمجھاؤ۔“

”جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اس کو سمجھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔“

”آپ تو بس ہربات پر گلا گھونٹ دیتے ہیں۔۔۔ آپ نے یہ تو پوچھ لیا ہوتا کہ میں آپ سے کیا کہنا چاہتی ہوں۔“

”اس کے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔۔۔ بس فقط لڑائی مول لینا چاہتی ہو۔“

”لڑائی میں مول لینا چاہتی ہوں کہ آپ۔۔۔ سارے ہم سائے اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ آئے دن مجھ سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔
”خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ایک برس تک میں نے آپ سے کوئی تباہت کی ہے نہ شیریں۔“

”شیریں بات کرنے کا آپ کو سلیقہ ہی کہاں آتا ہے۔۔۔ نوکر کو آواز دے کر بلوائیں گے تو سارے محلے کو پتہ چل جائے گا کہ آپ اسے
گولی سے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔“

”میرے پاس بندوق ہی نہیں۔۔۔ ویسے میں خرید سکتا ہوں مگر اس کو چلائے گا کون؟ میں تو پٹانے سے ڈرتا ہوں۔“

آپ بننے نہیں۔۔۔ میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔۔۔ یہ فراڈ میرے ساتھ نہیں چلے گا آپ کا۔“

”اب میں فراڈ بن گیا؟“

”آپ ہمیشہ سے فراڈ تھے۔“

”یہ فیصلہ آپ نے کن وجہ پر قائم کیا۔“

”آپ جب پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے تو کیا آپ نے ابھی کی جیب سے دور پے نہیں نکالے تھے؟“

”نکالے تھے۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ بھنگی کی لڑکی کو ضرورت تھی۔“

”اس لیے کہ وہ بھنگی کی لڑکی تھی۔۔۔ بہت بیمار۔۔۔ والد صاحب سے اگر کہا جاتا تو وہ کبھی ایک پیسے بھی اسے نہ دیتے، میں نے اسی لیے مناسب سمجھا کہ ان کے کوٹ سے دور و پے نکال کر اس کو دوں۔۔۔ یہ کوئی گناہ نہیں۔“

”جی ہاں۔۔۔ بہت بڑا اثواب ہے۔۔۔ باپ کے کوٹ پر چھاپ مار کر آپ تو اپنے خیال کے مطابق جنت میں اپنی سیٹ بک کر چکے ہوں گے لیکن میں آپ سے کہیے دیتی ہوں کہ اس کی سزا آپ کو اتنی کڑی ملے گی کہ آپ کی طبیعت صاف ہو جائے گی۔“

”طبیعت تو میری ہر روز صاف کی جاتی ہے۔۔۔ اب اتنی صاف ہو گئی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اس طبیعت کو کچھر میں لٹ پت کر دوں تاکہ تمہارا مشغله جاری رہ سکے۔“

”کچھر میں تو آپ ہر وقت لمحڑے رہتے ہیں۔“

”یہ سرا سر برہتان ہے۔“

”برہتان کیا ہے۔۔۔ حقیقت ہے۔۔۔ آپ سر سے پاؤں تک کچھر میں دھنے ہوئے ہیں۔۔۔ آپ کو کسی نفسی چیز سے دلچسپی ہی نہیں، بات کریں گے تو غلط کی۔۔۔ نہاتے آپ نہیں۔“

”غمضب خدا کا۔۔۔ میں تو دن میں تین مرتبہ نہاتا ہوں۔“

”وہ بھی کوئی نہانہ ہے۔۔۔ بدن پر دو ڈونگے پانی کے ڈالے۔۔۔ تو لیے سے اپنا نیم خشک جسم پونچھا اور عسل خانے سے باہر نکل آئے۔“

”دو ڈونگے تو نہیں، کم از کم بیس ہوتے ہیں۔“

”تو ان سے بھی کیا ہوتا ہے---کیا آپ نے آج تک کبھی صابن استعمال کیا ہے؟“

”میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ صابن جلد کے لیے بہت مضر ہے۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ اس میں ایسے تیزابی مادے ہوتے ہیں جو جلد کا سستیاناں کر دیتے ہیں۔“

”میری جلد تو آج تک سستیاناں نہیں ہوئی---آپ کی جلد بہت ہی نازک ہو گی۔“

”نازک ہونے کا سوال نہیں---یہ ایک سائنسی فک بحث ہے۔“

”میں سائنسی فک و انسٹی ٹیک کچھ نہیں جانتی۔۔۔ بس میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ صابن کیوں استعمال نہیں کرتے؟“

”بھی، تھیس بتا تو چکا ہوں کہ یہ مضر ہے۔“

”تو آپ نہاتے کس طرح ہیں۔“

”نہانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے---پانی ڈالتے گئے اور نہاتے گئے۔“

”جسم پر آپ کوئی چیز نہیں ملتے۔۔۔ میرا مطلب ہے، صابن نہیں تو کوئی اور چیز۔“

”ملا کرتا ہوں۔“

”کیا؟“

”بیسن“

”وہ کیا ہوتا ہے؟“

”ارے بھئی، پنے کا آٹا۔“

آپ کی جوبات ہے، نرالی ہے۔۔۔ میں تو آپ ایسے سنگی سے خدا قسم تنگ آگئی ہوں۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، کہاں جاؤں۔“

”اپنے میکے چلی جاؤ۔۔۔ وہاں تمہیں اپنی ہم خیال مل جائیں گی۔“

”میں کیوں جاؤں وہاں۔۔۔ میں یہیں رہوں گی۔“

”میں نے تم سے آج ہی کہا۔۔۔ اس لیے کہ تم لاکھ مرتبہ مجھے دھمکی دیتی رہی ہو کہ میں چلی جاؤں گی اپنے میکے۔“

”مجھے جب جانا ہو گا چلی جاؤں گی۔“

”آج تمہاری طبیعت نہیں چاہتی؟“

”آپ مجھے چڑانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟“

”میں نے تو کوئی کوشش نہیں کی۔۔۔ اگر تم چاہتی ہو کہ کوشش کروں، تو یقیناً مانو، تم ابھی تانگہ لے کر اسٹیشن پہنچ جاؤ گی۔“

”کوشش کر کے دیکھ لیجیے۔۔۔ میں یہاں سے ایک انج نہیں ہٹوں گی۔۔۔ یہ میراً گھر ہے۔“

”آپ کا ہے--- آپ کے باپ دادا کا ہے--- لیکن یہ تو بتائیے---“

”میرے باپ دادا کا نام مت لجھیے--- ان بیچاروں کا کیا قصور تھا؟“

”قصور تو سارا میرا ہے--- لیکن بیگم، تم کبھی کبھی اتنا غور کر لیا کرو کہ میں نے آخر تھیس کون ساجانی فضان پہنچایا ہے کہ تم لٹھ لے کر میرے پیچے پڑ جاتی ہو۔“

”لٹھ تو ہمیشہ آپ کے ہاتھ میں رہا ہے--- میں تو اُسے اٹھا بھی نہیں سکتی۔“

”تم بُڑے سے بڑا گرزٹھا سکتی ہو۔--- تم ایسی عورتوں میں بلا کی قوت ہوتی ہے--- تم عقاب ہو۔--- تمہارے سامنے تو میری حیثیت ایک چڑیا کی سی ہے۔“

”باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سکھے۔--- آپ چڑیاں--- سبحان اللہ۔ جب کڑکتے اور گرجتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیر دھاڑ رہا ہے۔“

”اس شیر کو پہلے ایک نظر دیکھ لو۔“

”کیا دیکھوں؟ پندرہ برس سے دیکھ رہی ہوں۔“

”یہ خاکسار شیر ہے کیا؟“

”شیر ہے، مگر خاک میں لپٹا ہوا۔“

”اس تعریف کا شکر یہ--- اب آپ یہ بتائیے کہ آپ کہنا کیا چاہتی تھیں۔“

”آپ اتنے لائق فائق بنے پھرتے ہیں۔۔۔ سمجھیے کہ میں کیا کہنا چاہتی تھی۔“

”تمہاری باتیں تو صرف خدا ہی سمجھ سکتا ہے۔۔۔ میں کیا سمجھوں گا۔“

”خدا کو بیچ میں کیوں لاتے ہیں۔“

”خدا کو اگر بیچ میں نہ لایا جائے تو کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔“

”بڑے آئے ہیں آپ خدا کو مانے والے۔“

”خدا کو تو میں ہمیشہ سے مانتا آیا ہوں۔۔۔ وہ طاقت جو دنیا پر کنٹول کرتی ہے۔“

”کنٹول تو آپ مجھ پر کرتے آئے ہیں۔“

”کس قسم کا؟“

”ہر قسم کا۔۔۔ میں آج تک اپنی مرضی کے موافق کوئی چیز نہیں کر سکتی کپڑے لیتی ہوں، تو اس میں آپ کی مرضی کا دخل ہوتا ہے۔
کھانے کے بارے میں بھی آپ کی مرضی چلتی ہے۔۔۔ آج یہ پکے، کل وہ پکے۔۔۔“

”اس میں تمھیں اعتراض ہے؟“

”اعتراض کیوں نہیں۔۔۔ میرا جی اگر کبھی چاہتا ہے کہ او جھڑی کھاؤں تو آپ نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔“

”او جھڑی بھی کوئی کھانے کی شے ہے۔“

”آپ کیا جائیں، کتنی مزیدار ہوتی ہے۔۔۔ چونے میں ڈال کر اسے صاف کر لیا جاتا ہے، اس کے بعد اچھی طرح گھی میں تلا جاتا ہے۔۔۔
اللہ قسم مزا آ جاتا ہے۔“

”لاحول ولا۔۔۔ میں ایسی غلط چیز کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔“

”اور ٹینڈے؟“

”بکواس ہیں۔۔۔ سبزی کی سب سے بڑی توہین ہیں۔ ان میں کوئی رس ہوتا ہے نہ لذت۔۔۔ بس فقط ٹینڈے ہوتے ہیں۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ پیدا کس غرض کے لیے کیے گئے تھے۔۔۔ نہایت وابیات ہوتے ہیں۔۔۔ میں تو اکثر یہ دعماً نگتا ہوں کہ ان کا وجود سرے ہی سے غائب ہو جائے۔۔۔ بڑے بے جان ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں کدو بدر جہا بہتر ہے، حالانکہ وہ بھی مجھے سخت ناپسند ہے۔“

”آپ کو کون سی چیز پسند ہے؟ ہر اچھی چیز میں آپ کیڑے ڈالتے ہیں۔۔۔ بھنڈی آپ کو پسند نہیں کہ اس میں لیس ہوتی ہے۔ گو بھی آپ کو نہیں بھاتی کہ اس میں یہ نقص نکالا جاتا ہے کہ بدبو ہوتی ہے۔۔۔ ٹماٹر آپ کو اچھے نہیں لگتے، اس لیے کہ اس کے چھلکے ہضم نہیں ہوتے۔“

”تم ان بالوں کو چھوڑو۔۔۔ ٹینڈے، گو بھی اور ٹماٹر جائیں جہنم میں۔۔۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ مجھ سے کہنا کیا چاہتی تھیں۔“

”کچھ بھی نہیں۔۔۔ بس ایسے ہی آگئی۔۔۔ میں نے دیکھا کہ آپ کوئی کام نہیں کر رہے، تو آپ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔“

”بڑی نوازش ہے آپ کی۔۔۔ لیکن کچھ نہ کچھ تو ضرور کہنا ہو گا آپ کو۔“

”آپ سے اگر کچھ کہہ بھی دیا تو اس کا حاصل کیا ہو گا۔“

”جو آگے آپ کو حاصل ہوتا رہا ہے، اسی حساب سے آج بھی حاصل ہو جائے گا۔۔۔ آپ بہاں سے کچھ حاصل کیے بغیر ٹلیں گی کیسے؟“

”میں آپ سے ایک خاص بات کرنے آئی تھی۔“

”کیا؟“

”میں--- میں یہ کہنے آئی تھی، کہ میری سمجھ میں نہیں آتا، میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟“

”آپ کیا سمجھانے آئی تھیں مجھے۔“

”آپ کو تو خدا سمجھائے گا--- میں یہ کہنے آئی تھی کہ آپ پتلون پہن کر اس کے بٹن بالکنی میں بندنہ کیا کریں۔ ہمسایوں کو سخت اعتراض ہے، یہ بہت بڑی بد تیزی ہے۔“

-[75]-

نعرہ: سعادت حسن مندو

اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھردی گئی ہیں۔ وہ ساتویں منزل سے ایک ایک سیڑھی کر کے یہ پہ اور تمام منزلوں کا بوجھ اس کے چوڑے مگر دبليے کاندھے پر سوار ہوتا گیا۔

جب وہ مکان کے مالک سے ملنے کے لیے اوپر چڑھ رہا تھا تو اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کا کچھ بوجھ ہاکا ہو گیا ہے اور کچھ ہاکا ہو جائے گا۔ اس لیے کہ اس نے اپنے دل میں سوچا تھا، مالک مکان جسے سب سیڑھے کے نام سے پکارتے ہیں اس کی بپتا ضرور سنے گا۔ اور کراہی چکانے کے لیے اسے ایک مہینے کی اور مہلت بخش دے گا--- بخش دے گا---! یہ سوچتے ہوئے اس کے غرور کو ٹھیس لگی تھی لیکن فوراً ہی اس کو اصلاحیت بھی معلوم ہو گئی تھی۔ وہ بھیک مانگنے ہی تو جارہا تھا۔ اور بھیک ہاتھ پھیلا کر، آنکھوں میں آنسو بھر کے، اپنے دکھ در دسنا کر اور اپنے گھاؤ دکھا کر ہی مانگی جاتی ہے۔

اس نے یہی کچھ کیا۔ جب وہ اس سنگین عمارت کے بڑے دروازے میں داخل ہونے لگا، تو اس نے اپنے غرور کو، اس چیز کو جو بھیک مانگنے میں عام طور پر رکاوٹ پیدا کرتی ہے، نکال کر فٹ پاتھ پر ڈال دیا تھا۔

وہ اپنا دیا بھاکر اور اپنے آپ کو اندر ہیرے میں لپیٹ کر مالک مکان کے اس روشن کمرے میں داخل ہوا، جہاں وہ اپنی دو بلڈنگوں کا کراہی وصول کیا کرتا تھا اور ہاتھ جوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ سیٹھ کے تلک لگے ماتھے پر کئی سلوٹیں پڑ گئیں۔ اس کا بالوں بھرا ہاتھ ایک موٹی سی کاپی کی طرف بڑھا۔ دو بڑی بڑی آنکھوں نے اس کاپی پر کچھ حروف پڑھے اور ایک بھدی سی آواز گو نجی، ”کیشو لاں۔۔۔ کھولی پانچویں، دوسرا مالا۔۔۔ دو مہینوں کا کراہی۔۔۔ لے آئے ہو کیا؟“

یہ سن کر اس نے اپنادل جس کے سارے پرانے اور نئے گھاؤہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کریڈ کریڈ کر گھرے کر چکا تھا، سیٹھ کو دکھانا چاہا۔ اسے پورا پورا یقین تھا کہ اسے دیکھ کر اس کے دل میں ضرور ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ پر۔۔۔ سیٹھ جی نے کچھ سننا نہ چاہا اور اس کے سینے میں ایک ہٹر سماچ مچ گیا۔

سیٹھ کے دل میں ہمدردی پیدا کرنے کے لیے اس نے اپنے وہ تمام دکھ، جوبیت چکے تھے، گزرے دنوں کی گھری کھائی سے نکال کر اپنے دل میں بھر لیے تھے اور ان تمام زخموں کی جلن جومت ہوئی مٹ چکے تھے، اس نے بڑی مشکل سے اکٹھی اپنی چھاتی میں جمع کی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنی چیزوں کو کیسے سنبھالے؟

اس کے گھر میں بن بلائے مہمان آگئے ہوتے، وہ ان سے بڑے روکھے پن کے ساتھ کہہ سکتا تھا، جاؤ بھئی میرے پاس اتنی جگہ نہیں ہے کہ تمہیں بٹھا سکوں اور نہ میرے پاس روپیہ ہے کہ تم سب کی خاطر مدارات کر سکوں۔ لیکن یہاں تو قصہ ہی دوسرا تھا۔ اس نے تو اپنے بھوے بھکلے دکھوں کو ادھر ادھر سے پکڑ کر اپنے آپ سینے میں جمع کیا تھا۔ اب بھلا وہ باہر نکل سکتے تھے؟

افرائی میں اسے کچھ پتہ نہ چلا تھا کہ اس کے سینے میں کتنی چیزیں بھر گئی ہیں۔ پر جیسے جیسے اس نے سوچنا شروع کیا، وہ پہچانے لگا کہ فلاں دکھ فلاں وقت کا ہے اور فلاں درد اسے فلاں وقت پر ہوا تھا اور جب یہ سوچ بچار ہوئی تو حافظے نے بڑھ کر وہ دھنڈھنادی جوان پر لپٹی ہوئی تھی۔ اور کل کے تمام دکھ درد آج کی تکلیفیں بن گئے اور اس نے اپنی زندگی کی باسی روٹیاں پھر انگاروں پر سینکنا شروع کر دیں۔

اس نے سوچا، تھوڑے سے وقت میں اس نے بہت کچھ سوچا۔ اس کے گھر کا اندر ہالیمپ کئی بار بھلی کے اس بلب سے ٹکرایا جو مالک مکان کے گنجے سر کے اوپر مسکرا رہا تھا۔ کئی بار اس کے پیوند لگے کپڑے ان کھوٹیوں پر لٹک کر پھر اس کے میلے بدن سے چھٹ گئے، جو دیوار میں گڑی چمک رہی تھیں۔ کئی بار اسے ان داتا بھگوان کا خیال آیا جو بہت دور نہ جانے کہاں بیٹھا اپنے بندوں کا خیال رکھتا ہے۔ مگر اپنے سامنے سیٹھ کو کرسی پر بیٹھا دیکھ کر جس کے قلم کی جنبش کچھ کا کچھ کر سکتی تھی، وہ اس بارے میں کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ کئی بار اسے خیال آیا۔ اور وہ سوچنے لگا کہ اسے کیا خیال آیا تھا۔ مگر وہ اس کے پیچھے بھاگ دوڑنہ کر سکا۔ وہ سخت گھبر آگیا تھا۔ اس نے آج تک اپنے سینے میں اتنی کھلبلی نہیں دیکھی تھی۔

وہ اس کھلبلی پر ابھی تعجب ہی کر رہا تھا کہ مالک مکان نے غصے میں آکر اسے گالی دی۔ گالی۔ یوں سمجھیے کہ کافیوں کے راستے پکھلا ہوا سیسہ شائیں کرتا اس کے دل میں اتر گیا، اور اس کے سینے کے اندر جو ہلڑ مج گیا، اس کا تو پچھہ ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ جس طرح کسی گرم جلے میں کسی شرارت سے بھگدڑ مج جایا کرتی ہے، تھیک اسی طرح اس کے دل میں ہلپل پیدا ہو گئی۔ اس نے بہت جتن کیے کہ اس کے وہ دکھ درد جو اس نے سیٹھ کو دکھانے کے لیے اکٹھے کیے تھے، چپ چاپ رہیں۔ پر کچھ نہ ہو سکا۔ گالی کا سیٹھ کے منہ سے نکلا تھا کہ تمام دکھ بے چین ہو گئے۔ اور اندر ہادھندا یک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ اب تو وہ یہ نئی تکلیف بالکل نہ سہ سکا، اور اس کی آنکھوں میں جو پہلے ہی تپ رہی تھیں، آنسو آگئے۔ جس سے ان کی گرمی اور بھی بڑھ گئی اور ان سے دھواں نکلنے لگا۔

اس کے جی میں آئی کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی حد تک نگل چکا تھا، سیٹھ کے جھریلوں پڑے چہرے پر قے کر دے مگر وہ اس خیال سے باز آگیا کہ اس کا غرور توفٹ پاتھ پر پڑا ہے۔ اپولو بندر پر نمک لگی موگ پھلی بیچنے والے کا غرور۔۔۔ اس کی آنکھیں ہنس رہی تھیں اور ان کے سامنے نمک لگی موگ پھلی کے وہ تمام دانے جو اس کے گھر میں ایک تھیلے کے اندر بر کھا کے باعث گیلے ہو رہے تھے، ناپنے لگے۔

اس کی آنکھیں ہنسیں، اس کا دل بھی ہنسا، یہ سب کچھ ہوا پر وہ کڑواہٹ دور نہ ہوئی جو اس کے گلے میں سیٹھ کی گالی نے پیدا کر دی تھی۔ یہ کڑواہٹ اگر صرف زبان پر ہوتی تو وہ اسے تھوک دیتا مگر وہ تو بہت بری طرح اس کے گلے میں اٹک گئی تھی۔ اور نکالنے نکلتی تھی اور پھر ایک عجیب قسم کا دکھ جو اس گالی نے پیدا کر دیا تھا، اس کی گھبر اہٹ کو اور بھی بڑھا رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں جو سیٹھ کے سامنے رونا غضول سمجھتی تھیں، اس کے سینے کے اندر اتر کر آنسو بھاڑی ہیں۔ جہاں ہر چیز پہلے ہی سے سوگ میں تھی۔

سیٹھ نے اسے پھر گالی دی۔ اتنی ہی موٹی جتنی اس کی چربی بھری گردان تھی، اور اسے یوں لگا کہ کسی نے اوپر سے اس پر کوڑا کر کٹ پھینک دیا ہے۔ چنانچہ اس کا ایک ہاتھ اپنے آپ چہرے کی حفاظت کے لیے بڑھا پر اس گالی کی ساری گرداس پر پھیل چکی تھی۔۔۔ اب اس نے

وہاں ٹھہرنا اچھا نہ سمجھا۔ کیونکہ کیا خبر تھی۔۔۔ کیا خبر تھی۔۔۔ اسے کچھ خبر نہ تھی۔۔۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ ایسی حالتوں میں کسی بات کی سدھ بدھ نہیں رہا کرتی۔

وہ جب نیچے اترتا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کندھوں پر دھردی گئی ہیں۔ ایک نہیں، دو گالیاں۔۔۔ بار بار یہ دو گالیاں جو سیٹھنے بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے منہ سے اگل دی تھیں جو اس کے کانوں کے پاس زہری بھڑوں کی طرح بھینختا شروع کر دیتی تھیں اور وہ سخت بے چین ہو جاتا تھا۔ وہ کیسے اس۔۔۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس گڑبڑ کا نام کیا رکھے، جو اس کے دل میں اور دماغ میں ان گالیوں نے مچا رکھی تھی۔ وہ کیسے اس تپ کو دور کر سکتا تھا جس میں وہ پھنکا جا رہا تھا۔ کیسے۔۔۔؟ پر وہ سوچ بچار کے قابل بھی تو نہیں رہا تھا۔ اس کا دماغ تو اس وقت ایک ایسا اکھاڑاہ بنا ہوا تھا جس میں بہت سے پہلو ان کشتی لڑ رہے ہوں۔ جو خیال بھی وہاں پیدا ہوتا، کسی دوسرے خیال سے، جو پہلے ہی سے وہاں موجود ہوتا بھڑک جاتا اور وہ کچھ سوچ نہ سکتا۔

چلتے چلتے جب ایک ایکی اس کے دکھ قے کی صورت میں باہر نکلنے کو تھے، اس کے جی میں آئی۔ جی میں کیا آئی، مجبوری کی حالت میں وہ اس آدمی کو روک کر جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے پاس سے گزر رہا تھا۔ یہ کہنے ہی والا تھا، ”بھیا میں روگی ہوں“ مگر جب اس نے اس را ہٹلتے آدمی کی شکل دیکھی تو بھلی کا وہ کھمباجو اس کے پاس ہی زمین میں گڑا تھا، اسے اس آدمی سے کہیں زیادہ حساس دکھائی دیا۔ اور جو کچھ وہ اپنے اندر سے باہر نکالنے والا تھا، ایک ایک گھونٹ کر کے پھر نگل گیا۔

فت پا تھ پر چوکو رپھرا ایک ترتیب کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ وہ ان پتھروں پر چل رہا تھا۔ آج تک کبھی اس نے ان کی سختی محسوس نہ کی تھی۔ مگر آج ان کی سختی اس کے دل تک پہنچ رہی تھی۔ فٹ پا تھ کاہر ایک پتھر جس پر اس کے قدم پڑ رہے تھے، اس کے دل کے ساتھ ٹکر رہا تھا۔۔۔ سیٹھ کے پتھر کے مکان سے نکل کر ابھی وہ تھوڑی دور ہی گیا ہو گا کہ اس کا بند بند ڈھیلا ہو گیا۔

چلتے چلتے اس کی ایک لڑکے سے ٹکر ہوئی اور اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ ٹوٹ گیا ہے۔ چنانچہ اس نے جھٹ اس آدمی کی طرح جس کی جھولی سے بیکر رہے ہوں، ادھر ادھر ہاتھ پھیلائے اور اپنے آپ کو اکٹھا کر کے ہو لے ہو لے چلانا شروع کیا۔

اس کا دماغ اس کی ناگوں کے مقابلے میں زیادہ تیزی کے ساتھ چل رہا تھا، چنانچہ کبھی کبھی چلتے چلتے اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کا نچلا دھڑ سارے کاسارا بہت بیچھے رہ گیا ہے اور دماغ بہت آگے نکل گیا ہے۔ کئی بار اسے اس خیال سے ٹھہرنا پڑا کہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہو جائیں۔

وہ فٹ پا تھے پر چل رہا تھا جس کے اس طرف سڑک پر پوں پوں کرتی موڑوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ گھوڑے گاڑیاں، ٹرائیاں، بھاری بھر کم ٹرک، لاریاں یہ سب سڑک کی کالی چھاتی پر دندناتی ہوئی چل رہی تھیں۔ ایک شور مچا ہوا تھا۔ پر اس کے کانوں کو کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ وہ تو پہلے ہی سے شائیں شائیں کر رہے تھے، جیسے ریل گاڑی کا نجی زائد بھاپ باہر نکال رہا ہے۔

چلتے چلتے ایک لنگڑے کتے سے اس کی ٹکر ہوئی۔ کتنے نے اس خیال سے کہ شاید اس کا پیر کچل دیا گیا ہے، ”چاؤں“ کیا اور پرے ہٹ گیا۔ اور وہ سمجھا کہ سیٹھنے اسے پھر گالی دی ہے۔۔۔ گالی۔۔۔ گالی ٹھیک اسی طرح اس سے الجھ کر رہ گئی تھی جیسے بیری کے کانٹوں میں کوئی کپڑا وہ جتنی کوشش اپنے آپ کو چھڑانے کی کرتا تھا، اتنی ہی زیادہ اس کی روح زخمی ہوتی جا رہی تھی۔

اسے اس نمک گلی مونگ پھلی کا خیال نہیں تھا جو اس کے گھر میں بر کھا کے باعث گلی ہو رہی تھی اور نہ اسے روٹی کپڑے کا خیال تھا۔ اس کی عمر تیس برس کے قریب تھی، اور ان تیس برسوں میں جن کے پر ماتما جانے کتنے دن ہوتے ہیں، وہ کبھی بھوکا نہ سویا تھا اور نہ کبھی نشکاہی پھرا تھا۔ اسے صرف اس بات کا دکھ تھا کہ اسے ہر مہینے کرایہ دینا پڑتا تھا۔ وہ اپنا اور اپنے بال بکوں کا پیٹ بھرے۔ اس کبرے جیسی داڑھی والے حکیم کی دوائیوں کے دام دے۔ شام کو ناٹری کی ایک بوتل کے لیے دونی پیدا کر لے، یا اس گنجے سیٹھ کے مکان کے ایک کمرے کا کرایہ ادا کرے۔

مکانوں اور کرایوں کا فلاسفہ اس کی سمجھ سے سدا اوپنچا رہا تھا۔ وہ جب بھی دس روپے گن کر سیٹھ یا اس کے منیم کی ہتھیلی پر رکھتا تو سمجھتا تھا کہ زبردستی اس سے یہ رقم چھین لی گئی ہے، اور اب اگر وہ پانچ برس تک برابر کرایہ دیتے رہنے کے بعد صرف دو مہینے کا حساب چلتا نہ کر سکتا تو کیا سیٹھ کو اس بات کا اختیار ہو گیا کہ وہ اسے گالی دے؟ سب سے بڑی بات تو یہ تھی جو اسے کھائے جا رہی تھی، اسے ان میں روپوں کی پروانہ تھی جو اسے آج نہیں کل ادا کر دیتے تھے۔ وہ ان دو گالیوں کی بابت سوچ رہا تھا، جو ان بیس روپوں کے بیچ میں سے نکلتی تھیں۔ نہ وہ بیس روپے کا مقروض ہوتا اور نہ سیٹھ کے کٹھائی جیسے منہ سے یہ گندگی باہر نکلتی۔

مان لیا وہ دھن و ان تھا۔ اس کے پاس دو بلڈنگیں تھیں۔ جن کے ایک سوچو میں کمروں کا کرایہ اس کے پاس آتا تھا۔ پر ان ایک سوچو میں کمروں میں جتنے لوگ رہتے ہیں، اس کے غلام تو نہیں اور اگر غلام بھی ہیں تو وہ انھیں گالی کیسے دے سکتا ہے؟“

”ٹھیک ہے اسے کرایہ چاہیے۔ پرمیں کہاں سے لاوں؟ پانچ برس تک اس کو دیتا ہی رہا ہوں۔ جب ہو گا، دے دوں گا۔ پچھلے برس بر سات کاسارا پانی ہم پر ٹپکتا رہا، پرمیں نے اسے کبھی گالی نہ دی، حالانکہ مجھے اس سے کہیں زیادہ ہولناک گالیاں یاد ہیں۔ پرمیں نے سیٹھ سے بارہ کہا کہ سیڑھی کا ڈنڈاٹ گیا ہے، اسے بنواد بیجے، پرمیری ایک نہ سنی گئی۔ میری پھول سی پنجی گری۔ اس کا داہنا ہاتھ ہمیشہ کے لیے بیکار ہو گیا۔ میں گالیوں کے بجائے اسے بد دعائیں دے سکتا تھا، پرمجھے اس کا دھیان ہی نہیں آیا۔ دو مینے کا رایہ نہ چکانے پرمیں گالیوں کے قابل ہو گیا۔ اس کو یہ خیال تک نہ آیا کہ اس کے بچے اپلو بند پرمیرے تھیلے سے مٹھیاں بھر بھر کے موگ پھلی کھاتے ہیں۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے پاس اتنی دولت نہیں تھی جتنی کہ اس دو بلڈنگوں والے سیٹھ کے پاس تھی۔ اور ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کے پاس اس سے بھی زیادہ دولت ہو گی، پروہ غریب کیسے ہو گیا۔ اسے غریب سمجھ کر ہی تو گالی دی گئی تھی۔ ورنہ اس گنجے سیٹھ کی کیا مجال تھی کہ کسی پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اسے دو گالیاں سناد پتا۔ گواکسی کے پاس دھن دولت کا نہ ہونا بہت برقی بات ہے۔ اب یہ اس کا قصور نہیں تھا کہ اس کے پاس دولت کی کمی تھی۔

سچ پوچھیے تو اس نے کبھی دھن دولت کے خواب دیکھے ہی نہ تھے۔ وہ اپنے حال میں مست تھا۔ اس کی زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی۔ پرمچھلے مینے ایک ایکی اس کی بیوی بیمار پڑ گئی اور اس کے دوادر و پروہ تمام روپے خرچ ہو گئے جو کراچے میں جانے والے تھے۔ اگر وہ خود بیمار ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ دواؤں پر روپیہ خرچ نہ کرتا لیکن یہاں تو اس کے ہونے والے بچے کی بات تھی جو ابھی اپنی ماں کے پیٹھ ہی میں تھا۔ اس کو اولاد بہت یاری تھی جو پیدا ہو چکی تھی اور جو پیدا ہونے والی تھی۔ سب کی سب اسے عزیز تھی۔ وہ کیسے اپنی بیوی کا اعلان نہ کراتا۔ کیا وہ اس بچے کا باپ نہ تھا۔؟ باپ پتا۔ وہ تو صرف دو مینے کے کرائے کی بات تھی۔ اگر اسے اپنے بچے کے لیے چوری بھی کرنا پڑتی تو وہ کبھی نہ چوکتا۔

چوری۔۔۔ نہیں نہیں وہ چوری کبھی نہ کرتا۔۔۔ یوں سمجھیے کہ وہ اپنے بچے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لیے تیار تھا مگر وہ چور کبھی نہ بتتا۔۔۔ وہ اپنی چھنی ہوئی چیزوں اپس لینے کے لیے لڑ مرنے کو تیار تھا پر وہ چوری نہیں کر سکتا تھا۔

اگر وہ چاہتا تو اس وقت جب سیٹھ نے اسے گالی دی تھی، آگے بڑھ کر اس کا ٹینٹو اد بادیتا اور اس کی تجویری میں سے وہ تمام نیلے اور سبز نوٹ نکال کر بھاگ جاتا، جن کو وہ آج تک لا جو نتی کے پتے سمجھا کرتا تھا۔۔۔ نہیں نہیں وہ ایسا کبھی نہ کرتا۔ لیکن پھر سیٹھ نے اسے گالی کیوں دی۔۔۔؟ پچھلے برس چوپائی پر ایک گاہک نے اسے گالی دی تھی۔ اس لیے کہ دوپیسے کی موگ پھلی میں چار دانے کڑوے چلے گئے تھے اور اس کے جواب میں اس کی گردن پر ایسی دھول جمائی تھی کہ دور نیچ پر بیٹھے آدمیوں نے بھی اس کی آواز سن لی تھی۔

مگر سیٹھ نے اسے دو گالیاں دیں اور وہ چپ رہا۔۔۔ کیشو لال کھاری سینگ والا، جس کی بابت یہ مشہور تھا کہ وہ ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتا۔۔۔ سیٹھ نے ایک گالی دی اور وہ کچھ نہ بولا۔۔۔ دوسری گالی دی تو بھی خاموش رہا جیسے وہ مٹی کا پتلا ہے۔۔۔ پر مٹی کا پتلا کیسے ہوا۔ اس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے تھوک بھرے منہ سے نکلتے دیکھا جیسے دو بڑے بڑے چوہے موریوں سے باہر نکلتے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر خاموش رہا۔ اس لیے کہ وہ اپنا غرور نیچے چھوڑ آیا تھا۔۔۔ مگر اس نے اپنا غرور اپنے سے الگ کیوں کیا؟ سیٹھ سے گالیاں لینے کے لیے؟

یہ سوچتے ہوئے اسے ایک ایکی خیال آیا کہ شاید سیٹھ نے اسے نہیں کسی اور کو گالیاں دی تھیں۔۔۔ نہیں، نہیں، گالیاں اسے ہی دی گئی تھیں۔ اس لیے کہ دو مینے کا کرایہ اسی کی طرف نکلتا تھا۔ اگر اسے گالیاں نہ دی گئی ہو تین تو اس سوچ بچار کی ضرورت ہی کیا تھی، اور یہ جو اس کے سینے میں ہلڑ سامج رہا تھا، کیا بغیر کسی وجہ کے اسے دکھ دے رہا تھا؟ اسی کو دو گالیاں دی گئی تھیں۔

جب اس کے سامنے ایک موڑ نے اپنے ماتھے کی بتیاں روشن کیں، تو اسے معلوم ہوا کہ وہ دو گالیاں پھٹل کر اس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں۔۔۔ گالیاں۔۔۔ گالیاں۔۔۔ وہ جھنجھلا گیا۔۔۔ وہ جتنی کوشش کرتا تھا کہ ان گالیوں کی بابت نہ سوچے اتنی ہی شدت سے اسے ان کے متعلق سوچنا پڑتا تھا اور یہ مجبوری اسے بہت چڑھڑا بنا رہی تھی۔ چنانچہ اسی چڑھڑے پن میں اس نے خواہ دو تین آدمیوں کو جو اس کے پاس سے گزر رہے تھے، دل ہی دل میں گالیاں دیں۔ ”پوں اکڑ کے چل رہے ہیں جیسے ان کے باوا کاراج ہے!“

اگر اس کا راج ہوتا تو وہ سیٹھ کو مزاچھا دیتا جو اسے اوپر تلے دو گالیاں سن کر اپنے گھر میں یوں آرام سے بیٹھا تھا جیسے اس نے اپنی گدے دار کر سی میں سے دو کھٹل نکال کر باہر پھیک دیے ہیں۔۔۔ سچ مجھ اگر اس کا اپنا راج ہوتا تو چوک میں بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر کے سیٹھ کو پیچ میں کھڑا کر دیتا۔ اور اس کی گنجی چند یا پر اس زور سے دھپا مارتا کہ بلبل اٹھتا، پھر وہ سب لوگوں سے کہتا کہ ہنسو، جی بھر کر ہنسو اور خود اتنا ہنستا کہ ہنسنے ہنسنے اس کا پیٹ دکھنے لگتا پر اس وقت اسے بالکل ہنسی نہیں آتی تھی۔۔۔ کیوں۔۔۔؟ وہ اپنے راج کے بغیر بھی تو سیٹھ کے گنجے سر پر دھپا مار سکتا تھا۔ اسے کس بات کی رکاوٹ تھی۔۔۔؟ رکاوٹ تھی۔۔۔ رکاوٹ تھی تو وہ گالیاں سن کر خاموش ہو رہا۔

اس کے قدم رک گئے۔ اس کا دماغ بھی ایک دوپل کے لیے ستایا اور اس نے سوچا کہ چلوا بھی اس جھنجھٹ کا فیصلہ ہی کر دوں۔۔۔ بھاگا ہوا جاؤں اور ایک ہی جھٹکے میں سیٹھ کی گردن مر ڈکر اس تجوہ پر رکھ دوں جس کا ڈھکنا مگر مچھ کے منہ کی طرح کھلتا ہے۔۔۔ لیکن وہ کھبے کی طرح زمین میں کیوں گڑ گیا تھا؟ سیٹھ کے گھر کی طرف پٹا کیوں نہیں تھا۔۔۔ کیا اس میں جرأت نہ تھی؟

اس میں جرأت نہ تھی۔۔۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ اس کی ساری طاقت سرد پڑگئی تھی۔۔۔ یہ گالیاں۔۔۔ وہ ان گالیوں کو کیا کہتا۔۔۔ ان گالیوں نے اس کی چوڑی چھاتی پر ول رسا پھیر دیا تھا۔۔۔ صرف دو گالیوں نے۔۔۔ حالانکہ پچھلے ہندو مسلم فساد میں ایک ہندو نے اسے مسلمان سمجھ کر لاٹھیوں سے بہت پیٹا تھا اور ادھ موکر دیا تھا اور اسے اتنی کمزوری محسوس نہ ہوئی تھی جتنا کہ اب ہورہی تھی۔۔۔ کیشو لاں کھاری سینگ والا جودو ستون سے بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتا تھا کہ وہ کبھی بیمار نہیں پڑا۔ آج یوں چل رہا تھا جیسے برسوں کا روگی ہے۔۔۔ اور یہ روگ کس نے پیدا کیا تھا۔۔۔؟ دو گالیوں نے!

گالیاں۔۔۔ گالیاں۔۔۔ کہاں تھیں وہ دو گالیاں۔۔۔؟ اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر رہا تھا ڈال کروہ ان دو پتھروں کو جو کسی حیلے لگتے ہی نہ تھے، باہر نکال لے اور جو کوئی بھی اس کے سامنے آئے اس کے سر پر دے مارے، پر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔۔۔ اس کا سینہ مر بے کا مرتبان تھوڑی تھا۔

ٹھیک ہے۔ لیکن پھر کوئی اور ترکیب بھی تو سمجھ میں آئے جس سے یہ گالیاں دور دفان ہوں۔۔۔ کیوں نہیں کوئی شخص بڑھ کر اسے دکھ سے نجات دلانے کی کوشش کرتا؟ کیا وہ ہمدردی کے قابل نہ تھا۔۔۔؟ ہو گا۔۔۔ پر کسی کو اس کے دل کے حال کا کیا پتہ تھا۔ وہ کھلی کتاب تھوڑی تھا، اور نہ اس نے اپنا دل باہر لٹکا رکھا تھا۔ اندر کی بات کسی کو کیا معلوم؟

نہ معلوم ہو۔۔۔! پر متماکرے کسی کو معلوم نہ ہو۔۔۔ اگر کسی کو اندر کی بات کا پتہ چل گیا تو کیشو لاں کھاری سینگ والا کے لیے ڈوب مر نے کی بات تھی۔۔۔ گالیاں سن کر خاموش رہنا معمولی بات تھی کیا؟

معمولی بات نہیں بہت بڑی بات ہے۔۔۔ ہماليہ پہاڑ جتنی بڑی بات ہے۔ اس سے بھی بڑی بات ہے۔ اس کا غرور مٹی میں مل گیا ہے۔ اس کی ذلت ہوئی ہے۔ اس کی ناک کٹ گئی ہے۔۔۔ اس کا سب کچھ لٹ گیا ہے، چلو بھی چھٹی ہوئی۔ اب تو یہ گالیاں اس کا پچھا چھوڑ دیں۔۔۔ وہ کمینہ تھا۔ رذیل تھا۔ تنج تھا۔ گندگی صاف کرنے والا بھگکی تھا، کتا تھا۔۔۔ اس کو گالیاں مانا ہی چاہیے تھیں۔ نہیں نہیں، کسی کی کیا مجال تھی کہ اسے گالیاں دے اور پھر بغیر کسی قصور کے، وہ اسے کچانہ چباجاتا۔۔۔ اماں ہٹاؤ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔۔۔ تم نے تو سیٹھ سے یوں گالیاں سینیں جیسے میٹھی میٹھی بولیاں تھیں۔

میٹھی میٹھی بولیاں تھیں، بڑے مزے دار گونٹ تھے، چلو یہی سہی۔۔۔ اب تو میرا پچھا چھوڑ دو ورنہ سچ کہتا ہوں، دیوانہ ہو جاؤں گا۔۔۔ یہ لوگ جو بڑے آرام سے ادھر ادھر چل پھر رہے ہیں، میں ان میں سے ہر ایک کا سر پھوڑ دوں گا۔ بھگوان کی قسم مجھے اب زیادہ تاب نہیں

رہی۔ میں ضرور دیوانے کتے کی طرح سب کو کامنا شروع کر دوں گا۔ لوگ مجھے پاگل خانے میں بند کر دیں گے۔ اور میں دیواروں کے ساتھ اپنا سر ٹکرائکر مر جاؤں گا۔۔۔ مر جاؤں گا، سچ کہتا ہوں، مر جاؤں گا۔۔۔ مر جاؤں گا، سچ کہتا ہوں، مر جاؤں گا۔ اور میری رادھا ودھوا اور میرے بچے اناتھ ہو جائیں گے۔

یہ سب کچھ اس لیے ہو گا کہ میں نے سیٹھ سے دو گالیاں سنیں اور خاموش رہا جیسے میرے منہ پر تالاگا ہوا تھا۔ میں لولا، لنگڑا، اپاچ تھا۔۔۔ پر ماتما کرے میری ٹانگیں اس موڑ کے نیچے آ کر ٹوٹ جائیں، میرے ہاتھ کٹ جائیں۔۔۔ میں مر جاؤں تاکہ یہ بک بک تو ختم ہو۔۔۔ تو بہ۔۔۔ کوئی ٹھکانہ ہے اس دکھ کا۔۔۔ کپڑے پھاڑ کر ننگا ناچنا شروع کر دوں۔۔۔ اس ٹرام کے نیچے سردے دوں، زور زور سے چلانا شروع کر دوں۔۔۔ کیا کروں کیا نہ کروں؟“

یہ سوچتے ہوئے اسے ایک ایکی خیال آیا کہ بازار کے بیچ کھڑا ہو جائے، اور سب ٹریفک کروکر جو اس کی زبان پر آئے بکتا چلا جائے۔ حتیٰ کہ اس کا سینہ سارے کاسارا خالی ہو جائے۔ یا پھر اس کے جی میں آئی کہ کھڑے کھڑے یہیں سے چلانا شروع کر دے، ”مجھے بچاؤ۔۔۔ مجھے بچاؤ!“

انتہے میں ایک آگ بجھانے والا انہن سڑک پر ٹن کرتا آیا اور ادھر اس موڑ میں گم ہو گیا۔ اس کو دیکھ کروہ اونچی آواز میں کہنے ہی والا تھا، ”ٹھہر و۔۔۔ میری آگ بجھاتے جاؤ۔“ مگر نہ جانے کیوں رک گیا۔

ایک ایکی اس نے اپنے قدم تیز کر دیے۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس کی سانس رکنے لگی ہے اور اگر وہ تیز نہ چلے گا تو بہت ممکن ہے کہ وہ پھٹ جائے لیکن جو نہیں اس کی رفتار بڑھی۔ اس کا دماغ آگ کا ایک چکر سا ہیں گیا۔ اس چکر میں اس کے سارے پرانے اور نئے خیال ایک ہار کی صورت میں گندھ گئے۔۔۔ دو مینے کا کرا یہ، اس کا پتھر کی بلڈنگ میں درخواست لے کر جانا۔۔۔ سات منزلوں کے ایک سوابہ زینے، سیٹھ کی بھدی آواز، اس کے گنجے سر پر مسکراتا ہوا بھلی کالیسپ اور۔۔۔ یہ موٹی گالی۔۔۔ پھر دوسری۔۔۔ اور اس کی خاموشی۔۔۔ یہاں پہنچ کر آگ کے اس چکر میں تڑتڑ گولیاں سی ٹکلنا شروع ہو جاتیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا سینہ چلنی ہو گیا ہے۔

اس نے اپنے قدم اور تیز کیے اور آگ کا یہ چکر اتنی تیزی سے گھومنا شروع ہوا کہ شعلوں کی ایک بہت بڑی گیند سی بن گئی، جو اس کے آگے آگے زمین پر اچھلنے کو دنے لگی۔ وہ اب دوڑنے لگا۔ لیکن فوراً ہی خیالوں کی بھیڑ بھاڑ میں ایک نیا خیال بلند آواز میں چلا یا، ”تم کیوں بھاگ رہے ہو؟ کس سے بھاگ رہے ہو؟ تم بزدل ہو!“

اس کے قدم آہستہ آہستہ اٹھنے لگے۔ بریک سی لگ گئی، اور وہ ہو لے ہو لے چلنے لگا۔۔۔ وہ سچ مج بزدل تھا۔۔۔ بھاگ کیوں رہا تھا۔۔۔؟ اسے تو انقام لینا تھا۔۔۔ انقام۔۔۔ یہ سوچتے ہوئے اسے اپنی زبان پر لہو کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا۔ اور اس کے بدن میں ایک جھر جھری سی پیدا ہوئی۔ لہو۔۔۔ اسے آسمان زمین سب لہو ہی میں رنگے ہوئے نظر آنے لگے۔۔۔ لہو۔۔۔ اس وقت اس میں اتنی قوت تھی کہ پتھر کی رگوں میں سے بھی لہو نچوڑ سکتا تھا۔

اس کی آنکھوں میں لال ڈورے ابھر آئے۔ مٹھیاں بھینچ گئیں اور قدموں میں مضبوطی پیدا ہو گئی۔۔۔ اب وہ انقام پر تل گیا تھا! وہ بڑھا۔ آنے جانے والے لوگوں میں سے تیر کے مانند اپناراستہ بناتا آگے بڑھتا رہا۔۔۔ آگے۔۔۔ آگے! جس طرح تیز چلنے والی ریل گاڑی چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو چھوڑ جایا کرتی ہے، اسی طرح وہ بجلی کے کھمبوں، دوکانوں اور لمبے لمبے بازاروں کو اپنے پیچھے چھوڑتا آگے بڑھ رہا تھا۔ آگے۔۔۔ آگے۔۔۔ بہت آگے!

راستے میں ایک سینما کی رنگیں بلڈنگ آئی۔ اس نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اور اس کے پاس سے بے پرواہ ہوا کے مانند بڑھ گیا۔۔۔ وہ بڑھتا گیا۔

اندر ہی اندر اس نے اپنے ہر ذرے کو ایک بم بنا لیا تھا۔ تاکہ وقت پر کام آئے۔ مختلف بازاروں سے زہر لیلے سانپ کے مانند پھر کارتا ہوا وہ اپولوبندر پہنچا۔۔۔ اپولوبندر۔۔۔ گیٹ وے آف انڈیا کے سامنے بے شمار موڑیں قطار اندر قطار کھڑی تھیں۔ ان کو دیکھ کر اس نے یہ سمجھا کہ بہت سے گدھ پر جوڑے کسی کی لاش کے ارد گرد بیٹھے ہیں۔ جب اس نے خاموش سمندر کی طرف دیکھا تو اسے یہ ایک لمبی چوڑی لاش معلوم ہوئی۔۔۔ اس سمندر کے اس طرف ایک کونے میں لال لال روشنی کی لکیریں ہو لے ہو لے بل کھاری تھیں۔ یہ ایک عالی شان ہوٹل کی پیشانی کا بر قی نام تھا۔ جس کی لال روشنی سمندر کے پانی میں گد گدی پیدا کر رہی تھی۔

کیشو لاں کھاری سینگ والا اس عالی شان ہوٹل کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

اس برقی بورڈ کے عین نیچے قدم گاڑ کر اس نے اوپر دیکھا۔۔۔ سگین عمارت کی طرف۔۔۔ جس کے روشن کمرے چمک رہے تھے اور۔۔۔ اس کے حلق سے ایک نعرہ۔۔۔ کان کے پر دے پھاڑ دینے والا نعرہ۔۔۔ پھلے ہوئے گرم گرم لاوے کے مانند نکلا، ”ہت تیری!“

جتنے کبوتر ہو ٹل کی منڈیروں پر اوگھر رہے تھے، ڈر گئے اور پھر پھڑانے لگے۔

نعرہ مار کر جب اس نے اپنے قدم زمین سے بڑی مشکل کے ساتھ علیحدہ کیے اور واپس مڑا تو اسے اس بات کا پورا تلقین تھا کہ ہو ٹل کی سکین نعمارت اڑاڑا ڈھم نیچے گر گئی ہے۔

اور یہ نعرہ سن کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے جو یہ شور سن کر ڈر گئی تھی، کہا، ”پگلا ہے!“

-[76]-

دس روپے: سعادت حسن منٹو

وہ گلی کے اس نکٹ پر چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اور اس کی ماں اسے چالی (بڑے مکان جس میں کئی منزلیں اور کئی چھوٹے چھوٹے کمرے ہوتے ہیں) میں ڈھونڈ رہی تھی۔ کشوری کو اپنی کھولی میں بٹھا کر اور باہر والے سے کافی ملی چائے لانے کے لیے کہہ کر وہ اس چالی کی تینیوں منزلوں میں اپنی بیٹی کو ملاش کر چکی تھی۔ مگر جانے وہ کہاں مر گئی تھی۔ سنڈاں کے پاس جا کر بھی اس نے آواز دی، ”اے سریتا!... سریتا!“ مگر وہ تو چالی میں تھی ہی نہیں اور جیسا کہ اس کی ماں سمجھ رہی تھی، اب اسے پچپس کی شکایت بھی نہیں تھی۔ دوا پیے بغیر اس کو آرام آچا تھا۔ اور وہ باہر گلی کے اس نکٹ پر جہاں کچرے کا ڈھیر پڑا رہتا ہے، چھوٹی چھوٹی لڑکیوں سے کھیل رہی تھی اور ہر قسم کے فکر و تردید سے آزاد تھی۔

اس کی ماں بہت متقدیر تھی۔ کشوری اندر کھولی میں بیٹھا تھا۔ اور جیسا کہ اس نے کہا تھا، دو سیٹھ بہر بڑے بازار میں موڑ لیے کھڑے تھے لیکن سریتا کہیں غائب ہی ہو گئی تھی۔ موڑ والے سیٹھ ہر روز تو آتے ہی نہیں، یہ تو کشوری کی مہربانی ہے کہ مہینے میں ایک دوبار موٹی اسمائی لے آتا ہے۔ ورنہ ایسے گندے محلے میں جہاں پان کی پیکیوں اور جلی ہوئی بیڑیوں کی ملی جلی بوسے کشوری گھبرا تا ہے، سیٹھ لوگ کیسے آسکتے ہیں۔ کشوری چونکہ ہوشیار ہے اس لیے وہ کسی آدمی کو مکان پر نہیں لاتا بلکہ سریتا کو کپڑے و پڑے پہنا کر باہر لے جایا کرتا ہے اور ان لوگوں سے کہہ دیا کرتا ہے کہ، ”صاحب لوگ آج کل زمانہ بڑا نازک ہے۔ پولیس کے سپاہی ہر وقت گھات میں لگے رہتے ہیں۔ اب تک دوسو ہندرا کرنے والی چھوکریاں پکڑی جا چکی ہیں۔ کورٹ میں میرا بھی ایک کیس چل رہا ہے۔ اس لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔“

سریتا کی ماں کو بہت غصہ آرہا تھا۔ جب وہ نیچے اتری تو سیر ہیوں کے پاس رام دی بیٹھی ہیڑیوں کے پتے کاٹ رہی تھی۔ اس سے سریتا کی ماں نے پوچھا، ”تو نے سریتا کو کہیں دیکھا ہے؟ جانے کہاں مر گئی ہے، بس آج مجھے مل جائے وہ چار چوٹ کی مار دوں کہ بند بند ڈھیلا ہو جائے۔۔۔ لوٹھا کی لوٹھا ہو گئی ہے پر سارا دن لوڑوں کے ساتھ کد کڑے لگاتی رہتی ہے۔“

رام دی بیڑیوں کے پتے کاٹتی رہی اور اس نے سریتا کی ماں کو جواب نہ دیا۔ دراصل رام دی سے سریتا کی ماں نے کچھ پوچھا ہی نہیں تھا، وہ یوں نہیں بڑھاتی ہوئی اس کے پاس سے گزرنگی۔ جیسا کہ اس کا عام دستور تھا۔ ہر دوسرے تیسرا دن اسے سریتا کو ڈھونڈنا پڑتا تھا اور رام دی کو جو کہ سارا دن سیر ہیوں کے پاس پڑا رہا سامنے رکھے ہیڑیوں پر لال اور سفید دھاگے پیٹھی رہتی تھی مخاطب کر کے یہی الفاظ دہرا یا کرتی تھی۔

ایک اور بات وہ چالی کی ساری عورتوں سے کہا کرتی تھی، ”میں تو اپنی سریتا کا کسی باپو سے بیاہ کروں گی۔۔۔ اسی لیے تو اس سے کہتی ہوں کہ کچھ پڑھ لکھ لے۔۔۔ یہاں پاس ہی ایک اسکول منی پاٹی (میونسپلی) نے کھولا ہے۔ سوچتی ہوں اس میں سریتا کو داخل کر دوں، یہن اس کے پتا کو بڑا شوق تھا کہ میری لڑکی لکھی پڑھی ہو۔۔۔“ اس کے بعد وہ ایک لمبی آہ بھر کر عام طور پر اپنے مرے ہوئے شوہر کا قصہ چھیڑ دیتی تھی۔ جو چالی کی ہر عورت کو زبانی یاد تھا۔ رام دی سے اگر آپ پوچھیں کہ اچھا جب سریتا کے باپ کو جو ریلوائی میں کام کرتا تھا، بڑے صاحب نے گالی دی تو کیا ہوا تو رام دی فوراً آپ کو بتا دے گی کہ سریتا کے باپ کے منہ میں جھاگ بھر آیا اور وہ صاحب سے کہنے لگا۔ ”میں تمہارا نوکر نہیں ہوں۔ سرکار کا نوکر ہوں۔ تم مجھ پر رعب نہیں جما سکتے۔ دیکھو اگر پھر گالی دی تو یہ دونوں جبڑے حلق کے اندر کر دوں گا۔“ بُس پھر کیا تھا۔ صاحب تاؤ میں آگئی، اور اس نے ایک اور گالی سنادی۔ اس پر سریتا کے باپ نے غصے میں آکر صاحب کی گردن پر دھول جما دی کہ اس کاٹوپ دس گن پر جا گر اور اس کو دن میں تارے نظر آگئے۔ مگر پھر بھی وہ بڑا آدمی تھا آگے بڑھ کر اس نے سریتا کے باپ کے پیٹ میں اپنے فوجی بوٹ سے اس زور کی ٹھوک کر ماری کہ اس کی تلی پھٹ گئی اور وہیں لاکنوں کے پاس گر کر اس نے جان دے دی۔ سرکار نے صاحب پر مقدمہ چلایا اور پورے پانچ سوروپے سریتا کی ماں کو اس سے دلوائے مگر قسمت بری تھی۔ اس کو سٹہ کھلینے کی چاٹ پڑ گئی۔ اور پانچ مہینے کے اندر اندر سارا روپیہ بر باد ہو گیا۔

سریتا کی ماں کی زبان پر ہر قت یہ کہانی جاری رہتی تھی لیکن کسی کو یقین نہیں تھا کہ یہ حق ہے یا جھوٹ۔ چالی میں سے کسی آدمی کو بھی سریتا کی ماں سے ہمدردی نہ تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ سب کے سب خود ہمدردی کے قابل تھے، کوئی کسی کا دوست نہیں تھا۔ اس بلڈنگ میں اکثر آدمی ایسے رہتے تھے جو دن بھر سوتے تھے اور رات کو جا گئے تھے۔ کیونکہ انھیں رات کو پاس والی مل میں کام پر جانا ہوتا تھا۔ اس بلڈنگ میں سب آدمی بالکل پاس پاس رہتے تھے لیکن کسی کو ایک دوسرے سے دلچسپی نہ تھی۔

چالی میں قریب قریب سب لوگ جانتے تھے کہ سریتا کی ماں اپنی جوان بیٹی سے پیشہ کرتی ہے لیکن چونکہ وہ کسی کے ساتھ اچھا برا سلوک کرنے کے عادی ہی نہ تھے، اس لیے سریتا کی ماں کو کوئی جھللانے کی کوشش نہ کرتا تھا۔ جب وہ کہا کرتی تھی میری بیٹی کو تو دنیا کی کچھ خبر ہی نہیں۔ البتہ ایک روز صحیح سویرے نل کے پاس جب تکارام نے سریتا کو چھیرا تھا تو سریتا کی ماں بہت چینی چلائی تھی۔ اس موئے گنجے کو تو کیوں سنبھال کے نہیں رکھتی۔

”پر ماتما کرے دونوں آنکھوں سے انداہا ہو جائے جن سے اس نے میری کنواری بیٹی کی طرف بری نظر وہ سے دیکھا۔۔۔ سچ کہتی ہوں ایک روز ایسا فساد ہو گا کہ اس تیری سوغات کا مارے جو توں کے سر پلپلا کر دوں گی۔۔۔ باہر جو چاہے کرتا پھرے یہاں اسے بھلے مانسوں کی طرح رہنا ہو گا۔ سننا!“

اور یہ سن کرتکارام کی بھینگی بیوی دھوتی باندھتے باندھتے باہر نکل آئی، ”خبردار موئی چڑیل جو تو نے ایک لفظ بھی اور زبان سے نکالا۔۔۔ یہ تیری دیوی توہو ٹل کے چھوکروں سے بھی آنکھ مچوی کھلیتی ہے اور تو کیا ہم سب کو انداہا سمجھتی ہے کیا ہم سب جانتے نہیں کہ تیرے گھر میں نت نئے باپوکس لیے آتے ہیں۔ اور یہ تیری سریتا آئے دن بن سنور کر بہر کیوں جاتی ہے۔۔۔ بڑی آئی عزت آبرو والی۔۔۔ جاجادور دفان ہو یہاں سے۔“

تکارام کی بھینگی بیوی کے متعلق بہت سی باتیں مشہور تھیں۔ لیکن یہ بات خاص طور پر سب لوگوں کو معلوم تھی کہ گھانسلیٹ والا (مٹی کا تیل بیچنے والا) تیل دینے کے لیے آتا ہے تو وہ اسے اندر بلا کر دروازہ بند کر لیا کرتی ہے۔ چنانچہ سریتا کی ماں نے اس خاص بات پر بہت زور دیا۔ وہ بار بار نفرت بھرے لجھے میں اس سے کہتی، ”وہ تیرا یار گھانسلیٹ والا۔۔۔ دو دو گھنٹے اسے کھوئی میں بٹھا کر کیا تو اس کا گھانسلیٹ سو نگھتی رہتی ہے؟“

تکارام کی بیوی سے سریتا کی ماں کی بول چال زیادہ دیر تک بند نہ رہی تھی کیونکہ ایک روز سریتا کی ماں نے رات کو اپنی اس پڑوسن کو گھپ اندر ہیرے میں کسی سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے کپڑ لیا تھا اور دوسرے ہی روز تکارام کی بیوی نے جب وہ رات کو پائے دھونی کی طرف سے آرہی تھی، سریتا کو ایک جنگل میں آدمی کے ساتھ موڑ میں میٹھے دیکھ لیا۔ چنانچہ ان دونوں کا آپس میں سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ اسی لیے سریتا کی ماں نے تکارام کی بیوی سے پوچھا، ”تو نے کہیں سریتا کو نہیں دیکھا؟“

تکارام کی بیوی نے جھینگی آنکھ سے گلی کے نکڑ کی طرف دیکھا، ”واہ گھورے کے پاس پٹواری کی لوڈیا سے کھیل رہی ہے۔“ پھر اس نے آواز دھیمی کر کے اس سے کہا، ”ابھی ابھی کشوری اوپر گیا تھا کیا تجھ سے ملا؟“

سریتا کی ماں نے ادھر ادھر دیکھ کر ہولے سے کہا، ”اوپر بیٹھا آئی ہوں پر یہ سریتا ہمیشہ وقت پر کہیں غائب ہو جاتی ہے۔ کچھ سوچتی نہیں۔
بس دن بھر کھیل کو دچاہیے۔“

یہ کہہ کر وہ گھورے کی طرف بڑھی اور جب سینٹ کی بنی ہوئی موڑتی (پیشتاب گاہ) کے پاس آئی تو سریتا فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے چہرے پر افسردگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اس کی ماں نے خشم آلو دل بجھے میں اس کا بازو پکڑ کر کہا، ”چل گھر میں چل کے مر۔۔۔ تجھے تو سوائے اچھل کو دکے اور کوئی کام ہی نہیں۔“ پھر راستے میں اس نے ہولے سے کہا، ”کشوری بڑی دیر سے آیا بیٹھا ہے، ایک موڑوا لے سیٹھ کو بلا یا ہے۔۔۔ چل تو بھاگ کے اوپر چل اور جلدی تیار ہو جا۔۔۔ اور سن۔۔۔ وہ نیلی جارجٹ کی سماڑی پہن۔۔۔ اور دیکھ یہ تیرے بال بھی بہت بری طرح بکھر رہے ہیں۔۔۔ تو جلدی تیار ہو۔ کنگھی میں کر دوں گی۔“

یہ سن کر کہ موڑوا لے سیٹھ آئے ہیں، سریتا بہت خوش ہوئی۔ اسے سیٹھ سے اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنا کہ موڑ سے تھی۔ موڑ کی سواری اسے بہت پسند تھی۔ جب موڑ فرائٹ بھرتی کھلی کھلی سڑکوں پر چلتی اور اس کے منہ پر ہوا کے طما نچ پڑتے، تو اس کے دل میں ایک ناقابل بیان مسرت اپنانشروع ہو جاتی۔ موڑ میں بیٹھ کر اس کو ہرشے ایک ہوائی چکر دکھائی دیتی اور سمجھتی کہ وہ خود ایک بگولا ہے جو سڑکوں پر اڑتا چلا جا رہا ہے۔

سریتا کی عمر زیادہ سے زیادہ پندرہ برس کی ہو گی۔ مگر اس میں بچپنا تیرہ برس کی لڑکیوں کا ساتھا۔ عورتوں سے ملنا جانا اور ان سے باتیں کرنا بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ سارا دن چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ اونٹ پلانگ کھیلوں میں مصروف رہتی۔ ایسے کھیل جن کا کوئی مطلب ہی نہ ہو۔ مثال کے طور پر وہ گلی کے کالے لُک پھرے فرش پر کھریا مٹی سے لکیریں کھینچنے میں بہت دلچسپی لیتی تھی اور اس کھیل میں وہ اس انہاک سے مصروف رہتی جیسے سڑک پر یہ ٹیڑھی بگلی لکیریں اگرنہ کھینچی گئیں تو آمد و رفت بند ہو جائے گی، اور پھر کھولی سے پرانے ٹاط اٹھا کر وہ اپنی ننھی سہیلیوں کے ساتھ کئی گھنٹے ان کو فٹ پاٹھ پر جھکلنے صاف کرنے، بچانے اور ان پر بیٹھنے کے غیر دلچسپ کھیل میں مشغول رہتی تھی۔

سریتا خوبصورت نہیں تھی۔ رنگ اس کا سیاہی مائل گندمی تھا۔ بمبیت کے مرطوب موسم کے باعث اس کے چہرے کی جلد ہر وقت چکنی رہتی تھی۔ اور پتلے پتلے ہو نٹوں پر جو چیکو (ایک پھل جس کا رنگ گندمی ہوتا ہے) کے چھکلے دکھائی دیتے تھے، ہر وقت خفیف سی لرزش طاری رہتی تھی۔ اوپر کے ہونٹ پر پسینے کی تین چار ناخنی ناخنی بوندیں ہمیشہ کپکپائی رہتی تھیں۔

اس کی صحت اچھی تھی۔ غلاظت میں رہنے کے باوجود اس کا جسم سڑوں اور مناسب تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پر جوانی کا حملہ بڑی شدت سے ہوا ہے جس نے مخالف قوتوں کو دبا کر رکھ دیا ہے۔ قد چھوٹا تھا جو اس کی تندرتستی میں اضافہ کرتا تھا۔ سڑک پر پھرتی سے ادھر ادھر چلتے ہوئے جب اس کی میلی گھنگری اوپر کو اٹھ جاتی تو کئی راہ چلنے والے مردوں کی نگاہیں اس کی پنڈلیوں کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ جن میں جوانی کے باعث تازہ رنده کی ہوئی ساگوان کی لکڑی جیسی چمک دکھائی دیتی تھی۔ ان پنڈلیوں پر جو بالوں سے بالکل بے نیاز تھیں۔ مساموں کے نئھے نئھے نشان دیکھ کر ان سنگروں کے چھکلے یاد آجاتے تھے جن کے چھوٹے چھوٹے خلیوں میں تیل بھرا ہوتا ہے اور جو تھوڑے سے دباو پر فوارے کی طرح اوپر اٹھ کر آنکھوں میں گھس جایا کرتا ہے۔

سریتا کی بائیں بھی سڑوں تھیں۔ کندھوں پر ان کی گولائی موٹے اور بڑے بیڈھب طریقے پر سلے ہوئے بلا ذکر کے باوجود باہر جھانکتی تھی۔ بال بڑے گھنے اور لمبے تھے۔ ان میں سے کھوپرے کے تیل کی بوآتی رہتی تھی۔ ایک موٹے کوڑے کے مانند اس کی چوٹی پیٹھ کو تکھنی رہتی تھی۔ سریتا اپنے بالوں کی لمبائی سے خوش نہیں تھی کیونکہ کھیل کو دے کے دوران میں اس کی چوٹی اسے بہت تکلیف دیا کرتی تھی اور اسے مختلف طریقوں سے اس کو قابو میں رکھنا پڑتا تھا۔

سریتا کا دل و دماغ ہر قسم کے فکر و تردد سے آزاد تھا۔ دونوں وقت اسے کھانے کو مل جاتا تھا۔ اس کی ماں گھر کا سب کام کا ج کرتی تھی۔ صبح کو سریتا دو بالیاں بھر کر اندر رکھ دیتی اور شام کو ہر روز لیپ میں ایک پیسے کا تیل بھروالا تھا۔ کئی برسوں سے وہ یہ کام بڑی باقاعدگی سے کر رہی تھی۔ چنانچہ شام کو عادت کے باعث خود بخود اس کا ہاتھ اس پیالے کی طرف بڑھتا جس میں پیسے پڑے رہتے تھے اور لیپ پٹھا کر وہ نیچے چلی جاتی۔

کبھی کبھی یعنی مہینے میں چار پانچ بار جب کشوری سیٹھ لوگوں کو لاتا تھا تو ان کے ساتھ ہوٹل میں یا باہر اندر ہیرے مقاموں پر جانے کو وہ تفریخ خیال کرتی تھی۔ اس نے اس باہر جانے کے سلسلے کے دوسرے پہلوؤں پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ شاید یہ سمجھتی تھی کہ دوسرا لڑکیوں کے گھر میں بھی کشوری جیسے آدمی آتے ہوں گے اور ان کو سیٹھ لوگوں کے ساتھ باہر جانا پڑتا ہو گا۔ اور وہاں رات کو ورنی کے ٹھنڈے ٹھنڈے نچوں پر یا جو ہو کی گیلی ریت پر جو کچھ ہوتا ہے سب کے ساتھ ہوتا ہو گا۔ چنانچہ اس نے ایک بار اپنی ماں سے کہا تھا، ”ماں اب تو

شانتا بھی کافی بڑی ہو گئی۔۔۔ اس کو بھی میرے ساتھ بھیج دوں۔۔۔ یہ سیٹھ جواب آئے ہیں، مجھے انڈے کھانے کو دیا کرتے ہیں اور شانتا کو انڈے بہت بھاتے ہیں۔“ اس پر اس کی ماں نے بات گول مول کر دی تھی، ”ہاں ہاں کسی روز اس کو بھی تمہارے ساتھ بھیج دوں گی۔ اس کی ماں پونہ سے واپس تو آجائے۔“

اور سریتا نے دوسرے روز ہی شانتا کو جب وہ سنداں سے نکل رہی تھی، یہ خوش خبری سنائی تھی، ”تیری ماں پونہ سے آجائے تو سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ تو بھی میرے ساتھ ورلی جایا کرے گی۔“ اور اس کے بعد سریتا نے اس کورات کی بات پچھا اس طریقے پر پینا شروع کی تھی جیسے اس نے ایک ہی پیارا سپنا دیکھا ہے۔ شانتا کو جو سریتا سے دو برس چھوٹی تھی یہ بتیں سن کر ایسا لگا تھا جیسے اس کے سارے جسم کے اندر نہیں نہیں گھنگھروں کر رہے ہیں۔ سریتا کی سب باتیں سن کر بھی اس کو تسلی نہ ہوئی تھی اور اس کا بازو کھینچ کر اس نے کہا تھا، ”چل نچے چلتے ہیں۔۔۔ وہاں بتیں کریں گے۔“ اور نیچے اس موترا کے پاس جہاں گردھاری بنیانے بہت سے ٹالوں پر کھوپرے کے میلے ٹکڑے سکھانے کے لیے ڈال رکھتے تھے، وہ دونوں دیر تک کپکپی کرنے والی بتیں کرتی رہی تھیں۔

اس وقت بھی جب کہ سریتا دھوتی کے پردے کے پیچھے نیلی جارجٹ کی ساڑھی پہن رہی تھی، کپڑے کے مسہی سے اس کے بدن پر گد گدی ہو رہی تھی اور موڑ کی سیر کا نیاں اس کے دماغ میں پرندوں کی پھٹ پھٹ اہمیں پیدا کر رہا تھا۔ اب کی بار سیٹھ کیسا ہو گا اور اسے کہاں لے جائے گا۔ یہ اور اسی قسم کے اور سوال اس کے دماغ میں نہیں آرہے تھے۔ البتہ جلدی کپڑے بدلتے ہوئے اس نے ایک دو مرتبہ یہ ضرور سوچا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ موڑ چلے اور چند ہی منٹوں میں کسی ہوٹل کے دروازے پر ٹھہر جائے اور ایک بند کمرے میں سیٹھ شراب پینا شروع کر دیں اور اس کا دم گھٹانا شروع ہو جائے۔ اسے ہوٹلوں کے بند کمرے پسند نہیں تھے۔ جن میں عام طور پر لوہے کی دو چار پائیاں اس طور پچھی ہوتی تھیں گویا ان پر جی بھر کے سونے کی اجازت ہی نہیں ہے۔

جلدی جلدی اس نے جارجٹ کی ساڑھی پہنی اور اس کی ٹکنیں درست کرتی ہوئی ایک لمحے کے لیے کشوری کے سامنے آکھڑی ہوئی، ”کشوری، ذرا دیکھو۔۔۔ پیچھے سے ساڑھی ٹھیک ہے نا؟“ اور جواب کا منتظر کیے بغیر وہ لکڑی کے اس ٹوٹے ہوئے بکس کی طرف بڑھی جس میں اس نے جاپانی سرخی رکھی ہوئی تھی۔۔۔ ایک دھنڈ لے آئینے کو کھڑکی کی سلاخوں میں انکا کر اس نے دوہری ہو کر اپنے گالوں پر پوڈر لگایا اور سرخی لگا کر جب بالکل تیار ہو گئی تو مسکرا کر کشوری کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔

شوخ رنگ کی نیلی ساڑھی میں، ہونٹوں پر بے ترتیبی سے سرخی کی دھڑی جمائے اور سانوں لے گالوں پر بیازی رنگ کا پوڈر ملے وہ مٹی کا ایک ایسا کھلونا معلوم ہوئی جو دیواری پر کھلونے بیچنے والوں کی دکان میں سب سے زیادہ نمایاں دکھائی دیا کرتا ہے۔

انتہے میں اس کی ماں آگئی۔ اس نے جلدی جلدی سریتا کے بال درست کیے اور کہا، ”دیکھو بیٹا اچھی اچھی باتیں کرنا۔۔۔ اور جو کچھ وہ کہیں مان لینا۔۔۔ یہ سیٹھ جو آئے ہیں نا بڑے آدمی ہیں موڑ ان کی اپنی ہے۔۔۔“ پھر کشوری سے مخاطب ہو کر کہا، ”اب تو جلدی سے لے جا اسے۔۔۔ بچارے کب کے کھڑے راہ دیکھ رہے ہوں گے۔“

باہر بڑے بازار میں جہاں ایک کارخانے کی لمبی دیوار دور تک چلی گئی ہے۔ ایک پیلے رنگ کی موڑ ”یہاں پیشتاب کرنا منع ہے۔“ کے چھوٹے سے بورڈ کے پہلو میں کھڑی تھی اور تین حیدر آبادی نوجوان اپنی اپنی ناک پر رومال رکھے کشوری کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ موڑ آگے لے جاتے مگر مصیبت یہ ہے کہ دیوار دور تک چلی گئی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی پیشتاب کا سلسلہ بھی۔

جب گلی کے موڑ سے اس نوجوان کو جو موڑ کا بینڈل تھامے بیٹھا تھا۔ کشوری نظر آیا تو اس نے اپنے باقی دوسرا تھیوں سے کہا۔ ”لو بھی آگئے۔۔۔ یہ کشوری۔۔۔ اور۔۔۔ اور“ اس نے موڑ کی طرف نگاہیں جائے رکھیں، ”اور۔۔۔ اور۔۔۔ ارے یہ تو بالکل ہی چھوٹی لڑکی ہے۔۔۔ ذرا تم بھی دیکھو نا۔۔۔ ارے بھی وہ۔۔۔ وہ نیلی ساڑھی میں۔“

جب کشوری اور سریتا دونوں موڑ کے پاس آگئے تو پچھلی سیٹ پر جو دو نوجوان بیٹھے تھے۔ انہوں نے درمیان میں سے اپنے ہبیث وغیرہ اٹھا لیے۔ اور جگہ خالی کر دی۔ کشوری نے آگے بڑھ کے موڑ کے پچھلے حصے کا دروازہ کھولا اور پھر تی سے سریتا کو اندر داخل کر دیا۔ دروازہ بند کر کے کشوری نے اس نوجوان سے جو موڑ کا بینڈل تھامے تھا۔ کہا، ”معاف کیجیے گا دیر ہو گئی۔۔۔ یہ باہر اپنی کسی سیمی کے پاس گئی ہوئی تھی۔۔۔ تو۔۔۔ تو؟“

نوجوان نے مر کر سریتا کی طرف دیکھا۔ اور کشوری سے کہا، ”ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن دیکھو۔“ سر کر کر موڑ کی اس کھڑی میں سے اس نے اپنا سر باہر نکلا اور ہولے سے کشوری کے کان میں کہا۔۔۔ ”شور وور تو نہیں مچائے گی؟“

کشوری نے اس کے جواب میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا، ”سیٹھ، آپ مجھ پر بھروسہ رکھیے۔“

یہ سن کر اس نوجوان نے جیب میں سے دوروپے نکالے اور کشوری کے ہاتھ میں تھما دیے، ”جا عیش کرو۔“ کشوری نے سلام کیا اور موڑ اسٹارٹ ہوئی۔

شام کے پانچ بجے تھے۔ بمبئی کے بازاروں میں گاڑیوں، ٹراموں، بسوں اور لوگوں کی آمد و رفت بہت زیادہ تھی۔ سریتا خاموشی سے دو آدمیوں کے نیچے میں دبکی بیٹھی رہی۔ بار بار اپنی رانوں کو جوڑ کر اوپر ہاتھ رکھ دیتی اور کچھ کہتے کہتے خاموش ہو جاتی۔ وہ دراصل موڑ چلانے والے نوجوان سے کہنا چاہتی تھی، ”سیٹھ جلدی جلدی موڑ چلاو۔۔۔ میرا تو یوں دم گھٹ جائے گا۔“

بہت دیر تک موڑ میں کسی نے ایک دوسرے سے بات نہ کی۔ موڑ والا موڑ چلاتا رہا۔ اور پچھلی سیٹ پر دونوں حیدر آبادی نوجوان اپنی اچکنوں میں وہ اضطراب چھپاتے رہے جو پہلی دفعہ ایک نوجوان لڑکی کو بالکل اپنے پاس دیکھ کر انھیں محسوس ہو رہا تھا۔۔۔ ایسی نوجوان لڑکی جو کچھ عرصے کے لیے ان کی اپنی تھی یعنی جس سے وہ بلا خوف و خطر چھیڑ چھاڑ کر سکتے تھے۔

وہ نوجوان جو موڑ چلا رہا تھا، دو برس سے بمبئی میں قیام پذیر تھا اور سریتا جیسی کئی لڑکیاں دن کے اجالے اور رات کے اندھیرے میں دیکھ چکا تھا۔ اس کی پہلی موڑ میں مختلف رنگ و نسل کی چھوکریاں داخل ہو چکی تھیں۔ اس لیے اسے کوئی خاص بے چینی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ حیدر آباد کے اس کے دو دوست آئے تھے، ان میں سے ایک جس کا نام شہاب تھا۔ جو بمبئی میں پوری طرح سیر و تفریق کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کفایت نے یعنی موڑ کے مالک نے ازراہ دوست نوازی کشوری کے ذریعہ سے سریتا کا انتظام کر دیا تھا۔ دوسرے دوست انور سے کفایت نے کہا کہ بھی تمہارے لیے بھی ایک رہے تو کیا بہرج ہے۔ مگر اس میں چونکہ اخلاقی قوت کم تھی۔ اس لیے شرم کے مارے وہ یہ نہ کہہ سکا کہ ہاں بھی میرے لیے بھی ایک رہے۔

کفایت نے سریتا کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ کشوری بہت دیر کے بعد یہ نئی چھوکری نکال کر لایا تھا۔ لیکن اس نئے پن کے باوجود اس نے ابھی تک اس سے دلچسپی نہیں کی۔ شاید اس لیے کہ وہ ایک وقت میں صرف ایک کام کر سکتا تھا۔ موڑ چلانے کے ساتھ ساتھ وہ سریتا کی طرف دھیان نہیں دے سکتا تھا۔

جب شہر ختم ہو گیا اور موڑ مضائقات کی سڑک پر چلنے لگی تو سریتا اچھل پڑی۔ وہ دباو جواب تک اس نے اپنے اوپر ڈال رکھا تھا، ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں اور اڑتی ہوئی موڑ نے ایک دم اٹھادیا۔ اور سریتا کے اندر بجلیاں سی دوڑ گئیں۔ وہ سریتا پا حر کرت بن گئی۔ اس کی ٹانگیں تھر کنے لگیں۔ بازو ناپنے لگے، انگلیاں کپکپانے لگیں اور وہ اپنے دونوں طرف بھاگتے ہوئے درختوں کو دوڑتی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

اب انور اور شہاب آرام محسوس کر رہے تھے۔ شہاب نے جو سریتا پر اپنا حق سمجھتا تھا، ہولے سے اپنا بازو اس کی کمر میں حائل کرنا چاہا، ایک دم سریتا کے گدگدی انٹھی۔ تڑپ کروہ انور پر جا گری۔ اور پیلی موڑ کی کھڑکیوں میں سے دور تک سریتا کی ہنسی بھتی گئی۔ شہاب نے جب ایک بار پھر اس کی کمر کی طرف ہاتھ بڑھایا تو سریتا دوہری ہو گئی اور ہنستے ہنستے اس کا براحال ہو گیا۔ انور ایک کونے میں دبکارہ اور منہ میں تھوک پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

شہاب کے دل و دماغ میں شوخ رنگ بھر گئے۔ اس نے کفایت سے کہا، ”واللہ بڑی کراری لوٹ دیا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے زور سے سریتا کی ران میں چلتی بھری۔ سریتานے اس کے جواب میں انور کا ہولے سے کان مر ڈیا۔ اس لیے کہ وہ اس کے بالکل پاس تھا۔ موڑ میں قہقہے ابلنے لگے۔

کفایت بار بار موڑ کر دیکھتا تھا۔ حالانکہ اسے اپنے سامنے چھوٹے سے آئینے میں سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ قہقہوں کے زور کا ساتھ دینے کی خاطر اس نے موڑ کی رفتار بھی تیز کر دی۔

سریتا کا جی چاہا کہ باہر نکل کر موڑ کے منہ پر بیٹھ جائے جہاں لو ہے کی اڑتی ہوئی پری گئی تھی۔ وہ آگے بڑھی۔ شہاب نے اسے چھیڑا، سو سنہلنے کی خاطر اس نے کفایت کے گلے میں اپنی باہیں جماکل کر دیں۔ کفایت نے غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھ چوم لیے۔ ایک سنہنی سی سریتا کے جسم میں دوڑ گئی اور پھاند کر اگلی سیٹ پر کفایت کے پاس بیٹھ گئی۔ اور اس کی ٹائی سے کھلینا شروع کر دیا، ”تمہارا نام کیا ہے؟“ اس نے کفایت سے پوچھا۔

”میرا نام!“ کفایت نے پوچھا، ”میرا نام کفایت ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

سریتานے اس کے نام کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور نوٹ اپنی چوپی میں اڑس کر بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا، ”تم بہت اچھے آدمی ہو۔۔۔ تمہاری یہ ٹائی بہت اچھی ہے۔“ اس وقت سریتا کو ہر شے اچھی نظر آ رہی تھی۔۔۔ وہ چاہتی تھی کہ جو برے بھی ہیں اچھے ہو جائیں۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ پھر ایسا ہو، ایسا ہو۔۔۔ کہ موڑ تیز دوڑتی رہے اور ہر شے ہوا تیک گولا بن جائے۔ ایک دم اس کا جی چاہا کہ گائے، چنانچہ اس نے کفایت کی ٹائی سے کھلینا بند کر کے گانا شروع کر دیا۔

تمہیں نے مجھ کو پریم سکھایا

سوئے ہوئے ہر دے کو جگایا

کچھ دیر یہ فلمی گیت گانے کے بعد سریتا ایک دم پیچھے مڑی اور انور کو خاموش دیکھ کر کہنے لگی، ”تم کیوں چپ چاپ بیٹھے ہو۔۔۔ کوئی بات کرو۔۔۔ کوئی گیت گاؤ۔۔۔“ یہ کہتی ہوئی وہ اچک کر پچھلی سیٹ پر چلی گئی اور شہاب کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی، ”آؤ ہم دونوں گائیں۔ تمہیں یاد ہے وہ گانا جو دیویکارانی نے گایا تھا۔۔۔ میں بن کے چڑیا بن کے بولوں رے۔۔۔ دیویکارانی کتنی اچھی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنی ٹھوڑی کے نیچے رکھ لیے اور آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ اشوک کمار اور دیویکارانی پاس پاس کھڑے تھے۔۔۔ دیویکارانی کہتی تھی۔۔۔ میں بن کی چڑیا بن کے بن بن بولوں رے۔۔۔ اور اشوک کمار کہتا تھا۔۔۔ تم کہونا۔“

سریتانے گانا شروع کر دیا۔ ”میں بن کی چڑیا بن کے بن بن بولوں رے“

شہاب نے بحمدی آواز میں گایا، ”میں بن کا پچھجھی بن کے بن بن بولوں رے“

اور پھر باقاعدہ ڈوٹ شروع ہو گیا۔ کفایت نے موڑ کا ہارن بجا کر تال کا ساتھ دیا۔ سریتانے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ سریتا کا باریک سر، شہاب کی پچھی ہوئی آواز، ہارن کی پوں پوں، ہوا کی سائیں سائیں اور موڑ کے انجن کی پھر پھر اہٹ یہ سب مل جل کر ایک آر کسٹر این گئے۔

سریتا خوش تھی، شہاب خوش تھا، کفایت خوش تھا۔ ان سب کو خوش دیکھ کر انور کو بھی خوش ہونا پڑا۔ وہ دل میں بہت شرمندہ ہوا کہ خواہ مخواہ اس نے اپنے کو قید کر کھا ہے۔ اس کے بازوؤں میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کے سوئے ہوئے جذبات نے انگڑائیاں لیں اور وہ سریتا، شہاب اور کفایت کی شور افشاں خوشی میں شریک ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔

گاتے گاتے سریتانے انور کے سر سے اس کا ہیئت اتار کر اپنے سر پر پہن لیا اور یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کے سر پر کیسا لگتا ہے، اچک کر اگلی سیٹ پر چلی گئی اور نئے سے آئئے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔۔۔ انور سوچنے لگا کہ کیا موڑ میں وہ شروع ہی سے ہیئت پہنے بیٹھا تھا۔ سریتانے زور سے کفایت کی موٹی ران پر طما نچ مارا۔ ”اگر میں تمہاری پتلوں پہن لوں اور تمیص پہن کر ایسی ٹائی رکالوں تو کیا پورا صاحب نہ بن جاؤں؟“

یہ سن کر شہاب کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ چنانچہ اس نے انور کے بازوؤں کو جھنجور دیا۔ ”واللہ تم نرے چغدر ہو۔“ اور انور نے تھوڑی دیر کے لیے محسوس کیا کہ وہ واقعی بہت بڑا چغدر ہے۔

کفایت نے سریتا سے پوچھا، ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”میرا نام“ سریتا نے ہیٹ کے فیتے کو اپنی ٹھوڑی کے نیچے جاتے ہوئے کہا، ”میرا نام سریتا ہے۔“

شہاب چھلی سیٹ سے بولا، ”سریتا تم عورت نہیں چھلھڑی ہو۔“

انور نے کچھ کہنا چاہا مگر سریتا نے اونچے سروں میں گانا شروع کر دیا۔

چھپے یم نگر میں بناؤں گی گھر میں تج کے سب سن سا آر

کفایت اور شہاب کے دل میں بیک وقت یہ خواہش پیدا ہوئی کہ یہ موڑیوں نبی ساری عمر چلتی رہے۔

انور پھر سوق رہا تھا کہ وہ چند نہیں ہے تو کیا ہے۔

چھپے یم نگر میں بناؤں گی گھر میں تج کے سب سن سا آر

سنسار کے ٹکڑے دیر تک اڑتے رہے۔۔۔ سریتا کے بال جواس کی چوٹی کی گرفت سے آزاد تھے، یوں لہر ارہے تھے جیسے گاڑھادھوال ہوا کے دباو سے بکھر رہا ہے۔ وہ خوش تھی۔

شہاب خوش تھا، کفایت خوش تھا اور اب انور بھی خوش ہونے کا ارادہ کر رہا تھا۔ گیت ختم ہو گیا۔ اور سب کو ٹھوڑی دیر کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ جوزور کی بارش ہو رہی تھی، ایکا ایکی تھم گئی ہے۔

کفایت نے سریتا سے کہا، ”کوئی اور گیت گاؤ۔“

شہاب پھلی سیٹ سے بولا، ”ہاں ایک اور رہے۔۔۔ یہ سینما والے بھی کیا یاد کریں گے۔“

سریتانے گا نا شروع کر دیا،

مورے آنگنا میں آئے آلی

میں چال چلوں متواں

موڑ بھی متواں چال چلنے لگی۔۔۔ آخر کار سڑک کے سارے پیچ ختم ہو گئے اور سمندر کا کنارا آگیا۔ دن ڈھل رہا تھا اور سمندر سے آنے والی ہوا خنکی اختیار کر رہی تھی۔

موڑر کی۔ سریتادر روازہ کھول کر باہر نکلی اور ساحل کے ساتھ ساتھ دور تک بے مقصد دوڑتی چلی گئی۔ کفایت اور شہاب بھی اس دوڑ میں شامل ہو گئے۔ کھلی فضائیں، بے پایاں سمندر کے پاس، تاڑ کے اوپرے اونچے پیڑوں تکے گیلی گیلی ریت پر سریتائی سمجھنے سکی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ بیک وقت فضائیں گھل مل جائے، سمندر میں پھیل جائے، اتنی اوپری ہو جائے کہ تاڑ کے درختوں کو اپر سے دیکھے۔ ساحل کی ریت کی ساری نبی پیروں کے ذریعے سے اپنے اندر جذب کر لے اور پھر۔۔۔ اور پھر۔۔۔ وہی موڑ ہوا اور وہی اڑائیں وہی تیز تیز جھوٹے اور وہی مسلسل پوں پوں۔ وہ بہت خوش تھی۔ جب تینوں حیدر آبادی نوجوان ساحل کی گیلی گیلی ریت پر بیٹھ کر بیسرا پینے لگے تو کفایت کے ہاتھ سے سریتانے بوتل چھین لیا، ”ٹھہر دیں ڈالتی ہوں۔“

سریتانے اس انداز سے گلاس میں بیسرا نڈیلی کہ جھاگ ہی جھاگ بیدا ہو گئے۔ سریتائیہ تماشا دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ سانوں لے جھاگوں میں اس نے اپنی انگلی کھبوئی۔ اور منہ میں ڈال لی۔ جب کڑوی لگی تو بہت برامنہ نہیا۔ کفایت اور شہاب بے اختیار ہنس پڑے جب دونوں کی ہنسی بند ہوئی تو کفایت نے مڑ کر اپنے چیچھے دیکھا۔ انور بھی ہنس رہا تھا۔

بیسرا کی چھ بو تلیں کچھ تو جھاگ بن کر ساحل کی ریت میں جذب ہو گئیں اور کچھ کفایت، شہاب اور انور کے پیٹ میں چلی گئیں۔ سریتائیہ رہی۔۔۔ انور نے ایک بار اس کی طرف دیکھا اور خیال کیا کہ سریتائیسرا کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے سانوں لے گال سمندر کی نم آلو دھوا کے مس

سے گیلے ہو رہے تھے۔۔۔ وہ بے حد مسرور تھی۔ اب انور بھی خوش تھا۔ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ سمندر کا سب پانی بیڑ بن جائے اور وہ اس میں غوطے لگائے، سریتا بھی ڈیکیاں لگائے۔

دو خالیں بو تلیں لے کر سریتานے ایک دوسرے سے ٹکرایں، جھنکا رپیدا ہوئی اور سریتائے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ کفایت، شہاب اور انور بھی ہنسنے لگے۔

ہنسنے ہنسنے سریتائے کفایت سے کہا، ”آوموڑ چلا کیں۔“

سب اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔ خالی بو تلیں گیلی گیلی ریت پر اوندھی پڑی رہیں اور وہ سب بھاگ کر موڑ میں بیٹھ گئے۔ پھر وہی ہوا کے تمیز تیز جھونکے آنے لگے۔ وہی مسلسل پوں پوں شروع ہوئی اور سریتائے باں پھرد ہوئیں کی طرح بکھرنے لگے۔

گیتوں کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔

موڑ ہوا میں آرے کی طرح چلتی رہی۔۔۔ سریتا گاتی رہی۔۔۔ پچھلی سیٹ پر شہاب اور انور کے درمیان سریتا بیٹھی تھی۔ انور اونگھ رہا تھا۔ سریتائے شرات سے شہاب کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کی۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سو گیا، سریتائے جب انور کی طرف رخ کیا تو اسے ویسا ہی سویا ہوا پایا۔ ان دونوں کے نقش میں سے اٹھ کر وہ اگلی سیٹ پر کفایت کے پاس بیٹھ گئی اور آواز دبا کر ہولے سے کہنے لگی، ”آپ کے دونوں ساتھیوں کو سُلا آئی ہوں۔۔۔ اب آپ بھی سو جائیے۔“

کفایت مسکرا یا، ”پھر موڑ کون چلائے گا۔“

سریتا بھی مسکرا یا، ”چلتی رہے گی۔“

دیر تک کفایت اور سریتا آپس میں باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں وہ بازار آگیا۔ جہاں کشوری نے سریتا کو موڑ کے اندر داخل کیا تھا۔۔۔ جب وہ دیوار آئی جس پر ”بیہاں پیشاب کرنا منع ہے“ کے کئی بورڈ لگے تھے۔ تو سریتائے کفایت سے کہا، ”بس بیہاں روک لو۔“

موڑ کی۔ پیشتر اس کے کہ کفایت کچھ سوچنے یا کہنے پائے۔ سریتا موڑ سے باہر تھی اس نے اشارے سے سلام کیا اور چل دی۔۔۔ کفایت ہینڈل پر ہاتھ رکھنے غالباً سارے واقعہ کوڈ ہن میں تازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سریتا کے قدم رکے۔ مڑی اور چوپی میں سے دس روپے کانوٹ نکال کر کفایت کے پاس سیٹ پر رکھ دیا۔

کفایت نے حیرت سے نوٹ کی طرف دیکھا اور پوچھا، ”سریتا یہ کیا؟“

”یہ۔۔۔ یہ روپے میں کس بات کے لوں؟“ کہہ کر سریتا پھرتی سے دوڑ گئی اور کفایت سیٹ کے گدے پر پڑے ہوئے نوٹ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

اس نے مڑ کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا۔ شہاب اور انور بھی نوٹ کی طرح سور ہے تھے۔

- [77] -

ابجی ڈڈو: سعادت حسن منظو

”مجھے مت ستائیے۔۔۔ خدا کی قسم، میں آپ سے کہتی ہوں، مجھے مت ستائیے۔“

”تم بہت ظلم کر رہی ہو آج کل۔“

”جی ہاں بہت ظلم کر رہی ہوں۔“

”یہ تو کوئی جواب نہیں۔“

”میری طرف سے صاف جواب ہے اور یہ میں آپ سے کئی دفعہ کہہ چکی ہوں۔“

”آج میں کچھ نہیں سنوں گا۔“

”مجھے مت ستائیے۔ خدا کی قسم، میں آپ سے آج کہتی ہوں، مجھے مت ستائیے، میں چلانا شروع کر دوں گی۔“

”آہستہ بولو۔ پچیاں جاگ پڑیں گی۔“

”آپ تو پچیوں کے ڈھیر لگانا چاہتے ہیں۔“

”تم ہمیشہ مجھے یہی طعنہ دیتی ہو۔“

”آپ کو کچھ خیال تو ہونا چاہیے۔۔۔ میں تنگ آچکی ہوں۔“

”درست ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔“

”تمہیں میرا کچھ خیال نہیں۔۔۔ اصل میں اب تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں۔۔۔ آج سے آٹھ برس پہلے جوبات تھی وہ اب نہیں رہی۔۔۔
تمہیں اب میری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔“

”جی ہاں!“

”وہ کیا دن تھے جب ہماری شادی ہوئی تھی۔ تمہیں میری ہربات کا کتنا خیال رہتا تھا۔ ہم باہم کس قدر شیر و شکر تھے۔۔۔ مگر اب تم کبھی سونے کا بہانہ کر دیتی ہو، کبھی تھکاؤٹ کا اذر پیش کر دیتی ہو اور کبھی دونوں کان بند کر لیتی ہو۔ کچھ سنتی ہی نہیں۔“

”میں کچھ سننے کے لیے تیار نہیں۔“

”تم ظلم کی آخری حد تک پہنچ گئی ہو۔“

”مجھے سونے دیجیے۔“

”سو جائیے۔۔۔ مگر میں ساری رات کروٹھیں بدلتا رہوں گا۔۔۔ آپ کی بلاسے!“

”آہستہ بولیے۔۔۔ ساتھ ہمسائے بھی ہیں۔“

”ہوا کریں۔“

”آپ کو تو کچھ خیال ہی نہیں۔۔۔ سنیں گے تو کیا کہیں گے؟“

”کہیں گے کہ اس غریب آدمی کو کیسی کڑی بیوی ملی ہے۔“

”اوہ ہو!“

”آہستہ بولو۔۔۔ دیکھو بچی جاگ پڑی۔“

”اللہ اللہ۔۔۔ اللہ جی اللہ۔۔۔ اللہ اللہ۔۔۔ سو جاؤ بیٹھے سو جاؤ۔۔۔ اللہ اللہ۔۔۔ اللہ جی اللہ۔۔۔ خدا کی قسم آپ بہت تنگ کرتے ہیں، دن بھر کی تھکی ماندی کو سونے تو دیجیے۔“

”اللہ، اللہ۔۔۔ اللہ جی، اللہ۔۔۔ اللہ اللہ۔۔۔ اللہ جی اللہ۔۔۔ تمہیں اچھی طرح سلانا بھی نہیں آتا۔۔۔“

”آپ کو تو آتا ہے نا۔۔۔ سارا دن آپ گھر میں رہ کر یہی تو کرتے رہتے ہیں۔“

”بھی میں سارا دن گھر میں کیسے رہ سکتا ہوں۔۔۔ جب فرصت ملتی ہے، آجاتا ہوں اور تمہارا ہاتھ بٹا دیتا ہوں۔“

”میرا ہاتھ بٹانے کی آپ کو کوئی ضرورت نہیں۔ آپ مہربانی کر کے گھر سے باہر اپنے دوستوں ہی کے ساتھ گل چہرے اڑایا کریں۔“

”گل چہرے؟“

”میں زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتی۔“

”اچھا دیکھو، میری ایک بات کا جواب دو۔۔۔“

”خدا کے لیے مجھے تنگ نہ کیجیے۔“

”کمال ہے میں کہاں جاؤں؟“

”جہاں آپ کے سینگ سائیں چلے جائیے۔“

”لواب ہمارے سینگ بھی ہو گئے۔“

”آپ چپ نہیں کریں گے؟“

”نہیں۔۔۔ میں آج بولتا ہی رہوں گا۔ خود سوؤں گانہ تمہیں سونے دوں گا۔“

”سچ کہتی ہوں، میں پاگل ہو جاؤں گی۔۔۔ لوگو یہ کیسا آدمی ہے۔۔۔ کچھ سمجھتا ہی نہیں۔۔۔ بس ہر وقت۔ ہر وقت۔ ہر وقت۔۔۔“

”تم ضرور تمام بچیوں کو جگا کر رہو گی۔“

”نه پیدا کی ہوتیں اتنی۔“

”پیدا کرنے والا میں تو نہیں ہوں۔۔۔ یہ تو اللہ کی دین ہے۔۔۔ اللہ، اللہ۔۔۔ اللہ جی، اللہ، اللہ۔۔۔ اللہ جی، اللہ۔۔۔“

”بھی کواب میں نے جگایا تھا؟“

”مجھے افسوس ہے!“

”افسوس ہے، کہہ دیا۔۔۔ چلو چھٹی ہوئی۔۔۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلائے چلے جا رہے ہیں۔ ہمسائیگی کا کچھ خیال ہی نہیں، لوگ کیا کہیں گے اس کی پروادی نہیں۔۔۔ خدا کی قسم میں عنقریب ہی دیوانی ہو جاؤں گی!“

”دیوانے ہوں تمہارے دشمن۔“

”میری جان کے دشمن تو آپ ہیں۔“

”تو خدا مجھے دیوانہ کرے۔“

”وہ تو آپ ہیں!“

”میں دیوانہ ہوں، مگر تمہارا۔“

”اب جو نچلے نہ بگھاریئے۔“

”تم تو نہ پوں مانتی ہونہ دوں۔“

”میں سونا چاہتی ہوں۔“

”سو جاؤ، میں پڑا بکواس کرتا رہوں گا۔“

”یہ بکواس کیا اشد ضروری ہے؟“

”ہے تو سہی۔۔۔ ذرا دھر دیکھو۔۔۔“

”میں کہتی ہوں، مجھے تنگ نہ کہیے۔ میں رو دوں گی۔“

”تمہارے دل میں اتنی نفرت کیوں پیدا ہو گئی۔۔۔ میری ساری زندگی تمہارے لیے ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تمہیں کیا ہو گیا ہے۔۔۔ مجھ سے کوئی خطاب ہوئی ہو تو بتا دو۔“

”آپ کی تین خطائیں یہ سامنے پلٹ پر پڑی ہیں۔“

”یہ تمہارے کو سنے کبھی ختم نہیں ہوں گے؟“

”آپ کی ہٹ کب ختم ہو گی؟“

”لو بابا میں تم سے کچھ نہیں کہتا۔ سو جاؤ۔۔۔ میں نیچے چلا جاتا ہوں۔“

”کہاں؟“

”جہنم میں۔“

”یہ کیا پاگل پن ہے۔۔۔ نیچے اتنے مچھر ہیں، پنکھا بھی نہیں۔۔۔ سچ کہتی ہوں، آپ بالکل پاگل ہیں۔۔۔ میں نہیں جانے دوں گی آپ کو۔“

”میں یہاں کیا کروں گا۔۔۔ مچھر ہیں پنکھا نہیں ہے، ٹھیک ہے۔ میں نے زندگی کے برے دن بھی گزارے بھی ہیں۔ تن آسان نہیں ہوں۔۔۔ سوجاؤں گا صوفی پر۔“

”سارا وقت جاگتے رہیں گے؟“

”تمہاری بلاسے۔“

”میں نہیں جانے دوں گی آپ کو۔۔۔ بات کا بتانے والا بنادیتے ہیں۔“

”میں مر نہیں جاؤں گا۔۔۔ مجھے جانے دو۔“

”کسی باقی منہ سے نکالتے ہیں۔۔۔ اخبردار جو آپ گئے۔“

”مجھے یہاں نیند نہیں آئے گی۔“

”نہ آئے۔“

”یہ عجیب منطق ہے۔۔۔ میں کوئی لڑ جھگڑ کر تو نہیں جا رہا۔“

”لڑائی جھگڑا کیا ابھی باقی ہے۔۔۔ خدا کی قسم آپ کبھی کبھی بالکل بچوں کی سی باقی کرتے ہیں۔ اب یہ خط سر میں سما یا ہے کہ میں نیچے گرمی اور مچھروں میں جا کر سوؤں گا۔۔۔ کوئی اور ہوتی تو پاگل ہو جاتی۔“

”تمہیں میرا بڑا خیال ہے---“

”اچھا بابا نہیں ہے--- آپ چاہتے کیا ہیں؟“

”اب سیدھے راستے پر آئی ہو۔“

”چلیے ہیئے--- میں کوئی راستہ واسطہ نہیں جانتی۔ منہ دھو کے رکھیے اپنا۔“

”منہ صبح دھو یا جاتا ہے--- لو، اب من جاؤ۔“

”تو بہ!“

”سائزی پروہ بورڈر لگ کر آگیا؟“

”نہیں!“

”عجب الوکا پڑھا ہے درزی--- کہہ رہا تھا آج ضرور پہنچا دے گا۔“

”لے کر آیا تھا، مگر میں نے واپس کر دی۔---“

”کیوں؟“

”ایک دو جگہ جھول تھے۔“

”اوہ--- اچھا، میں نے کہا، کل ”برسات“ دیکھنے چلیں گے۔ میں نے پاس کا بندوبست کر لیا ہے۔“

”کتنے آدمیوں کا؟“

”دو کا۔۔۔ کیوں؟“

”باجی بھی جانا چاہتی تھیں۔“

”ہٹاؤ باجی کو، پہلے ہم دیکھیں گے پھر اس کو دکھادیں گے۔۔۔ پہلے ہفتے میں پاس بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔۔۔ چاندنی رات میں تمہارا بدن کتنا چمک رہا ہے۔“

”مجھے تو اس چاندنی سے نفرت ہے۔ کم بخت آنکھوں میں گھستی ہے۔ سونے نہیں دیتی۔“

”تمہیں تو بس ہر وقت سونے ہی کی پڑی رہتی ہے۔“

”آپ کو بچیوں کی دلکشی بھال کرنا پڑے تو پھر پتا چلے۔ آئے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ ایک کے کپڑے بدلو، تو دوسرا کے میلے ہو جاتے ہیں۔ ایک کو سلاو، دوسرا جاگ پڑتی ہے، تیسرا نعمت خانے کی غارت گری میں مصروف ہوتی ہے۔“

”دونوں کر گھر میں موجود ہیں۔“

”نون کر کچھ نہیں کرتے۔“

”تو انہیں نکال باہر کرو۔“

”آہستہ بولیے، دیکھیے، چھوٹی کیسے چونکی ہے۔“

”معاف کر دینا۔۔۔ ذرا ہاتھ سے تھپکا دو۔“

”مجھلی بھی تڑپ رہی ہے۔“

”پیشاب کر دیا تھا اسے؟“

”جی ہاں!“

”پھر کیا وجہ ہے؟“

”گرمی آن کچھ زیادہ ہے۔۔۔ آپ پرے ہٹ جائیے۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔ آخر ہار مجھے ہی مانی پڑتی ہے۔“

”تمہاری ہار، ہار نہیں، جیت ہوتی ہے۔۔۔ اللہ بہتر جانتا ہے مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔“

”اپنی محبت آپ اسی وقت جتایا کرتے ہیں۔“

”لو بھئی، اور کیا سر بازار تم سے محبت کیا کروں۔۔۔؟ ادھر دیکھو میری طرف۔“

”آپ اپنی کرکے رہیں گے۔“

”میری جان جو ہوئیں تم۔“

”میں نے کہا۔۔۔ ہٹیے۔“

”کیا ہوا؟“

”دیکھتے نہیں، بڑی اٹھ کر پیٹھی ہوئی ہے۔“

”اوہ!“

”سنائیں آپ نے؟“

”کیا؟“

”کہہ رہی ہے---اجگی ڈڈو۔“

”ہاں ہاں---سنائے---دلے ددھ۔“

”میں نیچے بھول آئی ہوں۔“

”نیچے؟“

”ہاں، نعمت خانے میں، جائیئے، لے آئیئے۔“

”لے آؤں، نیچے سے؟“

”جلدی جائیئے روشن شروع کر دے گی۔“

”جاتا ہوں۔“

”میں نے کہا، سنتے۔۔۔ آگ جلا کر ذرا کنکنا کر کیجیے گا دودھ۔“

”اچھا، اچھا۔۔۔ سن لیا ہے۔“

-[78]-

بی زمانی بیگم: سعادت حسن منشو

”زمین شق ہو رہی ہے۔ آسمان کا نپ رہا ہے۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں ہے۔ آگ کے شعلوں میں دنیا مل رہی ہے۔ زلزلے پر زلزلے
آرہے ہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”تمہیں معلوم نہیں؟“

”نہیں تو۔“

”لو سنو۔۔۔ دنیا بھر کو معلوم ہے۔“

”کیا؟“

”وہی زمانی بیگم۔۔۔ وہ موٹی چڑو۔“

”ہاں ہاں، کیا ہوا اسے؟“

”وہی جو ہوتا ہے لیکن اس عمر میں شرم نہیں آئی بد بخت کو۔“

”یہ بد بخت زمانی نیگم ہے کون؟“

”ہائیں وہی اسکندر کی ہوتی سوتی۔ موئی نکھیائی چنگیز کے پاس رہی۔ ہلاکی داشتہ بنی۔ کچھ دن اس لنگرے تیمور کے ساتھ منہ کالا کرتی رہی۔ وہاں سے نکلی تو پولین کی بغل میں جا گھسی۔ اب یہ موہنلر باقی رہ گیا تھا۔“

”تو کیا بہنلر کے گھر ہے؟“

”بوا، گھر گھاٹ کیسا۔ نباہ ہو سکتا ہے کبھی ایسی عورت کا۔“

”طلاق ہو گئی ہے کیا؟“

”تم کیسی باتیں کرتی ہو بواؤ۔ طلاق تو وہاں ہو جو سہرے جلوؤں کی بیانی ہو اور پھر ایسے مردوں کا کیا اعتبار ہے۔ دو دن مزے کیے اور چلو چھٹی۔“

”تواب ہو کیا رہا ہے۔ یہ فضیحتا کس بات کا؟“

”فضیحتا کیا ہے، پورے دنوں سے ہے۔ بچہ پیدا ہونے والا ہے۔“

”تو ہو کیوں نہیں چلتا؟“

”ہاں سچ تو ہے، کوئی پبلو ٹھی کا تو ہے نہیں۔“

”ڈاکٹر آرہے ہیں۔ دیکھو آج نہ کل ہو جائے گا۔“

ڈاکٹر آتے رہے۔ لیکن بی زمانی کے بچپیدانہ ہوا۔ درد و کرب کی لہروں میں اضافہ ہو گیا۔ زلزلے اور زیادہ زور سے آنے لگے۔ شعلوں کی زبانیں اور زیادہ تیز ہو گئیں۔ ڈاکٹروں نے کافرنس کی۔ حکمت کی ساری کتابیں چھانی گئیں۔ طے ہوا کہ حاملہ کو طہران لے جائیں۔ وہاں روس کے ماہر ڈاکٹر کو بلاجایا جائے اور اس سے مشورہ کیا جائے۔ طہران میں خاص طور پر جلدی جلدی ایک میٹنگ ہوم تیار کیا گیا۔ بی زمانی بیگم درد سے ترپتی رہی اور دنیا کے تین بڑے ڈاکٹر مشورہ کرتے رہے۔

ایک بولا، ”صاحبان! اس میں کوئی شک نہیں کہ ہونے والا بچہ ہمارا نہیں لیکن انسانیت کے نام پر ہمیں مریضہ کو اس مشکل سے نجات دلانا ہی پڑے گی۔“

دوسرابولا، ”ہم تین بڑے ڈاکٹر تین قسم کے طریقہ علاج کے ماہر ہیں۔ سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایک طریقہ علاج پر متفق ہوں۔ اگر ایسا ہو گیا تو بی زمانی بیگم کے بچپیدا ہونا کوئی مشکل کام نہیں۔“

تیسرا بولا، ”بالکل درست ہے۔ آئیے ہم فوراً ایہ نیک کام شروع کر دیں۔“

تینوں طریقے ملائکر ایک اور طریقہ بنایا گیا۔ جس پر تینوں بڑے ڈاکٹر متفق ہو گئے۔ دنیا کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ مگر بی زمانی بیگم کے بچپیدا نہ ہوا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے۔۔۔ بچپیدا کیوں نہیں ہوا۔ بھی تک؟“

”بچپیدا ہو رہا تھا مگر اسے روک دیا گیا ہے۔“

”کیوں؟“

”ڈاکٹر سوچ رہے ہیں کہ اسے گود کون لے گا۔“

”ہوں!“

” توفیصلہ کیا ہوا؟“

”تم کسی باتیں کرتی ہو بوا۔ ایسے معاملوں کا اتنی جلدی فیصلہ کیسے ہو سکتا ہے۔ خیر چھوڑو اس قصے کو۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ جس کے ہاں اولاد نہیں وہ غریب گودلے لے گا۔“

اولاد ہر ایک کے تھی۔ کسی کے ہاں چار بچے تھے۔ کسی کے ہاں پانچ اور کسی کے ہاں سات۔ اب فیصلہ کیسے ہو۔

ایک اور کافرنس ہوئی۔ ڈمبارٹن اوکس میں ایک اور میٹر نی ہوم افراتفری میں بنایا گیا۔ تینوں بڑے ڈاکٹروں اس جمع ہوئے۔ ہر ایک نے سوچا۔ ہر ایک نے معاملہ کی اہمیت سمجھنے کی کوشش کی۔ اور بی زمانی بیگم بستر پر پڑی درد سے کراہتی رہی۔

ایک بولا، ”صاحبان! ہم صاحب اولاد ہیں۔ اس بچے کے وجود کے ہم ذمہ دار نہیں۔ لیکن انسانیت کا تقاضا ہے کہ ہم اس کی پیدائش میں ہر ممکن طریقے سے مدد کریں۔ آخر اس میں ہونے والے بچے کا کیا قصور ہے۔“

دوسراء، ”ہم ڈاکٹر ہیں۔ ہمارا مذہب دوا ہے۔ ہم چاہیں تو اس ہونے والے ناخلف بچے ہی کو جس سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں، ایک فرماں بردار، اطاعت شعار، آزادی پسند اور انسانیت دوست نوجوان بناسکتے ہیں۔“

تیسرا بولا، بالکل درست ہے۔ اس بچے کی پیدائش سے دنیا کا ایک بہت بڑا بوجھ دور ہو جائے گا۔ ہم ڈاکٹر ہیں۔ اپنے فرض سے ہمیں غافل نہیں رہنا چاہیے۔“

ٹے ہو گیا۔۔۔ ایک دستاویز پر انگوٹھے لگادیے گئے کہ ہونے والے بچے کو یہ تینوں ڈاکٹر گودلیں گے۔ تینوں مل کر اس کی پروردش کریں گے۔۔۔ لیکن بی زمانی بیگم کی تکلیف پھر بھی رفع نہ ہوئی۔ وہ پڑی درد سے کراہتی رہی۔

”آخر یہ مصیبت کیا ہے؟“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

”قصہ یہ ہے کہ بچے کو گود لینے کا توفیلہ ہو گیا ہے لیکن اس بی زمانی کا بھی تو کچھ بندوبست ہونا چاہیے۔“

”میں تو کہتی ہوں۔ سات جھاڑا اور حقہ کا پانی۔“

”لعنت بھیجیں موئی حرافہ پر۔“

”نہیں بوا۔ وہ سوچ رہے ہیں کہ یہ کم بخت کہیں پھر---۔“

”اوہ---۔“

ایک اور کافرنس ہوئی۔۔۔ تینوں بڑے ڈاکٹر آخری بار پوٹسٹم میں جمع ہوئے۔ جلدی جلدی ایک میٹر نٹی ہوم تیار کیا گیا۔ بی زمانی بیگم درد سے پیچ و تاب کھاتی رہی اور ادھر کافرنس ہوتی رہی۔

ایک بولا، ”صاحبان! دنیا کی فلاح اور بہودی کے لیے آج اس بات کا قطعی طور پر فیصلہ ہو جانا چاہیے کہ بی زمانی بیگم کا یہ بچہ اس کا آخری بچہ ہو۔“

دوسرابولا، ”دنیا کے تھن اس عورت کے لاتعداد حرامی بچوں کو دودھ پلاپلا کر سوکھ گئے ہیں۔ اب ہمیں اس کو بانجھ کرنا ہی پڑے گا۔“

تیسرا بولا، ”بالکل درست ہے۔ ہونے والے بچے کی صحت اور تدرستی کا خیال رکھتے ہوئے بھی ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔“

ٹے ہو گیا کہ بچہ فوراً پیدا کیا جائے اور بی زمانی بیگم کو ہمیشہ کے لیے بانجھ کر دیا جائے۔ عمل جراحی شروع ہوا۔ میٹرنٹی ہوم کے باہر دنیا کی ساری قومیں جمع ہو گئیں۔ بہت دیر تک سننا چھایا رہا۔ اس کے بعد میٹرنٹی ہوم کا دروازہ پھٹ سے کھلا۔ ایک سفید پوش نر س باہر نکلی اور اس نے اپنی باریک آواز میں اعلان کیا، ”مبارک ہو، بی زمانی بیگم کے بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ زچہ اور بچہ دونوں بے ہوش ہیں۔“

دنیا کی ساری قومیں فکر و تردید میں غرق ہو گئیں۔ ایک بوڑھا لگوٹی پہنے کھانتا کھکھلتا نر س کی طرف بڑھا۔ نر س نے پوچھا، ”تم کون ہو۔۔۔؟“

بوڑھے نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور لرزائ آواز میں کہا، ”میرا نام ہندوستان ہے۔“

”اوہ۔۔۔ کیا چاہتے ہو تم؟“

”میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ لڑکا ہوا ہے یا لڑکی؟“

دنیا کی ساری قومیں بے اختیار کھکھلا کر ہنس پڑیں۔

-[79]-

بائے بائے: سعادت حسن منٹو

نام اس کا فاطمہ تھا، پرسب اسے چھاتو کہتے تھے، بانہال کے دڑے کے اس طرف اس کے باپ کی پنچھی تھی جو بڑا سادہ لوح معمر آدمی تھا۔

دن بھروہ اس پنچھی کے پاس بیٹھی رہتی۔ پہاڑ کے دامن میں چھوٹی سی جگہ تھی جس میں یہ پنچھی لگائی گئی تھی۔ چھاتو کے باپ کو دو تین روپے روزانہ مل جاتے جو اس کے لیے کافی تھے۔ چھاتو البتہ ان کو ناکافی سمجھتی تھی اس لیے کہ اس کو بناؤ سنگھار کا شوق تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ امیروں کی طرح زندگی بسر کرے۔

کام کا جو کچھ نہیں کرتی تھی، بس کبھی کبھی اپنے بوڑھے باپ کا ہاتھ بٹادیتی تھی۔ اس کو آئے سے نفرت تھی۔ اس لیے کہ وہ اڑڑ کر اس کی ناک میں گھس جاتا تھا۔ وہ بہت جھنجھلاتی اور باہر نکل کر کھلی ہوا میں گھومنا شروع کر دیتی، یا چناب کے کنارے جا کر اپنا منہ ہاتھ دھوتی اور عجیب قسم کی ٹھنڈک محسوس کرتی۔

اس کو چناب سے پیار تھا، اس نے اپنی سہیلیوں سے سن رکھا تھا کہ یہ دریا عشق کا دریا ہے جہاں سو ہنی مہینوں، ہیران جھاکا عشق مشہور ہوا۔ بہت خوبصورت تھی اور بڑے مضبوط جسم کی جوان لڑکی۔ ایک پنچھی والے کی بیٹی شاندار لباس تو پہن نہیں سکتی، میلی شلوار اور پر 'پھر ان' کرتے۔۔۔ دوپٹہ ندارد۔

نذریں سچیت گڑھ سے لے کر بانہال تک اور بھدررواسے کشتوار تک خوب گھوما پھرا تھا۔ اس نے جب پہلی بار پھاتو کو دیکھا تو اسے کوئی حیرت نہ ہوئی۔ جب اس نے دیکھا کہ پھاتو کے کرتے کے نچلے تین بیٹیں ہیں اور اس کی جوان چھاتیاں باہر جھانک رہی ہیں۔ نذریں نے اس علاقے میں ایک خاص بات نوٹ کی تھی کہ وہاں کی عورتیں ایسی قمیصیں یا کرتے پہنچتی ہیں جن کے نچلے بیٹنے غائب ہوتے ہیں، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آیا یہ دانستہ ہٹادیے جاتے ہیں یا وہاں کے دھوپی ہی ایسے ہیں جو ان کو اتار لیتے ہیں۔

نذریں نے جب پہلی بار سیر کرتے ہوئے پھاتو کو اپنی تین کم بیٹنوں والی قمیص میں دیکھا تو اس پر فریفہت ہو گیا۔ وہ حسین تھی، ناک نقشہ بہت اچھا تھا، تعجب ہے کہ وہ میلی ہونے کے باوجود چمکتی تھی، اس کا لباس بہت گند اتھا مگر نذریں کو ایسا محسوس ہوا کہ یہی اس کی خوبصورتی کو نکھار رہا ہے۔

نذریں وہاں ایک آوارہ گرد کی حیثیت رکھتا تھا، وہ صرف کشمیر کے دیہات دیکھنے اور ان کی سیاحت کرنے آیا تھا اور قریب قریب تین مہینے سے ادھر ادھر گھوم پھر رہا تھا۔ اس نے کشتوار دیکھا، بھدرروادیکھا، کد اور بیوت میں کئی مہینے گزارے مگر اسے پھاتو ایسا حسن کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ بانہال میں پنچھی کے باہر جب اس نے پھاتو کو تین بیٹنوں سے بے نیاز کرتے میں دیکھا تو اس کے جی میں آیا کہ اپنی قمیص کے سارے بیٹن علیحدہ کر دے اور اس کی قمیص اور پھاتو کا کرتہ آپس میں خلط ملا جائیں۔ کچھ اس طرح کہ دونوں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آئے۔

اس سے ملنادری کے لیے مشکل نہیں تھا، اس لیے کہ اس کا باپ دن بھر گندم، مکتی اور جوار پیسے میں مشغول رہتا تھا اور وہ تھی بنس مکھ، ہر آدمی سے کھل کر بات کرنے والی۔ بہت جلد گھلو مٹھو ہو جاتی تھی۔ چنانچہ نذیر کو اس کی قربت حاصل کرنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ چند ہی دنوں میں اس نے راہ و رسم پیدا کر لی۔

یہ راہ و رسم تھوڑی دیر میں محبت میں تبدیل ہو گئی، پاس ہی چناب جسے عشق کا دریا کہتے ہیں اور جس کے پانی سے پھاتو کے باپ کی پنچھی چلتی تھی، اس دریا کے کنارے بیٹھ کر نذر اس کو اپنادل نکال کر دکھاتا تھا جس میں سوائے محبت کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ پھاتو سنتی۔ اس لیے کہ وہ اس کے جذبات کا مناق اڑانا چاہتی تھی۔۔۔ اصل میں وہ تھی ہی ہنسوڑ۔ ساری زندگی وہ کبھی روئی نہ تھی، اس کے ماں باپ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہماری بچی بچپن میں کبھی نہیں روئی۔

نذیر اور پھاتو میں محبت کی پینگیں بڑھتی گئیں۔ نذیر پھاتو کو دیکھتا تو اسے یوں محسوس ہوتا کہ اس نے اپنی روح کا عکس آئینے میں دیکھ لیا ہے اور پھاتو تو اس کی گرویدہ تھی اس لیے کہ وہ اس کی بڑی خاطرداری کرتا تھا۔ اس کو یہ چیز۔۔۔ جسے محبت کہتے ہیں پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی، اس لیے وہ خوش تھی۔

بانہال میں تو کوئی اخبار ملتا نہیں تھا اس لیے نذیر کو بہوت جانا پڑتا تھا۔ وہاں وہ دیر تک ڈاک خانہ کے اندر بیٹھا رہتا، ڈاک آتی تو اخبار پڑھ کے پنچھی پر چلا آتا۔ قریب قریب چھ میل کا فاصلہ تھا مگر نذیر اس کا کوئی خیال نہ کرتا، یہ سمجھتا کہ چلو ورزش ہی ہو گئی ہے۔ جب وہ پنچھی کے پاس پہنچتا تو پھاتو کسی نہ کسی بہانے سے باہر نکل آتی اور دونوں چناب کے پاس پہنچ جاتے اور پھر وہ پر بیٹھ جاتے۔

پھاتو اس سے کہتی، ”بجیر۔ آج کی خبریں سناؤ!“

اس کو خبریں سننے کا خط تھا۔ نذیر اخبار کھولتا اور اس کو خبریں سنانا شروع کر دیتا۔ ان دنوں فرقہ وارانہ فسادات تھے۔ امر تسری سے یہ قصہ شروع ہوا تھا جہاں سکھوں نے مسلمانوں کے کئی محلے جلا کر راکھ کر دیے تھے۔ وہ یہ سب خبریں اس کو سناتا، وہ سکھوں کو اپنی گنوار زبان میں برا بھلا کہتی۔ نذیر خاموش رہتا۔

ایک دن اچانک یہ خبر آئی کہ پاکستان قائم ہو گیا ہے اور ہندوستان علیحدہ ہو گیا ہے۔ نذیر کو تمام واقعات کا علم تھا مگر جب اس نے پڑھا کہ ہندوستان نے ریاست مانگرول اور مانا وادا پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے تو وہ بہت پریشان ہوا مگر اس نے اپنی اس پریشانی کو پھاتو پر ظاہر نہ ہونے

دیا۔ دونوں کا عشق اب بہت استوار ہو چکا تھا، اس کا علم پھاتو کے باپ کو بھی ہو گیا تھا۔ وہ خوش تھا کہ میری لڑکی ایک معزز اور شریف گھرانے میں جائے گی مگر وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی سیالکوٹ نہ جائے جہاں کانزیر رہنے والا تھا۔ اس کی یہ خواہش تھی کہ نذیر اس کے پاس رہے۔

دولت مند کا بیٹا ہے۔ پنچھی کے پاس کافی زمین پڑی ہے، اس پر ایک چھوٹا سامکان بنوالے اور دونوں میاں بیوی اس میں رہیں، جب چاہا پلک جھکتے سری نگر بہنچ گئے، وہاں ایک دو مینے رہے، پھر واپس آگئے، کبھی کبھار سیالکوٹ بھی چلے گئے کہ وہ بھی اتنی دور نہیں۔ پھاتو نے باپ سے مفصل گفتگو کی، وہ اس سے بہت متاثر ہوا اور اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ نذیر اور پھاتو بہت خوش ہوئے، اس روز پہلی مرتبہ نذیر نے اس کے ہونٹوں کو چوما اور خود اپنے ہاتھ سے اس کے کرتے میں میں ٹھنڈا لگائے۔

دوسرے دن نذیر نے اپنے والدین کو لکھ دیا کہ وہ شادی کر رہا ہے۔ کشمیر کی ایک دیہاتی لڑکی ہے جس سے اس کو محبت ہو گئی ہے، ایک ماہ تک خط و کتابت ہوتی رہی، آدمی روشن خیال تھے، اس لیے وہ مان گئے۔ حالانکہ وہ اپنے بیٹے کی شادی اپنے خاندان میں کرنا چاہتے تھے۔

اس کے والد نے جو آخری خط لکھا اس میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا تھا کہ نذیر فاطمہ کا فوٹو بھیجے تاکہ وہ اپنے رشتہ داروں کو دکھائیں۔ اس لیے کہ وہ اس کے حسن کی بڑی تعریفیں کر چکا تھا۔ لیکن بانہال جیسے دور افادہ علاقے میں وہ پھاتو کی تصویر کیسے حاصل کرتا۔ اس کے پاس کوئی کیمرہ نہیں تھا، نہ وہاں کوئی فوٹو گرافر، بٹوت اور گلڈ میں بھی ان کا نام و نشان نہیں تھا۔

اتفاق سے ایک دن سری نگر سے موڑ آئی، نذیر سڑک پر کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا دوست رنبیر سنگھ ڈرائیور کر رہا ہے، اس نے بلند آواز میں کہا:

”رنبیر یار، ٹھہرو!“

موڑ ٹھہر گئی، دونوں دوست ایک دوسرے سے گلے ملے۔ نذیر نے دیکھا کہ اس کی موڑ میں کیمرہ پڑا ہے، روپی فلیکس۔ نذیر نے اس سے کچھ دیرباتیں کیں، پھر پوچھا، ”تمہارے کیمرے میں فلم ہے؟“

رنبیر نے ہنس کر کہا، ”خالی کیمرہ اور خالی بندوق کس کام کی ہوتی ہے، میرے کیمرے میں سولہ ایکسپوزیر موجود ہیں۔“

نذیر نے فوراً چھاتو کو ٹھہرایا اور اپنے دوست رنبیر سے کہا، ”یار اس کے تین چار اچھے پوز لے لو اور تم میرا خیال ہے سیاکلوٹ جا رہے ہو، وہاں سے ڈیویلپ اور پرنٹ کرا کے مجھے دو دو کاپیاں ٹوٹ کے ڈاک خانے کی معرفت بھجوادینا۔“

رنبیر نے بڑے غور اور دلچسپی سے چھاتو کو دیکھا۔ اس کی موڑ میں ڈو گرہ فوج کے تین چار سپاہی تھے، تھری ناٹ تھری بندوقیں لیے۔ رنبیر جو مقام فوٹولینے کے لیے پسند کرتا یہ مسلح فوجی اس کے پیچھے پیچھے ہوتے۔ نذیر اس کے ہم راہ ہونا چاہتا تو یہ ڈو گرے اسے روک دیتے۔ کشیر میں ہلڑیج رہا تھا، اس کے متعلق نذیر کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ہندوستان اس پر قابض ہونا چاہتا ہے مگر پاکستانی اس کی مدافعت کر رہے ہیں۔ فوٹولے کر جب نذیر کا دوست رنبیر اپنی موڑ کے پاس آیا تو اس نے نذیر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، چھاتو ڈو گرے فوجیوں کی گرفت میں تھی، انہوں نے زبردستی موڑ میں ڈالا، وہ چیخنی چلائی۔ نذیر کو اپنی مدد کے لیے پکارا مگر وہ عاجز تھا۔ ڈو گرے فوجی سنگینیں تانے کھڑے تھے۔

جب موڑ اسٹارٹ ہوئی تو نذیر نے اپنے دوست رنبیر سے بڑے عاجزانہ لمحے میں کہا، ”یار رنبیر! یہ کیا ہو رہا ہے؟“

رنبیر سنگھ نے جو کہ موڑ چلا رہا تھا، نذیر کے پاس سے گزرتے ہوئے ہاتھ بلا کر صرف اتنا کہا:

”بائی بائی“

-[80]-

بس اسٹینڈ: سعادت حسن منشو

وہ بس اسٹینڈ کے پاس کھڑی اے روٹ والی بس کا انتظار کر رہی تھی، اس کے پاس کئی مرد کھڑے تھے، ان میں ایک اسے بہت بڑی طرح گھور رہا تھا، اس کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ شخص برے سے اس کے دل و دماغ میں چھید بنا رہا ہے۔

اس کی عمر یہی بیس برس کی ہو گی لیکن اس پختہ سالی کے باوجود وہ بہت گھبرائی تھی، جاڑوں کے دن تھے، پر اس کے باوجود اس نے کئی مرتبہ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے، بس اسٹینڈ سے چلی جائے، کوئی تانگہ لے لے یا اپنی سہیلی کے پاس چلی جائے۔

اس کی یہ سہیلی نئی نئی تھی، ایک پارٹی میں ان کی ملاقات ہوئی اور وہ دونوں ایک دوسرے کی گرویدہ ہو گئیں۔ پہلی بار تھی کہ وہ اپنی اس نئی سہیلی کے بلاوے پر اس کے گھر آئی تھی۔

نوکری مار تھا مگر جب اس سہیلی نے اتنا اصرار کیا تھا تو وہ اکیلی ہی اس کے ہاں چلی گئی، دو گھنٹے گپ لڑاتی رہیں۔ یہ وقت بڑے مزے میں کٹا، اس کی سہیلی جس کا نام شاہدہ تھا اس سے جاتے وقت کہا، ”سلمی! اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔“

سلمی شرمائی گئی، ”کیسی باتیں کرتی ہو شاہدہ۔۔۔ مجھے شادی نہیں کرنا ہے۔“

”تو کیا ساری عمر کنواری رہو گی؟“

”کنواری رہنے میں کیا حرج ہے؟“

شاہدہ مسکرائی، ”میں بھی یہی کہا کرتی تھی۔۔۔ لیکن جب شادی ہو گئی تو دنیا کی تمام لذتیں مجھ پر آشکارا ہو گئیں۔۔۔ یہی تو عمر ہے جب آدمی پوری طرح شادی کی اطافوں سے حظ اندوز ہو سکتا ہے۔۔۔ تم میرا کہا مانو۔۔۔ بس ایک دو مہینے کے اندر دلہن بن جاؤ۔۔۔ تمہارے ہاتھوں میں مہندی میں خود گاؤں گی۔“

”ہٹاؤ اس چھیڑخانی کو۔“

شاہدہ نے سلمی کے گال پر ہلکی سی چپٹ لگائی، ”یہ چھیڑخانی ہے؟ اگر یہ چھیڑخانی ہے تو ساری دنیا چھیڑخانی ہے۔ مرداور عورت کا رشتہ بھی فضول ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ایک ازلی اور ابدی رشتے سے منکر کیوں ہو؟ دیکھوں گی کہ تم مرد کے بغیر کیسے زندہ رہو گی۔۔۔ خدا کی قسم پاگل ہو جاؤ گی۔۔۔ پاگل!“

”اچھا ہے جو پاگل ہو جاؤں۔۔۔ کیا پاگلوں کے لیے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔۔۔ اتنے سارے پاگل ہیں، آخر وہ جوں توں جی ہی رہے ہیں۔“

”جوں توں جینے میں کیا مزاح ہے پیاری سلمی! میں تم سے کہتی ہوں کہ جب سے میری شادی ہوئی ہے، میری کایا ہی پلٹ گئی ہے۔۔۔ میرا خاوند بہت پیار کرنے والا ہے۔“

”کیا کام کرتے ہیں؟“

”مجھ سے محبت کرتے ہیں۔۔۔ یہی ان کا کام ہے۔ ویسے اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ میرا ہاتھ انھوں نے کبھی تنگ ہونے نہیں دیا۔“ سلمی نے یوں محسوس کیا کہ اس کا دل تنگ ہو گیا ہے۔ ”شاهدہ مجھے تنگ نہ کرو، مجھے شادی نہیں کرنا ہے۔ مجھے مردوں سے نفرت ہے۔“

”کیوں؟“

”بس ہے!“

”اب میں تم سے کیا کھوں۔۔۔ مردوں سے مجھے بھی نفرت تھی لیکن جب میری شادی ہوئی اور مجھ سے میرے خاوند نے پیار محبت کیا تو میں نے پہلی مرتبہ جانا کہ مرد عورت کے لیے کتنا لازمی ہے۔“

”ہوا کرے۔۔۔ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“

شاهدہ ہنسی، سلمی! ایک دن تم ضرور اس بات کی قائل ہو جاؤ گی کہ مرد عورت کے لیے لازمی ہے۔ اس کے بغیر وہ ایسی گاڑی ہے جس کے پہیے نہ ہوں۔۔۔ میری شادی کو ایک برس ہوا ہے، اس ایک برس میں مجھے جتنی مسرتیں اور راحتیں میرے خاوند نے پہنچائی ہیں، میں بیان نہیں کر سکتی۔۔۔ خدا کی قسم وہ فرشتہ ہے۔۔۔ فرشتہ۔۔۔ مجھ پر جان چھڑ کتا ہے۔“

سلمی نے یہ سن کر یوں محسوس کیا کہ جیسے اس کے سر پر فرشتوں کے پر پھر پھر اڑ رہے ہیں۔ اس نے سوچنا شروع کیا کہ شاید مرد عورت کے لیے لازمی ہی ہو۔۔۔ لیکن فوراً بعد اس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ اس کی عقل نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔۔۔ مرد کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیا عورت اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

جیسا کہ شاہدہ نے اس کا شوہر بہت پیار کرنے والا ہے، بہت نیک خصلت ہے۔۔۔ لیکن اس سے یہ ثابت تو نہیں ہوتا کہ وہ شاہدہ کے لیے لازمی تھا۔

سلمی حسین تھی، ابھر ابھر اجو بن، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، کشادہ پیشانی، گھٹنوں تک لمبے کالے بال، ستواں ناک اور اس کی پھنگ پر ایک تل۔ جب وہ اپنی سیہلی سے اجازت مانگ کر غسل خانے میں گئی تو اس نے آئینے میں خود کو بڑے غور سے دیکھا اور اسے بڑی الجھن محسوس ہوئی، جب اس نے سوچا کہ آخر یہ جسم یہ حسن، یہ ابھار کس لیے ہوتے ہیں۔۔۔ قدرت کی ساری کاریگری اکارت جاری ہے۔ ”گندم پیدا ہوتا ہے تو آدمی اس سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔۔۔ اس کی جوانی بھی تو کسی کھیت میں اُگی تھی۔۔۔ اگر اسے کوئی کھائے گا نہیں تو گل سڑ نہیں جائے گی؟“

وہ بہت دیر تک غسل خانے میں آئینے کے سامنے سوچتی رہی، اس کے ذہن میں اس کی سیہلی کی تمام باتیں گونج رہی تھیں۔۔۔ مرد عورت کے لیے بہت ضروری ہے، اس کا خاوند اس سے بہت پیار کرتا ہے، وہ فرشتہ ہے۔

سلمی نے ایک لمح کے لیے محسوس کیا کہ اس کی شلوار اور اس کا دوپٹہ فرشتوں کے پر بن گئے ہیں۔۔۔ وہ گھبرا گئی اور جلدی فارغ ہو کر باہر نکل آئی۔ باہر برآمدے میں مکھیاں بھجنچنار ہی تھیں، سلمی کو ایسا لگا کہ یہ بھی فرشتے ہیں جو بھیں بدلتے ہیں۔

پھر جب اس کی سیہلی اپنی کوٹھی سے ماحقہ باغ میں اسے لے گئی اور وہاں اس نے چند تیلیاں دیکھیں تو وہ بھی اسے فرشتے دکھائی دیے۔۔۔ لیکن اس نے کئی مرتبہ سوچا کہ ایسے رنگیں اور ایسے نخے منے فرشتے کیسے ہو سکتے ہیں۔

اسے بہت دیر تک فرشتے ہی فرشتے دکھائی دیتے رہے جو اس کے قریب آتے، اس سے پیار کرتے، اس کا منہ چومتے، اس کے سینے پر ہاتھ پھیرتے، جس سے اس کو بڑی راحت ملتی لیکن ان فرشتوں کے ہاتھ بڑی تند ہی سے ایک طرف جھٹک دیتی اور ان سے کہتی، ”جاو۔۔۔ چلے جاؤ یہاں سے۔۔۔ تمہارا گھر تو آسمان پر ہے۔۔۔ یہاں کیا کرنے آئے ہو؟“

وہ فرشتے اس سے کہتے، ”ہم فرشتے نہیں حضرت آدم کی اولاد ہیں۔۔۔ وہی بزرگ جو جنت سے نکالے گئے تھے۔۔۔ پر ہم تمھیں پھر جنت میں پہنچا دینے کا وعدہ کرتے ہیں۔۔۔ چلو ہمارے ساتھ، وہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں اور شہد کی بھی۔“

سلمی نے یوں محسوس کیا کہ اس کے سینے میں سے دودھ کے نخے منے قطرے نکلنے شروع ہو گئے ہیں اور اس کے ہونٹ مٹھاں میں لپٹے ہوئے ہیں۔

شاہدہ، اس سے بار بار اپنے خاوند کی تعریف کرتی، اصل میں اس کا مدعا یہ تھا کہ اس کے بھائی کے ساتھ سلمی کا رشتہ قائم کر دے۔۔۔ مگر گھر پر یہ پہلی ملاقات تھی، اس لیے وہ کھل کے بات نہ کر سکی۔ بہر حال اس نے اشاروں کنایوں میں سلمی پر یہ واضح کر دیا کہ اس کا خاوند جو بہت شریف اور محبت کرنے والا آدمی ہے اس کا بھائی اس سے بھی کہیں زیادہ شریف نفس ہے۔

سلمی نے یہ اشارہ نہ سمجھا، اس لیے کہ وہ بہت سادہ لوح تھی، اس نے صرف اتنا کہہ دیا، ”آج کل کے زمانے میں شریف آدمیوں کا ملنا محال ہے۔۔۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمھیں ایسا خاندان مل گیا جہاں ہر آدمی نیک اور شریف ہے۔“

”افسوس ہے کہ اس وقت میرے خاوند گھر میں موجود نہیں ورنہ میں تم سے انھیں ضرور ملتی۔“

”کبھی پھر سہی۔۔۔ کیا کام کرتے ہیں؟“

”ہاۓ! انھیں کیا کام کرنے کی ضرورت ہے۔ لاکھوں روپے کی جائیداد ہے۔ مکانوں اور دکانوں سے کرا یہ ہی ہر مہینے دو ہزار کے قریب وصول ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ماشاء اللہ ذ میں ہیں، وہاں کی آمدنی الگ ہے۔۔۔ انماں کی کوئی دقت نہیں۔ منوں گندم گھر میں پڑا رہتا ہے۔ چاول بھی۔ ہر قسم کی ترکاری بھی ہر وقت میرہو سکتی ہے۔ اللہ کا بڑا افضل و کرم ہے۔۔۔ ان کا چھوٹا بھائی جو آج کل لندن میں ہے، زراعت کے متعلق جانے کیا سیکھ رہا ہے۔۔۔ ایک مہینے تک واپس آ رہا ہے۔۔۔ وہ اپنے بڑے بھائی کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت ہے۔۔۔ تم اسے دیکھو گی۔۔۔ تو۔۔۔“

سلمی نے گھبراتے ہوئے لبجھ میں کہا، ”ہاں! ہاں۔۔۔ جب وہ آئیں گے تو ان سے ملنے کا اتفاق ہو جائے گا۔۔۔“

شہدہ نے کہا، ”بڑا شریف لڑکا ہے۔۔۔ بالکل اپنے بڑے بھائی کی مانند۔“

”جی ہاں۔۔۔ ضرور ہو گا، آخر شریف خاندان سے تعلق ہے۔“

”وہ بس آنے ہی والا ہے۔۔۔ تم مجھے اپنی ایک تصویر دے دو۔“

”کیا کرو گی؟“

”بس شہد لگا کے چاٹا کروں گی۔“

یہ کہہ کر شہدہ نے سلمی کامنہ چوم لیا، اور پھر اپنے خاوند کی تعریفیں شروع کر دیں۔ سلمی تنگ آگئی، اس نے تھوڑی دیر کے بعد کوئی بہانہ بنا کر رخصت چاہی اور بس اسٹینڈ پر پہنچ گئی، جہاں اسے ”اے روٹ“ کی بس پکڑنا تھی۔ وہ جب وہاں پہنچی تو ایک مرد نے اسے بہت بری نگاہوں سے گھورنا شروع کر دیا۔ وہ پریشان ہو گئی، جائزوں کے دن تھے مگر اس نے کئی مرتبہ اپنی پیشانی سے پسینہ پوچھا۔

اسٹینڈ پر ایک بس آئی، اس نے اس کا نمبر نہ دیکھا اور جب چند مسافراترے تو وہ فوراً اس میں سوار ہو گئی۔ وہ آدمی بھی اس بس میں داخل ہو گیا، اس کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ بس کے انہن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی، جس کے باعث اسے رکنا پڑا۔ سب مسافروں سے کہہ دیا گیا کہ وہ اتر جائیں کیونکہ کافی دیر تک یہ بس نہیں چل سکے گی۔

سلمی نیچے اتری تو وہ آدمی جو اسے بہت بری طرح گھور رہا تھا وہ بھی اس کے ساتھ باہر نکلا۔۔۔ سڑک پر ایک کار جا رہی تھی اس نے اس کے ڈرائیور کو آواز دی ”امام دین!“

امام دین نے موڑا ایک دم روک لی۔ اس آدمی نے سلمی کا ہاتھ پکڑا اور اس سے کہا، ”چلیے۔۔۔ یہ میری کار ہے۔ جہاں بھی آپ جانا چاہتی ہیں، آپ کو چھوڑ آؤں گا۔“ سلمی انکار نہ کر سکی، موڑ میں بیٹھ گئی۔ اس کو ماؤں ٹاؤں جانا تھا مگر وہ اسے کہیں اور لے گیا۔۔۔ اور۔۔۔!

سلیمی نے محسوس کیا کہ مردوا قعی عورت کے لیے لازم ہوتا ہے۔۔۔ اس نے اپنی زندگی کا بہترین دن گزارا۔۔۔ گواں نے پہلے بہت جمل و جھٹ اور احتجاج کیا مگر اس آدمی نے اسے رام کر ہی لیا۔

تین چار گھنٹوں کے بعد جب سلمی نے اس شخص کا بٹوہ کھول کر یوں نہی دیکھا تو اس میں ایک طرف شاہدہ کا فوٹو تھا۔۔۔ اس نے بچکچا ہٹ کے ساتھ پوچھا، ”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ عورت کون ہے؟“

”اس شخص نے جواب دیا، ”میری بیوی۔“

سلمی کے حلق سے چڑھتے نکلتے رہ گئی۔۔۔ ”آپ کی بیوی؟“

شاہدہ کا خاوند مسکرا یا، ”کیا مردوں کی بیویاں نہیں ہوتیں؟“

- [81] -

سوکینڈل پاور کا بلب: سعادت حسن منٹو

وہ چوک میں قیصر پارک کے باہر جہاں ٹانگے کھڑے رہتے ہیں، بجلی کے ایک کھمبے کے ساتھ خاموش کھڑا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔۔۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!

یہی پارک جو صرف دوسرس پہلے اتنی پرلونق جگہ تھی، اب اجڑی پچڑی دکھائی دیتی تھی۔ جہاں پہلے عورت اور مرد شوخ و شنگ فیشن کے لباسوں میں چلتے پھرتے تھے، وہاں اب بے حد میلے کچلے کپڑوں میں لوگ ادھر ادھر بے مقصد پھر رہے تھے۔ بازار میں کافی بھیڑ تھی گر اس میں وہ رنگ نہیں تھا جو ایک میلے ٹھیلے کا ہوا کرتا تھا۔ آس پاس کی سیمنٹ سے بنی ہوئی بلڈنگیں اپناروپ کھوچکی تھیں۔ سر جھاڑ منہ پھاڑ ایک دوسرے کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ جیسے بیوہ عورتیں۔

وہ حیران تھا کہ وہ غازہ کہاں گیا۔ وہ سیند ور کہاں اڑ گیا۔ وہ سر کہاں غائب ہو گئے جو اس نے کبھی یہاں دیکھے اور سنے تھے۔۔۔ زیادہ عرصہ کی بات نہیں، ابھی وہ کل ہی تو (دوبرس بھی کوئی عرصہ ہوتا ہے) یہاں آیا تھا۔ کلکتے سے جب اسے یہاں کی ایک فرم نے اچھی تنخواہ پر بلا�ا تھا تو اس نے قیصر پارک میں کتنی کوشش کی کہ اسے کرائے پر ایک کرہ ہی مل جائے مگر وہ ناکام رہا تھا۔ ہزار فرمائشوں کے باوجود۔

مگر اس نے دیکھا کہ جس کنجڑے، جولا ہے اور موچی کی طبیعت چاہتی تھی، فلیٹوں اور کمروں پر اپنا قبضہ جما رہا تھا۔

جہاں کسی شان دار فلم کمپنی کا دفتر ہوا کرتا تھا، وہاں چولہے سلگ رہے ہیں۔ جہاں کبھی شہر کی بڑی بڑی رنگین ہستیاں جمع ہوتی تھیں، وہاں دھوپی میلے کپڑے دھورے ہیں۔

دوبرس میں اتنا بڑا انقلاب!

وہ حیران تھا۔ لیکن اس کو اس انقلاب کا پس منظر معلوم تھا۔ اخباروں کے ذریعہ سے اور ان دوستوں سے جو شہر میں موجود تھے، اسے سب پتہ لگ چکا تھا کہ یہاں کیسا طوفان آیا تھا۔ مگر وہ سوچتا تھا کہ یہ کوئی عجیب و غریب طوفان تھا جو عمارتوں کا رنگ و روپ بھی چو س کر لے گیا۔ انسانوں نے انسان قتل کیے۔ عورتوں کی بے عزتی کی، لیکن عمارتوں کی خشک لکڑیوں اور ان کی اینٹوں سے بھی بھی سلوک کیا۔ اس نے سنا تھا کہ اس طوفان میں عورتوں کو ننگا کیا گیا تھا۔ ان کی چھاتیاں کاٹی گئی تھیں۔ یہاں اس کے آس پاس جو کچھ تھا، سب ننگا اور جو بن بریدہ تھا۔

وہ بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگا اپنے ایک دوست کا انتظار کر رہا تھا۔ جس کی مدد سے وہ اپنی رہائش کا کوئی بندوبست کرنا چاہتا تھا۔ اس دوست نے اس سے کہا کہ تم قیصر پارک کے پاس جہاں ٹانگے کھڑے رہا کرتے ہیں میرا انتظار کرنا۔

دوبرس ہوئے جب وہ ملازمت کے سلسلے میں یہاں آیا تو یہ ٹانگوں کا اڈا بہت مشہور جگہ تھی، سب سے عمدہ، سب سے بانکے ٹانگے صرف یہیں کھڑے رہتے تھے، کیونکہ یہاں سے عیاشی کا ہر سامان مہیا ہو جاتا تھا۔ اچھے سے اچھار یسٹورنٹ اور ہوٹل قریب تھا۔ بہترین چائے، بہترین کھانا اور دوسرے لوازمات بھی۔ شہر کے جتنے بڑے دلال تھے وہ یہیں دستیاب ہوتے تھے۔ اس لیے کہ قیصر پارک میں بڑی بڑی کمپنیوں کے باعث روپیہ اور شراب پانی کی طرح بہتے تھے۔

اس کو یاد آیا کہ دو برس پہلے اس نے اپنے دوست کے ساتھ بڑے عیش کیے تھے۔ اچھی سے اچھی لڑکی ہر رات کوان کی آغوش میں ہوتی تھی۔ اس کا جنگ کے باعث نایاب تھی مگر ایک منٹ میں درجنوں بوتلیں مہیا ہو جاتی تھیں۔

ٹانگے اب بھی کھڑے تھے مگر ان پر وہ کاغذیاں، وہ پھندنے، وہ پیتیل کے پالش کیے ہوئے ساز و سامان کی چمک دمک نہیں تھی۔ یہ بھی شاید دوسری چیزوں کے ساتھ اڑائی تھی۔

اس نے گھر میں وقت دیکھا۔ پانچ نجح چکے تھے۔ فروری کے دن تھے۔ شام کے سامنے چھانے شروع ہو گئے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے دوست کو لعنت ملامت کی اور دائیں ہاتھ کے ویران ہو ٹل میں موری کے پانی سے بنائی ہوئی چائے پینے کے لیے جانے ہی والا تھا کہ کسی نے اس کو ہولے سے پکارا۔ اس نے خیال کیا کہ شاید اس کا دوست آگیا۔ مگر جب اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک اجنبی تھا۔ عام شکل و صورت کا، لٹھے کی نئی شلوار میں جس میں اب اور زیادہ شکنون کی گنجائش نہیں تھی۔ نیلی پالپین کی قمیص جو لانڈری میں جانے کے لیے بیتاب تھی۔

اس نے پوچھا، ”کیوں بھی! تم نے مجھے بلا�ا؟“

اس نے ہولے سے جواب دیا، ”جی ہاں۔“

اس نے خیال کیا کہ مہاجر ہے بھیک ماننا چاہتا ہے، ”کیا مانگتے ہو؟“

اس نے اسی لمحے میں جواب دیا، ”جی کچھ نہیں۔“ پھر قریب آ کر کہا، ”کچھ چاہیے آپ کو؟“

”کیا؟“

”کوئی لڑکی وڑکی۔“ یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

اس کے سینے میں ایک تیر سالگا کہ دیکھواں زمانے میں بھی یہ لوگوں کے جنسی جذبات ٹولتا پھرتا ہے۔۔۔ اور پھر انسانیت کے متعلق اوپر تلے اس کے دماغ میں بڑے حوصلہ شکن خیالات آئے۔ انہی خیالات کے زیر اثر اس نے پوچھا۔

”کہاں ہے؟“

اس کا لہجہ دلال کے لیے امید افزان ہیں تھا۔ چنانچہ قدم اٹھاتے ہوئے اس نے کہا، ”جی نہیں آپ کو ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔“

اس نے اس کو روکا، ”یہ تم نے کس طرح جانا۔ انسان کو ہر وقت اس چیز کی ضرورت ہوتی ہے جو تم مہیا کر سکتے ہو۔۔۔ وہ سویل پر بھی۔۔۔ جلتی چتا میں بھی۔۔۔“

وہ فلسفی بننے ہی والا تھا کہ رک گیا۔ ”دیکھو۔۔۔ اگر کہیں پاس ہی ہے تو میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے یہاں ایک دوست کو وقت دے رکھا ہے۔“

دلال قریب آگیا، ”پاس ہی۔۔۔ بالکل پاس۔“

”کہاں؟“

”یہ سامنے والی بلڈنگ میں۔“

اس نے سامنے والی بلڈنگ کو دیکھا۔

”اس میں۔۔۔ اس بڑی بلڈنگ میں؟“

”جی ہاں۔“

وہ لرز گیا۔ ”اچھا۔۔۔ تو۔۔۔؟“

سنجل کر اس نے پوچھا، ”میں بھی چلوں؟“

”چلیے۔۔۔ لیکن میں آگے چلتا ہوں۔“ اور دلال نے سامنے والی بلڈنگ کی طرف چنان شروع کر دیا۔

وہ سیکڑوں روح شگاف باتیں سوچتا اس کے پیچھے ہولیا۔

چند گزوں کا فاصلہ تھا، فوراً طے ہو گیا۔ دلال اور وہ دونوں اس بڑی بلڈنگ میں تھے۔ جس کی پیشانی پر ایک بورڈ لائک رہا تھا۔۔۔ اس کی حالت سب سے خستہ تھی، جگہ جگہ اکھڑی ہوئی اینٹوں، کٹے ہوئے پانی کے نمou اور کوڑے کر کٹ کے ڈھیر تھے۔

اب شام گھری ہو گئی تھی۔ ڈیوڑھی میں سے گزر کر آگے بڑھے تو انہیں ہیرا شروع ہو گیا۔ چوڑا چکلا صحن طے کر کے وہ ایک صرف مڑا۔ عمارت بننے بنتے رک گئی تھی۔ ٹنگی اینٹیں تھیں۔ چونا اور سینٹ ملے ہوئے سخت ڈھیر پڑے تھے اور جا بجا بجری بکھری ہوئی تھی۔

دلال نا مکمل سیڑھیاں چڑھنے لگا کہ مڑ کر اس نے کہا، ”آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں ابھی آیا۔“

وہ رک گیا۔ دلال غائب ہو گیا۔ اس نے منہ اوپر کر کے سیڑھیوں کے اختتام کی طرف دیکھا تو اسے تیز روشنی نظر آئی۔

دو منٹ گزر گئے تو دبے پاؤں وہ بھی اوپر چڑھنے لگا۔ آخری زینے پر اسے دلال کی بہت زور کی کڑک سنائی دی۔ ”اٹھتی ہے کہ نہیں؟“

کوئی عورت بولی، ”کہہ جو دیا مجھے سونے دو۔“ اس کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔

دلال پھر کڑکا، ”میں کہتا ہوں اٹھ۔۔۔ میرا کہا نہیں مانے گی تو یاد رکھ۔۔۔“

عورت کی آوازی، ”تو مجھے مار ڈال۔۔۔ لیکن میں نہیں اٹھوں گی۔ خدا کے لیے میرے حال پر حرم کر۔“

دلال نے پچکا را، ”اٹھ میری جان۔ ضدنہ کر۔ گزارہ کیسے چلے گا۔“

عورت بولی، ”گزارہ جائے جہنم میں۔ میں بھوکی مر جاؤں گی۔ خدا کے لیے مجھے تنگ نہ کر۔ مجھے نیند آرہی ہے۔“

دلال کی آواز کڑی ہو گئی، ”تو نہیں اٹھے گی حرامزادی، سورکی پچی---“

عورت چلانے لگی، ”میں نہیں اٹھوں گی--- نہیں اٹھوں گی--- نہیں اٹھوں گی۔“

دلال کی آواز بھنج گئی۔

”آہستہ بول--- کوئی سن لے گا--- لے چل اٹھ--- تیس چالیس روپے مل جائیں گے۔“

عورت کی آواز میں اتنا تھی--- دیکھ میں ہاتھ جوڑتی ہوں--- میں کتنے دنوں سے جاگ رہی ہوں--- رحم کر--- خدا کے لیے مجھ پر رحم کر---“

”بس ایک دو گھنٹے کے لیے--- پھر سو جانا--- نہیں تو دیکھ مجھے سختی کرنی پڑے گی۔“

تحوڑی دیر کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ اس نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر اس کمرے میں جھانکا جس میں بڑی تیز روشنی آرہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی کوٹھری ہے جس کے فرش پر ایک عورت لیٹی ہے--- کمرے میں دو تین برتن ہیں، بس اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ دلال اس عورت کے پاس بیٹھا اس کے پاؤں داب رہا تھا۔

تحوڑی دیر کے بعد اس نے اس عورت سے کہا، ”لے اب اٹھ--- قسم خدا کی ایک دو گھنٹے میں آجائے گی--- پھر سو جانا۔“

وہ عورت ایک دم بیوں اٹھی جیسے آگ دکھائی ہوئی چھپھوندر اٹھتی ہے اور چلائی، ”اچھا اٹھتی ہوں۔“

وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ اصل میں وہ ڈر کیا تھا۔ دبے پاؤں وہ تیزی سے نیچے اتر گیا۔ اس نے سوچا کہ بھاگ جائے۔۔۔ اس شہر ہی سے بھاگ جائے۔۔۔ اس دنیا سے بھاگ جائے۔۔۔ مگر کہاں؟“

پھر اس نے سوچا کہ یہ عورت کون ہے؟ کیوں اس پر اتنا ظلم ہو رہا ہے؟ اور یہ دلال کون ہے؟ اس کا کیا لگتا ہے اور یہ اس کمرے میں اتنا بلب جلا کر جو سوکینڈل پاور سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ کیوں رہتے ہیں۔ کب سے رہتے ہیں؟“

اس کی آنکھوں میں اس تیز بلب کی روشنی ابھی تک گھسی ہوئی تھی۔ اس کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر وہ سوچ رہا تھا کہ اتنی تیز روشنی میں کون سو سکتا ہے؟ اتنا بڑا بلب؟ کیا وہ چھوٹا نہیں لگاسکتے۔ یہی پندرہ پچسیں کینڈل پاور کا؟

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آہٹ ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ دوسارے اس کے پاس کھڑے ہیں۔ ایک نے جو دلال کا تھا۔ اس سے کہا، ”دیکھ لجیئے۔“

اس نے کہا، ”دیکھ لیا ہے۔“

”ٹھیک ہے نا؟“

”ٹھیک ہے۔“

”چالیس روپے ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“

”دے دیجیے۔“

وہ اب سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ جیب میں اس نے ہاتھ ڈالا اور کچھ نوٹ نکال کر دلال کے حوالے کر دیے۔

”دیکھ لو کتنے ہیں!“

نوٹوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔

دلال نے کہا، ”چچاں ہیں۔“

اس نے کہا، ”چچاں ہی رکھو۔“

”صاحب سلام“

اس کے جی میں آئی کہ ایک بہت بڑا پتھر اٹھا کر اس کو دے مارے۔

دلال بولا، ”تو لے جائیے اسے۔ لیکن دیکھیے تنگ نہ کبھی گا اور پھر ایک دو گھنٹے کے بعد چھوڑ جائیے گا۔“

”بہتر۔“

اس نے بڑی بلڈنگ کے باہر نکلنا شروع کیا جس کی پیشانی پروہ کئی بار ایک بہت بڑا بورڈ پڑھ چکا تھا۔ باہر ٹانگہ کھڑا تھا۔ وہ آگے بیٹھ گیا اور عورت پیچھے۔ دلال نے ایک بار پھر سلام کیا اور ایک بار پھر اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ایک بہت بڑا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے۔

ٹانگہ چل پڑا۔۔۔ وہ اسے پاہی ایک دیر ان سے ہوٹل میں لے گیا۔۔۔ دماغ کو حتی المقدور اس بکدر سے جو اسے پہنچ چکا تھا کال کر اس نے اس عورت کی طرف دیکھا جو سر سے پیر تک اجازہ تھی۔۔۔ اس کے پپوٹ سوچے ہوئے تھے۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کا اوپر کا دھڑ بھی سارے کاسارا خمیدہ تھا جیسے وہ ایک ایسی عمارت ہے جو پل بھر میں گرجائے گی۔

وہ اس سے مخاطب ہوا، ”ذر اگر دن تو اونچی کبھی۔“

وہ زور سے چوکی، ”کیا؟“

”کچھ نہیں۔۔۔ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ کوئی بات تو بکھیے۔“

اس کی آنکھیں سرخ بوٹی ہو رہی تھیں جیسے ان میں مرچیں ڈالی گئی ہوں۔۔۔ وہ خاموش رہی۔

”آپ کا نام؟“

”کچھ بھی نہیں؟“ اس کے لمحے میں تیزاب کی سی تیزی تھی۔

”آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟“

”جہاں کی بھی تم سمجھ لو۔“

”آپ اتنا روکھا کیوں بولتی ہیں۔“

عورت اب قریب قریب جاگ پڑی اور اس کی طرف لاں بوٹی آنکھوں سے دیکھ کر کہنے لگی، ”تم اپنا کام کرو۔ مجھے جانا ہے۔“

اس نے پوچھا، ”کہاں؟“

عورت نے بڑی روکھی بے انتہائی سے جواب دیا، ”جہاں سے مجھے تم لائے ہو۔“

”آپ چلی جائیے۔“

”تم اپنا کام کرونا۔۔۔ مجھے تنگ کیوں کرتے ہو؟“

اس نے اپنے لبھے میں دل کا سارا درد بھر کے اس سے کہا، ”میں تمہیں تنگ نہیں کرتا۔۔۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔“

وہ جھلائی، ”مجھے نہیں چاہیے کوئی ہمدرد۔“ پھر قریب قریب چھپڑی، ”تم اپنا کام کرو اور مجھے جانے دو۔“

اس نے قریب آکر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہا تو اس عورت نے زور سے ایک طرف جھٹک دیا۔ ”میں کہتی ہوں مجھے تنگ نہ کرو۔ میں کئی دنوں سے جاگ رہی ہوں۔۔۔ جب سے آئی ہوں، جاگ رہی ہوں۔“

وہ سرتاپا ہمدردی بن گیا۔

”سو جاؤ میں۔“

عورت کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ تیز لبھے میں بولی، ”میں یہاں سونے نہیں آئی۔۔۔ یہ میرا گھر نہیں۔“

”تمہارا گھر وہ ہے جہاں سے تم آئی ہو؟“

عورت اور زیادہ خشنماک ہو گئی۔

”اف۔۔۔ بکواس بند کرو۔۔۔ میرا کوئی گھر نہیں۔۔۔ تم اپنا کام کرو ورنہ مجھے چھوڑ آؤ اور اپنے روپے لے لو اس۔۔۔ اس۔۔۔“ وہ گالی دیتی رہ گئی۔

اس نے سوچا کہ اس عورت سے ایسی حالت میں کچھ پوچھنا اور ہمدردی جتنا فضول ہے۔ چنانچہ اس نے کہا، ”چلو، میں تمہیں چھوڑ آؤں۔“

اور وہ اس بڑی بلڈنگ میں چھوڑ آیا۔

دوسرے دن اس نے قیصر پارک کے ایک ویران ہوٹل میں اس عورت کی ساری داستان اپنے دوست کو سنائی۔ دوست پر رفت طاری ہو گئی۔ اس نے بہت افسوس کا اظہار کیا اور پوچھا، ”کیا جوان تھی؟“

اس نے کہا، ”مجھے معلوم نہیں۔۔۔ میں اسے اچھی طرح بالکل نہ دیکھ سکا۔۔۔ میرے دماغ میں توہر وقت یہ خیال آتا تھا کہ میں نے وہیں سے پتھراٹھا کر دلال کا سر کیوں نہ کھل دیا۔“

دوست نے کہا، ”واقعی بڑے ثواب کا کام ہوتا۔“

وہ زیادہ دیر تک ہوٹل میں اپنے دوست کے ساتھ نہ بیٹھ سکا۔ اس کے دل و دماغ پر پچھلے روز کے واقعہ کا بہت بوجھ تھا۔ چنانچہ چائے ختم ہوئی تو دونوں رخصت ہو گئے۔

اس کا دوست چپکے سے ٹانگوں کے اڈے پر آیا۔ تھوڑی دیر تک اس کی نگاہیں اس دلال کو ڈھونڈتی رہیں مگر وہ نظر نہ آیا۔ چھنگ چکے تھے۔ بڑی بلڈنگ سامنے تھی چند گزوں کے فاصلے پر۔ وہ اس طرف چل دیا اور اس میں داخل ہو گیا۔

لوگ اندر آجاتے تھے۔ مگر وہ بڑے اطمینان سے اس مقام پر پہنچ گیا۔ کافی اندر ہیرا تھا مگر جب وہ ان سیڑھیوں کے پاس پہنچا تو اسے روشنی دکھائی دی۔ اوپر دیکھا اور دبے پاؤں اوپر چڑھنے لگا۔ کچھ دیر وہ آخری زینے پر خاموش کھڑا رہا۔ کمرے سے تیز روشنی آرہی تھی۔ مگر کوئی آواز، کوئی آہٹ اسے سنائی نہ دی۔ آخری زینہ طے کر کے وہ آگے بڑھا۔ دروازے کے پٹ کھلے تھے۔ اس نے ذرا ادھر ہٹ کر اندر جھانکا۔ سب سے پہلے اسے بلب نظر آیا جس کی روشنی اس کی آنکھوں میں گھس گئی۔ ایک دم وہ پرے ہٹ گیا تاکہ تھوڑی دیر اندر ہیرے کی طرف منہ کر کے اپنی آنکھوں سے چکا چوند نکال سکے۔

اس کے بعد وہ پھر دروازے کی طرف بڑھا مگر اس انداز سے کہ اس کی آنکھیں بلب کی تیز روشنی کی زد میں نہ آئیں۔ اس نے اندر فرش کا جو حصہ اسے نظر آیا۔ اس پر ایک عورٹ چٹائی پر لیٹی تھی۔ اس نے اسے غور سے دیکھا۔ سورہی تھی۔ منہ پر دو پٹھے تھا۔ اس کا سینہ سانس کے اتار چڑھا وہے ہل رہا تھا۔۔۔ وہ ذرا اور آگے بڑھا۔ اس کی چیخ نکل گئی مگر اس نے فوراً ہی دبای۔۔۔ اس عورت سے کچھ دور نگے فرش پر ایک آدمی پڑا تھا۔ جس کا سر پا ش پاش تھا۔۔۔ پاس ہی خون آلود اینٹ پڑی تھی۔ یہ سب اس نے ایک نظر دیکھا۔۔۔ اور

سیر ہیوں کی طرف لپکا۔۔۔ پاؤں پھسلا اور نیچے۔۔۔ مگر اس نے چوٹوں کی کوئی پروانہ کی اور ہوش و حواس قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بمشکل اپنے گھر پہنچا اور ساری رات ڈراونے خواب دیکھتا رہا۔

-[82]-

قادر اقصائی: سعادت حسن منفو

عیدن بائی آگرے والی، چھوٹی عید کو پیدا ہوئی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس کی ماں زہرہ جان نے اس کا نام اسی مناسبت سے عیدن رکھا۔ زہرہ جان اپنے وقت کی بہت مشہور گانے والی تھی، بڑی دور دور سے رئیس اس کا مجراسنے کے لیے آتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ میر ٹھکے ایک تاجر عبد اللہ سے، جولاکھوں میں کھلیتا تھا، اسے محبت ہو گئی، اس نے چنانچہ اسی جذبے کے ماتحت اپنا پیشہ چھوڑ دیا۔ عبد اللہ بہت متاثر ہوا اور اس کی ماہوار تنخواہ مقرر کر دی کوئی تین سو کے قریب۔ ہفتے میں تین مرتبہ اس کے پاس آتا، رات ٹھہرتا، صبح سویرے وہاں سے روانہ ہو جاتا۔

جو شخص زہرہ جان کو جانتے ہیں اور آگرے کے رہنے والے ہیں، ان کا یہ بیان ہے کہ اس کا چاہنے والا ایک بڑھتی تھا مگر وہ اسے منہ نہیں لگاتی تھی۔ وہ بیچارہ ضرورت سے زیادہ محنت و مشقت کرتا اور تین چار مہینے کے بعد روپے جمع کر کے زہرہ جان کے پاس جاتا مگر وہ اسے دھن تکار دیتی۔

آخر ایک روز اس بڑھتی کو زہرہ جان سے مفصل گفتگو کرنے کا موقعہ مل ہی گیا، پہلے تو وہ کوئی بات نہ کر سکا، اس لیے کہ اس پر اپنی محبوبہ کے حسن کا رب طاری تھا لیکن اس نے تھوڑی دیر کے بعد جرأت سے کام لیا اور اس سے کہا:

”زہرہ جان۔۔۔ میں غریب آدمی ہوں، مجھے معلوم ہے کہ بڑے بڑے دھن والے تمہارے پاس آتے ہیں اور تمہاری ہر ادا پر سیکڑوں روپے پنچاہر کرتے ہیں۔۔۔ لیکن تمھیں شاید یہ بات معلوم نہیں کہ غریب کی محبت دھن دولت والوں کے لاکھوں روپوں سے بڑی ہوتی ہے۔۔۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔۔۔ معلوم نہیں کیوں۔۔۔“

زہرہ جان بُنی، اس بُنی سے بڑھی کا دل مجرد ہو گیا، ”تم نہستی ہو۔۔۔ میری محبت کا مذاقِ اڑاتی ہو، اس لیے کہ یہ کنگے کی محبت ہے جو لکڑیاں چیر کر اپنی روزی کماتا ہے۔۔۔ یادِ کھویہ تمہارے لاکھوں میں کھینے والے تمحیں وہ محبت اور پیار نہیں دے سکتے جو میرے دل میں تمہارے لیے موجود ہے۔“

زہرہ جان آکتا گئی، اس نے اپنے ایک میراثی کو بلا یا اور اس سے کہا کہ بڑھی کو باہر نکال دو، لیکن وہ اس سے پہلے ہی چلا گیا۔ ایک برس کے بعد عیدِ نبی پیدا ہوئی۔۔۔ اس کا باب پ عبد اللہ تھا یا کوئی اور، اس کے متعلق کوئی بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا، بعض کا خیال ہے کہ وہ غازی آباد کے ایک ہندو سیطھ کے نطفے سے ہے۔۔۔ کسی کے نطفے سے بھی ہو مگر بلا کی خوبصورت تھی۔

ادھر زہرہ جان کی عمر ڈھلتی گئی، ادھر عیدِ نبی جوان ہوتی گئی، اس کی ماں نے اس کو مو سیقی کی بڑی اچھی تعلیم دی، لڑکی ذہین تھی، کئی استادوں سے اس نے سبق لیے اور ان سے داد و صول کی۔

زہرہ جان کی عمر اب چالیس برس کے قریب ہو گئی، وہ اب اس منزل سے گزر چکی تھی جب کسی طوائف میں کشش باقی رہتی ہے، وہ اپنی اکلوتی لڑکی عیدِ نبی کے شہارے بھی رہی تھی، ابھی تک اس نے اس سے مجر ا نہیں کرایا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ بہت بڑی تقریب ہو جس کا افتتاح کوئی راجہ نواب کرے۔

عیدِ نبی کے حسن کے چچے عام تھے۔ دور دور تک عیاش رئیس میں اس کے تذکرے ہوتے تھے، وہ اپنے ایجنتوں کو زہرہ جان کے پاس بھیجتے اور عیدِ نبی کی نتھی اتارنے کے لیے اپنی اپنی پیش کش بھیجتے، مگر اس کو اتنی جلدی نہیں تھی، وہ چاہتی تھی کہ مسی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ قیمت و صول کرے۔ اس کی لڑکی لاکھوں میں ایک تھی، سارے شہر میں اس جیسی حسین لڑکی اور کوئی نہیں تھی۔

اس کے حسن کی نمائش کرنے کے لیے وہ ہر جعرات کی شام کو اس کے ساتھ پیدل باہر سیر کو جاتی، عشق پیشہ مرد اس کو دیکھتے تو دل تھام تھام لیتے۔

پھنسی پھنسی چولی میں گدرایا ہوا جو بن، سٹول بانھیں، مخروطی انگلیاں جن کے ناخنوں پر جیتا جیتا ہوا ایسا رنگ، ٹھم کا ساقد، گھنگریا لے بال، قدم قدم پر قیامت ڈھاتی تھی۔

آخر ایک روز زہرہ جان کی امید بر آئی۔ ایک نواب عیدن پر ایسا لٹھا ہوا کہ وہ منہ مالگے دام دینے پر رضامند ہو گیا۔ زہرہ جان نے اپنی بیٹی کی مسی کی رسم کے لیے بڑا اہتمام کیا، کئی دیگریں پلاو اور تجنن کی چڑھائی گئیں۔ شام کو نواب صاحب اپنی بکھری میں آئے، زہرہ جان نے ان کی بڑی آوبھگت کی۔ نواب صاحب بہت خوش ہوئے، عیدن دلہن بنی ہوئی تھی، نواب صاحب کے ارشاد کے مطابق اس کا مجر اشروع ہوا۔ پھٹ پڑنے والا شباب تھا جو مجنون نہ سراہی تھا۔

عیدن اس شام بلا کی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی، اس کی ہر جنبش، ہر ادا، اس کے گانے کا ہر سرزد شکن تھا۔ نواب صاحب گاؤں تکیے کا سہارا لیے بیٹھے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ آج رات وہ جنت کی سیر کریں گے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک بے ہنگم سا آدمی اندر داخل ہوا اور زہرہ جان کے پاس بیٹھ گیا، وہ بہت گھبرائی، یہ وہی بڑھتی تھا۔ اس کا عاشق زار، بہت میلے اور گندے کپڑے پہنے تھا۔ نواب صاحب کو جو بہت نفاست پسند تھے، اب کائیاں آنے لگیں۔ انہوں نے زہرہ جان سے کہا، ”یہ کون بد تمیز ہے؟“

بڑھتی مسکرا یا، ”حضور! میں ان کا عاشق ہوں۔“

نواب صاحب کی طبیعت اور زیادہ مکدر ہو گئی، ”زہرہ جان، نکالو اس حیوان کو باہر۔“

بڑھتی نے اپنے تھیلے سے آری نکالی اور بڑی مضبوطی سے زہرہ جان کو کپڑ کر اس کی گردان پر تیزی سے چلانا شروع کر دی، نواب صاحب اور میراثی وہاں سے بھاگ گئے، عیدن بے ہوش ہو گئی۔ بڑھتی نے اپنا کام بڑے اطمینان سے ختم کیا اور لہو بھری آری اپنے تھیلے میں ڈال کر سیدھا تھانے گیا اور اقبال جرم کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے عمر قید ہو گئی تھی۔

عیدن کو اپنی ماں کے قتل ہونے کا اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ دواڑھائی مہینے تک یہاں رہی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ زندہ نہیں رہے گی مگر آہستہ آہستہ اس کی طبیعت سنجنہنے لگی اور وہ اس قابل ہو گئی کہ چل پھر سکے۔ ہسپتال میں اس کی تیار داری صرف اس کے استاد اور میراثی کی کرتے تھے۔ وہ نواب اور رئیس جو اس پر اپنی جان چھڑ کتے تھے، بھولے سے بھی اس کو پوچھنے کے لیے نہ آئے۔ وہ بہت دل برداشتہ ہو گئی۔ وہ آگرہ چھوڑ کر دہلی چلی آئی۔ مگر اس کی طبیعت اتنی ادا س تھی کہ اس کا جی قطعاً مجر اکرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ اس کے پاس بیس پچھیں ہزار روپے کے زیورات تھے جن میں آدھے اس کی مقتول ماں کے تھے وہ انھیں پیچتی رہی اور گزارہ کرتی رہی۔

عورت کو زیور بڑے عزیز ہوتے ہیں، اس کو بڑا دکھ ہوتا تھا جب وہ کوئی چوڑی یا نکس اونے پونے داموں بیچتی تھی۔ عجب عالم تھا، خون پانی سے بھی ارزال ہو رہا تھا۔ مسلمان دھڑادھڑ پاکستان جا رہے تھے کہ ان کی جانب محفوظ رہیں۔ عیندین نے بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ دہلی میں نہیں رہے گی۔ لاہور چلی جائے گی۔ بڑی مشکلوں سے اپنے کئی زیورات پیچ کروہ لاہور پہنچ گئی لیکن راستے میں اس کی تمام بیش قیمت پشوازیں اور باقی ماندہ زیور اس کے اپنے بھائی مسلمانوں ہی نے غائب کر دیے۔ جب وہ لاہور پہنچی تو وہ اٹی پٹی تھی۔۔۔ لیکن اس کا حسن ویسے کاویسا تھا۔ دہلی سے لاہور آتے ہوئے ہزاروں لیچائی ہوئی آنکھوں نے اس کی طرف دیکھا مگر اس نے بے انتہائی برتری۔

وہ جب لاہور پہنچی تو اس نے سوچا کہ زندگی بسر کیسے ہو گی؟ اس کے پاس توچنے کھانے کے لیے بھی چند پیسے نہیں تھے لیکن لڑکی ذہین تھی، سیدھی اس جگہ پہنچی جہاں اس کی ہم پیشہ رہتی تھیں، بہاں اس کی بڑی آؤ بھگت کی گئی۔ ان دونوں لاہور میں روپیہ عام تھا، ہندو جو کچھ یہاں چھوڑ گئے تھے، مسلمانوں کی ملکیت بن گیا تھا۔ ہیر امنڈی کے وارے نیارے تھے۔ عیندین کو جب لوگوں نے دیکھا تو وہ اس کے عاشق ہو گئے۔ رات بھراں کو سیکڑوں گانے سننے والوں کی فرمائشیں پوری کرنا پڑتیں۔ صحیح چاربے کے قریب جب کہ اس کی آواز جواب دے چکی ہوتی وہ اپنے سامعین سے معدرت طلب کرتی اور اوندھے منہ اپنی چارپائی پر لیٹ جاتی۔

یہ سلسلہ قریب ڈیڑھ برس تک جاری رہا۔۔۔ عیندین اس کے بعد ایک علیحدہ کوٹھا کرایے پر لے کر وہاں اٹھ آئی، جو نکہ جہاں وہ مقیم تھی، اس ناگلہ کو اسے اپنی آدمی آمدن دینا پڑتی تھی۔ جب اس نے علیحدہ اپنے کوٹھے پر مجرما کرنا شروع کیا تو اس کی آمدن میں اضافہ ہو گیا۔ اب اسے ہر قسم کی فراغت حاصل تھی، اس نے کئی زیور بنایے، کپڑے بھی اچھے سے اچھے تیار کرایے۔

اسی دوران میں اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو بلیک مارکیٹ کا بادشاہ تھا، اس نے کم از کم دو کروڑ روپے کمائے تھے، خوبصورت تھا، اس کے پاس تین کاریں تھیں، پہلی ہی ملاقات پر وہ عیندین کے حسن سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اپنی کھڑی سفید پیکارڈ اس کے حوالے کر دی۔

اس کے علاوہ وہ ہر شام آتا اور کم از کم دو ڈھائی سوروپے اس کی نذر ضرور کرتا۔ ایک شام وہ آیا تو چاندنی کسی تدریجی میلی تھی۔ اس نے عیندین سے پوچھا، ”کیا بات ہے آج تمہاری چاندنی اتنی گندی ہے؟“

عیندین نے ایک ادا کے ساتھ جواب دیا، ”آج کل لٹھا کہاں ملتا ہے؟“

دوسرے دن اس بلیک مارکیٹ کے بادشاہ نے چالیس تھان لٹھے کے بھجوادیے، اس کے تیرے روز بعد اس نے ڈھائی ہزار روپے دیے کہ عیدن اپنے گھر کی آرائش کا سامان خرید لے۔

عیدن کو اچھا گوشت کھانے کا بہت شوق تھا۔ جب وہ آگرے اور دلی میں تھی تو اسے عمدہ گوشت نہیں ملتا تھا مگر لاہور میں اسے قادر اقصائی بہترین گوشت مہیا کرتا تھا۔۔۔ بغیر ریشے کے، ہر بوٹی ایسی ہوتی تھی جیسے ریشم کی بنی ہو۔ دکان پر اپنا شاگرد بٹھا کر قادر اصح سویرے آتا اور ڈیڑھ سیر گوشت جس کی بوٹی بوٹی پھر کر رہی ہوتی، عیدن کے حوالے کر دیتا، اس سے دیر تک با تین کرتار ہتا جو عام طور پر گوشت ہی کے بارے میں ہوتیں۔

بلیک مارکیٹ کا بادشاہ جس کا نام ظفر شاہ تھا، عیدن کے عشق میں بہت بری طرح گرفتار ہو چکا تھا، اس نے ایک شام عیدن سے کہا کہ وہ اپنی ساری جانیاد، منقولہ اور غیر منقولہ اس کے نام منتقل کرنے کے لیے تیار ہے، اگر وہ اس سے شادی کر لے۔۔۔ مگر عیدن نہ مانی۔ ظفر شاہ بہت مایوس ہوا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ عیدن اس کی ہوجائے مگر ہر بار اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ مجرے سے فارغ ہو کر رات کے دو تین بجے کے قریب باہر نکل جاتی تھی، معلوم نہیں کہا۔

ایک رات جب ظفر شاہ اپنا غم غلط کر کے۔۔۔ یعنی شراب پی کر پیدل ہی چلا آرہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ سائیں کے تکیے کے باہر عیدن ایک نہایت بد نما آدمی کے پاؤں پکڑے انتباہیں کر رہی ہے کہ خدا کے لیے مجھ پر نظر کرم کرو، میں دل و جان سے تم پر فدا ہوں۔۔۔ تم اتنے ظالم کیوں ہو۔۔۔ اور وہ شخص جسے غور سے دیکھنے پر ظفر شاہ نے پہچان لیا کہ قادر اقصائی ہے، اسے دھنکار رہا ہے، ”جا۔۔۔ ہم نے آج تک کسی کنجھری کو منہ نہیں لگایا۔۔۔ مجھے تنگ نہ کیا کر۔“

قادر اسے ٹھوکریں مارتا رہا اور عیدن اسی میں لذت محسوس کرتی رہی۔

وہ انٹر کلاس کے زنانہ ڈبے سے نکلی، اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا اپنی کیس تھا۔ جاوید پشاور سے اسے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ راولپنڈی کے اسٹیشن پر گاڑی کافی دیر ٹھہری تو وہ ساتھ والے زنانہ ڈبے کے پاس سے کئی مرتبہ گزرا۔ لڑکی حسین تھی، جاوید اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا، اس کی ناک کی چینگ پر چھوٹا سا تھا، گالوں میں نئے نئے گڑھے تھے جو اس کے چہرے پر بہت بھلے لگتے تھے۔

راولپنڈی اسٹیشن پر اس لڑکی نے کھانا منگوایا، بڑے اطمینان سے ایک ایک نوالہ اٹھا کر اپنے منہ میں ڈالتی رہی۔ جاوید دور کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا، اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ بیٹھ جائے اور دونوں مل کر کھانا کھائیں۔ وہ یقیناً اس کے پاس پہنچ جاتا مگر مصیبت یہ تھی کہ ڈبہ زنانہ تھا، عورتوں سے بھرا ہوا، یہی وجہ ہے کہ جرأت نہ کرسکا۔ لڑکی نے کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھوئے جو بہت نازک تھے۔ لمبی لمبی مخروطی انگلیاں جن کو اس نے اچھی طرح صاف کیا اور اپنی کیس سے تولیہ نکال کر اپنے ہاتھ پوچھے، پھر اطمینان سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جاوید گاڑی چلنے تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر اپنے ڈبے میں سوار ہو گیا اور اسی لڑکی کے خیالوں میں غرق ہو گیا۔

معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ بڑے اچھے گھرانے کی ہے۔ دونوں کلا یوں میں قریب قریب بارہ بارہ سونے کی چوڑیاں ہوں گی۔ کالوں میں ٹاپس بھی تھے۔ دو انگلیوں میں، اگر میرا اندازہ غلط نہیں، ہیرے کی انگوٹھیاں ہیں، لباس بہت عمدہ، ساشن کی شلوار، ٹھیکی کی قمیص، شنون کا دوپٹ۔ جیرت ہے کہ گھٹیا درجے میں کیوں سفر کر رہی ہے؟

پشاور سے آئی ہے۔۔۔ وہاں کی عورتیں تو سخت پر دہ کرتی ہیں۔۔۔ لیکن یہ بر قعے کے بغیر وہاں سے گاڑی میں سوار ہوئی اور اس کے ساتھ کوئی مرد بھی نہیں۔۔۔ نہ کوئی عورت، اکیلی سفر کر رہی ہے، آخر یہ قصہ کیا ہے؟ میرا خیال ہے پشاور کی رہنے والی نہیں۔۔۔ وہاں کسی عزیز سے ملنے گئی ہو گی۔۔۔ مگر اکیلی کیوں؟ کیا اسے ڈر نہیں لگا کہ اٹھا کر لے جائے گا کوئی۔۔۔ ایسے تہا حسن پر توہر مرد جھپٹامارنا چاہتا ہے۔ پھر جاوید کو ایک اندریشہ ہوا کہ شادی شدہ تو نہیں؟

وہ دراصل دل میں تہیہ کر چکا تھا کہ اس لڑکی کا پیچھا کرے گا اور رومان لڑا کر اس سے شادی کرے گا، وہ حرام کاری کا بالکل قائل نہیں تھا۔ کئی اسٹیشن آئے اور گزر گئے۔۔۔ اسے صرف راولپنڈی تک جانا تھا کہ وہاں ہی اس کا گھر تھا مگر وہ بہت آگے نکل گیا۔ ایک اسٹیشن پر چینگ ہوئی جس کے باعث اسے جرمانہ ادا کرنا پڑا مگر اس نے اس کی کوئی پرواہ کی۔
ٹکٹ چکر نے پوچھا، ”آپ کو کہاں تک جانا ہے؟“

جاوید مسکرایا، ”جی ابھی تک معلوم نہیں۔۔۔ آپ لاہور کا ٹکٹ بنادیجیے کہ وہی آخری اسٹیشن ہے۔“ ٹکٹ چیکرنے اسے لاہور کا ٹکٹ بنا دیا، روپے و صول کیے اور دوسراے اسٹیشن پر اتر گیا، جاوید بھی اتر اکہ ٹرین کو ٹائم ٹیبل کے مطابق پانچ منٹ ٹھہرنا تھا۔

ساتھ وालے کمپارٹمنٹ کے پاس گیا، وہ لڑکی کھڑکی کے ساتھ لگی دانتوں میں خال کر رہی تھی، جاوید کی طرف جب اس نے دیکھا تو اس کے دل و دماغ میں چیزوں میں دوڑنے لگیں، اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کی موجودگی سے غافل نہیں ہے، سمجھ گئی ہے کہ وہ بار بار صرف اسے ہی دیکھنے آتا ہے۔ جاوید کو دیکھ کر وہ مسکرائی، اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔۔۔ مگر جاوید فرط جذبات کی وجہ سے فوراً وہاں سے ہٹ کر اپنے ڈبے میں چلا گیا اور رومانوں کی دنیا کی سیر کرنے لگا۔۔۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کے آس پاس کی تمام چیزیں مسکرائی ہیں۔ ٹرین کا پنکھا مسکرا رہا ہے۔۔۔ کھڑکی سے باہر تار کے کھبے مسکرا رہے ہیں۔۔۔ انہن کی سیٹی مسکرائی ہے، اور وہ بد صورت مسافر جو اس کے ساتھ بیٹھا تھا، اس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر بھی مسکرا ہٹ ہے۔۔۔ اس کے اپنے ہونٹوں پر مسکرا ہٹ نہیں تھی لیکن اس کا دل مسکرا رہا تھا۔

اگلے اسٹیشن پر جب وہ ساتھ والے کمپارٹمنٹ کے پاس گیا تو وہ لڑکی وہاں نہیں تھی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا، کہاں چلی گئی؟ کہیں پچھلے اسٹیشن پر تو نہیں اتر گئی جہاں اس نے ایک مسکرا ہٹ سے مجھے نوازا تھا۔۔۔ نہیں نہیں غسل خانے میں ہو گی۔

وہ واقعی غسل خانے ہی میں تھی۔ ایک منٹ کے بعد وہ کھڑکی میں نمودار ہوئی۔ جاوید کو دیکھ کر مسکرائی اور ہاتھ کے اشارے سے اس کو بلا یا۔ جاوید کا نیپٹا لرزتا کھڑکی کے پاس پہنچا۔ اس لڑکی نے بڑی مہین اور سریلی آواز میں کہا، ”ایک تکلیف دینا چاہتی ہوں آپ کو۔۔۔ مجھے دو سیب لاد کیجیے۔۔۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا پرس نکالا اور ایک روپے کا نوٹ جاوید کی طرف بڑھا دیا۔

جاوید نے جو اس غیر متوقع بلا واء سے قریب قریب بر ق زدہ تھا، ایک روپے کا نوٹ کپڑ لیا لیکن فوراً اس کے ہوش و حواس برقرار ہو گئے۔ نوٹ واپس دے کر اس نے اس لڑکی سے کہا، ”آپ یہ رکھیے۔۔۔ میں سب لے آتا ہوں“ اور پلیٹ فارم پر اس ریڑھی کی طرف دوڑا جس میں پھل بیچے جاتے تھے، اس نے جلدی جلدی چھ سیب خریدے کیونکہ وسل ہو چکی تھی۔ دوڑا دوڑا وہ اس لڑکی کے پاس آیا، اس کو سیب دیے اور کہا، ”معاف کیجیے گا۔۔۔ وسل ہو رہی تھی اس لیے میں اچھے سیب چن نہ سکا۔“

لڑکی مسکرائی۔۔۔ وہی دلفریب مسکرا ہٹ۔۔۔ گاڑی حرکت میں آئی۔ جاوید اپنے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے کا نپ رہا تھا لیکن بہت خوش تھا، اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کو دونوں جہاں مل گئے ہیں، اس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سے محبت نہیں کی تھی، لیکن اب وہ اس کی لذت سے لطف اندوڑ ہو رہا تھا۔

اس کی عمر پچھیں برس کے قریب تھی، اس نے سوچا کہ اتنی دیر میں کتنا خشک رہا ہوں۔ آج معلوم ہوا ہے کہ محبت انسان کو کتنی تروتازہ بنا دیتی ہے۔۔۔ وہ سب کھارہی ہو گی۔۔۔ لیکن اس کے گال تو خود سب ہیں، میں نے جو سب اس کو دیے ہیں کیا وہ ان کو دکھ کر شرمندہ نہیں ہوں گے۔

وہ میری محبت کے اشاروں کو سمجھ گئی جب ہی تو وہ مسکرائی اور اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلا یا اور کہا کہ میں اسے سب لا دوں۔ مجھ سے اگر وہ کہتی کہ گاڑی کا رخ پلٹ دوں تو میں خدا کی قسم اس کی خاطر یہ بھی کر دیتا۔ گو مجھ میں اتنی طاقت نہیں لیکن محبت میں آدمی بہت بڑے بڑے کام سرانجام دے سکتا ہے۔۔۔ فرہاد نے شیریں کے لیے پہاڑ کاٹ کر نہر نہیں کھو دی تھی؟

میں بھی کتنا یو قوف ہوں اس سے اور کچھ نہیں تو کم از کم یہی پوچھ لیا ہوتا کہ تمھیں کہاں تک جانا ہے۔۔۔ خیر میں لا ہور تک کاٹکٹ تو بنو اچکا ہوں۔۔۔ ہر اسٹینشن پر دکھ لیا کروں گا۔ ویسے وہ اب مجھے بتائے بغیر جائے گی بھی نہیں۔۔۔ شریف خاندان کی لڑکی ہے۔۔۔ میرے جذبہ محبت نے اسے کافی متاثر کیا ہے۔۔۔ سب کھارہی ہے، کاش کہ میں اس کے پاس بیٹھا ہوتا، ہم دونوں ایک سب کو بیک وقت اپنے دانتوں سے کاٹتے۔۔۔ اس کا منہ میرے منہ سے کتنا قریب ہوتا۔

میں اس کے گھر کا پتہ لوں گا۔۔۔ ذرا اور باقیں کرلوں، پھر راولپنڈی پہنچ کر ایسی سے کھوں گا کہ میں نے ایک لڑکی دکھلی ہے اس سے میری شادی کر دیجیے، وہ میری بات کبھی نہیں ٹالیں گی۔۔۔ بس ایک دو مہینے کے اندر اندر شادی ہو جائے گی۔ اگلے اسٹینشن پر جب جاویدا سے دیکھنے گیا تو وہ پانی پی رہی تھی، وہ جرأت کر کے آگے بڑھا اور اس سے مخاطب ہوا، ”آپ کو کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو فرمائیے۔“

لڑکی مسکرائی۔۔۔ دلفریب مسکراہٹ، ”مجھے سگریٹ لاد دیجیے۔“

جاوید نے بڑی حیرت سے پوچھا، ”آپ سگریٹ پیتی ہیں؟“

وہ لڑکی پھر مسکرائی، ”جی نہیں۔۔۔ یہاں ایک عورت ہے، پر دہدار۔۔۔ اس کو سگریٹ پینے کی عادت ہے۔“

”اوه! میں ابھی لا یا۔۔۔ کس برانڈ کے سگریٹ ہوں؟“

”میر اخیال ہے وہ گولڈ فائک پینتی ہے۔“

”میں ابھی حاضر کیے دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر جاوید اسٹال کی طرف دوڑا، وہاں سے اس نے دوپیکٹ لیے اور اس لڑکی کے حوالے کر دیے، اس نے شکریہ اس عورت کی طرف سے ادا کیا جو سکریٹ پینتے کی عادی تھی۔

جاوید اب اور بھی خوش تھا کہ اس لڑکی سے ایک اور ملاقات ہو گئی مگر اس بات کی بڑی الجھن تھی کہ وہ اس کا نام نہیں جانتا تھا، اس نے کئی مرتبہ خود کو کوسا کہ اس نے نام کیوں نہ پوچھا، اتنی باتیں ہوتی رہیں لیکن وہ اس سے اتنا بھی نہ کہہ سکا، ”آپ کا نام؟“ اس نے ارادہ کر لیا کہ اگلے اسٹیشن پر جب گاڑی ٹھہرے گی تو وہ اس سے نام ضرور پوچھے گا، اسے یقین تھا کہ وہ فوراً بتا دے گی کیونکہ اس میں قباحت ہی کیا تھی۔ اگلا اسٹیشن بہت دیر کے بعد آیا، اس لیے کہ فاصلہ بہت لمبا تھا۔ جاوید کو بہت کوفت ہو رہی تھی، اس نے کئی مرتبہ ٹائم ٹیبل دیکھا، گھٹری پار باردیکھی۔۔۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ انہیں کو پر لگ جائیں تاکہ وہ اڑ کر جلدی اگلے اسٹیشن پر پہنچ جائے۔

گاڑی ایک دم رک گئی، معلوم ہوا کہ انہیں کے ساتھ ایک بھینیں تکر اگئی ہے۔۔۔ وہ اپنے کمپارٹمنٹ سے اتر کر ساتھ والے ڈبے کے پاس پہنچا مگر لڑکی اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھی۔ مسافروں نے مری کٹی ہوئی بھینیں کو پڑی سے ہٹانے میں کافی دیرگاہی۔ اتنے میں وہ لڑکی جو غالباً دوسری طرف تماشادیکھنے میں مشغول تھی، آئی اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی، جاوید پر جب اس کی نظر پڑی تو مسکرائی۔۔۔ وہی دلفریب مسکرا ہٹ۔ جاوید کھڑکی کے پاس گیا مگر اس کا نام پوچھنا سکا۔ لڑکی نے اس سے کہا، ”یہ بھینیں کیوں گاڑی کے نیچ آجائی ہیں؟“ جاوید کو کوئی جواب نہ سوچا، گاڑی چلنے والی تھی اس لیے وہ اپنے کمپارٹمنٹ میں چلا گیا۔

کئی اسٹیشن آئے مگر وہ نہ اتر۔ آخر لاحر آگیا، پلیٹ فارم پر جب گاڑی رکی تو وہ جلدی جلدی باہر نکلا، لڑکی موجود تھی، جاوید نے اپنا سامان نکلوایا اور اس سے جس نے ہاتھ میں اپنی کیس پکڑا ہوا تھا، کہا، ”لایے! یہ اپنی کیس مجھے دے دیجئے۔“ اس لڑکی نے اپنی کیس جاوید کے حوالے کر دیا۔ قلی نے جاوید کا سامان اٹھایا اور دونوں باہر نکلے، تاگلہ لیا۔ جاوید نے اس سے پوچھا، ”آپ کو کہاں جانا ہے؟“

لڑکی کے ہونٹوں پر وہی دلفریب مسکرا ہٹ پیدا ہوئی، ”جی ہیر امنڈی۔“ جاوید بوکھلا سا گیا، ”کیا آپ وہاں رہتی ہیں؟“ لڑکی نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ میر امکان دیکھ لیں، آج رات میرا مجر اسنے ضرور آئیے گا۔

جاوید پشاور سے لے کر لاہور تک اپنا مجر اسن چکا تھا، اس نے اس طوائف کو اس کے گھر چھوڑا اور اس تانگے میں سیدھا لاریوں کے اڈے پہنچا اور راولپنڈی روائے ہو گیا۔

-[84]-

ہارتا چلا گیا: سعادت حسن منٹو

لوگوں کو صرف جیتنے میں مزا آتا ہے لیکن اسے جیت کر ہار دینے میں لطف آتا ہے۔ جیتنے میں اسے کبھی اتنی دقت محسوس نہیں ہوئی لیکن ہارنے میں البتہ اسے کئی دفعہ کافی تگ و دو کرنا پڑی۔ شروع شروع میں بینک کی ملازمت کرتے ہوئے جب اسے خیال آیا کہ اس کے پاس بھی دولت کے انبار ہونے چاہئیں تو اس کے عزیزو اور دوستوں نے اس خیال کا مضمحلہ اڑایا تھا مگر جب وہ بینک کی ملازمت چھوڑ کر بمبئی چلا گیا تو تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس نے اپنے دوستوں اور عزیزوں کی روپے پیسے سے مدد کرنا شروع کر دی۔

بمبئی میں اس کے لیے کئی میدان تھے مگر اس نے فلم کے میدان کو منتخب کیا۔ اس میں دولت تھی۔ اس میں چل پھر کروہ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ سکتا تھا اور دونوں ہی ہاتھوں سے لٹا بھی سکتا تھا۔ چنانچہ ابھی تک اسی میدان کا سپاہی ہے۔ لاکھوں نہیں کروڑوں روپیہ اس نے کمایا اور لشادیا۔ کمانے میں اتنی دیر نہ لگی جتنی لاثانے میں۔ ایک فلم کے لیے گیت لکھے۔ لاکھ روپے دھروالے لیکن ایک لاکھ روپوں کو رنڈیوں کے کوٹھوں پر، بھڑوں کی محفلوں میں، گھوڑوڑ کے میدانوں اور قمارخانوں میں ہارتے ہوئے اسے کافی دیر لگی۔

ایک فلم ہنایا۔ دس لاکھ کامنافع ہوا۔ اب اس رقم کو ادھر ادھر لٹانے کا سوال پیدا ہوا۔ چنانچہ اس نے اپنے ہر قدم میں لغزش پیدا کر لی۔ تین موڑیں خرید لیں۔ ایک نئی اور دوپرانی جن کے متعلق اسے اچھی طرح علم تھا کہ بالکل ناکارہ ہیں۔ یہ اس کے گھر کے باہر گلنے سڑنے کے لیے رکھ دیں۔ جوئی تھی اس کو گیراج میں بند کر دیا۔ اس بہانے سے کہ پتھر دل نہیں ملتا۔ اس کے لیے ٹیکسی ٹھیک تھی۔ صحنی، ایک میل کے بعد رکاوی، کسی قمارخانے میں چلے گئے۔ دو ڈھانی ہزار روپے ہار کر دوسرے روز باہر نکلے، ٹیکسی کھڑی تھی۔ اس میں بیٹھے اور گھر چلے گئے اور جان بوجھ کر کرایہ ادا کرنا بھول گئے۔ شام کو باہر نکلے اور ٹیکسی کھڑی دیکھ کر کہا، ”ارے نابکار، تو ابھی تک یہیں کھڑا ہے۔۔۔ چل میرے ساتھ دفتر۔ تجھے پیسے دلوادوں۔۔۔ دفتر پہنچ کر پھر کرایہ چکانا بھول گئے اور۔۔۔

اوپر تلے دو تین فلم کا میاب ہوئے جتنے ریکارڈ تھے سب ٹوٹ گئے۔ شہرت آسمان تک جا پہنچی۔ چھپلا کر اس نے اوپر تلے دو تین ایسے فلم بنائے۔ جن کی ناکامی اپنی مثال آپ ہو کے رہ گئی۔ اپنی تباہی کے لیے کئی دوسروں کو بھی تباہ کر دیا۔ لیکن فوراً ہی آستینیں چڑھائیں۔ جو تباہ ہو گئے ان کو حوصلہ دیا۔ اور ایک ایسا فلم تیار کر دیا جو سونے کی کان ثابت ہوا۔

عورتوں کے معاملے میں بھی ان کی ہار جیت کا یہی چکر کار فرم رہا ہے۔ کسی محفل سے یا کسی کوٹھے پر سے ایک عورت اٹھائی۔ اس کو بنا سنوار کر شہرت کی اوپنجی گدی پر بھادیا اور اس کی ساری نسوانیت مسخر کرنے کے بعد اسے ایسے موقعے بھم پہنچائے کہ وہ کسی دوسرے کی گردان میں اپنی بابیں حاکل کر دے۔

بڑے بڑے سرمایہ داروں اور بڑے بڑے عشق پیشہ خوبصورت جوانوں سے مقابلہ ہوا۔ سردھڑ کی بازیاں لگیں۔ سیاست کی بساطیں بچھیں۔ لیکن وہ ان تمام خاردار جهازوں میں ہاتھ ڈال کر اپنا پسندیدہ پھول نوچ کر لے آیا۔ دوسرے دن ہی اس کو اپنے کوٹ میں لگایا اور کسی رقیب کو موقع دے دیا کہ وہ جھپٹامار کر لے جائے۔

ان دنوں جب وہ فارس روڈ کے ایک قمار خانے میں لگاتار دس روز سے جا رہا تھا، اس پر ہارنے ہی کی دھن سوار تھی۔ یوں تو اس نے تازہ تازہ ایک بہت ہی خوبصورت ایکٹر سہاری تھی اور دس لاکھ روپے ایک فلم میں تباہ کر دیے تھے۔ مگر ان دو حادثوں سے اس کی طبیعت سیر نہیں ہوئی تھی۔ یہ دو چیزیں بہت ہی اچانک طور پر اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔ اس کا اندازہ اس دفعہ غلط ثابت ہوا تھا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ روز فارس روڈ کے قمار خانے میں ناپ قول کر ایک مقررہ رقم ہار رہا تھا۔

ہر روز شام کو اپنی جیب میں دوسروں پے ڈال کر وہ پون پل کا رخ کرتا۔ اس کی ٹیکسی لکھپائیوں کی جگہ لگی دکانوں کی قطار کے ساتھ ساتھ چلتی اور وہ جا کر بجلی کے ایک کھبے کے پاس رک جاتی۔ اپنی ناک پر موٹے موٹے شیشوں والی عنکبوتی اچھی طرح جما تا۔ دھوتی کی لانگ ٹھیک کرتا اور ایک نظر دائیں جانب دیکھ کر جہاں لوہے کے جنگلے کے پیچھے ایک نہایت ہی بد شکل عورت ٹوٹا ہوا آئینہ رکھے سنگار میں مصروف ہوتی اور بیٹھک میں چلا جاتا۔

دس روز سے وہ متواتر فارس روڈ کے اس قمار خانے میں دوسروں پیہ ہارنے کے لیے آ رہا تھا۔ کبھی تو یہ روپے دو تین ہاتھوں ہی میں ختم ہو جاتے اور کبھی ان کو ہارتے ہارتے صح ہو جاتی۔

گیارہوں روز بھلی کے پاس جب ٹیکسی رکی تو اس نے اپنی ناک پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک جما کر اور دھوتی کی لانگ ٹھیک کر کے ایک نظر دائیں جانب دیکھا تو اسے ایک دم محسوس ہوا کہ وہ دس روز سے اس بد شکل عورت کو دیکھ رہا ہے۔ حسب دستور ٹوٹا ہوا آئینہ سامنے رکھ لکڑی کے تخت پر بیٹھی سنگار میں مصروف تھی۔

لوہے کے جنگلے کے پاس آ کر اس نے غور سے اس ادھیر عمر کی عورت کو دیکھا۔ رنگ سیاہ، جلد چکنی، گالوں اور ٹھوڑی پر نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے سوئی سے گندھے ہوئے اور جو چیزی کی سیاہی میں قریب قریب جذب ہو گئے تھے۔ دانت بہت ہی بد نما، مسوڑھے پان اور تمباکو سے گلے ہوئے۔ اس نے سوچا اس عورت کے پاس کون آتا ہو گا؟

لوہے کے جنگلے کی طرف جب اس نے ایک قدم اور بڑھایا تو وہ بد شکل عورت مسکرائی۔ آئینہ ایک طرف رکھ کر اس نے بڑے ہی بھونڈے پن سے کہا، ”کیوں سیٹھر ہے گا؟“

اس نے اور زیادہ غور سے اس عورت کی طرف دیکھا جسے اس عمر میں بھی امید تھی کہ اس کے گاہک موجود ہیں۔ اس کو بہت حیرت ہوئی۔ چنانچہ اس نے پوچھا، ”بائی تمہاری کیا عمر ہو گی؟“

یہ سن کر عورت کے جذبات کو دھکا سالاگا۔ منہ بسور کر اس نے مراٹھی زبان میں شاید گالی دی۔ اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چنانچہ اس نے بڑے خلوص کے ساتھ اس سے کہا، ”بائی مجھے معاف کر دو۔ میں نے ایسے ہی پوچھا تھا۔ لیکن میرے لیے بڑے اچنپھے کی بات ہے۔ ہر روز تم صحیح کریہاں بیٹھتی ہو۔ کیا تمہارے پاس کوئی آتا ہے؟“ عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے پھر اپنی غلطی محسوس کی اور اس نے بغیر کسی تجسس کے پوچھا، ”تمہارا نام کیا ہے؟“

عورت جو پر دہھٹا کر اندر جانے والی تھی رک گئی، ”گنگوبائی۔“

”گنگوبائی، تم ہر روز کتنا کمالیتی ہو؟“ اس کے لمحے میں ہمدردی تھی۔ گنگوبائی لوہے کے سلاخوں کے پاس آگئی، ”چھ سات روپے۔۔۔ کبھی کچھ بھی نہیں۔“

”چھ سات روپے اور کبھی کچھ بھی نہیں۔“ گنگوباری کے یہ الفاظ دہراتے ہوئے ان دوسرو پوں کا خیال آیا جو اس کی جیب میں پڑے تھے اور جن کو وہ صرف ہار دینے کے لیے اپنے ساتھ لا یا تھا۔ اسے معاً ایک خیال آیا، ”دیکھو گنگوباری، تم روزانہ چھ سات روپے کماتی ہو۔ مجھ سے دس لے لیا کرو۔“

”رہنے کے؟“

”نہیں۔۔۔ لیکن تم یہی سمجھ لینا کہ میں رہنے کے دے رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر سلانخوں میں سے اندر گزار دیا، ”یہ لو۔“

گنگوباری نے نوٹ لے لیا۔ لیکن اس کا چہرہ سوال بنا ہوا تھا۔

”دیکھو گنگوباری، میں تمہیں ہر روز اسی وقت دس روپے دے دیا کروں گا لیکن ایک شرط پر۔“

”سرت؟“

”شرط یہ ہے کہ دس روپے لینے کے بعد تم کھانا و انا کھا کر اندر سو جایا کرو۔۔۔ رات کو میں تمہاری بقیٰ جلتی نہ دیکھوں۔“

گنگوباری کے ہونٹوں پر عجیب و غریب مسکراہٹ پیدا ہوئی، ”ہنسو نہیں۔ میں اپنے وچن کا پکار ہوں گا۔“

یہ کہہ کروہ اوپر قمار خانے میں چلا گیا۔ سیڑھیوں میں اس نے سوچا مجھے تو یہ روپے ہارنے ہی ہوتے ہیں۔ دوسونہ سہی ایک سونوے سہی۔“

کئی دن گزر گئے۔ ہر روز حسبِ دستور اس کی ٹیکسی شام کے وقت بھلی کے کھبے کے پاس رکتی۔ دروازہ کھول کروہ باہر نکلتا۔ موٹے شیشوں والی عینک میں سے دائیں جانب گنگوباری کو آہنی سلانخوں کے بیچھے تخت پر بیٹھی دیکھتا۔ اپنی دھوتی کی لانگ ٹھیک کرتا، جنگلے کے پاس پہنچتا اور دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر گنگوباری کو دے دیتا۔ گنگوباری اس نوٹ کو ماتھے سے چھو کر سلام کرتی اور وہ ایک سونوے ہارنے کے لیے

اوپر کوٹھے پر چلا جاتا۔ اس دوران میں دو تین مرتبہ روپیہ ہارنے کے بعد جب وہ رات کو گیارہ بجے یادو تین بجے نیچے اتر تو اس نے گنگو بائی کی دکان بند پائی۔

ایک دن حسبِ معمول دس روپے دے کر جب وہ کوٹھے پر گیا تو دس بجے ہی فارغ ہو گیا۔ تاش کے پتے کچھ ایسے بڑے کہ چند گھنٹوں ہی میں ایک سونوے روپوں کا صفائی ہو گیا۔ کوٹھے سے نیچے اتر کر جب وہ ٹیکسی میں بیٹھنے لگا تو اس نے کیا دیکھا کہ گنگو بائی کی دکان کھلی ہے اور وہ لو ہے کے جنگل کے پیچھے تخت پر یوں بیٹھی ہے جیسے گاہوں کا انتظار کر رہی ہے ٹیکسی میں سے باہر نکل کر وہ اس کی دکان کی طرف بڑھا۔ گنگو بائی نے اسے دیکھا تو گھبرائی لیکن وہ پاس پہنچ چکا تھا۔

”گنگو بائی یہ کیا؟“

گنگو بائی نے کوئی جواب نہ دیا۔

”بہت افسوس ہے تم نے اپناوچن پورا نہ کیا۔۔۔ میں نے تم سے کہا تھا۔۔۔ رات کو میں تمہاری بیتی نہ دیکھوں۔۔۔ لیکن تم یہاں اس طرح بیٹھی ہو۔“ اس کے لمحے میں دکھ تھا۔ گنگو بائی سوچ میں پڑ گئی۔

”تم بہت بری ہو۔“ یہ کہہ کر وہ واپس جانے لگا۔

گنگو بائی نے آواز دی، ”مُھُرُو سیٹھ۔“

وہ ٹھہر گیا۔ گنگو بائی نے ہولے ہولے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کرتے ہوئے کہا، ”میں بہت بری ہوں۔ پر یہاں چانگلی بھی کون ہے۔۔۔؟ سیٹھ تم دس روپے دے کر ایک کی بیتی بجھاتے ہو۔۔۔ ذرا دیکھو تو کتنی بتیاں جل رہی ہیں۔“ اس نے ایک طرف ہٹ کر گلی کے ساتھ ساتھ دوڑتی ہوئی جنگلہ لگی دکانوں کی طرف دیکھا۔ ایک نہ ختم ہونے والی قطار تھی اور بے شمار بتیاں رات کی کثیف نضال میں سلگ رہی تھیں۔

”کیا تم یہ سب بتیاں بجا سکتے ہو؟“

اس نے اپنی عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں سے پہلے گنگوباری کے سر پر لکھتے ہوئے روشن بلب کو دیکھا، پھر گنگوباری کے مت میلے چہرے کو اور گردن جھکا کر کہا، ”نہیں، گنگوباری نہیں۔“

جب وہ ٹیکسی میں بیٹھا تو اس کی جیب کی طرح اس کا دل بھی خالی تھا۔

-[85]-

سڑھے تین آنے: سعادت حسن منٹو

”میں نے قتل کیوں کیا۔ ایک انسان کے خون میں اپنے ہاتھ کیوں رنگے، یہ ایک لمبی داستان ہے۔ جب تک میں اس کے تمام عوائق و عواطف سے آپ کو آگاہ نہیں کروں گا، آپ کو کچھ پتہ نہیں چلے گا۔۔۔ مگر اس وقت آپ لوگوں کی گفتگو کا موضوع جرم اور سزا ہے۔ انسان اور جیل ہے۔۔۔ چونکہ میں جیل میں رہ چکا ہوں، اس لیے میری رائے نادرست نہیں ہو سکتی۔ مجھے منٹو صاحب سے پورا اتفاق ہے کہ جیل، مجرم کی اصلاح نہیں کر سکتی۔ مگر یہ حقیقت اتنی بار دھرائی جا چکی ہے کہ اس پر زور دینے سے آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی محفل میں ہزار بار سنایا ہو والطیفہ بیان کر رہا ہے۔۔۔ اور یہ لطیفہ نہیں کہ اس حقیقت کو جانتے پہچانتے ہوئے بھی ہزار بار جیل خانے موجود ہیں۔ ہتھڑیاں ہیں اور وہ ننگ انسانیت یہڑیاں۔۔۔ میں قانون کا یہ زیور پہنچ کا ہوں۔“

یہ کہہ کر رضوی نے میری طرف دیکھا اور مسکرا یا۔ اس کے موٹے موٹے جبشیوں کے سے ہونٹ عجیب انداز میں پھٹکے، ”اس کی چھوٹی چھوٹی مخور آنکھیں، جو قاتل کی آنکھیں لگتی تھیں، چمکیں۔ ہم سب چونک پڑے تھے، جب اس نے یکا یک ہماری گفتگو میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہمارے قریب کرسی پر بیٹھا کریم ملی ہوئی کوئی پی رہا تھا۔ جب اس نے خود کو متعارف کرایا تو ہمیں وہ تمام واقعات یاد آگئے جو اس کی قتل کی واردات سے وابستہ تھے۔ وعدہ معاف گواہ بن کر اس نے بڑی صفائی سے اپنی اور اپنے دوستوں کی گردن پھانسی کے پھندے سے بچا لی تھی۔

وہ اسی دن رہا ہو کر آیا تھا۔ بڑے شاستہ انداز میں وہ مجھ سے مخاطب ہوا، ”معاف کیجیے گا منٹو صاحب۔۔۔ آپ لوگوں کی گفتگو سے مجھے دلچسپی ہے۔ میں ادیب تو نہیں، لیکن آپ کی گفتگو کا جو موضوع ہے اس پر اپنی ٹوٹی چھوٹی زبان میں کچھ نہ کچھ ضرور کہہ سکتا ہوں۔ پھر اس نے کہا، ”میرا نام صدیق رضوی ہے۔۔۔ لندبازار میں جو قتل ہوا تھا، میں اس سے متعلق تھا۔“

میں نے اس قتل کے متعلق صرف سرسری طور پر پڑھا تھا، لیکن جب رضوی نے اپنا تعارف کرایا تو میرے ذہن میں خبروں کی تمام سرخیاں ابھر آئیں۔ ہماری گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ آیا جیل مجرم کی اصلاح کر سکتی ہے۔ میں خود محسوس کر رہا تھا، ہم ایک باتی روٹی کھا رہے ہیں۔ رضوی نے جب یہ کہا، ”یہ حقیقت اتنی بار دہرائی جا چکی ہے کہ اس پر زور دینے سے آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی محفل میں ہزار بار سنایا ہوا الطیفہ بیان کر رہا ہے۔“ تو مجھے بڑی تسکین ہوئی۔ میں نے یہ سمجھا جیسے رضوی نے میرے خیالات کی ترجمانی کر دی ہے۔

کریم ملی ہوئی کوئی کی پیالی ختم کر کے رضوی نے اپنی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بڑی سنبھال گی سے کہا، ”منٹو صاحب آدمی جرم کیوں کرتا ہے۔۔۔ جرم کیا ہے، سزا کیا ہے۔۔۔ میں نے اس کے متعلق بہت غور کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر جرم کے پیچھے ایک ہسترنی ہوتی ہے۔۔۔ زندگی کے واقعات کا ایک بہت بڑا گلکڑا ہوتا ہے، بہت الجھا ہوا، ٹیڑھا میڑھا۔۔۔ میں نفیات کا ماہر نہیں۔۔۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ انسان سے خود جرم سرزد نہیں ہوتا، حالات سے ہوتا ہے!“

نصیر نے کہا، ”آپ نے بالکل درست کہا ہے۔“

رضوی نے ایک اور کافی کا آرڈر دیا اور نصیر سے کہا، ”مجھے معلوم نہیں جناب، لیکن میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اپنے مشاہدات کی بنابر عرض کیا ہے ورنہ یہ موضوع بہت پرانا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وکٹر ہیو گو۔۔۔ فرانس کا ایک مشہور ناول سٹ تھا۔۔۔ شاید کسی اور ملک کا ہو۔۔۔ آپ تو خیر جانتے ہی ہوں گے، جرم اور سزا پر اس نے کافی لکھا ہے۔۔۔ مجھے اس کی ایک تصنیف کے چند فقرے یاد ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا، ”منٹو صاحب، غالباً آپ ہی کا ترجمہ تھا۔۔۔ کیا تھا۔۔۔؟ وہ سیڑھی اتار دو جو انسان کو جرائم اور مصائب کی طرف لے جاتی ہے۔۔۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ وہ سیڑھی کون سی ہے۔ اس کے کتنے زینے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ سیڑھی ضرور ہے، اس کے زینے بھی ہیں، لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں، بے شمار ہیں، ان کو گلنا، ان کا شمار کرنا ہی سب سے بڑی بات ہے۔“

”منٹو صاحب، حکومتیں رائے شماری کرتی ہیں، حکومتیں اعداد و شماری کرتی ہیں، حکومتیں ہر قسم کی شماری کرتی ہیں۔۔۔ اس سیڑھی کے زینوں کی شماری کیوں کرتیں۔۔۔ کیا یہ ان کا فرض نہیں۔۔۔ میں نے قتل کیا۔۔۔ لیکن اس سیڑھی کے کتنے زینے طے کر کے کیا۔۔۔ حکومت نے مجھے وعدہ معاف گواہ بنالیا، اس لیے کہ قتل کا ثبوت اس کے پاس نہیں تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ میں اپنے گناہ کی معافی

کس سے مانگوں۔۔۔ وہ حالات جنہوں نے مجھے قتل کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اب میرے نزدیک نہیں ہیں، ان میں اور مجھ میں ایک برس کا فاصلہ ہے۔ میں اس فاصلے سے معافی مانگوں یا ان حالات سے جو بہت دور کھڑے میرا منہ چڑا رہے ہیں۔“

ہم سب رضوی کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔ وہ ظاہر تعلیم یافتہ معلوم نہیں ہوتا تھا، لیکن اس کی گفتگو سے ثابت ہوا کہ وہ پڑھا کرنا ہے اور بات کرنے کا سلیقہ جانتا ہے۔ میں نے اس سے کچھ کہا ہوتا، لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ باتیں کرتا جائے اور میں سنتا جاؤں۔ اسی لیے میں اس کی گفتگو میں حاصل نہ ہوا۔

اس کے لیے نئی کوفی آگئی تھی۔ اسے بن کر اس نے چند گھونٹ پیے اور کہنا شروع کیا، ”خدا معلوم میں کیا بکواس کرتا رہا ہوں، لیکن میرے ذہن میں ہر وقت ایک آدمی کا خیال رہا ہے۔۔۔ اس آدمی کا، اس بھنگی کا جو ہمارے ساتھ جیل میں تھا۔ اس کو ساڑھے تین آنے چوری کرنے پر ایک برس کی سزا ہوئی تھی۔“

نصیر نے حیرت سے پوچھا، ”صرف ساڑھے تین آنے چوری کرنے پر؟“

رضوی نے تھا۔۔۔ صرف ساڑھے تین آنے کی چوری پر۔۔۔ اور جو اس کو نصیب نہ ہوئے، کیونکہ وہ کپڑا گیا۔۔۔ یہ رقم خزانے میں محفوظ ہے اور پھگو بھنگی غیر محفوظ ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے وہ پھر کپڑا جائے، کیونکہ ہو سکتا ہے اس کا پیٹ پھرا سے مجبور کرے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس سے گوموت صاف کرانے والے اس کی تختواہندے سکیں، کیونکہ ہو سکتا ہے اس کو تختواہ دینے والوں کو اپنی تختواہندے ملے۔۔۔ یہ ہو سکتا ہے کا سلسلہ منٹو صاحب عجیب و غریب ہے۔ سچ پوچھتے تو دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔۔۔ رضوی سے قتل بھی ہو سکتا ہے۔۔۔“

یہ کہہ کرو وہ تھوڑے عرصے کے لیے خاموش ہو گیا۔ نصیر نے اس سے کہا۔ ”آپ پھگو بھنگی کی بات کر رہے تھے؟“

رضوی نے اپنی چھدری موچھوں پر سے کوفی رو مال کے ساتھ پوچھی، ”جی ہاں۔۔۔ پھگو بھنگی چور ہونے کے باوجود، یعنی وہ قانون کی نظروں میں چور تھا۔ لیکن ہماری نظروں میں پورا ایمان دار۔۔۔ خدا کی قسم میں نے آج تک اس جیسا ایمان دار آدمی نہیں دیکھا، ساڑھے تین آنے اس نے ضرور چڑائے تھے، اس نے صاف صاف عدالت میں کہہ دیا تھا کہ یہ چوری میں نے ضرور کی ہے، میں اپنے حق میں کوئی گواہی پیش نہیں کرنا چاہتا۔۔۔ میں دون کا بھوکا تھا، مجبوراً مجھے کریم درزی کی جیب میں ہاتھ ڈالنا پڑا، اس سے مجھے پانچ روپے لینے تھے۔۔۔

دو مہینوں کی تباہ۔ حضور اس کا بھی کچھ صور نہیں تھا۔ اس لیے کہ اس کے کئی گاؤں نے اس کی سلامی کے پیے مارے ہوئے تھے۔
حضور، میں پہلے بھی چوریاں کر چکا ہوں۔

ایک دفعہ میں نے دس روپے ایک میم صاحب کے بٹوے سے نکال لیے تھے، مجھے ایک مہینے کی سزا ہوئی تھی۔ پھر میں نے ڈپٹی صاحب کے گھر سے چاندی کا ایک کھلوناچر ایاتھا اس لیے کہ میرے بچے کو نمونیا تھا اور ڈاکٹر بہت فیس مانگتا تھا۔ حضور میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا۔ میں چور نہیں ہوں۔ کچھ حالات ہی ایسے تھے کہ مجھے چوریاں کرنی پڑیں۔ اور حالات ہی ایسے تھے کہ میں پکڑا گیا۔ مجھ سے بڑے بڑے چور موجود ہیں لیکن وہ بھی تک پکڑے نہیں گئے۔ حضور، اب میرا بچہ بھی نہیں ہے، یہوی بھی نہیں ہے۔ لیکن حضور افسوس ہے کہ میرا اپیٹ ہے، یہ مر جائے تو سارا جھنگھٹ ہی ختم ہو جائے، حضور مجھے معاف کر دو۔ لیکن حضور نے اس کو معاف نہ کیا اور عادی چور سمجھ کر اس کو ایک برس قید با مشقت کی سزا دے دی۔“

رضوی بڑے بے تکلف انداز میں بول رہا تھا، اس میں کوئی قصنع، کوئی بناوت نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ الفاظ خود بخود اس کی زبان پر آتے اور بہتے چلتے جا رہے ہیں، میں بالکل خاموش تھا، سگریٹ پہ سگریٹ پی رہا تھا اور اس کی باتیں سن رہا تھا۔ نصیر پھر اس سے مخاطب ہوا، ”آپ پھگو کی ایمان داری کی بات کر رہے تھے؟“

”جی ہاں۔“ رضوی نے جیب سے بیڑی نکال کر سلاگائی، ”میں نہیں جانتا قانون کی نگاہوں میں ایمان داری کیا چیز ہے، لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ میں نے بڑی ایمان داری سے قتل کیا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ پھگو بھگی نے بھی بڑی ایمان داری سے سماڑھے تین آنے چرائے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ ایمان داری کو صرف اچھی باتوں سے کیوں منسوب کرتے ہیں، اور سچ پوچھیے تو میں اب یہ سوچنے لگا ہوں کہ اچھائی اور برائی ہے کیا۔ ایک چیز آپ کے لیے اچھی ہو سکتی ہے، میرے لیے بری۔ ایک سوسائٹی میں ایک چیز اچھی سمجھی جاتی ہے، دوسری میں بری۔ ہمارے مسلمانوں میں بغلوں کے بال بڑھانا گناہ سمجھا جاتا ہے، لیکن سکھ اس سے بے نیاز ہیں۔ اگر یہ بال بڑھانا واقعی گناہ ہے تو خدا ان کو سزا کیوں نہیں دیتا اگر کوئی خدا ہے تو میری اس سے درخواست ہے کہ خدا کے لیے تم یہ انسانوں کے قوانین توڑ دو، ان کی بنائی ہوئی جیلیں ڈھادو۔ اور آسمانوں پر اپنی جیلیں خود بناؤ۔ خود اپنی عدالت میں ان کو سزا دو، کیونکہ اور کچھ نہیں تو کم از کم خدا توہو۔“

رضوی کی اس تقریر نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کی خام کاری ہی اصل میں تاثر کا باعث تھی۔ وہ باتیں کرتا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے وہ ہم سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے دل ہی دل میں گفتگو کر رہا ہے۔ اس کی بیڑی بجھ گئی تھی، غالباً اس میں تمباکو کی گانٹھ اٹکی ہوئی تھی، اس لیے کہ اس

نے پانچ چھ مرتبہ اس کو سلگا نے کی کو شش کی۔ جب نہ سلگی تو چینک دی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، ”منظو صاحب، پھگو مجھے اپنی تمام زندگی یاد رہے گا۔۔۔ آپ کو بتاؤں گا تو آپ ضرور کہیں گے کہ جذباتیت ہے، لیکن خدا کی قسم جذباتیت کو اس میں کوئی دخل نہیں۔۔۔ وہ میرا دوست نہیں تھا۔۔۔ نہیں وہ میرا دوست تھا کیونکہ اس نے ہر بار خود کو ایسا ہی ثابت کیا۔“

رضوی نے جیب میں سے دوسری بیڑی نکالی مگر وہ ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے اسے سکریٹ پیش کیا تو اس نے قبول کر لیا، ”شکریہ۔۔۔ منشو صاحب، معاف کیجیے گا، میں نے اتنی کبواس کی ہے حالانکہ مجھے نہیں کرنی چاہیے تھی اس لیے کہ ماشاء اللہ آپ۔۔۔“

میں نے اس کی بات کاٹی، ”رضوی صاحب، میں اس وقت منشو نہیں ہوں صرف سعادت حسن ہوں۔ آپ اپنی گفتگو جاری رکھئے۔ میں بڑی دلچسپی سے سن رہا ہوں۔“

رضوی مسکرا یا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھوں میں چک پیدا ہوئی۔ آپ کی بڑی نوازش ہے۔ پھر وہ نصیر سے مخاطب ہوا، ”میں کیا کہہ رہا تھا۔“

میں نے اس سے کہا، ”آپ پھگو کی ایمان داری کے متعلق کچھ کہنا چاہتے تھے۔“

”جی ہاں۔“ یہ کہہ کر اس نے میرا پیش کیا ہوا سکریٹ سلگایا، ”منظو صاحب، قانون کی نظروں میں وہ عادی چور تھا۔ بیڑیوں کے لیے ایک دفعہ اس نے آٹھ آنے چراتے تھے۔ بڑی مشکلوں سے، دیوار پھاند کر جب اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی تو اس کے ٹخنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ قریب قریب ایک برس تک وہ اس کا علاج کرتا رہا تھا، مگر جب میرا ہم الزام دوست جرجی بیڑیاں اس کی معرفت بھیجا تو وہ سب کی سب پولیس کی نظریں بجا کر میرے حوالے کر دیتا۔ وعده معاف گواہوں پر بہت کڑی نگرانی ہوتی ہے، لیکن جرجی نے پھگو کو اپنا دوست اور ہمراز بنالیا تھا۔ وہ بھگلی تھا، لیکن اس کی نظرت بہت خوشبو دار تھی۔ شروع شروع میں جب وہ جرجی کی بیڑیاں لے کر میری پاس آیا تو میں نے سوچا، اس حرام زادے چور نے ضرور ان میں سے کچھ غائب کر لی ہوں گی، مگر بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ قطعی طور پر ایمان دار تھا۔۔۔ بیڑی کے لیے اس نے آٹھ آنے چراتے ہوئے اپنے ٹخنے کی ہڈی تزویں کی تھی مگر یہاں جیل میں اس کو تمباکو کہیں سے بھی نہیں مل سکتا تھا، وہ جرجی کی دی ہوئی بیڑیاں تمام و کمال میرے حوالے کر دیتا تھا، جیسے وہ امانت ہوں۔۔۔ پھر وہ کچھ دیر ہچکچانے کے بعد مجھ سے کہتا، با بوجی، ایک بیڑی تو دیجیے اور میں اس کو صرف ایک بیڑی دیتا۔۔۔ انسان بھی کتنا کمینہ ہے!“

رضوی نے کچھ اس انداز سے اپنا سر جھکا جیسے وہ اپنے آپ سے تنفر ہے۔ ”جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں مجھ پر بہت کڑی پابندیاں عائد تھیں۔ وعدہ معاف گواہوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جرجی البتہ میرے مقابلے میں بہت آزاد تھا۔ اس کورشوت دے دلا کر بہت آسانیاں مہیا تھیں۔ کپڑے مل جاتے تھے، صابن مل جاتا تھا، بیٹریاں مل جاتی تھیں۔ جیل کے اندر رشوت دینے کے لیے روپے بھی مل جاتے تھے۔۔۔ پچھو بھنگی کی سزا ختم ہونے میں صرف چند دن باقی رہ گئے تھے، جب اس نے آخری بار جرجی کی کوئی بیٹریاں مجھے لا کر دیں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ جیل سے نکلنے پر خوش نہیں تھا۔ میں نے جب اس کو مبارک باد دی تو اس نے کہا، ”بابو جی، میں پھر یہاں آجائیں گا۔۔۔ بھوکے انسان کو پوری کرنی ہی پڑتی ہے۔۔۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک بھوکے انسان کو کھانا کھانا ہی پڑتا ہے۔۔۔ بابو جی آپ بڑے اچھے ہیں، مجھے اتنی بیٹریاں دیتے رہے۔۔۔ خدا کرے آپ کے سارے دوست بری ہو جائیں۔ جرجی بابو آپ کو بہت چاہتے ہیں۔“

نصیر نے یہ سن کر غالباً اپنے آپ سے کہا، ”اور اس کو صرف ساڑھے تین آنے چرانے کے جرم میں سزا ملی تھی۔“

رضوی نے گرم کافی کا ایک گھونٹ پی کر ٹھنڈے انداز میں کہا، ”جی ہاں، صرف ساڑھے تین آنے چرانے کے جرم میں۔۔۔ اور وہ بھی خزانے میں جمع ہیں۔۔۔ خدا معلوم ان سے کس پیٹ کی آگ بجھے گی؟“ رضوی نے کافی کا ایک اور گھونٹ پیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، ”ہاں منٹو صاحب، اس کی رہائی میں صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ مجھے دس روپوں کی اشد ضرورت تھی۔۔۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ مجھے یہ روپے ایک سلسلے میں سنتری کورشوت کے طور پر دینے تھے۔ میں نے بڑی مشکلوں سے کاغذ پنسل مہیا کر کے جرجی کو ایک خط لکھا تھا اور پچھلے کے ذریعہ سے اس تک بھجوایا تھا کہ وہ مجھے کسی نہ کسی طرح دس روپے بھیج دے۔

پچھاں پڑھ تھا، شام کو وہ مجھ سے ملا، جرجی کا رقعہ اس نے مجھے دیا، اس میں دس روپے کا سرخ پاکستانی نوٹ قید تھا۔ میں نے رتعہ پڑھا، یہ لکھا تھا، ”رضوی پیارے دس روپے بھیج تورہا ہوں، مگر ایک عادی چور کے ہاتھ، خدا کرے تمہیں مل جائیں۔ کیونکہ یہ کل ہی جیل سے رہا ہو کر جا رہا ہے۔“ میں نے یہ تحریر پڑھی تو پچھو بھنگی کی طرف دیکھ کر مسکرا یا۔ اس کو ساڑھے تین آنے چرانے کے جرم میں ایک برس کی سزا ہوئی تھی۔ میں سوچنے لگا اگر اس نے دس روپے چرانے ہوتے تو ساڑھے تین آنے فی برس کے حساب سے اس کو کیا سزا ملتی؟“

یہ کہہ کر رضوی نے کافی کا آخری گھونٹ پیا اور رخصت مانگے بغیر کافی ہاؤس سے باہر چلا گیا۔

مستقیم نے محمودہ کو پہلی مرتبہ اپنی شادی پر دیکھا۔ آرسی مصحف کی رسم ادا ہو رہی تھی کہ اچانک اس کو دو بڑی بڑی۔۔۔ غیر معمولی طور پر بڑی آنکھیں دکھائی دیں۔۔۔ یہ محمودہ کی آنکھیں تھیں جو ابھی تک کنواری تھیں۔

مستقیم، عورتوں اور لڑکیوں کے جھرمٹ میں گھرا تھا۔۔۔ محمودہ کی آنکھیں دیکھنے کے بعد اسے قطعاً محسوس نہ ہوا کہ آرسی مصحف کی رسم کب شروع ہوئی اور کب ختم ہوئی۔ اس کی لہن کیسی تھی، یہ بتانے کے لیے اس کو موقع دیا گیا تھا مگر محمودہ کی آنکھیں اس کی لہن اور اس کے درمیان ایک سیاہ مخلیں پر دے کے مانند حائل ہو گئیں۔

اس نے چوری چوری کئی مرتبہ محمودہ کی طرف دیکھا۔ اس کی ہم عمر لڑکیاں سب چچھارہی تھیں۔ مستقیم سے بڑے زوروں پر چھیڑ خانی ہو رہی تھی مگر وہ الگ تھلگ، کھڑکی کے پاس گھٹنوں پر ٹھوڑی جمائے، خاموش بیٹھی تھی۔

اس کا رنگ گورا تھا۔ بال تختیوں پر لکھنے والی سیاہی کے مانند کال رکھی تھی جو اس کے بیضوی چہرے پر بہت سمجھتی تھی۔ مستقیم کا اندازہ تھا کہ اس کا قد چھوٹا ہے چنانچہ جب وہ اٹھی تو اس کی تصدیق ہو گئی۔ لباس بہت معمولی قسم کا تھا۔ دوپٹہ جب اس کے سر سے ڈھلا کا اور فرش تک جا پہنچا تو مستقیم نے دیکھا کہ اس کا سینہ بہت ٹھوس اور مضبوط تھا۔ بھرا بھرا جسم، تیکھی ناک، چوڑی پیشانی، چھوٹا سا لب دہان۔۔۔ اور آنکھیں۔۔۔ جو دیکھنے والے کو سب سے پہلے دکھائی دیتی تھی۔

مستقیم اپنی دہن گھر لے آیا۔ دو تین مہینے گزر گئے۔ وہ خوش تھا، اس لیے کہ اس کی بیوی خوبصورت اور بارسلیتہ تھی۔۔۔ لیکن وہ محمودہ کی آنکھیں ابھی نہیں بھول سکتا تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس کی دل و دماغ پر مر تسم ہو گئی ہیں۔ مستقیم کو محمودہ کا نام معلوم نہیں تھا۔۔۔ ایک دن اس نے اپنی بیوی، کلثوم سے بر سیل تذکرہ پوچھا۔ ”وہ۔۔۔ وہ لڑکی کون تھی ہماری شادی پر۔۔۔ جب آرسی مصحف کی رسم ادا ہو رہی تھی، وہ ایک کونے میں کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔“

کلثوم نے جواب دیا، ”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔۔۔ اس وقت کئی لڑکیاں تھیں۔ معلوم نہیں آپ کس کے متعلق پوچھ رہے ہیں۔“ مستقیم نے کہا، ”وہ۔۔۔ وہ جس کی یہ بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔“ کلثوم سمجھ گئی، ”اوہ۔۔۔ آپ کا مطلب محمودہ سے ہے ہے۔۔۔ ہاں، واقعی اس کی آنکھیں بہت بڑی ہیں، لیکن بری نہیں لگتیں۔۔۔ غریب گھرانے کی لڑکی ہے۔ بہت کم گو اور شریف۔۔۔ کل ہی اس کی شادی ہوئی ہے۔“

مستقیم کو غیر ارادی طور پر ایک دھپکا سالگا، ”اس کی شادی ہو گئی کل؟“

”ہاں۔۔۔ میں کل وہیں تو گئی تھی۔۔۔ میں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ میں نے اس کو ایک انگوٹھی دی ہے؟“

”ہاں ہاں۔۔۔ مجھے یاد آگیا۔۔۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم جس سیلی کی شادی پر جا رہی ہو، وہی لڑکی ہے، بڑی بڑی آنکھوں والی۔۔۔ کہاں شادی ہوئی ہے اس کی؟“

کلثوم نے گلوری بنائیں کہ اپنے خاوند کو دیتے ہوئے کہا، ”اپنے عزیزوں میں۔۔۔ خاوند اس کاریلوے ورکشاپ میں کام کرتا ہے، ڈیڑھ سورپیش ماہوار تھواہ ہے۔۔۔ سناء ہے بے حد شریف آدمی ہے۔“ مستقیم نے گلوری کلے کے نیچے دبائی، ”چلو، اچھا ہو گیا۔۔۔ لڑکی بھی، جیسا کہ تم کہتی ہو، شریف ہے۔“ کلثوم سے نہ رہا گیا، اسے تجھ تھا کہ اس کا خاوند محمودہ میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے، ”حیرت ہے کہ آپ نے اس کو محض ایک نظر دیکھنے پر بھی یاد رکھا۔“

مستقیم نے کہا، ”اس کی آنکھیں کچھ ایسی ہیں کہ آدمی انھیں بھول نہیں سکتا۔۔۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟“ کلثوم دوسرا بان بنارہی تھی۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد وہ اپنے خاوند سے مخاطب ہوئی، ”میں اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتی۔ مجھے تو اس کی آنکھوں میں کوئی کشش نظر نہیں آتی۔۔۔ مرد جانے کن نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔“

مستقیم نے مناسب خیال کیا کہ اس موضوع پر اب مزید گفتگو نہیں ہونی چاہیے۔ چنانچہ جواب میں مسکرا کروہ اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔۔۔ اتوار کی چھٹی تھی۔ حسب معمول اسے اپنی بیوی کے ساتھ میٹنی شوکیختے جانا چاہیے تھا، مگر محمودہ کا ذکر چھیڑ کر اس نے اپنی طبیعت مکدر کر لی تھی۔

اس نے آرام کر سی پر لیٹ کر تپائی پر سے ایک کتاب اٹھائی جسے وہ دو مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ پہلا ورق نکالا اور پڑھنے لگا، مگر حرف گٹھ مدد ہو کر محمودہ کی آنکھیں بن جاتے۔ مستقیم نے سوچا، ”شاید کلثوم ٹھیک کہتی تھی کہ اسے محمودہ کی آنکھوں میں کوئی کشش نظر نہیں آتی۔۔۔“ ہو سکتا ہے کسی اور مرد کو بھی نظر نہ آئے۔ ایک صرف میں ہوں جسے دکھائی دی ہے۔۔۔ پر کیوں۔۔۔ میں نے ایسا کوئی ارادہ نہیں کیا تھا۔۔۔ میری ایسی کوئی خواہش نہیں تھی کہ وہ میرے لیے پر کشش بن جائیں۔۔۔ ایک لمحے کی توبات تھی۔ بس میں نے ایک نظر دیکھا اور وہ میرے دل و دماغ پر چھا گئیں۔ اس میں نہ ان آنکھوں کا قصور ہے، نہ میری آنکھوں کا جن سے میں نے انھیں دیکھا تھا۔“

اس کے بعد مستقیم نے محمودہ کی شادی کے متعلق سوچنا شروع کیا، ”تو ہو گئی اس کی شادی۔۔۔ چلو اچھا ہوا۔۔۔ لیکن دوست یہ کیا بات ہے کہ تمہارے دل میں ہلکی سی ٹھیکی ہے۔۔۔ کیا تم چاہتے تھے کہ اس کی شادی نہ ہو۔۔۔ سدا کنواری رہے، کیوں کہ تمہارے دل میں اس سے شادی کرنے کی خواہش تو کبھی پیدا نہیں ہوئی، تم نے اس کے متعلق کبھی ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا، پھر جلن کیسی۔۔۔ اتنی دیر تمہیں اسے دیکھنے کا کبھی خیال نہ آیا، پر اب تم کیوں اسے دیکھنا چاہتے ہو۔۔۔ بفرض محال دیکھ بھی لو تو کیا کرو گے، اسے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لو گے۔۔۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں نوچ کر اپنے بٹوے میں ڈال لو گے۔۔۔ بولونا، کیا کرو گے؟“ مستقیم کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اصل میں اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اگر کچھ چاہتا بھی ہے تو کیوں چاہتا ہے۔

محمودہ کی شادی ہو چکی تھی، اور وہ بھی صرف ایک روز پہلے۔ یعنی اس وقت جب کہ مستقیم کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا، محمودہ یقیناً دلہنوں کے لباس میں یا تو اپنے میکے یا اپنی سرال میں شرمائی لجائی بیٹھی تھی۔۔۔ وہ خود شریف تھی، اس کا شوہر بھی شریف تھا، ریلوے ورکشاپ میں ملازم تھا اور ڈیڑھ سوروپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔۔۔ بڑی خوشی کی بات تھی۔ مستقیم کی دلی خواہش تھی کہ وہ خوش رہے۔۔۔ ساری عمر خوش رہے۔۔۔ لیکن اس کے دل میں جانے کیوں ایک ٹیس سی اٹھتی تھی اور اسے بے قرار بنا جاتی تھی۔

مستقیم آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ سب بکواس ہے۔ اسے محمودہ کے متعلق قطعاً سوچا نہیں چاہیے۔۔۔ دو برس گزر گئے۔ اس دوران میں اسے محمودہ کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوا اور نہ اس نے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ وہ اور اس کا خاوند بمبئی میں ڈو گنری کی ایک گلی میں رہتے تھے۔۔۔ مستقیم گڈو گنری سے بہت دوراً ہم میں رہتا تھا، لیکن اگر وہ چاہتا تو بڑی آسانی سے محمودہ کو دیکھ سکتا تھا۔

ایک دن کلثوم ہی نے اس سے کہا، ”آپ کی اس بڑی بڑی آنکھوں والی محمودہ کے نصیب بہت برے نکلے!“ چونکہ مستقیم نے تشویش بھرے لجھے میں پوچھا، ”کیوں کیا ہوا؟“ کلثوم نے گلوری بناتے ہوئے کہا، ”اس کا خاوند ایک دم مولوی ہو گیا ہے۔“

”تو اس سے کیا ہوا؟“

”آپ سن تو بیجیے۔۔۔ ہر وقت مذہب کی باتیں کرتا رہتا ہے۔۔۔ لیکن بڑی اوٹ پیلانگ قسم کی۔۔۔ وظیفے کرتا ہے، چلے کاٹتا ہے اور محمودہ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بھی ایسا کرے۔ فقیروں کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے۔ گھر بارے بالکل غافل ہو گیا ہے۔ داڑھی بڑھا لی ہے۔ ہاتھ میں ہر وقت تسبیح ہوتی ہے۔ کام پر کبھی جاتا ہے، کبھی نہیں جاتا۔۔۔ کئی کئی دن غائب رہتا ہے۔۔۔ وہ بے چاری کڑھتی رہتی ہے۔ گھر میں کھانے کو کچھ ہوتا نہیں، اس لیے فاقہ کرتی ہے۔ جب اس سے شکایت کرتی ہے تو آگے سے جواب یہ ہوتا ہے۔۔۔ فاقہ کشی اللہ تبارک و تعالیٰ کو بہت پیاری ہے۔“ کلثوم نے یہ سب کچھ ایک سانس میں کہا۔

مستقیم نے پند نیا میں سے تھوڑی سی چھالیا اٹھا کر منہ میں ڈالی، ”کہیں دماغ تو نہیں چل گیا اس کا؟“ کلثوم نے کہا، ”محمودہ کا تو بھی خیال ہے۔۔۔ خیال کیا، اس کو یقین ہے۔ گلے میں بڑے بڑے منکوں والی مالا ڈالے پھرتا ہے۔ کبھی کبھی سفید رنگ کا چولا بھی پہنتا ہے۔“ مستقیم گلوری لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور آرام کر سی میں لیٹ کر سوچنے لگا، ”یہ کیا ہوا۔۔۔ ایسا شوہر تو وہ جان ہوتا ہے۔۔۔ غریب کس مصیبت میں پھنس گئی ہے۔

میر اخیال ہے کہ پاگل پن کے جرا شیم اس کے شوہر میں شروع ہی سے موجود ہوں گے جواب ایک دم ظاہر ہوئے ہیں۔۔۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اب محمودہ کیا کرے گی۔ اس کا یہاں کوئی رشتہ دار بھی نہیں۔ کچھ شادی کرنے لا ہور سے آئے تھے اور واپس چلے گئے تھے۔۔۔ کیا محمودہ نے اپنے والدین کو لکھا ہو گا۔۔۔ نہیں، اس کے ماں باپ تو جیسا کہ کلثوم نے ایک مرتبہ کہا تھا اس کے بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ شادی اس کے پیچانے کی تھی۔ ڈونگری۔۔۔ ڈونگری میں شاید اس کی جان بیچان کا کوئی ہو۔۔۔ نہیں، جان بیچان کا کوئی ہوتا تو وہ فاقہ کیوں کرتی۔۔۔ کلثوم کیوں نہ اسے اپنے یہاں لے آئے۔۔۔ پاگل ہوئے ہو مستقیم۔۔۔ ہوش کے ناخن لو۔“

مستقیم نے ایک بار پھر ارادہ کر لیا کہ وہ محمودہ کے متعلق نہیں سوچے گا، اس لیے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا، بے کار کی مغزپاشی تھی۔ بہت دنوں کے بعد کلثوم نے ایک روز اسے بتایا کہ محمودہ کا شوہر جس کا نام جمیل تھا، قریب قریب پاگل ہو گیا ہے۔ مستقیم نے پوچھا، ”کیا مطلب؟“ کلثوم نے جواب دیا، ”مطلوب یہ کہ اب وہ رات کو ایک سینڈ کے لیے نہیں سوتا۔ جہاں کھڑا ہے، بس وہیں گھنٹوں خاموش کھڑا رہتا ہے۔۔۔ محمودہ غریب روئی رہتی ہے۔۔۔ میں کل اس کے پاس گئی تھی۔ بے چاری کوئی دن کا فاقہ تھا۔ میں میں روپے دے آئی کیوں کہ میرے پاس اتنے ہی تھے۔“

مستقیم نے کہا، ”بہت اچھا کیا تم نے۔۔۔ جب تک اس کا خاوند ٹھیک نہیں ہوتا، کچھ نہ کچھ دے آیا کروتا کہ غریب کو فاقوں کی نوبت نہ آئے۔“ کلثوم نے تھوڑے توقف کے بعد عجیب و غریب لمحے میں کہا، ”اصل میں بات کچھ اور ہے۔“

”کیا مطلب؟“

” محمودہ کا خیال ہے کہ جمیل نے محض ایک ڈھونگ رچار کھا ہے۔ وہ پاگل والگ ہرگز نہیں۔۔۔ بات یہ ہے کہ وہ۔۔۔“

”وہ کیا؟“

”وہ۔۔۔ عورت کے قابل نہیں۔۔۔ نقص دور کرنے کے لیے وہ فقیروں اور سنسنیاں سیوں سے ٹونے ٹونکے لیتا رہتا ہے۔“

مستقیم نے کہا، ”یہ بات تو پاگل ہونے سے زیادہ افسوس ناک ہے۔۔۔ محمودہ کے لیے تو یہ سمجھو کہ ازدواجی زندگی ایک خلا بن کر رہ گئی ہے۔“

مستقیم اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بیٹھ کر محمودہ کی حالت زار کے متعلق سوچنے لگا۔ ایسی عورت کی زندگی کیا ہو گی جس کا شوہر بالکل صفر ہو۔ کتنے ارمان ہوں گے اس کے سینے میں۔ اس کی جوانی نے کتنے کپکپا دینے والے خواب دیکھے ہوں گے۔ اس نے اپنی سہیلیوں سے کیا کچھ نہیں سنایا ہوا گا۔۔۔ کتنی ناامیدی ہوئی ہو گی غریب کو، جب اسے چاروں طرف خلاہی خلاف نظر آیا ہوا گا۔۔۔ اس نے اپنی گود ہری ہونے کے متعلق بھی کئی بار سوچا ہوا گا۔۔۔ جب ڈونگری میں کسی کے ہاں بچھ پیدا ہونے کی اطلاع اسے ملتی ہو گی تو بے چاری کے دل پر ایک گھونسا سا لگتا ہوا گا۔۔۔ اب کیا کمرے گی۔۔۔ اپنا نہ ہو خود کشی کر لے۔۔۔ دو برس تک اس نے کسی کو یہ راز نہ بتایا مگر اس کا سینہ پھٹ پڑا۔ خدا اس کے حال پر رحم کرے!

بہت دن گزر گئے۔ مستقیم اور کلثوم چھپیوں میں پیچ گئی چلے گئے۔ وہاں ڈھانی میئنے رہے۔ واپس آئے تو ایک مہینے کے بعد کلثوم کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔۔۔ وہ محمودہ کے ہاں نہ جاسکی۔ لیکن ایک دن اس کی ایک سہیلی جو محمودہ کو جانتی تھی، اس کو مبارک باد دینے کے لیے آئی۔ اس نے باتوں باتوں میں کلثوم سے کہا، ”کچھ سناتم نے۔۔۔ وہ محمودہ ہے نا، بڑی بڑی آنکھوں والی!“

کلثوم نے کہا، ”ہاں ہاں۔۔۔ ڈو گمری میں رہتی ہے۔“

”خاوند کی بے پروائی نے غریب کو بری باتوں پر مجبور کر دیا۔“ کلثوم کی سہیلی کی آواز میں درد تھا۔ کلثوم نے بڑے دکھ سے پوچھا، ”کیسی بری باتوں پر؟“

”اب اس کے یہاں غیر مردوں کا آنا جانا ہو گیا ہے۔“

”جھوٹ!“ کلثوم کا دل دھک کرنے لگا۔ کلثوم کی سہیلی نے کہا، ”نبیں کلثوم، میں جھوٹ نہیں کہتی۔۔۔ میں پرسوں اس سے ملنے گئی تھی۔ دروازے پر دستک دینے ہی والی تھی کہ اندر سے ایک نوجوان مرد جو میمن معلوم ہوتا تھا، باہر نکلا اور تیزی سے نیچے اتر گیا۔ میں نے اب اس سے ملنا مناسب نہ سمجھا اور واپس چلی آئی۔“

”یہ تم نے بہت بری خبر سنائی۔۔۔ خدا اس کو گناہ کے راستے سے بچائے رکھے۔۔۔ ہو سکتا ہے وہ میمن اس کے خاوند کا کوئی دوست ہو۔“ کلثوم نے خود کو فریب دیتے ہوئے کہا۔ اس کی سہیلی مسکراتی، ”دوست، چوروں کی طرح دروازہ کھول کر بھاگا نہیں کرتے۔“ کلثوم نے اپنے خاوند سے بات کی تو اسے بہت دکھ ہوا۔ وہ کبھی روپیانہیں تھا پر جب کلثوم نے اسے یہ اندھنک بات بتائی کہ محمودہ نے گناہ کا راستہ اختیار کر لیا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے اسی وقت تھیہ کر لیا کہ محمودہ ان کے یہاں رہے گی، چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کہا، ”یہ بڑی خوف ناک بات ہے۔۔۔ تم ایسا کرو، ابھی جاؤ اور محمودہ کو یہاں لے آؤ!“

کلثوم نے بڑے روکھے پن سے کہا، ”میں اسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی۔“

”کیوں؟“ مستقیم کے لبھ میں حیرت تھی۔

”بس، میری مرضی۔۔۔ وہ میرے گھر میں کیوں رہے۔۔۔ اس لیے کہ آپ کو اس کی آنکھیں پسند ہیں؟“ کلثوم کے بولنے کا انداز بہت زہریلا اور طنزیہ تھا۔ مستقیم کو بہت غصہ آیا، مگر پی گیا۔ کلثوم سے بحث کرنا بالکل فضول تھا۔ ایک صرف یہی ہو سکتا تھا کہ وہ کلثوم کو نکال کر محمودہ کو لے آئے۔۔۔ مگر وہ ایسے اقدام کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ مستقیم کی نیت قطعائیک تھی۔ اس کو خود اس کا احساس تھا۔

در اصل اس نے کسی گندے زاویہ نگاہ سے محمودہ کو دیکھا ہی نہیں تھا۔۔۔ البتہ اس کی آنکھیں اس کو واقعی پسند نہیں۔ اتنی کہ وہ بیان نہیں کر سکتا تھا۔

وہ گناہ کا راستہ اختیار کر چکی تھی۔ ابھی اس نے صرف چند قدم ہی اٹھائے تھے۔ اس کو تباہی کے غار سے بچایا جا سکتا تھا۔۔۔ مستقیم نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی، کبھی روزہ نہیں رکھا تھا، کبھی خیرات نہیں دی تھی۔۔۔ خدا نے اس کو کتنا اچھا موقع دیا تھا کہ وہ محمودہ کو گناہ کے رستے پر سے گھسیٹ کر لے آئے اور طلاق وغیرہ دلو اکراں کی کسی اور سے شادی کرادے۔۔۔ مگر وہ یہ ثواب کا کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ بیوی کا دینیل تھا۔

بہت دیر تک مستقیم کا ضمیر اس کو سرزنش کرتا رہا۔ ایک دو مرتبہ اس نے کوشش کر کے اس کی بیوی رضامند ہو جائے۔ مگر جیسا کہ مستقیم کو معلوم تھا، ایسی کوششیں لا حاصل تھیں۔ مستقیم کا خیال تھا کہ اور کچھ نہیں تو کلثوم، محمودہ سے ملنے ضرور جائے گی۔ مگر اس کو نا امیدی ہوئی۔ کلثوم نے اس روز کے بعد محمودہ کا نام تک نہ لیا۔

اب کیا ہو سکتا تھا۔۔۔ مستقیم خاموش رہا۔

قریب قریب دو برس گزر گئے۔ ایک دن گھر سے نکل کر مستقیم ایسے ہی تفریح گھر پر چہل قدمی کر رہا تھا کہ اس نے قصائیوں کی بلڈنگ کی گراؤنڈ فلور کی کھولی کے باہر، تھرے پر محمودہ کی آنکھوں کی جھلک دیکھی۔ مستقیم دو قدم آگے نکل گیا تھا۔ فوراً امرز کراں نے غور سے دیکھا۔۔۔ محمودہ ہی تھی۔ وہی بڑی بڑی آنکھیں۔۔۔ وہ ایک بیوی دن کے ساتھ جو اس کھولی میں رہتی تھی، بتیں کرنے میں مصروف تھی۔

اس بیوی دن کو سارا ماہم جانتا تھا۔ ادھیر عمر کی عورت تھی۔ اس کا کام عیاش مردوں کے لیے جوان لڑکیاں مہیا کرنا تھا۔ اس کی اپنی دو جوان لڑکیاں تھیں جن سے وہ پیشہ کرواتی تھی۔۔۔ مستقیم نے جب محمودہ کا چہرہ نہایت ہی بے ہودہ طور پر میک اپ کیا ہوا دیکھا تو وہ لرز اٹھا۔ زیادہ دیر تک یہ اندوہ ناک منظر دیکھنے کی تاب اس میں نہیں تھی۔۔۔ وہاں سے فوراً چل دیا۔

گھر پہنچ کر اس نے کلثوم سے اس واقعے کا ذکر نہ کیا۔۔۔ کیوں کہ اس کی اب ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ محمودہ اب مکمل عصمت فروش عورت بن چکی تھی۔۔۔ مستقیم کے سامنے جب بھی اس کا بے ہودہ اور فیش طور پر میک اپ کیا ہوا چہرہ آتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو

آجاتے۔ اس کا ضمیر اس سے کہتا، ”مستقیم! جو کچھ تم نے دیکھا ہے، اس کا باعث تم ہو۔۔۔ کیا ہوا تھا اگر تم اپنی بیوی کی چند روزہ ناراضی اور خفگی برداشت کر لیتے۔ زیادہ سے زیادہ وہ غصے میں آکر اپنے میکے چلی جاتی۔۔۔ مگر محمودہ کی زندگی اس گندگی سے تو نجاتی جاتی جس میں وہ اس وقت دھنسی ہوئی ہے۔۔۔ کیا تمہاری نیت نیک نہیں تھی۔۔۔ اگر تم سچائی پر رہتے تو کلثوم ایک نہ ایک دن اپنے آپ ٹھیک ہو جاتی۔۔۔ تم نے بڑا ظلم کیا۔۔۔ بہت بڑا گناہ کیا۔“

مستقیم اب کیا کر سکتا تھا۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔ پانی سر سے گزرا چکا تھا۔ چڑیاں سارا گھیت چک گئی تھیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ مرتے ہوئے مریض کو دم آخر آسیجن سنگھانے والی بات تھی۔ تھوڑے دنوں کے بعد بمبی کی فضافرقہ وارانہ فسادات کے باعث بڑی خطرناک ہو گئی۔ بٹوارے کے باعث ملک کے طول و عرض میں تباہی اور غارت گری کا بازار گرم تھا۔ لوگ دھڑادھڑ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جا رہے تھے۔ کلثوم نے مستقیم کو مجبور کیا کہ وہ بھی بمبی چھوڑ دے۔۔۔ چنانچہ جو پہلا جہاز ملا، اس کی سیٹیں بک کر اکے میاں بیوی کر ابھی پہنچ گئے اور چھوٹا مونٹا کار و بار شروع کر دیا۔

ڈھائی برس کے بعد یہ کار و بار ترقی کر گیا، اس لیے مستقیم نے ملازمت کا خیال ترک کر دیا۔۔۔ ایک روز شام کو دکان سے اٹھ کروہ ٹھلتا ٹھلتا صدر جانکلا۔۔۔ جی چاہا کہ ایک پان کھائے۔ بیس تیس قدم کے فاصلے پر اسے ایک دکان نظر آئی جس پر کافی بھیڑ تھی۔ آگے بڑھ کروہ دکان کے پاس پہنچا۔۔۔ کیا دیکھتا ہے کہ محمودہ پان لگا رہی ہے۔ جملے ہوئے چہرے پر اسی قسم کا فخش میک اپ تھا۔ لوگ اسے گندے گندے مذاق کر رہے ہیں اور وہ ہنس رہی ہے۔۔۔ مستقیم کے ہوش وہ حواس غائب ہو گئے۔ قریب تھا کہ وہاں سے بھاگ جائے کہ محمودہ نے اسے پکارا، ”ادھر آؤ دلہما میاں۔۔۔ تمہیں ایک فست کلاس پان کھلانگیں۔۔۔ ہم تمہاری شادی میں شریک ہیں۔“ مستقیم بالکل پتھر آگیا۔

-[87]-

جماعت: سعادت حسن منشو

”میری تو آپ نے زندگی حرام کر رکھی ہے۔۔۔ خدا کرے میں مر جاؤں۔“

”اپنے مرنے کی دعائیں کیوں مانگتی ہو۔ میں مر جاؤں تو سارا قصہ پاک ہو جائے گا۔۔۔ کہو تو میں ابھی خود کشی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہاں پاس ہی افیم کا ٹھیکہ ہے۔ ایک تو لہ افیم کافی ہو گی۔“

”جاو، سوچتے کیا ہو۔“

”جاتا ہوں--- تم اٹھو اور مجھے--- معلوم نہیں ایک تولہ افیم کتنے میں آتی ہے۔ تم مجھے انداز آدس روپے دے دو۔“

”دس روپے؟“

”ہاں بھئی--- اپنی جان گنوانی ہے--- دس روپے زیادہ تو نہیں۔“

”میں نہیں دے سکتی۔“

”ضرور آپ کو افیم کھا کے ہی مرننا ہے؟؟“

”سنکھیا بھی ہو سکتی ہے۔“

”کتنے میں آئے گی؟“

”معلوم نہیں--- میں نے آج تک کبھی سنکھیا نہیں کھائی۔“

”آپ کو ہر چیز کا علم ہے۔ بنے کیوں ہیں؟“

”بانا تم مجھے رہی ہو--- بھلا مجھے زہر دل کی قیتوں کے متعلق کیا علم ہو سکتا ہے۔“

”آپ کو ہر چیز کا علم ہے۔“

”تمہارے متعلق تو میں ابھی تک کچھ بھی نہ جان سکا۔“

”اس لیے کہ آپ نے میرے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں۔“

”یہ صریحاً تمہاری زیادتی ہے۔۔۔ ان پانچ برسوں کے جتنے دن ہوتے ہیں، ان میں آپ مجھ سے یہی خرافات کہتے رہے ہیں۔“

”ہٹائیے۔۔۔ ان پانچ برسوں کے جتنے دن ہوتے ہیں، ان میں آپ مجھ سے یہی خرافات کہتے رہے ہیں۔“

”تم حقیقت کو خرافات کہتی ہو۔۔۔؟ میں اب کیا کہوں۔“

”جو کہنا چاہتے ہیں کہہ ڈالیے۔۔۔ آپ کی زبان میں لگام ہی کہاں ہے۔“

”پھر تم نے بدزبانی شروع کر دی۔“

”بدزبان تو آپ ہیں۔۔۔ میں نے ان پانچ برسوں میں، آپ سرپر قرآن اٹھا کر کہیے، کب آپ سے اس قسم کی گستاخی کی ہے؟ گستاخ ہوں گے آپ کے۔۔۔“

”رک کیوں گئی ہو۔۔۔ جو کہنا چاہتی ہو کہہ دو۔“

”میں کچھ کہنا نہیں چاہتی۔۔۔ آپ سے کوئی کیا کہے۔۔۔ آپ تو یہ چاہتے ہیں کہ آدمی کو تکلیف پہنچ، لیکن وہ اف بھی نہ کرے۔ میں تو ایسی زندگی سے گھبرا گئی ہوں۔“

”تم چاہتی کیا ہو، یہ بھی تو پتا چلے۔“

”میں کچھ نہیں چاہتی۔“

”پھر یہ گلے شکوے کیا معنی رکھتے ہیں؟“

”ان کے معنی آپ بخوبی سمجھتے ہیں۔۔۔ انجان کیوں بنتے ہیں؟ ان گلے شکوؤں کے پیچھے کوئی بات تو ہو گی۔“

”کیا؟“

”میں کیا جانوں۔“

”یہ عجیب منطق ہے۔۔۔ خود ہی چھاڑتی ہو خود ہی رفوکرتی ہو۔۔۔ جو صحیح بات ہے اس کو بتائی کیوں نہیں ہو۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا یہ ہر روز کے جھگڑے ہمیں کہاں لے جائیں گے۔“

”جہنم میں۔“

”وہاں بھی تو ہمارا ساتھ ہو گا۔“

”میں تو وہاں بالکل نہیں جاؤں گی۔“

”تو کہاں ہو گی تم؟“

”مجھے معلوم نہیں۔“

”تمہیں بہت سی باتیں معلوم نہیں ہوتیں۔۔۔ سب سے بڑی بات میری محبت ہے، جس کا احساس تمہیں ابھی تک نہیں ہوا۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔ یا میں نے اس کے اظہار میں بخل کیا ہے، یا تم میں وہ حس نہیں جو اس جذبے کو پہچان سکے۔“

”اصل میں بے حس تو آپ ہیں۔“

”کیسے؟“

”یہ بھی کوئی بات ہے۔ ان پانچ برسوں میں ہر روز--- ہر روز---“

”یہی تو میری محبت کا ثبوت ہے۔“

”لعنت ہے ایسی محبت پر کہ آدمی تنگ آجائے۔“

”محبت سے کون تنگ آسکتا ہے؟“

”میری مثال موجود ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اقرار کیا ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں؟“

”میں نے کب اقرار کیا ہے؟“

”یہ اقرار ہی تو تھا۔“

”ہو گا۔“

”ہو گا نہیں--- تھا--- لیکن تم مانو گی نہیں، اس لیے کہ ضدی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عورتوں کی نفیات کیا ہیں۔ جب ان سے پیار کیا جائے تو گھبر اجائی ہیں اور جب ان سے ذرا بے احتنائی بر تی جائے تو بر ہم ہو جاتی ہیں۔“

”محض بکو اس ہے۔“

”اس لیے کہ یہ پر خلوص خاوند کی زبان سے نکلی ہے۔“

”ہٹائیئے۔۔۔ آپ کا خلوص میں دیکھ چکی ہوں۔“

”جب دیکھ چکی ہو تو ایمان کیوں نہیں لاتی ہو؟“

”مجھے تنگ نہ کیجیے، میری طبیعت خراب ہے۔ مجھے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔۔۔“

”اپنے آپ کو بھی اچھا نہیں سمجھتی؟“

”خدا کی قسم۔۔۔ آج نہیں۔“

”کل تو اچھا سمجھو گی؟“

”مجھے کچھ معلوم نہیں۔“

”یہ عجیب بات ہے کہ تمہیں سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔۔۔ مگر تمہیں معلوم نہیں ہوتا۔۔۔ یہ کیا سلسلہ ہے۔۔۔؟ تم صاف الفاظ میں یہ کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو۔“

”تو سن لیجیے۔۔۔ میں آپ سے نفرت کرتی ہوں۔“

”مجھے یہ سن کر بڑا دکھ ہوا ہے۔۔۔ میں نے تمہاری ہر آساں کش کا خیال رکھا۔۔۔“

”لیکن ایک بات کا خیال نہیں رکھا۔“

”کس بات کا؟“

”آپ عقل مند ہیں۔۔۔ خود سمجھیے۔۔۔ میں کیوں بتاؤں۔“

”کوئی اشارہ تو کر دو۔“

”میں ایسی اشارہ بازیاں نہیں جانتی۔“

”تم نے ایسی گفتگو کہاں سے سمجھی ہے؟“

”آپ سے“

”مجھ سے۔۔۔؟ مجھے حیرت ہے کہ یہ الزام تم نے مجھ پر کیوں لگایا ہے؟“

”آپ پر تو ہر الزام لگ سکتا ہے۔“

”مثال کے طور پر؟“

”میں آپ کو مثال نہیں دے سکتی۔۔۔ خدا کے لیے یہ گفتگو بند کیجیے، میں تنگ آگئی ہوں۔۔۔ بس، میں نے کہہ دیا ہے کہ مجھے۔۔۔“

”کیا؟“

”یا اللہ میری توبہ۔۔۔! مجھے زیادہ تنگ نہ کیجیے۔۔۔ میرا جی چاہتا ہے اپنے سر کے بال نوچنا شروع کر دوں۔“

”میرا سر موجود ہے۔۔۔ تم اس کے بال بڑے شوق سے نوج سکتی ہو۔“

”آپ کو تو اپنے بال بڑے عزیز ہیں۔“

”انسان کو اپنی ہر چیز عزیز ہوتی ہے۔“

”لیکن مردوں کے سر پر بالوں کے چھتے بھڑوں کے چھتے معلوم ہوتے ہیں۔۔۔ آپ معلوم نہیں بال کٹوانے سے کیوں پرہیز کرتے ہیں۔“

”میں پرہیزی آدمی ہوں۔“

”اس قدر جھوٹ۔۔۔ ابھی پرسوں آپ نے مجھ سے کہا کہ آپ نے ایک پارٹی میں شراب پی تھی۔“

”لا حول ولا۔۔۔ میں نے تو صرف شیری کا ایک گلاس پیا تھا۔“

”وہ کیا بلا ہوتی ہے؟“

”بڑی بے ضرر قسم کی چیز ہے۔“

”تمہاری بذریبانیاں کہیں مجھے بھی بذریبان نہ بنادیں۔“

”جیسے آپ بذریبان نہیں ہیں۔“

”بذریبان تمہارا باپ تھا۔۔۔ جانتی ہو۔۔۔ وہ ہر بات میں مغلاظات کرتا تھا۔“

”میں کہتی ہوں میرے موئے باپ کے متعلق کچھ نہ کہنے۔۔۔ آپ بڑے وابیات ہوتے جا رہے ہیں۔“

”وابیات کیسے ہوتا جا رہا ہوں؟“

”میں نہیں جانتی۔“

”جاننے کے بغیر تم نے یہ فتویٰ کیسے عائد کر دیا؟“

”میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ نے اتنے بال کیوں بڑھا رکھے ہیں، مجھے وحشت ہوتی ہے۔“

”بس اتنی سی بات تھی جس کو تم نے بنگڑہ بنا دیا۔۔۔ میں جا رہا ہوں۔“

”کہاں؟“

”بس جا رہا ہوں۔“

”خدا کے لیے مجھے بتا دیجیے۔۔۔ میں خود کشی کر لوں گی۔“

”میں نصرت ہسیر کنگ سیلوں میں جا رہا ہوں۔“

نعم ٹھلتا ٹھلتا ایک باغ کے اندر چلا گیا۔۔۔ اس کو وہاں کی فضا بہت پسند آئی۔۔۔ گھاس کے ایک تختے پر لیٹ کر اس نے خود کلامی شروع کر دی۔۔۔

”کیسی پر فضائیل ہے۔۔۔ حیرت ہے کہ آج تک میری نظروں سے او جمل رہی۔۔۔ نظریں۔۔۔ او جمل۔“

اتا کہہ کروہ مسکرایا۔

”نظر ہو تو چیزیں نظر بھی نہیں آتیں۔۔۔ آہ کہ نظر کی بے نظری!“ دیر تک وہ گھاس کے اس تختے پر لیٹا اور ٹھنڈک محسوس کرتا رہا۔ لیکن اس کی خود کلامی جاری تھی۔

”یہ نرم گھاس کتنی فرحت ناک ہے! آنکھیں پاؤں کے تلووں میں چلی آئیں۔۔۔ اور یہ پھول۔۔۔ یہ پھول اتنے خوبصورت نہیں جتنی ان کی ہر جائی خوبصورت ہے۔۔۔ ہر شے جو ہر جائی ہو۔۔۔ خوبصورت ہوتی ہے۔۔۔ ہر جائی عورت۔۔۔ ہر جائی مرد۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔ یہ خوبصورت چیزیں پہلے پیدا ہوئی تھیں۔۔۔ یا خوبصورت خیال۔۔۔ ہر خیال خوبصورت ہوتا ہے۔۔۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ہر پھول خوبصورت نہیں ہوتا۔۔۔ مثال کے طور پر یہ پھول۔۔۔“

اس نے اٹھ کر ایک پھول کی طرف دیکھا اور اپنی خود کلامی جاری رکھی، ”یہ اس ٹھنپ پر اکڑوں بیٹھا ہے۔۔۔ کتنا سفلہ دکھائی دیتا ہے بہر حال، یہ جگہ خوب ہے۔۔۔ ایک بہت بڑا دماغ معلوم ہوتی ہے۔۔۔ روشنی بھی ہے۔۔۔ سائے بھی ہیں۔۔۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت میں نہیں بلکہ یہ جگہ سوچ رہی ہے۔۔۔ یہ پر فضائیل جو اتنی دیر میری نظروں سے او جمل رہی۔“ اس کے بعد نعیم فرط مسرت میں کوئی غزل گانا شروع کر دیتا ہے۔۔۔ کہ اچانک موڑ کے ہارن کی کرخت آواز اس کے سازِ دل کے سارے تار چھنچھوڑ دیتی ہے۔

وہ چونک کراٹھتا ہے۔۔۔ دیکھتا ہے کہ ایک موڑ پاس کی روٹ پر کھڑی ہے اور ایک لمبی مونچھوں والا آدمی اس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔۔۔ اس مونچھوں والے آدمی نے گرج کر کہا:

”اے تم کون ہو؟“

نعم جو اپنے ہی نشے میں سرشار تھا، چونکا، ”یہ موڑ اس باغ میں کہاں سے آگئی؟“

موچھوں والا جو اس باغ کا مالک تھا، بڑا بڑا۔

”وضع قطع سے تو آدمی شریف معلوم ہوتا ہے مگر یہاں کیسے گھس آیا۔۔۔ کس اطمینان سے لیتا تھا جیسے اس کے باوکا باغ ہے۔“ پھر اس نے بلند آواز میں لکار کے نعیم سے کہا:

”اماں۔۔۔ کچھ سنتے ہو؟“

نعم نے جواب دیا، ”حضور سن رہا ہوں۔۔۔ تشریف لے آئیے۔۔۔ یہاں بہت پر فضائی گھے ہے۔۔۔“

باغ کا مالک بھٹاگ لیا، ”تشریف کا بچپ۔۔۔ ادھر آؤ۔۔۔“

نعم لیٹ گیا۔

”بھی مجھ سے نہ آیا جائے گا، تم خود ہی چلے آؤ۔۔۔ واللہ! بڑی دل فریب جگہ ہے تمہاری سب کو فت دور ہو جائے گی۔۔۔“

باغ کا مالک موڑ سے نکلا۔۔۔ اور غصے میں بھرا ہوا نعیم کے پاس آیا:

”اٹھو یہاں سے!“

نعم کے کانوں میں اس کی تیکھی آواز بہت ناگوار گزری، ”تنے اوچھے نہ بلو۔۔۔ آؤ، میرے پاس لیٹ جاؤ۔۔۔ بالکل خاموش جس طرح کہ میں لیٹا ہوا ہوں۔۔۔ آنکھیں بند کر لو۔۔۔ اپنا سارا جسم ڈھیلا چھوڑ دو۔۔۔ دماغ کی ساری بیباں گل کر دو۔۔۔ پھر جب تم اس اندر ہیرے میں چلو گے تو ٹھوٹتی ہوئی تمہاری انگلیاں غیر ارادی طور پر ایسے تقمی روش ن کریں گی جن کے وجود سے تم بالکل غافل تھے۔ آؤ میرے ساتھ لیٹ جاؤ۔۔۔“

باغ کے مالک نے ایک لمحہ سوچا۔۔۔ نعیم سے کہا، ”دیوانے معلوم ہوتے ہو۔۔۔“

نعم مسکرا یا، ”نبیں۔۔۔ تم نے کبھی دیوانے دیکھے ہی نہیں۔۔۔ میری جگہ یہاں اگر کوئی دیوانہ ہوتا تو وہ ان بکھری ہوئی جھاڑیوں اور ٹھنڈیوں پر بچوں کے گالوں کے مانند لٹکے ہوئے پھولوں سے کبھی مطمئن نہ ہوتا۔۔۔ دیوانگی اطمینان کا نام نہیں میرے دوست۔۔۔ لیکن آؤ! دیوانگی کی باتیں کریں۔“

”بکواس بند کرو۔۔۔ نکل جاؤ یہاں سے۔“

باغ کے مالک کو طیش آگیا۔۔۔ اس نے اپنے ڈرائیور کو بلا بیا اور کہا کہ نعیم کو دھکے مار کر باہر نکال دے۔

”ارے تم کون ہو؟ بڑے بد تمیز معلوم ہوتے ہو۔“

جب نعیم باہر جا رہا تھا تو اس نے گیٹ پر ایک بورڈ دیکھا جس پر یہ لکھا تھا، ”بغیر اجازت اندر آنا منع ہے۔“

وہ مسکرا یا۔

حیرت ہے کہ یہ میری نظر دوں سے او جھل رہا۔۔۔ نظر ہو تو بعض چیزیں نظر نہیں بھی آتیں۔۔۔ آہ نظر کی یہ بے نظری۔
یہاں سے نکل کر وہ ایک آرٹ کی نمائش میں چلا گیا تاکہ اپنا ذہنی تکددور دور کر سکے۔ ہال میں داخل ہوتے ہی اس کو عورتوں اور مردوں کا جھرمٹ نظر آیا جو دیواروں پر لگی پینٹنگز دیکھ رہا تھا۔

ایک مرد کسی پارسی عورت سے کہہ رہا تھا، ”مسز فوجدار۔۔۔ یہ پینٹنگ دیکھی آپ نے؟“

مسز فوجدار نے تصویر کو ایک نظر دیکھنے کے بعد ایک عورت شیریں کی طرف بڑے غور سے دیکھا اور اس مرد سے جو غالباً اس کا ہونے والا شوہر تھا کہا، ”تم نے دیکھا، شیریں کتنی سچ بن کر آئی ہے!“

ایک نوجوان عورت ایک نو عمر لڑکی سے کہہ رہی تھی، ”ثریا! ادھر آکے تصویریں دیکھ۔۔۔ تو وہاں کھڑی کیا کر رہی ہے؟“

ثریا کو تصویروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اصل میں اس کو ایک بوائے فرینڈ سے ملنا تھا۔

ایک ادھیر عمر کا مرد جسے پینٹنگ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اپنے ادھیر عمر کے دوست سے کہہ رہا تھا، ”بلی زکام کی وجہ سے نہ حال ہے، ورنہ ضرور آتی۔۔۔ آپ جانتے ہی ہیں پینٹنگ سے اسے کتنی دلچسپی ہے، اب تو وہ بہت اچھی تصویریں بنالیتی ہے، پرسوں اس نے پنسل کاغذ لے کر اپنے چھوٹے بھائی کی سائیکل کی تصویر اتاری۔۔۔ میں تو دنگ رہ گیا۔“

نعم پاس کھڑا تھا۔۔۔ اس نے ہلکے سے طنز کے ساتھ کہا، ”ہو بہو سائیکل معلوم ہوتی ہو گی!“

دونوں دوست بھوئیک سے ہو کر رہ گئے کہ یہ کون بد تیز ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے نعیم سے پوچھا، ”آپ کون۔۔۔؟“

نعم بوكھلا گیا۔

”میں۔۔۔ میں۔۔۔“

”میں میں کیا کرتے ہو۔۔۔ بتاؤ تم کون ہو؟“

نعم نے سنبھل کر کہا، ”آپ ذرا آرام سے پوچھیے۔۔۔ میں آپ کو بتا سکتا ہوں۔۔۔“

”تم یہاں آئے کیسے؟“

نعم کا جواب بڑا مختصر تھا، ”جی پیدل۔۔۔“

عورتوں اور مردوں نے جو آس پاس کھڑے تصویریں دیکھنے کی بجائے خدا معلوم کن کن چیزوں پر تبصرہ کر رہے تھے، ہنسنا شروع کر دیا۔۔۔
انتہے میں اس نمائش کا ناظم آیا۔ اس کو نعیم کی گستاخی کے متعلق بتایا گیا تو اس نے بڑے کڑے انداز میں اس سے پوچھا، ”تمہارے پاس کارڈ
ہے؟“

”بغیر اجازت تم اندر چلے آئے۔ جاؤ بھاگ جاؤ بیہاں سے۔“

نعم ایک تصویر کو دیر تک دیکھنا چاہتا تھا مگر اسے بادل ناخواستہ وہاں سے نکلنا پڑا۔۔۔ سیدھا اپنے گھر گیا، دروازے پر دستک دی۔ اس کا نوکر
فضلو باہر نکلا۔ نعیم نے اس سے درخواست کی، ”کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“

فضلو بوكھلا گیا، ”حضور۔۔۔ حضور۔۔۔ یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔ اجازت کیسی؟“

نعم نے کہا، ”نہیں فضلو۔۔۔ یہ میراگھر نہیں۔۔۔ یہ گھر جو مجھے راحت بخشتا ہے، کیسے میرا ہو سکتا ہے۔۔۔ مجھے اب ایک نئی بات معلوم ہوئی
ہے۔۔۔“

فضلو نے بڑے ادب سے پوچھا، ”کیا سر کار؟“

نعم نے کہا، ”یہی کہ یہ میراگھر نہیں۔۔۔ البتہ اس کا گرد و غبار۔۔۔ اس کی تمام غلطیں میری ہیں۔۔۔ وہ تمام چیزیں جن سے مجھے کوفت
ہوتی ہے، میری ہیں، لیکن وہ تمام چیزیں جن سے مجھے راحت پہنچتی ہے کسی اور کی۔۔۔ خدا جانے کس کی۔۔۔ میں اب ڈرتا ہوں۔۔۔ کسی
اچھی چیز کو اپنانے سے خوف لگتا ہے۔۔۔ یہ پانی میرا نہیں۔۔۔ یہ ہوا میری نہیں۔۔۔ یہ آسمان میرا نہیں۔۔۔ وہ لحاف جو میں سر دیوں میں
اوڑھتا ہوں، میرا نہیں۔۔۔ اس لیے کہ میں اس سے راحت طلب کرتا تھا۔۔۔ فضلو جاؤ۔۔۔ تم بھی میرے نہیں۔۔۔“

نعم نے فضلو کو کوئی بات کرنے نہ دی۔

وہ چلا گیا۔

رات کے دس نجیچے تھے۔

ہیر امنڈی کے ایک کوٹھے سے ”پیابن ناہیں آوت چین“ کے بول باہر اڑاڑ کے آرہے تھے

نعم اس کوٹھے پر چلا گیا۔

اندر مجر اسنے والے تین چار مردوں کی طرف دیکھا۔۔۔ اور طوائف سے کہا، ”ان اصحاب کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟“

طوائف مسکرائی، ”انہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔۔۔؟ ادھر مندرجہ پر بیٹھیے گاؤں تکیہ لے لجھے!“

نعم بیٹھ گیا۔۔۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور اس طوائف سے کہا، ”یہ کتنی اچھی جگہ ہے؟“

طوائف سنبھیدہ ہو گئی، ”آپ کیا میر انداق اڑانے آئے ہیں۔۔۔ یہ اچھی جگہ ہے۔۔۔ جسے تمام شرفاحد سے زیادہ گندی جگہ سمجھتے ہیں۔۔۔“

نعم نے اس سے کہا، ”یہ اچھی جگہ اس لیے ہے کہ یہاں ”بغیر اجازت کے آنا منع ہے“ کا بورڈ آویزاں نہیں ہے۔۔۔“

یہ سن کر طوائف اور اس کا مجر اسنے والے تماش بین ہنسنے لگے۔ نعم نے ایسا محسوس کیا کہ دنیا ایک اس قسم کی طوائف ہے جس کا مجر اسنے کے لیے اس قسم کے چغدا آتے ہیں۔

-[89]-

تین موٹی عورتیں: سعادت حسن منٹو

ایک کا نام مسز رچین اور دوسری کا نام مسز سٹلف تھا۔ ایک بیوہ تھی تو دوسری دو شوہروں کو طلاق دے چکی تھی۔ تیسری کا نام مس، تیکن تھا۔ وہ ابھی ناکل تھا۔

ان تینوں کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ اور زندگی کے دن مزے سے کٹ رہے تھے۔ مسنوسٹف کے خدوخال موٹاپے کی وجہ سے بھدے پڑ گئے تھے۔ اس کی بانیں کندھے اور کوہنے بھاری معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اس ادھیر عمر میں بھی وہ بن سنور کر رہتی تھی۔ وہ نیلا لباس صرف اس لیے پہنتی تھی کہ اس کی آنکھوں کی چک نمایاں ہو اور بناوی طریقوں سے اس نے اپنے بالوں کی خوبصورتی بھی قائم رکھی تھی۔ اسے مسنر چمیں اور مس، ہیکن اس لیے پسند تھیں کہ وہ دونوں اس کی نسبت موٹی تھیں۔ اور چونکہ وہ عمر میں بھی ان سے قادرے چھوٹی تھی اس لیے وہ اسے اپنی بچی کی طرح خیال کرتی۔ یہ کوئی ناپسندیدہ بات نہ تھی۔ وہ دونوں خوش طبیعت تھیں۔ اکثر تفریح اس کے ہونے والے میگنیٹ کا ذکر چھیڑ دیتیں۔ وہ خود تو اس عشق و محبت کی الجھن سے کسوں دور تھیں۔ لیکن اس معاملے میں انھیں مسنوسٹف سے پوری ہمدردی تھی۔ انھیں لیقین تھا کہ وہ دونوں ہی میں کوئی نیا گل کھلانے والی ہے۔

وہ اس کے لیے کسی اچھے برکی تلاش میں تھیں۔ کوئی پیش نیافت ایڈ میرل جو گولف بھی کھلنا جانتا ہو یا کوئی ایسار ڈا جو گھر بار کے جنجال سے آزاد ہو۔ بہر حال یہ ضروری تھا کہ اس کی آدمی معقول ہو۔ وہ بڑے غور سے ان کی باتیں سنتی اور دل ہی دل میں ہنس دیتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک بار پھر شادی کا تجربہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن شوہر کے انتخاب میں اس کا مزاج مختلف تھا۔ اسے کسی سیاہ رنگ چھریرے بدن کے اطالوی کی چاہت تھی، جس کی آنکھیں حد رجہ چمکیلی ہوں یا کوئی ہسپانوی جو اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہو اور اس کی عمر کسی صورت میں تیس برس سے ایک دن بھی زیادہ نہ ہو۔

یہ تھے ہے کہ تینوں ایک دوسری پر جان دیتی تھیں اور ان کی آپس میں محبت کی وجہ صرف موٹاپا تھا۔ اور متواتر اکٹھے برج کھینے سے دوستی اور گھری ہو گئی تھی۔ ان کی پہلی ملاقات کر بسا دیں ہوئی، جہاں یہ ایک ہی ہوٹل میں ٹھہری تھیں اور ایک ڈاکٹر کے زیر علاج تھیں۔ مسنر چمیں خوش شکل بھی تھی۔ اس کی نیسلی آنکھیں، کھر درے گال اور رنگین ہونٹ بہت ہی دلفریب اور دلکش تھے۔ اسے ہر وقت کھانے پینے کی فکر رہتی۔ مکھن، بالائی، آلو اور چربی می پڑنگ اس کا ممن بھاتا کھانا تھا۔ وہ سال میں گیارہ مہینے تو جی بھر کر کافی کھاتی اور پھر علاج کے ذریعے دلی ہونے کے لیے ایک مہینہ کر بسا دلی جاتی۔ وہ دن بہ دن پھولتی جا رہی تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اگر اسے من مرضی کی خواراک کھانے کونہ ملے تو زندگی بے کار ہے۔ مگر اس کے ڈاکٹروں کو اس بات سے اتفاق نہ تھا۔

مسنر چمیں کا خیال تھا کہ ڈاکٹر کچھ ایسا قابل نہیں ورنہ کیا عجب تھا کہ وہ ذرا دلبی ہو جاتی۔ اس نے مس، ہیکن سے اس بات کا ذکر کیا۔ وہ بس ایک قہقہہ لگا کر خاموشی ہو گئی۔ اس کی آواز بہت گھری تھی اور چپٹا سا چہرہ! اس کی دونوں آنکھوں میں بلی کی آنکھوں ایسی چک تھی۔ اسے مردانہ پوشک زیادہ پسند تھی اور صرف اس کی خوش مزاجی کی وجہ سے تینوں سہلیاں ایک دوسری سے بہت قریب ہو گئی تھیں۔ وہ تینوں

ایک ہی وقت پر کھانا کھاتیں، اکٹھی سیر کو جاتیں اور ٹینس کھلنے کے وقت بھی ایک دوسری سے کبھی جدا نہ ہوتیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنا وزن کرتیں تو اپنے موٹاپے میں کوئی فرق نہ پا کر ادا سی ہو جاتیں۔

مس، تیکن کو یہ بات بہت ہی ناگوار گزری کہ بیرس رچمین طبی علاج سے اپنا وزن بیس پاؤند گھٹا کر بد پر ہیزی کی وجہ سے دنوں میں پھرا سی طرح موٹی ہو جائے اور اس کے کہنے پر تینوں کربساد چھوڑ کر چند ہفتوں کے لیے کہیں اور چلی جائیں۔ بیرس کمزور طبیعت تھی اور اسے ایک ایسے انسان کی ضرورت تھی جو اسے بد اعتدالی سے بچاسکے۔ اسے یقین تھا کہ اب اسے درزش کرنے کا خوب موقع ملے گا۔ نہ صرف یہی بلکہ وہاں گھر میں اپنی باورچن رکھ لینے سے اسے چربی ملی چیزیں کھانے سے نجات مل جائے گی۔ اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ان سب کا وزن دنوں میں کم ہو جائے۔ مسز سٹلف اپنے گھر میں انوکھے ارادے باندھ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہاں دنوں میں اس کارنگ نکھر جائے گا۔ اور اپنے لیے کوئی چھیلا بانکا اطالوی فرانسیسی یا انگریز تلاش کرے گی۔ وہ تینوں ہفتے میں صرف دو دن ابلے ہوئے انڈے اور ٹماٹر کھاتیں اور ہر صبح اٹھ کر اپنا وزن کرتیں۔ مسز سٹلف کا وزن ابھی صرف ۵۲ اپونڈرہ گیا اور وہ تو گویا اپنے آپ کو ایک جواں سال لڑکی سمجھنے لگی۔ مس، تیکن اور مسز رچمین کے موٹاپے میں بھی کافی فرق پڑ گیا۔ وہ تینوں مطمئن نظر آتی تھیں۔ لیکن برج کھلنے کے لیے ایک چوتھے کھلاڑی کی ضرورت نے انھیں ایک حد تک پریشان سا کر دیا۔

وہ صبح سویرے ڈھیلے ڈھالے پاجامے پہنے چوتھے پر بیٹھی دودھ میں کھانڈ ملائے بغیر چائے پی رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ڈاکٹر برٹ کے تیار کیے ہوئے بسٹ بھی کھارہی تھیں، جن کے متعلق یہ گارٹی دی گئی تھی کہ وہ چربی سے بالکل پاک ہیں۔ ناشتے کے وقت مس، تیکن نے اتفاقاً لینا کا ذکر کیا۔

”وہ کون ہے؟“ مسز سٹلف نے پوچھا۔

”وہ میرے اس پچیرے بھائی کی بیوی ہے، جس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ وہ گز شستہ دنوں اعصاب شکنی کا شکار رہی۔ کیوں نہ اسے دو ہفتے کے لیے یہاں بلا لیں؟“

”کیا وہ برج کھلنا جانتی ہے---؟“

”کیوں نہیں۔۔۔ اس کے یہاں آنے سے کسی دوسرے کی ضرورت بھی نہ رہے گی۔“ بات طے ہو گئی۔۔۔ لینا کو بلاں کے لیے تار بھیجا گیا اور وہ تیرے دن آپنچی۔۔۔ مس، ہیکن اسے اسٹیشن پر لینے گئی۔ شوہر کی موت کی وجہ سے لینا کے چہرے پر غم کے آثار نمایاں تھے۔ مس، ہیکن نے اسے دو سال سے نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے بڑی گرم جوشی سے اس کا منہ چوم لیا۔۔۔ ”تم بہت دلی ہو۔“ اس نے کہا۔

لینا مسکرا دی۔

”گزشتہ دنوں میری طبیعت علیل رہی۔ اور اب تو وزن بھی بہت کم ہو گیا ہے۔“

مس، ہیکن نے ایک سرد آہ بھری، لیکن یہ ظاہرنہ ہو سکا کہ اس کی وجہ رشک تھی یا لینا سے ہمدردی۔ وہ اسے ایک پرفضا ہو ٹل میں لے گئی۔ جہاں دونوں سہیلیوں سے اس کا تعارف کرایا گیا۔ اس کی بیکسی دیکھ کر مسز رچمن کا دل بھر آیا اور اس کے چہرے کی زردی نے مسز ستلف کو بھی بہت متاثر کیا۔ ہو ٹل میں تھوڑی دیر تفریح کے بعد وہ لمحے کے لیے اپنی قیام گاہ کو چل دیں۔

”مجھے کچھ روٹی چاہیے۔“

لينا کے یہ الفاظ سہیلیوں کے کانوں پر بہت گراں گزرے۔ وہ تو دس سال ہوئے اسے چھوڑ چکی تھیں حالانکہ مسز رچمن ایسی لاچی عورت بھی روٹی سے پرہیز کرتی تھی۔ مسز، ہیکن نے ازراہ مہمان نوازی خانسماں سے کہا کہ فوراً حکم کی تعییل کرے۔

”تمھوڑا کھن بن بھی۔۔۔“

کسی غیر مریٰ قوت نے ایک لمحے کے لیے ان سب کے ہونٹ سی دیے۔

”غالباً گھر میں مکھن موجود نہیں، ابھی خانسماں سے پوچھتی ہوں۔“ مس، ہیکن نے کسی قدر توقف سے جواب دیا۔ ”مکھن روٹی بہت پسند ہے۔“ لینا نے مسز رچمن سے مخاطب ہو کر کہا اور خانسماں سے روٹی لے کر بڑے اطمینان سے اس پر مکھن لگایا۔۔۔ مس، ہیکن بولی، ”ہم یہاں بہت سادہ غذا کھائے ہیں، تمہیں بھی غالباً کوئی اعتراض نہ ہو گا۔“

”نبیں تو، میں بھی سادہ غذا کی عادی ہوں۔“ لینا نے مجھلی کے ٹکڑے پر مکسن لگاتے ہوئے کہا، ”مجھے جب تک مکسن، روٹی آلو اور بالائی ملتی رہے، بہت مطمئن رہتی ہوں۔“

”افسوس کہ یہاں کہیں بالائی نہیں ملتی۔“ مسز رچمین نے کہا۔

”اوہ---“ لینا بولی۔

لنج پر بغیر چربی کے کباب پختے گئے۔ اس کے علاوہ پالک تھی اور دم بخت ناشپاتیاں بھی۔ ناشپاتی کھاتے ہی لینا نے مجس نظر وں سے خانسامان کی طرف دیکھا اور اشارہ پاتے ہی خانسامان کھانڈ لے کر حاضر ہو گیا۔ اس نے اپنی قہوہ کی پیالی میں تین چھپ کھانڈ ڈال دی۔

”تمہیں کھانڈ بہت پسند ہے۔“ مسز ستلف نے کہا۔

”ہمیں تو سکرین زیادہ مرغوب ہے۔“ مس، ہیکن نے ایک ٹکریہ اپنی پیالی میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”یہ تو ایک بے لذت شے ہے۔“ لینا نے جواب دیا۔

مسز رچمین منہ بناؤ اور لچائی ہوئی نظر وں سے کھانڈ کی طرف دیکھنے لگی۔ مس، ہیکن نے اسے زور سے پکارا اور ایک سرد آہ بھر کر اس نے بھی مجبور آسکرین کی ٹکریہ اٹھالی۔

لنج سے فارغ ہونے کے بعد وہ برج کھیلنے لگیں۔ لینا خوب کھیلی۔ سب نے کھیل کا لطف اٹھایا۔ مسز ستلف اور مسز رچمین کے دل میں معزز مہماں کے لیے گہری ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ مس، ہیکن کے دل کی مراد بھی برآئی۔ اور وہ یہی تو چاہتی تھی کہ لینا ان کے ساتھ دوستتے خوشی سے بس رکرے۔ چند ساعت بعد مس، ہیکن اور مسز رچمین گاف کھیلنے چلی گئیں اور مسز ستلف ایک جوان سال، خوش شکل پر نس روکا میر کے ساتھ سیر کو نکل گئی۔ لینا کچھ دیرستانے کے خیال سے لیٹ گئی۔ ڈنر سے تھوڑا سا وقت پہلے سب لوٹ آئیں۔

”لینا پیاری کہو وقت کیسے گزر۔“ مس، ہیکن نے کہا، ”گاف کھیلتے وقت دھیان تمہاری ہی طرف تھا۔“

”اوہ میں تو بڑے مزے سے بستر پر ہی پڑی رہی اور جا کر کاک ٹیل بھی پی اور سنو۔ آج ایک چھوٹا سا قہوہ خانہ خیری نظر پڑا۔ جہاں بڑی اچھی بالائی بھی مل سکتی ہے۔ میں نے روزانہ مکان پر بالائی منگوانے کا انتظام کر لیا ہے۔“

اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور اسے یقین تھا کہ وہ تینوں اس کی بات کو سراہیں گی۔

”تم کتنی اچھی ہو، لینا“ مس، ہیکن نے کہا۔ ”لیکن افسوس کہ ہمیں بالائی پسند نہیں۔ ایسی آب و ہوا میں یہ ہمیں راس نہیں آ سکتی۔“

”نہ سہی، میں جو سلامت ہوں۔“ لینا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمھیں کیا اپنی شکل و صورت کی کوئی پرواہ نہیں۔“ مسز ستاف نے منہ بنا کر کہا۔

”مجھے تو ڈاکٹر نے بالائی کھانے کو کہا ہے۔“

”کیا اس نے مکھن، روٹی، آلو اور چاروں ہی چیزیں تجویز کی ہیں؟۔“

”بے شک، تمہاری سادی غذا سے میں یہی مراد لیتی ہوں۔“

”تم یقیناً بہت موٹی ہو جاؤ گی۔“

لینا کھلا کر ہنس دی۔ رات کو اس کے سو جانے پر دیر تک تینوں نکتہ چینی کرتی رہیں۔ آج شام ان کی طبیعت کتنی شگفتہ تھی لیکن اب مسز رچمیں ییزار سی نظر آنے لگی۔ مسز ستاف الگ جلی بیٹھی تھی۔ اور مس، ہیکن کا مزانج بھی برہم ہو چکا تھا۔

”میں قطعاً برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ میرا من بھاتا کھانا میری آنکھوں کے سامنے بیٹھ کر اڑائے۔“ مسز رچمیں نے ذرا تلخی سے کہا۔
”یہ تو کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔“ مس، ہیکن نے جواب دیا۔

”آخر تم نے اسے یہاں بلا یا ہی کیوں---؟“

”مجھے اس بات کی کیا خبر تھی۔“

”اگر اس کے دل میں اپنے مر حوم شوہر کا ذرا بھی خیال ہوتا تو وہ بھی پیٹ بھر کرنے کھاتی۔۔۔ اسے فوت ہوئے ابھی دو مہینے تو گزرے ہیں۔“

”عجیب مہمان ہے کہ اسے ہماری مرضی کا کھانا ہی پسند نہیں۔“

”سن، وہ کل کیا کہہ رہی تھی اسے ڈاکٹرنے مکھن روٹی، آلو اور بالائی کھانے کو کہا ہے۔“

”اسے تو پھر کسی سینوٹوریم کا رخ کرنا چاہیے۔“

”وہ مہمان ہے تو تمہاری۔ ہمارا تو اس سے کوئی رشتہ نہیں۔ میں تو متواتر دو ہفتے تک اس پیٹ کا تماشا دیکھتی رہی ہوں گی۔“

”صرف کھانے پینے کو زندگی کا مقصد سمجھ لینا بڑی بے ہودگی ہے۔“

”تم کیا مجھے بیہودہ پکار رہی ہو۔“ مسز سٹلف نے کہا۔

”آپس میں بد گمانی سے فائدہ---؟“ مسز رچین نے بات کاٹ کر کہا۔

”میں ہر گز برداشت نہیں کر سکتی کہ تم ہمارے سوتے میں باورچی خانہ میں گھس کر کھاتی پیتی رہو۔“

ان الفاظ نے مس، ہیکن کے تن بدن میں ایک آگ لگادی۔ وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

”مسز سٹاف اپنی زبان سن جالو۔ تم کیا مجھے اتنا ہی کمینہ خیال کرتی ہو۔“

”آخر تمہارا وزن کیوں نہیں کم ہوتا؟“

”بالکل غلط، میرا تو سیر و وزن کم ہو گیا ہے۔“ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک ٹپک کر چھانی پر گرنے لگے۔

”پیاری تم میرا مطلب نہیں سمجھیں۔۔۔“ یہ کہہ کر مسز سٹاف گھٹنوں کے بل جھکی اور اس کے جسم کو اپنی آنکھوں میں لینے کی کوشش کی۔ اس کا بھی دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہو گئی۔

”تو کیا میں دلبی دکھائی نہیں دیتی۔“ مس تیکن نے ہمچلی لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں بے شک۔۔۔“ مستزر سٹاف نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

مسز رچمین بھی جو فطرت تانہایت کمزور طبیعت واقع ہوئی تھی، اب رونے لگی۔ یہ منظر بہت رقت خیز تھا۔ مس تیکن ایسی عورت کو آنسو بھاتے دیکھ کر سگ دل انسان بھی موم ہو جاتا۔ بالآخر انھوں نے اپنے آنسو پوچھے اور ایک نے بر اندھی اور پانی کے چند گھونٹ پیے۔ وہ اب اس بات پر متفق تھیں کہ لینا ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اپنی من مرضی کی غذا کھائے۔ آخر وہ ان کی مہمان ٹھہری۔ ان کا فرض تھا کہ ہر طرح اس کا کلیجہ ٹھنڈا کریں۔ انھوں نے ایک دوسری کا گرم جوشی سے منہ چوما اور اپنی اپنی خوارگا ہوں میں چلی گئیں۔

یہ تھے کہ انسانی فطرت بہت کمزور ہے اور اس پر کسی کا کوئی اختیار نہیں۔ غذا کے معاملے میں اب ہر ایک اپنی مرضی کی مالک تھی۔ انھوں نے مچھلی کے کباب شروع کیے تو لینا کی سویاں مکصن اور پنیر پر بسر ہونے لگی۔ وہ ہفتے میں دوبار ابلے ہوئے انڈے اور کچے ٹماٹر کھاتیں۔ لینا مظر کے دانے بالائی میں ملا کر کھاتی۔ اسے اب ٹماٹر کو مختلف مصالوں میں پکا کر کھانے کا شوق چرایا تھا۔ اس کا خانسماں بھی بڑا بامداد تھا۔ وہ ہر بار ایک بہتر چیز تیار کر کے میز پر چین دیتا۔ لینا نے ایک موقع پر یہ بھی کہا کہ ڈاکٹر نے اسے لنج پر بر گندی کی ار غوانی شراب اور ڈنر پر

شمپسِن استعمال کرنے کو کہا ہے۔ ان الفاظ نے تینوں سہلیوں کو دم خود کر دیا۔ وہ ابھی ابھی ہنس کھیل رہی تھیں لیکن یاکیک کیفیت بدل گئی۔

مسزِ چمین کا تو گویارنگ زرد پڑ گیا۔ مسزِ ستلف کی نیلی آنکھوں میں ایک خوفناک سی چمک پیدا ہو گئی۔ اور مس، ہیکن کی آواز بھر اگئی۔ برج کھلیتے وقت وہ بڑے نرم لمحے میں ایک دوسرے سے بات کیا کرتی۔ لیکن اب بات بات پر گڑنے لگیں۔ لینا نے انھیں بہتیرا سمجھایا جھایا کہ کھیل کے وقت آپس میں تکرار مناسب نہیں۔ لیکن بے سود۔ وہ خوش تھی کہ کھیل میں شروع ہی سے اس کا پلہ بھاری رہا ہے۔ اور دنوں میں اس نے ایک بڑی رقم جیت لی ہے۔ تینوں موٹی سہلیوں کو اب ایک دوسری سے نفرت ہونے لگی۔ وہ اپنے مہمان سے بھی بد ظن ہو چکی تھیں۔ اس کے باوجود اکثر ایک دوسری کے خلاف کان بھر تیں۔ لینا کے سامنے وہ ایک دوسری سے ظاہر اُملتی رہیں، لیکن پھر یہ بات بھی نہ رہی۔ وہ ایک دوسری سے بہت ماہیوس ہو چکی تھیں۔ مس، ہیکن لینا کو رخصت کرنے اسٹیشن پر گئی۔ گاڑی پر سوار ہوتے وقت وہ بولی، ”میرے پاس الفاظ نہیں کہ تمہاری مہمان نوازی کا شکر یہ ادا کر سکوں۔۔۔“

”تمہاری صحبت بہت پر اطف رہی۔۔۔“ مس، ہیکن نے جواب دیا۔

جب گاڑی روانہ ہوئی تو اس نے اس زور سے آہ بھری کہ پلیٹ فارم اس کے پاؤں کے نیچے کا نپ کا نپ گیا۔ اور وہ ”اف اُف“ کا شور بلند کرتی گھر لوٹی۔

اس نے غسل کرنے کا لباس پہنا اور ہوٹل کی طرف آنکلی۔ ایک ایکی وہ مچل سی گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مسزِ چمین نیا پائچا مہ اور گلے میں موتویں کی مالا پہنے، بناؤ سنگھار کیے بیٹھی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھی۔

”کیا کر رہی ہو؟“ اس کے یہ الفاظ دو پہاڑوں میں بادل کی گرج کی طرح سنائی دیے۔

”کچھ کھا رہی ہوں۔“

اس کے سامنے مکھن، سیب کا مر悲ہ اور بالائی وغیرہ چنے ہوئے تھے، وہ گرم روٹی پر مکھن کی موٹی تجہما کراں پر مر悲ہ اور بالائی ڈال رہی تھی۔

”تم کھانے کی لائچ میں اپنی جان دے دو گی۔“

”کوئی پرداز نہیں۔“ مسز رچمین نے ایک بڑا قلمہ چباتے ہوئے کہا۔

”تم اور بھی موٹی ہو جاؤ گی۔“

بس خاموش، اس نابکار کو خدا سمجھے جسے میں متواتر دو ہفتے سے حلق میں رنگارنگ کے نواں ٹھونستے دیکھتی رہی ہوں۔ ایک انسان تو اتنا ہضم نہیں کر سکتا۔“

مس، تیکن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بالکل بے جان سی ہو گئی۔ اسے اس وقت شاید ایک مضبوط مرد کی ضرورت تھی جو اسے گھٹنے پر گا کر پچکارے۔ وہ خاموشی سے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔ خادم حاضر ہوا۔ اور اس نے قہوے کی طرف اشارہ کر کے اسے لانے کو کہا۔ وہ ہاتھ بڑھا کر کریم روں اٹھانے لگی۔ لیکن مسز رچمین نے رکابی ایک طرف رکھ دی۔ مس، تیکن جل بھن گئی اور اسے ایک ایسے نام سے مخاطب کیا جو خاص طور پر عورتوں کے شایان شان نہ تھا۔۔۔ اتنے میں خادم اس کے لیے مکھن، مرہب اور قہوہ لیے آیا۔

”پگلے بالائی لانا بھول گیا۔“۔۔۔ وہ شیرنی کی طرح بچھر کر بولی۔

اس نے کھانا شروع کیا اور حلق میں مکھن، مرہب ٹھونسنے لگی۔ ہوٹل میں اب رنگارنگ کے انسانوں کی چہل پہل نظر آنے لگی۔ مسز ستلف بھی پرنس روکامیر کے ساتھ چہل قدی کرتی ادھر آنگلی۔ وہ پہلے اپنے گرد ایک ریشمی لبادہ مضبوطی سے لپیٹے ہوئی تھی تاکہ اس طرح وہ کچھ دبی دکھائی دے۔ اپنی ٹھوڑی کا نقش چھپانے کے لیے اس نے سر کو اوپر اٹھایا ہوا تھا۔ وہ بہت مسرور تھی۔۔۔ ایک دوشیزہ کی طرح۔ پرنس اس سے اجازت لے کر پانچ منٹ کے لیے مردانہ کمرے میں اپنے بال سنوارنے لیا اور وہ بھی اپنے رخساروں کو غازہ سے چکانے کے لیے زنانہ کمرے کی طرف آئی۔ ایک ایکی اس کی نظر اپنی دونوں سہلیوں پر پڑی۔ وہ رک گئی۔

”تم پیٹھو جیوان۔۔۔“

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور خادم کو آواز دی۔ اس کے ذہن سے اب پرنس کا خیال بھی اتر پکا تھا۔ آنکھ جھکتے میں خادم حاضر ہو گیا۔

”میرے کھانے کو بھی بھی لاؤ۔“

”اور میرے لیے سویاں۔۔۔“

”مس، ہیکن!۔۔۔“ مسز رچین پکارا تھی۔

”بس خاموش۔۔۔“

”تو میں بھی بھی کھاؤں گی۔“

قہوہ لایا گیا اور کریم روپ اور بالائی بھی۔ وہ گرم روٹی پر بالائی تہ جما کر کھانے لگیں۔ مر بے کے بڑے چچے حلق میں ٹھونس لیے۔ وہ گویا ایک خاص اہتمام سے کھاری تھیں۔

ایسے موقع پر مسز ستاف کے لیے پرنس سے لگاؤ ایک بے معنی بات تھی۔

”میں نے پچیس سال سے آلو نہیں کھائے۔“ مس، ہیکن نے دھیمی آواز میں کہا۔

مسز رچین نے فوراً خادم کو تینوں کے لیے بھنے ہوئے آلو لانے کو کہا۔

ایک لمحہ کے بعد بھنے ہوئے آلو ان کے سامنے تھے اور وہ بڑے پٹخارے لے کر کھانے لگیں۔ تینوں سہیلیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سرد آہیں بھرنے لگیں۔ اب ان کے درمیان غلط فہمی رفع ہو چکی تھی اور دلوں میں انتہائی محبت کا جذبہ موجز تھا۔ انھیں یقین نہ آتا تھا کہ آج سے پہلے وہ ایک دوسرے سے قطع تعلق پر آمادہ ہو چکی تھیں۔ آلواب ختم ہو چکے تھے۔

”ہوٹل میں چاکلیٹ تو ضرور ہونگے۔“ مسز رچمین نے کہا۔

”کیوں نہیں۔“

ایک لمحہ بعد مس، لیکن اپنا منہ کھو لے حلق میں چاکلیٹ ٹھونس رہی تھی۔ اس نے دوسرے پر ہاتھ ڈالا اور منہ میں ڈالنے سے پہلے دونوں سہیلوں کی طرف نظر اٹھائے ناکار لینا کو کوئے لگی۔

”تم جو چاہو کھو لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ برج کھینا نہیں جانتی۔“

”بے شک۔“ مسز ستاف نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

مسز رچمین کا ذہن اس وقت کسی لذیذ کیک کی فکر میں تھا۔

-[90]-

ڈاکٹر شروڈر: سعادت حسن منٹو

بمبئی میں ڈاکٹر شروڈر کا بہت نام تھا، اس لیے کہ عورتوں کے امراض کا بہترین معانج تھا۔ اس کے ہاتھ میں شفا تھی۔ اس کا شفاخانہ بہت بڑا تھا۔ ایک عالی شان عمارت کی دو منزلوں میں، جن میں کئی کمرے تھے۔ نیچی منزل کے کمرے متوسط اور نیچے طبقے کی عورتوں کے لیے مخصوص تھے۔ بالائی منزل کے کمرے امیر عورتوں کے لیے۔ ایک لیبارٹری تھی۔ اس کے ساتھ ہی کمپاؤنڈ رکا کمرہ۔ ایکس رے کا کمرہ علیحدہ تھا۔ اس کی ماہانہ آمدی ڈھائی تین ہزار کے قریب ہوگی۔ مریض عورتوں کے کھانے کا انتظام بہت اچھا تھا جو اس نے ایک پارسن کے سپرد کر رکھا تھا، جو اس کے ایک دوست کی بیوی تھی۔

ڈاکٹر شروڈر کا یہ چھوٹا سا ہسپتال میٹر نٹی ہوم بھی تھا۔۔۔ بمبئی کی آبادی کے متعلق آپ اندازہ لگاسکتے ہیں کتنی ہوگی۔ وہاں بے شمار سرکاری ہسپتال اور میٹر نٹی ہوم ہیں لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر شروڈر کا کلینیک بھرا رہتا۔ بعض اوقات تو اسے کئی کیسوں کو مایوس کرنا پڑتا، اس لیے

کہ کوئی بیڈ خالی نہیں رہتا تھا۔ اس پر لوگوں کو اعتماد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی بیویاں اور جوان لڑکیاں اس کے ہسپتال میں چھوڑ آتے تھے جہاں ان کا بڑی توجہ سے علاج کیا جاتا تھا۔

ڈاکٹر شرود کے ہسپتال میں دس بارہ نر سین تھیں۔ یہ سب کی سب معنی اور پر خلوص تھیں۔ مریض عورتوں کی بہت اچھی طرح دیکھ بھال کرتیں۔ ان نرسوں کا انتخاب ڈاکٹر شرود کرنے بڑی چھان بین کے بعد کیا تھا۔ وہ بڑی اور بحدی شکل کی کوئی نر س اپنے ہسپتال میں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔

ایک مرتبہ چار نرسوں نے دفعتہ شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو ڈاکٹر بہت پریشان ہوا۔ یہ چاروں چلی گئیں۔ اس نے مختلف اخباروں میں اشتہار دیے کہ اسے نرسوں کی ضرورت ہے۔ کئی آئیں، ڈاکٹر شرود کرنے ان سے انٹروپوکیا مگر اسے ان میں کسی کی شکل پسند نہ آئی۔

کسی کا چہرہ ٹیڑھامیڑھا، کسی کا قد اگشنا نے بھر کا، کسی کارنگ خوفناک طور پر کالا، کسی کی ناک گز بھر لبی۔ لیکن وہ بھی اپنی ہٹ کا پکا تھا۔ اس نے اور اشتہار اخباروں میں دیے اور آخر اس نے چار خوش شکل اور نفاست پسند نر سین چن ہی لیں۔

اب وہ مطمئن تھا، چنانچہ اس نے پھر د الجمی سے کام شروع کر دیا۔ مریض عورتیں بھی خوش ہو گئیں۔ اس لیے کہ چار نرسوں کے چلے جانے سے ان کی خبر گیری اچھی طرح نہیں ہو رہی تھی۔ یہ نر سین بھی خوش تھیں کہ ڈاکٹر شرود کران سے بڑی شفقت سے پیش آتا تھا۔ انھیں وقت پر تxonah ملتی تھی۔ دوپھر کا کھانا ہسپتال ہی انھیں مہیا کرتا۔ وردی بھی ہسپتال کے ذمے تھی۔

ڈاکٹر شرود کی آمد نی چونکہ بہت زیادہ تھی اس لیے وہ ان چھوٹے موٹے اخراجات سے گھبرا تا نہیں تھا۔ شروع شروع میں جب اس نے سرکاری ہسپتال کی ملازمت چھوڑ کر خود اپنا ہسپتال قائم کیا تو اس نے تھوڑی بہت کنجوں کی، مگر بہت جلد اس نے کھل کر خرچ کرنا شروع کر دیا۔

اس کا ارادہ تھا کہ شادی کر لے۔ مگر اسے ہسپتال سے ایک لمحے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔۔۔ دن رات اس کو وہیں رہنا پڑتا۔ بالائی منزل میں اس نے ایک چھوٹا سا کمرہ اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا جس میں رات کو چند گھنٹے سو جاتا۔ لیکن اکثر اسے جگادیا جاتا، جب کسی مریض عورت کو اس کی فوری توجہ کی ضرورت ہوتی۔ تمام نرسوں کو اس سے ہمدردی تھی کہ اس نے اپنی نیند، اپنا آرام حرام کر رکھا ہے۔ وہ اکثر اس سے کہتیں، ”ڈاکٹر صاحب آپ کوئی اسٹینٹ کیوں نہیں رکھ لیتے؟“

ڈاکٹر شروڈ کر جواب دیتا، ”جب کوئی قابل ملے گا تو رکھ لوں گا۔“

وہ کہتیں، ”آپ تو اپنی قابلیت کا چاہتے ہیں۔ بھلا وہ کہاں سے ملے گا۔“

”مل جائے گا۔“

نر سیں یہ سن کر خاموش ہو جاتیں اور الگ آپس میں باتیں کرتیں، ”ڈاکٹر شروڈ کراپنی صحت خراب کر رہے ہیں ایک دن کہیں کو لیپس نہ ہو جائے۔“

”ہاں ان کی صحت کافی گرچکی ہے۔۔۔ وزن بھی کم ہو گیا ہے۔“

”کھاتے پینے بھی بہت کم ہیں۔“

”ہر وقت مصروف جو رہتے ہیں۔“

”اب انھیں کون سمجھائے۔“

قریب قریب ہر روز ان کے درمیان اسی قسم کی باتیں ہوتیں۔ ان کو ڈاکٹر سے اس لیے بھی بہت زیادہ ہمدردی تھی کہ وہ بہت شریف نفس انسان تھا۔۔۔ اس کے ہسپتال میں سیکڑوں خوبصورت اور جوان عورتیں علاج کے لیے آتی تھیں مگر اس نے کبھی ان کو بری نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا، وہ بس اپنے کام میں ملکن رہتا۔ اصل میں اسے اپنے پیشے سے ایک قدم کا عشق تھا۔۔۔ وہ اس طرح علاج کرتا تھا جس طرح کوئی شفقت اور پیار کا ہاتھ کسی کے سر پر پھیرے۔

جب وہ سرکاری ہسپتال میں ملازم تھا تو اس کے آپریشن کرنے کے عمل کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ نشر نہیں چلاتا برش سے تصویریں بناتا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اس کے کیسے ہوئے آپریشن نوے فیصد کامیاب رہتے تھے۔ اس کو اس فن میں مہارت تام حاصل تھی۔ اس کے علاوہ خود اعتمادی بھی تھی جو اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز تھی۔

ایک دن وہ ایک عورت کا، جس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی، بڑے غور سے معائنة کر کے باہر نکلا اور اپنے دفتر میں گیا تو اس نے دیکھا کہ ایک بڑی حسین لڑکی بیٹھی ہے۔ ڈاکٹر شروع کر ایک لمحے کے لیے ٹھنک گیا۔ اس نے نسوانی حسن کا ایسا نادر نمونہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

وہ اندر داخل ہوا، لڑکی نے کرسی پر سے اٹھنا چاہا۔ ڈاکٹر نے اس سے کہا، ”بیٹھو بیٹھو۔“ اور یہ کہہ کر وہ اپنی گھونمنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر ویٹ پکڑ کر اس کے اندر ہوا کے بلبلوں کو دیکھتے ہوئے اس لڑکی سے مخاطب ہوا، ” بتاؤ تم کیسے آئیں؟“

لڑکی نے آنکھیں جھکا کر کہا، ”ایک پرائیویٹ، بہت ہی پرائیویٹ بات ہے جو میں آپ سے کرنا چاہتی ہوں۔“

ڈاکٹر شروع کرنے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی جھکی ہوئی آنکھیں بھی بلا کی خوبصورت دکھائی دے رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے اس سے پوچھا، ”پرائیویٹ بات تم کر لینا۔۔۔ پہلے اپنا نام بتاؤ۔“

لڑکی نے جواب دیا، ”میں۔۔۔ میں اپنا نام بتانا نہیں چاہتی۔“

ڈاکٹر کی لچپسی اس جواب سے بڑھ گئی، ”کہاں رہتی ہو؟“

”شو لاپور میں۔۔۔ آج ہی یہاں پہنچی ہوں۔“

ڈاکٹر نے پھر ویٹ میز پر رکھ دیا، ”اتنی دور سے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟“

لڑکی نے جواب دیا، ”میں نے کہا ہے ناکہ مجھے آپ سے ایک پرائیویٹ بات کرنی ہے۔“

اتئے میں ایک نر س اندر داخل ہوئی۔ لڑکی گھبرائی۔ ڈاکٹر نے اس نر س کو چند ہدایات دیں جو وہ پوچھنے آئی تھی اور اس سے کہا، ”اب تم جاسکتی ہو۔۔۔ کسی نو کرسے کہہ دو کہ وہ کمرے کے باہر کھڑا رہے اور کسی کو اندر نہ آنے دے۔“

نر س ”جی اچھا“ کہہ کر چلی گئی۔ ڈاکٹر نے دروازہ بند کر دیا اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر اس حسین لڑکی سے مخاطب ہوا، ”اب تم اپنی پرائیویٹ بات مجھے بتا سکتی ہو۔“

شولا پور کی لڑکی شدید گھبر اہٹ اور الجھن محسوس کر رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر لفظ آتے مگر واپس اس کے حلق کے اندر چلے جاتے۔ آخر اس نے ہمت اور جرأت سے کام لیا اور رک رک کر صرف اتنا کہا، ”مجھ سے۔۔۔ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔۔۔ میں بہت گھبر ارہی ہوں۔“

ڈاکٹر شروڈ کر سمجھ گیا، لیکن پھر بھی اس نے اس لڑکی سے کہا، ”غلطیاں انسان سے ہو ہی جاتی ہیں، تم سے کیا غلطی ہوئی ہے؟“

لڑکی نے تھوڑے وقٹے کے بعد جواب دیا، ”وہی۔۔۔ وہی جو بے سمجھ جوان لڑکیوں سے ہو اکرتی ہیں۔“

ڈاکٹر نے کہا، ”میں سمجھ گیا۔۔۔ لیکن اب تم کیا چاہتی ہو؟“

لڑکی فوراً اپنے مقصد کی طرف آگئی، ”میں چاہتی ہوں کہ وہ ضائع ہو جائے۔۔۔ صرف ایک مہینہ ہوا ہے۔“

ڈاکٹر شروڈ کرنے کچھ دیر سوچا، پھر بڑی سنجیدگی سے کہا، ”یہ جرم ہے۔ تم جانتی نہیں ہو؟“

لڑکی کی بھوری آنکھوں میں یہ موٹے موٹے آنسو مڈ آئے، ”تو میں زہر کھالوں گی۔“

یہ کہہ کر اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔۔۔ ڈاکٹر کو اس پر بڑا ترس آیا۔ وہ اپنی جوانی کی پہلی لغزش کر چکی تھی۔ پتا نہیں وہ کیا لمحات تھے کہ اس نے اپنی عصمت کسی مرد کے حوالے کر دی اور اب پچھتار ہی ہے اور اتنی پریشان ہو رہی ہے۔ اس کے پاس اس سے پہلے کئی ایسے کیس آچکے تھے مگر اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ جیو ہتھیا نہیں کر سکتا۔ یہ بہت بڑا گناہ اور جرم ہے۔

مگر شولاپور کی اس لڑکی نے اس پر کچھ ایسا جادو کیا کہ وہ اس کی خاطر یہ جرم کرنے پر تیار ہو گیا۔ اس نے اس کے لیے ایک علیحدہ کمرہ مختص کر دیا۔ کسی نرس کو اس کے اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس لیے کہ وہ اس لڑکی کے راز کو افشا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اسقطاً بہت ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔۔۔ جب اس نے دوائیں وغیرہ دے کر یہ کام کر دیا تو شولاپور کی وہ مرہٹہ لڑکی جس نے آخر اپنام بتا دیا تھا، بے ہوش میں آئی تو نقاہت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے پانی بھی نہیں پی سکتی تھی۔

وہ چاہتی تھی کہ جلد گھر واپس چلی جائے مگر ڈاکٹر سے کیسے اجازت دے سکتا تھا، جب کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہی نہیں تھی۔ اس نے مس لیتیا کھمٹے کر سے (شولاپور کی اس حسینہ کا بیکی نام تھا) کہا، ”تمھیں کم از کم دو مہینے آرام کرنا پڑے گا۔ میں تمہارے باپ کو لکھ دوں گا کہ تم جس سہیلی کے پاس آئی تھیں وہاں اچانک طور پر بیمار ہو گئیں اور اب میرے ہسپتال میں زیر علاج ہو۔ تردید کی کوئی بات نہیں۔“

لیتیا مان گئی۔ دو مہینے ڈاکٹر شروڈ کر کے زیر علاج رہی۔ جب رخصت کا وقت آیا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ گڑبرڑ پھر پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے ڈاکٹر شروڈ کر کو اس سے آگاہ کیا۔

ڈاکٹر مسکرا یا، ”کوئی فکر کی بات نہیں۔۔۔ میں تم سے آج شادی کرنے والا ہوں۔“

-[91]-

سرمه: سعادت حسن منٹو

فهمیدہ کی جب شادی ہوئی تو اس کی عمر انہیں برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کا جیزیر تیار تھا۔ اس لیے اس کے والدین کو کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ پچیس کے قریب جوڑے تھے اور زیورات بھی، لیکن فهمیدہ نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ سرمہ جو خاص طور پر ان کے یہاں آتا ہے، چاندی کی سر مے دانی میں ڈال کر اسے ضرور دیں۔ ساتھ ہی چاندی کا سر چو بھی۔

فہمیدہ کی یہ خواہش فوراً پوری ہو گئی۔ اعظم علی کی دکان سے سرمه مغلوایا۔ برکت کی دکان سے سرمے دانی اور سرچولیا اور اس کے جہیز میں رکھ دیا۔

فہمیدہ کو سرمه بہت پسند تھا۔ وہ اس کو معلوم نہیں، کیوں اتنا پسند تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کارنگ بہت زیادہ گورا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ تھوڑی سی سیاہی بھی اس میں شامل ہو جائے۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے سرمے کا استعمال شروع کر دیا تھا۔

اس کی ماں اس سے اکثر کہتی، ”فہمی! یہ تمھیں کیا خط ہو گیا ہے۔۔۔ جب نہ تب آنکھوں میں سرمه لگاتی رہتی ہو۔۔۔“

فہمیدہ مسکراتی، ”امی جان۔۔۔ اس سے نظر کمزور نہیں ہوتی۔۔۔ آپ نے عینک کب لگوائی تھی؟“

”بارہ برس کی عمر میں“ فہمیدہ منسی۔ ”اگر آپ نے سرمے کا استعمال کیا ہوتا، تو آپ کو کبھی عینک کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ اصل میں ہم لوگ کچھ زیادہ ہی روشن خیال ہو گئے ہیں لیکن روشنی کے بد لے ہمیں اندر ہیرا ہی اندر ہیرا ملتا ہے۔“

اس کی ماں کہتی، ”جانے کیا بک رہی ہو۔“

”میں جو کچھ بک رہی ہوں صحیح ہے۔ آج کل اڑکیاں نقلی بھویں لگاتی ہیں۔ کالی پنسل سے خدا معلوم اپنے چہرے پر کیا کچھ کرتی ہیں، لیکن نتیجہ کیا نکلتا ہے۔۔۔ چڑیل بن جاتی ہیں۔“

اس کی ماں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا، ”جانے کیا کہہ رہی ہو۔ میری سمجھ میں تو خاک بھی نہیں آیا۔“

فہمیدہ کہتی، ”امی جان! آپ کو اتنا سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں صرف خاک ہی خاک نہیں۔۔۔ کچھ اور بھی ہے۔“

اس کی ماں اس سے پوچھتی، ”اور کیا ہے؟“

فہمیدہ جواب دیتی، ”بہت کچھ ہے۔۔۔ خاک میں بھی سونے کے ذرے ہو سکتے ہیں۔“

خیر۔۔۔ فہمیدہ کی شادی ہو گئی۔۔۔ پہلی ملاقات میاں بیوی کی بڑی دل چسپ تھی۔ جب فہمیدہ کا خاوند اس سے ہم کلام ہوا، تو اس نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں سیاہیاں تیر رہی ہیں۔

اس کے خاوند نے پوچھا، ”یہ تم اتنا سرمه کیوں لگاتی ہو؟“

فہمیدہ جھینپ گئی اور جواب میں کچھ نہ کہہ سکی۔

اس کے خاوند کو یہ اداپند آئی اور وہ اس سے لپٹ گیا۔ لیکن فہمیدہ کی سرمه بھری آنکھوں سے ٹپ ٹپ کالے کالے آنسو بہنے لگے۔

اس کا خاوند بہت پریشان ہو گیا، ”تم روکیوں رہی ہو؟“ فہمیدہ خاموش رہی۔

اس کے خاوند نے ایک بار پھر پوچھا، ”کیا بات ہے؟ آخر رونے کی وجہ کیا ہے؟ میں نے تمھیں کوئی دکھ پہنچایا؟“

”جی نہیں۔“

”تو پھر رونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟“

”کوئی بھی نہیں۔“

اس کے خاوند نے اس کے گال پر ہولے ہولے تھکی دی اور کہا، ”جان من جوبات ہے مجھے بتا دو۔۔۔ اگر میں نے کوئی زیادتی کی ہے تو اس کی معافی چاہتا ہوں۔۔۔ دیکھو تم اس گھر کی ملکہ ہو۔۔۔ میں تمہارا غلام ہوں۔۔۔ لیکن مجھے یہ روناد ہونا اچھا نہیں لگتا۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سدا ہنستی رہو۔“

فہمیدہ روتی رہی۔

اس کے خاوند نے اس سے ایک بار پھر پوچھا، ”آخر اس رو نے کی وجہ کیا ہے؟“

فہمیدہ نے جواب دیا، ”کوئی وجہ نہیں ہے، آپ پانی کا ایک گلاس دیجیے مجھے۔“

اس کا خاوند فوراً پانی کا ایک گلاس لے آیا۔ فہمیدہ نے اپنی آنکھوں میں لگا ہوا سرمدہ دھویا۔ تو لیے سے اچھی طرح صاف کیا۔ آنسو خود بخود خشک ہو گئے اس کے بعد وہ اپنے خاوند سے ہم کلام ہوتی۔

”میں معذرت چاہتی ہوں کہ آپ کو میں نے اتنا پریشان کیا، اب دیکھیے میری آنکھوں میں سرمے کی ایک لکیر بھی باقی نہیں رہی۔“

اس کے خاوند نے کہا، ”مجھے سرمے پر کوئی اعتراض نہیں، تم شوق سے اس کو استعمال کرو، مگر اتنا زیادہ نہیں کہ آنکھیں اب تی نظر آئیں۔“

فہمیدہ نے آنکھیں جھکا کر کہا، ”مجھے آپ کا ہر حکم بجالانا ہے، آئندہ میں کبھی سرمدہ نہیں لگاؤں گی۔“

”نہیں نہیں۔۔۔ میں تمحیں اس کے استعمال سے منع نہیں کرتا۔۔۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ اس چیز کو بقدر کفایت استعمال کیا جائے، ضرورت سے زیادہ جو بھی چیز استعمال میں آئے گی، اپنی قدر کوہو دے گی۔“

فہمیدہ نے سرمدہ لگانا چھوڑ دیا۔۔۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی چاندی کی سرمے دانی اور چاندی کے سرچوکوہ روز نکال کر دیکھتی تھی اور سوچتی تھی کہ یہ دونوں چیزیں اس کی زندگی سے کیوں خارج ہو گئی ہیں، وہ کیوں ان کو اپنی آنکھوں میں جگہ نہیں دے سکتی۔

صرف اس لیے کہ اس کی شادی ہو گئی ہے؟ صرف اس لیے کہ وہ اب کسی کی ملکیت ہو گئی ہے؟ یا ہو سکتا ہے کہ اس کی قوتِ ارادی سلب ہو گئی ہو۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔

ایک برس کے بعد اس کے ہاں چاند سا بچہ آگیا۔ فہمیدہ نڈھاں تھی لیکن اسے اپنی کمزوری کا کوئی احساس نہیں تھا اس لیے کہ وہ اپنے بڑے کی پیدائش پر نازاں تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے کوئی بہت بڑی تخلیق کی ہے۔

چالیس دنوں کے بعد اس نے سرمه مگوا کیا اور اپنے نومولود بڑکے کی آنکھوں میں لگایا۔ بڑکے کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ ان میں جب سرمه کی تحریر ہوئی تو وہ اور بھی زیادہ بڑی ہو گئیں۔ اس کے خاوند نے کوئی اعتراض نہ کیا کہ وہ بچے کی آنکھوں میں سرمه کیوں لگاتی ہے، اس لیے کہ اسے بڑی اور خوب صورت آنکھیں پسند تھیں۔

دن اچھی طرح گزر رہے تھے۔ فہمیدہ کے خاوند شجاعت علی کو ترقی مل گئی تھی۔ اب اس کی تشوہ اڈیٹھ ہزار روپے کے قریب تھی۔ ایک دن اس نے اپنے بڑکے، جس کا نام اس کی بیوی نے عاصم رکھا تھا، سرمه لگی آنکھوں کے ساتھ دیکھا۔ وہ اس کو بہت پیارالگا، اس نے بے اختیار اس کو اٹھایا چوما چاٹا اور پلنگڑی پر ڈال دیا۔ وہ ہنس رہا تھا، اور اپنے ننھے منے ہاتھ پاؤں ادھر ادھر مار رہا تھا۔

اس کی سالگردہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ فہمیدہ نے ایک بہت بڑے کیک کا آرڈر دے دیا تھا۔ محلے کے سب بچوں کو دعوت دی گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے بڑکے کی پہلی سالگردہ بڑی شان سے منائی جائے۔

سالگردہ یقیناً شان سے منائی جاتی، مگر دو دن پہلے عاصم کی طبیعت ناساز ہو گئی اور ایسی ہوئی کہ اسے تشنیخ کے دورے پڑنے لگے۔ اسے ہسپتال لے گئے، وہاں ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کیا۔ تشنیخ کے بعد معلوم ہوا کہ اسے ڈبل نمونیا ہو گیا ہے۔ فہمیدہ رونے لگی، بلکہ سرپیٹنے لگی، ”ہائے میرے لال کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ ہم نے تو اسے پھولوں کی طرح پالا ہے۔“ ایک ڈاکٹرنے اس سے کہا، ”میڈم یہ بیماریاں انسان کے احاطہ اختیار میں نہیں۔ ویسے بحیثیت ڈاکٹر میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ بچے کے جینے کی کوئی امید نہیں۔“ فہمیدہ نے رونا شروع کر دیا، ”میں تو خود مر جاؤں گی۔ خدا کے لیے، ڈاکٹر صاحب! اسے بچا بیجیے، آپ علاج کرنا جانتے ہیں، مجھے اللہ کے گھر سے امید ہے کہ میرا بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”آپ اتنے ناامید کیوں ہیں؟“

”میں ناامید نہیں۔ لیکن میں آپ کو جھوٹی تسلی نہیں دینا چاہتا۔“

”جھوٹی تسلیاں، آپ مجھ کو کیوں دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا بچہ زندہ رہے گا۔“

”خدا کرے کہ ایسا ہی ہو“

مگر خدا نے ایسا نہ کیا اور وہ تین روز کے بعد ہسپتال میں مر گیا۔

فہمیدہ پر دیر تک پاگل پن کی کیفیت طاری رہی اس کے ہوش و حواس گم تھے کو نکلے اٹھاتی انھیں پیشی اور اپنے چہرے پر ملنا شروع کر دیتی۔ اس کا خاوند سخت پریشان تھا۔ اس نے کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کی۔ دوائیں بھی دیں لیکن خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ فہمیدہ کے دل و دماغ میں سرمه ہی سرمه تھا۔ وہ ہربات کا لک کے ساتھ سوچتی تھی۔ اس کا خاوند اس سے کہتا، ”کیا بات ہے تم اتنی افسردہ کیوں رہتی ہو؟“ وہ جواب دیتی ”بھی، کوئی خاص بات نہیں۔۔۔ مجھے آپ سرمه لاد بیجے“ اس کا خاوند اس کے لیے سرمه لے آیا، مگر فہمیدہ کو پسند نہ آیا۔ چنانچہ وہ خود بازار گئی اور اپنی پسند کا سرمه خرید کر لائی۔ اپنی آنکھوں میں لگایا اور سو گئی۔۔۔ جس طرح وہ اپنے بیٹے عاصم کے ساتھ سویا کرتی تھی۔

صحیح جب اس کا خاوند اٹھا اور اس نے اپنی بیوی کو جگانے کی کوشش کی تو وہ مردہ پڑی تھی اس کے پہلو میں ایک گڑیا تھی جس کی آنکھیں سرے سے لبریز تھیں۔

-[92]-

فرشتہ: سعادت حسن منٹو

سرخ کھر درے کمبل میں عطاء اللہ نے بڑی مشکل سے کروٹ بدلتی اور اپنی مندی ہوئی آنکھیں آہستہ آہستہ کھولیں۔ کھرے کی دبیز چادر میں کئی چیزیں لپٹی ہوئی تھیں جن کے صحیح خدو خال نظر نہیں آتے تھے۔ ایک لمبا، بہت ہی لمبا، نہ ختم ہونے والا دالان تھا یا شاید کمرہ تھا جس میں دھنڈلی دھنڈلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی روشنی جو جگہ میلی ہو رہی تھی۔

دور بہت دور، جہاں شاید کمرہ یادالان ختم ہو سکتا تھا، ایک بہت بڑا بت تھا جس کا دراز قد چھٹ کو پھالتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ عطاء اللہ کو اس کا صرف نچلا حصہ نظر آ رہا تھا جو بہت پرہیبت تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ موت کا دیوتا ہے جو اپنی ہولناک شکل دکھانے سے قصد اگر یز کر رہا ہے۔

عطاء اللہ نے ہونٹ گول کر کے اور زبان پیچھے کھینچ کر اس پر ہیبت بت کی طرف دیکھا اور سیٹی بجائی، بالکل اس طرح جس طرح کتے کو بلا نے کے لیے بجائی جاتی ہے۔ سیٹی کا بجنا تھا کہ اس کمرے یادالان کی دھنڈی فضائیں ان گنت ڈمیں لہرانے لگیں۔ لہراتے لہراتے یہ سب بہت بڑے شیشے کے مرتبان میں جمع ہو گئیں جو غالباً اسپرٹ سے بھرا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ مرتبان فضائیں بغیر کسی سہارے کے تیرتا، ڈالتا اس کی آنکھوں کے پاس پہنچ گیا۔ اب وہ ایک چھوٹا سامرا مرتبان تھا جس میں اسپرٹ کے اندر اس کا دل ڈکیاں لگا رہا تھا اور دھڑکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ عطاء اللہ کے حلق سے دبی دبی چیخ نکلی۔ اس مقام پر جہاں اس کا دل ہوا کرتا تھا، اس نے اپنالرز تا ہوا پا تھر کھا اور بے ہوش ہو گیا۔

معلوم نہیں کتنی دیر کے بعد اسے ہوش آیا مگر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو کہر اغائب تھا۔ وہ دیو یہیکل بت بھی۔ اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا اور برف کی طرح ٹھنڈا۔ مگر اس مقام پر جہاں اس کا دل تھا، ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔۔۔ اس آگ میں کئی چیزیں جل رہی تھیں، بے شمار چیزیں۔ اس کی بیوی اور بچوں کی ڈیکیاں تو چڑھتی تھیں مگر اس کے گوشت پوست اور اس کی ڈیپوں پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ جھلسادینے والی تپش میں بھی وہ تن بستہ تھا۔

اس نے ایک دم اپنے بر فیلے ہاتھوں سے اپنی زردوبیوی اور سوکھے کے مارے ہوئے بچوں کو اٹھایا اور چھینک دیا۔۔۔ اب آگ کے اس الاؤ میں عرضیوں کے پلنڈے کے پلنڈے جل رہے تھے۔۔۔ ہر زبان میں لکھی ہوئی عرضیاں۔ ان پر اس کے اپنے ہاتھ سے کیے ہوئے دستخط، سب جل رہے تھے، آوانپیدا کے بغیر۔

آگ کے شعلوں کے پیچے اسے اپنا چہرہ نظر آیا۔ پسینے سے۔۔۔ سرد پسینے سے تر بت۔ اس نے آگ کا ایک شعلہ پکڑا اور اس سے اپنے ماٹھے کا پسینے پوچھ کر ایک طرف چھینک دیا۔ الاؤ میں گرتے ہی یہ شعلہ بھیگے ہوئے سفخ کی طرف رونے لگا۔۔۔ عطاء اللہ کو اس کی یہ حالت دیکھ کر بہت ترس آیا۔

عرضیاں جلتی رہیں اور عطاء اللہ دیکھتار ہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی زردر و بیوی نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں گندھے ہوئے آئے کا تھال تھا۔ جلدی جلدی اس نے پیڑے بنائے اور آگ میں ڈالنا شروع کر دیے جو آنکھ جھپکنے کی دیر میں کوئے بن کر سلگنے لگے۔ انھیں دیکھ کر عطاء اللہ کے پیٹ میں زور کا درد اٹھا۔ جھپٹامار کر اس نے تھال میں سے آخری پیڑا اٹھایا اور منہ میں ڈال لیا۔ لیکن آٹا خشک تھا۔۔۔ ریت کی طرح۔ اس کا سانس رکنے لگا اور وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔

اب اس نے ایک بے جوڑ خواب دیکھنا شروع کیا۔ ایک بہت بڑی محراب تھی جس پر جملی حروف میں یہ شعر لکھا تھا۔

روزِ محشر کہ جاں گدا زبود
اولیں پر سش نماز بود

وہ فوراً پھر لیے فرش پر سجدے میں گرد پڑا۔ نماز بخشوونے کے لیے دعا مانگنا چاہی مگر بھوک اس کے معدے کو اس بری طرح ڈسٹنے لگی کہ بلبلہ اٹھا۔ اتنے میں کسی نے بڑی بار عرب آواز میں پکارا:

”عطاء اللہ!“

عطاء اللہ کھڑا ہو گیا۔۔۔ محابوں کے پیچھے۔۔۔ بہت پیچھے، اوپنے منبر پر ایک شخص کھڑا تھا۔ مادرزاد برهنہ، اس کے ہونٹ ساکت تھے مگر آواز آرہی تھی۔

”عطاء اللہ! تم کیوں زندہ ہو؟ آدمی صرف اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک اسے کوئی سہارا ہو۔۔۔ ہمیں بتاؤ، کوئی ایسا سہارا ہے جس کا تمہیں سہارا ہو۔۔۔؟ تم پیمار ہو۔۔۔ تمہاری بیوی آج نہیں توکل پیمار ہو جائے گی۔ وہ جن کا کوئی سہارا نہیں ہوتا، پیمار ہوتے ہیں۔۔۔ زندگی در گور ہوتے ہیں۔ اس کا سہارا تم ہو جو بڑی تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔۔۔ تمہارے بچے بھی ختم ہو رہے ہیں۔۔۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم نے خود اپنے آپ کو ختم نہیں کیا۔ اپنے بچوں اور اپنی بیوی کو ختم نہیں کیا۔۔۔ کیا اس خاتمے کے لیے بھی تمہیں کسی سہارے کی ضرورت ہے۔۔۔؟ تم رحم و کرم کے طالب ہو۔۔۔ بے وقوف! کون تم پر رحم کرے گا۔ موت کو کیا پڑی ہے کہ وہ تمہیں مصیبتوں سے نجات دلائے۔ اس کے لیے یہ مصیبت کیا کم ہے کہ وہ موت ہے۔۔۔ کس کس کو آئے۔۔۔ ایک صرف تم عطاء اللہ نہیں ہو، تم ایسے لاکھوں عطاے

اللہ اس بھری دنیا میں موجود ہیں۔۔۔ جاؤ، اپنی مصیبتوں کا علاج خود کرو۔۔۔ دو مریل بچوں اور ایک فاقہ زدہ بیوی کو ہلاک کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس بوجھ سے ہلکے ہو جاؤ تو موت شرمسار ہو کر خود خود تمہارے پاس چلی آئے گی۔“

عطاء اللہ غصے سے تحریر تحریر کا نپنے لگا، ”تم۔۔۔ تم سب سے بڑے ظالم ہو۔۔۔ بتاؤ، تم کون ہو۔ اس سے پیشتر کہ میں اپنی بیوی اور بچوں کو ہلاک کروں، میں تمہارا خاتمہ کر دینا چاہتا ہوں۔“

مادرزاد برهنہ شخص نے قہقہہ لگایا اور کہا، ”میں عطا اللہ ہوں۔۔۔ غور سے دیکھو۔۔۔ کیا تم اپنے آپ کو بھی نہیں پہچانتے؟“

عطاء اللہ نے اس نگ دھرنگ آدمی کی طرف دیکھا اور اس کی گردان جھک گئی۔۔۔ وہ خود ہی تھا، بغیر لباس کے۔ اس کا خون کھولنے لگا۔ فرش میں سے اس نے اپنے بڑھے ہوئے ناخنوں سے کھرچ کھرچ کر ایک پتھر نکلا اور تان کر منبر کی طرف دیکھا۔۔۔ اس کا سر چکرا گیا۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اس میں سے لہو نکل رہا تھا۔ وہ بھاگا۔۔۔ پتھر یلے صحن کو عبور کر کے جب باہر نکلا تو ہجوم نے اسے گھیر لیا۔ ہجوم کا ہر فرد عطا اللہ تھا۔ جس کا ماتھا لہو لہان تھا۔

بڑی مشکلوں سے ہجوم کو چیر کروہ باہر نکلا۔ ایک تنگ و تاریک سڑک پر درستک چلتا رہا۔ اس کے دونوں کناروں پر حشیش اور تھوہر کے پودے اگے ہوئے تھے۔ ان میں کہیں کہیں دوسرا زہریلی بوٹیاں بھی تھیں۔ عطا اللہ نے جیب سے بوتل نکال کر تھوہر کا عرق جمع کیا۔ پھر زہریلی بوٹیوں کے پتے توڑ کر اس میں ڈالے اور انھیں ہلاتا ہلاتا اس موڑ پر پتھنگی گیا جہاں سے کچھ فاصلے پر اس کا مکان تھا۔۔۔ شکستہ اینٹوں کا ڈھیر۔

ٹاٹ کا بوسیدہ پر دہماکروہ اندر داخل ہوا۔۔۔ سامنے طاق میں مٹی کے تیل کی پکی سے کافی روشنی نکل رہی تھی۔ اس میلائی روشنی میں اس نے دیکھا کہ جھلنگی پلنگڑی پر اس کے دونوں مریل بچے مرے پڑے ہیں۔ عطا اللہ کو بہت ناامیدی ہوئی۔ بوتل جیب میں رکھ کر جب وہ پلنگڑی کے پاس گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ پھٹی پر اگنی گدڑی جو اس کے بچوں پر پڑی ہے، آہستہ آہستہ ہل رہی ہے۔ عطا اللہ بہت خوش ہوا۔۔۔ وہ زندہ تھے۔ بوتل جیب سے نکال کروہ فرش پر بیٹھ گیا۔

دونوں لڑکے تھے۔ ایک چار برس، دوسرا پانچ کا۔۔۔ دونوں بھوکے تھے۔ دونوں بڑیوں کا ٹھانچہ تھے۔ گدڑی ایک طرف ہٹا کر جب عطا اللہ نے ان کو غور سے دیکھا تو اسے تجب ہوا کہ اتنے چھوٹے بچے اتنی سوکھی بڑیوں پر اتنی دیر سے کیسے زندہ ہیں۔ اس نے زہر کی شیشی ایک

طرف رکھ دی اور انگلیوں سے ایک بچے کی گردن ٹھوٹتے ٹھوٹتے۔۔۔ ایک خفیف سا جھکا دیا۔ بلکہ سی تڑاخ ہوئی اور اس بچے کی گردن ایک طرف لٹک گئی۔ عطاء اللہ بہت خوش ہوا کہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے کام تمام ہو گیا۔ اسی خوشی میں اس نے اپنی بیوی کو پکارا، ”جیناں! جیناں۔۔۔ ادھر آؤ۔ دیکھو میں نے کتنی صفائی سے رحیم کو مارڈالا ہے۔۔۔ کوئی تکلیف نہیں ہوئی اس کو۔“

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ زینب کہاں ہے۔۔۔؟ معلوم نہیں کہاں چلی گئی ہے۔۔۔؟ شاید بچوں کے لیے کسی سے کھانا مانگنے گئی ہو۔۔۔ یا ہسپتال میں اس کی خیریت دریافت کرنے۔۔۔ عطاء اللہ ہنسا۔۔۔ مگر اس کی منی فوراً دب گئی، جب دوسرا بچہ نے کروٹ بدی اور اپنے مردہ بھائی کو بلا نا شروع کیا، ”رحیم۔۔۔ رحیم۔“

وہ نہ بولا تو اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ ڈیپوں کی چھوٹی چھوٹی سیاہ پیالوں میں اس کی آنکھیں چکیں، ”ابا۔۔۔ تم آگئے۔“ عطاء اللہ نے ہولے سے کہا، ”ہاں کریم، میں آگیا۔“ کریم نے اپنے استخوانی ہاتھ سے رحیم کو چھنچھوڑا، ”اٹھور رحیم۔۔۔ ابا آگئے ہسپتال سے۔“ عطاء اللہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، ”خاموش رہو۔۔۔ وہ سو گیا ہے۔“

کریم نے اپنے باپ کا ہاتھ ہٹایا، ”کیسے سو گیا ہے۔۔۔ ہم دونوں نے ابھی تک کچھ کھایا نہیں۔“

”تم جاگ رہے تھے؟“

”ہاں ابا“

”سو جاؤ گے ابھی تم“

”کیسے؟“

”میں سلاتا ہوں تمہیں۔“ یہ کہہ کر عطاء اللہ نے اپنی سخت انگلیاں کریم کی گردن پر رکھیں اور اس کو مروڑ دیا۔ مگر تڑاخ کی آواز پیدا نہ ہوئی۔ کریم کو بہت درد ہوا، ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“

”کچھ نہیں۔“ عطاء اللہ حیرت زدہ تھا کہ اس کا یہ دوسرا لڑکا اتنا سخت جان کیوں ہے۔

”کیا تم سونا نہیں چاہتے؟“

کریم نے اپنی گردن سہلاتے ہوئے جواب دیا، ”سونا چاہتا ہوں۔۔۔ کچھ کھانے کو دے دو۔۔۔ سو جاؤں گا۔“

عطاء نے اللہ زہر کی شیشی اٹھائی، ”پہلے یہ دوپی لو۔“

”اچھا۔“ کریم نے اپنا منہ کھول دیا۔ عطاء اللہ نے ساری شیشی اس کے حلق میں انڈیل دی اور اطمینان کا سانس لیا، ”اب تم گہری نیند سو جاؤ گے۔“ کریم نے اپنے باپ کا ہاتھ پکڑا اور کہا، ”ابا۔۔۔ اب کچھ کھانے کو دو۔“

عطاء اللہ کو بہت کوفت ہوئی، ”تم مرتبے کیوں نہیں؟“

کریم یہ سن کر سپٹا سا گیا، ”کیا ابا؟“

”تم مرتبے کیوں نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے، اگر تم مر جاؤ گے تو نیند بھی آجائے گی تمہیں۔“

کریم کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا باپ کیا کہہ رہا ہے، ”مارتا تو اللہ میاں ہے ابا۔“

اب عطاء اللہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے، ”مارا کرتا تھا کبھی۔۔۔ اب اس نے یہ کام چھوڑ دیا ہے۔۔۔ چلو اٹھو۔“

پلنگڑی پر کریم تھوڑا اٹھا تو عطاء اللہ نے اسے اپنی گود میں لے لیا اور سوچنے لگا کہ وہ اللہ میاں کیسے بنے۔ ٹالٹ کا پردہ ہٹا کر جب باہر گلی میں نکلا، اسے یوں محسوس ہوا جیسے آسمان اس پر جھکا ہوا ہے۔ اس میں جا بجا مٹی کے تیل کی کپیاں جل رہی تھیں۔ اللہ میاں خدا جانے کہاں تھا۔۔۔ اور زینب بھی۔۔۔ معلوم نہیں وہ کہاں چلی گئی تھی۔ کہیں سے کچھ مانگنے گئی ہو گی۔۔۔ عطاء اللہ ہنسنے لگا۔ لیکن فوراً اسے خیال آیا کہ اسے اللہ میاں بننا تھا۔۔۔ سامنے موری کے پاس بہت سے پتھر پڑے تھے۔ ان پر وہ اگر کریم کو دے مارے تو۔۔۔ مگر اس میں اتنی طاقت

نہیں تھی۔ کریم اس کی گود میں تھا۔ اس نے کو شش کی کہ اسے اپنے بازوں میں اٹھائے اور سر سے اوپر لے جا کر پھر وہ پر پٹک دے،
مگر اس کی طاقت جواب دے گئی۔ اس نے کچھ سوچا اور اپنی بیوی کو آواز دی، ”جیناں۔۔۔ جیناں۔۔۔“

زینب معلوم نہیں کہاں ہے۔۔۔ کہیں وہ اس ڈاکٹر کے ساتھ تو نہیں چلی گئی جو ہر وقت اس سے اتنی ہمدردی کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ وہ ضرور
اس کے فریب میں آگئی ہو گی۔ میرے لیے اس نے کہیں خود کو بیچ تو نہیں دیا۔۔۔ یہ سوچتے ہی اس کا خون کھول اٹھا۔ کریم کو پاس بہتی ہوئی
بدرو میں چینک کروہ ہسپتال کی طرف بھاگا۔۔۔ اتنا تیز دوڑا کہ چند منٹ میں ہسپتال پہنچ گیا۔

رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ چاروں طرف سناتا تھا۔ جب وہ اپنے وارڈ کے برآمدے میں پہنچا تو دو آوازیں سنائی دیں۔ ایک اس کی
بیوی کی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی، ”تم دغا باز ہو۔۔۔ تم نے مجھے دھو کا دیا ہے۔۔۔ اس سے جو کچھ تمہیں ملا ہے، تم نے اپنی جیب میں ڈال لیا
ہے۔“ کسی مرد کی آواز سنائی دی، ”تم غلط کہتی ہو۔۔۔ تم اس کو پسند نہیں آئیں اس لیے وہ چلا گیا۔“

اس کی بیوی دیوانہ وار چلائی، ”بکواس کرتے ہو۔۔۔ ٹھیک ہے کہ میں دوپھوں کی ماں ہوں۔۔۔ میرا وہ پہلا سارنگ روپ نہیں رہا۔۔۔ لیکن
وہ مجھے قبول کر لیتا اگر تم بھانجی نہ مارتے۔۔۔ تم بہت ظالم ہو۔۔۔ بہت کھوڑ ہو۔۔۔“ اس کی آواز گلے میں رندھنے لگی۔ ”میں کبھی
تمہارے ساتھ نہ چلتی۔۔۔ میں کبھی ذلت میں نہ گرتی اگر میرا خاوند بیمار اور میرے بچے کئی دونوں کے بھوکے نہ ہوتے۔۔۔ تم نے کیوں یہ
ظلماں کیا؟“

اس مرد نے جواب دیا، ”وہ۔۔۔ وہ کوئی بھی نہیں تھا۔۔۔ میں خود تھا۔۔۔ جب تم میرے ساتھ چل پڑیں تو میں نے خود کو پہچانا۔۔۔ اور تم
سے کہا کہ وہ چلا گیا ہے۔۔۔ وہ، جس کے لیے میں تمہیں لا یا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا خاوند مر جائے گا۔۔۔ تمہارے بچے مر جائیں گے۔
تم بھی مر جاؤ گی۔۔۔ لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا۔۔۔“ اس کی بیوی نے تیکھی آواز میں پوچھا۔

”میں مر تے دم تک زندہ رہوں گا۔۔۔ تم نے مجھے اس زندگی سے بچالیا ہے جو موت سے کہیں زیادہ خوفناک ہوتی۔۔۔ چلو آؤ۔۔۔ عطاۓ
اللہ ہمیں بلا رہا ہے۔“

”عطاء اللہ یہاں کھڑا ہے۔“ عطاء اللہ نے بچھی ہوئی آواز میں کہا۔

دوسرے پلٹے۔۔۔ اس سے کچھ فاصلے پر وہ ڈاکٹر کھڑا تھا جو زینب سے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اس کے منہ سے صرف اس قدر نکل سکتا تھا، ”تم!“

”ہاں، میں۔۔۔ تمہاری سب باتیں سن چکا ہوں۔“ یہ کہہ کر عطاء اللہ نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا، ”جیناں۔۔۔ میں نے رحیم اور کریم دونوں کو مارڈا لایا ہے۔۔۔ اب میں اور تم باقی رہ گئے ہیں۔“

زینب چیختی، ”مارڈا تم نے دونوں بچوں کو؟“

عطاء اللہ نے بڑے پر سکون لبھے میں کہا، ”ہاں۔۔۔ انھیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔۔۔ میرا خیال ہے تمہیں بھی کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ ڈاکٹر صاحب موجود ہیں۔“

ڈاکٹر کا نپنے لگا۔۔۔ عطاء اللہ آگے بڑھا اور اس سے مخاطب ہوا، ”ایسا نجکشن دے دو کہ فوراً مر جائے۔“

ڈاکٹر نے کامپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنابیگ کھولا اور سرخ میں زہر بھر کے زینب کے ٹیکہ لگانے کا دیا۔ لیکن لگتے ہی وہ فرش پر گری اور مر گئی۔ اس کی زبان پر آخری الفاظ ”میرے بچے“ تھے، مگر اچھی طرح ادا نہ ہو سکے۔ عطاء اللہ نے اطمینان کا سانس لیا، ”چلو یہ بھی ہو گیا۔۔۔ اب میں باقی رہ گیا ہوں۔“

”لیکن۔۔۔ لیکن میرے پاس زہر ختم ہو گیا ہے۔“ ڈاکٹر کے لبھے میں لکنت تھی۔ عطاء اللہ تھوڑی دیر کے لیے پریشان ہو گیا، لیکن فوراً سنبھل کر اس نے ڈاکٹر سے کہا، ”کوئی بات نہیں۔۔۔ میں اندر اپنے بستر پر لیٹتا ہوں، تم بھاگ کر زہر لے کر آؤ۔“

بستر پر لیٹ کر سرخ کھرد رے کمبل میں اس نے بڑی مشکل سے کروٹ بدلتی اور اپنی مندی ہوئی آنکھیں آہستہ کھولیں۔ کھرے کی چادر میں کئی چیزیں لپٹی ہوئی تھیں جن کے صحیح خدو خال نظر نہیں آتے تھے۔۔۔ ایک لمبا، بہت ہی لمبا، نہ ختم ہونے والا لالا تھا۔۔۔ یا شاید کمرہ جس میں دھنڈلی دھنڈلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی روشنی جو جگہ میلی ہو رہی تھی۔ دور، بہت دور ایک فرشتہ کھڑا تھا۔ جب وہ

آگے بڑھنے لگا تو چھوٹا ہوتا گیا۔ عطاء اللہ کی چار پائی کے پاس پہنچ کر وہ ڈاکٹر بن گیا۔ وہی ڈاکٹر جو اس کی بیوی سے ہر وقت ہمدردی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اور اسے بڑے پیار سے دلا سادیتا تھا۔

عطاء اللہ نے اسے پہچانا تو اٹھنے کی کوشش کی، ”آئیے ڈاکٹر صاحب!“ مگر وہ ایک دم غائب ہو گیا۔ عطاء اللہ لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ کہر ادور ہو چکا تھا۔ معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا تھا۔

اس کا دماغ بھی صاف تھا۔ ایک دم وارڈ میں شور بلند ہوا۔ سب سے اوپری آواز جو چیز سے مشابہ تھی، زینب کی تھی، اس کی بیوی کی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ معلوم نہیں کیا کہہ رہی تھی۔ عطاء اللہ نے اٹھنے کی کوشش کی۔ زینب کو آواز دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔۔۔ دھنڈ پھر چھانے لگی اور وارڈ لمبا۔۔۔ بہت لمبا ہوتا چلا گیا۔

تحوڑی دیر کے بعد زینب آئی۔ اس کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے عطاء اللہ کو جھنپٹنا شروع کیا۔ ”میں نے اسے مارڈا لاہے۔۔۔ میں نے اس حرام زادے کو مارڈا لاہے۔“

”کس کو؟“

اسی کو جو مجھ سے اتنی ہمدردی جتایا کرتا تھا۔۔۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تمہیں بچالے گا۔۔۔ وہ چھوٹا تھا۔۔۔ دغا باز تھا، اس کا دل توے کی کالک سے بھی زیادہ کالا تھا۔ اس نے مجھے۔۔۔ اس نے مجھے۔۔۔ اس کے آگے زینب کچھ نہ کہہ سکی۔

عطاء اللہ کے دماغ میں بے شمار خیالات آئے اور آپس میں گلہ گلہ ہو گئے، ”تمہیں تو اس نے مارڈا لاہے؟“

زینب پھینی، ”نہیں۔۔۔ میں نے اسے مارڈا لاہے۔“

عطاء اللہ چند لمحے خلامیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے زینب کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹایا، ”تم ادھر ہو جاؤ۔۔۔ وہ آرہا ہے۔“

”کون؟“

”وہی ڈاکٹر۔۔۔ وہی فرشتہ۔“

فرشته آہستہ آہستہ اس کی چارپائی کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں زہر بھری سرنج تھی۔ عطاء اللہ مسکرا یا، ”لے آئے؟“ فرشتہ نے اثبات میں سرہلا یا، ”ہاں، لے آیا۔“ عطاء اللہ نے اپنالرزائل بازو اس کی طرف بڑھایا، ”تو لگادو۔“ فرشتہ نے سوئی اس کے بازو میں گھونپ دی۔

عطاء اللہ مر گیا۔

زینب اسے جھنجور نے لگی، ”اٹھو۔۔۔ اٹھو کریم، رحیم کے ابا، اٹھو۔۔۔ یہ ہسپتال بہت بری جگہ ہے۔۔۔ چلو گھر چلیں۔“ تھوڑی دیر کے بعد پولیس آئی اور زینب کو اس کے خاوند کی لاش پر سے ہٹا کر اپنے ساتھ لے گئی۔

-[93]-

غسل خانہ: سعادت حسن منشو

صدر دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی سیڑھیوں کے پاس ایک چھوٹی کوٹھری ہے جس میں کبھی اپلے اور کٹریاں کو سلے رکھے جاتے تھے۔ مگر اب اس میں نہ لگا کر اس کو مردانہ غسل خانے میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ فرش وغیرہ مضبوط بنادیا گیا ہے تاکہ مکان کی بنیادوں میں پانی نہ چلا جائے۔ اس میں صرف ایک کھڑکی ہے جو گلی کی طرف کھلتی ہے۔ اس میں زنگ آلو دسلا خیں لگی ہوئی ہیں۔

میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا جب یہ غسل خانہ میری زندگی میں داخل ہوا۔ آپ کو حیرت ہو گی کہ غسل خانے انسانوں کی زندگی میں کیونکردا خل ہو سکتے ہیں۔ غسل خانہ تو ایسی چیز ہے جس میں آدمی داخل ہوتا ہے اور دیر تک داخل رہتا ہے۔ لیکن جب آپ میری کہانی سن لیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ غسل خانہ واقعی میری زندگی میں داخل ہوا اور اس کا ایک اہم ترین جزو بن کر رہ گیا۔

یوں تو میں اس غسل خانے سے اس وقت کا متعارف ہوں جب اس میں اپلے وغیرہ پڑے رہتے تھے اور میری بلی نے اس میں بھی ہوئے چو ہوں کی شکل کے چار بچے دیے تھے۔ ان کی آنکھیں دس بارہ روز تک مندی رہی تھیں۔ چنانچہ جب میرا چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا، اس کی

آنکھیں کھلی دیکھ کر میں نے امی جان سے کہا تھا، ”امی جان، میری بیٹی میں اس وقت داخل ہوا جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا اور ہوئی ہیں؟“

یعنی میں بچپن ہی سے اس غسل خانے کو جانتا ہوں لیکن یہ میری زندگی میں اس وقت داخل ہوا جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا اور ایک بھاری بھر کم بستہ بغل میں دبا کر ہر روز اسکول جایا کرتا تھا۔

ایک روز کا ذکر ہے میں نے اسکول سے گھر آتے ہوئے سردار دوہا و اسنگھ پھل فروش کی دکان سے ایک کابلی انار چرا یا۔ میں اور میرے دو ہم جماعت لڑکے ہر روز کچھ نہ کچھ اس دکان سے چرا کرتے تھے لیکن بھائی دوہا و اسنگھ جو چلوں کے ٹوکروں میں گھر ایک بڑی سی پکڑی اپنے کیسوں پر رکھے سارا دن افیم کے نشے میں او گھٹھا رہتا تھا، کو خبر تک نہ ہوتی تھی۔ مگر بات یہ ہے کہ ہم بڑی بڑی چیزیں نہیں چراتے تھے۔ کبھی انگور کے چند دانے اٹھا لیے کبھی لوکاٹ کا ایک گچھا لے اڑے۔ کبھی مٹھی بھر خوب نیاں اٹھائیں اور چلتے بنے۔ لیکن اس دفعہ چونکہ میں نے زیادتی کی تھی اس لیے پکڑا گیا۔ ایک دم بھائی دوہا و اسنگھ اپنی ابدی نیند سے چونکا اور اتنی پھرتی سے یقینے اتر کر اس نے مجھے رنگوں ہاتھوں پکڑا کہ میں دنگ رہ گیا۔ ساتھ ہی میرے حواس باختہ ہو گئے۔ پہلے تو میں اس چوری کو کھیل سمجھا تھا لیکن جب میلی داڑھی والے سردار دوہا و اسنگھ نے اپنی پھولی ہوئی رگوں والے ہاتھ سے میری گردان ناپی تو مجھے احساس ہوا کہ میں چور ہوں۔

بچپن ہی سے مجھے اس بات کا خیال رہا ہے کہ لوگوں کے سامنے میری ذلت نہ ہو۔ چنانچہ سر بازار جب میں نے خود کو ذلیل ہوتے دیکھا تو فوراً بھائی دوہا و اسنگھ سے معافی مانگ لی۔ آدمی کا دل بہت اچھا تھا۔ انار میرے ہاتھ سے چھین کر اس نے وہ میل جو اس کے خیال کے مطابق انار کو لگ گیا تھا اپنے کرتے سے صاف کیا اور بڑا اپنا چلا گیا، ”وکیل صاحب آئے تو میں ان سے کہوں گا کہ آپ کے لڑکے نے اب چوری شروع کر دی ہے۔“

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں تو سمجھا تھا کہ ستے چھوٹ گئے۔ وکیل صاحب یعنی میرے ابا جی سردار دوہا و اسنگھ نہیں تھے۔ وہ نہ افیم کا نشہ کرتے تھے اور نہ انھیں چلوں ہی سے کوئی دلچسپی تھی۔ میں نے سوچا اگر اس کجھ نہ دوہا و اسنگھ نے ان سے میری پوری کا ذکر کر دیا تو وہ گھر میں داخل ہوتے ہی امی جان سے کہیں گے، ”پچھ سنتی ہو، اب تمہارے اس برخوردار نے چوری چکاری بھی شروع کر دی ہے۔ سردار دوہا و اسنگھ نے جب مجھ سے کہا کہ وکیل صاحب آپ کا لڑکا انار اٹھا کے بھاگ گیا تھا تو خدا کی قسم میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔۔۔ میں نے آج تک اپنی ناک پر کمھی بیٹھنے نہیں دی۔ لیکن اس نالائق نے میری ساری عزت خاک میں مladی ہے۔“

وہ مجھے دو تین طماں پچے مار کر مطمئن ہو جاتے مگر امی جان کا ناک میں دم کر دیتے۔ اس لیے کہ وہ ہماری طرف داری کرتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ ان کی اولاد (ہم چھ بیٹے تھے) سے کوئی چھوٹی سی لغوش ہو اور وہ آنگن میں اپنے گنجے سر کا پسینہ پونچھ پونچھ کر امی جان کو کو سنا شروع کر دیں جیسے سارا تصور ان کا ہے۔ کوئے کے بعد بھی ان کا بھی ہلاکا نہیں ہوتا تھا۔ اس روز کھانا نہیں کھاتے تھے اور دیر تک خاموش آنگن میں سینٹ لگے فرش پر ادھر ادھر ٹھہرے رہتے تھے۔

جس وقت بھائی دہاوا نگھنے والی صاحب کا نام لیا میری آنکھوں کے سامنے اباجی کا گنجاسر آگیا جس پر پسینے کی نسخی نسخی بوندیں چک رہی تھیں۔ ان کو ہمیشہ غصے کے وقت اس جگہ پر پسینہ آتا ہے۔

بستہ میری بغل میں بہت وزنی ہو گیا۔ ٹانگیں بے جان سی ہو گئیں۔ دل دھڑکنے لگا۔ شرم کا وہ احساس جو چوری پکڑے جانے پر پیدا ہوا، مٹ گیا اور اس کی جگہ ایک تکلیف دہ خوف نے لے لی۔ اباجی کا گنجاسر۔ اس پر چمکتی ہوئی پسینے کی نسخی نسخی بوندیں۔ آنگن کا سینٹ لگا فرش۔ اس پر ان کا غصے میں ادھر ادھر چھیرے ہوئے بہر شیر کی طرح چلنا اور رک رک کر امی جان پر برستا۔۔۔

سخت پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا۔ غسل خانے کے پاس ٹھہر کر میں نے ایک بار سوچا کہ اگر اس کمخت پھل فروش نے سچ مج اباجی سے کہہ دیا تو آفت ہی آجائے گی۔ دو تین روز کے لیے سارا گھر جنم کا نمونہ بن جائے گا۔ اباجی اور سب کچھ معاف کر سکتے تھے لیکن چوری کبھی معاف نہیں کرتے تھے۔ ہمارے پرانے ملازم نبو نے ایک بار دس روپے کا نوٹ امی جان کے پان دان سے نکال لیا تھا۔۔۔ امی جان نے تو اسے معاف کر دیا تھا لیکن اباجی کو جب اس چوری کا پتا چلا تو انہوں نے اسے نکال باہر کیا، ”میں اپنے گھر میں کسی چور کو نہیں رکھ سکتا۔“

ان کے یہ الفاظ میرے کانوں میں کئی بار گونج چکے تھے۔ میں نے اوپر جانے کے لیے زینے پر قدم ہی رکھا کہ ان کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

جانے وہ میرے بڑے بھائی ٹھیلیں سے کیا کہہ رہے تھے لیکن میں یہی سمجھا کہ وہ نبو کو گھر سے باہر نکال رہے ہیں اور اس سے غصے میں یہ کہہ رہے ہیں، ”میں اپنے گھر میں کسی چور کو نہیں رکھ سکتا۔“

میرے قدم منوں بھاری ہو گئے۔ میں اور زیادہ سہم گیا اور اوپر جانے کے مجائے نیچے اتر آیا۔ خدا معلوم کیا جی میں آئی کہ غسل خانے کے اندر جا کر میں نے صدقِ دل سے دعائیں کیا کہ ابا جی کو میری چوری کا علم نہ ہو۔ یعنی دوہا واسنگہ ان سے اس کا ذکر کرنا بھول جائے۔ دعائیں کے بعد میرے جی کا بوجھ کچھ ہلاکا ہو گیا۔ چنانچہ میں اوپر چلا گیا۔

خدانے میری دعا قبول کی۔ دوہا واسنگہ اور اس کی دکان ابھی تک موجود ہے۔ لیکن اس نے ابا جی سے انار کی چوری کا ذکر نہیں کیا۔۔۔ غسل خانہ یہیں سے میری زندگی میں داخل ہوتا ہے۔

ایک بار پھر ایسی ہی بات ہوئی۔ میں زیادہ لطف لینے کی خاطر پہلی دفعہ بازار میں کھلے بندوں سکریٹ پیے جا رہا تھا کہ ابا جی کے ایک دوست سے میری مڈ بھیڑ ہو گئی۔ اس نے سکریٹ میرے ہاتھ سے چھین کر غصے میں ایک طرف پھینک دیا اور کہا، ”تم بہت آوارہ ہو گئے ہو۔ بڑوں کا شرم و لحاظ اب تمہاری آنکھوں میں بالکل نہیں رہا۔ خواجہ صاحب سے کہہ کر آج ہی تمہاری اچھی طرح گوش مالی کراؤ گا۔“

انار کی چوری کے مقابلے میں کھلے بندوں سکریٹ پینا اور بھی زیادہ خطرناک تھا۔ خواجہ صاحب یعنی میرے ابا جی خود سکریٹ پیتے تھے مگر اپنی اولاد کے لیے انہوں نے اس چیز کو قطعی طور پر منوع قرار دے رکھا تھا۔ ایک روز میرے بڑے بھائی کی جیب میں سے انھیں سکریٹ کی ڈبیال گئی تھی جس پر انہوں نے ایک تھپڑا کر فیصلہ کن لبجے میں یہ الفاظ کہے تھے، ”شقیلین اگر میں نے تمہاری جیب میں پھر سکریٹ کی ڈبیاد کیکھی تو میں تمہیں اسی وقت گھر سے باہر نکال دوں گا۔۔۔ سمجھ گئے؟“

شقیلین سمجھ گیا تھا۔ چنانچہ وہ ہر روز صرف ایک سکرت لاتا تھا اور پاسخنا نے میں جا کر پیا کرتا تھا۔

میں شقیلین سے عمر میں تین برس چھوٹا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میر اسکریٹ پینا اور وہ بھی بازاروں میں کھلے بندوں۔۔۔ ابا جی کسی طرح برداشت نہ کرتے۔ شقیلین کو تو انہوں نے صرف دھمکی دی تھی مگر مجھے وہ یقیناً گھر سے باہر نکال دیتے۔

گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے غسل خانے میں جا کر صدقِ دل سے دعائیں کیا کہ اے خد! ابا جی کو میرے سکریٹ پینے کا کچھ علم نہ ہو۔ دعائیں کے بعد میرے دل پر سے خوف کا بوجھ ہلاکا ہو گیا اور میں اوپر چلا گیا۔

آپ کہیں گے کہ میں خاص طور پر غسل خانے میں داخل ہو کر، ہی کیوں دعا مانگتا تھا۔ دعا کہیں بھی مانگی جا سکتی ہے۔ درست ہے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں دل میں اگر کوئی بات سوچوں تو اس کے ساتھ اور بہت سی غیر ضروری باتیں خود بخود آ جاتی ہیں۔ میں نے گھر لوٹتے ہوئے راستے میں دعا مانگی تھی مگر میرے دل میں کئی اوت پٹانگ باتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ دعا اور یہ باتیں خلط ملط ہو کر ایک بے ربط عبارت بن گئی تھی۔

”اللہ میاں۔۔۔ میں نے سکریٹ۔۔۔ بیڑا غرق ایک پوری ڈبیا سگر ٹوں کی میرے نیکر کی جیب میں پڑی ہے۔ اگر کسی نے دیکھ لی تو کیا ہو گا۔۔۔ کہیں ٹھلین ہی نہ لے اڑے۔۔۔ اللہ میاں۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سکریٹ پینے میں کیا برائی ہے؟ اباجی نے چھٹی جماعت سے پینے شروع کیے تھے۔۔۔ اللہ میاں۔۔۔ سگرٹ والے کے سارے تیرہ آنے میری طرف نکلتے ہیں۔ ان کی ادائیگی کیسے ہو گی اور اسکوں میں مٹھائی والے کے بھی چھ آنے دینا ہیں۔۔۔ مٹھائی اس کی بالکل وابیات ہے لیکن میں کھاتا کیوں ہوں۔۔۔؟ اللہ میاں مجھے معاف کر دے۔۔۔ جو سکریٹ اباجی پینتے ہیں ان کا مزا کچھ اور ہی قسم کا ہوتا ہے۔۔۔ پان کھا کر سکریٹ پینے کا لطف دو بالا ہو جاتا ہے۔۔۔ اللہ میاں۔۔۔ اب کے نہر پہ جائیں گے تو سگر ٹوں کا ذبہ ضرور خریدیں گے۔۔۔ کب تک سکریٹ والا ادھار دیتا ہے گا۔۔۔ اُمی جان کا بُوہ۔۔۔ اللہ میاں مجھے معاف کر دے۔“

میں دل ہی دل میں خاموش دعا مانگوں تو یہی گڑ بڑ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مجھے غسل خانے کے اندر جانا پڑتا تھا۔ دروازہ بند کر کے میں وہاں اپنے خیالات کو آوارہ نہیں ہونے دیتا تھا۔ میلی چھت کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ سانس روکا اور ہولے ہولے دعا مانگنا شروع کر دی۔۔۔ عجیب بات ہے کہ جو دعائیں نے اس غلیظ غسل خانے میں مانگی، قبول ہوئی۔ انار کی چوری کا اباجی کو کچھ علم نہ ہوا۔ سکریٹ پینے کے متعلق بھی وہ کچھ جان نہ سکے اس لیے کہ ان کا دوست اس روز شام کو ٹکڑے چلا گیا جہاں اس نے مستقل رہائش اختیار کر لی۔

غسل خانے سے میرا اعتقاد اور بھی پختہ ہو گیا۔ جب میں نے دسویں جماعت کا امتحان دینے کے دوران میں دعا مانگی اور وہ قبول ہوئی۔ جیو میستری کا پرچہ تھا۔ میں نے غسل خانے میں جا کر تمام پری پوزیشنیں کتاب سے پھاڑ کر اپنے پاس رکھ لیں اور دعا مانگی کہ کسی ممتحن کی نظر نہ پڑے اور میں اپنا کام اطمینان سے کر لوں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ میں نے پھاڑے ہوئے اور اق نکال کر کاغذوں کے نیچے ڈیک پر رکھ لیے اور اطمینان سے بیٹھا نقل کرتا رہا۔

ایک بار نہیں بچیوں بار میں نے اس غسل خانے میں حالات کی نزاکت محسوس کر کے دعا مانگی جو قبول ہوئی۔ میرے بڑے بھائی ٹھلین کو اس کا علم تھا مگر وہ میری ضعیف الاعتقادی سمجھتا تھا۔۔۔ بھائی کچھ بھی ہو۔ میرا تجربہ یہی کہتا ہے کہ اس غسل خانے میں مانگی ہوئی دعا کبھی

خالی نہیں گئی۔ میں نے اور جگہ بھی دعائیں مانگ کر دیکھی ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی قبول نہیں ہوئی۔ کیوں؟ اس کا جواب نہ میں دے سکتا ہوں اور نہ میرا بڑا بھائی ٹھلیں۔ ممکن ہے آپ میں سے کوئی صاحب دے سکیں۔

چند برس پیچھے کا ایک دلچسپ واقعہ آپ کو سنا تا ہوں۔ میرے پچاچان کی شادی تھی۔ آپ سنگاپور سے اس غرض کے لیے آئے تھے۔ چونکہ ان کا اور ہمارا گھر۔ بالکل ساتھ ساتھ ہے اس لیے جتنی رونق ان کے مکان میں تھی اتنی ہی ہمارے مکان میں بھی تھی بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی کہیے کیونکہ لڑکی والے ہمارے گھر آگئے تھے۔ آدمی آدمی رات ڈھولک کے گیت گائے جاتے تھے۔ ہونے والی دہن سے چھپڑ چھاڑ۔ عجیب و غریب رسماں۔ تیل۔ مہندی اور خدا معلوم کیا کیا کچھ۔ پھوپھو کی چیخنہ و پکار۔ الہ لڑکیوں کی نئی گرگابیوں اور سینڈلوں میں ایک چلت پھرت۔ اوٹ پٹانگ کھیل۔ غرض کہ ہر وقت ایک ہنگامہ مچا رہتا تھا۔

جب اس قسم کی خوش گوار افراتفری پھیلی ہو تو لڑکیوں کو چھپڑ نے کا بہت لطف آتا ہے بلکہ یوں کہیے کہ شادی بیاہ کے ایسے ہنگاموں ہی پر لڑکیوں کو چھپڑ نے کا موقع ملتا ہے۔ ہمارے دور کے رشتہ دار شالیاف تھے۔ ان کی لڑکی مجھے بہت پسند تھی۔ اس سے پہلے تین چار مرتبہ ہمارے یہاں آچکی تھی۔ اس کو دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک رکی ہوئی ہنسی ہے۔ نہیں، میں اپنے ماں الصمیر کو اچھی طرح بیان نہیں کر سکا۔ اس کا سارا وجود کھکھلا کر ہنس اٹھتا اگر اس کو ذرا سا چھپڑ دیا جاتا۔ بالکل ذرا سایعنی اس کو اگر صرف چھو لیا جاتا تو بہت ممکن ہے وہ ہنسی کا فوارہ بن جاتی۔ اس کے ہونٹوں اور اس کی آنکھوں کے کونوں میں، اس کی ناک کے ننھے ننھے ننھوں میں، اس کی پیشانی کی مصنوعی تیوریوں میں، اس کے کان کی لووں میں ہنسی کے ارادے مرتعش رہتے تھے۔ میں نے اس کو چھپڑ نے کا پورا تھیہ کر لیا۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سیڑھیوں کی بقی خراب ہو گئی۔ بلب فیوز ہوا یا کیا گیا، ہبھر حال اچھا ہوا، کیونکہ وہ بار بار کبھی نیچے آتی تھی اور کبھی اوپر جاتی تھی۔ میں غسل خانے کے پاس اندھیرے میں ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اوپر جاتی یا نیچے آتی، مجھ سے اس کی مدد بھیڑ ضرور ہوتی اور میں اندھیرے میں اس سے فائدہ اٹھا کر اپنا کام کر جاتا۔ بات معقول تھی چنانچہ میں کچھ دیر دم سادھے اس کا منتظر رہا۔ اور اس دوران میں اپنی آنکھوں کو تاریکی کا عادی بنا تارہ۔

کسی کے نیچے اترنے کی آواز آئی۔ کھٹ۔۔۔ کھٹ۔۔۔ کھٹ۔۔۔ میں تیار ہو گیا۔۔۔ اب اجی تھے۔ انھوں نے پوچھا کون ہے۔۔۔؟ میں نے کہا، ”جی عباس۔“ انھوں نے اندھیرے میں ایک زور کا طمانچہ میرے منہ پر مارا اور کہا، ”تمہیں شرم نہیں آتی۔ یہاں چھپ کر لڑکیوں کو چھپڑتے ہو۔ ثریا بھی ابھی اپنی ایک سیہلی سے تمہاری اس بیہودہ حرکت کا ذکر کر رہی تھی۔ اگر اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا تو جانتے ہو کیا

ہو گا؟۔۔۔ وہیات کہیں کے۔۔۔ تمہیں اپنی عزت کا خیال نہیں اپنے بڑوں کی آبرو ہی کا کچھ لحاظ کرو۔۔۔ اور ثریا کی ماں نے آج ہی ثریا کے لیے تمہیں مانگا ہے۔۔۔ لعنت ہوتم پر۔“

کھٹ کھٹ کھٹ۔۔۔ کسی کے نیچے اترنے کی آواز آئی۔ اباجی نے میرے حیرت زدہ منہ پر ایک اور طمانچہ رسید کیا اور بڑھاتے چلے گئے۔

کھٹ کھٹ کھٹ۔۔۔ ثریا تھی۔۔۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے ٹھنکی اور حیا آلو دغصے کے ساتھ یہ کہتی چلی گئی۔

”خبردار جواب آپ نے مجھے چھیڑا۔ اگی جان سے کہہ دوں گی۔“ میں اور بھی زیادہ متھیر ہو گیا۔ دماغ پر بہت زور دیا مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ اتنے میں غسل خانے کا دروازہ چرچڑا ہٹ کھلا اور ثقلین باہر نکلا۔

میں نے اس سے پوچھا، ”تم بیہاں کیا کر رہے تھے؟“

اس نے جواب دیا، ”دعا مانگ رہا تھا۔“

میں نے پوچھا، ”کس لیے؟“

مسکرا کر اس نے کہا، ”ثریا کو میں نے چھیڑا تھا۔ میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا۔ اس غسل خانے میں جو دعا مانگی جائے ضرور قبول ہوتی ہے۔۔۔“

-[94]-

پھاتو: سعادت حسن منظو

تیز بخار کی حالت میں اسے اپنی چھاتی پر کوئی ٹھنڈی چیز ریگتی محسوس ہوئی۔ اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ جب وہ مکمل طور پر بیدار ہوا تو اس کا چہرہ بخار کی شدت کے باعث تتمہارا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا چھاتو فرش پر بیٹھی، پانی میں کپڑا بھگو کر اس کے ماتھے پر گا رہی ہے۔

جب چھاتو نے اس کے ماتھے سے کپڑا اتارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے اسے کپڑا لیا۔ اور اپنے سینے پر رکھ کر ہولے ہولے پیار سے اپنا ہاتھ اس پر پھیرنا شروع کر دیا۔

اس کی سرخ آنکھیں دوانگارے بن کر دیر تک چھاتو کو دیکھتی رہیں۔ وہ اس دیکھتی ہوئی ٹکٹکی کی تاب نہ لاسکی اور ہاتھ چھڑا کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اس پر وہ اٹھ کر بستر میں بیٹھ گیا۔۔۔ چھاتو سے، جس کا اصل نام فاطمہ تھا، اس کو غیر محسوس طور پر محبت ہو گئی تھی، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ کردار و اطوار کی اچھی نہیں۔۔۔ محلے میں جتنے لوٹے ہیں اس سے عشق لڑا کچے ہیں۔ لیکن یہ سب جانتے ہوئے بھی اس کو چھاتو سے محبت ہو گئی تھی۔

وہ اگر بخار میں مبتلا نہ ہوتا تو یقیناً اس سے اپنے اس جذبے کا اظہار کبھی نہ کیا ہوتا۔۔۔ مگر تیز بخار کے باعث اس کو اپنے دل و دماغ پر کوئی اختیار نہیں رہتا۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اوپنی آواز میں چھاتو کو پکارنا شروع کیا۔ ”ادھر آؤ۔۔۔ میری طرف دیکھو۔ جانتی ہو، میں تمہاری محبت میں گرفتار ہوں، بہت بری طرح تمہاری محبت میں گرفتار ہوں۔۔۔ اس طرح تمہاری محبت میں پھنس گیا ہوں یعنی کوئی دل دل میں پھنس جائے۔ میں جانتا ہوں تم کیا کیا۔۔۔ میں جانتا ہوں تم اس قابل نہیں ہو کہ تم سے محبت کی جائے۔ مگر یہ سب کچھ جانتے بوجھتے تم سے محبت کرتا ہو۔ لعنت ہو مجھ پر۔ لیکن چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔ اور میری طرف دیکھو، میں بخار کے علاوہ تمہاری محبت میں بھی پھنکا جا رہا ہو۔۔۔ چھاتو۔۔۔ چھاتو۔۔۔ میں۔۔۔ میں“ اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور اس پر ہندیانی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے ڈاکٹر مکندر لال بھائی سے کوئی نقصانات پر بحث شروع کر دی۔

چند لمحات کے بعد وہ اپنی ماں سے جو وہاں موجود نہیں تھی، مخاطب ہوا، ”بی بی جی میرے دماغ میں بے شمار خیالات آرہے ہیں۔ آپ حیران کیوں ہوتی ہیں۔ مجھے چھاتو سے محبت ہے، اسی چھاتو سے جو ہمارے پڑوس میں پنج بندوں کے ہاں ملازم تھی اور جواب آپ کی ملازم ہے۔ آپ نہیں جانتیں اس لڑکی نے مجھے کتنا ذلیل کر دیا ہے۔ یہ محبت نہیں خسرہ ہے، نہیں خسرے سے بڑھ چڑھ کر۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ مجھے تمام ذلتیں برداشت کرنی ہوں گی۔ ساری لگلی کا کوڑا کر کٹ اپنے سر پر اٹھانا ہو گا۔ یہ سب کچھ ہو کے رہے گا، یہ سب کچھ ہو کے رہے گا۔“

آہستہ آہستہ اس کی آواز کمزور ہوتی گئی اور اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھیں نیم واٹھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی پلکوں پر بوجھ سا آن پڑا ہے۔ پھاتوپینگ کے پاس فرش پر بیٹھی اس کی بے جوڑ ہدیانی گفتگو سنتی رہی۔ مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ ایسے بیماروں کی کئی مرتبہ تیار داری کر چکی تھی۔

بخار کی حالت میں جب اس نے اپنی محبت کا اعتراف کیا تو پھاتونے اس کے متعلق کیا محسوس کیا، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس کا گوشت بھرا چہرہ جذبات سے بالکل عاری تھا۔ ممکن ہے کہ اس کے دل کے کسی گوشے میں ہلکی سی سر سراہٹ پیدا ہوئی ہو مگر یہ چربی کی تہوں سے نکل کر باہر نہ آسکی۔

پھاتونے رومال نچوڑ کر تازہ پانی میں بھگوایا اور اس کے ماتھے پر رکھنے کے لیے اٹھی۔ اب کی بارے اس لیے اٹھنا پڑا کہ اس نے کروٹ بدی تھی۔ جب اس نے آہستہ سے اُدھر سے اُدھر سے مڑ کر اس کے ماتھے پر گیلا رومال جمایا تو اس کی نیم واٹھیں یوں کھلیں جیسے لال لال زخموں کے منہ ٹانکے ادھڑ جانے سے کھل جاتے ہیں۔

اس نے ایک لمحے کے لیے پھاتوکے جھکے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے گال ٹھوڑے سے نیچے لٹک آئے تھے۔ پھر ایک دم جانے اس پر کیا وحشت سوار ہوئی، اس نے پھاتوکو اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑ کر اس زور سے اپنی چھاتی کے ساتھ بھینچا کہ اس کی ریڑھ کی بڈی کڑکڑ بول اٹھی۔ پھر اس نے اس کو اپنی رانوں پر لٹا کر اس کے موٹے اور گدگدے ہونٹوں پر اس زور سے اپنے تپتے ہوئے ہونٹ پیوست کیے جیسے وہ انھیں داغنا چاہتا ہے۔

اس کی گرفت اس قدر زبردست تھی کہ پھاتوکو شش کے باوجود خود کو آزاد نہ کر سکی۔ اس کے ہونٹ دیر تک اس کے ہونٹوں پر استری کرتے رہے۔ پھر اچانک ہانپتے ہوئے اس نے پھاتوکو ایک جھکلے سے الگ کر دیا اور اٹھ کر بستر میں یوں بیٹھ گیا جیسے اس نے کوئی ڈراؤ ناخواب دیکھا تھا۔

پھاتو ایک طرف سمٹ گئی۔ وہ سہم گئی تھی۔ اس کے لبوں پر ابھی تک اس کی پیڑی جھے ہونٹ سرک رہے تھے۔ جب پھاتونے انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا تو اس پر برس پڑا، ”تم بیہاں کیا کر رہی ہو۔۔۔ ڈائن ہو۔۔۔ میرا کلیجہ نکال کر جانا چاہتی ہو۔۔۔ جاؤ۔۔۔ جاؤ۔۔۔“

یہ کہتے کہتے اس نے اپنے وزنی سر کو دونوں ہاتھوں میں ٹھام لیا جیسے وہ گرپڑے گا اور ہولے ہولے بڑھانے لگا، ”پھاتو مجھے معاف کر دو۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں بس صرف ایک بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے تم سے دیوالگی کی حد تک محبت ہے، اس لیے کہ تم سے محبت کی جائے، میں تم سے محبت کرتا ہوں اس لیے کہ تم نفرت کے قابل ہو۔۔۔ تم عورت نہیں ہو۔۔۔ ایک سالم مکان ہو۔ ایک بہت بڑی بلڈنگ ہو۔ مجھے تمہارے سب کمروں سے محبت ہے۔۔۔ اس لیے کہ وہ غلظی ہیں۔۔۔ شکستہ ہیں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں؟“

پھاتو خاموش رہی۔ اس پر ابھی تک اس آہنی گرفت اور اس کے خوفناک بو سے کا اثر موجود تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر جانے کا ارادہ رہی کہ اس نے پھر ہدیانی کیفیت میں برابر ان انشروع کر دیا۔ پھاتو نے اس کی طرف دیکھا اور وہ کسی غیر مری آدمی سے بتائیں کر رہا تھا۔ بستر پر اس نے بڑی مشکل سے کروٹ بدلتی، پھاتو کو اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھا اور پوچھا، ”کیا کہہ رہی ہو تم؟“

اس نے کچھ بھی نہیں کہا تھا، اس لیے وہ خاموش رہی۔

پھاتو کی خاموشی سے اسے خیال آیا کہ ہدیانی کیفیت میں وہ بے شمار باتیں کر چکا ہے۔ جب اس کو اس بات کا احساس ہوا کہ وہ اپنی محبت کا اظہار بھی اس سے کر چکا ہے تو اسے اپنے آپ پر بے حد غصہ آیا۔ اسی غصے میں وہ پھاتو سے مخاطب ہوا۔ ”میں نے تم سے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل غلط ہے۔۔۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔“

پھاتو نے صرف اتنا کہا ”جی ٹھیک ہو گا۔“

وہ کڑکا، ”صرف ٹھیک ہی نہیں۔۔۔ سو فیصد حقیقت ہے۔۔۔ مجھے تم سے سخت نفرت ہے۔ جاؤ، چلی جاؤ میرے کمرے سے۔ خبردار جو کبھی ادھر کارخ کیا۔“

پھاتو نے حسبِ معمول نرم لمحے میں جواب دیا، ”جی اچھا۔“

یہ کہہ کر وہ جانے لگی کہ اس نے اسے روک لیا، ”ٹھہر د۔۔۔ ایک بات سننی جاؤ۔“

”فرمائیے۔“

”نہیں مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔۔۔ تم جاسکتی ہو۔“

پھاتونے کہا، ”میں جاتور ہی تھی، آپ نے خود مجھے روکا۔“ یہ کہہ اس نے برتن اٹھائے اور کمرے سے نکلنے لگی۔ مگر اس نے پھر اسے آواز دے کر روکا۔

”مُھر و۔۔۔ میں ایک بات تم سے کہنا بھول گیا ہوں۔“

پھاتونے برتن تپائی پر رکھے اور اس سے کہا، ”کیا بات ہے۔۔۔ بتا دیجیے۔۔۔ مجھے اور کام کرنے ہیں۔“

وہ سوچنے لگا کہ اس نے پھاتو کو روکا کیوں تھا۔۔۔ اس سے ایسی کون سی اہم بات کرنا تھی۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پھاتونے اس سے کہا، ”میاں صاحب میں کھڑی انتظار کر رہی ہوں۔۔۔ آپ کو مجھ سے کیا کہنا ہے۔“ وہ بو کھلا گیا، ”مجھے کیا کہنا تھا۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں کہنا تھا۔۔۔ میرا مطلب ہے، کہنا تو کچھ تھا مگر بھول گیا ہوں۔“

پھاتونے برتن تپائی پر رکھے، ”آپ یاد کر لیجیے۔۔۔ میں یہاں کھڑی ہوں۔“

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور یاد کرنے لگا۔ اسے پھاتو سے یہ کہنا تھا۔۔۔ اس کے دماغ میں بے شمار خیالات تھے۔ دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ پھاتو اس کے گھر سے چلی جائے۔ اس لیے کہ وہ اس سے اس قدر نفرت کرتا ہے کہ وہ نفرت بے پناہ محبت میں تبدیل ہو گئی ہے۔

اس نے تھوڑے عرصہ کے بعد آنکھیں کھولیں۔ پھاتو تپائی کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نے سمجھا کہ شاید یہ سب خواب ہے، پرجب اس نے ادھر ادھر کا جائزہ لیا تو اسے معلوم ہوا کہ خواب نہیں حقیقت ہے، لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پھاتو کیوں بت کی مانند اس کی چارپائی کے ساتھ کھڑی ہے۔

اس نے کہا، ”تو یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے؟“

پھاتونے جواب دیا، ”آپ ہی نے تو کہا تھا کہ آپ کو مجھ سے کوئی ضروری بات کہنی ہے۔“

وہ چڑھ گیا، جھنجھلا کر بولا، ”تم سے مجھے کون سی ضروری بات کہنا تھی---جاو---دور ہٹ جاؤ میری نظر وں سے۔“
پھاتونے تشویش ناک نظر وں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایسا لگتا ہے آپ کا بخار تیز ہو گیا ہے---میں بی بی جی سے کہتی ہوں کہ ڈاکٹر کو بلا لیں۔“

وہ اور زیادہ چڑھ گیا، ”ڈاکٹر آیا تو میں اسے گولی مادوں گا---اور تمہارا تو میں ان دوہاتھوں سے گلا گھونٹ دوں گا۔“ پھاتونے اپنے لبھے کو اور زیادہ نرم بنانے کر کہا، ”آپ ابھی گھونٹ ڈالیے---میں اپنی زندگی سے اکتا پچھی ہوں۔“

اس نے پوچھا ”کیوں؟“

”بس اب جی نہیں چاہتا زندہ رہنے کو---میاں صاحب آپ کو معلوم نہیں، میں یہ دن کیسے گزار رہی ہوں---اللہ کی قسم---ایک ایک پل زہر کا گھونٹ ہے---خدا کے لیے آپ میرا گلا گھونٹ کر مجھے مار دیجیے!“

وہ کاف کے اندر کا نپنے لگا---”پھاتو---جاو مجھے تم سے نفرت ہے۔“

پھاتونے بڑی معصومیت سے کہا، ”میں جانے لگتی ہوں---پر آپ مجھے روک لیتے ہیں۔“

اس نے بھنا کر کہا، ”کون حرامزادہ تجھے روکتا ہے---جا---دor ہو جا۔“

پھاتو جانے لگی تو اس نے اسے پھر روک لیا۔۔۔ ”مظہر و!“

”وہ مظہر گئی۔۔۔ فرمائیے۔“

”تم نہایت وہیات عورت ہو۔۔۔ خدا تمہیں غارت کرے۔۔۔ جاؤ اب میری نظر وہ سے غائب ہو جاؤ“ پھا تو بر تن اٹھا کر چلی گئی۔

ایک مہینے بعد محلے میں شور مچا کہ پھا تو کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ سب اس کو بر اجلا کہہ رہے تھے۔ عورت تین خاص طور پر اس کے کردار میں کیڑے ڈال رہی تھیں اور پھا تو اپنے میاں صاحب کے ساتھ ملکتے میں ازدواجی زندگی بسر کر رہی تھی۔

اس کا شوہر ہر روز اس سے کہتا تھا، ”فاطمہ! مجھے تم سے نفرت ہے۔“

اور وہ مسکرا کر جواب دیتی، ”یہ نفرت اگر نہ ہوتی تو میری زندگی کیسے سنورتی۔۔۔ آپ مجھ سے ساری عمر نفرت ہی کرتے رہیئے۔“

-[95]-

سرکندوں کے پیچھے: سعادت حسن مندو

کون سا شہر تھا، اس کے متعلق جہاں تک میں سمجھتا ہوں، آپ کو معلوم کرنے اور مجھے بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ جگہ جو اس کہانی سے متعلق ہے، پشاور کے مضامات میں تھی۔ سرحد کے قریب۔ اور جہاں وہ عورت تھی، اس کا گھر جھونپڑا نما تھا۔۔۔ سرکندوں کے پیچھے۔

گھنی باڑھ تھی، جس کے پیچھے اس عورت کا مکان تھا، کچی مٹی کا بنا ہوا۔ چونکہ یہ باڑھ سے کچھ فاصلے پر تھا، اس لیے سرکندوں کے پیچھے چھپ سا گیا تھا کہ باہر کچی سڑک پر سے گزرنے والا کوئی بھی اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ سرکندے بالکل سوکھے ہوئے تھے مگر وہ کچھ اس طرح زمین میں گڑے ہوئے تھے کہ ایک دیز پر دہ بن گیے تھے۔ معلوم نہیں اس عورت نے خود وہاں پیوسٹ کیے تھے یا پہلے ہی سے موجود تھے۔ بہر حال، کہنا یہ ہے کہ وہ آہنی قسم کے پر دہ پوش تھے۔

مکان کہہ لیجئے یا مٹی کا جھونپڑا، صرف چھوٹی چھوٹی تین کوٹھریاں تھیں مگر صاف سترہی۔ سامان مختصر تھا مگر اچھا۔ پیچھے کرے میں ایک بہت بڑا نواڑی پنگ تھا۔ اس کے ساتھ ایک طاقچہ تھا جس میں سرسوں کے تیل کا دیارات بھر جلتا رہتا تھا۔۔۔ مگر یہ طاقچہ بھی صاف سترہا رہتا تھا۔ اور وہ دیا بھی جس میں ہر روز نیا تیل اور بتی ڈالی جاتی تھی۔

اب میں آپ کو اس عورت کا نام بتا دوں جو اس مختصر سے مکان میں، جو سرکنڈوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا، اپنی جوان بیٹی کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔

مختلف روایتیں ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ اس کی بیٹی نہیں تھی ایک بیتم لڑکی تھی، جس کو اس نے بچپن سے گود لے کر پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کی ناجائز لڑکی تھی۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کا حیال ہے کہ وہ اس کی سگنی بیٹی تھی۔ حقیقت جو کچھ بھی ہے، اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ یہ کہانی پڑھنے کے بعد آپ خود مخدود کوئی نہ کوئی رائے قائم کر لیجئے گا۔

دیکھیے، میں آپ کو اس عورت کا نام بتانا بھول گیا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اس کا نام کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کا نام آپ کچھ بھی سمجھ لیجئے، سکینہ، مہتاب، گلشن یا کوئی اور۔ آخر نام میں کیا رکھا ہے لیکن آپ کی سہولت کی خاطر میں اسے سردار کہوں گا۔

یہ سردار، ادھیر عمر کی عورت تھی۔ کسی زمانے میں یقیناً خوبصورت تھی۔ اس کے سرخ و سفید گالوں پر گوکسی قدر جھریاں پڑ گئی تھیں، مگر پھر بھی وہ اپنی عمر سے کئی برس چھوٹی دکھائی دیتی تھی مگر ہمیں اس کے گالوں سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کی بیٹی، معلوم نہیں وہ اس کی بیٹی یا نہیں، شباب کا بڑا دلکش نمونہ تھی۔ اس کے خدوخال میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکے کہ وہ فاحشہ ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کی ماں اس سے پیشہ کراتی تھی اور خوب دولت کمارہی تھی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس لڑکی کو، جس کا نام پھر آپ کی سہولت کی خاطر نواب رکھے دیتا ہوں، کو اس پیشے سے نفرت نہیں تھی۔

اصل میں اس نے آبادی سے دور ایک ایسے مقام پر پروش پائی تھی کہ اس کو صحیح ازدواجی زندگی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ جب سردار نے اس سے پہلا مرد بستر پر۔۔۔ نوازی پلنگ پر متعارف کروایا تو غالباً اس نے یہ سمجھا کہ تمام لڑکیوں کی جوانی کا آغاز کچھ اسی طرح ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی اس کسبیانہ زندگی سے منوس ہو گئی تھی اور وہ مرد جو دور دور سے چل کر اس کے پاس آتے تھے اور اس کے ساتھ اس بڑے نوازی پلنگ پر لیتتے تھے، اس نے سمجھا تھا کہ یہی اس کی زندگی کا منتہی ہے۔

یوں تو وہ ہر لحاظ سے ایک فاحشہ عورت تھی، ان معنوں میں جن میں ہماری شریف اور مطہر عورتیں ایسی عورتوں کو دیکھتی ہیں، مگر صحیح پوچھیے تو اس امر کا قطعاً احساس نہ تھا کہ وہ گناہ کی زندگی بسر کر رہی ہے۔۔۔ وہ اس کے متعلق غور بھی کیسے کر سکتی تھی جب کہ اس کو اس کا موقع

ہی نہیں ملا تھا۔ اس کے جسم میں خلوص تھا۔ وہ ہر مرد کو جو اس کے پاس ہفتے ڈیڑھ ہفتے کے بعد طویل مسافت طے کر کے آتا تھا، اپنا آپ سپرد کر دیتی تھی، اس لیے کہ وہ یہ سمجھتی تھی کہ ہر عورت کا یہی کام ہے۔ اور وہ اس مرد کی ہر آسائش، اس کے ہر آرام کا خیال رکھتی تھی۔ وہ اس کی کوئی نئی سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اس کو شہر کے لوگوں کے تکلفات کا علم نہیں تھا۔ وہ یہ قطعاً نہیں جانتی تھی کہ جو مرد اس کے پاس آتے ہیں، صحیح سویرے اپنے دانت برش کے ساتھ صاف کرنے کے عادی ہیں اور آنکھیں کھول کر سب سے پہلے بستر میں چائے کی پیالی پیتے ہیں، پھر رفع حاجت کے لیے جاتے ہیں، مگر اس نے آہستہ آہستہ بڑے الہٹ طریقے پر ان مردوں کی عادات سے کچھ واتفیت حاصل کر لی تھی۔ پر اسے بڑی الجھن ہوتی تھی کہ سب مرد ایک طرح کے نہیں ہوتے تھے۔ کوئی صحیح سویرے اٹھ کر سگریٹ مانگتا تھا، کوئی چائے اور بعض ایسے بھی ہوتے جو اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ کچھ ساری رات جا گتے رہتے اور صحیح موڑ میں سوار ہو کر بھاگ جاتے تھے۔

سردار بے فکر تھی۔ اس کو اپنی بیٹی پر، یا جو کچھ بھی وہ تھی، پورا اعتماد تھا کہ وہ اپنے گاہوں کو سنبھال سکتی ہے، اس لیے وہ افیم کی ایک گولی کھا کر کھاٹ پر سوئی رہتی تھی۔ کبھی کبھار جب اس کی ضرورت پڑتی۔۔۔ مثال کے طور پر جب کسی گاہک کی طبیعت زیادہ شراب پینے کے باعث یکدم خراب ہوتی تو وہ غنوڈگی کے عالم میں اٹھ کر نواب کو ہدایات دے دیتی تھی کہ اس کو اچار کھلادے یا کوشش کرے کہ وہ نمک ملا گرم گرم پانی پلا کرے کرادے اور بعد میں تھپکیاں دے کر سلاادے۔

سردار اس معاملے میں بڑی محتاط تھی کہ جو نبی گاہک آتا، وہ اس سے نواب کی فیس پہلے وصول کر کے اپنے نیفے میں محفوظ کر لیتی تھی اور اپنے مخصوص انداز میں دعائیں دے کر کہ تم آرام سے جھولے جھولو، افیم کی ایک گولی ڈیبا میں سے نکال کر منہ میں ڈال کر سو جاتی۔

جور و پیہ آتا، اس کی مالک سردار تھی۔ لیکن جو تحفے تھائے وصول ہوتے، وہ نواب ہی کے پاس رہتے تھے۔ چونکہ اس کے پاس آنے والے لوگ دولت مند ہوتے، اس لیے وہ بڑھایا کپڑا اپنی اور قسم قسم کے پھل اور مٹھائیاں کھاتی تھی۔

وہ خوش تھی۔۔۔ مٹی سے لپے پتے اس مکان میں جو صرف تین چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں پر مشتمل تھا، وہ اپنی دانست کے مطابق بڑی دلچسپ اور خوش گوارزنگی پر کر رہی تھی۔۔۔ ایک فوجی افسر نے اسے گراموفون اور بہت سے ریکارڈ لادیے تھے۔ فرست کے اوقات میں وہ ان کو بجا جا کر فلمی گانے سنتی اور ان کی نقل اتارنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ اس کے گلے میں کوئی رس نہیں تھا مگر شاید وہ اس سے بے خبر

تھی۔۔۔ سچ پوچھئے تو اس کو کسی بات کی خبر بھی نہیں تھی اور نہ اس کو اس بات کی خواہش تھی کہ وہ کسی چیز سے باخبر ہو۔ جس راستے پر وہ ڈال دی گئی تھی، اس کو اس نے قبول کر لیا تھا۔۔۔ بڑی بے خبری کے عالم میں۔

سرکنڈوں کے اس پارکی دنیا کیسی ہے، اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتی تھی سوائے اس کے کہ ایک کچھ سڑک ہے جس پر ہر دوسرے تیسرا دن ایک موڑ دھول اڑاتی ہوئی آتی ہے اور رک جاتی ہے۔ ہارن بجتا ہے۔ اس کی ماں یا جو کوئی بھی وہ تھی، کھٹیا سے اٹھتی ہے اور سرکنڈوں کے پاس جا کر موڑ والے سے کہتی ہے کہ موڑ ذرا دور کھڑی کر کے اندر آجائے۔ اور وہ اندر آ جاتا ہے اور نواڑی پنگ پر اس کے ساتھ بیٹھ کر میٹھی میٹھی باتوں میں مشغول ہو جاتا ہے۔

اس کے ہاں آنے جانے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ یہی پانچ چھ ہوں گے مگر یہ پانچ چھ مستقل گاہک تھے اور سردار نے کچھ ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ ان کا باہم تصادم نہ ہو۔ بڑی ہو شیار عورت تھی۔۔۔ وہ ہر گاہک کے لیے خاص دن مقرر کر دیتی، اور ایسے سلیقے سے کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا تھا۔

اس کے علاوہ ضرورت کے وقت وہ اس کا بھی انتظام کرتی رہتی کہ نواب مان نہ بن جائے۔ جن حالات میں نواب اپنی زندگی گزار رہی تھی، ان میں اس کا مابن جانا یقینی تھا مگر سردار دوڑھائی بر س سے بڑی کامیابی کے ساتھ اس قدر تی خطرے سے بُٹ رہی تھی۔

سرکنڈوں کے پیچھے یہ سلسلہ دوڑھائی بر س سے بڑے ہموار طریقے پر چل رہا تھا۔ پویس والوں کو بالکل علم نہیں تھا۔ بس صرف وہی لوگ جانتے تھے جو وہاں آتے تھے۔ یا پھر سردار اور اس کی بیٹی نواب، یا جو کوئی بھی وہ تھی۔

سرکنڈوں کے پیچھے، ایک دن مٹی کے اس مکان میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ ایک بہت بڑی موڑ جو غالباً دوچ تھی وہاں آ کے رکی۔ ہارن بجا۔ سردار باہر آئی تو اس نے دیکھا کوئی اجنہی ہے۔ اس نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ اجنہی نے بھی اس سے کچھ نہ کہا۔ موڑ دور کھڑی کر کے وہ اتر اور سیدھا ان کے گھر میں گھس گیا جیسے بر سوں کا آنے جانے والا ہو۔

سردار بہت ٹپٹاٹی، لیکن دروازے کی دہلیز پر نواب نے اس اجنہی کا بڑی پیاری مسکراہٹ سے خیر مقدم کیا اور اسے اس کمرے میں لے گئی جس میں نواڑی پنگ تھا۔ دونوں اس پر ساتھ ساتھ بیٹھے ہی تھے کہ سردار آگئی۔۔۔ ہو شیار عورت تھی۔ اس نے دیکھا کہ اجنہی کسی دولت

مند گھرانے کا آدمی ہے۔ خوش شکل ہے، صحت مند ہے۔ اس نے اندر کو ٹھری میں داخل ہو کر سلام کیا اور پوچھا، ”آپ کو ادھر کارستہ کس نے بتایا؟“

اجنبی مسکرا بیا اور بڑے پیار سے نواب کے گوشت بھرے گالوں میں اپنی انگلی چھو کر کہا، ”اس نے؟“

نواب ترپ کر ایک طرف ہٹ گئی، ایک ادا کے ساتھ کہا، ”ہائیں۔۔۔ میں تو کبھی تم سے ملی بھی نہیں؟“

اجنبی کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اور زیادہ پھیل گئی۔ ”ہم تو کئی بار تم سے مل چکے ہیں۔“

نواب نے پوچھا، ”کہاں۔۔۔ کب؟“ حیرت کے عالم میں اس کا چھوٹا سامنہ کچھ اس طور پر واہوا کہ اس کے چہرے کی دلکشی میں اضافے کا موجب ہو گیا۔ اجنبی نے اس کا گدگداہاتھ پکڑ لیا اور سردار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”تم یہ بتیں ابھی نہیں سمجھ سکتیں۔۔۔ اپنی ماں سے پوچھو۔“

نواب نے بڑے بھول پن کے ساتھ اپنی ماں سے پوچھا کہ یہ شخص اس سے کب اور کہاں ملا تھا۔ سردار سارا معاملہ سمجھ گئی کہ وہ لوگ جو اس کے یہاں آتے ہیں، ان میں سے کسی نے اس کے ساتھ نواب کا ذکر کیا ہو گا اور سارا اتنا بتا دیا ہو گا چنانچہ اس نے نواب سے کہا، ”میں بتا دوں گی تمہیں۔“ اور یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔ کھلی پر بیٹھ کر اس نے ڈیبا میں سے افیم کی گولی نکالی اور لیٹ گئی۔ وہ مطمئن تھی کہ آدمی اچھا ہے گڑ بڑ نہیں کرے گا۔

واثق سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن اغلب یہی ہے کہ اجنبی جس کا نام ہبیت خان تھا اور ضلع ہزارہ کا بہت بڑا رہنیں تھا، نواب کے الہڑپن سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے رخصت ہوتے وقت سردار سے کہا کہ آئندہ نواب کے پاس اور کوئی نہ آیا کرے۔ سردار ہوشیار عورت تھی۔ اس نے ہبیت خان سے کہا، ”خان صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔ کیا آپ اتنا روپیہ دے سکیں گے کہ۔۔۔“

ہبیت خان نے سردار کی بات کاٹ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور سوسو کے نوٹوں کی ایک موٹی گذی نکالی اور نواب کے قدموں میں پھینک دی۔ پھر اس نے اپنی ہیرے کی انگوٹھی انگلی سے نکالی اور نواب کو پہنا کر تیزی سے سر کنڈوں کے اس پار چلا گیا۔

نواب نے نوٹوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بس دیر تک اپنی سمجھتی رہی جس پر کافی بڑے ہیرے سے رنگ رنگ کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ موڑ اسٹارٹ ہوئی اور دھول اڑاتی چلی گئی۔ اس کے بعد وہ چوکی اور سر کنڈوں کے پاس آئی، مگر اب گرد و غبار کے سوا سڑک پر کچھ نہ تھا۔

سردار نوٹوں کی گلڈی اٹھا کر انھیں گنچی تھی۔ ایک نوٹ اور ہوتا تو پورے دو ہزار تھے۔ مگر اس کو اس کا افسوس نہیں تھا۔ سارے نوٹ اس نے اپنی گھیرے دار شلوار کے نینفے میں بڑی صفائی سے اڑا سے اور نواب کو چھوڑ کر اپنی کھڈیا کی طرف بڑھی اور ڈبیا میں سے انہیں کی ایک بڑی گولی نکال کر اس نے منہ میں ڈالی اور بڑے اطمینان سے لیٹ گئی اور دیر تک سوتی رہی۔

نواب بہت خوش تھی۔ بار بار اپنی اس انگلی کو دیکھتی تھی جس پر ہیرے کی انگوٹھی تھی۔۔۔ تین چار روز گزر گیے۔ اس دوران میں اس کا ایک پرانا گاہک آیا جس سے سردار نے کہہ دیا کہ پولیس کا خطروہ ہے، اس لیے اس نے یہ دھنہ بند کر دیا ہے۔ یہ گاہک جو خاص ادالت مند تھا، بے نسل و مرام واپس چلا گیا۔ سردار کو ہبیت خان نے بہت متاثر کیا تھا۔ اس نے انہیں کھا کر پینگ کے عالم میں سوچا تھا کہ اگر آمدن اتنی ہی رہے جتنی کہ پہلے تھی اور آدمی صرف ایک ہو تو ہبہت اچھا ہے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ باقیوں کو آہستہ آہستہ یہ کہہ کر ٹرخادے گی کہ پولیس والے اس کے پیچھے ہیں اور یہ نہیں دیکھ سکتی کہ ان کی عزت خطرے میں پڑے۔

ہبیت خان ایک ہفتے کے بعد نمودار ہوا۔ اس دوران میں سردار دو گاہکوں کو منع کر چکی تھی کہ وہ اب ادھر کارخ نہ کریں۔ وہ اسی شان سے آیا جس شان سے پہلے روز آیا تھا۔ آتے ہی اس نے نواب کو اپنی چھاتی کے ساتھ بھیجن لیا۔ سردار نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ نواب اسے۔۔۔ بلکہ یوں کہیے کہ ہبیت خان اسے اس کو ٹھری میں لے گیا جہاں نواڑی پلنگ تھا۔ اب کے سردار اندر نہ آئی اور اپنی کھڈیا پر انہیں کی گولی کھا کر ادھر گھٹتی رہی۔

ہبیت خان بہت محظوظ ہوا۔ اس کو نواب کا الہڑپن اور بھی زیادہ پسند آیا۔ وہ پیشہ ور رنڈیوں کے چلت روں سے قطعاً ناواقف تھی۔ اس میں وہ گھر لیوپن بھی نہیں تھا جو عام عورتوں میں ہوتا ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات تھی جو خود اس کی اپنی تھی۔ دوسروں سے مختلف۔ وہ بستر میں اس کے ساتھ اس طرح لیٹتی تھی، جس طرح بچہ اپنی ماں کے ساتھ لیٹتا ہے۔ اس کی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ اس کی ناک کے نہتوں میں انگلیاں ڈالتا ہے، اس کے بال نوچتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ سو جاتا ہے۔

ہبیت خان کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اس کے لیے عورت کی یہ قسم بالکل نرالی، دلچسپ اور فرحت بخش تھی۔ وہ اب ہفتے میں دوبار آنے لگا تھا۔ نواب اس کے لیے ایک بے پناہ کشش بن گئی تھی۔ سردار خوش تھی کہ اس کے نیفے میں اڑانے کے لیے کافی نوٹ مل جاتے ہیں۔۔۔ لیکن نواب اپنے الہ پن کے باوجود بعض اوقات سوچتی تھی کہ ہبیت خان ڈراؤر اسکیوں رہتا ہے۔ اگر کچھ سڑک پر سے، سرکندوں کے اس پار کوئی لاری یا موڑ گزرتی ہے تو وہ کیوں سہم جاتا ہے۔ کیوں اس سے الگ ہو کر باہر نکل جاتا ہے اور چھپ چھپ کر دیکھتا ہے کہ کون تھا۔

ایک رات بارہ بجے کے قریب سڑک پر سے کوئی لاری گزری۔ ہبیت خان اور نواب دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے سور ہے تھے کہ ایک دم ہبیت خان بڑے زور سے کانپا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نواب کی نیند بڑی ہلکی تھی۔ وہ کانپا تو وہ سر سے پیر تک یوں لرزی جیسے اس کے اندر زلزلہ آگیا ہے۔ چھ کر اس نے پوچھا، ”کیا ہوا؟“

ہبیت خان اب کسی قدر سنبھل چکا تھا۔ اس نے خود کو اور زیادہ سنبھال کر اس سے کہا، ”کوئی بات نہیں۔۔۔ میں۔۔۔ میں شاید خواب میں ڈر گیا تھا۔“

لاری کی آواز دور سے رات کی خاموشی میں ابھی تک آرہی تھی۔

نواب نے اس سے کہا، ”نہیں خان۔۔۔ کوئی اور بات ہے۔ جب بھی کوئی موڑ یا لاری سڑک پر سے گزرتی ہے، تمہاری یہی حالت ہوتی ہے۔“

ہبیت خان کی شاید یہ دلکشی رگ تھی جس پر نواب نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس نے اپنا مردانہ و قار قائم رکھنے کے لیے بڑے تیز لمحے میں کہا، ”بکتی ہو تم۔۔۔ موڑوں اور لاریوں سے ڈرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“

نواب کا دل بہت نازک تھا۔ ہبیت خان کے تیز لمحے سے اس کو ٹھیس لگی اور اس نے بلک بلک کرونا شروع کر دیا۔ ہبیت خان نے جب اس کو چپ کرایا تو وہ اپنی زندگی کے ایک لطیف ترین خطے سے آشنا ہوا اور اس کا جسم نواب کے جسم سے اور زیادہ قریب ہو گیا۔

ہبیت خان اپنے قد کا ٹھہ کا آدمی تھا۔ اس کا جسم گھٹا ہوا تھا۔ خوبصورت تھا۔ اس کی بانخوں میں نواب نے پہلی بار بڑی پیاری حرارت محسوس کی تھی۔ اس کو جسمانی لذت کی الف بے اسی نے سکھائی تھی۔ وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ یوں کہیے کہ وہ شے جو محبت ہوتی ہے، اس کے معانی اب اس پر آشکار ہو رہے تھے۔ وہ اگر ایک ہفتہ غائب رہتا تو نواب گراموفون پر دردیلے گیتوں کے ریکارڈ لگا کر خود ان کے ساتھ گاتی اور آہیں بھرتی تھی۔ مگر اس کو اس بات کی بڑی الجھن تھی کہ ہبیت خان موڑوں کی آمد و رفت سے کیوں گھبرا تا ہے۔

مہینوں گزر گیے۔ نواب کی سپردگی اور اس کے انفات میں اضافہ ہوتا گیا۔ مگر ادھر اس کی الجھن بڑھتی گئی کہ اب ہبیت خان چند گھنٹوں کے لیے آتا اور افراتغزی کے عالم میں واپس چلا جاتا تھا۔ نواب محسوس کر رہی تھی کہ یہ سب کسی مجبوری کی وجہ سے ہے، ورنہ ہبیت خان کا جی چاہتا ہے کہ وہ زیادہ دیر ٹھہرے۔

اس نے کئی مرتبہ اس سے اس بارے میں پوچھا، مگر وہ گول کر گیا۔ ایک دن صبح سویرے اس کی ڈونج سرکنڈوں کے پار رکی۔ نواب سورہی تھی۔ ہارن بجا تو چونک کراٹھی۔ آنکھیں ملتی ملتی باہر آئی۔ اس وقت تک ہبیت خان اپنی موڑ دور کھڑی کر کے مکان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ نواب دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ اسے اٹھا کر اندر کمرے میں لے گیا جہاں نواڑ کا پلنگ تھا۔

دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ پیار محبت کی باتیں۔۔۔ معلوم نہیں نواب کے دل میں کیا آئی کہ اس نے اپنی زندگی کی پہلی فرماکش کی۔

”خان۔۔۔ مجھے سونے کے کڑے لادو۔“

ہبیت خان نے اس کی موٹی موٹی گوشہ بھری سرخ و سفید کلائیوں کو کئی مرتبہ چوما اور کہا، ”کل ہی آجائیں گے۔ تمہارے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔“

نواب نے ایک ادا کے ساتھ، مگر اپنے مخصوص الہ انداز میں کہا، ”خان صاحب۔۔۔ جانے دیجیے۔۔۔ جان تو مجھے ہی دینی پڑے گی۔“

ہبیت خان یہ سن کر کئی بار اس کے صدقے ہوا۔۔۔ اور بڑا پر لطف وقت گزار کے چلا گیا، اور وعدہ کر گیا کہ وہ دوسرے دن آئے گا اور سونے کے کڑے اس کے نرم نرم ہاتھوں میں خود پہنانے گا۔

نواب خوش تھی۔ اس رات وہ دیر تک سرت بھرے ریکارڈ بجایا کر اس چھوٹی سی کوٹھری میں ناچتی رہی جس پر نواڑی پنگ تھا۔۔۔ سردار بھی خوش تھی۔ اس رات اس نے پھر اپنی ڈبیا سے افیم کی ایک بڑی گولی نکالی اور اسے لگل کر سو گئی۔

دوسرے دن نواب اور زیادہ خوش تھی کہ سونے کے کڑے آنے والے بیس اور ہبیت خان خود اس کو پہنانے والا ہے۔ وہ سارا دن منتظر رہی پر وہ نہ آیا۔ اس نے سوچا شاید موڑ خراب ہو گئی ہو۔۔۔ شاید رات ہی کو آئے مگر وہ ساری رات جاگتی رہی اور ہبیت خان نہ آیا۔ اس کے دل کو، جو بہت نازک تھا، بڑی ٹھیس پکھی۔ اس نے اپنی ماں کو، یا جو کچھ بھی وہ تھی، بار بار کہا، ”دیکھو، خان نہیں آیا، وعدہ کر کے پھر گیا ہے۔“ لیکن پھر وہ سوچتی اور کہتی، ”ایسا نہ ہو، کچھ ہو گیا ہو۔“ اور وہ سہم جاتی۔

کئی باتیں اس کے دماغ میں آتی تھیں۔ موڑ کا حادثہ، اچانک پیاری، کسی ڈاکو کا حملہ۔۔۔ لیکن باہر اس کو لاریوں اور موڑوں کی آوازوں کا خیال آتا تھا جن کو سن کر ہبیت خان ہمیشہ بوکھلا جاتا تھا۔۔۔ وہ اس کے متعلق پھر وہ سوچتی تھی، مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران میں اس کا کوئی پرانا گاہک بھی نہ آیا، اس لیے کہ سردار ان سب کو منع کر چکی تھی۔ تین چار لاریاں اور دو موڑیں البتہ اس کچی سڑک پر سے دھول اڑاتی گزریں۔ نواب کا ہر بار یہی بھی چاہا کہ دوڑتی ہوئی ان کے پیچے جائے اور ان کو آگ لگادے۔ اس کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہی وہ چیزیں ہیں جو ہبیت خان کے یہاں آنے میں رکاوٹ کا باعث ہیں، مگر پھر سوچتی کہ موڑیں اور لاریاں رکاوٹ کا کیا باعث ہو سکتی ہیں، وہ اپنی کم عقلی پر ہنستی۔

لیکن یہ بات اس کے فہم سے بالاتر تھی کہ ہبیت خان جیسا تنومند مردان کی آواز سن کر سہم کیوں جاتا ہے۔ اس حقیقت کو اس کے دماغ کی پیدا کی ہوئی دلیل جھلنا نہیں سکتی تھی۔ اور جب ایسا ہوتا تو بے حد رنجیدہ اور مغموم ہو جاتی اور گراموفون پر دردیلے ریکارڈ لگا کر سننا شروع کر دیتی اور اس کی آنکھیں نمناک ہو جاتیں۔

ایک ہفتے کے بعد دوپہر کو جب نواب اور سردار کھانا کھا کر فارغ ہو چکی تھیں اور پچھلے دیر آرام کرنے کی سوچ رہی تھیں کہ اچانک باہر سڑک پر سے موڑ کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ دونوں یہ آواز سن کر چونکیں کیوں کہ ہبیت خان کی ڈونج کے ہارن کی آواز نہیں تھی۔۔۔ سردار باہر لپکی کہ دیکھے کون ہے، پرانا آدمی ہوا تو اسے ٹرخا دے گی۔ مگر جب وہ سرکنڈوں کے پاس پہنچی تو اس نے دیکھا کہ ایک نئی موڑ میں ہبیت خان بیٹھا ہے۔ پچھلی نشست پر ایک خوش پوش اور خوبصورت عورت ہے۔

ہبیت خان نے موڑ کچھ دور کھڑی کی اور باہر نکلا۔ اس کے ساتھ ہی پچھلی نشست سے وہ عورت ۔۔۔ دونوں ان کے مکان کی طرف بڑھے۔ سردار نے سوچا کہ یہ کیا سلسلہ ہے۔ عورت کے لیے تو ہبیت اتنی دور سے چل کر یہاں آتا ہے، پھر یہ عورت جو اتنی خوبصورت ہے، جوان ہے، قیمتی کپڑوں میں مبوس ہے، اس کے ساتھ یہاں کیا کرنے آئی ہے۔

وہ ابھی یہ سوچ رہی تھی کہ ہبیت خان اس خوبصورت کے ساتھ جس نے بیش قیمت زیور پہنے ہوئے تھے، مکان میں داخل ہو گیا۔ وہ ان کے پیچے پیچے چلے گی۔ اس کی طرف ان دونوں میں سے کسی نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ جب وہ اندر گئی تو ہبیت خان، نواب اور وہ عورت تینوں نواڑی پنگ پر بیٹھے تھے اور خاموشی طاری تھی ۔۔۔ عجیب قسم کی خاموشی۔ زیوروں سے لدی چندی عورت البتہ کسی قدر مضطرب نظر آتی تھی کہ اس کی ایک ٹانگ بڑے زور سے ہل رہی تھی۔

سردار دہلیز کے پاس ہی کھڑی ہو گئی۔ اس کے قدموں کی آہٹ سن کر جب ہبیت خان نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے سلام کیا۔۔۔ ہبیت خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سخت بوکھلا یا ہوا تھا۔ اس عورت کی ٹانگ ہلنا بند ہوئی اور وہ سردار سے مخاطب ہوئی، ”ہم آئے ہیں۔ کھانے پینے کا تو بندوبست کرو۔“ سردار نے سرتاپا مہمان نواز بن کر کہا، ”تو تم کہو، ابھی تیار ہو جاتا ہے۔“ اس عورت نے جس کے خدوخال سے صاف مترشح تھا کہ بڑی دھڑکے کی عورت ہے، سردار سے کہا، ”تو چلو تم باور پی خانے میں ۔۔۔ چولہا سلگاؤ۔۔۔ بڑی دیکھی ہے گھر میں؟“

”ہے!“ سردار نے اپنا وزنی سر ہلا کیا۔

”تو جاؤ اس کو دھو کر صاف کرو۔ میں ابھی آئی۔“ وہ عورت پنگ پر سے اٹھی اور گراموفون کو دیکھنے لگی۔

سردار نے معذرت بھرے لجھے میں اس سے کہا، ”گوشت وغیرہ تو، یہاں نہیں ملے گا۔“

اس عورت نے ایک ریکارڈ پر سوئی رکھی، ”مل جائے گا۔ تم سے جو کہا ہے، وہ کرو۔۔۔ اور دیکھو آگ کافی ہو۔“

سردار یہ احکام لے کر چل گئی۔ اب وہ خوش پوش عورت مسکرا کر نواب سے مخاطب ہوئی، ”نواب! ہم تمہارے لیے سونے کے کڑے لے کر آئے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا وینٹی بیگ کھولا اور اس میں سے باریک سرخ کاغذ میں لپٹے ہوئے کڑے نکالے جو کافی وزنی اور خوبصورت تھے۔

نواب اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے خاموش ہیبت خان کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے کڑوں کو ایک نظر دیکھا اور اس سے بڑی نرم و نازک مگر سہمی ہوئی آواز میں پوچھا، ”خان یہ کون ہے؟“ اس کا اشارہ اس عورت کی طرف تھا۔

وہ عورت کڑوں سے کھیلتے ہوئے بولی، ”میں کون ہوں۔۔۔ میں ہیبت خان کی بہن ہوں۔“ اور یہ کہہ کر اس نے ہیبت خان کی طرف دیکھا جو اس کے اس جواب پر سکھ رکھا۔ پھر وہ نواب سے مخاطب ہوئی، ”میرا نام ہلاکت ہے۔“

نواب کچھ نہ سمجھی۔ مگر وہ اس عورت کی آنکھوں سے خوف کھارہی تھی جو یقیناً نوبصورت تھیں مگر بڑے خوفاک طور پر کھلی۔ ان میں جیسے آگ برس رہی تھی۔

وہ آگے بڑھی اور اس نے سمٹی ہوئی، سہمی ہوئی نواب کی کلامیاں پکڑیں اور اس میں کڑے ڈالنے لگی۔ لیکن اس نے اس کی کلامیاں چھوڑ دیں اور ہیبت خان سے مخاطب ہوئی، ”تم جاؤ ہیبت خان۔۔۔ میں اسے اچھی طرح سجا بنا کر تمہاری خدمت میں پیش کرنا چاہتی ہوں۔“ ہیبت خان مبہوت تھا۔ جب وہ نہ اٹھا توہ عورت جس نے اپنانام ہلاکت بتایا تھا، ذرا تیزی سے بولی۔ ”جاؤ۔۔۔ تم نے سنا نہیں؟“ ہیبت خان، نواب کی طرف دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ بہت مضطرب تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائے اور کیا کرے۔

مکان کے باہر جو برآمدہ ساتھا، اس کے ایک کونے میں ٹاٹ لگا بارچی خانہ تھا۔ جب وہ اس کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سردار آگ سلاگ چکی ہے۔ اس نے اس سے کوئی بات نہ کی اور سرکنڈوں کے اس پار سڑک پر چلا گیا۔۔۔ اس کی حالت نیم دیوانوں کی سی تھی۔ ذرا سی آہٹ پر بھی وہ چونک اٹھتا تھا۔ جب اس کو دور سے ایک لاری آتی ہوئی دکھائی دی تو اس نے سوچا کہ وہ اسے روک لے اور اس میں بیٹھ کر وہاں سے غائب ہو جائے۔ مگر جب وہ پاس آئی تو ایسی دھول اڑی کہ وہ اس میں غائب ہو گیا۔ اس نے آوازیں دیں، مگر گرد کے باعث اس کا حلقت اس قابل ہی نہیں تھا کہ بلند آوازنکاں سکے۔

گرد و غبار کم ہوا تو ہیبت خان نیم مردہ تھا۔۔۔ اس نے چاہا کہ سرکنڈوں کے پیچھے اس مکان میں جائے جہاں اس نے کئی دن اور کئی راتیں نواب کے الہڑپہلو میں گزاری تھیں، مگر وہ نہ جاسکا۔ اس کے قدم ہی نہیں اٹھتے تھے۔

وہ بہت دیر تک کچی سڑک پر کھڑا سوچتا رہا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ وہ عورت جو اس کے ساتھ آئی تھی، اس کے ساتھ اس کے کافی پرانے تعلقات تھے، صرف اس بنابر کہ بہت دیر ہوئی، وہ اس کے خاوند کی موت کا افسوس کرنے لگا تھا جو اس کا لنگوٹیا تھا۔ مگر اتفاق سے یہ ماتم پر سی ان دونوں کے باہمی تعلق میں تبدیل ہو گئی۔ خاوند کی موت کے دوسرے ہی دن وہ اس کے گھر میں تھا، اور اس عورت نے اس کو ایسے تحکم سے اندر بلکر اپنا آپ اس کے سپرد کیا تھا جیسے وہ اس کا نوکر ہے۔

ہبیت خان عورت کے معاملے میں بالکل کو راتھا۔ جب شاہینہ نے اس سے اپنے عجیب و غریب تحکم بھرے اتفاقات کا اظہار کیا تو اس کے لیے یہی بڑی بات تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہینہ کے پاس بے اندازہ دولت تھی۔ کچھ اپنی اور کچھ اپنے مرحوم خاوند کی، مگر اسے اس دولت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کو شاہینہ سے صرف یہی دلچسپی تھی کہ وہ اس کی زندگی کی سب سے پہلی عورت تھی۔ وہ اس کے تحکم کے نیچے شاید اس لیے دب کے رہ گیا تھا کہ وہ بالکل اندازی تھا۔

بہت دیر تک وہ کچی سڑک پر کھڑا سوچتا رہا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ سرکنڈوں کے پیچھے مکان کی طرف بڑھا تو اس نے برآمدے میں ٹاٹ لگے باورچی خانے میں سردار کو کچھ بھونتے ہوئے دیکھا۔ اندر اس کمرے کی طرف گیا جہاں نواڑ کا پلنگ تھا تو دروازہ بند پایا۔ اس نے ہولے سے دستک دی۔

چند لمحات کے بعد دروازہ کھلا۔ کچھ فرش پر اس کو سب سے پہلے خون ہی خون نظر آیا۔ وہ کانپ اٹھا۔ پھر اس نے شاہینہ کو دیکھا جو دروازہ کے پڑ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نے ہبیت خان سے کہا، ”میں نے تمہاری نواب کو سجا بنا دیا ہے!“ ہبیت خان نے اپنے خشک گلے کو تھوک سے کسی تدر ترکر کے اس سے پوچھا، ”کہاں ہے؟“ شاہینہ نے جواب دیا۔ ”کچھ تو اس پلنگ پر ہے۔۔۔ لیکن اس کا بہترین حصہ باورچی خانہ میں ہے۔“

ہبیت خان پر اس کا مطلب سمجھے بغیر ہبیت طاری ہو گئی۔ وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ وہیں دہلیز کے پاس کھڑا رہا۔ مگر اس نے دیکھا کہ فرش پر گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی ہیں اور۔۔۔ ایک تیز چھری بھی پڑی ہے۔ اور نواڑی پلنگ پر کوئی لیٹا ہے جس پر خون آسود چادر پڑی ہے۔ شاہینہ نے مسکرا کر کہا، ”چادر اٹھا کر د کھاؤ۔۔۔ تمہاری سمجھی بنی نواب ہے۔۔۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے سنگھار کیا ہے۔۔۔ لیکن تم پہلے کھانا کھالو۔۔۔ بہت بھوک لگی ہو گئی، سردار بڑا لذیذ گوشت بھون رہی ہے۔ اس کی بوٹیاں میں نے خود اپنے ہاتھ سے کاٹی ہیں۔“

ہبیت خان کے پاؤں لڑکھڑائے۔۔۔ زور سے چلایا، ”شاہینہ تم نے یہ کیا کیا!“

شاہینہ مسکرائی۔ ”جان من! یہ پہلی مرتبہ نہیں۔۔۔ دوسری مرتبہ ہے۔ میر اخاوند، اللہ اسے جنت نصیب کرے، تمہاری طرح ہی بے وفا تھا۔ میں نے خود اس کو اپنے ہاتھوں سے مارا تھا اور اس کا گوشت پاک کر چیلوں اور کوؤں کو کھلایا تھا۔۔۔ تم سے مجھے پیار ہے، اس لیے میں نے تمہارے بجائے۔۔۔“

اس نے فقرہ مکمل نہ کیا اور پنگ پر سے خون آسود چادر ہٹادی۔۔۔ بیت خان کی چیخ اس کے حلقت کے اندر ہی دھنسی رہی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ شاہینہ کار چلا رہی ہے اور وہ غیر علاقے میں ہیں۔

-[96]-

پھولوں کی سازش: سعادت حسن منشو

باغ میں جتنے پھول تھے، سب کے سب باغی ہو گئے۔ گلاب کے سینے میں بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اس کی ایک ایک رگ آتشیں جذبہ کے تحت پھڑک رہی تھی۔ ایک روز اس نے اپنی کامنوں بھری گردان اٹھائی اور غور و فکر کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا، ”کسی کو کوئی حق حاصل نہیں کہ ہمارے پیسے سے اپنے عیش کا سامان مہیا کرے۔ ہماری زندگی کی بہاریں ہمارے لیے ہیں اور ہم اس میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کر سکتے۔“

گلاب کامنہ غصہ سے لال ہو رہا تھا۔ اس کی پنکھڑیاں تھر تھر رہی تھیں۔

چنبی کی جھاڑی میں تمام کلیاں یہ شور سن کر جاگ اٹھیں اور حیرت میں ایک دوسرے کامنہ تکنے لگیں۔ گلاب کی مردانہ آواز پھر بلند ہوئی۔

”ہر ذی روح کو اپنے حقوق کی نگرانی کا حق حاصل ہے اور ہم پھول اس سے مستثنی نہیں ہیں۔ ہمارے قلوب زیادہ نازک اور حساس ہیں۔ گرم ہوا کا ایک جھونکا ہماری دنیا کے رنگ و بو کو جلا کر خاکستر کر سکتا ہے اور شبنم کا ایک بے معنی قطرہ ہماری بیاس بجھا سکتا ہے۔ کیا ہم اس کا نے مالی کے کھر درے ہاتھوں کو برداشت کر سکتے ہیں جس پر موسموں کے تغیر و تبدل کا کچھ اثر ہی نہیں ہوتا؟“

موتیا کے پھول چلائے، ”ہر گز نہیں“ لالہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور کہنے لگا، ”اس کے ظلم سے میر اسینہ داغدار ہو رہا ہے۔ میں پہلا پھول ہوں گا جو اس جلاڈ کے خلاف بغاوت کا سرخ جھنڈ اپنند کرے گا۔“ یہ کہہ کروہ غصہ سے قهر تھر کا نپنے لگا۔

چنیلی کی کلیاں متغیر تھیں کہ یہ شور کیوں بلند ہو رہا ہے۔ ایک کلی ناز کے ساتھ گلاب کے پودے کی طرف جھکی اور کہنے لگی، ”تم نے میری نیند خراب کر دی ہے۔ آخر گلا بھلا بھلا کر کیوں چلا رہے ہو؟“

گل خیر وجودور کھڑا گلاب کی قائدانہ تقریر پر غور کر رہا تھا بولا، ”قطرہ قطرہ مل کر دریا بنتا ہے۔ گوہم ناؤں پھول ہیں لیکن اگر ہم سب مل جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی جان کے دشمن کو پیس کرنے رکھ دیں۔ ہماری پیتاں اگر خوشبو پیدا کرتی ہیں تو زہریلی گیس بھی تیار کر سکتی ہیں۔۔۔ بھائیو! گلاب کا ساتھ دو اور اپنی فتح سمجھو۔“ یہ کہہ کر اس نے اخوت کے جذبے کے ساتھ ہر پھول کی طرف دیکھا۔

گلاب کچھ کہنے ہی والا تھا کہ چنیلی کی کلی نے اپنے مرمریں جسم پر ایک قهر تھری پیدا کرتے ہوئے کہا، ”یہ سب بیکار باتیں ہیں۔۔۔ آؤ تم مجھے شعر سناؤ، میں آج تمہاری گود میں سونا چاہتی ہوں۔۔۔ تم شاعر ہو، میرے پیارے آہ! ہم بہار کے ان خوشگوار دنوں کو ایسی فضول باتوں میں ضائع نہ کریں اور اس دنیا میں جائیں جہاں نیند ہی نیند ہے۔۔۔ میٹھی اور راحت بخش نیند!“

گلاب کے سینے میں ایک بیجان بربپا ہو گیا۔ اس کی بعض کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ کسی اتحاہ گہرائی میں اتر رہا ہے۔ اس نے کلی کی گفتگو کے اثر کو دور کرنے کی سعی کرتے ہوئے کہا، ”نہیں میں میداں جنگ میں اترنے کی قسم کھاچکا ہوں۔ اب یہ تمام رومان میرے لیے ممکن ہیں۔“

کلی نے اپنے چکلیے جسم کو بل دے کر خواب گوں لہجہ میں کہا، ”آہ! میرے پیارے گلاب ایسی باتیں نہ کرو، مجھے وحشت ہوتی ہے۔۔۔ چاندنی راتوں کا خیال کرو۔۔۔ جب میں اپنا لباس اتار کر اس نورانی فوارے کے نیچے نہادوں گی تو تمہارے گالوں پر سرخی کا اتار چڑھاوے مجھے کتنا پیارا

معلوم ہو گا اور تم میرے سینیں لب کس طرح دیوانہ وار چومو گے۔۔۔ چھوڑوان فضول باتوں کو میں تمہارے کاندھے پر سر کھکھ سونا چاہتی ہوں۔“

اور چنبلی کی نازک اداکلی گلاب کے تھرا آتے ہوئے گال کے ساتھ لگ کر سو گئی۔۔۔ گلاب مد ہوش ہو گیا۔ چاروں طرف سے ایک عرصہ تک دوسرے پھولوں کی صدائیں بلند ہوتی رہیں مگر گلاب نہ جا گا۔۔۔ ساری رات وہ محور رہا۔

صحیح کانا مالی آیا۔ اس نے گلاب کے پھول کی ٹھنپ کے ساتھ چنبلی کی کلی چمٹی ہوئی پائی۔ اس نے اپنا گھر دراہاتھ بڑھایا اور دونوں کو توڑ لیا۔

-[97]-

گلگت خان: سعادت حسن منٹو

شہباز خان نے ایک دن اپنے ملازم جہانگیر کو، جو اس کے ہوٹل میں اندر باہر کا کام کرتا تھا، اس کی سست روی سے تنگ آکر بر طرف کر دیا۔ اصل میں وہ سست رو نہیں تھا، اس قدر تیز تھا کہ اس کی ہر حرکت شہباز خان کو غیر متحرک معلوم ہوتی تھی۔

شہباز خان نے اس کو مہینے کی تxonah دی۔ جہانگیر نے اس کو سلام کیا اور ٹکٹ کٹا کر سیدھا بلوچستان چلا گیا جہاں کوئی کی کا نہیں نکل رہی تھیں۔ اس کے اور کئی دوست وہیں چلے گئے تھے۔ لیکن اس نے گلگت اپنے بھائی حمزہ خان کو خط لکھا کہ وہ شہباز خان کے یہاں ملازمت کر لے کیونکہ اسے اپنا یہ آقاضند تھا۔

ایک دن حمزہ خان، شہباز خان کے ہوٹل میں آیا اور ایک کارڈ کھا کر اس نے کہا، ”خوام ملازمت چاہتا ہے۔۔۔ امارے بھائی نے لکھا ہے، تم اچھا اور نیک آدمی ہے۔۔۔ خوام بھی اچھا اور نیک ہے۔۔۔ تم کتنا پیسا دے گا؟“

شہباز خان نے حمزہ خان کی طرف دیکھا۔ وہ جہانگیر کا بھائی کسی لحاظ سے بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ناتاساقد، ناک چوڑی چیٹی، نہایت بد شکل۔ شہباز خان نے اسے ایک نظر دیکھ کر اور جہانگیر کا خط پڑھ کر سوچا کہ اس کو نکال باہر کرے۔ مگر آدمی نیک تھا، اس نے کسی سائل کو غالی نہیں جانے دیا تھا۔

حمزہ خان کو چنانچہ اس نے پندرہ روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا اور یہ ہدایت کر دی کہ جو کام اس کے سپرد کیا جائے، ایمان داری سے کرے۔ حمزہ خان نے اپنے بد نما ہونٹوں سے مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے شہباز خان کو بیچین دلایا، ”خان بادشاہ۔۔۔ ام تم کو کبھی تنگ نہیں کرے گا۔ جو کہے گامنے گا۔“ شہباز خان یہ سن کر خوش ہو گیا۔

حمزہ خان نے شروع شروع میں کچھ اتنا اچھا کام نہ کیا لیکن تھوڑے عرصے میں وہ سب کچھ سیکھ گیا۔ چائے کیسے بنائی جاتی ہے، شکر کے ساتھ گڑ کتنا ڈالا جاتا ہے، کوئی والیوں سے کوئی کیسے حاصل کیے جاتے ہیں اور مختلف گاہوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھنا چاہیے۔۔۔ یہ اس نے سیکھ لیا۔

اس میں صرف ایک کمی تھی کہ وہ بے حد بد شکل تھا۔ بد تمیز بھی کسی حد تک تھا۔۔۔ اس لیے کہ اس کی شکل صورت دیکھ کر شہباز خان کے ہوٹل میں آنے جانے والے کچھ غبراء سے جاتے۔ مگر جب گاہک آہستہ آہستہ اس کی بد صورتی سے ماوس ہو گئے تو انہوں نے اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔ بلکہ بعض لوگ تو اس سے دلچسپی لینے لگے، اس لیے کہ وہ کافی دلچسپ چیز تھا۔ مگر اس دلچسپی سے حمزہ خان کو تسلیم نہیں ہوتی تھی۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ محض ہنسی مذاق کی خاطر یہ لوگ جو ہوٹل میں چند گھنٹے گزارنے آتے ہیں، اس سے دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔

یوں حمزہ خان گلگت خان کے نام سے مشہور ہو گیا تھا، اس لیے کہ وہ کافی دیر گلگت میں رہا تھا اور اس ریاست کا ذکر بار بار کیا کرتا تھا۔ اس لیے ہوٹل میں آنے جانے والوں نے اس کا نام گلگت خان رکھ دیا، جس پر حمزہ خان کو اعتراض نہیں تھا۔ حمزہ کے کیا معنی ہوتے ہیں، اس کو معلوم نہیں تھا بلکہ گلگت کا مطلب وہ بخوبی سمجھتا تھا۔

شہباز خان کے ہوٹل میں آئے اس کو قریب قریب ایک برس ہو گیا۔ اس دوران میں اس نے محسوس کیا کہ اس کا مالک شہباز خان اس کی شکل صورت سے متفہر ہے، یہ احساس اسے کھائے جاتا تھا۔

ایک دن اس نے ہوٹل کے باہر کتے کا پلا دیکھا جو اس سے بھی کہیں زیادہ بد صورت تھا۔ اس کو اٹھا کر وہ اپنی کوٹھری میں لے آیا جو اسے ہوٹل کی بالائی منزل پر رہنے سہنے کے لیے دی گئی تھی۔ یہ اتنی چھوٹی تھی کہ اگر کتے کا ایک اور پلا آ جاتا تو وہ اس میں گلگت خان کے ساتھ سما نہ سکتا۔

اس کتے کے پلے کی ٹانگیں ٹیڑھی میرھی تھیں۔۔۔ تھوڑی بڑی واهیات تھی۔۔۔ عجیب بات ہے کہ گلگت خان کی ٹانگیں۔۔۔ بلکہ یوں کہیے کہ اس کا نچلا دھڑ اس کے اوپر کے جسمانی حصے کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا۔ بالکل اس کے مانند یہ پلا بھی سُخ شدہ صورت کا تھا۔

گلگت خان اس سے بہت پیار کرتا۔ شہباز خان نے اس سے کئی مرتبہ کہا کہ میں اس کتے کے بچے کو گولی مار دوں گا۔ مگر گلگت خان اس کو کسی بھی حالت میں اپنے سے جدا کرنے پر راضی نہیں تھا۔ اس نے شروع شروع میں تو اپنے آقا سے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ آخر ایک روز اس سے صاف لفظوں میں اس سے کہہ دیا، ”خو، تم۔۔۔ ہو ٹل کے مالک ہو۔ میرے دوست ٹن ٹن کے مالک نہیں ہو۔“

شہباز خان یہ سن کر چپ ہو گیا۔ گلگت خان بڑا مختنی تھا۔ صحیح پانچ بجے اٹھتا، دو انگلی ٹھیکان سلاگتا، سامنے والے ٹل سے پانی بھرتا اور پھر گاہکوں کی خدمت میں مصروف ہو جاتا۔

اس کا ٹن ٹن تین مہینوں بعد بڑا ہو گیا۔ وہ اس کے ساتھ کوٹھری میں سوتا تھا جو ہو ٹل کی بالائی منزل پر تھی۔۔۔ سردیاں تھیں۔ اس لیے گلگت خان کو اپنے بستر میں اس کی موجودگی بری نہیں معلوم ہوتی تھی۔ بلکہ وہ خوش تھا کہ وہ اس سے اس قدر پیار کرتا ہے کہ رات کو بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔

ٹن ٹن نام گلگت خان کے ایک خاص گاہک نے رکھا تھا، جو اس کی انتہائی بد صورتی کے باوجود اس سے دچپی لیتا۔ یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ کتنے کا وہ پلا جسے وہ سڑک پر سے اٹھا کر اپنے پاس لے آیا تھا اور جس کی گردن میں اس نے اپنی تختواہ میں سے پیسے بچا کر ایک ایسا پٹاؤ لاتھا جس میں گھنکرو بندھے ہوئے تھے۔ اس خاص گاہک نے جو غالباً کسی روزنامے کا کالم نویس تھا، ان گھنکروؤں کی آواز سن کر اس کا نام ٹن ٹن رکھ دیا۔

ٹن ٹن جب بڑا ہوا تو اس کی ٹانگیں اور بھی زیادہ چھوٹی ہو گئیں۔ گلگت خان کی بھی یہی حالت تھی۔ اس کی ٹانگیں بھی دن بہ دن مختصر ہو رہی تھیں۔ اوپر کا دھڑ مناسب و موزوں انداز میں بڑھ گیا تھا۔ شہباز خان کو گلگت خان کا یہ حلیہ پسند نہیں تھا مگر وہ مختنی تھا۔ گدھے کی مانند کام کرتا۔ صحیح پانچ بجے سے لے کر رات کے گیارہ بارہ بجے تک ہو ٹل میں رہتا۔ ایک گھڑی کے لیے بھی آرام نہ کرتا۔ لیکن اس دوران میں وہ تین چار مرتبہ اوپر اپنی کوٹھری میں ضرور جاتا اور اپنے پیارے کتے کی، جواب بڑا ہو گیا تھا، دیکھ بھال کرتا تھا، اس کو ہو ٹل کا چاکھا کھانا دیتا، پانی پلاتا اور پیار کر کے فوراً واپس چلا آتا۔

ایک دن اس کاٹن ٹن بیمار ہو گیا۔ ہوٹل میں اکثر میڈیکل اسٹوڈنٹ آیا کرتے تھے کیونکہ ان کا کان نزدیک ہی تھا۔ گلگت خان نے ان میں سے ایک کو یہ کہتے ہوئے سنائے کہ اگر پیٹ کی شکایت ہو تو مریض کو بیمار غ کا گوشت کھانا چاہیے۔ فاقہ دینا سخت حماقت ہے۔

اس نے اپنے ٹن ٹن کو صبح سے کوئی چیز کھانے کو نہیں دی تھی۔ اس لیے کہ اس کو بد ہضمی تھی۔ مگر جب اس نے اس میڈیکل اسٹوڈنٹس کی بات سنی تو اس نے ادھر ادھر کوئی مرغ تلاش کرنا شروع کیا مگر نہ ملا۔ محلہ ہی کچھ ایسا تھا جس میں کوئی مرغ مرغیاں نہیں پالتا تھا۔

شہباز خان کو بیٹیر بازی کا شوق تھا۔ اس کے پاس ایک بیٹیر تھا جسے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ گلگت خان نے تنکوں کا بنا ہوا پنجھرہ کھولا اور ہاتھ ڈال کر یہ بیٹیر پکڑی۔ کلمہ پڑھ کر اس کو ذبح کیا اور اپنے ٹن ٹن کو کھلادیا۔ شہباز خان نے جب پنجھرہ خالی دیکھا تو بہت پریشان ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ بیٹیر اس میں سے کیسے اڑ گئی۔ وہ تو اس کے اشاروں پر چلتی تھی۔ کئی پالیاں اس نے بڑی شان سے جیتی تھیں۔ اس نے گلگت خان سے پوچھا تو اس نے کہا، ”خوب مجھے کیا مالوم۔۔۔ تمہارا بیٹیر کدھر گیا۔۔۔ بھاگ گیا ہو گا کدھر۔“

شہباز خان نے جب زیادہ جستجو کی تو اس نے دیکھا کہ اس کے ہوٹل کے سامنے جہاں بدرہ تھی، تھوڑا ساخون اور بنچھے ہوئے پر پڑے ہیں۔ یہ بلاشبہ اس کی بیٹیر کے تھے۔ وہ سرپیٹ کر رہ گیا۔ اس نے سوچا کوئی ظالم اس کو بھون کر کھا گیا ہے۔

بیٹیر کے پر اس کے جانے پہچانے تھے۔ اس نے ان کو بڑے پیار سے اکٹھا کیا اور اپنے ہوٹل کے پچھوڑے جہاں کھلامیدان تھا، چھوٹا سا گڑھا کھود کر انھیں دفن کر دیا، فتحہ پڑھی۔ اس کے بعد اس نے کئی غریبوں کو اپنے ہوٹل سے مفت کھانا بھی کھلایا تاکہ مرحوم کی روح کو ثواب پہنچے۔

جب شہباز خان سے کوئی اس کی بیٹیر کے متعلق پوچھتا تو وہ کہتا، ”شہید ہو گیا ہے۔“

گلگت خان یہ سنتا اور اپنے کان سمیٹنے خاموش کام میں مشغول رہتا۔

اس کاٹن ٹن اچھا ہو گیا۔ اس کو جو شکایت تھی، رفع ہو گئی۔ گلگت خان بہت خوش تھا۔ اس نے اپنے پیارے کتنے کی صحت یابی پر دو بھکاریوں کو ہو ٹل سے کھانا کھلا لیا۔ شہباز خان نے پوچھا کہ تم نے ان سے دام و صول کیوں نہیں کیے تو اس نے کہا، ”کبھی کبھی خیرات بھی دے دینا چاہیے خان---“ یہ سن کر شہباز خان چپ ہو گیا۔

ایک دن مینا کا بچہ کہیں سے اڑتا اڑتا گلگت خان کے پاس آگرا، جب کہ وہ کالج کے کسی بڑے کے لیے ناشتہ تیار کر کے لے جا رہا تھا۔ اس نے ناشتے کی ٹرے کو ایک طرف رکھا اور مینا کے بچے کو جو بے حد سہا ہوا تھا، پکڑ کر اس پنجھرے میں ڈال دیا جس میں اس کے مالک شہباز خان کی بیٹر ہوتی تھی۔

مینا کو اس نے سوامینیتک پالا پوسا۔ خاصی موٹی ہو گئی۔ خوب چبکتی تھی۔ ایک دن اس کاٹن ٹن آگرا۔ اس نے مینا کو دیکھا تو بے تاب ہو گیا۔ چاہتا تھا کہ کسی طرح اس تک رسائی ہو جائے اور وہ اسے چباؤ لے۔

گلگت خان نے جب دیکھا کہ پنجھرے اور کھونٹی کے ساتھ ٹریگا ہے جہاں اس کاٹن ٹن نہیں پہنچ سکتا۔ بڑی حسرت بھری نظر وہ سے اسے دیکھ رہا ہے، تو اس نے پنجھرے میں سے مینا کو نکالا۔ اس کے پر نوچے۔ گردن مر وڑی اور اپنے عزیز کتنے کے سپرد کر دی۔

ٹن ٹن نے اس بے بال و پر پرندے کی لاش کو دو تین مرتبہ سو نگھا۔ بڑے زور کی ایک چھینک اس کے نھوں سے باہر نکلی اور وہاں سے دوڑ گیا۔

گلگت خان کو بڑا صدمہ ہوا۔ اسی دن اس کو کالج کی وہ دو لڑکیاں جو باقاعدہ چائے پینے کے لیے آتی تھیں اور جن کا وہ خاص طور پر خیال رکھتا تھا آئیں۔ پہلے وہ اس سے ہنس ہنس کے باتیں کیا کرتی تھیں۔ مگر اب انھیں جانے کیا ہو گیا کہ وہ اس سے خفا خنا نظر آتی تھیں۔ ایک نے جو گلگت خان کو بہت پسند تھی اس سے پوچھا، ”تم نے مینا کیوں ماری؟“

گلگت خان ایک لمحے کے لیے بوکھلا سا گیا، لیکن سنبھل کر اس نے جواب دیا، ”خوبی بی جی--- ام نے اپنے کتنے کو ڈالا تھا۔“

”خو حرام تھم نے اس کو سو نگھا اور چھوڑ دیا۔“

لڑکی نے کہا، ”تو اس کو مارنے سے کیا فائدہ ہوا۔ تم نے پہلے بھی اس کو خان صاحب کی بیٹر ذبح کر کے دی تھی۔ کیا اس نے کھائی تھی؟“

گلگت خان نے بڑے فخر سے جواب دیا، ”کھائی تھی۔۔۔ اس کی بڑیاں بھی۔“

شہباز خان پاس کھڑا تھا۔ اس نے جب یہ سناتوبڑے زور کی ایک دھول اس کی گردن پر جمائی، ”تحم حرام۔۔۔ تم نے اب مانا ہے۔۔۔ پہلے کیوں انکار کرتا تھا۔“

گلگت خان خاموش رہا۔

دونوں لڑکیوں نے قہقہے لگائے۔ گلگت خان کو دھول کا اتنا خیال نہیں تھا لیکن لڑکیوں کے ان قہقہوں نے اس کے دل کو زخمی کر دیا۔

شہباز خان کو بہت غصہ تھا۔ گلگت خان کے دھول جما کروہ اس پر برس پڑا۔ جتنی گالیاں اسے یاد تھیں اپنے نوکر پر صرف کر دیں۔ آخر میں اس سے کہا، ”تم اس ٹن ٹن یا چجن چجن سے اتنا بیمار کیوں کرتا ہے۔۔۔ حرام خور۔۔۔ وہ بھی کوئی کتا ہے۔۔۔ تم سے زیادہ بد شکل ہے۔۔۔ اتنا بد شکل کہ اس کو دیکھ کر نفرت پیدا ہوتا ہے۔“

شہباز خان سے مار کھا کر اور اس کی غصے کی ساری باتیں سن کر گلگت خان اوپر اپنی کوٹھری میں گیا۔۔۔ اس کے کانوں میں کانج کی دونوں لڑکیوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ کوٹھری کے ایک کونے میں اس کا ٹن ٹن لیٹا تھا۔ کچھ عجیب انداز سے ٹالگیں دیوار کے ساتھ لگائے، جو اس قدر ڈیڑھی تھیں کہ اور زیادہ ڈیڑھی ہو ہی نہیں سکتی تھیں۔

اس نے کچھ دیر غور کیا۔ اس کے بعد اپنا کمانی والا چاقو نکالا اور ٹن ٹن کی طرف بڑھا مگر اسے کوئی خیال آیا۔ کمانی والا چاقو بند کر کے اپنی جیب میں رکھا اور کتنے کو بڑے پیارے ساتھ لے گیا۔ جب گلگت خان اور ٹن ٹن ریلوے لائن کے پاس پہنچے تو گاڑی آرہی تھی۔ گلگت خان نے اپنے پیارے کتنے کو حکم دیا کہ وہ پٹری کے عین درمیان کھڑا ہو جائے۔ اس حیوان نے اپنے آقا کے حکم کی تعظیل کی۔

گاڑی پوری رفتار سے آرہی تھی۔ ٹن ٹن پٹری میں کھڑا گلگت خان کی طرف دیکھ رہا تھا۔۔۔ ایسی نگاہوں سے جن سے وفاداری ٹپک رہی تھی۔ گلگت خان نے ایک نظر اپنی طرف دیکھا، اس نے محسوس کیا کہ اس کا کتنا اس سے کہیں زیادہ خوش شکل ہے۔

گاڑی قریب آئی تو اس نے ٹن ٹن کو دھکا دے کر پڑی سے باہر گرا دیا اور خود اس کی جھپٹ میں آگیا۔۔۔ اس کا بالکل قیمہ ہو گیا۔۔۔ کتنے گوشت کے اس ڈھیر کو سونگھا اور زور زور سے بڑی دردناک آواز میں رونے لگا۔

-[98]-

چغد: سعادت حسن منظو

لڑکوں اور لڑکیوں کے معاشقوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ پر کاش جو بہت دیر سے خاموش بیٹھا اندر ہی اندر بہت شدت سے سوچ رہا تھا، ایک دم پھٹ پڑا۔ ”سب بکواس ہے، سو میں سے نانوے معاشقے نہایت ہی بھونڈے اور لچک اور بے ہودہ طریقوں سے عمل میں آتے ہیں۔ ایک باقی رہ جاتا ہے۔ اس میں آپ اپنی شاعری رکھ لیجیا اپنی ذہانت اور ذکاوت بھر دیجیے۔

مجھے حیرت ہے۔۔۔ تم سب تجربہ کار ہو۔ او سط آدمی کے مقابلے میں زیادہ سمجھ دار ہو۔ جو حقیقت ہے، تمہاری آنکھوں سے او جھل بھی نہیں۔ پھر یہ کیا حماقت ہے کہ تم برابر اس بات پر زور دیے جا رہے ہو کہ عورت کو راغب کرنے کے لیے نرم و نازک شاعری، حسین و جمیل شکل اور خوش وضع لباس، عطر، لونڈر اور جانے کس کس خرافات کی ضرورت ہے اور میری سمجھ سے یہ چیز تو بالکل بالاتر ہے کہ عورت سے عشق لڑانے سے پہلے تمام پہلو سوچ کر ایک اسکیم بنانے کی کیا ضرورت ہے۔“

چودھری نے جواب دیا، ”ہر کام کرنے سے پہلے آدمی کو سوچنا پڑتا ہے۔“

پر کاش نے فوراً ہی کہا، ”مانتا ہوں۔ لیکن یہ عشق لڑانا میرے نزدیک بالکل کام نہیں۔ یہ ایک۔۔۔ بھی تم کیوں غور نہیں کرتے۔ کہاںی لکھنا ایک کام ہے۔ اسے شروع کرنے سے پہلے سوچنا ضروری ہے لیکن عشق کو آپ کام کیسے کہہ سکتے ہیں۔۔۔ یہ ایک۔۔۔ یہ ایک۔۔۔ یہ ایک۔۔۔ یہ ایک۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ عشق مکان بنانا نہیں جو آپ کو پہلے نقشہ بنوانا پڑے۔۔۔ ایک لڑکی یا عورت اچانک آپ کے سامنے آتی ہے۔ آپ کے دل میں کچھ گڑ بڑ سی ہوتی ہے۔ پھر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ ساتھ لیٹی ہو۔ اسے آپ کام کہتے ہیں۔۔۔ یہ ایک۔۔۔ یہ ایک جیوانی طلب ہے جسے پورا کرنے کے لیے جیوانی طریقے ہی استعمال کرنے چاہئیں۔ جب ایک کتابتیا سے عشق لڑانا چاہتا ہے تو وہ بیٹھ کر

اسکیم تیار نہیں کرتا۔ اسی طرح سانڈ جب بُسو گھ کر گائے کے پاس جاتا ہے تو اسے بدن پر عطر لگانا نہیں پڑتا۔۔۔ بنیادی طور پر ہم سب حیوان ہیں۔ اس لیے عشق و محبت میں جو دنیا کی سب سے پرانی طلب ہے، انسانیت کا زیادہ دخل نہیں ہونا چاہیے۔“

میں نے کہا، ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ شعر و شاعری، مصوری، صنم تراشی یہ سب فنون لطیفہ محض بے کار ہیں؟“

پرکاش نے سگریٹ سلاگا یا اور اپنا جوش بقدر کفایت استعمال کرتے ہوئے کہا، ”محض بے کار نہیں۔۔۔ میں سمجھ گیا تم کیا کہنا چاہتے ہو، تمہارا مطلب یہ تھا کہ فنون لطیفہ کے وجود کا باعث عورت ہے، پھر یہ بے کار کیے ہوئے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کے وجود کا باعث خود عورت نہیں ہے، بلکہ مرد کی عورت کے متعلق حد سے بڑھی ہوئی خوش فہمی ہے۔ مرد جب عورت کے متعلق سوچتا ہے تو اور سب کچھ بھول جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ عورت کو عورت نہ سمجھے۔۔۔ عورت کو محض عورت سمجھنے سے اس کے جذبات کو ٹھیک پہنچتی ہے۔ چنانچہ وہ چاہتا ہے اسے خوبصورت سے خوبصورت روپ میں دیکھے۔ یورپی ممالک میں جہاں عورتیں فیشن کی دلداد ہیں، ان سے جا کر پوچھو کہ ان کے بالوں، ان کے کپڑوں، ان کے جو توں کے نت نئے فیشن کون ایجاد کرتا ہے۔“

چودھری نے اپنے مخصوص بے تکلفانہ انداز میں پرکاش کے کاندھے پر ہولے سے طما نچہ مارا، ”تم بہک گئے ہو یا ر۔۔۔ جو توں کے ڈیزائن کون بناتا ہے، سانڈ گائے کے پاس جاتا ہے تو اسے لوڈر لگانا نہیں پڑتا۔ بہاں بتیں ہو رہی تھیں کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے وہی رومان کامیاب ہوتے ہیں جو شریفانہ خطوط پر شروع ہوں۔“

پرکاش کے ہونٹوں کے کونے طنز سے سکڑ گئے، ”چودھری صاحب قبلہ! آپ بالکل بکواس کرتے ہیں۔ شرافت کو رکھیے آپ اپنے سگریٹ کے ڈبے میں، اور ایمان سے کہیے وہ لوڈیا جس کے لیے آپ پورا ایک بر سر والوں کو بہترین لوڈر لگا کر اسکیمیں بناتے رہے، کیا آپ کو مل گئی تھی؟“

چودھری صاحب نے کسی قدر کھسپائنا ہو کر جواب دیا۔ ”نہیں۔“

”کیوں؟“

”وہ۔۔۔ وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی۔“

”کس سے... کس الوکے پٹھے سے... ایک پھیری والے بزاں سے جس کونہ تو غالب کے شریاد تھنہ کرشن چدر کے افسانے۔ جو آپ کے مقابلے میں لوڈر لگے روماں سے نہیں بلکہ اپنے میلے تہب سے ناک صاف کرتا تھا۔“ پرکاش ہنسا۔ ”چودھری صاحب قبلہ! مجھے یاد ہے آپ بڑی محبت سے اسے خط لکھا کرتے تھے۔ ان میں آسمان کے تمام تارے نوچ کر آپ نے چکا دیے۔ چاند کی ساری چاندنی سمیٹ کر ان میں پھیلا دی مگر اس پھیری والے بزاں نے آپ کی لوڈیا کو جس کی ذہنی رفت کے آپ ہر وقت گیت گاتے تھے، جس کی نفاست پسند طبیعت پر آپ مر مٹتے تھے، ایک آنکھ مار کر اپنے تھانوں کی گھٹری میں باندھا اور چلتا بنا۔۔۔ اس کا جواب ہے آپ کے پاس؟“

چودھری منمنایا، ”میرا خیال ہے جن خطوط پر میں چل رہا تھا، غلط تھے۔ اس کا نفسیاتی مطالعہ بھی جو میں نے کیا تھا درست ثابت نہ ہوا۔“

پرکاش مسکرا یا، ”چودھری صاحب قبلہ! جن خطوط پر آپ چل رہے تھے، یقیناً غلط تھے۔ اس کا نفسیاتی مطالعہ بھی جو آپ نے کیا تھا، سو فیصد نادرست تھا اور جو کچھ آپ کہنا چاہتے ہیں وہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے کہ آپ کو خط کشی اور نفسیاتی مطالعے کی زحمت اٹھانی ہی نہیں چاہیے تھی۔ نوٹ بک نکال کر اس میں لکھ لیجیے کہ سو میں سو لکھیاں شہد کی طرف بھاگی آئیں گی اور سو میں ننانوے لڑکیاں بھونڈے پن سے مائل ہوں گی۔“

پرکاش کے لمحے میں ایک ایسا ظرخ تھا جس کا رخ چودھری کی طرف اتنا نہیں تھا جتنا خود پرکاش کی طرف تھا۔

چودھری نے سر کو جنبش دی اور کہا، ”تمہارا فلسفہ میں کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ آسان بات کو تم نے مشکل بنادیا ہے۔ تم آرٹسٹ ہو اور نوٹ بک نکال کر یہ بھی لکھ لو کہ آرٹسٹ اول درجے کے بے وقوف ہوتے ہیں۔ مجھے بہت تر س آتا ہے ان پر، کم بخنوں کی بے وقوفی میں بھی خلوص ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے مسئلے حل کر دیں گے پر جب کسی عورت سے مل بھیڑ ہو گی تو جناب ایسے چکر میں پھنس جائیں گے کہ ایک گز دور کھڑی عورت تک پہنچنے کے لیے پشاور کا لکٹ لیں گے اور وہاں پہنچ کر سوچیں گے وہ عورت آنکھوں سے او جھل کیسے ہو گئی۔ چودھری صاحب قبلہ، نکالیے اپنی نوٹ بک اور یہ لکھ لیجیے کہ آپ اول درجے کے چغد ہیں۔“

چودھری خاموش رہا اور مجھے ایک بار پھر محسوس ہوا کہ پرکاش، چودھری کو آئینہ بناؤ کر اس میں اپنی شکل دیکھ رہا ہے اور خود کو گالیاں دے رہا ہے۔ میں نے اسے کہا، ”پرکاش ایسا لگتا ہے چودھری کے بجائے تم اپنے آپ کو گالیاں دے رہے ہو۔“

خلاف تو اس نے جواب دیا، ”تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، اس لیے کہ میں بھی ایک آرٹسٹ ہوں، یعنی میں بھی۔ جب دواور دوچار بنتے ہیں تو خوش نہیں ہوتا۔ میں بھی قبلہ چودھری صاحب کی طرح امر تسر کے کمپنی باغ میں عورت سے مل کر فرنٹیئر میل سے پشاور جاتا ہوں اور وہاں آنکھیں مل کر سوچتا ہوں میری محبوبہ غائب کہاں ہو گئی۔“ یہ کہہ کر پرکاش خوب ہنسا۔ پھر چودھری سے مخاطب ہوا، ”چودھری صاحب قبلہ، ہاتھ ملائیے۔ ہم دونوں پھرستہ گھوڑے ہیں۔ اس دوڑ میں صرف وہی کامیاب ہو گا جس کے ذہن میں صرف ایک ہی چیز ہو کہ اسے دوڑنا ہے، یہ نہیں کہ کام اور وقت کا سوال حل کرنے بیٹھ جائے۔ اتنے قدموں میں اتنا فاصلہ طے ہوتا ہے تو اتنے قدموں میں کتنا فاصلہ طے ہو گا۔ عشق جو میری ہے نہ الجبرا۔ بس بکواس ہے۔ چونکہ بکواس ہے اس لیے اس میں گرفتار ہونے والے کو بکواس ہی سے مدد لینی چاہیے۔“

چودھری نے اکٹائے ہوئے لبجے میں کہا، ”کیا بکواس کرتے ہو؟“

”تو سنو!“ پرکاش جم کر بیٹھ گیا۔ ”میں تمہیں ایک سچا واقعہ سناتا ہوں۔ میرا ایک دوست ہے، میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ دو برس ہوئے وہ ایک ضروری کام سے چمبہ گیا۔ دروز کے بعد لوٹ کر اسے ڈلہوزی چلا آتا تھا۔ اس کے فوراً بعد امر تسر پکنچنا تھا مگر تین مہینے تک وہ لاپتہ رہا۔ نہ اس نے گھر خط لکھا نہ مجھے۔ جب واپس آیا تو اس کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ تین مہینے چمبہ ہی میں تھا۔ وہاں کی ایک خوبصورت لڑکی سے اسے عشق ہو گیا تھا۔“

چودھری نے پوچھا۔ ”ناکام رہا ہو گا۔“

پرکاش کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکر اہٹ پیدا ہوئی، ”نہیں، نہیں۔۔۔ وہ کامیاب رہا۔ زندگی میں اسے ایک شاندار تجربہ حاصل ہوا۔ تین مہینے وہ چمبہ کی سردیوں میں ٹھੜھر تا اور اس لڑکی سے عشق کرتا رہا۔ واپس ڈلہوزی آنے والا تھا کہ پہاڑی کی ایک پہنچنڈی پر اس کا فرج ممال حسینہ سے اس کی ڈبھیٹ ہوئی۔ تمام کائنات سکڑ کر اس لڑکی میں سما گئی اور وہ لڑکی پھیل کر والہانہ و سعت اختیار کر گئی۔ اس کو محبت ہو گئی تھی۔۔۔ قبلہ چودھری صاحب اس نے۔۔۔ پندرہ دنوں تک متواتر وہ غریب اپنی محبت کو چمبہ کی تن بستہ نفایں دل کے اندر دبائے چھپ چھپ کر دور سے اس لڑکی کو دیکھتا رہا مگر اس کے پاس جا کر اس سے ہم کلام ہونے کی ہمت نہ کر سکا۔۔۔ ہر دن گزرنے پر وہ سوچتا کہ دوری کتنی اچھی چیز ہے۔ اوپھی پہاڑی پر وہ بکریاں چرار ہی ہے۔۔۔ یونچے سڑک پر اس کا دل دھڑک رہا ہے۔ آنکھوں کے سامنے یہ شاعرانہ منظر لایئے اور داد دیجیے۔ اس پہاڑی پر عاشق صادق کھڑا ہے۔ دوسری پہاڑی پر اس کی سیمیں بدن محبوبہ۔۔۔ درمیان میں شفاف پانی کا نالہ رہا ہے۔۔۔ سبحان اللہ کیساد لکش منظر ہے، چودھری صاحب قبلہ۔“

چودھری نے ٹوکا، ”بکواس مت کرو جو واقعہ ہے، اسے بیان کرو۔“

پرکاش مسکرا یا۔ ”تو سینے۔۔۔ پندرہ دن تک میرا دوست عشق کے زبردست حملے کے اثرات دور کرنے میں مصروف رہا اور سوچتا رہا کہ اسے جلدی واپس چلا جانا چاہیے۔ ان پندرہ دنوں میں اس نے کاغذ پنسل لے کر تو نہیں لیکن دماغ ہی دماغ میں اس لڑکی سے اپنی محبت کائی بار جائزہ لیا۔ لڑکی کے جسم کی ہر چیز اسے پسند تھی۔ لیکن یہ سوال در پیش تھا کہ اسے حاصل کیسے کیا جائے۔ کیا ایک دم بغیر کسی تعارف کے وہ اس سے باتیں کرنا شروع کر دے؟ بالکل نہیں، یہ کیسے ہو سکتا تھا۔۔۔ کیوں، ہو کیسے نہیں سکتا۔۔۔ مگر فرض کر لیا جائے اس نے منہ پھیر لیا۔

جواب دیے بغیر اپنی بکریوں کو ہائکتی، پاس سے گزر گئی۔۔۔ جلد بازی کبھی بار آور نہیں ہوتی۔۔۔ لیکن اس سے بات کیے بغیر اسے حاصل کیسے کیا جا سکتا ہے؟ ایک طریقہ ہے، وہ یہ کہ اس کے دل میں اپنی محبت پیدا کی جائے۔ اس کو اپنی طرف راغب کیا جائے۔ ہاں ہاں، ٹھیک ہے۔ لیکن سوال یہ ہے راغب کیسے کیا جائے۔۔۔ ہاتھ سے، اشارہ؟ نہیں، بالکل پوچ ہے۔۔۔

سو قبلہ چودھری صاحب! ہمارا ہیر و ان پندرہ دنوں میں یہی سوچتا رہا۔۔۔ سولہویں دن اچانک باڈی پر اس لڑکی نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔۔۔ ہمارے ہیر و کے دل کی باچھیں کھل گئیں، لیکن ٹانگیں کانپنے لگیں۔۔۔ آپ نے اب ٹانگوں کے متعلق سوچنے لگا جو انہی ہوئی گھھری میں سے اسے نظر آئی تھیں۔ کتنی سڈوں تھیں۔ لیکن وہ دن دور نہیں جب وہ ان پر بہت آہستہ ہاتھ پھیر سکے گا۔۔۔ پندرہ دن اور گزر گئے۔۔۔ ادھروہ مسکرا کر پاس سے گزرتی رہی۔ ادھر ہمارے ہیر و صاحب جوابی مسکراہٹ کی ریہر سل کرتے رہے۔۔۔ سو امہینہ ہو گیا اور ان کا عشق صرف ہونٹوں پر ہی مسکراتا رہا۔

آخر ایک دن خود اس لڑکی نے مہر خاموشی توڑی اور بڑی ادا سے ایک سگریٹ مانگا۔ آپ نے ساری ڈبیا حوالے کر دی اور گھر آ کر ساری رات کپکپاہٹ پیدا کرنے والے خواب دیکھتے رہے۔ دوسرا دن ایک آدمی کوڈلہوزی بھیجا اور وہاں سے سگریٹوں کے پندرہ پیکٹ منگو اکر ایک چھوٹے سے لڑکے کے ہاتھ اپنی محبوبہ کو بھجوادیے۔ جب اس نے اپنی جھوولی میں ڈالے تو آپ کے دل کو دور کھڑے بہت مسرت محسوس ہوئی۔ ہوتے ہوتے وہ دن بھی آگیا۔ جب دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ کیسی باتیں؟ قبلہ چودھری صاحب بتائیے، ہمارا ہیر و کیا باتیں کرتا تھا اس سے؟“

چودھری نے اس کو اکتائے ہوئے لجھ میں جواب دیا، ”مجھے کیا معلوم۔“

پرکاش مسکرا�ا، ”مجھے معلوم ہے قبلہ چودھری صاحب۔۔۔ گھر سے چلتے وقت وہ باتوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست تیار کرتا تھا۔ میں اس سے یہ کہوں گا، میں اس سے یہ کہوں گا جب وہ نالے کے پاس کپڑے دھوتی ہو گی تو میں آہستہ جا کر اس کی آنکھیں مجھ لوں گا پھر اس کی بغلوں میں گد گدی کروں گا لیکن جب اس کے پاس پہنچتا اور آنکھیں مجھے اور گد گدی کرنے کا خیال آتا تو اسے شرم آجائی۔۔۔ کیا پچنا ہے۔۔۔ اور وہ اس سے کچھ دور ہٹ کر بیٹھ جاتا اور بھیڑ بکریوں کی باتیں کرتا رہتا۔۔۔ کئی دفعہ اسے خیال آیا کہ تک یہ بھیڑ بکریاں اس کی محبت چرتی رہیں گی۔۔۔

دو مہینے سے کچھ دن اوپر ہو گئے اور ابھی تک وہ اس کے ہاتھ تک نہیں لگا سکا۔ مگر وہ سوچتا کہ ہاتھ لگائے کیسے، کوئی بہانہ تو ہونا چاہیے لیکن پھر اسے خیال آتا بہانے سے ہاتھ لگانا بالکل بکواس ہے، لڑکی کی طرف سے اسے خاموش اجازت ملنی چاہیے کہ وہ اس کے بدن کے جس حصے کو بھی چاہے ہاتھ لگا سکتا ہے۔ اب خاموش اجازت کا سوال آ جاتا۔۔۔ اسے کیسے پتہ چل سکتا ہے اس نے خاموش اجازت دے دی ہے۔۔۔
قبلہ چودھری صاحب، اس کا کھون جاگاتے لگاتے پندرہ دن اور گزر گئے۔“

پرکاش نے سگریٹ سلاگا اور منہ سے دھواں نکالتے ہوئے کہنے لگا، ”اس دوران میں وہ کافی گھل مل گئے تھے۔ لیکن اس کا اثر ہمارے ہیر و کے حق میں برآ ہوا۔ دوران گنتیگوں میں اس نے لڑکی سے اپنے اوپنے خاندان کا کئی بارڈ کر کیا تھا، اپنے اوباش دوستوں پر کئی بار لعنتیں بھیجی تھیں جو پہاڑی دیہاتوں میں جا کر غریب لڑکیوں کو خراب کرتے تھے۔ کبھی دبی زبان میں، کبھی بلند بانگ اپنی تعریف بھی کی تھی۔ اب وہ کیسے اس لڑکی پر اپنی شہوانی خواہش ظاہر کرتا۔ ظاہر تھا کہ معاملہ بہت ٹیڑھا اور پیچدار ہو گیا ہے۔ مگر اس کا جذبہ عشق سلامت تھا اس لیے اسے امید تھی کہ ایک روز خود لڑکی ہی اپنا آپ تھاں میں ڈال کر اس کے حوالے کر دے گی۔۔۔ اس امید میں چنانچہ کچھ دن اور بیت گئے۔ ایک روز کپڑے دھوتے دھوتے لڑکی نے جب کہ ہاتھ صابن سے بھرے ہوئے تھے اس سے کہا۔ ”تمہاری ماچس ختم ہو گئی ہے میری جیب سے نکال لو۔۔۔ یہ جیب میں اس کی چھاتی کے ابھار کے اوپر تھی۔ ہمارا ہیر و جھینپ گیا۔

لڑکی نے کہا، ”نکال لوتا“۔۔۔ تھوڑی سی بہت کر کے اس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ بڑھایا اور دو انگلیاں بڑی احتیاط سے اس کی جیب میں ڈالیں۔ ماچس بہت نیچے تھی۔ گھبر ایا۔ کہیں اور نہ جا ٹکرائیں۔ چنانچہ باہر نکال لیں اور اپنی خالی ماچس سے تیلی نکال کر سگریٹ سلاگا اور لڑکی سے کہا، ”تمہاری جیب سے ماچس پھر کبھی نکالوں گا۔“ یہ سن کر لڑکی نے شریر شریر نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ ہمارے ہیر و

نے آدھامید ان مار لیا۔ دوسرा آدھامار نے کے لیے وہ اسکیمیں سوچنے لگا۔ ایک روز صبح سویرے نالے کے اس طرف بیٹھا، دوسری طرف ندی پر اس لڑکی کو بکریاں چراتے دیکھ رہا تھا اور اس کی ابھری ہوئی جیب کے مال پر غور کر رہا تھا کہ نیچے سڑک پر باوی کے پاس ایک موڑ لاری رکی۔ سکھ ڈرائیور نے باہر نکل کر پانی پیا اور اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ ”میرے دل میں ایک جلن سی پیدا ہوئی۔ باوی کی منڈیر پر کھڑے ہو کر اس موبائل آئکل سے لفڑرے ہوئے سکھ ڈرائیور نے پھر ایک بار ساوتری کی طرف دیکھا اور اپنا گلیٹھا تھا اٹھا کر اسے اشارہ کیا۔ میرے جی میں آئی پاس پڑا ہوا پتھر اس پر لٹھ کا دوں۔ اشارہ کرنے کے بعد اس نے دونوں ہاتھ منہ کے ادھر ادھر کھکھ کر نہایت ہی بھونڈے طریقے سے پکارا، ”او جانی۔۔۔ میں صدقے۔۔۔ آؤں؟“ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ سکھ ڈرائیور نے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ میرا دل گھٹنے لگا۔ چند منٹوں ہی میں وہ حرام زادہ اس کے پاس کھڑا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اگر اس نے کوئی بد تمیزی کی تو وہ چھڑی سے اس کی ایسی مرمت کرے گی کہ ساری عمر یاد رکھے گا۔۔۔ میں ادھر سے نگاہ ہٹا کر اس مرمت کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک دم دونوں میری آنکھوں سے او جھل ہو گئے۔

میں بھاگا گا نیچے، سڑک کی طرف باوی کے پاس پہنچ کر سوچا کیا جماقت ہے۔ تشویش کیسی؟ لیکن پھر خیال آیا کہیں وہ لوکا پٹھادر ازادستی نہ کر بیٹھے۔ اس لیے پہاڑی پر تیزی سے چڑھنا شروع کیا۔ بڑی مشکل چڑھائی تھی۔ جگہ جگہ خاردار جھاڑیاں تھیں۔ ان کو پکڑ کر آگے ہٹھنا پڑتا تھا۔ بہت دور اوپر چلا گیا پر وہ دونوں کہیں نظر نہ آئے۔ ہانپتے ہانپتے میں نے اپنے سامنے کی جھاڑی پکڑ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی۔۔۔ کیا دیکھتا ہوں جھاڑی کے دوسری طرف پتھروں پر ساوتری لیٹی ہے اور اس غلظی ڈرائیور کی داڑھی اس کے چہرے پر بکھری ہوئی ہے۔۔۔ میری۔۔۔ میرے جسم کے سارے بال جل گئے۔ ایک کروڑ گالیاں ان دونوں کے لیے میرے دل میں پیدا ہو گئیں۔ لیکن ایک لحظے کے لیے سوچا تو محسوس ہوا کہ دنیا کا سب سے بڑا چند میں ہوں۔ اسی وقت نیچے اتر اور سیدھا لاریوں کے اڈے کا رخ کیا۔۔۔

پرکاش کے ماتھے پر پسینے کی نئی نئی بوندیں چکنے لگیں۔

-[99]-

دیوالی کے دیے: سعادت حسن منٹو

چھٹ کی منڈیر پر دیوالی کے دیے ہانپتے ہوئے بچوں کے دل کی طرح دھڑک رہے تھے۔

مُنی دوڑتی ہوئی آئی۔ اپنی ننھی سی گھرگی کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھائے، چھٹ کے نیچے گلی میں سوری کے پاس کھڑی ہو گئی۔۔۔ اس کی روئی ہوئی آنکھوں میں، منڈیر پر چلیے ہوئے دیوں نے، کئی چکلیے نگینے جڑ دیے۔۔۔ اس کا نخا سایمنہ دیے کی لوکی طرح کانپا، مسکرا کر اس نے اپنی مٹھی کھولی، پسینے سے بھیگا ہوا پیسہ دیکھا اور بازار میں دیے لینے کے لیے دوڑ گئی۔

چھٹ کی منڈیر پر شام کی خنک ہوا میں دیوالی کے دیے پھر پھڑاتے رہے۔

سریندر دھڑکتے ہوئے دل کو پہلو میں چھپائے، چوروں کی مانند گلی میں داخل ہوا اور منڈیر کے نیچے بے قراری سے ٹھہلنے لگا۔۔۔ اس نے دیوں کی قطار کی طرف دیکھا۔ اسے ہوا میں اچھتے ہوئے یہ شعلے اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کے رقصان قطرے معلوم ہوئے۔۔۔ دفعتاً سامنے والی کھڑکی کھلی۔۔۔ سریندر سرتاپا نگاہ بن گیا۔ کھڑکی کے ڈنڈے کا سہارا لے کر ایک دو شیزہ نے جھک کر گلی میں دیکھا اور فوراً اس کا چہرہ تمباٹھا۔ کچھ اشارے ہوئے۔ کھڑکی چوڑیوں کی کھلکھلناہٹ کے ساتھ بند ہوئی اور سریندر وہاں سے مخموری کی حالت میں چل دیا۔

چھٹ کی منڈیر پر دیوالی کے دیے دلہن کی ساری میں ٹکرے ہوئے تاروں کی طرح چکتے رہے۔

سر جو کمہار لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا اور دم لینے کے لیے ٹھہر گیا۔ بلغم اس کی چھاتی میں سڑکیں کوٹنے والے ان جن کی مانند پھر رہا تھا۔۔۔ گلے کی رگیں دمے کے دورے کے باعث دھونکنی کی طرح کبھی پھولتی تھیں کبھی سکڑ جاتی تھیں۔ اس نے گردن اٹھا کر جگمگ جگمگ کرتے دیوں کی طرف اپنی دھنڈی آنکھوں سے دیکھا اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ دور۔۔۔ بہت دور۔۔۔ بہت سے نیچے قطار باندھ کھلی کو دیں مصروف ہیں۔ سر جو کمہار کی لاٹھی منوں بھاری ہو گئی۔ بلغم تھوک کروہ پھر چیونٹی کی چال چلنے لگا۔

چھٹ کی منڈیر پر دیوالی کے دیے جگمگاتے رہے۔

پھر ایک مزدور آیا۔ پھٹے ہوئے گریبان میں سے اس کی چھاتی کے بال، بر باد گھو نسلوں کی تیلیوں کے مانند بکھر رہے تھے۔ دیوں کی قطار کی طرف اس نے سراٹھا کر دیکھا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ آسمان کی گدی پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے چک رہے ہیں۔ پھر اسے اپنے گھر کے اندر ٹھیارے کا خیال آیا اور وہ ان تھرکتے ہوئے شعلوں کی روشنی، آنکھیوں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

چھٹ کی منڈیر پر دیوالی کے دیے آنکھیں جھکتے رہے۔

نئے اور چمکیلے بوٹوں کی چرچاہت کے ساتھ ایک آدمی آیا۔ اور دیوار کے قریب سگریٹ سلاگانے کے لیے ٹھہر گیا۔ اس کا چہرہ اشرفت پر لگی ہوئی مہر کی مانند جذبات سے عاری تھا۔ کالر چڑھی گردن اٹھا کر اس نے دیوں کی طرف دیکھا اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ بہت سی کٹھائیوں میں سونا پھیل رہا ہے۔ اس کے چرچاتے ہوئے چمکیلے جو توں پرناپتھے ہوئے شعلوں کا عکس پڑ رہا تھا۔ وہ ان سے کھلیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

چھت کے منڈیر پر دیوالی کے دیے جلتے رہے۔

جو کچھ انہوں نے دیکھا، جو کچھ انہوں نے سنا، کسی کو نہ بتایا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور سب دیے ایک کر کے بجھ گئے۔

-[100]-

سوراج کے لیے: سعادت حسن منٹو

مجھے سن یاد نہیں رہا، لیکن وہی دن تھے جب امر تسر میں ہر طرف ”انقلاب زندہ باد“ کے نعرے گونجتے تھے۔ ان نعروں میں، مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک عجیب قسم کا جوش تھا۔۔۔ ایک جوانی۔۔۔ ایک عجیب قسم کی جوانی۔ بالکل امر تسر کی گجریوں کی سی، جو سر پر اپلوں کے ٹوکرے اٹھائے بازاروں کو جیسے کاٹتی ہوئی چلتی ہیں۔۔۔ خوب دن تھے۔ فضائیں جو وہ جلیانوالہ بااغ کے خونیں حادثے کا اداس خوف سمویا رہتا تھا، اس وقت بالکل مفقود تھا۔ اب اس کی جگہ ایک بے خوف تڑپ نے لے لی تھی۔۔۔ ایک اندھادہند جست نے جو اپنی منزل سے ناواقف تھی۔

لوگ نعرے لگاتے تھے، جلوس نکالتے تھے اور سیکڑوں کی تعداد میں دھڑک دھڑک قید ہو رہے تھے۔ گرفتار ہونا ایک دلچسپ شغل بن گیا تھا۔ صبح قید ہوئے۔ شام چھوڑ دیے گئے، مقدمہ چلا، چند مہینوں کی قید ہوئی، واپس آئے، ایک نعرہ لگایا، پھر قید ہو گئے۔

زندگی سے بھر پور دن تھے۔ ایک نہما سابلبلہ پھٹنے پر بھی ایک بہت بڑا بھنور بن جاتا تھا۔ کسی نے چوک میں کھڑے ہو کر تقریر کی اور کہا، ”ہڑتاں ہونی چاہیے۔“ چلیے جی، ہڑتاں ہو گئی۔ ایک لہر اٹھی کہ ہر شخص کو کھادی پہنچی چاہیے تاکہ لنکاشائز کے سارے کارخانے بند ہو

جائیں۔۔۔ بدیشی کپڑوں کا بائیکاٹ شروع ہو گیا اور ہر چوک میں الاؤ جلنے لگے، لوگ جوش میں آکر کھڑے کھڑے وہیں کپڑے اتارتے اور الاؤ میں پھینکتے جاتے، کوئی عورت اپنے مکان کے شہنشین سے اپنی ناپسندیدہ سائزی اچھاتی تو ہجوم تالیاں پیٹ پیٹ کر اپنے ہاتھ لال کر لیتا۔

مجھے یاد ہے، کوتولی کے سامنے ٹاؤن ہال کے پاس ایک الاؤ جل رہا تھا۔۔۔ شیخو نے، جو میرا ہم جماعت تھا، جوش میں آکر اپناریشمی کوٹ اتارا اور بدیشی کپڑوں کی چتا میں ڈال دیا۔ تالیوں کا سمندر بنہنے لگا۔ کیونکہ شیخو ایک بہت بڑے ”ٹوڈی پچ“ کا لڑکا تھا، اس غریب کا جوش اور بھی زیادہ بڑھ گیا، اپنی بو سکی کی قیص اتاروہ بھی شعلوں کی نذر کر دی، لیکن بعد میں خیال آیا کہ اس کے ساتھ سونے کے بٹن تھے۔

میں شیخو کا نمادق نہیں اڑاتا، میرا حال بھی ان دونوں بہت دگر گوں تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کہیں سے پستول ہاتھ میں آجائے تو ایک دہشت پسند پارٹی بنائی جائے۔ باپ گور نمنٹ کا پشن خوار تھا، اس کا مجھے کبھی خیال نہ آیا۔ بس دل و دماغ میں ایک عجیب قسم کی کھدبرہتی تھی۔ بالکل ویسی ہی جیسی فلاش کھیلنے کے دوران دوپان میں رہا کرتی ہے۔

اسکول سے تو مجھے دیسے ہی دلچسپی نہیں تھی مگر ان دونوں تو خاص طور پر مجھے پڑھائی سے نفرت ہو گئی تھی۔۔۔ گھر سے کتابیں لے کر نکلتا اور جلیانوالہ باغ چلا جاتا، اسکول کا وقت ختم ہونے تک وہاں کی سرگرمیاں دیکھتا رہتا یا کسی درخت کے سامنے تلے بیٹھ کر دور مکانوں کی کھڑکیوں میں عورتوں کو دیکھتا اور سوچتا کہ ضرور ان میں سے کسی کو مجھ سے عشق ہو جائے گا۔۔۔ یہ خیال دماغ میں کیوں آتا، اس کے متعلق میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔

جلیانوالہ باغ میں خوب رونق تھی۔ چاروں طرف تمنبا اور قاتمیں پھیلی ہوئی تھیں، جو خیمہ سب سے بڑا تھا، اس میں ہر دوسرے تیسرا روز ایک ڈکٹیٹر بنانے کے بڑھا دیا جاتا تھا۔ جس کو تمام والنشیر سلامی دیتے تھے۔ دو تین روز یا زیادہ سے زیادہ دس پندرہ روز تک یہ ڈکٹیٹر کھادی پوش عورتوں اور مردوں کی نمسکاریں، ایک مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ وصول کرتا۔ شہر کے بنیوں سے لگنگ خانے کے لیے آٹاچاول اکٹھا کرتا اور وہی کی لسی پی پی کر، جو خدا معلوم جلیانوالہ باغ میں کیوں اس قدر عام تھی، ایک دن اچانک گرفتار ہو جاتا اور کسی قید خانے میں چلا جاتا۔

میرا ایک پرانا ہم جماعت تھا شہزادہ غلام علی، اس سے میری دوستی کا اندازہ آپ کو ان باتوں سے ہو سکتا ہے کہ ہم اکٹھے دو دفعہ میٹر کے امتحان میں فیل ہو چکے تھے اور ایک دفعہ ہم دونوں گھر سے بھاگ کر بمبی گئے، خیال تھا کہ روس جائیں گے مگر پیسے ختم ہونے پر جب فٹ پا تھوں پر سونا پڑا تو گھر خط لکھئے، معافیاں مانگیں اور واپس چلے آئے۔ شہزادہ غلام علی خوبصورت جوان تھا۔ لمبا تقد، گورانگ جو کشمیریوں کا

ہوتا ہے۔ تیکھی ناک، کھلنڈری آنکھیں، چال ڈھال میں ایک خاص شان تھی جس میں پیشہ ور غنڈوں کی کچ کلاہی کی ہلکی سی جھلک بھی تھی۔

جب وہ میرے ساتھ پڑھتا تھا تو شہزادہ نہیں تھا۔ لیکن جب شہر میں انقلابی سرگرمیوں نے زور پکڑا اور اس نے دس پندرہ جلوسوں اور جلوسوں میں حصہ لیا تو نعروں، گیندے کے ہاروں، جوشیے گیتوں اور لیڈی والٹیز سے آزادانہ گفتگوؤں نے اسے ایک نیم رس انقلابی بنادیا، ایک روز اس نے پہلی تقریر کی، دوسرے روز میں نے اخبار دیکھے تو معلوم ہوا کہ غلام علی شہزادہ بن گیا ہے۔

شہزادہ بنتے ہی غلام علی سارے امر تسری میں مشہور ہو گیا۔ چھوٹا سا شہر ہے، وہاں نیک نام ہوتے یا بد نام ہوتے دیر نہیں لگتی۔ یوں تو امر تسری عام آدمیوں کے معاملے میں بہت حرف گیر ہیں، یعنی ہر شخص دوسروں کے عیب ٹھوٹنے اور کرداروں میں سوراخ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہتا ہے لیکن سیاسی اور مذہبی لیڈروں کے معاملے میں امر تسری بہت چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔ ان کو دراصل ہر وقت ایک تقریر یا تحریک کی ضرورت رہتی ہے۔ آپ انھیں نیلی پوش بنا دیجیے یا سیاہ پوش، ایک ہی لیڈر چوٹے بدل بدل کر امر تسری میں کافی دیر تک زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن وہ زمانہ کچھ اور تھا۔ تمام بڑے بڑے لیڈر جیلوں میں تھوڑے اور ان کی گدیاں خالی تھیں۔ اس وقت لوگوں کو لیڈروں کی کوئی اتنی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ لیکن وہ تحریک جو کہ شروع ہوئی تھی اس کو البتہ ایسے آدمیوں کی اشد ضرورت تھی جو ایک دو روز کھادی پہن کر جلیانوالہ باغ کے بڑے تنبو میں بیٹھیں، ایک تقریر کریں اور گرفتار ہو جائیں۔

ان دونوں یورپ میں نئی نئی ڈکٹیٹر شپ شروع ہوئی تھی، ہٹلر اور مسولینی کا مہت اشتہار ہو رہا تھا۔ غالباً اس اثر کے ماتحت کا نگر یہ پارٹی نے ڈکٹیٹر بنانے شروع کر دیے تھے۔ جب شہزادہ غلام علی کی باری آئی تو اس سے پہلے چالیس ڈکٹیٹر گرفتار ہو چکے تھے۔

جو نہیں مجھے معلوم ہوا کہ اس طرح غلام علی ڈکٹیٹر بن گیا ہے تو میں فوراً جلیانوالہ باغ میں پہنچا۔ بڑے خیمے کے باہر والٹیز کا پہرہ تھا۔ مگر غلام علی نے جب مجھے اندر سے دیکھا تو بلا لیا۔۔۔ زمین پر ایک گدیا لاتھا جس پر کھادی کی چاندنی بچھی تھی۔ اس پر گاؤں تکیوں کا سہارا لیے شہزادہ غلام علی چند کھادی پوش بیویوں سے گفتگو کر رہا تھا جو غالباً ترکاریوں کے متعلق تھی۔ چند منٹوں ہی میں اس نے یہ بات چیت ختم کی اور چند رضاکاروں کو احکام دے کر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ اس کی یہ غیر معمولی سنجیدگی دیکھ کر میرے گدگدی سی ہو رہی تھی۔ جب رضا کا رچلے گئے تو میں ہنس پڑا۔

”سنابے شہزادے۔“

میں دیر تک اس سے مذاق کرتا رہا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ غلام علی میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ ایسی تبدیلی جس سے وہ باخبر ہے۔
چنانچہ اس نے کئی بار مجھ سے یہی کہا، ”نمیں سعادت۔۔۔ مذاق نہ اڑاؤ۔ میں جانتا ہوں میرا سرچھوٹا اور یہ عزت جو مجھے ملی ہے بڑی ہے۔۔۔ لیکن میں یہ کھلی ٹوپی ہی پہننے رہنا چاہتا ہوں۔“

پچھے دیر کے بعد اس نے مجھے دی کی ایک بہت بڑا گلاس پلایا اور میں اس سے یہ وعدہ کر کے گھر چلا گیا کہ شام کو اس کی تقریر سننے کے لیے ضرور آؤں گا۔ شام کو جلیانوالہ باغ کھچا کچھ بھرا تھا۔ میں چونکہ جلدی آیا تھا، اس لیے مجھے پلیٹ فارم کے پاس ہی جگہ مل گئی۔۔۔ غلام علی تالیوں کے شور کے ساتھ نمودار ہوا۔۔۔ سفید بے داغ کھادی کے کپڑے پہننے والے بوصورت اور پرکشش دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ وہ کچھ کلا ہی کی جھلک جس کا میں اس سے پہلے ذکر کر چکا ہوں، اس کی اس کشش میں اضافہ کر رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے تک وہ بولتا رہا۔ اس دوران میں کئی بار میرے رو نگٹے کھڑے ہوئے اور ایک دو دفعہ تو میرے جسم میں بڑی شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں بم کی طرح پھٹ جاؤں۔ اس وقت میں نے شاید یہی خیال کیا تھا کہ یوں پھٹ جانے سے ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔

خدا معلوم کتنے برس گزر چکے ہیں۔ بہت ہوئے احساسات اور واقعات کی نوک پلک جو اس وقت تھی، اب پوری صحت سے بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن یہ کہانی لکھتے ہوئے میں جب غلام علی کی تقریر کا تصور کرتا ہوں تو مجھے صرف ایک جوانی بولتی دکھائی دیتی تھی، جو سیاست سے بالکل پاک تھی۔۔۔ اس میں ایک ایسے نوجوان کی پر خلوص بے باکی تھی جو ایک دم کسی را چلتی عورت کو کپڑے لے اور کہے، ”دیکھو میں تمہیں چاہتا ہوں۔“ اور دوسرے لمحے قانون کے پنج میں گرفتار ہو جائے۔ اس تقریر کے بعد مجھے کی تقریریں سننے کا اتفاق ہوا ہے مگر وہ خام دیواگی، وہ سر پھری جوانی، وہ المھر جذبہ، وہ بے ریش و بروت لکار جو میں نے شہزادہ غلام علی کی آواز میں سنی، اب اس کی ہلکی سی گونج بھی مجھے کبھی سنائی نہیں دی۔ اب جو تقریریں سننے میں آتی ہیں، وہ ٹھنڈی سنجیدگی، بوڑھی سیاست اور شاعرانہ ہوش مندی میں لپٹی ہوتی ہیں۔

اس وقت دراصل دونوں پارٹیاں خام کار تھیں، حکومت بھی اور رعایا بھی۔ دونوں نتائج سے بے پروا، ایک دوسرے سے دست و گریاب تھے۔ حکومت قید کی اہمیت سمجھے بغیر لوگوں کو قید کر رہی تھی اور جو قید ہوتے تھے ان کو بھی قید خانوں میں جانے سے پہلے قید کا مقصد معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ایک دھاندلی تھی مگر اس دھاندلی میں ایک آتشیں انتشار تھا۔ لوگ شعلوں کی طرح بھڑکتے تھے، بجھتے تھے، پھر بھڑکتے تھے۔ چنانچہ اس بھڑکنے اور بجھنے، بجھنے اور بھڑکنے نے غلامی کی خوابیدہ، اداس اور جما یوں بھری فضائیں گرم ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

شہزادہ غلام علی نے تقریر ختم کی تو سارا جلیانوالہ باغ تالیوں اور نعروں کا دہکتا ہوا الاؤ بن گیا۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ جب میں اس سے الگ جا کر ملا اور مبارک باد دینے کے لیے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبایا تو وہ کانپ رہا تھا۔ یہ گرم کپکپا ہٹ اس کے چمکیلے چہرے سے بھی نمایاں تھی۔ وہ کسی قدر رہا نہ ہوتا۔ اس کی آنکھوں میں پر جوش جذبات کی دمک کے علاوہ مجھے ایک تھکی ہوئی تلاش نظر آئی، وہ کسی کوڈھونڈرہ تھیں۔ ایک دم اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے علیحدہ کیا اور سامنے چنبلی کی جھاڑی کی طرف بڑھا۔

وہاں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ کھادی کی بے داغ سماڑی میں ملبوس۔

دوسرے روز مجھے معلوم ہوا کہ شہزادہ غلام علی عشق میں گرفتار ہے۔ وہ اس لڑکی سے، جسے میں نے چنبلی کی جھاڑی کے پاس با ادب کھڑی دیکھا تھا، محبت کر رہا تھا۔ یہ محبت یک طرف نہیں تھی کیونکہ نگار کو بھی اس سے والہانہ لگا دیتا تھا۔ نگار جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ایک مسلمان لڑکی تھی۔۔۔ یقین از نانہ ہسپتال میں نرس تھی اور شاید پہلی مسلمان لڑکی تھی جس نے امر تسری میں بے پرده ہو کر کا نگریں کی تحریک میں حصہ لیا۔ کچھ کھادی کے لباس نے، کچھ کا نگریں کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے باعث اور کچھ ہسپتال کی فضائے نگار کی اسلامی خوکو، اس تکمیلی چیز کو جو مسلمان عورت کی فطرت میں نمایاں ہوتی ہے تھوڑا سا گھسادیا تھا جس سے وہ ذرا ملائم ہو گئی تھی۔

وہ حسین نہیں تھی لیکن اپنی جگہ نسوانتی کا ایک نہایت ہی دیدہ چشم منفرد نمونہ تھی۔ انکسار، تعظیم اور پرستش کا وہ ملا جلا جذبہ جو آدرس ہندو عورت کا خاصہ ہے نگار میں اس کی خفیہ سی آمیزش نے ایک روح پرور نگ پیدا کر دیا تھا۔ اس وقت تو شاید یہ کبھی میرے ذہن میں نہ آتا، مگر یہ لکھتے وقت میں نگار کا تصور کرتا ہوں تو وہ مجھے نماز اور آرتی کا دلفریب مجموعہ دکھائی دیتی ہے۔ شہزادہ غلام علی کی وہ پرستش کرتی تھی اور وہ بھی اس پر دل و جان سے فدا تھا۔ جب نگار کے بارے میں اس سے گفتگو ہوئی تو پتا چلا کہ کا نگریں تحریک کے دوران میں ان دونوں کی ملاقات ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں کے ملاپ سے وہ ایک دوسرے کے ہو گئے۔

غلام علی کا ارادہ تھا کہ قید ہونے سے پہلے پہلے وہ نگار کو اپنی بیوی بنالے۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ ایسا کیوں کرنا چاہتا تھا کیونکہ قید سے واپس آنے پر بھی وہ اس سے شادی کر سکتا تھا۔ ان دونوں کوئی اتنی لمبی قید نہیں تھی۔ کم سے کم تین مہینے اور زیادہ سے زیادہ ایک برس۔ بعضوں کو تو پندرہ بیس روز کے بعد ہی رہا کر دیا جاتا تھا تاکہ دوسرے قیدیوں کے لیے جگہ بن جائے۔ بہر حال وہ اس ارادے کو نگار پر بھی ظاہر کر چکا تھا اور وہ بالکل تیار تھی۔ اب صرف دونوں کو بابا جی کے پاس جا کر ان کا آشی� واد لینا تھا۔

بابا جی جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے بہت زبردست ہستی تھی۔ شہر سے باہر لکھ پتی صراف ہری رام کی شاندار کوٹھی میں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ یوں تو وہ اکثر اپنے آشرم میں رہتے جوانوں نے پاس کے ایک گاؤں میں بنار کھاتھا مگر جب کبھی امر ترا آتے تو ہری رام صراف ہی کی کوٹھی میں اترتے اور ان کے آتے ہی یہ کوٹھی بابا جی کے شیدائیوں کے لیے مقدس جگہ بن جاتی۔ سارا دن درشن کرنے والوں کا تاثنا بندھا رہتا۔ دن ڈھلنے والے کوٹھی سے باہر کچھ فاصلے پر آم کے پیڑوں کے جھنڈ میں ایک چوبی تخت پر بیٹھ کر لوگوں کو عام درشن دیتے، اپنے آشرم کے لیے چندہ اکٹھا کرتے۔ آخر میں بھجن وغیرہ سن کر ہر روز شام کو یہ جلسہ ان کے حکم سے برخاست ہو جاتا۔ بابا جی بہت پرہیز گار، خدا ترس، عالم اور ذہین آدمی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو، مسلمان، سکھ اور اچھوت سب ان کے گرویدہ تھے اور انھیں اپنا مام مانتے تھے۔ سیاست سے گو بابا جی کو ظاہر کوئی لچکی نہیں تھی مگر یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ پنجاب کی ہر سیاسی تحریک انہی کے اشارے پر شروع ہوئی اور انہی کے اشارے پر ختم ہوئی۔

گورنمنٹ کی نگاہوں میں وہ ایک عقدہ لا چیل تھے، ایک سیاسی چیتیں، جسے سرکارِ عالیہ کے بڑے بڑے مدبر بھی نہ حل کر سکتے تھے۔ بابا جی کے پتلے پتلے ہونٹوں کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ہزار معنی نکالے جاتے تھے مگر جب وہ خود اس مسکراہٹ کا بالکل ہی نیا مطلب واضح کرتے تو مرعوب عوام اور زیادہ مرعوب ہو جاتے۔

یہ جو امر تسر میں سول نافرمانی کی تحریک جاری تھی اور لوگ دھڑک دھڑک قید ہو رہے تھے، اس کے عقب میں جیسا کہ ظاہر ہے، بابا جی ہی کا اثر کار فرماتھا۔ ہر شام لوگوں کو عام درشن دیتے وقت وہ سارے پنجاب کی تحریک آزادی اور گورنمنٹ کی نت نئی سخت گیریوں کے متعلق اپنے پوپلے منہ سے ایک چھوٹا سا۔۔۔ ایک معصوم ساجملہ نکال دیا کرتے تھے، جسے فوراً ہی بڑے بڑے لیڈر اپنے گلے میں تعویذ بنا کر ڈال لیتے تھے۔

لوگوں کا بیان ہے کہ ان کی آنکھوں میں ایک مقناطیسی قوت تھی، ان کی آواز میں ایک جادو تھا اور ان کا ٹھنڈا دماغ۔۔۔ ان کا وہ مسکراتا ہوتا دماغ، جس کو گندی سے گندی گالی اور زہریلی سے زہریلی طنز بھی ایک لمحے کے ہزارویں حصے کے لیے برہم نہیں کر سکتی تھی، حریفوں کے لیے بہت ہی الجھن کا باعث تھا۔

امر تسر میں بابا جی کے سیکڑوں جلوس نکل چکے تھے، مگر جانے کیا بات ہے کہ میں نے اور تمام لیڈروں کو دیکھا، ایک صرف ان ہی کو میں نے دور سے دیکھا نہ نزدیک سے۔ اسی لیے جب غلام علی نے مجھ سے ان کے درشن کرنے اور ان سے شادی کی اجازت لینے کے متعلق بات چیت کی تو میں نے اس سے کہا کہ جب وہ دونوں جائیں تو مجھے بھی ساتھ لیتے جائیں۔

دوسرے ہی روز غلام علی نے تانگے کا انتظام کیا اور ہم صحیح سویرے لالہ ہری رام صراف کی عالی شان کو ٹھی میں پہنچ گئے۔ بابا جی غسل اور صحیح کی دعا سے فارغ ہو کر ایک خوبصورت پنڈتانی سے قومی گیت سن رہے تھے۔ چینی کی بے داغ سفید ٹانکوں والے فرش پر آپ کھجور کے پتوں کی چٹائی پر بیٹھے تھے، گاؤں تکہی ان کے پاس ہی پڑا تھا مگر انھوں نے اس کا سہارا نہیں لیا تھا۔ کمرے میں سوائے ایک چٹائی کے، جس کے اوپر بابا جی بیٹھے تھے اور فرنپر غیرہ نہیں تھا۔ ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سفید ٹانکیں چک رہی تھیں۔ ان کی چک نے قومی گیت گانے والی پنڈتانی کے ہلکے پیازی چہرے کو اور بھی زیادہ حسین بنادیا تھا۔

بابا جی گوستہ بہتر بر سر کے بڑھے تھے مگر ان کا جسم (وہ صرف گیر وے رنگ کا چھوٹا سا تھہ باندھے تھے) عمر کی جھریلوں سے بے نیاز تھا، جلد میں ایک عجیب قسم کی ملاحت تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ہر روز اشنان سے پہلے رو غن زیتون اپنے جسم پر ملواتے ہیں۔ شہزادہ غلام علی کی طرف دیکھ کر وہ مسکرائے، مجھے بھی ایک نظر دیکھا اور ہم تینوں کی بندگی کا جواب اسی مسکراہٹ کو ذرا طویل کر کے دیا اور اشارہ کیا کہ ہم بیٹھ جائیں۔

میں اب یہ تصویر اپنے سامنے لاتا ہوں تو شعور کی عینک سے یہ مجھے دلچسپ ہونے کے علاوہ بہت ہی فکر خیز دکھائی دیتا ہے۔ کھجور کی چٹائی پر ایک نیم بہنہ معرجو گیوں کا آسن لگائے بیٹھا ہے۔ اس کی بیٹھک سے، اس کے گنجے سر سے، اس کی ادھ کھلی آنکھوں سے، اس کے سانوں لے ملائم جسم سے، اس کے چہرے کے ہر خط سے ایک پر سکون اطمینان، ایک بے فکر تیقین مترش تھا کہ جس مقام پر دنیا نے اسے بھا دیا ہے، اب بڑے سے بڑا ززلہ بھی اسے وہاں سے نہیں گرا سکتا۔۔۔ اس سے کچھ درود اسکی ایک نو خیز گلی، جھکی ہوئی، کچھ اس بزرگ کی قربت کے احترام سے، کچھ قومی گیت کے اثر سے، کچھ اپنی شدید جوانی سے، جو اس کی کھرد روی سفید ساڑی سے نکل کر قومی گیت کے علاوہ اپنی جوانی کا گیت بھی گانا چاہتی تھی، جو اس بزرگ کی قربت کا احترام کرنے کے ساتھ ساتھ کسی ایسی تند رست اور جوان ہستی کی بھی تعظیم کرنے کی خواہش مند تھی جو اس کی نرم کلائی پکڑ کر زندگی کے دلکتے ہوئے الاؤ میں کو دپڑے۔ اس کے ہلکے پیازی چہرے سے، اس کی بڑی بڑی سیاہ متھر ک آنکھوں سے، اس کے کھادی کے کھر درے بلاوز میں ڈھکے ہوئے متلاطم سینے سے، اس معرجو گی کے ٹھوس تیقین اور نگلین اطمینان کے قابل میں ایک خاموش صدا تھی کہ آؤ، جس مقام پر میں اس وقت ہوں، وہاں سے کھینچ کر مجھے یا تو نیچ گر ادوا یا اس سے بھی اوپر لے جاؤ۔

اس طرف ہٹ کر ہم تین بیٹھے تھے۔ میں، نگار اور شہزادہ غلام علی۔۔۔ میں بالکل چند بنای بیٹھا تھا۔ بابا جی کی شخصیت سے بھی متأثر تھا اور اس پنڈتانی کے بے داغ حسن سے بھی۔ فرش کی چکیلی ٹانکوں نے بھی مجھے مرعوب کیا تھا۔ کبھی سوچتا تھا کہ ایسی ٹانکوں والی ایک کو ٹھی

مجھے مل جائے تو کتنا اچھا ہو۔ پھر سوچتا تھا کہ یہ پنڈتانی مجھے اور کچھ نہ کرنے دے، ایک صرف مجھے اپنی آنکھیں چوم لینے دے۔ اس کے تصور سے بدن میں تھر تھری پیدا ہوتی توجہ اپنی نوکر انی کا خیال آتا جس سے تازہ تازہ مجھے کچھ وہ ہوا تھا۔ جی میں آتا کہ ان سب کو، یہاں چھوڑ کر سیدھا گھر جاؤں۔۔۔ شاید نظر بچا کر اسے اوپر غسل خانے تک لے جانے میں کامیاب ہو سکوں، مگر جب باباجی پر نظر پڑتی اور کانوں میں قومی گیت کے پر جوش الفاظ گونجتے تو ایک دوسری تھر تھری بدن میں پیدا ہوتی اور میں سوچتا کہ کہیں سے پستول ہاتھ آجائے تو سول لائن میں جا کر انگریزوں کو مارنا شروع کر دوں۔

اس چغد کے پاس نگار اور غلام علی بیٹھے تھے۔ دو محبت کرنے والے دل، جو تنہا محبت میں دھڑکتے دھڑکتے اب شاید کچھ اکتا گئے تھے اور جلدی ایک دوسرے میں محبت کے دوسرے رنگ دیکھنے کے لیے مدغم ہونا چاہتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں وہ باباجی سے، اپنے مسلمہ سیاسی رہنماء سے شادی کی اجازت لینے آئے تھے اور جیسا کہ ظاہر ہے ان دونوں کے دماغ میں اس وقت قومی گیت کے بجائے ان کی اپنی زندگی کا حسین ترین مگر ان سنانگہ گونج رہا تھا۔

گیت ختم ہوا، باباجی نے بڑے مشقانہ انداز سے پنڈتانی کو ہاتھ کے اشارے سے آشیر واد دیا اور مسکراتے ہوئے نگار اور غلام علی کی طرف متوجہ ہوئے۔ مجھے بھی انہوں نے ایک نظر دیکھ لیا۔ غلام علی شاید تعارف کے لیے اپنا اور نگار کا نام بتانے والا تھا مگر باباجی کا حافظہ بلا کا تھا۔ انہوں نے فوراً ہی اپنی میٹھی آواز میں کہا، ”شہزادے، ابھی تک تم گرفتار نہیں ہوئے؟“

غلام علی نے ہاتھ جوڑ کر کہا، ”جی نہیں۔“

باباجی نے قلم دان سے ایک پنسل نکالی اور اس سے کھلتے ہوئے کہنے لگے، ”مگر میں تو سمجھتا ہوں تم گرفتار ہو چکے ہو۔“

غلام علی اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ لیکن باباجی نے فوراً ہی پنڈتانی کی طرف دیکھا اور نگار کی طرف اشارہ کر کے، ”نگار نے ہمارے شہزادے کو گرفتار کر لیا ہے۔“

نگار محب سی ہو گئی۔ غلام علی کامنہ فرط حیرت سے کھلا کھلا رہ گیا اور پنڈتانی کے پیازی چہرے پر ایک دعا یہ پچک سی آئی۔ اس نے نگار اور غلام علی کو کچھ اس طرح دیکھا جیسے یہ کہہ رہی ہے، ”بہت اچھا ہوا۔“ باباجی ایک بار پھر پنڈتانی کی طرف متوجہ ہوئے، ”یہ پچھے مجھ سے شادی کی اجازت لینے آئے ہیں۔۔۔ تم کب شادی کر رہی ہو کمل؟“

تو اس پنڈتانی کا نام کمل تھا۔ باباجی کے اچانک سوال سے وہ بوکھلا گئی۔ اس کا پیازی چہرہ سرخ ہو گیا۔ کانپتی ہوئی آواز میں اس نے جواب دیا، ”میں تو آپ کے آشram میں جا رہی ہوں۔“ ایک بلکل سی آہ بھی ان الفاظ میں لپٹ کر باہر آئی جسے باباجی کے ہشیار دماغ نے فوراً نوٹ کیا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر جو گیانہ انداز میں مسکرائے اور غلام علی اور نگار سے مخاطب ہو کر کہنے لگے، ”تو تم دونوں فیصلہ کر چکے ہو۔“

دونوں نے دبی زبان میں جواب دیا، ”جی ہاں۔“

باباجی نے اپنی سیاست بھری آنکھوں سے ان کو دیکھا، ”انسان جب فیصلے کرتا ہے تو کبھی کبھی ان کو تبدیل کر دیا کرتا ہے۔“

پہلی دفعہ باباجی کی بارعہ موجودگی میں غلام علی نے، اس کی المڑ اور پیاک جوانی نے کہا، ”یہ فیصلہ اگر کسی وجہ سے تبدیل ہو جائے تو کبھی اپنی جگہ پر اٹل رہے گا۔“

باباجی نے آنکھیں بند کر لیں اور جرح کے انداز میں پوچھا، ”کیوں؟“

حیرت ہے کہ غلام علی بالکل نہ گھبرایا۔ شاید اس دفعہ نگار سے جو اسے پر خلوص محبت تھی وہ بول اٹھی، ”باباجی ہم نے ہندوستان کو آزادی دلانے کا جو فیصلہ کیا ہے، وقت کی مجبوریاں اسے تبدیل کرتی رہیں مگر جو فیصلہ ہے وہ تو اٹل ہے۔“ باباجی نے جیسا کہ میرا اب خیال ہے کہ اس موضوع پر بحث کرنا مناسب خیال نہ کیا چنانچہ وہ مسکرا دیے۔۔۔ اس مسکراہٹ کا مطلب بھی ان کی تمام مسکراہٹوں کی طرح ہر شخص نے بالکل الگ الگ سمجھا۔ اگر باباجی سے پوچھا جاتا تو مجھے لیکن ہے کہ وہ اس کا مطلب ہم سب سے بالکل مختلف بیان کرتے۔

خیر۔۔۔ اس ہزار پہلو مسکراہٹ کو اپنے پتلے ہو نٹوں پر ذرا اور پھیلاتے ہوئے انھوں نے نگار سے کہا، ”نگار تم ہمارے آشram میں آ جاؤ۔۔۔ شہزادہ تو ہوڑے دونوں میں قید ہو جائے گا۔“

نگار نے بڑے دھینے لجھے میں جواب دیا، ”جی اچھا۔“

اس کے بعد بابا جی نے شادی کا موضوع بدل کر جلیانوالہ باغ کیمپ کی سرگرمیوں کا حال پوچھنا شروع کر دیا۔ بہت دیر تک غلام علی، نگار اور کمل گرفتاریوں، رہائیوں، دودھ، لسی اور ترکاریوں کے متعلق باتیں کرتے رہے اور جو میں بالکل چند بنابریا تھا، یہ سوچ رہا تھا کہ بابا جی نے شادی کی اجازت دینے میں کیوں اتنی میں میخ کی ہے۔ کیا وہ غلام علی اور نگار کی محبت کوشک کی نظر وہ سے دیکھتے ہیں۔۔۔؟ کیا انھیں غلام علی کے خلوص پر شہر ہے؟

نگار کو انھوں نے کیا آشرم میں آنے کی اس لیے دعوت دی کہ وہاں رہ کر وہ اپنے قید ہونے والے شوہر کا غم بھول جائے گی۔۔۔؟ لیکن بابا جی کے اس سوال پر ”کمل تم کب شادی کر رہی ہو؟“ کمل نے کیوں کہا تھا کہ میں تو آپ کے آشرم میں جا رہی ہوں۔۔۔؟ آشرم میں کیا مرد عورت شادی نہیں کرتے۔۔۔؟ میرا ذہن عجب منحصرے میں گرفتار تھا۔ مگر ادھر یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ لیڈی والنٹیرز کیا پانچ سو رضاکاروں کے لیے چاتیاں وقت پر تیار کر لیتی ہیں؟ چو لہے کتنے ہیں؟ اور توے کتنے بڑے ہیں؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک بہت بڑا جو لہا بنالیا جائے اور اس پر اتنا بڑا توار کھا جائے کہ چھ عورتیں ایک ہی وقت میں روٹیاں پکا سکیں؟

میں یہ سوچ رہا تھا کہ پہنڈتانی کمل کیا آشرم میں جا کر بابا جی کو بس قومی گیت اور بھجن ہی سنایا کرے گی۔ میں نے آشرم کے مردوں والنٹیر دیکھے تھے۔ گروہ سب کے سب وہاں کے قواعد کے مطابق ہر روز اشنا کرتے تھے، صبح اٹھ کر داتن کرتے تھے، باہر کھلی ہوا میں رہتے تھے، بھجن گاتے تھے، مگر ان کے کپڑوں سے پسینے کی بو پھر بھی آتی تھی۔ ان میں اکثر کے دانت بد بودا رہتے اور وہ جو کھلی فضائیں رہنے سے انسان پر ایک ہشاش بشاش نکھار آتا ہے، ان میں بالکل مفقود تھا۔

جھکے جھکے سے، دبے دبے سے۔۔۔ زرد چہرے، دھنسی ہوئی آنکھیں، مرعوب جسم۔۔۔ گائے کے نچڑے ہوئے ہننوں کی طرح بے حس اور بے جان۔۔۔ میں ان آشرم والوں کو جلیانوالہ باغ میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔۔۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہی مرد جن سے گھاس کی بو آتی ہے، اس پہنڈتانی کو جو دودھ، شہد اور زعفران کی بنی ہے، اپنی کچھ بھری آنکھوں سے گھوریں گے۔ کیا یہی مرد جن کا منہ اس قدر متعفن ہوتا ہے، اس لوبان کی مہک میں لپٹی ہوئی عورت سے گفتگو کریں گے؟

لیکن پھر میں نے سوچا کہ نہیں ہندوستان کی آزادی شاید ان چیزوں سے بالاتر ہے۔ میں اس ”شاید“ کو اپنی تمام حب الوطنی اور جذبہ آزادی کے باوجود نہ سمجھ سکا۔ کیونکہ مجھے نگار کا خیال آیا جو بالکل میرے قریب بیٹھی تھی اور بابا جی کو بتا رہی تھی کہ شاجہم بہت دیر میں گلتے ہیں۔۔۔ کہاں شاجہم اور کہاں شادی جس کے لیے وہ اور غلام علی اجازت لینے آئے تھے۔

میں نگار اور آشرم کے متعلق سوچنے لگا۔ آشرم میں نے دیکھا نہیں تھا، مگر مجھے ایسی جگہوں سے جن کو آشرم، ودیالہ جماعت خانہ، تکنیکی، یا درس گاہ کہا جائے، ہمیشہ سے نفرت ہے۔ جانے کیوں؟ میں نے کئی اندر ودیالوں اور اناتھ آشرموں کے لڑکوں اور ان کے منتظموں کو دیکھا ہے، سڑک میں قطار باندھ کر چلتے اور بھیک مانگتے ہوئے۔ میں نے جماعت خانے اور درس گاہیں دیکھی ہیں۔ شخصوں سے اونچا شرعی پائچا جامہ، بچپن ہی میں ماٹھے پر محراب، جو بڑے ہیں ان کے چہرے پر گھنی داڑھی۔۔۔ جو نو خیر ہیں ان کے گالوں اور ٹھڈی پر نہایت ہی بد نما موٹے اور مہین بال۔۔۔ نماز پڑھتے جا رہے ہیں لیکن ہر ایک کے چہرے پر حیوانیت۔۔۔ ایک ادھوری حیوانیت مصلے پر بیٹھی نظر آتی ہے۔

نگار عورت تھی۔ مسلمان، ہندو، سکھ یا عیسائی عورت نہیں۔۔۔ وہ صرف عورت تھی، نہیں عورت کی دعا تھی جو اپنے چاہنے والے کے لیے پا جھے وہ خود چاہتی ہے صدق دل سے مانگتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ بابا جی کے آشرم میں جہاں ہر روز قواعد کے مطابق دعائیں جاتی ہے۔ یہ عورت جو خود ایک دعا ہے، کیسے اپنے ہاتھ اٹھاسکے گی۔

میں اب سوچتا ہوں تو بابا جی، نگار، غلام علی، وہ خوبصورت پنڈت اور امر تسر کی ساری فضائل جو تحریک آزادی کے رومان آفریں کیف میں لپی ہوئی تھی، ایک خواب سامعلوم ہوتا ہے۔ ایسا خواب جو ایک بار دیکھنے کے بعد جی چاہتا ہے آدمی پھر دیکھے۔ بابا جی کا آشرم میں نے اب بھی نہیں دیکھا، مگر جو نفرت مجھے اس سے پہلے تھی اب بھی ہے۔ وہ جگہ جہاں فطرت کے خلاف اصول بنانے کے انسانوں کو ایک لکیر پر چلا یا جائے، میری نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ آزادی حاصل کرنے والے کل ٹھیک ہے! اس کے حصول کے لیے آدمی مر جائے، میں اس کو سمجھ سکتا ہوں، لیکن اس کے لیے اگر اس غریب کو ترکاری کی طرح ٹھنڈا اور بے ضرربنا دیا جائے تو میں میری سمجھ سے بالکل بالاتر ہے۔

جھونپڑوں میں رہنا، تن آسانیوں سے پرہیز کرنا، خدا کی حمد گانا، قومی نعرے مارنا۔۔۔ یہ سب ٹھیک ہے، مگر یہ کیا کہ انسان کی اس حس کو جسے طلبِ حسن کہتے ہیں آہستہ آہستہ مردہ کر دیا جائے۔ وہ انسان کیا جس میں خوبصورتی اور ہنگاموں کی تڑپ نہ رہے۔ ایسے آشرموں، مدرسوں، ودیالوں اور مولیوں کے کھیت میں کیا فرق ہے۔

دیر تک بابا جی، غلام علی اور نگار سے جلیانوالہ باغ کی جملہ سرگرمیوں کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ آخر میں انہوں نے اس جوڑے کو، جو کہ ظاہر ہے کہ اپنے آنے کا مقصد بھول نہیں گیا تھا، کہا کہ وہ دوسرے روز شام کو جلیانوالہ باغ آئیں گے اور ان دونوں کو میاں بیوی بنا دیں گے۔

غلام علی اور نگار بہت خوش ہوئے۔ اس سے بڑھ کر ان کی خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی تھی کہ بابا جی خود شادی کی رسم ادا کریں گے۔ غلام علی، جیسا کہ اس نے مجھے بہت بعد میں بتایا، اس قدر خوش ہوا تھا کہ فوراً ہی سے اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ شاید جو کچھ اس نے سنائے غلط ہے۔ کیونکہ بابا جی کے مختصر ہاتھوں کی خفیہ سی جنبش بھی ایک تاریخی حادثہ بن جاتی تھی۔ اتنی بڑی ہستی ایک معمولی آدمی کی خاطر جو محض اتفاق سے کاٹگریں کاٹ کر بن گیا ہے، چل کے جلیانوالہ باعث جائے اور اس کی شادی میں دلچسپی لے۔ یہ ہندوستان کے تمام اخباروں کے پہلے صفحے کی جملی سرنی تھی۔

غلام علی کا خیال تھا بابا جی نہیں آئیں گے کیونکہ وہ بہت مصروف آدمی ہیں لیکن اس کا یہ خیال، جس کا اظہار دراصل اس نے نفسیاتی نقطہ نگاہ سے صرف اس لیے کیا تھا کہ وہ ضرور آئیں، اس کی خواہش کے مطابق غلط ثابت ہوا۔۔۔ شام کے چھ بجے جلیانوالہ باعث میں جب رات کی رانی کی جھاڑیاں اپنی خوشبو کے جھوکنے پھیلانے کی تیاریاں کر رہی تھیں اور متعدد رضاکار دلوہاد لہن کے لیے ایک چھوٹا تنبوہ نصب کر کے اسے چھیلی، گیندے اور گلاب کے پھولوں سے سجوار ہے تھے، بابا جی اس قومی گیت گانے والی پنڈتانی، اپنے سیکریٹری اور لالہ ہری رام صراف کے ہمراہ لاٹھی ٹکتے ہوئے آئے۔ ان کی آمد کی اطلاع جلیانوالہ باعث میں صرف اسی وقت پہنچی، جب صدر دروازے پر لالہ ہری رام کی ہری موڑر کی۔

میں بھی وہیں تھا۔ لیڈی والٹریز ایک دوسرے تنبوہ میں نگار کو دلہن بنارہی تھیں۔ غلام علی نے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا۔ سارا دن وہ شہر کے کاٹگریں بیویوں سے رضاکاروں کے کھانے پینے کی ضروریات کے متعلق گفتگو کرتا رہا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے چند لمحات کے لیے نگار سے تنگی میں کچھ بات چیت کی تھی۔ اس کے بعد جیسا کہ میں جانتا ہوں، اس نے اپنے ماتحت افسروں سے صرف اتنا کہا تھا کہ شادی کی رسم ادا ہونے کے ساتھ ہی وہ اور نگار دونوں جھنڈا اونچا کریں گے۔

جب غلام علی کو بابا جی کی آمد کی اطلاع پہنچی تو وہ نتویں کے پاس کھڑا تھا۔ میں غالباً اس سے یہ کہہ رہا تھا، ”غلام علی تم جانتے ہوں یہ کنوں؟“ جب گولی چلی تھی، لاشوں سے لبال بھر گیا تھا۔۔۔ آج سب اس کا پانی پیتے ہیں۔۔۔ اس باعث کے جتنے پھول ہیں۔ اس کے پانی نے سینچے ہیں۔ مگر لوگ آتے ہیں اور انھیں توڑ کر لے جاتے ہیں۔۔۔ پانی کے کسی گھونٹ میں لہو کا نمک نہیں ہوتا، پھول کی کسی پتی میں خون کی لالی نہیں ہوتی۔۔۔ یہ کیا بات ہے؟“

مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے یہ کہہ کر اپنے سامنے، اس مکان کی کھڑکی کی طرف دیکھا جس میں، کہا جاتا ہے کہ ایک نو عمر لڑکی بیٹھی تماشا دیکھ رہی تھی اور جزل ڈائر کی گولی کا نشانہ بن گئی تھی۔ اس کے سینے سے نکلے ہوئے خون کی لکیر چونے کی عمر سیدہ دیوار پر دھنڈی ہو رہی

تھی۔ اب خون کچھ اس قدر ارزال ہو گیا کہ اس کے بینے بہانے کا وہ اثری نہیں ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ جلیانوالہ باغ کے خون میں حادثے کے چھ سات مہینے بعد جب میں تیری یا چوڑھی جماعت میں پڑھتا تھا، مار اسٹر ساری کلاس کو ایک دفعہ اس باغ میں لے گیا۔ اس وقت یہ باغ باغ نہیں تھا۔ اجڑا، سنسان اور اوپنی پنجی خشک ریں کا ایک کٹرا تھا، جس میں ہر قدم پر مٹی کے چھوٹے بڑے ڈھیلے ٹھوکریں کھاتے تھے۔ مجھے یاد ہے مٹی کا ایک چھوٹا سا ڈھیلہ جس پر جانے پان کی پیک کے دھبے یا کیا تھا، ہمارے ماسٹر نے اٹھا لیا تھا اور ہم سے کہا تھا۔ دیکھو اس پر ابھی تک ہمارے شہیدوں کا خون لگا ہے۔

یہ کہانی لکھ رہا ہوں اور حافظے کی تختی پر سیکڑوں چھوٹی چھوٹی باتیں ابھر رہی ہیں مگر مجھے تو غلام علی اور نگار کی شادی کا قصہ بیان کرنا ہے۔

غلام علی کو جب بابا جی کی آمد کی خبر ملی تو اس نے دوڑ کر سب والنشیر اکٹھے کیے جنہوں نے فوجی انداز میں ان کو سیلوٹ کیا۔ اس کے بعد کافی دیر تک وہ اور غلام علی مختلف کیپوں کا چکر لگاتے رہے۔ اس دوران میں بابا جی نے، جن کی مزاحیہ حس بہت تیز تھی، لیڈی والنشیر زاور دوسرے ورکرز سے گفتگو کرتے وقت کئی فقرے چست کیے۔

ادھر ادھر مکانوں میں جب بتیا جلنے لگیں اور دھندا اندھیرا سا جلیانوالہ باغ پر چھا گیا تو رضا کار لڑکیوں نے ایک آواز ہو کر بھجن گانا شروع کیا۔ چند آوازیں سریلی، باقی سب کن سری تھیں مگر ان کا مجموعی اثر بہت خوشنگوار تھا۔ بابا جی آنکھیں بند کیے سن رہے تھے۔ تقریباً ایک ہزار آدمی موجود تھے، جو چوتے کے ارد گرد میں پر بیٹھے تھے۔ بھجن گانے والی لڑکیوں کے علاوہ ہر شخص خاموش تھا۔ بھجن ختم ہونے پر چند لمحات تک ایسی خاموشی طاری رہی جو ایک دم ٹوٹنے کے لیے بے قرار ہو۔ چنانچہ جب بابا جی نے آنکھیں کھولیں اور اپنی میٹھی آواز میں کہا، ”بچو، جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، میں یہاں آج آزادی کے دودیوں کو ایک کرنے آیا ہوں۔“ تو سارا باغ خوشی کے نعروں سے گونج اٹھا۔

نگار دلہن بنی چبوترے کے ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ کھادی کی ترنگی ساڑی میں بہت بھلی دکھائی دے رہی تھی۔ بابا جی نے اشارے سے اسے بلا یا اور غلام علی کے پاس بھا دیا۔ اس پر اور خوشی کے نعرے بلند ہوئے۔ غلام علی کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتما رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا، جب اس نے نکاح کا کاغذ اپنے دوست سے لے کر بابا جی کو دیا تو اس کا ہاتھ لرز گیا۔ چبوترے پر ایک مولوی صاحب بھی موجود تھے۔ انہوں نے قرآن کی وہ آیت پڑھی جو ایسے موقعوں پر پڑھا کرتے ہیں۔ بابا جی نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایجاد و قبول ختم ہوا تو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں دو لحداں لہن کو آشیر وادی اور جب چھوہاروں کی بارش شروع ہوئی تو انہوں نے بچوں کی طرح جھپٹ جھپٹ کر دس پندرہ چھوہارے اکٹھے کر کے اپنے پاس رکھ لیے۔

نگار کی ایک ہندو سہیلی نے شر میلی مسکراہٹ سے ایک چھوٹی سی ڈبیا غلام علی کو دی اور اس سے کچھ کہا۔ غلام علی نے ڈبیا کھولی اور نگار کی سیدھی مانگ میں سیند و ر بھر دیا۔ جلیاںوالہ باغ کی خنک فضا ایک بار پھر تالیوں کی تیز آواز سے گونج اٹھی۔

بابا جی اس شور میں اٹھے۔ ہجوم ایک دم خاموش ہو گیا۔

رات کی رانی اور چیلی کی ملی جلی سوندھی سوندھی خوشبو، شام کی ہلکی پھلکی ہوا میں تیر رہی تھی، بہت سہنا سماں تھا، بابا جی کی آواز آج اور بھی میٹھی تھی۔ غلام علی اور نگار کی شادی پر اپنی دلی مسرت کا اظہار کرنے کے بعد انہوں نے کہا: یہ دونوں بچے اب زیادہ تند ہی اور خلوص سے اپنے ملک اور قوم کی خدمت کریں گے۔ کیونکہ شادی کا صحیح مقصد مرد اور عورت کی پر خلوص دوستی ہے۔ ایک دوسرے کے دوست بن کر غلام علی اور نگار بھجتی سے سوراج کے لیے کوشش کر سکتے ہیں۔ یورپ میں ایسی کئی شادیاں ہوتی ہیں جن کا مطلب دوستی اور صرف دوستی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ قابل احترام ہیں جو اپنی زندگی سے شہوت نکال پھینکتے ہیں۔

بابا جی دیر تک شادی کے متعلق اپنے عقیدے کا اظہار کرتے رہے۔ ان کا ایمان تھا کہ صحیح مزاصرف اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب مرد اور عورت کا تعلق صرف جسمانی نہ ہو۔ عورت اور مرد کا شہوانی رشتہ ان کے نزدیک اتنا ہم نہیں تھا جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ ہزاروں آدمی کھاتے ہیں، اپنے ذات کی حس کو خوش کرنے کے لیے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسا کرنا انسانی فرض ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو کھاتے ہیں زندہ رہنے کے لیے۔ اصل میں صرف یہی لوگ ہیں جو خور دنوں کے صحیح قوانین جانتے ہیں۔ اسی طرح وہ انسان جو صرف اس لیے شادی کرتے ہیں کہ انھیں شادی کے مطہر جذبے کی حقیقت اور اس رشتے کی تقدیس معلوم ہو، حقیقی معنوں میں ازدواجی زندگی سے لطف اندوڑ ہوتے ہیں۔

بابا جی نے اپنے اس عقیدے کو کچھ اس وضاحت، کچھ ایسے نرم و نازک خلوص سے بیان کیا کہ سننے والوں کے لیے ایک بالکل نئی دنیا کے دروازے کھل گئے۔ میں خود بہت متاثر ہوا۔ غلام علی جو میرے سامنے بیٹھا تھا، بابا جی کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو جیسے پر رہا تھا۔ بابا جی نے جب بولنا بند کیا تو اس نے نگار سے کچھ کہا۔ اس کے بعد اٹھ کر اس نے کانپتی ہوئی آواز میں یہ اعلان کیا، ”میری اور نگار کی شادی اسی قسم کی آدرش شادی ہو گی، جب تک ہندوستان کو سوراج نہیں ملتا، میر اور نگار کا رشتہ بالکل دوستوں جیسا ہو گا۔۔۔“

جلیاں والہ باغ کی خنک نضادیر تک تالیوں کے بے پناہ شور سے گو نجتی رہی۔ شہزادہ غلام علی جذباتی ہو گیا۔ اس کے کشمیری چہرے پر سرخیاں دوڑنے لگیں۔ جذبات کی اسی دوڑ میں اس نے نگار کو بلند آواز میں مخاطب کیا، ”نگار! تم ایک غلام بچے کی ماں بنو۔۔۔ کیا تمہیں یہ گوارا ہو گا؟“ نگار جو کچھ شادی ہونے پر اور کچھ بابا جی کی تقریر سن کر بوکھلائی ہوئی تھی، یہ کڑک سوال سن کر اور بھی بوکھلا گئی۔ صرف اتنا کہہ سکی، ”بی۔۔۔ بی نہیں۔“

ہجوم نے پھر تالیاں پیشیں اور غلام علی اور زیادہ جذباتی ہو گیا۔ نگار کو غلام بچے کی شرمندگی سے بچا کر وہ اتنا خوش ہوا کہ وہ بہک گیا اور اصل موضوع سے ہٹ کر آزادی حاصل کرنے کی پیچ دار گلیوں میں جانکلا۔ ایک گھنٹے تک وہ جذبات بھری آواز میں بولتا رہا۔ اچانک اس کی نظر نگار پر پڑی۔ جانے کیا ہوا۔۔۔ ایک دم اس کی قوت گویائی جواب دے گئی۔ جیسے آدمی ثراب کے نشے میں بغیر کسی حساب کے نوٹ نکالتا جائے اور ایک دم بٹوہ خالی پائے۔ اپنی تقریر کا بٹوہ خالی پا کر غلام علی کو کافی الجھن ہوئی مگر اس نے فوراً ہی بابا جی کی طرف دیکھا اور جھک کر کہا، ”بابا جی۔۔۔ ہم دونوں کو آپ کا آشیرواد چاہیے کہ جس بات کا ہم نے عہد کیا ہے، اس پر پورے رہیں۔“

دوسرے روز صبح چھ بجے شہزادہ غلام علی کو گرفتار کر لیا گیا۔ کیونکہ اس تقریر میں جو اس نے سوراج ملنے تک بچہ پیدا نہ کرنے کی قسم کھانے کے بعد کی تھی، انگریزوں کا تختہ اللئے کی دھمکی بھی تھی۔ گرفتار ہونے کے چند روز بعد غلام علی کو آٹھ مہینے کی قید ہوئی اور ملتان جیل بھیج دیا گیا۔ وہ امر تسر کا اکیالیسوں ڈلٹیٹر تھا اور شاید چالیس ہزارواں سیاسی قیدی۔ کیونکہ جہاں تک مجھے یاد ہے، اس تحریک میں قید ہونے والے لوگوں کی تعداد اخباروں نے چالیس ہزار ہی بتائی تھی۔

عام خیال تھا کہ آزادی کی منزل اب صرف دوہاتھی دوڑ ہے۔ لیکن فرنگی سیاست دنوں نے اس تحریک کا دو دھانبلنے دیا اور جب ہندوستان کے بڑے لیڈروں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہ ہوا تو یہ تحریک ٹھنڈی لسی میں تبدیل ہو گئی۔ آزادی کے دیوانے جیلوں سے باہر نکلے تو قید کی صعوبتیں بھولنے اور اپنے بگڑے ہوئے کاروبار سنوارنے میں مشغول ہو گئے۔ شہزادہ غلام علی سات مہینے کے بعد ہی باہر آگیا تھا۔ گواں وقت پہلا سا جوش نہیں تھا، پھر بھی امر تسر کے اسٹیشن پر لوگوں نے اس کا استقبال کیا۔ اس کے اعزاز میں تین چار دعویٰ میں اور جلسے بھی ہوئے۔ میں ان سب میں شریک تھا مگر یہ مخفیں بالکل پھیکی تھیں۔ لوگوں پر اب ایک عجیب قسم کی تھکاوٹ طاری تھی جیسے ایک لمبی دوڑ میں اچانک دوڑنے والوں سے کہہ دیا گیا تھا، ”ٹھہر و، یہ دوڑ پھر سے شروع ہو گی۔“ اور اب جیسے یہ دوڑنے والے کچھ دیرہا نپنے کے بعد دوڑ کے مقام آغاز کی طرف بڑی بے دلی کے ساتھ واپس آرہے تھے۔

کئی برس گز رکھنے۔۔۔ یہ بے کیف تھکاٹ ہندوستان سے دور نہ ہوئی تھی۔ میری دنیا میں چھوٹے موٹے کئی انقلاب آئے۔ داڑھی مونچھے اگی، کالج میں داخل ہوا، الیف اے میں دوبارہ فیل ہوا، والد انتقال کر گئے، روزی کی تلاش میں ادھر ادھر پریشان ہوا، ایک تھرڈ کلاس اخبار میں مترجم کی حیثیت سے نوکری کی، یہاں سے جی گھبرایا تو ایک بار پھر تعلیم حاصل کرنے کا نیا آیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل ہوا اور تین ہی میینے بعد دو قامر یعنی ہو کر کشمیر کے دیہاتوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ وہاں سے لوٹ کر بمبئی کا رخ کیا۔ یہاں دوسرے میں تین ہندو مسلم فساد دیکھے۔ جی گھبرایا تو دلی چلا گیا۔ وہاں بمبئی کے مقابلے میں ہر چیز ستر فتار دیکھی۔ کہیں حرکت نظر بھی آئی تو اس میں ایک زنانہ پن محسوس ہوا۔ آخر یہی سوچا کہ بمبئی اچھا ہے۔ کیا ہوا ساتھ والے ہمساۓ کو ہمارا نام تک پوچھنے کی فرصت نہیں۔ جہاں لوگوں کو فرصت ہوتی ہے، وہاں ریا کاریاں اور چال بازیاں زیادہ پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ دلی میں دوسرے ٹھنڈی زندگی بسرا کرنے کے بعد سدا متھر ک بمبئی چلا آیا۔

گھر سے نکلے اب آٹھ برس ہو چلے تھے۔ دوست احباب اور امر تسری سڑکیں، گلیاں کس حالت میں ہیں، اس کا مجھے کچھ علم نہیں تھا، کسی سے خط و لتابت ہی نہیں تھی جو پتہ چلتا۔ دراصل مجھے ان آٹھ برسوں میں اپنے مستقبل کی طرف سے کچھ بے پرواٹی سی ہو گئی تھی۔۔۔ کون بیتے ہوئے دنوں کے متعلق سوچے۔ جو آٹھ برس پہلے خرچ ہو چکا ہے، اس کا بہ احساس کرنے سے فائدہ۔۔۔؟ زندگی کے روپے میں وہی پائی زیادہ اہم ہے جسے تم آج خرچنا چاہتے ہو یا جس پر کل کسی کی آنکھ ہے۔

آج سے چھ برس پہلے کی بات کر رہا ہوں، جب زندگی کے روپے اور چاندی کے روپے سے، جس پر بادشاہ سلامت کی چھاپ ہوتی ہے، پائی خارج نہیں ہوئی تھی۔ میں اتنا زیادہ قلاش نہیں تھا کیونکہ فورٹ میں اپنے پاؤں کے لیے ایک قیمتی شو خریدنے جا رہا تھا۔ آرمی اینڈ نیوی اسٹور کے اس طرف ہار بی رود پر جو توں کی ایک دکان ہے جس کی نمائشی الماریاں مجھے بہت دیر سے اس طرف کھینچ رہی تھیں۔ میرا حافظہ بہت کمزور ہے، چنانچہ یہ دکان ڈھونڈنے میں کافی وقت صرف ہو گیا۔

یوں تو میں اپنے لیے ایک قیمتی شو خریدنے آیا تھا مگر جیسا کہ میری عادت ہے، دوسری دکانوں میں بھی ہوئی چیزیں دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ ایک اسٹور میں سگریٹ کیس دیکھے، دوسرے میں پاپ، اسی طرح فٹ پاٹھ پر ٹھلتا ہوا جو توں کی ایک چھوٹی سی دکان کے پاس آیا اور اس کے اندر چلا گیا کہ چلو بیہیں سے خرید لیتے ہیں، دکاندار نے میرا استقبال کیا اور پوچھا، ”کیا مانگتا ہے صاحب۔“

میں نے تھوڑی دیر یاد کیا کہ مجھے کیا چاہیے، ”ہاں۔۔۔ کریپ سول شو۔“

”ادھر نہیں رکھتا ہم۔“

مون سون قریب تھی۔ میں نے سوچا گم بوٹ ہی خرید لون، ”گم بوٹ نکالو۔“

”باجو والے کی دکان سے ملیں گے۔۔۔ ربڑ کی کئی چیز ہم ادھر نہیں رکھتا۔“

”میں نے ایسے ہی پوچھا، ”کیوں؟“

”سیٹھ کی مرضی!“

یہ مختصر مگر جامع جواب سن کر میں دکان سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ ایک خوش پوش آدمی پر میری نظر پڑی جو باہر فٹ پا تھ پر ایک بچہ گود میں اٹھائے پھل والے سے سُنگتہ خرید رہا تھا۔ میں باہر نکلا اور وہ دکان کی طرف مڑا، ”ارے۔۔۔ غلام علی۔۔۔“

”سعادت!“

یہ کہہ کر اس نے بچے سمیت مجھے اپنے سینے کے ساتھ بھیجن لیا۔۔۔ بچے کو یہ حرکت ناگوار معلوم ہوئی، چنانچہ اس نے رونا شروع کر دیا۔ غلام علی نے اس آدمی کو بلا یا جس نے مجھ سے کہا تھا کہ ربڑ کی کوئی چیز ادھر ہم نہیں رکھتا اور اسے بچہ دے کر کہا ”جاوا سے گھر لے جاؤ۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا، ”کتنی دیر کے بعد ہم ایک دوسرے سے ملے ہیں۔“

میں نے غلام علی کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔۔۔ وہ کچ کلا ہی، وہ بکا ساغند اپن جواس کی امتیازی شان تھا۔ اب بالکل مفقود تھا۔۔۔ میرے سامنے آتشیں تقریریں کرنے والے کھادی پوش نوجوان کی جگہ ایک گھریلو قسم کا عامان انسان کھڑا تھا۔۔۔ مجھے اس کی وہ آخری تقریر یاد آئی، جب اس نے جلیانوالہ باغ کی خنک فضا کو ان گرم الفاظ سے مرتعش کیا تھا، ”نگار۔۔۔“ تم ایک غلام بچہ کی ماں بنو۔۔۔ کیا تمہیں یہ گوارا ہو گا۔۔۔ ”فوراً ہی مجھے اس بچے کا خیال آیا جو غلام علی کی گود میں تھا۔ میں اس سے یہ پوچھا، ”یہ بچہ کس کا ہے؟“ غلام علی نے بغیر کسی جھگک کے جواب دیا، ”میرا۔۔۔ اس سے بڑا ایک اور بھی ہے۔۔۔ کہو، تم نے کتنے پیدا کیے۔“

ایک لحظے کے لیے مجھے محسوس ہوا جیسے غلام علی کے بجائے کوئی اور مل بول رہا ہے۔ میرے دماغ میں سیکڑوں خیال اور تلے گرتے گئے۔ کیا غلام علی اپنی قسم بالکل بھول چکا ہے؟ کیا اس کی سیاسی زندگی اس سے قطعاً علیحدہ ہو چکی ہے؟ ہندوستان کو آزادی دلانے کا وہ جوش، وہ ولولہ کہاں گیا؟ اس بے ریش وبروت لکار کا کیا ہوا۔۔۔؟ کیا اس نے دو غلام بچوں کی ماں بننا گوارا کیا۔۔۔؟ شاید وہ مر چکی ہو۔۔۔ ہو سکتا ہے، غلام علی نے دوسری شادی کر لی ہو۔

”کیا سوچ رہے ہو۔۔۔ کچھ باتیں کرو۔ اتنی دیر کے بعد ملے ہیں۔“ غلام علی نے میرے کانہ ٹھیپ پر زور سے ہاتھ مارا۔

میں شاید خاموش ہو گیا تھا۔ ایک دم چونکا اور ایک لمبی ”ہاں“ کر کے سوچنے لگا کہ گفتگو کیسے شروع کروں۔ لیکن غلام علی نے میرا انتظار نہ کیا اور بولنا شروع کر دیا، ”یہ دکان میری ہے۔ دو برس سے میں یہاں بمبئی میں ہوں۔ بڑا چھاکار و بار چل رہا ہے۔ تین چار سو مہینے کے فتح جاتے ہیں۔ تم کیا کر رہے ہو۔ سنا ہے کہ بہت بڑے افسانہ نویس بن گئے ہو۔ یاد ہے ہم ایک دفعہ یہاں بھاگ کے آئے تھے۔۔۔ لیکن یار عجیب بات ہے، اس بمبئی اور اس بمبئی میں بڑا فرق محسوس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے وہ چھوٹی تھی اور یہ بڑی ہے۔“

اتنے میں ایک گاہک آیا، جسے ٹینس شوچا ہیتے تھا۔ غلام علی نے اس سے کہا، ”ربڑ کا مالِ ادھر نہیں ملتا۔ بازو کی دکان میں چلے جائیے۔“

گاہک چلا گیا تو میں نے غلام سے پوچھا، ”ربڑ کا مال تم کیوں نہیں رکھتے؟ میں بھی یہاں کریپ سول شولینے آیا تھا۔“

یہ سوال میں نے یوں نہیں کیا تھا لیکن غلام علی کا چہرہ ایک دم بے رونق ہو گیا۔

دھیمی آواز میں صرف اتنا کہا، ”مجھے پسند نہیں۔“

”کیا پسند نہیں؟“

”یہی ربڑ۔۔۔ ربڑ کی بنی ہوئی چیزیں۔“ یہ کہہ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ جب ناکام رہا تو زور سے خشک ساق تھوہہ لگایا، ”میں تمہیں بتاؤں گا۔۔۔ ہے تو بالکل واہیات سی چیز، لیکن۔۔۔ لیکن میری زندگی سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے۔“

تفکر کی گہرائی غلام علی کے چہرے پر پیدا ہوئی۔ اس کی آنکھیں جن میں ابھی تک کھلنڈر اپن موجود تھا، ایک لمحتے کے لیے دھنڈی ہوئیں لیکن پھر چمک اٹھیں، ”بکواس تھی یار وہ زندگی۔۔۔ سچ کہتا ہوں سعادت میں وہ دن بالکل بھول چکا ہوں۔ جب میرے دماغ پر لیڈری سوار تھی۔ چار پانچ برس سے اب بڑے سکون میں ہوں۔ بیوی ہے، بچے ہیں، اللہ کا بڑا فضل و کرم ہے۔“

اللہ کے فضل و کرم سے متاثر ہو کر غلام علی نے بنس کا ذکر شروع کر دیا کہ کتنے سرماۓ سے اس نے کام شروع کیا تھا، ایک برس میں کتنا فائدہ ہوا، اب بنک میں اس کا لکنار و پیہی ہے۔ میں نے اسے درمیان میں ٹوکا اور کہا، ”لیکن تم نے کسی وابیات چیز کا ذکر کیا تھا جس کا تمہاری زندگی سے گہرا تعلق ہے۔“

ایک بار پھر غلام علی کا چہرہ بے رونق ہو گیا۔ اس نے ایک لمبی ہاں کی اور جواب دیا، ”گہرہ تعلق تھا۔۔۔ شکر ہے کہ اب نہیں ہے۔۔۔ لیکن مجھے ساری داستان سنانی پڑے گی۔“

انتہے میں اس کا نوکر آگیا۔ دکان اس کے سپرد کر کے وہ مجھے اندر اپنے کمرے میں لے گیا، جہاں بیٹھ کر اس نے مجھے اطمینان سے بتایا کہ اسے رہبر کی چیزوں سے کیوں نفرت پیدا ہوئی۔

”میری سیاسی زندگی کا آغاز کیسے ہوا، اس کے متعلق تم اچھی طرح جانتے ہو۔ میرا کیریکٹر کیسا تھا، یہ بھی تمہیں معلوم ہے۔ ہم دونوں قریب قریب ایک جیسے ہی تھے۔ میرا مطلب ہے ہمارے ماں باپ کسی سے فخر یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہمارے بڑے بے عیب ہیں۔ معلوم نہیں میں تم سے یہ کیوں کہہ رہا ہوں۔ لیکن شاید تم سمجھ گئے ہو کہ میں کوئی مضبوط کیریکٹر کا مالک نہیں تھا۔ مجھے شوق تھا کہ میں کچھ کروں۔ سیاست سے مجھے اسی لیے دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ لیکن میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں جھوٹا نہیں تھا۔ وطن کے لیے میں جان بھی دے دیتا۔ اب بھی حاضر ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں۔۔۔ بہت غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان کی سیاست، اس کے لیڈر سب ناپختہ ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح میں تھا۔ ایک لہر اٹھتی ہے، اس میں جوش، زور، شور سمجھی ہوتا ہے لیکن فوراً ہی بیٹھ جاتی ہے۔ اس کی وجہ جہاں تک میرا خیال ہے کہ لہر پیدا کی جاتی ہے، خود بخود نہیں اٹھتی۔۔۔ لیکن شاید میں تمہیں اچھی طرح سمجھا نہیں سکا۔“

غلام علی کے خیالات میں بہت الجھاؤ تھا۔ میں نے اسے سگریٹ دیا، اسے سلاگا کر اس نے زور سے تین کش لیے اور کہا، ”تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔ کیا ہندوستان کی ہر کو شش جو اس نے آزادی حاصل کرنے کے لیے کی ہے، غیر فطری نہیں۔۔۔ کو شش نہیں۔۔۔ میرا مطلب

ہے اس کا انجام کیا ہر بار غیر فطری نہیں ہوتا رہا۔۔۔ ہمیں کیوں آزادی نہیں ملتی۔۔۔ کیا ہم سب نامرد ہیں؟ نہیں، ہم سب مرد ہیں۔ لیکن ہم ایسے ماحول میں ہیں کہ ہماری قوت کا ہاتھ آزادی تک پہنچنے ہی نہیں پاتا۔“

میں نے اس سے پوچھا، ”تمہارا مطلب ہے آزادی اور ہمارے درمیان کوئی چیز حائل ہے۔“ غلام علی کی آنکھیں چمک انٹھیں، ”بالکل۔۔۔ لیکن یہ کوئی پکی دیوار نہیں ہے، کوئی ٹھوس چٹان نہیں ہے۔ ایک پتلی سی جھلی ہے۔۔۔ ہماری اپنی سیاست کی، ہماری مصنوعی زندگی کی جہاں لوگ دوسروں کو دھوکا دیجئے کے علاوہ اپنے آپ سے بھی فریب کرتے ہیں۔“

اس کے خیالات بدستور الجھے ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے وہ اپنے گز شستہ تجربوں کو اپنے دماغ میں تازہ کر رہا تھا۔ سگریٹ بجھا کر اس نے میری طرف دیکھا اور بلند آواز میں کہا، ”انسان جیسا ہے اسے ویسا ہی رہنا چاہیے۔ نیک کام کرنے کے لیے یہ کیا ضروری ہے کہ انسان اپنا سر منڈائے، گیروے کپڑے پہنے یا بدن پر راکھ ملے، تم کہو گے یہ اس کی مرضی ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں اس کی اس مرضی ہی سے، اس کی اس نرالی چیز ہی سے گمراہی پھیلتی ہے۔ یہ لوگ اونچے ہو کر انسان کی فطری کمزوریوں سے غافل ہو جاتے ہیں، بالکل بھول جاتے ہیں کہ ان کے کردار، ان کے خیالات اور عقیدے تو ہوا میں تخلیل ہو جائیں گے، لیکن ان کے منڈے ہوئے سر، ان کے بدن کی راکھ اور ان کے گیر دے کپڑے سادہ لوح انسانوں کے دماغ میں رہ جائیں گے۔“

غلام علی زیادہ جوش میں آگیا، ”دنیا میں اتنے مصلح پیدا ہوئے ہیں، ان کی تعلیم تو لوگ بھول چکے ہیں، لیکن صلیبیں، دھاگے، داڑھیاں، کڑے اور بغلوں کے بال رہ گئے ہیں۔۔۔ ایک ہزار برس پہلے جو لوگ یہاں بستے تھے، ہم ان سے زیادہ تجربہ کار ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا آج کے مصلح کیوں خیال نہیں کرتے کہ وہ انسان کی شکل مسح کر رہے ہیں۔ جی میں کئی دفعہ آتا ہے بلند آواز میں چلانا شروع کر دوں۔۔۔ خدا کے لیے انسان کو انسان رہنے دو، اس کی صورت کو تم بگاڑ چکے ہو، ٹھیک ہے۔۔۔ اب اس کے حال پر رحم کرو۔۔۔ تم اس کو خدا بنا نے کی کوشش کرتے ہو، لیکن وہ غریب اپنی انسانیت بھی کھو رہا ہے۔۔۔ سعادت، میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں یہ میرے دل کی آواز ہے، میں نے جو محسوس کیا ہے، وہی کہہ رہا ہوں۔ اگر یہ غلط ہے تو پھر کوئی چیز درست اور صحیح نہیں ہے۔۔۔ میں نے دو برس، پورے دو برس دماغ کے ساتھ کئی کشتیاں لڑی ہیں۔ میں نے اپنے دل، اپنے ضمیر، اپنے جسم، اپنے روئیں روئیں سے بحث کی ہے۔ مگر اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انسان کو انسان ہی رہنا چاہیے۔ نفس ہزاروں میں ایک دو آدمی ماریں۔ سب نے اپنا نفس مار لیا تو میں پوچھتا ہوں یہ کشتہ کام کس کے آئے گا؟“

یہاں تک کہہ کر اس نے ایک اور سگریٹ لیا اور اسے سلاگانے میں ساری تیلی جلا کر گردن کو ایک خفیف ساجھنا دیا، ”کچھ نہیں سعادت۔۔۔ تم نہیں جانتے۔۔۔ میں نے کتنی روحانی اور جسمانی تکلیف اٹھائی ہے، لیکن فطرت کے خلاف جو بھی قدم اٹھائے گا، اسے تکلیف برداشت کرنی ہی ہو گی۔۔۔ میں نے اس روز۔۔۔ تمہیں یاد ہو گا وہ دن۔۔۔ جلیانوالہ باغ میں اس بات کا اعلان کر کے کہ نگار اور میں غلام بچے پیدا نہیں کریں گے، ایک عجیب قسم کی برقی مسرت محسوس کی تھی۔۔۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ اس اعلان کے بعد میر اسر اونچا ہو کر آسمان کے ساتھ جا لگا ہے۔ لیکن جیل سے واپس آنے کے بعد مجھے آہستہ آہستہ اس بات کا تکلیف دہ۔۔۔ بہت ہی اذیت رسائی احساس ہونے لگا کہ میں نے اپنے جسم کا اپنی روح کا ایک بہت ہی ضروری حصہ مفلوج کر دیا ہے۔۔۔ اپنے ہاتھوں سے میں نے اپنی زندگی کے باغ کا سب سے حسین پھول مسل ڈالا ہے۔۔۔ شروع شروع میں اس خیال سے مجھے ایک عجیب قسم کا تسلی بخش فخر محسوس ہوتا رہا کہ میں نے ایسا کام کیا ہے جو دوسروں سے نہیں ہو سکتا۔ لیکن دھیرے دھیرے جب میرے شعور کے مسام کھلانے لگے تو تحقیقت اپنی تمام تکنیکوں سمیت میرے رگ و ریشے میں رچنے لگی۔ جیل سے واپس آنے پر میں نگار سے ملا۔۔۔ ہسپتال چھوڑ کر وہ بابا جی کے آشرم میں چل گئی تھی۔۔۔ سات مہینے کی قید کے بعد جب میں اس سے ملا تو اس کی بدی ہوئی رنگت، اس کی تبدیل شدہ جسمانی اور دماغی کیفیت دیکھ کر میں نے خیال کیا شاید میری نظر وہ نہ دھو کا کھایا ہے۔ لیکن ایک برس گزرنے کے بعد۔۔۔ ایک برس اس کے ساتھ۔۔۔

غلام علی کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ پیدا ہوئی، ”ہاں، ایک برس اس کے ساتھ رہنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس کا غم بھی وہی ہے جو میرا ہے۔۔۔ لیکن وہ مجھ پر ظاہر کرنا چاہتی ہے، نہ میں اس پر ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ ہم دونوں اپنے عہد کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ایک برس میں سیاسی جوش آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ کھادی کے لباس اور ترنے گے جھنڈوں میں اب وہ پہلی سی کشش باقی نہ رہی تھی۔۔۔ انقلاب زندہ باد کا نعرہ اگر کبھی بلند ہوتا بھی تاؤ اس میں وہ شان نظر نہیں آتی تھی۔۔۔ جلیانوالہ باغ میں ایک تنبو بھی نہیں تھا۔۔۔ پرانے کیپوں کے کھونٹے کہیں کہیں گڑے نظر آتے تھے۔۔۔ خون سے سیاست کی حرارت قریب قریب نکل چکی تھی۔۔۔ میں اب زیادہ وقت گھر ہی میں رہتا تھا، اپنی بیوی کے پاس۔۔۔ ”ایک بار پھر غلام علی کے ہونٹوں پر وہی زخمی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ میں بھی چپ رہا، کیونکہ میں اس کے خیالات کا تسلسل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔

چند لمحات کے بعد اس نے اپنی پیشانی کا پسینہ پوچھا اور سگرٹ بجھا کر کہنے لگا، ”ہم دونوں ایک عجیب قسم کی لعنت میں گرفتار تھے۔۔۔ نگار سے مجھے جتنی محبت ہے۔ تم اس سے واقف ہو۔۔۔ میں سوچنے لگا۔ یہ محبت کیا ہے۔۔۔؟ میں اس کو ہاتھ لگاتا ہوں تو کیوں اس کے رد عمل کو اپنی معراج پر پہنچنے کی اجازت نہیں دیتا۔۔۔ میں کیوں ڈرتا ہوں کہ مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے گا۔۔۔ مجھے نگار کی آنکھیں بہت پسند ہیں۔ ایک روز جب کہ شاید میں بالکل صحیح حالت میں تھا، میر امطلب ہے جیسا کہ ہر انسان کو ہونا چاہیے تھا۔ میں نے انھیں چوم لیا۔۔۔ وہ میرے بازوؤں میں تھی۔۔۔ یوں کہو کہ ایک کپکی تھی جو میرے بازوؤں میں تھی۔ قریب تھا کہ میری روح اپنے پر چھڑا کر پھر پھر آتی ہوئی

اوچے آسمان کی طرف اڑ جائے کہ میں نے --- کہ میں نے اسے پکڑ لیا اور قید کر دیا۔۔۔ اس کے بعد بہت دیر تک --- کئی دنوں تک اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ میرے اس فعل سے --- میرے اس بہادرانہ کارنا مے سے میری روح کو ایسی لذت ملی ہے جس سے بہت کم انسان آشنا ہیں --- لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس میں ناکام رہا اور اس ناکامی نے جسے میں ایک بہت بڑی کامیابی سمجھنا چاہتا تھا۔۔۔ خدا کی قسم یہ میری ولی خواہش تھی کہ میں ایسا سمجھوں، مجھے دنیا کا سب سے زیادہ دلکش انسان بنادیا۔۔۔ لیکن جیسا کہ تم جانتے ہو، انسان حیلے بہانے تلاش کر لیتا ہے، میں نے بھی ایک راستہ نکال لیا۔ ہم دونوں سوکھ رہے تھے۔۔۔ اندر ہماری تمام اطافوں پر پڑی جرم ری تھی۔۔۔ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے غیر بن رہے تھے۔۔۔ میں نے سوچا۔۔۔ بہت دنوں کے غور و فکر کے بعد ہم اپنے عہد پر قائم رہ کر بھی۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ ”نگار غلام نپکے پیدا نہیں کرے گی۔“

یہ کہہ کر اس کے ہونٹوں پر تیسری بار وہ زخمی مسکراہٹ پیدا ہوئی، لیکن فوراً ہی ایک بلند تھوڑے میں تبدیل ہو گئی، جس میں تکلیف دہ احساس کی چھپن نمایاں تھی۔ پھر فوراً ہی سنجیدہ ہو کر وہ کہنے لگا، ”ہماری ازاوجی زندگی کا یہ عجیب و غریب دور شروع ہوا۔۔۔ انہی کو جیسے ایک آنکھ مل گئی۔۔۔ میں ایک دم دیکھنے لگا لیکن یہ بصارت تھوڑی دیر ہی کے بعد دھنڈی ہونے لگی۔۔۔ پہلے پہل تو یہی خیال تھا۔ غلام علی موزوں الفاظ تلاش کرنے لگا، ”پہلے پہل تو ہم مطمئن تھے۔ میرا مطلب ہے شروع شروع میں ہمیں اس کا قطعاً خیال نہیں تھا کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم نا مطمئن ہو جائیں گے۔۔۔ یعنی ایک آنکھ تقاضا کرنے لگی کہ دوسری آنکھ بھی ہو۔۔۔ آغاز میں ہم دونوں نے محسوس کیا تھا جیسے ہم صحت مند ہو رہے ہیں، ہماری تند رستی بڑھ رہی ہے۔۔۔ نگار کا چہرہ نکھر گیا تھا، اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی، میرے اعضا سے بھی خشک ساتناؤ دور ہو گیا تھا جو پہلے مجھے تکلیف دیا کرتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ ہم دونوں پر عجیب قسم کی مردنی چھانے لگی۔۔۔ ایک برس ہی میں ہم دونوں رہڑ کے پنکے سے بن گئے۔۔۔ میرا احساس زیادہ شدید تھا۔۔۔ تم یقین نہیں کرو گے، لیکن خدا کی قسم اس وقت جب میں بازو کا گوشت چٹکی میں لیتا تو بالکل رہڑ معلوم ہوتا۔۔۔ ایسا لگتا تھا کہ اندر خون کی نسیں نہیں ہیں۔

نگار کی حالت مجھ سے، جہاں تک میرا خیال ہے مختلف تھی۔ اس کے سوچنے کا زاویہ اور تھا، وہ ماں بننا چاہتی تھی۔۔۔ گلی میں جب بھی کسی کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا تو اسے بہت سی آہیں چھپ چھپ کر اپنے سینے کے اندر دفن کرنا پڑتی تھیں۔ لیکن مجھے بچوں کا کوئی خیال نہیں تھا، پچھنہ ہوئے تو کیا ہے، دنیا میں لاکھوں انسان موجود ہیں جن کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔۔۔ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ میں اپنے عہد پر قائم ہوں۔۔۔ اس سے تسلیم تو کافی ہو جاتی تھی مگر میرے ذہن پر جب رہڑ کا مہین مہین جالتے لگا تو میری گھبر اہٹ بڑھ گئی۔۔۔ میں ہر وقت سوچنے لگا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے دماغ کے ساتھ رہڑ کا لمس چمٹ گیا۔ روٹی کھاتا تو لقمه دانتوں کے نیچے کچکچانے لگتے۔“

یہ کہتے ہوئے غلام علی کو پھریری آگئی، ”بہت ہی وابحیات اور غلط چیز تھی۔۔۔ انگلیوں میں ہر قت جیسے صابن سا نگاہ ہے۔۔۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ میری روح کا سارا رس نچڑ گیا ہے اور اس چھلکا سا باقی رہ گیا ہے، استعمال شدہ۔۔۔ استعمال شدہ۔۔۔ ” غلام علی ہنسنے لگا۔ ”شکر ہے کہ وہ لعنت دور ہوئی۔۔۔ لیکن سعادت، کن اذیتوں کے بعد۔۔۔ زندگی بالکل سوکھے ہوئے پچھپڑے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔۔۔ ساری حسین مردہ ہو گئی تھیں لیکن لمس کی حس غیر فطری حد تک تیز ہو گئی تھی۔۔۔ تیز نہیں۔۔۔ اس کا صرف ایک رخ ہو گیا تھا۔۔۔ لڑکی میں، شیشے میں، لوہے میں، کاغذ میں، پتھر میں ہر جگہ ربڑکی وہ مردہ، وہ ابکائی بھری ملا گئی!!

یہ عذاب اور بھی شدید ہو جاتا جب میں اس کی وجہ کا خیال کرتا۔۔۔ میں دواں گلیوں سے اس لعنت کو اٹھا کر چینک سکتا تھا، لیکن مجھ میں اتنی ہمتوں نہیں تھی۔ میں چاہتا تھا مجھے کوئی سہارا مل جائے۔ عذاب کے اس سمندر میں مجھے ایک چھوٹا سا نیکا مل جائے جس کی مدد میں کنارے لگ جاؤں۔۔۔ بہت دیر تک میں ہاتھ پاؤں مارتا رہا، لیکن ایک روز جب کوئے پر دھوپ میں ایک مذہبی کتاب پڑھ رہا تھا، پڑھ کر رہا تھا۔۔۔ ایسے ہی سرسری نظر سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک میری نظر ایک حدیث پر پڑی۔۔۔ خوشی سے اچھل پڑا۔۔۔ سہارا میری آنکھوں کے سامنے موجود تھا۔ میں نے بار بار وہ سطریں پڑھیں، میری خشک زندگی جیسے سراب ہونے لگی۔۔۔ لکھا تھا کہ شادی کے بعد میاں بیوی کے لیے بچ پیدا کرنے لازم ہیں۔۔۔ صرف اسی حالت میں ان کی پیدائش روکنے کی اجازت ہے۔ جب والدین کی زندگی خطرے میں ہو۔۔۔ میں نے دواں گلیوں سے اس لعنت کو اٹھایا اور ایک طرف چینک دیا۔ ” یہ کہہ وہ بچوں کی طرح مسکرانے لگا، میں بھی مسکرا دیا، کیونکہ اس نے دواں گلیوں سے سگریٹ کا ٹکڑا اٹھا کر ایک طرف ایسے چینکا تھا جیسے وہ کوئی نہایت ہی مکروہ چیز ہے۔

مسکراتے مسکراتے غلام علی دفعتاً سنبھیڈ ہو گیا، ”مجھے معلوم ہے سعادت۔۔۔ میں نے جو کچھ تم سے کہا ہے تم اس کا افسانہ بنادو گے۔۔۔ لیکن دیکھو میرا مذاق مت اڑانا۔۔۔ خدا کی قسم میں نے جو کچھ محسوس کیا تھا، ہی تم سے کہا ہے۔۔۔ میں اس معاملے میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ لیکن میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے، وہ یہ ہے کہ فطرت کی خلاف ورزی ہر گز ہر گز بہادری نہیں۔۔۔ یہ کوئی کارنامہ نہیں کہ تم فاقہ کشی کرتے کرتے مر جاؤ، یا زندہ رہو۔۔۔ قبر کھود کر اس میں گڑ جانا اور کئی کئی دن اس کے اندر دم سادھے رکھنا، نوکیلی کیلوں کے بستر پر مہینوں لیٹے رہنا، ایک ہاتھ بر سوں اوپر اٹھائے رکھنا، حتیٰ کہ وہ سوکھ کر لکڑی ہو جائے۔۔۔ ایسے مداری پنے سے خدا مل سکتا ہے نہ سوراج۔۔۔ اور میں تو سمجھتا ہوں ہندوستان کو سوراج صرف اس لیے نہیں مل رہا کہ یہاں مداری زیادہ ہیں اور لیڈر کم۔۔۔ جو ہیں وہ تو انیں فطرت کے خلاف چل رہے ہیں۔۔۔ ایمان اور صاف دلی کا بر تھک کنٹرول کرنے کے لیے ان لوگوں نے سیاست ایجاد کر لی ہے اور یہی سیاست ہے جس نے آزادی کے رحم کا منہ بند کر دیا ہے۔۔۔“

غلام علی اس کے آگے بھی کچھ کہنے والا تھا کہ اس کا نوکر اندر داخل ہوا۔ اس کی گود میں شاید غلام علی کا دوسرا بچہ تھا جس کے ہاتھ میں ایک خوش رنگ بیلوں تھا۔ غلام علی دیوانوں کی طرح اس پر جھپٹا۔۔۔ پٹاٹے کی سی آواز آئی۔۔۔ بیلوں پھٹ گیا اور بچے کے ہاتھ میں دھاگے کے ساتھ بڑکا ایک چھوٹا سا لکڑا لٹکتا رہ گیا۔ غلام علی نے دو انگلیوں سے اس لکڑے کو چھین کر یوں پھینکا جیسے وہ کوئی نہایت ہی مکروہ چیز تھی۔

-[101]-

شیر و سعادت حسن منشو

چیڑ اور دیوار کے نامہوار تختوں کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا مکان تھا جسے چوبی جھونپڑا کہنا بجا ہے۔ دو منزلیں تھیں۔ نیچے بھٹیار خانہ تھا جہاں کھانا پکایا اور کھایا جاتا تھا اور بالائی منزل مسافروں کی رہائش کے لیے مخصوص تھی۔ یہ منزل دو کمروں پر مشتمل تھی۔ ان میں سے ایک کافی کشادہ تھا۔ جس کا دروازہ سڑک کی دوسری طرف کھلتا تھا۔ دوسرا کمرہ جو طول و عرض میں اس سے نصف تھا بھٹیار خانے کے عین اوپر واقع تھا۔

یہ میں نے کچھ عرصے کے لیے کرایہ پر لے رکھا تھا۔ چونکہ ساتھ والے حلوائی کے مکان کی ساخت بھی بالکل اسی مکان جیسی تھی اور ان دونوں جگہوں کے لیے ایک ہی سیڑھی بنائی گئی تھی۔ اس لیے اکثر اوقات حلوائی کی کتیا پنے گھر جانے کے بجائے میرے کمرے میں چلی آتی تھی۔

اس عمارت کے تختوں کو آپس میں بہت ہی بھونڈے طریقے سے جوڑا گیا تھا۔ قیچ بہت کم استعمال کیے گئے تھے۔ شاید اس لیے کہ ان کو لکڑی میں داخل کرنے میں وقت صرف ہوتا ہے، کیلیں کچھ اس بے ربطی سے ٹھونکی گئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا اس مکان کو بنانے والا بالکل اندازی تھا۔ کیلوں کے درمیان فاصلہ کی یکسانی کا کوئی لحاظ نہ رکھا گیا تھا۔ جہاں ہاتھ ٹھہر گیا وہیں پر کیل ایک ہی ضرب میں چت کر دی گئی تھی۔ یہ بھی نہ دیکھا گیا تھا کہ لکڑی پھٹ رہی ہے یا کیل ہی بالکل ٹیڑھی ہو گئی ہے۔

چھٹ ٹین سے پاؤ ہوئی تھی، جس کی قینچی میں چڑیوں نے گھونسلے بنار کے تھے۔ کمرے کے باقی تختوں کی طرح چھٹ کی کڑیاں بھی رنگ اور روغن سے بے نیاز تھیں البتہ ان پر کہیں کہیں چڑیوں کی سفید بیٹھیں سفیدی کے چھینتوں کے مانند نظر آتی تھیں۔ میرے کمرے میں

تین کھڑکیاں تھیں۔ درمیانی کھڑکی، طول و عرض میں دروازے کے برابر تھی۔ باقی دو کھڑکیاں چھوٹی تھیں، ان کے کوڑوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ مالک مکان کا کبھی ارادہ تھا کہ ان میں شیشے جڑائے، پر اب ان کے بجائے میں کے ٹکڑے اور لکڑی کے موٹے موٹے ناہموار ٹکڑے جڑے تھے۔ کہیں کہیں لندن ٹائمز اور ٹریبیون اخبار کے ٹکڑے بھی لگے ہوئے تھے۔ جن کارنگ دھونکیں اور بارش کی وجہ سے خستہ بسکٹوں کی طرح بھوسلا ہو گیا تھا۔ یہ کھڑکیاں جن کی کنڈیاں ٹوٹی ہوئیں تھیں، بازار کی طرف کھلتی تھیں اور ہمیشہ کھلی رہتی تھیں۔ اس لیے کہ ان کو بند کرنے کے لیے کافی وقت اور محنت کی ضرورت تھی۔

کھڑکیوں میں سے دور نظر ڈالنے پر پہاڑیوں کے پیچوں بیچ ٹیڑھی بیانگی مانگ کی طرح ”کشتواڑ“ اور ”بحدروا“ جانے والی سڑک بل کھاتی ہوئی چلی گئی اور آخر میں آسمان کی نیلاہست میں گھل مل گئی تھی۔ کمرے کا فرش خالص مٹی کا تھا جو کپڑوں کو چھٹ جاتی تھی اور دھونکی کی کوششوں کے باوجود دپنا گیر وارنگ نہ چھوڑتی تھی۔ فرش پر پان کی پیک کے داغ جا بجا بھرے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں کونوں میں چھوڑی ہوئی ہڈیاں بھی پڑی رہتی تھیں جو ہر روز جھاڑو سے کسی نہ کسی طرح بچاؤ حاصل کر لیتی تھیں۔

اس کمرے کے ایک کونے میں میری چارپائی بچھی تھی جو یہ وقت میز، کرسی اور بستر کا کام دیتی تھی۔ اس کے ساتھ والی دیوار پر چند کیلیں ٹھنکی ہوئی تھیں، ان پر میں نے اپنے کپڑے وغیرہ لٹکا دیے تھے۔ دن میں پانچ چھ مرتبہ میں ان کو لٹکاتا رہتا تھا اس لیے کہ ہوا کی تیزی سے یہ اکثر گرتے رہتے تھے۔

کشمیر جانے یا وہاں سے آنے والے کئی مسافر اس کمرے میں ٹھہرے ہوں گے۔ بعض نے آتے جاتے وقت تختوں پر چاک کی ڈلی یا پنسل سے کچھ نشانی کے طور پر لکھ دیا تھا۔ سامنے کھڑکی کے ساتھ والے تختے پر کسی صاحب نے یادداشت کے طور پر پنسل سے یہ عبارت لکھی ہوئی تھی 4/5/25ء سے دو دھن شروع کیا اور ایک روپیہ پیشگی دیا گیا۔

اس طرح ایک اور تختے پر یہ مندرج تھا۔ دھونکی کو کل پندرہ کپڑے دیے گئے تھے جن میں سے وہ دو کم لا یا۔

میرے سرہانے کے قریب ایک تختے پر یہ شعر لکھا تھا۔

درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہواں وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

اس کے نیچے ”علیم پنڈر“ لکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ نویسنده کا نام ہو گا۔ یہی شعر کمرے کے ایک اور تختے پر لکھا تھا۔ مگر زرد چاک سے، اس کے اوپر تاریخ بھی لکھ دی گئی تھی۔ ایک اور تختے پر یہ شعر مرقوم تھا۔

میرے گھر آئے عنایت آپ نے مجھ پر یہ کی
میرے سر آنکھوں پر آئے، تھی یہ کب قسم میری

اس سے دور ایک کونے میں یہ مصرعہ لکھا تھا۔

ایک ہی شب گور ہے لیکن گلوں میں ہم رہے

اس مصرعے کے پاس ہی اسی خط میں پنجابی کے یہ شعر مرقوم تھے۔

تیرے بلجہ نہ آسی قرار دل نوں، جذبہ پر یہم والا بے پناہ رہے گا
لکھ اکھیاں تو ہو سیں دور بانو اے پر دلاں نوں دلاند اراہ رہے گا
تیرے میرے پیار دارب جانے، گونا لے دانیر گواہ رہے گا

ترجمہ: تیرے بغیر میرے دل کو کبھی قرار نہیں آئے گا۔ جذبہ محبت بے پناہ رہے گا تو لاکھ میری آنکھوں سے دور ہو لیکن دل کو دل کی راہ رہے گی۔ تیرے اور میرے پر یہم کو صرف خدا جانتا ہے۔ لیکن ”گونالہ“ کا پانی بھی اس کا گواہ رہے گا۔

میں نے ان اشعار کو غور سے پڑھا۔ ایک بار نہیں کئی بار پڑھا، نہ معلوم ان میں کیا جاذبیت تھی کہ پڑھتے پڑھتے میں نے ”ہیر“ کی دل نواز دھن میں انھیں گانا شروع کر دیا۔ لفظوں کا روکھاپن یوں بالکل دور ہو گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ لفظ پھسل کر اس دھن میں حل ہو گئے ہیں۔

یہ شعر کسی خاص واقعہ کے تاثرات تھے۔ مگوناہ ہو ٹل سے ایک میل کے فاصلہ پر شہتوں اور اخروٹ کے درختوں کے پیچوں نیچے بہتا تھا۔ میں یہاں کئی بار ہو آیا تھا۔ اس کے ٹھنڈے پانی میں غوطے لگا چکا تھا۔ اس کے نیچے نیچے پتھروں سے گھنٹوں کھیل چکا تھا لیکن یہ بانو کوں تھی۔۔۔؟ یہ بانو جس کا نام کشمیر کے بگو گوشے کی یاد تازہ کرتا تھا۔

میں نے اس بانو کو اس پہاڑی گاؤں میں ہر جگہ تلاش کیا مگر ناکام رہا۔ اگر شاعر نے اس کی کوئی نشانی بتا دی ہوتی تو بہت ممکن ہے مگونا لے ہی کے پاس اس کی اور میری مذہبیت ہو جاتی۔ اس مگونا لے کے پاس جس کا پانی میرے بدن میں جھر جھری پیدا کر دیتا تھا۔

میں نے ہر جگہ بانو کو ڈھونڈا مگر وہ نہ ملی۔ اس موہوم جستجو میں اکثر اوقات مجھے اپنی بیوی قوئی پر بہت ہنسی آئی، کیونکہ بہت ممکن تھا کہ وہ اشعار سرے ہی سے مہمل ہوں اور کسی نوجوان شاعر نے اپنا من پر چانے کے لیے گھردیے ہوں مگر خدا معلوم کیوں مجھے اس بات کا دلی یقین تھا کہ بانو۔۔۔ وہ بانو جو آنکھوں سے دور ہونے پر بھی اس شاعر کے دل میں موجود ہے، ضرور اس پہاڑی گاؤں میں سانس لے رہی ہے۔ چ پوچھیے تو میرا یقین اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ بعض اوقات مجھے فضائیں اس کا تنفس گلاہوا محسوس ہوتا تھا۔

مگونا لے کے پتھروں پر بیٹھ کر میں نے اس کا انتظار کیا کہ شاید وہ ادھر آنکھے اور میں اسے پہچان جاؤں لیکن وہ نہ آئی۔ کئی لڑکیاں خوبصورت اور بد صورت میری نظر وہیں سے گزریں مگر مجھے بانو دکھائی نہ دی۔ مگونا لے کے ساتھ ساتھ اگے ہوئے ناشپاٹی کے درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں، اخروٹ کے گھنے درختوں میں پرندوں کی نغمہ ریزیاں اور گیلی زمین پر سبز اور یشمیں گھاس، میرے دل و دماغ پر ایک خوش گوار تکان پیدا کر دیتی تھی اور میں بانو کے حسین تصور میں کھو جاتا تھا۔

ایک روز شام کو مگونا لے کے ایک چوڑے چکلے پتھر پر لیٹا تھا۔ خنک ہوا جنگلی بوٹیوں کی سوندھی سوندھی خوشبو میں بسی ہوئی چل رہی تھی۔ فضائیاں اسی عظیم الشان اور ناقابل بیان محبت میں ڈوبتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آسمان پر اڑتی ہوئی ابا میلیں زمین پر رہنے والوں کو گویا یہ پیغام دے رہی تھیں، ”اٹھو، تم بھی ان بلندیوں میں پرواز کرو۔“

میں نیچر کی ان سحر کاریوں کا لیٹے لیٹے تماشا کر رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے خشک ٹھنڈیوں کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے مڑکر دیکھا۔ جھاڑیوں کے پیچھے کوئی بیٹھا خشک ٹھنڈیاں توڑ رہا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا، اور سلیپر پہن کر اس طرف روانہ ہو گیا کہ دیکھوں کوں ہے۔

ایک لڑکی تھی جو خشک لکڑیوں کا ایک گٹھا بنائے کر باندھ رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ بحمدی اور کن سری آواز میں ”ماہیا“ گاری تھی۔ میرے جی میں آئی کہ آگے بڑھوں اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کے کھوں، ”کہ خدا کے لیے نہ گاؤ۔۔۔ لکڑیوں کا گٹھا اٹھا دا اور جاؤ۔ مجھے اذیت پہنچ رہی ہے۔“ لیکن مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہ ہوئی، کیونکہ اس نے خود بخود گانا بند کر دیا۔

گٹھا اٹھانے کی خاطر جب وہ مرٹی تو میں نے اسے دیکھا اور پیچان لیا یہ وہی لڑکی تھی جو بھٹیار خانے کے لیے ہر روز شام کو ایندھن لایا کرتی تھی۔ معمولی شکل و صورت تھی۔ ہاتھ پاؤں بے حد غلیظ تھے۔ سر کے بالوں میں بھی کافی میل جم رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور دیکھ کر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ میں جب اٹھ کر دیکھنے آیا تھا تو دل میں آئی کہ چلو اس سے کچھ بتیں ہی کر لیں۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا، ”یہ ایندھن جو تم نے اکٹھا کیا ہے! اس کا تمہیں جٹا کیا دے گا؟“

جٹا اس بھٹیار خانے کے مالک کا نام تھا۔

اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا، ”ایک آنہ“

”صرف ایک آنہ۔“

”کبھی کبھی پانچ پیسے بھی دے دیتا ہے۔“

”تو سارا دن محنت کر کے تم ایک آنہ یا پانچ پیسے کماتی ہو۔“

اس نے گٹھے کی خشک لکڑیوں کو درست کرتے ہوئے کہا، ”نہیں، دن میں ایسے دو گٹھے تیار ہو جاتے ہیں۔“

”تو دو آنے ہو گئے۔“

”کافی ہیں۔“

”تمہاری عمر کیا ہے؟“

اس نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا، ”تم وہی ہو ناجو بھٹیار خانے کے اوپر رہتے ہو۔“

میں نے جواب دیا، ”ہاں وہی ہوں۔ تم مجھے کئی بار وہاں دیکھ چکی ہو۔“

”یہ تم نے کیسے جانا؟“

”اس لیے کہ میں نے تمہیں کئی بار دیکھا ہے۔“

”دیکھا ہو گا۔“

یہ کہہ وہ زمین پر بیٹھ کر گٹھا اٹھانے لگی۔ میں آگے بڑھا، ”ٹھہرو میں اٹھوادیتا ہوں۔“ گٹھا اٹھواتے ہوئے لکڑی کا ایک نوکیلا لکڑا اس زور سے میری انگلی میں چھا کہ میں نے دونوں ہاتھ ہٹالیے۔ وہ سرپر رسی کو اٹھا کر گٹھے کو قریب قریب اٹھا چکی تھی۔ میرے ہاتھ ہٹانے سے اس کا توازن قائم نہ رہا اور وہ لڑکھڑائی۔ میں نے فوراً اسے تھام لیا۔ ایسا کرتے ہوئے میرا ہاتھ اس کی کمر سے لے کر اٹھے ہوئے بازو کی بغل تک گھستنا چلا گیا، وہ تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ سرپر رسی کو اچھی طرح جمانے کے بعد اس نے میری طرف کچھ عجیب نظروں سے دیکھا اور چلی گئی۔

میری انگلی سے خون جاری تھا۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر اس پر باندھا اور مگونا لے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس پتھر پر بیٹھ کر میں نے اپنی زخی انگلی کو پانی سے دھو کر صاف کیا اور اس پر رومال باندھ کر سوچنے لگا، ”یہ بھی اچھی رہی، بیٹھے بٹھائے اپنی انگلی اہولہاں کر لی۔۔۔ خود ہی اٹھائیتی، میں نے بھلا یہ تکلف کیوں کیا۔“

یہاں سے میں اپنے ہوٹل، معاف کیجیے گا، بھٹیار خانے پہنچا اور کھانا و انا کھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دیر تک، کھانا ہضم کرنے کی غرض سے کمرے میں میں ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ پھر کچھ دیر تک لاثین کی اندر ہی روشنی میں ایک واہیات کتاب پڑھتا رہا۔ سچ پوچھئے تو ارد گردہ برثے واہیات تھی۔ لال مٹی جو کپڑے کے ساتھ ایک دفعہ لگتی تھی تو دھوپی کے پاس جا کر بھی الگ نہ ہوتی تھی اور وہ آپس میں نہایت ہی

بھونڈے طریقے پر جوڑے ہوئے تھتے اور ان پر لکھے ہوئے غلط اشعار اور چھوڑی ہوئی ہڈیاں جو ہر روز جھاڑو کی زد سے کسی نہ کسی طرح بچ کر میری چارپائی کے پاس نظر آتی تھیں۔

کتاب ایک طرف رکھ کر میں نے لاٹھین کی طرف دیکھا۔ مجھے اس میں اور اس لکڑیاں چنے والی میں ایک گونہ مماثلت نظر آئی۔ کیونکہ لاٹھین کی چمنی کی طرح اس لڑکی کا لباس بھی بے حد غلیظ تھا۔ مجھے اس کو بھانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کیونکہ میں نے سوچا، تھوڑی ہی دیر میں دھوئیں کی وجہ سے یہ اس قدر انہی ہو جائے گی کہ خود بخود انہیں میرا ہو جائے گا۔

کھڑکیاں خود بخوبی بند ہو گئی تھیں۔ میں نے ان کو بھی نہ کھولا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ رات کے نو یادس نجح پکھے تھے۔ سونے ہی والا تھا کہ بازار میں ایک کتازور سے بھونکا جیسے اس کی پسلی میں لیکا یک درد اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں اس پر لعنتیں بھیجیں اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا مگر فوراً ہی نزدیک دور سے کئی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک عجیب و غریب سبستک قائم ہو گیا۔ اگر کوئی کتا ایک سرچھیٹر تالو سبستک کے سارے سرفضا میں گوئنے لگتے۔ میری نیند حرام ہو گئی۔

دیر تک میں نے صبر کیا۔ لیکن مجھ سے نہ رہا گیا تو میں اٹھا، دوسرے کمرے میں گیا اور اس کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ نیچے بازار میں اترا اور جو پتھر میرے ہاتھ میں آیا مارنا شروع کر دیا۔ ایک دوپتھر کتوں کو لگے کیونکہ نہایت ہی مکروہ آوازیں بلند ہوئیں۔ میں نے اس کامیابی پر اور زیادہ پتھر پھینکنے شروع کیے۔ دغناً کسی انسان کے ”اف“ کرنے کی آوازنائی دی۔ میرا ہاتھ وہیں پتھر بن گیا۔

آواز کسی عورت کی تھی۔ سڑک کے دائیں ہاتھ ڈھلوان تھی، ادھر تیز قدی سے گیا تو میں نے دیکھا کہ نیچے ایک لڑکی دوہری ہو کر کراہ رہی تھی۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ کھڑی ہو گئی۔ بدلی کے پیچھے پیچھے ہوئے چاند کی دھنڈلی روشنی میں مجھے اپنے سامنے وہی ایندھن چننے والی لڑکی نظر آئی۔ اس کے ماتھے سے خون نکل رہا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ میری غفلت کے باعث اسے اتنی تکلیف ہوئی۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا، ”مجھے معاف کر دینا۔۔۔ لیکن تم یہاں کیا کر رہی ہی تھیں؟“

اس نے جواب دیا، ”میں اوپر چڑھ رہی تھی۔“

”رات کو اس وقت تمہیں کیا کام تھا؟“

اس نے کرتے کی آئین سے ماتھے کا خون صاف کیا اور کہا، ”اپنے کتنے شیر و کوڑ ہونڈ رہی تھی۔“ بے اختیار مجھے منسی آگئی، ”اور میں تمام کتوں کا خون کر دینے کا تھیہ کر کے گھر سے نکلا تھا۔“ وہ بھی پنس دی۔

”کہاں ہے تمہارا شیر و؟“

”اللہ جانے کہاں گیا ہے۔ یوں ہی سارا دن مارا مارا پھرتا ہے۔“

”توب کیسے تلاش کرو گی؟“

”یہیں سڑک پر مل جائے گا کہیں۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ اسے تلاش کروں؟“

نیند میری آنکھوں سے بالکل اڑ چکی تھی، اس لیے میں نے کہا کہ چلو کچھ دیر شغل رہے گا لیکن اس نے سر ہلا کر کہا، ”نہیں میں اسے آپ ہی ڈھونڈ لوں گی۔ مجھے معلوم ہے وہ کہاں ہو گا۔“

”ابھی ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ تمہارے مکان کے پچھواؤڑے ہو گا۔“

”تو چلو، مجھے بھی ادھر ہی جانا ہے کیوں کہ میں پچھلادروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔“

ہم دونوں بھیلار خانے کے پچھواؤڑے کی جانب روانہ ہوئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جو کبھی کبھی بدن پر خوشگوار کپکی طاری کر دیتی تھی۔ چاند ابھی تک باول کے پیچھے چھا ہوا تھا۔ روشنی تھی مگر بہت ہی دھنڈلی جو رات کی خنکی میں بڑی پراسرار معلوم ہوتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ آدمی کمبل اوڑھ کے لیٹ جائے اور اوت پٹانگ با تین سوچے۔

سڑک طے کر کے ہم اوپڑ چڑھے اور بھٹیار خانے کے عقب میں پہنچ گئے۔ وہ میرے آگے تھی۔ ایک دم وہ ٹھٹکی اور منہ پھیر کر عجیب و غریب لمحے میں اس نے کہا، ”دور دفاتر ہونا مراد!“ ایک موٹا تازہ کتا نمودار ہوا اور اپنے ساتھ حلوائی کی کتیا کو گھسیٹا ہوا ہمارے پاس سے گزر گیا۔ دروازہ کھلا تھا میں اسے اندر اپنے کمرے میں لے گیا۔

لاٹھیں کی چمنی ابھی مکمل طور پر سیاہ نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ ایک کونے سے جو اس کالک سے نیچ گیا تھا، تھوڑی تھوڑی روشنی باہر نکل رہی تھی۔ دوڑھائی گھنٹے کے بعد ہم باہر نکلے۔ چاند اب بادل میں سے نکل آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ نیچے سڑک پر اس کا لاتا شیر و بڑے سے پتھر کے پاس بیٹھا اپنا بدن صاف کر رہا تھا۔ اس سے کچھ دور حلوائی کی کتیا کھڑی تھی۔

جب وہ جانے لگی تو میں نے اس سے پوچھا، ”تمہارا نام کیا ہے؟“

اس نے جواب دیا، ”بانو۔“

”بانو!“ میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

اب اس نے پوچھا، ”تمہارا نام کیا ہے؟“

میں نے جواب دیا، ”شیر و۔“

-[102]-

خالد میاں: سعادت حسن منٹو

ممتاز نے صحیح سویرے اٹھ کر، حسب معمول تینوں کمرے میں جھاڑو دی۔ کونے کھدروں سے سگر ٹوں کے ٹکڑے، ماچس کی جلی ہوئی تیلیاں اور اسی طرح کی اور چیزیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں۔ جب تینوں کمرے اچھی طرح صاف ہو گئے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس کی بیوی باہر صحن میں سورہی تھی۔ بچہ پنگوڑے میں تھا۔ ممتاز ہر صبح سویرے اٹھ کر صرف اس لیے خود تینوں کروں میں جھاڑو دیتا تھا کہ اس کا لڑکا خالد اب چلتا پھرتا تھا اور عام پچوں کے مانند، ہر چیز جو اس کے سامنے آئے، اٹھا کر منہ میں ڈال لیتا تھا۔

ممتاز ہر روز تینوں کرے بڑے اختیاط سے صاف کرتا مگر اس کو حیرت ہوتی جب خالد فرش پر اسے اپنے چھوٹے چھوٹے ناخنوں کی مدد سے کوئی نہ کوئی چیز اٹھایتا۔ فرش کا پلستر کئی جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ جہاں کوڑے کر کٹ کے چھوٹے چھوٹے ذرے پھنس جاتے تھے۔ ممتاز اپنی طرف سے پوری صفائی کرتا مگر کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتا جو اس کا پلوٹھی کا بیٹھا خالد جس کی عمر ابھی ایک برس کی نہیں ہوئی تھی، اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لیتا۔

ممتاز کو صفائی کا خطہ ہو گیا تھا۔ اگر وہ خالد کو کوئی چیز فرش پر سے اٹھا کر اپنے منہ میں ڈالتے دیکھتا تو وہ خود کو اس کا لازم سمجھتا۔ اپنے آپ کو دل ہی دل میں کوستا کہ اس نے کیوں بد اختیاطی کی۔ خالد سے اس کو پیارہی نہیں عشق تھا، لیکن عجیب بات ہے کہ جوں جوں خالد کی پہلی سا گرہ کا دن نزدیک آتا تھا اس کا یہ وہم، یقین کی صورت اختیار کرتا جاتا تھا کہ اس کا بیٹھا ایک سال کا ہونے سے پہلے پہلے مر جائے گا۔

اپنے اس خوف ناک وہم کا ذکر ممتاز اپنی بیوی سے بھی کر چکا تھا۔ ممتاز کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ اوہام کا بالکل قائل نہیں۔ اس کی بیوی نے جب پہلی بار اس کے منہ سے ایسی بات سنی تو کہا، ”آپ اور ایسے وہم۔۔۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا بیٹھا سو سال زندہ رہے گا۔۔۔ میں نے اس کی پہلی سا گرہ کے لیے ایسا اہتمام کیا ہے کہ آپ دنگ رہ جائیں گے۔“

یہ سن کر ممتاز کے دل کو ایک دھماکا سا لگا تھا۔ وہ کب چاہتا تھا کہ اس کا بیٹھا نہ رہے لیکن اس کے وہم کا کیا علاج تھا۔۔۔ خالد بڑا تندرست بچہ تھا۔ سر دیوں میں جب نو کرا یک دفعہ اس کو باہر سیر کے لیے لے گیا تو واپس آ کر اس نے ممتاز کی بیوی سے کہا، ”میگم صاحب، آپ خالد میاں کے گالوں پر سرخی نہ لگایا کریں۔۔۔ کسی کی نظر لگ جائے گی۔“

یہ سن کر اس کی بیوی بہت ہنسی تھی، ”بے وقوف مجھے کیا ضرورت ہے سرخی لگانے کی۔ ماشاء اللہ اس کے گال تو قدرتی لال ہیں۔“

سردیوں میں خالد کے گال بہت سرخ رہتے تھے مگر اب گرمیوں میں کچھ زردی مائل ہو گئے تھے۔ اس کو پانی کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ جب وہ انگڑائی لے کر اٹھتا اور دودھ کی بوتل پی لیتا تو فتر جانے سے پہلے ممتاز اس کو پانی کی بالٹی میں کھڑا کر دیتا۔ دیر تک وہ پانی کے چھینٹے اڑاڑا کر کھیلتا رہتا۔ ممتاز اور اس کی بیوی خالد کو دیکھتے اور بہت خوش ہوتے۔ لیکن ممتاز کی خوشی میں غم کا ایک بر قی دھکا سا ضرور ہوتا۔

وہ سوچتا: خدا میری بیوی کی زبان مبارک کرے، لیکن یہ کیا ہے کہ مجھے اس کی موت کا کھلاڑا رہتا ہے۔ یہ وہم کیوں میرے دل و دماغ میں بیٹھ گیا ہے کہ یہ مر جائے گا۔۔۔ کیوں مرے گا۔۔۔؟ اچھا بھلا صحت مند ہے۔ اپنی عمر کے بچوں سے کہیں زیادہ صحت مند۔۔۔ میں یقیناً پاگل ہوں۔ اس سے میری حد سے زیادہ بڑھی ہوئی محبت دراصل اس وہم کا باعث ہے۔۔۔ لیکن مجھے اس سے اتنی زیادہ محبت کیوں ہے۔۔۔؟ کیا سارے باپ اسی طرح بچوں سے پیار کرتے ہیں۔۔۔ کیا ہر بات کو اپنی اولاد کی موت کا کھلاڑا رکھتا ہے۔۔۔؟ مجھے آخر ہو کیا گیا ہے؟

ممتاز نے جب حسب معمول تینوں کمرے اچھی طرح صاف کر دیے تو وہ فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹ گیا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ صح اٹھ کر، جھاڑوں غیرہ دے کروہ گرمیوں میں ضرور آدھے گھنٹے کے لیے چٹائی پر لیٹا کر تاھا۔ بغیر تینی کے اس طرح اس کو لطف محسوس ہوتا تھا۔

لیٹ کروہ سوچنے لگا، ”پرسوں میرے بچے کی پہلی سالگرہ ہے۔۔۔ اگر یہ بغیر و عافیت گزر جائے تو میرے دل کا سارا بوجھ ہلاکا ہو جائے گا۔ یہ میر اوہم بالکل دور ہو جائے گا۔۔۔ اللہ میاں یہ سب تیرے ہاتھ میں ہے۔“

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ دفعتاً اس نے اپنے ننگے سینے پر بوجھ سا محسوس کیا۔ آنکھیں کھولیں تو دیکھا خالد ہے۔ اس کی بیوی پاس کھڑی تھی۔ اس نے کہا، ”ساری رات بے چین سارہا ہے سوتے میں جیسے ڈرڈر کے کانپتا رہا ہے۔“

خالد، ممتاز کے سینے پر زور سے کانپا۔ ممتاز نے اس پر ہاتھ رکھا اور کہا، ”خدا میرے بیٹے کا محافظ ہو۔“ ممتاز کی بیوی نے خفگی آمیز لمحے میں کہا، ”توبہ، آپ کو بس وہموں نے گھیر رکھا ہے۔ ہلاکا سا بخار ہے، انشاء اللہ دور ہو جائے گا۔“ یہ کہہ کر ممتاز کی بیوی کمرے سے چلی گئی۔

ممتاز نے ہولے ہولے بڑے پیار سے خالد کو تھپکنا شروع کیا جو اس کی چھاتی پر اوندھا لیٹا تھا اور سوتے میں کبھی کبھی کانپ اٹھتا تھا۔ تھپکنے سے وہ جاگ پڑا۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھولیں اور باپ کو دیکھ کر مسکرا لیا۔ ممتاز نے اس کا منہ چوما۔ ”کیوں میاں خالد کیابات ہے۔۔۔ آپ کا نپتے کیوں تھے؟“

خالد نے مسکرا کر اپنا اٹھا ہوا سر باب کی چھاتی پر گرادیا۔ ممتاز نے پھر اس کو تھپکا نا شروع کر دیا۔ دل میں وہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ اس کے بیٹے کی عمر دراز ہو۔ اس کی بیوی نے خالد کی پہلی سالگرہ کے لیے بڑا اہتمام کیا تھا۔ اپنی ساری سہیلیوں سے کہا تھا کہ وہ اس تقریب پر ضرور آئیں۔ درزی سے خاص طور پر اس کی سالگرہ کے کپڑے سلوائے تھے۔ دعوت پر کیا کیا چیز ہو گی، یہ سب سوچ لیا تھا۔۔۔ ممتاز کو یہ ٹھہٹ پسند نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی کو خبر نہ ہو اور سالگرہ گزر جائے۔ خود اس کو بھی پتانہ چلے اور اس کا بیٹا ایک برس کا ہو جائے۔ اس کو اس بات کا علم صرف اس وقت ہو جب خالد ایک برس اور کچھ دنوں کا ہو گیا ہو۔

خالد اپنے باپ کی چھاتی پر سے اٹھا۔ ممتاز نے اس سے محبت میں ڈوبے ہوئے لبجھ میں کہا، ”خالد بیٹا، سلام نہیں کرو گے ابا جی کو۔“

خالد نے مسکرا کر ہاتھ اٹھایا اور اپنے سر پر کھدیا۔ ممتاز نے اس کو دعا دی، ”جیتے رہو۔“ لیکن یہ کہتے ہی اس کے دل پر اس کے وہم کی ضرب لگی اور وہ غم و فکر کے سمندر میں غرق ہو گیا۔

خالد سلام کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ دفتر جانے میں ابھی کافی وقت تھا۔ ممتاز چٹائی پر لیٹا رہا اور اپنے وہم کو دل و دماغ سے محوكرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اتنے میں باہر ٹھن سے اس کی بیوی کی آواز آئی، ”ممتاز صاحب، ممتاز صاحب۔۔۔ ادھر آئیے۔“ آواز میں شدید گھبراہٹ تھی۔ ممتاز چونک کراٹھا۔ دوڑ کر باہر گیا۔ دیکھا کہ اس کی بیوی خالد کو غسل خانے کے باہر گود میں لیے کھڑی ہے اور وہ اس کی گود میں بل پہ بل کھارا ہے۔۔۔ ممتاز نے اس کو اپنی بانھوں میں لے لیا اور بیوی سے جو کانپ رہی تھی پوچھا، ”کیا ہوا؟“

اس کی بیوی نے خوف زدہ لبجھ میں کہا، ”معلوم نہیں۔۔۔ پانی سے کھیل رہا تھا۔۔۔ میں نے ناک صاف کی تو دوہر ا ہو گیا۔“

ممتاز کی بانھوں میں خالد ایسے بل کھارا تھا، جیسے کوئی اسے کپڑے کی طرح نچوڑ رہا ہے۔ سامنے چار پائی پڑی تھی۔ ممتاز نے اس کو وہاں لٹا دیا۔ میاں بیوی سخت پریشان تھے۔ وہ پڑا بل پہ بل کھارا تھا اور ان دونوں کے اوسان خط تھے کہ وہ کیا کریں۔ تھپکایا، چوما، پانی کے چھینٹے مارے گر اس کا تشنیج دور نہ ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد خود بخود دورہ آہستہ آہستہ ختم ہو گیا اور خالد پر بے ہوشی سی طاری ہو گئی۔ ممتاز نے سمجھا، مر گیا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کہا، ”ختم ہو گیا۔“

وہ چلائی، ”لا حول ولا۔۔۔ کیسی بتیں منہ سے نکلتے ہیں۔ کنو لشن تھی، ختم ہو گئی۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔“

خالد نے اپنی مر جھائی ہوئی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھو لیں اور اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ ممتاز کی ساری دنیازندہ ہو گئی۔ بڑے ہی درد بھرے پیار سے اس نے خالد سے کہا، ”کیوں خالد بیٹا۔۔۔ یہ کیا ہوا آپ کو؟“

خالد کے ہونٹوں پر تشنیج زدہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ممتاز نے اس کو گود میں اٹھایا اور اندر کمرے میں لے گیا۔ لٹانے ہی والا تھا کہ دوسری کنولشن آئی۔ خالد پھر بل کھانے لگا۔ جس طرح مرگی کا دورہ ہوتا ہے، یہ تشنیج بھی اسی قسم کا تھا۔ ممتاز کو ایسا محسوس ہوتا کہ خالد نہیں بلکہ وہ اس اذیت کے شکنچے میں کساجا رہا ہے۔

دوسرادورہ ختم ہوا تو خالد اور زیادہ مر جھاگیا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں دھنس گئیں۔ ممتاز اس سے بتیں کرنے لگا، ”خالد بیٹے، یہ کیا ہوتا ہے آپ کو؟“

”خالد میاں، اٹھو نا۔۔۔ چلو پھرو۔“

”خالدی۔۔۔ مکھن کھائیں گے آپ؟“

خالد کو مکھن بہت پسند تھا مگر اس نے یہ سن کر اپنا سر ہلا کر ہاں نہ کی، لیکن جب ممتاز نے کہا، ”بیٹے، گلوکھائیں گے آپ؟“ تو اس نے بڑے نحیف انداز میں نہیں کے طور پر اپنا سر ہلایا۔ ممتاز مسکرا یا اور خالد کو اپنے گلے سے گالیا، پھر اس کو اپنی بیوی کے حوالے کیا اور اس سے کہا، ”تم اس کا دھیان رکھو میں ڈاکٹر لے کر آتا ہوں۔“

ڈاکٹر ساتھ لے کر آیا تو ممتاز کی بیوی کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ اس کی غیر حاضری میں خالد پر تشنیج کے تین اور دورے پڑھکے تھے۔ ان کے باعث وہ بے جان ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور کہا، ”تردو کی کوئی بات نہیں۔ ایسی کنولشن چھوں کو عموماً آیا کرتی ہے۔۔۔ اس کی وجہ دانت ہیں۔ معدے میں کرم وغیرہ ہوں تو وہ بھی اس کا باعث ہو سکتے ہیں۔۔۔ میں دوالکھ دیتا ہوں۔ آرام آجائے گا۔ بخار تیز نہیں ہے، آپ کوئی فکر نہ کریں۔“

ممتاز نے دفتر سے چھٹی لے لی اور سارا دن خالد کے پاس بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد اس کو دو مرتبہ اور دورے پڑے۔ اس کے بعد وہ نڈھاں لیتھا رہا۔ شام ہو گئی تو ممتاز نے سوچا، ”شاید اب اللہ کا فضل ہو گیا ہے۔۔۔ اتنے عرصے میں کوئی کنو لشن نہیں آئی۔۔۔ خدا کرے رات اسی طرح کٹ جائے۔“

ممتاز کی بیوی بھی خوش تھی، ”اللہ تعالیٰ نے چاہا تو کل میرا خالد دوڑتا پھرے گا۔“

رات کو چونکہ مقررہ اوقات پر دوادینی تھی، اس لیے ممتاز چارپائی پرنہ لیٹا کہ شاید سو جائے۔ خالد کے پنگوڑے کے پاس آرام کر سی رکھ کر وہ بیٹھ گیا اور ساری رات جا گتار رہا، کیونکہ خالد بے چین تھا، کانپ کانپ کر بار بار جا گتا تھا، حرارت بھی تیز تھی۔

صحیح سات بج کے قریب ممتاز نے تھر ما میٹر لگا کے دیکھا تو ایک سو چار ڈگری بخار تھا۔ ڈاکٹر بلایا۔ اس نے کہا، ”تردو کی کوئی بات نہیں، برونا کمیس ہے میں نسخہ لکھ دیتا ہوں۔ تین چار روز میں آرام آجائے گا۔“

ڈاکٹر نسخہ لکھ کر چلا گیا۔ ممتاز دوابنوا لایا۔ خالد کو ایک خوراک پلائی مگر اس کو تسلکیں نہ ہوئی۔ دس بج کے قریب وہ ایک بڑا ڈاکٹر لایا۔ اس نے اچھی طرح خالد کو دیکھا اور تسلی دی، ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

سب ٹھیک نہ ہوا۔ بڑے ڈاکٹر کی دوانے کوئی اثر نہ کیا۔ بخار تیز ہوتا گیا۔ ممتاز کے نوکرنے کہا، ”صاحب، بیماری وغیرہ کوئی نہیں۔۔۔ خالد میاں کو نظر لگ گئی ہے، میں ایک تعویذ لکھو کر لایا ہوں۔ اللہ کے حکم سے یوں چنکیوں میں اثر کرے گا۔“

سات کنوں کا پانی اکھٹا کیا گیا۔ اس میں یہ تعویذ گھول کر خالد کو پلا یا گیا۔ کوئی اثر نہ ہوا۔ ہمسائی آئی، وہ ایک یونانی دوا تجویز کر گئی۔ ممتاز یہ دوالے آیا مگر اس نے خالد کو نہ دی۔ شام کو ممتاز کا ایک رشتے دار آیا، ساتھ اس کے ایک ڈاکٹر تھا۔ اس نے خالد کو دیکھا اور کہا، ”ملیریا ہے۔۔۔ اتنا بخار ملیریا ہی میں ہوتا ہے۔ آپ اس پر برف کا پانی ڈالیے، میں کوئین کا انجکشن دیتا ہوں۔“

برف کا پانی ڈالا گیا۔ بخار ایک دم کم ہو گیا۔ درجہ حرارت اٹھانوے ڈگری تک آگیا۔ ممتاز اور اس کی بیوی کی جان میں جان آئی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے میں بخار بہت ہی تیز ہو گیا۔ ممتاز نے تھر ما میٹر لگا کر دیکھا۔ درجہ حرارت ایک سو چھتکے پہنچ گیا تھا۔

ہمسائی آئی۔ اس نے خالد کو مایوس نظر وں سے دیکھا اور ممتاز کی بیوی سے کہا، ”بچے کی گردن کا منکار ٹوٹ گیا ہے۔“

متاز اور اس کی بیوی کے دل بیٹھ گئے۔ ممتاز نے بچے کا رخانے سے ہسپتال فون کیا۔ ہسپتال والوں نے کہا مریض لے آؤ۔ ممتاز نے فوراً ٹانگہ منگوایا۔ خالد کو گود میں لیا۔ بیوی کو ساتھ بٹھایا اور ہسپتال کا رخ کیا۔ سارا دن وہ پانی پیتا رہا تھا۔ مگر پیاس تھی کہ بجھتی ہی نہیں تھی۔ ہسپتال جاتے ہوئے راستے میں اس کا حلق بے حد خشک ہو گیا۔ اس نے سوچا اتر کر کسی دکان سے ایک گلاس پانی پی لے، لیکن خدا معلوم کہاں سے یہ وہم ایک دم اس کے دماغ میں آن پکا، دیکھوا گر تم نے پانی پیا تو تمہارا خالد مر جائے گا۔

متاز کا حلق سوکھ کے لکڑی ہو گیا مگر اس نے پانی نہ پیا۔ ہسپتال کے قریب ٹانگہ پہنچا تو اس نے سگریٹ سلاگا یا۔ دو ہی کش لیے تھے تو اس نے ایک دم سگریٹ چینک دیا۔ اس کے دماغ میں یہ وہم گونجا تھا: ممتاز سگریٹ نہ پیو تمہارا بچہ مر جائے گا۔

متاز نے ٹانگہ ٹھہرایا۔ اس نے سوچا: یہ کیا حماقت ہے۔۔۔ یہ وہم سب فضول ہے۔ سگریٹ پینے سے بچے پر کیا آفت آسکتی ہے۔

ٹانگے سے اتر کر اس نے سڑک پر سے سگریٹ اٹھایا۔ واپس ٹانگے میں بیٹھ کر جب اس نے کش لینا چاہا تو کسی نامعلوم طاقت نے اس کو روکا: نہیں ممتاز، ایسا نہ کرو۔ خالد مر جائے گا۔

متاز نے سگریٹ زور سے چینک دیا۔۔۔ ٹانگے والے نے گور کے اس کو دیکھا۔ ممتاز نے محسوس کیا کہ جیسے اس کو اس کی دماغی کیفیت کا علم ہے اور وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ اپنی خفت دور کرنے کی خاطر نے ٹانگے والے سے کہا، ”خراب ہو گیا تھا سگریٹ“ یہ کہہ اس نے جیب سے ایک نیا سگریٹ نکالا۔ سلاگنا چاہا مگر ڈر گیا۔ اس کے دل و دماغ میں ہلچل سی مجھ گئی۔ اور اک کہتا تھا کہ یہ اوہا م سب فضول ہیں مگر کوئی ایسی آواز تھی، کوئی ایسی طاقت تھی جو اس کی منطق، اس کے استدلال، اس کے ادراک پر غالب آ جاتی تھی۔

ٹانگہ ہسپتال کے پھاٹک میں داخل ہوا تو اس نے سگریٹ انگلیوں میں مسل کر چینک دیا۔ اس کو اپنے اوپر بہت ترس آیا کہ وہ اوہا م کا غلام بن گیا ہے۔

ہسپتال والوں نے فوراً ہی خالد کو داخل کر لیا۔ ڈاکٹر نے دیکھا اور کہا، ”بروگنونو نیا ہے، حالت مندوش ہے۔“ خالد بے ہوش تھا۔ مال اس کے سرہانے بیٹھی ویران ٹنگا ہوں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ کمرے کے ساتھ غسل خانہ تھا۔ ممتاز کو سخت پیاس لگ رہی تھی۔ نل کھول کر اوک سے پانی پینے لگا تو پھر وہی وہم اس کے دماغ میں گونجا: ممتاز، یہ کیا کر رہے ہو تھم۔ مت پانی پیو۔۔۔ تمہارا خالد مر جائے گا۔

متاز نے دل میں اس وہم کو گالی دی اور انتقام آتنا پانی پیا کہ اس کا پیٹ اپھر گیا۔ پانی پی کر غسل خانے سے باہر آیا تو اس کا خالد اسی طرح مر جھایا ہوا بے ہوش ہسپتال کے آہنی پلنگ پر پڑا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کہیں بھاگ جائے۔۔۔ اس کے ہوش و حواس غائب ہو جائیں۔۔۔ خالد اچھا ہو جائے اور وہ اس کے بد لے نہ نمیں پیا کہ اس کا پیٹ اپھر گیا۔۔۔

متاز نے محسوس کیا کہ خالد اب پہلے سے زیادہ زرد ہے۔ اس نے سوچا، یہ سب اس کے پانی پی لینے کا باعث ہے۔۔۔ اگر وہ پانی نہ پیتا تو ضرور خالد کی حالت بہتر ہو جاتی۔ اس کو بہت دکھ ہوا۔ اس نے خود کو بہت لعنت ملامت کی مگر پھر اس کو خیال آیا کہ جس نے یہ بات سوچی تھی وہ ممتاز نہیں کوئی اور تھا۔۔۔ اور کون تھا۔۔۔ کیوں اس کے دماغ میں ایسے وہم پیدا ہوتے تھے۔ پیاس لگتی تھی، پانی پی لیا۔ اس سے خالد پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔۔۔ خالد ضرور اچھا ہو جائے گا۔۔۔ پرسوں اس کی سالگرہ ہے۔ انشاء اللہ خوب ٹھاٹ سے منائی جائے گی۔

لیکن فوراً ہی اس کا دل بیٹھ جاتا۔ کوئی آواز اس سے کہتی: خالد ایک برس کا ہونے ہی نہیں پائے گا۔ ممتاز کا جی چاہتا کہ وہ اس آواز کی زبان کپڑے لے اور اسے گدی سے نکال دے مگر یہ آواز تو خود اس کے دماغ میں پیدا ہوتی تھی خدا معلوم کیسے ہوتی تھی۔۔۔ کیوں ہوتی تھی۔

متاز اس قدر تنگ آگیا کہ اس نے دل ہی دل میں اپنے اوہام سے گڑ گڑا کر کہا: خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔۔۔ کیوں تم مجھ غریب کے پیچے پڑ گئے ہو۔

شام ہو چکی تھی۔ کئی ڈاکٹر خالد کو دیکھ چکے تھے۔ دوادی جا رہی تھی۔ کئی انجکشن بھی لگ چکے تھے مگر خالد ابھی تک بے ہوش تھا۔ دفعتاً ممتاز کے دماغ میں یہ آواز گونجی: تم یہاں سے چلے جاؤ۔۔۔ فوراً چلے جاؤ، ورنہ خالد مر جائے گا۔

متاز کمرے سے باہر چلا گیا۔ ہسپتال سے باہر چلا گیا۔ اس کے دماغ میں آوازیں گونجتی رہیں۔ اس نے اپنے آپ کو ان آوازوں کے حوالے کر دیا۔ اپنی ہر جنبش، اپنی ہر حرکت ان کے حکم کے سپرد کر دی۔۔۔ یہ اسے ایک ہوٹل میں لے گئیں۔ انہوں نے اس کو شراب پینے کے

لیے کہا۔ شراب آئی تو اسے چینک دینے کا حکم دیا۔ ممتاز نے ہاتھ سے گلاں چینک دیا تو اور منگوانے کے لیے کہا۔ دوسرا گلاں آیا تو اسے بھی چینک دینے کے لیے کہا۔

شراب اور ٹوٹے ہوئے گلاسوں کے بل ادا کر کے ممتاز باہر نکلا۔ اس کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی ہے۔۔۔ صرف اس کا دماغ ہے جہاں شور برپا ہے۔ چلتا چلتا وہ ہسپتال پہنچ گیا۔ خالد کے کمرے کا رخ کیا تو اسے حکم ہوا: مت جاؤ ادھر۔۔۔ تمہارا خالد مرجائے گا۔

وہ لوٹ آیا۔۔۔ گھاس کا میدان تھا۔ وہاں ایک نیچ پڑی تھی، اس پر لیٹ گیا۔۔۔ رات کے دس بجے چکے تھے۔ میدان میں اندر ہیرا تھا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ کبھی کبھی کسی موڑ کے ہارن کی آواز اس خاموشی میں خراش پیدا کرتی ہوئی گزر جاتی۔ سامنے اوپنی دیوار میں ہسپتال کا روشن کلاک تھا۔۔۔ ممتاز، خالد کے متعلق سوچ رہا تھا: کیا وہ نیچ جائے گا۔۔۔ یہ نیچ کیوں پیدا ہوتے ہیں جنہیں مرننا ہوتا ہے۔۔۔ وہ زندگی کیوں پیدا ہوتی ہے جسے اتنی جلدی موت کے منہ میں جانا ہوتا ہے۔۔۔ خالد ضرور۔۔۔

ایک دم اس کے دماغ میں ایک وہم پھوٹا۔ نیچ پر سے اتر کروہ سجدے میں گر گیا۔ حکم تھا اسی طرح پڑے رہو جب تک خالد ٹھیک نہ ہو جائے۔ ممتاز سجدے میں پڑا رہا۔ وہ دعا ملنگا چاہتا تھا مگر حکم تھا کہ مت مانگو۔ ممتاز کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ خالد کے لیے نہیں، اپنے لیے دعا ملنگے لگا: خدا یا مجھے اس اذیت سے نجات دے۔۔۔ تجھے اگر خالد کو مارنا ہے تو ماردے، یہ میرا کیا حشر کر رہا ہے تو۔۔۔

دفعتاً سے آوازیں سنائی دیں۔ اس سے کچھ دور دو آدمی کر سیوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

”بچہ بڑا خوبصورت ہے۔“

”ماں کا حال مجھ سے تو دیکھا نہیں گیا۔“

”بے چاری ہر ڈاکٹر کے پاؤں پڑ رہی تھی۔“

”ہم نے اپنی طرف سے توہر مکن کو شش کی۔“

”بچنا محال ہے۔“

”میں نے یہی کہا تھا میں سے کہ دعا کرو بہن!“

ایک ڈاکٹر نے ممتاز کی طرف دیکھا جو سجدے میں پڑا تھا۔ اس کو زور سے آواز دی، ”اے، کیا کر رہا ہے تو۔۔۔ ادھر آ۔۔۔“

ممتاز اٹھ کر دونوں ڈاکٹروں کے پاس گیا۔ ایک نے اس سے پوچھا، ”کون ہوتا تھا؟“

ممتاز نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر جواب دیا، ”میں ایک مریض۔۔۔“

ڈاکٹر نے سختی سے کہا، ”مریض ہو تو اندر جاؤ۔۔۔ یہاں میدان میں ڈنٹر کیوں پلیتے ہو؟“

ممتاز نے کہا، ”جی، میرا بچہ ہے۔۔۔ ادھر اس وارڈ میں۔“

”وہ تمہارا بچہ ہے جو۔۔۔“

”جی ہاں۔۔۔ شاید آپ اسی کی باتیں کر رہے تھے۔۔۔ وہ میرا بچہ ہے۔۔۔ خالد۔“

”آپ اس کے باپ ہیں؟“

ممتاز نے اپنا غم و اندوہ سے بھرا ہوا سر ہلایا، ”جی ہاں میں اس کا باپ ہوں۔“

ڈاکٹر نے کہا، ”آپ یہاں بیٹھے ہیں۔ جائیے آپ کی والف بہت پریشان ہیں۔“

”جی اچھا“ کہہ کر ممتاز وارڈ کی طرف روانہ ہوا۔ سیر ہیاں طے کر کے جب اوپر پہنچا تو کمرے کے باہر اس کا نوک رو رہا تھا۔ ممتاز کو دیکھ کر اور زیادہ رونے لگا، ”صاحب، خالد میاں فوت ہو گئے۔“

ممتاز اندر کمرے میں گیا۔ اس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی۔ ایک ڈاکٹر اور نرنس اس کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ممتاز پلٹنگ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ خالد آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ اس کے چہرے پر موت کا سکون تھا۔ ممتاز نے اس کے ریشمیں بالوں پر ہاتھ پھیر اور دل چیر دینے والے لبھ میں اس سے پوچھا، ”خالد میاں--- گلوکھائیں گے آپ؟“

خالد کا سر نفی میں نہ ہلا۔ ممتاز نے پھر درخواست بھرے لبھ میں کہا، ”خالد میاں--- میرے وہم لے جائیں گے اپنے ساتھ؟“

ممتاز کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے خالد نے سر ہلا کرہا کی ہے۔

-[103]-

مونج دین: سعادت حسن منشو

رات کی تاریکی میں سنترل جیل کے دووار ڈن بندوق لیے چار قیدیوں کو دریا کی طرف لیے جا رہے تھے جن کے ہاتھ میں کdalیں اور بیٹھ تھے۔ پل پر پہنچ کر انہوں نے گارڈ کے سپاہی سے ڈبیا لے کر لاٹھیں جلائی اور تیز تیز قدم بڑھاتے دریا کی طرف چل دیے۔

کنارے پر پہنچ کر انہوں نے بارہ دری کی بغل میں کdalیں اور بیٹھ پھینکے اور لاٹھیں کی مدھم روشنی میں اس طرح تلاش شروع کی جیسے وہ کسی مدفنون خزانے کی کھوج میں آئے ہیں۔ ایک قیدی نے لاٹھیں تھامے وارڈن کو داروغہ جی کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا، ”داروغہ جی! یہ جگہ مجھے بہت پسند ہے اگر حکم ہو تو کھدائی شروع کر دیں۔“

”دیکھنا، زمین نیچے سے پتھر لیا نہ ہو، ورنہ ساری رات کھدائی میں گزر جائے گی۔ کم بخت کو مرنا بھی رات ہی کو تھا۔“ وارڈن نے تحکمانہ اور بیزاری کے لبھے میں کہا۔ قیدیوں نے کdalیں اور بیٹھ اٹھائے اور کھودنا شروع کیا۔ وارڈن بیزاری کے مودہ میں بیٹھے سکریٹ پی رہے تھے۔ قیدی زمین کھو دنے میں ہمہ تن مصروف تھے۔ رفتہ رفتہ زمین پر کھدی ہوئی مٹی کا ڈھیر لگ گیا اور وارڈن نے قریب آ کر قبر کا معائنہ کیا۔

زمیں چونکہ پتھریلی نہیں تھی، اس لیے وہ بڑے اطمینان کے ساتھ قریب ہی ایک پتھر پر بیٹھا سگریٹ پینے لگا۔ جسے سلاگنے کے لیے اس نے لاٹھیں منگائی۔

کھدائی قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ وارڈن دو قیدیوں کو لیے جیل کی جانب چلا گیا اور بیس منٹ کے وقفے کے بعد کمبل میں لپٹی ہوئی قیدی کی لاش لے کر واپس آیا۔ دوسرا وارڈن جب تک سلیں جمع کر کے لایا تھا۔ ایک قیدی نے جو قتل کے جرم کی پاداش میں سزاکاٹ رہا تھا، کہ ایس اور بیٹھے اٹھائے اور قبر کے سرہانے چند تدمہٹ کر کھٹرا ہو گیا۔ وارڈن نے بہت ہی بڑھ لجھ میں اس کی طرف دیکھ کر کہا، ”او، الو کے پٹھے اپنے ابا کو لحد میں اتنا نے میں ان کی مدد کر۔“ قیدی نے ملتحیانہ لجھ میں کہا، ”داروغہ جی! لاٹھیں پکڑتا ہوں۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ اس معموم اور بے گناہ کو ایک قاتل کے ہاتھ چھو جائیں۔“

وارڈن یہ سن کر گر جا، ”بے گناہ کے بچے۔۔۔ جاسوس کو معصوم کہتا ہے۔“ قاتل نے کہا، ”داروغہ جی! میں قاتل ہوں۔۔۔ یہی احساس مجھے اس قیدی کی لاش چھونے سے روکتا ہے۔“

”جاسوس“ دفنا یا جاچکا تھا۔۔۔ قیدی اور وارڈن جاچکے تھے۔ صبح آٹھ بجے پولیس کی معیت میں ڈپٹی کمشنز قبر پر آیا۔ جیل کے حکام کے بیانات لیے گئے اور ڈپٹی کمشنز صاحب عدالت تشریف لے گئے۔ پیشی کی پہلی مسل جواہی گئی، اس پر سرکار بنام موچ دین لکھا تھا۔ اردوی نے تین مرتبہ کمرہ عدالت سے باہر نکل کر بلند آواز میں تین بار پکارا۔ بلکہ یوں کہیے کہ لکارا ”سرکار بنام موچ دین۔۔۔ موچ دین۔۔۔ موچ دین ہے؟“ لیکن یہ آواز بد قسمتی سے اس جاسوس قیدی کی قبر تک نہ پہنچ سکی۔۔۔ یا اگر پہنچی بھی ہو تو وہ تعییل کے لیے نہ آیا۔ شاید یہ سمجھ کر کہ وہ اب ڈپٹی کمشنز کے قانون کی زد سے بہت دور جاچکا ہے۔ اس جگہ جہاں کوئی اور قانون چلتا ہے۔ جہاں ڈپٹی کمشنز کے سمن کی بھی تعییل نہیں ہو سکتی۔

ملزم چونکہ غیر حاضر تھا، اس لیے ڈپٹی کمشنز صاحب بہادر نے عدم حاضری ملزم کارروائی کی طرفہ کے لیے مسل اٹھائی اور ریڈر سے جرم کی نوعیت دریافت کی، ”جاسوسی“، مشی نے نمبر 1 کی کارروائی لکھتے ہوئے کہا۔

”ملزم رات کو سنٹرل جیل میں فوت ہو چکا ہے۔ مسل داخل دفتر کر دی جائے۔“ ڈپٹی کمشنز نے حکم دیا۔

”جاسوس“ کی سترل جبل میں موت کی خبر شہر بھر میں اس لیے مشہور ہو گئی کہ ضلع کے ڈپٹی کمشٹر اور پولیس کے افسروں نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ آزاد کشمیر حکومت کے نیک سیرت افسروں کی ہر طرف سے دادو تحسین دی جا رہی تھی۔ مجھے جب اس واقعہ کا علم ہوا تو مجھے ایک مہینہ پہلے کی ایک شام یاد آئی جب کہ میں دارالحکومت کے ایک ہوٹل میں بیٹھا ڈاک گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ جس کے ذریعے سے میرے مرمت شدہ جو تے راولپنڈی سے آنے والے تھے۔ گاڑی آنے میں خلاف معمول دیر ہوئی۔ میں قریب قریب اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک گھرے سانو لے رنگ کے آدمی نے جس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی۔ مجھے اپنی طرف متوجہ کیا، ”آپ بُوت ٹیم سے بیٹھا کسی کا انتظار کرتا ہے؟“ اس نے مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔

”بھی عجیب مصیبت ہے۔ جو تا پھٹ جائے مظفر آباد میں تو مرمت کے لیے راولپنڈی بھیجنا پڑتا ہے۔ یا اگر کوئی ڈرائیور مہربان ہو تو اسی کے ہاتھ بچھ دیتے ہیں۔ آج میں اپنے مرمت شدہ جوتوں کے انتظار میں تین گھنٹے سے بیٹھا ہوں اور کم بخت ڈاک گاڑی بھی آج ہی لیٹ ہوئی ہے۔ خیر کل سہی۔“ میں یہ کہہ کر اٹھنے لگا تو اس نے مجھے چند منٹ مزید انتظار کرنے کے لیے کہا۔ میں اس اجنبی صورت کو دیکھتا رہا، جس کی آنکھوں میں اضطراب تھا۔ جس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے بے تاب تھے۔ وہ بیڑی پر بیڑی سپیے جا رہا تھا اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھا بار بار باہر خلایں دیکھتا تھا۔ میں ڈاک گاڑی کے انتظار میں ہر ایک ہارن پر کان دھرتا۔ وقت گزارنے کے لیے میں نے اس سے پوچھا، ”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”ہم بیٹھا ہے“ اس نے انتہائی سادگی سے جواب دیا۔

”نہیں، میرا مطلب ہے یہاں آپ کا کیا کاروبار ہے؟“

”کاروبار کچھ نہیں کرتا، کشمیر دیکھنے کا شوق تھا، چلا آیا۔“

”آپ کہاں سے آئے ہیں؟“

”لاہور سے۔ لیکن میں مشرقی پاکستان کا ہوں، لاہور میں دینیات کی تعلیم پڑھتا ہوں۔“

مجھے گنگو کے دوران میں اس نے بتایا کہ وہ جس ادارے میں زیر تعلیم ہے، خیر اتی ادارہ ہے، جہاں کے ارباب اعلیٰ رسید بک چھاپ کر زیر تعلیم کم عمر پھوں کو چندے کی فراہمی کے لیے دوسرے شہروں میں بھیج دیتے ہیں۔ وہ چونکہ کم عمر بچہ نہ تھا۔ اس لیے اس کو بڑی مشکلوں کے بعد ”سفیر“ بن کر آزاد کشمیر میں چندہ جمع کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس کی باتوں میں سادگی تھی۔ محض کشمیر دیکھنے کے شوق میں اس نے ”سفرات“ حاصل کی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یتیم خانوں کے نام پر ”بھک منگوں“ کا نام اداروں نے سفیر رکھا ہے۔ جمع شدہ چندہ ان کی جیبوں میں جاتا ہے اور ”سفیر“ کا گزارہ چڑھاوے کی دیگوں یا محلے والے کی خیرات پر ہوتا ہے۔ دینیات کی تعلیم مساجد میں دی جاتی ہے۔

مجھے اس کی باتیں سن کر بہت دکھ ہوا۔ واقعی وہ ہمدردی کے قابل تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس شہر میں نیا ہے اور کسی مسجد کا پتا بھی نہیں جانتا جہاں وہ رات بسر کر سکے۔ میں نے مسجد کا پتادیا اور اس کے لیے روٹی منگوائی۔ وہ چونکہ بھوکا تھا، اس نے بلا تکلف بجائے روٹی کے سادہ چاول کے لیے بیرے سے کہا، ”ہم لاہور کی مسجد میں بھی لوگوں کا دیا کھاتے ہیں، اس لیے ادھر بھی ہم نے انکار نہیں کیا۔“ اس نے انتہائی سادگی سے کہا۔

وہ کھانا کھا چکا تھا۔ مجھ سے اجازت لے کر اس نے جیب سے لکھنے کے لیے پسل اور کاغذ نکالا۔ اور اپنے گھر والوں کو بغلہ زبان میں خط لکھنے لگا۔ میں جب تک فرمائشی گانے سنتا رہا۔ خط لکھنے کے بعد اس نے مجھ سے معافی مانگی اور کہا کہ ”میں نے گھر والوں کو لکھا کہ میں آزاد کشمیر آیا ہوں۔ اب یہیں رہوں گا۔ اگر پاکستان نے ہندوستان کے خلاف جہاد شروع کیا تو میں بھی اس میں حصہ لوں گا اور کشمیر کو آزاد کراؤں گا۔“

میں نے جواب میں ہندی مقبوضہ کشمیر کی خوبصورتی کا ذکر کیا۔ کشمیری مسلمانوں پر بھارتی ظلم واستبداد بیان کیا، جس سے وہ اور زیادہ متاثر ہوا، ”پھر ہم لاہور واپس نہیں جائے گا۔ کل ان کو بھی خط لکھے گا۔ جہاد شروع ہونے تک ادھر ہی پان بیڑی کی چھاڑی لگائے گا۔“ اس نے فیصلہ کن لبجھ میں کہا۔

اتی دیر میں ڈاک گاڑی آئی اور میں وہاں سے اٹھ کر لاریوں کے اٹے کی طرف گیا، اور وہ میرے بتائے ہوئے راستے سے مسجد کی طرف گیا۔ اپنے جوتے ڈرائیور سے لے کر جب میں گھر کی طرف جا رہا تھا تو راستے میں سی آئی ڈی کے ہیڈ کا نسٹبل نے مجھے آواز دی جو میر اداقہ کا رہا۔ میں نے رسمی طور پر اس کی خیریت پوچھی۔ وہ مشکلوں نظر وں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

رسی باتوں کے بعد اس نے مجھے اس ”کالے آدمی“ کے متعلق پوچھا کہ وہ کون ہے جو آپ کے ساتھ ہو۔ میں میں بیٹھا تھا۔ میں نے مختصر آکھا۔ بھی بگالی ہے، آزاد کشمیر دیکھنے کا شوق تھا۔ چلا آیا۔ نام موج دین ہے اور آج رات جامع مسجد میں گزارنے کے لیے گیا ہے۔

”لیکن وہ تو ہو ٹل میں بیٹھا کچھ عجیب و غریب زبان میں خط لکھ رہا تھا۔ مجھے اس پر کچھ شے بھی ہوا۔“ ہیڈ کا نشیبل نے رازدارانہ لہجہ میں کہا۔

”وہ عجیب و غریب زبان نہیں۔ اس کی مادری زبان بگلہ ہے۔ ہاں تمہارے لیے اجنبی ہے۔“ اتنے میں میر امکان قریب آیا اور میں خدا حافظ کہہ کر گھر چلا گیا۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ سی آئی ڈی والوں کو دن کی کار گزاری کی رپورٹ دوسرے روز صح سویرے دفتر میں دینی پڑتی ہے اور اگر رپورٹ نہ دی گئی تو جواب طلبی ہوتی ہے۔

ہیڈ کا نشیبل صاحب بھی دن کی کار گزاری میں کچھ نہ کچھ دکھانا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے گھر جا کر حکومت کے ”صدر مقام“ میں ایک غیر ملکی ”جاسوس“ کی آمد کی رپورٹ اس طرح دی کہ دوسرے روز موج دین، پان فروشی کے لیے چونا کھاخریدتا ہوا اگر فقار کیا گیا۔ پان، چونا، کھانا وغیرہ بھی اس کی جاسوسی کی ایک کڑی بن گئی۔ اور سی آئی ڈی والوں نے مزید رپورٹ دے دی کہ ”جاسوس“ چونکہ پان کھانے کا عادی ہے، اس لیے یہ اسٹاک خرید کر ہماری فوجوں کی پکٹوں کی پوزیشن دیکھنے پہاڑی علاقوں میں جا رہا ہے۔

موج دین کا چالان ہوا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر نے الزامات کی ٹیکنیک کے تحت ”جاسوس“ کو پندرہ دن کے ریمانڈ پر پولیس کے حوالے کر دیا۔ جہاں سے وہ اپیشل ٹاف میں منتقل ہوا۔ پندرہ دن کی میعاد گزر جانے پر ڈپٹی کمشنر صاحب نے مزید ایک ہفتے کے ریمانڈ پر اس کو جو ڈیشل (سنٹرل جیل) بھیج دیا۔ وہ ہفتہ بھی گزر گیا اور ”جاسوس“ ہتھکڑیاں پہنے ڈپٹی کمشنر صاحب کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ جہاں وہ زار و قطار رویا، گڑ گڑایا، منت سماجت کی، لیکن ڈپٹی کمشنر صاحب نے مزید ایک ہفتے کا ریمانڈ دے کر سنٹرل جیل بھیج دیا۔

سنٹرل جیل میں اس کی آخری رات تھی جب کہ وہ ایک ستون سے بندھا رہا تھا، وہی قاتل قیدی جس نے اس کو دفاترے وقت چھو نے سے انکار کر دیا، اس کے قریب آیا اور پوچھا، ”جاسوس! تم ہر روز کیوں روتے ہو۔ یہ جگہ باہر والوں کی بہ نسبت بہت اچھی ہے۔ یہاں جھوٹ نہیں، مکر نہیں، بے ایمانی نہیں، روٹی ملتی ہے۔ اس کے مقابلے میں باہر دیکھو، کون لوگ ہیں جنہوں نے تم ایسے بے گناہ کو بھی یہاں بھیجا، جو اقتدار کے لیے ایک کا نہیں، ہزاروں کا خون بھاتے ہیں جو دن دہاڑے ڈاکے ڈالتے ہیں، جو اپنی ذات کے لیے وہ کام بھی کرتے ہیں جو شیطان بھی کرنے سے گریز کرتا ہے۔ مجھے دیکھو، میں نے قتل کیا ہے محض ایک بے بس عورت کے ناموس کے تحفظ کے لیے۔ بہر حال مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ اگر تم باہر جا کر خوش ہو تو خدا تمہیں آزاد کرائے گا۔“

موج دین نے قیدی کی باتیں سنیں اور بالکل خاموش بیٹھا رہا۔

”سنابہ بگالی جادو جانتے ہیں۔ تم بھی جادو کے زور سے باہر جاؤ“ قیدی نے موج دین کو بہلانے کے لیے ازراہ مذاق کہا۔

”ہاں، میں اس قید سے رہائی کا جادو جانتا ہوں۔ میں آج ہی یہاں سے بھاگ جاؤں گا، بہت دور، جہاں سے دنیا کی کوئی طاقت مجھے واپس نہیں لاسکتی۔“ اتنے میں کھانے کی گھنٹی بجی۔ قیدی اپنی تھالی لیے دال روٹی لینے گیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد اچانک جیل کی گھنٹی بجنی شروع ہوئی اور متواتر بجتی رہی۔۔۔ داروغہ جیل کئی وارڈنوں کے ساتھ جیل کے احاطہ میں داخل ہوا اور ”جاسوس“ کے گلے سے رسی کا پھند اکھلا جو اس نے خود کشی کے لیے استعمال کیا تھا۔ ”جاسوس“ بھاگ چکا تھا، اس کو رہائی مل گئی تھی۔ ”بگال کا جادو“ کام آیا تھا۔

موج دین کی لاش کے ارد گرد قیدیوں کا ہجوم تھا۔ داروغہ جیل نے چند ایک قیدیوں کو وہاں ٹھہرنے کا حکم دے دیا اور باقی سارے قیدی بار کوں میں چلے گئے۔ موج دین کے چہرے پر اب بھی مسکرا رہا تھا جس نے اس کو جاسوس بنانے کر مجبوس کیا تھا۔

-[104]-

نطفہ: سعادت حسن منٹو

معلوم نہیں بابو گوپی ناتھ کی شخصیت در حقیقت ایسی ہی تھی جیسی آپ نے افسانے میں پیش کی ہے، یا محض آپ کے دماغ کی پیداوار ہے، پر میں اتنا جانتا ہوں کہ ایسے عجیب و غریب آدمی عام ملتے ہیں۔

میں نے جب آپ کا افسانہ پڑھا تو میر ادمان غوراً ہی اپنے ایک دوست کی طرف منتقل ہو گیا۔۔۔ صادقے کی طرف۔۔۔ آپ کے بابو گوپی ناتھ اور اس میں بظاہر کوئی مماثلت نہیں ہے۔۔۔ لیکن میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ان دونوں کا خمیر ایک ہی مٹی سے اٹھا ہے۔۔۔ آپ کے بابو گوپی ناتھ کو دولت و راثت میں ملی ہے۔ میرے صادقے کو اپنی محنت و مشقت اور ذہانت کے سلے میں۔ دونوں شاہ خرچ تھے۔ آپ کا بابو گوپی ناتھ بظاہر بد ہوتا لیکن دراصل بہت ہوشیار اور باخبر آدمی تھا۔ میر اصادق اندر باہر سے بالکل ایک جیسا تھا۔ وہ بد ہوتا نہ

چالاک۔۔۔ درمیانے درجے کی عقل و فہم کا آدمی تھا۔ اپنے کاموں میں آٹھوں گانٹھ ہوشیار۔ حساب کا پاک، یعنی دین کے معاملے میں بڑا با اصول۔

آپ کے بابو گوپی ناتھ کو لٹ جانے میں مزا آتا ہے، اسے دوسروں کو لوٹنے میں۔ بابو صاحب کو پیروں فقیروں کے تکیوں اور رنڈیوں کے کوٹھوں سے رغبت تھی۔ صادق کوان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔۔۔ مگر ان تمام تقاوتوں کے باوجود میں جب بھی بابو گوپی ناتھ کو صادق کے ساتھ کھڑا کرتا ہوں تو مجھے ان کے خدوخال ایک جیسے نظر آتے ہیں، جیسے وہ جڑواں ہیں۔

میں تجزیہ نہیں کرنا چاہتا۔۔۔ ہو سکتا ہے آپ، جب صادق کا حال مجھ سے سینیں تو اس کو انسانوں کی کسی اور ہی صفت میں کھڑا کر دیں۔ جس میں بابو گوپی ناتھ کی موچھ کا ایک بال بھی نہ آسکا ہو، لیکن میں سمجھوں گا کہ آپ کے تجزیے میں غلطی ہوئی ہے اور میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اسے اس صفت سے نکال کر اس صفت میں شامل کر دیجیے جس میں آپ کا بابو گوپی ناتھ موجود ہے۔

میں افسانہ نگار نہیں۔۔۔ معلوم نہیں بابو گوپی ناتھ کے حالات آپ نے من و عن بیان کیے ہیں یا ان میں کچھ رد و بدل کیا ہے۔۔۔ بہر حال جو کچھ بھی ہے بہت خوب ہے۔ اور جو کچھ اس افسانے میں ہے اگر اس کے مطابق بابو گوپی ناتھ نہیں چلا تو لعنت ہے اس پر۔۔۔ اور اگر وہ ایسا ہی تھا جیسا کہ افسانے میں ہے تو اس پر خدا کی رحمت ہو۔۔۔ یقین مانیے ایسے لوگ پرستش کے قابل ہوتے ہیں۔۔۔ اور صادق کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔

اس سے میری ملاقات دلی میں ہوئی۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ ٹھیکیداریاں بڑے زوروں پر تھیں۔ صادقے کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں اور سر محاورے کے مطابق کڑا ہے میں۔ میل ملاپ اور اثر سونخ کافی تھا اور شاہ خرچ تھا ہی۔ دس بیس پر تکلف دعویٰ تین کرتا اور ایک کنٹریکٹ اپنی جیب میں ڈال لیتا۔

ایک بات ہے۔۔۔ بے شک اس نے بہت کمایا۔۔۔ دونوں ہاتھوں سے گورنمنٹ کمال لوٹا۔ لیکن اس میں اس نے ان لوگوں کو برابر کا حصہ دیا جن کے ذریعے سے اس کو اس لوٹ کے موقع بھم پہنچتے تھے۔۔۔ اسی دوران میں اس کا گزر ان وادیوں میں ہوا جن کا بابو گوپی ناتھ ایک بہت بڑا زار تھا۔ لیکن وہ ان میں بھکنا نہیں۔ دوسروں کے ساتھ محض رواداری کی خاطر جاتا رہا اور واپس گھر آ کر اپنے جو توں کی گرد جھلاؤ کر بیٹھ جاتا رہا۔ اس نے بوتل سے بھی تعارف حاصل کیا مگر معاشرے کی نوبت نہ آنے دی۔ ایک دو گھنٹے پی، صرف دوسروں کا ساتھ دینے کے لیے۔

ان کو ٹھوں پر جہاں آپ کے بابو گپی ناتھ کے قول کے مطابق دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے۔۔۔ صادق نے خود کو دھوکا دینے کی کبھی کوشش نہ کی۔ ایک دوبار اسے اپنے ساتھیوں کی خوشی کے لیے رنڈیوں کا منہ چومنا پڑا تھا اور چند وابیتیں حرکتیں بھی کرنا پڑی تھیں، مگر اس نے ان سے کوئی لطف حاصل نہیں کیا تھا۔

وہ رنڈی کے متعلق کبھی سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔۔۔ لیکن اگر ملٹری کے نوجوانوں کے لیے رنڈیاں فراہم کرنے کا ٹھیکہ اسے مل جاتا تو وہ یقیناً ان کے متعلق بڑے غورو فکر سے سوچنا شروع کر دیتا۔۔۔ وہ کاروباری آدمی تھا۔ لیکن ایک دم حالات نے کچھ ایسا پٹا کھایا کہ صادق وہ صادق ہی نہ رہا۔ جنگ ختم ہوئی تو ٹھیکے بھی ختم ہو گئے۔ پھر مقدموں کا کچھ ایسا تابندھا کہ صادق کچھریوں کے چکر میں کھنس گیا۔ جو دولت پیدا کی تھی، سب مقدموں کی نذر ہو گئی موڑ کے بجائے اب صادق ٹالگے پر ہوتا تھا یا سائیکل پر۔ پہلے نئے سانیا سوٹ اس کے بدن پر ہوتا تھا، اب اسے کپڑوں سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہتی تھی۔ پہلے اس کے خوشامدی دوست اسے نواب صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ اب وہ صرف ”صادق“۔۔۔ اور ”صادقا“ رہ گیا تھا۔ مگر ان کی اس تبدیلی تھا۔ صادق نے قطعاً محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کو اپنے مقدموں کی اتنی فکر تھی کہ وہ ایسی فروعات کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔

کچھریوں کے اس چکر میں اس نے اپنی مرضی سے بوقت کی طرف ہاتھ بڑھایا اور تھوڑے ہی عرصے میں بڑے دھڑلے کا شرابی بن گیا۔۔۔ اسی دوران میں اس کی ملاقات سرحد کے ایک خان سے ہوئی جس کو وہاں کی حکومت نے صوبہ بدر کر رکھا تھا۔ یہ ملاقات رنڈی کے ایک کوٹھ پر ہوئی۔ زندگی میں صادق پہلی مرتبہ کسی انسان کے خلوص سے متاثر ہوا۔

یہ خان اپنے علاقے کا بہت بڑا رکن تھا۔ بالکل ان پڑھ مگر جاہل نہیں تھا۔ اس کا دل و دماغ قوم کی فلاں و بہبود کے لیے پوری طرح روشن تھا۔ وہ ایک بہت بڑا انقلاب چاہتا تھا جو ظلم و ستم کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ سرمائے کی لعنت سے دنیا آزاد ہو جائے۔۔۔ دنیا آزاد نہ ہو تو کم از کم اس کا صوبہ آزاد ہو جائے۔۔۔ ان خیالات کی پاداش میں وہ اپنے وطن سے باہر نکال دیا گیا۔

میں آپ کی طرح افسانہ نگار نہیں ہوں۔ مجھ سے حاشیہ آرائی نہیں ہوتی۔۔۔ خان کا کیریکٹر بھی کم دلچسپ نہیں۔ کسی زمانے میں وہ بڑا پر جوش سرخ پوش تھا۔ اس تحریک سے والستہ ہو کر اس نے کئی مرتبہ جمل دیکھی۔ اپنی جانیداد میں سے ہزاروں روپے خرچ کیے۔۔۔ جب بٹوارہ ہوا تو وہ مسلم لیگی بن گیا۔ قائد اعظم محمد علی جناح سے اس کو والہانہ عشق ہو گیا۔ مسلم لیگ کی تنظیم کے لیے اس نے قابل قدر خدمات سرانجام دیں، لیکن پھر کچھ ایسے حالات ہوئے کہ وہ جو تعلیم یافتہ تھے، اس سے آگے بڑھ گئے اور بڑے بڑے منصبوں پر جا بیٹھے۔۔۔

خان جھنجلائی۔ اس جھنجلائی میں اس نے اپنے غرض و غصب کا بڑا خام مظاہرہ کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو کان سے کپڑا کر باہر نکال دیا گیا۔

جس زمانے میں صادق کی ان سے ملاقات ہوئی، آپ کی حالت بالکل بچوں کی سی تھی۔ ان بچوں کی سی جن کو معمولی سی شرارت پر سخت گیر ماstry نے بخ پر کھڑا کر دیا ہو یا مرغابنا کر کلاس کے ایک کونے میں کان کپڑے کا حکم دے دیا ہو۔۔۔ صادق جب بھی مجھ سے ان کی بات کرتا تو کہتا، ”ڈاپیا آدمی ہے۔۔۔“

کچھ میں بھی اس خان کے متعلق جانتا ہوں۔ یہ واقعہ ہے کہ صرف ”بیبا“ ہی ایک ایسا لفظ ہے جو اس کی شخصیت کو پورے طور پر اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔۔۔ وطن سے دور تھا، سیکڑوں میل دور۔۔۔ مگر وطن کی یاد اسے کبھی نہیں ستاتی تھی۔۔۔ اپنے گاؤں میں ایک چھوڑ دو بیویاں تھیں، مگر ان کے متعلق اس نے کبھی تردود کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس لیے کہ اس کو اس طرف سے کامل یقین تھا کہ زمینداری سے جو کچھ وصول ہوتا ہے، ان کے اخراجات کے لیے کافی سے زیادہ ہے۔ سات آٹھ سور و پیہ ماہو اس کا فیجر وہاں سے روانہ کر دیتا تھا جو اس کی واکھاں موڑ کے پڑوں اور اس کی شراب پر اٹھ جاتا تھا۔

گھر اس کا ہیر امنڈی کے ایک کوٹھے پر تھا۔ صوبہ بدرا ہونے کے بعد اس نے کچھ دیر اس منڈی کے مختلف کوٹھوں پر جھک ماری۔ آخر کار ایک کوٹھا منتخب کر کے وہاں مستقل طور پر اپنے ڈیرے جمادیے۔ ڈیرہ دو مہینے کے بعد خان صاحب کو محسوس ہوا کہ آپ کو اس کوٹھے کی رنڈی سے عشق ہو گیا ہے۔ آپ نے صادق کو اس راز سے بڑے میے پن کے ساتھ آگاہ کیا، ”صادق۔۔۔ وہ رنڈی جس کے کوٹھے پر تم سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، ہمارے دل کے اندر گھس گئی ہے۔۔۔ اس کو بدرا کرنے کی کوئی ترکیب تمہارے دماغ کے اندر آتی ہو تو ہم کو بتاؤ۔“

صادق نے اس کو بہت سی ترکیبیں بتائیں۔ جن پر خان صاحب نے عمل بھی کیا مگر وہ اپنے دل کے اندر سے اس رنڈی کو ”شہر بدرا“ نہ کر سکے۔ آخر کار انھوں نے ایک بار پھر اسی میے پن کے ساتھ صادق سے کہا، ”صادق۔۔۔ وہ رنڈی ہم پر سوار ہو گئی ہے۔۔۔ ہم اس کو اپنی بیوی بنالے گا۔۔۔“

صادق نے ان کو بہت سمجھایا بجھایا مگر خان صاحب عشق کے ہاتھوں مجبور تھے۔ رنڈی کو بھی وہ پسند آگئے تھے۔ چنانچہ ایک دن وہ میاں بیوی بن گئے۔ رنڈی کے گھر والوں کو یہ رشتہ بالکل پسند نہ آیا۔ بڑی گڑ بڑی ہوئی۔ آخر سمجھوتہ ہو گیا۔۔۔ رنڈی وہیں کوٹھے پر رہی اور خان صاحب اس کے شوہر کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہنے لگے۔

صادق نے مجھ سے کہا، ”خان عجیب و غریب آدمی ہے۔۔۔ اتنے اوپر گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اخباری اور سیاسی دنیا میں نام رکھتا ہے، لیکن اسے کبھی اتنا خیال نہیں آتا کہ وہ ایک بدنام محلے میں رہتا ہے۔ ایک رنڈی جس کے ہزاروں گاہک تھے، اس کی بیوی ہے۔۔۔ مجھے بعض اوقات حیرت ہوتی ہے کہ پھنان ہو کر اس کی غیرت کہاں سورہ ہی ہے۔۔۔ سرحد میں دو بیویاں بڑی ہیں۔ اولاد موجود ہے مگر وہ کس اطمینان سے ہیر امنڈی کے کوٹھے میں ایک چھوڑی ہوئی ہڈی چوتار رکھتا ہے۔۔۔ اس سے اس بارے میں کچھ کہتا ہوں تو اس کے بے ریا چہرے پر نبی سی مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے اور وہ مجھ سے کہتا ہے۔۔۔ صادق۔۔۔ وہ لوگ ادھر راضی خوشی ہے۔۔۔ ہمیں کوئی تردود نہیں۔۔۔ اور یہ رنڈی بہت اچھا ہے۔۔۔ ہم سے محبت کرتا ہے۔۔۔ جو عورت ادھر ہوتا ہے، محبت کرنا نہیں جانتا۔۔۔ ناز خزہ نہیں جانتا۔۔۔ اور مجھے یقین آ جاتا ہے۔۔۔ مجھے اس کی ہربات کا یقین آ جاتا ہے۔“

اور یہ واقعہ ہے کہ صادق جس کو پہلے کسی بات کا یقین نہیں آتا تھا، اب اس خان کے کہنے پر چلتا تھا۔۔۔ جب وہ مقدموں سے فارغ ہوا تو اس کے کہنے پر اس نے ملٹری کی چھوڑی ہوئی بار کیں ڈھانے اور ان کا ملبہ اٹھانے کا ٹھیکہ لے لیا۔ اس کام سے اسے نفرت تھی، مگر خان صاحب کے مشورے کو وہ کیسے ٹال سکتا تھا، چنانچہ ایک برس تک وہ کہاروں اور ان کے گدھوں اور ملبے کے دھول غبار میں پھنسا رہا۔ لیکن اس میں اس نے کافی کمایا۔ خوشامدی دوست یار، پھر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ میر انجیال تھا کہ وہ انھیں منہ نہیں لگائے گا، لیکن اس نے ان کو دھنکارنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ پہلے صرف دستر خوان پر ان کی شمولیت ہوتی تھی۔ اب بوتل میں بھی وہ اس کے شریک ہونے لگے۔

خان نے اس کو بتایا تھا کہ شراب بہت اچھی چیز ہے خصوصاً اس آدمی کے لیے جو صوبہ بدر کر دیا گیا ہو۔ بوتل سے منہ لگاتے ہی ایک نیا صوبہ اس کے دل و دماغ میں آباد ہو جاتا ہے۔ جس میں وہ ایک کونے سے دوسرے کونے تک جہاں چاہے اسٹول پر کھڑا ہو کے با غایبانہ سے با غایبانہ تقریر کر سکتا ہے۔ سرمائے کی تمام لعنتوں سے اس کو پاک کر سکتا ہے۔۔۔ اور پھر رنڈی کا کوٹھا۔۔۔ اس سے بہترین گھر تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ بیوی گھر یلو اور سگی قسم کی ہو تو آدمی اسے گالی نہیں دے سکتا۔ اگر رنڈی ہو تو گندی سے گندی گالی بھی اسے دی جا سکتی ہے۔۔۔ اس کی ماں کے سامنے۔۔۔ اس کی پھوپھی کے سامنے۔۔۔ اس کی چچی کے سامنے۔۔۔ اور اگر اس کا کوئی باپ موجود ہو تو اس کے بھی سامنے۔۔۔ پھر وہ اسے اپنے مخصوص خام اور یہی انداز میں روزمرہ زندگی میں گالی کی اہمیت بیان کرنے لگتا اور اسے بتاتا کہ یہ بہت ضروری چیز ہے۔۔۔ اگر آدمی اسے وقار و فوت اپنے اندر سے باہر نہ نکالے تو تعفن پیدا ہو جاتا ہے جو بالآخر دل و دماغ پر براثر کرتا ہے۔۔۔ رنڈی کا کوٹھا۔۔۔ اور گھر یلو گھر۔۔۔ زمین و آسمان کا فرق ہے۔۔۔ وہاں سو بکھیرے ہوتے ہیں۔ اتنا ساز و سامان اور اتنے رشتے ہوتے ہیں کہ آدمی ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے تو پوری زندگی اسی کو شش میں بسر ہو جائے مگر یہاں رنڈی کے کوٹھے پر ایسی کوئی مشکل نہیں۔۔۔ اپنا ہولڈ اور ٹرنک اٹھاؤ، اچکن کا ندھے پر ڈالا اور کسی ہوٹل میں جا کر بڑے اطمینان سے طلاق کا گذلکھ کروانہ کر دو۔

ایک بات اور بھی ہے۔۔۔ رندی کو سمجھنے میں اگر وقت محسوس ہو تو اس کو استعمال کرنے والے ایسے کئی آدمی موجود ہوں گے جن کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔۔۔ پھر گناہ جانا مفت۔۔۔ عیاشی کی عیاشی، شادی کی شادی۔۔۔ جی اتنا یا تو چھوڑ کے چلتے بنے۔۔۔ کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ کوئی بر انہیں کہے گا۔۔۔ بلکہ وہ جو شریف ہیں مر جا کہیں گے کہ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آیا۔۔۔ رندی کو لعنتی کہیں گے جو چٹ کئی تھی اور خداوند کریم کا شکر بجا لائیں گے کہ اس نے اس سے نجات دلائی۔۔۔ اور رندی کی زندگی میں بھی کوئی زلزلہ نہیں آتا۔۔۔ اس کے لگے بندھے گاہک موجود ہوتے ہیں۔۔۔ تمہاری ٹھیکے داری ختم ہوتی ہے تو وہ اطمینان کا سانس لیتے ہیں کہ چلو ہمارا راستہ کھلا۔۔۔

صادق کو خان رندی سے شادی کے فوائد اکثر بتاتا رہتا تھا۔۔۔ بوتل سے بڑے خلوص کے ساتھ منہ لگا کر اب اس نے رندیوں کے کوٹھوں پر بھی آنا جانا شروع کر دیا تھا۔۔۔ مگر اس نے ان میں وہ بات ابھی تک نہیں دیکھی تھی کہ جن کے متعلق وہ اکثر اپنے پٹھان دوست سے سن کرتا تھا۔

خان کو صادق کے دل کا حال اچھی طرح معلوم تھا۔ اس کو پتا چل گیا تھا کہ وہ ہیر امنڈی سے اکتا گیا ہے۔ کار و بار اچھا ہے۔ آمدن کی معقول صورت پیدا ہو گئی ہے، اس لیے وہ اب اپنا گھر بنانا چاہتا ہے جس میں اس کی ایک عدد بیوی ہو۔ دس عدد بچے ہوں۔۔۔ گلوٹ ہوں، پوتڑے ہوں، چولہا ہو، چمٹا ہو، تو اہو۔۔۔ وہ پھل خریدے تو سیدھا گھر پہنچے۔ شراب کی بوتلوں کے بجائے، دودھ کی بوتلیں خریدے۔ میراثیوں اور بھڑروں کے بجائے شریف شریف لوگوں سے ملے۔ شروع شروع میں تو خان اپنے مخصوص انداز میں اسے ایسے واہیات اقدام سے روکنے کی نرم و نازک کوشش کرتا رہا۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ اس نے اپنے محلے میں کسی سے کوئی مناسب و موزوں رشتہ ڈھونڈنے کے لیے کہا ہے تو اس کو بہت کوفت ہوئی۔

”صادق۔۔۔ یہ تم کیا حمایت کرنے والا ہے۔۔۔ شادی وادی ہرگز مت کرنا۔۔۔ یہ دنیا ایسی ہے جہاں کسی وقت بھی تم کو صوبہ بدریا شہر بدر کر دیا جاسکتا ہے۔۔۔ میں اتنے برس کا نگر لیں میں رہا ہوں۔۔۔ سرخ پوش تحریک چلانے میں اتنا کام میں نے کیا ہے کہ تم کو اس کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔۔۔ میں نے اپنی پولیٹیکل لائف میں صرف یہ سیکھا ہے کہ زندگی میں تم جس کو بھی شریک بناؤ، اپنی کیس کی طرح ہونی چاہیے جس کو تم ہاتھ میں اٹھا کر چلتے ہو۔۔۔ یا اسے وہیں چھوڑ دو۔۔۔ وہ زیادہ قیمتی نہیں ہونی چاہیے۔۔۔ قیمتی چیزوں کو چھوڑ دینے کا بڑا غم رہتا ہے۔۔۔ سورادر، تم شادی نہ کرو۔۔۔ باز آؤ اس خیال سے۔۔۔ وہ رندی جس کے پاس تم جاتے ہو، کلیبری ہے۔۔۔ اس سے عشق کرنا شروع کر دو۔۔۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔۔۔ تھوڑی سی پریکٹس کر لو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

صادق نے گھریلو قسم کی عورت سے شادی کے حق میں اپنے دلائل پیش کیے مگر خان کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ چلی۔

”صادق، تم الو ہے۔۔۔ خدا کی قسم الو ہے۔۔۔ تم ہماری بات نہیں مانتا، جس کے پاس دو بیویاں ہیں اپنے قبیلے کی۔۔۔ تم ہماری بات مانو۔۔۔ ہم تمہارا دوست ہے۔ پڑھان ہے۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ ہم جھوٹ نہیں بولتا۔۔۔ یہ دنیا جس میں ہم جیسے خلص آدمی کو صوبہ بدر کرنے والے حاکم موجود ہیں، اس میں رندی کے کوئی ہی کو اپنا گھر بنانا چاہیے۔۔۔ ہم کو تو یہاں بہت آرام ہے۔۔۔ تم بھی ہیر امنڈی میں اپنا گھر بنالا اور آرام کرو۔“

صادق عجیب مخچے میں گرفتار تھا۔ مجھ سے مل کر وہ گھنٹوں باقیں کرتا رہتا۔ وہ ہیر امنڈی کے سخت خلاف تھا مگر تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ اس کا قائل ہوتا جا رہا ہے، کیونکہ اب وہ خان کی کہی ہوئی باقیں یوں سناتا تھا جیسے اس کے دل کو گچھلی ہیں۔ چنانچہ ایک روز اس نے مجھ سے کہا:

”میں نے ساری عمر ٹھیکے داری کی ہے۔۔۔ اور ٹھیکے داری سے بڑھ کے بے ایمانی کا اور کوئی کاروبار نہیں ہو سکتا۔ اس کا اول کھوٹ، اس کا آخر کھوٹ۔۔۔ یہ ایسا بازار ہے جس میں کوئی کھر اسکے نہیں چل سکتا۔۔۔ سناء ہے ولایت میں ایسی مشینیں بنی ہیں جن میں اگر کھوٹے سکے ڈالے جائیں تو وہ باہر نکال دیتی ہیں۔۔۔ لیکن ٹھیکے داری ایسی مشین ہے جس میں اگر کھرے سکے ڈالے جائیں تو قبول نہیں کرے گی۔۔۔ فوراً باہر نکال دے گی۔۔۔ مجھے ساری عمر یہی کاروبار کرنا ہے کہ مجھے صرف یہاں آتا ہے۔۔۔ تو کیوں نہ میں ہیر امنڈی میں ہی اپنا گھر بناؤ۔۔۔ وہاں کھرے سکے چلتے ہیں لیکن ان کے عوض جو مال ملتا ہے اس میں صرف کھوٹ ہی کھوٹ ہوتا ہے۔۔۔ میں سمجھتا ہوں، میری روحانی تسلیم کے لیے وہاں کی فضا چھپی رہے گی۔“

پھر ایک روز اس نے مجھے بتایا، ”خان بہت خوش ہے۔۔۔ اس کی دونوں بیویاں وہاں سرحد میں اس کے گھر میں خوش ہیں۔ اس کی اولاد بھی خوش ہے۔۔۔ ان کی خیر نیزیت اس کو اپنے مخبر کے ذریعے سے معلوم ہوتی رہتی ہے۔۔۔ یہاں ہیر امنڈی میں اس کی رندی بھی خوش ہے۔۔۔ اس کی ماں بھی خوش ہے۔۔۔ اس کی پھوپھی بھی خوش ہے۔۔۔ اس کے میراثی بھی خوش ہیں۔۔۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ خان خوش ہے۔ کبھی کبھی ان حاکموں کے خلاف ایک بیان اخباروں میں شائع کر دیتا ہے جس نے اس کو صوبہ بدر کیا تھا اور اپنی رندی کو سناد دیتا ہے، وہ بھی خوش ہو جاتی ہے۔۔۔ اس رات گانے بجائے کی محفل گرم ہوتی ہے اور خان مند پر گاؤں تکیے کا سہارا لے کر یوں بیٹھتا ہے جس طرح ایک تماش ہیں۔۔۔ استاد صاحب اور میراثیوں سے اس طرح باقی کرتا ہے جیسے اس نے نئی نئی تماش بنی شروع کی

ہے۔۔۔ اس کی رنڈی مجر اکرتی ہے اور وہ جیب میں ہاتھ ڈال کر اس کو دس روپے کا نوٹ دیتا ہے، پھر پانچ کا، پھر دو کا، پھر ایک روپے والا۔۔۔ اس کے بعد وہ محفل برخواست کر دیتا ہے اور اس رنڈی کے ساتھ سو جاتا ہے اور اس منکوہ عورت کے ساتھ ایسی رات بسر کرتا ہے جو گناہ آلود ہو۔۔۔ میں تو سمجھتا ہوں، یہ بڑے مزے کی چیز ہے۔۔۔

لیکن جب اس رنڈی سے شادی کا سوال پیدا ہوا، یعنی خان صاحب نے سب معاملہ تیار کر دیا اور صرف ایجاد و قبول کی رسم باقی رہ گئی تو صادق پیچھے ہٹ گیا۔ خان آگ بگولا ہو گیا۔ میرے سامنے اس نے صادق کو بہت لعن طعن کی۔

”تمہاری سمجھ پر پتھر پڑ گئے ہیں صادق۔۔۔ تم الو کے پٹھے ہو۔ شریف عورت سے شادی کر کے خدا کی قسم تم پچھتاو گئے۔۔۔ یہ دنیا ایسی نہیں ہے پروردگار کی قسم، جس میں شرافت سے شادی کی جائے۔۔۔ اس میں رنڈی اچھی رہتی ہے۔۔۔ تم شریف مت بنو۔ یاد رکھو اگر تم شریف بن گئے تو صوبہ بدر کر دیے جاؤ گے۔۔۔ تم ہیر امنڈی میں رہو۔ یہاں صرف ایک صوبہ ہے جس میں سے تم بدر نہیں کیے جاسکتے اس لیے کہ اس کے ساتھ کوئی حاکم اپنار شنة قائم نہیں کرے گا۔۔۔ تم گدھے ہو۔۔۔ اپنا گھر بیہیں بناؤ۔۔۔ اس سے بہتر جگہ تمہیں اور کوئی نہیں مل سکتی۔“

صادق نے اپنے محلے میں ایک چکر بات پکی کر لی تھی۔ جب خان نے اس کو سمجھایا جھایا تو اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا لیکن وہ رنڈی سے شادی کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا، ”میں نے اب شادی کا خیال ہی چھوڑ دیا ہے۔۔۔ میں خان کا کہنا ضرور مان لیتا مگر میر ادل نہیں مانتا۔۔۔ میں اب عیش کروں گا۔۔۔ ایک رنڈی کے پاس نہیں کئی رنڈیوں کے پاس جایا کروں گا۔“

اور اس نے متعدد رنڈیوں کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ اسے اب کئی ٹھیکے مل گئے تھے۔۔۔ اس کے پاس دولت کی فراوانی تھی۔ ہیر امنڈی سے جب وہ موڑ میں گزرتا تو چاروں طرف کو ٹھوں پر نگین مسکرا ہٹیں تیتریوں کی طرح اڑنے لگتیں۔۔۔ اب وہ پھر نواب صاحب تھا۔۔۔ ہیر امنڈی کا نواب صاحب۔

پورے تین برس تک وہ کھل کھیلتا رہا، میراں خیال ہے، یہ غالباً خان کی اس کوشش کا رد عمل تھا جو اس نے صادق کو اپنے قالب میں ڈھالنے کے لیے کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے تجربات کا نچوڑ اس کے حلق میں ڈال کر اس کو اپنے جیسا بنالے، مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صادق ادھر کا رہا نہ ادھر کا۔ وہ پورا او باش بن گیا۔۔۔ جس راستے سے اس کو نفرت تھی، وہ اسی کا انتحک مسافر بن گیا۔

میں نے اس کو بارہا سمجھایا کہ دیکھو صادق باز آکے اپنی جوانی، اپنی صحت اور اپنی دولت یوں بر بادنہ کرو لیکن وہ نہ مانتا۔ میری باتیں سنتا اور مسکرا دیتا، ”میری دنیا، کھوٹ کی دنیا ہے۔ اس میں ایک بٹا سو حصہ سیمنٹ ہوتا ہے۔ باقی سب ریت۔۔۔ اور وہ بھی جس میں آدمی مٹی ہوتی ہے۔۔۔ میری ٹھیکہ داری میں جو عمارت بنتی ہے اس کی عمر اگر کاغذ پر پچاس سال ہے تو زمین پر دس سال ہوتی ہے۔۔۔ میں اپنے لیے پختہ گھر کیسے تعمیر کر سکتا ہوں۔۔۔ رنڈیاں ٹھیک ہیں۔۔۔ میں نے سوسائٹی کے اس بلے کا بھی ٹھیکہ لے رکھا ہے۔۔۔ ہر روز ایک نہ ایک بوری ڈھونڈ کر ٹھکانے لگا دیتا ہوں۔“

وہ بوریاں ڈھونڈھو کر اپنی دانست میں ٹھکانے لگاتا رہا۔۔۔ میں نے اس سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ وہ بہت بدنام ہو چکا تھا۔۔۔ اس کو معلوم تھا کہ میں اس سے ناراض ہوں لیکن اس نے مجھے منانے کی کوشش نہ کی۔

ڈیڑھ برس کے بعد ایک دن اچانک وہ میرے پاس آیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بہت ضروری بات کہنا چاہتا ہے مگر نہیں کہہ سکتا۔ میں نے اس سے پوچھا، ”کچھ کہنے آئے ہو۔“

اس نے جواب دیا، ”ہاں۔۔۔ میں شادی کر رہا ہوں۔“

”کس سے؟“

”ایک رنڈی سے۔“

مجھے بہت غصہ آیا، ”بکو نہیں۔“

اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا، ”میں مجبور ہو گیا ہوں۔“

”میں چڑھیا، ”مجبوری کیسی؟“

صادق نے سر جھکا کر کہا، ”اس کے نطفہ ٹھہر گیا ہے۔“

یہ سن کر میں خاموش ہو گیا۔ اس سے کیا کہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ صادق نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور کہنا شروع کیا، ”میں مجبور ہو گیا ہوں۔۔۔ شادی کے سواب اور کوئی چارہ نہیں۔“

صادق نے اس رنڈی سے شادی کر لی۔۔۔ مگر اس کے کوٹھے کو اس نے اپنا گھرنہ بنایا۔۔۔ ان لوگوں نے، یہ رنڈی جن کی روزی کا ٹھیکرہ تھی، بہت دنگا فساد کیا۔ مگر اس نے کوئی پروانہ کی۔ ہزاروں روپے پانی کی طرح بہادیے اور آخر کامیاب ہو گیا۔۔۔ اس رنڈی کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کی پیدائش کے چھ مہینے بعد صادق کے دل میں جانے کیا آئی کہ اس نے رنڈی کو طلاق دے دی اور اس سے کہا، ”تمہارا اصل مقام یہ گھر نہیں۔۔۔ ہیر امنڈی ہے۔۔۔ جاؤ اس لڑکی کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔۔۔ اس کو شریف بنانا کر میں تم لوگوں کے کاروبار کے ساتھ ظلم کرنا نہیں چاہتا۔۔۔ میں خود کاروباری آدمی ہوں۔۔۔ یہ نکتے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔۔۔ جاؤ، خدامیرے اس نطفے کے بھاگ اچھے کرے۔۔۔ لیکن دیکھو اسے نصیحت دیتی رہنا کہ کسی سے شادی کی غلطی کبھی نہ کرے۔۔۔ یہ غلط چیز ہے۔“

معلوم نہیں، جو کچھ میں نے بیان کیا ہے، صادق کے متعلق زیادہ ہے یا خان کے متعلق۔۔۔ بہر حال مجھے یہ دونوں اسی صفت کے آدمی معلوم ہوتے ہیں جس میں آپ کا باپو گوپی ناتھ موجود ہے۔۔۔ اور اس دنیا میں جہاں صوبہ بدر اور شہر بدر کیا جا سکتا ہو، ایسے آدمی ضرور موجود ہونے چاہئیں جن کو سوسائٹی اپنے اور اپنے بنائے ہوئے تو انہیں کے منہ پر طمانچے کے طور پر کبھی کبھی مار سکے۔

-[105]-

صاحب کرامات: سعادت حسن منتو

چودھری موجو بوڑھے بر گد کی گھنی چھاؤں کے نیچے کھڑی چارپائی پر بڑے اطمینان سے بیٹھا اپنا چھوڑاپی رہا تھا۔ دھوکیں کے ہلکے ہلکے بقے اس کے منہ سے نکلتے تھے اور دوپہر کی ٹھیکھری ہوئی ہوا میں ہولے ہولے گم ہو جاتے تھے۔

وہ صح سے اپنے چھوٹے سے کھیت میں ہل چلاتا رہا تھا اور اب تھک گیا تھا۔ دھوپ اس قدر تیز تھی کہ چیل بھی اپنا انڈا اچھوڑ دے مگر اب وہ اطمینان سے بیٹھا اپنے چھوڑے کا مزہ لے رہا تھا جو چٹکیوں میں اس کی تھکن دور کر دیتا تھا۔ اس کا پسینہ خشک ہو گیا تھا۔ اس لیے ٹھیکھری ہوا اسے کوئی ٹھنڈک نہیں پہنچا رہی تھی مگر چھوڑے کا ٹھنڈا ٹھنڈا الذیذ دھواں اس کے دل و دماغ میں ناقابل بیان سرور کی لہریں پیدا کر رہا تھا۔

اب وقت ہو چکا تھا کہ گھر سے اس کی اکلوتی لڑکی جیناں روٹی لسی لے کر آجائے۔ وہ ٹھیک وقت پر پہنچ جاتی تھی۔ حالانکہ گھر میں اس کا ہاتھ بٹانے والا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کی ماں تھی جس کو دوسال ہوئے موجودے ایک طویل جھگڑے کے بعد انہی غصے میں طلاق دے دی تھی۔ اس کی جوان اکلوتی بیٹی جیناں بڑی فرمائی بردار لڑکی تھی۔ وہ اپنے باپ کا بہت خیال رکھتی تھی۔ گھر کا کاج جو اتنا زیادہ نہیں تھا، برٹی مستعدی سے کرتی تھی کہ جو خالی وقت ملے اس میں چرخہ چلائے اور پو نیاں کاتے۔ یا اپنی سہیلیوں کے ساتھ جو گنتی کی تھیں اور ہر ادھر کی خوشگپیوں میں گزار دے۔

چودھری موجود کی زمین واجبی تھی مگر اس کے گزارے کے لیے کافی تھی۔ گاؤں بہت چھوٹا تھا۔ ایک دور افتادہ جگہ پر جہاں سے ریل کا گزر نہیں تھا، ایک کچی سڑک تھی جو اسے دور ایک بڑے گاؤں کے ساتھ ملاتی تھی۔ چودھری موجود ہر میئے دو مرتبہ اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر اس گاؤں میں جاتا تھا۔ جس میں دو تین دکانیں تھیں اور ضرورت کی چیزیں لے آتا تھا۔

پہلے وہ بہت خوش تھا۔ اس کو کوئی غم نہیں تھا۔ دو تین برس اس کو اس خیال نے البتہ ضرورستا یا تھا کہ اس کے کوئی نرینہ اولاد نہیں ہوتی، مگر پھر وہ یہ سوچ کر شاکر ہو گیا کہ جو اللہ کو منظو ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔۔۔ مگر اب جس دن سے اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر میکے رخصت کر دیا تھا۔ اس کی زندگی سوکھا ہوا نیچے سی بن کے رہ گئی تھی۔ ساری طراوت جیسے اس کی بیوی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

چودھری موجود ہبی آدمی تھا۔ حالانکہ اسے اپنے مذہب کے متعلق صرف دو تین چیزوں ہی کا پتہ تھا کہ خدا ایک ہے جس کی پرستش لازمی ہے۔ محمدؐ اس کے رسول ہیں، جن کے احکام ماننا فرض ہے اور قرآن پاک خدا کا کلام ہے جو محمدؐ پر نازل ہوا اور بس۔ نمازوں سے وہ بے نیاز تھا۔ گاؤں بہت چھوٹا تھا جس میں کوئی مسجد نہیں تھی۔ دس پندرہ گھنٹے تھے۔ وہ بھی ایک دوسرے سے دور دور۔ لوگ اللہ اللہ کرتے تھے۔ ان کے دل میں اس ذات پاک کا خوف تھا مگر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا۔ قریب قریب ہر گھر میں قرآن موجود تھا مگر پڑھنا کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ سب نے اسے احتراماً جزدان میں لپیٹ کر کسی اونچے طاق میں رکھ چھوڑا تھا۔ اس کی ضرورت صرف اسی وقت پیش آتی تھی جب کسی سے کوئی سچی بات کہلوانی ہوتی تھی یا کسی کام کے لیے حلف اٹھانا ہوتا تھا۔

گاؤں میں مولوی کی شکل اسی وقت دکھائی دیتی تھی جب کسی لڑکے یا لڑکی شادی ہوتی تھی۔ مرگ پر جنازہ وغیرہ وہ خود ہی پڑھ لیتے تھے، اپنی زبان میں۔ چودھری موجود ایسے موقعوں پر زیادہ کام آتا تھا۔ اس کی زبان میں اثر تھا۔ جس انداز سے وہ مرHom کی خوبیاں بیان کرتا تھا اور اس کی مغفرت کے لیے دعا کرتا تھا، وہ کچھ اسی کا حصہ تھا۔

پچھلے برس جب اس کے دوست دینو کا جوان لڑکا مر گیا تو اس کو قبر میں اتار کر اس نے بڑے موثر انداز میں یہ کہا تھا۔ ہائے، کیا حشین جوان لڑکا تھا۔ تھوک پھیلتا تھا تو میں گز دور جا کے گرتی تھی۔ اس کی پیشاب کی دھار کا تو آس پاس کے کسی گاؤں کھیرے میں بھی مقابلہ کرنے والا موجود نہیں تھا اور بنی پکڑنے میں تو جواب نہیں تھا اس کا۔۔۔ ہے گھسنی کانغرہ مارتا اور دوالگیوں سے یوں بنی کھولتا جیسے کرتے کا بُن کھولتے ہیں۔۔۔ دینوبار، تجھ پر آج قیامت کا دن ہے۔۔۔ تو کبھی یہ صدمہ نہیں برداشت کرے گا۔۔۔ یاروا سے مر جانا چاہیے تھا۔۔۔ ایسا حشین جوان لڑکا۔۔۔ ایسا خوبصورت گبر و جوان۔۔۔ نیت سنیاری جیسی سندر اور ہیلی ناری اس کو قابو کرنے کے لیے تعویذ دھاگے کراتی رہی۔۔۔ مگر بھئی مر جبا ہے دینو، تیر لڑکا لنگوٹ کا پکارہا۔۔۔ خدا کرے اس کو جنت میں سب سے خوبصورت حور ملے اور وہاں بھی لنگوٹ کا پکار ہے۔ اللہ میاں خوش ہو کر اس پر اپنی اور حمتیں نازل کرے گا۔۔۔ آمین۔“

یہ چھوٹی سی تقریر سن کر دس میں آدمی جن میں دینو بھی شامل تھا، دھاڑیں مار مار کر روپڑے تھے۔ خود چوہدری موجود کی آنکھوں سے آنسو روائ تھے۔ موجود نے جب اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہی تھی تو اس نے مولوی بلانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اس نے بڑے بوڑھوں سے سن رکھا تھا کہ تین مرتبہ طلاق، طلاق، طلاق کہہ دو تو قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے یہ قصہ اس طرح ختم کیا تھا۔ مگر دوسرا ہی دن اس کو بہت افسوس ہوا تھا۔ بڑی ندامت ہوئی تھی کہ اس نے یہ کیا غلطی کی۔ میاں بیوی میں جھگڑے ہوتے ہی رہتے ہیں مگر طلاق تک نوبت نہیں آتی۔ اس کو درگزر کرنا چاہیے تھا۔

پھاتاں اس کو پسند تھی۔ گوہاب جوان نہیں تھی، لیکن پھر بھی اس کو اس کا جسم پسند تھا۔ اس کی باتیں پسند تھیں۔۔۔ اور پھر وہ اس کی جیناں کی ماں تھی۔۔۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا جو واپس نہیں آ سکتا تھا۔ چوہدری موجود جب بھی اس کے متعلق سوچتا تو اس کے چہیتے چوڑے کا دھواں اس کے حلق میں تیخ گھونٹ بن بن کے جانے لگتا۔

جیناں خوبصورت تھی۔ اپنی ماں کی طرح ان دو برسوں میں اس نے ایک دم بڑھنا شروع کر دیا تھا اور دیکھتے دیکھتے جوان میاں بن گئی تھی جس کے انگ انگ سے جوانی پھوٹ پھوٹ کے نکل رہی تھی۔ چوہدری موجود کو اب اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر بھی تھی۔ یہاں پھر اس کو پھاتاں یاد آتی۔ یہ کام وہ کتنی آسانی سے کر سکتی تھی۔

کھری کھاط پر چوہدری موجود نے اپنی نشست اور اپنا تہجد درست کرتے ہوئے چوڑے سے غیر معمولی لمبا کش لیا اور کھانے لگا۔ کھانے کے دوران میں کسی کی آواز آئی، ”السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته۔“ چوہدری موجود نے پلٹ کر دیکھا تو اسے سفید کپڑوں میں ایک دراز ریش

بزرگ نظر آئے۔ اس نے سلام کا جواب دیا اور سوچنے لگا کہ یہ شخص کہاں سے آگیا ہے۔ دراز ریش بزرگ کی آنکھیں بڑی بڑی اور بار عرب تھیں جن میں سرمه لگا ہوا تھا۔ لمبے لمبے پٹے تھے۔ داڑھی کے بال کچھری تھے۔ سفید زیادہ اور سیاہ کم۔ سر پر سفید عمامہ تھا۔ کاندھے پر ریشم کا کاڑھا ہوا بستی رومال۔ ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والا موٹا عصا تھا۔ پاؤں میں لال کھال کا نرم و نازک جوتا۔ چوہدری موجود نے جب اس بزرگ کا سر اپا گور سے دیکھا تو اس کے دل میں فوراً ہی اس کا احترام پیدا ہو گیا۔ چارپائی پر سے جلدی جلدی اٹھ کروہ اس سے مخاطب ہوا،

آپ کہاں سے آئے؟ کب آئے؟“

بزرگ کی کتری ہوئی شرعی لبوں میں مسکراہٹ پیدا ہوئی، ”نقیر کہاں سے آئیں گے، ان کا کوئی گھر نہیں ہوتا، ان کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں، ان کے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں، اللہ تبارک تعالیٰ نے جدھر حکم دیا چل پڑے۔۔۔ جہاں ٹھہر نے کا حکم ہوا وہیں ٹھہر گئے۔“

چوہدری موجود پر ان الفاظ کا بہت اثر ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر بزرگ کا ہاتھ بڑے احترام سے اپنے ہاتھوں میں لیا۔ چوہا، آنکھوں سے لگایا، ”چوہدری موجود کا گھر آپ کا اپنا گھر ہے۔“ بزرگ مسکراتا ہوا کھاٹ پر بیٹھ گیا اور اپنے چاندی کی موٹھو والے عصا کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس پر اپنا سرجھ کا دیا، ”اللہ جل شانہ کو جانے تیری کون سی ادا پسند آگئی کہ اپنے اس حقیر اور عاصی بندے کو تیرے پاس بھیج دیا۔“ چوہدری موجود نے خوش ہو کر پوچھا، ”مولوی صاحب آپ اس کے حکم سے آئے ہیں؟“ مولوی صاحب نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور کسی قدر خشم آلو دلچھے میں کہا، ”تو کیا ہم تیرے حکم سے آئے ہیں۔۔۔ ہم تیرے بندے ہیں یا اس کے، جس کی عبادت میں ہم نے پورے چالیس برس گزار کر یہ تھوڑا بہت رتبہ حاصل کیا ہے۔“

چوہدری موجود کا نپ گیا۔ اپنے مخصوص گنوار لیکن پر خلوص انداز میں اس نے مولوی صاحب سے اپنی تقصیر معاف کرائی اور کہا، ”مولوی صاحب، ہم جیسے انسانوں سے جن کو نماز پڑھنی بھی نہیں آتی ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔۔۔ ہم گنہگار ہیں، ہمیں بخشوانا اور بخشنا آپ کا کام ہے۔“

مولوی صاحب نے اپنی بڑی بڑی سرمه لگی آنکھیں بند کیں اور کہا، ”ہم اسی لیے آئے ہیں۔“ چوہدری موجود میں پر بیٹھ گیا اور مولوی صاحب کے پاؤں دبانے لگا۔ اتنے میں اس کی لڑکی جیناں آگئی۔ اس نے مولوی صاحب کو دیکھا تو گھو نگھٹ چھوڑ لیا۔

مولوی صاحب نے مندی آنکھوں سے پوچھا، ”کون ہے چوہدری موجود؟“

”میری بیٹی مولوی صاحب---جینا!“

مولوی صاحب نے نیم و آنکھوں سے جینا کو دیکھا اور موجود سے کہا، ”ہم فقیروں سے کیا پردہ ہے---اس سے پوچھو۔“

”کوئی پردہ نہیں مولوی صاحب---پردہ کیسا ہو گا۔“ پھر موجود جینا سے مخاطب ہوا۔ ”یہ مولوی صاحب جینا۔ اللہ کے خاص بندے---ان سے پردہ کیسا، اٹھا لے اپنا گھوٹکھٹ۔“ جینا نے اپنا گھوٹکھٹ اٹھایا۔ مولوی صاحب نے اپنی سرمہ لگی نظریں بھر کے اس کی طرف دیکھا اور موجود سے کہا، ”تیری بیٹی خوبصورت ہے چوہدری موجود!“

جینا شرمگئی۔ موجود نے کہا، ”اپنی ماں پر ہے مولوی صاحب!“

”کہاں ہے اس کی ماں؟“ مولوی صاحب نے ایک بار پھر جینا کی جوانی کی طرف دیکھا۔ چوہدری موجود سپٹا گیا کہ جواب کیا دے۔ مولوی صاحب نے پھر پوچھا، ”اس کی ماں کہاں ہے چوہدری موجود؟“ موجود نے جلدی سے کہا، ”مرچکی ہے جی!“ مولوی صاحب کی نظریں جینا پر گڑی تھیں۔ اس کا رد عمل بجانب کرانھوں نے موجود سے کڑک کر کہا، ”تو جھوٹ بولتا ہے۔“ موجود نے مولوی صاحب کے پاؤں کپڑا لیے اور ندامت بھری آواز میں کہا، ”جی ہاں---جی ہاں---میں نے جھوٹ بولا تھا۔۔۔ مجھے معاف کر دیجیے---میں بڑا جھوٹا آدمی ہوں---۔۔۔ میں نے اس کو طلاق دے دی تھی مولوی صاحب۔“

مولوی صاحب نے ایک لمبی ہوں، کی اور نظریں جینا کی چدريا سے ہٹا لیں اور موجود سے مخاطب ہوئے، ”تو بہت بڑا گناہ گار ہے---کیا قصور تھا اس بے زبان کا؟“ موجود نامت میں غرق تھا، ”کچھ نہیں معلوم مولوی صاحب۔۔۔“ معمولی سی بات تھی جو بڑھتے بڑھتے طلاق تک پہنچ گئی۔۔۔ میں واقعی گناہ گار ہوں۔۔۔ طلاق دینے کے دوسرے دن، ہی میں نے سوچا تھا کہ موجود نے یہ کیا جھک ماری۔۔۔ پر اس وقت کیا ہو سکتا تھا۔۔۔ چڑیاں کھیت چک چکی تھیں۔۔۔ پچھتاوار سے کیا ہو سکتا تھا مولوی صاحب۔“

مولوی صاحب نے چاندی کی موٹھ والا عصا موجود کے کاندھے پر رکھ دیا، ”اللہ تبارک تعالیٰ کی ذات بہت بڑی ہے۔ وہ بڑا حیم ہے، بڑا کریم ہے۔۔۔ وہ چاہے توہر بگڑی بناسکتا ہے۔۔۔ اس کا حکم ہوا تو یہ حقیر فقیر ہی تیری نجات کے لیے کوئی راستہ ڈھونڈ نکالے گا۔“ ”ممنون و تفکر“

چوہدری موجو مولوی صاحب کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ گیا اور رونے لگا۔ مولوی صاحب نے جیناں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی اشک روائی تھے، ”ادھر آڑ کی۔“

مولوی صاحب کے لجھے میں ایسا تحکم تھا جس کو رد کرنا جیناں کے لیے ناممکن تھا۔ روٹی اور لسی ایک طرف رکھ کر وہ کھات کے پاس چلی گئی۔ مولوی صاحب نے اس کو بازو سے پکڑا اور کہا، ”بیٹھ جا۔“ جیناں زمین پر بیٹھنے لگی تو مولوی صاحب نے اس کا بازو اور کھینچا، ”ادھر میرے پاس بیٹھ۔“ جیناں سمت کر مولوی صاحب کے پاس بیٹھ گئی۔ مولوی صاحب نے اس کی کمر میں ہاتھ دے کر اس کو اپنے قریب کر لیا اور ذرا دبا کر پوچھا، ”کیا لائی ہے تو ہمارے کھانے کے لیے؟“ جیناں نے ایک طرف ہٹا چاہا مگر گرفت مضبوط تھی۔ اس کو جواب دینا پڑا، ”جی۔۔۔ جی روٹیاں ہیں۔ ساگ ہے اور لسی۔“ مولوی صاحب نے جیناں کی تپلی مضبوط کمر اپنے ہاتھ سے ایک بار پھر دبائی، ”چل کھول کھانا اور ہمیں کھلا۔“

جیناں اٹھ کر چلی گئی تو مولوی صاحب نے موجو کے کندھ سے اپنا چاندی کی موٹھ والا عصا نہیں سی ضرب کے بعد اٹھالیا، ”اٹھ موجو۔۔۔ ہمارے ہاتھ دھلا۔“ موجو فوراً اٹھا۔ پاس ہی کنوں تھا۔ پانی لایا اور مولوی صاحب کے ہاتھ بڑے مریدانہ طور پر دھلانے، جیناں نے چار پانی پر کھانا کھ دیا۔ مولوی صاحب سب کا سب کھانے اور جیناں کو حکم دیا کہ وہ ان کے ہاتھ دھلانے۔ جیناں عدول حکمی نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ مولوی صاحب کی شکل و صورت اور ان کی گفتگو کا انداز ہی کچھ ایسا تحکم بھرا تھا۔ مولوی صاحب نے ڈکار لے کر بڑے زور سے الحمد للہ کہا۔ داڑھی پر گیلا گیلا ہاتھ پھیرا۔ ایک اور ڈکار لی اور چار پانی پر لیٹ گئے اور ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ سے جیناں کی ڈھنکی ہوئی چدریا کی طرف دیکھتے رہے۔ اس نے جلدی جلدی برتن سمیٹے اور چلی گئی۔ مولوی صاحب نے آنکھ بند کی اور موجو سے کہا، ”چوہدری اب ہم سوئیں گے۔“

چوہدری کچھ دیر ان کے پاؤں دابتارہا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ سو گئے ہیں تو ایک طرف جا کر اس نے اپلے سلاگئے اور چلم میں تمبا کو بھر کے بھوکے پیٹ چمودا پینا شروع کر دیا۔ مگر وہ خوش تھا۔ اس کو ایسا لگتا تھا کہ اس کی زندگی کا کوئی بہت بڑا بوجھ دور ہو گیا ہے۔ اس نے دل تی دل میں اپنے مخصوص گنوار مگر مخلص انداز میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جس نے اپنی جانب سے مولوی صاحب کی شکل میں فرشتہ رحمت بھیج دیا۔ پہلے اس نے سوچا کہ مولوی صاحب کے پاس ہی بیٹھا رہے کہ شاید ان کو کسی خدمت کی ضرورت ہو، مگر جب دیر ہو گئی اور وہ سوتے رہے تو وہ اٹھ کر اپنے کھیت میں چلا گیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اس کو اس بات کا قطعاً خیال نہیں تھا کہ وہ بھوکا ہے۔ اس کو بلکہ اس بات کی بے حد مسرت تھی کہ اس کا کھانا مولوی صاحب نے کھایا اور اس کو اتنی بڑی سعادت ہوئی۔

شام سے پہلے پہلے جب وہ کھیت سے والپس آیا تو اس کو یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ مولوی صاحب موجود نہیں۔ اس نے خود کو بڑی لعنت ملامت کی کہ وہ کیوں چلا گیا۔ ان کے حضور بیٹھا رہتا۔ شاید وہ ناراض ہو کر چلے گئے ہیں اور کوئی بد دعا بھی دے گئے ہوں۔ جب چوہدری موجود نے یہ سوچا تو اس کی سادہ روح لرز گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اس نے ادھر ادھر مولوی صاحب کو تلاش کیا مگر وہ نہ ملے۔ گھری شام ہو گئی پھر بھی ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ تھک ہار کر اپنے کو دل ہی دل میں کوستا اور لعنت ملامت کرتا۔ وہ گردن جھکائے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ اسے دوجوان لڑکے گھبرائے ہوئے ملے۔ چوہدری موجود نے ان سے گھبر اہٹ کی وجہ پوچھی تو انہوں نے پہلے تو نالنا چاہا، مگر پھر اصل بات بتا دی کہ وہ گھرے میں دباہوا شراب کا گھڑا انکال کر پینے والے تھے کہ ایک نورانی صورت والے بزرگ ایک دم وہاں نمودار ہوئے اور بڑی غصب ناک نگاہوں سے ان کو دیکھ کر پوچھا کہ وہ یہ کیا حرام کاری کر رہے ہیں۔ جس چیز کو اللہ تبارک تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے وہ اسے پی کر اتنا بڑا گناہ کر رہے ہیں جس کا کوئی کفارہ ہی نہیں، ان لوگوں کو اتنی جرات نہ ہوئی کہ کچھ بولیں۔ بس سر پر پاؤں رکھ کے بھاگے اور بیہاں آکے دم لیا۔

چوہدری موجود نے ان دونوں کو بتایا کہ وہ نورانی صورت والے واقعی اللہ کو پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ پھر اس نے اندیشہ ظاہر کیا کہ اب جانے اس گاؤں پر کیا قہر نازل ہو گا۔ ایک اس نے ان کو چھوڑ چلے جانے کی بری حرکت کی، ایک انہوں نے کہ حرام شے نکال کر پی رہے تھے۔ ”اب اللہ ہی بچائے۔۔۔ اب اللہ ہی بچائے میرے بچو۔“ یہ بڑا چوہدری موجود گھر کی جانب روانہ ہوا۔ جیناں موجود تھیں، پر اس نے اس سے کوئی بات نہ کی اور خاموش کھاٹ پر بیٹھ کر حقہ پینے لگا۔ اس کے دل و دماغ میں ایک طوفان برپا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اس پر اور گاؤں پر ضرور کوئی خدائی آفت آئے گی۔

شام کا کھانا تیار تھا، جیناں نے مولوی صاحب کے لیے بھی پکار کھا تھا۔ جب اس نے اپنے باپ سے پوچھا کہ مولوی صاحب کہاں ہیں تو اس نے بڑے دکھ بھرے لجھ میں کہا، ”گئے۔۔۔ چلے گئے۔ ان کا ہم گنہگاروں کے ہاں کیا کام!“ جیناں کو افسوس ہوا کیونکہ مولوی صاحب نے کھا تھا کہ وہ کوئی ایسا راستہ ڈھونڈ نکالیں گے جس سے اس کی ماں والپس آجائے گی۔۔۔ پر وہ جا چکے تھے۔۔۔ اب وہ راستہ ڈھونڈے والا کون تھا۔ جیناں خاموشی سے پیڑھی پر بیٹھ گئی۔۔۔ کھانا ٹھنڈا ہوتا رہا۔

تحوڑی دیر کے بعد ڈیوڑھی میں آہٹ ہوئی۔ باپ بیٹی دونوں چونکے۔ موجود اٹھ کے باہر گیا اور چند لمحات میں مولوی صاحب اور وہ دونوں اندر صحن میں تھے۔ دیے کی دھنڈلی روشنی میں جیناں نے دیکھا کہ مولوی صاحب لڑکھڑا رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سامان کا ہے۔ موجود نے ان کو سہارا دے کر چارپائی پر بٹھایا۔ مولوی صاحب نے گھڑا موجود کو دیا اور لکنت بھرے لجھ میں کہا، ”آج خدا نے ہمارا

بہت کڑا امتحان لیا۔۔۔ تمہارے گاؤں کے دوڑ کے شراب کا گھٹ انکال کر پینے والے تھے کہ ہم پہنچ گئے۔۔۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی بھاگ گئے۔ ہم کو بہت صدمہ ہوا کہ اتنی چھوٹی عمر اور اتنا بڑا گناہ۔۔۔ لیکن ہم نے سوچا کہ اسی عمر میں تو انسان رستے سے بھکتا ہے۔ چنانچہ ہم نے ان کے لیے اللہ تبارک تعالیٰ کے حضور میں گڑ گڑا کرد عالمگی کہ ان کا گناہ معاف کیا جائے۔۔۔ جواب ملا۔۔۔ جانتے ہو کیا جواب ملا؟“

موجونے لرزتے ہوئے کہا۔ ”جی نہیں!“

”جواب ملا۔۔۔ کیا تو ان کا گناہ اپنے سر لیتا ہے۔ میں نے عرض کی۔ ہاں باری تعالیٰ۔۔۔ آواز آئی، تو جایہ سارا گھٹ اشراب کا توپی۔۔۔ ہم نے ان لڑکوں کو بخشا۔“ موجو ایک ایسی دنیا میں چلا گیا جو اس کے اپنے تخلیل کی پیداوار تھی۔ اس کے رو گٹھے گھٹے ہو گئے، ”تو آپ نے پی؟“ مولوی صاحب کا ہجہ اور زیادہ لکنت بھرا ہو گیا، ”ہاں پی۔۔۔ پی۔۔۔ ان کا گناہ اپنے سر لینے کے لیے پی۔۔۔ رب العزت کی آنکھوں میں سرخرو ہونے کے لیے پی۔۔۔ گھٹے میں اور بھی پڑی ہے۔۔۔ یہ بھی ہمیں پینی ہے۔۔۔ رکھ دے اسے سنبھال کے، اور دیکھ اس کی ایک بو نداد ہڑا دھرنہ ہو۔“

موجونے گھٹاٹھا کر اندر کو ٹھری میں رکھ دیا اور اس کے منہ پر کپڑا باندھ دیا۔ واپس صحن میں آیا تو مولوی صاحب جیناں سے اپنا سر دبوا رہے تھے اور اس سے کہہ رہے تھے، ”جو آدمی دوسروں کے لیے کچھ کرتا ہے، اللہ جل شانہ اس سے بہت خوش ہوتا ہے۔۔۔ وہ اس وقت تجھ سے بھی خوش ہے۔۔۔ ہم بھی تجھ سے خوش ہیں۔“ اور اسی خوشی میں مولوی صاحب نے جیناں کو اپنے پاس بٹھا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ مولوی صاحب نے اس کو اپنے گلے سے گالیا اور موجو سے کہا، ”چوہدری تیری بیٹی کا نصیبا جاگ اٹھا ہے۔“ چوہدری سرتاپا ممنون و تمشکر تھا، ”یہ سب آپ کی دعا ہے۔۔۔ آپ کی مہربانی ہے۔“ مولوی صاحب نے جیناں کو ایک مرتبہ پھر اپنے سینے کے ساتھ بھینچا، ”اللہ مہربان سوکل مہربان۔۔۔ جیناں ہم تجھے ایک وظیفہ بتائیں گے، وہ پڑھا کرنا۔ اللہ ہمیشہ مہربان رہے گا۔“

دوسرے دن مولوی صاحب بہت دیر سے اٹھ۔ موجو ڈر کے مارے کھیتوں پر نہ گیا۔ صحن میں ان کی چار پائی کے پاس بیٹھا رہا۔ جب وہ اٹھ تو ان کو مساوک کرائی، نہ لایا دھلا کیا۔۔۔ اور ان کے ارشاد کے مطابق شراب کا گھٹ لا کر ان کے پاس رکھ دیا۔ مولوی صاحب نے کچھ پڑھا۔ گھٹے کامنہ کھول کر اس میں تین بار پھونکا اور دو تین کٹورے چڑھا گئے۔ اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ کچھ پڑھا اور بلند آواز میں کہا، ”ہم تیرے ہر امتحان میں پورے اتریں گے مولا۔“ پھر وہ چوہدری سے مخاطب ہوئے، ”موجو جا۔۔۔ حکم ملا ہے ابھی جا اور اپنی بیوی کو لے آ۔۔۔ راستہ مل گیا ہے ہمیں۔“

موجہ بہت خوش ہوا۔ جلدی جلدی اس نے گھوڑی پر زین کسی اور کہا کہ وہ دوسرے روز صح سویرے پہنچ جائے گا۔ پھر اس نے جیناں سے کہا کہ وہ مولوی صاحب کی ہر آسانش کا خیال رکھے اور خدمت گزاری میں کوئی کسر اٹھانہ رکھے۔

جیناں برتن مانچھے میں مشغول ہو گئی۔ مولوی صاحب چارپائی پر بیٹھے اسے گھورتے اور شراب کے کٹورے پیتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے جیب سے موٹے موٹے دانوں والی تسبیح اٹھائی اور پھیرنا شروع کر دی۔ جب جیناں کام سے فارغ ہو گئی تو انھوں نے اس سے کہا، ”جیناں دیکھو۔۔۔ وضو کرو۔“ جیناں نے بڑے بھولپن سے جواب دیا، ”مجھے نہیں آتا مولوی جی۔“ مولوی صاحب نے بڑے پیارے اس کو سرزنش کی، ”وضو کرنا نہیں آتا۔۔۔ کیا جواب دے گی اللہ کو۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھے اور اس کو وضو کرایا اور ساتھ ساتھ اس انداز سے سمجھاتے رہے کہ وہ اس کے بدن کے ایک ایک کونے کھدرے کو جھانک جھانک کر دیکھ سکیں۔

وضو کرنے کے بعد مولوی صاحب نے جانماز مانگی۔ وہ نہ ملی تو پھر ڈانٹا، مگر اسی انداز میں۔ کھیس منگوایا، اس کو اندر کی کوٹھری میں بچھایا اور جیناں سے کہا کہ باہر کی کنڈی لگادے۔ جب کنڈی لگ گئی تو اس سے کہا کہ گھڑ اور کٹورا اٹھا کے اندر لے آئے۔ وہ لے آئی۔ مولوی صاحب نے آدھا کٹورا پیا اور آدھا اپنے سامنے رکھ لیا اور تسبیح پھیرنا شروع کر دی۔ جیناں ان کے پاس خاموش بیٹھی رہی۔ بہت دیر تک مولوی صاحب آنکھیں بند کیے اسی طرح وظیفہ کرتے رہے، پھر انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ کٹورا جو آدھا بھرا تھا، اس میں تین پھونک ماریں اور جیناں کی طرف بڑھا دیا، ”پی جاؤ اسے۔“

جیناں نے کٹورا کپڑ لیا مگر اس کے ہاتھ کا نپنے لگ۔ مولوی صاحب نے بڑے جلال بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا، ”ہم کہتے ہیں، پی جاؤ۔۔۔ تمہارے سارے دل در در ہو جائیں گے۔“ جیناں پی گئی، مولوی صاحب اپنی پتلی لبوں میں مسکرائے اور اس سے کہا، ”ہم پھر اپنا وظیفہ شروع کرتے ہیں۔۔۔ جب شہادت کی انگلی سے اشارہ کریں تو آدھا کٹورہ گھڑے سے نکال کر فوراً پی جانا۔۔۔ سمجھ گئیں۔“

مولوی صاحب نے اس کو جواب کا موقعہ ہی نہ دیا اور آنکھیں بند کر کے مر اتنے میں چلے گئے۔۔۔ جیناں کے منہ کا ذائقہ بے حد خراب ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ سینے میں آگ سی لگ گئی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اٹھ کر ٹھنڈا ٹھنڈا اپانی پیے۔ پر وہ کیسے اٹھ سکتی تھی۔ جلن کو حلق اور سینے میں لیے دیر تک بیٹھی رہی۔ اس کے بعد ایک دم مولوی صاحب کی شہادت کی انگلی زور سے اٹھی۔ جیناں کو جیسے کسی نے ہپنا ٹرم کر دیا تھا۔ فوراً اس نے آدھا کٹورا بھر اور پی گئی۔ تھوکنا چاہا مگر اٹھنے سکی۔ مولوی صاحب اسی طرح آنکھیں بند کیے تسبیح کے دانے کھٹا کھٹ

پھیرتے رہے۔ جیناں نے محسوس کیا کہ اس کا سرچکردار ہے اور جیسے اس کو نیند آ رہی ہے، پھر اس نے نیم بے ہوش کے عالم میں یوں محسوس کیا کہ وہ کسی بے داڑھی منچھ والے جوان مرد کی گود میں ہے اور وہ اسے جنت دکھانے لے جا رہا ہے۔

جیناں نے جب آنکھیں کھولیں تو وہ کھیس پر لیٹی تھی۔ اس نے نیم و مخمور آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اور یہاں کیوں لیٹی تھی کے متعلق سوچنا شروع کیا تو اسے سب کچھ دھند میں لپٹا نظر آیا۔ وہ پھر سونے لگی۔ لیکن ایک دم اٹھ بیٹھی۔ مولوی صاحب کہاں تھے۔؟ اور وہ جنت؟ کوئی بھی نہیں۔ وہ باہر صحن میں نکلی تو دیکھا کہ دن ڈھل رہا ہے اور مولوی صاحب کھرے کے پاس بیٹھے وضو کر رہے ہیں۔ آہٹ سن کر انھوں نے پلٹ کر جیناں کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔ جیناں واپس کوٹھری میں چلی گئی اور کھیس پر بیٹھ کر اپنی ماں کے متعلق سوچنے لگی۔ جس کو لانے اس کا باپ گیا ہوا تھا۔۔۔ پوری ایک رات باقی تھی ان کی واپسی میں اور سخت بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے کچھ لپکایا بھی نہیں تھا۔۔۔ اس کے چھوٹے سے مضطرب دماغ میں بے شمار باتیں آ رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد مولوی صاحب نمودار ہوئے اور یہ کہہ کر چلے گئے، ”مجھے تمہارے باپ کے لیے ایک وظیفہ کرنا ہے۔۔۔ ساری رات کسی قبر کے پاس بیٹھنا ہو گا۔۔۔ صح آ جاؤں گا۔۔۔ تمہارے لیے بھی دعائیں گوں گا۔“

مولوی صاحب صح سویرے نمودار ہوئے۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں جن میں سرمے کی تحریر غالب تھیں، بے حد سرخ تھیں۔ ان کے لمحے میں لکنت تھی اور قدموں میں لڑکھڑاہٹ۔ صحن میں آتے ہی انھوں نے مسکرا کر جیناں کی طرف دیکھا، آگے بڑھ کر اس کو گلے سے لگایا۔ اس کو چوہا اور چارپائی پر بیٹھ گئے۔ جیناں ایک طرف کونے میں پیڑھی پر بیٹھ گئی اور گزشتہ دھندے واقعات کے متعلق سوچنے لگی۔ اس کو اپنے باپ کا بھی انتظار تھا جس کو اس وقت تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔

ماں سے کچھڑے ہوئے اس کو دو برس ہو چکے تھے۔۔۔ اور جنت۔۔۔ وہ جنت۔۔۔ کیسی تھی وہ جنت!!۔۔۔ کیا وہ مولوی صاحب تھے۔۔۔ مولوی صاحب تھوڑی دیر کے بعد اس سے مخاطب ہوئے۔ ”جیناں، ابھی تک موجود نہیں آیا۔“ جیناں خاموش رہی۔ مولوی صاحب پھر اس سے مخاطب ہوئے، ”اور میں ساری رات ایک ٹوٹی پھوٹی قبر پر سر نیوڑھائے سنستان رات میں اس کے لیے وظیفہ پڑھتا رہا۔۔۔ کب آئے گا وہ؟۔۔۔ کیا وہ لے آئے گا تمہاری ماں کو؟“ جیناں نے صرف اس قدر کہا، ”بھی معلوم نہیں۔۔۔ شاید آتے ہی ہوں۔۔۔ آجائیں گے۔۔۔ اماں بھی آجائے گی۔۔۔ پر ٹھیک پتا نہیں۔“

اتنے میں آہٹ ہوئی۔۔۔ جیناں اٹھی۔ اس کی ماں نمودار ہوئی۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ موجود آیا تو اس نے مولوی صاحب کو بڑے ادب اور احترام کے ساتھ سلام کیا۔ پھر اس نے اپنی بیوی سے کہا، ”پھاتاں۔۔۔ سلام کرو مولوی صاحب کو۔“

پھاتاں اپنی بیٹی سے الگ ہوئی۔ آنسو پوچھتے ہوئے آگے بڑھی اور مولوی صاحب کو سلام کیا۔ مولوی صاحب نے اپنی لال لال آنکھوں سے اس کو گھور کے دیکھا اور موجود سے کہا، ”ساری رات قبر کے پاس تمہارے لیے وظیفہ کرتا رہا۔۔۔ ابھی ابھی اٹھ کے آیا ہوں۔۔۔ اللہ نے میری سن لی ہے۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

چوہدری موجود نے فرش پر بیٹھ کر مولوی صاحب کے پاؤں دابنے شروع کر دیے وہ اتنا منون و تشرکر تھا کہ کچھ نہ کہہ سکا۔ البتہ بیوی سے مخاطب ہو کر اس نے آنسوؤں بھری آواز میں کہا، ”ادھر آپھاتاں۔۔۔ تو ہی مولوی صاحب کا شکریہ ادا کر۔۔۔ مجھے تو نہیں آتا۔“ پھاتاں اپنے خاوند کے پاس بیٹھ گئی۔ پروہ صرف اتنا کہہ سکی، ”ہم غریب کیا ادا کر سکتے ہیں۔“ مولوی صاحب نے غور سے پھاتاں کو دیکھا، ”موجو چوہدری، تم ٹھیک کہتے تھے۔ تمہاری بیوی خوبصورت ہے۔۔۔ اس عمر میں بھی جوان معلوم ہوتی ہے۔ بالکل دوسرا جینا۔۔۔ اس سے بھی اچھی۔۔۔ ہم سب ٹھیک کر دیں گے پھاتاں۔۔۔ اللہ کا فضل و کرم ہو گیا ہے۔“ میاں بیوی دونوں خاموش رہے۔ موجود مولوی صاحب کے پاؤں دباتا رہا۔ جیناں چوہاسلاگانے میں مصروف ہو گئی تھی۔

تحوڑی دیر کے بعد مولوی صاحب اٹھے۔ پھاتاں کے سر پر ہاتھ سے پیار کیا اور موجود سے مخاطب ہوئے، ”اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے اور پھر اس کو اپنے گھر بسانا چاہے تو اس کی سزا یہ ہے کہ پہلے وہ عورت کسی اور مرد سے شادی کرے۔ اس سے طلاق لے، پھر جائز ہے۔“ موجود نے ہولے سے کہا، ”میں سن چکا ہوں مولوی صاحب۔“ مولوی صاحب نے موجود کو اٹھایا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، ”لیکن ہم نے خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگی کہ ایسی کڑی سزا نہ دی جائے غریب کو۔ اس سے بھول ہو گئی ہے۔۔۔ آواز آئی۔۔۔ ہم ہر روز سفارشیں کب تک سنیں گے تو اپنے لیے جو بھی مانگ، ہم دینے کے لیے تیار ہیں۔۔۔ میں نے عرض کی، میرے شہنشاہ۔۔۔ بحر و بر کے مالک۔۔۔ میں اپنے لیے کچھ نہیں مانگتا۔۔۔ تیرا دیا میرے پاس بہت کچھ ہے۔۔۔ موجود چوہدری کو اپنی بیوی سے محبت ہے۔۔۔ ارشاد ہوا۔۔۔ تو ہم اس کی محبت اور تیرے ایمان کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔۔۔ ایک دن کے لیے تو اس سے نکاح کر لے۔ دوسرے دن طلاق دے کر موجود کے حوالے کر دے۔۔۔ ہم تیرے لیے بس صرف یہی کر سکتے ہیں کہ تو نے چالیس برس دل سے ہماری عبادت کی ہے۔“

موجود بہت خوش ہوا۔ ”مجھے منظور ہے مولوی صاحب۔۔۔ مجھے منظور ہے۔“ اور پھاتاں کی طرف اس نے تتمائی آنکھوں سے دیکھا، ”کیوں پھاتاں؟“ مگر اس نے پھاتاں کے جواب کا انتظار نہ کیا، ”ہم دونوں کو منظور ہے۔“ مولوی صاحب نے آنکھیں بند کیں۔ کچھ پڑھا۔ دونوں کے پھونک ماری اور آسمان کی طرف نظریں اٹھائیں، ”اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کو اس امتحان میں پورا اتارے۔“ پھر وہ موجود سے مخاطب

ہوا، ”اچھا موجو۔۔۔ میں اب چلتا ہوں۔۔۔ تم اور جیناں آج کی رات کہیں چلے جانا، صح سویرے آ جانا۔“ یہ کہہ کر مولوی صاحب چلے گئے۔

جیناں اور موجو تیار تھے۔ جب شام کو مولوی صاحب واپس آئے تو انہوں نے ان سے بہت مختصر باتیں کیں۔ وہ کچھ بڑھ رہے تھے۔ آخر میں انہوں نے اشارہ کیا۔ جیناں اور موجو فوراً چلے گئے۔ مولوی صاحب نے کنڈی بند کر دی اور پھاتاں سے کہا، ”تم آج کی رات میری بیوی ہو۔۔۔ جاؤ اندر سے بستر لاؤ اور چارپائی پر بچاؤ، ہم سوکیں گے۔“ پھاتاں نے اندر کو ٹھری سے بستر لاؤ کر چارپائی پر بڑے سیلے سے لگادیا۔ مولوی صاحب نے کہا، ”بی بی تم بیٹھو، ہم بھی آتے ہیں۔“ یہ کہہ وہ کو ٹھری میں چلے گئے۔ اندر دیار و شن تھا۔ کونے میں برتوں کے منارے کے پاس ان کا گھڑا رکھا تھا۔ انہوں نے اسے ہلا کر دیکھا۔ تھوڑی سی باقی تھی۔ گھڑے کے ساتھ ہی منہ لگا کر انہوں نے کئی بڑے بڑے گھونٹ پیے۔ کاندھے سے ریشمی پھولوں والا سنتی رومال اتار کر موچھیں اور ہوتھ صاف کیے اور دروازہ بھیڑ دیا۔

پھاتاں چارپائی پر بیٹھی تھی۔ کافی دیر کے بعد مولوی صاحب نکلے۔ ان کے ہاتھ میں کٹوار تھا۔ اس میں تین دفعہ پھونک کر انہوں نے پھاتاں کو پیش کیا، ”لواسے پی جاؤ۔“ پھاتاں پی گئی۔ قہ آنے لگی تو مولوی صاحب نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہا، ”ٹھیک ہو جاؤ گی فوراً۔“ پھاتاں نے کوشش کی اور کسی قدر ٹھیک ہو گئی۔ مولوی صاحب لیٹ گئے۔

صح سویرے جیناں اور موجو آئے تو انہوں نے دیکھا کہ صحن میں پھاتاں سورہ ہی ہے مگر مولوی صاحب موجود نہیں۔ موجو نے سوچا۔ باہر گئے ہوں گے کھیتوں میں۔ اس نے پھاتاں کو جگایا۔ پھاتاں نے غنوں کر کے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ پھر بڑبڑائی، ”جنت۔۔۔ جنت۔۔۔“ لیکن جب اس نے موجو کو دیکھا تو پوری آنکھیں کھول کر بستر میں بیٹھ گئی۔ موجو نے پوچھا، ”مولوی صاحب کہاں ہیں؟“ پھاتاں ابھی تک پورے ہوش میں نہیں تھی، ”مولوی صاحب۔۔۔ کون مولوی صاحب۔۔۔ وہ تو۔۔۔ پتا نہیں کہاں گئے۔۔۔ یہاں نہیں ہیں؟“

”نہیں۔“ موجو نے کہا، ”میں دیکھتا ہوں انھیں باہر۔“ وہ جا رہا تھا کہ اسے پھاتاں کی بھلی سی چینے سنائی دی۔ پلٹ کر اس نے دیکھاتکے کے نیچے سے وہ کوئی کالی کالی چیز نکال رہی تھی۔۔۔ جب پوری نکل آئی تو اس نے کہا، ”یہ کیا ہے؟“ موجو نے کہا، ”بال۔“ پھاتاں نے بالوں کا وہ گچھا فرش پر پھینک دیا۔ موجو نے اسے اٹھالیا اور غور سے دیکھا، ”دائر ہی اور پڑے۔“ جیناں پاس ہی کھڑی تھی۔ وہ بولی، ”مولوی صاحب کی دائی ہی اور پڑے۔“ پھاتاں نے وہیں چارپائی سے کہا، ”ہاں۔۔۔ مولوی صاحب کی دائی ہی اور پڑے۔“

موجو عجیب چکر میں پڑ گیا، ”اور مولوی صاحب کہاں ہیں؟“ لیکن فوراً ہی اس کے سادہ اور بے لوٹ دماغ میں ایک خیال آیا، ”جیناں---پھاتاں، تم نہیں سمجھیں---وہ کوئی کرامات والے بزرگ تھے۔ ہمارا کام کر گئے اور یہ نشانی چھوڑ گئے۔“ اس نے ان بالوں کو چومنا۔ آنکھوں سے لگایا اور ان کو جیناں کے حوالے کر کے کہا، ”جاہ، ان کو کسی صاف کپڑے میں لپیٹ کر بڑے صندوق میں رکھ دو۔۔۔ خدا کے حکم سے گھر میں برکت ہی برکت رہے گی۔“

جیناں اندر کو ٹھری میں گئی تو وہ پھاتاں کے پاس بیٹھ گیا اور بڑے پیار سے کہنے لگا، ”میں اب نماز پڑھنا سیکھوں گا اور اس بزرگ کے لیے دعا کیا کروں گا جس نے ہم دونوں کو پھر سے ملا دیا۔“

پھاتاں خاموش رہی۔

-[106]-

پڑھیے کلمہ: سعادت حسن منٹو

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ۔۔۔ آپ مسلمان ہیں، یقین کریں میں جو کچھ کہوں گا، سچ کہوں گا۔

پاکستان کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ قائد اعظم جناح کے لیے میں جان دینے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں اس معاملے سے پاکستان کا کوئی تعلق نہیں۔ آپ اتنی جلدی نہ کیجیے۔۔۔ مانتا ہوں، ان دونوں ہلڑ کے زمانے میں آپ کو فرصت نہیں، لیکن آپ خدا کے لیے میری پوری بات تو سن لجیجے۔۔۔ میں نے تکارام کو ضرور مارا ہے، اور جیسا کہ آپ کہتے ہیں تیز چھری سے اس کا پیٹ چاک کیا ہے، مگر اس لیے نہیں کہ وہ ہندو تھا۔ اب آپ پوچھیں گے کہ تم نے اس لیے نہیں مارا تو پھر کس لیے مارا۔۔۔ لجیجے میں ساری داستان ہی آپ کو سنا دیتا ہوں۔

پڑھیے کلمہ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ۔۔۔ کس کافر کو معلوم تھا کہ میں اس لفڑے میں کچھ جاؤں گا۔ پچھلے ہندو مسلم فساد میں میں نے تین ہندو مارے تھے۔ لیکن آپ یقین مانیے وہ مارنا کچھ اور ہے، اور یہ مارنا کچھ اور ہے۔ خیر، آپ سنئے کہ ہوا کیا، میں نے اس تکارام کو کیوں مارا۔

کیوں صاحب عورت ذات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے--- میں سمجھتا ہوں بزرگوں نے ٹھیک کہا ہے--- اس کے چلتروں سے خدا ہی بچائے--- پھانسی سے نجگیا تو دیکھیے کا نوں کوہا تھا لگاتا ہوں، پھر کبھی کسی عورت کے نزدیک نہیں جاؤں گا--- لیکن صاحب عورت بھی اکیلی سزاوار نہیں۔ مرد سالے بھی کم نہیں ہوتے۔ بس، کسی عورت کو دیکھا اور ریشہ خٹھی ہو گئے۔ خدا کو جان دینی ہے۔ انسپکٹر صاحب! رکما کو دیکھ کر میرا بھی یہی حال ہوا تھا۔

اب کوئی مجھ سے پوچھے۔ بندہ خدا تو ایک پینتیس روپے کا ملازم، تجھے بھلا عشق سے کیا کام۔ کرایہ وصول کر اور چلتا بن۔ لیکن آفت یہ ہوئی صاحب کہ ایک دن جب میں سولہ نمبر کی کھولی کا کرایہ وصول کرنے گیا اور دروازہ ٹھوکا تو اندر سے رکمابائی نکلی۔ یوں تو میں رکمابائی کو کئی دفعہ دیکھ چکا تھا لیکن اس دن کم بخت نے بدن پر تیل ملا ہوا تھا اور ایک تپلی دھوتی لپیٹ رکھی تھی۔ جانے کیا ہوا مجھے، جی چاہا اس کی دھوتی اتار کر زور سے ماش کر دوں۔ بس صاحب اسی روز سے اس بندہ ناکار نے اپنا دل، دماغ سب کچھ اس کے حوالے کر دیا۔

کیا عورت تھی--- بدن تھا پتھر کی طرح سخت، ماش کرتے کرتے ہانپہ لگ گیا تھا مگر وہ اپنے باپ کی بیٹی یہی کہتی رہی، ”تھوڑی دیر اور۔“

شادی شدہ--- جی ہاں شادی شدہ تھی اور خان چوکیدار نے کہا تھا کہ اس کا ایک یار بھی ہے۔ لیکن آپ سارا قصہ سن لیجیے--- یار وار سب ہی اس میں آجائیں گے۔

جی ہاں، بس اس روز سے عشق کا بھوت میرے سر پر سوار ہو گیا۔ وہ بھی کچھ کچھ سمجھ گئی تھی کیونکہ کبھی کبھی کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتی تھی--- لیکن خدا گواہ ہے جب بھی وہ مسکرانی، میرے بدن میں خوف کی ایک تھر تھری سی دوڑ گئی۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ یہ معشوق کو پاس دیکھنے کا--- وہ--- ہے--- لیکن بعد میں معلوم ہوا--- لیکن آپ شروع ہی سے سینے۔

وہ تو میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ رکمابائی سے میری آنکھ لڑکی تھی۔ اب دن رات میں سوچتا تھا کہ اسے پٹایا کیسے جائے۔ کم بخت، اس کا خاوند ہر وقت کھولی میں بیٹھا لکڑی کے کھلونے بنا تارہتا، کوئی چانس ملتا ہی نہیں تھا۔ ایک دن بازار میں، میں نے اس کے خاوند کو جس کا نام--- خدا آپ کا بھلا کرے کیا تھا جی ہاں--- گردھاری--- لکڑی کے کھلونے چادر میں باندھے لے جاتے دیکھا تو میں نے جھٹ سے سولہ نمبر کی کھولی کا رخ کیا۔ دھڑکتے دل سے میں نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ رکمابائی نے میری طرف گھور کے دیکھا۔ خدا اکی قسم میری روح لرز گئی۔ بھاگ گیا ہوتا وہاں سے، لیکن اس نے مسکراتے ہوئے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

جب اندر گیا تو اس نے کھولی کا دروازہ بند کر کے مجھ سے کہا، ”بیٹھ جاؤ!“ میں بیٹھ گیا تو اس نے میرے پاس آ کر کہا، ”دیکھو میں جانتی ہوں تم کیا چاہتے ہو۔ لیکن جب تک گردھاری زندہ ہے، تمہاری مراد پوری نہیں ہو سکتی۔“

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے پاس دیکھ کر میرا خون گرم ہو گیا تھا۔ کپٹیاں ٹھک ٹھک کر رہی تھیں۔ کم بجنت نے آج بھی بدن پر تیل ملا ہوا تھا اور وہی پتلی دھوتی پینی ہوئی تھی۔ میں نے اسے بازوؤں سے کپڑا اور دبا کر کہا، ”مجھے کچھ معلوم نہیں۔ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ اف! اس کے بازوؤں کے پٹھے کس قدر سخت تھے۔۔۔ عرض کرتا ہوں۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ وہ کس قسم کی عورت تھی۔

خیر، آپ داستان سنئے۔

میں اور زیادہ گرم ہو گیا اور اسے اپنے ساتھ چمٹالیا، ”گردھاری جائے جہنم میں۔۔۔ تمہیں میری بنتا ہو گا۔“

رکمانے مجھے اپنے جسم سے الگ کیا اور کہا، ”دیکھو تیل لگ جائے گا۔“ میں نے کہا، ”لگنے دو۔“ اور پھر اسے اپنے سینے کے ساتھ بھیجن لیا۔۔۔ یقین مانیے اگر اس وقت آپ مارے کوڑوں کے میری پیٹھ کی چڑی ادھیڑ دیتے، تب بھی میں اسے علیحدہ نہ کرتا۔ لیکن کم بجنت نے ایسا پچکارا کہ جہاں اس نے مجھے پہلے بٹھایا تھا، خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم تھا وہ سوچ کیا رہی ہے۔ گردھاری سالا باہر ہے، ڈر کس بات کا ہے۔۔۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے رہانہ گیا تو میں نے اس سے کہا، ”رکما! ایسا اچھا موقع پھر کبھی نہیں ملے گا۔“

اس نے بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا کر مسکرا کر کہا، ”اس سے بھی اچھا موقع ملے گا۔۔۔ لیکن تم یہ بتاؤ جو کچھ میں کہوں گی کرو گے؟“ صاحب میرے سر پر توجہ سوار تھا۔ میں نے جوش میں آکر جواب دیا، ”تمہارے لیے میں بندراہ آدمی قتل کرنے کو تیار ہوں۔“ یہ سن کر وہ مسکرائی، ”مجھے وشwas ہے۔“ خدا کی قسم ایک بار پھر میری روح لرز گئی۔ لیکن میں نے سوچا شاید زیادہ جوش آنے پر ایسا ہوا ہے۔

بس وہاں میں تھوڑی دیر اور بیٹھا، پیار اور محبت کی باتیں کیں، اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے بھیجے کھائے اور چپکے سے باہر نکل آیا۔ گووہ سلسلہ نہ ہوا، لیکن صاحب ایسے سلسے پہلے ہی دن تھوڑے ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا، پھر سہی! دس دن گزر گئے۔ ٹھیک گیا رہ ہویں دن، رات کے دو بجے ہاں دو ہی کا عمل تھا۔۔۔ کسی نے مجھے آہستہ سے جگایا۔ میں نیچے سیڑھیوں کے پاس جو جگہ ہے نا، وہاں سوتا ہوں۔

آنکھیں کھول کر میں نے دیکھا۔ ارے رکما بائی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا، ”کیا ہے؟“ اس نے ہو لے کہا، ”آؤ میرے ساتھ۔۔۔“ میں نگے پاؤں اس کے ساتھ ہولیا۔ میں نے اور کچھ نہ سوچا اور وہیں کھڑے کھڑے اس کو سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ اس نے میرے کان میں کہا، ”ابھی ٹھہر وو۔“ پھر مت روشن کی، میری آنکھیں چند ہیساں گئیں۔

تحوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ سامنے چٹائی پر کوئی سورہا ہے۔ منہ پر کپڑا ہے۔ میں نے اشارے سے پوچھا، ”یہ کیا؟“ رکمانے کہا، ”بیٹھ جاؤ۔“ میں الوکی طرح بیٹھ گیا۔ وہ میرے پاس آئی اور بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر اس نے ایسی بات کہی جس کو سن کر میرے او سان خطا ہو گئے۔۔۔ بالکل برف ہو گیا۔ صاحب۔۔۔ کاٹو تو ہو نہیں بدن میں۔۔۔ جانتے ہیں رکمانے مجھ سے کیا کہا۔۔۔

پڑھیے کلمہ !الا اللہ محمد رسول اللہ۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی عورت نہیں دیکھی۔۔۔ کم بخت نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا، ”میں نے گردھاری کو مار ڈالا ہے۔“ آپ یقین کیجیے، اس نے اپنے ہاتھوں سے ایک ہٹنے کٹے آدمی کو قتل کیا تھا۔۔۔ کیا عورت تھی صاحب۔۔۔ مجھے جب بھی وہ رات یاد آتی ہے، قسم خداوند پاک کی رو گٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس نے مجھے وہ چیز دکھائی جس سے اس ظالم نے گردھاری کا گلا گھونٹا تھا۔ بغلی کے تاروں کی گندھی ہوئی ایک مضبوط رسمی تھی۔ لکڑی پھنسا کر اس نے زور سے کچھ ایسے پیچ دیے تھے کہ بے چارے کی زبان اور آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔۔۔ کہتی تھی بس یوں چلتیوں میں کام تمام ہو گیا تھا۔

کپڑا اٹھا کر جب اس نے گردھاری کی شکل دکھائی تو میری ہڈیاں تک برف ہو گئیں۔ لیکن وہ عورت جانے کیا تھی۔ وہیں لاش کے سامنے اس نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ قرآن کی قسم! میرا خیال تھا کہ ساری عمر کے لیے نامرد ہو گیا ہوں۔ مگر صاحب! جب اس کا گرم گرم پنڈا میرے بدن کے ساتھ لگا اور اس نے ایک عجیب و غریب قسم کا پیار کیا تو اللہ جانتا ہے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ زندگی بھر وہ رات مجھے یاد رہے گی۔۔۔ سامنے لاش پڑی تھی لیکن رکما اور میں دونوں اس سے غافل ایک دوسرے کے اندر دھنسے ہوئے تھے۔

صحیح ہوئی تو ہم دونوں نے مل کر گردھاری کی لاش کے تین ٹکڑے کیے، اوزار اس کے موجود تھے، اس لیے زیادہ تکلیف نہ ہوئی۔ ٹھک ٹھک کافی ہوئی تھی پر لوگوں نے سمجھا ہو گا گردھاری کھلونے بنارہا ہے۔۔۔ آپ پوچھیں گے بندہ خدا تم نے ایسے گھناؤنے کام میں کیوں حصہ لیا۔ پولیس میں رپٹ کیوں نہ لکھوائی۔۔۔ صاحب، عرض یہ ہے کہ اس کم بخت نے مجھے ایک ہی رات میں اپنا غلام بنالیا تھا۔ اگر وہ مجھ سے کہتی تو شاید میں نے پندرہ آدمیوں کا خون بھی کرہی دیا ہوتا۔ یاد ہے نا! میں نے ایک دفعہ اس سے جوش میں آکر کیا کہا تھا۔

اب مصیبت یہ تھی کہ لاش کو ٹھکانے کیسے لگایا جائے۔ رکما کچھ بھی ہو، آخر عورت ذات تھی۔ میں نے اس سے کہا، جان من! تم کچھ فکرنا کرو۔ فی الحال ان ٹکڑوں کو ٹرنک میں بند کر دیتے ہیں۔ جب رات آئے گی تو میں اٹھا کر لے جاؤں گا۔ اب خدا کا کرنا ایسا ہوا صاحب کہ اس روز ہلڑ ہوا۔ پانچ چھ علاقوں میں خوب مارا ماری ہوئی۔ گورنمنٹ نے چھتیں گھٹنے کا کرفیو لگادیا۔ میں نے کہا عبد الکریم! کچھ بھی ہو، لاش آج ہی ٹھکانے لگا دو۔۔۔ چنانچہ دو بجے اٹھا۔۔۔ اوپر سے ٹرنک لیا۔ خدا کی پناہ! کتنا وزن تھا۔ مجھے ڈر تھا ستے میں کوئی پیلی پگڑی والا ضرور ملے گا اور کرفیو آرڈر کی خلاف ورزی میں دھر لے گا۔ مگر صاحب، جسے اللہ رکھے اسے کون چھے۔ جس بازار سے گزر، اس میں سناتا تھا۔ ایک جگہ۔۔۔ بازار کے پاس مجھے ایک چھوٹی سی مسجد نظر آئی۔ میں نے ٹرنک کھولا اور لاش کے ٹکڑے نکال کر اندر ڈیوٹ ہی میں ڈال دیے اور واپس چلا آیا۔

قربان اس کی قدرت کے، صحیح پتہ چلا کہ ہندوؤں نے اس مسجد کو آگ لگادی۔ میر اخیال ہے گردھاری اس کے ساتھ ہی جل کر راکھ ہو گیا ہو گا۔ کیونکہ اخباروں میں کسی لاش کا ذکر نہیں تھا۔ اب صاحب، بقول شخصے میدان خالی تھا۔ میں نے رکما سے کہا چالی میں مشہور کردو کہ گردھاری باہر کام گیا ہے۔ میں رات کو دو ڈھانی بجے آ جایا کروں گا اور عیش کیا کریں گے۔۔۔ مگر اس نے کہا نہیں عبد، اتنی جلدی نہیں۔ ابھی ہم کو کم از کم پندرہ بیس روز تک نہیں ملنا چاہیے۔ بات معقول تھی، اس لیے میں خاموش رہا۔

ستہ روز گزر گئے۔۔۔ کئی بار ڈراؤ نے خوابوں میں گردھاری آیا۔ لیکن میں نے کہا۔۔۔ سالے مرکھ پچکا ہے۔ اب میر اکیا بگڑ سکتا ہے۔ اٹھا رہویں روز صاحب، میں اسی طرح سیڑھیوں کے پاس چارپائی پر سورہ تھا کہ رکمارات کے بارہ۔۔۔ بارہ نہیں تو ایک ہو گا، آئی اور مجھے اوپر لے گئی۔

چٹائی پر ننگی لیٹ کر اس نے مجھ سے کہا، ”عبدل میر ابدن دکھ رہا ہے، ذرا چپی کر دو۔ میں نے فوراً تیل لیا اور مالش کرنے لگا لیکن آدھے گھٹے میں ہی ہانپنے لگا۔ میرے سینے کی کئی بوندیں اس کے چکنے بدن پر گریں۔ لیکن اس نے یہ نہ کہا، بس کر عبد۔ تم تھک گئے ہو۔ آخر مجھے ہی کہنا پڑا، ”رکما بھئی، اب خلاص۔۔۔“ وہ مسکرائی۔۔۔ میرے خدا کیا مسکراہٹ تھی۔ تھوڑی دیر دم لینے کے بعد میں چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اٹھ کر تی بجھائی اور میرے ساتھ لیٹ گئی۔ چپی کر کر کے میں اس قدر تھک گیا تھا کہ کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ رکما کے سینے پر ہاتھ رکھا اور سو گیا۔

جانے کیا بات تھا۔ میں ایک دم ہڑپڑا کے اٹھا۔ گردن میں کوئی سخت سخت سی چیز دھنس رہی تھی۔ فوراً مجھے اس تار والی رسی کا خیال آیا لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر سکوں، رکما میری چھاتی پر چڑھ بیٹھی۔ ایک دوایسے مرڈے دیے کہ میری گردن کر کر کر بول اٹھی۔ میں نے شور مچنا چاہا، لیکن آواز میرے پیٹ میں رہی۔ اس کے بعد میں بے ہوش ہو گیا۔

میرا خیال ہے چار بجے ہوں گے۔ آہستہ آہستہ مجھے ہوش آنا شروع ہوا۔ گردن میں بہت زور کا درد تھا۔ میں ویسے ہی دم سادھے پڑا رہا اور ہولے ہولے ہاتھ سے رسی کے مرڈے کھولنے شروع کیے۔۔۔ ایک دم آوازیں آنے لگیں۔ میں نے سانس روک لیا۔ کمرے میں گھپ اندر ہیرا تھا۔ آنکھیں چھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی پر کچھ نظر نہ آیا۔ جو آوازیں آرہی تھیں، ان سے معلوم ہوتا تھا دو آدمی کشتی لڑ رہے ہیں۔ رکما ہانپر رہی تھی۔۔۔ ہانپتے ہانپتے اس نے کہا، ”تکرام! تی جلا دو۔“ تکرام نے ڈرتے ہوئے لبھ میں کہا، ”نہیں نہیں، رکما نہیں۔۔۔“ رکما بولی۔۔۔ بڑے ڈرپوک ہو۔۔۔ صح اس کے تین ٹکڑے کر کے لے جاؤ گے کیسے؟“

میرا بدن بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔ تکرام نے کیا جواب دیا۔ رکمانے پھر کیا کہا۔ اس کا مجھے کچھ ہوش نہیں۔ پتہ نہیں کہ ایک دم روشنی ہوئی اور میں آنکھیں جھپکتا اٹھ بیٹھا۔ تکرام کے منہ سے زور کی چیز نکلی اور وہ دروازہ کھول کر بھاگ گیا۔ رکمانے جلدی سے کواڑ بند کیے اور کنڈی چڑھا دی۔۔۔ صاحب میں آپ سے کیا بیان کروں، میری حالت کیا تھی۔ آنکھیں کھلی تھیں۔ دیکھ رہا تھا، سن رہا تھا لیکن ہلنے کی بالکل سکت نہیں تھی۔ یہ تکرام میرے لیے کوئی نیا آدمی نہیں تھا۔ ہماری چالی میں اکثر آم بیچنے آیا کرتا تھا۔ رکمانے اس کو کیسے پھنسایا، اس کا مجھے علم نہیں۔

رکما میری طرف گھور گھور کے دیکھ رہی تھی جیسے اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں۔ وہ مجھے مار چکی تھی۔ لیکن میں اس کے سامنے زندہ بیٹھا تھا۔ خیر وہ مجھ پر جھپٹنے کو تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور بہت سے آدمیوں کی آوازیں آئیں۔ رکمانے جھٹ سے میرا بازو پکڑا اور گھسیٹ کر مجھے غسل خانے کے اندر ڈال دیا۔ اس کے بعد اس نے دروازہ کھولا، پڑوس کے آدمی تھے۔

انھوں نے رکما سے پوچھا، ”نیمیریت ہے۔ ابھی ابھی ہم نے چیز کی آواز سنی تھی۔“ رکمانے جواب دیا، ”نیمیریت ہے۔ مجھے سوتے میں چلنے کی عادت ہے۔۔۔ دروازہ کھول کر باہر نکلی تو دیوار کے ساتھ ٹکرائی اور ڈر کر منہ سے چیز نکل گئی۔“ پڑوس کے آدمی یہ سن کر چلے گئے۔ رکما نے کواڑ بند کیے اور کنڈی چڑھا دی۔ اب مجھے اپنی جان کی فکر ہوئی۔۔۔ آپ یقین مانیے، یہ سوچ کر کہ وہ ظالم مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی، ایک دم میرے اندر مقابلے کی بے پناہ طاقت آگئی۔ بلکہ میں نے ارادہ کر لیا کہ رکما کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔

غسل خانے سے باہر نکلا تو دیکھا کہ وہ بڑی کھڑکی کے پٹ کھولے باہر جھاٹک رہی ہے۔ میں ایک دم لپکا۔ چوتھوں پر سے اوپر اٹھایا اور باہر دھکیل دیا۔ یہ سب یوں چٹکیوں میں ہوا۔ دھپ سی آواز آئی اور میں دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ ساری رات میں چار پائی پر لیٹا اپنی گردن پر جو بہت بری طرح زخمی ہو رہی تھی۔۔۔ آپ نشان دیکھ سکتے ہیں۔۔۔ تیل مل کر سوچتا رہا کہ کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔۔۔ اس نے پڑوسیوں سے کہا تھا کہ اسے سوتے میں چلنے کی عادت ہے۔

مکان کے اس طرف جہاں میں نے اسے گرایا تھا جب اس کی لاش دیکھی جائے گی تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ سوتے میں چلی ہے اور کھڑکی سے باہر گر پڑی ہے۔۔۔ خدا خدا کر کے صح ہوئی۔ گردن پر میں نے رومال باندھ لیا تاکہ زخم دکھائی نہ دیں۔ نونج گئے، بارہ ہو گئے، مگر رکما کی لاش کی کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ جدھر میں نے اس کو گرایا تھا، ایک تنگ گلی ہے۔ دو بلڈنگوں کے درمیان دو طرف دروازے ہیں تاکہ لوگ اندر داخل ہو کر پیشتاب پاخانہ نہ کریں۔ پھر بھی دو بلڈنگوں کی کھڑکیوں میں سے پہنچنا ہوا کچرا کافی جمع ہوتا ہے جو ہر روز صح سویرے بھگن اٹھا کر لے جاتی ہے۔ میں نے سوچا شاید بھگن نہیں آئی، آئی ہوتی تو اس نے دروازہ کھولتے ہی رکما کی لاش دیکھی ہوتی اور شور برپا کر دیا ہوتا۔

قصہ کیا تھا! میں چاہتا تھا کہ لوگوں کو جلد اس بات کا پتہ چل جائے۔ دونج گئے تو میں نے جی کڑا کر کے خود ہی دروازہ کھولا۔ لاش تھی نہ کچرا۔ یا مظہر الحجاب! رکما گئی کہاں۔۔۔ قرآن کی قسم کھا کر کہتا ہوں مجھے اس پھانسی کے پھندے سے نیچ نکلنے کا اتنا تعجب نہیں ہو گا جتنا کہ رکما کے غائب ہونے کا ہے۔ تیسری منزل سے میں نے اسے گرایا تھا، پھر وہ فرش پر۔ پچی کیسے ہو گی۔۔۔ لیکن پھر سوال ہے کہ اس کی لاش کون اٹھا کر لے گیا۔ عقل نہیں مانتی، لیکن صاحب کچھ پتہ نہیں وہ ڈائی زندہ ہو۔۔۔ چالی میں تو یہی مشہور ہے کہ یا تو کسی مسلمان نے گھر ڈال لیا ہے یا مر ڈالا ہے۔۔۔ واللہ اعلم باصواب۔۔۔ مر ڈالا ہے تو اچھا کیا ہے۔ گھر ڈال لیا ہے تو جو حشر اس غریب کا ہو گا آپ جانتے ہی ہیں۔۔۔ خدا بچائے صاحب۔

اب تکارام کی بات سننے۔ اس واقعے کے ٹھیک میں روز بعد وہ مجھ سے ملا اور پوچھنے لگا، ”بتاؤ! رکما کہاں ہے؟“ میں نے کہا، ”مجھے کچھ علم نہیں۔“ کہنے لگا، ”نہیں، تم جانتے ہو۔۔۔“ میں نے جواب دیا، ”بھائی قرآن مجید کی قسم! مجھے کچھ معلوم نہیں۔۔۔“ بولا ”نہیں، تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم نے اسے مار ڈالا ہے۔ میں پولیس میں رپٹ لکھوانے والا ہوں کہ پہلے تم نے گردھاری کو مارا پھر رکما کو۔“ یہ کہہ کروہ تو چلا گیا۔ لیکن صاحب میرے پسینے چھوٹ گئے۔ بہت دیر تک کچھ سمجھ میں نہ آیا کیا کروں۔ ایک ہی بات سو جھی کہ اس کو ٹھکانے لگادوں۔۔۔ آپ ہی سوچیے اس کے علاوہ اور علاج بھی کیا تھا۔ چنانچہ صاحب اسی وقت چھپ کر چھری تیز کی اور تکارام کو ٹھونڈنے نکل پڑا۔

اتفاق کی بات ہے، شام کو چھ بجے وہ مجھے اسٹریٹ کے ناکے پر موڑتی کے پاس مل گیا۔ موسیمیوں کی خالی ٹوکری باہر رکھ کر وہ پیشتاب کرنے کے لیے اندر گیا۔ میں بھی لپک کر اس کے پیچھے۔ دھوتی کھول ہی رہا تھا کہ میں نے زور سے پکارا، ”تکارام---!“ پلٹ کر اس نے میری طرف دیکھا۔ چھری میرے ہاتھ ہی میں تھی۔ ایک دم اس کے پیٹ میں بھونک دی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی باہر نکلتی ہوئی انتڑیاں تھامیں اور دوہر اہو کر گر پڑا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ باہر نکل کر ندو گیارہ ہو جاتا مگر بے وقوفی دیکھیے، بیٹھ کر اس کی نبض دیکھنے لگا کہ آیا مرد ہے یا نہیں۔ میں نے اتنا سنا تھا کہ نبض ہوتی ہے، انگوٹھے کی طرف یادوسری طرف، یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ چنانچہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے دیر لگ گئی۔ اتنے میں ایک کاشمیل پتلوں کے ٹین کھولتے کھولتے اندر آیا اور میں دھر لیا گیا۔ بس صاحب یہ ہے پوری داستان--- پڑھیے کلمہ، لا
الله الا اللہ محمد رسول اللہ! جو میں نے رتی بھر بھی جھوٹ بولا ہو۔

-[107]-

قاسم: سعادت حسن منتو

باور پی خانہ کی مت میلی فضائیں بھی کا اندازہ سابلب کمزور روشنی پھیلارہا تھا۔ اسٹوپر پانی سے بھری ہوئی کیتیلی دھری تھی۔ پانی کا کھولا ڈا اور اسٹوپ کے حلق سے نکتے ہوئے شعلے مل جل کر مسلسل شور برپا کر رہے تھے۔ انگیٹھیوں میں آگ کی آخری چنگاریاں را کھی میں سو گئی تھیں۔ دور کونے میں قاسم، گیارہ برس کا لڑکا برتن مانجھنے میں مصروف تھا۔ یہ ریلوے انسپکٹر صاحب کا بوائے تھا۔

برتن صاف کرتے وقت یہ لڑکا کچھ گنگنا رہا تھا۔ یہ الفاظ ایسے تھے جو اس کی زبان سے بغیر کسی کوشش کے نکل رہے تھے، ”جی آیا صاحب! جی آیا صاحب---!“ بس ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب۔ ”ابھی برتوں کو راکھ سے صاف کرنے کے بعد انھیں پانی سے دھو کر قرینے سے رکھنا بھی تھا۔ اور یہ کام جلدی سے نہ ہو سکتا تھا۔ لڑکے کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ سر سخت بھاری ہو رہا تھا مگر کام کیے بغیر آرام--- یہ کیونکر ممکن تھا۔

اسٹوپ بدستور ایک شور کے ساتھ نیلے شعلوں کو اپنے حلق سے اگل رہا تھا۔ کیتیلی کا پانی اسی انداز میں کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔ دفتار لڑکے نے نیند کے ناقابل مغلوب حملے کو محسوس کر کے اپنے جسم کو ایک جنبش دی۔ اور ”جی آیا صاحب“، گنگنا تا پھر کام میں مشغول ہو گیا۔ دیوار گیروں پر چنے ہوئے برتن سوئے ہوئے تھے۔ پانی کے نل سے پانی کی بوندیں نیچ میلی سل پر ٹپک رہی تھیں اور اداس آواز پیدا کر رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا پر غنوڈگی سی طاری ہے۔ دفتار آواز بلند ہوئی۔

”قاسم---! قاسم---!”

”جی آیا صاحب!“ لڑکا انہی الفاظ کی گردان کر رہا تھا، بھاگا بھاگا اپنے آقا کے پاس گیا۔

انسپکٹر صاحب نے گرج کر کہا، ”بیو تو ف کے پچ آج پھر یہاں صراحی اور گلاس رکھنا بھول گیا ہے۔“

”ابھی لا یا صاحب---۔۔۔ ابھی لا یا صاحب۔“

کمرے میں صراحی اور گلاس رکھنے کے بعد وہ ابھی بر تن صاف کرنے کے لیے گیا ہی تھا کہ پھر اسی کمرے سے آواز آئی۔

”قاسم--- قاسم!“

”جی آیا صاحب!“ قاسم بھاگتا ہوا پھر اپنے آقا کے پاس گیا۔

”بمبئی کا پانی کس قدر خراب ہے۔۔۔ جاؤ پارسی کے ہوٹل سے سوڈا لے کر آؤ۔۔۔ بس بھاگے جاؤ۔ سخت پیاس لگ رہی ہے۔“

”بہت اچھا صاحب۔“

قاسم بھاگا بھاگا گیا اور پارسی کے ہوٹل سے، جو گھر سے قریباً نصف میل کے فاصلے پر تھا، سوڈے کی بوٹل لے آیا اور اپنے آقا کو گلاس میں ڈال کر دے دی۔

”اب تم جاؤ۔ مگر اس وقت تک کیا کر رہے ہو؟ بر تن صاف نہیں ہوئے کیا؟“

”ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب!“

”برتن صاف کرنے کے بعد میرے دونوں کالے شوپاٹش کر دینا۔ مگر دیکھنا احتیاط رہے۔ چڑھے پر کوئی خراش نہ آئے۔ ورنہ۔۔۔“ قاسم کو ”ورنہ“ کے بعد کا جملہ بخوبی معلوم تھا۔ ”بہت اچھا صاحب“ کہہ کروہ باور پی خانہ میں چلا گیا اور برتن صاف کرنے شروع کر دیے۔ اب نیند اس کی آنکھوں میں سمٹی چلی آرہی تھی۔ پلکیں آپس میں ملی جا رہی تھیں، سر میں پگھلا ہوا سیسہ اتر رہا تھا۔۔۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ صاحب کے بوٹ بھی ابھی پالش کرنے ہیں، قاسم نے اپنے سر کو زور سے جنبش دی اور وہی راگ الائپا نا شروع کر دیا۔

”جی آیا صاحب۔ جی آیا صاحب! بوٹ صاف ہو جاتے ہیں صاحب۔“

مگر نیند کا طوفان ہزار بند باندھنے پر بھی نہ رکا۔ اب اسے محسوس ہوا کہ نیند ضرور غلبہ پا کے رہے گی۔ پر ابھی برتنوں کو دھو کر انھیں اپنی جگہ پر رکھنا باقی تھا۔ جب اس نے یہ سوچا تو ایک عجیب و غریب خیال اس کے دماغ میں آیا، ”بھاڑ میں جائیں برتن اور چوڑھے میں جائیں شو۔۔۔ کیوں نہ تھوڑی دیر اسی جگہ سو جاؤں اور پھر چند لمحہ آرام کرنے کے بعد۔۔۔“ اس خیال کو باغیانہ تصور کر کے قاسم نے ترک کر دیا۔ اور برتنوں پر جلدی جلدی راکھ ملنا شروع کر دی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب نیند پھر غالباً آئی تو اس کے جی میں آئی کہ البتا ہو اپنی اپنے سر پر انڈھیلے۔ اور اس طرح اس غیر مرئی طاقت سے جو اس کام میں حارج ہو رہی تھی نجات پا جائے۔۔۔ مگر پانی اتنا گرم تھا کہ اس کے بھیجے تک کو پھلا دیتا۔ چنانچہ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار مار کر اس نے باقی ماندہ برتن صاف کیے۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب وہ آرام سے سوکلتا تھا اور نیند۔۔۔ وہ نیند، جس کے لیے اس کی آنکھیں اور دماغ اس شدت سے انتظار کر رہے تھے اب بالکل نزدیک تھی۔

باور پی خانے کی روشنی گل کرنے کے بعد قاسم نے باہر برآمدے میں اپنا بستہ بچھالیا اور لیٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ نیند اسے اپنے نرم نرم بازوؤں میں تھام لے اس کے کان ”شوشو“ کی آواز سے گونج اٹھے۔ ”بہت اچھا صاحب۔ ابھی پالش کرتا ہوں۔“ قاسم ہڑ بڑا کے اٹھ بیٹھا۔ ابھی قاسم شو کا ایک پیور بھی اچھی طرح پالش کرنے نہ پایا تھا کہ نیند کے غلبہ نے اسے وہیں سلا دیا۔ سورج کی لال لال کر نیں مکان کے شیشوں سے نمودار ہوئیں۔ مگر قاسم سویار ہا۔

جب انسپکٹر صاحب نے اپنے نوکر کو باہر برآمدے میں اپنے کالے جوتوں کے پاس سویادیکھا تو اسے ٹھوکر مار کے جگاتے ہوئے کہا، ”یہ سور کی طرح یہاں بے ہوش پڑا ہے اور مجھے خیال تھا کہ اس نے شو صاف کر لیے ہوں گے۔ ”نمک حرام!۔۔۔ ابے قاسم!“

”جی آیا صاحب!“ قاسم فوراً اٹھ بیٹھا۔ ہاتھ میں جب اس نے پالش کرنے کا برش دیکھا اور رات کے اندر ہیرے کی بجائے دن کی روشنی دیکھی تو اس کی جان خطا ہو گئی۔ ”میں سو گیا تھا صاحب! مگر۔۔۔ مگر شوا بھی پالش ہو جاتے ہیں صاحب۔“ یہ کہہ کر اس نے جلدی جلدی پالش کرنا شروع کر دیا۔ پالش کرنے کے بعد اس نے اپنا بستر بند کیا اور اسے اوپر کے کمرے میں رکھنے چلا گیا۔

”قاسم!“

”جی آیا صاحب!“

قاسم بجا گا ہوا نیچے آیا۔ اور اپنے آقا کے پاس کھڑا ہو گیا۔

”دیکھو، آج ہمارے یہاں مہمان آئیں گے، اس لیے باورچی خانہ کے تمام برتن اچھی طرح صاف کر رکھنا۔ فرش دھلا ہوا ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ تمہیں ڈرائیور میزیں اور کرسیاں بھی صاف کرنا ہوں گی۔۔۔ سمجھے۔۔۔ خیال رہے میری میز پر ایک تیز دھار والا چاقو پڑا ہے، اسے مت چھیڑنا! میں اب دفتر جا رہوں۔ مگر یہ کام دو گھنٹے سے پہلے پہلے ہو جائے۔“

”بہت بہتر صاحب۔“

انسپکٹر صاحب دفتر چلے گئے۔ قاسم باورچی خانہ صاف کرنے میں مشغول ہو گیا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی انٹکھ مختت کے بعد اس نے باورچی خانہ کا سارا کام ختم کر دیا۔ اور ہاتھ پاؤں صاف کرنے کے بعد جھاڑاں لے کر ڈرائیور میں چلا گیا۔ وہ ابھی کرسیوں کو جھاڑاں سے صاف کر رہا تھا کہ اس کے تھکے ہوئے دماغ میں ایک تصویر سی کھنگ گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کے گرد برتن ہی برتن پڑے ہیں اور پاس ہی راکھ کا ایک ڈھیر لگ رہا ہے۔ ہوا زور دل پر چل رہی ہے جس سے وہ راکھ اڑا کر فضا کو خاکستری بناتی ہے۔ یا کیا اس ظلمت میں ایک سرخ آفتاب نمودار ہوا جس کی کرنیں سرخ بر چھیوں کی طرح ہر برتن کے سینے میں کھس گئیں۔ زمین خون سے شرابور ہو گئی۔

قاسم دہشت زده ہو گیا، اور اس وحشت ناک تصور کو دماغ سے جھٹک کر ”جی آیا صاحب، جی آیا صاحب“ کہتا پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے تصور میں ایک اور منظر رقص کرنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے آپس میں کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔

دفعتاً آندھی چلنے لگی جس کے ساتھ ہی ایک بد نما اور بھینک دیو نمودار ہوا۔ یہ دیوان سب لڑکوں کو نگل گیا۔ قاسم نے خیال کیا کہ وہ دیواس کے آقا کے ہم شکل تھا۔ گو کہ قد و قامت کے لحاظ سے وہ اس سے کہیں بڑا تھا۔ اب اس دیو نے زور زور سے ڈکارنا شروع کیا۔ قاسم سر سے پیر تک لرز گیا۔

ابھی تمام کمرہ صاف کرنا تھا۔ اور وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ چنانچہ قاسم نے جلدی کر سیوں پر جھاڑن مارنا شروع کیا۔ کر سیوں کا کام ختم کرنے کے بعد وہ میز صاف کرنے کے لیے بڑھا تو اسے خیال آیا، ”آج مہمان آ رہے ہیں۔ خدا معلوم کتنے بر تن صاف کرنا پڑیں گے۔ نیند کم بخت پھر ستائے گی۔ مجھ سے تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔۔۔“

وہ یہ سوچ رہا تھا اور میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو پوچھ رہا تھا۔ اچانک اسے قلمدان کے پاس ایک کھلا ہوا چاقو نظر آیا۔۔۔ وہی چاقو جس کے متعلق اس کے آقا نے کہا تھا بہت تیز ہے، چاقو کا دیکھنا تھا کہ اس کی زبان پر یہ لفظ خود بخود جاری ہو گئے، ”چاقو، تیز دھار چاقو! یہی تمہاری مصیبت ختم کر سکتا ہے۔“ کچھ اور سوچ بغیر قاسم نے تیز دھار چاقو اٹھا کے اپنی انگلی پر پھیر لیا۔ اب وہ شام کو بر تن صاف کرنے کی زحمت سے بہت دور تھا اور نیند۔۔۔ پیاری پیاری نیند اسے بآسانی نصیب ہو سکتی تھی۔ انگلی سے خون کی سرخ دھار بہہ رہی تھی۔ سامنے والی دوات کی سرخ روشنائی سے کہیں چمکیلی۔ قاسم اس خون کی دھار کو مسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اور منہ میں گنگنا رہا تھا، ”نیند، نیند۔۔۔ پیاری نیند۔“

تحوڑی دیر بعد وہ بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا جوز نان خانہ میں پیٹھی سلائی کر رہی تھی اور اپنی انگلی دکھا کر کہنے لگا، ”دیکھیے بی بی جی!“

”ارے قاسم یہ تو نے کیا کیا۔۔۔ کم بخت، صاحب کے چاقو کو چھپڑا ہو گا تو نے؟“

قاسم مسکرا دیا، ”لبی جی۔۔۔ بس میز صاف کر رہا تھا کہ اس نے کاٹ کھایا۔“

”سو را بہستا ہے، ادھر آ، میں اس پر کپڑا باندھ دوں۔۔۔ پر اب یہ تو بتا کہ آج یہ بر تن تیر ابا پ صاف کرے گا؟“

قاسم اپنی فتح پر جی ہی میں بہت خوش ہوا۔ انگلی پر پٹی بندھوا کر قاسم پھر کمرے میں چلا آیا۔ میز پر سے خون کے دھبے صاف کرنے کے بعد اس نے خوشی خوشی اپنا کام ختم کر دیا۔ سامنے طوٹے کا پنجھرہ لٹک رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر قاسم نے مسرت بھرے لجھے میں کہا، ”اب اس نمک حرام باور پچی کو برتن صاف کرنے ہوں گے۔۔۔ اور ضرور صاف کرنے ہوں گے۔۔۔ کیوں میاں مٹھو؟“ شام کے وقت مہمان آئے اور چلے گئے۔ باور پچی خانہ میں جھوٹے برتوں کا ایک طومار سالگ گیا۔ انسپکٹر صاحب قاسم کی انگلی دیکھ کر بہت برسے اور جی کھول کر اسے گالیاں دیں۔ مگر اسے مجبور نہ کر سکے۔۔۔ شاید اس وجہ سے کہ ایک بار ان کی اپنی انگلی میں قلم تراش چبھ جانے سے بہت درد ہوا تھا۔

آقا کی نیگلی آنے والی مسرت نے بھلا دی اور قاسم کو دتا پھاندتا اپنے بستر پر جالیٹا۔ تین چار روز تک وہ برتن صاف کرنے کی زحمت سے بچا رہا مگر اس کے بعد انگلی کا زخم بھر آیا۔۔۔ اب وہی مصیبت پھر نمودار ہو گئی۔

”قاسم۔۔۔ صاحب کی جرائیں اور قیصیں دھوڈا لو۔“

”بہت اچھا بی بی جی۔“

”قاسم اس کمرے کا فرش کتنا میلا ہو رہا ہے۔ پانی لا کر ابھی صاف کرو۔ دیکھنا کوئی داغ دھبہ باقی نہ رہے!“

”بہت اچھا صاحب۔“

”قاسم، شیشے کے گلاس کتنے چکنے ہو رہے ہیں، انھیں نمک سے ابھی ابھی صاف کرو۔“

”ابھی کرتا ہوں بی بی جی۔“

”قاسم، ابھی بھنگن آرہی ہے۔ تم پانی ڈالتے جانا۔ وہ سیڑھیاں دھوڈا لے گی۔“

”بہت اچھا صاحب۔“

”قاسم ذرا بھاگ کے ایک آنہ کا دھی تو لے آنا!“

”ابھی چلائی بی جی۔“

پانچ روز اس قسم کے احکام سننے میں گزر گئے۔ قاسم کام کی زیادتی اور آرام کے تھطسے تنگ آگیا۔ ہر روز اسے نصف شب تک کام کرنا پڑتا۔ پھر بھی علی الصباح چار بجے کے قریب بیدار ہو کر ناشتے کے لیے چائے تیار کرنا پڑتی۔ یہ کام قاسم کی عمر کے لڑکے کے لیے بہت زیادہ تھا۔

ایک روز انسپکٹر صاحب کی میز صاف کرتے وقت اس کا ہاتھ خود بخود چاقو کی طرف بڑھا۔ اور ایک لمحہ کے بعد اس کی انگلی سے خون بہنے لگا۔ انسپکٹر صاحب اور ان کی بیوی قاسم کی اس حرکت پر سخت خفا ہوئے۔ چنانچہ سزا کی صورت میں اسے شام کا کھانا دیا گیا۔ مگر قاسم خوش تھا۔۔۔ ایک وقت روئی نہ ملی۔ انگلی پر معمولی ساز خم آگیا۔ مگر برتوں کا انبار صاف کرنے سے تونجات مل گئی۔۔۔ یہ سودا کیا برائے؟

چند دنوں کے بعد اس کی انگلی کا زخم ٹھیک ہو گیا۔ اب پھر کام کی وہی بھرمار تھی۔ پندرہ بیس روز گدھوں کی سی مشقتوں میں گزر گئے۔ اس عرصہ میں قاسم نے بارہا رادہ کیا کہ چاقو سے پھر انگلی زخمی کر لے۔ مگر اب میز پر سے وہ چاقو اٹھالیا گیا تھا اور باورچی خانہ والی چھری کُنڈ تھی۔

ایک روز باورچی بیمار پڑ گیا۔ اب قاسم کو ہر وقت باورچی خانہ میں رہنا پڑا۔ کبھی مر چیں پیتا، کبھی آنا گوندھتا، کبھی کوئے سلاگتا، غرض صح سے لے کر شام تک اس کے کانوں میں ”ابے قاسم یہ کر! ابے قاسم وہ کر!“ کی صد اگو نجتی رہتی۔ باورچی دو روز تک نہ آیا۔۔۔ قاسم کی نجتی سی جان اور ہمت جواب دے گئی۔ مگر سوائے کام کے اور چارہ ہی کیا تھا۔

ایک روز انسپکٹر صاحب نے اسے الماری صاف کرنے کو کہا جس میں ادویات کی شیشیاں اور مختلف چیزیں پڑی تھیں۔ الماری صاف کرتے وقت اسے داڑھی موٹنے کا ایک بلیڈ نظر آیا۔ بلیڈ پکڑتے ہی اس نے اپنی انگلی پر پھیر لیا۔ دھار تھی بہت تیز، انگلی میں دور تک چل گئی۔ جس سے بہت بڑا زخم بن گیا۔۔۔

قاسم نے بہت کو شش کی کہ خون لکھنا بند ہو جائے مگر زخم کا منہ بڑا تھا۔ سیر و خون پانی کی طرح بہہ گیا۔ یہ دیکھ کر قاسم کا رنگ کا غذہ کی مانند سپید ہو گیا۔ بھاگا ہوا انسپکٹر صاحب کی بیوی کے پاس گیا۔۔۔

”بی بی جی، میری انگلی میں صاحب کا استر الگ گیا ہے۔“

جب انسپکٹر صاحب کی بیوی نے قاسم کی انگلی کو تیسری مرتبہ زخمی دیکھا تو فوراً معاملے کو سمجھ گئی۔ چپ چاپ اٹھی اور کپڑا انکال کر اس کی انگلی پر باندھ دیا اور کہا، ”قاسم! اب تم ہمارے گھر میں نہیں رہ سکتے۔“

”کیوں بی بی جی؟“

”یہ صاحب سے پوچھنا۔“

صاحب کا نام سنتے ہی قاسم کا رنگ اور پیلا پڑ گیا۔ چار بجے کے قریب انسپکٹر صاحب دفتر سے لوٹے اور اپنی بیوی سے قاسم کی نئی حرکت سن کر اسے فوراً اپنے پاس بلایا۔

”کیوں میاں! یہ انگلی ہر روز زخمی کرنے کیا معنی؟“

قاسم خاموش کھڑا رہا۔

”تم نوکر لوگ یہ سمجھتے ہو کہ ہم اندھے ہیں اور ہمیں بار بار دھوکا دیا جا سکتا ہے۔۔۔ اپنا بوریہ بستر دبا کرنا ک کی سیدھی میں یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ہمیں تم جیسے نوکروں کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ سمجھے۔۔۔!“

”مگر۔۔۔ مگر صاحب۔“

”صاحب کا بچہ۔۔۔ بھاگ جائیا سے، تیری بھایا تنوہ کا ایک بیسہ بھی نہیں دیا جائے گا۔۔۔ اب میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا۔۔۔“ قاسم کو افسوس نہ ہوا بلکہ اسے خوشی محسوس ہوئی کہ چلو کام سے کچھ دیر کے لیے چھٹی مل گئی۔ گھر سے نکل وہ اپنی زخی انگلی سے بے پرواںیدھا چوپائی پہنچا اور وہاں ساحل کے پاس ایک نیچ پر لیٹ گیا اور خوب سویا۔

چند دنوں کے بعد اس کی انگلی کا رخم بد احتیاطی کے باعث سیپیک ہو گیا۔ سارا ہاتھ سونج گیا۔ جس دوست کے پاس وہ ٹھہر اتحاں نے اپنی دانست کے مطابق اس کا بہتر علاج کیا مگر تکلیف بڑھتی گئی۔ آخر قاسم خیراتی ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ جہاں اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ اب جب کبھی قاسم اپنا کٹا ہوا ٹنڈہ منڈہ ہاتھ بڑھا کر فلورا فاؤ نٹین کے پاس لوگوں سے بھیک مانگتا ہے تو اسے وہ بلیڈ یاد آ جاتا ہے جس نے اسے بہت بڑی مصیبت سے نجات دلائی۔ اب وہ جس وقت چاہے سر کے نیچے اپنی گدڑی رکھ کر فٹ پا تھ پر سو سکتا ہے۔ اس کے پاس میں کا ایک چھوٹا سا بھکھا ہے جس کو کبھی نہیں مانجھتا، اس لیے کہ اسے انسپکٹر صاحب کے گھر کے وہ بر تن یاد آ جاتے ہیں جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔

-[108]-

چور: سعادت حسن مندو

مجھے بے شمار لوگوں کا قرض ادا کرنا تھا اور یہ سب شراب نوٹی کی بدولت تھا۔ رات کو جب میں سونے کے لیے چارپائی پر لیٹتا تو میرا ہر قرض خواہ میرے سرہانے موجود ہوتا۔۔۔ کہتے ہیں کہ شرابی کا ضمیر مرد ہو جاتا ہے، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے ساتھ میرے ضمیر کا معاملہ کچھ اور ہی تھا۔ وہ ہر روز مجھے سرزنش کرتا اور میں خفیف ہو کے رہ جاتا۔

واقعی میں نے بیسیوں آدمیوں سے قرض لیا تھا۔ میں نے ایک رات سونے سے پہلے بلکہ یوں کہیے کہ سونے کی ناکام کوشش کرنے سے پہلے حساب لگایا تو قریب ڈیڑھ ہزار روپے میرے ذمے نکلے۔ میں بہت پریشان ہوا۔ میں نے سوچا یہ ڈیڑھ ہزار روپے کیسے ادا ہوں گے۔ بیس پچیس روزانہ کی آمدن ہے لیکن وہ میری شراب کے لیے بمشکل کافی ہوتے ہیں۔

آپ یوں سمجھیے کہ ہر روز کی ایک بوٹل۔۔۔ تھر ڈکلاس رم کی۔۔۔ دام ملاحظہ ہوں۔۔۔ سولہ روپے تو ایک طرف رہے، ان کے حاصل کرنے میں کم از کم تین روپے ٹانگے پر صرف ہو جاتے تھے۔ کام ہوتا نہیں تھا، بس پیشگی پر گزارہ تھا۔ لیکن جب پیشگی دینے

والے تگ آگئے تو انہوں نے میری شکل دیکھتے ہی کوئی نہ کوئی بہانہ تراش لیا اس سے پیشتر کہ میں ان سے ملوں، کہیں غائب ہو گئے۔ آخر کب تک وہ مجھے پیشگی دیتے رہتے۔۔۔ لیکن میں مایوس نہ ہوتا اور خدا پر بھروسہ رکھ کر کسی نہ کسی حیلے سے دس پندرہ روپے ادھار لینے میں کامیاب ہو جاتا۔

مگر یہ سلسلہ کب تک جاری رہ سکتا تھا۔ لوگ میری عزت کرتے تھے مگر اب وہ میری شکل دیکھتے ہی بھاگ جاتے تھے۔۔۔ سب کو افسوس تھا کہ اتنا اچھا مکینک تباہ ہو رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بہت اچھا مکینک تھا۔ مجھے کوئی بگڑی مشین دے دی جاتی تو میں اس کو سرسری طور پر دیکھنے کے بعد یوں چکلیوں میں ٹھیک کر دیتا۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں میری یہ ذہانت صرف شراب ملنے کی امید پر قائم تھی، اس لیے کہ میں پہلے طے کر لیا کرتا تھا کہ اگر کام ٹھیک ہو گیا تو وہ مجھے اتنے روپے ادا کر دیں گے جن سے میرے دورو زکی شراب چل سکے۔

وہ لوگ خوش تھے۔ مجھے وہ تین روز کی شراب کے دام ادا کر دیتے۔ اس لیے کہ جو کام میں کر دیتا وہ کسی اور سے نہیں ہو سکتا تھا۔

لوگ مجھے لوٹ رہے تھے۔۔۔ میری ذہانت و ذکاؤت پر میری اجازت سے ڈاکے ڈال رہے تھے۔۔۔ اور لطف یہ ہے کہ میں سمجھتا تھا کہ میں انھیں لوٹ رہا ہوں۔۔۔ ان کی جیبوں پر ہاتھ صاف کر رہا ہوں۔۔۔ اصل میں مجھے اپنی صلاحیتوں کی کوئی قدر نہ تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ میکنزیم بالکل ایسی ہے جیسے کھانا کھانا کیا شراب پینا۔

میں نے جب بھی کوئی کام ہاتھ میں لیا مجھے کوفت محسوس نہیں ہوئی۔ البتہ اتنی بات ضرور تھی کہ جب شام کے چھ بجے لگتے تو میری طبیعت بے چین ہو جاتی۔ کام کامل ہو چکا ہو تا مگر میں ایک دو تیج غائب کر دیتا تا کہ دوسرے روز بھی آمدن کا سلسلہ قائم رہے۔۔۔ یہ شراب حرام زادی کتنی بری چیز ہے کہ آدمی کو بے ایمان بھی بنادیتی ہے۔

میں قریب قریب ہر روز کام کرتا تھا۔ میری مانگ بہت زیادہ تھی اس لیے کہ مجھے ایسا کاریگر ملک بھر میں نایاب تھا۔۔۔ تاربا جا اور راگ بو جھاؤ لا حساب تھا۔ میں مشین دیکھتے ہی سمجھ جاتا تھا کہ اس میں کیا قصور ہے۔

میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں، مشینری کتنی ہی بگڑی ہوئی کیوں نہ ہو، اس کو ٹھیک کرنے میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگنا چاہیے۔ لیکن اگر اس میں نئے پرزوں کی ضرورت ہو اور آسانی سے دستیاب نہ ہو رہے ہوں تو اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

میں بلاناغہ شراب پیتا تھا اور سوتے وقت بلاناغہ اپنے قرض کے متعلق سوچتا تھا، جو مجھے مختلف آدمیوں کو ادا کرنا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا عذاب تھا۔ پینے کے باوجود اضطراب کے باعث مجھے نیند نہ آتی۔۔۔ دماغ میں سیکڑوں اسکیمیں آتی تھیں۔ بس میری یہ خواہش تھی کہ کہیں سے دس ہزار روپے آجائیں تو میری جان میں جان آئے۔۔۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ قرض کافی الفور ادا کر دوں۔ ایک ٹیکسی لوں اور ہر قرض خواہ کے پاس جا کر معاذرت طلب کروں اور جیب سے روپے نکال کر ان کو دے دوں۔ جو روپے باقی بچیں ان سے ایک سینڈ بینڈ موڑ خرید لوں اور شراب پینا چھوڑ دوں۔

پھر یہ خیال آتا کہ نہیں دس ہزار سے کام نہیں چلے گا۔۔۔ کم از کم پچاس ہزار ہونے چاہیں۔۔۔ میں سوچنے لگتا کہ اگر اتنے روپے آجائیں، جو یقیناً آنے چاہیں تو سب سے پہلے میں ایک ہزار نادار لوگوں میں تقسیم کر دوں گا۔۔۔ ایسے لوگوں میں جو روپیہ لے کر کچھ کاروبار کر سکیں۔

باقی رہے انچاس ہزار۔۔۔ اس رقم میں سے میں نے دس ہزار اپنی بیوی کو دینے کا ارادہ کیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ فکسٹڈ پاٹ ہونا چاہیے۔۔۔ گیارہ ہزار ہوئے باقی رہے انتا لیس ہزار۔۔۔ میرے لیے بہت کافی تھے۔ میں نے سوچا، یہ میری زیادتی ہے۔ چنانچہ میں نے بیوی کا حصہ دو گنا کر دیا، یعنی بیس ہزار۔۔۔ اب بچے انتیس ہزار۔۔۔ میں نے سوچا کہ پندرہ ہزار اپنی بیوہ بہن کو دے دوں گا۔ اب میرے پاس چودہ ہزار رہے۔۔۔ ان میں سے آپ سمجھیے کہ دو ہزار قرض کے نکل گئے۔ باقی بچے بارہ ہزار۔۔۔ ایک ہزار روپے کی اچھی شراب آئی چاہیے۔۔۔ لیکن میں نے فوراً تھوکر دیا اور یہ سوچا کہ پہاڑ پر چلا جاؤں گا اور کم از کم چھ مہینے رہوں گا تاکہ صحت درست ہو جائے۔ شراب کے بجائے دودھ بیا کروں گا۔

بس ایسے ہی خیالات میں دن رات گزر رہے تھے۔۔۔ پچاس ہزار کہاں سے آئیں گے یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔۔۔ ویسے دو تین اسکیمیں ذہن میں تھیں۔ شمع دہلی کے معنے حل کروں اور پہلا انعام حاصل کرلوں۔۔۔ ڈربی کی لاٹری کا ٹکٹ خرید لوں۔۔۔ چوری کروں اور بڑی صفائی سے۔ میں فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے کون سا تم اٹھانا چاہیے۔ بہر حال یہ طے تھا کہ مجھے پچاس ہزار روپے حاصل کرنا ہیں۔۔۔ یوں میں یا ووں میں۔

اسکیمیں سوچ سوچ کر میر ادمان چکر آگیا۔۔۔ رات کو نیند نہیں آتی تھی، جو بہت بڑا عذاب تھا۔ قرض خواہ بے چارے تقاضا نہیں کرتے تھے لیکن جب ان کی شکل دیکھتا تو نہ امت کے مارے پسینہ پسینہ ہو جاتا۔۔۔ بعض اوقات تو میر انس رکنے لگتا اور میر اجی چاہتا کہ خود کشی کر لوں اور اس عذاب سے نجات پاؤں۔

مجھے معلوم نہیں کیسے اور کب میں نے تھیہ کر لیا کہ چوری کروں گا۔۔۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ مجھے کیسے معلوم ہوا کہ۔۔۔ محلے میں ایک بیوہ عورت رہتی ہے جس کے پاس بے اندازہ دولت ہے۔۔۔ اکیلی رہتی ہے۔۔۔ میں وہاں رات کے دو بجے پہنچا۔ یہ مجھے پہلے ہی معلوم ہو پکا تھا کہ وہ دوسری منزل پر رہتی ہے۔۔۔ نیچے پٹھان کا پھرہ تھا۔ میں نے سوچا کوئی اور ترکیب سوچنی چاہیے اور پر جانے کے لیے۔۔۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے خود کو اس پارسی لیڈی کے فلیٹ کے اندر پایا۔۔۔ میر اخیال ہے کہ میں پاپ کے ذریعے اوپر چڑھ گیا تھا۔

ٹارچ میرے پاس تھی۔۔۔ اس کی روشنی میں میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ ایک بہت بڑا سیف تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی سیف کھولا تھا نہ بند کیا تھا، لیکن اس وقت جانے مجھے کہاں سے ہدایت ملی کہ میں نے ایک معمولی تار سے اسے کھول ڈالا۔ اندر زیور ہی زیور تھے۔ بہت بیش قیمت۔۔۔ میں نے سب سیٹیں اور کے مدینے والے زردوں میں باندھ لیے۔۔۔ پچاس ساٹھ ہزار روپے کامال ہو گا۔۔۔ میں نے کہا ٹھیک ہے اتنا ہی چاہیے تھا کہ اچانک دوسرے کمرے سے ایک بڑھیا پارسی عورت نمودار ہوئی۔۔۔ اس کا چہرہ جھریلوں سے بھرا ہوا مجھے دیکھ کر پوپلی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ میں بہت جیران ہوا کہ یہ ماجرہ کیا ہے۔۔۔ میں نے اپنی جب سے بھرا ہوا پستول نکال کر تان لیا۔۔۔ اس کی پوپلی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اور زیادہ پھیل گئی۔ اس نے مجھ سے بڑے پیار سے پوچھا، ”آپ بیہاں کیسے آئے؟“

میں نے سیدھا ساجواب دیا، ”چوری کرنے۔“

”اوہ!“ بڑھیا کے چہرے کی جھریاں مسکرانے لگیں، ”تو بیٹھو۔۔۔ میرے گھر میں تو نقدی کی صورت میں صرف ڈیڑھ روپیہ ہے۔۔۔ تم نے زیور چرا یا ہے، لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم پکڑے جاؤ گے کیونکہ ان زیوروں کو صرف کوئی بڑا جو ہری ہی لے سکتا ہے۔۔۔ اور ہر بڑا جو ہری انھیں پہچانتا ہے۔۔۔“

یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔۔۔ میں بہت پریشان تھا کہ یا الہی یہ سلسلہ کیا ہے۔ میں نے چوری کی ہے اور بڑی بی مسکرا کر مجھ سے با تین کر رہی ہیں۔۔۔ کیوں؟

لیکن فوراً اس کیوں کا مطلب سمجھ میں آگیا جب ماتاجی نے آگے بڑھ کر میرے پستول کی پروانہ کرتے ہوئے میرے ہونٹوں کا بوسہ لے لیا اور اپنی بانخیں میری گردن میں ڈال دیں۔۔۔ اس وقت خدا کی قسم میرا جی چاہا کہ گھٹھری ایک طرف پھینکوں اور وہاں سے بھاگ جاؤ۔ مگر وہ تسمہ پا عورت نکلی، اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ میں مطلقاً جل نہ سکا۔۔۔ اصل میں میرے ہر رگ و ریشے میں ایک عجیب و غریب قسم کا خوف سراستہ کر گیا تھا۔ میں اسے ڈائنس سمجھنے لگا تھا جو میرا کلیجہ نکال کر کھانا چاہتی تھی۔

میری زندگی میں کسی عورت کا دخل نہیں تھا۔ میں غیر شادی شدہ تھا۔ میں نے اپنی زندگی کے تیس برسوں میں کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر پہلی رات جب کہ میں چوری کرنے کے لیے نکلا تو مجھے یہ پچھا کٹنی مل گئی جس نے مجھ سے عشق کرنا شروع کر دیا۔۔۔ آپ کی جان کی قسم! میرے ہوش و حواس غائب ہو گئے۔۔۔ وہ بہت ہی کریبہ المنظر تھی۔ میں نے اس سے ہاتھ جوڑ کر کہا، ”ماتا جی مجھے بکشو۔۔۔ یہ پڑے ہیں آپ کے زیور۔۔۔ مجھے اجازت دیجیے۔“

اس نے تحکمانہ لبھجے میں کہا، ”تم نہیں جا سکتے۔۔۔ تمہارا پستول میرے پاس ہے۔۔۔ اگر تم نے ذرا سی بھی جنبش کی تو میں ڈز کر دوں گی۔۔۔ یا ٹیلی فون کر کے پولیس کو اطلاع دے دوں گی کہ وہ آکر تمہیں گرفتار کر لے۔۔۔ لیکن جانِ من! میں ایسا نہیں کروں گی۔۔۔ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔۔۔ میں ابھی تک کنواری رہی ہوں۔۔۔ اب تم یہاں سے نہیں جا سکتے۔“

یہ سن کر فریب تھا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں کہ ٹن ٹن شروع ہوئی۔ دور کوئی کلاک صبح کے پانچ بجنتے کی اطلاع دے رہا تھا۔ میں نے بڑی بی کی ٹھوڑی پکڑی اور اس کے مر جھائے ہوئے ہونٹوں کا بوسہ لے کر جھوٹ بولتے ہوئے کہا، ”میں نے اپنی زندگی میں سیکڑوں عورتیں دیکھی ہیں، لیکن خدا واحد شاہد ہے کہ تم ایسی عورت سے میرا کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ تم کسی بھی مرد کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنی زندگی کی پہلی چوری تمہارے مکان سے شروع کی۔ یہ زیور پڑے ہیں۔ میں کل آؤں گا، بشرطیکہ تم وعدہ کرو کہ مکان میں اور کوئی نہیں ہو گا۔“

بڑھیا یہ سن کر بہت خوش ہوئی، ”ضرور آؤ۔۔۔ تم اگر چاہو گے تو گھر میں ایک مچھر تک بھی نہیں ہو گا جو تمہارے کانوں کو تکلیف دے۔۔۔ مجھے افسوس ہے کہ گھر میں صرف ایک روپیہ اور آٹھ آنے تھے۔۔۔ کل تم آؤ گے تو میں تمہارے لیے بیس پچیس ہزار بنک سے نکلوں گی۔۔۔ یہ لو اپنا پستول۔“

میں نے اپنا پستول لیا اور وہاں سے دم دبا کر بھاگا۔۔۔ پہلا دار خالی گیا تھا۔۔۔ میں نے سوچا کہیں اور کو شش کرنی چاہیے۔ قرض ادا کرنے ہیں اور جو میں نے پلان بنایا ہے اس کی تکمیل بھی ہونا چاہیے۔

چنانچہ میں نے ایک جگہ اور کو شش کی۔ سرد یوں کے دن تھے، صبح کے چھ بجھے والے تھے۔۔۔ یہ ایسا وقت ہوتا ہے جب سب گھری نیند سو رہے ہوتے ہیں۔۔۔ مجھے ایک مکان کا پتہ تھا کہ اس کا جو مالک ہے بڑا مالدار ہے۔۔۔ بہت کنجوس ہے۔۔۔ اپنا روپیہ بینک میں نہیں رکھتا۔۔۔ گھر میں رکھتا ہے۔ میں نے سوچا اس کے ہاں چلنا چاہئے۔ میں وہاں کن مشکلوں سے اندر داخل ہوا میں بیان نہیں کر سکتا۔۔۔ بہر حال پہنچ گیا۔ صاحب خانہ جو ماشاء اللہ جوان تھے، سور ہے تھے۔ میں نے ان کے سرہانے سے چابیاں نکالیں اور الماریاں کھولنا شروع کر دیں۔

ایک الماری میں کاغذات تھے اور کچھ فرنچ لیدر۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ شخص جو کنوار ہے، فرنچ لیدر کہاں استعمال کرتا ہے۔۔۔ دوسری الماری میں کپڑے تھے۔ تیری بالکل خالی تھی، معلوم نہیں اس میں تالا کیوں پڑا ہوا تھا۔ اور کوئی الماری نہیں تھی۔ میں نے تمام مکان کی تلاشی لی لیکن مجھے ایک بیسہ بھی نظر نہ آیا۔۔۔ میں نے سوچا اس شخص نے ضرور اپنی دولت کہیں دبار کھی ہو گی۔۔۔ چنانچہ میں نے اس کے سینے پر بھرا ہوا پستول رکھ کر اسے جگایا۔

وہ ایسا چونکا اور بد کا کہ میرا پستول فرش پر جا پڑا۔ میں نے ایک دم پستول اٹھایا اور اس سے کہا، ”میں چور ہوں۔۔۔ یہاں چوری کرنے آیا ہوں۔۔۔ لیکن تمہاری تین الماریوں سے مجھے ایک دمڑی بھی نہیں ملی۔۔۔ حالانکہ میں نے سنا تھا کہ تم بڑے مالدار آدمی ہو۔“

وہ شخص جس کا نام مجھے اب یاد نہیں، مسکرا یا۔۔۔ انگڑائی لے کر اٹھا اور مجھے سے کہنے لگا، ”یار تم چور ہو تو تم نے مجھے پہلے اطلاع دی ہوتی۔۔۔ مجھے چوروں سے بہت پیار ہے۔۔۔ یہاں جو بھی آتا ہے وہ خود کو بڑا شریف آدمی کہتا ہے، حالانکہ وہ اول درجے کا کالا چور ہوتا ہے۔۔۔ مگر تم چور ہو۔۔۔ تم نے اپنے آپ کو چھیایا نہیں ہے۔۔۔ میں تم سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد ریفریجریٹر کھولا، میں سمجھا شاید میری تواضع شربت وغیرہ سے کرے گا۔۔۔ لیکن اس نے مجھے بلا یا اور کھلے ہوئے ریفریجریٹر کے پاس لے جا کر کہا، ”دوسٹ میں اپنا سارا روپیہ اس میں رکھتا ہوں۔۔۔ یہ صندوقچی دیکھتے ہو۔۔۔ اس میں قریب قریب ایک لاکھ روپیہ پڑا ہے۔۔۔ تمھیں کتنا چاہیے؟“

اس نے صندوقچی باہر نکالی جو نجسی تھی۔ اسے کھولا۔ اندر سبز رنگ کے نوٹوں کی گڑیاں پڑی تھیں۔ ایک گڈی نکال کر اس نے میرے ہاتھ میں تھما دی اور کہا، ”بس اتنے کافی ہوں گے۔۔۔ دس ہزار ہیں۔“

میری سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا جواب دوں۔ میں تو چوری کرنے آیا تھا۔۔۔ میں نے گڈی اس کو واپس دی اور کہا، ”صاحب! مجھے کچھ نہیں چاہیے۔۔۔ مجھے معافی دیجیے۔۔۔ پھر کبھی حاضر ہوں گا۔“

میں وہاں سے آپ سمجھیے کہ دم دبا کر بھاگا۔ گھر پہنچا تو سورج نکل چکا تھا۔۔۔ میں نے سوچا کہ چوری کا ارادہ ترک کر دینا چاہیے۔۔۔ دو جگہ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔۔۔ دوسری رات کو کوشش کرتا تو کامیابی یقینی نہیں تھی۔۔۔ لیکن قرض بدستور اپنی جگہ پر موجود تھا جو مجھے بہت تنگ کر رہا تھا۔۔۔ حلق میں یوں سمجھیے کہ ایک پھانس سی اٹک گئی تھی۔۔۔ میں نے بالآخر یہ ارادہ کر لیا کہ جب اچھی طرح سوچکوں گا تو اٹھ کر خود کشی کروں گا۔

سورہاتھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔۔۔ میں اٹھا۔۔۔ دروازہ کھولا۔۔۔ ایک بزرگ آدمی کھڑے تھے۔ میں نے ان کو آداب عرض کیا۔۔۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا، ”لفافہ دینا تھا، اس لیے آپ کو تکلیف دی۔۔۔ معاف فرمائیے گا، آپ سور ہے تھے۔“

میں نے ان سے لفافہ لیا۔۔۔ وہ سلام کر کے چلے گئے۔۔۔ میں نے دروازہ بند کیا۔۔۔ لفافہ کافی وزنی تھا۔۔۔ میں نے اسے کھولا اور دیکھا کہ سوسوروپے کے بے شمار نوٹ ہیں۔۔۔ گنے تو پچاس ہزار نکل۔۔۔ ایک محترم سار قعہ تھا، جس میں لکھا تھا کہ ”آپ کے یہ روپے مجھے بہت دیر پہلے ادا کرنے تھے۔۔۔ افسوس ہے کہ میں اب ادا کرنے کے قابل ہوا ہوں۔“

میں نے بہت غور کیا کہ یہ صاحب کون ہو سکتے ہیں جنہوں نے مجھ سے قرض لیا۔۔۔ سوچتے سوچتے میں نے آخر سوچا کہ ہو سکتا ہے کسی نے مجھ سے قرض لیا ہو جو مجھے یاد نہ رہا ہو۔ میں ہزار اپنی بیوی کو۔۔۔ پندرہ ہزار اپنی بیوہ بہن کو۔۔۔ دو ہزار قرض کے۔۔۔ باقی بچے تیرہ ہزار۔۔۔ ایک ہزار میں نے اچھی شراب کے لیے رکھ لیے۔۔۔ پہاڑ پر جانے اور دودھ پینے کا خیال میں نے چھوڑ دیا۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔۔۔ اٹھ کر باہر گیا۔ دروزہ کھولا تو میرا ایک قرض خواہ کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے پانچ سوروپے لینا تھے۔ میں لپک کر اندر گیا۔۔۔ نکیے کے نیچے نوٹوں کا لفافہ دیکھا مگر وہاں کچھ موجود ہی نہیں تھا۔

آج میں آپ کو اپنی ایک پر لطف حماقت کا قصہ سناتا ہوں۔

کرفیو کے دن تھے۔ یعنی اس زمانے میں جب بمبئی میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو چکے تھے۔ ہر روز صحیح سویرے جب اخبار آتا تو معلوم ہوتا کہ متعدد ہندوؤں اور مسلمانوں کی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ میری بیوی اپنی بہن کی شادی کے سلسلے میں لاہور جا چکی تھی۔ گھر بالکل سونا سونا تھا، اسے گھر تو نہیں کہنا چاہیے کیونکہ صرف دو کمرے تھے، ایک غسل خانہ، جس میں سفید چمکیلی ٹالکیں لگی تھیں۔ اس سے کچھ دور ہٹ کر ایک اندھیرا سا باور پی خانہ اور بس۔

جب میری بیوی گھر میں تھی تو دونوں کر تھے۔ دونوں بھائی کم عمر تھے۔ ان میں سے جو چھوٹا تھا وہ مجھے قطعاً پسند نہیں تھا اس لیے کہ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ چالاک اور مکار تھا چنانچہ میں نے موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے نکال باہر کیا اور اس کی جگہ ایک اور لڑکا ملازم رکھ لیا جس کا نام افتخار تھا۔

رکھنے کو تو میں نے اسے رکھ لیا لیکن بعد میں بڑا فسوس ہوا کہ وہ ضرورت سے زیادہ پھر تیلا تھا۔ میں کری پر بیٹھا ہوں اور کوئی افسانہ سوچ رہا ہوں کہ وہ باور پی خانہ سے بھاگا آیا اور مجھ سے مخاطب ہوا، ”صاحب آپ نے بلا یا مجھے؟“

میں حیران کہ اس خرد़ات کو میں نے کب بلا یا تھا۔ چنانچہ میں نے شروع شروع میں تو اپنی حیرت کا اظہار کیا اور اس سے کہا، ”افخار! تمہارے کان بجھتے ہیں میں جب آواز دیا کروں اسی وقت آیا کرو۔“ افتخار نے مجھ سے کہا، ”لیکن صاحب آپ کی آواز مجھے سنائی دی تھی۔“ میں نے اس سے بڑے زرم لجھے میں کہا، ”نہیں، میں نے تحسیں نہیں بلا یا تھا جاؤ اپنا کام کرو۔“

وہ چلا گیا لیکن جب ہر روز چھپ مرتبہ آکر یہی پوچھتا صاحب آپ نے بلا یا ہے۔۔۔ مجھے تو تنگ آکر اس سے کہنا پڑتا۔۔۔ تم بکواس کرتے ہو، تم ضرورت سے زیادہ چالاک ہو بھاگ جاؤ یہاں سے۔۔۔ اور وہ بھاگ جاتا۔

گھر میں چونکہ اور کوئی نہیں تھا اس لیے میرا دوست راجہ مہدی علی خان میرے ساتھ ہی رہتا تھا، اس کو افتخار کی مستعدی بہت پسند تھی۔ وہ اس سے بہت متاثر تھا۔ اس نے کئی بار مجھ سے کہا، ”منٹو! تمہارا یہ ملازم کتنا اچھا ہے۔ ہر کام کتنی مستعدی سے کرتا ہے۔“ میں نے اس سے ہر بار بھی کہا، ”راجہ میری جان تم مجھ پر بہت بڑا احسان کرو گے۔ اگر اسے اپنے یہاں لے جاؤ، مجھے ایسے مستعد نو کر کی ضرورت نہیں۔ معلوم نہیں کہ راجہ کو افتخار پسند تھا تو اس نے اسے ملازم کیوں نہ رکھ لیا۔ میں نے راجہ سے کہا، ”دیکھو بھائی، یہ لڑکا بڑا اخطرناک ہے، مجھے یقین ہے کہ چور ہے کبھی نہ کبھی میرے چونا ضرور لگائے گا۔“

راجہ میرا تمسخر اڑاتا، ”تم فرائد بن رہے ہو، ایسا نو کر زندگی میں مشکل سے ملتا ہے تم نے تم نے اسے سمجھا ہی نہیں۔“

”میں سوچ میں پڑ جاتا کہ میرا قیافہ یا اندازہ کہیں غلط تو نہیں۔ شاید راجہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ ہو سکتا ہے افتخار ایماندار ہو اور جو میں نے اس کی ضرورت سے زیادہ پھرتی اور چالاکی کے متعلق فیصلہ کیا ہے، بہت ممکن ہے غلط ہو۔۔۔ مگر سوچ بچار کے بعد میں اس نتیج پر پہنچتا کہ میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہی درست ہے۔ مجھے اپنے متعلق یہ حسن ظن ہے کہ انسانی نفیسیات کا ماہر ہوں۔ آپ یقین مانیے افتخار کے متعلق جو رائے میں نے قائم کی تھی درست نکلی۔۔۔ لیکن۔۔۔“

”یہ۔۔۔ لیکن، ہی سارا قصہ ہے۔۔۔“

اور قصہ یوں ہے کہ میں جب بھتی تاکیز سے واپس آیا کرتا تھا تو عادتاً میل گاڑی کا ماہنہ ٹکٹ جو ایک کارڈ کی صورت میں ہوتا تھا جو سلو لا ہیڈ کے کور میں بند رہتا تھا، اپنے میز کے ٹرے میں رکھا کرتا تھا۔ جتنے روپے پیسے اور آنے جیب میں ہوتے وہ بھی اس ٹرے میں رکھ دیتا۔ اگر کچھ نوٹ ہوں تو میں وہ ٹکٹ کے سلو لا ہیڈ کے کور میں اڑس دیا کرتا۔

ایک دن جب میں بھتی تاکیز سے واپس آیا تو میری جیب میں ساٹھ روپے کی مالیت کے چھ نوٹ دس دس کے تھے، میں نے حسبِ عادت جیب میں سے ٹرین کا پاس نکلا اور سلو لا ہیڈ کو میں چھ نوٹ اڑ سے اور بر انڈی پینے لگا۔ کھانا کھانے کے بعد میں سو گیا۔

صحیح جلد بیدار ہوتا ہوں یعنی بھی کوئی 5 بجے۔ ساڑھے پانچ کے قریب اخبار آ جاتے تھے ان کا جلدی جلدی مطالعہ کرتے کرتے چھ بجے میں اٹھ کر غسل کرتا اس کے بعد پھر بر انڈی پینا اور کھانا کھا کر سو جاتا۔ اس شام بھی ایسا ہی ہوا۔ افتخار نے بڑی پھرتی سے میز پر کھانا لگایا جب میں کھا کر فارغ ہوا تو اس نے بڑی پھرتی سے بر تن اٹھائے۔ میز صاف کی اور مجھ سے کہا، ”صاحب آپ کو سکریٹ چاہئیں۔“

میں اس سے کباب تھا، چنانچہ میں نے اس سے بڑے درشت لبجے میں کہا کہ، ”سُکریٹ تو مجھے چاہئیں۔ لیکن تم لاوے گے کہاں سے؟ جانتے نہیں ہو آج کرفیو ہے۔ نوبے سے صحیح بجے تک۔“

افتخار خاموش ہو گیا۔

میں حسبِ معمول صحیح بجے اٹھا لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں، نوکر سورہ ہے تھے۔ کرفیو کا وقت چھ بجے تک تھا۔ اس وقت کوئی اخبار نہیں آیا تھا۔ صوفے پر بیٹھا اونگھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد آتا کر میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو بازار سنسان تھا وہ بازار جو صحیح تین بجے ہی ٹرالوں کی کھڑک ہے اور مل میں کام کرنے والی عورتوں اور مردوں کی تیز رفتاری سے زندہ ہو جاتا تھا۔

کھڑکی ایک ہی تھی۔ اس کے پاس ہی میری میز پر جو ٹرے پڑی تھی میری نظراتفاقیہ اس پر پڑی۔ شام کو ہر روز میں اس میں اپناریل کا پاس اور روپے پسیے رکھا کرتا تھا اس لیے کہ یہ معاملہ عادت بن کر طبیعت بن گیا تھا۔ جب میں نے ٹرے کو تھاں دیکھا تو مجھے وہ پاس نظر نہ آیا جس کے کور میں میں نے دس دس کے چھ کرنی نوٹ رکھے تھے۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ شاید میں نے کاغذوں کے نیچے رکھ دیا ہو گا لیکن جب کاغذ اٹھائے تو کچھ بھی نہ تھا۔

بڑی حیرت ہوئی۔ ایک ایک کاغذ الٹ پلٹ کیا گرودہ پاس نہ ملا۔ دونوں نوکر باورچی خانے میں سور ہے تھے۔ میں بڑا تھیر تھا کہ یہ قصہ کیا ہے۔ میں نے اگر گھر آنے سے پہلے شراب پی ہوتی تو میں سمجھتا کہ میرا حافظ جواب دے گیا ہے یا حیب سے رومال نکالتے وقت مجھ سے وہ چھ نوٹ کہیں گر گئے۔ لیکن معاملہ اس کے بر عکس تھا۔ میں نے بمبیٹا کیز سے واپس گھر آتے ہوئے راستے میں ایک قطرہ بھی نہیں پیا تھا اس لیے کہ گھر میں بر انڈی کی پوری بوتل موجود تھی۔ میں نے ادھر ادھر تلاش شروع کی تو دیکھا میرا ریلوے پاس دس دس کے چھ نوٹوں سمیت میز کے نچلے دراز میں فائلوں کے نیچے پڑا ہے۔ میں دیر تک سوچتا رہا لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا اس لیے کہ میں نے اسے چھپا کر نہیں رکھا تھا۔

میں نے سوچا کہ یہ افتخار کی حرکت ہے۔ جبکہ میں سورہ تھا باورچی خانے کے کام سے فارغ ہو کر ٹرے میں وہ پاس دیکھا اور اس کو میز کے نیچے والی دراز میں فائلوں کے اندر چھپا دیا۔ رات کرفیو تھا اس لیے وہ باہر نہیں جا سکتا تھا۔ اس کی غالباً یہ اسکیم تھی کہ جب صحیح کرفیو اٹھے تو وہ پاس نوٹوں سمیت لے کر چپت ہو جائے، مگر میں بھی ایک کائیاں تھا۔ میں نے پاس فائلوں کے نیچے سے اٹھایا اور پھر ٹرے میں رکھ دیا تا کہ میں افتخار کی پریشانی دیکھ سکوں۔

مجھے مقررہ وقت پر بکبیٹی ٹاکیز جانا تھا، چنانچہ حسبِ معمول میں نے کرتہ اور پاجامہ نکالا۔ پاجامہ میں ازار بند ڈالا اور تو لیہ لے کر غسل خانے میں چلا گیا لیکن میرے دل و دماغ میں صرف ایک ہی خیال تھا، اور وہ افتخار کو رنگ ہاتھوں کپڑنے کا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میری میز کے نچلے دراز میں چھپا یا ہوا پاس بڑے و ثوق سے نکالے گا پھر جب اسے نہیں ملے گا تو وہ ادھر ادھر دیکھے گا۔ جب اسے ناکامی ہو گی تو وہ اٹھے گا۔ اس کی نظر ٹرے پر پڑے گی وہ کس قدر جیر ان ہو گا لیکن وہ پاس کو اٹھائے گا اور اپنے نیفے میں اڑس کر چلتا بنے گا۔

میں نے اپنے دماغ میں اسکیم بنائی تھی کہ غسل خانے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا رکھوں گا۔ غسل خانہ میرے کمرے کے بالکل سامنے تھا ذرا سا دروازہ کھلا رہتا اور میں تاک میں رہتا تو افتخار کو رنگ ہاتھوں کپڑلینے میں کوئی مشکل نہیں ہو سکتا۔ میں جب غسل خانے میں داخل ہوا تو بہت مسرور تھا۔ بزمِ خود نفسیاتی ماہر ہونے کی وجہ سے اور بھی زیادہ خوش تھا کہ آج میری قابلیت مسلم ہو جائے گی۔

افتخار کو کپڑ کر میں راجہ کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ میرا یہ ارادہ نہیں تھا کہ اسے پولیس کے حوالے کروں مجھے صرف اپنادی اور ذہنی اطمینان ہی تو مطلوب تھا۔ چنانچہ میں نے غسل خانے میں داخل ہو کر جب اپنے کپڑے اتارے تو دروازہ ذرا سا کھلا رکھا۔ پانی کے دو ڈو ٹنگ اپنے بدن پر ڈال کر میں نے صابن ملنابر و عکیا اس کے بعد کئی مرتبہ میں نے جھانک کر کمرے کی طرف دیکھا مگر افتخار پاس لینے نہ آیا۔ لیکن مجھے یقین واثق تھا کہ وہ ضرور آئے گا اس لیے کہ اس وقت کر فیو اٹھ چکا تھا۔

میں فوارے کے نیچے بیٹھا اور اس کی تیز اور ٹھنڈی پھوار میں اپنا کام بھول گیا اور سوچنے لگا، افسانہ نگار ہونا بھی بہت بڑی لعنت ہے۔ میں نے اسکیم کو افسانے کی شکل دینا شروع کر دی، ساتھ ساتھ نہاتا بھی رہا تنا مز آیا کہ افسانے اور پانی میں غرق ہو گیا۔ میں نے پورا افسانہ صابن اور پانی سے دھو دھا کر اپنے دماغ میں صاف کر لیا۔ بہت خوش تھا۔ اس لیے کہ اس افسانے کا انجام یہ تھا کہ میں نے اپنے نوکر کو رنگ ہاتھوں کپڑ لیا ہے اور میری نفسیات شناسی کی چاروں طرف دھوم مج گئی ہے۔

میں بہت خوش تھا، چنانچہ میں خلافِ معمول اپنے بدن پر ضرورت سے زیادہ صابن ملا۔ ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کیا لیکن ایک بات تھی کہ افسانہ میرے دماغ میں اور زیادہ صاف اور زیادہ اجلہ ہوتا گیا۔ جب نہا کر باہر نکلا تو میں اور بھی زیادہ خوش تھا، اس لیے کہ پورا افسانہ میں نے صابن اور پانی کے ساتھ اپنے دماغ میں لکھ لیا تھا، اب صرف یہ کرنا تھا کہ یہ قلم اٹھاؤں اور یہ افسانہ لکھ کر کسی پر پچ کو بھیج دوں۔

میں خوش تھا کہ چلو ایک افسانہ ہو گیا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں گیا۔ میرے فلیٹ میں صرف دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں تو وہ معاملہ پڑا تھا۔ یعنی میرا بیوی کا پاس جس میں دس دس کے چھ نوٹ ملغوف تھے۔ میں دوسرے کمرے میں کپڑے پہن رہا تھا۔ کپڑے پہن کر جب باہر نکلا تو یوں سمجھیے جیسے افسانوں کی دنیا سے باہر آیا۔ فوراً مجھے خیال آیا کہ میری اسکیم کیا تھی۔ لپک کر میں اپنی میز کے پاس پہنچا، ٹرے کو دیکھا تو میری افسانہ نگاری ختم ہو گئی۔

میرا بیوی کے پاس دس دس کے چھ نوٹوں سمیت غائب تھا۔

میں نے فوراً اپنے شریف نوکر کو طلب کیا اور اس سے پوچھا، ”کریم، افتخار کہاں ہے؟“

اس نے جواب دیا، ”صاحب وہ کوئلے لینے گیا ہے۔“

میں نے صرف اتنا کہا، ”تو اس نے اپنا منہ کالا کر لیا ہے۔“

کریم نے اس کی تلاش کی مگر وہ نہ ملا۔ میں غسل خانے میں انسانی نفیسیات کو صابن اور پانی سے دھوتا اور صاف کرتا رہا۔ مگر افتخار مجھے صاف کر گیا۔ اس لیے کہ اسی صحیح جب میں بمبئی ٹائکیز کی بر قی ٹرین میں روانہ ہوا تو میرے پاس، پاس نہیں تھا لکٹ چیکر آیا تو میں کپڑا گیا۔۔۔ مجھے کافی جرمانہ ادا کرنا پڑا۔

-[110]-

شانتی: سعادت حسن منٹو

دونوں، پیرے ٹین ڈیری کے باہر، بڑے دھاریوں والے چھاتے کے نیچے، کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ادھر سمندر تھا جس کی لہروں کی گلنگناہ ہٹ سنائی دے رہی تھی۔ چائے بہت گرم تھی۔ اس لیے دونوں آہستہ آہستہ گھونٹ بھر رہے تھے۔ سامنے موٹی بھوووں والی یہودن کی جانی پہچانی صورت تھی: یہ بڑا گول مٹول چہرہ، تیکھی ناک، موٹے موٹے بہت ہی زیادہ سرخی لگے ہونٹ، شام کو ہمیشہ درمیان

والے دروازے کے ساتھ والی کرنسی پر بیٹھی دکھائی دیتی تھی۔ مقبول نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور بلراج سے کہا، ”بیٹھی ہے جال پھینکنے۔“

بلراج، موٹی بھوؤں کی طرف دیکھے بغیر بولا، ”پھنس جائے گی کوئی نہ کوئی مچھلی۔“

مقبول نے ایک پیسٹری منہ میں ڈالی، ”یہ کاروبار بھی عجیب کاروبار ہے، کوئی دکان کھول کر بیٹھتی ہے، کوئی چل پھر کے سودا اپتھی ہے، کوئی اس طرح ریسمور انوں میں گاہک کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہے۔۔۔ جسم پہنچا بھی ایک آرٹ ہے، اور میر اخیال ہے بہت مشکل آرٹ ہے۔۔۔ یہ موٹی بھوؤں والی کیسے گاہک کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کیسے کسی مرد کو یہ بتاتی ہو گی کہ وہ بلا قہہ ہے۔“

بلراج مسکرا یا، ”کسی روز وقت نکال کر کچھ دیر یہاں بیٹھو۔ تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ نگاہوں ہی نگاہوں میں کیونکر سودے ہوتے ہیں، اس جنس کا بھاؤ کیسے چلتا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک مقبول کا ہاتھ پکڑا، ”ادھر دیکھو، ادھر۔“ مقبول نے موٹی بھوؤں کی طرف دیکھا۔ بلراج نے اس کا ہاتھ دبایا، ”نہیں یار۔۔۔ ادھر کونے کے چھاتے کے نیچے دیکھو۔“ مقبول نے ادھر دیکھا۔ ایک دبلي پتلی، گوری چٹی لڑکی کرنسی پر بیٹھ رہی تھی۔ بال کٹھے ہوئے تھے۔ ناک نقشہ ٹھیک تھا۔ ہلکے زرد رنگ کی جارجٹ کی سائزی میں ملبوس تھی۔ مقبول نے بلراج سے پوچھا، ”کون ہے یہ لڑکی؟“

بلراج نے اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا، ”اماں وہی ہے جس کے بارے میں تم سے کہا تھا کہ بڑی عجیب و غریب ہے۔“ مقبول نے کچھ دیر سوچا پھر کہا، ”کون سی یار تم، تم تو جس لڑکی سے بھی ملتے ہو عجیب و غریب ہی ہوتی ہے۔“ بلراج مسکرا یا، ”یہ بڑی خاص الخاص ہے۔۔۔ ذرا غور سے دیکھو۔“

مقبول نے غور سے دیکھا۔ بریدہ بالوں کا رنگ بھوسلا تھا، ملکے بستنی رنگ کی سائزی کے نیچے چھوٹی آستینیوں والا بلا دوز، پتلی پتلی بہت ہی گوری باخھیں۔ لڑکی نے اپنی گردن موڑی تو مقبول نے دیکھا کہ اس کے باریک ہونٹوں پر سرخی پھیلی ہوئی سی تھی۔

”میں اور تو کچھ نہیں کہہ سکتا مگر تمہاری اس عجیب و غریب لڑکی کو سرخی استعمال کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔۔۔ اب اور غور سے دیکھا ہے تو سائزی کی پہناؤٹ میں بھی خامیاں نظر آئی ہیں۔ بال سنوارنے کا انداز بھی سترہ انہیں۔“

بلراج ہنسا، ”تم صرف خامیاں ہی دیکھتے ہو۔ اچھائیوں پر تمہاری نگاہ کبھی نہیں پڑتی۔“

مقبول نے کہا، ”جو اچھائیاں ہیں وہ اب بیان فرمادیجیے، لیکن پہلے یہ بتا دیجیے کہ آپ اس لڑکی کو ذاتی طور پر جانتے ہیں یا۔۔۔“

لڑکی نے جب بلراج کو دیکھا تو مسکرائی۔ مقبول رک گیا، ”مجھے جواب مل گیا۔ اب آپ محترمہ کی خوبیاں بتا دیجیے۔“

”سب سے پہلی خوبی اس لڑکی میں یہ ہے کہ بہت صاف گو ہے۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ جو اصول اس نے اپنے لیے بنارکھے ہیں ان پر بڑی پابندی سے عمل کرتی ہے۔ پر سنل ہائی جسین کا بہت خیال رکھتی ہے۔ محبت و جنت کی بالکل قائل نہیں۔ اس معاملے میں دل اس کا برف ہے۔“

بلراج نے چائے کا آخری گھونٹ پیا، ”کہیے کیا خیال ہے؟“

مقبول نے لڑکی کو ایک نظر دیکھا، ”جو خوبیاں تم نے بتائی ہیں ایک ایسی عورت میں نہیں ہونی چاہئیں جس کے پاس مرد صرف اس خیال سے جاتے ہیں کہ وہ ان سے اصلی نہیں تو مصنوعی محبت ضرور کرے گی۔۔۔ خود فریبی میں اگر یہ لڑکی کسی مرد کی مدد نہیں کرتی تو میں سمجھتا ہوں بڑی بے وقوف ہے۔“

”یہی میں نے سوچا تھا۔۔۔ میں تم سے کیا بیان کروں، روکھے پن کی حد تک صاف گو ہے۔ اس سے با تیں کرو تو کئی بار دھکے سے لگتے ہیں۔۔۔ ایک گھنٹہ ہو گیا، تم نے کوئی کام کی بات نہیں کی۔۔۔ میں چلی، اور یہ جاوہ جا۔۔۔ تمہارے منہ سے شراب کی بو آتی ہے۔ جاؤ چل جاؤ۔۔۔ سماڑھی کو ہاتھ مت لگاؤ میلی ہو جائے گی۔“ یہ کہہ کر بلراج نے سکریٹ سلاگا یا، ”عجیب و غریب لڑکی ہے۔ پہلی دفعہ جب اس سے ملاقات ہوئی تو میں، بائی گوڑ، چکر اگیا۔ چھوٹتے ہی مجھ سے کہا، ”فتنی سے ایک پیسہ کم نہیں ہو گا۔ جیب میں ہیں تو چلو ورنہ مجھے اور کام ہیں۔“

مقبول نے پوچھا، ”نام کیا ہے اس کا؟“

”شانتی بتایا اس نے۔۔۔ کشمیرن ہے۔“

مقبول کشمیری تھا۔ چونکہ پڑا، ”کشمیرن!“

”تمہاری ہم وطن۔“

مقبول نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ ناک نقشہ صاف کشمیریوں کا تھا، ”یہاں کیسے آئی؟“

”معلوم نہیں!“

”کوئی رشتہ دار ہے اس کا؟“ مقبول لڑکی میں دلچسپی لینے لگا۔

”وہاں کشمیر میں کوئی ہوتا میں کہہ نہیں سکتا۔ یہاں بمبئی میں اکیلی رہتی ہے۔“ بُرراج نے سگریٹ ایش ٹرے میں دبایا، ”ہار بندی روڈی رائیک ہو ٹھیل ہے، وہاں اس نے ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا ہے۔۔۔ یہ مجھے ایک روز اتفاقاً معلوم ہو گیا اور نہ یہ اپنے ٹھکانے کا پتا کسی کو نہیں دیتی۔ جس کو ملنا ہوتا ہے یہاں پیرے ٹین ڈیری میں چلا آتا ہے۔ شام کو پورے پانچ بجے آتی ہے یہاں!“

مقبول کچھ دیر خاموش رہا پھر بیرے کو اشارے سے بلا یا اور اس سے بل لانے کے لیے کہا۔ اس دوران میں ایک خوش پوش نوجوان آیا اور اس لڑکی کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔ مقبول بُرراج سے مخاطب ہوا، ”اس سے کبھی ملاقات کرنی چاہیے۔“

بُرراج مسکرا یا، ”ضرور ضرور۔۔۔ لیکن اس وقت نہیں۔ مصروف ہے۔ کبھی آجانا یہاں شام کو۔۔۔ اور ساتھ بیٹھ جانا۔“

مقبول نے بل ادا کیا۔ دونوں دوست اٹھ کر چلے گئے۔

دوسرے روز مقبول اکیلا آیا اور چائے کا آرڈر دے کر بیٹھ گیا۔ ٹھیک پانچ بجے وہ لڑکی بس سے اتری اور پرس ہاتھ میں لٹکائے مقبول کے پاس سے گزری۔ چال بھدی تھی۔ جب وہ کچھ دور، کرسی پر بیٹھ گئی تو مقبول نے سوچا، ”اس میں جنسی کشش تو نام کو بھی نہیں۔ حیرت ہے کہ اس کا کاروبار کیوں نکر جلتا ہے۔۔۔ لپ اسٹک کیسے بے ہودہ طریقے سے استعمال کی ہے اس نے۔۔۔ ساری کی پہناؤٹ آج بھی غامیوں سے بھری ہے۔“

پھر اس نے سوچا کہ اس سے کیسے ملے۔ اس کی چائے میز پر آچکی تھی ورنہ اٹھ کر وہ اس لڑکی کے پاس جا بیٹھتا۔ اس نے چائے پینا شروع کر دی۔ اس دوران میں اس نے ایک ہلاکا سا اشارہ کیا۔ لڑکی نے دیکھا کچھ تو قف کے بعد اٹھی اور مقبول کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ مقبول پہلے تو کچھ گھبرایا لیکن فوراً ہی سنجل کر لڑکی سے مخاطب ہوا، ”چائے شوق فرمائیں گی آپ۔“

”نہیں۔“

اس کے جواب کے اس اختصار میں روکھا پن تھا۔ مقبول نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا، ”کشمیریوں کو تو چائے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔“

لڑکی نے بڑے بے ہنگم انداز میں پوچھا، ”تم چلنے چاہتے ہو میرے ساتھ؟“

مقبول کو جیسے کسی نے اوندھے منہ گرا دیا۔ گھبر اہٹ میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا، ”ہا۔۔۔“

لڑکی نے کہا، ”فقطی روپیز۔۔۔ میں اور نو؟“

یہ دوسرا ریلا تھا مگر مقبول نے اپنے قدم جمالیے، ”چلیے!“

مقبول نے چائے کا بل ادا کیا۔ دونوں اٹھ کر ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں اس نے کوئی بات نہ کی۔ لڑکی بھی خاموش رہی۔ ٹیکسی میں میٹھے تو اس نے مقبول سے پوچھا، ”کہاں جائے گا تم؟“

مقبول نے جواب دیا، ”جہاں تم لے جاؤ گی۔“

”ہم کچھ نہیں جانتا۔۔۔ تم بولو کہ درجائے گا؟“

مقبول کو کوئی اور جواب نہ سوچتا تو کہا، ”ہم کچھ نہیں جانتا۔“

لڑکی نے ٹیکسی کا دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، ”تم کیسا آدمی ہے۔۔۔ خالی پیلی جوک کرتا ہے۔“

مقبول نے اس کا ہاتھ کپڑلیا، ”میں مذاق نہیں کرتا۔۔۔ مجھے تم سے صرف باتیں کرنی ہیں۔“

وہ بگڑ کر بولی، ”کیا۔۔۔ تم تو بولا تھا فٹی روپیز یہس!“

مقبول نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے، ”یہ لوگبراتی کیوں ہو۔“

اس نے نوٹ لے لیے، ”تم جائے گا کہاں؟“

مقبول نے کہا، ”تمہارے گھر۔“

”نہیں۔“

”کیوں نہیں؟“

”تم کو بولا ہے نہیں۔۔۔ ادھر ایسی بات نہیں ہو گی۔“

مقبول مسکرا کر ایسا ہے، ”ٹھیک ہے۔ ایسی بات ادھر نہیں ہو گی۔“

وہ کچھ متھیر سی ہوئی، ”تم کیسا آدمی ہے۔“

”جیسا میں ہوں۔ تم نے بولا فٹی روپیز یہس کہ نو۔۔۔ میں نے کہا میں اور نوٹ تمہارے حوالے کر دیے۔ تم نے بولا ادھر ایسی بات نہیں ہو گی۔ میں نے کہا بالکل نہیں ہو گی۔۔۔ اب اور کیا کہتی ہو۔“

لڑکی سوچنے لگی۔ مقبول مسکرا یا، ”دیکھو شانتی، بات یہ ہے۔ کل تم کو دیکھا۔ ایک دوست نے تمہاری کچھ بتیں سنائیں جو مجھے ولپسپ معلوم ہوئیں۔ آج میں نے تمہیں پکڑ لیا۔ اب تمہارے گھر چلتے ہیں۔ وہاں کچھ دیر تم سے بتیں کروں گا اور چلا جاؤں گا۔۔۔ کیا تمہیں یہ منظور نہیں۔“

”نہیں۔۔۔ یہ لو اپنے فنٹی روپیز۔“ لڑکی کے چہرے پر بھجن بلہ تھی۔

”تمہیں بس فنٹی روپیز کی پڑی ہے۔۔۔ روپے کے علاوہ بھی دنیا میں اور بہت سی چیزیں ہیں۔۔۔ چلو، ڈرائیور کو اپنا ایڈریس بتاؤ۔۔۔ میں شریف آدمی ہوں۔ تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کروں گا۔“ مقبول کے انداز گفتگو میں صداقت تھی۔ لڑکی متاثر ہوئی۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر کہا، ”چلو۔۔۔ ڈرائیور، ہار بینی روڑ!“

ٹیکسی چلی تو اس نے نوٹ مقبول کی جیب میں ڈال دیے، ”یہ میں نہیں لوں گی۔“

مقبول نے اصرار نہ کیا، ”تمہاری مرضی!“

ٹیکسی ایک پانچ منزلہ بلڈنگ کے پاس رکی۔ پہلی اور دوسری منزل پر مسas خانے تھے۔ تیسرا، چوتھی اور پانچویں منزل ہوٹل کے لیے مخصوص تھی۔ بڑی تنگ و تار جگہ تھی۔ چوتھی منزل پر سیر ہیوں کے سامنے والا کمرہ شانتی کا تھا۔ اس نے پرس سے چابی نکال کر دروازہ کھولا۔ بہت مختصر سامان تھا۔ لو ہے کا ایک پلنگ جس پر اجلی چادر بچھی تھی۔ کونے میں ڈرینگ ٹیبل۔ ایک اسٹول، اس پر ٹیبل فین۔ چار ٹرنک تھے وہ پلنگ کے نیچے دھرے تھے۔

مقبول کمرے کی صفائی سے بہت متاثر ہوا۔ ہر چیز صاف ستری تھی۔ تیکے کے غلاف عام طور پر میلے ہوتے ہیں گر اس کے دونوں تیکے بے داغ غلافوں میں ملغوف تھے۔ مقبول پلنگ پر بیٹھنے لگا تو شانتی نے اسے روکا، ”نہیں۔۔۔ ادھر بیٹھنے کا اجازت نہیں۔۔۔ ہم کسی کو اپنے بستر پر نہیں بیٹھنے دیتا۔ کرسی پر بیٹھو۔“ یہ کہہ کر وہ خود پلنگ پر بیٹھ گئی۔ مقبول مسکرا کر کرسی پر نکل گیا۔

شانتی نے اپنا پرس تیکے کے نیچے رکھا اور مقبول سے پوچھا، ”بولو۔۔۔ کیا با تیں کرنا چاہتے ہو؟“

مقبول نے شانتی کی طرف غور سے دیکھا، ”پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہیں ہونٹوں پر لپ اسک لگانی بالکل نہیں آتی۔“

شانتی نے برانہ مانا۔ صرف اتنا کہا، ”مجھے مالوم ہے۔“

”اٹھو، مجھے لپ اسک دو میں تمہیں سکھاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر مقبول نے اپنارومال نکالا۔

شانتی نے اس سے کہا، ”ڈریسینگ ٹیبل پر پڑا ہے، اٹھا لو۔“

مقبول نے لپ اسک اٹھائی۔ اسے کھول کر دیکھا، ”ادھر آؤ، میں تمہارے ہونٹ پوچھوں۔“

”تمہارے رومال سے نہیں۔۔۔ میرالو۔“ یہ کہہ کر اس نے ٹرنک کھولا اور ایک دھلاہ وارومال مقبول کو دیا۔ مقبول نے اس کے ہونٹ پوچھے۔ بڑی نفاست سے نئی سرخی ان پر لگائی۔ پھر کنکھی سے اس کے بال ٹھیک کیے اور کہا، ”لواب آئینہ دیکھو۔“

شانتی اٹھ کر ڈریسینگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بڑے غور سے اس نے اپنے ہونٹوں اور بالوں کا معاشرہ کیا۔ پسندیدہ نظروں سے تبدیلی محسوس کی اور پلٹ کر مقبول سے صرف اتنا کہا، ”اب ٹھیک ہے۔“ پھر پنگ پر بیٹھ کر پوچھا، ”تمہارا کوئی بیوی ہے؟“

مقبول نے جواب دیا، ”نہیں۔“

کچھ دیر خاموشی رہی۔ مقبول چاہتا تھا تیں ہوں چنانچہ اس نے سلسلہ کلام شروع کیا، ”انتنا مجھے معلوم ہے کہ تم کشمیر کی رہنے والی ہو۔ تمہارا نام شانتی ہے۔ یہاں رہتی ہو۔۔۔ یہ بتاؤ تم نے فنی روپیز کا معاملہ کیوں شروع کیا؟“

شانتی نے یہ بے تکف جواب دیا، ”میرا فادر سری نگر میں ڈاکٹر ہے۔۔۔ میں وہاں ہو پیٹھ میں نرس تھا۔ ایک لڑکے نے مجھ کو خراب کر دیا۔۔۔ میں بھاگ کر ادھر کو آگئی۔ یہاں ہم کو ایک آدمی ملا۔ وہ ہم کو فنی روپیز دیا۔۔۔ بولا ہمارے ساتھ چلو۔ ہم گیا۔ بس کام چالو ہو گیا۔۔۔ ہم یہاں ہو ٹل میں آگیا۔۔۔ پر ہم ادھر کسی سے بات نہیں کرتی۔۔۔ سب رنڈی لوگ ہے۔۔۔ کسی کو یہاں نہیں آنے دیتی۔“

مقبول نے کریڈ کریڈ کر تمام واقعات معلوم کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ کچھ اور باتیں ہوئیں جن سے اسے پتا چلا کہ شانتی کو جنسی معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب اس کا ذکر آیا تو اس نے بر اسمانہ بنانے کر کہا۔ ”آئی ڈونٹ لائک۔ دیت از بیڈ۔“

اس کے نزدیک فضی روپیز کا معاملہ ایک کاروباری معاملہ تھا۔ سری نگر کے ہسپتال میں جب کسی لڑکے نے اس کو خراب کیا تو جاتے وقت دس روپے دینا چاہیے، شانتی کو بہت غصہ آیا، نوٹ پھاڑ دیا۔ اس واقعے کا اس کے دماغ پر یہ اثر ہوا کہ اس نے باقاعدہ کاروبار شروع کر دیا۔ پچاس روپے فیس خود بخود مقرر ہو گئی۔ اب لذت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔۔۔ چونکہ نرس رہ چکی تھی اس لیے بڑی محتاط رہتی تھی۔

ایک برس ہو گیا تھا سے بمبئی میں آئے ہوئے۔ اس دوران میں اس نے دس ہزار روپے بچائے ہوتے مگر اس کو ریس کھینچنے کی لٹ پڑ گئی۔ پچھلی ریسوس پر اس کے پانچ ہزار اڑگنے لیکن اس کو یقین تھا کہ وہ نئی ریسوس پر ضرور جیتے گی، ”ہم اپنالوس پورا کر لے گا۔“

اس کے پاس کوڑی کوڑی کا حساب موجود تھا۔ سور روپے روزانہ کمالیتی تھی جو فوراً بُنک میں جمع کرادیے جاتے تھے۔ سو سے زیادہ وہ نہیں کمانا چاہتی تھی۔ اس کو اپنی صحت کا بہت خیال تھا۔ دو گھنٹے گزر گئے تو اس نے اپنی گھرڑی دیکھی اور مقبول سے کہا، ”تم اب جاؤ۔۔۔ ہم کھانا کھائے گا اور سو جائے گا۔“ مقبول اٹھ کر جانے لگا تو اس نے کہا، ”باتیں کرنے آؤ تو صحیح کے ٹائم آؤ۔ شام کے ٹائم ہمارا نقصان ہوتی ہے۔“

مقبول نے ”اچھا“ کہا اور چل دیا۔

دوسرے روز صحیح دس بجے کے قریب مقبول شانتی کے پاس پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی آمد پسند نہیں کرے گی مگر اس نے کوئی ناگواری ظاہر نہ کی۔ مقبول دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا۔ اس دوران میں شانتی کو صحیح طریقے پر ساڑی پہننی سکھائی۔ لڑکی ذہین تھی، جلدی سیکھ گئی۔

کپڑے اس کے پاس کافی تعداد میں اور اچھے تھے۔ یہ سب کے سب اس نے مقبول کو دکھائے۔ اس میں بچپنا تھا نہ بڑھا پا۔ شباب بھی نہیں تھا۔ وہ جیسے کچھ بنتے بنتے ایک دم رک گئی تھی، ایک ایسے مقام پر ٹھہر گئی تھی جس کے موسم کا تعین نہیں ہو سکتا۔ وہ خوبصورت تھی نہ بد صورت، عورت تھی نہ لڑکی۔ وہ پھول تھی نہ کلی۔ شاخ تھی نہ تنا۔ اس کو دیکھ کر بعض اوقات مقبول کو بہت الجھن ہوتی تھی۔ وہ اس میں وہ نقطہ دیکھنا چاہتا تھا جہاں اس نے خلط مالٹ ہونا شروع کیا تھا۔

شانتی کے متعلق اور زیادہ جاننے کے لیے مقبول نے اس سے ہر دوسرے تیرے روز ملنا شروع کر دیا۔ وہ اس کی کوئی خاطر مدارات نہیں کرتی تھی۔ لیکن اب اس نے اس کو اپنے صاف سترے بستر پر بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی۔ ایک دن مقبول کو بہت تعجب ہوا جب شانتی نے اس سے کہا، ”تم کوئی لڑکی مانگتا؟“

مقبول لیٹا ہوا تھا چونکہ کراٹھا، ”کیا کہا؟“

شانتی نے کہا، ”ہم پوچھتی، تم کوئی لڑکی مانگتا تو ہم لا کر دیتا۔“

مقبول نے اس سے دریافت کیا کہ یہ بیٹھے بیٹھے اسے کیا خیال آیا۔ کیوں اس نے یہ سوال کیا تو وہ خاموش ہو گئی۔ مقبول نے اصرار کیا تو شانتی نے بتایا کہ مقبول اسے ایک بیکار عورت سمجھتا ہے۔ اس کو حیرت ہے کہ مرد اس کے پاس کیوں آتے ہیں جبکہ وہ اتنی ٹھنڈی ہے۔ مقبول اس سے صرف باتیں کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ وہ اسے کھلونا سمجھتا ہے۔ آج اس نے سوچا، مجھ جیسی ساری عورتیں تو نہیں مقبول کو عورت کی ضرورت ہے، کیوں نہ وہ اسے ایک منگا دے۔

مقبول نے پہلی بار شانتی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ ایک دم وہ اٹھی اور چلانے لگی، ”ہم کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔ جاؤ چلے جاؤ۔۔۔ ہمارے پاس کیوں آتا ہے تم۔۔۔ جاؤ۔“

مقبول نے کچھ نہ کہا، خاموشی سے اٹھا اور چلا گیا۔

متواتر ایک ہفتہ وہ پیرے ٹین ڈیری جاتا رہا مگر شانتی دکھائی نہ دی۔ آخر ایک صبح اس نے اس کے ہوٹل کا رخ کیا۔ شانتی نے دروازہ کھول دیا مگر کوئی بات نہ کی۔ مقبول کرسی پر بیٹھ گیا۔۔۔ شانتی کے ہونٹوں پر سرخی پرانے بھدے طریقے پر لگی تھی۔ بالوں کا حال بھی پر انداختا۔ سائزی کی پہناؤٹ تو اور زیادہ بدزیب تھی۔ مقبول اس سے مخاطب ہوا، ”مجھ سے ناراض ہو تم؟“

شانتی نے جواب نہ دیا اور پینگ پر بیٹھ گئی۔ مقبول نے تندریج میں پوچھا، ”بھول گئیں جو میں نے سکھایا تھا؟“ شانتی خاموش رہی۔ مقبول نے غصے میں کہا، ”جواب دو، ورنہ یاد کھوماروں گا۔“

شانتی نے صرف اتنا کہا، ”مارو۔“

مقبول نے اٹھ کر ایک زور کا چانٹا اس کے منہ پر جڑ دیا۔۔۔ شانتی بلبلہ اٹھی۔ اس کی حیرت زدہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ مقبول نے جیب سے اپنا رومال نکالا۔ غصے میں اس کے ہونٹوں کی بھدی سرخی پوچھی۔ اس نے مزاحمت کی لیکن مقبول اپنا کام کرتا رہا۔ لپ اسٹک اٹھا کر نئی سرخی لگائی۔ کنگھے سے اس کے بال سنوارے، پھر اس نے تحکمانہ لبجھ میں کہا، ”سائزی ٹھیک کرو اپنی۔“

شانتی اٹھی اور سائزی ٹھیک کرنے لگی مگر ایک دم اس نے پھوٹ پھوٹ کر دیا اور روتنی خود کو بستر پر گرا دیا۔ مقبول تھوڑی دیر خاموش رہا۔ جب شانتی کے رونے کی شدت کچھ کم ہوئی تو اس کے پاس جا کر کہا، ”شانتی اٹھو۔۔۔ میں جا رہا ہوں۔“

شانتی نے ترپ کر کر وٹ بدلی اور چلانی، ”نہیں نہیں۔۔۔ تم نہیں جاسکتے۔“ اور دونوں بازو پھیلا کر دروازے کے درمیان میں کھڑی ہو گئی۔ ”تم گلیا تو مار ڈالوں گی۔“

وہ ہانپ رہی تھی۔ اس کا سینہ جس کے متعلق مقبول نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا جیسے گھری نیند سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مقبول کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے، شانتی نے تلے اوپر بڑی سرعت سے کئی رنگ بدلتے۔ اس کی نمناک آنکھیں چمک رہی تھیں، سرخی لگے باریک ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ ایک دم آگے بڑھ کر مقبول نے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔

دونوں پلنگ پر بیٹھے تو شانتی نے اپنا سر نیوڑھا کر مقبول کی گود میں ڈال دیا۔ اس کے آنسو بند ہونے ہی میں نہ آتے تھے۔ مقبول نے اس کو پیار کیا۔ رونا بند کرنے کے لیے کہا تو وہ آنسوؤں میں انک انک کر بولی، ”ادھر سری غیر میں۔۔۔ ایک آدمی نے۔۔۔ ہم کو مار دیا تھا۔۔۔ ادھر ایک آدمی نے۔۔۔ ہم کو زندہ کر دیا۔“

دو گھنٹے کے بعد جب مقبول جانے لگا تو اس نے جیب سے پچاس روپے نکال کر شانتی کے پلنگ پر رکھے اور مسکرا کہا، ”یہ لو اپنے ففٹی روپیز!“

شانتی نے بڑے غصے اور بڑی نفرت سے نوٹ اٹھائے اور پھیک دیے۔

پھر اس نے تیزی سے اپنی ڈریسگ میبل کا ایک دراز کھولا اور مقبول سے کہا، ”ادھر آئے۔ دیکھو یہ کیا ہے؟“

مقبول نے دیکھا۔ دراز میں سوسو کے کئی نوٹوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ مٹی بھر کے شانتی نے اٹھائے اور ہوا میں اچھائے، ”ہم اب یہ نہیں مانگتا!“

مقبول مسکرا یا۔ ہولے سے اس نے شانتی کے گال پر چھوٹی سی چپت لگائی اور پوچھا، ”اب تم کیا مانگتا ہے؟“

شانتی نے جواب دیا، ”تم کو۔“ یہ کہہ کروہ مقبول کے ساتھ چھٹ گئی اور رونا شروع کر دیا۔

مقبول نے اس کے بال سنوارتے ہوئے بڑے پیار سے کہا، ”روئے نہیں۔۔۔ تم نے جو مانگا ہے وہ تمہیں مل گیا ہے۔“

- [111] -

باردہ شملی: سعادت حسن منٹو

دو گوگز آئیں۔ تین بیش شرٹوں نے ان کا استقبال کیا۔ بیش شرٹ میں دنیا کے نقشے بنی ہوئی تھیں، ان پر پرندرے، چندے، درندے، پھول بوٹے اور کئی ملکوں کی شکلیں بنی ہوئی تھیں۔

دونوں گوگز نے اپنی کتابیں میز پر رکھیں۔ اپنے ڈسٹ کور اتارے اور بیش شرٹوں کے بیٹن بن گئیں۔ ایک گوگل نے اس بیش شرٹ سے جو خالص امر کی تھی، کہا، ”آپ کا لباس بڑا وہیات ہے۔“ وہ بیش شرٹ ہنسا، ”تمہارے گوگز بڑے وہیات ہیں۔ اسے لگا کر تم ایسی دکھائی دیتی ہو جیسے روشن دن اندھیری رات بن گیا ہے۔“ اس اندھیری رات نے اس بیش شرٹ سے کہا، ”میں تو چاندنی رات ہوں۔“ امریکی بیش شرٹ نے اس کو ایک کوہ ہمالہ پیش کیا جو بہت ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔

اس نے چجھ سے اس کوہ ہمالہ کو سر کر لیا۔ لیکن اس مہم کے دوران میں اس کو بڑی کوفت ہوئی۔۔۔ وہ برفوں کی عادی نہیں تھی۔ وہ مجبوراً اپنی سہیلی دوسری گوگز کے ساتھ آگئی تھی کہ وہاں اس کا چھینتیا بیش شرٹ مل گیا۔ دوسری گوگز اپنے بیش شرٹ سے علیحدہ با تین کر رہی تھی۔

”آج تم اتنی حسین کیوں دکھائی دے رہی ہو؟“

”مجھے کیا معلوم؟“

”اپنی حقیقیں اتار دو۔“

”کیوں؟“

”مجھے تمہاری آنکھیں نظر نہیں آتیں۔“

”میرا دل تو تمہیں نظر آرہا ہو گا۔“

”نظر آتا رہا ہے۔۔۔ نظر آتا رہے گا۔۔۔ لیکن مجھے تمہاری آنکھوں پر یہ غلاف پسند نہیں۔“

”تیز روشنی مجھے پسند نہیں۔“

”کیوں؟“

”بس نہیں۔۔۔ تمہاری بش شرٹ بھی مجھے پسند نہیں۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ اس کا ذیز ائن بہت بے ہودہ ہے۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئس کریم میں کیڑے مکوڑے چل رہے ہیں۔“

”تم کھاتوچکی ہو۔“

”میں نے تو صرف چکھی ہے، کھائی کب ہے؟“

”آپ بارہہ شماں، میں صرف آئس کریم چکھنے کے لیے ہی آتی ہیں؟“

”آپ مجبور کرتے ہیں تو میں آتی ہوں، ورنہ مجھے اس جگہ سے کوئی رغبت نہیں۔“

”میں یہ چاہتا تھا کہ ہم دونوں مل کر کوئی مہم سر کریں۔“

”کون سی مہم؟“

”بے شمار مہمیں ہیں۔۔۔ لیکن ایک سب سے بڑی ہے۔“

”کون سی؟“

”کسی آتش نشاں پہاڑ کے اندر کو دجا نہیں اور وہاں کے حالات معلوم کریں۔“

”میں تیار ہوں۔۔۔ لیکن پھر میں یہاں آکر آئس کریم ضرور کھاؤں گی۔“

”میں کھلاؤں گا تمہیں۔“

دونوں بانہوں میں بانہیں ڈالے ایک ایسی دوزخ میں چلے گئے جو آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوتی گئی۔ اس گولگز کی ساری کتابیں اس بشرط کی لا بسیری میں داخل ہو گئیں۔ دوسری گولگز نے اپنی بشرط کو اپنے بلاوز کی ساری کتابیں پڑھائیں مگر اس کی سمجھ میں نہ آئیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بشرط کسی گھٹیا قسم کے درزی کی سلی ہوئی ہے۔

اس نے ”باردہ شمالي“ میں اس سے کہا، ”تم آئس کریم نہ کھایا کرو۔۔۔ ہم آئندہ آتشیں ہاؤس“ میں جایا کریں گے۔۔۔“ دوسری گولگز کلبانے لگی۔ اس گلگاہت میں اس نے اپنی بخشش کے کاج بنانے شروع کر دیے اور ان میں کئی پھول ٹانک دیے۔ یہ بخشش گھٹیا قسم کے درزی کی سلی ہوئی نہیں تھی، اصل میں اس کا کپڑا اکھر درا تھا، جیسے ٹاث ہو، اس میں دوسری گولگز نے اپنی محمل کے کئی پوںڈ لگائے، مگر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

وہ ”آتشیں ہاؤس“ میں بھی کئی مرتبہ گئے، وہاں انہوں نے کئی گلاس پکھلی ہوئی آگ کے پیے مگر کوئی تسلیم نہ ہوئی۔ دوسری گولگز حیران تھی کہ اس کا بخشش جس کے لیے اس نے اپنے بلاوز کے تمام نیچے ادھیر دیے، اس سے متفقہ کیوں نہیں ہوتا۔ وہ اس کی ہر سلوٹ سے پیار کرتی تھی۔ لیکن وہ ”باردہ شمالي“ میں اور ”آتشیں ہاؤس“ میں اس کے خوبصورت فریم سے کوئی دلچسپی لیتا ہی نہیں تھا۔ عجیب بات ہے کہ وہ باردہ شمالي میں گرم ہو جاتا اور آتشیں ہاؤس میں اولادا بن جاتا۔ دوسری بخشش بہت حیران تھی کہ یہ کیا ماجرا ہے!

اس نے پہلی گولگز کو جو اس کی سیہلی تھی، ایک خط لکھا اور اس کو اپنا سارا دکھ بتایا۔ اس نے جواب میں یہ لکھا، ”تم کچھ فکر نہ کرو۔ یہ بخشش رٹ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کبھی سکڑ جاتے ہیں۔ کبھی پھیل جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری لانڈری میں بھی کوئی نقص ہے۔ اسے دور کرنے کی کوشش کرو۔ تمہاری استری بھی ایسا معلوم ہوتا ہے، خراب ہو گئی ہے، اسے ٹھیک کرو۔ کہیں کرنٹ تو نہیں مارتی؟“

دوسری گولگز نے اسے لکھا، ”کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری استری کرنٹ مارتی ہے۔۔۔ میرا بخشش گلیا ہو چکا ہوتا ہے کہ میری استری گرم ہوتی ہے، میں جب اس پر پھیرتی ہوں تو مجھے بجلی کے دھکے لگتے ہیں۔“ جواب میں اس کی سیہلی نے لکھا، ”میں تمہاری استری کی خرابی سمجھ گئی ہوں۔ نیا پلک بھیج رہی ہوں، اس کو لگا کر دیکھو، شاید یہ خرابی دور ہو جائے۔“

وہ پلک آیا۔ بُخوبصورت تھا۔ مگر جب اس نے اپنی استری میں لگانا چاہا تو فٹ نہ ہوا۔ کنڈم کر کے اس نے واپس کر دیا، اور اپنے بخشش رٹ کی رنگری شروع کر دی۔ یہ کام بُدا نازک تھا مگر اس دوسری گولگز نے بڑی محنت سے کیا پر نتیجہ پھر بھی صفر رہا۔۔۔ وہ ”باردہ شمالي“ میں گئی۔ وہاں اس نے پانچ کوہ ہمالہ چھپوں سے سر کیے۔۔۔ وہاں سے تختستہ ہو کے اٹھی اور ایک نہایت وابیت بخشش کے ساتھ ”آتشیں ہاؤس“ جا کر اس نے دس جو لاکھی نگے اور واپس اپنے چڑے کے تھیلے میں آگئی۔

دوسرے دن وہ پھر اپنے چھیتے بش شرٹ سے ملی۔ اس کو اس نے بتایا کہ وہ رات ایک نہایت لغو قسم کے بش شرٹ کے ساتھ ”آتشیں ہاؤس“ گئی تھی، اس نے قطعاً برانہ مانا، وہ سوچنے لگی کہ یہ کیسا کلف لگا بش شرٹ ہے جس کی جیبوں میں رشک اور حسد کے سکے کھنکھناتے ہی نہیں۔

اس نے پھر اپنی سیمیلی گو گلز کو خط لکھا اور سنایا، ”تمہارا بھیجا ہوا پلگ میری استری میں لگا ہی نہیں۔۔۔ میں نے واپس بھیج دیا تھا۔ امید ہے کہ تمہیں مل گیا ہو گا۔۔۔ اب مجھے تم سے یہ پوچھنا ہے کہ میں کیا کروں۔۔۔ وہ میرا بش شرٹ۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا شے ہے۔۔۔ خدا کے لیے آؤ۔۔۔ میں بہت پریشان ہوں، اپنے بش شرٹ کو میر اسلام کہنا، میر اخیال ہے کہ تم اس کو ہر رات پہنچتے ہو۔۔۔ اس کا کپڑا بڑا مالمم ہے۔“

اس کی سیمیلی، اس کے بلا وے پر آگئی، اس کے ساتھ کا اپنا بش شرٹ نہیں تھا۔۔۔ دونوں بہت خوش تھیں، ان کے شیشے آپس میں ٹکرائے۔۔۔ بڑی کھلکھلیں پیدا ہوئیں، جیسے کئی کانچ کی چوڑیاں ایک کلانی میں پڑی نجگر ہیں۔ اس کی سیمیلی گو گلز کا فریم سنہرا تھا۔ اسے دیکھ کر دوسرا کو تھوڑا سار شک ہوا، مگر اس نے اس جذبے کو فوراً دور کر دیا اور اس سنہرے فریم کا تعارف اپنے ” بش شرٹ“ سے کرایا تاکہ وہ اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرے اور بتائے کہ اس پر استری کس طرح کرنی چاہیے تاکہ اس کی سلوٹیں دور ہو جائیں۔

وہ اپنی سیمیلی کے بش شرٹ سے بڑے تپاک سے ملی، اس نے بڑے غور سے اس کاٹا نکہ دیکھا، مگر اسے کوئی عیب نظر نہ آیا۔ وہ اس کے اپنے بش شرٹ کے مقابلہ میں کئی درجے اچھا سلا ہوا تھا۔ ان دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہیں، آخر ایک دن انہوں نے ”باردہ شمالی“ جانے کا پروگرام بنایا۔ وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس بش شرٹ کا رہ عمل کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنی سیمیلی گو گلز سے کہہ گئی تھی کہ وہ اپنے شیشوں میں سے اس کے بش شرٹ کو دیکھنا چاہتی ہے۔

جب وہ ”باردہ شمالی“ میں گئے تو وہاں اس بش شرٹ کو آگ لگ گئی جس میں اس نے اپنی ساتھی گو گلز کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔۔۔ دونوں دیر تک اس آگ میں جلتے رہے۔۔۔ اور اسے بھانے کے لیے ”آتشیں ہاؤس“ میں چلے گئے۔۔۔ چونکہ آبلے زیادہ پڑ گئے تھے، اس لیے وہ کئی دن ان کا اعلان باہر ہی باہر کرتے رہے۔

دوسری گو گلزار حیران تھی کہ یہ دونوں کہاں غائب ہو گئے ہیں۔۔۔ اس کے دونوں شیشے دھنڈ لے ہوتے جا رہے تھے کہ اچانک اس کی سیکھی کا بخشش تھرٹ آگیا۔ اس نے اس کو نہ پہچانا اور کہا، ”معاف کیجیے گا میرے شیشے دھنڈ لے ہو گئے ہیں۔“ اس نے فوراً اس کے شیشے نکالے، ان کو اپنی سانسوں سے پہلے گرم، پھر نم آسود کیا، اور اپنے دامن سے پوچھ کر صاف کر دیا۔

وہ حیرت زدہ ہو گئی۔۔۔ اس کی زندگی میں اس کے شیشے کبھی اتنے صاف نہیں ہوئے تھے۔۔۔ دونوں ”باردہ شمالی“ میں کوہ ہمالہ کھانے کے لیے گئے۔۔۔ وہ یہ کہا ہی رہے تھے کہ پہلا بخشش تھرٹ دوسری گو گلزار کے ساتھ آگیا۔ دونوں خاموش رہے۔۔۔ انہوں نے دل ہی دل میں محسوس کر لیا کہ وہ غلط چوٹیوں پر پڑھ رہے تھے۔

-[112]-

منظور: سعادت حسن منٹو

جب اسے ہسپتال میں داخل کیا گیا تو اس کی حالت بہت خراب تھی۔ پہلی رات اسے آسیجن پر رکھا گیا۔ جونس ڈیوٹی پر تھی، اس کا خیال تھا کہ یہ نیا مریض صح سے پہلے پہلے مر جائے گا۔ اس کی نبض کی رفتار غیر یقینی تھی۔ کبھی زور زور سے پھر پھر اتی اور کبھی لمبے و قفوں کے بعد چلتی تھی۔

پسینے میں اس کا بدن شر ابور تھا، ایک لمحے کے لیے بھی اسے چین نہیں ملتا تھا۔ کبھی اس کروٹ لیتا، کبھی اس کروٹ۔ جب گھبر اہٹ بہت زیادہ بڑھ جاتی تو اٹھ کر بیٹھ جاتا اور لمبے سانس لینے لگتا۔ رنگ اس کا بلدی کی گانٹھ کی طرح زرد تھا۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں، ناک کا بانسابر ف کی ڈلی، سارے بدن پر رعشہ تھا۔ ساری رات اس نے بڑے شدید کرب میں کاٹی، آسیجن برادری جا رہی تھی، صح ہوئی تو اسے کسی قدر افاقہ ہوا اور وہ نذر حال ہو کر سو گیا۔

اس کے دو تین عزیز آئے۔ کچھ دیر بیٹھ رہے اور چلے گئے۔ ڈاکٹروں نے انھیں بتا دیا تھا کہ مریض کو دل کا عارضہ ہے جسے ”کورونزی تھرموس“ کہتے ہیں۔ یہ بہت مہلک ہوتا ہے۔ جب وہ اٹھا تو اسے ٹیکے لگادیے گئے۔ اس کے بدл میں بدستور میٹھا میٹھا درد ہو رہا تھا۔ شانوں کے پٹھے اکٹھے ہوئے تھے جیسے رات بھرا نہیں کوئی کوٹارہا تھا۔ جسم کی بوٹی بوٹی دکھر رہی تھی مگر نقابت کے باعث وہ بہت زیادہ تکلیف محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ویسے اس کو یقین تھا کہ اس کی موت دور نہیں، آج تو نہیں کل ضرور مر جائے گا۔

اس کی عمر بیس برس کے قریب تھی۔ ان برسوں میں اس نے کوئی راحت نہیں دیکھی تھی، جو اس وقت اسے یاد آتی اور اس کی صعوبت میں اضافہ کرتی۔ اس کے ماں باپ اس کو بچپن ہی میں داغ مفارقت دے گیے تھے۔ معلوم نہیں اس کی پرورش کس خاص شخص نے کی تھی۔ بس وہ ایسے ہی ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھاتا اس عمر تک پہنچ گیا اور ایک کارخانے میں ملازم ہو کر بچپنیں روپے ماہوار پر انہتاد رجے کی افلام زدہ زندگی گزار رہا تھا۔

دل میں ٹیسیں نہ اٹھتیں تو وہ اپنی تدرستی اور بیماری میں کوئی نمایاں فرق محسوس نہ کرتا۔ کیونکہ صحت اس کی کبھی بھی اچھی نہیں تھی۔ کوئی نہ کوئی عارضہ اسے ضرور لاحق رہتا تھا۔ شام تک اسے چار ٹیکے لگ چکے تھے۔ آکسیجن ہٹالی گئی تھی۔ دل کا درد کسی قدر کم تھا، اس لیے وہ ہوش میں تھا اور اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے سکتا تھا۔

وہ بہت بڑے وارڈ میں تھا جس میں اس کی طرح اور کئی مریض لوہے کی چارپائیوں پر لیٹے تھے۔ نر میں اپنے کام میں مشغول تھیں۔ اس کے دامنے ہاتھ نو دس برس کا لڑکا کمبل میں لپٹا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کا چہرہ تمثیل رہا تھا۔

”السلام علیکم“ لڑکے نے بڑے پیار سے کہا۔

نئے مریض نے اس کے پیار بھرے لبھ سے متاثر ہو کر جواب دیا، ”وعلیکم السلام۔“ لڑکے نے کمبل میں کروٹ بدلتی، ”جھائی جان! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ نئے مریض نے اختصار سے کہا، ”اللہ کا شکر ہے۔“

لڑکے کا چہرہ اور زیادہ تمثیل اٹھا، ”آپ بہت جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ کا نام کیا ہے؟“

”میرا نام!“ نئے مریض نے مسکرا کر لڑکے کی طرف برادرانہ شفقت سے دیکھا۔

”میرا نام اختتہ ہے۔“

”میرا نام منظور ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک دم کروٹ بدلتی اور اس نر س کو پکارا جو ادھر سے گزر رہی تھی، ”آپا جان۔۔۔ آپا جان۔۔۔“

نر رک گئی۔ منظور نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سلام کیا۔ نر قریب آئی اور اسے پیار کر کے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اسٹنٹ ہاؤس سر جن آیا۔ منظور نے اس کو بھی سلام کیا، ”ڈاکٹر جی، السلام علیکم۔“ ڈاکٹر سلام کا جواب دے کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور دیر تک اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے باتیں کرتا رہا جو ہسپتال کے بارے میں تھیں۔

منظور کو اپنے وارڈ کے ہر مریض سے لچکی تھی۔ اس کو معلوم تھا کس کی حالت اچھی ہے اور کس کی حالت خراب ہے۔ کون آیا ہے، کون گیا ہے۔ سب نر سیں اس کی بہنیں تھیں اور سب ڈاکٹر اس کے دوست۔ مریضوں میں کوئی چچا تھا، کوئی ماں اور کوئی بھائی۔ سب اس سے پیار کرتے تھے۔ اس کی شکل و صورت معمولی تھی مگر اس میں غیر معمولی کشش تھی۔ ہر وقت اس کے چہرے پر تمثیل ہٹ کھیلتی رہتی جو اس کی معصومیت پر ہالے کا کام دیتی تھی۔ وہ ہر وقت خوش رہتا تھا۔ بہت زیادہ با تونی تھا، مگر اختر کو، حالانکہ وہ دل کا مریض تھا اور اس مرض کے باعث بہت چڑچڑا ہو گیا تھا، اس کی یہ عادت کھلتی نہیں تھی۔

چونکہ اس کا بستر اختر کے بستر کے پاس تھا اس لیے وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد اس سے گفتگو شروع کر دیتا تھا جو چھوٹے چھوٹے معصوم جملوں پر مشتمل ہوتی تھی:

”بھائی جان! آپ کے بھائی بہن ہیں؟“

”میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا لڑکا ہوں۔“

”آپ کے دل میں اب درد تو نہیں ہوتا ہے؟“

”مجھے معلوم نہیں دل کا درد کیسا ہوتا ہے۔“

”آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔۔۔ دودھ زیادہ پیا کریں!“

”میں بڑے ڈاکٹر جی سے کہوں، وہ آپ کو مکھن بھی دیا کریں گے۔“

بڑا کثرت بھی اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ صبح جب راؤنڈ پر آتا تو کرسی منگا کر اس کے پاس تھوڑی دیر تک ضرور بیٹھتا اور اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہتا۔

اس کا باپ درزی تھا۔ دوپہر کو پندرہ بیس منٹ کے لیے آتا۔ سخت افراتفری کے عالم میں اس کے لیے پھل وغیرہ لاتا اور جلدی جلدی اسے کھلا کر اور اس کے سر پر محبت کا ہاتھ پھیر کر چلا جاتا۔ شام کو اس کی ماں آتی اور بر قع اوڑھے دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہتی۔ اختر نے اسی وقت اس سے دلی رشته قائم کر لیا تھا، جب اس نے اس کو سلام کیا تھا۔ اس سے باتیں کرنے کے بعد یہ رشته اور بھی مضبوط ہو گیا۔ دوسرے دن رات کی خاموشی میں جب اسے سوچنے کا موقع ملا تو اس نے محسوس کیا، اس کو جو افاقہ ہوا ہے، منظور ہی کا مجوزہ ہے۔

ڈاکٹر جواب دے پکے تھے۔ وہ صرف چند گھنٹیوں کا مہمان تھا۔ منظور نے اس کو بتایا تھا کہ جب اسے بستر پر لٹایا گیا تھا تو اس کی نبض قریب قریب غائب تھی۔ اس نے دل ہی دل میں کئی مرتبہ دعائی گئی تھی کہ خدا اس پر رحم کرے۔ یہ اس کی دعا ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ مرتبے مرتبے گیا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہے گا، اس لیے کہ اس کا مرض بہت مہلک تھا۔ بہر حال اب اس کے دل میں اتنی خواہش ضرور پیدا ہو گئی تھی کہ وہ کچھ دن زندہ رہے تاکہ منظور سے اس کا رشته فورانہ ٹوٹ جائے۔

دو تین روز گزر گئے۔ منظور حسب معمول سارا دن چہکتا رہتا تھا۔ کبھی نرسوں سے باتیں کرتا، کبھی ڈاکٹروں سے، کبھی جعدادروں سے۔ یہ بھی اس کے دوست تھے۔ اختر کو تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وارڈ کی بد بودار فضائیا ہر ذرہ اس کا دوست ہے۔ وہ جس شے کی طرف دیکھتا تھا، فوراً اس کی دوست بن جاتی تھی۔

دو تین روز گزرنے کے بعد جب اختر کو معلوم ہوا کہ منظور کا نچلا دھڑ مفلوج ہے تو اسے سخت صدمہ پہنچا، لیکن اس کو جیرت بھی ہوئی کہ اتنے بڑے نقصان کے باوجود وہ خوش کیوں نکر رہتا ہے۔ باتیں جب اس کے منہ سے بلبلوں کے مانند نکلتی تھیں تو انھیں سن کر کون کہہ سکتا تھا کہ اس کا نچلا دھڑ گوشت پوست کا بے جان لو تھڑا ہے۔

اختر نے اس سے اس کے فالج کے متعلق کوئی بات نہ کی۔ اس لیے کہ اس سے ایسی بات کے متعلق پوچھنا بہت بڑی حماقت ہوتی، جس سے وہ قطعاً بے خبر معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اسے کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا کہ منظور ایک دن جب کھلیل کو دکروالیں آیا تو اس نے ٹھنڈے پانی سے نہالیا جس کے باعث ایک دم اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا۔

ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا، انھیں بہت دکھ ہوا۔ شروع شروع میں حکیموں کا علاج کرایا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پھر ٹونے ٹوٹکوں کا سہارا لیا مگر بے سود۔ آخر کسی کے کہنے پر انھوں نے اسے ہسپتال میں داخل کرایا تاکہ باقاعدگی سے اس کا علاج ہوتا رہے۔

ڈاکٹر مایوس تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ اس کے جسم کا مفلوج حصہ کبھی درست نہ ہو گا مگر پھر بھی اس کے والدین کا جی رکھنے کے لیے وہ اس کا علاج کر رہے تھے۔ انھیں حیرت تھی کہ وہ اتنی دیر زندہ کیسے رہا ہے۔ اس لیے کہ اس پر فانچ کا حملہ بہت شدید تھا، جس نے اس کے جسم کا نچلا حصہ بالکل ناکارہ کرنے کے سوا اس کے بدن کے بہت سے نازک اعضا جھنجور کر کر کھدیے تھے۔ وہ اس پر ترس کھاتے تھے اور اس سے پیار کرتے تھے، اس لیے کہ اس نے سدا خوش رہنے کا گراپنی اس شدید عالت سے سیکھا تھا۔ اس کے مخصوص دماغ نے یہ طریقہ خود ایجاد کیا تھا کہ اس کا دکھ دب جائے۔

اختر پر پھر ایک دورہ پڑا۔ یہ پہلے دورے سے کہیں زیادہ تکلیف دہ اور خطرناک تھا مگر اس نے صبر اور تحمل سے کام لیا اور منظور کی مثال سامنے رکھ کر اپنے دکھ درد سے غافل رہنے کی کوشش کی جس میں اسے کامیابی ہوئی، ڈاکٹروں کو اس مرتبہ تو سونی صدی یقین تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں بجا سکتی، مگر مجذہ رونما ہوا اور رات کی ڈیوٹی پر متعین نرسر نے صحیح سوریرے اسے دوسری نرسوں کے سپرد کیا تو اس کی گرفتی ہوئی بنسنچل بھی تھی۔۔۔ وہ زندہ تھا۔

موت سے کشتی لڑتے لڑتے نہ حال ہو کر جب وہ سونے گا تو اس نے نیم مندی ہوئی آنکھوں سے منظور کی طرف دیکھا جو مونخواب تھا۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اختر نے اپنے کمزور اور نحیف دل میں اس کی پیشانی کو چوما اور سو گیا۔ جب اٹھا تو منظور چپک رہا تھا، اسی کے متعلق ایک نرس سے کہہ رہا تھا، ”آپا، اختر بھائی جان کو جگاؤ۔ دو اکا وقت ہو گیا ہے۔“

”سو نے دو۔۔۔ اسے آرام کی ضرورت ہے۔“

”نہیں۔۔۔ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ انھیں دوادیجھیے۔“

”اچھا دے دوں گی۔“

منظور نے جب اختر کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ بہت خوش ہو کر باواز بلند کہا، ”السلام علیکم!“ اختر نے نقاہت بھرے لبجے میں جواب دیا، ”وعلیکم السلام!“

”بھائی جان! آپ بہت سوئے۔“

”ہاں---شاید۔“

”زر آپ کے لیے دوالا رہی ہے۔“

اختر نے محسوس کیا کہ منظور کی باتیں اس کے نحیف دل کو تقویت پہنچا رہی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ خود اسی کی طرح چکنے چکارنے لگا۔ اس نے منظور سے پوچھا، ”اس مرتبہ بھی تم نے میرے لیے دعماً نگی تھی؟“ منظور نے جواب دیا، ”نہیں۔“

”کیوں؟“

”میں روز رو دعا میں نہیں مانگا کرتا۔۔۔ ایک دفعہ مانگ لی، کافی تھی۔ مجھے معلوم تھا آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔“ اس کے لبجے میں یقین تھا۔ اختر نے اسے ذرا سا چھیڑنے کے لیے کہا، ”تم دوسروں سے کہتے رہتے ہو کہ ٹھیک ہو جاؤ گے، خود کیوں نہیں ٹھیک ہو ہو اکر گھر چلے جاتے۔“ منظور نے تھوڑی دیر سوچا، ”میں بھی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ بڑے ڈاکٹر جی کہتے تھے کہ تم ایک مہینے تک چلنے پھرنے لگو گے۔۔۔ دیکھیے ناب میں نیچے اور اوپر کھسک سکتا ہوں۔“

اس نے کمبل میں اوپر نیچے کھسکنے کی ناکام کوشش کی۔ اختر نے فوراً کہا، ”واہ منظور میاں واہ۔۔۔ ایک مہینہ کیا ہے۔۔۔ یوں گزر جائے گا۔“ منظور نے چیلکی بجائی اور خوش ہو کر ہنسنے لگا۔

ایک مہینے سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ اس دوران میں اختر پر دل کے دو تین دورے پڑے جو زیادہ شدید نہیں تھے۔ اب اس کی حالت بہتر تھی، نقاہت دور ہو رہی تھی۔ اعصاب میں پہلا ساتناو بھی نہیں تھا۔ دل کی رفتار ٹھیک تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اب وہ خطرے سے باہر ہے۔ لیکن ان کا تعجب بدستور قائم تھا کہ وہ نج کیسے گیا۔

اختر دل ہی دل میں ہستا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے بچانے والا کون ہے۔ وہ کوئی انگشن نہیں تھا۔ کوئی دوائی ایسی نہیں تھی۔ وہ منظور تھا۔ مفلوج منظور، جس کا نچلا دھڑ بالکل ناکارہ ہو چکا تھا، اور جسے یہ خوش فہمی تھی کہ اس کے گوشت پوسٹ کے بے جان لو تھڑے میں زندگی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔

اختر اور منظور کی دوستی بہت بڑھ گئی تھی۔ منظور کی ذات اس کی نظر و میں مسیح اکار تبہ رکھتی تھی کہ اس نے اس کو دوبارہ زندگی عطا کی تھی اور اس کے دل و دماغ سے وہ تمام کا لے بادل ہٹادیے تھے جن کے سامنے میں وہ اتنی دیر تک گھٹی گھٹی زندگی بسر کرتا رہا تھا۔ اس کی قتوطیت رجائیت میں تبدیل ہو گئی تھی، اسے زندہ رہنے سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ بالکل ٹھیک ہو کر ہسپتال سے نکلے اور ایک نئی صحت مند زندگی بسر کرنی شروع کر دے۔

اسے بڑی الجھن ہوتی تھی جب وہ دیکھتا تھا کہ منظورویے کا ویسا ہے۔ اس کے جسم کے مفلوج حصے پر ہر روز ماش ہوتی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا تھا، اس کی خوش رہنے والی طبیعت شفقت سے شفقتہ ترہور ہی تھی۔ یہ بات حیرت اور الجھن کا باعث تھی۔

ایک دن بڑے ڈاکٹر نے منظور کے باپ سے کہا کہ اب وہ اسے گھر لے جائے کیوں کہ اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔ منظور کو صرف اتنا پتہ چلا کہ اب اس کا علاج ہسپتال کے بجائے گھر پر ہو گا اور بہت ٹھیک ہو جائے گا، مگر اسے سخت صدمہ پہنچا۔ وہ گھر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اختر نے جب اس سے پوچھا کہ وہ ہسپتال میں کیوں رہنا چاہتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”وہاں اکیلار ہوں گا۔ اباد کان پر جاتا ہے، ماں ہمسائی کے ہاں جا کر کپڑے سیتی ہے، میں وہاں کس سے کھیلا کروں گا، کس سے باتیں کروں گا۔“

اختر نے بڑے بیار سے کہا، ”تم اچھے جو ہو جاؤ گے منظور میاں۔ چند دن کی بات ہے پھر تم باہر اپنے دوستوں سے کھیلا کرنا۔ اسکوں جایا کرنا۔“

”نہیں نہیں۔“ منظور نے کمبل سے اپنا سدا تمتما نے والا چہرہ ڈھانپ کر رونا شروع کر دیا۔ اختر کو بہت دکھ ہوا۔ دیر تک وہ اسے چکارتا پچکارتا رہا۔ آخر اس کی آواز گلے میں رندھ گئی اور اس نے کروٹ بدلتی۔

شام کو ہاؤس سرجن نے اختر کو بتایا کہ بڑے ڈاکٹر صاحب نے اس کی ریلیز کا آرڈر دے دیا ہے۔ وہ صحیح جا سکتا ہے۔ منظور نے سنا تو بہت خوش ہوا۔ اس نے اتنی باتیں کیں، اتنی باتیں کیں کہ تھک گیا۔ ہر نرس کو، ہر اسموڈنٹ کو، ہر جمدار کو اس نے بتایا کہ بھائی جان اختر جا رہے ہیں۔

رات کو بھی وہ اختر سے دیر تک خوشی سے بھر پور نئی معموم باتیں کرتا رہا۔ آخر سو گیا۔ اختر جا گئا اور سوچتا رہا کہ منظور کب تک ٹھیک ہو گا۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی دوام موجود نہیں جو اس پیارے بچے کو تدرست کر دے۔ اس نے اس کی صحت کے لیے صدق دل سے دعائیں مالگیں مگر اسے یقین تھا کہ یہ قبول نہیں ہوں گی، اس لیے کہ اس کا دل منظور کا ساپاک دل کیسے ہو سکتا تھا۔

منظور اور اس کی جدائی کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے بہت دکھ ہوتا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ صحیح اس کو وہ چھوڑ کر چلا جائے گا اور اپنی نئی زندگی تعمیر کرنے میں مصروف ہو کر اسے اپنے دل و دماغ سے محکر دے گا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ منظور کی "السلام علیکم" سننے سے پہلے ہی مر جاتا۔ یہ نئی زندگی جو اس کی عطا کر دے تھی، وہ کس منہ سے اٹھا کر ہسپتال سے باہر لے جائے گا۔

سوچتے سوچتے اختر سو گیا۔ صحیح دیر سے اٹھا۔ نر سیسیں وارڈ میں ادھر ادھر تیزی سے چل پھر رہی تھیں۔ کروٹ بدل کر اس نے منظور کی چارپائی کی طرف دیکھا۔ اس پر اس کی بجائے ایک بوڑھا، بڑیوں کا ڈھانچہ، لیٹا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اختر پر سناٹا ساطاری ہو گیا۔ ایک نرس پاس سے گزر رہی تھی، اس سے اس نے قریب قریب چلا کر پوچھا، "منظور کہاں ہے؟"

نرس رکی۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے بڑے افسوس انک لجھ میں جواب دیا، "بے چارہ! صحیح سائز ہے پانچ بجے مر گیا۔" یہ سن کر اختر کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے سمجھا کہ یہ آخری دورہ ہے۔۔۔ مگر اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی اسے ہسپتال سے رخصت ہونا پڑا۔

کیونکہ اس کی جگہ لینے والا مریض داخل کر لیا گیا تھا۔

گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ تمام کمرے لڑکے لڑکیوں، بچے بچیوں اور عورتوں سے بھرے تھے۔ اور وہ شور برپا ہوا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اگر اس کمرے میں دو تین بچے اپنی ماں سے لپٹے دو دھپینے کے لیے بلبار ہے ہیں تو دوسرا کمرے میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ڈھونکی لیے بے سُری تانیں اڑا رہی ہیں۔ نہ تال کی خبر ہے نہ لے کی۔ بس گائے جا رہی ہیں۔ نیچے ڈیوڑھی سے لے کر بالائی منزل کے شہ نشینوں تک مکان مہمانوں سے کھچا کھج بھرا تھا۔ کیوں نہ ہو۔ ایک مکان میں دو بیاہ رپچے تھے۔ میرے دونوں بھائی اپنی چاند سی دلہنیں بیاہ کر لائے تھے۔

رات کے گیارہ بجے کے لگ بھگ دونوں ڈولیاں آئیں، اور گلی میں اس قدر شور برپا ہوا کہ الامان، مگر وہ نظارہ بڑا روح افزاتھا۔ جب گلی کی سب شوخ و شنگ لڑکیاں باہر نکل آئیں اور تیتریوں کی طرح ادھر پھر پھر انے لگیں۔

سائزیوں کی ریشمی سر سراہٹ، کلف گلی شلواروں کی کھڑکھڑاہٹ اور چوڑیوں کی ھنکھناہٹ ہوا میں تیرنے لگی۔ تھمتا تھے ہوئے مکھڑوں پر بار بار گرتی ہوئی لٹیں، ننھے ننھے سینوں پر زور دے کر نکالی ہوئی بلند آوازیں، اوپھی ایڑی کے بوٹوں پر تھر کتی ہوئی ٹاگمیں، چکتی ہوئی انگلیاں، دھڑکتے ہوئے لبجے، پھٹکتی ہوئیں رگیں اور پھر ان الہڑ لڑکیوں کی آپس کی سرگوشیاں۔۔۔! یہ سب کچھ دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ گلی کے پھر میلے فرش پر حسن و شباب اپنے قلم سے معانی لکھ رہا ہے!

عباس میرے پاس کھڑا تھا۔ ہم دونوں عورتوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے تھے۔ دفعتاً عباس نے گلی کے نکٹ پر نظریں گاڑ کر کہا، ”شو شو کہاں ہے؟“ میں نے جواب دیا، ”مجھے اس وقت تمہارے سوال کا جواب دینے کی فرصت نہیں ہے۔“ میں اس ہجوم میں اس بھوزرے کے مانند کھڑا تھا جو پھولوں بھری کیاری دیکھ کر یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کس پھول پر بیٹھے۔ عباس نے رومنی آواز میں کہا، ”وہ نہیں آئی!“

”تو کیا ہوا۔۔۔ باقی تو سب موجود ہیں۔۔۔ ارے۔۔۔ دیکھو تو وہ نیلی سائزی میں کون ہے۔۔۔؟ شو شو۔“ میں نے عباس کا ہاتھ دبایا۔ عباس نے غور سے دیکھا۔ نیلی سائزی میں۔۔۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے مخصوص انداز میں میری طرف تھر آکو دنگا ہوں سے دیکھ کر کہا۔ ”علانج کرو اپنی آنکھوں کا۔۔۔ چغد کہیں کے، یہ شو شو ہے؟“

”کیوں وہ نہیں ہے کیا؟“ میں نے پھر نیلی ساری کی طرف غور سے دیکھا اور ایسا کرتے ہوئے میری لگاہیں ایکا ایکی اس لڑکی کی لگاہوں سے
ٹکرائیں کچھ اس طور پر کہ اس کو ایک دھکا سالاگا۔ وہ سنبھلی اور فوراً منہ سے لال جیب نکال کر میرا منہ چڑایا۔ اپنی سیمیلی کے کان میں کچھ
کہا۔۔۔ اس سیمیلی نے ہنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔۔۔ میرے ماتھے پر پسینہ آگیا۔

عباس نے جو اپنا اطمینان کرنے کے لیے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھ رہا تھا بلند آواز میں کہا، ”بخدا تم اس کی توبین کر رہے ہو۔۔۔ گدھے
کہیں کے۔۔۔ عورت کے معاملے میں نرے احتمق ہو۔۔۔ کاٹھ کی کوئی پتی نیلے رنگ میں لپیٹ لپاٹ کر تمہارے سامنے رکھ دی جائے۔ تم
اسی کی بلاسیں لینا شروع کر دو گے۔“

یہ الفاظ اتنی اوپنجی آواز میں ادا کیے گئے تھے کہ اس نیلی ساری والی نے سن لیے، جب وہ ہمارے پاس سے گزرنے لگی تو خود بخود ٹھٹھک گئی۔
ایک لحظے کے لیے اس کے قدم رکے، گویا ہم میں سے کسی نے اس کو مخاطب کیا ہے۔ پھر فوراً اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور اس احساس
کی پیدا کی ہوئی تفت دوڑ کرنے کے لیے اس نے یوں ہنی چیچے ٹرکر دیکھا اور کہا، ”ارے۔۔۔ امینہ تو کہاں اڑ گئی؟!“

مجھے موقع ملا۔ میں نے جھٹ سے عباس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اسے اچھی طرح دبا کر اس سے کہا، ”آپ سے مل کر بہت خوشی
حاصل ہوئی۔ مگر میرا نام محمد امین ہے۔۔۔ مجھے نیل کنٹھ بھی کہتے ہیں۔۔۔“

جل ہی تو گئی۔ مگر ہم زیرِ لب مسکراتے آگے بڑھ گئے۔ چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ عباس نے اضطراب بھرے لجھ میں کہا، ”شوشا بھی
تک نہیں آئی۔“

”تو میں کیا کروں۔۔۔ میرے سر پر نمدہ باندھ دیجیے۔ تو میں ابھی سر کار کے لیے اسے تلاش کر کے لے آتا ہوں۔۔۔ آخر یہ کیا حماقت ہے
بھی۔ تم تماشا بھی دیکھنے دو گے یا کہ نہیں۔۔۔؟ اور پھر جناب یہ تو بتائیے۔ اگر وہ یہاں موجود بھی ہو تو آپ اس سے ملاقات کیوں نکر کر سکتے
ہیں۔۔۔ آپ کوئی امر کی ناول نہیں پڑھ رہے۔ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہے۔“

عباس میری بات فوراً سمجھ گیا۔ وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا۔ چنانچہ ہم دونوں آہستہ آہستہ قدم اٹھائے گلی سے نکل کر بازار میں چلے گئے۔ موڑ
پر رام بھروسے پنوٹھی کی دکان کھلی تھی جو بجلی کے قمقے کے نیچے سرجھ کائے او گھر رہا تھا۔ ہم نے اس سے دوپان بنوائے اور وہیں بازار میں
کر سیوں پر بیٹھ کر باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے۔ دیر تک ہم ہندوستان میں مرد عورت کے درمیان جوانہ بیت چلی آرہی ہے، اس کے

بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ جب ایک نجی گیا تو عباس جمائی لے کر اٹھا اور کہنے لگا، ”بھئی اب نیند آ رہی ہے۔۔۔ اس حسرت کو ساتھ لیے جا رہا ہوں کہ شوشو کونہ دیکھ سکا۔ سچ کہتا ہوں امین وہ لڑکی۔۔۔ میں اب تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کیا ہے؟“

عباس نے اپنے گھر کا رخ کیا اور میں نے اپنے گھر کا۔ راستے میں سوچتا رہا کہ عباس نے شوشو جیسی معمولی لڑکی میں ایسی کون سی غیر معمولی چیز دیکھی ہے جو ہر وقت اسی کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ عباس کے مذاق کے متعلق میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بڑا اونچا ہے۔ مگر یہاں اسے کیا ہو گیا تھا۔۔۔؟ شوشو۔۔۔ شوشو۔۔۔ ارے یہ کیا۔۔۔؟ دو تین بار اس کا نام میری زبان پر آیا تو میں نے یوں محسوس کیا کہ پیپر منٹ کی گولیاں چوں رہا ہوں۔۔۔ شوشو۔۔۔ ایک دو مرتبہ آپ بھی اسے دوہرایئے۔ ذرا جلدی جلدی۔۔۔ کیا آپ کو لذت محسوس ہوئی۔۔۔ ضرور ہوئی ہو گی مگر کیوں۔۔۔؟ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں عباس کی محبوہ شوشو کے بارے میں خواخواہ کیوں غور کرنے لگا ہوں؟ اس میں ایسی کوئی چیز ہے ہی نہیں جو غور افروز ہو مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ یہ شوشونام میں دلچسپی ضرور تھی، اور کیا کہا تھا میں نے۔۔۔ لذت بھی۔“

شوشو میں بانجھو کے تھرکتے ہوئے تاروں کی جھنکار سی پائی جاتی ہے۔ آپ یہ نام پکاریئے تو ایسا معلوم ہو گا کہ آپ نے کسی ساز کے تنے ہوئے تاروں پر زور سے گز پھیر دیا ہے۔ شوشو۔۔۔ سو شیلا کا دوسرا نام ہے۔ یعنی اس کی بگڑی ہوئی شکل مگر اس کے باوجود اس میں کتنی مو سیقی ہے۔۔۔ سو شیلا۔۔۔ شوشو۔۔۔ شوشو۔۔۔ سو شیلا۔۔۔ غلط۔۔۔ سو شیلا میں شوشو کی سی مو سیقیت ہر گز نہیں ہو سکتی!

فرنگی شاعر بائز ن شکلیں تھا مگر اس میں وہ کون سی شے تھی جو عورتوں کے سینے میں یہ جان برباکر دیتی تھی۔۔۔؟ اس کا انگڑا کر چلنا۔ گریٹا گاربو قطعاً نوش شکل نہیں ہے مگر اس میں کون سی چیز ہے جو فلمی تماشا یوں پر جادو کا کام کرتی ہے۔۔۔؟ اس کا ذرا بگڑے ہوئے انگریزی لمحے میں با تیں کرنا۔۔۔ یہ کیا بات ہے کہ بعض اوقات اچھی بھلی شے کو بگڑنے سے اس میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔۔۔؟

سو شیلا پندرہ برس کی ایک معمولی لڑکی ہے جو ہمارے پڑوس میں رہتی ہے۔ اس عمر میں ان تمام چیزوں کی مالک ہے جو عام نوجوانوں کے سینے میں ہلکل پیدا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ مگر عباس کی نظر وہ میں یہ کوئی خوبی نہ تھی۔ عام نوجوانوں کی طرح عباس کا دل گھاس کی پتی کے مانند نہیں تھا جو ہوا کے ہلکے سے جھونکے کے ساتھ ہی کا نپنا شروع کر دیتی ہے۔۔۔ خدا جانے وہ اس کی کس ادا پر مر تھا۔ جو میرے ذہن سے بالا تر تھی۔

میں نے سو شیلا کی شکل و صورت اور اس کی صناعانہ قدر و قیمت کے متعلق کبھی غور نہیں کیا تھا۔ مگر نہ جانے میں اس روز اس کے متعلق کیوں سوچتا رہا۔ بار بار وہ میرے ذہن میں آ رہی تھی۔ اور ہر بار میں سو شیلا کو چھوڑ کر اس کے مختصر نام شوشوکی مو سیقی میں گم ہو جاتا تھا۔ انہی خیالات میں غرق گلی کے موڑ پر پہنچ گیا، اور مجھے اس چیز کا احساس اس وقت ہوا جب میں نے دفتاؤہاں کی فضا کو غیر معمولی طور پر خاموش پایا۔ مکان میری نظروں کے سامنے تھا۔ اس کے باہر گلی کی دیوار کے ساتھ ایک بر قی قمقہ لٹک رہا تھا جس کی چوندھیادینے والی روشنی ساری گلی میں بکھری ہوئی تھی۔۔۔ مجھے اس قمقے کے ”تجدد“ پر بڑا تر س آیا۔ گلی بالکل سنسان تھی اور وہ قمقہ متین معلوم ہوتا تھا۔

گھر میں داخل ہوا تو وہاں بھی خاموشی تھی۔ البتہ کبھی کبھار کسی بچے کے رونے کی لرزائ صدا اور پھر ساتھ ہی اس کی ماں کی خواب آلوہ آواز سنائی دیتی تھی۔ ڈیوٹھی کے ساتھ والا کمرہ کھول کر میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ پاس ہی تپائی پر ”رومَان“ پڑا تھا۔ اس کو اٹھا کر میں نے ورق گردانی شروع کی۔ ورق اللئے اللئے اختر کی غزل پر نظریں جنم گئیں۔ مطلع کس قدر حسین تھا۔

نہ بھولے گا ترا توں کو شرماتے ہوئے آنا
رسیلی انھڑیوں سے نیند برساتے ہوئے آنا

مجھے نیند آگئی۔ کلاک کی طرف دیکھا تو چھوٹی سوئی دوکے ہندسے کے پاس پہنچ چکی تھی، اور اس کا اعلان کرنے کے لیے الارم میں ارتقاش پیدا ہو رہا تھا۔۔۔ ٹن نن نن۔۔۔ ن! دونج گئے۔۔۔ میں اٹھا اور سونے کے ارادے سے سیڑھیاں طے کر کے اپنی خواب گاہ میں پہنچا۔ بہار کے دن تھے اور موسم جنک۔ میری خواب گاہ کی ایک کھڑکی باہر کی گلی میں کھلتی ہے۔ جس کے پیازی رنگ کے ریشمی پر دے میں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے بڑی پیاری لہریں پیدا کر رہے تھے۔ میں نے شب خوابی کا لباس پہننا اور سبز رنگ کا قمقہ روشن کر کے بستر پر لیٹ گیا۔

میری پلکیں آپس میں ملنے لگیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں دھنکی ہوئی روئی کے بہت بڑے انبار میں دھنسا جا رہا ہوں۔ نیند اور بیداری کے درمیان ایک لمحہ باقی رہ گیا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں کسی کے بولنے کی گنگناہٹ آئی۔ اس پر ملتی ہوئی پلکیں کھل گئیں۔ اور میں نے غنوڈگی دور کرتے ہوئے غور سے سنا شروع کیا۔ ساتھ والے کمرے میں کوئی بول رہا تھا۔ یا کیک کسی کی دلکش ہنسی کی متننم آواز بلند ہوئی اور پھل جھڑی کے نورانی تاروں کے مانند پر سکوت فضائیں بکھر گئی۔ میں بستر پر سے اٹھا اور دروازے کے ساتھ کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔

”دونوں دلہنیں ماشاء اللہ بڑی خوبصورت ہیں۔“

”چندے آفتاب چندے ماہتاب“

غالباً دو لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ ان کے موضوع نے میری دلچسپی کو بڑھادیا اور میں نے زیادہ غور سے سننا شروع کیا، ”تلے والی سرخ سائزی میں نرگس کتنی بھلی معلوم ہوتی تھی۔۔۔ گورے گورے گالوں پر بکھری ہوئی مقیش۔۔۔ جی چاہتا تھا بڑھ کر بلاں میں لے لوں۔۔۔“

”بچاری سمٹی جا رہی تھی۔۔۔“

”سر تو اٹھایا ہی نہیں اس نے۔۔۔ پر۔۔۔“

”پر یہ شرم و حیا کب تک رہے گی۔۔۔ آج رات۔۔۔“

”آج رات۔۔۔!“

”اوی اللہ۔۔۔ تو کیسی باتیں کر رہی ہے شوشو۔ اس کے ساتھ ہی کپڑے کی سر سراہٹ سنائی دی۔ میرے جسم میں بھلی سی دوڑگئی۔۔۔ شوشو۔۔۔ تو ان میں سے ایک سو شیلا بھی تھی۔ میری دلچسپی اور بھلی بڑھ گئی اور میں نے دروازے میں کوئی دراڑ تلاش کرنا شروع کی، کہ ان کی گفتگو کے ساتھ ساتھ ان کو دیکھ بھی سکوں۔

ایک کواڑ کے نچلے تنخے سے چھوٹی سی گانٹھ نکل گئی تھی، اور اس طرح چونی کے برابر سوراخ پیدا ہو گیا تھا۔ گھنٹوں کے بل بیٹھ کر میں نے اس پر آنکھ جمادی۔ شوشو قالین پر بیٹھی بسکٹی رنگ کی سائزی سے اپنی ننگی پنڈلی کو ڈھانک رہی تھی۔ اس کے پاس عفت شرمائی ہوئی سی گاؤں تینے پر دونوں کہنیاں ٹیکے لیئے تھیں۔

”اس وقت ان گوری چیٹی دلہنوں پر کیا بیت رہی ہو گی؟“ شوشو یہ کہہ کر رک گئی اور اپنی آواز دبا کر اس نے عفت کی چوڑیوں کو چھیڑ کر ان میں گھنٹھناہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا، ”ذراسوچو تو؟“ عفت کے گال ایک لمحے کے لیے تھر تھرائے، ”کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو شوشو۔“

”جی ہاں--- گویا ان باتوں سے دلچسپی نہیں میری ہنگو۔ بس میں ہو تو ابھی سے ابھی اپنی شادی رچالو۔“ عفت نے سو شیلا کی بات کاٹ دی،
”پر یہ دلہنوں کو کہاں لے گئے ہیں شوشو؟“

”کہاں لے گئے ہیں؟“ شوشو مسکرائی، ”سمندر کی تھی میں جہاں جل پر یوں کاراج ہے۔۔۔ کوہ قاف کے غاروں میں جہاں سینگوں والے جن
رہتے ہیں۔۔۔“ چند لمحات کے لیے ایک پر اسرار سکوت طاری رہا۔ اس کے بعد شوشو پھر بولی، ”کہاں لے گئے ہیں۔۔۔؟ لے گئے ہوں گے
اپنے اپنے کمروں میں!“

”یچار یوں کو نیند کیسے آئے گی؟“ ایک لڑکی نے جو ابھی تک خاموش بیٹھی تھی اور جس کا نام میں نہیں جانتا تھا، اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔ شوشو کہنے
لگی، ”بے چاریاں۔۔۔ کوئی ذرا ان کے دل سے جا کر پوچھے کہ ان کی آنکھیں اس رت جگے کے لیے کتنی بے قرار تھیں؟“

”تو بہت خوش ہوں گی؟“

”اور کیا؟“

”پر میں نے یہ سنا ہے کہ یہ لوگ بہت ستایا کرتے ہیں؟“ عفت سو شیلا کے پاس سر ک آئی۔

”میں پوچھتی ہوں، تمہیں اندیشہ کس بات کا ہو رہا ہے۔۔۔؟ جب تمہارے وہ ستانے لگیں گے تو نہ ستانے دینا اٹھیں۔۔۔ ہاتھ پیر باندھ دینا
ان کے۔۔۔ ابھی سے فکر میں کیوں گھلی جا رہی ہو۔“

”ہائیں ہائیں۔“ عفت نے تیزی سے کہا، ”تم کیسی باتیں کر رہی ہو ششو۔ دیکھو تو میرا دل کتنے زور سے دھڑکنے لگا ہے؟“ عفت نے سو شیلا کا
ہاتھ اٹھا کر دل کے مقام پر رکھ دیا، ”کیوں؟“ شوشو نے عفت کے دل کی دھڑکنیں غور سے سینیں اور بڑے پر اسرار لجھ میں کہا، ”جانقی ہو کیا
کہہ رہا ہے؟“ عفت نے جواب دیا، ”نہیں تو؟“

”یہ کہتا ہے عفت بنو غزنوی دلہن بننا چاہتی ہے۔۔۔!“

”ہٹاؤ جی، لاج تو نہیں آتی تمہیں۔“ عفت نے مسکرا کر کروٹ بدی، ”دل اپنا چاہتا ہے تمہارا اور خواہ مخواہ یہ سب کچھ میرے سر منڈھ رہی ہو۔“ پھر یا کیا یک اٹھ کھڑی ہوئی اور سو شیلا سے پوچھنے لگی، ”ہاں، یہ تو بتاؤ شو شو تم بھلا کیسے آدمی سے شادی کرنا پسند کرو گی۔۔۔؟ میرے سر کی قسم، سچ سچ بتاؤ، مجھی کو ہائے ہائے کرو، اگر جھوٹ بولو!“

”میں کیوں بتاؤں۔“ یہ کہہ کر سو شیلا نے تیزی سے اپنے سر کو حرکت دی اور اس کا چہرہ (جو میری) نگاہوں سے پوشیدہ تھا، سامنے آگیا، میں نے غور سے دیکھا وہ مجھے بے حد حسین معلوم ہوئی۔ آنکھیں مست تھیں اور ہونٹ تلوار کے تازہ زخم کے مانند کھلے ہوئے تھے۔ سر کے چند پریشان بال بر قی روشنی سے متور فضای میں ناچ رہے تھے۔ چہرے کا گندمی رنگ نکھرا ہوا تھا اور سینہ پر سے ساڑی کا پلو نیچے ڈھلک گیا تھا، ہو لے ہو لے دھڑک رہا تھا۔ چوڑے ماتھے پر سرخ بندیاڑی پیاری معلوم ہوتی تھی۔

عفت نے اصرار کیا، ”تمہیں میرے سر کی قسم بتاؤ؟“ شو شو نے کہا، ”پہلے تم بتاؤ۔“

”تو سنو، مگر کسی سے کہو گی تو نہیں۔“ یہ کہہ کر عفت کچھ شرمائی گئی، ”میں چاہتی ہوں۔۔۔ میں چاہتی ہوں کہ میری شادی ایسے نوجوان سے ہو۔۔۔ ایسے۔۔۔“ شو شو بولی، ”تو بہ اب کہہ بھی دو۔“ عفت نے پیشانی پر سے بال ہٹائے اور کہا، ”ایسے نوجوان سے ہو جس کا قد لمبا ہو جسم بڑے بھائی کی طرح سڑوں ہو، انگلینڈ ریٹریٹ نہ ہو، انگریزی فرفربولتا ہو۔۔۔ رنگ گورا اور نقش تیکھے ہوں، موڑ چلانا جانتا ہو اور بیڈ منٹن بھی کھیلتا ہو۔“

شو شو نے پوچھا، ”بس کہہ چکیں؟“

”ہاں“ عفت نے نیم والبوں سے سو شیلا کی طرف غور سے دیکھنا شروع کیا۔

”میری دعا ہے کہ پر ما تما تمہیں ایسا ہی پتی عطا فرمائیں۔“ سو شیلا کا چہرہ بڑا سنجیدہ تھا، اور ابھے ایسا تھا جیسے مندر میں کوئی مقدس منتر پڑھ رہی ہے۔ وہ لڑکی جو گفتگو میں بہت کم حصہ لیتی تھی، بولی، ”عفت! اب شو شو کی باری ہے۔“ عفت جو شو شو کی ساڑی کا ایک کنارہ پکڑ کر اپنی انگلی کے گرد پیٹ رہی تھی کہنے لگی، ”بھئی اب تم بتاؤ ہم نے تو اپنے دل کی بات تم سے کہہ دی۔“ شو شو نے جواب دیا، ”سن کے کیا کرو گی۔۔۔؟ میرے خیالات تم سے بالکل مختلف ہیں۔“

”مختلف ہوں یا ملتے ہوں، پر ہم سے بغیر تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔“

”میں---“ سوشاں نے چھت کی طرف دیکھا۔ اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی، ”میں--- پر تم مذاق اڑاؤ گی عفت!“

”ارے--- تم سناؤ تو؟“

سوشاں نے ایک آہ بھری، ”میرے سپنے عجیب و غریب ہیں عفت---“ یہ میرے دماغ میں صابن کے رنگ برلنے بلبلوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور آنکھوں کے سامنے ناف کر غائب ہو جاتے ہیں--- میں سوچتی ہوں--- اور پھر سوچتی ہوں کہ میں کیوں سوچا کرتی ہوں۔ انسان جو کچھ چاہتا ہے اگر ہو جایا کرے تو کتنی اچھی بات ہے--- لیکن پھر زندگی میں کیا رہ جائے گا--- خواہشیں اور تمنائیں کہاں سے پیدا ہوں گی--- ہم جس طرح جی رہے ہیں ٹھیک ہے--- جانتی ہوں کہ جو کچھ مانگ رہی ہوں، نہیں ملے گا۔ مگر دل میں مانگ تو رہے گی--- کیا زندہ رہنے کے لیے یہی کافی نہیں؟“

عفت اور دوسرا لڑکی خاموش بیٹھی تھیں۔

شو شونے پھر کہنا شروع کیا، ”میں اپنا جیون ساتھی ایک ایسے نوجوان کو بنانا چاہتی ہوں جو صرف عمر کے لحاظ سے ہی جوان نہ ہو، بلکہ اس کا دل، اس کا دماغ--- اس کا روایا روایا جوان ہو--- وہ شاعر ہو--- میں شکل و صورت کی قائل نہیں--- مجھے شاعر چاہیے جو میری محبت میں گرفتار ہو کر سرتاپا محبت بن جائے، جس کو میری ہربات میں حسن نظر آئے--- جس کے ہر شعر میں میری اور صرف میری تصویر ہو--- جو میری محبت کی گہرائیوں میں گم ہو جائے--- میں اسے ان تمام چیزوں کے بدالے میں اپنی نسوانیت کا وہ تحفہ دوں گی جو آج تک کوئی عورت نہیں دے سکی۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ عفت جیرت کے مارے اس کا منہ تنکنے لگی۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سوشاں کی گفتگو کا کوئی مطلب نہیں سمجھ سکی۔ میں خود متوجہ تھا کہ پندرہ سولہ برس کی اس دلبی پتلی لڑکی کے سینے میں کیسے کیسے خیالات کرو ٹھیں لے رہے ہیں۔ اس کا ایک لفظ دماغ میں گونج رہا تھا۔

”اگر وہ مجھے نظر آجائے“ یہ کہہ کر سو شیلا آگے بڑھی اور عفت کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہنے لگی، ”تو میں اس کے استقبال کے لیے بڑھوں اور اس کے ہونٹوں پر وہ بوسہ دوں۔ جو ایک زمانے سے میرے ہونٹوں کے نیچے جل رہا ہے۔“ اور شو شونے عفت کے حیرت سے کھلے ہوئے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ جمادیے۔۔۔ اور دیر تک ان کو جماۓ رکھا۔ تجب ہے کہ عفت بالکل ساکت بیٹھی رہی اور متعرض نہ ہوئی۔

جب دونوں کے لب ایک مدھم آواز کے ساتھ جدا ہوئے اور ان کے چہرے مجھے نظر آئے تو ایک عجیب و غریب نظارہ دیکھنے میں آیا۔ جس کو الفاظ بیان ہی نہیں کر سکتے۔ عفت اس شہد کی کمھی کی طرح مسرورو متعجب معلوم ہوتی تھی جس نے پہلی مرتبہ پھول کی نازک پتیوں پر بیٹھ کر اس کا رس چونے کی لذت محسوس کی ہو۔۔۔ اور سو شیلا۔۔۔ وہ اور زیادہ پراسرار ہو گئی تھی۔

”آواب سوئں۔“

یہ خواب آلود اور دھیکی آواز عفت کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کپڑوں کی سر سراہٹ بھی سنائی دی اور میں خیالات کے گھرے سمندر میں غوطہ لگا گیا۔ گندمی رنگ کی ننھی سی گڑیا، اپنے چھوٹے سے دماغ میں کیسے کیسے انوکھے خیالات کی پرورش کر رہی تھی۔۔۔ اور وہ کون ساتھمہ اپنے دامنِ نسوانیت میں چھپائے بیٹھی تھی۔ جو آج تک کوئی عورت مرد کو پیش نہیں کر سکی۔۔۔؟

میں نے سوراخ میں سے دیکھا۔ شو شو اور عفت دونوں ایک دوسری کے گلے میں باہیں ڈالے سورہی تھیں۔ شو شو کے چہرے پر بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کے سانس سے ان میں خفیف سا ارتقاش پیدا ہو رہا تھا۔ وہ کس قدر تروتازہ معلوم ہوتی تھی۔۔۔ واقعی وہ اس قابل تھی کہ اس پر شعر کہے جائیں۔۔۔ لیکن عباس تو شاعر نہیں تھا۔۔۔؟ پھر پھر۔۔۔!

-[114]-

شیر آیا شیر آیا دوڑنا: سعادت حسن منتو

اوپنچھیلے پر گذریے کا لڑکا کھڑا، دور گھنے جنگلوں کی طرف منہ کیے چلا رہا تھا، ”شیر آیا شیر آیا دوڑنا۔“ بہت دیر تک وہ اپنا گلا پھاڑتا رہا۔ اس کی جوان بلند آواز بہت دیر تک فضاؤ میں گونجتی رہی۔ جب چلا چلا کر اس کا حلق سوکھ گیا تو بستی سے دو تین بڑھے لاٹھیاں ٹکتے ہوئے آئے اور گذریے کے لڑکے کو کان سے پکڑ کر لے گئے۔

پنچایت بلائی گئی۔ بستی کے سارے عقائد جمع ہوئے اور گذریے کے لڑکے کا مقدمہ شروع ہوا۔ فرد جرم یہ تھی کہ اس نے غلط خبر دی اور بستی کے امن میں خلل ڈالا۔ لڑکے نے کہا، ”میرے بزرگو، تم غلط سمجھتے ہو۔۔۔ شیر آیا نہیں تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ آنہیں سکتا؟“ جواب ملا، ”وہ نہیں آسکتا۔“ لڑکے نے پوچھا، ”کیوں؟“ جواب ملا، ”محکمہ جنگلات کے افسر نے ہمیں چھپی بھیجی تھی کہ شیر بڑھا ہو چکا ہے۔“ لڑکے نے کہا، ”لیکن آپ کو یہ معلوم نہیں کہ اس نے تھوڑے ہی روز ہوئے کیا کلپ کرایا تھا۔“ جواب ملا، ”یہ افواہ تھی۔ ہم نے محکمہ جنگلات سے پوچھا تھا اور ہمیں یہ جواب آیا تھا کہ کیا کلپ کرانے کی بجائے شیر نے تو اپنے سارے دانت نکلوادیے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی کے بقا یاد ان اہنسا میں گزارنا چاہتا ہے۔“

لڑکے نے جوش کے ساتھ کہا، ”میرے بزرگو! کیا یہ جواب جھوٹا نہیں ہو سکتا۔“ سب نے بیک زبان ہو کر کہا، ”قطعاً نہیں۔ ہمیں محکمہ جنگلات کے افسر پر پورا بھروسہ ہے۔ اس لیے کہ وہ سچ بولنے کا حلف اٹھا چکا ہے۔“ لڑکے نے پوچھا، ”کیا یہ حلف جھوٹا نہیں ہو سکتا؟“ جواب ملا، ”ہرگز نہیں۔۔۔ تم سازشی ہو، فتح کا مست ہو، کمیونسٹ ہو، غدار ہو، ترقی پسند ہو۔۔۔ سعادت حسن منشو ہو۔“ لڑکا مسکرا یا، ”خدا کا شکر ہے کہ میں وہ شیر نہیں جو آنے والا ہے۔۔۔ محکمہ جنگلات کا سچ بولنے والا افسر نہیں۔۔۔ میں۔۔۔“

پنچایت کے ایک بوڑھے آدمی نے لڑکے کی بات کاٹ کر کہا، ”تم اسی گذریے کے لڑکے کی اولاد ہو، جس کی کہانی سالہا سال سے اسکو لوں کی ابتدائی جماعتوں میں پڑھائی جا رہی ہے۔۔۔ تمہارا حشر بھی وہی ہو گا جو اس کا ہوا تھا۔۔۔ شیر آئے گا تو تمہاری ہی تکابوٹی اڑادے گا۔“

گذریے کا لڑکا مسکرا یا، ”میں تو اس سے اڑوں گا۔ مجھے تو ہر گھری اس کے آنے کا کھلا گا رہتا ہے۔۔۔ تم کیوں نہیں سمجھتے ہو کہ شیر آیا شیر آیا والی کہانی جو تم اپنے بچوں کو پڑھاتے ہو آج کی کہانی نہیں۔۔۔ آج کی کہانی میں تو شیر آیا شیر آیا کا مطلب یہ ہے کہ خبردار ہو۔ ہوشیار رہو۔ بہت ممکن ہے شیر کے بجائے کوئی گیدڑی ادھر چلا آئے، مگر اس حیوان کو بھی تروکنا چاہیے۔“ سب لوگ کھکھلا کر ہنس پڑے، ”گیدڑ سے ڈرتے ہو؟“ گذریے کے لڑکے نے کہا، ”میں شیر اور گیدڑ دونوں سے نہیں ڈرتا، لیکن ان کی حیوانیت سے البتہ ضرور خائن رہتا ہوں اور اس حیوانیت کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو ہمیشہ تیار کھتا ہوں۔۔۔ میرے بزرگو، اسکو لوں میں سے وہ کتاب اٹھالو، جس میں شیر آیا شیر آیا والی پرانی کہانی چھپی ہے۔۔۔ اس کی جگہ یہ نئی کہانی پڑھاؤ۔“

ایک بوڑھے نے کھانتے کھکارتے ہوئے کہا، ”یہ لوٹا ہمیں گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ ہمیں راہ مستقیم سے ہٹانا چاہتا ہے۔“ لڑکے نے مسکرا کر کہا، ”زندگی خط مستقیم نہیں ہے میرے بزرگو۔“ دوسرا بڑھے نے فرط جذبات سے لرزتے ہوئے کہا، ”یہ ملحد ہے، یہ بے دین ہے، فتنہ پردازوں کا ایجنت ہے۔ اس کو فوراً زندان میں ڈال دو۔“ گذریے کے لڑکے کو زندان میں ڈال دیا گیا۔

اسی رات بستی میں شیر داخل ہوا۔ بھگدڑچ مچ گئی۔ کچھ بستی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ باقی شیر نے شکار کر لیے۔ موچھوں کے ساتھ گاہو اخون چوتا جب شیر زندان کے پاس سے گزرا تو اس نے مضبوط آہنی سلاخوں کے پیچھے گذریے کے لڑکے کو دیکھا اور دانت پیس کر رہ گیا۔ گذریے کا لڑکا مسکرا یا، ”دوست یہ میرے بزرگوں کی غلطی ہے ورنہ تم میرے لہو کا ذائقہ بھی چکھ لیتے۔“

-[115]-

سراج: سعادت حسن منٹو

ناگ پاڑہ پولیس چوکی کے اس طرف جو چھوٹا سا باغ ہے، اس کے بالکل سامنے ایرانی کے ہوٹل کے باہر، بھلی کے کھبے کے ساتھ لگ کر ڈھونڈو کھڑا تھا۔ دن ڈھلے، مقررہ وقت پروہ یہاں آ جاتا اور صبح چار بجے تک اپنے دھندرے میں مصروف رہتا۔

معلوم نہیں اس کا اصل نام کیا تھا، مگر سب اسے ڈھونڈو کہتے تھے۔ اس لحاظ سے تو یہ بہت مناسب تھا کہ اس کا کام اپنے موکلوں کے لیے ان کی خواہش اور پسند کے مطابق ہر نسل اور ہر رنگ کی لڑکیاں ڈھونڈنا تھا۔ یہ دھندرہ وہ قریب قریب دس برس سے کر رہا تھا۔ اس دوران میں ہزاروں لڑکیاں اس کے ہاتھوں سے گزر چکی تھیں۔ ہر مذہب کی، ہر نسل کی، ہر مزاج کی۔

اس کا اڈہ شروع سے یہی رہا تھا۔ ناگ پاڑہ پولیس چوکی کے اس طرف، باغ کے بالکل سامنے، ایرانی ہوٹل کے باہر بھلی کے کھبے کے ساتھ۔۔۔ کہما اس کا نشان بن گیا تھا۔ بلکہ مجھے تو وہ ڈھونڈو ہی معلوم ہوتا تھا۔ میں جب کبھی ادھر سے گزرتا اور میری نظر اس کھبے پر پڑتی، جس پر جگہ جگہ چونے اور کھتے کی انگلیاں پوچھی گئی تھیں تو مجھے ایسا لگتا کہ ڈھونڈو کھڑا ہے اور کالے کانڈی اور سینکے لی سوپاری والا پان چبارا ہے۔

یہ کھبکا فی اونچا تھا، ڈھونڈو بھی دراز قد تھا۔۔۔ کھبے کے اوپر بجلی کے تاروں کا ایک جال سا بچا تھا۔ کوئی تار دور تک دوڑتا چلا گیا تھا اور دوسرے کھبے کے تاروں کے الجھاؤ میں مدغم ہو گیا تھا۔ کوئی تار کسی بلڈنگ میں اور کوئی کسی دکان میں چلا گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کھبے کی پہنچ دور دور تک ہے۔ وہ دوسرے کھمبوں سے مل کر گویا سارے شہر پر چھایا ہوا ہے۔

اس کھبے کے ساتھ ٹیلی فون کے ملکے نے ایک بکس لگا رکھا تھا، جس کے ذریعے سے وقایتوں تاروں کی درستی وغیرہ کی جانچ پڑتاں کی جاتی تھی۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ ڈھونڈو بھی اسی قسم کا ایک بکس ہے جو لوگوں کی جنسی جانچ پڑتاں کے لیے کھبے کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ کیونکہ اسے آس پاس کے علاقے کے علاوہ دور دور کے علاقوں کے ان تمام سینیٹھوں کا پتا تھا جن کو وقفوں کے بعد یا ہمیشہ ہی اپنی جنسی خواہشات کے تنے ہوئے یا ڈھیلے تار درست کرانے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

اسے ان تمام چھوکریوں کا بھی پتا تھا جو اس دھندے میں تھیں، وہ ان کے جسم کے ہر خدوخال سے واقف تھا، ان کی ہر نبض سے آشنا تھا، کون کس مزاج کی ہے اور کس وقت اور کس گاہک کے لیے موزوں ہے، اس کو اس کا بخوبی اندازہ تھا۔ لیکن ایک صرف اس کو سراج کے متعلق ابھی تک کوئی اندازہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

ڈھونڈو کئی بار مجھ سے کہہ چکا تھا، ”سالی کامستک پھرے لا ہے۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا منٹو صاحب، کیسی چھوکری ہے۔۔۔ گھڑی میں ماشہ گھڑی میں تو لا۔۔۔ کبھی آگ، کبھی پانی۔۔۔ ہنس رہی ہے۔۔۔ قعہ لگا رہی ہے۔۔۔ لیکن ایک دم رونا شروع کر دے گی۔۔۔ سالی کی کسی سے نہیں سنتی۔۔۔ بڑی جھگڑا لو ہے۔۔۔ ہر پنجھر سے لڑتی ہے۔۔۔ سالی سے کئی بار کہہ چکا کہ دیکھ، اپنا مستک ٹھیک کر، ورنہ جا، جہاں سے آئی ہے۔۔۔ انگ پر تیرے کوئی کپڑا نہیں۔۔۔ کھانے کو تیرے پاس ڈیڑھیا نہیں۔۔۔ مارا ماری اور دھاندلي سے تو میری جان کام نہیں چلے گا۔۔۔ پر وہ ایک ستم ہے، کسی کی سنتی ہی نہیں۔“

میں نے سراج کو ایک دو مرتبہ دیکھا ہے۔ بڑی دلیلی پتلی لڑکی تھی مگر خوبصورت۔۔۔ اس کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ بڑی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کے بیضوی چہرے پر صرف اپنی بڑائی جتنے کی خاطر چھائی ہوئی ہیں۔ میں نے جب اس کو پہلی مرتبہ لکیسرو ڈپر دیکھا تو مجھے بڑی لجھن ہوئی تھی۔ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ اس کی آنکھوں سے کہوں کہ بھئی تم تھوڑی دیر کے لیے ذرا ایک طرف ہٹ جاؤ تاکہ میں سراج کو دیکھ سکوں۔ لیکن میری اس خواہش کے باوجود، جو یقیناً میری آنکھوں نے اس کی آنکھیں تک پہنچا دی ہو گی، وہ اسی طرح اس کے سفید بیضوی چہرے پر چھائی رہیں۔

مختصر سی تھی، مگر اس اختصار کے باوجود بڑی جامع معلوم ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک صراحی ہے جس میں ایک جنم سے زیادہ پانی ملی ہوئی شراب بھرنے کی کوشش کی گئی ہے اور نتیجے کے طور پر سیال چیز دباؤ کے باعث ادھر ادھر تڑپ کر بہہ گئی ہے۔

میں نے پانی ملی ہوئی شراب اس لیے کہا ہے کہ اس میں تلنگی تھی، وہی جو تیز و تند شراب کی ہوتی ہے، مگر ایسا لگتا تھا کسی دھوکے باز نے اس میں پانی ملا دیا ہے، تاکہ مقدار زیادہ ہو جائے۔ مگر سراج میں نسائیت کی جو مقدار تھی، ویسی کی ویسی موجود تھی اور اس جھنجھلاہٹ سے، جو اس کے گھنے بالوں سے، اس کی تیکھی ناک سے، اس کے بھنچے ہوئے ہونٹوں سے اور اس کی انگلیوں سے، جو نقشہ نویسوں کی نوکلی اور تیز تیز پنسلیں معلوم ہوتی تھیں، میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ ہر چیز سے ناراض ہے۔ ڈھونڈو سے۔۔۔ اس کھمبے سے جس کے ساتھ لگ کروہ کھڑا رہتا تھا۔۔۔ ان گاکوں سے جو اس کے لیے لائے جاتے تھے۔۔۔ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے بھی جو اس کے سفید بینوی چہرے پر قبضہ جمائے رکھتی تھیں۔ اس کی پتلی پتلی، نوکلی انگلیاں جو نقشہ نویسوں کی طرح تیز تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان سے بھی ناراض ہے۔ شاید اس لیے کہ جو نقشہ سراج بنانا چاہتی تھی وہ نہیں بناسکتی تھیں۔

یہ تو ایک افسانہ نگار کے تاثرات ہیں جو چھوٹے سے تل میں سنگِ اسود کی تمام سختیاں بیان کر سکتا ہے۔۔۔ آپ ڈھونڈو کی زبانی سراج کے متعلق سینے اس نے مجھ سے ایک دن کہا، ”منٹو صاحب۔۔۔ آج سالی نے پھر ٹھنا کر دیا۔۔۔ وہ تو جانے کس دن کا ثواب کام آگیا اور آپ کی دعا سے یوں بھی ناگ پاڑھ جو کی کے سب افسر مہربان ہیں، ورنہ کل ڈھونڈو اندر ہوتا۔۔۔ وہ دھماں چائی کہ میں توباب رے باپ کہتا رہ گیا۔۔۔“

میں نے اس سے پوچھا، ”کیا بات ہوئی تھی؟“

”وہی جو ہوا کرتی ہے۔۔۔ میں نے لاکھ لعنت بھیجی ابھی ہشت پشت پر کہ حر امی جب تو اس چھوکری کو اچھی طرح جانتا ہے تو پھر کیوں انگلی لیتا ہے۔۔۔ کیوں اس کو نکال کر لاتا ہے۔ تیری ماں لگتی ہے یا بہن۔۔۔ میری تو کوئی عقل کام نہیں کرتی منٹو صاحب!“

ہم دونوں ایرانی کے ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ ڈھونڈو نے کوفی ملی چائے پرچ میں انڈا ملی اور سڑپ سڑپ پینے لگا، ”اصل بات یہ ہے کہ سالی سے مجھے ہمدردی ہے۔۔۔“

میں نے پوچھا، ”کیوں؟“

ڈھونڈو نے سر کو ایک جھٹکا دیا، ”جانے کیوں--- یہ سالا معلوم ہو جائے تو یہ روز کا ٹھنٹا ختم نہ ہو۔“ پھر اس نے ایک دم پرچ میں پیالی اونڈھی کر کے مجھ سے کہا، ”آپ کو معلوم ہے--- ابھی تک کنواری ہے۔“

لیقین مانیے کہ میں ایک لمحے کے لیے چکر آگیا۔

”کنواری!“

”آپ کی جان کی قسم!“

میں نے جیسے اس کو اپنی بات پر نظر ثانی کرنے کے لیے کہا، ”نہیں ڈھونڈو۔“

ڈھونڈو کو میرا یہ شک ناگوار معلوم ہوا، ”میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا منٹو صاحب۔ سولہ آنے کنواری ہے۔ آپ مجھ سے شرط لگا لیجھے۔“

میں صرف اسی قدر کہہ سکا، ”مگر ایسا کیوں نکر ہو سکتا ہے۔“

ڈھونڈو نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا، ”ایسا کیوں ہو نہیں سکتا۔ سراج جیسی چھوکری تو اس دھندے میں بھی رہ کر ساری عمر کنواری رہ سکتی ہے۔ سالی کسی کو ہاتھ ہی نہیں لگانے دیتی۔ مجھے اس کی ساری ہشتری معلوم نہیں۔ اتنا جانتا ہوں پنجابن ہے۔ لینگلش روڈ پر میم صاحب کے پاس تھی۔ وہاں سے نکالی گئی کہ ہر پینجر سے لڑتی تھی۔ دو تین مہینے نکل گئے کہ ڈام کے پاس دس بیس اور چھوکریاں تھیں۔ پر منٹو صاحب کوئی کب تک کے کھلاتا ہے۔ اس نے ایک دن تین کپڑوں میں نکال باہر کیا۔ یہاں سے فارس روڈ میں دوسری ڈام کے پاس پہنچی۔ وہاں بھی اس کامستک ویسے کا ویسا تھا۔ ایک پینجر کے کاٹ کھایا۔ دو تین مہینے یہاں گزرے۔ پر سالی کے مزاد میں تو جیسے آگ بھری ہوئی ہے، اب کون اسے ٹھنڈا کرتا پھرے۔ پھر خدا آپ کا بھلا کرے، کھیت واڑی کے ایک ہوٹل میں رہی۔ پر یہاں بھی وہی دھماں۔ میجر نے تنگ آکر چلتا کیا۔ کیا تاؤں منٹو صاحب، نہ سالی کو کھانے کا ہوش ہے نہ پینے کا۔“

کپڑوں میں جو نیس پڑی ہیں، سر دو دمینے سے نہیں دھویا۔۔۔ چرس کے ایک دو سگرٹ مل جائیں کہیں سے تو پھر کم لیتی ہے۔۔۔ یا کسی ہوٹل سے دور کھڑی ہو کر، فلمی ریکارڈ سننی رہتی ہے۔“

میرے لیے یہ تفصیل کافی تھی۔ اس کے رد عمل سے میں آپ کو آگاہ نہیں کرنا چاہتا کہ افسانہ نگار کی حیثیت سے یہ نامناسب ہے۔ میں نے ڈھونڈو سے محض سلسلہ گفتگو قائم رکھنے کے لیے پوچھا، ”تم اسے واپس کیوں نہیں بھیج دیتے۔ جب کہ اسے اس دھندے سے کوئی دلچسپی نہیں۔۔۔ کراچی میں مجھ سے لے لو!“

ڈھونڈو کو یہ بات بھی ناگوار معلوم ہوئی، ”منٹو صاحب کرانے سالے کی کیا بات ہے۔۔۔ میں نہیں دے سکتا۔“

میں نے ٹوہ لینی چاہی، ”پھر اسے واپس کیوں نہیں بھیجتے؟“

ڈھونڈو کچھ عرصے کے لیے خاموش ہو گیا۔ کان میں اڑ سے ہوئے سگرٹ کا ٹکڑا انکال کر اس نے سلاگایا اور ڈھونڈیں کوناک کے دونوں تنخنوں سے باہر پھینک کر اس نے صرف اتنا کہا، ”میں نہیں چاہتا کہ وہ جائے۔“

میں نے سمجھا ابھی ہوئے دھاگے کا ایک سر امیرے ہاتھ میں آگیا ہے، ”کیا تم اس سے محبت کرتے ہو؟“

ڈھونڈو پر اس کا شدید رد عمل ہوا، ”آپ کیسی باتیں کرتے ہیں منٹو صاحب۔“ پھر اس نے دونوں کان پکڑ کر کھینچے، ”قرآن کی قسم میرے دل میں ایسا پلید خیال کبھی نہیں آیا۔۔۔ مجھے بس۔۔۔“ وہ رک گیا، ”مجھے بس، کچھ اچھی لگتی ہے!“

میں نے بڑا صحیح سوال کیا، ”کیوں؟“

ڈھونڈو نے بھی اس کا بڑا صحیح جواب دیا، ”اس لیے۔۔۔ اس لیے کہ وہ دوسروں جیسی نہیں۔۔۔ باقی جتنی ہیں سب پیسے کی پیر ہیں۔۔۔ حرماں ہیں اول درجے کی۔۔۔ پر یہ جو ہے نا۔۔۔ کچھ عجیب و غریب ہے۔۔۔ نکال کے لاتا ہوں تو راضی ہو جاتی ہے۔۔۔ سودا ہو جاتا ہے۔۔۔ ٹیکسی یا کٹوریہ میں بیٹھ جاتی ہے۔۔۔ اب منٹو صاحب، پیشہ سالامونج شوق کے لیے آتا ہے۔۔۔ مال پانی خرچ کرتا ہے۔۔۔ ذرا دبا کے دیکھتا ہے۔۔۔ یا ویسے ہی ہاتھ لگا کے دیکھتا ہے۔۔۔ بس دھماں مجھ جاتی ہے۔۔۔ مارا ماری شروع کر دیتی ہے۔۔۔ آدمی شریف ہو تو

بھاگ جاتا ہے۔ پیے لا ہو۔۔۔ یا موالی ہو تو آفت۔۔۔ ہر موقع پر مجھے پہنچا پڑتا ہے۔۔۔ پیے واپس کرنے پڑتے ہیں اور ہاتھ پیر الگ جوڑنے پڑتے ہیں۔۔۔ قسم قرآن کی صرف سراج کی خاطر۔۔۔ اور منٹو صاحب آپ کی جان کی قسم اسی سالی کی وجہ سے میرا دھندا آدھا رہ گیا ہے۔۔۔!

میرے ذہن نے سراج کا جو عقبی منظر تیار کیا تھا، میں اس کا ذکر کرنا نہیں چاہتا، لیکن اتنا ہے کہ جو کچھ ڈھونڈو نے مجھے بتایا وہ اس کے ساتھ ٹھیک طور پر جتنا نہیں تھا۔ میں نے ایک دن سوچا کہ ڈھونڈو کوتائے بغیر سراج سے ملوں۔ وہ بائی کلہ اسٹیشن کے پاس ہی ایک نہایت وابحیات جگہ میں رہتی تھی، جہاں کوڑے کر کٹ کے ڈھیر تھے، آس پاس کا تمام فصلہ تھا۔ کار پوریشن نے یہاں غربوں کے لیے جست کے بے شمار جھونپڑے بنادیے تھے۔ میں یہاں ان بلند بام عمارتوں کا ذکر کرنا نہیں چاہتا جو اس غلاظت گاہ سے تھوڑی دور ایستادہ تھیں کیونکہ ان کا اس افسانے سے کوئی تعلق نہیں۔ دنیانام ہی نشیب و فراز کا ہے یار فتوں اور پستیوں کا۔

ڈھونڈو سے مجھے اس کے جھونپڑے کا اتنا پتا معلوم تھا، میں وہاں گیا۔۔۔ اپنے خوش وضع کپڑوں کو اس ماہول سے چھپائے ہوئے۔۔۔ لیکن یہاں میری ذات متعلق نہیں۔ بہر حال میں وہاں گیا۔۔۔ جھونپڑے کے باہر ایک بکری بندھی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو ممیائی۔ اندر سے ایک بڑھیا نکلی۔۔۔ جیسے پرانی داستانوں کے کرم خور دہ انبار سے کوئی کٹنی لاٹھی ٹیکتی ہوئی۔۔۔ میں لوٹنے ہی والا تھا کہ ٹاٹ کے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے پر دے کے پیچھے مجھے دو بڑی بڑی آنکھیں نظر آئیں۔۔۔ بالکل اسی طرح پھٹی ہوئی جس طرح وہ ٹاٹ کا پر دہ تھا۔ پھر میں نے سراج کا سفید بیضوی چہرہ دیکھا اور مجھے ان غاصب آنکھوں پر بڑا غصہ آیا۔

اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ معلوم نہیں اندر کیا کام کر رہی تھی، فوراً سب چھوڑ چھاڑ کر باہر آئی۔ اس نے بڑھیا کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور مجھ سے کہا، ”آپ یہاں کیسے آئے؟“

میں نے مختصر آگہا، ”تم سے ملنا تھا۔“

سراج نے بھی اختصار ہی کے ساتھ کہا، ”آؤ اندر“

میں نے کہا، ”نہیں میرے ساتھ چلیے۔“

اس پر کرم خورده دست انوں کی کرم خورده کٹنی بڑے دکاندارانہ انداز میں بولی، ”دس روپے ہوں گے۔“

میں نے بٹوہ نکال کر دس روپے اس بڑھیا کو دے دیے اور سراج سے کہا، ”آؤ سراج۔۔۔“

سراج کی بڑی بڑی آنکھوں نے ایک لحظے کے لیے میری نگاہوں کو راستہ دیا کہ اس کے چہرے کی سڑک پر چند قدم چل سکیں۔۔۔ میں ایک بار پھر اسی نتیجے پر پہنچا کہ وہ خوبصورت تھی۔۔۔ سکڑی ہوئی خوبصورتی۔۔۔ حنوط لگی خوبصورتی۔۔۔ صدیوں کی محفوظ و مامون اور مدفون کی ہوئی خوبصورتی۔۔۔ میں نے ایک لحظے کے لیے یوں محسوس کیا کہ میں مصر میں ہوں اور پرانے دفینوں کی کھدائی پر مامور کیا گیا ہوں۔

میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔۔۔ سراج میرے ساتھ تھی۔ ہم دونوں ایک ہو ٹل میں تھے۔ وہ میرے سامنے، اپنے غلیظ کپڑوں میں ملبوس بیٹھی تھی اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں اس کے بیضوی چہرے پر قبضہ مخالفانہ کیے ہوئے تھیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ انہوں نے صرف سراج کے چہرے، ہی کو نہیں، اس کے سارے وجود کو ڈھانپ لیا ہے کہ میں اس کے کسی روئیں کو بھی نہ دیکھ سکوں۔

بڑھیانے جو قیمت بتائی تھی، میں نے ادا کر دی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے چالیس روپے اور سراج کو دیے تھے۔۔۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے بھی اسی طرح اڑے جھگڑے، جس طرح وہ دوسروں کے ساتھ اڑتی جھگڑتی ہے۔ چنانچہ اسی غرض سے میں نے اس سے کوئی ایسی بات نہ کی جس سے محبت اور خلوص کی بو آئے۔۔۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے بھی میں خائف تھا۔ وہ اتنی بڑی تھیں کہ میرے علاوہ میرے ارد گرد کی ساری دنیا بھی دیکھ سکتی تھیں۔

وہ خاموش تھی۔۔۔ واہیات طریقے پر اسے چھیڑنے کے لیے ضروری تھا کہ میرے جسم اور ذہن میں غلط قسم کی حرارت ہو۔ چنانچہ نے وسکی کے چار پیگ پیے اور اس کو عام پینسہروں کی طرح چھیڑا، اس نے کوئی مراحت نہ کی۔ میں نے ایک زبردست فضول حرکت کی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بارود جو اس کے اندر بھری پڑی ہے، اس کو بھک سے اڑانے کے لیے یہ چنگاری کافی ہے، مگر حیرت ہے کہ وہ کسی قدر پر سکون ہو گئی۔ اٹھ کر اس نے مجھے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کے پھیلاؤ میں سمیٹتے ہوئے کہا، ”چرس کا ایک سگریٹ ملنگا و مجھے!“

”شراب پیو!“

”نہیں۔۔۔ چرس کا سگریٹ پیوں گی!“

میں نے اسے چرس کا سگرٹ منگوادیا۔۔۔ اسے ٹھیٹ چرسیوں کے انداز میں پی کر اس نے میری طرف دیکھا۔۔۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں اب اپنا سلطان چھوڑ چکی تھیں۔۔۔ مگر اسی طرح جس طرح کوئی غاصب چھوڑتا ہے۔۔۔ اس کا چہرہ مجھے ایک اجڑی ہوئی، ایک بر باد شدہ سلطنت نظر آیا۔۔۔ تخت و تاراج ملک، اس کا ہر خط، ہر خال۔۔۔ ویرانی کی ایک لکیر تھی۔

مگر یہ ویرانی کیا تھی۔۔۔؟ کیوں تھی۔۔۔؟ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آبادیاں ہی ویرانوں کا باعث ہوتی ہیں۔۔۔ کیا وہ اسی قسم کی آبادی تھی جو شروع ہونے کے بعد کسی حملہ آور کے باعث ادھوری رہ گئی تھی اور آہستہ آہستہ اس کی دیواریں جو ابھی گز بھر بھی اوپر نہیں اٹھی تھیں کھنڈر بن گئی تھیں۔

میں چکر میں تھا، لیکن آپ کو میں اس چکر میں نہیں ڈالنا چاہتا۔۔۔ میں نے کیا سوچا، کیا نتیجہ برآمد کیا، اس سے آپ کو کیا مطلب۔

سراج کنواری تھا یا نہیں، میں اس کے متعلق جانا نہیں چاہتا تھا۔ سلفے کے دھوکیں میں، البتہ اس کی محروم و محروم آنکھوں میں مجھے ایک ایسی جھلک نظر آئی تھی جس کو میرا قلم بھی بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے اس سے باتیں کرنا چاہیں مگر اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے چاہا کہ وہ مجھ سے لڑے جھگڑے، مگر یہاں بھی اس نے مجھے ناامید کیا۔

میں اسے گھر چھوڑ آیا۔

ڈھونڈو کو جب میرے اس خفیہ سلسلے کا پتہ چلا تو وہ بہت ناراض ہوا۔ اس کے دوستانہ اور تاجر انہ جذبات دونوں بہت بری طرح مجرور ہوئے تھے۔ اس نے مجھے صفائی کا موقعہ نہ دیا۔ صرف اتنا کہا، ”منشو صاحب آپ سے یہ امید نہ تھی!“ اور یہ کہہ کرو وہ کھبے سے ہٹ کر ایک طرف چلا گیا۔

عجیب بات ہے کہ دوسرے روز شام کو وقتِ مقررہ پر وہ مجھے اپنے اٹے پر نظر نہ آیا۔ میں سمجھا شاید بیمار ہے مگر اس سے اگلے روز بھی وہ موجود نہیں تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ وہاں سے میرا صبح شام آنا جانا ہوتا تھا۔ میں جب اس کھبے کو دیکھتا، مجھے ڈھونڈو یاد آتا۔ میں باہی کلہ اسٹیشن کے پاس ہی جو واہیات جگہ تھی وہاں بھی گیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ سراج کہاں ہے۔ مگر وہاں اب صرف وہ کرم خور دہ کٹنی رہتی تھی۔ میں نے اس سے سراج کے متعلق پوچھا تو وہ پولی مسکراہٹ میں لاکھوں بر س کی پرانی جنسی کروٹیں بدلت کر بولی، ”وہ گئی۔۔۔ اور ہیں۔۔۔ منگوائیں؟“

میں نے سوچا، اس کا کیا مطلب ہے۔ ڈھونڈو اور سراج دونوں غائب ہیں اور وہ بھی میری اس خفیہ ملاقات کے بعد۔۔۔ لیکن میں اس ملاقات کے متعلق اتنا مرد نہیں تھا۔۔۔ یہاں پھر میں اپنے خیالات آپ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا لیکن مجھے یہ حرمت ضرور تھی کہ وہ دونوں غائب کہاں ہو گئے۔ ان میں محبت کی قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ڈھونڈو ایسی چیزوں سے بالاتر تھا۔ اس کی بیوی تھی، بچے تھے اور وہ ان سے بے حد محبت کرتا تھا، پھر یہ سلسلہ کیا تھا کہ دونوں بیک وقت غائب تھے۔ میں نے سوچا، ہو سکتا ہے کہ اچانک ڈھونڈو کے دماغ میں یہ خیال آگیا ہو کہ سراج کو واپس گھر جانا پایے۔ اس کے متعلق وہ پہلے فیصلہ نہیں کر سکتا تھا، پر اب اچانک کر لیا ہو۔

غالباً ایک مہینہ گزر گیا۔

ایک شام اچانک مجھے ڈھونڈو نظر آیا۔ اسی کھبے کے ساتھ، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے بڑی دیر کرنٹ فیل رہنے کے بعد ایک دم واپس آگیا ہے۔ اس کھبے میں جان پڑ گئی۔ ٹیکی فون کے ڈبے میں بھی۔۔۔ چاروں طرف، اوپر تاروں کے پھیلے ہوئے جال، ایسا لگتا تھا آپس میں سر گوشیاں کر رہے ہیں۔ میں اس کے پاس سے گزارا۔۔۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا یا۔

ہم دونوں ایرانی کے ہوٹل میں تھے۔ میں نے اس سے کچھ نہ پوچھا۔ اس نے اپنے لیے کوفی ملی چائے اور میرے لیے سادہ چائے منگوائی اور پہلو بد کر اس نے ایسی نشست قائم کی کہ جیسے وہ مجھے کوئی بہت بڑی بات سنانے والا ہے، مگر اس نے صرف اتنا کہا، ”اور سناؤ منٹو صاحب۔“

”کیا سنائیں ڈھونڈو۔۔۔ بس گزر رہی ہے۔“

ڈھونڈو مسکرا یا، ”ٹھیک کہا آپ نے۔۔۔ بس گزر رہی ہے۔۔۔ اور گزرتی جائے گی۔۔۔ لیکن یہ سالا گزرتے رہنا یا گزرنा بھی عجیب چیز ہے۔۔۔ سچ پوچھیے تو اس دنیا میں ہر چیز عجیب ہے۔“

میں نے صرف اتنا کہا، ”تم ٹھیک کہتے ہو ڈھونڈو۔“

چائے آئی اور ہم دونوں نے پینا شروع کی۔ ڈھونڈو نے پرچ میں اپنی کوفی ملی اور مجھ سے کہا، ”منٹو صاحب۔۔۔ اس نے مجھے بتا دی تھی ساری بات۔۔۔ کہتی تھی، وہ سیٹھ جو تمہارا دوست ہے اس کامستک پھرے لائے۔“

میں نہسا، ”کیوں؟“

”بولی۔۔۔ مجھے ہو ٹل لے گیا۔۔۔ اتنے روپے دیے۔۔۔ پر سیٹھوں والی کوئی بات نہ کی۔“

میں اپنے اندازی پن پر بہت خفیف ہوا، ”وہ قصہ ہی کچھ ایسا تھا ڈھونڈو۔“

اب ڈھونڈو پیٹ بھر کے ہنسا، ”میں جانتا ہوں۔۔۔ مجھے معاف کر دینا کہ میں اس روز تم سے ناراض ہو گیا تھا۔“ اس کے اندازِ گفتگو میں ان جانے میں بے تکلفی پیدا ہو گئی، ”پر اب وہ قصہ خلاص ہو گیا ہے۔“

”کون سا قصہ؟“

”اس سالی کا سراج کا۔۔۔ اور کس کا۔۔۔“

میں نے پوچھا کیا، ”کیا ہوا؟“

ڈھونڈو لکنے لگا، ”جس روز آپ کے ساتھ گئی۔۔۔ واپس آکر مجھ سے کہنے لگی۔۔۔ میرے پاس چالیس روپے ہیں۔۔۔ چلو مجھے لاہور لے چلو۔۔۔ میں بولا سالی، یہ ایک دم تیرے سر پر کیا بھوت سوار ہوا۔۔۔ بولی، نہیں۔۔۔ چل ڈھونڈو، تجھے میری قسم۔۔۔ اور منٹو صاحب، آپ جانتے ہیں۔۔۔ میں سالی کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا کہ مجھے اچھی لگتی ہے۔۔۔ میں نے کہا چل۔۔۔ سو ٹکٹ کٹا کے ہم دونوں گاڑیوں میں سوار ہوئے۔۔۔ لاہور پہنچ کر ایک ہو ٹل میں ٹھہرے۔۔۔ مجھ سے بولی۔۔۔ ڈھونڈو۔۔۔ ایک برخالا دے میں لے آیا۔۔۔ اسے پہن کروہ لگی سڑک اور گلی گلی گھومنے۔۔۔ کئی دن گزر گئے۔۔۔ میں بولا، یہ بھی اچھی رہی ڈھونڈو۔ سراج سالی کامستک تو پھرے لاتھا۔ سالا

تیرا بھی بھیجا پھر گیا جو تو اتنی دور اس کے ساتھ آگیا۔۔۔ منٹو صاحب! آخر ایک دن اس نے ٹانگہ رکوایا اور ایک آدمی کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہنے لگی۔۔۔ ڈھونڈو۔۔۔ اس آدمی کو میرے پاس لے آ۔۔۔ میں چلتی ہوں واپس سرائے میں۔۔۔ میری عقل جواب دے گئی۔

میں ٹانگ سے اتر اتو وہ غائب۔۔۔ اب میں اس آدمی کے پیچھے پیچھے۔۔۔ آپ کی دعا سے اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے۔۔۔ میں آدمی آدمی کو پہچانتا ہوں۔ دو باتیں کیں اور میں تازگی کا مون شوق کرنے والا ہے۔۔۔ میں بولا بکھنی کا خاص مال ہے۔۔۔ بولا، ابھی چلو۔۔۔ میں بولا، نہیں پہلے مال پانی دکھاؤ۔ اس نے اتنے سارث نوٹ دکھائے۔۔۔ میں دل میں بولا۔۔۔ چلو ڈھونڈو۔۔۔ یہاں بھی اپنا دھند اچلتار ہے۔۔۔ پر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ سراج سالمی نے سارے لاہور میں اسی کو کیوں چنان۔۔۔ میں نے کہا، چلتا ہے۔۔۔ ٹانگہ لیا اور سیدھا سرائے میں۔۔۔ سراج کو خبر کی۔۔۔ وہ بولی، ابھی ٹھہر۔۔۔ میں ٹھہر گیا۔۔۔ تھوڑی دیر کے بعد اس آدمی کو جوا چھی شکل کا تھا، اندر لے گیا۔۔۔ سراج کو دیکھتے ہی وہ سالا یوں بد کا جیسے گھوڑا۔۔۔ سراج نے اس کو پکڑ لیا۔“

ڈھونڈو نے یہاں پہنچ کر پیالی سے اپنی ٹھنڈی کو فی ملی چائے ایک ہی جرعے میں ختم کی اور بیڑی سلاگا نے لگا۔

میں نے اس سے کہا، ”سراج نے اس کو پکڑ لیا۔“

ڈھونڈو نے بلند آواز میں کہا، ”ہاں جی۔۔۔ پکڑ لیا اس سالے کو۔۔۔ کہنے لگی۔ اب کہاں جاتا ہے۔۔۔ میرا اگھر چھڑا کر تو مجھے اپنے ساتھ کس لیے لایا تھا۔۔۔ میں تجھ سے محبت کرتی تھی۔۔۔ تو نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ تو مجھ سے محبت کرتا ہے۔۔۔ پر جب میں اپنا گھر بار، اپنا ماں باپ چھوڑ کر تیرے ساتھ بھاگ نکلی اور امر تسرے ہم دونوں یہاں آئے۔۔۔ اسی سرائے میں آکر ٹھہرے تو رات ہی رات تو بھاگ گیا۔۔۔ مجھے اکیلی چھوڑ کر۔۔۔ کس لیے لایا تھا تو مجھے یہاں۔۔۔ کس لیے بھگایا تھا تو مجھے۔۔۔ میں ہر چیز کے لیے تیار تھی۔۔۔ پر تو میری ساری تیاریاں چھوڑ کر بھاگ گیا۔۔۔ آ۔۔۔ اب میں نے تمہیں بلا یا ہے۔۔۔ میری محبت ولی کی ولی قائم ہے۔۔۔ آ۔۔۔ اور منٹو صاحب، وہ اس کے ساتھ لپٹ گئی۔۔۔ اس سالے کے آنسو ٹکنے لگے۔۔۔ رورو کر معافیاں مانگنے لگا۔۔۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔۔۔ میں ڈر گیا تھا۔۔۔ میں اب کبھی تم سے علیحدہ نہیں ہوں گا۔ قسمیں کھاتا رہا۔۔۔ جانے کیا بتا رہا۔۔۔ سراج نے مجھے اشارہ کیا۔۔۔ میں باہر چلا گیا۔۔۔ صح ہوئی تو میں باہر کھاٹ پر سورہا تھا۔۔۔ سراج نے مجھے جگایا اور کہا۔۔۔ چلو ڈھونڈو۔۔۔ میں بولا، کہاں۔۔۔؟ بولی، واپس بکھنی۔۔۔ میں بولا۔۔۔ وہ سالا کہاں ہے۔۔۔ سراج نے کہا۔ سورہا ہے۔۔۔ میں اس پر اپنا بخادوال آئی ہوں۔“

ڈھونڈنے اپنے لیے دوسری کو فیملی چائے کا آرڈر دیا تو سراج اندر داخل ہوئی۔۔۔ اس کا سفید بیضوی چہرہ نکھرا ہوا تھا اور اس پر اس کی بڑی بڑی آنکھیں دو گرے ہوئے سگنل معلوم ہوتی تھیں۔

-[116]-

رام کھلاون: سعادت حسن منٹو

کھٹل مارنے کے بعد میں ٹرنک میں پرانے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ سعید بھائی جان کی تصویر مل گئی۔ میز پر ایک خالی فریم پڑا تھا۔۔۔ میں نے اس تصویر سے اس کو پر کر دیا اور کرسی پر بیٹھ کر دھوپی کا انتظار کرنے لگا۔

ہر اتوار کو مجھے اسی طرح انتظار کرنا پڑتا تھا کیونکہ ہفتے کی شام کو میرے دھلے ہوئے کپڑوں کا اسٹاک ختم ہو جاتا تھا۔۔۔ مجھے اسٹاک تو نہیں کہنا چاہیے اس لیے کہ مفلسی کے اس زمانے میں میرے صرف اتنے کپڑے تھے جو بکشکل چھ سات دن تک میری وضعداری قائم رکھ سکتے تھے۔

میری شادی کی بات چیت ہو رہی تھی اور اس سلسلے میں پچھلے دو تین اتواروں سے میں ماہم جا رہا تھا۔ دھوپی شریف آدمی تھا۔ یعنی دھلانی نے ملنے کے باوجود ہر اتوار کو باقاعدگی کے ساتھ پورے دس بجے میرے کپڑے لے آتا تھا، لیکن پھر بھی مجھے کھٹکا تھا کہ ایسا نہ ہو میری نادہندگی سے تنگ آکر کسی روز میرے کپڑے چور بازار میں فروخت کر دے اور مجھے اپنی شادی کی بات چیت میں بغیر کپڑوں کے حصہ لینا پڑے جو کہ ظاہر ہے بہت ہی معیوب بات ہوتی۔

کھولی میں مرے ہوئے کھٹملوں کی نہایت ہی مکروہ بوچھیلی ہوئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسے کس طرح دباوں کہ دھوپی آگیا، ”ساب سلام۔“ کر کے اس نے اپنی گھری کھولی اور میرے گنتی کے کپڑے میز پر رکھ دیے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی نظر سعید بھائی جان کی تصویر پر پڑی۔ ایک دم چونک کراس نے اس کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اور ایک عجیب اور غریب آواز حلق سے نکالی، ”ہے ہے ہے ہیں؟“

میں نے اس سے پوچھا، ”کیا بات ہے دھوپی؟“

دھوپی کی نظریں اس تصویر پر جمی رہیں، ”یہ تو سا عید شالیم باشٹر ہے؟“

”کون؟“

دھوپی نے میری طرف دیکھا اور بڑے وثوق سے کہا، ”سا عید شالیم باشٹر۔“

”تم جانتے ہو انھیں؟“

دھوپی نے زور سے سر ہلاایا، ”ہاں۔۔۔ دو بھائی ہوتا۔۔۔ ادھر کولا بامیں ان کا کوٹھی ہوتا۔۔۔ سا عید شالیم باشٹر۔۔۔ میں ان کا کپڑا دھوتا ہوتا۔۔۔“

میں نے سوچا یہ دو برس پہلے کی بات ہو گی کیونکہ سعید حسن اور محمد حسن بھائی جان نے فتحی آئی لینڈ جانے سے پہلے تقریباً ایک برس بمبنی میں پر سکیل کی تھی۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا، ”دو برس پہلے کی بات کرتے ہو تم؟“

دھوپی نے زور سے سر ہلاایا، ”ہاں۔۔۔ سا عید شالیم باشٹر جب گیا تو ہم کو ایک پگڑی دیا۔۔۔ ایک دھوتی دیا۔۔۔ ایک کرتہ دیا۔۔۔ نیا۔۔۔ بہت اچھا لوگ ہوتا۔۔۔ ایک کا داڑھی ہوتا۔۔۔ یہ بڑا۔۔۔ اس نے ہاتھ سے داڑھی کی لمبائی بتائی اور سعید بھائی جان کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا، ”یہ چھوٹا ہوتا۔۔۔ اس کا تین باؤں لوگ ہوتا۔۔۔ دو لڑکا، ایک لڑکی۔۔۔ ہمارے سگ بہت کھلیتا ہوتا۔۔۔ کولا بے میں کوٹھی ہوتا۔۔۔ بہت بڑا۔۔۔“

میں نے کہا، ”دھوپی یہ میرے بھائی ہیں۔“ دھوپی نے حلق سے عجیب و غریب آواز نکالی، ”ہے ہے ہے ہیں۔۔۔؟ سا عید شالیم باشٹر؟“ میں نے اس کی حیرت دور کرنے کی کوشش کی اور کہا، ”یہ تصویر سعید حسن بھائی جان کی ہے۔۔۔ داڑھی والے محمد حسن ہیں۔۔۔ ہم سب سے بڑے۔۔۔“

دھوپی نے میری طرف گھور کے دیکھا، پھر میری کھولی کی غلاظت کا جائزہ لیا۔۔۔ ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی بجلی کی لائٹ سے محروم۔ ایک میز تھا۔ ایک کرسی اور ایک ٹائل کی کوٹ جس میں ہزارہا کھٹل تھے۔ دھوپی کو یقین نہیں آتا تھا کہ میں سا عید شالیم باشٹر کا بھائی ہوں۔ لیکن

جب میں نے اس کو ان کی بہت سی باتیں بتائیں تو اس نے سر کو عجیب طریقے سے جنبش دی اور کہا، ”سامعید شالیم باشٹر کو لابے میں رہتا اور تم اس کھولی میں!“

میں نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا، ”دنیا کے یہی رنگ ہیں دھوپ کہیں دھوپ کہیں چھاؤں۔۔۔ پانچ انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔۔۔“

”ہاں ساپ۔۔۔ تم برو برا کہتا ہے۔“ یہ کہہ کر دھوپی نے گھٹھری اٹھائی اور باہر جانے لگا۔ مجھے اس کے حساب کا خیال آیا۔ جیب میں صرف آٹھ آنے تھے جو شادی کی بات چیت کے سلسلے میں ماہم تک آنے جانے کے لیے بمشکل کافی تھے۔ صرف یہ بتانے کے لیے میری نیت صاف ہے میں نے اسے ٹھہرایا اور کہا، ”دھوپ۔۔۔ کپڑوں کا حساب یاد رکھنا۔۔۔ خدا معلوم کتنی دھلائیاں ہو چکی ہیں۔“

دھوپی نے اپنی دھوتی کا لانگ درست کیا اور کہا، ”ساپ ہم حساب نہیں رکھتے۔۔۔ سامعید شالیم باشٹر کا ایک برس کام کیا۔۔۔ جو دے دیا، لے لیا۔۔۔ ہم حساب جانتے ہی ناہیں۔“ یہ کہہ وہ چلا گیا اور میں شادی کی بات چیت کے سلسلے میں ماہم جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔ بات چیت کا میا ب رہی۔۔۔ میری شادی ہو گئی۔ حالات بھی بہتر ہو گئے اور میں سکینڈ پیر خان اسٹریٹ کی کھولی سے جس کا کراچی نور پر ماہوار تھا، کلیئر روڈ کے ایک فلیٹ میں جس کا کراچی پینتیس روپے ماہوار تھا، اٹھ آیا اور دھوپی کو ماہ بماہ باقاعدگی سے اس کی دھلائیوں کے دام ملنے لگے۔

دھوپی خوش تھا کہ میرے حالات پہلے کی بہ نسبت بہتر ہیں چنانچہ اس نے میری بیوی سے کہا، ”بیگم ساپ۔۔۔ ساپ کا بھائی سامعید شالیم باشٹر بہت بڑا آدمی ہوتا۔۔۔ ادھر کو لابہ میں رہتا ہوتا۔۔۔ جب گیا تو ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتادیا ہوتا۔۔۔ تمہارا ساپ بھی ایک دن بڑا آدمی بتتا ہوتا۔“

میں اپنی بیوی کو تصویر والا قصہ سنا پکھا اور اس کو یہ بھی بتاچکا تھا کہ مفلسی کے زمانے میں کتنی دریادی سے دھوپی نے میرا ساتھ دیا تھا۔۔۔ جب دے دیا، جو دے دیا، اس نے کبھی شکایت کی ہی نہ تھی۔۔۔ لیکن میری بیوی کو تھوڑے عرصے کے بعد ہی اس سے یہ شکایت پیدا ہو گئی کہ وہ حساب نہیں کرتا۔ میں نے اس سے کہا، ”چار برس میرا کام کرتا رہا۔۔۔ اس نے کبھی حساب نہیں کیا۔“ جواب یہ ملا، ”حساب کیوں کرتا۔۔۔ ویسے دو گئے چو گئے وصول کر لیتا ہو گا۔“

”وہ کیسے؟“

”آپ نہیں جانتے۔۔۔ جن کے گھروں میں بیویاں نہیں ہوتیں ان کو ایسے لوگ بے وقوف بنانا جانتے ہیں۔“

قریب قریب ہر مہینے دھوپی سے میری بیوی کی حجت چوتھی تھی کہ وہ کپڑوں کا حساب الگ اپنے پاس کیوں نہیں رکھتا۔ وہ بڑی سادگی سے صرف اتنا کہہ دیتا، ”بیگم ساب۔۔۔ ہم حساب جانتے نہیں۔ تم جھوٹ نہیں بولے گا۔۔۔ سعید شاہیم باشٹر جو تمہارے ساب کا بھائی ہوتا۔۔۔ ہم ایک برس اس کا کام کیا ہوتا۔۔۔ بیگم ساب بولتا دھوپی تمہارا اتنا پیسہ ہوا۔۔۔ ہم بولتا، ٹھیک ہے۔“

ایک مہینہ ڈھائی سو کپڑے دھلائی میں گئے۔ میری بیوی نے آزانے کے لیے اس سے کہا، ”دھوپی اس مہینے ساتھ کپڑے ہوئے۔“ اس نے کہا، ”ٹھیک ہے۔۔۔ بیگم ساب، تم جھوٹ نہیں بولے گا۔“ میری بیوی نے ساتھ کپڑوں کے حساب سے جب اس کو دام دیے تو اس نے ماتھے کے ساتھ روپے چھو اکر سلام کیا اور چلنے لگا۔ میری بیوی نے اسے روکا، ”ٹھیک دھوپی، ساتھ نہیں، ڈھائی سو کپڑے تھے۔۔۔ لو اپنے باقی روپے، میں نے مذاق کیا تھا۔“ دھوپی نے صرف اتنا کہا، ”بیگم ساب تم جھوٹ نہیں بولے گا۔“ باقی کے روپے اپنے ماتھے کے ساتھ چھووا کر سلام کیا اور چل گیا۔

شادی کے دو برس بعد میں دلی چلا گیا۔ ڈیڑھ سال وہاں رہا، پھر واپس بھیتی آگیا اور ماہم میں رہنے لگا۔ تین مہینے کے دوران میں ہم نے چار دھوپی تبدیل کیے کیونکہ بے حد بے ایمان اور جھگڑا لو تھے۔ ہر دھلائی پر جھگڑا کھڑا ہو جاتا تھا۔ کبھی کپڑے کم نکلتے تھے، کبھی دھلائی نہیاں تھی ذلیل ہوتی تھی۔ ہمیں اپنا پرانی دھوپی یاد آنے لگا۔ ایک روز جب کہ ہم بالکل بغیر دھوپی کے رہ گئے تھے وہ اچانک آگیا اور کہنے لگا، ”ساب کو ہم نے ایک دن بس میں دیکھا۔۔۔ ہم بولا، ایسا کیسا۔۔۔ ساب تو دلی چلا گیا تھا۔۔۔ ہم نے ادھربائی کھلہ میں تپاس کیا۔ چھاپہ والا بولا، ادھر ماہم میں تپاس کرو۔۔۔ باجوہ والی چالی میں ساب کا دوست ہوتا۔۔۔ اس سے پوچھا اور آگیا۔“ ہم بہت خوش ہوئے اور ہمارے کپڑوں کے دن ہنسی خوشی گزرنے لگے۔

کانگریس برسر اقتدار آئی تو اتنا ی شراب کا حکم نافذ ہو گیا۔ انگریزی شراب ملتی تھی لیکن دیسی شراب کی کشید اور فروخت بالکل بند ہو گئی۔ ننانوے فی صدی دھوپی شراب کے عادی تھے۔۔۔ دن بھر پانی میں رہنے کے بعد شام کو پاؤ آدھ پاؤ شراب ان کی زندگی کا جزو بن چکی تھی۔۔۔ ہمارا دھوپی بیمار ہو گیا۔ اس بیماری کا علاج اس نے اس زہر لی شراب سے کیا جو ناجائز طور پر کشید کر کے چھپے چوری کیتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے معدے میں خطرناک گڑ بڑ پیدا ہو گئی جس نے اس کو موت کے دروازے تک پہنچا دیا۔

میں بے حد مصروف تھا۔ صبح چھ بجے گھر سے نکلتا تھا اور رات کو دس ساڑھے دس بجے لوٹتا تھا۔ میری بیوی کو جب اس کی خطرناک بیماری کا علم ہوا تو وہ ٹیکسی لے کر اس کے گھر گئی۔ نوکرا اور شوفر کی مدد سے اس کو گاڑی میں بٹھایا اور ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ڈاکٹر بہت متاثر ہوا چنانچہ اس نے فیس لینے سے انکار کر دیا۔ لیکن میری بیوی نے کہا، ”ڈاکٹر صاحب، آپ سارا ثواب حاصل نہیں کر سکتے۔“ ڈاکٹر مسکرایا، ”تو آدھا آدھا کر لیجیے۔“ ڈاکٹر نے آدمی فیس قبول کر لی۔

دھوپی کا باقاعدہ علاج ہوا۔ معدے کی تکلیف چند انجلکشنوں ہی سے دور ہو گئی۔ نقاہت تھی، وہ آہستہ آہستہ مقوی دواؤں کے استعمال سے ختم ہو گئی۔ چند مہینوں کے بعد وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور اٹھتے بیٹھتے ہمیں دعائیں دیتا تھا، ”بھگوان ساب کو ساعید شالیم باشٹر بنائے۔۔۔ ادھر کوالے میں ساب رہنے کو جائے۔۔۔ باوالوگ بیس۔۔۔ بہت بہت پیسہ ہو۔۔۔ بیگم ساب دھوپی کو لینے آیا۔۔۔ موڑ میں۔۔۔ ادھر کلے (قلعے) میں بہت بڑے ڈاکٹر کے پاس لے گیا جس کے پاس میم ہوتا۔۔۔ بھگوان بیگم ساب کو خُس رکھے۔۔۔“

کئی برس گزر گئے۔ اس دوران میں کئی سیاسی انقلاب آئے۔ دھوپی بلاناغہ اتوار کو آتا رہا۔ اس کی صحت اب بہت اچھی تھی۔ اتنا عرصہ گزرنے پر بھی وہ ہمارا سلوک نہیں بھولا تھا۔ ہمیشہ دعائیں دیتا تھا۔ شراب قطعی طور پر چھوٹ چکی تھی۔ شروع میں وہ کبھی کبھی اسے یاد کیا کرتا تھا۔ پر اب نام تک نہ لیتا تھا۔ سارا دن پانی میں رہنے کے بعد تھکن دور کرنے کے لیے اب اسے دارو کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

حالات بہت زیادہ بگڑ گئے تھے۔ ٹوارہ ہوا تو ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ ہندوؤں کے علاقوں میں مسلمان اور مسلمانوں کے علاقوں میں ہندو دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں ہلاک کیے جانے لگے۔ میری بیوی لاہور چلی گئی۔ جب حالات اور زیادہ خراب ہوئے تو میں نے دھوپی سے کہا، ”دیکھو دھوپی اب تم کام بند کر دو۔۔۔ یہ مسلمانوں کا محلہ ہے، ایسا نہ ہو کوئی تمہیں مار ڈالے۔“ دھوپی مسکرایا، ”ساب اپن کو کوئی نہیں مارتا۔“ ہمارے محلے میں کئی وارداتیں ہوئیں مگر دھوپی برابر آتا رہا۔

ایک اتوار میں گھر میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ کھلیوں کے صفحے پر کرکٹ کے میچوں کا اسکور درج تھا اور پہلے صفحات پر فسادات کے شکار ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعداد و شمار۔۔۔ میں ان دونوں کی خوفناک مماثلت پر غور کر رہا تھا کہ دھوپی آگیا۔ کاپی نکال کر میں نے کپڑوں کی پڑتال شروع کر دی تو دھوپی نے بنس کے با تین شروع کر دیں۔ ساعید شالیم باشٹر بہت اچھا آدمی ہوتا۔۔۔ بیہاں سے جاتا تو ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوپی، ایک کرتہ دیا ہوتا۔۔۔ تمہارا بیگم ساب بھی ایک دم اچھا آدمی ہوتا۔۔۔

باہر گام گیا ہے نا۔۔۔؟ اپنے ملک میں۔۔۔؟ ادھر کا گچ لکھو تو ہمارا سلام بولو۔۔۔ موڑ لے کر آیا ہماری کھوی میں۔۔۔ ہم کو اتنا جلا ب آنا ہوتا۔۔۔ ڈاکٹر نے سوئی لگایا۔۔۔ ایک دم ٹھیک ہو گیا۔۔۔ ادھر کا گچ لکھو تو ہمارا سلام بولو۔۔۔ بولو رام کھلاون بولتا ہے، ہم کو بھی کا گچ لکھو۔۔۔ ”میں نے اس کی بات کاٹ کر ذرا تیزی سے کہا، ”دھوپی۔۔۔ دارو شروع کر دی؟“ دھوپی ہنسا، ”دارو؟۔۔۔ دارو کہاں سے ملتی ہے ساب؟“ میں نے اور کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے میلے کپڑوں کی گھٹھری بنائی اور سلام کر کے چلا گیا۔

چند دنوں میں حالات بہت ہی زیادہ خراب ہو گئے۔ لاہور سے تار پر تار آنے لگے کہ سب کچھ چھوڑو اور جلدی چلے آؤ۔ میں نے ہفتے کے روز ارادہ کر لیا کہ اتوار کو چل دوں گا۔ لیکن مجھے صحیح سویرے نکل جانا تھا۔ کپڑے دھوپی کے پاس تھے۔ میں نے سوچا کرفیو سے پہلے پہلے اس کے ہاں جا کر لے آؤں، چنانچہ شام کو وکٹوریہ لے کر مہالکشمی روانہ ہو گیا۔

کرفیو کے وقت میں بھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اس لیے آمد و رفت جاری تھیں۔ ٹرینیں چل رہی تھیں۔ میری وکٹوریہ پل کے پاس پہنچی تو ایک دم شور برپا ہوا۔ لوگ اندر ہادھنڈ بھاگنے لگے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے سانڈوں کی لڑائی ہو رہی ہے۔۔۔ ہجوم چھدر را ہوا تو دیکھا، دور بھیوں کے پاس بہت سے دھوپی لاغھیاں ہاتھ میں لیے ناچ رہے ہیں اور طرح طرح کی آوازیں نکال رہے ہیں۔ مجھے ادھر ہی جانا تھا مگر وکٹوریہ والے نے انکار کر دیا۔ میں نے اس کو کرایہ ادا کیا اور پیدل چل پڑا۔۔۔ جب دھوبیوں کے پاس پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر غاموش ہو گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک دھوپی سے پوچھا، ”رام کھلاون کہاں رہتا ہے؟“ ایک دھوپی جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، جھومتا ہوا اس دھوپی کے پاس آیا جس سے میں نے سوال کیا تھا، ”کیا پوچھتے ہے؟“

”پوچھتے ہے رام کھلاون کہاں رہتا ہے؟“

شراب سے دھت دھوپی نے قریب قریب میرے اوپر چڑھ کر پوچھا، ”تم کون ہے؟“

”میں۔۔۔؟ رام کھلاون میرا دھوپی ہے۔۔۔“

”رام کھلاون تھا دھوپی ہے۔۔۔ تو کس دھوپی کا بچہ ہے۔۔۔“

ایک چلایا، ”ہندو دھوپی یا مسلمین دھوپی کا۔“

تمام دھوپی جو شراب کے نئے میں چور تھے، مکے تانتے اور لاٹھیاں گھماتے میرے ارڈ گرد جمع ہو گئے۔ مجھے ان کے صرف ایک سوال کا جواب دینا تھا۔ مسلمان ہوں یا ہندو۔۔۔؟ میں بے حد خوف زدہ ہو گیا۔ بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ میں ان میں گھرا ہوا تھا۔ نزدیک کوئی پولیس والا بھی نہیں تھا جس کو مدد کے لیے پکارتا۔۔۔ اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بے جوڑ الفاظ میں ان سے گفتگو شروع کر دی۔ رام کھلاون ہندو ہے۔۔۔ ہم پوچھتا ہے وہ کہ ہر رہتا ہے۔۔۔ اس کی کھوپی کہاں ہے۔۔۔ دس برس سے وہ ہمارا دھوپی ہے۔۔۔ بہت بیکار تھا۔۔۔ ہم نے اس کا علاج کرایا تھا۔۔۔ ہماری بیگم۔۔۔ ہماری میم صاحب بیہاں موڑ لے کر آئی تھی۔۔۔ بیہاں تک میں نے کہا تو مجھے اپنے اوپر بہت ترس آیا۔ دل ہی دل میں بہت خفیف ہوا کہ انسان اپنی جان بچانے کے لیے کتنی نیچی سطح پر اتر آتا ہے اس احساس نے جرأت پیدا کر دی چنانچہ میں نے ان سے کہا، ”میں مسلمین ہوں۔“

”مارڈالو۔۔۔ مارڈالو“ کا شور بلند ہوا۔ دھوپی جو کہ شراب کے نئے میں دھت تھا ایک طرف دیکھ کر چلایا، ”مکھرو۔۔۔ اسے رام کھلاون مارے گا۔“ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ رام کھلاون موٹاٹا ڈھاٹا تھا میں لیے لڑکھڑا رہتا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مسلمانوں کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ڈنڈا سر تک اٹھا کر گالیاں دیتا ہوا وہ میری طرف بڑھا۔ میں نے تحکمانہ لبھے میں کہا، ”رام کھلاون!“

رام کھلاون دھاڑا، ”چپ کر بے رام کھلاون کے۔۔۔“

میری آخری امید بھی ڈوب گئی۔ جب وہ میرے قریب آپنچا تو میں نے خشک گلے سے ہولے سے کہا، ”مجھے پہچانتے نہیں رام کھلاون؟“ رام کھلاون نے دار کرنے کے لیے ڈنڈا اٹھایا۔۔۔ ایک دم اس کی آنکھیں سکڑیں، پھر پھیلیں، پھر سکڑیں۔ ڈنڈا تھے سے گرا کر اس نے قریب آ کر مجھے غور سے دیکھا اور پکارا، ”ساب!“ پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا ”یہ مسلمین نہیں۔۔۔ ساب ہے۔۔۔ بیگم ساب کا ساب۔۔۔ وہ موڑ لے کر آیا تھا۔۔۔ ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔۔۔ جس نے میرا جلب ٹھیک کیا تھا۔“

رام کھلاون نے اپنے ساتھیوں کو بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔۔۔ سب شرابی تھے۔ تو تو میں میں شرع ہو گئی۔ کچھ دھوپی رام کھلاون کی طرف ہو گئے اور ہاتھا پائی پر نوبت آگئی۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا اور وہاں سے کھمک گیا۔ دوسرے روز صحیح نوبجے کے قریب میرا ساماں تیار تھا۔ صرف جہاز کے ٹکٹلوں کا انتظار تھا جو ایک دوست بلکہ مارکیٹ سے حاصل کرنے گیا تھا۔ میں بہت بے قرار تھا۔ دل میں طرح طرح کے

جدبات ابل رہے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ جلدی ٹکٹ آجائیں اور میں بندر گاہ کی طرف چل دوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر دیر ہو گئی تو میر افیٹ مجھے اپنے اندر قید کر لے گا۔

دروازہ پر دستک ہوئی۔ میں نے سوچا ٹکٹ آگئے۔ دروازہ کھولا تو باہر دھوپی کھڑا تھا۔

”ساب سلام!“

”سلام“

”میں اندر آ جاؤں؟“

”آؤ“

وہ خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ گھری کھول کر اس نے کپڑے نکال بینگ پر رکھے۔ دھوتی سے اپنی آنکھیں پوچھیں اور گلوگیر آواز میں کہا، ”آپ جا رہے ہیں ساب؟“

”ہاں!“

اس نے رونا شروع کر دیا، ”ساب، مجھے ماف کر دو۔۔۔ یہ سب دارو کا قصور تھا۔۔۔ اور دارو۔۔۔ دارو آج کل مفت ملتی ہے۔۔۔ سیٹھ لوگ بانٹتا ہے کہ پی کر مسلمین کو مارو۔۔۔ مفت کی دارو کون چھوڑتا ہے ساب۔۔۔ ہم کو ماف کر دو۔۔۔ ہم پئے لا تھا۔۔۔ ساعد شالیم بالشر ہمارا بہت مہربان ہوتا۔۔۔ ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتادیا ہوتا۔۔۔ تمہارا بیگم ساب ہمارا جان بچایا ہوتا۔۔۔ جلا بسے ہم مرتا ہوتا۔۔۔ وہ موڑ لے کر آتا۔ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔ اتنا پیسہ خرچ کرتا۔۔۔ ملک ملک جاتا۔۔۔ بیگم ساب سے مت بولنا۔رام کھلاون۔۔۔“

اس کی آواز گلے میں رندھ گئی۔ گھری کی چادر کا ندھ پر ڈال کر چلنے لگا تو میں نے روکا، ”مُہہ و رام کھلاون!“

لیکن وہ دھوتی کالانگ سنبھالتا تیزی سے باہر نکل گیا۔

-[117]-

مائی نانکی: سعادت حسن منٹو

اس دفعہ میں ایک عجیب سی چیز کے متعلق لکھ رہا ہوں۔ ایسی چیز جو ایک ہی وقت میں عجیب و غریب اور زبردست بھی ہے۔ میں اصل چیز لکھنے سے پہلے ہی آپ کو پڑھنے کی ترغیب دے رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کہیں آپ کل کونہ کہہ دیں کہ ہم نے چند پہلی سطور ہی پڑھ کر چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ وہ خشک سی تھیں۔ آج اس بات کو قریب قریب تین ماگزین گئے ہیں کہ میں مائی نانکی کے متعلق کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں چاہتا تھا کہ کسی طرح جلدی سے اسے لکھ دوں تاکہ آپ بھی مائی نانکی کی عجیب و غریب اور پر اسرار شخصیت سے واقف ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے آپ اس سے پہلے بھی مائی نانکی کو جانتے ہوں کیونکہ اسے کشمیر اور جموں کشمیر کے علاقے کے سبھی لوگ جانتے ہیں اور لاہور میں سید مٹھا اور ہیر امنڈی کے گرد نواح میں رہنے والے لوگ بھی۔ کیونکہ اصل میں وہ رہنے والی جموں کی ہے اور آج کل راجہ دھیان سنگھ کی حوالی کے ایک اندر ہیرے کو نہیں میں رہتی ہے۔ لہذا بہت ممکن ہے کہ آپ بھی جموں یا ہیر امنڈی کے گرد نواح میں رہتے ہوں اور مائی نانکی سے واقف ہوں۔ لیکن میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے۔

میں نے اپنی زندگی میں بہت سی عورتیں دیکھی ہیں اور بڑی بڑی زہریلی قسم کی عورتیں لیکن میں آج تک کسی سے اتنا متاثر نہیں ہوا جتنا اس عورت سے۔ جیسا کہ میں اپر لکھ چکا ہوں وہ جموں کی رہنے والی ہے۔ وہاں وہ ایک دایہ کام کرتی تھی اور اس کے کہنے کے مطابق وہ جموں اور کشمیر کی سب سے بڑی دایہ تھی۔ وہاں کے سب سے بڑے ہسپتالوں اور ڈاکٹروں کے ہاں اس کا ہی چرچا رہتا تھا۔ اور جہاں کہیں کسی عورت کے ہاں بچپن پیدا نہ ہو تا تو فوراً اسے بلا یا جاتا۔

اس کے علاوہ وہاں کے بڑے بڑے راجہ، مہاراجہ، نواب، نج، وکیل اور ملٹری کے بڑے بڑے افسر سب اس کے مدارج اور مرید تھے۔ انہوں نے آج تک نہ کبھی اس کی بات ٹالی اور نہ اسے ناراض کیا۔ بلکہ جب بھی اس کا بھی چاہا اس نے اُن سے ہزار ہا قسم کے کام نکالے۔ اس

کے علاوہ وہ غالباً روزانہ اپنے کام سے تین چار سوروپے کے قریب کمالیت تھی۔ روزانہ ان گنت بچے جناتی۔ ان میں کئی ایک مردہ، کئی ست ماہیں اور باقی ٹھیک ٹھاک ہوتے۔ اس کے علاوہ وہاں اس کا عالیشان مکان اور دودکانیں تھیں۔ ایک طویلہ جس میں بارہ مہینے پانچ سات گائیں بھیں بندھی رہتیں۔۔۔ اس کا کنبہ جو ۱۲۵ افراد پر مشتمل تھا، سب دودھ مکھن کھاتے اور موج میں رہتے۔

کنبہ کے لفظ پر ایک لطیفہ سنتے چلے۔ اس کے کنبے کے سبھی آدمی اس کے گھر کے نہیں تھے۔ ان پچیس افراد میں سے اس کا نہ کوئی لڑکا تھا نہ لڑکی، ماں نہ بہن صرف وہ ایک خود تھی یا اس کا شوہر اور باقی سب لڑکیاں اس نے دوسروں سے لے کر پالے ہوئے تھے۔

میں نے ایک روز اس سے پوچھا کہ ”تم دوسروں کے بچے جناتی رہیں لیکن خود کیوں نہ جنا؟“ کہنے لگی، ”ایک ہوا تھا میں نے اسے مار دیا۔“ میں نے پوچھا، ”کیوں؟“ کہنے لگی، ”میری طبیعت کو اس کارونانا گوار گزرا تھا۔ بُخوبصورت تھا لیکن میں نے اسے زین پر رکھا اور اوپر سے لحاف اور رضاۓیوں کا ایک انبار گردایا اور وہ نیچے ہی دم گھٹ کے مر گیا۔“

میں اس کی زبانی اس کے حالات آپ کو بتا رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کہتی کہ میرے پاس کم از کم پچیس تیس ہزار کی مالیت کا زیور بھی تھا۔ بقول اُس کے وہ بڑی موج میں رہ رہی تھی کہ اچانک ہندوستان تقسیم ہو گیا اور کشمیر میں قتل و غارت شروع ہوئی۔ ڈو گرے مسلمانوں کو چن چن کے قتل کرنے لگے۔ چنانچہ اسی افرا تفری میں اس نے اپنا گھر چھوڑا کیونکہ اس کے محلے میں بھی قتل و خون اور عصمت دری شروع ہو گئی تھی۔ لیکن اس بھاگ دوڑ میں اس کے گھر کے سبھی آدمی اسے چھوڑ گئے اور وہ اکیلی جان بچانے کو عیساۓیوں کے محلے میں جا گھسی۔

آپ حیران ہوں گے وہ اس قیامت کے سے میں بھی اپنا زیور اور گائے بھیں اور ضروری کپڑے اور سامان وغیرہ بھی اپنے ساتھ لے گئی اور وہاں سکونت پذیر ہوئی۔ لیکن جس واقف کار کے ہاں وہ ٹھہری تھی اسے دوسرا روز کے روز اس نے کہا کہ مائی ہم کو بھی قتل کروانے کی ٹھانی ہے۔ تم اپنا زیور سامان اور گائے بھیں چھوڑ کر پاکستان چلی جاؤ۔ کیونکہ اگر یہ چیزیں کسی ڈو گرے نے دیکھ لیں تو تم کو ختم کر دے گا۔ چنانچہ وہاں سے صرف اپنا دن رات کا فیض حقہ اٹھا کر باہر نکلی تھی کہ ساتھ والی عیساائن نے کہا، ”مائی تم میرے گھر میں آر ہو۔ اگر کوئی تصحیح مارنے آیا تو پہلے ہم کو مارے گا۔“

وہ رضا مند ہو گئی لیکن اسی شام کو جوں کے مہاراجہ کا بھیجا ہوا ایک سپاہی آیا اور اس نے اس عیساائن سے سوال کیا، ”کیا دائی ناکی بھیں ہے؟“ عیساائن نے جواب دیا کہ نہیں وہ بیہاں کہاں۔ سپاہی اور عیساائن کے سوال وجواب وہ خود اندر سن رہی تھی اور وہ کہتی ہے کہ میں خود باہر آئی اور سپاہی سے کہا، ”میں ہوں مہاراج، مائی ناکی میراہی نام ہے۔“ سپاہی کہنے لگا، ”مہاراج کہتے ہیں ناکی بھیں ہمارے پاس رہے گی۔ پاکستان

نہیں جائے گی۔ اس نے بتایا کہ سپاہی کا یہ فقرہ سن کر مجھے جلال آگیا اور میں نے آنکھیں لاں کر کے کہا، ”مہاراج سے کہو ہم نے آپ سے اور آپ کی رعایا سے بہت کچھ انعام لے لیا ہے۔ اب ہمیں اور سکھ نہیں چاہیے اور دیکھو مہاراج سے جا کر کہہ دو کہ مائی نانکی پاکستان ضرور جائے گی کیونکہ اگر پاکستان نہیں جائے تو کیا جہنم میں جائے گی۔“

سپاہی یہ سن کر واپس مہاراج کے پاس چلا گیا اور دوسرے ہی روز ملٹری کے ایک کرٹل کی حفاظت میں مائی نانکی سرحد عبور کر کے پاکستان میں داخل ہو رہی تھی۔ سرحد پر اسے پتہ چلا کہ اس کے کنبے کے پیچیں افراد میں سے اٹھارہ جن میں لڑکے اور لڑکیاں تھیں شہید ہو چکے ہیں اور باقی کے تین لڑکے اور ایک بہو اور دونوں پچھے پاکستان صحیح و سلامت جا چکے ہیں۔ وہ کہتی تھی میرے آنسو نہیں نکلے۔ میں نے اپنا بھرا بھرا یا گھر دیا، سات گائیں بھینیں اور تمیں ہزار کا زیور کشمیر کے ہندوؤں اور عیسائیوں نے چھین لیا۔

میرے اٹھارہ لاڈ لے جن میں بڑے بڑے سورما تھے ان کافروں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ میں خود اجڑی لیکن میرے آنسو نہیں نکلے۔ ہاں زندگی میں پہلی بار روئی، وہ اس وقت جب میں نے مہاجرین کے کمپ میں پاکستانیوں کو جوان لڑکیوں سے بد فعلی کرتے دیکھا۔ اپنی بہو اور لڑکوں سمیت شہربہ شہر پیٹ پالنے کی خاطر پھرتی رہی۔ آخر اپنے ایک عزیز کے ہاں جو کہ خوش قسمتی سے ہو میلی دھیان سنگھ میں رہتا تھا آگئی اور اس کے لڑکے موچی گری کرنے لگے اس کے متعلق وہ کچھ پہلے بھی جانتے تھے۔

جموں کی ٹھاٹ دار زندگی اور اس کے تمام حالات وہیں رہ گئے۔ لیکن جہاں تک میں نے اسے یہاں جس غربت کی حالت میں دیکھا ہے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ ایک بہت ہی اوپنچے درجے کی عورت ہے۔ ایسی عورت تین بہت کم دنیا میں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی ذات بہت ہی بلند اور بے مثال ہے۔ ۸۵ سال کی عمر ہونے کو آئی لیکن گھر کا سب کام کا جن خود کرتی ہے۔ بیماری اور پریشانی میں بھی اس کا چھرہ پروقاڑ اور پھول کی طرح کھلا رہتا ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے غمگین نہیں ہوتی اور نہ کسی گھری سوچ میں غرق رہتی ہے۔ چوبیں گھنٹے ہنستی اور مسکراتی رہتی ہے۔

اس بڑھاپے میں بھی بڑی بڑی بو جمل چیزیں خود اٹھاتی ہے۔ بڑی اچھی باتیں سناتی ہے۔ کسی بھی فقیر کو غالی ہاتھ نہیں لوٹاتی۔ اور سب سے بڑی بات جو میں اب اس کے متعلق بتانے لگا ہوں وہ یہ کہ وہ انتہا درجے کی غریب عورت ہوتے ہوئے بھی بڑے بڑے شہنشاہوں سے زیادہ امیر ہے۔ اس لیے کہ اس کا دل بادشاہ کا ہے۔ اگر محلے کی کسی عورت نے اس سے کچھ مانگ لیا تو بس بھر بھر کے دیتی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ خوش ہوتی جاتی ہے اور مجھے تو بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا شہنشاہ اپنی رعیت کو کائنات کی نعمتیں تقسیم کر رہا ہو۔

کھانے کے معاملے میں وہ بہت تیز ہے اور اس عمر میں بھی دن میں وہ چار وقت پیٹ بھر کر کھانا کھاتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ سارا اسر سفید ہو گیا ہے لیکن اس کے گالوں پر سرخیاں ہنوز باقی ہیں۔

اس کا اپنا بیان ہے کہ وہ ایک دفعہ کسی زچہ کو دیکھنے کی تو اتفاق سے وہاں گھروالوں نے گھی، سو جی پتے بادام اور دوسرے میوے ملا کر ایک قسم کی چوری تیار کی تھی جو کہ تین چار سیر کے قریب ہو گی۔ شامت اعمال لڑکی کی ماں ناگی کو ذرا چکھے کے دیکھنے کو کہہ بیٹھی۔ بس اس کا کہنا تھا کہ ناگی نے برتن تمام لیا اور ساری چوری چٹ کر گئی۔

اتنا کچھ کھاچنے کے بعد وہ کہتی تھی مجھے کچھ خبر بھی نہ ہوئی اور وہ وہاں سے اٹھ کر دوسرا زچہ کے ہاں گئی جہاں سے اس نے ایک سیر کے قریب حلوہ پوری کھایا۔ اسی طرح کے کئی اور واقعات وہ ہنس کے سناتی ہے۔ جہاں تک لباس کا تعلق ہے وہ عام پنجابی لباس یعنی قمیص اور شلوار پہنتی ہے لیکن اس عام میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنی قمیص کو ہمیشہ شلوار کے اندر کر کے ازار بند باندھتی ہے۔ میں نے اس سے استفسار کیا تو وہ کہنے لگی، ”تم ابھی بنچے ہو، تمھیں کیا معلوم ہو۔“ اور میں خاموش ہو گیا۔ پاؤں میں وہ مردانہ جوتا پہنتی ہے اور جب آدھی رات کو سب سوئے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ غسل خانے میں جاتی ہے تو اس کے پاؤں کی آواز بہت ہی مہیب معلوم ہوتی ہے۔

اب ذرا سا اس کے لڑکوں کے متعلق سن لیجیے۔ اس کے سب سے بڑے لڑکے کا نام جبیب اللہ ہے جس کی ایک دکان جو تیوں کی ہے اور ناگی کا کہنا ہے کہ اس لڑکے کو اس نے بڑے نازو نعم سے پالا پوسا ہے اور وہی سب میں زیادہ خدمت گزار اور فاشعار ہے، وہ اس کی خوب خدمت کرتا ہے اور ناگی اس پر بہت خوش ہے۔ جبیب اللہ اپنی سرال کے مکان کی سب سے اوپر والی منزل کے دو کمروں میں ایک بیوی اور تین بچوں سمیت رہتا ہے۔ گریوں میں اس کے بچوں کے پاؤں دھوپ میں جل جلتے ہیں اور سردیوں میں اوپر سکڑتے رہتے ہیں لیکن آج تک کبھی اس نے ماتھے پر بل نہیں ڈالا اور نہ اس کے ہونٹ مسکراہٹ سے بے خبر ہوئے ہیں بلکہ وہ اپنے دستور کے مطابق ہر اتوار کو ناگی کے لیے پانچ سات روپے کا چھل وغیرہ لے کر مسکراتا ہوا آتا ہے اور ناگی کی دعائیں لے کر چلا جاتا ہے۔

اس سے چھوٹے لڑکے کا نام محمد حسین ہے جو بھلی اور ریڈیو کا کام اچھی طرح جانتا ہے اور اسے دفتر روزگار سے کم از کم پانچ دفعہ کارڈ بنوانے کے باوجود آج سات سال سے کوئی نوکری نہیں ملی۔ مائی ناگی نے بڑی کوشش کی کہ جیتے جی اپنے ان پالے ہوئے لڑکوں کی شادیاں کر کے جائے تاکہ بعد میں وہ دربدرنہ ہوں اور اسے بھی قبر میں آرام نصیب ہو۔ لیکن بقول اسی کے، غریب کو مر کے بھی آرام نہیں ملتا۔ شاید اسی لیے ابھی تک اس کی شادی کا کوئی بندوبست نہیں ہوا۔

ایک دو جگہ دریافت کرنے پر لڑکی والوں نے کہا کہ کم از کم دو تین زیور لڑکی کوڈالو تب لڑکی ملے گی ورنہ نہیں لیکن دوسری طرف یعنی ناگنی کے پاس تصرف اللہ کا نام اور اپنا بیٹا ہی ہے۔ ناگنی کا کہنا ہے کہ اس کا لڑکا محمد حسین عقل کے لحاظ سے تو کسی بڑے لیڈر کے برابر ہے لیکن اس کی اکٹھنڈے لاث کی طرح ہے۔

محمد حسین سے چھوٹے لڑکے کا نام محمد یونس ہے جو خوبصورت اور دبلا پتلا ہے اور اس کی تعلیم سات جماعت تک ہے۔ سینکڑوں کام کرنے کی تجویزیں کر رہا ہے اور جن میں سب سے بڑی خواہش اس کی یہ ہے کہ اسے کوئی معمولی سی ملازمت مل جائے جہاں اسے صحیح سے دوپہر تک کام کرنا پڑے اور شام کے وقت وہ کچھ پڑھ لے اور اس طرح اپنی تعلیم کو بڑھاسکے۔ لیکن آج تک اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ ناگنی کا یہ خیال ہے کہ وہ جنات کی قوم سے ہے کیونکہ اس میں غصے کا مادہ زیادہ ہے۔

مائی ناگنی آج کل کچھ اداں اور غمگین سی رہنے لگی ہے۔ ایک روز میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگی، ”بچے مجھے پاکستان نے بہت سی بیماریاں لگادی ہیں۔ مجھے جموں میں کوئی بیماری نہیں تھی اور نہ کبھی میں نے کسی بات کے متعلق آج تک سوچا ہے۔ ہاں اپنی ساری زندگی میں ایک دفعہ میں نے ایک بات پر غور کیا تھا اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے۔ اصل میں قصہ یہ ہوا کہ جموں کی ایک بائیمنی کے ہاں بچہ پیدا نہیں ہوتا تھا، بڑی بڑی کار گیر نرسوں اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا اور مصیبت یہ تھی کہ بچہ پیٹ میں ادھر چکر لگاتا تھا اور ہمکتا بھی تھا۔ اس مشکل میں سمجھی نے گھروالوں کو مشورہ دیا کہ ناگنی کو بلاو۔ چنانچہ میں گئی اور دوہاتھ لگانے سے ہی بچہ پیدا ہو گیا لیکن میر ارگن اڑ گیا اور اپنی جوانی میں میں پہلی بار سر سے پاؤں تک پسینے میں شرابو رہ گئی۔“ یہاں تک کہہ کرو وہ ذرار کی۔

میں نے پوچھا، ”کیوں؟“ کہنے لگی، ”کیونکہ بچے کے دوسرا چار آنکھیں اور دونوں سرروں میں دو دو سینگ تھے۔ میں نے آنکھیں لال کرتے ہوئے براہمی سے کہا، ”کیوں لاہہ یہ کیا ظلم کیا تم نے۔ تم نے مجھے بتایا تک نہیں کہ یہ تصدی ہے۔ اگر میرے دل کی حرکت بند ہو جاتی تو؟“

اس پر لاہہ جی نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے کے کسی سے اس بات کا ذکر نہ کرنا۔ جو جی چاہے لے لو۔ سو میں نے اس سے سوروپے لیے۔ لیکن اب تو کئی اندریشے جان کو کھائے جا رہے ہیں بچہ۔ سب سے زیادہ اس بات کو سوچتی ہوں کہ میں پاکستان کی خاطر اپنا بھرا بھرا لٹا کر آئی۔ اٹھارہ آدمی شہید ہوئے اور تیس ہزار کی مالیت کا زیور بھی وہیں رہ گیا۔ اس بے بسی اور غربت کی حالت میں ہم یہاں آئے۔ لیکن پاکستان والوں نے میرے نام کوئی مکان الٹ کیا اور نہ کوئی دکان۔ آج تک نہ کہیں سے راشن ملا اور نہ ہی کچھ مالی امداد۔ باعث کمالی جس نے پاکستان کو بڑی مشکلوں سے بنایا تھا اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اب اس کے بعد جتنے بھی ہیں آنکھیں بند کیے مست پڑے ہیں۔ ان کو کیا خبر کہ ہم

غريب کس حالت میں رہ رہے ہیں اس کی خبر یا ہمارے اللہ کو ہے یا تمیں۔ اس لیے اب ہر دم اپنے اللہ سے یہی دعا کرتی ہوں کہ ایک دفعہ پھر سے سب کو مہاجر کرتا کہ غیر مہاجر لوگوں کو پتہ چلے کہ مہاجر کس طرح ہوتے ہیں اتنا کہہ کر اس نے حق کی نہ منہ میں دبائی۔

میں نے اس سے کہا، ”ماں پہلے تو لوگ ہندوستان سے مہاجر ہوئے تو پاکستان آگئے۔ اب اگر یہاں سے مہاجر ہو گئے تو کہاں جائیں گے؟“ وہ حقہ کی نے کو غصے سے جھٹک کر بولی، ”جہنم میں جائیں گے۔ کوئی پروا نہیں۔ لیکن ان کو معلوم تو ہو جائے گا کہ مہاجر کس کو کہتے ہیں۔“

-[118]-

کبوتروں والا سائیں: سعادت حسن منشو

پنجاب کے ایک سرددیہات کے تکیے میں، ماں جیواں: صبح سویرے ایک غلاف چڑھی قبر کے پاس، زمین کے اندر کھدے ہوئے گڑھے میں، بڑے بڑے اپلوں سے آگ سلاگار ہی ہے۔ صبح کے سرداور میاں لے دھنڈ لکے میں، جب وہ اپنی پانی بھری آنکھوں کو سکیڑ کر اور اپنی کمر کو دھرا کر کے، منہ قریب قریب زمین کے ساتھ لگا کر اوپر نتے رکھے ہوئے اپلوں کے اندر پھونک گھسیرنے کی کوشش کرتی ہے تو زمین پر سے تھوڑی سی راکھ اڑتی ہے اور اس کے آدھے سفید اور آدھے کالے بالوں پر جو کہ گھسے ہوئے کمبل کا نمونہ پیش کرتے ہیں، بیٹھ جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بالوں میں تھوڑی سی سفیدی اور آگئی ہے۔

اپلوں کے اندر آگ سلگتی ہے اور یوں جو تھوڑی سی لال لال روشنی پیدا ہوتی ہے، ماں جیواں کے سیاہ چہرے پر جھریوں کو اور نمایاں کر دیتی ہے۔

ماں جیواں یہ آگ کئی مرتبہ سلاگچکی ہے۔ یہ تکیہ یا چھوٹی سی خانقاہ جس کے اندر بنی ہوئی قبر کی بابت اس کے پردادا نے لوگوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے پیر کی آرام گاہ ہے، ایک زمانے سے ان کے قبضہ میں تھی۔ گاماسائیں کے مرنے کے بعد اب اس کی ہوشیار بیوی اس تکیے کی مجاور تھی۔ گاماسائیں سارے گاؤں میں ہر دل عزیز تھا۔ ذات کا وہ کمہار تھا مگر چونکہ اسے تکیے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی، اس لیے اس نے برتن بنانے چھوڑ دیے تھے۔ لیکن اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کونڈیاں اب بھی مشہور ہیں۔ بھنگ گھوٹنے کے لیے وہ سال بھر میں چھ کونڈیاں بنایا کرتا تھا جن کے متعلق بڑے فخر سے وہ یہ کہا کرتا تھا، ”چودھری لوہا ہے لوہا۔۔۔ فولاد کی کونڈی ٹوٹ جائے پر گاما سائیں کی یہ کونڈی، دادا لے تو اس کا پوتا بھی اسی میں بھنگ گھوٹ کر پیے۔“

مرنے سے پہلے گاماسائیں چھ کونڈیاں بنانے کر کھا جواب مائی جیوال بڑی احتیاط سے کام میں لاتی تھی۔

گاؤں کے اکثر بڑھے اور جوان تکیے میں جمع ہوتے تھے اور سردائی پیا کرتے تھے۔ گھوٹنے کے لیے گاماسائیں نہیں تھاپر اس کے بہت سے چیلے چانٹے جواب سر اور بھویں منڈا کر سائیں بن گئے تھے، اس کے بجائے بھنگ گھوٹا کرتے تھے اور مائی جیوال کی سلاکائی ہوئی آگ سُلفہ پینے والوں کے کام آتی تھی۔

صبح اور شام کو تو خیر کافی رونق رہتی تھی، مگر دوپہر کو بھی آٹھ دس آدمی مائی جیوال کے پاس بیری کی چھاؤں میں بیٹھے ہی رہتے تھے۔ ادھر ادھر کونے میں لمبی لمبی نیل کے ساتھ ساتھ کئی کاپک تھے جن میں گاماسائیں کے ایک بہت پرانے دوست ابوپہلوان نے سفید کبوتر پال رکھتے تھے۔ تکیے کی دھوکیں بھری فضایں ان سفید اور چٹکبرے کبوتروں کی پھر پھر اہم بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جس طرح تکیے میں آنے والے لوگ شکل و صورت سے معصومانہ حد تک بے عقل نظر آتے تھے اسی طرح یہ کبوتر جن میں سے اکثر کے پیروں میں مائی جیوال کے بڑے لڑکے نے جھانجھ پہنار کئے تھے، بے عقل اور معصوم دکھائی دیتے تھے۔

مائی جیوال کے بڑے لڑکے کا اصلی نام عبد الغفار تھا۔ اس کی پیدائش کے وقت یہ نام شہر کے تھانے دار کا بھی کبھی گھوڑی پر چڑھ کر موقعہ دیکھنے کے لیے گاؤں میں آیا کرتا تھا اور گاماسائیں کے ہاتھ کا بنا ہوا ایک پیالہ سردائی کا ضروری پیا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ بات نہ رہی تھی۔ جب وہ گیارہ برس کا تھا تو مائی جیوال اس کے نام میں تھانے داری کی بوسونگھ سکتی تھی مگر جب اس نے بارہویں سال میں قدم رکھا تو اس کی حالت ہی بگڑ گئی۔ خاصاً مگر اجوان تھا پرنہ جانے کیا ہوا کہ بس ایک دو برس میں ہی سچ مجھ کاماسائیں بن گیا۔ یعنی ناک سے رینٹھ بہنے لگا اور چپ چپ رہنے لگا۔ سر پہلے ہی چھوٹا تھا پر اب کچھ اور بھی چھوٹا ہو گیا اور منہ سے ہر وقت لعاب سانکھنے لگا۔

پہلے پہل ماں کو اپنے بچے کی اس تبدیلی پر بہت صدمہ ہوا مگر جب اس نے دیکھا کہ اس کی ناک سے رینٹھ اور منہ سے لعاب بہتے ہی گاؤں کے لوگوں نے اس سے غیب کی باقیں پوچھنا شروع کر دی ہیں اور اس کی ہر جگہ خوب آؤ بھگت کی جاتی ہے تو اسے ڈھارس ہوئی کہ چلو یوں بھی تو کماہی لے گا۔ کمانا و مانا کیا تھا۔ عبد الغفار جس کو لوگ اب کبوتروں والا سائیں کہتے تھے، گاؤں میں پھر پھر اک آٹا چاول اکٹھا کر لیا کرتا تھا، وہ بھی اس لیے کہ اس کی ماں نے اس کے گلے میں ایک جھوٹی لکا دی تھی، جس میں لوگ کچھ نہ کچھ ڈال دیا کرتے تھے۔ کبوتروں والا سائیں اسے اس لیے کہا جاتا تھا کہ اسے کبوتروں سے بہت پیار تھا۔ تکیے میں جتنے کبوتر تھے ان کی دیکھ بھال ابوپہلوان سے زیادہ بھی کیا کرتا تھا۔

اس وقت وہ سامنے کو ٹھری میں ایک ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر اپنے باپ کا میلا کچیل الحاف اوڑھے سور ہاتھا۔ باہر اس کی ماں آگ سلاگر ہی تھی۔ چونکہ سر دیاں اپنے جو بن پر تھیں اس لیے گاؤں ابھی تک رات اور صبح کے دھونکیں میں لپٹا ہوا تھا۔ یوں تو گاؤں میں سب لوگ بیدار تھے اور اپنے کام دھندوں میں مصروف تھے مگر تکنیک جو کہ گاؤں سے فاصلہ پر تھا، ابھی تک آباد نہ ہوا تھا، البتہ دور کونے میں مائی جیوال کی بکری زور زور سے ممیاڑی تھی۔

مائی جیوال آگ سلاگا کر بکری کے لیے چارہ تیار کرنے ہی لگی تھی کہ اسے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی۔ مژ کردیکھا تو اسے ایک اجنبی سر پر ٹھانا اور موٹا سا کمبل اوڑھے نظر آیا۔ پگڑی کے ایک پلو سے اس آدمی نے اپنا چڑھا آنکھوں تک چھپا رکھا تھا۔ جب اس نے موٹی آواز میں، ”مائی جیوال السلام علیکم“ کہا تو پگڑی کا کھدر دا کپڑا اس کے منہ پر تین چار مرتبہ سکڑا اور پھیلا۔ مائی جیوال نے چارہ بکری کے آگے رکھ دیا اور اجنبی کو پیچانے کی کوشش کیے بغیر کہا، ”و علیکم السلام۔۔۔ آؤ بھائی بیٹھو۔ آگ تاپو۔“

مائی جیوال کمر پر ہاتھ رکھ کر اس گڑھے کی طرف بڑھی جہاں ہر روز آگ سلائق رہتی تھی۔ اجنبی اور وہ دونوں پاس پاس بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر ہاتھ تاپ کر اس آدمی نے مائی جیوال سے کہا، ”ماں، اللہ بخشنے، گماں سائیں مجھے باپ کی طرح چاہتا تھا۔ اس کے مرنے کی خبر ملی تو مجھے بہت صدمہ ہوا۔ مجھے آسیب ہو گیا تھا، قبرستان کا جن ایسا چھٹا تھا کہ اللہ کی بناء، گماں سائیں کے ایک ہی تعویذ سے یہ کالی بلا دور ہو گئی۔“

مائی جیوال خاموشی سے اجنبی کی باتیں سنتی رہی جو کہ اس کے شوہر کا بہت ہی معتقد نظر آتا تھا۔ اس نے ادھر ادھر کی اور بہت سی باتیں کرنے کے بعد بڑھیا سے کہا، ”میں بارہ کوس سے چل کر آیا ہوں، ایک خاص بات کہنے کے لیے۔“ اجنبی نے رازداری کے انداز میں اپنے چاروں طرف دیکھا کہ اس کی بات کوئی اور تو نہیں سن رہا اور بھنچ ہوئے لجھے میں کہنے لگا، ”میں سندرڈا کو کے گروہ کا آدمی ہوں۔ پرسوں رات ہم لوگ اس گاؤں پر ڈاکا مارنے والے ہیں۔ خون خرابہ ضرور ہو گا، اس لیے میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اپنے لڑکوں کو دور ہی رکھنا۔ میں نے سنا ہے کہ گماں سائیں مر حوم نے اپنے پیچھے دو لڑکے چھوڑے ہیں۔ جوان آدمیوں کا ہو ہے بابا، ایسا نہ ہو کہ جوش مارا ٹھے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ تم ان کو پرسوں گاؤں سے کہیں باہر بھیج دو تو تھیک رہے گا۔ بس مجھے بہی کہنا تھا۔ میں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ السلام علیکم۔“

اجنبی اپنے ہاتھوں کو آگ کے الاوپر زور زور سے مل کر اٹھا اور جس راستے سے آیا تھا اسی راستے سے باہر چلا گیا۔

سند رجات بہت بڑا ادا کو تھا۔ اس کی دہشت اتنی تھی کہ مائیں اپنے بچوں کو اسی کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں۔ بے شمار گیت اس کی بہادری اور بے باکی کے گاؤں کی جوان لڑکیوں کو یاد تھے۔ اس کا نام سن کر، بہت سی نکواریوں کے دل دھڑکنے لگتے تھے۔ سند رجات کو بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا مگر جب چوپال میں لوگ جمع ہوتے تھے تو ہر شخص اس سے اپنی اچانک ملاقات کے من گھڑت قصے سنانے میں ایک خاص لذت محسوس کرتا تھا۔ اس کے قد و قامت اور ڈیل ڈول کے بارے میں مختلف بیان تھے: بعض کہتے تھے کہ وہ بہت قد آور جوان ہے، بڑی بڑی موچھوں والا۔ ان موچھوں کے بالوں کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ دو بڑے بڑے لیموں ان کی مدد سے اٹھا سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ بیان تھا کہ اس کا قد معمولی ہے مگر بدن اس قدر گٹھا ہوا ہے کہ گینڈے کا بھی نہ ہو گا۔ بہر حال سب متفقہ طور پر اس کی طاقت اور بے باکی کے مترف تھے۔

جب مائی جیوال نے یہ سننا کہ سند رجات ان کے گاؤں پر ڈاکا ڈالنے کے لیے آرہا ہے تو اس کے آئے اوسان خطا ہو گئے اور وہ اس اجنبي کے سلام کا جواب تک نہ دے سکی اور نہ اس کا شکر یہ ادا کر سکی۔ مائی جیوال کو اچھی طرح معلوم تھا کہ سند رجات کا ڈاکا کیا معنی رکھتا ہے۔ پچھلی دفعہ جب اس نے ساتھ والے گاؤں پر حملہ کیا تھا تو سکھی مہاجن کی ساری جمع پونجی غائب ہو گئی تھی اور گاؤں کی سب سے سند رجات اور پچھلی چھو کری بھی ایسی گم ہوئی تھی کہ اب تک اس کا پتہ نہیں ملتا تھا۔ یہ بلااب ان کے گاؤں پر نازل ہونے والی تھی اور اس کا علم سوائے مائی جیوال کے، گاؤں میں کسی اور کوئہ تھا۔ مائی جیوال نے سوچا کہ وہ اس آنے والے بھونچال کی خبر کس کس کو دے۔ چودھری کے گھر خبر کر دے۔ لیکن نہیں وہ تو بڑے کمینے لوگ تھے۔ پچھلے دونوں اس نے تھوڑا سا ساگ ان سے مانگا تھا تو انھوں نے انکار کر دیا تھا۔ گھسیٹارام حلوائی کو متنبہ کر دے۔ نہیں، وہ بھی ٹھیک آدمی نہیں تھا۔

وہ دیر تک ان ہی خیالات میں غرق رہی۔ گاؤں کے سارے آدمی وہ ایک ایک کر کے اپنے دماغ میں لائی اور ان میں سے کسی ایک کو بھی اس نے مہربانی کے قابل نہ سمجھا۔ اس کے علاوہ اس نے سوچا اگر اس نے کسی کو ہمدردی کے طور پر اس راز سے آگاہ کر دیا تو وہ کسی اور پر مہربانی کرے گا اور یوں سارے گاؤں والوں کو پتہ چل جائے گا جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔ آخر میں وہ یہ فیصلہ کر کے اٹھی کہ اپنی ساری جمع پونجی نکال کر وہ سبز رنگ کی غلاف چڑھی قبر کے سرہانے گاڑ دے گی اور رحمان کو پاس والے گاؤں میں بھیج دے گی۔

جب وہ سامنے والی کو ٹھری کی طرف بڑھی تو دہلیز میں اسے عبد الغفار یعنی کبوتروں والا سائیں کھڑا نظر آیا۔ ماں کو دیکھ کر وہ ہنسا۔ اس کی یہ ہنسی آج خلافِ معمول معنی خیز تھی۔ مائی جیوال کو اس کی آنکھوں میں سنجیدگی اور ممتازت کی جھلک بھی نظر آئی جو کہ ہوش مندی کی نشانی ہے۔ جب وہ کو ٹھری کے اندر جانے لگی تو عبد الغفار نے پوچھا، ”ماں، یہ صبح سویرے کون آدمی آیا تھا؟“

عبدالنفار اس قسم کے سوال عام طور پر پوچھا کرتا تھا، اس لیے اس کی ماں جواب دیے بغیر اندر چل گئی اور اپنے چھوٹے لڑکے کو جگانے لگی، ”اے رحمان، اے رحمان اٹھ اٹھ۔“ بازو چھنجوڑ کر مائی جیوا نے اپنے چھوٹے لڑکے رحمان کو جگایا اور وہ جب آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا اور اچھی طرح ہوش آگیا تو اس کی ماں نے اس کو ساری بات سنادی۔ رحمان کے تواسان خطا ہو گئے۔ وہ بہت ڈر پوک تھا، گواں کی عمر اس وقت بائیس برس کی تھی اور کافی طاقتور جوان تھا مگر اس میں بہت اور شجاعت نام تک کونہ تھی۔ سند رجات! اتنا بڑا کو، جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ تھوک پھینکتا تھا تو پورے بیس گز کے فاصلے پر جا کر گرتا تھا، پر سوں ڈاکا ڈالنے اور لوٹ مار کرنے کے لیے آ رہا تھا۔ وہ فوراً اپنی ماں کے مشورے پر راضی ہو گیا بلکہ یوں کہیے کہ وہ اسی وقت گاؤں چھوڑنے کی تیاریاں کرنے لگا۔

رحمان کو نیتی چمارن یعنی عنایت سے محبت تھی جو کہ گاؤں کی ایک بے باک، شوخ اور چنچل لڑکی تھی۔ گاؤں کے سب جوان لڑکے، شباب کی یہ پوٹھی حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ بڑے بڑے ہوشیار لڑکوں کو وہ باتوں باتوں میں اڑادیتی تھی۔ چودھری دین محمد کے لڑکے فضل دین کو کلامی پکڑنے میں کمال حاصل تھا۔ اس فن کے بڑے بڑے ماہر دور دور سے اس کو بیچا دکھانے کے لیے آتے تھے مگر اس کی کلامی کسی سے بھی نہ مڑی تھی۔ وہ گاؤں میں اکٹھا کر چلتا تھا مگر اس کی یہ ساری اکٹھوں نیتی نے ایک ہی دن میں غائب کر دی جب اس نے دھان کے کھیت میں اس سے کہا، ”فجیے، گندھا سنگھ کی کلامی مر وڑ کر تو اپنے من میں یہ مت سمجھ کہ بس اب تیرے مقابلہ میں کوئی آدمی نہیں رہا۔۔۔ آ، میرے سامنے بیٹھ، میری کلامی پکڑ، ان دونوں گلکیوں کی ایک ہی ٹھکمکی سے تیرے دونوں ہاتھ نہ چھڑا دوں تو نیتی نام نہیں۔۔۔“

فضل دین اس کو محبت کی لگا ہوں سے دیکھتا تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کی طاقت اور شہزادی کے رعب اور دبدبے میں آکر وہ خود بخود ایک روز رام ہو جائیگی۔ لیکن جب اس نے کئی آدمیوں کے سامنے اس کو مقابلہ کی دعوت دی تو وہ پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اگر وہ انکار کرتا ہے تو نیتی اور بھی سر پر چڑھ جاتی ہے اور اگر وہ اس کی دعوت قبول کرتا ہے تو لوگ یہی کہیں گے، عورت ذات سے مقابلہ کرتے شرم تو نہیں آتی مردوں کو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ چنانچہ اس نے نیتی کی دعوت قبول کر لی تھی۔ اور جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے اس نے جب نیتی کی گدرائی ہوئی کلامی اپنے ہاتھوں میں لی تو وہ سارے کاسارا کا نپ رہا تھا۔ نیتی کی موٹی موٹی آنکھیں اس کی آنکھوں میں دھنس گئیں، ایک نعرہ بلند ہوا اور نیتی کی کلامی فضل کی گرفت سے آزاد ہو گئی۔۔۔ اس دن سے لے کر اب تک فضل نے پھر کبھی کسی کی کلامی نہیں کپڑا۔

ہاں، تو اس نیتی سے رحمان کو محبت تھی، جیسا کہ وہ آپ ڈر پوک تھا اسی طرح اس کا پریم بھی ڈر پوک تھا۔ دور سے دیکھ کر وہ اپنے دل کی ہوں پوری کرتا تھا اور جب کبھی اس کے پاس ہوتی تو اس کو اتنی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ حرف مدعا زبان پر لائے۔ مگر نیتی سب کچھ جانتی

تھی۔ وہ کیا کچھ نہیں جانتی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ چھو کر اجودختوں کے تنوں کے ساتھ پیچھے ٹکے کھڑا رہتا ہے، اس کے عشق میں گرفتار ہے، اس کے عشق میں کون گرفتار نہیں تھا؟ سب اس سے محبت کرتے تھے۔ اس قسم کی محبت جو کہ بیریوں کے بیرپکنے پر گاؤں کے جوان لڑکے اپنی رگوں کے تناوے کے اندر محسوس کیا کرتے ہیں مگر وہ ابھی تک کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہوئی تھی۔ محبت کرنے کی خواہش البتہ اس کے دل میں اس قدر موجود تھی کہ بالکل اس شرابی کے مانند معلوم ہوتی تھی جس کے متعلق ڈر رہا کرتا ہے کہ اب گرا اور اب گرا۔۔۔ وہ بے خبری کے عالم میں ایک بہت اونچی چٹان کی چوٹی پر پہنچ چکی تھی اور اب تمام گاؤں والے اس کی افتاد کے منتظر تھے جو کہ یقینی نہیں۔

رحمان کو بھی اس افتاد کا یقین تھا مگر اس کا ڈر پوک دل ہمیشہ اسے ڈھارس دیا کرتا تھا کہ نہیں، نیتی آخر تیری ہی باندی بنے گی اور وہ یوں خوش ہو جایا کرتا تھا۔ جب رحمان دس کوس طے کر کے دوسرے گاؤں میں پہنچنے کے لیے تیار ہو کر تکیے سے باہر نکلا تو اسے راستے میں نیتی کا خیال آیا مگر اس وقت اس نے یہ نہ سوچا کہ سندر جاث دھاوا بولنے والا ہے۔ وہ دراصل نیتی کے تصور میں اس قدر مگن تھا اور اکیلے میں اس کے ساتھ من ہی من میں اتنے زوروں سے پیار محبت کر رہا تھا کہ اسے کسی اور بات کا خیال ہی نہ آیا۔ البتہ جب وہ گاؤں سے پانچ کوس آگے نکل گیا تو ایکا ایکی اس نے سوچا کہ نیتی کو توبتا دینا چاہیے تھا کہ سندر جاث آرہا ہے۔ لیکن اب واپس کون جاتا۔

عبد الغفار یعنی کبوتروں والا سائیں تکیے سے باہر نکلا۔ اس کے منہ سے لعاب نکل رہا تھا جو کہ میلے کرتے پر گر کر دیر تک گلیسرین کی طرح چلتا رہتا تھا۔ تکیے سے نکل کروہ سیدھا کھیتوں کا رخ کیا کرتا تھا اور سارا دن وہیں گزار دیتا تھا۔ شام کو جب ڈھور ڈھر واپس گاؤں کو آتے تو ان کے چلنے سے جو دھول اڑتی ہے اس کے پیچھے کبھی کبھی غفار کی شکل نظر آ جاتی تھی۔ گاؤں اس کو پسند نہیں تھا۔ اجازاً اور سنسان جگہوں سے اسے غیر محسوس طور پر محبت تھی۔ یہاں بھی لوگ اس کا پیچھانہ چھوڑتے تھے اور اس سے طرح طرح کے سوال پوچھتے تھے۔ جب برسات میں دیر ہو جاتی تو قریب قریب سب کسان اس سے درخواست کرتے تھے کہ وہ پانی بھرے بادلوں کے لیے دعا مانگے اور گاؤں کے عشق پیشہ جوان اس سے اپنے دل کا حال بیان کرتے اور پوچھتے کہ وہ کب اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے، نوجوان چھو کریاں بھی چکے چکے دھڑکتے ہوئے دلوں سے اس کے سامنے اپنی محبت کا اعتراض کرتی تھیں اور یہ جانا چاہتی تھیں کہ ان کے ”ماہیا“ کا دل کیسا ہے۔ عبد الغفار ان سوایوں کو اٹ پٹانگ جواب دیا کرتا تھا اس لیے کہ اسے غیب کی باتیں کہاں معلوم تھیں، لیکن لوگ جو اس کے پاس سوال لے کر آتے تھے، اس کی بے ربط باتوں میں اپنا مطلب ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔

عبد الغفار مختلف کھیتوں میں سے ہوتا ہوا اس کنویں کے پاس پہنچ گیا جو کہ ایک زمانے سے بے کار پڑا تھا۔ اس کنویں کی حالت بہت ابتر تھی۔ اس بوڑھے بر گد کے پتے جو کہ سالہا سال سے اس کے پہلو میں کھڑا تھا اس قدر اس میں جمع ہو گئے تھے کہ اب پانی نظر ہی نہ آتا تھا اور ایسا

معلوم ہوتا کہ بہت سی مکریوں نے مل کر پانی کی سطح پر موٹا سا جالا بن دیا ہے۔ اس کنویں کی ٹوٹی ہوئی منڈیر پر عبد الغفار بیٹھ گیا اور دوپھر کی اداس فضائیں اس نے اپنے وجود سے اور بھی ادا سی پیدا کر دی۔

دفعتاً اڑتی ہوئی جیلوں کی اداس چینوں کو عقب میں چھوڑتی ہوئی ایک بلند آواز اٹھی اور بوڑھے بر گد کی شاخوں میں ایک کپکاپاٹ سی دوڑ گئی۔

نیتی گاری تھی،

ماہی مرے نے باگ لوایا
چپا، مہ واخوب کھلایا
اسی تے لوایاں کھلیاں وے
رات میں سونتر نہیں، دیندیاں اکھیاں وے

اس گیت کا مطلب یہ تھا کہ میرے ماہیا یعنی میرے چاہنے والے نے ایک باغ لگایا ہے، اس میں ہر طرح کے پھول اگائے ہیں، چپا، مہ وَا وغیرہ کھلائے ہیں۔ اور ہم نے تو صرف نارنگیاں لگائی ہیں۔۔۔ رات کو آنکھیں سونے نہیں دیتیں۔۔۔ کتنی انکساری بر تی گئی ہے۔ معشوق عاشق کے لگائے ہوئے باغ کی تعریف کرتا ہے، لیکن وہ اپنی جوانی کے باغ کی طرف نہایت انکسارانہ طور پر اشارہ کرتا ہے جس میں حیر نارنگیاں گلی ہیں اور پھر شب خوابی کا گلہ کس خوبی سے کیا گیا ہے۔

گو عبد الغفار میں نازک جذبات بالکل نہیں تھے پھر بھی نیتی کی جوان آواز نے اس کو چونکا دیا اور وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس نے پیچان لیا تھا کہ یہ آواز نیتی کی ہے۔ گاتی گاتی نیتی کنویں کی طرف آنگلی۔ غفار کو دیکھ کر وہ دوڑی ہوئی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی، ”اوہ، غفار سائیں۔۔۔ تم۔۔۔ اوہ، مجھے تم سے کتنی باتیں پوچھنا ہیں۔۔۔ اور اس وقت یہاں تمہارے اور میرے سوا اور کوئی بھی نہیں۔۔۔ دیکھو میں تمہارا منہ میٹھا کراؤ گی اگر تم نے میرے دل کی بات بوجھی اور۔۔۔ لیکن تم تو سب کچھ جانتے ہو۔۔۔ اللہ والوں سے کسی کے دل کا حال چھپا تھوڑی رہتا ہے۔“ وہ اس کے پاس زمین پر بیٹھ گئی اور اس کے میلے کرتے پرہاٹھ پھیرنے لگی۔

خلافِ معمول کبوتروں والا سائیں مسکرا یا مگر نیتی اس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی، اس کی نگاہیں گاڑھے کے تانے بانے پر بغیر کسی مطلب کے تیر رہی تھیں۔ کھر درے کپڑے پرہاٹھ پھیرتے پھیرتے اس نے گردان اٹھائی اور آہوں میں کہنا شروع کیا، ”غفار سائیں تم اللہ میاں

سے محبت کرتے ہو اور میں۔۔۔ میں ایک آدمی سے محبت کرتی ہوں۔۔۔ تم میرے دل کا حال کیا سمجھو گے۔۔۔! اللہ میاں کی محبت اور اس کے بندے کی محبت ایک جیسی تو ہونہیں سکتی۔۔۔ کیوں غفار سائیں۔۔۔ ارے تم بولتے کیوں نہیں۔۔۔ کچھ بولو۔۔۔ کچھ کہو۔۔۔ اچھا تو میں ہی بولے جاؤں گی۔۔۔ تم نہیں جانتے کہ آج میں کتنی دیر بول سکتی ہوں۔۔۔ تم سنتے سنتے تھک جاؤ گے پر میں نہیں تھکوں گی۔۔۔” یہ کہتے کہتے وہ خاموش ہو گئی اور اس کی سنجیدگی زیادہ بڑھ گئی۔ اپنے من میں غوطہ لگانے کے بعد جب وہ ابھری تو اس نے ایکا ایکی عبد الغفار سے پوچھا، ”سائیں! میں کب تھکوں گی؟“ عبد الغفار کے منہ سے لعاب نکلا بند ہو گیا۔ اس نے کنویں کے اندر جھک کر دیکھتے ہوئے جواب دیا، ”بہت جلد۔“ یہ کہہ کرو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس پر نیتی نے اس کے کرتے کا دامن پکڑ لیا اور گھبر اکر پوچھا، ”کب۔۔۔ کب۔۔۔ کب۔۔۔؟ سائیں کب؟“

عبد الغفار نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور بول کے جھنڈ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ نیتی کچھ دیر کنویں کے پاس کھڑی سوچتی رہی، پھر تیز قدموں سے جدھر سائیں گیا تھا اور چل دی۔

وہ رات جس میں سند رجات گاؤں پر ڈاکا ڈالنے کے لیے آرہا تھا، مائی جیوال نے آنکھوں میں کاٹی۔ ساری رات وہ اپنی کھاٹ پر لخاف اوڑھے جا گتی رہی۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔ رحمان کو اس نے دوسرا گاؤں بھیج دیا اور عبد الغفار نہ جانے کہاں سو گیا تھا۔ ابو پہلوان کبھی کبھی تکیے میں آگ تاپتا تاپتا وہیں الاؤ کے پاس سو جایا کرتا تھا مگر وہ صبح ہی سے دکھائی نہیں دیا تھا، چنانچہ کبوتروں کو دانہ مائی جیوال ہی نے کھلا یا تھا۔

تکیہ گاؤں کے اس سرے پر واقع تھا جہاں سے لوگ گاؤں کے اندر داخل ہوتے تھے۔ مائی جیوال ساری رات جا گتی رہی مگر اس کو ہلکی سی آہٹ بھی سنائی نہ دی۔ جب رات گزر گئی اور گاؤں کے مرغوں نے اذا نیں دینا شروع کر دیں تو وہ سند رجات کی بابت سوچتی سوچتی سو گئی۔ چونکہ رات کو وہ بالکل نہ سوئی تھی اس لیے صبح بہت دیر کے بعد جا گی۔ کوڑھری سے نکل کر جب وہ باہر آئی تو اس نے دیکھا کہ ابو پہلوان کبوتروں کو دانہ دے رہا ہے اور دھوپ سارے تکیے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس نے باہر نکلتے ہی اس سے کہا، ”ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ یہ موابڑھا پا بڑا تنگ کر رہا ہے۔ صبح سوئی ہوں اور اب اٹھی ہوں۔۔۔ ہاں تم سناو کل کہاں رہے ہو؟“

ابو نے جواب دیا، ”گاؤں میں۔۔۔“

اس پر مائی جیوال نے کہا، ”کوئی تازہ خبر سناؤ۔“

ابونے جھولی کے سب دانے زمین پر گرا کر اور جھپٹ کر ایک کبوتر کو بڑی صفائی سے اپنے ہاتھ میں دبو پھتے ہوئے کہا، ”آج صبح چوپال پر نخنا سنگھ کہہ رہا تھا کہ گام پچمار کی وہ لوئڈ یا۔۔۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔؟ ہاں وہ نیتی، کہیں بھاگ گئی ہے۔۔۔؟ میں تو کہتا ہوں اچھا ہوا۔۔۔ حرام زادی نے سارا گاؤں سر پر اٹھا کر کھا تھا۔“

”کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے یا کوئی اٹھا کر لے گیا ہے؟“

”جانے میری بلا۔۔۔ لیکن میرے خیال میں تو وہ خود ہی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔“

ماں جیوال کو اس گفتگو سے اطمینان نہ ہوا۔ سند رجات نے ڈاک انہیں ڈالا تھا پر ایک چھو کری تو غائب ہو گئی تھی۔ اب وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح نیتی کا غائب ہو جانا سند رجات سے متعلق ہو جائے۔ چنانچہ وہ ان تمام لوگوں سے نیتی کے بارے میں پوچھتی رہی جو کہ نتیئے میں آتے جاتے رہے لیکن جو کچھ ابونے بتایا تھا اس سے زیادہ اسے کوئی بھی نہ بتاسکا۔

شام کو رحمان لوٹ آیا۔ اس نے آتے ہی ماں سے سند رجات کے ڈاک کے متعلق پوچھا۔ اس پر مائی جیوال نے کہا، ”سند رجات تو نہیں آیا بیٹا، پر نیتی کہیں غائب ہو گئی ہے۔۔۔ ایسی کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔“ رحمان کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ٹانگوں میں دس کوس اور چلنے کی تھکا کاٹ پیدا ہو گئی ہے۔ وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا، اس کا چہرہ خوف ناک طور پر زرد تھا۔ ایک دم بیہ دیکھ کر مائی جیوال نے تشویش ناک لہجہ میں اس سے پوچھا، ”کیا ہوا بیٹا؟“

رحمان نے اپنے خشک ہو نہیں پر زبان پھیری اور کہا، ”کچھ نہیں ماں۔۔۔ تھک گیا ہوں۔“

”اور نیتی کل مجھ سے پوچھتی تھی، میں کب تھکوں گی؟“

رحمان نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا بھائی عبد الغفار آستین سے اپنے منہ کا لاعب پوچھ رہا تھا۔ رحمان نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور پوچھا ”کیا کہا تھا اس نے تھجھ سے؟“

عبد الغفار الاؤ کے پاس بیٹھ گیا، ”کہتی تھی کہ میں تھکتی ہی نہیں۔۔۔ پر اب وہ تھک جائے گی۔“

رحمان نے تیزی سے پوچھا، ”کیسے؟“

غفار سائیں کے چہرے پر ایک بے معنی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی، ”مجھے کیا معلوم---؟ سن در جات جانے اور وہ جانے۔“

یہ سن کر رحمان کے چہرے پر اور زیادہ زردی چھائی اور مالی جیوال کی جھریاں زیادہ گہرائی اختیار کر گئیں۔

-[119]-

پہنندنے: سعادت حسن منشو

کوٹھی سے ماحقہ و سعیج و عریض باغ میں جھاڑیوں کے پیچھے ایک بلی نے بچے دیے تھے، جو بلا کھا گیا تھا۔ پھر ایک کتیانے بچے دیے تھے جو بڑے بڑے ہو گئے تھے اور دن رات کوٹھی کے اندر باہر بھونکتے اور گندگی بکھیرتے رہتے تھے۔ ان کو زہر دے دیا گیا۔۔۔ ایک ایک کر کے سب مر گئے تھے۔ ان کی ماں بھی۔۔۔ ان کا باپ معلوم نہیں کہاں تھا۔ وہ ہوتا تو اس کی موت بھی یقینی تھی۔

جانے کتنے برس گزر چکے تھے۔ کوٹھی سے ماحقہ باغ کی جھاڑیاں سیکڑوں ہزاروں مرتبہ کتری بیوں تی، کافی چھانٹی جا چکی تھیں۔ کئی بلیوں اور کتیوں نے ان کے پیچھے بچے دیے تھے جن کا نام و نشان بھی نہ رہا تھا۔ اس کی اکثر بد عادت مر غیباں وہاں انڈے دے دیا کرتی تھیں جن کو ہر صبح اٹھا کر وہ اندر لے جاتی تھی۔

اسی باغ میں کسی آدمی نے ان کی نوجوان ملازمہ کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔۔۔ اس کے گلے میں اس کا پہنندنou والا سرخ ریشمی ازار بند جو اس نے دو روز پہلے پھیری والے سے آٹھ آنے میں خریدا تھا، پھنسا ہوا تھا۔ اس زور سے قاتل نے بیچ دیے تھے کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔

اس کو دیکھ کر اس کو اتنا تیز بخار چڑھا تھا کہ بے ہوش ہو گئی تھی۔۔۔ اور شاید ابھی تک بے ہوش تھی۔ لیکن نہیں، ایسا کیوں کر ہو سکتا تھا، اس لیے کہ اس قتل کے دیر بعد مرغیوں نے انڈے، نہیں بلیوں نے بچے دیے تھے اور ایک شادی ہوئی تھی۔۔۔ کتنا تھی جس کے گلے میں لال دوپٹہ تھا۔ ملکیتی۔۔۔ جملہ جملہ کرتا۔ اس کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی نہیں تھیں، اندر دھنسی ہوئی تھیں۔

باغ میں بینڈ بجا تھا۔۔۔ سرخ وردیوں والے سپاہی آئے تھے جو رنگ برلنگی مشکین بغلوں میں دبا کر منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتے تھے۔ ان کی وردیوں کے ساتھ کئی پھندنے لگے تھے۔ جنہیں اٹھا اٹھا کر لوگ اپنے ازار بندوں میں لگاتے جاتے تھے۔۔۔ پر جب صحیح ہوئی تھی تو ان کا نام و نشان تک نہیں تھا۔۔۔ سب کو زہر دے دیا گیا تھا۔

دلہن کو جانے کیا سوچی، کم بخت نے جھاڑیوں کے پیچھے نہیں، اپنے بستر پر صرف ایک بچہ دیا۔۔۔ جو بڑا گل گو تھنا، لال پھندنا تھا۔ اس کی ماں مر گئی۔۔۔ باپ بھی۔۔۔ دونوں کو بچے نے مارا۔۔۔ اس کا باپ معلوم نہیں کہاں تھا۔ وہ ہوتا تو اس کی موت بھی ان دونوں کے ساتھ ہوتی۔

سرخ وردیوں والے سپاہی بڑے بڑے پھندنے لگائے جانے کہاں غائب ہوئے کہ پھر نہ آئے۔ باغ میں بلے گھومتے تھے، جو اسے گھورتے تھے، اس کو پھیججڑوں کی بھری ہوئی ٹوکری سمجھتے تھے حالانکہ ٹوکری میں نارنگیاں تھیں۔

ایک دن اس نے اپنی دو نارنگیاں نکال کر آئینے کے سامنے رکھ دیں۔ اس کے پیچھے ہو کے اس نے ان کو دیکھا گر نظر نہ آئیں۔ اس نے سوچا اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی ہیں۔۔۔ مگر وہ اس کے سوچتے سوچتے ہی بڑی ہو گئیں اور اس نے ریشمی کپڑے میں لپیٹ کر آتش دان پر رکھ دیں۔

اب کتے بھونکنے لگے۔۔۔ نارنگیاں فرش پر لٹھکنے لگیں۔ کوٹھی کے ہر فرش پر اچھلیں، ہر کمرے میں کو دیں اور اچھلاتی کو دیتی بڑے بڑے باغوں میں بھاگنے دوڑنے لگیں۔۔۔ کتنے ان سے کھلتے اور آپس میں لڑتے جھگٹتے رہتے۔ جانے کیا ہوا، ان کتوں میں دوزہر کھا کے مر گئے۔ جو باقی بچے وہ ان کی ادھیر عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ کھا گئی۔ یہ اس نوجوان ملازمہ کی جگہ آئی تھی، جس کو کسی آدمی نے قتل کر دیا تھا، گلے میں اس کے پھندنوں والے ازار بند کا پھندن اڑال کر۔

اس کی ماں تھی۔ ادھیر عمر کی ملازمہ سے عمر میں چھ سات برس بڑی۔ اس کی طرح ہٹی کٹی نہیں تھی۔ ہر روز صبح شام موڑ میں سیر کو جاتی تھی اور بعد ادعا مرغیوں کی طرح دور دراز باغوں میں جھاڑیوں کے پیچھے انڈے دیتی تھی۔ ان کو وہ خود اٹھا کر لاتی تھی نہ ڈرائیور۔ اول میٹ بناتی تھی۔ جس کے داع کپڑوں پر پڑ جاتے تھے۔ سو کھ جاتے تو ان کو باغ میں جھاڑیوں کے پیچھے پھینک دیتی تھی جہاں سے چیلیں اٹھا کر لے جاتی تھیں۔

ایک دن اس کی سمیبلی آئی۔ پاکستان میل، موڑ نمبر 12619 پی ایل بڑی گرمی تھی۔ ڈیڈی پہاڑ پر تھے۔ ممی سیر کرنے کی ہوئی تھیں۔ پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنا بلاوز اتارا اور پانچھے کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ اس کے دودھ ابلے ہوئے تھے جو آہستہ آہستہ ٹھنڈے ہو گئے۔ اس کے دودھ ٹھنڈے تھے جو آہستہ آہستہ ابلنے لگے۔ آخر دونوں دودھ ہل ہل کے کنگنے ہو گئے اور کھٹی لسی بن گئی۔

اس سمیبلی کا بینڈ نجیگیا۔ مگر وہ وردی والے سپاہی پہنندے نچانے نہ آئے۔ اس کی جگہ پیتل کے برتن تھے، چھوٹے اور بڑے، جن سے آوازیں نکلتی تھیں۔ گرجدار اور دھیمی۔ دھیمی اور گرجدار۔ یہ سمیبلی جب پھر ملی تو اس نے بتایا کہ وہ بدل گئی ہے۔ سچ مجبدل گئی تھی۔ اس کے اب دوپیٹ تھے۔ ایک پرانا، دوسرا نیا۔ ایک کے اوپر دو سراچھا ہوا تھا۔ اس کے دودھ پھٹے ہوئے تھے۔

پھر اس کے بھائی کا بینڈ بجا۔ ادھیر عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ بہت روئی۔ اس کے بھائی نے اس کو بہت دلاسا دیا۔ بیچاری کو اپنی شادی یاد آگئی تھی۔ رات بھر اس کے بھائی اور اس کی دلہن کی لڑائی ہوتی رہی۔ وہ روئی رہی، وہ نہستا رہا۔ صبح ہوئی تو ادھیر عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ اس کے بھائی کو دلاسا دینے کے لیے اپنے ساتھ لے گئی۔ دلہن کو نہلایا گیا۔ اس کی شلوار میں اس کالال پہنند نوں والا زار بند پڑا تھا۔ معلوم نہیں یہ دلہن کے گلے میں کیوں نہ باندھا گیا۔

اس کی آنکھیں بہت موٹی تھیں۔ اگر گلازوں سے گھونٹا جاتا تو وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی آنکھوں کی طرح باہر نکل آتیں۔ اور اس کو بہت تیز بخار پڑھتا۔ گر پہلا تو ابھی تک اترانہیں۔ ہو سکتا ہے اتر گیا ہو اور یہ نیا بخار ہو جس میں وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔

اس کی ماں موڑ رائیوری سیکھ رہی ہے۔ باپ ہوٹل میں رہتا ہے۔ کبھی کبھی آتا ہے اور اپنے لڑکے سے مل کر چلا جاتا ہے۔ لڑکا کبھی کبھی اپنی بیوی کو گھر بلایتا ہے۔ ادھیر عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ کو دو تین روز کے بعد کوئی یادگاری نہیں۔ وہ اسے دلاسا دیتا ہے، وہ اسے پچکارتی ہے اور دلہن چلی جاتی ہے۔

اب وہ اور دلہن بھا بھی، دونوں سیر کو جاتی ہیں۔۔۔ سیمیلی بھی، پاکستان میل، موڑ نمبر 9612 پی ایل۔۔۔ سیر کرتے کرتے اجتنا جانکتی ہیں، جہاں تصویریں بنانے کا کام سکھایا جاتا ہے۔ تصویریں دیکھ کر تینوں تصویر بن جاتے ہیں۔ رنگ ہی رنگ، لال، پیلے، ہرے، نیلے۔۔۔ سب کے سب چیخنے والے ہیں۔ ان کو رنگوں کا خالق چپ کرتا ہے۔ اس کے لمبے لمبے بال ہیں۔

سردیوں اور گرمیوں میں اور رکوٹ پہنتا ہے، اچھی شکل و صورت کا ہے، اندر باہر ہمیشہ کھڑا اول استعمال کرتا ہے۔۔۔ اپنے رنگوں کو چپ کرنے کے بعد خود چیننا شروع کر دیتا ہے۔ اس کو یہ تینوں چپ کرتا ہے اور بعد میں خود چلانے لگتی ہیں۔ تینوں اجتنا میں مجرد آرٹ کے سیکڑوں نمونے بناتی رہیں۔ ایک کی ہر تصویر میں عورت کے دوپیٹ ہوتے ہیں۔ مختلف رنگوں کے۔۔۔ دوسری کی تصویروں میں عورت ادھیر عمر کی ہوتی ہے۔ ہٹی کٹی۔ تیسری کی تصویروں میں پھندنے ہی پھندنے۔ ازار بندوں کا گچھا۔

مجرد تصویریں بنتی رہیں۔ مگر تینوں کے دودھ سوکھتے رہے۔۔۔ بڑی گرمی تھی، اتنی کہ تینوں پینے میں شرابور تھیں۔ خس لگے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے اپنے بلاوز اتارے اور پنکھے کے نیچے کھڑی ہو گئیں۔ پنکھا چلتا رہا۔ دودھوں میں ٹھنڈک پیدا ہوئی نہ گرمی۔

اس کی ممی دوسرے کمرے میں تھی۔ ڈرائیور اس کے بدن سے موبائل آئیل پونچھ رہا تھا۔

ڈیڈی ہوٹل میں تھا جہاں اس کی لیڈی ٹینو گرافر اس کے ماتھے پر یوڈی کلوں مل رہی تھی۔

ایک دن اس کا بھی بینڈنگ گیا۔ اجڑا باغ پھر بارونق ہو گیا۔ گملوں اور دروازوں کی آرائش اجتنا اسٹوڈیو کے مالک نے کی تھی۔ بڑی بڑی گھری لپ اسٹکیں اس کے بکھرے ہوئے رنگ دیکھ کر اڑ گئیں۔ ایک جوز یادہ سیاہی مائل تھی، اتنی اڑی کہ وہیں گر کر اس کی شاگرد ہو گئی۔

اس کے عروضی لباس کا ڈیزائن بھی اس نے تیار کیا تھا۔ اس نے اس کی ہزاروں سمتیں پیدا کر دی تھیں۔ عین سامنے سے دیکھو تو وہ مختلف رنگ کے ازار بندوں کا بنڈل معلوم ہوتی تھی۔ ذرا ادھر ہٹ جاؤ تو پھلوں کی ٹوکری تھی۔ ایک طرف ہو جاؤ تو کھڑکی پر پڑا ہوا اچھا کاری کا پر دہ۔ عقب میں چلے جاؤ۔ کچلے ہوئے تربوزوں کا ڈھیر۔۔۔ ذرا زاویہ بدلت کر دیکھو ٹھاؤ ساس سے بھرا ہوا مرتبان۔۔۔ اوپر سے دیکھو تو یگانہ آرٹ۔ نیچے سے دیکھو تو میرا جی کی مہم شاعری۔

فُن شناس نگاہیں عش عش کرائھیں۔۔۔ دو لہا اس قدر متاثر ہوا تھا کہ شادی کے دوسرے روز ہی اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بھی مجرد آرٹسٹ بن جائے گا۔ چنانچہ اپنی بیوی کے ساتھ وہ اجتنانگیا۔ جہاں انھیں معلوم ہوا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے اور وہ چند روز سے اپنی ہونے والی دلہن ہی کے ہاں رہتا ہے۔ اس کی ہونے والی دلہن وہی گھرے رنگ کی اسٹک تھی جو دوسری لپ اسٹکوں کے مقابلے میں زیادہ سیاہی مائل تھی۔ شروع شروع میں چند مینے تک اس کے شوہر کو اس سے اور مجرد آرٹ سے دلچسپی رہی، لیکن جب اجتنانگیا اور اس کے مالک کی کہیں سے بھی سن گئی تو اس نے نمک کا کاروبار شروع کر دیا۔ جو بہت نفع بخش تھا۔

اس کاروبار کے دوران میں اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی۔ جس کے دودھ سوکھے ہوئے نہیں تھے۔ یہ اس کو پسند آگئے۔ بینڈنہ بجا لیکن شادی ہو گئی۔ پہلی اپنے برش اٹھا کر لے گئی اور الگ رہنے لگی۔ یہ ناچاقی پہلے تو دونوں کے لیے تلخی کا موجب ہوئی لیکن بعد میں ایک عجیب و غریب مٹھاں میں تبدیل ہو گئی۔ اس کی سیہلی نے جو دوسرا شوہر تبدیل کرنے کے بعد سارے پورپ کا چکر لگا آئی تھی اور اب دق کی مریض تھی، اس مٹھاں کو کیوب آرٹ میں پینٹ کیا۔ صاف شفاف چینی کے بے شمار کیوب تھے جو تھوہر کے پو دوں کے درمیان اس انداز سے اوپر تلر کئے تھے کہ ان سے دو شکلیں بن گئیں تھی۔ اس پر شہد کی گھیاں بیٹھی رس چوس رہی تھیں۔

اس کی دوسری سیہلی نے زہر کھا کر خود کشی کر لی۔ جب اس کو یہ المناک خبر ملی تو وہ بے ہوش ہو گئی۔ معلوم نہیں بے ہوشی نئی تھی یاد ہی پرانی جو بڑے تیز بخار کے بعد ظہور میں آئی تھی۔

اس کا باپ یوڈی گلوں میں تھا۔ جہاں اس کا ہو ٹل اس کی لیڈی ٹینو گرافر کا سر سہلا تھا۔ اس کی ممی نے گھر کا سارا حساب کتاب ادھیر عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ کے حوالے کر دیا تھا۔ اب اس کو ڈرائیونگ آگئی تھی مگر بہت بیمار ہو گئی تھی۔ مگر پھر بھی اس کو ڈرائیور کے بن ماں کے پلے کا بہت خیال تھا۔ وہ اس کو اپنا موبائل آئکن پلاتی تھی۔

اس کی بھا بھی اور اس کے بھائی کی زندگی بہت ادھیر اور ہٹی کٹی ہو گئی تھی۔ دونوں آپس میں بڑے پیار سے ملتے تھے کہ اچانک ایک رات جب کہ ملازمہ اور اس کا بھائی گھر کا حساب کتاب کر رہے تھے، اس کی بھا بھی نمودار ہوئی، وہ مجرد تھی۔۔۔ اس کے ہاتھ میں قلم تھانہ برش۔ لیکن اس نے دونوں کا حساب صاف کر دیا۔ صح کمرے میں سے جنم ہوئے لہو کے دو بڑے بڑے پہنچنے نکلے جو اس کی بھا بھی کے گلے میں لگا دیے گئے۔

اب وہ قدرے ہوش میں آئی۔ خاوند سے ناچاقی کے باعث اس کی زندگی تلخ ہو کر بعد میں عجیب و غریب مٹھاس میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس نے اس کو تھوڑا سا تلخ بنانے کی کوشش کی اور شراب پینا شروع کی، مگر ناکام رہی۔ اس لیے کہ مقدار کم تھی۔۔۔ اس نے مقدار بڑھادی حتیٰ کہ وہ اس میں ڈبکیاں لینے لگی۔۔۔ لوگ سمجھتے تھے کہ اب غرق ہوئی مگر وہ سطح پر ابھر آتی تھی۔ منہ سے شراب پوچھتی ہوئی اور قہقہے لگاتی ہوئی۔ صح کو جب اٹھتی تو اسے محسوس ہوتا کہ رات بھر اس کے جسم کا ذرہ دھاڑیں مار مار کر روتا رہا ہے۔ اس کے وہ سب بچ جو پیدا ہو سکتے تھے، ان قبروں میں جوان کے لیے بن سکتی تھیں، اس دودھ کے لیے جوان کا ہو سکتا تھا، بلکہ بلک کر رور ہے ہیں۔ مگر اس کے دودھ کہاں تھے۔۔۔ وہ تو جنگلی بلپی بچے تھے۔

وہ زیادہ پیتی کہ اتحاہ سمندر میں ڈوب جائے مگر اس کی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ ذہین تھی۔ پڑھی لکھی تھی۔ جنسی موضوعات پر بغیر کسی تصنیع کے بے تکلف گفتگو کرتی تھی۔ مردوں کے ساتھ جسمانی رشتہ قائم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی تھی، مگر پھر بھی کبھی کبھی رات کی نہائی میں اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی کسی بد عادت مرغی کی طرح جھاڑیوں کے پیچھے جائے اور ایک انڈہ دے آئے۔

بالکل کھو کھلی ہو گئی۔ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی رہ گیا تو اس سے لوگ دور رہنے لگے۔۔۔ وہ سمجھ گئی، چنانچہ وہ ان کے پیچھے نہ بھاگی اور اکیلی گھر میں رہنے لگی۔ سکریٹ پر سکریٹ پھونکتی، شراب پیتی اور جانے کیا سوچتی رہتی۔۔۔ رات کو بہت کم سوتی تھی۔ کوٹھی کے ارد گرد گھومتی رہتی تھی۔ سامنے کوارٹر میں ڈرائیور کا بن ماں کا بچہ موبائل کے لیے روتا رہتا تھا مگر اس کی ماں کے پاس ختم ہو گیا تھا۔ ڈرائیور نے ایکسٹینٹ کر دیا تھا۔ موٹر گیر اج میں اور اس کی ماں ہسپتال میں پڑی تھی۔ جہاں اس کی ایک ٹانگ کاٹی جا چکی تھی، دوسری کاٹی جانے والی تھی۔

وہ کبھی کبھی کوارٹر کے اندر جھانک کر دیکھتی تو اس کو محسوس ہوتا کہ اس کے دودھوں کی تلچھٹ میں ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی ہے، مگر اس بد ذاتتہ سے تو اس کے بچے کے ہوتے بھی ترنہ ہوتے۔

اس کے بھائی نے کچھ عرصے سے باہر رہنا شروع کر دیا تھا۔ آخر ایک دن اس کا خط سوئیزر لینڈ سے آیا کہ وہ وہاں اپنا اعلان کرا رہا ہے، نرس بہت اچھی ہے۔ ہسپتال سے نکتے ہی وہ اس سے شادی کرنے والا ہے۔

ادھیر عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ نے تھوڑا زیور، کچھ نقدی اور بہت سے کپڑے جو اس کی ممی کے تھے، چرائے اور چند روز کے بعد غائب ہو گئی۔ اس کے بعد اس کی ماں آپریشن ناکام ہونے کے باعث ہسپتال میں مر گئی۔ اس کا باپ جنازے میں شامل ہوا۔ اس کے بعد اس نے اس کی صورت نہ دیکھی۔

اب وہ بالکل تنہا تھی۔ جتنے نوکرتے، اس نے علیحدہ کر دیے، ڈرائیور سمیت۔ اس کے بچے کے لیے اس نے ایک آیار کھدی۔ کوئی بوجہ سوائے اس کے خیالوں کے باقی نہ رہا تھا۔ کبھی بھاراً اگر کوئی اس سے ملنا آتا تو وہ اندر سے چلا اٹھی تھی، ”چلے جاؤ۔۔۔ جو کوئی بھی تم ہو، چلے جاؤ۔۔۔ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔“

سیف میں اس کو اپنی ماں کے بے شمار قیمتی زیورات ملے تھے۔ اس کے اپنے بھی تھے جن سے ان کو کوئی رغبت نہ تھی۔ مگر اب وہ رات کو گھنٹوں آئینے کے سامنے ننگی بیٹھ کر یہ تمام زیور اپنے بدن پر سجائی اور شراب پی کر کن سری آواز میں نخش گانے گاتی تھی۔ اس پاس اور کوئی کوٹھی نہیں تھی اس لیے اسے مکمل آزادی تھی۔

اپنے جسم کو تو وہ کئی طریقوں سے ننگا کر چکی تھی۔ اب وہ چاہتی تھی کہ اپنی روح کو بھی ننگا کر دے۔ مگر اس میں وہ زبردست جحاب محسوس کرتی تھی۔ اس جحاب کو دبانے کے لیے صرف ایک ہی طریقہ اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ پیسے اور خوب پیسے اور اس حالت میں اپنے ننگے بدن سے مدلے۔۔۔ مگر یہ ایک بہت بڑا الیہ تھا کہ وہ آخری حد تک ننگا ہو کر سترپوش ہو گیا تھا۔

تصویریں بنانا کروہ تھک چکی تھی۔۔۔ ایک عرصے سے اس کا پینٹنگ کا سامان صندو قپے میں بند پڑا تھا۔ لیکن ایک دن اس نے سب رنگ نکالے اور بڑے بڑے پیالوں میں گھولے۔ تمام برش دھو دھا کر ایک طرف رکھے اور آئینے کے سامنے ننگی کھڑی ہو گئی اور انے جسم پر نئے نئے خدوخال بنانے شروع کیے۔ اس کی یہ کوشش اپنے وجود کو مکمل طور پر عریاں کرنے کی تھی۔

وہ اپنا سماں حاصلہ ہی پینٹ کر سکتی تھی۔ دن بھر وہ اس میں مصروف رہی۔ بن کھائے پیے، آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بدن پر مختلف رنگ جماتی اور ٹیڑھے بنے خطوط بناتی رہی۔ اس کے برش میں اعتماد تھا۔۔۔ آدمی رات کے قریب اس نے دور ہٹ کر اپنا بغور جائزہ لے کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد اس نے تمام زیورات ایک ایک کر کے اپنے رنگوں سے لکھڑے ہوئے جسم پر سجائے اور آئینے میں ایک بار پھر غور سے دیکھا کہ ایک دم آہٹ ہوئی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔۔۔ ایک آدمی چھرا ہاتھ میں لیے، منہ پر ڈھانٹا باندھے کھڑا تھا جیسے حملہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر جب وہ مژدی تو حملہ آور کے حلق سے چنج بلند ہوئی۔ چھر اس کے ہاتھ سے گر پڑا، افراتفری کے عالم میں کبھی ادھر کارخ کیا کبھی ادھر۔۔۔ آخر جو رستہ ملا، اس میں سے بھاگ نکلا۔ وہ اس کے پیچے بھاگی۔ چینتی، پکارتی، ”ٹھہرو۔۔۔ ٹھہرو میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی۔۔۔ ٹھہرو!“

مگر چور نے اس کی ایک نہ سنی اور دیوار پھاند کر غائب ہو گیا۔ مایوس ہو کر واپس آئی۔ دروازے کی دلیز کے پاس چور کا خنجر پڑا تھا۔ اس نے اٹھا لیا اور اندر چلی گئی۔۔۔ اچانک اس کی نظریں آئیں سے دوچار ہو گئیں۔ جہاں اس کا دل تھا، وہاں اس نے میان نما چڑی کے رنگ کا خول سا بنایا ہوا تھا۔ اس نے اس پر خنجر کھ کر دیکھا۔ خوب بہت چھوٹا تھا۔ اس نے خنجر چھینک دیا اور بوتل میں سے شراب کے چار پانچ بڑے بڑے گونٹ پی کر ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔۔۔ وہ کئی بو تلیں خالی کر چکی تھی۔ کھایا کچھ بھی نہیں تھا۔

دیر تک ٹہلنے کے بعد وہ پھر آئیں کے سامنے آئی۔ اس کے گلے میں ازار بند نما گلوبند تھا جس کے بڑے بڑے پھندنے تھے۔ یہ اس نے برش سے بنایا تھا۔ دفتاً اس کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ گلوبند تنگ ہونے لگا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اس کے گلے کے اندر دھستا جا رہا ہے۔۔۔ وہ خاموش کھڑی آئیں میں آنکھیں گاڑی رہی جو اسی رفتار سے باہر نکل رہی تھیں۔۔۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے چہرے کی تمام رگیں پھولنے لگیں۔ پھر ایک دم سے اس نے چنج ماری اور اوندھے منہ فرش پر گر پڑی۔

-[120]-

خود کشی: سعادت حسن منظو

زادہ صرف نام ہی کا زا بہ نہیں تھا، اس کے زہد و تقویٰ کے سب قائل تھے، اس نے بیس پچھیں برس کی عمر میں شادی کی، اس زمانے میں اس کے پاس دس ہزار کے قریب روپے تھے، شادی پر پانچ ہزار صرف ہو گئے، اتنی ہی رقم باقی رہ گئی۔

زادہ بہت خوش تھا، اس کی بیوی بڑی خوش خصلت اور خوبصورت تھی، اس کو اس سے بے پناہ محبت ہو گئی، وہ بھی اس کو دل و جان سے چاہتی تھی، دونوں سمجھتے تھے کہ جنت میں آباد ہیں۔

ایک برس کے بعد ان کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جو مال پر تھی، یعنی ویسی ہی حسین، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، ان پر لمبی پلکیں، مہین ابرو، چھوٹا سالب دہن۔۔۔ اس لڑکی کا نام سوچنے میں کافی دیر لگ گئی۔ زاہد اور اس کی بیوی کو دوسروں کے تجویز کیے ہوئے نام پسند نہیں آتے تھے، وہ چاہتی تھی کہ خود زاہد نام بتائے۔

زاہد دیر تک سوچتا رہا لیکن اس کے دماغ میں ایسا کوئی موزوں و مناسب نام نہ آیا جو وہ اپنی بیٹی کے لیے منتخب کرتا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا، ”اتنی جلدی کیا ہے۔۔۔ نام رکھ لیا جائے گا۔“

بیوی مصر تھی کہ نام ضرور کھا جائے، ”میں اپنی بیٹی کو اتنی دیر بے نام نہیں رکھنا چاہتی۔“

وہ کہتا، ”اس میں کیا ہرج ہے۔۔۔ جب کوئی اچھا سانام ذہن میں آئے گا تو اس گل گو تھنی کے ساتھ ٹانک دیں گے۔“

”پر میں اسے کیا کہہ کر پکاروں۔۔۔ مجھے بڑی لجھن ہوتی ہے۔“

”فی الحال بیٹیا کہہ دینا کافی ہے۔“

”یہ کافی نہیں ہے۔۔۔ میری بیٹیا کا کوئی نام ہونا چاہیے۔“

”تم خود ہی کوئی منتخب کرلو۔“

تو تھوڑے دن انتظار کرو۔۔۔ میں اردو کی لغت لاتا ہوں۔۔۔ اس کو پہلے صفحے سے آخری صفحے تک غور سے دیکھوں گا۔۔۔ یقیناً کوئی اچھا نام مل جائے گا۔“

”میں نے آج تک یہ کبھی نہیں سنا تھا کہ لوگ اپنے بچوں بچیوں کے نام ڈکشنریوں سے نکالتے ہیں۔“

”نہیں میری جان، نکلتے ہیں۔۔۔ میرا ایک دوست ہے، اس کے جب پچھی پیدا ہوئی تو اس نے فوراً اردو کی لغت نکالی اور اس کی ورق گردانی کرنے کے بعد ایک نام چن لیا۔“

”کیا نام تھا؟“

”نہت!“

”اس کے معنی کیا ہیں؟“

”خوشبو!“

”بڑا چھانام ہے۔۔۔ نہت۔۔۔ یعنی خوشبو۔“

”تو یہی نام رکھ لو۔“

زادہ کی بیوی نے اپنی پچھی کو جو سورہ تھی، ایک نظر دیکھا اور کہا، ”نہیں۔۔۔ میں اپنی بیٹیا کے لیے پرانا نام نہیں چاہتی۔۔۔ کوئی نیا نام تلاش کیجیے۔۔۔ جائے ڈکشنری لے آئیے۔“

”زادہ مسکرا یا، لیکن میرے پاس پیسے کہاں ہیں؟“

زادہ کی بیوی بھی مسکرائی، ”میرا پرس الماری میں پڑا ہے، اس میں جتنے روپے آپ کو چاہئیں، نکال جبجھے۔“

زادہ نے ”بہت بہتر“ کہا اور الماری کھول کر اس میں سے اپنی بیوی کا پرس نکالا اور دس روپے کا ایک نوٹ لے کر بازار روانہ ہو گیا کہ لغت خرید لے۔

وہ کئی کتب فروش دکانوں میں گیا۔۔۔ کئی لغت دیکھے، بعض تو بہت قیمتی تھے جن کی تین تین جلدیں تھیں۔۔۔ کچھ بڑے ناقص۔۔۔ آخر اس نے ایک لغت جس کی قیمت واجبی تھی، خرید لیا اور راستے میں اس کی ورق گردانی کرتا رہتا کہ نام کا مسئلہ جلد حل ہو جائے۔

جب وہ انارکلی میں سے گزر رہا تھا تو اس کو ایک دوست مل گیا، وہ اسے اپنی بوٹوں کی دکان میں لے گیا، وہاں اسے قریب قریب ایک گھنٹے تک بیٹھنا پڑا۔ کیونکہ بہت دیر کے بعد اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ جب اس کے دوست کو دورانِ گفتگو میں پتہ چلا کہ زاہد کے ہاں لڑکی ہوئی ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ تجویز میں سے گیارہ روپے نکالے اور زاہد سے کہا، ”یہ اس بچی کو دے دینا، کہنا تمہارے چچا نے دیے ہیں۔۔۔ نام کیا رکھا ہے اس کا؟“

زاہد نے لغت کی طرف دیکھا جس کی جلد لال رنگ کی تھی، ”ابھی تک کوئی اچھا نام سو جھانہیں۔“

اس کے دوست نے جوتے کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے کہا، ”یار نام رکھنے میں دقت ہی کیا پیش آتی ہے۔ ثمینہ ہے، شاہینہ ہے، نسرین ہے، الماس ہے۔“

زاہد نے جواب دیا، ”یہ سب بکواس ہے۔“

اس کے دوست نے جوتاڈبے میں رکھا، ”تواب جو بکواس تم کرو گے وہ بھی ہم سن لیں گے۔“ اس کے بعد اٹھ کر اس نے زاہد کو گلے سے لگایا۔ خدا اس کی عمر دراز کرے۔۔۔ نام ہونہ ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

زاہد جب دکان سے باہر نکلا تو اس نے سوچنا شروع کیا کہ واقعی نام میں کیا رکھا ہے۔ خیر اتنی کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ بڑی خیرات کرتا ہے، عین کیا بلا ہے۔۔۔ اور گھسیٹا۔۔۔ کیا اسے لوگ گھسینا شروع کر دیں۔۔۔ اور یہ زلدو۔۔۔ شبر اتنی؟ اس کے جی میں آتی کہ لغت کسی گندی موری میں پھینک دے اور گھر جا کر اپنی بیوی سے کہے ”میری جان! نام میں کچھ نہیں پڑا، میں یہ دعا کرو کہ بچی کی عمر دراز ہو۔“

وہ مختلف خیالات میں غرق تھا۔۔۔ لیکن معلوم نہیں کیوں اس کا دل غیر معمولی طور پر دھڑک رہا تھا، اس نے سوچا کہ شاید یہ اس کی پرالگندہ خیالی کا باعث ہے۔۔۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس کی طبیعت بہت زیادہ مضطرب ہو گئی، وہ چاہتا تھا کہ اڑ کر گھر پہنچے اور اپنی بچی کی پیشانی چومنے۔

بغل میں لغت تھی۔۔۔ اس کو اس نے کئی بار دیکھنے کی کوشش کی مگر اس کا دل و دماغ متوازن نہیں تھا۔۔۔ اس نے تیز تیز چلنائشروع کر دیا۔۔۔ مگر تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی بہت بری طرح ہانپنے لگا اور ایک دکان کے کھڑے پر بیٹھ گیا۔۔۔ اتنے میں ایک خالی تانگہ آیا۔ اس نے اس کو ٹھہرایا اور اس میں بیٹھ کر تانگہ والے سے کہا، ”چلو مرنگ لے چلو۔ لیکن جلدی پہنچاؤ، مجھے وہاں ایک بڑا ضروری کام ہے۔“

مگر گھوڑا بہت ہی سست رفتار تھا، یا شاید زاہد کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کو عجلت تھی۔ وہ برق رفتاری سے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ تانگہ والے سے سخت سست الفاظ کہے جو وہ برداشت کرتا گیا، آخر جب اس کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اس نے زاہد کو تانگہ سے اتار دیا۔۔۔ ہائی کورٹ کے قریب، اس نے زاہد سے کرا یہ بھی طلب نہ کیا۔

زاہد اور زیادہ پریشان ہوا، وہ جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا، وہ کچھ دیر چوک میں کھڑا رہا، اتنے میں ایک پشاوری تانگہ آیا اس میں بیٹھ کر وہ مرنگ پہنچا۔ کرا یہ ادا کیا اور گھر میں داخل ہوا۔ کیا دیکھتا ہے کہ صحن میں کئی عورت تیس کھڑی ہیں جو غالباً ہمسائی تھیں، وہ دروازے کے پاس رک گیا، ایک عورت دوسری عورت سے کہہ رہی تھی، مشکل ہی سے بچے گی بے چاری۔۔۔ تشنخ کے یہ دورے بڑے خطرناک ہیں۔“

زاہدان عورتوں کی پرواہ کرتے ہوئے دیوانہ وار اندر بجھا گا اور اس کمرے میں پہنچا جہاں وہ اور اس کی بیوی رہتے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنی بیوی کی فلک شگاف چھپ سنی۔

اس کی میڈام توڑ چکی تھی اور اس کی بیوی بیہوش پڑی تھی۔ زاہد نے اپنا سر پیٹنا شروع کر دیا۔ ہمسائیاں پر دے کو بھول کر بے اختیار اندر چل آئیں اور زاہد کو اس کمرے سے باہر نکال دیا۔

ایک ہمسائی کے شوہر کے پاس موڑ تھی وہ ایک ڈاکٹر لے آیا۔ اس نے زاہد کی بیوی کو ایک دو نجاشن لگائے جن سے وہ ہوش میں آگئی۔ زاہد ایک ایسے عالم میں تھا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں معطل ہو گئی تھیں۔ وہ صحن میں ایک کرسی پر بیٹھا، بغل میں لغت دبائے خلامیں دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ اپنی بچی کے لیے کوئی نام تلاش کرنے میں محو ہے۔

پچی کو دفنانے کا وقت آیا تو زاہد بہوش ہو گیا، اس نے کوئی آنسو نہ بھایا۔ کفن میں پڑی پچی کو اٹھایا اور اپنے دوستوں اور ہمسایوں کے ہمراہ قبرستان روانہ ہو گیا۔ وہاں قبر پہلے ہی سے تیار کرالی گئی تھی۔ اس میں اس نے خود اسے لٹایا اور اس کے ساتھ لغت رکھ دی۔ لوگوں نے سمجھا قرآن مجید ہے، انھیں بڑی حیرت ہوئی کہ مردوں کے ساتھ قرآن کون دفن کرتا ہے، یہ تو سراسر کفر ہے لیکن ان میں سے کسی نے بھی زاہد سے اس کے متعلق کچھ نہ کہا، بس آپس میں کھسپھسر کرتے رہے۔

پچی کو دفنانے کا جب گھر آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کو بہت تیز بخار ہے، سر سام کی کیفیت ہے۔ فوراً ڈاکٹر کو بلا یا گیا، اس نے اچھی طرح دیکھا اور زاہد سے کہا، ”حالت بہت نازک ہے۔۔۔ میں علاج تجویز کیے دیتا ہوں لیکن میں صحت کی بحالی کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ زاہد کو ایسا محسوس ہوا کہ اس پر بجلی آن گری ہے لیکن اس نے سنبھل کر ڈاکٹر سے پوچھا ”تکلیف کیا ہے؟“

ڈاکٹر نے جواب دیا، ”بہت سی تکلیفیں ہیں۔۔۔ ایک تو یہ کہ انھیں بہت صدمہ پہنچا، دوسری یہ کہ ان کا دل بہت کمزور ہے۔۔۔ تیسرا یہ کہ انھیں ایک سوپا نجی ڈگری بخار ہے۔“ ڈاکٹر نے چند ٹیکے تجویز کیے، دونسخ پلانے والی دواؤں کے لکھے اور چلا گیا۔ زاہد فوراً یہ سب چیزیں لے آیا، ٹیکے لگائے، دوائیں بڑی مشکل سے حلق میں پکائی گئیں لیکن مریضہ کی حالت بہتر نہ ہوئی۔ دس پندرہ روز کے بعد اسے تھوڑا سا ہوش آیا، ہذیانی کیفیت بھی دور ہو گئی۔ زاہد نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کی پیاری حسین بیوی نے اسے بلا یا اور بڑی نحیف آواز میں کہا، ”میرا اب آخری وقت آگیا ہے۔۔۔ میں چند گھنٹیوں کی مہمان ہوں۔۔۔“

زاہد کی آنکھوں میں آنسو آگئے، ”کیسی باتیں کرتی ہوتیں۔۔۔ تم خدا نتوانستہ اگر کچھ ہو گیا تو میں کہاں زندہ رہوں گا۔“

زاہد کی بیوی نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا، ”یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔۔۔ میں مر گئی، کل دوسری آجائے گی۔۔۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔“

اس نے پچی لی اور ایک سینٹ کے اندر اندر اس کی روح پرواز کر گئی۔۔۔ زاہد نے بڑے صبر و تحمل سے کام لیا، اس کے کفن دفن سے فارغ ہو کر وہ رات کو گھر سے باہر نکلا اور ریلوے ٹائم ٹیبل دیکھ کر ریلوے لائن کا رخ کیا۔ رات کو ساڑھے نوبجے کے قریب ایک گاڑی آتی تھی، وہ مغل پورہ کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ وہاں پڑی پر لیٹ جائے اور اسے کوئی دیکھنہ سکے۔ گاڑی آئے گی تو اس کا خاتمه ہو جائے گا۔۔۔ مجھے لمبی عمر کی کوئی خواہش نہیں۔۔۔ یہ جتنی جلدی مختصر ہو، اتنا ہی اچھا ہے، میں اب اور زیادہ صدمے برداشت نہیں کر سکتا۔

جب وہ ریلوے لائن کے پاس پہنچا تو اسے گاڑی کی تیز روشنی جو نجٹ کی پیشانی پر ہوتی ہے، دکھائی دی۔۔۔ لیکن ابھی وہ دور ہی تھی۔۔۔ اس نے انتظار کیا کہ جب قریب آئے گی تو وہ پڑی پر لیٹ جائے گا۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی قریب آگئی۔۔۔ زاہد آگے بڑھا مگر اس نے دیکھا کہ ایک آدمی کہیں سے نمودار ہوا اور پڑی کے عین درمیان کھڑا ہو گیا۔ گاڑی بڑی تیز رفتار سے آرہی تھی اور قریب تھا کہ وہ آدمی اس کی جھپٹ میں آجائے، وہ تیزی سے لپکا اور اس آدمی کو دھکا دے کر پڑی کے اس طرف گردایا۔ گاڑی دندناتی ہوئی گزر گئی۔

اس آدمی سے زاہد نے کہا، ”کیا تم خود کشی کرنا چاہتے ہے؟“

اس نے جواب دیا، ”جی ہاں!“

”کیوں؟“

”بس۔۔۔ صدمے اٹھاتے اٹھاتے اب جینے کو جی نہیں چاہتا۔“

زاہد ناصح بن گیا، ”بھائی میرے ازندگی زندہ رہنے کے لیے ہے، اس کو اچھی طرح استعمال کرو، خود کشی بہت بڑی بزدلی ہے۔۔۔ اپنی جان خود لینا کہاں کی عقل مندی ہے۔۔۔ اٹھو، اپنے صدموں کو بھول جاؤ۔۔۔ انسان کی زندگی میں صدمے نہ ہوں تو خوشیوں سے کیا حظ اٹھائے گا۔۔۔ چلو میرے ساتھ۔“

بائی بائی

-[121]-

مسٹر حمیدہ: سعادت حسن منٹو

رشید نے پہلی مرتبہ اس کو بس استینڈ پر دیکھا، جہاں وہ شید کے نیچے کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ رشید نے جب اسے دیکھا تو وہ ایک لمحے کے لیے حیرت میں گم ہو گیا۔ اس سے قبل اس نے کوئی ایسی لڑکی نہیں دیکھی تھی جس کے چہرے پر مردوں کی مانند داڑھی اور موچھیں ہوں۔

پہلے رشید نے سوچا کہ شاید اس کی نگاہوں نے غلطی کی ہے۔ عورت کے چہرے پر بال کیسے اگ سکتے ہیں۔ پرجب اس نے غور سے دیکھا تو اس لڑکی نے باقاعدہ شیو کر کھی تھی اور سر منے غبار اس کے گالوں اور ہونٹوں پر موجود تھا۔

رشید نے سمجھا کہ شاید یہ بھرا ہو، مگر نہیں۔۔۔ وہ یہ بھرا نہیں تھی۔ اس لیے کہ اس میں یہ بھروں کی سی مصنوعی نسوانیت کے کوئی آثار نہیں تھے۔ وہ مکمل عورت تھی۔۔۔ ناک نقشہ بہت اچھا تھا۔۔۔ کوئی چوڑے چکلے۔۔۔ کمر پتلی۔۔۔ سینہ جوانی سے بھر پور۔۔۔ بازو سڑوں، غرضیکہ اس کے جسم کا ہر عضو اپنی جگہ پر نسوانیت کا عمدہ نمونہ تھا۔

ایک صرف اس کی داڑھی اور موچھوں نے سب کچھ غارت کر دیا تھا۔ رشید سوچنے لگا۔۔۔ قدرت کی یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ ایک اچھی بھلی نوجوان خوبصورت لڑکی کو بد نہ بنا دیا۔ رشید کے دماغ میں کئی خیال اور پتلے آئے اور وہ بوکھلا گیا۔ وہ سوچتا تھا:

”کیا اس لڑکی کی زندگی اجیرن ہو کے نہیں رہ گئی؟“

”صح اٹھ کر جب اسے استراپکٹر کر شیو کرنا پڑتی ہوگی تو اسے کیا محسوس ہوتا ہو گا۔۔۔ کیا اس وقت اس کے جی میں جھنجھلا کر انتقامی خواہش پیدا نہ ہوتی ہوگی کہ وہ گھس کھدے کی طرح اپنے گال اور ہونٹ چھیل ڈالے۔“

”ایک عورت کے لیے یہ کتنا بڑا عذاب ہے کہ خارپشت کی مانند اس کے گالوں پر دوسرے روز نکلیے بال اگ آئیں۔“

”اگر مردوں کے مانند عورتوں کے بھی داڑھی موچھ اگتی تو کوئی ہر ج نہیں تھا پر یہاں ازل سے عورتیں ان بالوں سے بے نیاز ہی رہی ہیں۔“

”جہاں تک میں سمجھتا ہوں، عورتوں کے چہرے پر بالوں کا ہونا کوئی معیوب چیز نہیں، لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ہم لوگ یہ دیکھنے کے عادی نہیں۔“

”صنفِ نازک، آخر صنفِ نازک ہے، اس میں شگ نہیں۔ اس لڑکی میں نسوانیت کے تمام جو ہر موجود ہیں، پھر یہ داڑھی مونچھ کس لیے اگ آئی ہے۔۔۔ نظر بٹو کے طور پر۔۔۔ اس کی کوئی تشریح و توضیح تو ہونی چاہیے، بیکار میں ایک خوبصورت شے کو بھونڈ ابنا دیا، یہ کہاں کی شرافت ہے۔“

”اب ایسی لڑکی سے شادی کون کرے گا جو ہر روز صبح سویرے اٹھ کر، استراہاتھ میں پکڑ کر شیو کر رہی ہو۔“

”یہ لڑکی مونچھیں نہ مونڈے اور انہیں بڑھا لے۔۔۔ تو کیا اس سے خوف نہیں آئے گا۔۔۔ آپ بے ہوش نہ ہوں، لیکن چند لمحات کے لیے آپ کے ہوش و حواس ضرور جواب دے جائیں گے۔۔۔ آپ اپنے ہونٹوں پر انگلیاں پھیریں گے جہاں مونچھیں منڈی ہوں گی۔۔۔ مگر آپ کی صنف مقابل اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہی ہو گی۔“

بس آگئی۔۔۔ وہ لڑکی اس میں سوار ہو کر چلی گئی۔ رشید کو بھی اسی بس سے جانا تھا لیکن وہ اپنے خیالوں میں اس قدر غرق تھا کہ اس کو بس کی آمد کا پتہ چلانہ اس کے جانے کا۔

تحوڑی دیر کے بعد جب وہ لڑکی کو ایک نظر اور دیکھنے کے لیے پلٹا تو وہ موجود نہیں تھی۔ اس کا ذہن اس قدر مضطرب تھا کہ اس نے اپنا کام ملتوی کر دیا اور گھر چلا آیا۔ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ کر اس نے مزید سوچ بچار شروع کر دی۔ اس کو اس لڑکی پر بہت ترس آ رہا تھا، بار بار قدرت کی بے رحمی پر لعنتیں بھیجتا تھا کہ اس نے کیوں نسوانیت کے اتنے اچھے اور خوبصورت نمونے کو خود ہی بنایا کہ اس پر سیاہی کا لیپ کر دیا، آخر اس میں کیا مصلحت تھی، اب اس شکل میں اس سے شادی کون کرے گا، قدرت نے کیا اس کے لیے کوئی ایسا مرد پیدا کر کھا ہے جو اسے قبول کر لے گا لیکن وہ سوچتا کہ قدرت اتنی دور اندیش نہیں ہو سکتی۔“

اس کی بہن آئی۔۔۔ دوپہر ہو چکی تھی۔۔۔ اس نے رشید سے کہا، ”بھائی جان۔۔۔ چلیے کھانا کھا لیجیے۔“ رشید نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور اس کویوں محسوس ہوا کہ اس کے چہرے پر بھی باں ہیں۔

”سلیمہ!“

”جی!“

”کچھ نہیں۔۔۔ لیکن نہیں مٹھر و۔۔۔ کیا تمہاری موٹھیں ہیں؟“
سلیمہ جھینپ گئی۔

”جی ہاں۔۔۔ بال اگتے ہیں۔“

رشید نے اس سے پوچھا، ”تو۔۔۔ میرا مطلب ہے تمہیں الجھن نہیں ہوتی ان بالوں سے؟“ سلیمہ نے اور زیادہ جھینپ کر جواب دیا، ”ہوتی ہے بھائی جان۔“

”تو انہیں تم کیسے صاف کرتی ہو۔۔۔ بلیڈ سے؟“

”جی نہیں۔۔۔ ایک چیز ہے جسے بے بی ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔ اس کو تھوڑی دیر ہونٹوں پر گھسنے پڑتا ہے۔“

”تو بال اڑ جاتے ہیں؟“

”اڑتے وڑتے خاک بھی نہیں، دوسرے تیسرے روز پھر نمودار ہو جاتے ہیں بڑی مصیبت ہے۔ بعض اوقات تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔“

”وہ کیوں؟“

سلیمہ نے دردناک لہجہ میں جواب دیا، ”تکلیف ہوتی ہے بہت، جب بال اکھڑتے ہیں تو چھینکیں آتی ہیں اور چھینکوں کے ساتھ آنکھوں میں پانی اتر آتا ہے۔۔۔ معلوم نہیں اللہ میاں مجھے کن گناہوں کی سزا دے رہا ہے۔“

رشید نے تھوڑے توقف کے بعد اپنی بہن سے پوچھا، ”تمہاری کسی کی بھی داڑھی اور موچھیں ہیں؟“

”موچھیں تو کئی لڑکیوں کی دیکھی ہیں پر داڑھی میں نے کبھی کسی عورت کے چہرے پر نہیں دیکھی، ایک دو بال ٹھوڑی پر دیکھنے میں آئے ہیں جو وہ موچنے یا ہاتھ سے اکھاڑ پھینکتی ہیں، یہ آپ نے کسی گفتگو آج شروع کر دی، چلیے کھانا کھا لیجیے۔“

رشید نے کچھ دیر سوچا، ”نہیں، میں آج کھانا نہیں کھاؤں گا، میرا معدہ ٹھیک نہیں ہے“، رشید کویوں محسوس ہوتا تھا کہ اس نے بالوں کی پڈنگ کھائی ہے جو ہضم ہونے میں ہی نہیں آتی۔ اس کے سارے جسم پر تیز تیز نکلیے بالیوں رینگ رہے تھے جیسے خاردار چیزوں نیاں۔ جب سلیمہ چلی گئی تو رشید نے پھر سوچنا شروع کر دیا، لیکن موچنے سے کیا ہو سکتا تھا، اس لڑکی کے چہرے کے بال تو دور نہیں ہو سکتے تھے۔ اس امر کا رشید کو کامل یقین تھا لیکن پھر بھی وہ سوچے چلا جا رہا تھا، جیسے وہ کوئی بہت بڑا معملا حل کر رہا ہے۔

رشید کو داخلے کی درخواست دینا تھی۔ اس نے بی اے کا امتحان را ولپنڈی سے پاس کیا تھا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ لاہور میں کسی کالج میں داخل ہو جائے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کر کے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلا جائے جہاں اس کے والد پر ائمروی کو نسل میں پرکیش کرتے تھے۔

اس روز موچھوں اور داڑھی والی لڑکی کے باعث نہ جاسکا۔ دوسرے روز وہ بس کے بجائے تالگے میں گیا۔ اس نے چونکہ بی اے کا امتحان بڑے اچھے نمبروں پر پاس کیا تھا اس لیے اسے داخلے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ وہ داڑھی موچھوں والی لڑکی اب رشید کے دل و دماغ سے قریب قریب محو ہو چکی تھی، لیکن ایک دن اس نے اس کو کالج میں دیکھا، لڑکے اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔

ایک نے آوازہ کسما، مسٹر حمیدہ!“ دوسرے نے کہا، ”ایک ٹکٹ میں دو مزے ہیں۔۔۔ عورت کی عورت اور مرد کا مرد۔“ تیرے نے قہقهہ لگایا، ”عجائب گھر میں رکھنا چاہیے تھا ایسی شخصیت کو۔“ اور وہ بیچاری خفیف ہو رہی تھی، اس کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔ رشید کو اس پر بہت ترس آیا۔ اس کے جی میں آئی کہ آگے بڑھ کر ان تمام لڑکوں کا سر پھوڑ دے جو اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ مگر وہ کسی مصلحت کی بنا پر خاموش رہا۔

جب لڑکے چلے گئے، اور اس لڑکی نے اپنے دوپٹے سے آنکھوں میں اٹھے ہوئے آنسو خشک کیے تو وہ جرأت سے کام لے کر اس کے پاس گیا اور بڑے ملامم لبجے میں اس سے مخاطب ہوا، ”آپ یہاں کس کلاس میں پڑھتی ہیں؟“

اس نے ٹنگ آ کر کہا، ”کیا آپ بھی میر امداد اڑانے آئے ہیں؟“ رشید نے اپنا لجہ اور ملامم کر دیا، ”بھی نہیں، آپ مجھے اپنا دوست یقین کیجیے۔“ اس نے، جس کا نام حمیدہ تھا۔۔۔ نفرت کی نگاہوں سے رشید کو دیکھا۔

”مجھے کسی دوست کی ضرورت نہیں۔“

”یہ آپ کی زیادتی ہے، ہر شخص کو دوست اور ہمدرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں اس وقت مناسب نہیں سمجھتا کہ آپ کے مضطرب دماغ کو اپنی باتوں سے اور زیادہ مضطرب کر دوں، ویسے میں آپ سے پھر درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھے اپنا دوست یقین کیجیے۔“

یہ کہہ کر رشید چلا گیا۔

اس کے بعد متعدد مرتبہ اس نے حمیدہ کو دیکھا جو بی اے میں پڑھتی تھی۔ سارے کالج میں اس کی داڑھی موچھوں کے چرچے تھے، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ لڑکوں کی آوازہ بازی کی عادی ہو چکی ہے۔ میر اخیال ہے کہ اب اس نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اس کے چہرے پر کوئی بال نہیں ہے۔

وہ ہوشل میں رہتی تھی۔ ایک دفعہ وہ شدید طور پر بیمار ہو گئی، دس پندرہ دن تک بستر میں لیٹنا پڑا۔ رشید نے کئی بار ارادہ کیا کہ وہ اس کی بیمار پر سی کے لیے جائے مگر اس کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ وہ مشتعل ہو جائے گی کیونکہ اسے کسی کی ہمدردی پسند نہ تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی کشتنی، ٹوٹی پھوٹی، جیسی بھی ہے اسے اس کے سوا اور کوئی کھینے والا نہ ہو۔ لیکن ایک دن مجبور ہو کر اس نے چپ اسی کے ہاتھ ایک رقعہ رشید کے نام بھیجا۔۔۔ جس میں یہ چند الفاظ مرقوم تھے:

”رشید صاحب!

میں بیمار ہوں، کیا آپ چند لمحات کے لیے میرے کمرے میں تشریف لاسکتے ہیں۔ ممنون و متشکر ہوں گی۔
”حمیدہ“

رشید یہ رقم ملتے ہی ہو سل میں گیا، بڑی مشکلوں سے حمیدہ کا کمر اتنا شک کیا، اندر داخل ہوا تو اس نے پہلے یہ سمجھا کہ کوئی مرد جس نے کئی دنوں سے شیو نہیں کی، کمبل اوڑھے لیٹا ہے مگر اس نے اپنارِ عمل ظاہرنہ ہونے دیا۔ چارپائی کے ساتھ ہی کر سی پڑی تھی۔ رشید اس پر بیٹھ گیا۔ حمیدہ مسکرائی۔

”میں نے آپ کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ مجھے بخار کے باعث بہت نقاہت ہو گئی ہے اور شیو نہیں کر سکی۔ کیا آپ میرے لیے یہ زحمت برداشت کر سکیں گے؟“

رشید نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔۔۔ شیو کا سامان کھڑکی کی سل پر موجود تھا۔ میں میں گرم پانی لا کر اس نے حمیدہ کے چہرے کے بال نرم کیے، صابن ملا۔ اچھی طرح جھاگ پیدا کی اور پھر پانچ منٹ کے اندر اندر شیو بناؤالی۔ پھر تو لیے سے اس کا چہرہ خشک کیا اور شیو کا سامان صاف کرنے کے بعد وہیں رکھ دیا جہاں سے اس نے اٹھایا تھا۔ حمیدہ نے اپنا حجف ہاتھ گالوں پر پھیرا، اور پھر رشید سے کہا۔

”شکر یہ!“

اب دونوں ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔ رشید نے ایم اے اور حمیدہ نے بی اے پاس کر لیا، رشید کو فوراً بہت اچھی ملازمت مل گئی۔

اب وہ ایک نہیں، روزانہ دو شیو بناتا تھا!

-[122]-

ماہی گیر: سعادت حسن منشو

فرانسیسی شاعر و کٹر ہیو گو کی ایک نظم کے تاثرات

سمندر رورہا تھا۔

مقید لہریں پھر یے ساحل کے ساتھ ٹکڑا ٹکڑا کر آہ وزاری کر رہی تھیں۔

دور پانی کی رقصائ سطح پر چند کشتیاں اپنے دھنڈے اور کمزور باد بانوں کے سہارے بے پناہ سردی میں ٹھہری ہوئی کانپ رہی تھیں۔

آسمان کی نیلی قاب میں چاند کھل کھلا کر بنس رہا تھا۔

ستاروں کا کھیت اپنے پورے جوبن میں لہلہرا رہا تھا۔

فضاسمندر کے نمکین پانی کی تیزبو میں بسی ہوئی تھی۔

ساحل سے کچھ فاصلے پر چند شکستہ جھونپڑیاں خاموش زبان میں ایک دوسرے سے اپنی خستہ حالی کا تذکرہ کر رہی تھیں۔۔۔

یہ ماہی گیروں کے سرچھپا نے کی جگہ بھیں تھیں۔

ایک جھونپڑی کا دروازہ کھلا تھا جس میں سے چاند کی آوارہ شعاعیں زمین پر رینگ کر اس کی کاجل ایسی فضا کو نیم روشن کر رہی تھیں۔
اس اندر ہی روشنی میں دیوار پر ماہی گیر کا جال نظر آ رہا تھا اور ایک چوبی تخت پر چند تھالیاں جھملارہی تھیں۔

جھونپڑی کے کونے میں ایک ٹوٹی چارپاری، تاریک چاروں میں ملبوس اندر ہیرے میں سر نکالے ہوئے تھی۔ اس کے پہلو میں پھٹے ہوئے
ٹاٹ پر پانچ بچے مخواہب تھے۔۔۔ ننھی روحوں کا ایک گھونسلا جو خوابوں سے تحریر تھر ا رہا تھا۔ پاس ہی ان کی ماں نہ معلوم کن خیالات میں
مستغرق گھٹنوں کے بل بیٹھی گنگنا رہی تھی۔

یک ایک وہ لہروں کا شور سن کر چوکی۔۔۔ بوڑھا سمندر، کسی آنے والے خطرے سے آگاہ، سیاہ چٹانوں، تنہ ہواں اور نصف شب کی تاریکی کو
مخاطب کر کے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا۔ وہ اٹھی اور بچوں کے پاس جا کر ایک کی پیشانی پر اپنے سر دلبوں سے بوسہ دیا۔ اور وہیں ٹاٹ کے
ایک کونے پر بیٹھ کر دعا مانگنے میں مصروف ہو گئی۔ لہروں کے شور میں یہ الغاظ بخوبی سنائی دے رہے تھے۔

”اے خدا! اے بے کسوں اور غریبوں کے خدا، ان پکوں کا واحد سہارا، رات کا تاریک کفن اور یہ سمندر کی لہروں کے ساتھ کھلی رہا ہے۔۔۔ موت کے عمیق گڑھے میں پاؤں لٹکائے ہے۔ صرف ان کی خاطر وہ ہر روز اس دیو کے ساتھ کشتوں لڑتا ہے۔۔۔ اے خدا تو اس کی جان حفاظت میں رکھیو۔۔۔ آہ! اگر یہ صرف نوجوان ہوتے۔۔۔ اگر یہ صرف اپنے والد کی مدد کر سکتے۔۔۔!“

یہ کہہ کر خدا معلوم اسے کیا خیال آیا کہ وہ سر سے پیر تک کانپ گئی اور ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے تھر تھر اتی ہوئی آواز میں کہنے لگی، ”بڑے ہو کر ان کا بھی یہی شغل ہو گا۔ پھر مجھے چھ جانوں کا خدشہ لاحق رہے گا۔“

آہ۔۔۔! کچھ سمجھ نہیں آتا۔ غربت! غربت!!“

یہ کہتے ہوئے وہ اپنی غربت اور تنگ دامانی کے خیالات میں غرق ہو گئی۔ دفعاً وہ اس اندھیرے خواب سے بیدار ہوئی۔ اس کے دماغ میں ہوٹلوں کی دیو قامت عمارتیں اور امراء کے راحت کدوں کی تصویریں کھج گئیں۔ ان عمارتوں کی دل فریب راحتیوں اور امراء کی تعیش پرستیوں کا خیال آتے ہی اس کے دل پر ایک دھند سی چھائی۔ کلیج پر کسی غیر مرئی ہاتھ کی گرفت محسوس کر کے وہ جلدی سے اٹھی اور دروازے سے تاریکی میں آوارہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔

اس کی یہ حرکت خیالات کی آمد کونہ روک سکی۔ وہ سخت حیران تھی کہ لوگ امیر اور غریب کیوں ہوتے ہیں جبکہ ہر انسان ایک ہی طرح مال کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سوال کے حل کے لیے اس نے اپنے دماغ پر بہت زور دیا مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہ مل سکا۔ ایک اور چیز جو اسے پریشان کر رہی تھی، وہ یہ تھی کہ جب اس کا خاوند اپنی جان پر کھلی کر سمندر کی گود سے مچھلیاں چھین کر لاتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ مارکیٹ کا مالک بغیر محنت کئے ہر روز سیکڑوں روپے پیدا کر لیتا ہے۔ اسے یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی کہ محنت تو کریں ماہی گیر اور نفع ہو مارکیٹ کے مالک کو۔ رات بھر اس کا خاوند اپناخون پسینہ ایک کر دے اور صبح کے وقت آدمی کمائی اس کی بڑی توند میں چلی جائے۔۔۔ ان تمام سوالوں کا جواب نہ پا کر وہ نہ پڑی اور بلند آواز میں کہنے لگی، ”مجھے بے عقل کو بھلا کیا معلوم ہو۔ یہ سب خدا جانتا ہے مگر۔۔۔“

اس کے بعد وہ کچھ کہنے والی تھی کہ کانپ اٹھی، ”اے خدا میں گناہ گار ہوں۔ تو جو کرتا ہے، بہتر کرتا ہے۔۔۔ ایسا خیال کرنا کفر ہے۔“ یہ کہتی ہوئی وہ خاموشی سے اپنے پکوں کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور ان کے معصوم چہروں کی طرف دیکھ کر بے اختیار رونا شروع کر دیا۔

باہر آسمان پر کالے بادل مہمیب ڈائینوں کی صورت میں اپنے سیاہ بال پر بیثان کیے چکر کاٹ رہے تھے۔ کبھی کبھی اگر کوئی بادل کا ٹکڑا اچاند کے درخشاں رخسار پر اپنی سیاہی مل دیتا تو فضا پر قبر کی تاریکی کی چھا جاتی۔ سمندر کی سیمیں لہریں گہرے رنگ کی چادر اوڑھ لیتیں اور کشتوں کے مستولوں پر ٹمٹماں ہوئی روشنیاں اچانک تبدیلی کو دیکھ کر آنکھیں جھپکنا شروع کر دیتیں۔

ماہی گیر کی بیوی نے اپنے میلے آنچل سے آنسو خشک کئے اور دروازے کے پاس کھڑی ہو کر دیکھنے لگی کہ آیا دن طلوع ہوا ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس کا خاوند طلوع کی پہلی کرنے کے ساتھ ہی گھر واپس آ جایا کرتا ہے۔ مگر صحیح کا ایک سانس بھی بیدار نہ ہوا تھا۔ سمندر کی تاریک سطح پر روشنی کی ایک دھاری بھی نظر نہ آ رہی تھی۔ بارش کا جل کی طرح تمام فضا پر برس رہی تھی۔۔۔ بوڑھا سمندر کا حانس رہا تھا۔

وہ بہت دیر تک دروازے کے پاس کھڑی اپنے خاوند کے خیال میں مستغرق رہی۔ جو اس بارش میں اور سمندر کی تند موجودوں کے مقابلے میں لکڑی کے ایک معمولی تختے اور کمزور بادبان سے مسلح تھا۔ وہ ابھی اس کی عافیت کے لیے دعا مانگ رہی تھی کہ یہاں کی ایک اس کی نگاہیں گہرے اندر ہیرے میں ایک شکستہ جھونپڑی کے سائے کی طرف اٹھیں جو تاروں سے محروم آسمان کی طرف ہاتھ پھیلائے لرز رہا تھا۔

اس جھونپڑی میں روشنی کا نام نہ تھا۔ کمزور دروازہ کسی نامعلوم خوف کی وجہ سے تھر تھر کا نپ رہا تھا۔ تنکوں کی چھت ہوا کے دباو تلے دوہری ہو رہی تھی۔

”آہ! خدا معلوم بیچاری بیوہ کا کیا حال ہے۔۔۔ اسے کئی روز سے بخار آ رہا ہے۔“ ماہی گیر کی بیوی زیر لب گلنگانی اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید کسی روز وہ بھی اپنے خاوند سے محروم ہو جائے۔۔۔ کانپ اٹھی۔ وہ شکستہ جھونپڑی ایک بیوہ کی تھی جو اپنے دو کم سن بچوں سمیت روئی کے قحط میں اپنی موت کی گھریاں کاٹ رہی تھی۔ مصیبت کی چلقتی ہوئی دھوپ میں اس پر کوئی سایہ کرنے والا نہ تھا۔ رہا سہارا دو ننھے بچے تھے جو ابھی مشکل سے چل پھر سکتے تھے۔

ماہی گیر کی بیوی کے دل میں ہمدردی کا جذبہ املا۔۔۔ بارش سے بچاؤ کے لیے سر پر ٹاٹ کا ایک ٹکڑا رکھ کر ایک اندر ہی لاٹھیں روشن کرنے کے بعد وہ جھونپڑی کے پاس پہنچی اور دھڑکتے ہوئے دل سے دروازے پر دستک دی۔۔۔ لہروں کا شور اور تیز ہواں کی چیخ و پکار اس کا جواب تھی۔ وہ کانپی اور خیال کیا کہ شاید اس کی اچھی ہمسایہ گھری نیند سور ہی ہے۔ اس نے ایک بار پھر آواز دی۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر جواب پھر خاموش تھا۔۔۔ کوئی صدا، کوئی جواب، اس جھونپڑی کے بوسیدہ لبوں پر نمودار نہ ہوا۔ یکیک دروازہ، جیسے اس بے جان چیز نے رحم کی لہر محسوس کی ہو۔ متحرک ہوا اور کھل گیا۔

ماہی گیر کی بیوی جھونپڑی کے اندر داخل ہوئی اور اس خاموش قبر کو اندھی لالٹین سے روشن کر دیا۔ جس میں اہروں کے شور کے سوا مکمل سکوت طاری تھا۔ پتلی چھت سے بارش کے قطرے بڑے بڑے آنسوؤں کی صورت میں سیاہ زمین کو ترکر رہے تھے۔۔۔ فضا میں ایک مہبیب خوف سانس لے رہا تھا۔

ماہی گیر کی بیوی اس خوفاک سماں کو دیکھ کر جو جھونپڑی کی چار دیواری میں سملا ہوا تھا۔ سرتاپا ارتقاش بن کر رہ گئی۔ آنکھوں میں گرم گرم آنسو چھلکے اور بے اختیار اچھل کر بارش کے ٹپکے ہوئے قطروں کے ساتھم آغوش ہو گئے۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور دردناک آوار میں کہنے لگی، ”آہ۔۔۔! تو ان بوسوں کا جو جسم کو راحت بخستہ ہیں۔ ماں کی محبت، گیت، تبسم، ہنسی اور ناج کا ایک ہی انعام ہے۔۔۔ یعنی قبر۔۔۔! آہ، میرے خدا۔“

اس کے سامنے پھوس کے بستر پر بیوہ کی سرد لاش اکٹھی ہوئی تھی اور اس کے پہلو میں دونچھے محو نواب تھے۔ لاش کے سینے میں ایک آہ کچھ کہنے کو رکھی ہوئی تھی۔ اس کی پتھرائی آنکھیں جھونپڑی کی خستہ چھت کو چیر کر تاروں سے محروم آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں جیسے انہیں کچھ پیغام دینا ہو۔ ماہی گیر کی بیوی اس وحشت خیز منظر کو دیکھ کر چلا اٹھی۔ تھوڑی دیر دیوانہ وارادھر ادھر گومی۔ یہاں کیک اس کی نمناک آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی اور اس نے لپک کر لاش کے پہلو سے کچھ چیز اٹھا کر اپنی چادر میں لپیٹ لی اور اس دار لختر سے لڑکھراتی ہوئی اپنی جھونپڑی میں چلی آئی۔

چہرے کے بد لے ہوئے رنگ اور لرزائ ہاتھوں سے اس نے اپنی جھوٹی کو میلے بستر پر خالی کر دیا اور اس پر سچھٹی ہوئی چادر ڈال دی۔ تھوڑی دیر بیوہ سے چھینی ہوئی چیز کی طرف دیکھ کر وہ اپنے بچوں کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔ مطلع سمندر کے افق پر سپید ہو رہا تھا۔ سورج کی دھنڈی کرن نیں تارکی کا تعاقب کر رہی تھیں۔ ماہی گیر کی بیوی بیٹھی اپنے احساں حرم کے شکستہ تارچھیتر رہی تھی۔ ان غیر مربوط الفاظ کے ساتھ سنہری لہریں اپنی مغموم تانیں چھیڑتھیں۔

”آہ! میں نے بہت برا کیا ہے! اب اگر وہ مجھے مارے تو مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔۔۔ یہ بھی عجیب ہے کہ میں اس سے خائف ہوں جس سے محبت کرتی ہوں۔۔۔ کیا واپس چھوڑ آؤں۔۔۔؟ نہیں۔۔۔ شاید وہ معاف کر دے۔“ وہ اسی قسم کے خیالات میں غلط اور پیچاں بیٹھی ہوئی تھی کہ ہوا کے زور سے دروازہ ہلا۔ یہ دیکھ کر اس کا لکیجہ دھک سے رہ گیا۔ اٹھی اور کسی کونہ پا کر پھر وہیں متفرگ بیٹھ گئی۔

”ابھی نہیں۔۔۔ بیچارہ۔۔۔ اسے ان پھوٹ کیلئے کتنی تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔۔۔ اکیلے آدمی کو سات پیٹ پالنے پڑتے ہیں اور۔۔۔ مگر یہ شور کیا ہے؟“

یہ آواز چینی ہوئی ہوا کی تھی۔ جو جھونپڑی کے ساتھ رگڑ کر گزر رہی تھی۔

”اس کے قدموں کی چاپ۔۔۔ آہ! نہیں، ہوا ہے۔“ یہ کہ کروہ پھر اپنے اندر ورنی غم میں ڈوب گئی۔ اب اس کے کانوں میں ہوا اول اور لہروں کا شور مفقود ہو گیا۔۔۔ سینے میں مختلف خیالات کا تصادم کیا کم شور تھا۔

آبی جانور ساحل کے آس پاس چلا رہے تھے۔ پانی میں گھسے ہوئے سنگ ریزے ایک دوسرے سے ٹکرایکر کھنکھنارہ ہے تھے۔ کشتی کے چپپوں کی آواز صح کی خاموش فضائی کو مرتعش کر رہی تھی۔۔۔ ماہی گیر کی بیوی کشتی کی آمد سے بے خبر اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔

دفعتاً دروازہ ایک شور کے ساتھ کھلا۔۔۔ صح کی دھنڈی شعاعیں جھونپڑی میں تیرتی ہوئی داخل ہو گئیں۔ ساتھ ہی ماہی گیر کا ندھوں پر ایک بڑا جال ڈالے دہلیز پر نمودار ہوا۔ اس کے کپڑے رات کی بارش اور سمندر کے نمکین پانی سے شرابور ہو رہے تھے۔ آنکھیں کم خوابی کی وجہ سے اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ جسم سردی اور غیر معمولی مشقت سے اکڑا ہوا تھا۔

”نسیم کے ابا، تم ہو!“ ماہی گیر کی بیوی چونک اٹھی۔ اور عاشقانہ بیتابی سے اپنے خاوند کو چھاتی سے لگالیا۔

”ہاں میں ہوں پیاری۔“

یہ کہتے ہوئے ماہی گیر کے کشادہ مگر مغموم چہرے پر مسرت کی ایک دھنڈی سی روشنی چھا گئی۔ وہ مسکرا یا۔۔۔ بیوی کی محبت نے اس کے دل سے رات کی کلفت کا خیال محو کر دیا تھا۔

”موسم کیسا تھا؟“ بیوی نے محبت بھرے لجے میں دریافت کیا۔“

”تند!“

”محصلیاں ہاتھ آئیں؟“

”بہت کم---! آج رات تو سمندر قزاقوں کے گروہ کے مانند تھا۔“

یہ سن کر اس کی بیوی کے چہرے پر مردی چھائی۔ ماہی گیر نے اسے مغموم دیکھا اور مسکر کر بولا، ”تو میرے پہلو میں ہے--- میرا دل خوش ہے۔“

”ہوا تو بہت تیز ہو گی؟“

”بہت تیز، معلوم ہو رہا تھا کہ دنیا کے تمام شیطان مل کر اپنے منہوس پر پھر پھر اڑا رہے ہیں--- جال ٹوٹ گیا۔ رسیاں کٹ گئیں اور کشتی کامنہ بھی ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔“ پھر اس گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے بولا، ”مگر تم شب بھر کیا کرتی رہی ہو پیاری؟“

بیوی کسی چیز کا خیال کر کے کانپی اور لرزائ آواز میں جواب دیا، ”میں---! آہ، کچھ بھی نہیں--- سیتی پروتی رہی، تمہاری راہ تکمیلی رہی--- لہریں بچلی کی طرح کڑک رہی تھیں--- مجھے ڈر لگ رہا تھا۔“

”ڈر---! ہم لوگوں کو ڈر کس بات کا---“

”اور ہاں، ہماری ہمسایہ بیوہ مر گئی ہے۔“ بیوی نے اپنے خاوند کی بات کا ٹتے ہوئے کہا۔
”ماہی گیر نے یہ دردناک خبر سنی۔ مگر اسے کچھ تجھب نہ ہوا۔ شاید اس لئے کہ وہ ہر گھنٹی اس عورت کی موت کی خبر سننے کا متوقع تھا۔ اس نے آہ بھری اور صرف اتنا کہا، ”بیچاری سدھار گئی!“

”ہاں دونپچھے چھوڑ گئی ہے۔ جو لاش کے پاس لیٹے ہوئے ہیں۔“

یہ سن کر ماہی گیر کا جسم زور سے کانپا اور اس کی صورت سنجیدہ و متقلکر ہو گئی۔ ایک کونے میں اپنی اونی ٹوپی، جو پانی سے بھیک رہی تھی پھینک کر سر کھجلانا شروع کر دیا۔ اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اپنے آپ سے بولا، ”پانچ بچے تھے۔ اب سات ہو گئے۔۔۔ اس سے پیشتر، ہی اس تند موسم میں ہمیں دو وقت کا کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا۔۔۔ اب، مگر خیر۔۔۔ یہ میرا قصور نہیں، اس قسم کے حوادث بہت گہرے معانی رکھتے ہیں۔“

وہ کچھ عرصے تک اسی طرح اپنا سر گھٹنوں میں دبائے سوچتا رہا۔ اسے یہ سمجھنا آتا تھا کہ خدا نے ان بچوں سے جو اس کی مٹھی کے برابر بھی نہیں، ماں کیوں چھین لی ہے۔۔۔؟ ان بچوں سے جونہ کام کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی چیز کی خواہش کر سکتے ہیں۔ اس کا دماغ ان سوالوں کا کوئی حل نہ پیش کر سکا۔ وہ بڑا بڑا ہوا اٹھا۔

”شاید ایسی چیزوں کو ایک پڑھا لکھا ہی سمجھ سکتا ہے۔“ اور پھر اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر بولا، ”پیاری جاؤ انہیں یہاں لے آؤ۔ وہ کس قدر وحشت زده ہوں گے اگر صحیح اپنی ماں کی لاش کے پاس بیدار ہوئے۔ ان کی ماں کی روح سخت بے قرار ہو گی۔۔۔ جاؤ انہیں ابھی لے کر آؤ۔“

یہ کہہ کر وہ دل میں سوچنے لگا کہ وہ ان بچوں کو اپنی اولاد کی طرح پالے گا۔ وہ بڑے ہو کر اس کے گھٹنوں پر چڑھنا سیکھ جائیں گے۔ خدا ان اجنبیوں کو جھوپڑی میں دیکھ کر بہت خوش ہو گا اور انہیں زیادہ کھانے کو عطا کرے گا۔

”تمہیں فکر نہیں کرنی چاہیے پیاری۔۔۔ میں زیادہ محنت سے کام کروں گا۔“ اور پھر اپنی بیوی کو چارپائی کی طرف رو انہ ہوتے ہوئے دیکھ کر بلند آواز میں کہنے لگا، ”مگر تم سوچ کیا رہی ہو۔۔۔ اس دھیمی چال سے نہیں چلتا چاہیے تمہیں۔“

ماہی گیر کی بیوی نے چارپائی کے پاس پہنچ کر چادر کو والٹ دیا۔

”وہ تو یہ ہیں۔“

دو بچے صحیح کی طرح مسکرا رہے تھے۔

سن اکتیس کے شروع ہونے میں صرف رات کے چند برفائے ہوئے گھنٹے باقی تھے۔ وہ حاف میں سردی کی شدت کے باعث کانپ رہا تھا۔ پتلون اور کوٹ سمیت لیتا تھا، لیکن اس کے باوجود سردی کی لہریں اس کی ہڈیوں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کمرے کی سبز روشنی میں جو سردی میں اضافہ کر رہی تھی، زور زور سے ٹھہننا شروع کر دیا کہ اس کا دوران خون تیز ہو جائے۔

تحوڑی دیریوں چلنے پھرنے کے بعد جب اس کے جسم کے اندر تھوڑی سی حرارت پیدا ہو گئی تو وہ آرام کر سی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلاگا کر اپنے دماغ کو ٹھونکہ بالکل خالی تھا، اس لیے اس کی قوتِ سامعہ بہت تیز تھی۔ کمرے کی ساری کھڑکیاں بند تھیں، مگر وہ باہر گلی میں ہوا کی مدد میں مدد گتھنا ہٹ بڑی آسانی سے سن سکتا تھا۔ اس گتھنا ہٹ میں اسے انسانی آوازیں سنائی دیں۔ ایک دبی دبی چیخ دسمبر کی آخری رات کی خاموشی میں چاہک کے اول کی طرح ابھری، پھر کسی کی اتجائیہ آواز لرزی۔۔۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کھڑکی کی درز میں سے باہر کی طرف دیکھا۔

وہی۔۔۔ وہی اڑ کی یعنی سوداگروں کی نوکرانی میو نسلی کی لاٹھیں کے نیچے کھڑی تھی۔ صرف ایک سفید بنیان پہنچنے لیمپ کی روشنی میں یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کے بدنبال پر برف کی ایک پتی سی تہہ جم گئی ہے۔ اس کے بنیان کے نیچے، اس کی بد نما چھاتیاں، ناریلوں کے مانند لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ اس انداز میں کھڑی تھی، گویا ابھی ابھی کشتنی سے فارغ ہوئی ہے۔ ایسی حالت میں دیکھ کر سعید کے صناعاتہ جذبات کو دھچکا سا لگا۔ اتنے میں کسی مرد کی بھنچی بھنچی آواز سنائی دی، ”خدا کے لیے اندر چلی آؤ۔۔۔ کوئی دیکھ لے گا تو آفت ہی آجائے گی۔۔۔ وحشتی بلی کی طرح اس نے غرا کر جواب دیا۔ ”میں نہیں آؤں گی۔۔۔ بس ایک بار جو کہہ دیا کہ نہیں آؤں گی۔“

سوداگر کے بچے نے اتجائے طور پر اس سے کہا، ”خدا کے لیے اوپنچے نہ بولو، کوئی سن لے گا، راجو۔“

تو اس کا نام راجو تھا۔ راجو نے اپنی لنڈوری چھیا کو جھٹکا دے کر کہا، ”سن لے۔۔۔ ساری دنیا سن لے۔۔۔ خدا کرے ساری دنیا سن لے۔۔۔ اگر تم مجھے یوں ہی اپنے کمرے کے اندر آنے کو کہتے رہو گے، تو میں خود محلے بھر کو جگا کر سب کچھ کہہ دوں گی۔“

راجو اس کو نظر آرہی تھی، مگر وہ جس سے مخاطب تھی وہ اس کی نظر دوں سے اوچھل تھا۔ اس نے بڑی درز سے راجو کو دیکھا، اس کے بدن پر جھر جھری سی طاری ہو گی۔ اگر وہ ساری کی ساری ننگی ہوتی تو شاید اس کے صناعانہ جذبات کو ٹھیس نہ پہنچتی۔ لیکن اس کے جسم کے وہ حصے جو ننگے تھے، دوسرے مستور حصوں کو عربیانی کی دعوت دے رہے تھے۔ راجو میو نسپٹی کی لاٹھیں کے نیچے کھڑی تھی اور اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ عورت کے متعلق اس کے جذبات اپنے کپڑے اتار رہے ہیں۔

راجو کی غیر متناسب بانجھیں، جو کاندھوں تک ننگی تھیں، نفرت انگیز طور پر لکھ رہی تھیں۔ مردانہ بنیان اور گول گلے میں سے اس کی نیم پختہ ڈبل روٹی ایسی موٹی اور نرم چھاتیاں، کچھ اس انداز سے باہر جھانک رہی تھیں، گویا سبزی تزکاری کی ٹوٹی ہوئی ٹوکری میں سے گوشت کے ٹکڑے دکھائی دے رہے ہوں۔ زیادہ استعمال سے گھسی ہوئی تپلی بنیان کا نچلا گھیر اخود بخود اوپر کواٹھ گیا تھا۔ اور راجو کی ناف کا گڑھا، اس کے خمیرے آٹے ایسے پھولے ہوئے پیٹ پر یوں دکھائی دیتا تھا۔ جیسے کسی نے انگلی کھبودی ہو۔

یہ نظارہ دیکھ کر اس کے دماغ کا ذائقہ خراب ہو گیا۔ اس نے چاہا کہ کھڑکی سے ہٹ کر اپنے بستر پر لیٹ جائے، اور سب کچھ بھول بھال کر سو جائے لیکن جانے کیوں، وہ سوراخ پر آنکھیں جھائے کھڑا رہا؟ راجو کو اس حالت میں دیکھ کر اس کے دل میں کافی نفرت پیدا ہو گئی تھی۔۔۔ شاید وہ اسی نفرت کی وجہ سے اس سے دلچسپی لے رہا تھا۔

سوداگر کے سب سے چھوٹے لڑکے نے جس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ ہو گی، ایک بار پھر التجاہیہ لجھ میں کہا، ”راجو خدا کے لیے اندر چلی آؤ۔۔۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ پھر کبھی تمھیں نہیں ستاؤں گا۔۔۔ لو اب مان جاؤ۔۔۔ یہ تمہاری بغل میں وکیلوں کا مکان ہے، ان میں سے کسی نے دیکھایا سن لیا تو بڑی بد نامی ہو گی۔“

راجو خاموش رہی لیکن تھوڑی دیر کے بعد بولی، ”مجھے میرے کپڑے لادو۔۔۔ بس اب میں تمہارے گھر میں نہیں رہوں گی۔۔۔ ننگ آگئی ہوں۔۔۔ کل سے وکیلوں کے ہاں نوکری کر لوں گی۔۔۔ سمجھے۔۔۔؟ اب اگر تم نے مجھ سے کچھ اور کہا تو خدا کی قسم شور مچانا شروع کر دوں گی۔۔۔ میرے کپڑے چپ چاپ لائے دے دو۔“

سوداگر کے لڑکے کی آواز آئی، ”لیکن تم رات کہاں کاٹو گی؟“

راجونے جواب دیا، ”جہنم میں۔ تھیں اس سے کیا۔۔۔ جاؤ تم اپنی بیوی کی بغل گرم کرو۔۔۔ میں کہیں نہ کہیں سو جاؤں گی۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ سچ مجھ رورہی تھی۔

سوراخ پر سے آنکھ ہٹا کر وہ پاس پڑی کر سی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ راجو کی آنکھوں میں آنسود کیچھ کرا سے عجیب قسم کا صدمہ ہوا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس صدمے کے ساتھ وہ نفرت بھی لپٹی ہوئی تھی جو راجو کو اس حالت میں دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی، مگر غایت درجہ نرم دل ہونے کے باعث وہ پگھل سا گیا۔ راجو کی ہلاڑی آنکھوں میں، جوشیش کے مرتبان میں چک دار چھمیلوں کی طرح سدا متھر کر رہتی تھیں آنسود کیچھ کرا س کا جی چاہا کہ انھیں تھپکا کر دلا سادے۔

راجو کی جوانی کے چار قیمتی برس سوداگر بھائیوں نے معمولی چٹائی کی طرح استعمال کیے تھے۔ ان برسوں میں تینوں بھائیوں کے نقش قدم کچھ اس طرح خلط ملط ہو گئے تھے کہ ان میں سے کسی کو اس بات کا خوف نہیں رہا تھا کہ کوئی ان کے پیروں کے نشان پہچان لے گا اور راجو کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے قدموں کے نشان دیکھتی تھی نہ دوسروں کے۔

اسے بس چلتے جانے کی دھن تھی کسی بھی طرف۔ پر اب شاید اس نے مڑ کے دیکھا تھا۔۔۔ مڑ کے اس نے کیا دیکھا تھا جو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔۔۔ یہ اس کو معلوم نہیں تھا۔

باہر سن تیس کی آخری رات دم توڑ رہی تھی اور اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

وہ کہاں گئی۔۔۔ کیا وہ اندر چلی گئی۔۔۔ کیا وہ مان گئی تھی۔۔۔؟ مگر سوال یہ تھا کہ وہ کس بات پر جھگڑی تھی۔۔۔؟ راجو کے کانپتے ہوئے نتھنے ابھی تک اس کو نظر آرہے تھے۔۔۔ ضرور اس کے اور سوداگر کے لڑکے کے درمیان، جس کا نام محمود تھا کسی بات پر جھگڑا ہوا تھا جبھی تو وہ دسمبر کی خون منجمد کر دینے والی رات میں صرف ایک بنیان اور شلوار کے ساتھ باہر نکل آئی تھی اور اندر جانے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ راجو کو دیکھ کر اس کے ایک نامعلوم جذبے کو تو سکین پہنچی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں رحم کے جذبات بھی پیدا ہوئے تھے۔۔۔ کسی عورت سے اس نے کبھی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ شاید اسی لیے وہ راجو کو دیکھنا چاہتا تھا تاکہ وہ اس سے اپنی ہمدردی کا اظہار کر سکے۔

اسے لقین تھا کہ اگر وہ راجو کے قریب ہونا چاہئے گا تو وہ جنگلی گھوڑی کی طرح بد کے گی نہیں۔ راجو غلاف چڑھی عورت نہیں تھی۔ وہ جیسی بھی تھی دور سے نظر آ جاتی تھی۔ اس کی بھدی اور موٹی ہنسی جو اکثر اس کے مٹ میلے ہو نہیں پر پھوٹ کے ٹوٹے ہوئے گھروندے کے مانند نظر آتی تھی، اصلی ہنسی تھی۔۔۔ بڑی صحت مند۔۔۔ اور اب اس کی بھونزے جیسی متحرک آنکھوں نے آنسو اگلے تھے، تو ان میں کوئی مصنوعی پن نہیں تھا۔

راجو کو وہ ایک مدت سے جانتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے چہرے کے تمام خطوط تبدیل ہوئے تھے اور وہ غیر محسوس طریق پر لڑکی سے عورت بننے کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تین سو دا گر بھائیوں کو ہجوم نہیں سمجھتی تھی۔۔۔ یہ ہجوم اسے پسند نہیں تھا، اس لیے کہ ایک عورت کے ساتھ وہ صرف ایک مردمسلک دیکھنے کا قائل تھا۔۔۔ مگر یہاں۔۔۔ یعنی راجو کے معاملے میں اسے پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے درمیان رک جانا پڑتا تھا۔

اس واقعے کے دوسرے روز جب وہ جاگ رہا تھا لاف اوڑھے لیٹا تھا کہ راجو آئی۔ اس نے کمرہ صاف کیا۔ اس نے یہ سمجھا کہ شاید جمدادار ہے۔۔۔ جو آج جلدی آگیا ہے۔ چنانچہ اس نے لحاف کے اندر سے کہا، ”دیکھو بھتی۔۔۔ گرد مٹ اڑانا۔“

ایک نسوانی آواز اس کو سنائی دی، ”جی میں۔۔۔ جی میں میں تو۔۔۔“

اس نے لحاف اپنے سے جدا کیا اور دیکھا کہ راجو ہے۔۔۔ وہ بہت متیر ہوا۔ چند لمحات وہ اس کو دیکھتا رہا۔۔۔ اس کے بعد اس سے مخاطب ہوا، ”تم یہاں کیسے آئی ہو؟“

راجو نے جھاڑن اپنے کا ندھے پر رکھا اور جواب دیا، ”میں آج صحیح یہاں آئی ہوں۔ سو دا گروں کی نوکری میں نے چھوڑ دی ہے۔“ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔۔۔ بہر حال اس نے اتنا کہہ دیا، ”اچھا کیا۔۔۔ اب کیا تم نے ہمارے یہاں ملازمت اختیار کر لی ہے؟“

”جی ہاں۔۔۔“ یہ اس کا مختصر جواب تھا۔

اس کو راجو سے سخت نفرت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے گھر میں اس کا کسی قسم کا دخل نہ ہو لیکن اس کی والدہ نے جو بہت رحم دل تھیں اور جنہیں نوکرانی کی ضرورت بھی تھی راجو کو ملازم رکھ لیا تھا۔ اس کو بڑی الجھن محسوس ہوئی کہ وہ رات کا تماشادیکھا تھا۔۔۔ اس سے

نفرت تھی۔۔۔ اس قدر نفرت کو وہ چاہتا تھا کہ وہ اس کی نظر وہ کے سامنے نہ آئے۔ مگر وہ آتی تھی۔۔۔ صح ناشہ لے کر آتی۔۔۔ شیوکا سامان لے کر آتی۔ دوپہر کا کھانا پیش کرتی۔ مگر اس کو یہ سب باتیں بہت ناگوار گزر تیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ راجو اس سے اس قسم کا سلوک کرے۔

چنانچہ ایک دن اس نے تنگ آ کر اس سے کہا، ”دیکھو راجو، مجھے تمہاری ہمدردیاں پسند نہیں۔۔۔ میں اپنا کام خود کر سکتا ہوں۔۔۔ تم مہربانی کر کے تکلیف نہ کیا کرو۔“ راجونے بڑی متنانت سے کہا، ”سر کار۔۔۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔۔۔ میں تو آپ کی بامدی ہوں۔“ وہ جھینپ سا گیا، ”ٹھیک ہے۔۔۔ تم نو کرانی ہو۔۔۔ بس اس کا خیال رکھو۔“

راجونے تپائی کا کپڑا ٹھیک کرتے ہوئے کہا، ”جی مجھے ہر چیز کا خیال ہے۔۔۔ مجھے اس بات کا بھی خیال ہے کہ آپ مجھے اچھی نظر وہ سے نہیں دیکھتے۔“

وہ لوٹ پوٹ گیا، ”میں۔۔۔ میں تمھیں اچھی نظر وہ سے کیوں نہیں دیکھتا۔۔۔ یہ تم نے کیسے جانا؟“

راجو مسکراتی، ”حضور آپ امیر آدمی ہیں۔۔۔ آپ کو ہم غریبوں کے دکھ درد کا کوئی احساس نہیں ہو سکتا۔“

اس کو راجو سے اور نفرت ہو گئی۔ وہ سمجھنے لگا کہ یہ لڑکی جو اس کے گھر میں اس کی والدہ کی نرم طبیعت کی وجہ سے آگئی ہے، بہت واہیات ہے۔

راجو بڑی باقاعدگی سے کام کرتی رہی۔۔۔ اس کا کوئی نقش نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

جب اس کی شادی کا سوال اٹھا تو وہ بہت مضطرب ہوا۔ وہ اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔۔۔ اس نے اپنے والدین سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ مجھے یہ جھنجھٹ ابھی نہیں چاہیے۔ اس کے والدین نے بہت زور دیا کہ وہ شادی کر لے مگر وہ نہ مانا۔۔۔ اسے کوئی لڑکی پسند نہیں آتی تھی۔

ایک دن وہ گھر سے غائب ہو گیا۔۔۔ اس کے ساتھ راجو بھی۔۔۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ وہ میاں بیوی بن چکے ہیں۔

خوشیا سوچ رہا تھا۔۔۔

پنوٹری سے کالے تمباکو والا پان لے کر وہ اس کی دکان کے ساتھ اس سنگین چبوتے پر بیٹھا تھا، جو دن کے وقت ٹاروں اور موڑوں کے مختلف پرزوں سے بھرا ہوتا ہے۔ رات کو ساڑھے آٹھ بجے کے قریب موڑ کے پرزے اور ٹار بینچے والوں کی یہ دکان بند ہو جاتی ہے۔ اور اس کا سنگین چبوتہ خوشیا کے لیے خالی ہو جاتا ہے۔

وہ کالے تمباکو والا پان آہستہ آہستہ چبارہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ پان کی گاڑھی تمباکو ملی پیک اس کے دانتوں کی رینوں سے نکل کر اس کے منہ میں ادھر ادھر پھسل رہی تھی۔ اور اسے ایسا لگتا تھا کہ اس کے خیال، دانتوں تلے پس کر اس کی پیک میں گھل رہے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اسے پھینکنا نہیں چاہتا تھا۔

خوشیا پان کی پیک منہ میں پلپلارہا تھا۔ اور اس واقعہ پر غور کر رہا تھا جو اس کے ساتھ پیش آیا تھا۔ یعنی آدھ گھنٹہ پہلے۔

وہ اس سنگین چبوتے پر حسبِ معمول بیٹھنے سے پہلے کھیت واڑی کی پانچویں گلی میں گیا تھا۔ منگور سے جونئی چھو کری کانتا آئی تھی۔ اسی گلی کے نکٹ پر رہتی تھی۔ خوشیا سے کسی نے کہا تھا کہ وہ اپنا مکان تبدیل کر رہی ہے چنانچہ وہ اسی بات کا پتہ لگانے کے لیے وہاں گیا تھا۔ کانتا کی کھوی کا دروازہ اس نے کھٹکھایا۔ اندر سے آواز آئی ”کون ہے؟“ اس پر خوشیا نے کہا، ”میں خوشیا“

آواز دوسرے کمرے سے آئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا خوشیا اندر داخل ہوا۔ جب کانتا نے دروازہ اندر سے بند کیا تو خوشیا نے مڑ کر دیکھا۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے کانتا کو بالکل نیگاہی سمجھو۔ کیونکہ وہ اپنے انگ کو صرف ایک تو لیے سے چھپائے ہوئے تھی، چھپائے ہوئے بھی نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ چھپانے کی جتنی چیزیں ہوتی ہیں وہ تو سب کی سب خوشیا کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے تھیں۔

”کہو خوشیا کیسے آئے۔۔۔؟ میں بس اب نہانے والی ہی تھی۔ بیٹھو بیٹھو۔۔۔ باہر والے سے اپنے لیے چائے کا تو کہہ آئے ہوتے۔۔۔ جانتے تو ہو وہ موارد ایسا ہے جہاگ گیا ہے۔“

خوشیا جس کی آنکھوں نے کبھی عورت کو یوں، اچانک طور پر نگاہ نہیں دیکھا تھا، بہت گھبر آگیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے؟ اس کی نظریں جو ایک دم عربیانی سے دوچار ہو گئی تھیں، اپنے آپ کو کہیں چھپانا چاہتی تھیں۔

اس نے جلدی جلدی صرف اتنا کہا، ”جاو۔۔۔ جاؤ تم نہاوا، پھر ایک دم اس کی زبان کھل گئی“، ”پر جب تم ننگی تھیں تو دروازہ کھولنے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔؟ اندر سے کہہ دیا ہوتا میں پھر آ جاتا۔۔۔ لیکن جاؤ۔۔۔ تم نہاوا۔“

کانتا مسکرائی، ”جب تم نے کہا خوشیا ہے۔ تو میں نے سوچا۔ کیا ہرج ہے۔ اپنا خوشیا ہی تو ہے آنے دو۔۔۔“

کانتا کی یہ مسکراہٹ ابھی تک خوشیا کے دل و دماغ میں تیر رہی تھی۔ اس وقت بھی کانتا کا ننگا جسم موم کے پتلے کی مانند اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا اور پکھل پکھل کر اس کے اندر جا رہا تھا۔

اس کا جسم خوبصورت تھا۔ پہلی مرتبہ خوشیا کو معلوم ہوا کہ جسم بیچنے والی عورت تیں بھی ایسا سڈول بدن رکھتی ہیں۔ اس کو اس بات پر حیرت ہوئی تھی۔ پرسب سے زیادہ تعجب اسے اس بات پر ہوا تھا کہ ننگ دھڑنگ وہ اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اور اس کو لاج تک نہ آئی۔ کیوں؟ اس کا جواب کانتا نے یہ دیا تھا، ”جب تم نے کہا خوشیا ہے۔ تو میں نے سوچا کیا ہرج ہے۔ اپنا خوشیا ہی تو ہے۔۔۔ آنے دو۔“

کانتا اور خوشیا ایک ہی پیشے میں شریک تھے۔ وہ اس کا دلال تھا۔ اس لحاظ سے وہ اسی کا تھا۔۔۔ پر یہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اس کے سامنے ننگی ہو جاتی۔ کوئی خاص بات تھی۔ کانتا کے الفاظ میں خوشیا کوئی اور ہی مطلب کریں رہا تھا۔ یہ مطلب بیک وقت اس قدر صاف اور اس قدر مبہم تھا کہ خوشیا کسی خاص نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اس وقت بھی وہ کانتا کے ننگے جسم کو دیکھ رہا تھا، جو ڈھونکی پر منڈھے ہوئے چڑے کی طرح تباہ اتھا۔ اس کی لڑکتی ہوئی نگاہوں سے بالکل بے پرواں! کئی بار حیرت کے عالم میں بھی اس نے اس کے سانوں سلو نے بدن پر ٹوہ لینے والی نگاہیں گاڑی تھیں مگر اس کا ایک روایتک بھی نہ کپکل پایا تھا۔ بس سانوں پر پتھر کی مورتی کی مانند کھڑی رہی۔ جواہس س سے عاری ہو۔

”بھی! ایک مرد اس کے سامنے کھڑا تھا۔۔۔ مرد جس کی نگاہیں کپڑوں میں بھی عورت کے جسم تک پہنچ جاتی ہیں اور جو پرماننجانے خیال ہی خیال میں کہاں کہاں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن وہ ذرا بھی نہ گھبرائی اور۔۔۔ اور اس کی آنکھیں ایسا سمجھ لو کہ ابھی لانڈری سے ڈھل کر آئی ہیں۔۔۔ اس کو تھوڑی سی لاج تو آنچا چاہیے تھی۔ ذرا سی سرخی تو اس کے دیدوں میں پیدا ہوئی چاہیے۔ مان لیا کبی تھی۔ پرسیاں یوں ننگی تو نہیں کھڑی ہو جاتیں۔“

دوسراں اس کو دلائی کرتے ہو گئے تھے۔ اور ان دس برسوں میں وہ پیشہ کرانے والی لڑکیوں کے تمام رازوں سے واقف ہو چکا تھا۔ مثال کے طور پر اسے یہ معلوم تھا کہ پائے دھونی کے آخری سرے پر جو چھو کری ایک نوجوان لڑکے کو بھائی بنانے کا رہتی ہے، اس لیے اچھوت کنیا ماریکاڑھ کا ہے کرتا مور کھپیار، پیار، پیار، اپنے ٹوٹے ہوئے باجے پر بجا کرتی ہے کہ اسے اشوک کمار سے بہت بڑی طرح عشق ہے۔ کئی من چلے لوئے اشوک کمار سے اس کی ملاقات کرانے کا جہانسہ دے کر اپنا الوسید ہا کر چکے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دادر میں جو پنجابن رہتی ہے صرف اس لیے کوٹ پتلوں پہنچتی ہے کہ اس کے ایک یارے اس سے کہا تھا کہ تیری ٹانگیں تو بالکل اس انگریز ایکٹر س کی طرح ہیں جس نے ”مرا کو عرف خونِ تمثنا“ میں کام کیا تھا۔ یہ فلم اس نے کئی بار دیکھی اور جب اس کے یارے کہا کہ مار لین ڈیڑھ اس لیے پتلوں پہنچتا ہے کہ اس کی ٹانگیں بہت خوبصورت ہیں، اور ان ٹانگوں کا اس نے دولاٹ کا نیمہ کرا رکھا ہے تو اس نے بھی پتلوں پہنچ شروع کر دی۔ جو اس کے چوتھوں میں بہت پھنس کر آتی تھی۔ اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ”مزگاؤں“ والی دکھشنی چھو کری صرف اس لیے کالج کے خوبصورت لوئزوں کو پھانستی ہے کہ اسے ایک خوبصورت بچے کی ماں بننے کا شوق ہے۔ اس کو یہ بھی پتہ تھا کہ وہ کبھی اپنی خواہش پوری نہ کر سکے گی، اس لیے کہ بانجھ ہے۔ اور اس کالی مدرسی کی بابت جو ہر وقت کا نوں میں ہیرے کی بوٹیاں پہنے رہتی تھی اس کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اس کا رنگ کبھی سفید نہیں ہو گا۔ اور وہ ان دواؤں پر بیکار روپیہ بر باد کر رہی ہے جو آئے دن خریدتی رہتی ہے۔

اس کو ان تمام چھو کریوں کا اندر باہر کا حال معلوم تھا جو اس کے حلے میں شامل تھیں۔ مگر اس کو یہ خبر نہ تھی کہ ایک روز کانتا کماری جس کا اصلی نام اتنا مشکل تھا کہ وہ عمر بھر یاد نہیں کر سکتا تھا، اس کے سامنے ننگی کھڑی ہو جائے گی۔ اور اس کو زندگی کے سب سے بڑے تعجب سے دوچار کرائے گی۔

سوچتے سوچتے اس کے منہ میں پان کی پیک اس قدر جمع ہو گئی تھی کہ اب وہ مشکل سے چھالیا کے ان نئے نئے ریزوں کو چبا سکتا تھا جو اس کے دانتوں کی ریخوں میں سے ادھر ادھر پھسل کر نکل جاتے تھے۔

اس کے نگ ماتھے پر سینے کی نئی نئی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں جیسے ململ میں پنیر کو آہستہ سے دبادیا گیا ہے۔۔۔ اس کے مردانہ وقار کو دھکا سا پنچتا تھا جب وہ کانتا کے ننگے جسم کو اپنے تصور میں لاتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا اپمان ہوا ہے۔

ایک دم اس نے اپنے دل میں کہا، ”بھی یہ اپمان نہیں ہے تو کیا ہے۔۔۔ یعنی ایک چھوکری نگ دھڑنگ سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور کہتی ہے اس میں حرج ہی کیا ہے۔۔۔؟ تم خوشیا ہی تو ہو۔۔۔ خوشیا نہ ہوا، سالا وہ بلا ہو گیا جو اس کے بستر پر ہر وقت او گھٹا رہتا ہے۔۔۔ اور کیا؟“

اب اسے یقین ہونے لگا کہ سچ مجھ اس کی ہنگ ہوئی ہے۔ وہ مرد تھا۔ اور اس کو اس بات کی غیر محسوس طریق پر موقع تھی کہ عورتیں خواہ شریف ہوں یا بازاری اس کو مرد ہی سمجھیں گی۔ اور اس کے اور اپنے درمیان وہ پرده قائم رکھیں گی جو ایک مدت سے چلا آ رہا ہے۔ وہ تو صرف یہ پتہ لگانے کے لیے کانتا کے یہاں گیا تھا کہ وہ کب مکان تبدیل کر رہی ہے؟ اور کہاں جا رہی ہے؟ کانتا کے پاس اس کا جانا یکسر بزنس سے متعلق تھا۔ اگر خوشیا کانتا کی بابت سوچتا کہ جب وہ اس کا دروازہ کھٹکھٹائے گا تو وہ اندر کیا کر رہی ہو گی تو اس کے تصور میں زیادہ سے زیادہ اتنی باتیں آسکتی تھیں۔

سر پر پٹی باندھے لیٹ رہی ہو گی۔

بلے کے بالوں میں سے پتوں نکال رہی ہو گی۔

اس بال صفا پوڈر سے اپنی بغلوں کے بال اڑا رہی ہو گی جو اتنی بس مارتا تھا کہ خوشیا کی ناک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

پلنگ پر اکیلی بیٹھی تاش پھیلائے پیشنس کھیلنے میں مشغول ہو گی۔

بس اتنی چیزیں تھیں جو اس کے ذہن میں آتیں۔ گھر میں وہ کسی کو رکھتی نہیں تھی۔ اس لیے اس بات کا خیال ہی نہیں آ سکتا تھا۔ پر خوشیا نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ تو کام سے وہاں گیا تھا کہ اچانک کانتا۔۔۔ یعنی کپڑے پہننے والی کانتا۔۔۔ مطلب یہ کہ وہ کانتا جس کو وہ ہمیشہ

پڑوں میں دیکھا کرتا تھا، اس کے سامنے بالکل ننگی کھڑی ہو گئی۔۔۔ بالکل ننگی ہی سمجھو۔ کیونکہ ایک چھوٹا سا تو یہ سب کچھ تو چھپا نہیں سکتا۔ خوشیا کو یہ نظارہ دیکھ کر ایسا محسوس ہوا تھا جیسے چھلکا اس کے ہاتھ میں رہ گیا ہے اور کیلے کا گودا پرچ کر کے اس کے سامنے آگرا ہے۔ نہیں اسے کچھ اور ہی محسوس ہوا تھا۔ جیسے۔۔۔ جیسے وہ خود ننگا ہو گیا ہے۔ اگر بات یہاں تک ہی ختم ہو جاتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ خوشیا پنی حیرت کو کسی نہ کسی حیلے سے دور کر دیتا۔ مگر یہاں مصیبت یہ آن بڑی تھی کہ اس لوڈیا نے مسکرا کر یہ کہا تھا، ”جب تم نے کہا۔ خوشیا ہے تو میں نے سوچا اپنا خوشیا ہی تو ہے آنے دو“۔۔۔ یہ بات اسے کھائے جا رہی تھی۔

”سامی مسکرا رہی تھی۔۔۔“ وہ بار بار بڑا تا جس طرح کانتا ننگی تھی اسی طرح اس کی مسکراہٹ خوشیا کو ننگی نظر آئی تھی۔ یہ مسکراہٹ ہی نہیں اسے کانتا کا جسم بھی اس حد تک نظر آیا تھا گویا اس پر رند اپھر ہوا ہے۔

اسے بار بار بچپن کے وہ دن یاد آرہے تھے جب پڑوں کی ایک عورت اس سے کہا کرتی تھی، ”خوشیا بیٹا جادوڑ کے جا، یہ بالٹی پانی سے بھر لा۔ جب وہ بالٹی بھر کے لایا کرتا تھا تو وہ دھوتی سے بنائے پردے کے پیچھے سے کہا کرتی تھی۔“ اندر آکے یہاں میرے پاس رکھ دے۔ میں نے منہ پر صابن ملا ہوا ہے۔ مجھے کچھ بھائی نہیں دیتا۔“ وہ دھوتی کا پردہ ہٹا کر بالٹی اس کے پاس رکھ دیا کرتا تھا۔ اس وقت صابن کے جھاگ میں لپٹی ہوئی ننگی عورت اسے نظر آیا کرتی تھی مگر اس کے دل میں کسی قسم کا یہجان پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”بھی میں اس وقت بچہ تھا۔ بالکل بھولا بھالا۔ نیچے اور مرد میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بچوں سے کون پر دہ کرتا ہے۔ مگر اب تو میں پورا مرد ہوں۔ میری عمر اس وقت اٹھائیں بر س کے قریب ہے۔ اور اٹھائیں بر س کے جوان آدمی کے سامنے تو کوئی بوڑھی عورت بھی ننگی کھڑی نہیں ہوتی۔“

کانتا نے اسے کیا سمجھا تھا۔ کیا اس میں وہ تمام باتیں نہیں تھیں جو ایک نوجوان مرد میں ہوتی ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کانتا کو یک بیک ننگ دھڑنگ دیکھ کر بہت گھبرایا تھا لیکن چورنگا ہوں سے کیا اس نے کانتا کی ان چیزوں کا جائزہ نہیں لیا جو روزانہ استعمال کے باوجود اصلی حالت پر قائم تھیں۔ اور کیا تجھ کے ہوتے ہوئے اس کے دماغ میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ دس روپے میں کانتا بالکل مہنگی نہیں۔ اور دسہرے کے روز بینک کا وہ منشی جو دوروپے کی رعایت نہ ملنے پرواپس چلا گیا تھا، بالکل گدھا تھا۔۔۔؟ اور۔۔۔ ان سب کے اوپر، کیا ایک لمح کے لیے اس کے تمام پٹھوں میں ایک عجیب قسم کا کھنچا پیدا نہیں ہو گیا تھا۔ اور اس نے ایک ایسی انگڑائی نہیں لینا چاہی تھی جس سے اس کی ٹڈیاں چھٹنے لگیں۔۔۔؟ پھر کیا وجہ تھی کہ منگور کی اس سانوںی چھوکری نے اس کو مرد نہ سمجھا اور صرف۔۔۔ صرف خوشیا سمجھ کر اس کو اپنا سب کچھ دیکھنے دیا؟

اس نے غصے میں آکر پان کی گاڑھی پیک ٹھوک دی جس نے فٹ پاتھ پر کئی بیل بوٹے بنادیے۔ پیک ٹھوک کروہ اٹھا اور ٹرام میں بیٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔

گھر میں اس نے نہاد ھو کرنی دھوتی پہنی۔ جس بلڈنگ میں رہتا تھا اس کی ایک دکان میں سیلوں تھا۔ اس کے اندر جا کر اس نے آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کی۔ پھر فوراً ہمیکجھ خیال آیا تو کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور بڑی سنجیدگی سے اس نے داڑھی منڈنے کے لیے جام سے کہا، ”آن چونکہ وہ دوسری مرتبہ داڑھی منڈوارا تھا۔ اس لیے جام نے کہا، ”ارے بھئی خوشیا بھول گئے کیا؟ صبح میں نے ہی تو تمہاری داڑھی منڈی تھی اس پر خوشیا نے بڑی متانت سے داڑھی پر المٹا تھے پھیرتے ہوئے کہا، ”کھونٹی اچھی طرح نہیں نکلی۔۔۔“

اچھی طرح کھونٹی نکلا اور چہرے پر پوڑر ملو اکروہ سیلوں سے باہر نکلا۔ سامنے ٹیکسیوں کا اڈا تھا۔ بمبئی کے مخصوص انداز میں اس نے ’چھی چھی‘ کر کے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور انگلی کے اشارے سے اسے ٹیکسی لانے کے لیے کہا۔ جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا تو ڈرائیور نے مڑ کر اس سے پوچھا، ”کہاں جانا ہے صاحب؟“

ان چار لفظوں نے اور خاص طور پر ’صاحب‘ نے خوشیا کو بہت مسرور کیا۔ مسکرا کر اس نے بڑے دوستانہ لہجہ میں جواب دیا، ”باتیں گے، پہلے تم آپراہا اس کی طرف چلو۔۔۔ لیمنگٹن روڈ سے ہوتے ہوئے۔۔۔ سمجھیے! ڈرائیور نے میٹر کی لال جھنڈی کا سر نیچے دبادیا۔ ٹن ٹن ہوئی اور ٹیکسی نے لیمنگٹن روڈ کا رج تھ کیا۔ لیمنگٹن روڈ کا جب آخری سر اآگیا تو خوشیا نے ڈرائیور کو ہدایت دی، ”باتیں ہاتھ موزلو۔“

ٹیکسی باتیں ہاتھ مڑ گئی۔ ابھی ڈرائیور نے گیئر بھی نہ بدل لاتھا کہ خوشیا نے کہا، ”یہ سامنے والے کھبے کے پاس روک لینا ذرا۔“ ڈرائیور نے عین کھبے کے پاس ٹیکسی کھڑی کر دی۔ خوشیا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ اور ایک پان والے کی دکان کی طرف بڑھا۔ یہاں سے اس نے ایک پان لیا۔ اور اس آدمی سے جو کہ دکان کے پاس کھڑا تھا، چند باتیں کیں۔ اور اسے اپنے ساتھ ٹیکسی میں بٹھا کر ڈرائیور سے کہا، ”سیدھے لے چلو۔“

دیر تک ٹیکسی چلتی رہی۔ خوشیا نے جدھر اشارہ کیا، ڈرائیور نے ادھر بینڈل پھر ادیا۔ مختلف پُر رونق بازاروں میں سے ہوتے ہوئے ٹیکسی ایک نیم روشن گلی میں داخل ہوئی۔ جس میں آمد و رفت بہت کم تھی۔ کچھ لوگ سڑک پر بستر جائے لیئے تھے۔ ان میں سے کچھ بڑے اطمینان سے چپی کر رہے تھے۔ جب ٹیکسی ان چپی کرانے والوں کے آگے گئی۔ اور ایک کاٹھ کے بغلہ نامکان کے پاس پہنچی تو خوشیا نے

ڈرائیور کو ٹھہرنے کے لیے کہا۔ ”بس اب یہاں رک جاؤ۔“ ٹیکسی ٹھہر گئی تو خوشیا نے اس آدمی سے جس کو وہ پان والے کی دکان سے اپنے ساتھ لیا تھا۔ آہستہ سے کہا، ”جاو۔۔۔ میں یہاں انتظار کرتا ہوں۔“ وہ آدمی بیو تو فوں کی طرح خوشیا کی طرف دیکھتا ہوا ٹیکسی سے باہر نکلا اور سامنے والے چوبی مکان میں داخل ہو گیا۔

خوشیا جم کر ٹیکسی کے گدے پر بیٹھ گیا۔ ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ کر اس نے جیب سے بیڑی نکال کر سلاگائی اور ایک دوکش لے کر باہر پھینک دی۔ وہ بہت مضطرب تھا۔ اس لیے اسے ایسا لگا کہ ٹیکسی کا انجمن بند نہیں ہوا۔ اس کے سینے میں چونکہ پھٹر پھٹر اہٹ سی ہو رہی تھی اس لیے وہ سمجھا کہ ڈرائیور نے بل بڑھانے کی غرض سے پڑول چھوڑ رکھا ہے چنانچہ اس نے تیزی سے کہا، ”یوں بیکار انجمن چالو رکھ کر تم کتنے پیسے اور بڑھالو گے؟“

ڈرائیور نے مڑ کر خوشیا کی طرف دیکھا اور کہا، ”سیٹھ انجمن تو بند ہے۔“

جب خوشیا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس کا اضطراب اور بھی بڑھ گیا اور اس نے کچھ کہنے کے بجائے اپنے ہونٹ چبانے شروع کر دیے۔ پھر ایک ایکی سرے پر وہ کشتی نما کالی ٹوپی پہن کر جواب تک اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی، اس نے ڈرائیور کا شانہ ہلا�ا اور کہا، ”دیکھو، ابھی ایک چھو کری آئے گی۔ جو نہیں اندر داخل ہو تو تم موڑ چلا دینا۔۔۔ مجھے۔۔۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ معاملہ ایسا ویسا نہیں۔“

اتنے میں سامنے چوبی مکان سے دو آدمی باہر نکلے۔ آگے آگے خوشیا کا دوست تھا اور اس کے پیچھے کانتا، جس نے شوخ رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ خوشیا جھٹ اس طرف کو سرک گیا جدھر اندر ہیرا تھا۔ خوشیا کے دوست نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور کانتا کو اندر داخل کر کے دروازہ بند کر دیا۔ فوراً ہی کانتا کی حرمت بھری آواز سنائی دی جو چچ سے ملتی جلتی تھی، ”خوشیا تم“

”ہاں میں۔۔۔ لیکن تمہیں روپے مل گئے ہیں نا؟“ خوشیا کی موٹی آواز بلند ہوئی، ”دیکھو ڈرائیور۔۔۔ جو ہو لے چلو۔“

ڈرائیور نے سلف دبایا۔ انہن پھٹر پھٹر اندا شروع ہوا۔ وہ بات جو کانتا نے کہی، سنائی نہ دے سکی۔ ٹیکسی ایک دھکے کے ساتھ آگے بڑھی اور خوشیا کے دوست کو سڑک کے پیچے جیرت زدہ چھوڑ کر نیم روشن گلی میں غائب ہو گئی۔

اس کے بعد کسی نے خوشیا کو موڑوں کی دکان کے سنگین چپوتے پر نہیں دیکھا۔

یہ جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد کی بات ہے جب میر اعزیز ترین دوست لیفٹینٹ کرٹل محمد سلیم شخ (اب) ایران، عراق اور دوسرے محاذوں سے ہوتا ہوا بمبی پہنچا۔ اس کو اچھی طرح معلوم تھامیر افیٹ کہاں ہے۔ ہم میں گاہے گاہے خط و کتابت بھی ہوتی رہتی تھی لیکن اس سے کچھ مزانہیں آتا تھا اس لیے کہ ہر خط سنسر ہوتا ہے۔ ادھر سے جائے یادھر سے آئے، عجیب مصیبت تھی۔

مگر اب ان مصیبتوں کا ذکر کیا کرنا، اس کی بمبی کے بی بی اینڈ سی آئی اے کے ٹرپیسنس پر پوسٹنگ ہوئی۔ اس وقت وہ صرف لیفٹینٹ تھا۔ ہم دونوں وسیع و عریض ریلوے اسٹیشن کے بونے میں بیٹھ گئے اور دوپہر کے بارہ ایک بجے تک ٹھنڈی ٹھنڈی بیسپیتے رہے۔ اس نے اس دوران میں مجھے کئی کہانیاں سنائیں جن میں سے ایک خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

اس نے ایران، عراق اور خدا معلوم کن کن ملکوں کے اپنے معاشقے سنائے، میں ستارہا، پیشہ و رعاشق توکالج کے زمانے سے تھا۔ اس کی داستانیں اگر میں سناؤں تو ایک خنیم کتاب بن جائے۔ بہر حال آپ کو اتنا بتا نا ضروری ہے کہ اسے لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا گر معلوم تھا۔

گورڈن کالج راولپنڈی میں وہ راجہ اندر تھا۔ اس کے دربار میں وہاں کی تمام پریاں مجر اعرض کرتی تھیں۔ خوبصورت تھا۔۔۔ کافی خوبصورت مگر اس کا حسن مردانہ حسن تھا۔ پتلی نوکیلی ناک جو یقیناً اپنا کام کر جاتی ہو گی۔ چھوٹی چھوٹی گھرے بھوسلے رنگ کی آنکھیں جو اس کے چہرے پر جگ گئی تھیں، بڑی ہوتیں تو شاید اس کے چہرے کی ساری کشش ماری جاتی۔

وہ کھلنڈ را تھا۔ جس طرح لاڑ باڑن صرف کچھ عرصے کے لیے کسی سے دلچسپی لیتا تھا اور اسے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا، جیسے وہ اس کی زندگی میں کبھی آئی ہی نہیں۔ اسی طرح کا سلوک وہ اپنے جاں میں پھنسی ہوئی لڑکیوں سے کرتا، مجھے اس کا یہ رویہ پسند نہیں تھا کہ یہ میری نظر میں بہت ظالمانہ ہے۔ مگر وہ بے پروا تھا، کہا کرتا، ”اُلو کے پٹھے۔۔۔ غالب پڑھو وہ کیا کہتا ہے۔۔۔ اسے متن یاد کبھی نہیں رہتا تھا مگر اس کا مفہوم اپنے الفاظ میں ادا کر دیا کرتا۔ وہ کہتا ہے، وہی شاخ طوبی اور جنت میں وہی ایک حور۔۔۔ واللہ زندگی اجیرن ہو جائے گی۔۔۔ شہد کی کمھی

بنو، کلی کارس چو سو۔۔۔ مکھی کسی مصری کی نہ بن جو وہیں چپک کر رہ جائے۔” پھر اس نے اقبال کے ایک شعر کا حوالہ اپنا بیس کا گلاس خالی کرتے ہوئے دیا، ”کیا کہا ہے اقبال نے،

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگی دام بھی تھا

ثابت ہوا کہ تم نہ صرف ناداں ہو بلکہ درجہ اول بنا سپتی گھی کی طرح درجہ اول چغد بھی ہو۔۔۔ اب ہٹا داں بکواس کو۔“

میں نے یہ بکواس اس طرح ہٹائی جس طرح بیرے نے میری بیس کی خالی بوقت۔

پیشتر اس کے کہ میں اصل کہانی کی طرف آؤں۔ میں آپ کو شیخ سلیم سے متعلق ایک بہت دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ ہم گورڈن کالج میں بی اے فائنل میں پڑھتے تھے کہ کر سمس کی چھیلوں میں رکمنی کی شادی کی اڑتی اڑتی افواہ ہمیں ملی۔ یہ رکمنی ہماری ہی کسی کلاس میں پڑھتی تھی اور کچھ عرصہ پہلے بری طرح شیخ سلیم پر فریفتہ تھی۔ شکل صورت اس کی واجبی تھی مگر میرا دوست شہد کی مکھی تھا۔ چنانچہ دو مہینے ان کا معاشرتہ چلتا رہا، اس کے بعد وہ اس سے بالکل اجنبی ہو گیا۔ جب اس کو بتایا گیا کہ رکمنی جو تمہاری محبوبہ تھی اور جس کی خاطر تم نے اتنے جھگڑے اپنی کلاس کے طالب علموں سے کیے، ”وہ اگر دوسری جگہ بیا ہی جائے تو ڈوب مرو۔۔۔ لیکن تم تیرنا جانتے ہو۔۔۔ ڈوبنے کا کام ہم اپنے ذمے لیتے ہیں۔“

شیخ سلیم کو اس قسم کی باتیں عموماً کھا جاتی تھیں۔ اس نے اپنی مہین مہین موچھوں کو تاؤ دینے کی کوشش کی اور کہا، ”اچھا، تم دیکھ لینا کیا ہو گا۔“

اس کی پارٹی کے ایک قوی ہیکل لڑکے نے پوچھا، ”کیا ہو گا؟“

شیخ سلیم نے اس کو جھاگ کی طرح بٹھا دیا، ”ہو گا تمہاری ماں کا سر۔۔۔ جب شادی کا دن آئے گا، دیکھ لینا۔۔۔ چلو آؤ میرے ساتھ مجھے تم سے چند باتیں کرنی ہیں۔“

شادی کا دن آگیا۔ بارات جب دوہن والوں کے گھر کے پاس پہنچی تو کوئی شخص سر پر سہر ابندھے بڑے اپنے گھوڑے پر سوار اندر داخل ہو گیا۔ دوہما موڑ میں تھا جس پر پھولوں کا جال بنایا تھا۔

گھوڑا سوار سہر سے لے اپنداشامیانے کے پاس تھا۔ گھوڑا خود دوہما بنایا تھا۔ دوہن کا باپ اور اس کے رشتہ دار آگے بڑھے۔ گھوڑے کا مالک بھاگا بھاگا آگیا تھا۔ اس سہر سے لدے ہوئے آدمی کو اس جگہ بٹھا دیا گیا، جہاں دوہن کو بھی ساتھ بیٹھنا تھا۔ نقش میں ہون کنڈ تھا جس میں چھوٹی چھوٹی لکڑیوں کے ٹکڑے جل رہے تھے۔ انھوں نے ننگے بدن اٹھ کر دوہن کو آشیر واد دیا اور دوہن سے کہا، ”سردار جی دوہن کو جلد بلا یئے مہورت ہو گیا ہے۔“

فوراً کمنی پہنچ گئی اور کچھ عرصے کے لیے دوہما کے ساتھ بٹھا دی گئی۔ پنڈت جی نے کچھ پڑھا جس کا مطلب میری سمجھ میں نہ آیا۔۔۔ لیکن ایک دم شادی کے اس جلسے میں ایک ہڑبونگ سی مج گئی جب کار سے ایک دوہما نکل کر سامنے آگیا اور بلند آواز میں تمام حاضرین کو مخاطب کیا، ”میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔۔۔ میں دعویٰ دائر کروں گا۔“

وہ دوہما جو ہاتھ کپڑ کر دوہن کو اٹھا رہا تھا بڑی خوفناک آواز میں چلا یا، ”ابے جابے، دعویٰ دائر کرنے کے کچھ لگتے۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنے پھولوں کا گھوٹکھٹ اٹھا دیا اور ان ہزار کے قریب آدمیوں سے جو شامیانے کے نیچے تھے کچھ کہنا چاہا۔۔۔ مگر قہقہوں کا ایک سمندر موجود مارنے لگا۔۔۔ دوسری پارٹی کے آدمی بھی ان قہقہوں میں شریک ہوئے کیونکہ جب یہ پھولوں کا پردہ عیجمدہ ہوا تو انھوں نے دیکھا کہ شیخ سلیم ہے۔

رکمنی بڑی خفیف ہوئی، مگر شیخ سلیم نے بڑی جرأت سے کام لے کر اس سے بلند آواز میں پوچھا، ”تم اس چغد کے ساتھ شادی کرنے کے لیے تیار ہو؟“

رکمنی خاموش رہی۔

”اچھا جاؤ جہنم میں۔۔۔ لیکن ایک دن نہیں پورے تین مہینے تم ہمیں پوچھتی رہی ہو۔“ یہ کہہ کر وہ صحیح دوہما کی طرف بڑھا جس کے منہ سے غصے کے مارے جھاگ نکل رہے تھے آگے بڑھ کر اس نے اپنے سارے ہار اس کے گلے میں ڈال دیے۔۔۔ سب براتی بت بنے بیٹھے تھے۔

ہستا، تھے لگاتا وہ اپنے گھوڑے پر بڑی صفائی سے سوار ہوا اور ایڑا لگا کر کوئی نکل گیا۔ گھوڑے سے اتر کر (ہم دور نکل گئے تھے، اس لیے کہ میں اس کے پیچے گھوڑے کی سی تیز رفتاری سے بھاگتا تھا) اس نے میرا کندھا بڑے زور سے ہلايا ”کیوں بیٹھے! میں نے تم سے کیا کہا تھا اب دیکھ لیا؟“

ہوا تو سب کچھ ٹھیک تھا مگر مجھے ڈر تھا کہیں شیخ سلیم گرفتار نہ ہو جائے۔ میں نے اس سے کہا، ”جو تم نے کیا وہ اور کوئی نہیں کر سکتا، لیکن بھائی میرے کہیں ہنسی میں پھنسنی نہ ہو جائے۔ فرض کرو اگر رکمنی کے باپ نے تمھیں گرفتار کر دیا؟“

وہ اکٹھ کر بولا، ”اس کے باپ کا باپ بھی نہیں کر سکتا۔ کون اپنی بیٹی کو عدالت چڑھائے گا۔۔۔ میں تو اسی وقت گرفتار ہونے کے لیے تیار ہوں۔۔۔ لے جائے مجھے تھانے۔۔۔ اس سالی کی ساری پول کھول دوں گا۔۔۔ میرے پاس اس کے درجنوں خطوط پڑے ہیں۔“ سارے شہر میں یہی انواہ پھیلی ہوئی تھی کہ رکمنی کا باپ شیخ سلیم کو ضرور اس کی گستاخی کی سزا دلوائے گا کہ وہ ساری عمر یاد رکھنے ہوا۔ جب کئی دن گزر گئے تو میرے پاس گاتا ہوا آیا۔

تحمی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پر زے
دیکھنے ہم بھی گئے پر وہ تماشا نہ ہوا

اب میں اصل کہانی کی طرف پلٹتا ہوں، جو اس واقعے سے بھی کہیں زیادہ دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ یہ خود اس نے مجھے سنائی جس کی صداقت پر مجھے سو فیصد یقین ہے۔۔۔ اس لیے کہ شیخ سلیم جھوٹا کبھی نہیں تھا۔

اس نے مجھے بتایا، ”میں ایران میں تھا۔ وہاں کی لڑکیاں عام یورپین لڑکیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ وہی لباس، وہی وضع قطع، البتہ ناک نقشے کے لحاظ سے کافی مختلف ہوتی ہیں۔ جتنی خرافات وہاں ہوتی ہے شاید ہی کسی اور ملک میں ہوتی ہے۔ میں نے وہاں کئی شکار کیں۔ وہاں میرے ایک بڑے افسر کرنل عثمانی تھے۔ حالانکہ ان کا عہدہ جیسا کہ ظاہر ہے مجھ سے بہت بڑا تھا۔ لیکن وہ میرے بڑے مہربان تھے۔ میں میں جب بھی مجھے دیکھتے، زور سے پکارتے۔۔۔ ادھر آؤ شیخ، میرے پاس بیٹھو، اور وہ میرے لیے ایک کرسی منگواتے۔ وہ کسی کا دور چلتا تو ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیتے، کرنل عثمان کو مجھ سے چھپتے غافل کرنے میں خاص مزا آتا۔ جب وہ کوئی نقرہ مجھ پر چست کرتے تو بہت خوش ہوتے۔ کافی معمر آدمی تھے۔ اس کے علاوہ بڑا افسر، میں خاموش رہتا۔۔۔ ان کو ان پولستانی زسوس سے بڑی دلچسپی تھی جو وہاں ایسا بولنس

کو رہیں کام کرتی تھیں۔۔۔ یہ پولستانی لڑکیاں بالا کی تنومند ہوتی ہیں۔۔۔ یہ موٹی موٹی سفید پنڈلیاں، بڑی مضبوط چھاتیاں، بڑی بڑی اور صحت مند۔ کوہے چوڑے اور گوشت سے بھرے ہوئے جن میں سختی ہو۔ لوہے ایسی سختی۔۔۔ میری کئی دوست تھیں، پر جب میں آرزن سے ملا تو سب کو بھول گیا۔ سارے ایران کو بھول گیا۔ بڑی صفتیں تھیں۔ نقش سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ اگر تم اس کی چھاتیوں اور پنڈلیوں کو پیش نظر رکھتے تو یہی سمجھتے کہ اس کے ہاتھ ڈبل روٹی کے مانند ہوں گے۔ اس کی انگلیاں اتنی موٹی ہوں گی جیسے کسی درخت کی ٹہنی۔۔۔ مگر نہیں دوست، اس کے ہاتھ بڑے نرم و نازک تھے اور اس کی انگلیاں تم یہ سمجھ لو کہ چفتائی کی بنائی تصویروں کی طرح مخروطی لانبی نہیں، مگر پتی پتلی تپلی تھیں۔ میں تو اس پر فریقتہ ہو گیا۔ چند روز کی ملاقاتوں ہی میں اس کے میرے تعلقات بے تکلفی کی حد تک بڑھ گئے۔

یہاں تک پہنچ کر شیخ رک گیا۔ ایک نیا پیگ گلاس میں ڈالا اور سوڈا ملا کر غٹ پی گیا، ”نه یاد کرو اؤ یہ قصہ“ میں نے اس سے کہا، ”لیفٹینٹ صاحب، آپ نے خود ہی تو شروع کیا تھا۔“

اس نے ما تھے پر تیوری چڑھا کر میری طرف دیکھا اور ایک پیگ اپنے گلاس میں۔۔۔ تین چار پیگ جو بوتل میں باقی پنج گئے تھے اتنا قاماً میرے گلاس میں ڈالے اور خود سوکھی جسے انگریزی میں نیٹ کہتے ہیں پی گیا اور کھانس کھانس کر اپنا بر احال کر لیا، ”لعنت ہو تم پر!“

”یعنی یہ کیا موقعہ تھا مجھ پر لعنت بھیجنے کا۔“

اس کی کھانسی اب بند ہو گئی تھی اور وہ رومال سے اپنا منہ پوچھ رہا تھا کہ نہ پوچھو میری جان۔۔۔ دوسرے روز رات کو کرٹل صاحب سے ملاقات ہوئی۔۔۔ انہوں نے بڑے طفر سے کہا کہو صاحبزادے مجھے بڑھا سمجھتے ہو۔۔۔ وہ تم نے ضرب المثل نہیں سنی۔۔۔ نیا ایک دن پر نا سودن۔۔۔ میں نے ان سے عرض کی کرٹل صاحب آپ کا میر اکیا مقابلہ۔۔۔ مگر میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ کمخت اس حقیقت سے اب تک غافل ہے کہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے اور عشق فرم رہا ہے۔

”میں تو خدا کی قسم جب اس عمر کو پہنچوں گا تو خود کشی کرلوں گا۔۔۔ اس منہ کے ساتھ جس میں آدھے دانت مصنوعی ہیں میری آرزن پر نگاہیں لگائے بیٹھا ہے۔ کرٹل ہو گا تو اپنے گھر میں، اس نے کبھی پھر اس کی بات کی تو ایک ایسا گھونسہ جماوں گا اس کی سوکھی گردن پر کہ منکا باہر آجائے گا۔ دیر تک اس بڑھے کھوست سے آرزن۔۔۔ نہایت ہی پیاری آرزن کے متعلق بتیں ہوتی رہیں اور وہ طفر کرنے سے باز نہ آیا۔ وسکی کا چوتھا دور پچل رہا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر بڑی فرمانبردار قسم کی مسکراہٹ پیدا کی اور اس سے کہا، ”کرٹل صاحب جو آپ کو بڑھا کہے وہ خود بڑھا ہے آپ تو مشاء اللہ دھان پان ہیں۔“

یہ محفل ختم ہوئی تو میں بہت خوش ہوا۔ آئرن نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ دوسرے روز فلاں ہو ٹھل میں شام کو سات بجے ملے گی۔ اس میں فوجیوں کو اجازت تھی۔

اتوار تھا اس لیے میں وردی کے بجائے نہایت اعلیٰ سوت پہن کرو ہاں پہنچا۔ سات بجھے میں ابھی نو منٹ باقی تھے۔ میں ڈائینگ ہال میں داخل ہوا تو میرے پاؤں وہیں کے وہیں جم گئے۔ کرمل عثمانی صاحب آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے غافل آئرن کا بڑا المباہوس سے لے رہے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اس کرمل سے کہیں زیادہ بڑھا کھو سٹ بن گیا ہوں۔

-[126]-

برف کا پانی: سعادت حسن منٹو

”یہ آپ کی عقل پر کیا پتھر پڑ گئے ہیں؟“

”میری عقل پر تو اسی وقت پتھر پڑ گئے تھے جب میں نے تم سے شادی کی۔ بھلا اس کی ضرورت ہی کیا تھی اپنی ساری آزادی سلب کرالی۔“

”جی ہاں آزادی تو آپ کی یقیناً سلب ہوئی اس لیے کہ آپ اب کھلے بندوں عیاشی نہیں کر سکتے شادی سے پہلے آپ کو کون پوچھنے والا تھا، جدھر کو منہ اٹھایا چل دیئے جھک مارتے رہے۔“

”دیکھو میں تم سے کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے جو کچھ کہنا ہو چند لفظوں میں صاف صاف کہہ دیا کرو، مجھے یہ جھک جھک پنڈ نہیں۔ جس طرح میں صاف گو ہوں اسی طرح میں چاہتا ہوں کہ دوسرے بھی صاف گو ہوں۔“

”آپ کی صاف گوئی تو ضرب المثل بن چکی ہے۔“

”تمہاری یہ طنز خدا معلوم تم سے کب جدا ہو گی اتنی بھونڈی ہوتی ہے کہ طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔“

”آپ کی طبیعت تو شگفتہ گفتگو سن کر بھی خراب ہو جاتی ہے اب اس کا کیا علاج ہے۔ اصل میں آپ کو میری کوئی چیز بھی پسند نہیں۔ ہر وقت مجھ میں کیڑے ڈالنا آپ کا شغل ہو گیا ہے۔ اگر میں آپ کے دل سے اتر گئی ہوں تو صاف صاف کہہ کیوں نہیں دیتے۔ بڑے صاف گوبنے پھرتے ہیں آپ، ایسا ریا کار شاید ہی دنیا کے تختہ پر ہو۔“

”اب میں ریا کار بھی ہو گیا؟ کیا ریا کاری کی ہے میں نے تم سے؟ یہی کہ تمہاری نوکروں کی طرح خدمت کرتا ہوں۔“

”بڑی خدمت کی ہے آپ نے میری ---۔“

”سر پر قرآن اٹھا و اور بتاؤ کہ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے کبھی تم نے میرا سر تک سہلا�ا ہے۔ میں بخار میں پھکنتا رہا ہوں، کبھی تم نے میری تیارداری کی۔ پچھلے دنوں میرے سر میں شدت کا درد تھا، میں نے رات کو تمہیں آواز دی اور کہا مجھے بام دے دو مگر تم نے کروٹ بدلت کر کہا۔ میری نیند نہ خراب کیجیے، آپ اٹھ کر ڈھونڈ لجیے کہاں ہے۔ اور یاد ہے جب تمہیں نمویہ ہو گیا تھا تو میں نے سات رات میں جاگ کر کاملی تھیں، دن اور رات مجھے پل بھر کا چین نصیب نہیں تھا۔“

”دن بھر سوئے رہتے تھے آپ، میری بیماری کا ایک بہانہ مل گیا تھا، سات چھٹیاں لیں اور دفتر کے کام سے نجات پا کر آرام کرتے رہے ہیں۔ آپ کے سارے حیلے بہانے جانتی ہوں، میرا علاج آپ نے کیا تھا یا ڈاکٹروں نے ---۔“

”جان ڈاکٹروں کو تم بلا کر لائی تھیں کیا؟ اور دوائیں بھی کیا تم نے خود جا کر خریدی تھیں؟ اور جو روپیہ خرچ ہوا کیا فرشتوں نے اوپر سے پھینک دیا تھا؟ کتنے سفید جھوٹ بولتی ہو کہ میں دن کو سویا رہتا تھا۔ قسم خدا کی جو ایک لمحے کے لیے بھی ان دنوں سویا ہوں، تم بیمار ہو جاؤ تو گھر کی اینٹیں بھی جاگتی ہیں تم اس وقت کس کو سونے دیتی ہو۔ آہ و پکار کا تانتا بندھار ہتا ہے جیسے کسی پر بہت بڑا ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔“

”جناب بیماریاں ظلم نہیں ہوتیں تو کیا ہوتی ہیں، جو میں نے برداشت کیا ہے وہ آپ کبھی نہ کر سکتے اور نہ کبھی کر سکتے ہیں۔ میں نے کتنی بیماریاں خنده پیشانی سے سہی ہیں۔ آپ کو تو خیر اس وقت کچھ یاد نہیں آئے گا، اس لیے کہ آپ میرے دشمن بنے بیٹھے ہیں۔“

”دن ہی کو میں تمہارا دشمن بن جاتا ہوں، رات کو تو تم نے ہمیشہ بہترین دوست سمجھا ہے۔“

”شرم نہیں آتی آپ کو ایسی بتیں کرتے، رات اور دن میں فرق ہی کیا ہے۔“

”اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔“

”یہ کہہ کر آپ نے میرا گلا گھونٹ دیا کہ میں آپ سے کچھ اور نہ کہہ سکوں۔“

”لو بھی اب میں اطمینان سے یہاں بیٹھ جاتا ہوں۔ آرام جائے جہنم میں، تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو ایک ہی سانس میں کہتی چلی جاؤ۔۔۔“

”میری سانس اتنی لمبی نہیں۔۔۔“

”عورتوں کی سانس کے متعلق تو یہی سناتھا کہ بہت لمبی ہوتی ہے اور زبان بھی ماشاء اللہ کافی دراز۔۔۔“

”آپ یہ مہین مہین چکلیاں نہ لجھیے، میں نے اگر کچھ کہہ دیا تو آپ کے تن بدن میں آگ لگ جائے گی۔“

”اس تن بدن میں کئی بار آگ لچکی ہے چلو ایک فائر کرو اور قصہ تمام کر دو۔“

”قصہ تو آپ میرا نام کر کے رہیں گے۔“

”کس لیے؟ مجھے تم سے کیا بغرض ہے؟ اللہ کے واسطے کا بیر تو نہیں مجھ سے؟“

”محبت اور اطاعت کو آپ یہ سمجھتے ہیں اس لیے تو میں نے کہا تھا کہ آپ کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔“

”میری عقل پر پتھر پڑیں یا کوہ ہمالیہ کا پہاڑ لیکن تمہاری محبت اور اطاعت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اطاعت کو فی الحال چھوڑو۔۔۔ لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ اب تک تم محبت بھری گفتگو کر رہی تھیں؟“

”تو میں نے آپ کو کون سی گالی دی ہے؟“

”گالی دینے میں تم نے کوئی کسر تو اٹھا نہیں رکھی، ریا کا رتک توبتا دیا مجھ کو، اس سے بدتر گالی اور کیا ہو سکتی ہے؟“

”یہ لوکھلا گریبان ہے۔ میں نے اپنا سارا سراس میں ڈال دیا۔ اب تم بتاؤ۔ صرف تمہاری شکل نظر آتی ہے۔ خوفناک، بڑی بیت ناک۔“

”تو کوئی دوسرا کریجیے جو خوش شکل ہو۔“

”ایک ہی کر کے میں نے بھر پایا ہے۔ خدا نہ کرے زندگی میں دوسرا آئے۔“

”آپ مجھ سے اس قدر تنگ کیوں آگئے ہیں۔“

”میں قطعاً تنگ نہیں آیا۔۔۔ بس تم دل جلاتی رہتی ہو۔“

”میرا دل تو جل کر کوئلہ ہو چکا ہے، تھپ پوچھیے تو میں چاہتی ہوں کہ کچھ کھا کے مر جاؤں۔۔۔ میں جا رہی ہوں۔“

”کہاں؟“

”میں نے ایک من برف منگوائی ہے، اسے چار بالیوں میں پانی کے اندر ڈال رکھا ہے، اس ٹھنڈے پانی سے نہاؤں گی اور پنکھے کے نیچے بیٹھ جاؤں گی۔ ایک مرتبہ مجھے پہلے نمونیہ تو ہو ہی چکا ہے اب ہو گا تو پھیپھڑے یقیناً جواب دے جائیں گے۔“

”خدا حافظ۔۔۔“

”خدا حافظ۔۔۔ خود کشی کا یہ طریقہ تم نے بہت اچھا ہو نہ ڈاہے جو آج تک کسی کو سوچنا نہیں ہو گا۔۔۔“

”آپ کے پہلو میں تodel ہی نہیں۔“

”جو کچھ بھی ہے بہر حال موجود ہے اور دھڑکتا بھی ہے۔ جاؤ تو آلو دپانی سے نہا کر پنچھے کے نیچے بیٹھ جاؤ۔۔۔“

”جار ہی ہوں، آپ سے چند باتیں کرنی ہیں۔“

”ضرور کرو۔۔۔“

”میرے بچوں کا آپ ضرور خیال رکھیے گا۔۔۔“

”کیا وہ میرے بچے نہیں ہیں۔“

”ہیں۔۔۔ لیکن شاید میری وجہ سے اچھا سلوک نہ کریں۔“

”نہیں نہیں۔۔۔ تم کوئی فکر نہ کرو۔۔۔ میں انھیں بورڈنگ میں داخل کرانے لے جاتا ہوں۔۔۔ خدا حافظ۔“

”خدا تمہارا حافظ ہو، مجھے تو فی الحال خود کشی نہیں کرنی لیکن سنونمی ہو تو ڈاکٹر کو بلااؤں؟“

”ہرگز نہیں۔۔۔ میں مرنا چاہتی ہوں۔“

”تو میں نہیں بلااؤں گا لیکن نمونیہ کے مريض فوراً نہیں، مرتے پانچ چھ روز تو لگاتے ہیں۔“

”آپ اس عرصہ تک انتظار کبھیے گا۔“

”بہت بہتر---“

”میری کہی سنی معاف کر دیجیے گا---“

”وہ تو میں نے اسی روز کر دی تھی جب تم سے نکاح ہوا تھا۔“

”میں آپ سے صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ آپ کی عقل پر جو پتھر پڑ گئے ہیں انھیں دور کر دیجیے گا۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں۔ اگر تم کہو تو قسم اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔ اچھا تو میں چلا۔ نچے باہر کھیل رہے ہیں انھیں ہوشیں لے جاتا ہوں واپس دو تین گھنٹے میں آجائوں گا۔ اگر اس دوران میں تم مر گئیں تو بہت اچھا، تبہیز و تنفس کا سامان کر دوں گا، مجھے ابھی کل ہی تنخواہ ملی ہے۔“

”جائیے میں بھی چلی۔“

”الوداع---“

”الوداع---“

”کبھی کبھی مجھ نا بکار کو یاد کر لیا کہجیے۔“

”ضرور ضرور تم نا بکار کیوں کہتی ہو خود کو۔“

”میں کس کام کی ہوں؟“

”خیر چھوڑو۔ بحث اس پر الگ شروع ہو جائے گی اور تمہاری خریدی ہوئی ایک من بر ف پکھل کر گرم پانی میں تبدیل ہو جائے گی۔“

”یہ تو آپ نے درست کہا۔ اچھا۔۔۔ میں چلی۔“

”میں آگیا ہوں بچوں کو بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرائے، تم غسل خانے میں ابھی تک کیا کر رہی ہو؟“

”کچھ نہیں۔۔۔ سوچ رہی تھی۔“

”کیا سوچ رہی تھیں؟“

”میں نے وہ خط دوبارہ پڑھا۔“

”کون سا خط؟“

”جو آپ کی میز کی دراز میں پڑا تھا کسی لڑکی کی طرف سے تھا۔ اب میں نے جو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ آپ کے نام نہیں بلکہ اس اخبار کے ایڈیٹر کے نام ہے جہاں آپ کام کرتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے میں نے آپ پر شک کیا۔“

”تم ہمیشہ شک کیا کرتی ہو۔۔۔ اب تو میری عقل کے پھرہٹ گئے۔ وہ لڑکی نہیں کوئی مرد ہے اسی لیے میں تفتیش کی غرض سے اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ خیر چھوڑو ٹھنڈا اپنی توپلا و ایک من برف تم نے منگوائی تھی۔“

”اس کا سب پانی میں نے غسل خانے میں ڈال دیا۔ بڑا ٹھنڈا ہو گیا ہے آپ بھی یہاں آجائیے۔“

میدان بالکل صاف تھا مگر جاوید کا خیال تھا کہ میو نسل کمیٹی کی لائیں جو دیوار میں گڑی ہے، اس کو گھور رہی ہے۔ بار بار وہ اس پوڑے صحن کو جس پر ناک شاہی اینٹوں کا اونچا نچا فرش بنایا تھا، طے کر کے اس نکڑوالے مکان تک پہنچے کا ارادہ کرتا جو دوسری عمارتوں سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ مگر یہ لائیں جو مصنوعی آنکھ کی طرح ہر طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی، اس کے ارادے کو متزلزل کر دیتی اور وہ اس بڑی موری کے اس طرف ہٹ جاتا جس کو پھاند کروہ صحن کو چند قدموں میں طے کر سکتا تھا۔۔۔ صرف چند قدموں میں!

جاوید کا گھر اس جگہ سے کافی دور تھا۔ مگر یہ فاصلہ بڑی تیزی سے طے کر کے یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کے خیالات کی رفتار اس کے قدموں کی رفتار سے زیادہ تیز تھی۔ راستے میں اس نے بہت سی چیزوں پر غور کیا۔ وہ بیوقوف نہیں تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایک بیسوائے پاس جا رہا ہے۔ اور اس کو اس بات کا بھی پورا شعور تھا کہ وہ کس غرض سے اس کے یہاں جانا چاہتا ہے۔

وہ عورت چاہتا تھا۔ عورت، خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ عورت کی ضرورت اس کی زندگی میں یک بیک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ایک زمانے سے یہ ضرورت اس کے اندر آہستہ شدت اختیار کرتی رہی تھی۔ اور اب دفعتاً اس نے محسوس کیا تھا کہ عورت کے بغیر وہ ایک لمحہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ عورت اس کو ضرور ملنی چاہیے، ایسی عورت جس کی ران پر ہولے سے طما نچھ مار کروہ اس کی آواز سن سکے۔ ایسی عورت جس سے وہ واہیات قسم کی گفتگو کر سکے۔

جاوید پڑھا لکھا ہوش مند آدمی تھا۔ ہربات کی اونچ تیز سمجھتا تھا مگر اس معاملے میں مزید غورو فکر کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے دل میں ایک ایسی خواہش پیدا ہوئی تھی، جو اس کے لیے نئی نہ تھی۔ عورت کی قربت حاصل کرنے کی خواہش اس سے پہلے کئی بار اس کے دل میں پیدا ہوئی اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے انتہائی کوششوں کے بعد جب اسے نامیدی کا سامنا کرنا پڑا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کی زندگی میں سالم عورت کبھی نہیں آئے گی اور اگر اس نے اس سالم عورت کی تلاش جاری رکھی تو کسی روز وہ دیوانے کے کی طرح را چلتی عورت کو کاٹ کھائے گا۔

کاٹ کھانے کی حد تک اپنے ارادہ میں ناکام رہنے کے بعد اب دفعتاً اس کے دل میں اس خواہش نے کروٹ بدی تھی۔ اب کسی عورت کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کٹنگی کرنے کا خیال اس کے دماغ سے نکل چکا تھا۔ عورت کا تصور اس کے دماغ میں موجود تھا۔ اس کے بال بھی تھے۔ مگر اب اس کی یہ خواہش تھی کہ وہ ان بالوں کو حشیوں کی طرح کھینچے، نوچے، اکھیڑے۔

اب اس کے دماغ میں سے وہ عورت نکل چکی تھی جس کے ہونٹوں پر وہ اپنے ہونٹ اس طرح رکھنے کا آرزو مند تھا جیسے تسلی پھولوں پر بیٹھتی ہے، اب وہ ان ہونٹوں کو اپنے گرم ہونٹوں سے داغنا چاہتا تھا۔۔۔ ہو لے ہو لے سر گوشیوں میں با تین کرنے کا خیال بھی اس کے دماغ میں نہیں تھا۔ اب وہ بلند آواز میں با تین کرنا چاہتا تھا، ایسی با تین جو اس کے موجودہ ارادے کی طرح ننگی ہوں۔

اب سالم عورت اس کے پیش نظر نہیں تھی۔۔۔ وہ ایسی عورت چاہتا تھا جو گھس گھسا کر شکستہ حال مرد کی شکل اختیار کر گئی ہو۔ ایسی عورت جو آدمی عورت ہو اور آدمی کچھ بھی نہ ہو۔

ایک زمانہ تھا جب جاوید عورت کہتے وقت اپنی آنکھوں میں خاص قسم کی ٹھنڈک محسوس کیا کرتا تھا۔ جب عورت کا تصور اسے چاند کی ٹھنڈی دنیا میں لے جاتا تھا۔ وہ ”عورت“ کہتا تھا بڑی احتیاط سے جیسے اس کو اس بے جان لفظ کے ٹوٹنے کا ذرہ ہو۔۔۔ ایک عرصے تک وہ اس دنیا کی سیر کر تارہا مگر انجم کا راس کو معلوم ہوا کہ عورت کی تمنا اس کے دل میں ہے۔ اس کی زندگی کا ایسا خواب ہے جو خراب معدے کے ساتھ دیکھا جائے۔

جاوید اب خوابوں کی دنیا سے باہر نکل آیا تھا۔ بہت دیر تک ذہنی طور پر وہ اپنے آپ کو بہلا تارہا۔ مگر اب اس کا جسم خوف ناک حد تک بیدار ہو چکا تھا۔ اس کے تصور کی شدت نے اس کی جسمانی حیات کی نوک پلک کچھ اس طور پر نکالی تھی کہ اب زندگی اس کے لیے سوئیوں کا بستر بن گئی۔ ہر خیال ایک لشتر بن گیا اور عورت اس کی نظروں میں ایسی شکل اختیار کر گئی جس کو وہ بیان بھی کرنا چاہتا تونہ کر سکتا۔

جاوید کبھی انسان تھا۔ مگر اب انسانوں سے اسے نفرت تھی، اس قدر کہ اپنے آپ سے بھی متفر ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ اس طور پر کہ ایک عرصے تک اس کے خوبصورت خیال جن کو وہ اپنے دماغ میں پھولوں کی طرح سجا کے رکھتا رہا تھا، غلاظت سے لختہ رہیں۔

”مجھے نفاست تلاش کرنے میں ناکامی رہی ہے لیکن غلاظت تو میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اب جی یہ چاہتا ہے کہ اپنی روح اور جسم کے ہر ذرے کو اس غلاظت سے آلودہ کر دوں۔ میری ناک جو اس سے پہلے خوشبوؤں کی متجسس رہی ہے اب بدبدوار اور متعفن چیزیں سوچنے کے لیے بیتاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آج اپنے پرانے خیالات کا چوغہ اتار کر اس محلے کا رخ کیا ہے جہاں ہر شے ایک پر اسرار تھن میں لپٹی نظر آتی ہے۔۔۔ یہ دنیا کس قدر بھی انک طور پر حسین ہے!“

ناک شاہی اینٹوں کا ناموار فرش اس کے سامنے تھا۔ لاٹھن کی بیمار و روشنی میں جاوید نے اس فرش کی طرف اپنی بدی ہوئی نظر وہ سے دیکھا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ بہت سی نگی عورتیں اوندھی سیدھی لیتی ہیں، جن کی ہڈیاں جا بجا بھر رہی ہیں۔ اس نے ارادہ کیا کہ اس فرش کو طے کر کے نکڑواںے مکان کی سیڑھیوں تک پہنچ جائے اور کوٹھے پر چڑھ جائے مگر میونپل کمیٹی کی لاٹھن غیر مختتم ٹکٹکی باندھے اس کی طرف گھور رہی تھی۔ اس کے بڑھنے والے قدم رک گئے اور وہ بھنا سا گیا۔ یہ لاٹھن مجھے کیوں گھور رہی ہے۔۔۔ یہ میرے راستے میں کیوں روڑے انکاتی ہے۔

وہ جانتا تھا کہ یہ محض وابھہ ہے اور اصلیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن پھر بھی اس کے قدم رک جاتے تھے۔ اور وہ اپنے دل میں تمام بھیانک ارادے لیے موری کے اس پارکھڑا رہ جاتا تھا، وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کی زندگی کے ستائیں برسوں کی جھجک جو اسے ورنے میں ملی تھی، اس لاٹھن میں جمع ہو گئی ہے۔ یہ جھجک جس کو پرانی کیخنی کی طرح اتار کروہ اپنے گھر چوڑ آیا تھا، اس سے پہلے وہاں پہنچ پچکی تھی جہاں اسے اپنی زندگی کا سب سے بھدا کھیل کھینا تھا۔ ایسا کھیل جو اسے کچھ میں لٹ پت کر دے، اس کی روح کو ملوٹ کر دے۔

ایک میلی کچھی عورت اس مکان میں رہتی تھی۔ اس کے پاس چار پانچ جوان عورتیں تھیں جو رات کے اندر ہیرے اور دن کے اجائے میں یکساں بھدے پن سے پیشہ کیا کرتی تھیں۔ یہ عورتیں گندی موری سے غالاطت نکالنے والے پہپ کی طرح چلتی رہتی تھیں۔ جاوید کو اس تجھے خانے کے متعلق اس کے ایک دوست نے بتایا تھا جو حسن و عشق کی تلاش کئی مرتبہ اس قبرستان میں دفن کر چکا تھا۔ جاوید سے وہ کہا کرتا تھا، ”تم عورت عورت پکارتے ہو۔۔۔ عورت ہے کہاں۔۔۔؟ مجھے تو اپنی زندگی میں صرف ایک عورت نظر آئی جو میری ماں تھی۔۔۔ مستورات البتہ دیکھی ہیں اور ان کے متعلق سنابھی ہے لیکن جب کبھی عورت کی ضرورت محسوس ہوئی ہے تو میں نے مائی جیوال کے کوٹھے کو اپنا بہترین رفیق پایا ہے۔۔۔ بخدا مائی جیوال عورت نہیں فرشتہ ہے۔۔۔ خدا اس کو حضر کی عمر عطا فرمائے۔“

جاوید، مائی جیوال اور اس کے یہاں کی چار پانچ پیشہ کرنے والی عورتوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ ان میں سے ایک ہر وقت گھرے رنگ کے شیشے والا چشمہ پہنچ رہتی ہے۔ اس لیے کہ کسی بیماری کے باعث اس کی آنکھیں خراب ہو چکی ہیں۔ ایک کالی کلوٹی لوٹ دیا ہے جو ہر وقت ہنستی رہتی ہے۔ اس کے متعلق جاوید جب سوچتا تو عجیب و غریب تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی، ”مجھے ایسی ہی عورت چاہیے جو ہر وقت ہنستی رہے۔۔۔ ایسی عورتوں کو ہنسنے ہی رہنا چاہیے۔۔۔ جب وہ ہنستی ہو گی تو اس کے کالے کالے ہونٹ یوں کھلتے ہوں گے جیسے بد بودا رگنے پانی میں میلے بلبلے بن بن کر اٹھتے ہیں۔“

مائی جیوال کے پاس ایک اور چھوکری بھی تھی جو باقاعدہ طور پر پیشہ کرنے سے پہلے گلیوں اور بازاروں میں بھیک مانگا کرتی تھی۔ اب ایک برس سے وہ اس مکان میں تھی، جہاں اٹھارہ برسوں سے یہی کام ہو رہا تھا۔ یہ اب پوڑا اور سرخی لگاتی تھی۔ جاوید اس کے متعلق بھی سوچتا، ”اس کے سرخی لگے گال بالکل داغدار سیبوں کے مانند ہوں گے۔۔۔ جوہر کوئی خرید سکتا ہے۔“

ان چار یا پانچ عورتوں میں سے جاوید کی کسی خاص پر نظر نہیں تھی۔۔۔ مجھے کوئی بھی مل جائے۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے دام لیے جائیں اور کھٹ سے ایک عورت میری بغل میں تھما دی جائے۔۔۔ ایک سینڈ کی دیر نہ ہونی چاہیے، کسی قسم کی گنتگونہ ہو، کوئی نرم و نازک فقرہ منہ سے نہ نکلنے پائے۔۔۔ قدموں کی چاپ سنائی دے۔ دروازہ کھلنے کی کھڑکھڑا ہٹ پیدا ہو۔۔۔ روپے لکھنھائیں، اور آوازیں بھی آئیں مگر منہ بند رہے، اگر آواز نکلے تو ایسی جو انسانی آواز معلوم نہ ہو۔۔۔ ملاقات ہو بالکل حیوانوں کی طرح، تہذیب و تمدن کے صندوق میں تالاگ جائے۔ تھوڑی دیر کے لیے ایسی دنیا آباد ہو جائے جس میں سو گھنے، دیکھنے اور سننے کی نازک حیات زنگ لگے استرے کے مانند کندہ ہو جائیں۔

جاوید بے چیں ہو گیا۔ ایک لجھن سی اس کے دماغ میں پیدا ہو گئی۔ ارادہ اس کے اندر اتنی شدت اختیار کر چکا تھا کہ اگر پہاڑ بھی اس کے راستے میں ہوتے تو وہ ان سے بھڑ جاتا۔ مگر میو نسل کمیٹی کی ایک اندھی لاٹین جس کو ہوا کا ایک جھونکا بھا سکتا تھا، اس کی راہ میں بہت بری طرح حائل ہو گئی تھی۔

اس کی بغل میں پان والے کی دکان کھلی تھی۔ تیز روشنی میں اس کی چھوٹی سی دکان کا اسباب اس قدر نمایاں ہو رہا تھا کہ بہت سی چیزیں نظر نہیں آتی تھیں۔ بجلی کے قمقے کے ارد گرد کھیاں اس انداز سے اڑ رہی تھیں جیسے ان کے پر بو جھل ہو رہے ہیں۔ جاوید نے جب ان کی طرف دیکھا تو اس کی لجھن میں اضافہ ہو گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے کوئی سست رفتار چیز نظر آئے۔ اس کا کر گزرنے کا ارادہ جو وہ اپنے گھر سے لے کر یہاں آیا تھا ان مکھیوں کے ساتھ ساتھ بار بار کلرا یا اور وہ اس کے احساس سے اس قدر پریشان ہوا کہ ایک ہلکا سا اس کے دماغ میں مج گیا، ”میں ڈرتا ہوں۔۔۔ میں خوف کھاتا ہوں۔۔۔ اس لاٹین سے مجھے ڈر لگتا ہے۔۔۔ میرے تمام ارادے اس نے تباہ کر دیے ہیں۔۔۔ میں ڈر پوک ہوں۔۔۔ میں ڈر پوک ہوں۔۔۔ لعنت ہو مجھ پر۔“ اس نے کئی لعنتیں اپنے آپ پر بھیجن مگر خاطر خواہ اثر پیدا نہ ہوا۔ اس کے قدم آگے نہ بڑھ سکے۔ ناک شاہی اینٹوں کا ناہموار فرش اس کے سامنے لیٹا رہا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ نصف رات گزرنے پر بھی ہوا ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ بازار میں آمد و رفت بہت کم تھی۔ گنتی کی صرف چند دکانیں کھلی تھیں۔ فضام خاموشی میں لپٹی ہوئی تھی۔ البتہ کبھی کبھی کسی کوٹھے سے ہوا کے گرم جھونکے کے ساتھ تھکلی ہوئی موسيقی کا ایک ٹکڑا اڑ کر ادھر چلا آتا تھا اور گاڑھی خاموشی میں گھل جاتا تھا۔

جاوید کے سامنے، یعنی مائی جیوال کے قبہ خانے سے ادھر ہٹ کر بڑے بازار میں جو دکانوں کے اوپر کوٹھوں کی ایک قطار تھی، اس میں کئی جگہ زندگی کے آثار نظر آرہے تھے۔ اس کے بال مقابل کھڑکی میں تیر روشنی کے قلعے کے نیچے ایک سیاہ فام عورت بیٹھی پنچھا جھل رہی تھی۔ اس کے سر کے اوپر بجلکی کا بلب جل رہا تھا اور ایسا دکھانی دیتا تھا کہ سفید آگ کا ایک گولا ہے جو پکھل پکھل کر اس ویشیا پر گر رہا ہے۔

جاوید اس سیاہ فام عورت کے متعلق کچھ غور کرنے ہی والا تھا کہ بازار کے اس سرے سے جو اس کی آنکھوں سے او جھل تھا، بڑے بھدے نعروں کی صورت میں چند آوازیں بلند ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی جھومتے جھامتے شراب کے نشے میں چور نمودار ہوئے۔ تینوں کے تینوں اس سیاہ فام عورت کے کوٹھے کے نیچے پہنچ کر کھڑے ہو گئے اور جاوید کے دکانوں نے ایسی ایسی واہیات بتائیں کہ اس کے تمام ارادے اس کے اندر سمٹ کر رہے گئے۔

ایک شرابی نے، جس کے قدم بہت زیادہ اڑ کھڑا رہے تھے، اپنے موچھوں بھرے ہو نٹوں سے بڑی بھدی آواز کے ساتھ ایک بو سہ نوج کراس کالی ویشیا کی طرف اچھلا اور ایک ایسا نقہ کسا کہ جاوید کی ساری ہمت پست ہو گئی۔ کوٹھے پر بر قی لیمپ کی روشنی میں اس سیاہ فام عورت کے ہونٹ ایک آبنوی نقہ نے واکیے اور اس نے شرابی کے نقہ کے کجاوب یوں دیا جیسے ٹوکری بھر کوڑا نیچ پھینک دیا ہے۔ نیچے غیر مربوط قہقہوں کا ایک فوارہ سا چھوٹ پڑا اور جاوید کے دیکھتے دیکھتے وہ تینوں شرابی کوٹھے پر چڑھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ نشست جہاں وہ کالی ویشیا بیٹھی تھی خالی ہو گئی۔

جاوید اپنے آپ سے اور زیادہ تنفر ہو گیا، ”تم۔۔۔ تم۔۔۔ تم کیا ہو۔۔۔؟ میں پوچھتا ہوں، آخر تم کیا ہو۔۔۔ نہ تم یہ ہو، نہ وہ ہو۔۔۔ نہ تم انسان ہونہ حیوان۔۔۔ تمہاری ذہانت و ذکاؤت آج سب دھری کی دھری رہ گئی ہے۔ تین شرابی آتے ہیں۔ تمہاری طرح ان کے دل میں ارادہ نہیں ہوتا۔ لیکن بے دھڑک اس ویشیا سے واہیات بتائیں کرتے ہیں اور ہنسنے، قہقہے لگاتے کوٹھے پر چڑھ جاتے ہیں۔ گویا پنگ اڑانے جا رہے ہیں۔۔۔ اور تم۔۔۔ اور تم جو کہ اچھی طرح سمجھتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ یوں یوں قوفوں کی طرح بیچ بازار میں کھڑے ہو اور ایک بے جان لاثین سے خوف کھا رہے ہو۔۔۔ تمہارا ارادہ اس قدر صاف اور شفاف ہے لیکن پھر بھی تمہارے قدم آگے نہیں بڑھتے۔۔۔
لعنت ہو تم پر۔۔۔“

جاوید کے اندر ایک لمحے کے لیے خود انتقامی کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس کے قدموں میں جنبش ہوئی اور موری چھاند کر وہ مائی جیوال کے کوٹھے کی طرف بڑھا۔ قریب تھا کہ وہ لپک کر سیر ہیوں کے پاس پہنچ جائے کہ اوپر سے ایک آدمی اتر۔ جاوید پیچھے ہٹ گیا۔ غیر ارادی طور پر اس نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش بھی کی لیکن کوٹھے پر سے نیچ آنے والے آدمی نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

اس آدمی نے اپنا ململ کا کرتہ اتار کر کامنے ہے پر دھڑا تھا۔ اور داہنی کلائی میں موتیے کے پھولوں کا مسلما ہوا ہمارا پیٹا تھا۔ اس کا بدن پینے سے شر ابور ہوا تھا۔ جاوید کے وجود سے بے خبر وہ اپنے تہم کو دونوں ہاتھوں سے گھٹنوں تک اونچا کیے ناک شاہی اینٹوں کا اونچانچا فرش طے کر کے موری کے اس پار چلا گیا اور جاوید نے سوچنا شروع کیا کہ اس آدمی نے اس کی طرف کیوں نہیں دیکھا۔

اس دوران میں اس نے لاٹھیں کی طرف دیکھا تو وہ اسے یہ کہتی معلوم ہوئی، ”تم کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ تم ڈرپوک ہو۔۔۔ یاد ہے تمہیں پچھلے برس برسات میں جب تم نے اس ہندو ڈڑ کی اندر اسے اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہا تو تمہارے جسم میں سکت نہیں رہی تھی۔۔۔ کیسے کیسے بھی انک خیال تمہارے دماغ میں پیدا ہوئے تھے۔۔۔ یاد ہے، تم نے ہندو مسلم فساد کے متعلق بھی سوچا تھا اور ڈر گئے تھے۔ اس ڈڑ کی کو تم نے اسی ڈر کے مارے بھلا دیا اور حمیدہ سے تم اس لیے محبت نہ کر سکے کہ وہ تمہاری رشتہ دار تھی اور تمہیں اس بات کا خوف تھا کہ تمہاری محبت کو غلط نظر وں سے دیکھا جائے گا۔ کیسے کیسے وہم تمہارے اوپر ان دنوں مسلط تھے۔۔۔ اور پھر تم نے بلقیس سے محبت کرنا چاہی۔

مگر اس کو صرف ایک بار دیکھ کر تمہارے سب ارادے غائب ہو گئے اور تمہارا دل ویسے کا ویسا بخبر رہا۔۔۔ کیا تمہیں اس بات کا احساس نہیں کہ ہر بار تم نے اپنی بے لوث محبت کو آپ ہی شک کی نظر وں سے دیکھا ہے۔ تمہیں اس بات کا کبھی پوری طرح یقین نہیں آیا کہ تمہاری محبت ٹھیک فطری حالت میں ہے۔۔۔ تم ہمیشہ ڈرتے ہو۔ اس وقت بھی تم خائف ہو۔ یہاں گھر بیلو عورتوں اور ڈر کیوں کا سوال نہیں، ہندو مسلم فساد کا بھی اس جگہ کوئی خدشہ نہیں لیکن اس کے باوجود تم کبھی اس کوٹھے پر نہیں جاسکو گے۔۔۔ میں دیکھوں گی تم کس طرح اوپر جاتے ہو۔“

جاوید کی سہی ہمت بھی پست ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا وہ واقعی پر لے درجے کا ڈرپوک ہے۔۔۔ بیتے ہوئے واقعات تیز ہوا میں رکھی ہوئی کتاب کے اوراق کی طرح اس کے دماغ میں دیر تک پھر پھر اتے رہے اور پہلی مرتبہ اس کو اس بات کا بڑی شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ اس کے وجود کی بنیادوں میں ایک ایسی جھجک بیٹھی ہوئی ہے جس نے اسے قابلِ رحم حد تک ڈرپوک بنادیا ہے۔

سامنے سیڑھیوں سے کسی کے اترنے کی آواز آئی تو جاوید اپنے خیالات سے چونک پڑا۔ وہی جو گھرے رنگ کے شیشوں والی عینک پہننی تھی اور جس کے متعلق وہ کئی بار اپنے دوست سے سن چکا تھا، سیڑھیوں کے اختتامی چبوترے پر کھڑی تھی۔ جاوید گھبر اگیا، قریب تھا کہ وہ آگے سرک جائے کہ اس نے بڑے بھدے طریقے پر اسے آواز دی، ”اجی ٹھہر جاؤ۔۔۔ میری جان گھبر او نہیں۔۔۔ آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔“ اس کے بعد اس نے پچکارتے ہوئے کہا، ”چلے آؤ۔۔۔ آجائو۔۔۔“

یہ سن کر جاوید کو ایسا محسوس ہوا کہ اگر وہ کچھ دیر وہاں ٹھہر اتواس کی پیٹھ میں دم اگ آئے گی جو ویشیا کے پچکارنے پر ہلا شروع کر دے گی۔ اس احساس سمتیت اس نے چیوترے کی طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ مائی جیوال کے قبہ خانے کی اس عینک چڑھی لوڈیا نے کچھ اس طرح اپنے بالائی جسم کو حرکت دی کہ جاوید کے تمام ارادے پکے ہوئے بیروں کی مانند جھٹر گئے۔ اس نے پھر پچکارا، ”آؤ۔۔۔ میری جان اب آبھی جاؤ۔۔۔“

جاوید اٹھ بھاگا۔ موری پھاند کر جب وہ بازار میں پہنچا تو اس نے ایک ایسے قہقہے کی آواز سنی جو خطرناک طور پر بھیانک تھا۔ وہ کانپ اٹھا۔ جب وہ اپنے گھر کے پاس پہنچا تو اس کے خیالات کے بھوم میں سے دفعتاً ایک خیال رینگ کر آگے بڑھا جس نے اس کو تسلیم دی، ”جاوید، تم ایک بہت بڑے گناہ سے نج گئے۔ خدا کا شکر بجالاؤ۔۔۔“

-[128]-

افشاۓ راز: سعادت حسن منٹو

”میری لگدی کسے نہ ویکھی، تے ٹھدی نوں جگ جاندا“

”یہ آپ نے گانا کیوں شروع کر دیا ہے؟“

”ہر آدمی گاتا اور روتا ہے۔۔۔ کونسا گناہ کیا ہے؟“

”کل آپ غسل خانے میں بھی یہی گیت گارہے تھے۔“

”غسل خانے میں تو ہر شریف آدمی اپنی استطاعت کے مطابق گاتا ہے۔۔۔ اس لیے کہ وہاں کوئی سنسنے والا نہیں ہوتا۔۔۔ میرا خیال ہے، تمھیں میری آواز پسند نہیں آتی۔“

”آپ کی آواز توماشاء اللہ بڑی اچھی ہے۔“

”مجھے بنارہی ہو۔۔۔ مجھے اس کا علم ہے کہ میں کن سراہوں، میری آواز میں کوئی کشش نہیں۔۔۔ کوئی بھی اسے پھٹے بانس کی آواز کہہ سکتا ہے۔“

”مجھے تو آپ کی آواز بڑی سریلی معلوم ہوتی ہے، باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔۔۔ لیکن میں پوچھتی ہوں، ہر وقت یہ پنجابی بولی ورديزان کیوں رہتی ہے؟“

”مجھے اچھی لگتی ہے۔۔۔ بیگم تم کو اگر ادب اور شعر سے ذرا سا بھی شغف ہو۔۔۔“

”یہ شغف کیا بلایا ہے۔۔۔ آپ ہمیشہ ایسے الفاظ میں گفتگو کرتے ہیں جسے کوئی سمجھھی نہیں سکتا۔“

”شغف کا مطلب۔۔۔ بس تم یہ سمجھ لو۔۔۔ کہ اس کا مطلب لگاؤ ہے۔“

”مجھے شاعری سے لگاؤ کیوں ہو۔۔۔ ایسی واهیات چیز ہے۔“

”یعنی شاعری بھی ایک چیز ہو گئی۔۔۔ یہ تمہاری بڑی زیادتی ہے۔۔۔ فرصت کے لمحات میں اپنے اندر ذوق پیدا کیا کرو۔“

”چھپے پیدا کر چکی ہوں۔۔۔ اب میں اور کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتی۔“

”میں نے تم سے کئی مرتبہ کہا کہ معاملہ ختم ہونا چاہیے، پر تم ہی نہیں مانیں۔۔۔ چھپنچ پیدا کر کے تم تھک گئی ہو، تمہارے پڑوس میں مسز قیوم رہتی ہے اس کے گیارہ بچے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ میں بھی گیارہ ہی پیدا کروں؟“

”میں نے یہ کب کہا ہے۔۔۔ میں تو ایک کا بھی قائل نہیں تھا۔“

”میں اچھی طرح جانتی ہوں۔۔۔ جب میرے بچہ نہ ہوتا تو آپ اسی بہانے سے دوسری شادی کر لیتے۔“

”میں تو ایک ہی شادی سے بھر پایا ہوں۔۔۔ تم ساری زندگی کے لیے کافی ہو۔۔۔ میں دوسری شادی کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا۔“

”اور یہ پنجابی بولی کس لیے گائی جا رہی تھی؟“

”بھجنی، میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے یہ پسند ہے۔۔۔ تمھیں نالپسند ہو تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔۔۔ میری لگدی کسے نہ ویکھی۔۔۔ تے ٹلڈی نوں جگ جاندا۔“

”اس بولی میں آپ کو کیا لذت محسوس ہوتی ہے؟“

”میں اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”آپ نے اب تک کوئی بات وقوث سے نہیں کہی۔“

”وقوٹ نہیں۔۔۔ وثوق۔۔۔ یعنی یقین کے ساتھ۔“

”آپ نے ابھی تک کوئی بات ایسی نہیں کی جس میں یقین پایا جاتا ہو۔“

”لو، آج یہ نئی بات سنی۔۔۔ میری باتوں پر آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔“

”مردوں کی باتوں کا اعتبار ہی کیا ہے؟“

”عورتوں کی باتوں کا اعتبار ہی کیا۔۔۔ گھری میں تو گھری میں ماشہ۔۔۔ آپ ہی پھاڑتی ہیں، آپ ہی رونکرتی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا یہ آج کی برہمی کس بات پر ہے۔“

”آپ ایسے وابیات گیت گاتے رہیں اور میں چپ رہوں۔۔۔ اب سے دور قرآن در میان، آپ نے ہمیشہ مجھ سے بے اعتنائی کی۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو غزلوں اور گیتوں سے اتنی دلچسپی کیوں ہے۔۔۔ ابھی پچھلے دنوں آپ مسلسل یہ شعر گنگنا تے رہے:

سن ہے مہ جبینوں کو بھی کچھ کچھ
مردت کے قرینے آرہے ہیں

مجھے اس پر سخت اعتراض ہے۔۔۔ کوئی شریف آدمی ایسے شعر نہیں گاتا۔۔۔ آپ:

تیری ذات ہے اکبری سروری
میری بار کیوں دیر اتنی کری

کیوں نہیں گاتے۔“

”لا حول ولا۔۔۔ تم بھی کیسی اوٹ پٹانگ بتیں کرتی ہو۔“

”یہ بتیں گویا آپ کے نزدیک اوٹ پٹانگ ہیں۔۔۔؟ اس لیے کہ پاکیزہ ہیں؟“

”دنیا میں ہر چیز پا کیزہ ہے۔“

”آپ بھی؟“

”میں تو ہمیشہ صاف ستر ارتھتا ہوں، تم نے کئی مرتبہ اس کی تعریف کی ہے، دن میں دو مرتبہ کپڑے بدلتا ہوں، سخت سردی بھی ہو، غسل کرتا ہوں، تم تو تین چار دن چھوٹ کے نہاتی ہو، تمھیں پانی سے نفرت ہے۔“

”اچی وادا۔۔۔ میں تو ہر ہفتے باقاعدہ نہاتی ہوں۔“

”ہر ہفتے کا نہانا تو سفید جھوٹ ہے۔۔۔ قرآن کی قسم کھا کے بتاؤ، تمھیں نہائے ہوئے کتنے دن ہو گئے ہیں۔“

”میں قرآن کی قسم کھانے کے لیے تیار نہیں۔۔۔ آپ بتائیے کب غسل کیا تھا۔“

”آج صحیح۔“

”جھوٹ۔۔۔ آپ کا اول جھوٹ، آخر جھوٹ۔۔۔ آج صحیح تو میں پانی ہی نہیں تھا۔۔۔ میں نے سماڑھے نوبجے کے قریب دو مشکلین منگوائی تھیں۔“

”میں بھول گیا۔۔۔ واقعی آج میں نے غسل نہیں کیا۔“

”آپ کو بھول جانے کا مرض ہے۔“

”بھولنا انسان کی فطرت ہے۔۔۔ اس پر تمھیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔۔۔ چند روز ہوئے تم دس کانوٹ کہیں رکھ کے بھول گئی تمھیں اور مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے چوری کر لیا ہے۔۔۔ یہ کتنی بڑی زیادتی تھی۔“

”بھی آپ نے میرے روپے کبھی نہیں چرائے۔۔۔ پچھلے مہینے میری الماری سے آپ نے سوروپے نکالے اور غائب کر گئے۔

”ہو سکتا ہے وہ کسی اور نے چرائے ہوں۔۔۔ اگر تمہیں مجھ پر شک تھا تو بتا دیا ہوتا۔۔۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تم نے وہ سوروپے کا نوٹ کسی محفوظ جگہ رکھا ہوا اور بعد میں بھول گئی ہو۔۔۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے۔“

”کب؟“

”پچھلے سال اسی مہینے تم نے پانچ سوروپے کے نوٹ اپنے پلنگ کے بستر کے نیچے چھپا رکھے تھے اور تم ان کے متعلق بالکل بھول گئی تھیں۔۔۔ مجھ پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ میں نے چرائے ہیں۔۔۔ آخر میں نے ہی تلاش کر کے نکالے اور تمہارے حوالے کر دیے۔“

”کیا پتا ہے کہ آپ نے چرائے ہوں اور بعد میں میرے شور چالنے پر اپنی جیب سے نکال کر بستر کے نیچے رکھ دیے ہوں۔“

”میری سمجھ میں تمہاری یہ منطق نہیں آتی۔“

”آپ کی سمجھ میں تو کوئی چیز بھی نہیں آتی۔۔۔ کل میں نے آپ سے کہا تھا کہ دھی کھانا آپ کے لیے مفید ہے، لیکن آپ نے مجھے ایک لکچر پلا دیا کہ دھی فضول چیز ہے۔“

”دھی تو میں ہر روز کھاتا ہوں۔“

”کتنا کھاتے ہیں؟“

”یہی، کوئی آدھ سیر۔“

”میں ہر روز سیر منگواتی ہوں۔۔۔ باقی پڑا جھک مارتا رہتا ہے۔“

”دہی کو جھک مارنے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔ جو نجح جاتا ہے اس کی تم کڑھی بنائیتی ہو۔“

”میں دہی کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔۔۔ کڑھی بناتی ہوں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میں سلیقہ شعار عورت ہوں۔۔۔ میں نے آپ سے صرف اتنا پوچھا تھا کہ آپ آج کل ایک خاص پنجابی بولی کیوں ہر وقت گاتے رہتے ہیں۔“

”اس لیے کہ مجھے پسند ہے۔“

”کیوں پسند ہے۔۔۔؟ اس کی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔“

”تمہیں کالارنگ کیوں پسند ہے۔۔۔ اس کی وجہ بتاؤ؟ تمہیں بھنڈیاں مر غوب ہیں۔۔۔ کیوں؟ تمہیں سینما دیکھنے کا شوق ہے۔ اس کا جواز پیش کرو۔۔۔ تم لٹھے کی بجائے ریشم کی شلواریں پہنتی ہو۔۔۔ اس کی کیا وجہ ہے؟“

”آپ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ مجھ سے اس قسم کے سوال کریں۔۔۔ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔“

”اپنی مرضی کا مالک میں بھی ہوں۔۔۔ کیا مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ جو شعر بھی مجھے پسند ہو، اپنی بھونڈی آواز میں دن رات گاتا رہوں۔“

”مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔۔۔ لیکن میں صحیح ہوں۔۔۔“

”رک کیوں گئیں؟“

”دیکھیے، آپ میری زبان نہ کھلوائیے۔۔۔ میں نے آج تک آپ سے کچھ نہیں کہا، حالانکہ میں سب کچھ جانتی ہوں۔“

”تم میرے متعلق کیا جانتی ہو؟“

”سب کچھ۔“

”کچھ مجھے بھی بتادو، تاکہ میں اپنے متعلق کچھ جان سکوں--- میں تو سالہا سال کے غور و فکر کے بعد بھی اپنے متعلق کچھ جان نہ سکا۔“

”آپ اس پنجابی بولی میں جو آپ مسلسل گنگنا تے رہتے ہیں--- سب کچھ جان سکتے ہیں۔“

”تم اس قدر شاکی کیوں ہو؟“

”ہر مرد بے وفا ہوتا ہے۔“

میں نے تم سے کیا بے وفائی کی ہے--- اصل میں عورتیں جاوے بے جا پنے شوہروں پر شک کرتی رہتی ہیں۔“

ٹھہر یے--- دروازے پر دستک ہوئی ہے--- میرا خیال ہے، ڈاکیا ہے۔“

”یہ خط میرا ہے--- لاڈاڈھر۔“

”میں کھولتی ہوں--- پڑھ کے آپ کے حوالے کر دوں گی۔“

”تمھیں میرے خط پڑھنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔“

”میں ہمیشہ آپ کے خط پڑھتی رہی ہوں--- یہ حق آپ نے کب سے چھین لیا؟“

”اچھا یہ بتادو کہ خط کس کا ہے؟“

”آپ ہی کا ہے؟“

”کس نے لکھا ہے؟“

”آپ کی کسی سہیلی نے--- جس کا نام عذر اہے--- وہ پنجابی بولی جو آپ گاتے پھرتے ہیں اس کاغذ کی پیشانی پر لکھی ہے

میری لگدی کسے نہ دیکھی وے--- تے ٹنڈی نوں جگ جاندا۔

یہ ٹوٹتی جائے تو بہتر ہے۔“

-[129]-

پری: سعادت حسن منٹو

کشمیری گیٹ دہلی کے ایک فلیٹ میں انور کی ملاقات پرویز سے ہوئی۔ وہ قطعاً متاثر نہ ہوا۔ پرویز نہایت ہی بے جان چیز تھی۔ انور نے جب اس کی طرف دیکھا اور اس کو آداب عرض کھانا تو اس نے سوچا، ”یہ کیا ہے--- عورت ہے یا مولی۔“

پرویزا تین سفید تھی کہ اس کی سفیدی بے جان سی ہو گئی تھی۔ جس طرح مولی ٹھنڈی ہوتی ہے اسی طرح اس کا سفید رنگ بھی ٹھنڈا تھا۔ کمر میں ہاکا ساختم تھا جیسا کہ اکثر مولیوں میں ہوتا ہے۔ انور نے جب اس کو دیکھا تو اس نے سبز دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کو پرویز ہو ہو مولی نظر آئی جس کے ساتھ سبز پتے لگے ہوں۔

انور سے ہاتھ ملا کر پرویز اپنے ننھے سے کتے کو گود میں لے کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے سرخی لگے ہونٹوں پر جو اس کے سفید ٹھنڈے چہرے پر ایک دہلتا ہوا انگارہ سالگتے تھے، ضعیف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ کتے کے بالوں میں اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے لکھی کرتے ہوئے اس نے دیوار کے ساتھ لکھتی ہوئی انور کے دوست جمیل کی تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔“

انور کو اس کے ساتھ مل کر قطعاً خوبی نہیں ہوئی تھی۔ رنج بھی نہیں ہوا۔ اگر وہ سوچتا تو یقین طور پر اپنے صحیح رد عمل کو بیان نہ کر سکتا۔ دراصل پرویز سے مل کر وہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ایک لڑکی سے ملا ہے یا اس کی ملاقات کسی لڑکے سے ہوئی ہے۔ یا سردیوں میں کر کت کے میج دیکھتے ہوئے اس نے ایک مولیٰ خریدلی ہے۔

انور نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں خوبصورت تھیں۔ بس ایک صرف یہی چیز تھی جس کے متعلق تعریفی الفاظ میں کچھ کہا جا سکتا تھا۔ ان آنکھیں کے علاوہ پرویز کے جسم کے ہر حصے پر نکتہ چینی ہو سکتی تھی۔ باہمیں بہت پتلی تھیں جو چھوٹی آستینیوں والی قمیص میں سے بہت ہی تھیں آلو دند از میں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ اگر اس کے سر پر سبز دوپٹہ نہ ہوتا تو انور نے یقیناً اس کو فرج ڈیر سمجھا ہوتا جس کا رنگ عام طور پر اکتادینے والا سفید ہوتا ہے۔

اس کے ہونٹوں پر جیتے جیتے لہو جیسی سرخی بہت کھل رہی تھی۔ برف کے ساتھ آگ کا کیا جوڑ۔۔۔؟ اس کی چھوٹی آستینیوں والی قمیص سفید کمرک کی تھی۔ شلوار سفید لٹھے کی تھی۔ سینٹل بھی سفید تھے۔ اس تمام سفیدی پر اس کا سبز دوپٹہ اتنا انقلاب انگیز نہیں تھا۔ مگر اس کے سرخی لگے ہوئے ایک عجیب سا ہنگامہ خیز تضاد بن کر اس کے چہرے کے ساتھ چھٹے ہوئے تھے۔

صحن میں جب وہ چند قدم چل کر جیل کی طرف اپنے ننھے سے کتے کو دیکھتی ہوئی بڑھی تھی، تو انور نے محسوس کیا تھا کہ یہ عورت جو کہ آرہی ہے عورت نہیں شکاری ہے۔ اس سے ہاتھ ملاتے وقت اسے ایسا لگا تھا جیسے اس کا ہاتھ کسی لاش نے کپڑا لیا ہے۔ مگر جب اس نے باتیں شروع کیں تو وہ ٹھنڈی گرفت جو اس کے ہاتھ کے ساتھ چھٹی ہوئی تھی، کچھ گرم ہونے لگی۔

وہ آوارہ خیال تھی۔ اس کی باتیں سب کی سب بے جوڑ تھیں۔ موسم کا ذکر کرتے کرتے وہ اپنے درزی کی طرف لڑک گئی۔ درزی کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ اس کو اپنے کتے کی چھینکوں کا نیا ہاں آگیا۔ کتنے چھینکا تو اس نے اپنے خاوند کے متعلق یہ کہنا شروع کر دیا، ”وہ بالکل میر انخیال نہیں رکھتے۔ دیکھیے ابھی تک دفتر سے نہیں آئے۔“

انور کے لیے پرویز اور اس کا خاوند دونوں بالکل نئے تھے۔ وہ پرویز کو جانتا تھا نہ اس کے خاوند کو۔ گفتگو کے دوران میں صرف اس کو اس قدر معلوم ہوا کہ پرویز کا خاوند جیل کا پڑوسی ہے اور ایکسپورٹ اپیورٹ کا کام کرتا ہے۔ البتہ اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ پرویز گفتگو کے آغاز سے گفتگو کے اختتام تک اس کو ایسی نظریوں سے دیکھتی تھی جن میں جنسی بلا و اتحا۔ انور کو حیرت تھی کہ ایک ٹھنڈی مولیٰ میں یہ بلا و کیسے ہو سکتا ہے۔

وہ اٹھ کر جانے لگی تو اس نے گود سے اپنے ننھے کتے کو اتارا اور اس سے کہا، ”چلو ٹینی چلیں۔“ پھر مسز جمیل سے جیگر وول کے بارے میں کچھ پوچھ کر اپنے سرخ ہونٹوں پر چدری سی مسکراہٹ پیدا کر کے انور کی طرف ہاتھ بڑھا کر اس نے کہا، ”میرے ہز بند سے مل کر آپ کو بہت خوشی ہو گی۔“

ایک بار پھر انور نے فرج ڈیٹر میں اپنا ہاتھ دھویا اور سوچا، ”مجھے اس کے ہز بند سے مل کر کیا خوشی ہو گی۔ جب کہ یہ خود اس سے ناخوش ہے۔۔۔ اس نے کہا تھا کہ وہ میرا بالکل خیال نہیں رکھتے۔“

دیر تک وہ جمیل اور اس کی بیوی سے باتیں کرتا رہا کہ شاید ان میں سے کوئی پرویز کے متعلق بات کرے گا اور اس کو اس عورت کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوں گی جس کو اس نے ٹھنڈی مولی سمجھا تھا۔ مگر کوئی ایسی بات نہ ہوئی، جو پرویز کی شخصیت پر روشنی ڈالتی۔ جیگر وول کا ذکر آیا تو مسز جمیل نے صرف اتنا کہا، ”پری کا ٹیسٹ رنگوں کے بارے میں بہت اچھا ہے۔“

”پرویز۔۔۔ پری“ انور نے سوچا، ”کتنی غلط تخفیف ہے۔ یہ خستہ سی ریڑھ کی ہڈی والی عورت جس کا رنگ اکتا دینے والی حد تک سفید ہے۔۔۔ اس کو پری کہا جائے کیا یہ کوہ قاف کی توہین نہیں؟“

جب پرویز کے متعلق اور کوئی بات نہ ہوئی تو انور نے جمیل سے رخصت چاہی، ”اچھا بھائی میں چلتا ہوں۔“ پھر وہ مسز جمیل سے مخاطب ہوا، ”بھا بھی آپ کی پری بڑی دلچسپ چیز ہے۔“

مسز جمیل مسکرائی، ”کیوں؟“

انور نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔ مسز جمیل نے کیوں کہا تو اس کو کوئی جواب نہ سو جھا۔ تھوڑے سے تو قف کے بعد وہ مسکرا یا، ”کیا آپ کے نزدیک وہ دلچسپ نہیں؟ کون ہیں یہ محترمہ؟“

مسز جمیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ جمیل نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔ جمیل مسکرا کر اٹھا اور انور کے کاندھے کو دبا کر اس نے گٹک کر کہا، ”چلو تمہیں بتاتا ہوں کون ہیں یہ محترمہ۔۔۔ بڑی واجب تعظیم ہستی ہیں۔“

”آپ کو توبس کوئی موقعہ ملنا چاہیے۔“ مسز جمیل کے لجھ میں جھنجھلاہٹ تھی۔

جمیل ہنسا، ”کیا میں غلط کہتا ہوں کہ پری واجب تعظیم ہستی نہیں؟“

”میں نہیں جانتی“ یہ کہہ کر مسز جمیل اٹھی اور اندر کمرے میں چلی گئی۔ جمیل نے پھر انور کا کنڈھا دبایا اور اس سے مسکراتے ہوئے کہا، ”بیٹھ جاؤ۔۔۔ تمہاری بھا بھی نے تمیں پری کے متعلق بتائیں کرنے کا موقعہ دے دیا ہے۔۔۔“

انور بیٹھ گیا۔ جمیل نے سگریٹ سلاگایا اور اس سے پوچھا، ”تمہیں پری میں کیا دلچسپی نظر آئی؟“

انور نے کچھ دیر اپنے دماغ کو کریدا، ”دلچسپی۔۔۔؟ میں کچھ نہیں کہہ سکتا میر اخیال ہے اس کا غیر دلچسپ ہونا ہی شاید اس دلچسپی کا باعث ہے۔۔۔“

جمیل نے چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی، ”لکھوں کا الٹ پھیر نہیں چلے گا۔۔۔ صاف صاف بتاؤ تمہیں اس میں کیا دلچسپی نظر آئی؟“

انور کو یہ جرح پسند نہ آئی، ”مجھے جو کچھ کہنا تھا۔ میں نے کہہ دیا ہے۔“

جمیل ہنسا، پھر ایک دم سنجیدہ کر اس نے سامنے کمرے کی طرف دیکھا اور دبی زبان میں کہا، ”بڑی خطرناک عورت ہے انور۔“

انور نے حیرت سے پوچھا، ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ محترمہ دو آدمیوں کا خون کراچی ہے۔“

انور کی آنکھوں کے سامنے معاپرویز کا سفید رنگ آگیا، مسکرا کر کہنے لگا، ”اس کے باوجود ابھو کی ایک چھینٹ بھی نہیں اس میں۔“ لیکن فوراً ہی اس کو معاملے کی شگینی کا خیال آیا تو اس نے سنجیدہ ہو کر جمیل سے پوچھا، ”کیا کہا تم نے۔۔۔؟ دو آدمیوں کا خون؟“

انور نے چنکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی، ”جی ہاں۔۔۔ ایک کیپٹن تھا۔ دوسرا سر بہاؤ الدین کا لڑکا۔“

”کون سر بہاؤ الدین؟“

”اماں وہی۔۔۔ جو ایگر یکچھ ڈیپارٹمنٹ میں خدا معلوم کیا تھے۔“

انور کو کچھ پتہ نہ چلا۔ بہاؤ الدین کو چھوڑ کر اس نے جمیل سے پوچھا۔

”کیسے خون ہوا ان دونوں کا؟“

”بھیسے ہوا کرتا ہے۔ کالج میں کیپٹن صاحب سے پری کا یارانہ تھا۔ شادی کر کے جب وہ بھبھی گئی تو وہاں سر بہاؤ الدین کے لڑکے سے راہ در سم پیدا ہو گئی۔ اتفاق سے ٹرنینگ کے سلسلے میں کپتان صاحب وہاں پہنچے۔ پرانے تعلقات قائم کرنا چاہے تو سر بہاؤ الدین کے لڑکے آڑے آئے۔ ایک پارٹی میں دونوں کی بیچ ہوئی۔ دوسرے روز کپتان صاحب نے پستول داغ دیا۔ رقبیب وہیں ڈھیر ہو گئے، پری کو بہت افسوس ہوا۔ سر بہاؤ الدین کے لڑکے کی موت کے غم میں اس نے کئی دن سوگ میں کاٹے۔ جب کپتان صاحب کو بھانسی ہوئی تو لوگ کہتے ہیں۔ اس کی آنکھوں نے ہزارہا اصلی آنسو بھائے۔۔۔ اس کے بعد ایک نوجوان پارسی اس کے دام محبت میں گرفتار ہو گیا۔ وصل کی رات جب اسے پتہ چلا کہ اس کی محبوبہ شادی شدہ ہے تو اس نے اپنے باپ کی ڈسپنسری سے زہر لے کر کھالیا۔“

انور نے کہا، ”یہ تین خون ہوئے۔“

جمیل مسکرا یا، ”نوجوان پارسی خوش قسمت تھا، اس کے باپ نے اسے موت کے منہ سے بچالیا۔“

”بڑی عجیب و غریب عورت ہے۔“ یہ کہہ کر انور سوچنے لگا کہ پرویز جس میں کشش نام کو بھی نہیں کیسے ان ہنگاموں کا باعث ہوئی۔ کپتان نے اس میں کیا دیکھا۔ سر بہاؤ الدین کے لڑکے کو اس میں کیا چیز نظر آئی۔۔۔؟ اور اس نوجوان پارسی نے اس ڈھیلی ڈھالی عورت میں کیا دلکشی دیکھی؟

انور نے پرویز کو تصور میں نگاہ کر کے دیکھا۔ ڈھیلی ڈھالی ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ جس پر سفید گوشہ منڈھا ہوا تھا۔ خون کے بغیر کوئی
دلے پتے لڑکے کے کوالہوں جیسے تھے۔ ریڑھ کی ہڈی میں کوئی دم نہیں تھا۔ ایسا معلوم تھا کہ اگر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کسی نے دبایا تو وہ
دونیم ہو جائے گی۔ بال کٹے ہوئے تھے جو ہائیڈروجن پر اکسانڈر کے استعمال سے اپنا قدرتی رنگ کھو چکے تھے۔۔۔ کیا تھا اس کے سر پا
میں۔۔۔؟ ایک فقط اس کی آنکھیں کچھ غنیمت تھیں۔

انور نے سوچا۔ صرف آنکھیں کون چلتا پھرتا ہے۔۔۔ کوئی بات ہونی چاہیے۔۔۔ لیکن حیرت ہے کہ اس ٹھنڈی مولی نے اتنے بڑے
ہنگامے پیدا کیے۔ مجھ سے توجہ اس نے ہاتھ ملایا تھا تو میں نے خیال کیا تھا کہ مجھے بد بودار ڈکاریں آئی شروع ہو جائیں گی۔۔۔ کچھ سمجھ میں
نہیں آتا۔ لیکن کچھ نہ کچھ ہے ضرور اس پری میں۔

جمیل نے اسے بتایا کہ راولپنڈی میں پرویز کے کالج کے رومان مشہور ہیں۔ اس زمانے میں اس کے بیک وقت تین تین چار چار لڑکوں سے
رومان چلتے تھے۔ چھ لڑکے اسی کے باعث کالج بدر ہوئے۔ ایک کو بیمار ہو کر سینے ٹوریم میں داخل ہونا پڑا۔ انور کی حیرت بڑھ گئی۔ اس نے
جمیل سے پوچھا۔ کون ہے اس کا خاوند۔۔۔؟ اور خود کس کی لڑکی ہے؟ جمیل نے جواب دیا، ”بہت بڑے باپ کی۔۔۔ کسی زمانے میں احمد
آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے، آجکل ریٹائرڈ ہیں۔۔۔ خاوند اس کا ہندو ہے۔“

”ہندو؟“

”نہیں، اب عیسائی ہو چکا ہے۔“

”کیا کرتا ہے؟“

”میرا خیال ہے شروع میں اس کا ذکر آیا تھا کہ ایکسپورٹ اپورٹ کا کام کرتا ہے۔“

انور کو یاد آگیا، ”ہاں، ہاں کچھ ایسی بات ہوئی تھی۔۔۔ شاید بھابی جان نے بتایا تھا؟“

جمیل اور انور تھوڑی دیر خاموش رہے۔ جمیل نے سگریٹ سلاکا یا اور ادھر ادھر دیکھ کر کہ اس کی بیوی نہ سن رہی ہو، انور کا کاندھا دبا کر سر گوشی میں کہا، ”تم پری سے ضرور ملو۔۔۔ دیکھنا کیا ہوتا ہے؟“

انور نے خود سے پوچھا مگر جمیل سے کہا، ”کیا ہو گا؟“

جمیل کے ہونٹوں میں ایک شریر سی مسکراہٹ پیدا ہوئی، ”وہی ہو گا جو منظورِ خدا ہو گا۔“ پھر اس نے آواز دبا کر کہا، ”کل شام چائے وہیں پہنیں گے۔ اس کا خاوندرات کو آتا ہے۔“

پروگرام طے ہو گیا۔ پرویز کے متعلق اتنی باتیں سن کر اس کے دماغ میں کھد بد سی ہو رہی ہے۔ وہ بار بار سوچتا تھا ملاقات پر کیا ہو گا۔۔۔ کوئی غیر معمولی چیز و قوع پذیر ہوگی۔۔۔ ہو سکتا ہے جمیل نے مذاق کیا ہو۔۔۔ ہو سکتا ہے جمیل نے جو کچھ بھی اس کے بارے میں کہا سرتاپا غلط ہو۔ لیکن پھر اسے خیال آتا، جمیل کو خواہ مخواہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔“

دوسرے روز شام کو جمیل اور وہ دونوں پری کے ہاں آگئے۔ وہ غسل خانے میں نہار ہی تھی۔ نو کرنے ان کو بڑے کمرے میں بٹھا دیا۔ انور ووگ کی ورق گردانی کرنے لگا۔ دفتار جمیل اٹھا، ”میں سگریٹ بھول آیا۔۔۔ ابھی آتا ہوں“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

انور ”ووگ“ میں چپھی ہوئی ایک تصویر دیکھ رہا تھا کہ اسے کمرے میں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا۔ نظریں اٹھا کر اس نے دیکھا تو پرویز تھی۔ انور سپٹا گیا۔ اس نے سفید پاجامہ پہنانا ہوا تھا جو جا بجا گیلا تھا۔ ململ کا کرتہ اس کے پانی سے تربدن کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ مسکرا کر اس نے انور سے کہا، ”آپ بڑے انہاک سے تصویریں دیکھ رہے ہے تھے۔“

پرچہ چھوڑ کر انور اٹھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر پرویز اس کے پاس آگئی۔ پرچہ اٹھا کر اس نے ایک ہاتھ سے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو ایک طرف کیا۔ اور مسکرا کر کہا، ”مجھے معلوم ہے کہ آپ آئے ہیں تو میں ایسے ہی چلی آئی۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے ململ کے گیلے کرتے کو دیکھا جس میں دو کالے دھبے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ پھر اس نے انور کا ہاتھ پکڑا، ”چلیے اندر چلیں۔“

انور منمنایا، ”جمیل۔۔۔ جمیل بھی ساتھ تھا میرے۔۔۔ سگریٹ بھول آیا تھا۔ لینے گیا ہے۔“

پرویز نے انور کو سمجھا، ”وہ آجائے گا۔۔۔ چلیے۔“

انور کو جانا ہی پڑا۔ جس کمرے میں وہ داخل ہوئے اس میں کوئی کرسی نہیں تھی۔ دو اسپر نگوں والے سا گوانی پنگ تھے۔ ایک ڈرینگ ٹیبل تھی۔ اس کے ساتھ ایک اسٹول پڑا تھا۔ پری اس اسٹول پر بیٹھ گئی اور ایک پنگ کی طرف اشارہ کر کے انور سے کہا، ”بیٹھیے۔“

انور بچکھاتے ہوئے بیٹھ گیا۔ اس نے چاہا کہ جمیل آجائے، کیونکہ اسے بے حد لمحن ہو رہی تھی۔ پرویز کے گلے کرتے کے ساتھ چھٹے ہوئے دو کالے دھبے اس کو دواندھی آنکھیں لگتے تھے جو اس کے سینے کو گھور گھور کر دیکھ رہی ہیں۔ انور نے اٹھ کر جانا چاہا، ”میرا خیال ہے میں جمیل کو بلا لا اوں“، مگر وہ اس کے ساتھ پنگ پر بیٹھ گئی۔ ڈرینگ ٹیبل پر رکھے ہوئے فریم کی طرف اشارہ کر کے اس نے انور سے کہا، ”یہ میرے ہند بند ہیں۔۔۔ بہت خالم آدمی ہے جمیل صاحب۔“

انور منمنایا، ”آپ مذاق کرتی ہیں۔“

”جی نہیں۔۔۔ میرے اور اس کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔۔۔ اصل میں شادی سے پہلے مجھے دیکھ لینا چاہیے تھا کہ وہ مجھے سمجھتا ہے کہ نہیں۔۔۔ جس چیز کا مجھے شوق ہوا سے بالکل پسند نہیں ہوتی۔۔۔ آپ بتائیے۔ یہ کہتی ہوئی وہ اوٹ لگا کر پنگ پر اوندھی لیٹ گئی، ”اس طرح لینے میں کیا ہرج ہے؟“

انور ایک کونے میں سر ک گیا۔ اسے کوئی جواب نہ سو جھا۔ اس نے صرف اتنا سوچا، ”اس کا درمیانی حصہ کتنا غیر نسوانی ہے۔“

پرویز اوندھی لیٹی رہی، ”آپ نے جواب نہیں دیا مجھے۔۔۔ بتائیے اس طرح لینے میں کیا ہرج ہے؟“

انور کا حلق سوکھنے لگا، ”کوئی ہرج نہیں۔“

”لیکن اس کو ناپسند ہے۔۔۔ خدا معلوم کیوں۔“ یہ کہہ کر پرویز نے گردن ٹیڑھی کر کے انور کی طرف دیکھا، ”آدمی اس طرح لیٹے تو معلوم ہوتا ہے تیر رہا ہے۔۔۔ میں لیٹیوں تو اور پر بڑا تکیہ رکھ لیا کرتی ہوں۔ ذرا اٹھائیئے نا وہ تکیہ اور میرے اوپر رکھ دیجیے۔“

انور کا حلق بالکل خشک ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کیا کرے۔ اٹھنے لگا تو پرویز نے اپنی پتلی ناگ سے اس کو روکا، ”بیٹھ جائیے نا!“

”جی میں جمیل---“

وہ مسکرائی، ”جمیل بے وقوف ہے، ایک دن مجھ سے با تین کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا“ اپنے خاوند کے سوامیر اور کسی سے وہ تعلق نہیں رہا جو ایک مرد اور عورت میں ہوتا ہے۔ تو وہ ہنسنے لگا۔ مجھے تو ویسے بھی اس تعلق سے نفرت ہے۔۔۔ ذرا تکیہ اٹھا کر رکھ دیجیے نامیرے اوپر!“ انور اسی بہانے اٹھا۔ تکیہ دوسرے کو نے میں پڑا تھا۔ اسے اٹھایا اور پرویز کے درمیانی حصہ پر جو کہ بہت ہی غیر نسوانی تھار کھ دیا۔ پرویز مسکرائی، ”شکریہ۔۔۔ بیٹھیے اب با تین کریں۔“

”جی نہیں۔۔۔ آپ تکیے سے با تین کریں۔ میں چلا۔“ یہ کہہ کر انور پسینہ پوچھتا باہر نکل گیا۔

-[130]-

ٹوٹو: سعادت حسن منشو

میں سوچ رہا تھا:

دنیا کی سب سے پہلی عورت جب مال بنی تو کائنات کا رد عمل کیا تھا؟ دنیا کے سب سے پہلے مرد نے کیا آسمانوں کی طرف تتمتی آنکھوں سے دیکھ کر دنیا کی سب سے پہلی زبان میں بڑے فخر کے ساتھ یہ نہیں کہا تھا، ”میں بھی خالق ہوں۔“

ٹیلی فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ میرے آوارہ خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ بلکنی سے اٹھ کر میں اندر کمرے میں آیا۔ ٹیلی فون ضدی بچ کی طرح چلا گئے جا رہا تھا۔ ٹیلی فون بڑی مفید چیز ہے، مگر مجھے اس سے نفرت ہے، اس لیے کہ یہ وقت بے وقت بجھے لگانا ہے۔۔۔ چنانچہ بہت ہی بد دلی سے میں نے ریسیور اٹھایا اور نمبر بتایا، ”فور فور فائیوسیون۔“

دوسرے سرے سے ہیلو ہیلو شروع ہوئی۔ میں جھنجھلا گیا، ”کون ہے؟“

جواب ملا، ”آیا۔“

میں نے آیاں کے طرز گفتگو میں پوچھا، ”کس کو مانگتا ہے؟“

”میم صاحب ہے؟“

”ہے۔۔۔ ٹھہرو۔“

ٹیلی فون کاریسیور ایک طرف رکھ کر میں نے اپنی بیوی کو جو غالباً اندر سورہ ہی تھی، آواز دی، ”میم صاحب۔۔۔ میم صاحب۔“

آواز سن کر میری بیوی اٹھی اور جمایاں لیتی ہوئی آئی، ”یہ کیا مذاق ہے۔۔۔ میم صاحب، میم صاحب!“

میں نے مسکرا کر کہا، ”میم صاحب ٹھیک ہے۔۔۔ یاد ہے، تم نے اپنی پہلی آیا سے کہا تھا کہ مجھے میم صاحب کے بد لے بیگم صاحبہ کہا کرو تو اس نے بیگم صاحبہ کو بیگن صاحبہ بنادیا تھا۔“

ایک مسکراتی ہوئی جمائی لے کر میری بیوی نے پوچھا، ”کون ہے؟“

”دریافت کرلو۔“

میری بیوی نے ٹیلی فون اٹھایا اور ہیلو ہیلو شروع کر دیا۔۔۔ میں باہر بالکنی میں چلا گیا۔۔۔ عورت تین ٹیلی فون کے معاملے میں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ چنانچہ پندرہ میں منٹ تک ہیلو ہیلو ہوتا رہا۔

میں سوچ رہا تھا۔

ٹیلی فون پر ہر دو تین الفاظ کے بعد ہیلو کیوں کہا جاتا ہے؟

کیا اس بولہو کے عقب میں احساس کمتری تو نہیں۔۔۔؟ بار بار بولو صرف اسے کرنی چاہیے جسے اس بات کا اندیشہ ہو کہ اس کی مہمل گفتگو سے تنگ آکر سننے والا ٹیلی فون چھوڑ دے گا۔۔۔ یا ہو سکتا ہے یہ محض عادت ہو۔

دفعتاً میری بیوی گھبرائی ہوئی آئی، ”سعادت صاحب، اس دفعہ معاملہ بہت ہی سیر لیں معلوم ہوتا ہے۔“

”کون سامعاملہ؟“

معاملے کی نوعیت بتائے بغیر میری بیوی نے کہنا شروع کر دیا، ”بات بڑھتے بڑھتے طلاق تک پہنچ گئی ہے۔۔۔ پاگل پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔۔۔ میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں کہ بات کچھ بھی نہیں ہو گی۔ لب بمحسری کا بھگندر بناؤ گا۔۔۔ دونوں سر پھرے ہیں۔“

”اچی حضرت کون؟“

”میں نے بتایا نہیں آپ کو۔۔۔؟ اوہ۔۔۔ ٹیلی فون، طاہرہ کا تھا!“

”طاہرہ۔۔۔ کون طاہرہ؟“

”مسنیز زدائلی۔“

”اوہ!“ میں سارا معاملہ سمجھ گیا، ”کوئی نیا جھگڑا ہوا ہے؟“

”نیا اور بہت بڑا۔۔۔ جائیے یزدانی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”مجھ سے کیا بات کرنا چاہتا ہے؟“

”معلوم نہیں۔۔۔ طاہرہ سے ٹیلی فون چھین کر مجھ سے فقط یہ کہا۔ بھابی جان، ذرا منشو صاحب کو بلا یئے!“

”خواہ مخواہ میر امغرز چاٹے گا۔“ یہ کہہ کر میں اٹھا اور ٹیلی فون پریز دانی سے مخاطب ہوا۔

اس نے صرف اتنا کہا، ”معاملہ بے حد نازک ہو گیا ہے۔۔۔ تم اور بھابی جان ٹیکسی میں فوراً یہاں آجائو۔“

میں اور میری بیوی جلدی کپڑے تبدیل کر کے یزدانی کی طرف روانہ ہو گئے۔۔۔ راستے میں ہم دونوں نے یزدانی اور طاہرہ کے متعلق بے شمار باتیں کیں۔

طاہرہ ایک مشہور عشق پیشہ موسیقار کی خوبصورت لڑکی تھی۔ عطا یزدانی ایک پٹھان آڑھتی کا لڑکا تھا۔ پہلے شاعری شروع کی، پھر ڈرامہ نگاری، اس کے بعد آہستہ آہستہ فلمی کہانیاں لکھنے لگا۔۔۔ طاہرہ کا باپ اپنے آٹھویں عشق میں مشغول تھا اور عطا یزدانی علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک کے لیے ”بیلچے“ نامی ڈرامہ لکھنے میں۔۔۔

ایک شام پر یہ کرتے ہوئے عطا یزدانی کی آنکھیں طاہرہ کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ ساری رات جاگ کر اس نے ایک خط لکھا اور طاہرہ تک پہنچا دیا۔۔۔ چند ماہ تک دونوں میں نامہ و پیام جاری رہا اور آخر کار دونوں کی شادی بغیر کسی حیل جحت ہو گئی۔ عطا یزدانی کو اس بات کا افسوس تھا کہ ان کا عشق ڈرامے سے محروم رہا۔

طاہرہ بھی طبعاً ڈرامہ پسند تھی۔۔۔ عشق اور شادی سے پہلے سہیلیوں کے ساتھ باہر شوپنگ کو جاتی تو ان کے لیے مصیبت بن جاتی۔۔۔ گنجے آدمی کو دیکھتے ہی اس کے ہاتھوں میں کھجلی شروع ہو جاتی، ”میں اس کے سر پر ایک دھول تو ضرور جماوں گی، چاہے تم کچھ ہی کرو۔“

ذہین تھی۔۔۔ ایک دفعہ اس کے پاس کوئی پیٹی کوٹ نہیں تھا۔ اس نے کمر کے گرد ازار بند باندھا اور اس میں ساڑی اڑس کر سہیلیوں کے ساتھ چل دی۔

کیا طاہرہ واقعی عطا یزدانی کے عشق میں بنتا ہوئی تھی؟ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یزدانی کا پہلا عشقیہ خط ملنے پر اس کا رد عمل غالباً یہ تھا کہ کھلی دلچسپ ہے کیا ہرج ہے، کھلی لیا جائے۔ شادی پر بھی اس کا رد عمل کچھ اسی قسم کا تھا۔ یوں تو مضبوط کردار کی لڑکی تھی، یعنی جہاں تک باعصمت ہونے کا تعلق ہے، لیکن تھی کھنڈری۔ اور یہ جو آئے دن اس کا اپنے شوہر کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہوتا تھا، میں سمجھتا ہوں ایک کھلی ہی تھا۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے اور حالات دیکھئے تو معلوم ہوا کہ یہ کھلی بڑی خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا۔

ہمارے داخل ہوتے ہی وہ شور برپا ہوا کہ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ طاہرہ اور یزدانی دونوں اونچے اونچے سروں میں بولنے لگے۔ گلے، شکوے، طعنے ہٹنے۔۔۔ پرانے مردوں پر نئی لاشیں، نئی لاشوں پر پرانے مردے۔۔۔ جب دونوں تھک گئے تو آہستہ آہستہ لڑائی کی نوک پلک نکلنے لگی۔

طاہرہ کو شکایت تھی کہ عطا اسٹوڈیو کی ایک وابحیات ایکٹرس کو ٹیکسیوں میں لیے لیے پھرتا ہے۔

یزدانی کا بیان تھا کہ یہ سراسر بہتان ہے۔

طاہرہ قرآن اٹھانے کے لیے تیار تھی کہ عطا کا اس ایکٹرس سے ناجائز تعلق ہے۔ جب وہ صاف انکاری ہوا تو طاہرہ نے بڑی تیزی کے ساتھ کہا، ”کتنے پار سائبنتے ہو۔۔۔ یہ آیا جو کھڑی ہے، کیا تم نے اسے چونمنے کی کوشش نہیں کی تھی۔۔۔ وہ تو میں اوپر سے آگئی۔۔۔“

یزدانی گر جا، ”بکواس بند کرو۔“

اس کے بعد پھر وہی شور برپا ہو گیا۔ میں نے سمجھایا۔ میری بیوی نے سمجھایا مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ عطا کو تو میں نے ڈالا بھی، ”زیادتی سراسر تمہاری ہے۔۔۔ معافی مانگو اور یہ قصہ ختم کرو۔“ عطا نے بڑی سمجھیدگی کے ساتھ میری طرف دیکھا، ”سعادت، یہ قصہ یوں ختم نہیں ہو گا۔۔۔ میرے متعلق یہ عورت بہت کچھ کہہ چکی ہے، لیکن میں نے اس کے متعلق ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔۔۔ عنایت کو جانتے ہو تم؟“

”عنایت؟“

”پلے بیک سنگر---اس کے باپ کا شاگرد!“

”ہاں ہاں“

”اول درجے کا چھٹا ہوا بد معاشر ہے---مگر یہ عورت ہر روز اسے یہاں بلا قیمت ہے---بہانہ یہ ہے کہ---“

طاہرہ نے اس کی بات کاٹ دی، ”بہانہ وہانہ کچھ نہیں---بولو، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

عطانے انتہائی نفرت کے ساتھ کہا، ”کچھ نہیں۔“

طاہرہ نے اپنے ماتھے پر بالوں کی جھال رائیک طرف ہٹائی، ”عنایت میر اچا ہے والا ہے---بس!“

عطانے گالی دی---عنایت کو موٹی اور طاہرہ کو چھوٹی---پھر شور برپا ہو گیا۔

ایک بار پھر وہی کچھ دہرا یا گیا۔ جو پہلے کئی بار کہا جا چکا تھا۔۔۔ میں نے اور میری بیوی نے بہت شاشی کی مگر نتیجہ وہی صفر۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے عطا اور طاہرہ دونوں اپنے جھگڑے سے مطمئن نہیں۔ لڑائی کے شعلے ایک دم بھڑکتے تھے اور کوئی مرئی نتیجہ پیدا کیے بغیر ٹھنڈے ہو جاتے تھے۔ پھر بھڑکائے جاتے تھے، لیکن ہوتا ہوا تکچھ نہیں تھا۔

میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ عطا اور طاہرہ چاہتے کیا ہیں مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔۔۔ مجھے بڑی الجھن ہو رہی تھی۔ دو گھنٹے سے بک بک اور جھک جھک جاری تھی۔ لیکن انجمام خدا معلوم کہاں بھکر رہا تھا۔ تنگ آکر میں نے کہا، ”بھائی، اگر تم دونوں کی آپس میں نہیں بخ سکتی تو بہتر یہی ہے کہ علیحدہ ہو جاؤ۔“

طاہرہ خاموش رہی، لیکن عطانے چند لمحات غور کرنے کے بعد کہا، ”علیحدگی نہیں---طلاق!“

طاہرہ چلائی، ”طلاق، طلاق، طلاق۔۔۔ دیتے کیوں نہیں طلاق۔۔۔ میں کب تمہارے پاؤں پڑی ہوں کہ طلاق نہ دو۔“

عطانے بڑی مضبوط لمحے میں کہا، ”دے دوں گا اور بہت جلد۔“

طاہرہ نے اپنے ماتھے پر سے بالوں کی جھال رائیک طرف ہٹائی، ”آج ہی دو۔“

عطاءٹھ کر ٹیلی فون کی طرف بڑھا، ”میں قاضی سے بات کرتا ہوں۔“

جب میں نے دیکھا کہ معاملہ بگڑ رہا ہے تو اٹھ کر عطا کو روکا، ”بے وقوف نہ بنو۔۔۔ بیٹھو آرام سے!“

طاہرہ نے کہا، ”نہیں بھائی جان، آپ مت رو کیے۔“

میری بیوی نے طاہرہ کو ڈانٹا، ”بکواس بند کرو۔“

”یہ بکواس صرف طلاق ہی سے بند ہو گی۔“ یہ کہہ کر طاہرہ ناگ ہلانے لگی۔

”سن لیا تم نے؟“ عطا مجھ سے مخاطب ہو کر پھر ٹیلی فون کی طرف بڑھا، لیکن میں درمیان میں کھڑا ہو گیا۔

طاہرہ میری بیوی سے مخاطب ہوئی، ”مجھے طلاق دے کر اس چڑواکیشرس سے بیاہ رچائے گا۔“

عطانے طاہرہ سے پوچھا، ”اور تو؟“

طاہرہ نے ماتھے پر بالوں کے پسینے میں بھیکی ہوئی جھال رہا تھا سے اوپر کی، ”میں۔۔۔ تمہارے اس یوسفِ ثانی عنایت خان سے!“

”بس اب پانی سر سے گز رچ کا ہے۔۔۔ حد ہو گئی ہے۔۔۔ تم ہٹ جاؤ ایک طرف۔“ عطا نے ڈائرکٹر کی اٹھائی اور نمبر دیکھنے لگا۔ جب وہ ٹیلی فون کرنے لگا تو میں نے اسے روکنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ ڈائل کیا لیکن نمبر نہ ملا۔ مجھے موقعہ ملا تو میں نے اسے پر زور الفاظ میں کہا کہ اپنے ارادے سے باز رہے۔ میری بیوی نے بھی اس سے درخواست کی مگر وہ مانا۔ اس پر طاہرہ نے کہا، ”صفیہ، تم کچھ نہ کہو۔۔۔ اس آدمی کے پہلو میں دل نہیں پتھر ہے۔۔۔ میں تمہیں وہ خط دکھاؤں گی جو شادی سے پہلے اس نے مجھے لکھے تھے۔۔۔ اس وقت میں اس کے دل کا قرار اس کی آنکھوں کا نور تھی۔ میری زبان سے کلام ہوا صرف ایک لفظ اس کے تن مردہ میں جان ڈالنے کے لیے کافی تھا۔۔۔ میرے چہرے کی صرف ایک جھلک دیکھ کر یہ بتو شی مرنے کے لیے تیار تھا۔۔۔ لیکن آج اسے میری ذرہ برابر پروانہیں۔“

عوا نے ایک بار پھر نمبر ملانے کی کوشش کی۔

طاہرہ بولتی رہی، ”میرے باپ کی مو سیقی سے بھی اسے عشق تھا۔۔۔ اس کو فخر تھا کہ اتنا بڑا آرٹسٹ مجھے اپنی دامادی میں قبول کر رہا ہے۔۔۔ شادی کی منظوری حاصل کرنے کے لیے اس نے ان کے پاؤں تک دابے، پر آج اسے ان کا کوئی خیال نہیں۔“

عوا ڈائل گھما تارہا۔

طاہرہ مجھ سے مخاطب ہوئی، ”آپ کو یہ بھائی کہتا ہے، آپ کی عزت کرتا ہے۔۔۔ کہتا تھا جو کچھ بھائی جان کہیں گے میں مانوں گا۔۔۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں۔۔۔ ٹیلی فون کر رہا ہے قاضی کو۔۔۔ مجھے طلاق دینے کے لیے۔“

میں نے ٹیلی فون ایک طرف ہٹا دیا، ”عوا، اب چھوڑو بھی۔“

”نہیں“ یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

طاہرہ بولی، ”جانے دیجیے بھائی جان۔۔۔ اس کے دل میں میرا کیا، ٹوٹو کا بھی کچھ خیال نہیں!“

عوا تیزی سے پلٹا، ”نام نہ لوٹوٹو کا!“

طاہرہ نے نتھنے پھلا کر کہا، ”کیوں نام نہ لوں اس کا؟“

عطانے ریسیور رکھ دیا، ”وہ میرا ہے!“

طاہرہ اٹھ کھڑی ہوئی، ”جب میں تمہاری نہیں ہوں تو وہ کیسے تمہارا ہو سکتا ہے۔۔۔ تم تو اس کا نام بھی نہیں لے سکتے۔“

عطانے کچھ دیر سوچا، ”میں سب بندوبست کر لوں گا۔“

طاہرہ کے چہرے پر ایک دم زردی چھا گئی، ”ٹوٹو کو چھین لو گے مجھ سے؟“

عطانے بڑے مضبوط لمحے میں جواب دیا، ”ہاں۔“

”ظالم۔“

طاہرہ کے منہ سے ایک چیز نکلی۔ بے ہوش کر گرنے والی ہی تھی کہ میری بیوی نے اسے تھام لیا۔۔۔ عطا پریشان ہو گیا۔ پانی کے چھینٹے۔ یوڈی کلوں۔ اسمانگ سالٹ۔ ڈاکٹروں کو ٹیلی فون۔۔۔ اپنے بال نوچ ڈالے، قیسیں چھاڑا ڈالی۔۔۔ طاہرہ ہوش میں آئی تو وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھکنے لگا، ”جانم ٹوٹو تمہارا ہے۔۔۔ ٹوٹو تمہارا ہے۔“

طاہرہ نے رونا شروع کر دیا، ”نہیں وہ تمہارا ہے۔“

عطانے طاہرہ کی آنسوؤں بھری آنکھوں کو چومنا شروع کر دیا، ”میں تمہارا ہوں، تم میری ہو۔۔۔ ٹوٹو تمہارا بھی ہے، میرا بھی ہے۔“

میں نے اپنی بیوی سے اشارہ کیا۔ وہ باہر نکلی تو میں بھی تھوڑی دیر کے بعد چل دیا۔۔۔ نیکسی کھڑی تھی، ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میری بیوی مسکرا رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا، ”یہ یہ ٹوٹو کون ہے؟“

میری بیوی کھکھلا کر نہس پڑی، ”ان کا لڑکا۔“

میں نے حیرت سے پوچھا، ”لڑکا؟“

میری بیوی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے اور زیادہ حیرت سے پوچھا، ”کب پیدا ہوا تھا۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔“

”ابھی پیدا نہیں ہوا۔۔۔ چوتھے مہینے میں ہے۔“

چوتھے مہینے، یعنی اس واقعے کے چار مہینے بعد، میں باہر بالکن میں بالکل خالی الذہن بیٹھا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ بڑی بے دلی سے اٹھنے والا تھا کہ آواز بند ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میری بیوی آئی۔ میں نے اس سے پوچھا، ”کون تھا؟“

”یزدانی صاحب۔“

”کوئی نئی لڑائی تھی؟“

”نہیں۔۔۔ طاہرہ کے لڑکی ہوئی ہے۔۔۔ مری ہوئی۔“ یہ کہہ کروہ روتی ہوئی اندر چلی گئی۔

میں سوچنے لگا، ”اگر اب طاہرہ اور عطا کا جھگڑا ہوا تو اسے کون ٹوٹوچ کائے گا؟“

بھنگنوں کی باتیں ہو رہی تھیں۔ خاص طور پر ان کی جو بٹوارے سے پہلے امر تسری میں رہتی تھیں۔ مجید کا یہ ایمان تھا کہ امر تسری بھنگنوں جیسی کراری چھو کریاں اور کہیں نہیں پائی جاتیں۔ خدا معلوم تقسیم کے بعد وہ کہاں تتر بترا ہو گئی تھیں۔

رشید ان کے مقابلے میں گجریوں کی تعریف کرتا تھا۔ اس نے مجید سے کہا، ”تم ٹھیک کہتے ہو کہ امر تسری بھنگنیں اپنی جوانی کے زمانے میں بڑی پرکشش ہوتی ہیں، لیکن ان کی یہ جوانی کھترانیوں کی طرح زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی۔۔۔ بن ایک دن جوان ہوتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اوہ یہڑ ہو جاتی ہیں۔۔۔ ان کی جوانی معلوم نہیں کون سا چور چڑا کے لے جاتا ہے۔ خدا کی قسم۔۔۔ ہمارے ہاں ایک بھنگ کو ٹھاکمانے آتی تھی۔۔۔ اتنی کڑیل جوان تھی کہ میں اپنی کمزور جوانی کو محسوس کر کے اس سے کبھی بات نہ کر سکا۔۔۔ عیسائی مشنریوں نے اسے اپنے مذہب میں داخل کر لیا تھا۔ نام اس کا فاطمہ تھا۔ پہلے گھروالے اسے چھاتو کہتے تھے۔۔۔ مگر جب وہ عیسائی ہوئی تو اسے مس چھاتو کے نام سے پکارا جانے لگا۔۔۔ صبح کو وہ بریک فاست کرتی تھی، دوپہر کو لونچ اور شام کو ڈوز۔۔۔ لیکن چند مہینوں کے بعد میں نے اسے دیکھا کہ اس کی ساری کڑیل جوانی جیسے پگھل گئی ہے۔۔۔ اس کی چھاتیاں جو بڑی تند خود تھیں اور اس طرح اوپر اٹھی رہتی تھیں جیسے ابھی اپنا سارا جوان بدن آپ پر داغ دیں گی، اس قدر نیچے ڈھلک گئی تھیں کہ ان کا نام و نشان بھی نہیں ملتا تھا۔

لیکن اس کے مقابلے میں ہمارے گھر میں وہ گجری جو اپلے کر آتی تھی، تیر کی طرح سیدھی تھی۔ اس کی عمر بھی اتنی ہو گی جتنی اس بھنگن کی تھی۔۔۔ مگر وہ تین برس کے بعد بھی ولیسی ہی جوان تھی۔۔۔ سروقد۔۔۔ اپلوں کاٹو کر اس کے سر پر ہوتا تھا۔۔۔ ایک پہاڑ ساینا ہوا۔ مگر مجال ہے کہ اس کی گردن میں ملکی سی جنبش آجائے یا اس کی کمر میں خفیف ساخم آجائے۔۔۔ تین برس وہ ہمارے یہاں آتی رہی۔ اس کے بعد اس کی شادی ہو گئی۔۔۔ اس کے بعد دیگرے تین لڑکے پیدا ہوئے۔۔۔ اور مجید! میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کی کمر ولیسی ہی مضبوط تھی۔۔۔ تم میری مان لو کہ بھنگنیں، گجریوں کا مقابلہ کسی صورت بھی نہیں کر سکتیں۔“

مجید تلملا رہا تھا۔ اس نے پان کی گلوری پندرہ نیا میں سے نکال کر اپنے کلے میں دبائی۔ چھوٹی ڈبیا سے ماچس کی تیلی کی مدد سے تھوڑا سا قوام نکالا اور منہ میں ڈال کر بڑے تحمل سے کہا، ”رشید بھائی۔۔۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔ لیکن جس بھنگن کا تصور میرے دماغ میں ہے، اور جس کی دراصل میں بات کرنا چاہتا تھا۔۔۔ ایک فتنہ تھا۔۔۔ اب تم ایسا کرو کہ میری ساری داستان سن لوتا کہ تمہیں اس فتنہ و قیامت کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے۔

جب بن ڈھلنے کی تم جوبات کرتے ہو، اس کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ گجریوں کا قد لمبا ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر انھیں جلدی ڈھلانا چاہیے، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہ نگے پاؤں رہتی ہیں اور اپنے سر پر بقول تمہارے پہاڑ سا اپلوں کاٹو کر اٹھائے اٹھائے پھرتی ہیں۔۔۔ لیکن

لخت سمجھو فی الحال گھر یوں پر، کیوں کہ مجھے بچنی کی بات کرنا ہے جو ہمارے محلے کی بڑی کراری بھنگ تھی۔۔۔ اس کا قدم تو انگشتانہ بھر کا تھا مگر زبان اسکندری گز تھی۔ شادی شدہ تھی، مگر خاوند سے ہر روز لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔ ہمارے کمپاؤنڈ میں یہ دونوں میاں بیوی ہر روز صبح سویرے آتے اور ایک بڑے درخت کے ساتھ جھولا لٹکا دیتے۔ اس میں وہ اپنا لڑکا ڈال دیتے تھے۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اس کو جھلانے والا کوئی نہیں تھا، چنانچہ دونوں میاں بیوی جھاڑو چھوڑ کر اسے جھولا جھلاتے یا گود میں اٹھائے پھرتے تھے۔“

رشید نے مجید سے کہا، ”یہ جھولے کی بات کہاں سے آگئی۔۔۔ تم تو ایک کراری بھنگ کی بات کر رہے تھے۔۔۔ جو بقول تمہارے بہت خوبصورت تھی۔“

مجید نے فوراً کہا، ”یا ر تم جھولے کے ساتھ کیوں اٹک گئے۔۔۔ میری پوری کہانی تو سن لو۔۔۔ یہ جھولے کی نہیں بچنی کی بات ہے۔۔۔ اس بچنی کی جسے میں ساری عمر فراموش نہیں کر سکتا۔۔۔ وہ ایک آفت تھی۔۔۔ صبح اپنے خاوند کے ساتھ آتی تھی۔۔۔ ہاتھ میں لمبی سی جھاڑو لیے۔۔۔ ماٹھے پر سیکڑوں تیوریاں۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ابھی جھاڑو آپ کے سر پر دے مارے گی۔۔۔ مگر ایسا موقع کبھی نہیں آیا۔۔۔ میں نے ہزاروں بار اس کو گھورا، لیکن اس نے میرے سر پر جھاڑو نہیں ماری۔۔۔ اس کی تیوریاں اس کے ماٹھے پر بدستور قائم رہیں اور وہ حسب سابق اپنا کام کرتی رہیں۔ اس کا خاوند جس کا نام معلوم نہیں کیا تھا، اول درجے کا زن مرید تھا۔ اس کا قدم اپنی بیوی سے بھی چھوٹا تھا۔ وہ اس کو کام کے دوران میں ہمیشہ گالیاں دیا کرتی تھی۔۔۔ محلے کے سب لوگ سنتے تھے اور آپس میں چہ میگیو یاں کرتے تھے۔“

رشید اتنی لمبی داستان سن کر بھنا گیا، ”تم اصل بات کی طرف آؤ۔۔۔ یہ کیا چے مے گوئیاں بک رہے ہو۔۔۔ بچنی نام بڑا چھا ہے، ورنہ خدا کی قسم! میں تمہاری یہ خرافات کبھی نہ سنتا۔۔۔ معلوم نہیں۔۔۔ یہ تمہاری جوڑی ہوئی کہانی ہے۔۔۔ بہر حال، تمہیں چند منٹ دیتا ہوں۔۔۔ سنالو۔“

مجید تاؤ میں آگیا، ”لو کے پٹھے۔۔۔ تم نے صرف بچنی کا نام سنائے، کبھی تم نے اسے دیکھا ہو تا تو دل بکال کر اس کے ٹوکرے میں ڈال دیا ہوتا۔۔۔ میں تم سے اگر ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں تو اس میں نمک مرچ لگانے کی مجھے اجازت ہونی چاہیے۔۔۔ تم اگر آلتا گئے ہو تو جہنم میں جاؤ۔“

رشید کو اور کوئی کام نہیں تھا۔ اس کے پاس اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ کسی سینما میں چلا جاتا، اس لیے اس نے مناسب سمجھا کہ مجید کی داستان سن لے ”جہنم میں جانے کا سوال نہیں۔۔۔ تم ذرا اختصار سے کام لو۔۔۔ اصل میں مجھے بچنی سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔“

مجید غصے میں آگیا، ”تمہاری دلچسپی کی ایسی کی تیسی۔۔۔ سالے، تم کون ہوتے ہو اس میں دلچسپی لینے والے۔۔۔ اس میں دلچسپی لینے والے تم ایسے ہزاروں تھے، مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔۔۔ میں تم سے کروڑ مرتبہ زیادہ خوبصورت ہوں، لیکن میں اس نگہ التفات کا ہر وقت منتظر رہتا تھا۔۔۔ وہ بڑی پہلی تھی۔۔۔ میرے دوست رشید، خدا کی قسم! اس جیسی لڑکی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ نام اس کا پچھنی تھا۔۔۔ یعنی پچن سے تعلق رکھتا تھا۔۔۔ مگر وہ تو پچاچاٹنی تھی۔۔۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ اس کو اپنے قبضے میں لے آؤں، پر ناکام رہا۔ وہ پٹھے پر ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتی تھی۔“

یہ سن کر رشید بولا، ”تم پار ہمیشہ ایسے معاملوں میں کورے رہے ہو۔“

مجید کے گھری چوت لگی، ”بکواس کرتے ہو۔۔۔ میں نے ایک روز اسے پکڑ لیا۔۔۔ میرے گھر کے باہر وہ جھاڑو دے رہی تھی کہ میں نے اس کا بازو پکڑ لیا اور اپنے ساتھ چھٹا لیا۔“

”پھر کیا ہوا؟“ رشید نے ازراہ مذاق سکریٹ سلگا کیا اور ماچس کی تیلی بجھا کر اس کے کئی ٹکڑے کر کے ایش ٹرے میں ڈال دیے۔ مجید کو ایسا محسوس ہوا کہ رشید نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں۔ بہت جزبز ہوا، لیکن آدمی سچا تھا اس لیے جھوٹ نہ بول سکا، ”رشید! تم مذاق اڑاتے ہو۔۔۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ اس روز ہوا، اس کا مذاق اڑانا ہی چاہیے۔۔۔ میں نے اسے اپنے ساتھ بھیجن لیا۔۔۔ لیکن اس حرام زادی نے کھینچ کے اپنی جھاؤ میرے منہ پر دے ماری۔ میں شرم کے مارے اندر بھاگ گیا۔۔۔ لیکن فوراً باہر نکلا۔۔۔ دیکھا کہ وہ میرے مکان کے باہر جھاؤ دے رہی ہے۔۔۔ میں نے اسے پھر کپڑا۔۔۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔۔۔ میں نے سوچا۔۔۔“

رشید نے مجید کا فقرہ مکمل کر دیا، ”کہ معاملہ درست ہو گیا ہے۔“

مجید بوکھلا گیا، ”خاک درست ہوا۔۔۔ وہ میری گرفت سے نکل کر سید ہمیشہ میری بیوی کے پاس چل گئی۔۔۔ لیکن اس سے کوئی شکایت نہ کی۔۔۔ میں ڈر کے مارے دبکا ہوا تھا۔۔۔ میں نے صرف یہ سننا اور میری جان کا بوجھ ہلا کا ہوا، ”لبی جی آج پانی نہیں آیا۔۔۔ یہ ان لوگوں کو جو آپ سے ہر مہینے دس روپے وصول کرتے ہیں، کیا یہو گلیا ہے۔۔۔ کیوں وہ اتنا خیال نہیں کرتے کہ آپ کو ہر روز ماشکی کو دس مشکوں کے چار آنے فی مشک کے حساب دور پی آٹھ آنے دینا پڑیں۔۔۔“ میں نے خدا کالا کھلا کھلا شکر ادا کیا کہ اس نے میری عزت و آبرور کھ

لی۔۔۔ لیکن میں نے بعد میں سوچا کہ میری عزت و آبرور کھنے والی اصل میں بچنی۔۔۔ لیکن جب زیادہ سوچا تو احساس ہوا کہ ایسا سوچنا کفر ہے۔۔۔

رشید قریب قریب نگ آچکا تھا۔ اس نے اپنے دوست کی خاطر آواز دبا کر کہا، ”کافر کے بچ۔۔۔ بات تو کر کہ تیر اس بچنی کی بچنی سے کیا ہوا۔۔۔ کیا تم نے اسے پٹالیا؟“

مجید نے رشید کی پند نیا میں سے ایک گلوری لی اور کہا، ”دیکھو رشید۔۔۔ تم بچنی کو جانتے نہیں۔۔۔ افسوس ہے کہ میں افسانہ نگار نہیں ورنہ میں اس کا کردار بہت اچھی طرح۔۔۔ جیتا جائیں کر سکتا۔۔۔ وہ معلوم نہیں شے کیا تھی۔۔۔ عمر اس کی زیادہ سے زیادہ۔۔۔ یہ سمجھو کہ سترہ اٹھارہ برس کے قریب ہو گی۔۔۔ قد اس کا ساڑھے چار فٹ ہو گا۔۔۔ چھاتی ایسی تھی جیسے لوہے کی بنی ہے، حالانکہ ایک بچے کی ماں تھی۔۔۔“

رشید بہت نگ آگیا، ”ایک بچے کی ماں کے بچے۔۔۔ تو اپنی داستان کے انعام کو پہنچ۔۔۔ مجھے ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے۔۔۔ ساڑھے سات نج چکے ہیں، لیکن تمہاری داستان ہی ختم ہونے میں نہیں آتی۔“

مجید سنجیدہ رہا، ”شید لالے۔۔۔ معاملہ بڑا نازک ہے۔۔۔“

”کس کا۔۔۔ تمہارا یا میرا؟“

”میں نہیں کہہ سکتا، لیکن جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں، اس وقت معاملہ میرا تو بہت نازک تھا۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں، کیا نہ کروں۔۔۔ اب تم یہ خیال کرو کہ میں ہزاروں کامالک تھا۔۔۔ تم جانتے ہو کہ ماں باپ مر کھپ چکے تھے۔۔۔ ساری جائیداد کا میں وارث تھا۔ جہاں چاہتا، لٹادیتا۔۔۔ اس روز جب میں نے بچنی کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچا اور وہ میری گرفت سے یوں الگ ہٹی جیسے میرا کام تمام کر دے گی، لیکن میری بیوی سے اس نے اس سلسلے کا ذکر تک نہ کیا تو مجھے امید ہو گئی کہ چند ایسے معاملوں کے بعد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

رشید نے اس سے پوچھا، ”تجھے کامیابی ہوئی؟“

”خاک--- تم اسے جانتے ہی نہیں--- بڑی تیز خود کی ہے--- اپنے خاوند کو کچھ نہیں سمجھتی--- لیکن ایک عجیب بات ہے کہ میں نے اس سے اتنی چھیر خانی کی، لیکن اس نے کسی سے بات تک نہ کی، ورنہ اگر چاہتی تو میر اگھر نکلا کر سکتی تھی۔“

رشید مسکرا یا۔ ”میں تمہاری پچنی کو جانتا ہوں---!“

مجید نے بڑی حیرت سے پوچھا، ”تم کیسے جانتے ہو اس کو؟“

”جس طرح تم جانتے ہو--- کیا تم نے ٹھیکہ لے رکھا ہے کہ وہ تمہارے ہی محلے کے کام کیا کرے--- میں اس کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“

مجید کو یقین نہ آیا، ”بکواس کرتے ہو--- اس کی عمر ہی کتنی ہے کہ تم اسے جانو۔ دو برس سے کچھ مہینے اوپر ہو گئے ہیں کہ وہ ہمارے محلے میں بلاناغ آتی ہے۔ اس کے لڑکے کی عمر بھی دو سال کے قریب ہو گی--- یعنی جب وہ ہمارے ہاں ملازم ہوئی تو اس کے کوئی بچہ نہیں تھا۔ لیکن دو تین مہینے کے بعد اس کی گود میں ایک لڑکا تھا۔“

رشید پھر مسکرا یا، ”تمہارا؟“

”میرا!“ مجید گھبرا گیا، لیکن فوراً سنبھل کر اس نے مذاق کا جواب مذاق میں دیا، ”میرا ہوتا تو کیا کہنے تھے--- کم از کم میں یہ تو کہنے کے قابل ہو جاتا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔“

رشید کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب رنگ اختیار کر گئی، ”تمہیں اپنی پچنی کے شوہر کا نام معلوم نہیں؟“

”نہیں!“

”میں بتاتا ہوں تمہیں--- اس کے شوہر کا نام رشید ہے۔“

مجید بوکھلا گیا، ”رشید۔۔۔ کیا اس کا نام رشید ہے؟“

رشید نے بڑے وثوق اور بڑی سنجیدگی سے جواب دیا، ”ہاں۔۔۔ اس کا نام رشید ہے۔۔۔ اصل میں وہی اس کا شوہر ہے۔“

”وہ جو اس کے ساتھ ہمارے محلے میں جھاڑو دیتا ہے اور اپنے بچے کو جھولا جھلاتا ہے؟“ مجید کی بوکھلاہٹ اسی طرح قائم تھی۔

رشید کی سنجیدگی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا، ”وہ الوکا پٹھا اپنے بچے کو جھولا نہیں جھلاتا!“

”تو کسے جھلاتا ہے۔۔۔ کیا وہ اس رشید کا بچہ نہیں؟“

”نہیں!“

”تو کس کا بچہ ہے؟“

”ایک غریب اور ندار آدمی کا۔۔۔ جو خوبصورت بھی نہیں۔۔۔ تم سے ہزاروں درجے نیچے ہے۔“

”کون ہے وہ؟“

”پوچھ کے کیا کرو گے؟“

”کروں گا کیا۔۔۔ بس ایسے ہی جاننا چاہتا ہوں۔“

رشید نے ایک سکریٹ سلگایا اور بڑے اطمینان سے کہا، ”جاننا چاہتے ہو تو جان لو۔۔۔ وہ رشید میں ہوں۔۔۔ تمہاری بچنی سے میری آشنا بچپن کی ہے۔۔۔ وہ گیارہ برس کی تھی۔۔۔ میں تیرہ برس کا۔۔۔ جب سے میرا اس کا معاملہ چل رہا ہے۔۔۔ وہ لڑکا جو تم اس کی گود میں

دیکھتے ہو اور جسے اس کا الوکا پھاشوہر ہر روز جھولا جھلاتا ہے، اس خاکسار کی اولاد ہے۔۔۔ شکر ہے خداوند کریم کا کہ لڑکی نہ ہوئی، ورنہ میں تو اسے دوسرے ہی روز مارڈالتا۔۔۔

یہ کہہ کر رشید فوراً اٹھا اور چلا گیا۔۔۔ مجید سوچتا رہ گیا کہ خداوند کریم نے اس پر کون سا کرم کیا تھا جو وہ اس کا شکر گزار تھا۔۔۔!

-[132]-

نکی: سعادت حسن منٹو

طلاق لینے کے بعد وہ بالکل نچنت ہو گئی تھی۔ اب وہ ہر روز کی دن تاکل کل اور مارکٹائی نہیں تھی۔ نکی بڑے آرام واطمینان سے اپنا گزر اوقات کر رہی تھی۔

یہ طلاق پورے دس برس کے بعد ہوئی تھی۔ نکی کا شوہر بہت ظالم تھا۔ پر لے درجے کا گھٹو اور شرابی کبابی۔ بھنگ چرس کی بھی لست تھی۔ کئی کئی دن بھنگر خانوں میں اور تکیوں میں پڑا رہتا تھا۔ ایک لڑکا ہوا تھا۔ وہ پیدا ہوتے ہی مر گیا۔ برس کے بعد ایک لڑکی ہوئی جو زندہ تھی اور اب نوبرس کی تھی۔

نکی سے اس کے شوہر گام کو اگر کوئی دلچسپی تھی تو صرف اتنی کہ وہ اس کومار پیٹ سکتا تھا۔ جی بھر کے گالیاں دے سکتا تھا۔ طبیعت میں آئے تو کچھ عرصے کے لیے گھر سے نکال دیتا تھا۔ اس کے علاوہ نکی سے اس کو اور کوئی سروکار نہیں تھا۔ محنت مزدوری کی جب تھوڑی سی رقم نکی کے پاس جمع ہوتی تھی تو وہ اس سے زبردستی چھپیں لیتا تھا۔

طلاق بہت پہلے ہو چکی ہوتی، اس لیے کہ میاں بیوی کے نباد کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ یہ صرف گام کی ضرر تھی کہ معاملہ اتنی دیر لٹکا رہا۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ تھی کہ نکی کے آگے پیچھے کوئی بھی نہ تھا۔ ماں باپ نے اس کو ڈولی میں ڈال کر گام کے سپرد کیا اور دو مہینے کے اندر اندر رہی ملک بقا ہوئے جیسے انھوں نے صرف اسی غرض کے لیے موت کو روک رکھا تھا۔ انھیں اپنی بیٹی کو ایک لمبی موت کے لیے گام کے حوالے کرنا تھا۔ بہت دور کے دو ایک رشتہ دار ہوں گے مگر نکی سے ان کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ انھوں نے خود کو اور زیادہ دور کر لیا تھا۔

گام کیسا ہے، یہ نکی کے ماں باپ اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کی بیٹی ساری عمر وہی رہے گی، یہ بھی ان کو اچھی طرح معلوم تھا۔ مگر انھیں تو اپنی زندگی میں ایک فرض سے سبکدوش ہونا تھا، اور ایسے سبکدوش ہوئے کہ سارا بوجھ نکی کے ناتواں کا ندھوں پر ڈال گئے۔

طلاق لینے سے نکی کا یہ مطلب نہیں تھا کہ کسی شریف سے نکاح کرنا چاہتی تھی۔ دوسرا شادی کا اس کو کبھی خیال تک بھی نہ آیا تھا۔ طلاق ہونے کے بعد وہ کیا کرے گی، کیا نہیں کرے گی، اس کے متعلق بھی نکی نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اصل میں وہ ہر روز کی بک بک اور جھک جھک سے صرف ایک اطمینان کا سنس لینا چاہتی تھی۔ اس کے بعد جو ہونے والا تھا اس کو نکی خاموشی برداشت کرنے کے لیے تیار تھی۔

لڑائی بھگڑے کا آغاز تو پہلے روز ہی سے ہو گیا تھا جب نکی دو لہن بن کر گام کے گھر گئی تھی۔ لیکن طلاق کا سوال اس وقت پیدا ہوا تھا جب وہ گام کے سدھار کے لیے دعائیں مانگ کر عاجز آگئی تھی اور اس کے ہاتھ اپنی یا اس کی موت کے لیے اٹھنے لگے تھے۔ جب یہ حیله بھی بے اثر ثابت ہوا تو اس نے اپنے شوہر کی منت سماجت شروع کی کہ وہ اسے بخش دے اور علیحدہ کر دے، مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ دس برس کے بعد تیکے میں ایک ادھیر عمر کی میراث سے گام کی آنکھ لڑائی اور ایک دن اس کے کہنے پر اس نے نکی کو طلاق دے دی اور بیٹی پر بھی اپنا کوئی حق نہ جتایا۔ حالانکہ نکی کو اس بات کا ہمیشہ دھڑکا رہتا تھا کہ اگر اس کا شوہر طلاق پر راضی بھی ہو گیا تو وہ بیٹی کبھی اس کے حوالے نہیں کرے گا۔۔۔ بہر حال نکی نچنت ہو گئی۔ اور ایک چھوٹی سی کوٹھری کرائے پر لے کر چین کے دن گزارنے لگی۔

اس کے دس برس اداں خاموشی میں گزرے تھے۔ دل میں ہر روز اس کے بڑے بڑے طوفان جمع ہوتے تھے مگر وہ خاوند کے سامنے اف ٹک نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے کہ اسے بچپن ہی سے یہ تعلیم ملی تھی کہ شوہر کے سامنے بولنا ایسا گناہ ہے جو کبھی بخشنادی نہیں جاتا۔ اب وہ آزاد تھی اس لیے وہ چاہتی تھی کہ اپنے دس برس کی بھڑاس کسی نہ کسی طرح نکالے۔ چنانچہ ہمسایوں سے اس کی اکثر لڑائی بھڑائی ہونے لگی۔ معمولی تو تو میں میں ہوتی جو گالیوں کی جنگ میں تبدیل ہو جاتی۔ نکی پہلے جس قدر خاموش تھی، اب اسی قدر اس کی زبان چلتی تھی۔ مٹا مٹی میں وہ اپنے مد مقابل کی ساتوں پیڑھیاں پُن کر رکھ دیتی۔ ایسی ایسی گالیاں اور سٹھنیاں دیتی کہ حریف کے چھکے چھوٹ جاتے۔

آہستہ آہستہ سارے محلے پر نکی کی دھاک بیٹھ گئی۔ یہاں کار و باری قسم کے مرد رہتے تھے جو صحیح سویرے الٹھ کر کام پر نکل جاتے اور رات دیر سے گھر لوٹتے۔ سارے دن میں عورتوں میں جو لڑائی بھگڑا ہوتا، اس سے وہ مرد بالکل الگ تھلگ رہتے تھے۔ ان میں سے شاید کسی کو پتا بھی نہیں تھا کہ نکی کون ہے اور محلے کی ساری عورتیں اس سے کیوں دیتی ہیں۔

چرخہ کات کر، بھوں کے لیے گذے گڑیاں بناؤ اور اسی طرح کے چھوٹے موٹے کام کر کے وہ گزر اوقات کے لیے کچھ نہ کچھ پیدا کر لیتی تھی۔ طلاق لیے اسے قریب قریب ایک برس ہو چلا تھا۔ اس کی بیٹی بھولی اب گیارہ کے لگ بھگ تھی اور بڑی سرعت سے جوان ہو رہی تھی، نکی کو اس کی شادی بیاہ کی بہت فکر تھی۔ اس کے اپنے زیور تھے جو ایک ایک کر کے گام نے چٹ کر لیے تھے۔ ایک صرف ناک کی کیل باقی رہ گئی تھی، وہ بھی گھس گھسا کر آدھی رہ گئی تھی۔

اسے بھولی کا پورا جھینپھین بناتا تھا اور اس کے لیے کافی روپیہ درکار تھا۔ تعلیم تھی، وہ اس نے اپنی طرف سے ٹھیک دی تھی۔ قرآن ختم کر دیا تھا۔ معمولی حرف شناسی کر لیتی تھی۔ کھانا پکانا خوب آتا تھا۔ گھر کے دوسرے کام کا جبھی اچھی طرح جانتی تھی۔ چونکہ نکی کو اپنی زندگی میں بہت تعلیم تجربہ ہوا تھا اس لیے اس نے بھولی کو خاوند کا اطاعت گزار ہونے کے لیے کبھی اشارتاً بھی نہیں کہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی سسرال میں چھپر کھٹ پر بیٹھی راج کرے۔

ماں کے ساتھ جو کچھ بیتا تھا اس پتکا سارا حال بھولی کو معلوم تھا مگر ہمسایوں کے ساتھ جب نکی کی لڑائی ہوتی تھی تو وہ پانی پی پی کر اسے کوستی تھیں اور یہ طعنہ دیتی تھیں کہ وہ مظلوم ہے جس کو خاوند نے صرف اس لیے علیحدہ کیا تھا کہ اس غریب کاناکس میں دم کر کھاتھا۔ اور بہت سی باتیں اپنی ماں کے کردار و اطوار کے متعلق اس کی ساعت میں آتی تھیں مگر وہ خاموش رہتی تھی۔ بڑے بڑے معز کی لڑائیاں ہوتیں مگر وہ کان سمیئے اپنے کام میں لگی رہتی۔

جب سارے محلے پر نکی کی دھاک بیٹھ گئی تو کئی عورتوں نے مرعوب ہو کر اس کے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ کئی اس کی سہیلیاں بن گئیں۔ جب ان کی اپنی کسی بڑو سن سے لڑائی ہوتی تو نکی ساتھ دیتی اور ہر ممکن مدد کرتی۔ اس کے بد لے میں اس کو کبھی قیص کے لیے کپڑا مل جاتا تھا، کبھی پھل، کبھی مٹھائی اور کبھی کبھی کوئی بھولی کے لیے سوٹ بھی سلواد بتاتھا۔

لیکن جب نکی نے دیکھا کہ ہر دوسرے تیرے دن اسے محلے کی کسی نہ کسی عورت کی لڑائی میں شریک ہونا پڑتا ہے اور اس کے کام کا جگہ ہر ج ہوتا ہے تو اس نے پہلے دبی زبان سے پھر کھلے لفظوں میں اپنا معاوضہ مانگنا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ اپنی فیس بھی مقرر کر لی۔ معز کی جنگ ہو تو پچیس روپے، دن زیادہ لگیں تو چالیس۔ معمولی بچ کے صرف چار روپے اور دو وقت کا کھانا۔ درمیانے درجے کی لڑائی کے پندرہ روپے۔۔۔ کسی کی سفارش ہو تو وہ کچھ رعایت بھی کر دیتی تھی۔

اب چونکہ اس نے دوسروں کی طرف سے لڑنا اپنی پیشہ بنالیا تھا، اس لیے اسے محلے کی تمام عورتوں اور ان کی بہو بیٹیوں کے تمام فضحتے یاد رکھنے پڑتے تھے۔ ان کا تمام حسب و نسب معلوم کر کے اپنی یادداشت میں محفوظ کرنا پڑتا تھا۔ مثال کے طور پر اس کو معلوم تھا کہ اونچی حولی والی سوداگر کی بیوی جو اپنی ناک پر کمکھی نہیں بیٹھنے دیتی، ایک موچی کی بیٹی ہے، اس کا باپ شہر میں لوگوں کے جوتنے گانٹھا پھر تھا اور اس کا خاوند جو جناب شیخ صاحب کہلاتا ہے معمولی قصائی تھا۔ اس کے باپ پر ایک رندی مہربان ہو گئی تھی، وہ اسی کے بطن سے تھا اور یہ اونچی حولی والی اس طوالے نے اپنے یار کو بنوا کر دی تھی۔

کس لڑکی کا کس کے ساتھ معاشرہ ہے، کون کس کے ساتھ بھاگ گئی تھی، کون کتنے حمل گرا چکی ہے، اس کا حساب سب نکی کو معلوم تھا۔ یہ تمام معلومات حاصل کرنے میں وہ کافی محنت کرتی تھی۔ کچھ مبالغہ اس کو اپنے موکلوں سے مل جاتا تھا۔ اسے اپنی معلومات کے ساتھ ملا کروہ ایسے ایسے بھم بناتی کہ مد مقابل کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ ہوشیار و کیلوں کی طرح وہ سب سے وزنی ضرب صرف اسی وقت استعمال کرتی تھی جب لوہا پوری طرح سرخ ہوتا، چنانچہ یہ ضرب سولہ آنے فیصلہ کن ثابت ہوتی تھی۔

جب وہ اپنے موکل کے ساتھ کسی مجاز پر جاتی تھی تو گھر سے پوری طرح کیل کانٹے سے لیس ہو کے جاتی تھی، طعنے مہنوں اور گالیوں اور سٹھنیوں کو موثر بنانے کے لیے مختلف اشیا بھی استعمال کرتی تھی۔ مثال کے طور پر گھسا ہوا جوتا، پھٹی ہوئی قمیص، چمنا، پچکنی وغیرہ وغیرہ۔ کوئی خاص تشبیہ دینی ہو یا کوئی خاص الخاص اشارہ یا کنایہ مطلوب ہو تو وہ اس غرض کے لیے کار آمد شے گھر ہی سے لے کر چلتی تھی۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ آج وہ جنتے کے لیے خیر اس سے لڑی ہے، تو دوڑھائی مہینے کے بعد اسی خیر اس سے ڈبل فیس لے کر اسے جنتے سے لڑنا پڑتا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ گھبراتی نہیں تھی۔ اسے اپنے فن میں اس قدر مہارت ہو گئی تھی اور اس کی پرکیش میں وہ اتنی مخلص تھی کہ اگر کوئی فیس دیتا تو وہ اپنی بھی دھجیاں کمھیر دیتی۔

نکی اب فارغ البال تھی۔ ہر مہینے اسے اب اتنی آمدن ہونے لگی تھی کہ اس نے پس انداز کر کے اپنی بیٹی بھولی کا جھینپنا شروع کر دیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اتنے گھنے پاتے اور کپڑے لئے ہوئے گئے تھے کہ وہ کسی بھی وقت اپنی بیٹی کو ڈولی میں ڈال سکتی تھی۔

اپنے ملنے والیوں سے وہ بھولی کے لیے کوئی اچھا سابر تلاش کرنے کی بات کئی مرتبہ کر چکی تھی۔ شروع شروع میں تو اس کو کوئی اتنی جلدی نہیں تھی، مگر بھولی سولہ برس کی ہو گئی۔ لوٹھا کی لوٹھا۔ قد کاٹھ کی چونکہ اچھی تھی، اس لیے چودھویں برس ہی میں پوری جوان عورت بن گئی تھی۔ سترھویں میں تو ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کی چھوٹی بہن ہے، چنانچہ اب نکی کو دن رات اس کے بیاہ کی فکر تانے لگی۔

نکی نے بڑی دوڑدھوپ کی۔ کوئی صاف انکار تو نہیں کرتا تھا مگر دل سے ہامی بھی نہیں بھرتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ہونہ ہو لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ اس کی یہ صفت کہ لڑنے کے فن میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی، دراصل اس کے آڑے آرہی تھی۔ بعض گھروں میں تو وہ خود ہی سلسلہ جنبانی نہ کرتی کہ اس کی کسی عورت کا اس نے کبھی ناطقہ بند کیا تھا۔ دن پر دن چڑھتے جا رہے تھے اور گھر میں پہاڑ سی جوان بیٹی کنواری بیٹھی تھی۔

نکی کو اپنے پیشے سے اب گھن آنے لگی، اس نے سوچا کہ ایسا ذلیل کام کیوں اس نے اختیار کیا۔ مگر وہ کیا کرتی، محلے میں آرام چین کی جگہ پیدا کرنے کے لیے اسے پڑو سنوں کا مقابلہ کرنا ہی تھا۔ اگر وہ نہ کرتی تو اسے دب کے رہنا پڑتا۔ پہلے خاوند کے جوتے کھاتی تھی، پھر ان کی پیزار کی غلامی کرنی پڑتی۔ یہ عجیب بات تھی کہ بر سوں دبیل رہنے کے بعد جب اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور مختلف قوتوں کا مقابلہ کر کے ان کو شکست دی، یہ تو تم جھک کر اس کی امداد کی طالب ہوئیں کہ دوسری قوتوں کو شکست دیں اور اس کو اس امداد پر کچھ اس طرح راغب کیا گیا کہ اس کو چسکا ہی پڑ گیا۔

اس کے متعلق وہ سوچتی تو اس کا دل نہ مانتا تھا۔ کیوں کہ اس نے صرف بھولی کی خاطر اس پیشے کو جسے اب لوگ ذلیل سمجھنے لگے تھے اختیار کیا تھا۔ یہ بھی کم عجیب چیز نہیں تھی۔ نکی کو روپے دے کر کسی عورت پر انگلی رکھ دی جاتی تھی، اور اس سے کہا جاتا تھا کہ وہ اس کی ساتوں پیڑھیاں پن ڈالے۔۔۔ اس کے آبا اجداد کی ساری کمزوریاں ماضی کے ملبے سے کرید کرید کر نکالے اور اس کے وجود پر چھید کر دے۔۔۔ نکی یہ کام بڑی ایمان داری سے کرتی، وہ گالیاں جوان کے منہ میں ٹھیک نہیں بیٹھی تھیں اپنے منہ میں بھٹکتی، ان کی بہو بیٹیوں کے عیوب پر پر دے ڈال کر وہ دوسروں کی بہو بیٹیوں میں کیڑے ڈالتی۔ غلیظ سے غلیظ گالیاں اپنے ان مولکوں کی خاطر خود بھی کھاتی۔۔۔ پر اب کہ اس کی بیٹی کے بیاہ کا سوال آیا تھا، وہ کہیں تیخ اور رذیل بن گئی تھی۔

ایک دو مرتبہ تو اس کے جی میں آئی کہ محلے کی ان تمام عورتوں کو جنہوں نے اس کی بیٹی کو رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا، بیچ چوراہے میں جمع کرے اور ایسی گالیاں دے کہ ان کے دل کے کانوں کے پر دے پھٹ جائیں مگر وہ سوچتی کہ اگر اس نے یہ غلطی کر دی تو غریب بھولی کا مستقبل بالکل تیرہ و تار ہو جائے گا۔

جب چاروں طرف سے ماہی ہوئی تو نکی نے شہر چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ ایک صرف یہی راستہ تھا جس سے بھولی کی شادی کا کٹھن مرحلہ طے ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک روز بھولی سے کہا، ”بیٹا، میں نے سوچا ہے کہ اب کسی اور شہر میں جا رہیں۔“

بھولی نے چونک کر پوچھا، ”کیوں ماں؟“

”بس اب یہاں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔“ نکی نے اس کی طرف متابھری نظروں سے دیکھا اور کہا، ”تیرے بیاہ کی فکر میں گھلی جا رہی ہوں۔
یہاں بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ تیری ماں کو سب رذیل سمجھتے ہیں۔“

بھولی کافی سیانی تھی، فوراً نکی کا مطلب سمجھ گئی، اس نے صرف اتنا کہا، ”ہاں ماں!“

نکی کو ان دونوں لفظوں سے سخت صدمہ پہنچا۔ بڑے دکھی لجھے میں اس نے بھولی سے سوال کیا، ”کیا تو بھی مجھے رذیل سمجھتی ہے؟“

بھولی نے جواب نہ دیا اور آٹا گوندھنے میں مصروف ہو گئی۔

اس دن نکی نے عجیب عجیب باتیں سوچیں۔ اس کے سوال کرنے پر بھولی خاموش کیوں ہو گئی تھی، کیا وہ اسے واقعی رذیل سمجھتی ہے، کیا وہ اتنا بھی نہ کہہ سکتی تھی کہ ”نہیں ماں۔“ کیا یہ باپ کے خون کا اثر تھا؟ بات میں سے بات نکل آتی اور وہ بہت بری طرح ان میں الجھ جاتی۔ اسے بیتے ہوئے دس برس یاد آتے۔ بیاہی زندگی کے دس برس جس کا ایک ایک دن مارپیٹ اور گالی گلوچ سے بھرا تھا۔ پھر وہ اپنی نظروں کے سامنے مطلقہ زندگی کے دن لاتی۔۔۔ ان میں بھی گالیاں ہی گالیاں تھیں جو وہ پیسے کی خاطر دوسروں کو دیتی رہی تھی۔ تھک ہار کروہ بعض اوقات کوئی سہاراٹھو لئے لگتی اور سوچتی، کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ طلاق نہ لیتی۔۔۔ آج بیٹی کا بوجھ گام کے کندھوں پر ہوتا۔ نکھٹو تھا، پر لے درجے کا ظالم تھا، عینی تھا مگر بیٹی کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کرتا۔ یہ اس کے عجز کی انتہا تھی۔

پرانی ماریں اور ان کے دبے ہوئے درداب آہستہ آہستہ نکی کے جوڑوں میں ابھرنے لگے۔ پہلے اس نے کبھی اُف تک نہیں کی تھی۔ براب اُھستے بیٹھتے ہائے ہائے کرنے لگی۔ اس کے کانوں میں ہر وقت ایک شور سا براپا ہونے لگا، جیسے ان کے پردوں پر وہ تمام گالیاں اور سٹھنیاں ٹکر رہی ہیں جو ان گنت لڑائیوں میں اس نے استعمال کی تھیں۔

عمر اس کی زیادہ نہیں تھی۔ چالیس کے لگ بھگ تھی۔ مگر اب نکی کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ بوڑھی ہو گئی ہے، اس کی کرجواب دے چکی ہے، اس کی زبان جو قینچی کی طرح چلتی تھی، اب کندھ ہو گئی ہے۔ بھولی سے گھر کے کام کا ج کے متعلق معمولی سی بات کرتے ہوئے اس کو مشقت کرنی پڑتی تھی۔

نکی بیمار پڑ گئی اور چارپائی کے ساتھ گئی۔ شروع شروع میں تو وہ اس بیماری کا مقابلہ کرتی رہی۔ بھولی کو بھی اس نے خبر نہ ہونے دی کہ اندر ہی اندر کون سی دیمک اسے چاٹ رہی ہے۔ لیکن ایک دم وہ ایسی نذر حال ہوئی کہ اس سے اٹھاٹک نہ گیا۔ بھولی کو بہت تشویش ہوئی۔ اس نے حکیم کو بلا یا جس نے بپس دیکھ کر بتایا کہ فلکر کی کوئی بات نہیں، پرانا بخار ہے، علاج سے دور ہو جائے گا۔

علاج باقاعدہ ہوتا رہا۔ بھولی سعادت مند بیٹیوں کی طرح ماں کی ہر ممکن خدمت بجالا رہی تھی۔ اس سے نکی کے دکھی دل کو کافی تسکین ہوتی تھی مگر مرض دور نہ ہوا۔ بخار پہلے سے تیز ہو گیا اور آہستہ آہستہ نکی کی بھوک غائب ہو گئی جس کے باعث وہ بہت ہی لاگر اور نحیف ہو گئی۔

عورتوں میں ایک خداداد و صفت ہوتا ہے کہ مریض کی شکل دیکھ کر ہی پہچان لیتی ہیں کہ وہ کتنے دن کا مہمان ہے۔ ایک دوسرے تین جب بیمار پر سی کے لیے نکی کے پاس آئیں تو انہوں نے اندازہ لگایا کہ وہ بمشکل دس روز نکالے گی چنانچہ یہ بات سارے محلے کو معلوم ہو گئی۔

کوئی بیمار ہو، مرنے کے قریب ہو تو عورتوں کے لیے ایک اچھی خاصی تفریح کا بہانہ نکل آتا ہے۔ گھر سے بن سنور کر لکھتی ہیں اور مریض کے سرہانے پیٹھ کراپنے تمام مرحوم عزیزوں کو یاد کرتی ہیں، ان کی بیماریوں کا ذکر ہوتا ہے، وہ تمام علاج بیان کیے جاتے ہیں جو لاعلاج ثابت ہوئے تھے۔ گفتگو کا رخ پلٹ کر قیصوں کے نئے ڈیزاںسنوں کی طرف آ جاتا ہے۔

نکی ایسی باتوں سے بہت گھبراتی تھی لیکن وہ خود چونکہ مریضوں کے سرہانے ایسی ہی باتیں کرتی رہی تھی اس لیے مجبوراً اسے یہ خرافات سننی پڑتی تھی۔۔۔ ایک روز جب محلے کی بہت سی عورتیں اس کے گھر میں جمع ہو گئیں تو اس احساس نے اس کو بہت مضطرب کیا کہ اب اس کا وقت آچکا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے چہرے پر یہ فیصلہ مر قوم تھا کہ نکی کے دروازے پر موت دستک دے رہی ہے۔ جو عورت آتی، اپنے ساتھ یہ کھٹ کھٹ لاتی۔ تنگ آ کر کئی دفعہ نکی کے جی میں آئی کہ کٹھی کھول دے اور دستک دینے والے فرشتے کو اندر بلالے۔

ان بیمار پر س عورتوں کو سب سے بڑا فسوس بھولی کا تھا۔ نکی سے وہ بار بار اس کا ذکر کرتیں کہ ہائے اس بیچاری کا کیا ہو گا۔ دنیا میں غریب کی صرف ایک ماں ہے۔ وہ بھی چلی گئی تو اس کا کیا ہو گا۔ پھر وہ اللہ میاں سے دعا کرتیں کہ وہ نکی کی زندگی میں چند نوں کا اضافہ کر دے تاکہ وہ بھولی کی طرف سے مطمئن ہو کر مرے۔

نکی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ دعا بالکل جھوٹی ہے۔ انھیں بھولی کا اتنا خیال ہوتا تو وہ اس کے رشتے سے انکار کیوں کرتیں۔ صاف انکار نہیں کیا تھا، اس لیے کہ یہ دنیاداری کے اصول کے خلاف تھا مگر کسی نے ہامی نہیں بھری تھی۔

وہ چھوٹا سا کمرہ جس میں نکی چار پائی پر پڑی تھی، بیمار پر س عورتوں سے بھر اہوا تھا۔۔۔ بھولی نے ان کے بیٹھنے کا انتظام، ایسا معلوم ہوتا ہے پہلے ہی سے کر رکھا تھا۔ پیڑھیاں کم تھیں، اس لیے اس نے کھجور کے پتوں کی چٹائی بچھادی تھی۔ بھولی کے اس اہتمام و انتظام سے نکی کو بڑا صدمہ پہنچا تھا گویا وہ بھی دوسری عورتوں کی طرح اس کی موت کے استقبال کے لیے تیار تھی۔

بخار تیز تھا، دماغ پتا ہوا تھا۔ نکی نے اوپر تلے بہت سی تکلیف دہ باتیں سوچیں تو بخار اور زیادہ تیز ہو گیا اور اس پر ہڈیاں کیفیت طاری ہو گئی۔ جلدی جلدی بے جوڑ باتیں کرنے لگی۔ بیمار پر س عورتوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ جو اٹھ کر جانے والی تھیں، نکی کا وقت قریب دیکھ کر بیٹھ گئیں۔

نکی کے جاری تھی۔ ایسا معلوم تھا کہ وہ کسی سے لڑ رہی ہے، ”میں تیری ہشت پشت کو اچھی طرح جانتی ہوں۔۔۔ جو کچھ تو نے میرے ساتھ کیا ہے، وہ کوئی دشمن کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔ میں نے اپنے خاوند کی دس رس غلامی کی۔ اس نے مار مار کر میری کھال ادھیر دی، پر میں نے اف تک نہ کی۔۔۔ اب تو نے۔۔۔ اب تو نے مجھ پر یہ ظلم شروع کیے ہیں۔۔۔“

پھر وہ کمرے میں جمع شدہ عورتوں کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتی، ”تم۔۔۔ تم یہاں کیا کرنے آئی ہو۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ میں کسی فیس پر بھی لڑنے کے لیے تیار نہیں۔۔۔ تم میں سے ہر ایک کے عیب وہی ہیں۔۔۔ پرانے۔۔۔ صدیوں کے پرانے، جو کیڑے۔۔۔ جو کیڑے۔۔۔ پھامال میں ہیں وہی تم سب میں ہیں۔۔۔ تم میں سے قریب قریب ہر ایک کا خصم رنڈی باز ہے۔۔۔ جو بری بیماری پھاتو کے خاوند کو لگی ہے۔ وہی جنتے کے گھروالے کو چھٹی ہوئی ہے۔۔۔ تم سب کوڑھی ہو۔۔۔ اور یہ کوڑھ تم نے مجھے بھی دے دیا ہے۔۔۔ لعنت ہو تم سب پر خدا کی۔۔۔ خدا کی۔۔۔ خدا۔۔۔“ اور وہ ہنسنے لگتی۔

”میں اس خدا کو بھی جانتی ہوں۔۔۔ اس کی ہشت پشت کو اچھی طرح جانتی ہوں۔۔۔ یہ کیا دنیا بنائی ہے تو نے۔۔۔ یہ دنیا جس میں گام ہیں، جس میں چہل ماں ہے جو اپنے خاوند کو چھوڑ کر دوسروں کے بستر گرم کرتی ہے۔۔۔ اور مجھے فیس دیتی ہے۔۔۔ میں روپے گن کر میرے ہاتھ پر رکھتی ہے کہ میں نور فشاں کے پرانے یاروں کا پول کھولوں۔۔۔ اور فشاں میرے پاس آتی ہے کہ کنگی یہ پانچ زیادہ لو اور جاؤ ایمنہ سے لڑو۔ وہ مجھے ستاتی ہے۔۔۔ یہ کیا چکر چلا یا ہوا ہے تو نے اپنی دنیا میں۔۔۔ میرے سامنے آ۔۔۔ ذرا میرے سامنے آ۔۔۔“

آوازِ نگی کے حلق میں رکنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد گھنگرو بجھنے لگا۔ تشنخ سے وہ یقین وہ تاب کھارہی تھی اور ہندیانی کیفیت میں چلا رہی تھی، ”گام مجھے نہ مار۔۔۔ او گام۔۔۔ او خدا مجھے نہ مار۔۔۔ او خدا۔۔۔ او گام۔۔۔“

او خدا او گام بڑبڑاتی آخر نگی بیار پرس عورتوں کے اندازے کے عین مطابق مر گئی۔ بھولی جوان عورتوں کی خاطرداری میں مصروف تھی۔ پانی کا گلاس ہاتھ سے گرا کر دھڑادھڑا پنا سر پینٹے لگی۔

-[133]-

رتی، ماشہ، تولہ: سعادت حسن منشو

زینت اپنے کالج کی زیست تھی۔ بڑی زیر ک، بڑی ذہین اور بڑے اچھے خود خال کی صحتنامہ نوجوان لڑکی۔ جس طبیعت کی وہ مالک تھی اس کے پیش نظر اس کی ہم جماعت لڑکیوں کو کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ وہ اتنی مقدار پسند عورت بن جائے گی۔ ویسے وہ جانتی تھیں کہ چائے کی پیالی میں صرف ایک چچی شکر ڈالنی ہے، زیادہ ڈال دی جائے تو پینے سے انکار کر دیتی ہے، تمیں اگر آدھا نچ بڑی یا چھوٹی سل جائے تو کبھی نہیں پہنچے گی۔ لیکن انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ شادی کے بعد وہ اپنے خاوند سے بھی نی تلی محبت کرے گی۔

زینت سے ایک لڑکے کو محبت ہو گئی وہ اس کے گھر کے قریب ہی رہتا تھا بلکہ یوں کہیے کہ اس کا اور زینت کا مکان آمنے سامنے تھا۔ ایک دن اس لڑکے نے جس کا نام جمال تھا سے کوٹھے پر اپنے بال خشک کرتے دیکھا تو وہ سرتاپا محبت کے شربت میں شر ابور ہو گیا۔ زینت وقت کی پابند تھی۔ صحٹھیک چھ بجے اٹھتی، اپنی بہن کے دوپھوں کو اسکول کے لیے تیار کرتی، اس کے بعد خود نہاتی اور سر پر تولیہ لپیٹ کر اوپر کوٹھے پر چلی جاتی اور اپنے بال جواس کے ٹخنوں تک آتے تھے، سکھاتی، کنگھی کرتی اور نیچے چلی جاتی۔ جوڑا وہ اپنے کمرے میں کرتی تھی۔

اس کی ہر حرکت اور اس کے ہر عمل کے وقت معین تھے۔ جمال اگر صبح سلاٹھے چھ بجے اٹھتا اور حوالج ضروری سے فارغ ہو کر اپنے کوٹھ پر پہنچتا تو اسے ناامیدی کا سامنا کرنا پڑتا، اس لیے کہ زینت اپنے بال سکھا کر نیچے چلی گئی ہوتی تھی۔ ایسے لمحات میں وہ اپنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتا اور ادھر ادھر دیکھ کے واپس نیچے چلا جاتا۔ اس کو سیرھیاں اترتے ہوئے یوں محسوس ہوتا کہ ہر زینہ کنگھی کا ایک دندان ہے جو اترتے ہوئے ایک ایک کر کے ٹوٹ رہا ہے۔

ایک دن جمال نے زینت کو ایک رقہ بھیجا۔ وقت پر وہ کوٹھ پر پہنچ گیا تھا جبکہ زینت اپنے ٹخنوں تک لمبے بال سکھا ہی تھی۔ اس نے یہ تحریر جو خوشبودار کاغذ پر تھی، روڑے میں لپیٹ کر سامنے کوٹھ پر پھینک دی۔ زینت نے یہ کاغذی پیرا ہن میں ملبوس پتھر اٹھایا۔ کاغذ اپنے پاس رکھ لیا اور پتھر واپس پھینک دیا۔ لیکن اس کو جمال کی شوئی تحریر پنداہ آئی اور وہ سرتاپ افریاد بن گئی۔ اس نے لکھا تھا۔

زلف برہم سنہجال کر چلیے
راستہ دیکھ بھال کر چلیے

موسم گل ہے اپنی بانھوں کو
میری بانھوں میں ڈال کر چلیے

موسم گل قطعاً نہیں تھا۔ اس لیے اس آخری شعر نے اس کو بہت کوفت پہنچائی۔ اس کے گھر میں کئی گلے تھے جن میں بوٹے لگے ہوئے تھے، یہ سب کے سب مر جھائے ہوئے تھے۔ جب اس نے یہ شعر پڑھا تو اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ اس نے مر جھائے ہوئے، بے گل بوٹے اکھاڑے اور اس کنستر میں ڈال دیا جس میں کوڑا کر کٹ وغیرہ جمع کیا جاتا تھا۔

ایک زلف اس کی برہم رہتی تھی۔ لیکن راستہ دیکھ بھال کر چلنے کا سوال کیا پیدا ہوتا تھا۔ زینت نے سوچا کہ یہ محض شاعرانہ تک بندی ہے لیکن اس کے بال ٹخنوں تک لمبے تھے۔ اسی دن جب اس کو یہ رقہ ملا تو نیچے سیرھیاں اترتے ہوئے جب ایک زینے پر اپنی ایک بھانجی کے کان سے گری ہوئی سونے کی بالی اٹھانی پڑی تو وہ اس کی سینڈل سے الجھنے اور گرتے گرتے پھی۔ چنانچہ اس دن سے اس نے راستہ دیکھ بھال کر چلنا شروع کیا۔ مگر اس کی بانھوں میں باٹھیں ڈال کر چلنے میں سخت اعتراض تھا۔ وہ اسے زیادتی سمجھتی تھی۔ اس لیے کہ موسم گل نہیں تھا، موسم گل بھی ہوتا تو اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ پھولوں سے بانھوں کا کیا تعلق ہے۔ اس کے نزدیک بانھوں میں

بانھیں ڈال کر چلنا بڑا اہمیات بلکہ سو قیانہ ہے۔ چنانچہ جب وہ دوسرے روز صبح ۶ بجے اٹھی اور اپنی بھانجیوں کو اسکول کے لیے تیار کرنا چاہا تو اسے معلوم ہوا کہ اتوار ہے۔ اس کے دل و دماغ میں وہ دو شعر سوار تھے۔

اس نے اسی وقت تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بھیوں کو تیار کرے گی، اس کے بعد نہائے گی اور اپنے کمرے میں جا کر جمال کا رقعہ پڑھ کر اسے جی ہی جی میں کوئے گی مگر اتوار ہونے کے باعث اس کا یہ تہیہ درہم برہم ہو گیا۔ اسے وقت سے پہلے غسل کرنا پڑا، حالانکہ وہ اپنے روز مرہ کے اوقات کے معاملے میں بڑی پابند تھی۔

اس نے غسل خانے میں ضرورت سے زیادہ وقت صرف کیا۔ دو بالٹیوں سے پہلے نہاتی تھی دو بالٹیوں سے اب بھی نہایتی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس نے نہاتے وقت اپنی بانھوں کو دیکھا جو سڑوں اور خوبصورت تھیں، پھر اسے جمال کی بانھوں کا خیال آیا لیکن اس نے ان کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ قمیص کی آستینوں کے اندر چھپی رہتی تھیں، ان کے متعلق وہ کیا رائے قائم کر سکتی تھی۔ بہر حال وہ اپنے گدرائے ہوئے بازو دیکھ کر مطمئن ہو گئی اور جمال کو بھول گئی۔

غسل میں کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی۔ اس لیے کہ وہ اپنے حسن و جمال کے متعلق اندازہ کرنے بیٹھ گئی تھی۔ اس نے کافی دیر غور کرنے پر یہ نتیجہ نکلا کہ وہ زیادہ حسین تو نہیں لیکن قبول صورت اور جوان ضرور ہے۔ جوان وہ بلاشبہ تھی۔ وہ چھوٹی مختصر سی ریشمی چیز جو اس نے اپنے بدن سے اتار کر لکس صابن کی ہوا یوں میں دھوئی تھی، اس کے سامنے ٹھیک تھی۔ یہ گلی ہونے کے باوجود بہت سی چغلیاں کھا رہی تھی۔

اس کے بعد روڑے میں لپٹا ہوا ایک اور خط آیا، اس میں بے شمار اشعار تھے۔ شعروں سے اسے نفرت تھی، اس لیے کہ وہ انھیں محبت کا عامیانہ ذریعہ سمجھتی تھی۔ خط آتے رہے، زینت وصول کرتی رہی لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

وہ محبت کے شدید جذبے کی قائل نہیں تھی۔ اس کو جمال پسند تھا، اس لیے کہ وہ خوش شکل اور صحت مندرجوان تھا۔ اس کے متعلق وہ لوگوں سے بھی سن چکی تھی کہ وہ بڑے اچھے خاندان کا لڑکا ہے۔ شریف ہے، اس کو اور کسی لڑکی سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ غالباً یہی وجہ تھی، ایک دن اس نے اپنی نوکرانی کے دس سالہ بچے کے ہاتھ اس کو یہ رقعہ لکھ کر بھیج دیا، ”آپ کی رقعہ نویسی پر مجھے اس کے سوا اور کوئی اعتراض نہیں کہ یہ شعروں میں نہ ہوا کرے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ کوئی مجھے چاندی اور سونے کے ہتھوڑوں سے کوٹ رہا ہے۔“

یہ خط ملنے کے بعد جمال نے اشعار لکھنے بند کر دیے۔ لیکن اس کی نشر اس سے بھی کہیں زیادہ جذبات سے پر ہوتی تھی۔ زینت کی طبع پر یہ بھی گراں گزرتی۔ وہ سوچتی یہ کیسا آدمی ہے۔ وہ رات کو سوتی تو اپنا کمرہ بند کر کے قمیص اتار دیتی تھی، اس لیے کہ اس کی نیند پر یہ ایک بوجھ سا

ہوتا تھا۔ مگر جمال تو اس کی قمیص کے مقابلے میں کہیں زیادہ بو جھل تھا۔ وہ اسے کبھی برداشت نہ کر سکتی لیکن اس کو اس بات کا کامل احساس تھا کہ وہ اس سے والہانہ محبت کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ زینت نے جمال کو کئی موقعے دیے کہ وہ اس سے ہم کلام ہو سکے۔ وہ اس سے جب پہلی بار ملا تو کانپ رہا تھا۔ کانپتے کا نپتے اور ڈرتے ڈرتے اس نے ایک ناول بغیر عنوان کے اپنی حیب سے نکالا اور زینت کو پیش کیا، ”اسے پڑھیے۔۔۔ میں۔۔۔ اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا اور کانپتا رز تازینت کے گھر سے نکل گیا۔“

زینت کو بڑا ترس آیا لیکن اس نے سوچا کہ اچھا ہوا۔ اس لیے کہ اس کے پاس زیادہ وقت تھیلے کے لیے نہیں تھا۔ اس کے اباٹھیک ساڑھے سات بجے آنے والے تھے اور جمال سو اسات بجے چل دیا تھا۔ اس کے بعد جمال نے ملاقات کی درخواست کی تو زینت نے اسے کہلا کیا جا کہ وہ اس سے پلازہ میں شام کا پہلا شو شروع ہونے سے دس منٹ پہلے مل سکے گی۔ زینت وہاں پندرہ منٹ پہلے پہنچی۔ جو سیمیلی اس کے ساتھ تھی اس کو کسی بہانے ادھر ادھر کر دیا۔ دس منٹ اس نے باہر گیٹ کے پاس جمال کا انتظار کیا، جب وہ نہ آیا تو کسی تکدر کے بغیر وہاں سے ہٹی اور اپنی سیمیلی کو تلاش کر کے اندر سینما میں چل گئی۔

جمال اس وقت پہنچا جب وہ فرست کلاس میں داخل ہو رہی تھی۔ زینت نے اسے دیکھا، اس کے ملتی چہرے اور اس کی معافی کی خواستگار آنکھوں کو، مگر اس نے اس کو گیٹ کیپر کی بھی حیثیت نہ دی اور اندر داخل ہو گئی۔ شو چونکہ شروع ہو چکا تھا اس لیے اس نے اتنی نوازش کی کہ جمال کی طرف دیکھ کر گیٹ کیپر سے کہا، ”معاف کیجیے گا ہم لیٹ ہو گئے۔“

جمال شو ختم ہونے تک باہر کھڑا رہا۔ جب لوگوں کا ہجوم سینما کی بلڈنگ سے نکلا تو اس نے زینت کو دیکھا۔ آگے بڑھ کے اس سے بات کرنا چاہی مگر اس نے اس کے ساتھ بالکل اجنبیوں سا سلوک کیا چنانچہ اسے مایوس گھر لوٹنا پڑا۔

اس کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ بال بنو انے اور نہاد ہو کر کپڑے پہننے میں اسے دیر ہو گئی تھی۔ اس نے رات کو بڑی سوچ بچار کے بعد ایک خط لکھا جو مغذرت نامہ تھا۔ وہ زینت کو پہنچا دیا، یہ خط پڑھ کر جب وہ مقررہ وقت پر کوٹھے پر آئی تو جمال نے اس کے تیوروں سے محسوس کیا کہ اسے بخش دیا گیا ہے۔ اس کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ زینت کو جمال سے شکایت رہتی کہ وہ خط بہت لمبے لکھتا ہے جو ضرورت سے زیادہ جذبات سے پر ہوتے ہیں۔ وہ اختصار کی قائل تھی، محبت اس کو بھی جمال سے ہو چکی تھی مگر وہ اس کے اظہار میں اپنی طبیعت کے موافق کفایت بر تھی تھی۔

آخر ایک دن ایسا آیا کہ زینت شادی پر آمادہ ہو گئی مگر ادھر دونوں کے والدین رضامند نہیں ہوتے تھے۔ بہر حال بڑی مشکلوں کے بعد یہ مرحلہ طے ہوا اور جمال کے گھر زینت دلہن بن کے پہنچ گئی۔ جملہ عروسی سجا ہوا تھا، ہر طرف پھول ہی پھول تھے۔ جمال کے دل و دماغ میں ایک طوفان برپا تھا، عشق و محبت کا۔ اس نے چنانچہ عجیب و غریب حرکتیں کیں، زینت کو سر سے پاؤں تک اپنے ہونٹوں کی سجدہ گاہ بناؤالا۔

زینت کو جذبات کا یہ بے پناہ بہاؤ پسند نہ آیا، وہ آلتا گئی۔ ٹھیک دس بجے سو جانے کی عادی تھی۔ اس نے جمال کے تمام جذبات ایک طرف جھٹک دیے اور سو گئی۔

جمال نے ساری رات جاگ کر کاٹی۔ زینت حسبِ معمول صبح ٹھیک چھ بجے اٹھی اور غسل خانے میں چلی گئی۔ باہر نکلی تو اپنے ٹخنوں تک لمبے بالوں کا بڑی چاکب دستی سے جوڑا بنانے میں مصروف ہو گئی۔ اس دوران میں وہ صرف ایک مرتبہ جمال سے مخاطب ہوئی، ”ڈار لنگ مجھے بڑا افسوس ہے۔“

جمال اس نئھے سے جملے سے ہی خوش ہو گیا جیسے کسی بچے کو کھلونا مل گیا ہو۔ اس نے دل ہی دل میں اس فضا ہی کو چومنا شروع کر دیا جس میں زینت سانس لے رہی تھی۔ وہ اس سے والہانہ طور پر محبت کرتا، اس قدر شدید انداز میں کہ زینت کی مقدار پسند طبیعت برداشت نہیں کرتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک طریقہ طے ہو جائے جس کے مطابق محبت کی جائے۔

ایک دن اس نے جمال سے کہا، ”آپ مجھ سے یقیناً ناراض ہو جاتے ہوں گے کہ میری طرف سے محبت کا جواب تارک سے اختصار سے ملتا ہے لیکن میں مجبور ہوں، میری طبیعت ہی کچھ ایسی ہے۔ آپ کی محبت کی میں قدر کرتی ہوں لیکن پیار مصیبت نہیں بن جانا چاہیے، آپ کا پیار بعض اوقات میرے لیے بہت بڑی مصیبت بن جاتا ہے، آپ کو اس کا خیال رکھنا چاہیے۔

جمال نے بہت خیال رکھا۔ ناپ توں کر بیوی سے محبت کی مگر ناکام رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں میں ناجاہی ہو گئی۔ زینت نے بہت سوچا کہ طلاق ہی بہتر صورت ہے جو بد مزگی دور کر سکتی ہے۔ چنانچہ جمال سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد اس نے طلاق کے لیے جمال کو کہلوا بھیجا۔ اس نے جواب دیا کہ مر جائے گا مگر طلاق نہیں دے گا۔ وہ اپنی محبت کا گلا ایسے بے رحم طریقے سے گھونٹنا نہیں چاہتا۔

زینت کے لیے جمال کی یہ محبت بہت بڑی مصیبت بن گئی تھی۔ اس نے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کیا۔ عدالت میں پہلے روز جب فریقین حاضر ہوئے تو عجیب تماشا ہوا۔ جمال نے زینت کو دیکھا تو اس کی حالت غیر ہو گئی۔ اس کے وکیل نے

مجھڑیٹ سے درخواست کی کہ سماعت اور کسی تاریخ پر ملتوی کر دی جائے۔ زینت کو بڑی کوفت ہوئی، وہ چاہتی تھی کہ جلد کوئی فیصلہ ہو۔ اگلی تاریخ پر جمال حاضر عدالت نہ ہوا کہ وہ بیمار ہے۔ دوسرے مہینے کی تاریخ پر بھی وہ نہ آیا تو زینت نے ایک رقہ لکھ کر جمال کو بھیجا کہ وہ اسے پریشان نہ کرے اور جو تاریخ مقرر ہوئی ہے اس پر وہ ٹھیک وقت پر آئے۔ تاریخ سولہ اگسٹ تھی۔ رات سے موسلادھار بارش ہو رہی تھی، زینت حسبِ معمول صحیح بچھے اٹھی، نہاد ہو کر کپڑے پہنے اور اپنے وکیل کے ساتھ تالے میں عدالت پہنچ گئی۔ اس کو یقین تھا کہ جمال وہاں موجود ہو گا اس لیے کہ اس نے اس کو لکھ بھیجا تھا کہ وقت پر پہنچ جائے۔ مگر جب اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور اسے جمال نظر نہ آیا تو اس کو بہت غصہ آیا۔

مقدمہ اس دن سرفہrst تھا۔ مجھڑیٹ نے عدالت میں داخل ہوتے ہی تھوڑی دیر کے بعد جمال اور زینت کو بلایا۔ زینت اندر جانے ہی والی تھی کہ اس کو جمال کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کا چہرہ خون میں لٹھرا ہوا تھا، بالوں میں بکھڑا، کپڑوں پر خون کے دھبے، لڑکھڑا تھا ہوا وہ اس کے پاس آیا اور معذرت بھرے لجھے میں کہا، ”زینت مجھے افسوس ہے، میری موڑ سائیکل پھسل گئی اور میں ---“

جمال کے ماتھے پر گہرا خم تھا جس سے خون نکل رہا تھا۔ زینت نے اپنا دوپٹہ پھاڑا اور پیٹی بنایا کہ اس پر باندھ دی اور جمال نے جذبات سے مغلوب ہو کر وہیں عدالت کے باہر اس کا منہ چوم لیا۔ اس نے کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ وکیل سے کہا کہ وہ طلاق لینا نہیں چاہتی، مقدمہ واپس لے لیا جائے۔

جمال دس دن ہسپتال میں رہا۔ اس دوران میں زینت اس کی بڑی محبت سے تیارداری کرتی رہی۔ آخری دن جب جمال مشین پر اپنا وزن دیکھ رہا تھا تو اس نے زینت سے دبی زبان سے پوچھا، ”میں اب تم سے کتنی محبت کر سکتا ہوں؟“

زینت مسکراتی، ”ایک من۔“

جمال نے وزن کرنے والی مشین کی سوئی دیکھی اور زینت سے کہا، ”مگر میرا وزن تو ایک من تیس سیر ہے۔ میں یہ فال تو تیس سیر کہاں غائب کروں؟“

زینت ہنسنے لگی۔

میں گجرات کا ٹھیاواڑ کا رہنے والا ہوں۔ ذات کا بنیا ہوں۔ پچھلے برس جب تقسیم ہندوستان پر منٹا ہوا تو میں بالکل بیکار تھا۔ معاف کیجیے گا میں نے لفظ منٹا استعمال کیا مگر اس کا کوئی ہرج نہیں۔ اس لیے کہ اردو زبان میں باہر کے الفاظ آنے ہی چاہئیں۔ چاہے وہ گجراتی ہی کیوں نہ ہوں۔

جی ہاں، میں بالکل بیکار تھا۔ لیکن کوئین کا تھوڑا سا کار و بار چل رہا تھا جس سے کچھ آمدن کی صورت ہو جاتی تھی۔ جب بٹوارہ ہوا اور ادھر کے آدمی ادھر اور ادھر کے ادھر ہزاروں کی تعداد میں آنے جانے لگے تو میں نے سوچا چلوپا پاکستان چلیں۔ کوئین کا نہ سہی کوئی اور کار و بار شروع کر دوں گا۔ چنانچہ وہاں سے چل پڑا اور راستے میں مختلف قسم کے چھوٹے چھوٹے دھندرے کرتا پاکستان پہنچ گیا۔

میں تو چلا ہی اس نیت سے تھا کہ کوئی موٹا کار و بار کروں گا۔ چنانچہ پاکستان پہنچتے ہی میں نے حالات کو اچھی طرح جانچا اور الٹ منٹوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سکھ پالش مجھے آتا ہی تھا۔ چکنی چڑی باتیں کیں۔ ایک دو آدمیوں کے ساتھ یارانہ گانٹھا اور ایک چھوٹا سا مکان الٹ کرالیا۔ اس سے کافی منافع ہو تو میں مختلف شہروں میں پھر کر مکان اور دکانیں الٹ کرانے کا دھندا کرنے لگا۔

کام کوئی بھی ہو، انسان کو محنت کرنا پڑتی ہے۔ مجھے بھی چنانچہ الٹ منٹوں کے سلسلے میں کافی ٹنگ دو کرنا پڑتی۔ کسی کے مسکنے لگایا، کسی کی مٹھی گرم کی، کسی کو کھانے کی دعوت دی، کسی کو ناج رنگ کی، غرضیکہ بے شمار بکھیرے تھے۔ دن بھر خاک چھانا تا، بڑی بڑی کوٹھیوں کے پچیرے کرتا اور شہر کا چچہ چپہ دیکھ کر اچھا سا مکان تلاش کرتا جس کے الٹ کرانے سے زیادہ منافع ہو۔

انسان کی محنت کبھی خالی نہیں جاتی۔ چنانچہ ایک برس کے اندر اندر میں نے لاکھوں روپے پیدا کر لیے۔ اب خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ رہنے کو بہترین کوٹھی۔ بینک میں بے اندازہ مال پانی۔۔۔ معاف کیجیے گا۔ میں کا ٹھیاواڑ گجرات کا روزمرہ استعمال کر گیا۔ مگر کوئی واندہ نہیں۔ اردو زبان میں باہر کے الفاظ بھی شامل ہونے چاہئیں۔۔۔ جی ہاں، اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ رہنے کو بہترین کوٹھی، نوکر چار، پیکارڈ موتھ بینک میں ڈھائی لاکھ روپے۔ کارخانے اور دکانیں الگ۔۔۔ یہ سب کچھ تھا۔ لیکن میرے دل کا چین جانے کہاں اڑ گیا۔ یوں تو کوئین کا دھندا کرتے

ہوئے بھی دل پر کبھی کبھی بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ لیکن اب تو جیسے دل رہا ہی نہیں تھا۔ یا پھر یوں کہیے کہ بوجھ اتنا آن پڑا کہ دل اس کے نیچے
دب گیا۔ پر یہ بوجھ کس بات کا تھا؟

آدمی ذہین ہوں، دماغ میں کوئی سوال پیدا ہو جائے تو میں اس کا جواب ڈھونڈتی ہی نکالتا ہوں۔ ٹھنڈے دل سے (حالانکہ دل کا کچھ پتا ہی نہیں
تھا) میں نے غور کرنا شروع کیا کہ اس گڑبڑ گھوٹالے کی وجہ کیا ہے؟

عورت۔۔۔ ہو سکتی ہے۔ میری اپنی تو کوئی تھی نہیں۔ جو تھی وہ کاٹھیاواڑ گجرات ہی میں اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ لیکن دوسروں کی عورتیں
موجود تھیں۔ مثال کے طور پر اپنے والی ہی کی تھی۔ اپنا اپنا میٹسٹ ہے۔ سچ پوچھیے تو عورت جوان ہونی چاہیے اور یہ ضروری نہیں کہ پڑھی
لکھی ہو، ڈانس کرنا جانتی ہو۔ اپن کو تو ساری جوان عورتیں چلتی ہیں (کاٹھیاواڑ گجرات کا محاورہ ہے جس کا اردو میں نعم البدل موجود نہیں۔)

عورت کا تو سوال ہی اٹھ گیا اور دولت کا پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ بندہ زیادہ لاٹھی نہیں، جو کچھ ہے اسی پر قیامت ہے۔ لیکن پھر یہ
دل والی بات کیوں پیدا ہو گئی تھی۔ آدمی ذہین ہوں۔ کوئی مسئلہ سامنے آجائے تو اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کارخانے چل
رہے تھے۔ دکانیں بھی چل رہی تھیں۔ روپیہ اپنے آپ پیدا ہو رہا تھا۔ میں نے الگ تھلک ہو کر سوچنا شروع کیا اور بہت دیر کے بعد اس
نتیجے پر پہنچا کہ دل کی گڑبڑ صرف اس لیے ہے کہ میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا۔

کاٹھیاواڑ گجرات میں تو میں نے بیسیوں نیک کام کیے تھے۔ مثال کے طور پر جب میرا دوست پانڈورنگ مر گیا تو میں نے اس کی رائٹ کو اپنے
گھر ڈال لیا اور دو برس تک اس کو دھندا کرنے سے روکے رکھا۔ وناک کی لکڑی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تو اسے نئی خرید دی۔ تقریباً چالیس روپے
اس پر اٹھ گئے تھے۔ جمنابائی کو گرمی ہو گئی۔ سماں کو (معاف کیجیے گا) کچھ پتا ہی نہیں۔ میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ چھ مہینے برابر اس کا
علان کر اتارا ہا۔۔۔ لیکن پاکستان آکر میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا تھا اور دل کی گڑبڑ کی یہی وجہ تھی۔ ورنہ اور سب ٹھیک تھا۔

میں نے سوچا۔ کیا کروں۔۔۔ ؟ خیرات دینے کا خیال آیا۔ لیکن ایک روز شہر میں گھوما تو دیکھا کہ قریب ہر شخص بھکاری ہے۔ کوئی
بھوکا ہے کوئی ننگا۔ کس کس کا پیٹ بھروں، کس کس کا انگ ڈھانکوں۔۔۔ سوچا ایک لنگر خانہ کھول دوں لیکن ایک لنگر خانے سے کیا ہوتا
اور پھر ان جگہیں سے لاتا؟ بلیک مارکیٹ سے خریدنے کا خیال پیدا ہوا تو یہ سوال بھی ساتھ ہی پیدا ہو گیا کہ ایک طرف گناہ کر کے دوسری
طرف کا رثواب کا مطلب ہی کیا ہے۔؟

گھنٹوں بیٹھ بیٹھ کر میں نے لوگوں کے دکھ درد سنے۔ سچ پوچھیے تو ہر شخص دکھی تھا۔ وہ بھی جو دکھ کانوں کے تھڑوں پر سوتے ہیں اور وہ بھی جو اوپری اونچی حولیوں میں رہتے ہیں۔ پیدل چلنے والے کو یہ دکھ تھا کہ اس کے پاس کام کا کوئی جو تاثر نہیں۔ موڑ میں بیٹھنے والے کو یہ دکھ تھا کہ اس کے پاس کار کا نیماڈل نہیں۔ ہر شخص کی شکایت اپنی اپنی جگہ درست تھی۔ ہر شخص کی حاجت اپنی اپنی جگہ معقول تھی۔

میں نے غالب کی ایک غزل، اللہ بنخشنے شولا پور کی امینہ بائی چلتے کر سے سنی تھی۔ ایک شعر یاد رہ گیا ہے کیس کی حاجت روکرے کوئی۔۔۔
معاف کیجیے گا یہ اس کا دوسرا مرصع ہے اور ہو سکتا ہے پہلا ہی ہو۔

بھی ہاں، میں کس کس کی حاجت روکر تاجب سو میں سے سو ہی حاجت مند تھے۔ میں نے پھر یہ بھی سوچا کہ خیرات دینا کوئی اچھا کام نہیں۔ ممکن ہے آپ مجھ سے اتفاق نہ کریں۔ لیکن میں نے مہاجرین کے کمپوں میں جا جا کر جب حالات کا اچھی طرح جائزہ لیا تو مجھے معلوم ہوا کہ خیرات نے بہت سے مہاجرین کو بالکل ہی نکما بنا دیا ہے۔ دن بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، تاش کھیل رہے ہیں۔ جگار ہو رہی ہے (معاف کیجیے گا جگار کا مطلب ہے جو ایعنی قمار بازی) گالیاں بک رہے ہیں اور فوکٹ لیعنی مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہیں۔۔۔ ایسے لوگ بھلا پاکستان کو مضبوط بنانے میں کیا مدد سکتے ہیں۔ چنانچہ میں اسی نتیجہ پر پہنچا کہ بھیک دینا ہر گز ہر گز نیکی کا کام نہیں۔ لیکن پھر نیکی کے کام کے لیے اور کون سارستہ ہے؟

کمپوں میں دھڑادھڑ آدمی مر رہے تھے۔ کبھی ہیضہ پھوٹا تھا کبھی پلیگ۔ ہسپتا لوں میں قل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ مجھے بہت ترس آیا۔ قریب تھا کہ ایک ہسپتال بناؤں مگر سوچنے پر ارادہ ترک کر دیا۔ پوری اسکیم تیار کر چکا تھا۔ عمارت کے لیے ٹینڈر طلب کرتا۔ داخلے کی فیسوں کا روپیہ جمع ہو جاتا۔ اپنی ہی ایک کمپنی کھڑی کر دیتا اور ٹنڈر اس کے نام نکال دیتا۔ خیال تھا ایک لاکھ روپے عمارت پر صرف کروں گا۔ ظاہر ہے کہ ستر ہزار روپے میں بلڈنگ کھڑی کر دیتا اور پورے تیس ہزار بچالیتا مگر یہ ساری اسکیم دھری کی دھری رہ گئی۔ جب میں نے سوچا کہ اگر مرنے والوں کو بجا لیا گیا تو یہ جوزا نہ آبادی ہے وہ کیسے کم ہو گی۔

غور کیا جائے تو یہ سارا الفڑا ہی فالتو آبادی کا ہے۔ الفڑا کا مطلب ہے جگلڑا، وہ جگلڑا جس میں فشیتا بھی ہو۔ لیکن اس سے بھی اس لفظ کی پوری معنویت میں بیان نہیں کر سکا۔ جی ہاں غور کیا جائے تو یہ سارا الفڑا ہی اس فالتو آبادی کا ہے۔ اب لوگ بڑھتے جائیں گے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمینیں بھی ساتھ ساتھ بڑھتی جائیں گی۔ آسمان بھی ساتھ ساتھ پھیلتا جائے گا۔ بارشیں زیادہ ہوں گی۔ انہیں زیادہ اگے گا۔ اس لیے میں اس نتیجے پر پہنچا۔۔۔ کہ ہسپتال بنانا ہر گز ہر گز نیک کام نہیں۔

پھر سوچا مسجد بناؤں۔ لیکن اللہ جختے شوالاپور کی امینہ بائی چلتے کر کا گایا ہوا ایک شعر یاد آگیانام منور ہے تو فتح کے اسباب بناء۔۔۔ وہ منظور کو منور اور فیض کو فتح کہا کرتی تھی۔ نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بناء۔ پل بننا چاہ بنا مسجد و تالاب بناء۔ کس کم بخت کونام و نمود کی خواہش ہے۔ وہ جو نام اچھا لئے کے لیے پل بناتے ہیں۔ نیکی کا کیا کام کرتے ہیں۔۔۔؟ خاک! میں نے کہا نہیں یہ مسجد بنوانے کا خیال بالکل غلط ہے۔ بہت سی الگ الگ مسجدوں کا ہونا بھی قوم کے حق میں ہرگز مفید نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ عوام بٹ جاتے ہیں۔

تھک ہار کر میں حج کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اللہ میاں نے مجھے خود ہی ایک راستہ بتا دیا۔ شہر میں ایک جلسہ ہوا۔ جب ختم ہوا تو لوگوں میں بد نظمی پھیل گئی۔ اتنی بھگڑ پھی کہ تمیں آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس حادثے کی خبر دوسرے روز اخباروں میں چھپی تو معلوم ہوا کہ وہ ہلاک نہیں بلکہ شہید ہوئے تھے۔

میں نے سوچنا شروع کیا۔ سوچنے کے علاوہ میں کئی مولویوں سے ملا۔ معلوم ہوا کہ وہ لوگ جو اچانک حادثوں کا شکار ہوتے ہیں۔ انھیں شہادت کا رتبہ ملتا ہے یعنی وہ رتبہ جس سے بڑا کوئی اور رتبہ ہی نہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر لوگ مر نے کی وجہے شہید ہوا کریں تو کتنا اچھا ہے۔ وہ جو عام موت مرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی موت بالکل اکارت جاتی ہے۔ اگر وہ شہید ہو جاتے تو کوئی بات بنتی۔

میں نے اس باریک بات پر اور غور کرنا شروع کیا۔ چاروں طرف جدھر دیکھو خستہ حال انسان تھے۔ چہرے زرد، فکرو تردد اور غم روز گار کے بوجھ تلتے پسے ہوئے۔ دھنسی ہوئی آنکھیں، بے جان چال۔ کپڑے تار تار، ریل گاڑی کے کنڈم مال کی طرح یا تو کسی ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں پڑے ہیں یا بازاروں میں بے مالک مویشیوں کی طرح منہ اٹھائے بے مطلب گھوم رہے ہیں۔ کیوں جی رہے ہیں۔ کس کے لیے جی رہے ہیں اور کیسے جی رہے ہیں۔ اس کا کچھ پتہ نہیں۔ کوئی وبا پھیلی۔ ہزاروں لوگ مر گئے اور کچھ نہیں تو بھوک اور پیاس ہی سے گھل گھل مرے۔ سردیوں میں اکٹھ گئے۔ گرمیوں میں سوکھ گئے۔ کسی کی موت پر کسی نے دو آنسو بہادیے، اکثریت کی موت خشک ہی رہی۔

زندگی سمجھ میں نہ آئی، ٹھیک ہے۔ اس سے حظ نہ اٹھایا، یہ بھی ٹھیک ہے۔۔۔ وہ کس کا شعر ہے۔ اللہ جختے شوالاپور کی امینہ بائی چلتے کر کیا درد بھری آواز میں گایا کرتی تھی۔۔۔ مر کے بھی چین نہ پایا تو کمدھر جائیں گے۔ میرا مطلب ہے اگر مر نے کے بعد بھی زندگی نہ سدھری تو لعنت ہے سری پر۔

میں نے سوچا کیوں نہ بیچارے، یہ قسمت کے مارے، در در کے ٹھکرائے ہوئے انسان جو اس دنیا میں ہر اچھی چیز کے لیے ترستے ہیں، اس دنیا میں ایسا رتبہ حاصل کریں کہ وہ جو یہاں ان کی طرف نگاہ اٹھانا پسند نہیں کرتے، وہاں ان کو دیکھیں اور رشک کریں۔ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ عام موت نہ مرنی بلکہ شہید ہوں۔

اب سوال یہ تھا کہ یہ لوگ شہید ہونے کے لیے راضی ہوں گے؟ میں نے سوچا، کیوں نہیں۔ وہ کون مسلمان ہے جس میں ذوقِ شہادت نہیں۔ مسلمانوں کی دیکھادیکھی تو ہندوؤں اور سکھوں میں بھی یہ رتبہ پیدا کر دیا گیا ہے۔ لیکن مجھے سخت نامیدی ہوئی جب میں نے ایک مریل سے آدمی سے پوچھا، ”کیا تم شہید ہونا چاہتے ہو؟“ تو اس نے جواب دیا، ”نہیں۔“

سمجھ میں نہ آیا کہ وہ شخص جی کر کیا کرے گا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ دیکھوڑے میاں، زیادہ سے زیادہ تم ڈیڑھ مہینہ اور جیو گے، چلنے کی تتم میں سکت نہیں۔ کھانتے کھانتے غوطے میں جاتے ہو تو ایسا لگتا ہے کہ بس دم نکل گیا۔ پھوٹی کوڑی تک تمہارے پاس نہیں۔ زندگی بھر تم نے سکھ نہیں دیکھا۔ مستقبل کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر اور جی کریا کرو گے۔ فونج میں تم بھرتی نہیں ہو سکتے۔ اس لیے محاذ پر اپنے وطن کی خاطر لڑتے لڑتے جان دینے کا خیال بھی عبث ہے۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہیں کہ تم کوشش کر کے یہیں بازار میں یا ڈیرے میں جہاں تم رات کو سوتے ہو، اپنی شہادت کا بندوبست کرلو۔ اس نے پوچھا، ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

میں نے جواب دیا، ”یہ سامنے کیلے کا چھکا کا پڑا ہے۔ فرض کر لیا جائے کہ تم اس پر سے پھسل جاؤ۔۔۔ ظاہر ہے کہ تم مر جاؤ گے اور شہادت کا رتبہ پاؤ گے۔“ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ کہنے لگا۔ ”میں کیوں آنکھوں دیکھے کیلے کے چھکلے پر پاؤ دھرنے لگا۔۔۔ کیا مجھے اپنی جان عزیز نہیں۔۔۔“ اللہ اللہ کیا جان تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچا جھریوں کی گٹھری!

مجھے بہت افسوس ہوا اور اس وقت اور بھی زیادہ ہوا، جب میں نے سننا کہ وہ کم بخت جو بڑی آسانی سے شہادت کا رتبہ اختیار کر سکتا تھا، خیراتی ہسپتال میں لو ہے کی چار پائی پر کھانتا کھنکارتا مار گیا۔ ایک بڑھا تھی منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ آخری سانس لے رہی تھی، مجھے بہت ترس آیا۔ ساری عمر غریب کی مفسسی اور رنج و غم میں گزری تھی۔ میں اسے اٹھا کر ریل کے پاٹ پر لے گیا۔ معاف کیجیے گا، ہمارے یہاں پڑھی کو پاٹا کہتے ہیں۔ لیکن جناب جو نہیں اس نے ٹرین کی آواز سنی۔ ہوش میں آگئی اور کوک بھرے کھلونے کی طرح اٹھ کر بھاگ گئی۔

میرا دل ٹوٹ گیا۔ لیکن پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری۔ بنیا کا بیٹا اپنی دھن کا پاک ہوتا ہے۔ نیکی کا جو صاف اور سیدھا راستہ مجھے نظر آیا تھا، میں نے اس کو اپنی آنکھ سے اوچھل نہ ہونے دیا۔ مغلوں کے وقت کا ایک بہت بڑا احاطہ غالی پڑا تھا۔ اس میں ایک سوا کاون چھوٹے چھوٹے

کمرے تھے۔ بہت ہی خستہ حالت میں۔ میری تجربہ کار آنکھوں نے اندازہ لگایا کہ پہلی ہی بڑی بارش میں سب کی چھتیں ڈھے جائیں گی۔ چنانچہ میں نے اس احاطے کو ساڑھے دس ہزار روپے میں خرید لیا اور اس میں ایک ہزار مغلوک الحال آدمی بسادیے۔ دو مہینے کرایہ وصول کیا۔ ایک روپیہ ماہوار کے حساب سے۔ تیرے مہینے جیسا کہ میر اندازہ تھا، پہلی ہی بڑی بارش میں سب کمروں کی چھتیں نیچے آ رہیں اور سات سو آدمی جن میں بچ بوڑھے سمجھی شامل تھے۔ شہید ہو گئے۔

وہ جو میرے دل پر بوجھ ساختا، کسی قدر ہلاک ہو گیا۔ آبادی میں سے سات سو آدمی کم بھی ہو گئے۔ لیکن انھیں شہادت کا رتبہ بھی مل گیا۔۔۔ ادھر کا پلٹ ابھاری ہی رہا۔ جب سے میں یہی کام کر رہا ہوں۔ ہر روز حسب توفیق دو تین آدمیوں کو جام شہادت پلا دیتا ہوں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ کام کوئی بھی ہو انسان کو محنت کرنا ہی پڑتی ہے۔ اللہ بنخشنے شوالا پور کی ایسے بائی چتلے کر ایک شعر کایا کرتی تھی۔ لیکن معاف کیجیے گا وہ شعر یہاں ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ کچھ بھی ہو، کہنا یہ ہے کہ مجھے کافی محنت کرنا پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی کو جس کا وجود چھٹرے کے پانچویں پہیے کی طرح بے معنی اور بیکار تھا۔ جام شہادت پلانے کے لیے مجھے پورے دس دن جگہ جگہ کیلے کے چھلکے گرانے پڑے لیکن موت کی طرح جہاں تک میں سمجھتا ہوں شہادت کا بھی ایک دن مقرر ہے۔ دسویں روز جا کر وہ پتھر لیے فرش پر کیلے کے چھلکے پر سے پھسلا اور شہید ہوا۔

آج کل میں ایک بہت بڑی عمارت بنوار ہوں۔ ٹھیکہ میری ہی کمپنی کے پاس ہے، دولاٹھ کا ہے۔ اس میں سے پچھتر ہزار تو میں صاف اپنی جیب میں ڈال لوں گا۔ بیمه بھی کرا لیا ہے۔ میر اندازہ ہے کہ جب تیری منزل کھڑی کی جائے گی تو ساری بلڈنگ اڑا اڑا دھڑام گر پڑے گی۔ کیونکہ مصالحہ ہی میں نے ایسا لگوایا ہے۔ اس وقت تین سو مزدور کام پر لگے ہوں گے۔ خدا کے گھر سے مجھے پوری پوری امید ہے کہ یہ سب کے سب شہید ہو جائیں گے۔ لیکن اگر کوئی نیچ گیا تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ پر لے درجے کا گناہ گار ہے جس کی شہادت اللہ تبارک تعالیٰ کو منظور نہیں تھی۔

-[135]-

شادی: سعادت حسن منٹو

جمیل کو اپنا شیفر لائف نائم قلم مرمت کے لیے دینا تھا۔ اس نے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں شیفر کمپنی کا نمبر تلاش کیا۔ فون کرنے سے معلوم ہوا کہ ان کے ایجنت میرز ڈی، بے، سستو رہیں جن کا دفتر گرین ہو ٹل کے پاس واقع ہے۔

جمیل نے ٹیکسی لی اور فورٹ کی طرف چل دیا۔ گرین ہو ٹل پہنچ کر اسے میسر ڈی، جے، سمتور کا دفتر تلاش کرنے میں وقت نہ ہوئی۔ بالکل پاس تھا مگر تیسرا منزل پر۔ لفت کے ذریعے جمیل وہاں پہنچا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی چوبی دیوار کی چھوٹی سی کھڑکی کے پیچھے اسے ایک خوش شکل اینگلو انڈین لڑکی نظر آئی، جس کی چھاتیاں غیر معمولی طور پر نمایاں تھیں۔ جمیل نے قلم اس کھڑکی کے اندر داخل کر دیا اور منہ سے کچھ نہ بولا۔ لڑکی نے قلم اس کے ہاتھ سے لے لیا، کھول کر ایک نظر دیکھا اور ایک چٹ پر کچھ لکھ کر جمیل کے حوالے کر دیا۔ منہ سے وہ بھی کچھ نہ بولی۔

جمیل نے چٹ دیکھی۔ قلم کی رسید تھی۔ چلنے ہی والا تھا کہ پلٹ کر اس نے لڑکی سے پوچھا، ”وس بارہ روز تک تیار ہو جائے گا، میر انھیاں ہے۔“ لڑکی بڑے زور سے ہنسی۔ جمیل کچھ کھسپانا سا ہو گیا، ”میں آپ کی اس ہنسی کا مطلب نہیں سمجھتا۔“ لڑکی نے کھڑکی کے ساتھ منہ لگا کر کہا، ”مسٹر۔۔۔ آج کل وار ہے وار۔۔۔ یہ قلم امریکہ جائے گا۔۔۔ تم نومہینے کے بعد پتا کرنا۔“ جمیل بوکھلا گیا، ”نومہینے!“ لڑکی نے اپنے بریدہ بالوں والا سر ہلا یا۔۔۔ جمیل نے لفت کا رخ کیا۔

یہ نومہینے کا سلسلہ خوب تھا۔۔۔ نومہینے۔۔۔ اتنی مدت کے بعد تو عورت گل گو تھنا بچھ پیدا کر کے ایک طرف رکھ دیتی ہے۔۔۔ نومہینے۔۔۔ نومہینے تک اس چھوٹی سی چٹ کو سنبھالے رکھو۔۔۔ اور یہ بھی کون و ثوق سے کہہ سکتا ہے کہ نومہینے تک آدمی یاد رکھ سکتا ہے کہ اس نے ایک قلم مرمت کے لیے دیا تھا۔۔۔ ہو سکتا ہے اس دوران میں وہ کم بخت مرکھ پہ ہی جائے۔

جمیل نے سوچا، یہ سب ڈھکو سلا ہے۔۔۔ قلم میں معمولی سی خرابی تھی کہ اس کا فیڈر ضرورت سے زیادہ روشنائی سپلائی کرتا تھا۔ اس کے لیے اسے امریکہ کے ہسپتال میں بھیجننا صریحًا بازی تھی۔۔۔ مگر پھر اس نے سوچا، لعنت بھیجو اس قلم پر۔۔۔ امریکہ جائے یا افریقہ۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے یہ بلیک مارکیٹ سے ایک سوچھتر روپے میں خریدا تھا۔۔۔ مگر اس نے ایک برس اسے خوب استعمال بھی تو کیا تھا۔۔۔ ہزاروں صفحے کا لے کر ڈالے تھے۔۔۔ چنانچہ وہ قوطی سے ایک دم رجائی بن گیا۔ اور رجائی بنتے ہی اسے خیال آیا کہ وہ فورٹ میں ہے اور فورٹ میں شراب کی بے شمار دکانیں۔ وسکی تو ظاہر ہے نہیں ملے گی لیکن فرانس کی بہترین کونک برانڈی تو مل جائے گی، چنانچہ اس نے قریب والی شراب کی دکان کا رخ کیا۔

برانڈی کی ایک بوتل خرید کرو وہ لوٹ رہا تھا کہ گرین ہوٹل کے پاس آکے رک گیا۔ ہوٹل کے نیچے قد آدم شیشوں کا بنا ہوا قالینوں کا شوروم تھا۔ یہ جمیل کے دوست پیر صاحب کا تھا۔ اس نے سوچا چلو اندر چلیں۔ چنانچہ چند لمحات کے بعد ہی وہ شوروم میں تھا اور اپنے دوست پیر سے، جو عمر میں اس سے کافی بڑا تھا، ہنسی مذاق کی گفتگو کر رہا تھا۔

برانڈی کی بوتل باریک کاغذ میں لپٹی دبیز ایرانی قالین پر لیٹی ہوئی تھی۔ پیر صاحب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جمیل سے کہا، ”یا اس دلہن کا گھونگٹ تو کھولو۔۔۔ ذرا اس سے چھپر خانی تو کرو۔“ جمیل مطلب سمجھ گیا، ”سو پیر صاحب گلاس اور سوڈے منگوائیے۔ پھر دیکھیے کیا نگ جنمتا ہے۔“

فوراً گلاس اور تن بستہ سوڈے آگئے۔ پہلا دور ہوا۔ دوسرا دور شروع ہونے ہی والا تھا کہ پیر صاحب کے ایک گجراتی دوست اندر چلے آئے اور بڑی بے تکلفی سے قالین پر بیٹھ گئے۔ اتفاق سے ہوٹل کا چھوکر ادوار کے بجائے تین گلاس اٹھالا یا تھا۔ پیر صاحب کے گجراتی دوست نے بڑی صاف اردو میں چند ادھر ادھر کی باتیں کیں اور گلاس میں یہ بڑا پیگ ڈال کر اس کو سوڈے سے باللب بھردیا۔ تین چار لمبے لمبے گھونٹ لے کر انہوں نے رومال سے اپنا منہ صاف کیا، ”سکریٹ نکالو یا!“

پیر صاحب میں ساتوں عیب شرعی تھے۔ مگر وہ سکریٹ نہیں پیتے تھے۔ جمیل نے جیب سے اپنا سکریٹ کیس نکلا اور قالین پر رکھ دیا۔ ساتھ ہی لاکٹر۔۔۔ اس پر پیر صاحب نے جمیل سے اس گجراتی کا تعارف کرایا، ”مسٹر نٹور لال۔۔۔ آپ متیوں کی دلائی کرتے ہیں۔“ جمیل نے ایک لحظے کے لیے سوچا، کوئی دلائی میں تو انسان کامنہ کالا ہوتا ہے۔۔۔ متیوں کی دلائی میں۔۔۔ پیر صاحب نے جمیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”مسٹر جمیل۔ مشہور سونگ رائٹر۔۔۔“ دونوں نے ہاتھ ملایا اور برانڈی کا نیا دور شروع ہوا اور ایسا شروع ہوا کہ بوتل خالی ہو گئی۔

جمیل نے دل میں سوچا یہ کم بخت متیوں کا دلال بلا کا پینے والا ہے۔۔۔ میری پیاس اور سرور کی ساری برانڈی چڑھا گیا۔ خدا کرے اسے متیا بند ہو۔ مگر جو نہی آخري دور کے پیگ نے جمیل کے پیٹ میں اپنے قدم جمائے، اس نے نٹور لال کو معاف کر دیا۔ اور آخر میں اس سے کہا، ”مسٹر نٹور! اٹھیے، ایک بوتل اور ہو جائے۔“ نٹور لال فوراً اٹھا۔ اپنے سفید دلگے کی شکنیں درست کیں۔ دھوٹی کی لانگ ٹھیک کی اور کہا، ”چلیے!“

جمیل پیر صاحب سے مخاطب ہوا، ”ہم ابھی حاضر ہوتے ہیں۔“ جمیل اور نور نے باہر نکل کر ٹیکسی لی اور شراب کی دکان پر پہنچ۔ جمیل نے ٹیکسی روکی مگر نور نے کہا، ”مسٹر جمیل--- یہ دکان ٹھیک نہیں۔ ساری چیزیں مہنگی پیچتا ہے۔“ یہ کہہ کروہ ٹیکسی ڈرائیور سے مخاطب ہوا، ”دیکھو کولا بے چلو!“ کولا بے پہنچ کر نور، جمیل کو شراب کی ایک چھوٹی سی دکان میں لے گیا۔ جو برانڈ جمیل نے فورٹ سے لیا، وہ تونہ مل سکا، ایک دوسرا مل گیا جس کی نور نے بہت تعریف کی کہ نمبرون ہے۔

یہ نمبرون چیز خرید کر دونوں باہر نکلے۔ ساتھ ہی بار تھی۔ نور کے ساتھ، ”مسٹر جمیل! کیا خیال ہے آپ کا، ایک دوپیگی یہیں سے پی کر چلتے ہیں۔“ جمیل کو کوئی اعتراض نہیں تھا، اس لیے کہ اس کا نشہ حالت نزع میں تھا۔ چنانچہ دونوں بار کے اندر داخل ہوئے۔ معاجمیل کو خیال آیا کہ باروائے تو بھی باہر کی شراب پینے کی اجازت نہیں دیا کرتے، ”مسٹر نور آپ یہاں کیسے پی سکتے ہیں۔ یہ لوگ اجازت نہیں دیں گے۔“ نور نے زور سے آنکھ ماری، ”سب چلتا ہے۔“

اور یہ کہہ کر ایک کیبن کے اندر رکھس گیا۔ جمیل بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ نور نے بوتل سنگین تپائی پر رکھی اور بیرے کو آواز دی۔ جب وہ آیا تو اس کو بھی آنکھ ماری، ”دیکھو! دو سو ڈے رو جرز۔ ٹھنڈے۔ اور دو گلاس۔ ایک دم صاف“ بیرا یہ حکم سن کر چلا گیا اور فور اس سے اور گلاس حاضر کر دیے۔ اس پر نور نے اسے دوسرا حکم دیا۔ ”فسٹ کلاس چپس اور ٹو میٹو سوس۔ اور فست کلاس کٹلس۔“

بیرا چلا گیا۔ نور جمیل کی طرف دیکھ کر ایسے ہی مسکرا یا۔ بوتل کا کارک نکلا اور جمیل کے گلاس میں اس سے پوچھے بغیر ایک ڈبل ڈال دیا۔ خود اس سے کچھ زیادہ سوڈا حل ہو گیا تو دونوں نے اپنے گلاس ٹکرائے۔ جمیل پیاساتھا۔ ایک جرعے میں اس نے آدھا گلاس ختم کر دیا۔ سوڈا چونکہ بہت ٹھنڈا اور تیز تھا اس لیے پھوٹھوں کرنے لگا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد چپس اور کٹلس آگئے۔ جمیل صبح گھر سے ناشہ کر کے نکلا تھا لیکن برانڈی نے اسے بھوک لگادی۔ چپس گرم گرم تھے، کٹلس بھی۔ وہ پل پڑا۔ نور نے اس کا ساتھ دیا۔ چنانچہ دونوں ہومنٹ میں دونوں پلیٹیں صاف!

دو پلیٹیں اور منگوائی گئیں۔ جمیل نے اپنے لیے چپس بھی منگوائے۔ دو گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ بوتل کی تین چوتھائی گانجہ ہو چکی تھی۔ جمیل نے سوچا کہ اب پیر صاحب کے پاس جانا بے کار ہے۔ نشے خوب جم رہے تھے، سرور خوب گھٹ رہے تھے۔ نور اور جمیل دونوں ہوا کے گھوڑوں پر سوار تھے۔ ایسے سواروں کو عام طور پر ایسی وادیوں میں جانے کی بڑی خواہش ہوتی ہے، جہاں انھیں عریاں بدن حسین عورتیں ملیں۔ وہ ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گھوڑے پر بٹھا لیں اور یہ جا، وہ جا۔

جمیل کا دل و دماغ اس وقت کسی ایسی وادی کے متعلق سوچ رہا تھا جہاں اس کی کسی ایسی خوبصورت عورت سے مذکور ہو جائے جس کو وہ اپنے پتھر ہوئے سینے کے ساتھ بھینچ لے، اس زور سے کہ اس کی ہڈیاں تک چڑھائیں۔ جمیل کو اتنا تو معلوم تھا کہ وہ ایسی جگہ پر ہے۔۔۔ مطلب ایسے علاقے میں ہے جو اپنے برو تھلز (قبہ خانے) کی وجہ سے ساری بیمی میں مشہور ہے، جبھیں عیاشی کرنا ہوتی ہے وہ ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ شہر سے بھی جس لڑکی کو لوگ چھپ کر پیشہ کرنا ہوتا ہے، یہیں آتی ہے۔ ان معلومات کی بنابر اس نے نور سے کہا، ”میں نے کہا۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ میرا مطلب ہے، ادھر کوئی چھو کری وو کری نہیں ملتی؟“

نور نے اپنے گلاس میں ایک بڑا پیگ انٹھیلا اور ہنسا، ”مسٹر جمیل! ایک نہیں ہزاروں۔۔۔ ہزاروں۔۔۔ ہزاروں۔۔۔!“ یہ ہزاروں کی گردان جاری رہتی اگر جمیل نے اس کی بات کائی نہ ہوتی، ”ان ہزاروں میں سے آج ایک ہی مل جائے تو ہم سمجھیں کہ نور بھائی نے کمال کر دیا۔“ نور بھائی مزے میں تھے۔ جھوم کر کہا، ”جمیل بھائی۔۔۔ ایک نہیں ہزاروں۔۔۔ چلو، اس کو ختم کرو۔“

دونوں نے بوتل میں جو کچھ بچا تھا، آدھ گھنٹے کے اندر اندر ختم کر دیا۔ بل ادا کرنے اور بیرے کو تنگی ٹپ دینے کے بعد دونوں باہر نکلے۔ اندر اندر ہیرا تھا۔ باہر دھوپ چمک رہی تھی۔ جمیل کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ ایک لمحے کے لیے اسے کچھ نظر نہ آیا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں تیز روشنی کی عادی ہوئیں تو اس نے نور سے کہا، ”چلو بھائی!“

نور نے تلاشی لینے والی نگاہوں سے جمیل کی طرف دیکھا، ”مال پانی ہے نا؟“ جمیل کے ہونٹوں پر نیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ نور کی پسلیوں میں کہنی سے ٹھوکا دے کر اس نے کہا، ”نمہت۔ نور بھائی، نہت۔“ اور اس نے جیب سے پانچ نوٹ سوسو کے نکالے۔ ”کیا اتنے کافی نہیں؟“ نور کی باچھیں کھل گئیں، ”کافی۔۔۔؟ بہت زیادہ ہیں۔۔۔ چلو آؤ، پہلے ایک بوتل خرید لیں، وہاں ضرورت پڑے گی۔“ جمیل نے سوچا بات بالکل ٹھیک ہے، وہاں ضرورت نہیں پڑے گی تو کیا کسی مسجد میں پڑے گی۔ چنانچہ فوراً ایک بوتل خرید لی گئی۔ ٹیکسی کھڑی تھی۔ دونوں اس میں بیٹھ گئے اور اس وادی کی سیاحتی کرنے لگے۔

سیکڑوں برو تھلز تھے۔ ان میں سے بیس پچھیں کا جائزہ لیا گیا، مگر جمیل کو کوئی عورت پسند نہ آئی۔ سب میک اپ کی موٹی اور شوخ تھوں کے اندر چھپی ہوئی تھیں۔ جمیل چاہتا تھا کہ ایسی لڑکی ملے جو مرمت شدہ مکان معلوم نہ ہو۔ جس کو دیکھ کر یہ احساس نہ ہو کہ جگہ جگہ اکھڑے ہوئے پلٹر کے ٹکڑوں پر بڑے انڑی پن سے سرخی اور چونا لگایا گیا ہے۔ نور نگ آگیا۔ اس کے سامنے جو بھی عورت آتی تھی، وہ جمیل کا کندھا پکڑ کر کہتا، ”جمیل بھائی، چلے گی؟“ مگر جمیل بھائی اٹھ کھڑا ہوتا، ”ہاں چلے گی۔۔۔ اور ہم بھی چلیں گے۔“

دو جگہیں اور دیکھی گئیں مگر جمیل کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ سوچتا تھا کہ ان عورتوں کے پاس کون آتا ہے جو سورکے سوکھے ہوئے گوشت کے ٹکڑوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی ادایمیں کتنی مکروہ ہیں۔ اٹھنے بیٹھنے کا انداز کتنا فرش ہے اور کہنے کو یہ پرائیویٹ ہیں یعنی ایسی عورتیں جو درپرده پیشہ کرتی ہیں۔۔۔ جمیل کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ پر دکھاں ہے جس کے پیچے یہ دھنہ کرتی ہیں۔

جمیل سوچ ہی رہا تھا کہ اب پروگرام کیا ہونا چاہیے کہ نٹورنے ٹیکسی رکوائی اور اتر کر چلا گیا کہ ایک دم اسے ایک ضروری کام یاد آگیا تھا۔ اب جمیل اکیلا تھا۔ ٹیکسی تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی تھی۔ اس وقت ساڑھے چار نجع پکے تھے۔ اس نے ڈرائیور سے پوچھا، ”یہاں کوئی بھڑوا ملے گا؟“ ڈرائیور نے جواب دیا، ”ملے گا جناب!“

”تو چلو اس کے پاس۔“ ڈرائیور نے دو تین موڑ گھومے اور ایک پہاڑی بلگہ نما بلڈنگ کے پاس گاڑی کھڑی کر دی۔ دو تین مرتبہ ہارن بجا یا۔ جمیل کا سرنشے کے باعث سخت بو جھل ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھنڈ سی چھائی ہوئی تھی۔۔۔ اسے معلوم نہیں تھا کیسے اور کس طرح، مُرجب اس نے ذرا دماغ کو جھکا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک پنگ پر بیٹھا ہے اور اس کے پاس ہی ایک جوان لڑکی، جس کی ناک کی پھنگ پر چھوٹی سی پھنسی تھی، اپنے بریدہ بالوں میں لگانچھی کر رہی ہے۔

جمیل نے اس کو غور سے دیکھا۔ سوچنے ہی والا تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا مگر اس کے شعور نے اس کو مشورہ دیا کہ دیکھو یہ سب عبث ہے۔ جمیل نے سوچا، یہ ٹھیک ہے لیکن پھر بھی اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی اندر نوٹ گن کر اور پاس پڑی ہوئی تپائی پر برانڈی کی سالم بوتل دیکھ کر اپنی تشفی کر لی کہ سب خیریت ہے۔ اس کا نشہ کسی قدر نیچے اتر گیا۔ اٹھ کر وہ اس گیسوبریدہ لڑکی کے پاس گیا اور کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ مسکرا کر اس سے کہا، ”کہیے، مزاج کیسا ہے؟“ اس لڑکی نے لگانچھی میز پر رکھی اور کہا، ”کہیے آپ کا کیسا ہے؟“

”ٹھیک ہوں!“ یہ کہہ کر اس نے لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالا، ”آپ کا نام؟“

” بتاؤ چکی ایک دفعہ۔۔۔ آپ کو میرا خیال ہے یہ بھی یاد نہ رہا ہو گا کہ آپ ٹیکسی میں یہاں آئے۔۔۔ جانے کہاں کہاں گھومتے رہے ہوں گے کہ بل اڑتیں روپے بناؤ جو آپ نے ادا کیا اور ایک شخص کا نام شاید نٹور تھا، آپ نے اس کو بے شمار گالیاں دیں۔“

جمیل اپنے اندر ڈوب کر سارے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنے ہی والا تھا کہ اس نے سوچا کہ فی الحال اس کی ضرورت نہیں، میں بھول جایا کرتا ہوں۔۔۔ یا یوں سمجھیے کہ مجھے بار بار پوچھنے میں مزا آتا ہے۔۔۔ وہ صرف اتنا یاد کر سکا کہ اس نے ٹیکسی والے کا بل جو کہ اڑتیس روپے بتا تھا، ادا کیا تھا۔

لڑکی پنگ پر بیٹھ گئی، ”میرا نام تارہ ہے۔“ جمیل نے اس کو شادیا اور اس سے مصنوعی پیار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کو پیاس محسوس ہوئی تو اس نے تارہ سے کہا، ”دو خوبستہ سوڈے اور گلاس!“ تارہ نے یہ دونوں چیزیں فوراً حاضر کر دیں۔ جمیل نے بوتل کھوی۔ اپنے لیے ایک پیگ ڈال کر اس نے دوسرا تارہ کے لیے ڈالا۔۔۔ پھر دونوں پینے لگے۔ تین پیگ پینے کے بعد جمیل نے محسوس کیا کہ اس کی حالت بہتر ہو گئی ہے۔ تارہ کو چونمنے چاٹنے کے بعد اس نے سوچا کہ اب قصہ مختصر ہو جانا چاہیے، ”کپڑے اتار دو!“

”سارے؟“

”ہاں سارے!“

تارہ نے کپڑے اتار دیے اور لیٹ گئی۔ جمیل نے اس کے نگے جسم کو ایک نظر دیکھا اور یہ رائے قائم کی کہ اچھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی خیالات کا ایک تانتا بندھ گیا۔ جمیل کا نکاح ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو دو تین مرتبہ دیکھا تھا۔ اس کا بدن کیسا ہو گا۔۔۔ کیا وہ تارہ کی طرح اس کے ایک مرتبہ کہنے پر اپنے سارے کپڑے اتار کر اس کے ساتھ لیٹ جائے گی؟ کیا وہ اس کے ساتھ برانڈی پیے گی؟ کیا اس کے بال کٹے ہوئے ہیں؟

پھر فوراً اس کا ضمیر جا گا جس نے اس کو لعنت ملامت شروع کر دی۔ نکاح کا یہ مطلب تھا کہ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ صرف ایک مرحلہ باقی تھا کہ وہ اپنی سر اسراں جائے اور لڑکی کا ہاتھ کپڑا کر لے آئے۔۔۔ کیا اس کے لیے یہ واجب تھا کہ ایک بازاری عورت کو اپنی آنکھ کی زینت بنائے۔۔۔ خم کے خم لندھاتا پھرے۔

جمیل بہت خفیف ہوا اور اسی خفت میں اس کی آنکھیں مند ناشرد ع ہو گئیں اور وہ سو گیا۔ تارہ بھی تھوڑی دیر کے بعد خواب غفلت کے مزے لینے لگی۔ جمیل نے کئی بے ربط، اوٹ پٹاگنگ خواب دیکھے۔۔۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد جب کہ ایک بہت ہی ڈرائنا خواب دیکھ رہا تھا، وہ

ہٹ بڑا کے اٹھا۔ جب اچھی طرح آنکھیں کھلیں تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک اخوبی کمرے میں ہے اور اس کے ساتھ الف نگلی لڑکی لیٹی ہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد واقعات آہستہ آہستہ اس کے دماغ کی دھند چیز کر نمودار ہونے لگے۔

وہ خود بھی الف نگا تھا۔ بوکھلا ہٹ میں اس نے الٹا پاجامہ پہن لیا، مگر اس کو احساس نہ ہوا۔ کرتا پہن کر اس نے جیسیں ٹھوپیں۔ نوٹ سب کے سب موجود تھے۔ اس نے سوڈا کھولا اور ایک پیگ بنائ کر پیا۔ پھر اس نے تارہ کو ہولے سے چنجھوڑا، ”اٹھو!“ تارہ آنکھیں ملتی اٹھی۔ جمیل نے اس سے کہا، ”کپڑے پہن لو!“

تارہ نے کپڑے پہن لیے۔۔۔ باہر گھری شام رات بننے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ جمیل نے سوچا، اب کوچ کرنا چاہیے۔ لیکن وہ تارہ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا، کیوں کہ بہت سی باتیں اس کے ذہن سے نکل گئیں تھیں، ”کیوں تارہ جب ہم لیٹے۔۔۔ میرا مطلب ہے جب میں نے تم سے کپڑے اتارنے کو کہا تو اس کے بعد کیا ہوا؟“ تارہ نے جواب دیا، ”کچھ نہیں۔۔۔ آپ نے اپنے کپڑے اتارے اور میرے بازو پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے سو گئے۔“

”بس؟“

”ہا۔۔۔ لیکن سونے سے پہلے آپ دو تین مرتبہ بڑھائے اور کہا، ”میں گنہگار ہوں۔۔۔ میں گنہگار ہوں۔۔۔“ یہ کہہ کر تارہ اٹھی اور اپنے بال سنوارنے لگی۔ جمیل بھی اٹھا۔ گناہ کا احساس دبانے کے لیے اس نے ڈبل پیگ اپنے حلق میں جلدی جلدی انڈیلا۔ بوتل کو کاغذ میں لپیٹا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

تارہ نے پوچھا، ”چلے؟“

”ہا، پھر کبھی آؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ لوہے کی بیچ دار سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ بڑے بازار کی طرف اس کے قدم اٹھنے ہی والے تھے کہ ہارن بجا، اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ اس نے کہا چلو، اچھا ہوا، بیسیں مل گئی۔ پیدل چلنے کی زحمت سے نیچ گئے۔ اس نے ڈرائیور سے پوچھا، ”کیوں بھائی خالی ہے؟“ ڈرائیور نے جواب دیا، ”خالی ہے کا کیا مطلب۔۔۔ لگی ہوئی ہے۔“

”تو پھر---“ یہ کہہ کر جمیل مڑا، لیکن ڈرائیور نے اس کو پکارا، ”کدھر جاتا ہے سیٹھ؟“ جمیل نے جواب دیا، ”کوئی اور ٹیکسی دیکھتا ہوں۔“ ڈرائیور باہر نکل آیا، ”متک تو نہیں پھرے لا۔-- یہ ٹیکسی تمہیں نے تولے رکھی ہے!“ جمیل بوکھلا گیا، ”میں نے؟“ ڈرائیور نے بڑے گناوار لجھے میں اس سے کہا، ”ہاں تو نے--- سالا داروپی کرسب کچھ بھول گیا۔“ اس پر تو تو میں میں شروع ہوئی۔ ادھر ادھر سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ جمیل نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا، ”چلو!“

ڈرائیور نے ٹیکسی چلانی، ”کدھر؟“ جمیل نے کہا، ”پولیس اسٹیشن!“ ڈرائیور نے اس پر جانے کیا وہ تباہی بکی۔-- جمیل سوچ میں پڑ گیا۔ جو ٹیکسی اس نے لی تھی، اس کا بل جواڑ تیس روپے تھا، اس نے ادا کر دیا تھا۔ اب یہ نئی ٹیکسی کہاں سے آن پکی۔ گودہ نشے کی حالت میں تھا مگر وہ یقینی طور پر کہہ سکتا تھا کہ یہ وہ ٹیکسی نہیں تھی، اور نہ یہ ڈرائیور وہ ڈرائیور جو اسے یہاں لایا تھا۔

پولیس اسٹیشن پہنچے۔ جمیل کے قدم بہت بری طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ سب انسپکٹر جو اس وقت ڈیوٹی پر تھا، فوراً بھانپ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے جمیل کو کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ ڈرائیور نے اپنی داستان شروع کر دی جو سرتاپ غلط تھی۔ جمیل یقیناً اس کی تردید کرتا مگر اس میں زیادہ بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ سب انسپکٹر سے مخاطب ہو کر اس نے کہا، ”جناب! میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ کیا قصہ ہے، جو ٹیکسی میں نے لی تھی، اس کا کرایہ میں نے اڑتیس روپے ادا کر دیا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ یہ کون ہے اور مجھ سے کیسا کرایہ مانگتا ہے؟“

ڈرائیور نے کہا، ”حضور انسپکٹر بہادر! یہ داروپئے ہے۔“ اور ثبوت کے طور پر اس نے جمیل کی برائذی کی بوتل میز پر رکھ دی۔ جمیل جھنجھلا گیا، ”ارے بھئی! کون سور کہتا ہے کہ اس نے نہیں پی۔-- سوال تو یہ ہے کہ آپ کہاں سے تشریف لے آئے۔“ سب انسپکٹر شریف آدمی تھا۔ کرایہ ڈرائیور کے حساب سے بیالیس روپے بنتا تھا۔ اس نے پندرہ روپے میں فیصلہ کر دیا۔ ڈرائیور بہت چیخا چلا یا مگر سب انسپکٹر نے اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر تھانے سے نکلا دیا۔ پھر اس نے ایک سپاہی سے کہا کہ وہ دوسرا ٹیکسی لائے۔ ٹیکسی آئی تو اس نے ایک سپاہی جمیل کے ساتھ کر دیا کہ وہ اسے گھر چھوڑ آئے۔ جمیل نے لکنت بھرے لجھ میں اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور پوچھا، ”جناب کیا یہ گرانٹ روڈ پولیس اسٹیشن ہے؟“

سب انسپکٹر نے زور کا تھہہ لگایا اور پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ”مسٹر! اب ثابت ہو گیا کہ تم نے خوب پی رکھی ہے۔-- یہ کولا بہ پولیس اسٹیشن ہے۔-- جاؤ، اب گھر جا کر سو جاؤ۔“ جمیل گھر جا کے کھانا کھائے اور کپڑے اتارے بغیر سو گیا۔-- برائذی کی بوتل بھی اس کے ساتھ سوتی رہی۔

دوسرے روز وہ دس بجے کے قریب اٹھا۔ جوڑ جوڑ میں درد تھا۔ سر میں جیسے بڑے بڑے وزنی پتھر تھے۔ منہ کا ذائقہ خراب۔ اس نے اٹھ کر دو تین گلاس فروٹ سالٹ کے پیے، چار پانچ پیالے چائے کے۔ تب کہیں شام کو جا کر طبیعت کسی قدر بحال ہوئی اور اس نے خود کو گزشتہ واقعات کے متعلق سوچنے کے قابل محسوس کیا۔

بہت لمبی زنجیر تھی۔ ان میں سے بعض کڑیاں تو سلامت تھیں مگر بعض غائب۔ واقعات کا تسلسل شروع سے لے کر گرین ہوٹل اور وہاں سے لے کر کولا بے تک بالکل صاف تھا۔ اس کے بعد جب نٹور کے ساتھ خاص وادی کی سیاحی شروع ہوئی تھی، معاملہ گذمہ ہو جاتا تھا۔ چند جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں بڑی واضح، مگر فوراً مہم پر چھائیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ وہ کیسے اس لڑکی کے گھر پہنچا۔۔۔ اس کا نام جیل کے حافظے سے پھسل کر جانے کس کھڈ میں جا گرا تھا۔ اس کی شکل و صورت اسے البتہ بڑی اچھی طرح یاد تھی۔

وہ اس کے گھر کیسے پہنچا تھا۔۔۔ یہ جاننا بہت اہم تھا۔ اگر جیل کا حافظہ اس کی مدد کرتا تو بہت سی چیزیں صاف ہو جاتیں۔ مگر بصد کوشش وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اور یہ نیکیوں کا کیا سلسلہ تھا۔ اس نے پہلی کو تو چھوڑ دیا تھا، مگر وہ دوسری کہاں سے پیک پڑی تھی؟ سوچ سوچ کے جیل کا دماغ پاش پاش ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ جتنے وزنی پتھر تھے، سب آپس میں ٹکرائیں کر چور چور ہو گئے ہیں۔ رات کو اس نے برانڈی کے تین پیگ پے، تھوڑا سا ہلاک کھانا کھایا اور گزشتہ واقعات کے متعلق سوچتا سوچتا سوگیا۔

وہ ٹکڑے جو گم ہو گئے تھے، ان کو تلاش کرنا اب جیل کا شغل ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جو کچھ اس روز ہوا، من و عن اس کی آنکھوں کے سامنے آجائے اور یہ روز روز کی مغزپاشی دور ہو۔۔۔ اس کے علاوہ اس کو اس بات کا بھی بڑا لفظ تھا کہ اس کا گناہ نامکمل رہ گیا۔ وہ سوچتا یہ ادھوراً گناہ جائے گا کس کھاتے میں۔ وہ چاہتا تھا کہ بس ایک دفعہ اس کی بھی تتمیل ہو جائے۔ مگر تلاش بسیار کے باوجود وہ پہاڑی بُنگلوں جیسا مکان جیل کی آنکھوں سے اوچھل رہا۔ جب وہ تھک ہار گیا تو اس نے ایک دن سوچا کہ یہ سب خواب ہی تو نہیں تھا!

مگر خواب کیسے ہو سکتا تھا۔ خواب میں آدمی اتنے روپے تو خرچ نہیں کرتا۔۔۔ اس روز اس کے کم از کم ڈھائی سوروپے خرچ ہوئے تھے۔ بیر صاحب سے اس نے نٹور کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ اس روز کے بعد دوسرے دن ہی سمندر پار کہیں چلا گیا ہے۔ غالباً موتویوں کے سلسلے میں۔ جیل نے اس پر بہار لعنتیں بھیجیں اور اپنی تلاش شروع کر دی۔

اس نے جب اپنے حافظے پر بہت زور دیا تو اسے بُنگلے کی دیوار کے ساتھ پیٹل کی ایک پلیٹ نظر آئی۔۔۔ اس پر کچھ لکھا تھا۔۔۔ غالباً۔۔۔ ڈاکٹر۔۔۔ ڈاکٹر بیرام جی۔۔۔ آگے جانے کیا۔۔۔ ایک دن کولا بے کی گلیوں میں چلتے چلتے آخر وہ ایک ایسی گلی میں پہنچا جو اس کو جانی پہچانی

معلوم ہوئی۔ دور ویہ اسی قسم کی بگلہ نما عمارت میں تھیں۔ ہر عمارت کے باہر چھوٹے چھوٹے پیتل کے بورڈ لگے تھے۔ کسی پر چار کسی پر پانچ۔۔۔ کسی پر تین۔ وہ ادھر ادھر غور سے دیکھتا چلا جا رہا تھا، مگر اس کے دماغ میں وہ خط گھوم رہا تھا جو صحیح اس کی ساس کی طرف سے موصول ہوا تھا کہ اب انتظار کی حد ہو گئی ہے۔ میں نے تاریخ مقرر کر دی ہے، آؤ اور اپنی دلہن کو لے جاؤ۔

اور وہ ادھر ایک نامکمل گناہ کو مکمل بنانے کی کوشش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ جمیل نے کہا، ”ہٹاو جی اس وقت۔۔۔ پھر نے دو مار مارا۔۔۔ ایک دم اس نے اپنے داہنے ہاتھ پیتل کا ایک چھوٹا سا بورڈ دیکھا۔۔۔ اس پر لکھا تھا۔۔۔ ڈاکٹر ایم بیر ایم جی۔۔۔ ایم ڈی۔ جمیل کا نپنے لگا۔ یہ وہی بلڈنگ۔۔۔ بالکل وہی۔۔۔ وہی رنگ، وہی بل کھاتی ہوئی آہنی سیڑھیاں۔ جمیل بے دھڑک اوپر چلا گیا۔ اس کے لیے اب ہر چیز جانی پچھانی تھی۔ کوریڈور سے نکل کر اس نے سامنے والے دروازے پر دستک دی۔

ایک لڑکے نے دروازہ کھولا۔۔۔ اسی لڑکے نے جو اس روز سوڈا اور برف لایا تھا۔ جمیل نے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے اس سے پوچھا، ”بیٹا، بائی جی ہیں؟“ لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا، ”جی ہاں!“

”جاو، ان سے کہو، صاحب ملنے آئے ہیں۔“ جمیل کے لبھ میں بے تکلفی تھی۔ لڑکا دروازہ بھیڑ کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور تارہ نمودار ہوئی۔ اس کو دیکھتے ہی جمیل نے پچان لیا کہ وہی لڑکی ہے، مگر اب اس کی ناک پر چھنسی نہیں تھی، ”نمیتے!“

”نمیتے! کہیے مزاد کیسے ہیں؟“ یہ کہہ کر اس نے اپنے کٹھے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔ جمیل نے جواب دیا، ”اچھے ہیں۔۔۔ میں پچھلے دنوں بہت مصروف رہا، اس لیے آنه سکا۔۔۔ کہو، پھر کیا ارادہ ہے؟“ تارہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا، ”معاف کیجیے، میری شادی ہو چکی ہے۔“ جمیل بوکھلا گیا، ”شادی۔۔۔ کب؟“ تارہ نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا، ”جی، آج صحیح۔۔۔ آئیے میں آپ کو اپنے پتی سے ملاوں۔“

جمیل چکر اگیا اور کچھ کہے سنے بغیر کھٹا کھٹ نیچے اتر گیا۔۔۔ سامنے ٹیکسی کھڑی تھی۔ جمیل کا دل ایک لختے کے لیے ساکت سا ہو گیا۔ تیز قدم اٹھاتا، وہ بڑے بازار کی طرف نکل گیا۔ معاً جمیل کو جاتے دیکھ کر ڈرائیور نے زور سے کہا، ”سیٹھ صاحب ٹیکسی!“

جمیل نے جھنچھلا کر کہا، ”نہیں کم بخت، شادی!“